ٹھاکرانی سب کچھ بھول کرایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''کیا..... کیا ہوا چھوٹے ٹھاکر کو؟'' اس نے گھبرا کر پوچھا۔ اس کا ایک ہاتھ سینے پر تھا۔ اس کی آنکھیں پوری طرح کھل گئی تھیں..... بلکہ پھٹ سی گئی تھیں۔

شانتا بت بنی کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے لیکن آواز نہیں نکل پا رہی تھی۔

''کیا بات ہے؟ بولتی کیوں نہیں؟'' ٹھاکرانی نے اسے ڈانٹا۔

''وہ..... چھوٹے ٹھاکر..... چھوٹے ٹھاکر یہاں نہیں ہیں'' شانتا نے بڑی مشکل سے کہا۔

ٹھاکرانی کو لگا کہ اس کا دل بند ہو جائے گا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ ''کیا بکتی ہے۔ یہیں تو تھے چھوٹے ٹھاکر''۔ اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔

''جھولا خالی پڑا ہے مالکن''۔

ٹھاکرانی نے بہت تیزی سے سوچنے کی کوشش کی۔ مگر بات سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔ راجو گئی ہے تو بچہ یہیں تھا۔ ورنہ راجو ہی شور مچا دیتی۔ اور راجو کے جانے کے ایک منٹ بعد شانتا کمرے میں آ گئی تھی۔ اور اس دوران وہ خود آنکھیں کھولے لیٹی رہی تھی۔ اس ایک منٹ میں بچہ کہاں جا سکتا ہے۔ ''کمرے میں دیکھ ادھر ادھر'' اس نے شانتا سے کہا۔

لیکن کمرے میں ایسی کوئی جگہ ہی نہیں تھی۔ پھر بھی شانتا نے کمرا چھان مارا۔ اس دوران ٹھاکرانی سوچتی رہی۔ مگر اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ''جا..... جا کے ٹھاکر جی کو بلا کر لا''۔ ٹھاکرانی نے کہا۔

چند منٹ بعد ٹھاکرانی کا کمرا بھر گیا..... سب مہمانوں کو پتا چل گیا تھا۔ سب آ گئے تھے۔ لیکن ٹھاکر پرتاپ سنگھ کا کہیں پتا نہیں تھا۔ ٹھاکرانی کا برا حال تھا۔ مہمانوں میں ٹھاکر کے چچیرے بھائی بلبیر سنگھ بھی تھے۔ انہوں نے دلاسا دیا۔ ''بچہ کہاں جائے گا دیورانی جی، خود کو ہلکان مت کرو''۔

پوری حویلی چھان ماری گئی۔ بچے کا کہیں پتا نہیں چلا۔ ٹھاکر بھی ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ ٹھاکرانی پر غشی کے دورے پڑنے لگے۔ ایک اور مصیبت کھڑی ہو گئی۔ ٹھاکرانی کو سنبھالا جائے یا بچے کو تلاش کیا جائے۔ ایسے میں دلاسا ہی دیا جا سکتا ہے۔

ٹھاکرانی کی بہن کو راجو کا خیال آیا۔ ''دائی کو بلاؤ۔ اس سے پوچھو''۔

شانتا راجو کو بلانے کے لئے دوڑ گئی۔ راستے میں اسے جو بھی ملا، اس نے اسے بچے کی گمشدگی کا بتا دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پورے گاؤں کو پتا چل گیا۔ گاؤں والے ٹھاکر سے محبت کرتے تھے وہ پریشان ہو گئے اور ادھر ادھر بچے کو ڈھونڈنے لگے۔

ادھر ٹھاکرانی کو ایک اور خیال سوجھا۔ ڈوبنے والا تنکے کا سہارا تلاش کر رہا تھا ''ہو سکتا ہے، وہ بچے کو کہیں لے گئے ہوں'' وہ بولی۔ اس کا اشارہ ٹھاکر کی طرف تھا۔

اس پر سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ٹھاکر کو باہر جاتے ان میں سے کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ ممکن ہے ایسا ہی ہوا ہو۔

لیکن راجو نے آ کر وہ تنکا بھی توڑ دیا ''میں گئی ہوں مالکن تو چھوٹے ٹھاکر پنگھوڑے میں تھے''۔

ٹھاکرانی جانتی تھی کہ ٹھاکر راجو کے جانے سے پہلے ہی کمرے سے چلے گئے تھے۔ تو پھر؟ راجو گئی اور ایک منٹ بعد شانتا کمرے میں آ گئی۔ اس ایک منٹ میں بچہ کیسے غائب ہو گیا! اس نے یہی بات بلند آواز میں کہہ بھی دی۔

اس پر سب لوگ دائی راجو کو مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ ''تو جھوٹ بول رہی ہے''۔ بلبیر سنگھ نے راجو سے کہا۔

راجو بوکھلا گئی۔ ''مالکن سے پوچھ لیں۔ میں گئی ہوں تو میرے ہاتھ خالی تھے''۔

''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے''۔ ٹھاکرانی نے گواہی دی۔

اب سب شانتا کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ''تو پھر تو بتا''۔ ٹھاکر ارجن سنگھ نے اسے ڈپٹا۔

''مم..... میں..... میں کیا بتاؤں مالک''۔

''تو اور کون بتائے گا۔ راجو کے جانے کے بعد کمرے میں تیرے سوا کون تھا''۔ ٹھاکر کی بہن کویتا بولی۔

''بتا، کس نے دشمنی کی ہے ہم سے۔ کون تھا، جسے تو نے بچہ دے کر بھگا دیا بتا، ورنہ میں تیری کھال کھینچ لوں گا''۔ بلبیر سنگھ بولے۔

''رام جی کی سوگند۔ یہاں کوئی نہیں آیا ٹھاکر جی''۔ شانتا گڑگڑائی۔ ''اور میں نے دیکھا تو جھولا خالی تھا''۔

''بتا حرام.....''

شانتا نے ہاتھ جوڑ لئے۔ ''مالکن، مجھ پر شبہ کرنے کے بجائے آپ مجھے جان سے مار دیں''۔ وہ رونے لگی۔ ''میں ایسا کیسے کر سکتی ہوں۔ ہم تو نسلوں سے ٹھاکروں کا نمک کھا رہے ہیں.....''۔

''نمک حرامی میں دیر کتنی لگتی ہے''۔ ارجن سنگھ نے کہا۔

ٹھاکرانی کو شانتا پر ترس آنے لگا۔ وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ ''اسے کچھ نہ کہیں۔ میرا دل نہیں مانتا کہ یہ میرے بچے کو نقصان پہنچا سکتی ہے''۔

''خیر..... بعد میں دیکھیں گے ان دونوں کو کہیں جانے نہ دینا'' بلبیر سنگھ بولے اشارہ شانتا اور راجو کی طرف تھا۔ ''ہم ذرا باہر دیکھتے ہیں''۔

مرد باہر چلے گئے۔ کمرے میں عورتیں رہ گئیں۔ شانتا روئے جا رہی تھی۔ راجو سر جھکائے کھڑی تھی۔

اچانک باہر شور مچا۔ ''ٹھاکر جی آ گئے۔ ٹھاکر جی آ گئے.....''۔

ٹھاکرانی کے دل میں امید جاگ اٹھی.....

.....X.....

ٹھاکر پرتاپ سنگھ حویلی کی طرف بڑھتا رہا۔ اس نے کسی سے ہنگامے کا سبب نہیں پوچھا کیوں کہ اسے معلوم تھا اور کسی کو اسے بتانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ سب اپنی اپنی جگہ ٹھہر گئے اور اسے جاتا دیکھتے رہے۔

حویلی میں داخل ہوتے ہی اس کا سامنا ارجن سنگھ اور بلبیر سنگھ سے ہوا۔ ''کاکا..... تمہارا بالک غائب ہو گیا ہے'' بلبیر سنگھ نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

''پریشان نہ ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ وہ کہاں ہے''۔ پرتاپ سنگھ نے کہا ''آپ سب کو سمجھا دیں ویر جی کہ اس کی چنتا نہ کریں''۔ یہ کہہ کر ٹھاکر آگے بڑھ گیا۔

بلبیر سنگھ اور ارجن سنگھ نے سب کو سمجھایا۔ ستے ہوئے چہروں کی رونق واپس آنے لگی۔

ادھر ٹھاکر پرتاپ سنگھ ٹھاکرانی کے کمرے میں داخل ہوئے۔ انہیں دیکھ کر ٹھاکرانی رونے لگی۔ شانتا اور دائی راجو کے چہروں پر زردی کھنڈ گئی۔ ٹھاکر نے پتنی سے کہا ''رنجیتا..... رونے کی ضرورت نہیں۔ چھوٹا ٹھاکر خیریت سے ہے۔ اس کی چنتا مت کرو''۔

''کہاں ہے میرا پتر؟''

''بتاتا ہوں۔ دھیرج رکھو''۔ ٹھاکر نے کہا۔ پھر عورتوں کی طرف مڑے۔ ''تم لوگ جا کر جشن کی فکر کرو''۔

سب سمجھ گئے کہ ٹھاکر جی کو ٹھاکرانی سے بات کرنی ہے۔ شانتا اور راجو کی بھی جان میں جان آ گئی۔

تخلیہ ہونے کے بعد ٹھاکر نے ٹھاکرانی سے کہا۔ ''ہمارا پتر اس کمرے میں ہے، جہاں ہر وقت تالا لگا رہتا ہے..... وہی کونے والا کمرا.....''

''ہائے رام''۔ ٹھاکرانی بوکھلا کر اٹھنے لگی۔ ''یہ کیا غضب کیا آپ نے؟''۔

''بیٹھی رہو''۔ ٹھاکر نے کہا۔ ''اور اسے میں وہاں نہیں لے کر گیا۔ کسی نے اسے وہاں پہنچا دیا ہے۔ مگر تم ڈرو مت۔ اسے کچھ نہیں ہو گا''۔

''کیا بات کرتے ہیں آپ۔ وہاں تو آسیب.....''۔

ٹھاکر نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''ایسا مت کہو۔ کبھی نہ کہنا۔ کسی کو کہنے بھی نہ دینا''۔ اسے مجذوب کا ردعمل یاد آ گیا تھا۔ ''اب وہی ہمارے پتر کا کمرا ہے''۔

''آپ کیسی بات کرتے ہیں۔ اسے لائیں وہاں سے''۔ ٹھاکرانی بپھر گئی۔

''رنجیتا..... میری بات سنو سکون سے''۔ ٹھاکر کا لہجہ سخت ہو گیا۔ ''تمہیں وہ خواب یاد ہے؟''۔

.....X.....

وہ خواب ٹھاکر نے ٹھیک ایک سال پہلے دیکھا تھا۔ یہی مہینہ تھا..... یہی تاریخ تھی.....

اس صبح ٹھاکر نے ٹھاکرانی کو وہ خواب سنانے کا ارادہ کیا۔ لیکن اس سے پہلے ہی ٹھاکرانی بول اٹھی۔ ''ناتھ..... رات میں نے ایک سپنا دیکھا''۔

''میں نے بھی دیکھا۔ میرا من کہتا ہے کہ وہ بہت شبھ سپنا ہے۔ پہلے تم میرا سپنا سن لو''۔ ٹھاکر نے کہا۔

''سپنا میرا بھی شبھ ہے۔ چلیں..... پہلے آپ سنا دیں''۔

''میں نے دیکھا کہ کونے والے بند کمرے کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور میں وہاں کھڑا ہوں.....''۔

''وہ آسیب والا کمرا؟'' ٹھاکرانی نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں وہی۔ اب ٹوکو مت۔ سنتی رہو''۔ ٹھاکر نے ناگواری سے کہا۔ ''اچانک کمرے میں ایک بزرگ آتے ہیں۔ ان کا سر بھی سفید ہے اور داڑھی بھی.....''۔

''اور ماتھے پر مسلمانوں والا نماز کا ٹیکہ ہے''۔ ٹھاکرانی بولی۔

''ہاں''۔ ٹھاکر نے روانی میں کہا۔ پھر چونک کر اسے دیکھا اور اچنبھے سے بولا ''تمہیں کیسے معلوم؟''۔

ٹھاکرانی کی نگاہوں میں بھی حیرت تھی۔ ''ایسے کہ میں نے بھی یہی دیکھا تھا''۔

ٹھاکر حیرت سے اسے دیکھتا رہا ''اچھا! یہ بتاؤ، انہوں نے تم سے کیا کہا؟''

''وہ بولے..... تم اس برگد کے درخت سے بیٹا مانگ رہی تھیں نا؟ میں نے کہا..... ہمیں تو بیس سال ہو گئے مانگتے مانگتے۔ جو جہاں کا بتاتا ہے، ہم وہاں چلے جاتے ہیں نگر نگر کی خاک چھان لی۔ پر منو کامنا پوری نہیں ہوئی.....''

ٹھاکر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں نے بھی خواب میں یہی کہا تھا رنجو۔ اس پر وہ بولے۔ ''درخت کے مالک نے تمہاری سن لی ہے۔ تمہیں بیٹا ملے گا..... نصیبوں والا بیٹا.....''

''مجھ سے بھی یہی کہا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ اس کی پرورش کرنا، اس سے محبت کرنا تمہارا کام ہے.....''۔

www.allurdu.com

''اوراس کی تعلیم وتربیت میں دخل نہ دینا۔اس کی مرضی کے خلاف نہ کرنا۔بس یہ یادرکھنا کسی بھی معاملے میں اس کے ساتھ زبردستی نہ کرنا.....کسی بھی معاملے میں''۔ٹھاکر نے کہا۔

''جی ہاں۔بالکل یہی.....اور پھر میری آنکھ کھل گئی''۔

انہوں نے ٹکڑے لگا لگا کر خواب بیان کیا.....ایک دوسرے کی بات بڑھاتے ہوئے۔پھر دونوں دیر تک بیٹھے سوچتے رہے.....خاموشی سے۔دونوں ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔شاید ان کی آرزو پوری ہونے والی ہے۔لیکن انہیں یقین کیسے آتا۔بائیس سال کی محرومی ختم ہونے پر خود بھگوان آکر بدھائی دے تو بھی محروم کو تو اس وقت اعتبار آئے گا جب جھولی سچ مچ بھر جائے گی۔پھر بھی ان کے دل امید سے بھر گئے تھے وہ تاریخ جب انہوں نے یہ خواب دیکھا تھا،ان کے دل پر نقش ہوگئی تھی۔انہیں احساس تھا کہ ایک ہی وقت میں بالکل ایک سا خواب ان دونوں نے دیکھا تھا۔اور یہ غیر معمولی بات تھی۔

اب یہ روز کا معمول ہوگیا کہ ٹھاکر سو کر اٹھتا تو اس خیال کے ساتھ کہ شاید آج پتنی اسے کوئی اچھی خبر سنائے گی۔وہ اپنے کاموں میں مصروف رہتا۔

مگر ٹھاکرانی کے سامنے آتا تو نظریں کیا،ایک زبان کو چھوڑ کر اس کے جسم کا ہر عضو سوال بن جاتا اور ٹھاکرانی خوب جانتی تھی کہ زبان خاموشی سے وہ کیا پوچھ رہا ہے۔وہ ایک آہ بھر کے نظریں جھکا لیتی یا وہاں سے ہٹ جاتی۔اس صبح کے بعد ان کے درمیان اس سلسلے میں کبھی گفتگو نہیں ہوئی تھی.....نہ بالواسطہ نہ بلاواسطہ۔دونوں ڈرتے تھے کہ امید نہ ٹوٹ جائے۔دل میں مایوسی جگہ نہ بنالے۔حالاں کہ ہو یہی رہا تھا۔ہر گزرتا دن امید کو کم زور کر رہا تھا۔اور مایوسی چپکے چپکے دل میں سرایت کر رہی تھی۔

ایک مہینہ ہوگیا اور کچھ بھی نہیں ہوا۔پھر ایک رات ٹھاکر تو بجھا بجھا تھا.....خاموش،دل گرفتہ اور ملول۔ٹھاکرانی نے کریدا تو وہ اسے ٹالنے لگا۔''نہیں رنجو۔کوئی خاص بات نہیں۔بس تھکن سی ہوگئی ہے''۔

''تھکن تو روز ہوتی ہے جی۔پر ایسا تو نہیں ہوتا''۔

''اب بڑھاپے کا احساس بھی ستاتا ہے''۔

ٹھاکرانی سمجھ گئی کہ کوئی تازہ بات ہے بڑھاپے کا تذکرہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔''ایسے نہ کہو ناتھ۔بڑھاپا ابھی بہت دور ہے''۔وہ سمجھ گئی کہ آج پھر محرومی نے ڈنک چبھویا ہے۔

ٹھاکر وہ بات اسے بتانا نہیں چاہتا تھا۔لیکن اس سے یہ بوجھ اٹھایا بھی نہیں جا رہا تھا۔''رنجو.....آج میں اس درخت کی طرف گیا تھا''۔

''کون سا درخت؟''

''وہی برگد کا درخت،جہاں ہم نے نذر چڑھائی تھی.....پرارتھنا کی تھی بچے کے لئے''۔

''اچھا''۔ٹھاکرانی نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

''پتا ہے۔وہ پیڑ سوکھ چکا ہے''۔ٹھاکر نے دل گرفتگی سے کہا۔''بالکل سوکھ چکا ہے۔بہار کے موسم میں جل گیا۔ایک پتا بھی نہیں بچا''۔

ٹھاکرانی کے دل پر گھونسہ سا لگا۔''چلو.....جو بھگوان کی اچھا''۔بہ ظاہر تو اس نے یہ بات پیڑ کے سوکھنے پر کہی تھی۔مگر اصل میں وہ اولاد کے امکان کو رو بیٹھی تھی۔

''اب کچھ نہیں ہوسکتا''۔ٹھاکر بولا۔''جس سے ہم نے مانگا وہ خود ہی مٹ گیا''۔

اس دن کے بعد وہ چپ چپ رہنے لگے۔ٹھاکر تو بالکل ہی مایوس ہوگیا۔امید کی شاخ اس باریوں سوکھی تھی کہ اس کے ہرے ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں رہا تھا۔

خواب دیکھے تین مہینے ہوئے تھے کہ ٹھاکرانی نے اسے خوش خبری سنادی۔

اب وہ خوش تھے۔لیکن ٹھاکر کو اندیشے بھی ستاتے تھے۔کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہوجائے۔مگر چھ مہینے خیریت سے گزر گئے تو اسے اعتبار آئے لگا کہ خواب سچا تھا اور آج وہی تاریخ تھی جس تاریخ کو ایک سال پہلے اس نے خواب دیکھا تھا۔اور اسے تعبیر مل گئی تھی.....

.....X.....

''یاد ہے مجھے۔اس خواب کو بھلا بھول سکتی ہوں!''ٹھاکرانی نے کہا۔

''شاید ابھی میں اس خواب والے سے مل کر آرہا ہوں''۔

''شاید کا مطلب؟''

''اس کی صورت الگ تھی۔پر کبھی مجھے لگتا تھا،وہ وہی ہے جسے خواب میں دیکھا تھا''۔

''اسے چھوڑو۔میرے پتر کو اس کمرے سے نکالو نا''۔

''وہی تو میں بات رہا ہوں''۔ٹھاکر نے کہا۔''مجذوب نے سختی سے کہا تھا کہ کسی کو کچھ نہ بتانا۔ہاں ضروری ہو تو اپنی بیوی کو بتا دینا۔تو ضروری تو تھا۔وہ ٹھاکرانی کو نہ بتاتا تو وہ بچے کو اس کمرے میں کبھی نہ رہنے دیتی۔جب کہ یہ مجذوب کا حکم تھا کہ بچہ اسی کمرے میں رہے گا۔

سو ٹھاکر نے ٹھاکرانی کو سب کچھ کہہ سنایا۔''اور یہ بات کسی کو بھی نہیں بتانی ہے''۔اس نے آخر میں کہا۔

''لیکن وہ کمرا تو.....''۔

''رنجو۔یہ مت بھولو کہ بچے کی خبر بھی ہمیں اسی کمرے میں ملی تھی۔مجھے وشواس ہے کہ کسی کو کوئی نقصان نہیں ہوگا''۔ٹھاکر نے اٹھتے ہوئے کہا۔''میں جا کر کمرا کھولتا ہوں۔اسے ٹھیک کراتا ہوں۔پھر تمہیں وہاں لے جاؤں گا''۔

''ٹھیک ہے ناتھ''

ٹھاکر اٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔

وہ اسی مقفل کمرے کی طرف جا رہا تھا کہ بلبیر سنگھ اور ارجن سنگھ آگئے۔''تمہارا پتر کہاں ہے کاکا؟''بلبیر سنگھ نے پوچھا۔

''وہ کونے والے کمرے میں ہے''

وہ دونوں ٹھاکر کے ساتھ چلتے رہے۔انہیں اس کمرے کے متعلق کچھ معلوم نہیں تھا۔یہ بات تو ٹھاکر نے اپنے کسی ملازم کو بھی پتا نہیں چلنے دی تھی۔بس وہ اور ٹھاکرانی جانتے تھے اس بارے میں۔وہ بند دروازے کے پاس رکا اور اس نے چابی نکالی۔

''پرکاکا،تم اسے یاں لائے کیوں؟''بلبیر سنگھ نے پوچھا۔

''وہ.....ویر جی.....بات یہ ہے کہ.....یہ کمرا الگ تھلگ ہے۔اور زیادہ آرام دہ بھی ہے۔''ٹھاکر پرتاپ نے تیزی سے بات بنائی۔

اسی وقت ارجن سنگھ کی نظر دروازے کے تالے پر پڑی۔''اور تم نے تالا بھی ڈال دیا۔ارے بچہ بند کمرے میں اکیلا ہے۔تم پاگل تو نہیں ہوگئے ہو؟''اس نے کہا۔

''وہ.....مجھے تو.....''ٹھاکر گڑبڑا گیا۔اس کے منہ سے سچ نکلنے ہی والا تھا کہ اس نے خود کو روک لیا۔''عادت ہے نا۔مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ تالا لگا رہا ہوں۔''اس نے چابی تالے میں لگائی۔پھر اسے خیال آیا کہ برسوں سے یہ کمرا نہیں کھلا ہے۔اندر کا تو حال بہت برا ہوگا۔ دھول مٹی،مکڑی کے جالے۔وہ اس کے سلسلے میں بھائیوں کو کیا جواب دے گا۔پھر اس کا دل یہ سوچ کر کانپ گیا کہ وہاں اس کا ننھا سا بچہ بھی ہے۔

لیکن اس نے دروازہ کھولا تو ہکا بکا رہ گیا۔کمرا صاف ستھرا بھی تھا اور جگمگا بھی رہا تھا۔سچ تو یہ ہے کہ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ وہی کمرا ہے۔وہ اتنا روشن اور ہوادار تو نہیں تھا۔مگر اس وقت اس کمرے میں قدم رکھتے ہوئے تازگی کا احساس ہو رہا تھا۔اس کی حیرت کی کوئی حد نہیں تھی۔کھڑکیوں اور دروازوں پر خوب صورت پردے پڑے تھے۔پچھواڑے کے رخ پر کھلنے والی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔

کمرے کا حلیہ اتنا بدلا ہوا تھا کہ اگر اس میں بچہ موجود نہ ہوتا تو ٹھاکر یہی سمجھتا کہ وہ کسی اور کمرے میں آگیا ہے۔وہ بے حد وسیع وعریض کمرا تھا۔لیکن اس وقت اتنا بڑا نہیں لگ رہا تھا۔وجہ شاید یہ تھی کہ پہلے اس میں ایک بڑی مسہری کے سوا کچھ نہیں تھا۔جبکہ اب وہاں بچے کا پنگھوڑا بھی تھا،کرسیاں بھی تھیں.....اور ایک بڑا تخت بھی موجود تھا۔

ٹھاکر چند لمحے تو سکتے کی سی حالت میں دروازے کی چوکھٹ پر کھڑا یہ سب دیکھتا رہا۔پھر وہ تیزی سے اندر داخل ہوا اور پنگھوڑے کے پاس جا کر بچے کو دیکھا۔وہ سو رہا تھا۔اور پنگھوڑے کے پاس ایک تپائی تھی،جس پر چاندی کی کٹوری رکھی تھی۔اس کٹوری میں شہد تھا۔

.....X.....

ایک گھنٹے کے اندر کمرا رونقوں سے بھر گیا۔ٹھاکرانی کو بھی وہاں منتقل کر دیا گیا۔ادھر حویلی میں ہنگامہ شروع ہوگیا۔اس روز دعوت عام تھی حویلی،میں گاؤں کے کسی گھر میں چولہا نہیں جلا تھا۔ٹھاکر نے سختی سے منع کیا تھا۔پورا گاؤں حویلی میں جمع تھا۔

پھر راگ رنگ کی محفل جم گئی۔بنارس سے ناچنے گانے والیاں آئی ہوئی تھیں۔ سب مہمان وہاں بیٹھے تھے۔ٹھاکر میر محفل تھا۔فن کاروں کو داد بھی مل رہی تھی اور پیسہ بھی۔چنانچہ وہ جم کر اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

وہیں جمال دین بھی تھا۔ وہ دوسرے درجے کے تماشائیوں میں تھا۔وہاں تماشائیوں کے تین درجے تھے۔ٹھاکر کے مہمان درجہ اول میں اس کے ساتھ تھے۔دوسرا درجہ مزارعین کا تھا۔یہ وہ لوگ تھے جو ٹھاکر کی زمینوں پر کام کرتے تھے۔ان کیلئے ایک جانب میں بڑی سی دری بچھا دی گئی تھی۔تیسرا درجہ حویلی میں کام کرنے والوں یا اوپر کے کام کرنے والوں کا تھا۔وہ آزاد تھے۔چاہیں تو کھڑے ہو کر ناچ گانا دیکھیں۔اور تھک جائیں تو بے شک زمین پر بیٹھ جائیں۔

جمال دین اس گاؤں میں واحد مسلمان تھا۔شاید اسی لئے وہ ٹھاکر کا منہ چڑھا بھی تھا۔اس کی عمر تیس کے قریب تھی۔جیسے وہ ٹھاکر کا منہ چڑھا تھا،ویسے ہی اس کی بیوی ٹھاکرانی کے بہت قریب تھی۔ان کا ایک ہی بیٹا تھا،جو شادی کے چھ سال بعد پیدا ہوا تھا۔اب وہ دس ماہ کا ہونے والا تھا۔

ٹھاکر نے برسوں پہلے جمال دین کے باپ مہر دین پر ایک احسان کیا تھا۔مہر دین پڑوس کے گاؤں میں رہتا تھا۔اوروں کی طرح وہ بھی مہاجن کا مقروض تھا۔

لیکن مہاجن خاص طور پر اسے بہت پریشان کرتا تھا۔وجہ یہ تھی کہ وہ اس کی بیٹی پر نظر رکھے ہوئے تھا۔

ایک دن مہاجن سود کی رقم وصول کرنے آیا۔مہر دین کے پاس اس وقت کچھ بھی نہیں تھا۔مہاجن موقع پا کر دل کی بات زبان پر لے آیا۔''سن مہر دین۔تو اپنی پتری کو کام کرنے کیلئے میرے ہاں بھیج دیا کر۔تو میں سود معاف کر دوں گا۔اصل رقم تو تھوڑی تھوڑی کر کے.....''

مہر دین بیٹی کا نام سن کر آپے سے باہر ہوگیا۔اس نے مہاجن کی مرمت کر دی۔

www.allurdu.com

.....X.....

''اب تو اصل رقم اور سود تیار رکھ مہر دین'' مہاجن نے جاتے جاتے کہا۔''اب کے میں تیاری سے آؤں گا۔ پوری رقم نہ ملی تو تجھے گھر سے نکلوا دوں گا۔''

مہر دین اپنے زمین دار کے پاس گیا، جس کی زمین پر وہ کام کرتا تھا.....اور اس سے مدد چاہی۔

زمین دار نے بے مہری سے کہا''مہر دین، میں اس طرح کے معاملے میں نہیں پڑتا۔''

''راجا صاحب، آپ مجھے قرض دے دو۔ میں آپ کی پائی پائی اتار دوں گا۔'' مہر دین نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''نہیں بھئی مہر دین۔ یہ میرے لئے ممکن نہیں۔''

''مائی باپ، آپ میری مدد نہیں کریں گے تو کون کرے گا''۔ مہر دین گھگھیانے لگا۔''آخر آپ کی زمینوں پر ہی کام کرتا ہوں۔''

''مفت تو نہیں کرتا۔ پورا محنتانہ دیتا ہوں میں۔'' راجہ صاحب نے بگڑ کر کہا۔

''مگر میں تو قرض مانگ رہا ہوں۔''

''قرض دینا میرا نہیں'' مہاجن کا کام ہے'' راجا صاحب نے بے رحمی سے کہا۔''مہاجن سے بگاڑی کیوں تھی۔''

''عزت کی بات تھی راجا جی.....''

''تو اب بیوی بچوں کو گھر سے باہر آسمان کے نیچے رکھے گا تو وہی عزت دوسری طرح جائے گی۔ جانے والی چیز تو نہیں بچ سکتی عقل کے دشمن''

مہر دین لوٹ آیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ راجا صاحب اور مہاجن کی ملی بھگت ہے۔ اور مہاجن اپنی نہیں، پردہ رکھتے ہوئے راجا صاحب کے دل کی بات کر رہا تھا۔ وہ ڈر گیا۔ اس نے ادھر ادھر ہاتھ پھیلائے۔ لیکن کہیں سے دھیلا بھی نہیں ملا۔

اور پھر ایک دن مہاجن ڈگری لیکر آ گیا۔ اس نے گھر کا سامان باہر پھنکوا دیا۔ عدالت کے اہلکار اس کے ساتھ تھے۔ خوش قسمتی سے عین وقت پر ٹھاکر پرتاپ سنگھ ادھر آ نکلا۔ وہ کسی کام سے آیا تھا۔ یہ ہنگامہ دیکھ کر رک گیا۔ پوچھ گچھ کی تو پتا چلا کہ ظلم ہو رہا ہے۔ اس نے ہاتھ کے ہاتھ قرض مع سود کے چکا دیا۔ مہاجن اور اہلکار چلے گئے تو اس نے مہر دین سے کہا۔''اب تو یہاں آرام سے رہ.....''

''پرتھا کر جی، اب میں یہاں رہنا نہیں چاہتا۔''

''کیوں؟''

مہر دین نے تفصیل سے اسے وجہ بتا دی۔

ٹھاکر چند لمحے سوچتا رہا۔ نجانے کیوں، مہر دین اسے پہلی نظر میں ہی اچھا لگا تھا..... بھلا مانس اور وفادار۔ پھر وہ بولا۔''تو چاہتا کیا ہے؟''

''آپ اپنی کوئی زمین مجھے کام کیلئے دے دیں۔ ایک احسان کیا ہے تو دوسرا بھی کر دیں۔ یہاں تو میں لٹ جاؤں گا۔''

یوں یہ گھرانا ٹھاکروں کی گڑھی میں آ کر آباد ہو گیا۔ یہیں مہر دین نے بیٹی کی اور پھر بیٹے کی شادی کی۔ دو سال پہلے وہ گزر گیا۔ اس کی موت کے بعد ٹھاکر نے جمال دین کو بلوا لیا۔''اب تو نے کیا سوچا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میں سمجھا نہیں ٹھاکر جی''

''دیکھ.....میں جانتا ہوں، تو نماز پڑھتا ہے۔ اپنے دھرم کا پکا ہے۔ اور یہاں تیرے سوا کوئی تیرے دھرم کا نہیں۔ مسجد بھی نہیں ہے.....''

جمال دین کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ سمجھا کہ نماز پڑھنا اس کا جرم بن گیا ہے۔''آپ مجھے نکال رہے ہیں ٹھاکر جی'' اس نے فریاد کرنے والے انداز میں کہا۔

''یہ بات نہیں۔ میں تیرے بھلے کیلئے کہہ رہا ہوں۔''

''میرا بھلا تو یہاں رہنے میں ہے'' جمال دین بولا۔''ابا نے کہا تھا، یہ در کبھی نہ چھوڑنا۔''

''میں تجھے کچھ رقم دوں گا۔ کسی ایسے گاؤں چلا جا، جہاں تیرے دھرم والے رہتے ہوں۔''

''آپ دھکے دے کر نکالیں تو مجبوری ہے ٹھاکر جی۔ ورنہ میں تو آپ کی رعیت بن کر رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے یہاں کوئی تکلیف، کوئی پریشانی نہیں۔ اللہ کا قبلہ ہر جگہ موجود ہے۔ مسجد نہ سہی۔ میں کہیں بھی کھڑا ہو کر، اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لیتا ہوں۔'' اس نے گہری سانس لی۔''ابا کہتے تھے، احسان کرنے والے کو کبھی نہیں چھوڑتے۔''

اس بات کا ٹھاکر کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ جمال دین جس زمین پر کام کرتا تھا، وہ اس نے اس کے نام کر دی۔ اور وضع دار آدمی تھا۔ اس کے بعد اس نے کبھی جمال دین کے ساتھ ملازموں اور مزارعوں والا سلوک نہیں کیا۔ وہ اسے ایک زمین دار کا مقام دیتا تھا۔ لیکن جمال دین کو بھی وفاداری اپنے باپ سے ملی تھی۔ اس نے خود کو کبھی دوسرے درجے سے نہیں نکالا۔ بہر حال یہ بات گاؤں کے سب لوگوں نے جان لی۔ اب کسی کو ٹھاکر سے کچھ کہنا ہوتا اور ہمت نہ ہوتی، تو جمال دین کی سیڑھی لگاتا۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ جمال دین کی بات کم ہی ٹالتا تھا۔

اس وقت بھی یہی کچھ ہوا، شانتا باہر آئی اور اس طرف گئی، جہاں ملازمین کھڑے تھے۔ اس نے ان میں سے ایک سے کہا،''ٹھاکر جی کو بولو، مالکن انہیں بلاتی ہیں''

''پاگل ہوئی ہے یہ ملازم نے اسے گھور کر دیکھا۔

''کہنا، کوئی بہت ضروری بات ہے''

اس بار ملازم نے اسے غور سے دیکھا۔ شانتا کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ لیکن ایسے میں ٹھاکر کے پاس جانا اور یہ پیغام پہنچانا رنگ میں بھنگ ڈالنے کے برابر تھا یہ خطرناک کام وہ کیسے کرتا۔''نا بابا نا'' اس نے ہاتھ جوڑ لئے۔''اتنے مہمانوں کے بیچ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔''

''مالکن کا حکم ٹالتا ہے۔'' شانتا نے جھنجھلا کر کہا۔''ٹھاکر جی کو پتا چلا تو.....''

اب دوسرے بھی ان کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ لیکن ٹھاکر کیلئے اس محفل سے اٹھنے کا پیغام لے کر جانے کی کسی میں ہمت نہیں تھی۔ اور وہ اس سے بھی ڈر رہے تھے کہ پیغام نہ پہنچانے کی صورت میں ٹھاکرانی، ٹھاکر جی سے شکایت کرے گی اور پھر ٹھاکر جی کا عتاب ..... یعنی آگے کنواں پیچھے کھائی والا معاملہ تھا۔

ایسے میں گنگو کو جمال دین کا خیال آ گیا۔''او، جمال دین سے بات کرو نا''

جمال دین کو صورت حال بتائی گئی۔ وہ پہلے تو ہچکچایا، لیکن پھر راضی ہو گیا۔

جمال دین ٹھاکر کی طرف گیا تو ٹھاکر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔''تجھ سے کہا تھا جمال دین کہ تو ادھر کرسی پر بیٹھ۔ کہاں گھومتا پھر رہا ہے۔''

''میں ٹھیک ہوں سرکار۔ بہت خوش ہوں۔'' جمال دین نے کہا۔ پھر سرگوشی میں بولا۔''ٹھاکرانی جی آپ کو بلا رہی ہیں۔''

ٹھاکر کچھ بدمزہ ہو گیا۔''اس وقت مہمانوں کو چھوڑ کر نہیں اٹھ سکتا میں۔ تھوڑی دیر میں آ جاؤں گا۔''

یہ وہ مرحلہ تھا، جس سے کوئی نوکر، کوئی مزارعہ نہیں گزر سکتا تھا۔ جمال دین صرف ایک لمحے کو ہچکچایا۔ پھر اس نے کہا''ٹھاکر جی۔ ضرور کوئی بڑی بات ہے۔ ورنہ وہ آپ کو نہیں بلاتیں۔ انہوں نے آپ کو فوراً بلایا ہے۔''

ایک لمحے کو ٹھاکر کے چہرے پر سختی ابھری۔ مگر فوراً ہی معدوم ہو گئی۔ اس نے نرم لہجے میں کہا۔''اچھا.....تو چل۔ میں آتا ہوں۔''

جمال دین فوراً ہی درجہ اول سے باہر آ گیا۔

.....X.....

ٹھاکرانی رنجیتا کو ایک پل کیلئے بھی یقین نہیں آیا کہ یہ وہی کمرا ہے، عجیب بات تھی کہ اپنے کمرے کے مقابلے میں یہاں اسے زیادہ سکون محسوس ہو رہا تھا۔

www.allurdu.com

اورایک احساس اس سے زیادہ گہرائی میں.....اوراس سے زیادہ طاقت ورتھا۔وہ تحفظ کا احساس تھا۔جیسے یہاں کوئی اسے اوراس کے بچے کونقصان نہیں پہنچا سکتا۔

بچے کے رونے کی آواز نے اسے چونکا دیا۔وہ اچانک ہی بلک بلک کر رونے لگا تھا۔دائی راجو نے کہا''مالکن،چھوٹے ٹھاکر کودودھ پلانے کی کوشش کریں''

یہ ایک عجیب بات تھی،ٹھاکرانی کی چھاتیوں میں مامتا کے سوتے پھوٹ چکے تھے۔اب تک وہ کئی بار بچے کودودھ پلانے کی کوشش کر چکی تھی۔لیکن بچے نے منہ بھی نہیں لگایا تھاوہ پوری طاقت سے منہ موڑ لیتا تھا۔

عورت کہیں کی بھی ہو۔کسی بھی مذہب،رنگ یانسل سے تعلق رکھتی ہو،ماں کی حیثیت میں ایک جیسی ہوتی،اپنے بچے کودودھ پلانا اس کیلئے زندگی کا سب سے بڑا اعزاز ہوتا ہے۔ٹھاکرانی کیلئے تو اس کی اہمیت اور زیادہ تھی۔بائیس سال کی محرومی کے بعد اسے یہ موقع ملا تھا۔مگر بچہ تھا کہ اسے یہ اعزاز دینے کیلئے تیار نہیں تھا،ٹھاکرانی کو اس پر رنج تھا۔ادھر دودھ اب رک نہیں رہا تھا۔بہنے لگا تھا۔یہ اس کیلئے جسمانی اذیت کا سبب بھی تھا۔اسے تکلیف ہورہی تھی۔

جن ماؤں کے بچے مردہ پیدا ہوں یا شیر خواری میں مرجائیں،انہیں لازمی یہ اذیت اٹھانی پڑتی ہے۔دودھ کے جاری سوتے آسانی سے نہیں رکتے۔پینے والا منہ موڑ جائے تو ماں کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ٹھاکرانی اس تکلیف سے بھی دوچار تھی۔ننھا دیوتا ماں کی پہلی بھینٹ سویکار کرلے،اسی میں اس کی مکتی تھی۔

''ٹھیک ہے راجو۔ادھر لے آ چھوٹے ٹھاکر کو''۔اس نے پکارا۔

راجو نے بڑی نزاکت سے بچے کو لا کر ٹھاکرانی کو دیا۔ٹھاکرانی نے بڑی چاہت سے بچے کودودھ پلانے کی کوشش کی۔لیکن بچہ اب بھی انکاری تھا۔ٹھاکرانی نے لاکھ کوشش کرلی۔لیکن بچے نے ہر بار منہ موڑ لیا۔گردن بھی اکڑالی۔

''کیا بات ہے؟یہ میرا دودھ کیوں نہیں پیتا؟''ٹھاکرانی نے افسردگی سے کہا۔

راجو بڑی تجربہ کار عورت تھی۔''آپ دل چھوٹا نہ کریں مالکن''۔وہ بولی۔''کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دودھ کسی وجہ سے کڑوا ہو جاتا ہے۔بچہ اسے قبول نہیں کرتا۔پھر کڑواہٹ دور ہو جاتی ہے تو پینے لگتا ہے''۔

''تو کڑواہٹ کیسے دور ہوگی؟''

''کچھ جڑی بوٹیاں ہوتی ہیں۔بس ان کی پھنکی بنا کر آپ کو دوں گی۔سب ٹھیک ہو جائے گا''۔

بچہ ماں کے دودھ کو مسترد کرنے کے بعد چیخ چیخ کر روئے جارہا تھا''مگر یہ بہت بھوکا ہے''۔ٹھاکرانی نے تڑپ کر کہا۔

''تب تک کے لئے بکری کا دودھ دے دیں انہیں''۔راجو نے تجویز پیش کی۔''میں دوا کوٹتی ہوں۔پھر بھگوان نے چاہا تو یہ آپ کا دودھ پینے لگیں گے''۔

''ابھی تو تم انہیں انگلی سے شہد چٹادو۔یہ ٹھاکر جی کا حکم ہے''۔

''مالکن،برا نہ ماننا۔میں سچ کہہ رہی ہوں''۔راجو نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔''اتنی عمر ہوگئی مجھے یہی کرتے۔پر ایسا کبھی نہیں دیکھا۔اپنے لوگوں میں بچے کو شہد نہیں چٹایا جاتا۔یہ تو مسلوں میں ہوتا ہے''۔

بات سچی تھی۔مگر ٹھاکرانی کو بہت برا لگا۔''تجھ سے جو کہا جائے،وہ کر راجو۔زیادہ بات کرنے والا بولنے کا ہی نہیں رہتا''۔

راجو ڈر گئی۔اسنے خاموشی سے بچے کو اٹھایا اور لے جا کر پنگھوڑے میں لٹا دیا۔پھر وہ انگلی سے بچے کو شہد چٹانے لگی۔روتا ہوا بچہ ایک دم چپ ہوگیا۔چند منٹ بعد وہ قلقاریاں مارنے لگا۔اور پھر سو گیا۔

تھوڑی دیر بعد بچہ پھر چنگھاڑنے لگا۔ٹھاکرانی نے شانتا سے کہا۔''دیکھو تو۔شاید چھوٹے ٹھاکر گیلے ہوگئے ہیں۔کپڑے بدلا دے''۔

شانتا پنگھوڑے کی طرف بڑھی۔''مالکن،میں گھر جاؤں۔آپ کے لئے دوا بناؤں گی''۔دائی راجو نے ٹھاکرانی سے پوچھا۔''صبح سویرے آجاؤں گی''۔

ٹھاکرانی جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ پنگھوڑے کے پاس سے شانتا کی چیخ سنائی دی۔''ہائے رام.....''۔

''کیا ہوا؟''ٹھاکرانی نے گھبرا کر پوچھا۔

مگر شانتا کوئی جواب نہ دے سکی۔اس کے ہونٹ البتہ لرز رہے تھے۔ایک ہاتھ سینے پر رکھا تھا۔

ٹھاکرانی کی گھبراہٹ اور بڑھ گئی۔''بچہ خیریت سے تو ہے نا؟''۔اس کا دل اندیشوں کے بوجھ سے لرزنے لگا۔

''جج.....جی.....چھ.....چھوٹے ٹھاکر ٹھیک ہیں۔پر.....''۔

راجو دوڑ کر اس طرف گئی اور پنگھوڑے میں پڑے بچے کو دیکھتی رہی،جس کا نچلا دھڑ برہنہ تھا۔وہ بھی پریشان ہوگئی۔

''کیا ہوا؟بولتی کیوں نہیں؟کیا بات ہے شانتا؟''ٹھاکرانی چلائی۔

شانتا اب بھی جواب نہ دے سکی۔ٹھاکرانی نے راجو کو پکارا۔''راجو،تو بتا۔کیا بات ہے؟''

''وہ.....مالکن.....وہ.....آپ خود ہی دیکھ لیں''۔راجو نے جواب دیا۔وہ گڑبڑائی ہوئی تھی۔

ٹھاکرانی کا ضبط جواب دے گیا۔وہ ساری احتیاط بھول کر اٹھی اور پنگھوڑے کی طرف لپکی۔بچے کو دیکھنے کے بعد اس کے منہ سے بھی بے ساختہ.....ہائے رام،یہ کیا.....؟نکلا۔

تینوں دیر تک بچے کے جسم کے،ناف سے نیچے والے حصے کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہیں۔پھر راجو منمنائی۔''میں گھر جاؤں مالکن؟''

ٹھاکرانی نے چونک کر نظریں اٹھائیں اور اسے دیکھا۔اچانک اس کی آنکھیں جیسے شعلے اگلنے لگیں۔اس نے کہا۔''راجو،پہلے تجھے یہ بتانا ہوگا کہ یہ کیا ہے؟''۔

راجو نے اس کے تیور دیکھے تو تھر تھر کانپنے لگی۔''مم.....میں.....میں کیا جانوں مالکن۔میں نے تو کچھ نہیں کیا ہے''۔

www.allurdu.com

''تو پھر؟''

''مجھے..... مجھے کچھ پتا نہیں مالکن''۔ راجو کا چہرہ فق ہو گیا۔

ٹھاکرانی شانتا کی طرف مڑی۔ ''شانتا، تو جا کے ٹھاکر جی کو بلا کر لا''

''مالکن، باہر مجرا ہو رہا ہے۔ ٹھاکر جی مہمانوں کے ساتھ ہیں''۔ شانتا نے گھبرا کر کہا۔

ٹھاکرانی عام حالات میں نرم مزاج تھی۔ لیکن اس وقت صورت حال ایسی تھی کہ اسے جلال آ گیا، اس نے درشت لہجے میں شانتا کو ڈپٹا۔ ''مجھے بھی معلوم ہے۔ تو مجھے مت پڑھا جا..... ان سے کہنا، بہت ضروری بات ہے۔ فوراً آ جائیں، تو خود جا کر ان سے کہنا''۔

اب کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ شانتا مرے مرے قدموں سے یوں چلی، جیسے مقتل کی طرف جا رہی ہو۔

ٹھاکرانی کو اس پر ترس آ گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اس بے چاری پر بچے کے غائب ہونے کے سلسلے میں شبہ کیا جا رہا تھا۔ اس وقت خوف سے کیا حال ہوا ہو گا اس کا! اور اب یہ مصیبت''۔ کسی نوکر سے کہہ دینا۔ وہ بلا دے گا۔ پر یہ بات منہ سے نہ نکلے۔ بس ان کو بلانا ہے۔ جلدی جا''۔

شانتا کے قدموں میں کچھ جان سی پڑ گئی.....

.....X.....

ٹھاکر مہمانوں سے معذرت کر کے حویلی کی طرف چلا تو جھنجلایا ہوا تھا۔ وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ اس بات پر ٹھاکرانی کی اچھی طرح خبر لے گا۔ ایسے ذرا ذرا سی بات پر مہمانوں کے بیچ سے بلوا لینا۔ ٹھاکروں کے ہاں یہ سب چونچلے تو جوانی میں بھی نہیں ہوتے۔ جب کہ اب تو بڑھاپا آن لگا ہے چوکھٹ پر۔

مگر فوراً ہی اس کے دل میں نرمی سی پھوٹ نکلی۔ بے چاری رنجیتا! بہت اچھی پتنی تھی وہ۔ چونچلوں کا عرصہ..... امنگوں بھری جوانی تو اس نے دبے دبے گزار دی تھی۔ صرف اس لئے کہ بھگوان نے اسے اولاد نہیں دی تھی۔ اور وہ سمجھتی تھی کہ یہ اس کی اپنی نااہلی ہے۔ اس لئے وہ کبھی کچھ مانگتی ہی نہیں تھی۔ کوئی مطالبہ نہیں کرتی تھی۔ کسی چیز پر حق نہیں جتاتی تھی۔ یہاں تک کہ اس پر بھی..... اپنے پتی پر بھی!

یہ سوچتے ہوئے ٹھاکر کو اپنا خیال آیا۔ اس کا بھی یہی حال تھا۔ اولاد سے محرومی کا ذمے دار وہ خود کو سمجھتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس میں یہ اہلیت ہی نہیں ہے۔ اور وہ راج پوت تھا..... آن بان والا۔ وہ یہ بات کسی سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا..... پتنی سے بھی نہیں۔ اس نے کبھی اپنا معائنہ بھی نہیں کرایا۔ اگر رپورٹ صاف بتا دیتی کہ وہ اس جوہر سے محروم ہے تو اس کے سامنے مر جانے کے سوا کوئی راستہ نہ رہتا۔ چنانچہ وہ خاموش رہا اور اندر ہی اندر احساس کمتری پالتا رہا۔

شاید اس کا ایک فائدہ بھی ہوا۔ یہ کہ وہ ایک اچھا انسان بن گیا۔ وہ بہت بڑا زمین دار تھا۔ دور تک اس کی زمینیں تھیں۔ بیسیوں گاؤں تھے اس کے۔ بڑی رعیت تھی۔ پر اس نے کبھی زمین داروں کی روایتی عادتیں نہیں اپنائیں۔ وہ ظالم و جابر نہیں بنا۔ کبھی ناچ گانا دیکھ لینا الگ بات ہے۔ مگر اس نے کبھی کسی عورت پر بری نظر نہیں ڈالی۔ ہوس میں کبھی مبتلا نہیں ہوا۔ رعیت کی بہو بیٹیوں کو میلی نظر سے نہیں دیکھا جب کہ زمین دار تو پسند کی لڑکیوں کو گھر سے اٹھوا لیتے ہیں۔ اس نے تو کبھی کسی ناچنے والی کی خواہش بھی نہیں کی۔ کبھی کسی پر ظلم نہیں کیا۔ اس کے مزارعے، ملازمین، گھر کے نوکر چاکر، سب ہمیشہ اس سے خوش رہے۔ اسے دعائیں دیتے رہے۔ وہ اس کی عزت کرتے تھے۔ اس سے ڈرتے بھی تھے۔ حالاں کہ اس نے کبھی کسی کو سزا نہیں دی تھی۔ وہ تو ہر پریشانی میں ان کے کام آتا تھا۔ ان کی مدد کرتا تھا۔ فصل خراب ہوئی تو اس نے اپنا حصہ معاف کر دیا۔ الٹا مزارعوں کو کچھ پلے سے دے دیا۔ کسی کے گھر میں پریشانی ہوئی تو وہ اس کے کام آیا۔ شاید صرف اسی لئے کہ وہ بائیس سال اولاد سے محروم رہا۔ اور خود کو کم تر سمجھتا رہا۔ ورنہ شاید وہ بھی دوسرے زمین داروں کی طرح ہوتا۔

یہ بھی ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی اچھائی تھی کہ وہ اس انداز میں سوچتا تھا۔ اس کی طبیعت میں راج پوتوں کی ضد اور اکھڑ پن کے ساتھ ایسا انکسار، ایسی عاجزی تھی، جسے راجپوت توہین سمجھتے ہیں۔ جو راج پوتوں میں ہوتی ہی نہیں۔ ورنہ اگر وہ پیچھے کی طرف دیکھتا تو اکڑ جاتا۔ اس نے اپنے باپ ٹھاکر رندھیر سنگھ کو دیکھا تھا۔ وہ اولاد سے محروم نہ ہونے کے باوجود ایسے ہی تھے۔ رعایا کو اولاد کی طرح سمجھتے اور ان کا خیال رکھتے تھے۔ عیاش طبع بھی نہیں تھے۔ ان کی شرافت اور عزت کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ اور ٹھاکر پرتاپ سنگھ ان ہی کا بیٹا تھا۔

اور پھر ٹھاکر پرتاپ سنگھ اپنے ماضی کو دیکھتا تو بھی اس میں اکڑ پیدا ہو جاتی۔ اپنے بیاہ سے پہلے وہ جوانی کے نو سال گزار چکا تھا۔ بیاہ تو اس کا پچیس سال کی عمر میں ہوا تھا۔ زمین داروں کے جوان بیٹے تو طاقت کے نشے میں چور ہو کر اپنے گلشن عمل داری میں کسی کلی، کسی پھول کو شاخ پر نہیں رہنے دیتے۔ ٹھاکر پرتاپ چاہتا تو کیا نہیں کر سکتا تھا۔ بیاہ سے پہلے کتنی لڑکیاں اس کی نظر التفات کی آرزو کرتی تھیں۔ مگر اس نے کبھی آنکھ اٹھا کر کسی کو نہیں دیکھا۔ اس لئے کہ یہ اس کی فطرت ہی نہیں تھی۔ محرومی تو بعد کی بات تھی۔

اور بیاہ کے پانچ سال بعد تو ٹھاکرانی رنجیتا ہی دوسرے بیاہ کیلئے اس کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ مگر اس نے ہی ہمیشہ انکار کیا..... اور بہت درشتی سے انکار کیا۔ اسے رنجیتا سے بہت محبت تھی۔ وہ اسے سوکن کا دکھ کیسے دے سکتا تھا!

''مجھے بیٹا چاہئے ناتھ''۔ رنجیتا اکثر جھنجلا کر کہتی۔ ''تمہارا بیٹا۔ میری کوکھ سے نہ سہی، کسی اور کی کوکھ سے سہی۔ تمہارا بیٹا میرا بیٹا ہو گا''

''میں نے کہہ دیا نا۔ مجھے یہ سننا بھی برا لگتا ہے''۔

''مگر کیوں ناتھ''۔

''دیکھ رنجو، بیٹے کو میرا من بھی بہت چاہتا ہے۔ پر میں کہتا ہوں، بھگوان کو دینا ہی ہے تو تم سے دے۔ ورنہ مجھے نہیں چاہئے''۔

تو ٹھیک ہے۔ کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے ٹھاکر نے دل میں کہا۔ ایئس برس کی دبی ہوئی رنجیتا اب توجہ کی حق دار ہوئی ہے۔ وہ تمہیں محفل سے بھی بلائے تو ہنسی خوشی جاؤ۔ ماتھے پر بل نہیں ہونا چاہئے۔ یہ توجہ، یہ نخرے..... اب اسے ان کا ادھیکار ہے۔ وہ تمہاری پتنی ہی نہیں تمہارے چھوٹے ٹھاکر کی ماں بھی ہے۔

اس نے دروازہ دھکیلا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔

اندر داخل ہوتے ہی اسے احساس ہو گیا کہ مسئلہ رنجیتا کے توجہ حاصل کرنے کا نہیں۔ بلکہ سنگین ہے۔ رنجیتا بستر پر نہیں تھی۔ بلکہ پنگھوڑے کے پاس کھڑی بچے کو دیکھ رہی تھی۔ اور اس کے چہرے پر وحشت تھی۔ اس کے پاس ہی دائی راجو اور شانتا کھڑی تھیں۔ ان کے چہرے ستے ہوئے تھے۔

ٹھاکر کا دل وسوسوں سے بھر گیا۔ بچے کو کچھ ہو گیا ہے؟ یہ سوچ کر ہی اسے لگا کہ اس کا دل بند ہو رہا ہے۔ سانسیں رکی جا رہی ہیں۔ مگر اسی لمحے اسے مجذوب کی بات یاد آ گئی۔ بچہ اسے جس طرح ملا ہے، دیا گیا ہے، بھگوان نے چاہا تو وہ لمبی عمر پائے گا۔

اس نے کھنکھار کر گویا اپنے آنے کا اعلان کیا۔ رنجیتا نے چونک کر اسے دیکھا اور شانتا اور راجو سے کہا ''تم باہر جاؤ۔ جب تک میں نے بلاؤں، اندر نہ آنا''۔

راجو اور شانتا نظریں جھکائے ٹھاکر کے قریب سے گزر کر باہر چلی گئیں۔

''کیا بات ہے رنجو''۔ ٹھاکر نے وہیں کھڑے کھڑے پوچھا۔ اسے آگے جانے اور بچے کو دیکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ نہ جانے کیا دیکھنے کو ملے۔

''ادھر آئیں ناتھ''۔

ٹھاکر دھڑکتے دل سے بڑھا اور پنگھوڑے کے پاس پہنچ گیا۔

''ادھر دیکھیں بچے کو''۔ ٹھاکرانی نے کہا۔

ٹھاکر نے بچے کو دیکھا۔ وہ ٹھیک ٹھاک تھا اور سو رہا تھا۔

www.allurdu.com

اس نے سکون کی سانس لی۔ ''ٹھیک تو ہے۔ سو رہا ہے۔ تم پریشان کیوں ہو؟''۔ اس نے کہا۔

''ادھر دیکھیں..... نچلے دھڑ کو''۔

تب ٹھاکر نے دیکھا کہ بچہ نیچے سے کھلا ہوا ہے۔ اور پھر اس نے دیکھا اور گڑبڑا گیا۔ ''یہ..... یہ کیا؟''۔

''یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے''۔

''بچہ ایسا پیدا تو نہیں ہوتا''۔

''ہاں۔ ایسا ہوتا نہیں۔ مگر مسلوں کے ہاں بچے کو ایسا کر دیتے ہیں''

اسی لمحے ایک عجیب بات ہوئی۔ اس پریشانی میں بھی ٹھاکر کو لفظ مسلا برا لگا۔ ''سنو رنجیتا، ہم لوگ نفرت سے، ان کی توہین کرنے کیلئے مسلمانوں کو ایسے پکارتے ہیں اب تم آئندہ کبھی یہ لفظ زبان پر نہ لانا''

ٹھاکرانی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

''دیکھو نا، ہمیں خواب میں جنہوں نے بیٹے کی خبر دی، وہ مسلمان بزرگ تھے۔ پھر آج جس مجذوب سے میں ملا، وہ بھی مسلمان تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ بھگوان کی اچھا سے ہمارا اور ہمارے بیٹے کا مسلمانوں سے کوئی سمبندھ ہو گیا ہے۔ اب انہیں کبھی ایسے نہ پکارنا۔ کبھی برا نہ کہنا''۔

ٹھاکرانی نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ ٹھاکر ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ''مگر یہ.....؟'' اس نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے ہے''۔

دونوں چند لمحے سوچتے رہے۔ پھر ٹھاکرانی نے کہا۔ ''بچے کو یہاں کون لایا تھا؟''

''یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ مجھے تو مجذوب نے بتایا تھا کہ بچہ یہاں پہنچا دیا گیا ہے۔ اور اب یہی اس کا کمرا ہے''۔ ٹھاکر نے کہا۔ پھر اسے یاد آیا کہ جب اس نے مجذوب سے پوچھا تھا کہ وہ کہاں سے آ رہا ہے تو اس نے حویلی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اور اس نے کہا تھا..... ہم تو خود خیر مقدم کے لئے یہاں آئے تھے۔ کچھ ضروری کام بھی تھے نمٹا لئے، اب ہمیں جانا ہے۔ یہ تو ٹھاکر اب سوچ رہا تھا کہ وہ کون سے کام تھے جو مجذوب نے نمٹا لئے تھے۔ بچے کو اس کمرے میں پہنچانا..... شہد چٹانا..... اور..... اور.....؟ اور پھر مجذوب نے یہ ہی کہا تھا..... بچے کی صورت دیکھ لی اور دعا بھی دے دی ہم وہیں سے آ رہے ہیں..... تو یہ تو تھا کہ مجذوب یہاں آیا تھا۔ ''میرا خیال ہے رنجو کہ بچے کو مجذوب نے ہی یہاں پہنچایا تھا''۔

''تو ہو سکتا ہے، انہوں نے ہی.....'' ٹھاکرانی نے جان بوجھ کر جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔

''پاگل ہوئی ہو''۔ ٹھاکر نے بگڑ کر کہا۔ ''کوئی ایسا کرتا تو کوئی نشان ہوتا، کٹا ہوتا، زخم ہوتا۔ اتنی جلدی ٹھیک تو نہیں ہو سکتا''۔

''میں تو اب بھی یہی کہوں گی''۔ ٹھاکرانی بولی۔ ''آپ بتائیں، آپ جب اس کمرے میں آئے تھے تو دروازے پر تالا تھا''۔

''ہاں۔ میں نے چابی سے تالا کھولا تھا۔ مگر تم کہنا کیا چاہتی ہو''۔

''دیکھیں نا تھ۔ اگر وہ سب کی آنکھوں کے سامنے بچے کو اٹھا کر یہاں لا سکتے ہیں۔ تالا کھولے بغیر اسے اندر لا سکتے ہیں، تو یہ بھی کر سکتے ہیں۔ اچھا، ایک بات بتائیں۔ یہ کمرہ تو برسوں سے بند تھا۔ یہاں تو گرد، مٹی ہو گی، مکڑی کے جالے ہوں گے، گھٹن ہو گی، اندھیرا ہو گا''۔

''ایسا کچھ نہیں تھا''۔ ٹھاکر نے کمرے کا نقشہ بیان کیا۔ ''ہم اگر برسوں سے بند کسی کمرے کی صفائی کریں تو پورا دن لگ جائے۔ مگر یہ کمرا منٹوں میں صاف ہو گیا۔ تو کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ زخم منٹوں میں ٹھیک ہو جائے''۔

بات ٹھاکر کے دل کو لگی۔ لیکن پھر بھی اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ ''اچھا، تم راجو کو بلاؤ میں اس سے بات کروں گا''۔

ٹھاکرانی نے آواز دی تو راجو اندر آ گئی۔ وہ سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ ''راجو، تو کیا کہتی ہے اس معاملے میں''۔ ٹھاکر نے پوچھا۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں مالک''۔ راجو گڑگڑائی۔

''تو جانتی ہے، میں کیا پوچھ رہا ہوں''۔ ٹھاکر کا لہجہ سخت ہو گیا۔

''اس میں میرا کوئی قصور نہیں مالک''۔

''وہ تو میں جانتا ہوں۔ تیرا کسی طرح بھی کوئی قصور نہیں''۔ ٹھاکر نے لہجہ نرم کر لیا۔ ''بس میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ یہ پیدا ہی ایسا ہوا ہے یا بعد میں ایسا ہوا؟''۔

''مم..... مجھے..... مجھے معلوم نہیں ٹھاکر جی''۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ تیرے ہاتھوں کی پیدائش ہے''۔

''وہ..... ٹھاکر جی..... میں نے تو اس بات پر دھیان ہی نہیں دیا تھا''۔

''جھوٹ بولتی ہے تو۔ یہ تو ممکن ہی نہیں''۔ ٹھاکر کو غصہ آ گیا۔ ''سچ بتا دے۔ نہیں تو میں تجھے شکاری کتوں کے آگے ڈلوا دوں گا''۔

راجو تھر تھر کانپنے لگی۔ لگتا تھا، بے ہوش ہو کر گر جائے گی''۔ سچ بتا دے۔ تجھے کچھ نہیں ہو گا راجو''۔ ٹھاکرانی نے اسے دلاسہ دیا۔

''مالکن..... اگر آپ کو وشواس نہیں ہوا تو؟'' راجو نے کہا۔

''کیوں نہیں ہو گا وشواس۔ سچ بولے گی تو ضرور ہو گا''۔

''وہ جی بات ہی ایسی ہے مالکن۔ جیون گزر گیا اس کام میں۔ پر پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا''۔

''صاف بات کر..... سیدھی بات''۔ ٹھاکر نے ڈپٹ کر کہا۔

''سچ یہ ہے مالک کہ چھوٹے ٹھاکر ایسے ہی پیدا ہوئے تھے۔ میں نے ایسا پہلے کبھی نہیں دیکھا''۔

ٹھاکر نے سکون کی سانس لی۔ لیکن ٹھاکرانی کو غصہ آ گیا۔ ''یہ تو پہلے بتانے والی بات تھی۔ تو نے چھپائی کیوں؟ ایسی بات چھپ سکتی ہے بھلا''۔

''ایک تو مجھے ڈر تھا کہ یہ بدشگونی ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ ٹھاکر جی ناراض ہو کر مجھے کتوں کے سامنے نہ ڈلوا دیں۔ اتنے برسوں کے بعد منتوں مرادوں کا بچہ ہے پھر میں نے سوچا، مجھے انعام بھی نہیں ملے گا''

ٹھاکر مسکرایا۔ ''تو تجھے انعام ملا یا نہیں؟''۔

''بہت ملا مالک۔ جھولی بھر کے ملا''۔

''نہیں۔ جھولی بھر کے تو اب ملے گا۔ کل تو آئے گی تو سچ مچ تیری جھولی بھر دوں گا''۔ ٹھاکر نے کہا۔ پھر سخت لہجے میں بولا۔ ''لیکن غور سے سن راجو۔ یہ بھگوان کی اچھا تھی۔ کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ بات کسی کو معلوم نہ ہو۔ ورنہ تیری خیر نہیں''۔

''میری زبان نہیں کھلے گی مالک۔ پر شانتا.....''۔

''تو اس کی فکر نہ کر۔ میں اسے سمجھا دوں گی''۔ ٹھاکرانی نے کہا۔ ''بس اب تو جا''۔

راجو چلی گئی۔ وہ دونوں خاموش تھے۔ اپنی اپنی سوچوں میں گم۔ دونوں ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ لیکن ایک دوسرے سے کہنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے ..... یہ کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ۔ ایک دن میں کتنا کچھ ہو گیا۔ مگر خیر..... جیون اکارت تو نہیں گیا۔ من کی سب سے بڑی مراد تو پوری ہو گئی۔

یہ سچی بات تھی۔ وہ اولاد پانے کیلئے کچھ بھی کر سکتے تھے..... کچھ بھی!

چند منٹ بعد ٹھاکرانی نے آواز دے کر شانتا کو بلایا۔ ''شانتا..... چھوٹے ٹھاکر کو کپڑے بدلا دے''۔

شانتا بچے کے پاس جا کر مصروف ہو گئی۔ ٹھاکرانی اور ٹھاکر مسہری پر آ بیٹھے۔ ''سن شانتا، اس بات کا کبھی کسی سے نہ کہنا''۔ ٹھاکرانی نے پکار کر کہا۔

شانتا نے سر جھکائے جھکائے کہا۔ ''کون سی بات مالکن؟''۔

''یہی والی بات چھوٹے ٹھاکر والی''۔

''مجھے تو ایسی کسی بات کا خود بھی پتا نہیں مالکن۔ اور جو بات مجھے نہیں پتا، وہ میں کسی کو کیسے بتا سکتی ہوں''۔

www.allurdu.com

شانتا نے معصومیت سے کہا۔

''اور سن۔ چھوٹے ٹھاکر کا یہ کام اب صرف تیرے ذمے ہے۔ پھر کبھی کسی کے سامنے ان کا گیلا سوکھا نہ کرنا''۔

شانتا بچے کو کپڑے پہنا کر مڑی۔ ''مالکن، وہ حمیدہ دیدی آئی ہوئی ہیں''۔

''تو جا کر اسے بھیج دے۔ اور گھنٹا دو گھنٹا سو جا۔ تب تک حمیدہ میرے پاس رہ لے گی''۔

''حمیدہ کون؟ جمال دین کی گھر والی؟''۔ ٹھاکر نے پوچھا۔

ٹھاکرانی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

شانتا کے جانے کے بعد ٹھاکر نے کہا۔ ''رنجو، اکیلی شانتا تو بچے کو نہیں سنبھال سکے گی۔ اور کوئی اور بچے کا کام کرے گا تو راز راز نہیں رہے گا''۔

''آپ فکر نہ کریں ناتھ۔ تھوڑے دن کی تو بات ہے۔ راجو شانتا کا ہاتھ بٹا دے گی۔ ایک، دن میں میرے پاس رہے گی تو دوسری رات میں۔ اور پھر بعد میں تو میں اپنے راج دلارے کا ہر کام خود ہی کروں گی۔ کسی کو چھونے بھی نہ دوں گی اسے''۔

ٹھاکر مطمئن ہو گیا۔ مگر پھر اسے ایک اور خیال آیا۔ اس نے کہا۔ ''اور کوئی بات تو نہیں رنجو..... پریشانی والی؟''۔

ٹھاکرانی ایک لمحے کو ہچکچائی۔ پھر بولی تو اس کے لہجے میں فخر تھا۔ ''آپ کا بیٹا راجپوت ہے۔ بہت ضدی ہے۔ پتا ہے، اب تک میرا دودھ نہیں پیا ہے اس نے۔ بھوک سے تڑپ رہا ہوتا ہے مگر دودھ کو منہ نہیں لگاتا۔ بس شہد پر گزارہ ہو رہا ہے''۔

''یہ تو پریشانی کی بات ہے۔ ایسا کب تک چلے گا۔ دودھ کے بغیر تو بچے کا گزارہ نہیں ہوتا''۔ ٹھاکر پریشان ہو گیا۔

''بھگوان جانے.....''۔

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی ''آجا حمیدہ۔ ٹھاکرانی نے پکارا۔

دروازہ کھلا اور حمیدہ اندر آئی۔ ٹھاکر کو دیکھ کر وہ جھجکی۔ پھر ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ''مبارک ہو ٹھاکر جی۔ بدھائی ہو مالکن''۔

ٹھاکر مسکرایا اور ٹھاکرانی نے شکریہ کہا۔ پھر پوچھا۔ ''تو اپنے بچے کو نہیں لائی؟''۔

''یہاں آتے ہوئے ان کے پاس چھوڑ آئی ہوں مالکن''۔ حمیدہ نے محجوب لہجے میں کہا۔

''لے آتی تو اچھا تھا، اب اگر میں تجھے کچھ دیر روک لوں تو؟''۔

''آپ حکم کریں تو میں پوری رات رکی رہوں''۔ حمیدہ نے بے ساختہ کہا۔

ٹھاکر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں جا رہا ہوں ٹھاکرانی، مہمان بیٹھے ہوئے ہیں۔ بری بات ہے''۔

''ٹھیک ہے ناتھ''۔

.....X.....

حمیدہ کو بیٹھے تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ بچہ بلک بلک کر رونے لگا۔ ''چھوٹے ٹھاکر اٹھ گئے''۔ حمیدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''دیکھوں ..... گیلے تو نہیں ہو گئے''۔ وہ اٹھ کر پنگھوڑے کی طرف چلی۔

ٹھاکرانی بوکھلا گئی۔ ''حمیدہ..... گیلا ہو تو تم ہاتھ نہ لگانا۔ میں آپ ہی بدل دوں گی''۔ اس نے لہجے کو عام سا رکھنے کی کوشش کی تھی۔

حمیدہ کو اس کے لہجے کی وحشت نے حیران کر دیا۔ اس میں کیا حرج ہے کہ میں..... پھر اس نے سوچا، مالکوں کی باتیں مالک جانے۔ کیا پتہ، کوئی دھرم کا معاملہ ہو۔ اس نے پنگھوڑے میں لیٹے بچے کو دیکھا اور دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ وہ بہت خوب صورت بچہ تھا۔ پیشانی بہت کشادہ تھی اس کی۔ نقوش کھڑے اور بہت پیارے تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بلک بلک کر روئے جا رہا تھا۔ حمیدہ نے دیکھ لیا کہ وہ گیلا نہیں ہے۔

''چھوٹے ٹھاکر گیلے نہیں ہیں مالکن۔ بھوکے ہو رہے ہیں''۔ اس نے ٹھاکرانی کو بتایا۔

''اٹھا کر لے آؤ۔ پھر کوشش کرتی ہوں۔ اب تک انہوں نے دودھ نہیں پیا ہے''۔ ٹھاکرانی نے کہا۔

''یہ تو اچھی بات نہیں''۔ حمیدہ نے بچے کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

بچے نے حمیدہ کی گود میں آتے ہی ہاتھ چلانے شروع کئے اور پھر اس کے ننھے ننھے ہاتھ حمیدہ کی چھاتیوں پر رک گئے۔ پھر جیسے وہ بار بار ہاتھ مار کر دودھ کا مطالبہ کرنے لگا۔

''یہ تو صاف صاف دودھ مانگ رہے ہیں''۔ حمیدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ اور دل میں سوچا، کتنے عقل مند ہیں چھوٹے ٹھاکر۔ ابھی سے اتنی سمجھ ہے!''۔

''اچھا شگون ہے۔ شاید اب دودھ پی ہی لیں''۔ ٹھاکرانی نے ہاتھ پھیلائے۔

لیکن ٹھاکرانی کیساتھ بچے کا رویہ اب بھی پہلے جیسا تھا۔ ٹھاکرانی اسے زبردستی اپنی طرف کرتی اور وہ پوری طاقت سے منہ موڑ لیتا۔ یہی نہیں۔ وہ بار بار پاس کھڑی حمیدہ کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا۔

ٹھاکرانی کا چہرہ خفت سے تمتما اٹھا۔ ''پتا نہیں، کیا بات ہے۔ کوئی خرابی ہے میرے دودھ میں''۔

''یہ بات نہیں مالکن۔ کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے''۔

بچہ اب چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ ضد کر رہا ہے۔ اس نے تو آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ ''حمیدہ..... اسے لے جا کر لٹا دے اور شہد چٹا دے۔ اس پر گزارہ ہو رہا ہے میرے بچے کا''۔

مگر حمیدہ نے جیسے ہی بچے کو گود میں لیا، بچہ یک لخت چپ ہو گیا۔ اس کے ننھے منے ہاتھ پھر حمیدہ کی چھاتیوں کو ٹٹولنے لگے۔ حمیدہ کا اپنا دودھ پیتا بچہ تھا۔ وہ ماتا سے بھری تھی۔ اس کا دل پگھلنے لگا۔ لیکن کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ بچے کو گود میں لئے وہیں کھڑی رہی۔

ٹھاکرانی کوئی بچی نہیں تھی۔ وہ سمجھ گئی۔ اس کا دل رنج اور حسد سے بھر گیا۔ میرا بچہ..... اور میرا دودھ ٹھکرا کر کسی اور کا دودھ مانگے۔ یہ کیسی توہین ہے ماتا کی۔ وہ سوچتی اور دانتوں سے اپنا نچلا ہونٹ چباتی رہی۔

ننھے منے ہاتھوں کی چھیڑ خانی نے ماتا سے لدی پھندی حمیدہ کو بے حال کر دیا۔ بچے پکاریں، دودھ مانگیں تو رکی ہوئی ماتا آتش فشاں کی طرح ہو جاتی ہے۔ اب مالکن کا رعب بھی حمیدہ کو باز نہ رکھ سکا۔ اس نے ملتجیانہ لہجے میں ٹھاکرانی سے کہا۔ ''چھوٹے ٹھاکر تو مجھ سے دودھ مانگ رہے ہیں''۔

ٹھاکرانی کا جواب بے حد مختصر اور فیصلہ کن تھا۔ ''اسے پنگھوے میں لٹا دے اور انگلی سے شہد چٹا''۔

حمیدہ کسی اور ہی کیفیت میں تھی۔ وہ بچے کو لپٹائے کھڑی رہی پھر بولی۔ ''پلانے دیں نا مالکن''۔

''میں کہتی ہوں، لٹا دے اسے''۔ اس بار ٹھاکرانی نے گرج کر کہا۔

حمیدہ کی کیفیت ختم ہو گئی۔ اس نے بڑی نزاکت سے بچے کو خود سے دور کیا۔ پھر اسے پنگھوڑے میں لٹا دیا۔ بچے نے پھر رونا شروع کر دیا۔ ایک منٹ بعد تو یہ حال ہوا کہ اس کی چیخیں چھت پھاڑے ڈال رہی تھیں۔

''حمیدہ، اسے شہد چٹا''۔ ٹھاکرانی نے پکارا۔

لیکن اس بار بچہ شہد میں ڈوبی ہوئی انگلی سے بھی منہ موڑ رہا تھا۔ بلکہ اس نے ایک اور ادا سیکھ لی تھی۔ اب وہ ہونٹ سختی سے بھینچ لیتا تھا۔ اور اس کے دونوں ہاتھ آگے کی سمت مسلسل کچھ تلاش کر رہے تھے۔ وہ ننھے ننھے ہاتھ اپنی منزل کو نہیں چھو سکتے تھے۔ لیکن کوشش کئے جا رہے تھے۔ اور حمیدہ ان کے معصوم لمس کو، ان کے جان دار مطالبے کو صاف اپنی چھاتیوں پر محسوس کر رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اس کا دل پھٹ جائے گا۔

بچہ اتنے زور سے رو رہا تھا کہ اتنے فاصلے سے بات کرنا ممکن نہیں تھا۔ حمیدہ ٹھاکرانی کے پاس چلی گئی۔ ''مالکن..... چھوٹے ٹھاکر شہد بھی نہیں لے رہے ہیں''۔ اس نے کہا۔

ٹھاکرانی نے ایک نظر اس کے چہرے کو دیکھا اور جان لیا کہ وہ اس کے بچے کو دودھ پلانے کیلئے تڑپ رہی ہے۔ اسے یقین ہو گیا کہ حمیدہ نے بچے کو شہد چٹانے کی کوشش ہی نہیں کی ہے۔ تاکہ وہ بچے کو اس سے دودھ پلوانے پر مجبور ہو جائے۔ راج پوت خون جوش مارنے لگا۔ پھر بھی اس نے تحمل سے کام لیا۔ معاملہ منتوں مرادوں والے بچے کا بھی تھا۔

''مالکن مجھے دودھ پلانے دیں، نا'' حمیدہ نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

''سن حمیدہ، یہ جو دودھ ہوتا ہے نا، یہ اصل میں خون ہوتا ہے''۔ ٹھاکرانی نے بے حد سرد لہجے میں کہا۔ ''اور ہم راج پوت لوگ اپنے خون میں ملاوٹ کرنے سے اچھا مر جانے کو سمجھتے ہیں''۔ ٹھاکرانی کہہ تو گئی لیکن اگلے ہی لمحے لرز گئی۔ یہ کیسی منحوس بات منہ سے نکالی ہے اس نے۔ اس بچے پر تو سب کچھ قربان کیا جا سکتا ہے۔

ادھر حمیدہ کچھ سننے اور سمجھنے کے قابل ہی نہیں تھی۔ وہ بولی۔ ''خدا کی قسم، میں کسی کو بھی نہیں بتاؤں گی مالکن۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا''۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ خون میں ملاوٹ تو ہو جائے گی نا''۔

اب کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی۔ حمیدہ ٹھاکرانی کو ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہیں جیسے بھیک مانگ رہی تھیں۔

ادھر بچے کی چیخیں، ادھر حمیدہ کی نظریں..... ٹھاکرانی کا دل کٹنے لگا۔ بہ یک وقت دونوں چیزیں برداشت کرنا اس کیلئے ناممکن تھا۔ اس نے حمیدہ سے کہا ''تو اب گھر جا حمیدہ۔ اور یہ بات کسی سے نہ کہنا''۔

''نہیں کہوں گی مالکن۔ مگر آپ ایک بار.....'' بات پوری کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

''ٹھاکر کو پتا چل گیا تو یہ چاہتی ہے تو وہ تیرا خون پی جائیں گے..... اور میرا بھی''۔ ٹھاکرانی نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔ یہ سن کر حمیدہ کا چہرہ فق ہو گیا۔ ''بس اب تو جا۔ اور جاتے ہوئے شانتا کو جگا دے۔ کہنا، میں بلا رہی ہوں''۔

حمیدہ دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ ٹھاکرانی نے اسے پکارا تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ''اور سن، جب تک میں خود نہ بلواؤں، حویلی میں قدم نہ رکھنا''۔

حمیدہ باہر نکل گئی۔ ٹھاکرانی نے سکون کی سانس لی۔ بچے کے رونے کی آواز سے اب بھی اس کا دل پھٹا جا رہا تھا۔ لیکن یہ اطمینان تھا کہ اب شانتا آ کر اسے شہد چٹائے گی اور وہ چپ ہو جائے گا۔ حمیدہ نے تو شہد چٹایا ہی نہیں۔

شانتا کمرے میں آئی تو ٹھاکرانی نے اس کی خوب خبر لی۔ ''کیسے سوتی ہے تو۔ برابر والے کمرے میں تھی اور چھوٹے ٹھاکر کے رونے کی آواز سے بھی تیری آنکھ نہیں کھلی''۔

www.allurdu.com

''شما کر دیں مالکن''۔شانتا نے ہاتھ جوڑ کر کہا اور پنگھوڑے کی طرف چلی گئی۔اس نے صورت حال کا جائزہ لیا اور اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔''چھوٹے ٹھاکر بھوکے ہیں مالکن''۔

''پتا ہے مجھے۔شہد چٹا دے''۔

لیکن بچہ چپ نہیں ہوا۔ایک منٹ بعد شانتا نے کہا۔''مالکن،چھوٹے ٹھاکر کی طرف انگلی بڑھاؤں تو ہونٹ بھینچ لیتے ہیں۔شہد نہیں لے رہے ہیں''۔

ٹھاکرانی کو افسوس ہوا کہ،اس نے خوامخواہ حمیدہ پر شک کیا،اسے جھوٹا سمجھا۔اب کیا کیا جائے۔''اچھا یہاں میرے پاس لے آ چھوٹے ٹھاکر کو''۔

.....X.....

ٹھاکر پرتاپ سنگھ دیوان خانے میں تھا۔پنڈت روپ سہائے اس کے سامنے،جنم کنڈلی پھیلائے،اس پر جھکا بیٹھا تھا۔اس کے چہرے پر الجھن تھی۔

''پہلی بار ایسی جنم کنڈلی دیکھی ہے ٹھاکر جی۔چھوٹے ٹھاکر بڑے بھاگوان ہیں''۔اس نے ایسے موقعوں کے لئے رٹا رٹایا جملہ دہرایا۔لیکن اس کا پہلا حصہ بالکل سچ تھا۔

''مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ پنڈت جی''۔

''زیادہ نہیں بتا سکتا ٹھاکر جی۔میرا علم کم پڑ رہا ہے۔یہ جنم کنڈلی تو میں اپنے گرو کو دکھاؤں گا۔وہ زیادہ بتا سکیں گے''۔پنڈت نے عاجزی سے کہا۔

''وہ تو جب بتائیں گے،تب بتائیں گے''۔ٹھاکر نے خشک لہجے میں کہا۔''جو تم بتا سکتے ہو،وہ تو بتاؤ۔رکاوٹ کیا ہے آخر''۔

پنڈت نے گہری سانس لی اور ٹھاکر کو سمجھانے کی کوشش کی۔''کبھی کوئی ایسی جنم کنڈلی بھی دکھائی دے جاتی ہے ٹھاکر جی،جس میں بڑے پیچ ہوتے ہیں۔ستاروں کو کھوجنے نکلو تو اندھیرا نظر آنے لگتا ہے۔کچھ بجھائی نہیں دیتا۔یہاں معاملہ الٹ ہے۔روشنی اتنی ہے کہ آنکھیں چندھیا جائیں اور کچھ دکھائی نہ دے''۔

''پھر وہی گھماؤ پھراؤ والی بات''۔ٹھاکر جھنجلا گیا۔

''جنم کنڈلی میں راج یوگ بھی ہے اور.....''۔پنڈت کہتے کہتے رک گیا۔اب وہ یوگ بتائے گا تو ٹھاکر کچھ سمجھ نہیں پائے گا۔لہٰذا سیدھی سیدھی بات کی جائے۔بتانے کو تو کچھ زیادہ ہے بھی نہیں۔''جنم کنڈلی بتاتی ہے کہ چھوٹے ٹھاکر اوتار نہیں،پراوتار جیسے ہیں۔وہ راجہ بھی ہوں گے اور فقیر بھی۔وہ سب کچھ ہوگا ان کے پاس،جس کی انہیں پروا نہیں ہوگی۔اور جو وہ چاہیں گے،اس کے لئے انہیں بڑی تپسیا کرنی ہوگی۔بڑا کشٹ اٹھانا ہوگا۔کنڈلی بتاتی ہے کہ وہ کچھ کھوجتے،کچھ ڈھونڈتے پھریں گے۔وہ جو ارادہ کرلیں گے،اس سے کبھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ان کے جیون کی کہانی پریم کہانی ہوگی۔اور.....اور.....''۔پنڈت ہچکچانے لگا۔

''بتاؤ مجھے۔بے فکر ہو کر بتاؤ''۔

''آپ کے جیون میں چھوٹے ٹھاکر کی وجہ سے بڑی کٹھنائیاں آئیں گی۔اور.....اور.....''۔

''اور کیا؟''ٹھاکر نے بے تاب ہو کر پوچھا۔

''اور آپ اپنا جیون ان کی بھینٹ کر دیں گے''۔

ٹھاکر تو اب بھی بچے پر اپنا جیون بھینٹ کرنے کو تیار تھا۔اس نے بغیر کسی تردد کے کہا۔''وہ تو ٹھیک ہے۔پر بھاگیہ کا تو بتاؤ''۔

''بھگوان نے بڑی شکتی دی ہے چھوٹے ٹھاکر کو۔ان کے بھاگیہ کا کوئی نہیں بتا سکتا۔وہ اپنا بھاگیہ آپ لکھیں گے۔جو چاہیں گے،لکھیں گے اور وہی کچھ ہوگا بھی''۔

''تم نے بتایا تو کچھ بھی نہیں''۔ٹھاکر نے شکایتی لہجے میں کہا۔

پنڈت نے ہاتھ جوڑ لئے۔''اس سے زیادہ میں نہیں جانتا۔گرو جی کو لاؤں گا آپ کے پاس''۔

''اچھا.....کوئی شبھ نام تو نکال دو میرے پتر کا''۔

''ٹھاکر اوتار سنگھ سے شبھ نام کوئی نہیں۔اگر چھوٹے ٹھاکر سوئیکار کرلیں تو.....''۔

''اس کا کیا مطلب ہوا؟''۔

''ان کی مرضی کے آگے کسی کی نہیں چلے گی ٹھاکر جی''۔

ٹھاکر کو نام اچھا لگا تھا۔اس نے مسخرے پن سے کہا۔''اچھا۔میں ان سے پوچھ لوں گا۔وہ مجھے انکار نہیں کریں گے''۔

ٹھاکر نے پنڈت کو اتنا دیا کہ وہ خوش ہو گیا۔پنڈت کے جانے کے بعد ٹھاکر بیٹے کے پاس جانے کو بے تاب ہو گیا۔رات وہ دیر سے سویا تھا۔صبح اٹھتے ہی وہ اس کے درشن کرنا چاہتا تھا۔لیکن پنڈت کو آنا تھا۔وہ یہ سوچ کر رک گیا کہ اب بچے کے پاس اس کا نام لے کر ہی جائیں گے۔نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے اس کا جسم اور دماغ شل ہو رہا تھا۔اتنی بڑی خوشی نہ ہوتی تو اس وقت اس کے چڑچڑے پن سے حویلی کے نوکر لرزتے پھر رہے ہوتے۔

وہ دیوان خانے سے نکلا اور ٹھاکر اوتار سنگھ کے کمرے کی طرف چل دیا۔دور سے ہی اسے اس کے رونے کی آواز سنائی دی۔یہ کیا؟ٹھاکر نے خود سے کہا۔چھوٹے ٹھاکر اتنی بری طرح کیوں رو رہے ہیں۔کیا ابھی سے ضد شروع کر دی ہے؟

.....X.....

ٹھاکرانی اور شانتا ایک پل بھی نہیں سو سکی تھی۔رات بھر جاگتی رہی تھیں۔اس لئے کہ بچہ رات بھر روتا رہا تھا۔اس نے ایک بار بھی شہد قبول نہیں کیا تھا ٹھاکرانی نے کئی بار اسے دودھ پلانے کی کوشش کی تھی۔مگر ناکام رہی۔آخر اسے ایک ترکیب سوجھی۔اس نے سوچا،شاید بات بن جائے۔

اس نے اپنا چہرہ ساڑھے کے پلو میں چھپا لیا۔پھر وہ نیچے قالین پر بیٹھ گئی.....وہیں جہاں حمیدہ بیٹھی تھی۔پھر اس نے شانتا سے کہا کہ وہ بچے کو لا کر اس کی گود میں دے اس کا خیال تھا کہ ناسمجھ بچہ دھوکہ کھا جائے گا۔لیکن ایسا ہوا نہیں۔بچے نے دودھ کو منہ بھی نہیں لگایا۔

ننھے بچے میں جان ہی کتنی ہوتی ہے۔پھر وہ بچہ جس نے بارہ گھنٹے سے کچھ کھایا ہی نہ ہو۔مگر راج پوت بچہ تھا۔اپنی طاقت سے بڑھ کر روتا رہا۔کوئی اور بچہ ہوتا تو اب سے بہت پہلے نڈھال ہو کر چپ ہو چکا ہوتا۔

ٹھاکرانی کیلئے وہ بڑی کشمکش کی رات تھی۔بچے کے رونے سے اس کے دل پر چوٹ لگتی۔کلیجے سے ہوک اٹھتی۔بے بسی کے احساس نے اسے اور نڈھال کر دیا تھا۔دودھ کی کمی نہیں تھی۔مگر ضدی بچہ دودھ قبول نہیں کر رہا تھا۔بھوک سے روئے جا رہا تھا۔اور وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ہر پل وہ یہی سوچتی کہ بھوک سے بچے پر کیا گزر رہی ہوگی۔کہتے ہیں کہ کوئی کسی سے کتنی ہی محبت کرتا ہو،اس کی تکلیف کا اندازہ نہیں کر سکتا۔کیوں کہ اسے پتا ہی نہیں ہوتا کہ وہ کتنی تکلیف میں ہے۔یہ بات بالکل درست ہے۔لیکن ماں اس کلیے سے مستثنیٰ ہے۔بچے کو جتنی تکلیف ہوتی ہے،ماں اس سے بڑھ کر قیاس کرتی،اس سے بڑھ کر محسوس کرتی اور اس کے بارے میں سوچ کر اس سے زیادہ اذیت اٹھاتی ہے۔اسی لئے تو اس کے پاؤں کے نیچے جنت ہوتی ہے۔صبح ہوتے ہوئے ٹھاکرانی بچے سے بڑھ کر نڈھال ہو گئی۔

www.allurdu.com

روتے روتے بچے کا گلا بیٹھ گیا۔اس میں رونے کی طاقت ہی نہیں رہی۔اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ٹھاکرانی نے اس کی نیند گہری ہونے کا انتظار کیا۔پھر خود جا کر اپنی انگلی شہد میں ڈبوئی اور اس سے ہونٹوں پر دباؤ ڈالا۔ننھا سا منہ کھلا۔بھوکا بچہ سوتے میں تو مزاحمت نہیں کر سکتا تھا۔لیکن شہد کا ذائقہ جیسے ہی دہن میں اترا، وہ جاگ گیا، اور لگا پھر چنگھاڑنے۔ٹھاکرانی نے پھر شہد چٹانا چاہا۔لیکن بچہ پھر اکڑ گیا تھا۔

اس ایک رات میں ٹھاکرانی مامتا کے ہر مرحلے سے گزر گئی۔وہ ابتدا میں بائیس برس کے طویل انتظار کے بعد نوازی جانے والی وہ ماں تھی، جس میں عورت کی پوری تنگ نظری موجود تھی۔جو اپنا اعزاز کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرنا چاہتی تھی۔وہ محرومی کے احساس سے چور تھی کہ اس کے بچے نے اس کی مامتا کا پہلا تحفہ ہی قبول نہیں کیا تھا۔اور وہ ایک اور عورت سے دودھ مانگ رہا تھا۔اور وہ عورت نہ صرف غیر تھی۔بلکہ مسلمان تھی۔یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اسے اپنے بچے کو دودھ پلانے دیتی۔وہ تو کسی کو بھی یہ اجازت نہیں دے سکتی تھی۔

سو پہلے مرحلے میں وہ اس بات کو قبول نہیں کر سکتی تھی۔مگر پھر اسے احساس ہوا کہ بچہ بھوکا ہے۔اور اگر یہ صورتحال جاری رہی تو اس کی زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔اس احساس کے بعد پہلے تو وہ گھبرائی۔یہ تصور اس کیلئے جان لیوا تھا کہ بچے کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔یہ بات سمجھ میں آئی کہ بات کو وہاں تک پہنچنے سے روکنا ہے۔اس کیلئے وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔وہ یہ توہین بھی گوارا کر سکتی ہے کہ اس کا بچہ اس کا دودھ ٹھکرا رہا ہے۔کوئی بھی..... ہاں کوئی بھی اسے دودھ پلا دے۔بس اس کا پیٹ بھر جائے اور وہ جیتا رہے۔عورت اپنے شوہر کی سیج نہیں سجا سکتی۔اپنے اوپر سوکن نہیں لا سکتی۔لیکن وہ بچے کیلئے یہ سب کچھ کرنے کو تیار تھی..... بلکہ مصر تھی۔تو اب اپنے بچے کی زندگی بچانے کیلئے اسے اس کی من پسند ماں نہیں دے سکتی! اسے دودھ نہیں دلا سکتی اس کا! کیوں نہیں۔بس اس کا بچہ جیتا رہے۔چاہے کسی اور کا بچہ بن کر جیئے۔چاہے اسے ماں بھی نہ کہے۔

مگر بچہ ایک مسلمان عورت کا دودھ مانگ رہا تھا۔اس کا دھرم بھرشٹ ہو جاتا کوئی بات نہیں۔یہ بھی سہی۔بس وہ زندہ رہے اس کے زندہ رہنے کی زیادہ اہمیت ہے۔چاہے وہ ادھرمی بن کر جیئے۔راج پوت کہتا ہے، جان چلی جائے پر آن نہ جائے۔اور راج پوت ماں ہو تو کہتی ہے کہ آن بے شک چلی جائے، بچے کی جان نہ جائے۔

اس کی سوچ پتا نہیں کب بدل گئی۔اس کا ننھا سا بچہ ہندو بعد میں ہے۔سب سے پہلے بس وہ اس کا بچہ ہے۔یہ بنیادی بات ہے۔اس کی زندگی پر، اس کی زندگی کیلئے سب کچھ قربان کیا جا سکتا ہے۔

اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ ابھی حمیدہ کو بلاتی اور بچے کو اس کی گود میں دے کر کہتی کہ اسے پیٹ بھر کر دودھ پلا دے۔لیکن اس کے پاس یہ اختیار نہیں تھا۔فیصلہ بچے کے باپ کو کرنا تھا۔اور وہ جانتی تھی کہ وہ کیا فیصلہ کرے گا۔فیصلہ تو وہ بعد میں کرے گا۔پہلے تو وہ یہ سوچنے پر اس کی گردن اڑا دے گا۔وہ آن والا راج پوت ہے اور ماں نہیں ہے۔

ابتدا میں وہ خوف زدہ تھی۔اس میں ٹھاکر سے بات کرنے کی ہمت نہیں تھی۔پھر بچے کی چیخوں کی پے در پے زربوں نے اسے طاقت دے دی۔اس نے سوچا، نتیجہ کچھ بھی ہو، وہ صبح ٹھاکر سے بات ضرور کرے گی۔اگر ٹھاکر نہ مانا تو بچے کی جان بچانے کیلئے چپکے سے وہ سب کچھ کر گزرے گی، جو اسے کرنا چاہئے۔

دروازہ کھلنے کی آواز سن کر وہ چونکی اور دروازے کی سمت دیکھا۔ٹھاکر کمرے میں داخل ہوا۔اس نے نہ ٹھاکرانی کو دیکھا، نہ نمسکار کرتی ہوئی شانتا پر نظر ڈالی۔وہ سیدھا پنگھوڑے کی طرف گیا۔ٹھاکرانی نے شانتا کو آنکھ کا اشارہ کیا۔ شانتا کمرے سے چلی گئی۔

ٹھاکر نے ایک نظر روتے ہوئے بچے کو دیکھا۔پھر ٹھاکرانی کی طرف مڑا۔''میں اسے گود میں لے سکتا ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

ٹھاکرانی نے حیرت سے اسے دیکھا۔''ایسے کیوں کہہ رہے ہیں؟ آپ پتا ہیں اس کے''

ٹھاکر جھینپ سا گیا۔''اتنا چھوٹا سا ہے نا۔لگتا ہے، میری گود میں دب نہ جائے، کوئی نقصان نہ ہو جائے اسے۔ڈر لگتا ہے اس سے۔

''جی نہیں۔دیکھنے میں چھوٹا سہی۔پر راج پوت بچہ ہے۔'' ٹھاکرانی کے لہجے میں فخر تھا۔''اور باپ کی گود کی سختی سے بھی بچوں کو کوئی نقصان نہیں ہوتا۔''

''رنجو.....تم اسے میری گود میں دے دو ذرا''

ٹھاکرانی اٹھ کر اس طرف گئی۔اس نے بچے کو نزاکت سے اٹھا کر ٹھاکر کی گود میں دے دیا۔

ٹھاکر نے بچے کو غور سے دیکھا۔''کیا بات ہے ٹھاکر اوتار سنگھ جی۔کیوں روئے جا رہے ہیں آپ؟ کوئی ضد کر لی ہے کیا؟'' ٹھاکر نے بچے سے کہا۔

تو یہ ہے میرے بچے کا نام.....اوتار سنگھ! پیارا نام ہے۔ٹھاکرانی نے سوچا۔دل میں عجیب سی خوشی جاگی۔''ہاں ناتھ۔آپ کے ٹھاکر اوتار سنگھ ابھی دو دن کے ہوئے نہیں ہیں۔اور انہوں نے ضد بھی شروع کر دی ہے'' اس نے کہا۔

ٹھاکر نے حیرت سے اسے دیکھا۔وہ خود تو جنم کنڈلی کے حوالے سے بات کر رہا تھا۔مگر رنجو یہ بات کیوں کہہ رہی ہے۔اتنا سا بچہ ضد کیسے کر سکتا ہے۔یہ تو ان ہونی ہے۔

''کیسی ضد؟'' اس نے پوچھا۔

''بیٹھ کر سکون سے سنیں تو بتاؤں'' ٹھاکرانی بولی۔

----------X----------

جمال دین نے عادت کے مطابق چنگیر پیچھے ہٹائی اور بیوی کو پکارا۔''حمیدہ..... برتن اٹھا لو۔''

روز حمیدہ اس کی ایک آواز پر برتن سمیٹنے کیلئے آ جاتی تھی۔لیکن اس روز ایسا نہیں ہوا۔جمال دین چند لمحے خاموش بیٹھا رہا۔مگر کب تک؟ جھوٹے برتن پھیلے ہوئے اسے بہت برے لگتے تھے۔وہ انہیں برداشت کر ہی نہیں سکتا تھا۔پھر اسے چلم کی طلب بھی ہو رہی تھی۔جب تک دو کش نہ لے لیتا، اس کا ناشتہ مکمل ہی نہیں ہوتا تھا۔اس نے پھر آواز لگائی۔''حمیدہ، کہاں ہو۔یہ برتن اٹھا لو نا''

حمیدہ تو اب بھی نہیں آئی۔لیکن کمرے کی طرف سے اس کی آواز آئی۔''آتی ہوں جی، بھی آتی ہوں''

www.allurdu.com

''ایسا کیا کر رہی ہو اس وقت؟'' جمال دین کو حیرت ہوئی۔ برسوں کا بنا معمول آج پہلی بار ٹوٹا تھا۔

ایک لمحے جھجکتی سی خاموشی رہی۔ پھر حمیدہ نے پکارا۔ ''وصال کو ناشتہ کرا رہی ہوں جی۔ ابھی آتی ہوں''

اس جواب نے جمال دین کی الجھن دور نہیں کی۔ بلکہ اس کی الجھن اور حیرت اور بڑھا دی۔ حمیدہ بہت اچھی عورت اور بہت اچھی بیوی تھی۔ عقل مند، محبت کرنے والی اور خیال رکھنے والی۔ چھ سال بعد اللہ نے انہیں اولاد سے نوازا تھا۔ اتنے عرصے کے بعد اولاد ہو تو عورتیں ان کیلئے پاگل ہو جاتی ہیں۔ مگر حمیدہ ایسی نہیں تھی۔ اس کا اصول تھا کہ بچہ شوہر سے ہے، نہ کہ شوہر بچے سے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ ہر معاملے میں شوہر کو بچے پر فوقیت دیتی تھی۔ سب سے پہلے وہ بچے کو صاف ستھرا کرتی، اس کے کپڑے بدلا دیتی۔ یہ اس لئے کہ وہ خود ہاتھ منہ نہیں دھو سکتا تھا۔ پھر وہ خود ہاتھ منہ دھوتی اور ناشتہ بنانے لگتی۔ اس دوران وہ دونوں اٹھ جاتے تھے۔ وہ جمال دین کو ناشتہ دیتی، اس کیلئے چلم تیار کرتی۔ وہ ناشتے سے فارغ ہوتا تو وہ برتن سمیٹتی اور اس کے سامنے چلم لا کر رکھ دیتی۔ اس کے بعد وہ بچے کی طرف توجہ دیتی۔ کبھی ایسا ہوتا کہ جمال دین ناشتہ کر رہا ہے اور بچہ رونے لگا ہے۔ تو برتن سمیٹنے کے انتظار میں کھڑی حمیدہ لپک کر اندر جاتی اور بچے سے کہتی..... بے صبرا پن نہ کرو صال۔ ابھی تیرے ابا ناشتہ کر رہے ہیں۔ ان سے پہلے تجھے ناشتہ نہیں مل سکتا۔ چپ کر جا۔ اور وہ فوراً باہر آ جاتی۔ لیکن اس کے انگ انگ سے بے چینی اور اضطراب ٹپکتا۔ وہ ٹہل نہیں رہی ہوتی۔ بلکہ ساکت کھڑی ہوتی۔ لیکن اس کا جسم یوں پھڑکتا، جیسے وہ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر ٹہل رہی ہو۔ جمال دین کہتا..... ''جاؤ حمیدہ'' دودھ پلا دو وصال کو.....''

اور حمیدہ کہتی..... ''نا جی نا۔ آپ فارغ ہو جاؤ۔ پھر اسے ناشتہ ملے گا۔''

بچہ روتا رہتا اور جمال دین کا دل کٹنے لگتا۔ پلا دو نا۔ اتنا چھوٹا بچہ، معصوم ہے ابھی؟

''ابھی سے سکھانا پڑے گا۔ تبھی تو سمجھے گا کہ باپ بڑا ہوتا ہے۔ اللہ کی زمین پر اللہ کے بعد سب سے بڑے درجے والا،

جمال دین کو اپنی بیوی کی عقل پر فخر محسوس ہوتا۔ اسے یقین ہو جاتا کہ اس کے بیٹے کی تربیت بہت اچھی ہوگی۔ وہ سعادت مند اور فرماں بردار اٹھے گا۔ اندر بچہ روتا رہتا۔ باہر حمیدہ پہلو بدلتی، کسمساتی، لیکن اس کے قدم کبھی کمرے کی طرف نہ اٹھتے۔ جمال دین جلدی سے ناشتہ بھگتاتا۔ تاکہ حمیدہ فارغ ہو جائے۔ وہ چنگیر پرے ہٹا دیتا۔ حمیدہ برتن سمیٹتی، اسے چلم لا کر دیتی، پھر بے تابی سے کمرے کی طرف لپکتی۔ چند لمحے بعد کمرے کی طرف سے اس کی محبت میں لپٹی آواز سنائی دیتی۔ وہ دودھ پیتے ہوئے بچے کو ڈانٹ رہی ہوتی۔ ''وصال دین'' آپ بہت برے بچے ہو۔ اپنے ابا کو ٹھیک سے ناشتہ بھی نہیں کرنے دیتے۔ بے صبرے کہیں کے۔ اگلی بار ایسا کرو گے تو آپ کی پٹائی ہوگی۔ اور دودھ بھی نہیں ملے گا آپ کو۔

جمال دین نے حیرت سے سامنے پڑے برتنوں کو دیکھا۔ آج اتنے دنوں کے بعد ایسا کیا ہو گیا کہ حمیدہ اس کے ناشتہ کرنے کے دوران وصال کو دودھ پلانے لگی ہے۔ یہ تبدیلی کیسی؟ کیا مطلب ہے اس کا؟ ضرور کوئی بڑی بات اس کے پیچھے۔

اچانک جمال دین کو دھندلی دھندلی سی پچھلی رات یاد آنے لگی۔ دھندلی اس لئے کہ اس وقت وہ نیند میں تھا۔

اسی لمحے خجل خجل سی حمیدہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس نے خاموشی سے برتن سمیٹے۔ پھر وہ بولی تو اس کے لہجے میں شرمندگی تھی۔ ''معاف کر دینا جی۔ وہ وصال بھوکا ہو رہا تھا نا، اس لئے.....''

''میں نے تو اس کے رونے کی آواز نہیں سنی۔'' جمال دین بولا۔

''رونے سے پہلے بچوں کا پیٹ بھر دینا چاہئے''

''لیکن پہلے وہ روتا تھا، تب بھی تم اسے دودھ نہیں دیتی تھیں'' جمال دین نے اعتراض کیا۔

''غلطی کرتی تھی جی۔ اب نہیں کروں گی'' حمیدہ نے بڑے وثوق سے کہا۔ پھر وہ اس کیلئے چلم لے آئی۔ ''یہ لو جی''

جمال دین نے چلم سنبھالی اور ایک کش لیا۔ پھر کچھ سوچتے اور دھواں چھوڑتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ''وصال دین کیا کر رہا ہے حمیدہ؟''

''سو رہا ہے جی۔''

''تو ٹھیک ہے۔ تم یہاں بیٹھو تھوڑی دیر''

حمیدہ پلنگ کی پائینتی والی پٹی پر ٹک گئی۔ جمال دین نے دوسرا کش لیا اور پچھلی رات کو یاد کیا۔ دھندلی دھندلی سی یاد پھر تازہ ہونے لگی۔ اس نے ایک اور کش لیا اور بولا۔ تم رات کو ٹھیک سے نہیں سوئی تھیں حمیدہ''

حمیدہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''سوئی تو تھی۔ بس ذرا بے چینی سی تھی۔''

''تم بار بار اٹھ کیوں رہی تھیں؟''

''دودھ پلانے کیلئے''

جمال دین کی یاد کا دھندلا پن ذرا کم ہوا۔ ہاں واقعی..... حمیدہ بار بار بچے پر جھک رہی تھی۔ تو وہ دودھ پلانے کیلئے تھا..... مگر بار بار؟ اس کی الجھن اور گہری ہو گئی۔

''بچے کو اتنی بار دودھ تو نہیں پلاتے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر مجھے بے چینی ہو رہی تھی۔ دور ہی نہیں ہوتی تھی کس طرح۔''

''بے چینی! کس بات کی؟''

''مجھے لگتا تھا کہ میرا بچہ مجھ سے ناراض ہے۔ بہت بھوکا ہے اور رو رہا ہے''

جمال دین کو ایک اور دھندلی سی بات یاد آئی۔ حمیدہ رات بچے سے کہہ رہی تھی..... وصال دین، میرے بچے، مجھ سے کبھی ناراض نہ ہونا۔ دودھ سے منہ نہ موڑنا کبھی۔

''لیکن حمیدہ، وصال رو تو نہیں رہا تھا۔ بھوکا تو نہیں تھا''

''وہ تو نہیں تھا جی۔ مگر مجھے تو ایسا ہی لگ رہا تھا نا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ بچہ بھوک سے تڑپے اور دودھ نہ پیے تو ماں کیسے سو سکتی ہے''

''مگر جب ایسا نہیں تھا تو پھر؟ تم پگلی ہو حمیدہ''

جمال دین چلم ٹھنڈی کر کے اٹھا۔ اسے زمین پر جانا تھا۔ اس کے جانے کے بعد حمیدہ بیٹھی سوچتی رہی۔ چھوٹے ٹھاکر کی صورت اس کی نگاہوں میں پھر رہی تھی۔ کیسے وہ اس سے دودھ مانگ رہے تھے۔ کیسے چھو رہے تھے اسے کیسی عجیب بات ہے۔ مجھی سے کیوں..... اپنی ماں سے کیوں نہیں۔ اور اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ اس لمحے میں، میں جیسے سچ مچ ان کی ماں بن گئی اور وہ میری اولاد بن گئے۔ تبھی تو رات بھر بے چینی رہی۔

.....X.....

اور چھوٹے ٹھاکر نے اسے چھونے کے بعد شہد بھی نہیں لیا تھا۔ تو اب کیا ہوگا؟ کیا وہ بھوکے ہوں گے؟ رات بھر بھوکے رہے ہوں گے؟ مگر نہیں..... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ننھی سی جان اتنا تو برداشت نہیں کر سکتی۔ چھوٹا سا بچہ اتنی ضد نہیں کر سکتا۔ مگر اس کی بے چینی اسے کچھ اور ہی بتا رہی تھی۔

اور یہ کیسا تعلق تھا۔ ایک اجنبی نوزائیدہ بچہ اس کی گود میں آیا..... ننھا بے زبان بچہ..... اور اس سے دودھ مانگنے لگا اور وہ یوں تڑپ گئی، جیسے سچ مچ اس کی ماں ہو۔ جب کہ یہ بے حد خطرناک تعلق تھا۔ کہاں ٹھاکر، گاؤں کا مالک، اور کہاں وہ، ان کی رعایا۔ یہ تو ان کی مہربانی تھی کہ انہوں نے زیر کاشت زمین ان کے نام کر دی تھی۔ اور پھر سب سے بڑا فرق تو مذہب کا تھا۔ لیکن تعلق جڑتا ہے تو یہ سب سوچنے کی مہلت کہاں ملتی ہے۔

وصال جاگا تو وہ اس کے پاس گئی۔ اس کی ضرورتیں پوری کیں۔ پھر اسے گھر میں چلنے کے لئے چھوڑ دیا۔ ابھی وہ گھٹنوں چل رہا تھا۔ کھڑا ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ مگر ابھی اس کے چلنے میں کچھ دیر تھی۔

وہ ٹہلتی اور سوچتی رہی کہ حویلی میں کیا ہو رہا ہوگا۔ ٹھاکرانی نے اسے وہاں آنے سے منع کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر بچے نے دودھ نہ پیا تو اسے بلوا لیا جائے گا۔ اور بلوائے نہ جانے کا مطلب یہی ہوگا کہ بچے نے دودھ پی لیا ہے۔

جمال دین گھر واپس آیا تو حمیدہ کو احساس ہوا کہ بہت دیر ہو گئی ہے۔ اسے احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ دھوپ چڑھ آئی ہے۔ اس نے ابھی تک کھانے کی فکر بھی نہیں کی تھی۔ اس نے خود تو ناشتہ بھی نہیں کیا تھا۔ بھوک ہی نہیں تھی۔ اسے تو بس چھوٹے ٹھاکر کی بھوک کا خیال ستا رہا تھا۔

وہ باورچی خانے میں گئی۔ تھالی میں دال اور چاول نکالے اور انہیں چننے بیٹھ گئی۔ دوپہر ہونے کو آئی تھی اور حویلی سے اس کا بلاوا نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا..... اپنی مایوسی نے اسے خود بھی حیران کر دیا۔ اسے احساس ہوا کہ اب زندگی کی سب سے بڑی خوشی اس کے لئے چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلانا ہے۔

بہ ظاہر وہ مایوس تھی۔ لیکن شاید اندر اسے کچھ اور یقین تھا۔ وہ دال چاول چنتے چنتے اٹھ کر دروازے پر جاتی کہ کہیں بلاوا تو نہیں آ گیا۔ ہر بار وہ تھکے قدموں سے باورچی خانے میں واپس آ جاتی۔ آخر اس نے دال چاول پکنے کے لئے چڑھا دیئے۔

جمال دین کو اس کا بار بار دروازے پر جانا غیر معمولی لگا۔ اس نے پوچھا۔ ''حمیدہ، کوئی آنے والا ہے کیا؟''۔

''نہیں جی۔ پر صبح سویرے منڈیر پر کاگا بولا تھا''۔

تھوڑی دیر بعد جمال دین نے پکارا۔ ''حمیدہ، وصال گندا ہو رہا ہے۔ اسے صاف کر دو''۔

حمیدہ نے بچے کو دھلایا۔ کپڑے بدلوائے اور پھر باورچی خانے میں چلی گئی۔ کھانا تیار ہو گیا تھا۔ ''سنیں جی، کھانا تیار ہے''۔ اس نے پکارا۔

''تھوڑی دیر بعد کھاؤں گا''۔

اسی لمحے دروازے پر کھٹکا ہوا۔ جمال دین باہر گیا۔ حمیدہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا

www.allurdu.com

وہ جلدی سے کمرے میں گئی اور کپڑے تبدیل کرنے لگی۔ کپڑے تبدیل کر کے وہ باہر آئی تو جمال دین اندر آ رہا تھا۔ ''تمہیں ٹھاکرانی نے بلایا ہے حمیدہ''۔ اس نے کہا۔

''آپ کھانا کھالینا جی۔ اور بچے کا خیال رکھنا۔ میں تھوڑی دیر میں آجاؤں گی''۔ اس نے باہر نکلتے ہوئے کہا۔

.....X.....

ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے بڑے تحمل سے پوری روداد سنی۔ پھر وہ بولا تو اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔ ''تمہارا مطلب ہے، ہمارا بچہ حمیدہ کا دودھ پینا چاہتا ہے؟''۔

''ہاں ناتھ۔ حمیدہ کی گود میں جانے کے بعد سے اس نے شہد بھی نہیں لیا ہے۔ رو رو کر بے حال ہو گیا ہے''۔

ٹھاکر کے ماتھے پر ناگواری کی سلوٹیں ابھر آئیں۔ ''ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ٹھاکرانی''۔ اس نے سخت لہجے میں کہا۔

ٹھاکرانی کا دل لرزنے لگا۔ وہ ٹھاکر کا مزاج پہچانتی تھی۔ اس کا اکیلے میں ٹھاکرانی کہہ کر پکارنا اس بات کی دلیل تھا کہ اس وقت وہ غصے میں ہے۔ اس نے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔ ''ناتھ'' یہ بات آپ سے بڑھ کر میرے لئے تکلیف دہ ہے۔ آپ جس وجہ سے غصہ کر رہے ہیں، وہ میرے پاس بھی ہے۔ اور میرے پاس غصے کی وہ وجہ بھی ہے جو آپ کے پاس نہیں''۔

ٹھاکر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

''دیکھیں، میں اوتار سنگھ کی ماں ہوں۔ بھگوان نے مجھے دودھ بھی دیا ہے اور یہ میرا ارمان بھی ہے لیکن چھوٹا وہ دودھ نہیں پی رہا ہے۔ کچھ اور مانگ رہا ہے۔ یہ میری بے عزتی ہے..... میری مامتا کی بے عزتی۔ مجھے اس کا دکھ بھی ہے اور سوچ کر غصہ بھی آتا ہے پر.....''۔

''پوری بات کرو''۔

''رات گزر گئی، چھوٹے کے پیٹ میں کچھ بھی نہیں گیا۔ ننھا بچہ ہے۔ ایسے تو نہیں چلے گا؟''۔

ٹھاکر نے اس بات پر غور کیا۔ بچے کا چہرہ وہ دیکھ چکا تھا۔ اب پہلی بار اس نے بیوی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ بہت کم زور اور نڈھال لگ رہی تھی۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے تھے۔ ظاہر ہے، وہ رات بھر نہ صرف جاگی تھی بلکہ پریشان بھی رہی تھی چناں چہ اس نے لہجہ نرم رکھتے ہوئے کہا ''سنو رنجو، تم جلد بازی میں فیصلہ کر رہی ہو۔ ممکن ہے، تمہارے دودھ میں کڑواہٹ ہو جو بعد میں دور ہو جائے۔ ایسے میں بچہ جس کی گود میں بھی جائے گا اس سے دودھ تو مانگے گا نا اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ صرف حمیدہ کا دودھ چاہتا ہے''۔

ٹھاکرانی کو ٹھاکر کی بات معقول لگی۔ ''پھر آپ کیا بولتے ہیں؟''۔

''دیکھو، بغیر بتائے اسے دوسری عورتوں کی گود میں دیکر دیکھو۔ ہم اسے کسی راج پوت عورت سے دودھ پلوا سکتے ہیں۔ اس میں کوئی حرج نہیں۔ دوسرے میں ابھی جا کر شہر سے ڈاکٹر کو لاتا ہوں۔ یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں کہ حل نہ ہو سکے''۔

ٹھاکرانی کی ڈھارس بندھی۔ ''کچھ بھی ہو۔ میرے بچے کو کچھ نہیں ہونا چاہئے''۔

''بائیس سال بعد یہ پھول کھلا ہے۔ میں اسے مرجھانے تو نہیں دوں گا''۔

ٹھاکر شہر چلا گیا۔ اسی دوران ٹھاکرانی نے تمام تجربے کر لئے۔ دائی راجو کی بنائی ہوئی دوا وہ پہلے ہی لے چکی تھی۔ بچے کو بچوں والی بیسیوں عورتوں کی گود میں دیکر دیکھ لیا گیا۔ مگر اس نے کسی سے دودھ نہیں مانگا۔ وہ بس روئے جا رہا تھا روتے روتے نڈھال ہو جاتا تو اس کی آواز بند ہو جاتی۔ اس دوران اس نے بس ایک بار ذرا سا شہد چاٹا تھا۔ ورنہ وہ بھوکا ہی تھا۔

ٹھاکر شہر سے آیا تو اس کے ساتھ ایک لیڈی ڈاکٹر تھی۔ ڈاکٹر جولیا نے بچے کا معائنہ کیا اور بولی۔ ''یہ بہت کم زور ہو گیا ہے بھوک سے۔ آپ ایسا کریں کہ اسے بکری کا دودھ دیں۔ نہ لے تو گائے اور بھینس کا دودھ آزمائیں..... لیکن پانی ملا کر، آدھا دودھ آدھا پانی اور اس دوران میں ٹھاکرانی کا دودھ لے جا کر لیبارٹری میں ٹیسٹ کراؤں گی۔ آپ میرے ساتھ چلئے گا یہ تخاطب ٹھاکر سے تھا۔

ٹھاکر ڈاکٹر کے ساتھ چلا گیا ادھر بچہ ہر ترکیب کو ناکام بنانے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے کسی دودھ کو بھی منہ نہیں لگایا۔ ہر بوتل کو پرے کر دیا اور جب تک اس میں رونے کی طاقت ہوتی تھی، وہ روتا رہتا تھا۔ ٹھاکرانی نے ایک نوکر کو شہر دوڑایا تا کہ وہ ٹھاکر کو صورت حال بتا سکے۔

آخر دوپہر کے قریب ٹھاکرانی نے حمیدہ کو بلوا لیا۔ اس کی آمد سے پہلے ٹھاکرانی نے حیلے بہانے سے سب لوگوں کو کمرے سے ہٹا دیا تھا۔

حمیدہ کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے چہرے سے، جسم کی ہر حرکت سے، ہر عضو سے ہیجان جھلک رہا تھا۔ اس نے ٹھاکرانی کو سلام کیا اور توقعات سے چھلکتے لہجے میں بولی۔ ''کیا حکم ہے ٹھاکرانی جی؟''۔

''کل رات سے اب تک میرے بچے کے پیٹ میں کچھ نہیں گیا ہے حمیدہ''۔ ٹھاکرانی نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔ اس پر اسے خود بھی حیرت ہوئی۔ وہ بڑے ضبط، بڑے رکھ رکھاؤ والی عورت تھی لیکن حمیدہ کو دیکھتے ہی وہ ایسی دکھیاری بن گئی جسے دنیا میں اپنا واحد غم گسار مل گیا ہو، جسے وہ اپنا ہر دکھڑا سنا سکتی ہے ورنہ اب تک اس نے اپنی سگی بہن سے بھی ایسے ٹوٹے لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ ''رو رو کر نڈھال ہو گیا ہے میرا بچہ۔ اب تو رونے جتنی جان بھی نہیں ہے اس میں''۔

حمیدہ کے دل میں پھول سے کھل اٹھے۔ اسے یاد تھا کہ گزشتہ رات ٹھاکرانی نے کتنی بے رخی سے اسے دودھ پلانے سے روکا تھا مگر کوئی بات نہیں۔ اب اس کی تلافی ہونے والی تھی۔ اب ٹھاکرانی خود ہی اسے دودھ پلانے کو کہے گی اسکی خودداری کا سر اونچا رہے گا۔

''تو اپنے خدا سے دعا کر میرے بچے کیلئے''۔ ٹھاکرانی نے کہا۔

حمیدہ کو مایوسی ہوئی۔ ''چھوٹے ٹھاکر کیلئے میری جان بھی حاضر ہے ٹھاکرانی جی''۔

''بس تو دعا کر''۔ ٹھاکرانی کا لہجہ پھر خشک سا ہو گیا۔ موہوم سی بے رخی سے بھرپور۔

اب حمیدہ ضبط نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے خودداری کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ ''میں دودھ پلا دوں چھوٹے ٹھاکر کو؟''۔

''نہیں حمیدہ۔ بس تو اسے گود میں لے لے میرے سامنے''۔

مایوسی اپنی جگہ تھی مگر حمیدہ بچے کو دیکھنے کے لئے تیزی سے پنگھوڑے کی طرف بڑھی۔ اسے دیکھا تو کلیجے میں ہوک سی اٹھی۔ دل کٹنے لگا۔ ننھا ٹھاکر رو رہا تھا۔ مگر آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اس کی کھلی ہوئی آنکھوں سے نقاہت جھلک رہی تھی ''مالکن، یہ تو رو رہے ہیں۔ پر آواز نہیں نکل رہی ہے'' اس نے ٹھاکرانی کو بتایا۔

''روتے روتے گلا بیٹھ گیا ہے۔ ٹھاکرانی نے دل گرفتگی سے کہا۔ ''ہائے رام، کیا کروں؟''۔

حمیدہ نے بچے کو گود میں لے لیا اور ٹھاکرانی کے پاس چلی آئی۔ ٹھاکرانی بچے کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ حمیدہ کی گود میں آتے ہی وہ بے تابی سے اس کی چھاتیوں پر ہاتھ مار رہا تھا۔ اس کا ننھا سا دہن بار بار یوں کھلتا تھا، جیسے پانی سے نکلی ہوئی مچھلی ہو اور کل کے مقابلے میں آج اس کے ہاتھوں کی بے تابی بہت نمایاں اور رلا دینے والی تھی۔ ٹھاکرانی کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے جلدی سے منہ پھیر کر آنکھیں پونچھ لیں۔ حمیدہ کو اس کا خیال ہی نہیں تھا۔ وہ تو ننھے ٹھاکر میں گم تھی۔ وہ بچے کو والہانہ انداز سے تک رہی تھی۔

www.allurdu.com

.....X.....

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

اس کی نظروں کو دیکھ کر ٹھاکرانی متضاد جذبوں میں گھر گئی۔ حمیدہ کی مامتا بھری نگاہ نے اسے حسد اور رقابت میں مبتلا کر دیا۔ وہ کون ہوتی ہے اس کے بچے کو اس طرح دیکھنے والی۔ پھر اسے حمیدہ پر پیار آنے لگا۔ کوئی کسی دوسرے کے بچے کو اتنی چاہت سے بھی دیکھ سکتا ہے۔ حمیدہ کا انداز ایسا تھا کہ اس کا بس چلے تو خود کو بچے پر قربان کر دے۔

مدعا پورا نہ ہوا تو بچے کے ہاتھوں کی بے تابی وحشت میں تبدیل ہونے لگی۔ ادھر حمیدہ کے جسم کی اینٹھن بھی واضح ہو گئی تھی۔

پھر حمیدہ کا ضبط جواب دے گیا۔ ''مجھ پر رحم کریں مالکن۔ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔ میں مر جاؤں گی'' وہ گڑگڑائی۔

''برداشت تو مجھ سے بھی نہیں ہوتا حمیدہ۔ پر یہ ہو نہیں سکتا''۔ ٹھاکرانی نے کم زور لہجے میں کہا۔ ٹھاکر کا ڈر نہ ہوتا تو وہ ابھی بچے کو دودھ پلوا دیتی۔

''تو پھر آپ ہی کوشش کریں ٹھاکرانی جی''۔ حمیدہ کے ہاتھ بری طرح لرز رہے تھے۔

''تو بچے کو میرے پاس لٹا دے''۔ ٹھاکرانی نے کہا۔ وہ حمیدہ کے سامنے اپنی مامتا کی توہین کرانا نہیں چاہتی تھی۔

حمیدہ نے کانپتے ہاتھوں سے بچے کو ٹھاکرانی کے پہلو میں لٹا دیا۔ بچے کو پھر آواز مل گئی۔ حمیدہ کی آغوش سے جدا ہوتے ہی وہ پھر رونے لگا۔ مگر آواز کم زور تھی۔

''ٹھاکرانی جی، مجھے چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلانے دیں..... خدا کے لئے''۔ حمیدہ پھر گڑگڑائی۔

''دیکھ حمیدہ۔ تو ماں ہے۔ جانتی ہے کہ ماں کیا ہوتی ہے''۔ ٹھاکرانی نے بکھرتے لہجے کو ہم وار کرنے کی کوشش کی ''اور میں تو وہ ماں ہوں، جسے بائیس برس بعد بچہ ملا ہے۔ تیرا دودھ پلوانا تو بہت چھوٹی بات ہے اس کے لئے تو میں اپنے ہاتھوں سے اپنے شریر کے ٹکڑے کر سکتی ہوں۔ پر پتی کی بات ماننا میرا دھرم ہے''۔

حمیدہ اب رو رہی تھی۔

''میں ٹھاکر جی کو سمجھانے کی کوشش کروں گی۔ وہ مان گئے تو تجھے بلوا لوں گی''۔ ٹھاکرانی صرف اسے نہیں، خود کو بھی دلاسہ دے رہی تھی۔ ''پر ایسا ہو بھی تو یاد رکھنا، کسی کو بھی پتا نہ چلے۔ بس اب تو جا''۔

حمیدہ کا دل نہیں مانتا تھا۔ مگر اب وہ رک نہیں سکتی تھی۔ دروازے تک دس قدم کے فاصلے میں اس نے دس بار، روتے ہوئے چھوٹے ٹھاکر کو پلٹ کر دیکھا تھا۔ مگر ٹھاکرانی نے منہ پھیر لیا تھا۔ کمرے سے نکل کر اس نے جلدی جلدی آنکھیں پونچھیں اور آگے بڑھ گئی۔

کمرے میں ٹھاکرانی نے بچے کو پھر دودھ پلانے کی کوشش کی۔ لیکن بچہ اور زیادہ رونے لگا۔ ٹھاکرانی بے بسی سے اپنی انگلیاں چباتی رہی۔

.....X.....

ٹھاکر پرتاپ سنگھ شہر میں تھا۔ رامو کے ذریعے اسے اطلاع مل چکی تھی کہ ننھے ٹھاکر نے کسی کا دودھ بھی قبول نہیں کیا ہے۔ اس نے اس سلسلے میں ڈاکٹر جولیا سے بات بھی کی۔

''میرا خیال ہے، بچہ ضد کر رہا ہے''۔ ڈاکٹر نے رائے دی۔ ''کوئی طبی وجہ تو نظر نہیں آتی۔ دودھ کی رپورٹ آ جائے تو بات واضح ہو جائے گی''۔

''اس صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہئے؟''۔

''اس کی ضد کا پتا چلائیں اور اسے پورا کریں''۔ ڈاکٹر جولیا کے لہجے میں الجھن تھی۔ ''مگر اتنے چھوٹے بچے ضد نہیں کرتے''۔

ٹھاکر جانتا تھا کہ بچہ ضد کر رہا ہے۔ لیکن وہ ڈاکٹر کو نہیں بتا سکتا تھا۔ ''کوئی اور صورت نہیں ہو سکتی''۔ اس نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اتنے چھوٹے بچے کو ڈرپ بھی نہیں لگائی جا سکتی''۔

''کیوں؟''۔

''بچہ روئے گا۔ ہاتھ پاؤں چلائے گا تو الٹا لینے کے دینے پڑ جائیں گے اور پھر غذا کا کوئی بدل نہیں۔ آپ صرف یہ کر سکتے ہیں کہ زبردستی چمچے سے اسے دودھ دیں''۔

ذرا دیر میں دودھ کی رپورٹ بھی آ گئی۔ رپورٹ کے مطابق دودھ میں کوئی خرابی نہیں تھی۔ ''میں نے کہا تھا نا'' ڈاکٹر نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ ''دیکھیں مسٹر ٹھاکر، بچے کی کنڈیشن میں دیکھ چکی ہوں۔ اتنا سا بچہ اور پھر غذا نہ لینا اور رونا۔ یہ تو دہرا نقصان ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہا تو اس کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے''۔

ٹھاکر کے تو ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ ''ڈاکٹر، آپ میرے ساتھ چل نہیں سکتیں؟''۔

''چل تو سکتی ہوں۔ لیکن فائدہ کچھ نہیں۔ بچے کو کوئی بیماری نہیں۔ وہ پوری طرح صحت مند ہے۔ میں کوئی مدد نہیں کر سکوں گی۔ بس آپ زبردستی اسے دودھ اور گلوکوز پلانے کی کوشش کریں اور کوئی صورت نہیں''۔

ٹھاکر گاؤں کی طرف جاتے ہوئے مایوس تھا!

.....X.....

شام ہو چکی تھی۔ ڈاکٹر کے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن بچہ الٹی کر کے سب کچھ نکال دیتا تھا۔ اس کا رونے کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ بس گھنٹے دو گھنٹے میں وہ ذرا سا شہد قبول کر لیتا تھا۔

پھر ایک تجربہ کار عورت نے ایک ترکیب بتائی۔ ''بچے کا منہ کھول کر زبردستی چمچے سے دودھ اس کے منہ میں ڈالو۔ پھر اس کے کھلے منہ میں پھونک مارو۔ دودھ اس کے حلق سے اتر جائے گا''۔

اس ترکیب سے ابتدا میں فائدہ ہوا۔ دو چمچے دودھ ننھے ٹھاکر کے حلق سے اتر گیا۔ مگر پھر اسے پھندا لگ گیا اس پھندے نے اسے اور نڈھال کر دیا۔ اب اس پر ایسی نقاہت طاری تھی کہ ان سے دیکھا نہیں جاتا تھا۔ اب وہ رونے سے بھی گیا۔ اس میں ہاتھ پاؤں مارنے کی سکت بھی نہیں رہی۔

www.alhurdu.com

ایک خرابی اور تھی۔ وہ رات سے اب تک جاگتا رہا تھا۔ جب کہ اتنے چھوٹے بچے زیادہ وقت سوتے ہیں۔

رات ہونے کو تھی۔ ٹھاکر کمرے میں موجود تھا۔ بچہ ٹھاکرانی کے پہلو میں بے سدھ لیٹا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ لیکن ان میں دھندلاہٹ نظر آرہی تھی۔ اب اس میں کسی طرح کی سکت نہیں تھی۔ کمرے میں ٹھاکر، ٹھاکرانی اور بچے کے سوا کوئی نہیں تھا۔

ٹھاکر نے اسے ایک نظر دیکھا اور اس کے بعد ٹھاکرانی سے نظریں چرانے لگا۔ ''بائیس سال بعد بھگوان نے ہم پر دیا کی ہے ناتھ''۔ ٹھاکرانی نے کہا۔ ''پھر ایسا کیوں ہے کہ آپ کو اس سے محبت نہیں ہے''۔

ٹھاکر کو ان لفظوں نے تڑپا دیا۔ ''راج پوتوں کی محبت کا کب کسی کو پتا چلتا ہے رنجو''۔ اس نے شاکی لہجے میں کہا۔

''یہ محبت ہے کہ آپ کا بچہ بھوک سے مرجائے۔ آپ کے پاس دولت ہو، دنیا کی ہر چیز ہو اور آپ اسے دودھ بھی نہ دے سکیں''۔

ٹھاکر کو غصہ آ گیا۔ ''ہوش میں رہو ٹھاکرانی۔ تم کس سے بات کر رہی ہو''۔ اس نے پرجلال لہجے میں کہا۔ ''اور تمہیں احساس بھی نہیں کہ تم غلط بات کر رہی ہو۔ سب کچھ موجود ہے۔ ہر طرح کا دودھ میسر ہے۔ بچہ دودھ نہیں پی رہا ہے تو اس میں میرا کیا دوش۔ اور یہ بیماری بھی نہیں۔ ورنہ میں اپنی جاگیر لٹا کر بھی اس کا علاج کراتا''

''دودھ میسر ہے۔ بچہ پینا بھی چاہتا ہے''۔ ٹھاکرانی کی رگوں میں راج پوتی خون دوڑ رہا تھا۔ ''لیکن آپ اجازت نہیں دے رہے ہیں۔ سچ سننے اور برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کیجئے ناتھ''۔

''تمہارا مطلب ہے کہ میں اپنے بچے کو اس حمیدہ کا دودھ پینے دوں!''۔ ٹھاکر کا لہجہ زہریلا تھا۔

''آپ کا بچہ یہی چاہتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ اس کی پہلی ضد ہے''۔

''یہ ضد پوری نہیں کی جاسکتی۔ دودھ خون ہوتا ہے۔ پاگل عورت اور تم خوب جانتی ہو کہ یہ دھرم کی بات بھی ہے''۔

''معصوم بچہ یہ سب کچھ نہیں جانتا۔ وہ ضد کر رہا ہے۔ وہ اپنی ضد نہیں چھوڑے گا۔ آپ ہی کا بچہ ہے وہ..... راج پوت بچہ۔ میں اس پر حیران ہوں کہ آپ اتنے چھوٹے سے بچے سے ضد کر رہے ہیں۔ کیسے پتا ہیں آپ''۔

''راج پوت بچہ!''۔ ٹھاکر نے غصے سے کہا۔ ''جمال دین کی بیوی کا دودھ پینے کے بعد وہ راج پوت بچہ نہیں رہے گا۔ خون میں ملاوٹ ہو جائے گی..... اور وہ بھی دوسرے دھرم کی۔ پھر تو وہ ہمارا بچہ بھی نہیں رہے گا۔ حمیدہ کا ہو جائے گا''۔

ٹھاکرانی کو بھی طیش آ گیا۔ ''آپ کیسی بات کرتے ہیں۔ اس طرح تو بکری کا دودھ پینے سے وہ منش ہی نہیں رہے گا۔ کیا بکری کا بچہ ہو جائے گا وہ؟ ایسا ہے تو اسے بکری کا دودھ پلانے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں، اس طرح تو وہ بکری اس کی ماں ہو جائے گی''۔

ٹھاکرانی کی دلیل ایسی تھی کہ ٹھاکر کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ مگر معاملہ سنگین تھا۔ اس نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا ''دیکھو رنجو، جانور اور منش میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ منش کے دودھ میں تاثیر ہوتی ہے۔ جانور کے دودھ میں نہیں۔ جس عورت کا دودھ پیئے گا بچہ، اسی کی فطرت اختیار کریگا۔ اسکی عادتیں، اس کے طور طریقے، اس کا رنگ ڈھنگ اپنائے گا''۔

''بچے کا جیون زیادہ ضروری ہے یا ان باتوں کا دھیان رکھنا؟''۔ ٹھاکرانی نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''جیون تو بھگوان کی دین ہے، وہ جانے''۔ ٹھاکر نے ہٹیلے پن سے کہا۔ ''ہمیں تو انہی باتوں کا دھیان رکھنا ہے''۔

''تو اس کیلئے ہر مندر، ہر استھان پر جا کر پرا تھنا کیوں کی تھی؟''

''پرکھوں کی آن، پرکھوں کا مان ختم کرنے کیلئے نہیں کی تھی''۔

''چاہے نسل ختم ہو جائے''۔ ٹھاکرانی نے تڑ کی کہا۔

ٹھاکر لاجواب ہو گیا اور اس کے نتیجے میں جھنجلا گیا۔ ''کچھ بھی ہو ٹھاکرانی یہ نہیں ہو سکتا''۔ یہ کہہ کر وہ پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے چلا گیا

ٹھاکرانی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پھر وہ بچے پر جھک گئی۔ اس نے بچے کو دودھ پلانے کی کوشش کی۔ لیکن بچے کی نقاہت اپنی جگہ، منہ پھیرنے کی طاقت اس میں اب بھی موجود تھی۔ ''ضد چھوڑ دو میرے لال۔ برسوں کے بعد جنم جلی ماں کے بھاگ جاگے ہیں تو تم اسے دکھ دے رہے ہو''۔

ٹھاکرانی اس وقت بچے کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ بچے کی آنکھوں میں واضح طور پر ایک پل کیلئے ایک تاثر سا چمکا۔ وہ اسے کوئی مفہوم نہ پہنا سکی اور اگلے ہی لمحے بچے کی آنکھوں میں نقاہت کے سوا کچھ نہیں رہا۔

ٹھاکرانی منہ چھپا کر رونے لگی۔

.....X.....

ٹھاکر اپنے کمرے میں اکیلا تھا۔ یہ اس کی خواب گاہ تھی۔ آدھی رات ہو چکی تھی۔ کئی گھنٹوں سے وہ اس کمرے میں بیٹھا تھا۔ کبھی وہ اٹھتا اور ٹہلنے لگتا، کبھی بیٹھ جاتا اور کبھی لیٹ جاتا۔ وہ بہت پریشان اور مضطرب تھا۔ اس کے دل و دماغ میں ایسی کشمکش برپا تھی، جس کا اس نے پہلے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

اس کمرے میں اس کا اتنی جلدی آنا ایک نئی بات تھی۔ یہاں وہ صرف سونے کیلئے آتا تھا۔ آتا، لیٹتا اور سو جاتا۔ کبھی ٹھاکرانی اس کی سیوا کے لئے آ جاتی۔ اس کے سر میں تیل لگاتی، سر تھپکتی۔ ٹانگیں اور جسم دباتی اور جب وہ سو جاتا تو کمرے سے چلی جاتی۔

یہ کمرا ٹھاکر کی ذاتی ملکیت تھا..... خاص ملکیت۔ اس کے بلائے بغیر یہاں ٹھاکرانی کے سوا کوئی نہیں آ سکتا تھا۔ کسی کو بلانا ہوتا تو وہ بٹن دبا کر گھنٹی بجاتا۔ لیکن ایسا کم ہی ہوتا تھا جاگیر کے معاملات وہ اس کمرے سے باہر ہی نمٹاتا تھا وہ عام طور پر اپنے سارے کام، معاملات اور مشاغل سے نمٹ کر رات گئے ہی یہاں آتا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ سرِ شام ہی یہاں آ گیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ بہت پریشان تھا اور اسے تنہائی کی ضرورت تھی۔

ٹھاکر کی کشمکش بہت بڑی تھی۔ وہ اپنے پرکھوں کے ورثے کا امین تھا بے شمار روایات تھیں۔ بہت بڑی جاگیر تھی۔ پرجا تھی۔ ٹھاکروں کی آن بان تھی۔

جب وہ ادھیر عمری کی سرحد میں داخل ہو گیا اور وارث نہ ملا تو اسے دنیا کے سب سے بڑے خوف نے گھیر لیا۔ کیا اس کی نسل اسی پر ختم ہو جائے گی؟ اس کے خاتمے کے ساتھ ہی اس کا، اس کی نسل کا، اس کے پرکھوں کا نام و نشان مٹ جائے گا؟ یہ جاگیر مالک سے محروم ہو کر مزارعوں میں بٹ جائے گی؟ رشتے دار تو بہت تھے لیکن اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر بھگوان نے اسے اولاد نہیں دی تو یہی ہوگا کہ وہ ساری کی ساری زمینیں مزارعوں میں تقسیم کر دیگا۔ جاگیردار رشتے داروں کی جاگیر بڑھانے کا فائدہ؟ یوں کم از کم مزارعے ہی اسے یاد رکھیں گے۔ اس کا نام تو لیتے رہیں گے۔

شادی کے تین سال بعد سے اسے الجھن شروع ہو گئی تھی۔ پہلی بار اسے پتہ چلا کہ جینے کی خواہش کے بعد انسان کے اندر سب سے توانا خواہش اولاد کی ہوتی ہے۔ شاید اس لئے کہ اولاد کے ذریعے وہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔ بہر حال اس خواہش میں وہ بے چین رہنے لگا۔ ادھر ٹھاکرانی بھی اپنے عورت پن کی تکمیل کیلئے تڑپ رہی تھی۔

اس کے بعد طلب اور خوف کے انیس سال ایسے گزرے کہ جس نے جہاں کا بتایا کہ وہاں من کی مراد ملتی ہے، وہ اور ٹھاکرانی وہاں گئے۔ کوئی مندر، کوئی استھان، حتیٰ کہ کوئی مزار نہیں چھوڑا انہوں نے۔ لیکن مراد پوری نہیں ہوئی۔

www.allurdu.com

یہاں تک کہ ان دونوں نے ایک ہی رات، ایک ہی خواب دیکھ لیا اور خوش خبری دینے والے اس خواب میں حوالہ کسی بڑے استھان کا نہیں، برگد کے اس درخت کا تھا، جہاں انہوں نے چڑھاوا چڑھایا تھا۔ منت مانی تھی۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ کو احساس تھا کہ بھگوان نے اسے ایک غیر معمولی بچہ دیا ہے۔ شروع ہی سے واقعات اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ پہلی بات تو یہی تھی کہ جہاں انہوں نے اولاد کے لئے منت مانی تھی۔ وہ درخت ہی جل گیا تھا اور اس درخت کے جلنے کے بعد ہی بچہ ٹھاکرانی کے پیٹ میں آیا تھا اور اس سے پہلے اس نے اور ٹھاکرانی نے بہ یک وقت خوش خبری والا وہ خواب دیکھا تھا۔ اس خواب میں خوش خبری کے ساتھ انہیں ہدایات بھی دی گئی تھیں۔ ان ہدایات کا خلاصہ یہ تھا کہ بچے کی پرورش کرنا اور اس سے محبت کرنا ان کا کام ہے لیکن اس کی تعلیم و تربیت میں انہیں دخل نہیں دینا ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف نہیں کرنا ہے۔ پھر زور دے کر کہا گیا تھا کہ بچے کے ساتھ کسی بھی معاملے میں زبردستی نہ کی جائے۔

اب ٹھاکر ان ہدایات پر غور کر رہا تھا۔ بچے کی پرورش اور اس سے محبت کرنے کی ہدایت! لیکن کیوں؟ یہ دونوں کام تو ہر بچے کے ماں باپ کرتے ہیں۔ کون ہے جو اپنے بچے کی پرورش نہیں کرتا۔ کون ہے جو اپنے بچے سے محبت نہیں کرتا اور پھر وہ لوگ جو بائیس برس سے اولاد کے لئے ترس رہے ہیں۔ ان کی محبت کی تو کوئی حد ہی نہیں ہوگی۔ وہ تو اور کچھ کر ہی نہیں سکتے محبت کے سوا۔ پھر یہ ہدایت کیوں..... یہ تاکید کیوں؟ کوئی نکتہ ہے اس میں۔ بہت غور کرنے پر تعلیم یافتہ ٹھاکر کی سمجھ میں بس اتنا آیا کہ شاید یہ کوئی پیش گوئی ہے۔ پیش گوئی کہ یہ بچہ شاید ایسا ہو کہ ماں باپ کی پرورش سے گھبرا جائیں۔ بائیس برس بعد ملنے والی اولاد ایسی ہو کہ ان کے لئے اس سے محبت کرنا ممکن نہ رہے۔ اسی صورت میں انہیں اس بات کی تاکید کی جا سکتی ہے۔ مگر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ خود سے اس سے محبت، نہ کر پائیں۔ بلکہ تاکید کی وجہ سے محبت کریں۔

ٹھاکر نے خود کو ٹٹولا۔ ایک دن کے بیٹے پر اسے ایسی محبت آئی تھی کہ بیٹا اس محبت کے عملی اظہار کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اور بچے کے لئے ٹھاکرانی کی محبت تو اس کے انگ انگ سے بول رہی تھی۔ وہ تو برستی محسوس ہو رہی تھی۔

پھر تعلیم و تربیت کے سلسلے میں ہدایت! اس کا تو ابھی وقت ہی نہیں آیا تھا اور آخری بات خواب کی یہ تھی کہ بچے کے ساتھ زبردستی نہ کی جائے..... کسی بھی..... کسی بھی معاملے میں۔ تو بچہ ابھی اس قابل ہی کہاں تھا کہ اس سے زبردستی کی جاتی۔ یہ سوچتے ہوئے ٹھاکر کو اچانک خیال آیا کہ معاملہ تو الٹ ہے۔ یہاں تو بچہ خود ان کے ساتھ زبردستی کر رہا تھا۔ اس نے تو ایک اعتبار سے مرن برت رکھ لیا تھا۔ لفظ مرن برت ذہن میں گونجا تو ٹھاکر تھرا کر رہ گیا۔ بھگوان نہ کرے مگر ڈاکٹر نے بھی یہی تو کہا ہے کہ بچے کی زندگی خطرے میں پڑ سکتی ہے اور یہ سب کچھ کیوں؟ اس لئے کہ بچہ ہر دودھ کو، بچوں کے کھانے کی ہر چیز کو ٹھکرا رہا تھا..... منہ موڑ رہا تھا اس سے اور وہ مانگ کیا رہا تھا؟ ایک مسلمان عورت کا دودھ! دودھ جو خون ہوتا ہے۔ زندگی بن کر رگوں میں دوڑتا ہے۔ وہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ یہ کیسے گوارا کر سکتا تھا کہ اپنی نسلوں کے بخشے ہوئے خالص اور پوتر خون میں ملاوٹ قبول کر لے۔ یہ تو ممکن ہی نہیں تھا۔ لیکن اتنا ننھا سا بچہ اتنے نازک معاملے میں زبردستی کر رہا تھا۔

تو اب..... کسی بھی معاملے میں زبردستی نہ کی جائے..... کا مطلب یہ ہے کہ بچے کی ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے جائیں؟ بچے کی زبردستی کے سامنے سر جھکا دیا جائے؟ اور پرکھوں کی آتماؤں کو ہمیشہ کے لئے دکھ میں مبتلا کر دیا جائے؟ اپنی آن..... اپنے خالص اور پوتر خون کا غرور خاک میں ملا دیا جائے؟ نہیں..... نہیں..... یہ تو ممکن ہی نہیں۔

پھر اسے مجذوب کی باتیں یاد آئیں۔ مجذوب نے کہا تھا..... وہ تجھے ملا، یہ رب کا احسان ہے تجھ پر۔ تیری سمجھ میں اس کی باتیں نہیں آئیں گی۔ بحث نہ کرنا۔ سختی نہ کرنا اس پر۔ اس کو کسی بات سے مت روکنا۔ اس کی بات مان لیا کرنا۔ اس کا دل میلا نہ ہونے دینا۔ اس کا بن کر رہنا۔ تیرا ہی بھلا ہے اس میں۔

اب ٹھاکر ان باتوں پر غور کر رہا تھا۔ اتنے چھوٹے سے بچے سے نہ بحث کی جا سکتی ہے، نہ اس پر سختی کی جا سکتی ہے۔ مگر وہ ننھا نا سمجھ وہ مانگ رہا تھا، جو اسے نہیں دیا جا سکتا تھا اور وہ چیز بھی کوئی معمولی چیز نہیں، جیون دھارا تھی وہ۔ جس کے بغیر جیا ہی نہیں جا سکتا۔ اب یہ کیسے مان لیا جائے۔ ٹھاکر کی سمجھ میں یہ نکتہ نہیں آیا کہ بچے کو اس کی مرضی کا دودھ نہ دینا سختی ہی ہے اس کیلئے۔ یہ وہ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔

اور پھر ٹھاکر کو آج صبح کی بات یاد آئی..... پنڈت روپ سہائے کی بات! پنڈت نے جو آگے کی باتیں کی تھیں، وہ تو کہانی لگتی تھی۔ پر اس نے یہ بھی کہا تھا کہ چھوٹے ٹھاکر اپنا بھاگیہ آپ لکھیں گے جو چاہیں گے، لکھیں گے..... اور وہی کچھ ہوگا۔ بھگوان نے بڑی شکتی دی ہے انہیں۔

یہ سب باتیں پریشان کرنے والی تھیں۔ بچے کی زندگی خطرے میں تھی۔ اس بچے کی جو ٹھاکر کی زندگی کی اکلوتی کمائی تھا۔ ایسے میں اسے مجذوب کی ایک بات یاد آئی تو اس کی ڈھارس بندھی۔ مجذوب نے کہا تھا چراغ جس نے روشن کیا ہے، اس کی حفاظت بھی وہی کرے گا۔ لیکن تو اس کے سامنے ہوا کیلئے آڑ بن کر کھڑا ہوگا تو تیرا ہی بھلا ہوگا۔ چراغ کو تو روشن ہی رہنا ہے۔ اسے کوئی نہیں بجھا سکتا

ٹھاکر کے ذہن میں ایک ہی جملہ گونجتا رہا..... چراغ کو تو روشن ہی رہنا ہے۔ باقی سب کچھ مٹ گیا۔ اس کا مطلب ہے کہ بچے کو کچھ نہیں ہوگا۔ بس پھر ٹھیک ہے۔ اور کیا چاہئے مجھے۔

اس جملے نے ٹھاکر کی پریشانی دور کی اور اسے تھپک تھپک کر سلا دیا۔ پھر اچانک ہی وہ خواب شروع ہو گیا۔ مگر اس بار بشارت دینے والے کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں اور آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ ''کیوں رے ناشکرے''۔ اس نے گرج کر کہا۔ ''آ گیا نا اپنی اوقات پر..... احسان فراموش''۔

ٹھاکر سہم گیا۔ اس نے ہاتھ جوڑ لئے۔ ''مجھ سے کیا بھول ہو گئی مہاراج''۔

''اکڑ کو بھول کہتا ہے۔ بچے کی جان پر بن گئی اور تو کہتا ہے کہ کیا بھول ہو گئی''۔

''میں کیا کروں مہاراج؟''۔

''دودھ پلوا بچے کو''۔

''وہ پیتا ہی نہیں''۔

''جو مانگتا ہے، وہ دے اسے''۔

''یہ نہیں ہو سکتا مہاراج''۔ ٹھاکر ہاتھ جوڑ کر گھگھیایا۔ ''ٹھاکروں کے خون میں ملاوٹ کیسے کروں۔ پرکھوں کو کیا منہ دکھاؤں گا''۔

''اس وقت تیری ٹھاکری کہاں تھی، جب تو بچے کیلئے بے جان اور حقیر چیزوں کے سامنے ماتھا ٹیکتا تھا۔ منتیں مانتا تھا''۔ بزرگ نے تند لہجے میں کہا۔ ''وہ مل گیا تو تیری ٹھاکری جاگ اٹھی۔ احسان بھول گیا۔ کیا اب اسے مارنا چاہتا ہے''۔

ٹھاکر مسکرایا۔ ''میں جانتا ہوں مہاراج۔ وہ جئے گا۔ بھگوان اسے مرنے نہیں دے گا''۔ اس نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

''اوہ..... تو یہ اکڑ بھی ہے''۔ بزرگ نے پرجلال لہجے میں کہا۔ ''تو ٹھیک کہتا ہے وہ جئے گا۔ لیکن تیرا نہیں رہے گا''۔

ٹھاکر لرز کر رہ گیا۔ ''کیا مطلب مہاراج؟''۔

''جیسے اس کا کمرا بدلا جا سکتا ہے، ویسے ہی گھر بھی بدلا جا سکتا ہے''۔

ٹھاکر گنگ ہو کر رہ گیا۔ یہ بات وہ کیسے بھول سکتا تھا۔

''اور ایک بات سن۔ تجھے بچہ برگد کے اس پیڑ نے نہیں دیا تھا، جہاں تو نے منت مانی تھی''۔

ٹھاکر خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

''تجھے خوش خبری ملنے سے پہلے ہی وہ تو جل گیا تھا نا''۔

ٹھاکر کو یاد تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''جو اپنی زندگی کے لئے خود محتاج ہے، وہ کسی کو کچھ دے سکتا ہے۔ تجھے یہ بیٹا اس نے دیا ٹھاکر، جو سب کا مالک ہے۔ جو نہ سوتا ہے، نہ اونگھتا ہے۔ موت اس کے حکم کی محتاج ہے، سب اسکے محتاج ہیں۔ یہ بچہ اس کی دین ہے۔ زندگی اس کے حکم سے ہے۔ وہ جو چاہتا ہے، وہی ہوتا ہے۔ تیرے بچے کے معاملے میں اسی کا فیصلہ چلے گا۔ جیسے کمرا بدلا تھا، گھر بھی بدل سکتا ہے۔ تیرے بچے کو اس کا من پسند دودھ پلوانے کیلئے لے جایا بھی جا سکتا ہے۔ کون روکے گا ٹھاکر اسے؟ تو روک سکتا ہے۔ زندگی تو جاری رہے گی۔ ماں باپ بدل جائیں گے۔ یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں''۔

''تجھ پر احسان کیا گیا تو احسان مان، تجھے امان دی گئی تو اس کی قدر کر۔ اس کے سوا سب کچھ بھول جا۔ زندگی سنور جائے گی''۔

''ٹھیک ہے مہاراج۔ میں ایسا ہی کروں گا''۔

''اور خود سے سمجھنے کی عادت ڈال۔ کیا ہمیں ہی زحمت دیتا رہے گا؟''۔

''نہیں مہاراج۔ اب ایسا نہیں ہوگا''۔

اور ٹھاکر کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ چند منٹ وہ اس خواب پر غور کرتا رہا اور پھر وہ ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ سچی بات تو یہی تھی کہ بچے کی زندگی سب سے اہم تھی۔ وہ اسے کیسے کھونے دیتا۔ اس کی زندگی بچانے کے لئے تو وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ وہ واقعی ناقدری کر رہا تھا، خوامخواہ بچے کو اتنی تکلیف دی اس نے۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا؟

.....X.....

ٹھاکرانی رو رہی تھی۔ اسے ٹھاکر کے آنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ وہ مایوس تھی۔ ٹھاکر فیصلہ کر چکا تھا اور اب اس سے ہٹنے والا نہیں تھا۔ اور ٹھاکرانی جانتی تھی کہ بچہ اب زیادہ دیر بھوک نہیں جھیل سکے گا۔ ایک ہی امید تھی..... اور وہ یہ کہ بچہ ضد چھوڑ دے..... اور یہ نہ ہوتا تو..... اس کے بعد کی بات ٹھاکرانی سوچ ہی نہیں سکتی تھی وہ بس رو سکتی تھی۔

ٹھاکر کمرے میں آیا تو وہ حیران ہوئی۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ شانتا ایک کونے میں بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ ٹھاکر کے قدموں کی چاپ سن کر اس نے آنکھیں کھولیں اور گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''پرنام مالک''۔ اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

ٹھاکر نے بچے کو دیکھا جو ٹھاکرانی کے پہلو میں لیٹا تھا۔ پھر اس نے نرم لہجے میں کہا۔ ''شانتا، جا..... تو جا کر سو جا آرام سے''۔

شانتا نے یوں دیکھا، جیسے اس کی سمجھ میں بات نہیں آئی ہو۔

''اب تیری ضرورت صبح کے وقت پڑے گی۔ رات کی تیری چھٹی''۔

شانتا کمرے سے چلی گئی تو ٹھاکر نے ٹھاکرانی سے وضاحت کی۔ ''اس کے سامنے بات نہیں کی جا سکتی تھی''۔

ٹھاکرانی نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ مگر سچ یہ ہے کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

ٹھاکر چند لمحے کھڑا بچے کو غور سے دیکھتا رہا۔ بچے کے چہرے سے نقاہت عیاں تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ٹھاکر نے بڑی محبت سے اسے پکارا۔ ''چھوٹے ٹھاکر، کیا بات ہے۔ آپ ایسے کیوں ہو گئے؟ ٹھاکر لوگ ایسے ہمت نہیں ہارتے''۔

یہ کہنا غضب ہو گیا۔ بچے نے آنکھیں کھولیں۔ اور اگلے ہی لمحے چنگھاڑ چنگھاڑ کر رونے لگا۔ یہ گویا باپ کی بات کا جواب تھا۔ ٹھاکر بچے نے نہ ہمت ہاری تھی اور نہ ہی اپنی ضد چھوڑی تھی۔

ٹھاکر کو حیرت ہوئی۔ بچے کی آنکھوں سے جھلکنے والی نقاہت بہت خوف ناک تھی۔ اور اس نقاہت میں وہ اپنی پوری طاقت سے رو رہا تھا۔ ٹھاکر کو خوف آنے لگا۔ کہیں بچے کو کچھ ہو نہ جائے۔ اس نے بچے کو گود میں اٹھا کر چمکارا۔ ''نا چھوٹے ٹھاکر، نا۔ آپ کو رونے کی ضرورت نہیں''۔

روتا ہوا بچہ ایک دم چپ ہو گیا۔

''میں نادان تھا چھوٹے ٹھاکر''۔ پرتاپ سنگھ اب خود کلامی کے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ''مجھے سب کچھ بتا دیا گیا۔ لیکن میں سمجھا کچھ نہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ آپ سے ضد نہیں کرنی، بس آپ کی ماننی ہے۔ میں نے سوچا، آپ اتنے چھوٹے ہیں۔ ضد نہیں کر سکتے۔ مجھے بتایا گیا کہ آپ اپنا بھاگیہ خود لکھیں گے۔ میں نے سوچا، اس وقت نا، جب لکھنا سیکھیں گے۔ میں نادان تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ آپ نے اپنا بھاگیہ آپ لکھنا شروع کر دیا ہے۔ اب میری سمجھ میں آ رہا ہے آپ فکر نہ کریں۔ جو آپ مانگیں گے وہ ملے گا آپ کو۔ اب روئیے گا نہیں''۔

www.allurdu.com

ٹھاکرانی یہ سب کچھ سن اور دیکھ رہی تھی۔اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔مگر آخری بات اس کی سمجھ میں خوب آ گئی۔''تو ٹھاکر جی، کیا حمیدہ.....؟''۔

''ہاں رنجو۔میں ابھی حمیدہ کو لینے جا رہا ہوں''۔

''آپ؟''ٹھاکرانی کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں رنجو۔میں خود جاؤں گا''۔

''شانتا کو بھیج دیں۔کسی نوکر کو بھیج دیں''۔

''نہیں رنجو۔غرض میری ہے۔میں خود جاؤں گا۔جب کسی سے کچھ مانگنا ہو.....اور وہ بھی جیون جیسی چیز،تو بھکاری بن کر مانگنا چاہئے۔بادشاہ بن کر نہیں۔

میرا بس چلتا تو میں چھوٹے کو لے کر حمیدہ کے دروازے پر جاتا۔''وہ کہتے کہتے رکا اور چند لمحے سوچ کر بولا۔''لیکن رنجو،ایک بات یاد رکھنا۔یہ بات سب سے چھپانی ہے۔سب سے۔کسی کو پتا نہ چلے کہ چھوٹا حمیدہ کا دودھ پیتا ہے۔یہ تمہاری ذمے داری ہے۔یہ بات نہ ہوتی تو چھوٹا خود جا کر حمیدہ سے دودھ مانگتا۔''

''آپ فکر نہ کریں ناتھ''ٹھاکرانی نے سکون کی سانس لی۔

''میں چلتا ہوں''ٹھاکر نے کہا۔پھر اس نے جھک کر بچے کی پیشانی چوم لی۔''اب رونا مت چھوٹے''اس نے کہا۔''میں تمہاری من پسند چیز لینے جا رہا ہوں۔''

ٹھاکر حویلی سے نکلا تو رات کے دس بجنے والے تھے۔گاؤں میں یہ وقت آدھی رات کے برابر تھا۔

ننھا وصال دودھ پی کر سو چکا تھا۔حمیدہ اور جمال دین سونے کیلئے لیٹ چکے تھے۔لیکن نیند حمیدہ کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔وہ بہت بے چین تھی۔سینے میں جیسے لاوا سا دہک رہا تھا۔سکون صرف ایک ہی صورت میں مل سکتا تھا۔اور وہ یہ کہ وہ دھماکے سے پھٹ جاتی اور اندر کھولنے والا لاوا باہر نکل آتا۔وہ کروٹیں بدلتی رہی۔عجیب سی اذیت سے دوچار تھی وہ۔دودھ پلانے کی ایسی طلب اسے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی کہ دودھ پلا کر بھی اسے چین نہیں آتا تھا

تھوڑی دیر بعد بستر پر لیٹنا بھی اس کیلئے اذیت ناک ہو گیا۔لیکن وہ اٹھ بھی نہیں سکتی تھی۔وہ نہیں چاہتی تھی کہ جمال دین کی آنکھ کھلے اور اس کی نیند خراب ہو مگر جب یہ اذیت اس کیلئے ناقابل برداشت ہو گئی تو وہ بستر سے اٹھ گئی۔ویسے بھی اس کا اندازہ تھا کہ جمال دین اب تک سو چکا ہو گا۔

وہ کمرے سے نکلی اور گھر کے صحن میں آ گئی۔

ادھر جمال دین کو نیند تو آ رہی تھی۔لیکن پلنگ پر زلزلہ سا آیا ہوا ہو تو آدمی کیسے سو سکتا ہے۔حمیدہ بے چین تھی اور کروٹ پر کروٹ بدل رہی تھی۔جمال دین کی نیند گہری ہونے سے پہلے ہی اچٹ جاتی تھی۔آخر میں اس کی نیند بالکل ہی اڑ گئی۔وہ حمیدہ کے بارے میں سوچنے لگا۔

ضرور کوئی خاص بات تھی۔ورنہ حمیدہ تو بے سدھ ہو کر سونے والی تھی۔جس کروٹ سے سوتی،جاگتی بھی اسی کروٹ سے تھی،اور یہ تبدیلی گزشتہ رات سے آئی تھی۔کل رات بھی وہ بے چین تھی۔بار بار اٹھ کر وصال دین کو دودھ پلاتی تھی۔پھر دن میں بھی اس کا حال عجیب رہا تھا۔کئی غیر معمولی باتیں ہوئی تھیں دن میں۔اور لگتا تھا کہ حمیدہ کو کسی کا انتظار ہے۔پھر جب حویلی سے بلاوا آیا تھا تو دستک ہوتے ہی اس نے کپڑے بدلے تھے اور تیار ہو گئی تھی،جیسے وہ اس دستک ہی کی منتظر ہو اور وہ کیسی بے قرار ہو کر حویلی جانے کیلئے نکلی تھی۔

یہ سب یاد کر کے جمال دین کے دل میں ہول اٹھنے لگا۔دماغ میں اندیشے سرسرانے لگے۔کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں.....کل رات حویلی سے واپسی پر ہی حمیدہ بے چین ہوئی تھی۔وہاں کوئی بات.....

اسی لمحے حمیدہ بڑی آہستگی سے بستر سے اٹھی اور صحن کی طرف چل دی۔

جمال دین کا دل عجیب انداز میں دھڑکا۔اب وہ شک کی آگ میں جل رہا تھا۔یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیا ہونے والا ہے؟ وہ بھی بستر سے اٹھا اور دبے پاؤں صحن کی طرف چل دیا۔کمرے کے دروازے کی چوکھٹ پر وہ ٹھٹھک گیا۔

اس کا خیال تھا کہ حمیدہ دروازہ کھول کر گھر سے باہر گئی ہو گی۔لیکن وہ صحن میں ہی تھی۔

وہ پورے چاند کی رات تھی۔صحن چاندنی میں نہایا ہوا تھا۔سب کچھ بہت صاف دکھائی دے رہا تھا۔اس کھیت کرتی چاندنی میں جمال دین نے حمیدہ کو دیکھا اور دہل کر رہ گیا۔وہ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر یوں تیز قدموں سے ٹہل رہی تھی،جیسے اس کے پیروں کے نیچے انگارے بچھے ہوں۔اس کے چہرے پر ایسی وحشت تھی کہ جمال دین نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سینے کو نوچ رہی تھی۔

حمیدہ کی اس کیفیت نے جمال دین کو اور ہراساں کر دیا۔''حمیدہ.....او حمیدہ''اس نے سرگوشی میں پکارا۔

اس کی آواز سنتے ہی حمیدہ بت بن گئی۔اس کے قدم جہاں تھے،وہیں رک گئے۔ہاتھ سینے پر جمے رہے۔اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔جمال دین وہاں ہیولا سا نظر آ رہا تھا۔''آپ کیوں اٹھ گئے ہو جی''اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

جمال دین نے قدم بڑھایا اور صحن میں آ گیا۔''بات کیا ہے حمیدہ؟ کل سے تمہارا یہی حال ہے۔''

''کوئی بات نہیں جی۔بس نیند نہیں آ رہی ہے۔''

''بات تو ہے۔کل رات تم حویلی سے آئی ہو تو اسی حال میں ہو''اب کے جمال دین کا لہجہ سخت تھا۔

حویلی کے حوالے پر حمیدہ کا چہرہ فق ہو گیا۔''کک.....کچھ.....کچھ بھی تو نہیں۔''وہ ہکلائی۔

جمال دین کا دل بیٹھنے لگا۔''حمیدہ.....کوئی روگ تو نہیں لگا لائی تو؟''اس کے لہجے میں اندیشوں کی سرسراہٹ تھی۔

حمیدہ کو جھٹکا سا لگا۔جیسے کسی نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا ہو۔اس نے شکایتی نظروں سے شوہر کو دیکھا۔''آپ میرے بارے میں ایسا بھی سوچ سکتے ہو جی!''

''تو تیری حالت دیکھ کر اور کیا سوچوں''

''روگ تو لگا ہے جی۔پر عزت کا،آبرو کا نہیں،ایسا ہونے سے پہلے تو میں مر جاؤں''

حمیدہ کے لہجے کی سچائی نے جمال دین کے دل کو چھو لیا۔اس کا لہجہ نرم ہو گیا۔''تو پھر کیسا روگ لگا ہے ری''

''یہ مامتا کا روگ ہے وصال کے ابا''

یہ جواب جمال دین کیلئے اور معما تھا۔وہ جھنجلا گیا۔''صاف بات کر حمیدہ''

''اتنا کافی نہیں کہ بات تمہاری عزت اور میری آبرو کی نہیں؟''

''نہیں۔تو مجھے سب کچھ بتا دے۔''

حمیدہ چند لمحے سوچتی رہی۔پھر نظریں جھکا کر بولی۔''پر کسی کو بتانا نہیں''

حمیدہ بولتی رہی۔جمال دین سنتا رہا۔اس کا دل خوف سے بھرتا جا رہا تھا۔سب کچھ سننے کے بعد اس نے کہا۔''تو آگ سے کھیل رہی ہے حمیدہ۔دیکھ یہ دین دھرم کے گورکھ دھندے ہیں۔ان میں خود کو الجھانا ٹھیک نہیں۔''

''میں بھی جانتی ہوں۔پر کیا کروں۔میں مجبور ہوں۔''

''یہ خیال دل سے نکال دے۔یہ تیرا حق بھی نہیں ہے۔''

''میں یہی چاہتی ہوں۔مگر مجبور ہوں۔خود پر زور بھی تو نہیں چلتا۔''حمیدہ کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''کیسے نہیں چلتا۔تجھے خود کو سنبھالنا ہو گا۔میں کوئی مجبوری نہیں جانتا۔پھر یہ تو سوچ کہ ٹھاکر جی کے کتنے احسان ہیں ہم پر''

''تم کیسے سمجھو گے۔مرد ہو نا۔تمہیں کیا معلوم۔دودھ کا ابال کیا ہوتا ہے۔مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔''

''میں صرف یہ جانتا ہوں کہ ٹھاکر جی کو پتا چل گیا تو وہ ہمیں تباہ کر دیں گے''

www.allurdu.com

''میں نہیں جانتی کہ میں ایسی بے بس کیوں ہوگئی ہوں.....''

یہ وہ لمحہ تھا کہ جمال دین کا ہاتھ اٹھنے والا تھا۔مگر اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔وہ بے وقت کی دستک تھی۔جمال دین گھبرا گیا۔اس کا اٹھا ہوا ہاتھ جیسے پتھر کا بن گیا۔

دستک دوبارہ ہوئی تو وہ چونکا۔''تو اندر جا حمیدہ، میں دیکھتا ہوں۔اتنی رات کو کسی کا آنا خیر تو نہیں''

حمیدہ کمرے میں چلی گئی۔جمال دین دروازے کی طرف بڑھا۔اس نے کنڈی کھولی۔مگر دروازہ کھلتے ہی وہ حیران رہ گیا۔ایک بار پھر وہ بت بن کر رہ گیا.....

.....X.....

گاؤں میں سناٹا تھا۔ادھر ادھر گھومنے والے آوارہ کتوں کے سوا کہیں کوئی ذی روح نظر نہیں آرہا تھا۔یہ بھی اچھا تھا کہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کو جمال دین کے دروازے پر جاتے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ اس وقت متضاد جذبوں کا اسیر تھا۔اس نے زندگی میں کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا تھا۔کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی کچھ مانگنے کی اسی لئے پہلی بار جب اولاد کیلئے منت ماننے وہ مندر گیا تو اسے عجیب سا لگا۔اسے حیرت بھی ہوئی کہ اس سے پہلے اس نے کبھی بھگوان سے بھی کچھ نہیں مانگا تھا۔وہ راج پوت تھا اور اس کے پاس دو طرح کی طاقت تھی۔ایک دولت کی، جس کے زور پر کچھ بھی خریدا جاسکتا تھا۔اور دوسری طاقت اپنے بازوؤں کی تھی۔لیکن ان دونوں کے استعمال کی بھی اسے کبھی ضرورت نہیں پڑی تھی۔طبعاً وہ نیک اور شریف النفس تھا۔اس نے کبھی ایسی کوئی خواہش ہی نہیں کی۔وہ تو ہمیشہ دوسروں کو دیتا ہی رہا تھا۔

تو جب پہلی بار مندر میں اس نے بھگوان (مورتی) کے سامنے ماتھا ٹیک کر اولاد کیلئے پرارتھنا کی تو وہ اپنے اندر بہت شرمندہ ہوا۔شرمندگی اس بات کی بھی تھی کہ وہ کچھ مانگ رہا ہے اور اس بات کی بھی کہ اس سے پہلے اس نے بھگوان سے کسی بھی طرح کا تعلق رکھا ہی نہیں تھا۔اس نے کبھی پوجا بھی نہیں کی تھی۔اور اس وقت اپنی غرض سے اس کے سامنے سر جھکائے ہوئے بھی اس کے دل میں کوئی جذبہ نہیں تھا عبودیت کا احساس تک نہیں تھا اسے۔

پہلی بار اسے پتا چلا کہ منش کے پاس کتنی ہی طاقت ہو، وہ بہر حال غرض مند ہوتا ہے اور اس پر بے بسی طاری ہوتی ہے۔اگلے اٹھارہ برسوں کون سی ایسی چوکھٹ تھی، جہاں اس نے سر نہ جھکایا ہو۔اس نے سادھوؤں کے پیر چھوئے۔درختوں کے سامنے ماتھا ٹیکا۔اولاد کی طلب نے اسے بھکاری بنا دیا۔کبھی کبھی راج پوت کی انا کے زخم سے ٹیسیں اٹھتیں تو وہ سوچتا.....کوئی بات نہیں۔بھگوان کے سامنے ہی تو ہاتھ پھیلائے ہیں نا، جس سے راجے مہاراجے بھی بھیک مانگتے ہیں۔یہی ایک مقام تو ہے، جہاں پر منش جھکنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

وہ بھکاری بن کر پھرتا رہا۔آخر اسے بیٹا مل گیا۔اور اب وہ بیٹا اس سے ایک ایسی چیز مانگ رہا تھا، جو اس کے اور اس کی پتنی کے پاس نہیں تھی۔وہ چیز بھگوان کے پاس بھی نہیں تھی۔ہاں.....ایک منش کے پاس تھی۔سو اس کیلئے اب اسے ایک منش کے سامنے ہاتھ پھیلانا تھا۔اور منش بھی وہ جس کا دھرم ہی دوسرا تھا۔''وہ اس کا مزارتھا، جسے اس نے زمین بخش دی تھی۔وہ منش آج تک اس کا احسان مانتا تھا۔مگر آج کے بعد صورتحال الٹ جائے گی۔اب وہ چور اس کا احسان مانے گا.....مانتا رہے گا.....جیون بھر!

یہ سوچتے ہوئے ٹھاکر کا جی چاہا کہ پلٹ جائے۔مگر کم وقت میں اتنا کچھ ہو چکا تھا، اس نے اتنا کچھ دیکھ لیا تھا کہ مشکل باتیں بھی اس کی سمجھ میں آنے لگی تھیں.....بھگوان کی باتیں! اور وہ اتنی مشکل سے ہاتھ آنے والے بیٹے کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔یہ سچ سہی کہ جس نے چراغ جلایا ہے، وہ اسے بجھنے نہیں دے گا۔لیکن وہ اسے ناقدرا سمجھ کر اسے اس سے چھین لے اور کسی قدرداں کو دے دے تو.....؟ کون روک سکتا ہے اسے؟ پھر اس کی حویلی میں تو اندھیرا ہوگا، اور چراغ کسی اور کے گھر کو روشن کر دے گا۔نہیں.....یہ تو وہ گوارا نہیں کر سکتا۔اتنے برسوں کے بعد تو کہیں پردے میں روشنی ہوئی ہے.....

اور یہ کتنی عجیب بات تھی کہ اس کے گاؤں میں وہی ایک مسلمان پریوار تھا۔وہ خود اس پریوار کو دور کے گاؤں سے، ان پر مہربانی کر کے، انہیں بچا کے یہاں لایا تھا.....اس دن کیلئے! یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔مگر بھگوان تو جانتا تھا۔یہ تو وہ اب سمجھ رہا تھا کہ اس وقت اس نے ان پر نہیں، خود پر احسان کیا تھا۔وہ جانتا تھا کہ وہ اس کا احسان مانتے ہیں۔اس کیلئے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔شاید اگر وہ جمال دین سے جان بھی مانگ لے تو وہ انکار نہ کرے۔لیکن وہ.....ٹھاکر پرتاب سنگھ مانگنے والا تو نہیں تھا۔یہ الگ بات کہ مانگنے پر مجبور ہو گیا تھا۔چھوٹے نے.....اس کے چھوٹے ٹھاکر نے اپنے دودھ کے لئے اسی گھر کی عورت کو پسند کیا تھا۔

تو اب وہ ان کے سامنے جھولی پھیلائے گا.....ان سے بھیک مانگے گا!

یہ سوچ کر اس کے قدم پھر ٹھٹھکے۔یہ ضروری تو نہیں کہ وہ خود جا کر سوال کرے، ضرورت کی جھولی پھیلائے۔وہ ٹھاکرانی سے کہہ کر حمیدہ کو حویلی میں بلوا بھی سکتا ہے۔کیوں نہیں۔وہ یہاں کا مالک ہے۔ٹھاکرانی نے بھی تو یہی کہا تھا۔لیکن اس نے خود ہی تو منع کر دیا تھا۔مانگنا ہے تو آدمی مانگنے والوں کی طرح مانگے۔مانگنے کے بھی آداب ہوا کرتے ہیں۔

پھر ایک اور بات بھی تھی۔اس طرح دوسروں کو شبہ ہو سکتا ہے۔اور سب سے بڑی بات یہ کہ منہ چھپانا بزدلی ہے جو راج پوتوں کے شایان شان نہیں اور وہ بازار میں ملنے والی کوئی عام چیز تو نہیں مانگ رہا ہے۔ورنہ وہ اس چیز کو خرید ہی نہ لیتا۔اس عورت حمیدہ کا اپنا ایک بچہ ہے، جس کا اس کے دودھ پر حق ہے۔اور اس کا پتی ہے، جس کی اجازت کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتی۔اس سے اجازت لینا بھی ضروری ہے۔اور پھر اس کا صلہ دینا بھی ضروری ہے۔

ٹھاکروں کی گڑھی کے ٹھاکر پرتاپ سنگھ کو احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ مانگنے کے آداب خود بہ خود سیکھ رہا ہے۔

ٹھاکر چونک کر رکا۔وہ منزل پر پہنچ چکا تھا۔سامنے جمال دین کے گھر کا دروازہ تھا۔ایک بار پھر اس کی راج پوتی آن نے اسے اکسایا کہ وہ پلٹ جائے۔لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔وہ ایک قدم آگے بڑھا اور کنڈی ہلا دی.....''

.....X.....

اتنی رات کو ٹھاکر کو اپنے دروازے پر کھڑا دیکھ کر جمال دین کے اوسان خطا ہو گئے۔ابھی تو حمیدہ نے دھماکہ کیا تھا۔وہ سمجھا کہ ٹھاکر کو سب کچھ معلوم ہو گیا ہے۔''ٹھاکر جی، آپ.....؟ اور اس وقت؟'' اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔پھر اس نے خود ہی اندازہ لگایا ''ضرور ت تو ہے۔

www.aiurdu.com

حویلی کے حوالے پر حمیدہ کا چہرہ فق ہوگیا۔ ''کک..... کچھ..... کچھ بھی تو نہیں۔'' وہ ہکلائی۔

جمال دین کا دل بیٹھنے لگا۔ ''حمیدہ..... کوئی روگ تو نہیں لگا لائی تو؟'' اس کے لہجے میں اندیشوں کی سرسراہٹ تھی۔

حمیدہ کو جھٹکا سا لگا۔ جیسے کسی نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا ہو۔ اس نے شکایتی نظروں سے شوہر کو دیکھا۔ ''آپ میرے بارے میں ایسا بھی سوچ سکتے ہو جی!''

''تو تیری حالت دیکھ کر اور کیا سوچوں''

''روگ تو لگا ہے جی۔ پر عزت کا، آبرو کا نہیں، ایسا ہونے سے پہلے تو میں مر جاؤں''

حمیدہ کے لہجے کی سچائی نے جمال دین کے دل کو چھو لیا۔ اس کا لہجہ نرم ہوگیا۔ ''تو پھر کیسا روگ لگا ہے ری''

''یہ مامتا کا روگ ہے وصال کے ابا''

یہ جواب جمال دین کیلئے اور معما تھا۔ وہ جھنجلا گیا۔ ''صاف بات کر حمیدہ''

''اتنا کافی نہیں کہ بات تمہاری عزت اور میری آبرو کی نہیں؟''

''نہیں۔ تو مجھے سب کچھ بتا دے۔''

حمیدہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر نظریں جھکا کر بولی۔ ''پر کسی کو بتانا نہیں''

حمیدہ بولتی رہی۔ جمال دین سنتا رہا۔ اس کا دل خوف سے بھرتا جا رہا تھا۔ سب کچھ سننے کے بعد اس نے کہا۔ ''تو آگ سے کھیل رہی ہے حمیدہ۔ دیکھ یہ دین دھرم کے گورکھ دھندے ہیں۔ ان میں خود کو الجھانا ٹھیک نہیں۔''

''میں بھی جانتی ہوں۔ پر کیا کروں۔ میں مجبور ہوں۔''

''یہ خیال دل سے نکال دے۔ یہ تیرا حق بھی نہیں ہے۔''

''میں یہی چاہتی ہوں۔ مگر مجبور ہوں۔ خود پر زور بھی تو نہیں چلتا۔'' حمیدہ کے لہجے میں بے بسی تھی۔

''کیسے نہیں چلتا۔ تجھے خود کو سنبھالنا ہوگا۔ میں کوئی مجبوری نہیں جانتا۔ پھر یہ تو سوچ کہ ٹھاکر جی کے کتنے احسان ہیں ہم پر''

''تم کیسے سمجھو گے۔ مرد ہونا۔ تمہیں کیا معلوم۔ دودھ کا ابال کیا ہوتا ہے۔ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔''

''میں صرف یہ جانتا ہوں کہ ٹھاکر جی کو پتا چل گیا تو وہ ہمیں تباہ کر دیں گے۔''

''میں نہیں جانتی کہ میں ایسی بے بس کیوں ہوگئی ہوں.....''

یہ وہ لمحہ تھا کہ جمال دین کا ہاتھ اٹھنے والا تھا۔ مگر اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ بے وقت کی دستک تھی۔ جمال دین گھبرا گیا۔ اس کا اٹھا ہوا ہاتھ جیسے پتھر کا بن گیا۔ دستک دوبارہ ہوئی تو وہ چونکا۔ ''تو اندر جا حمیدہ، میں دیکھتا ہوں۔ اتنی رات کو کسی کا آنا خیر تو نہیں''

حمیدہ کمرے میں چلی گئی۔ جمال دین دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے کنڈی کھولی۔ مگر دروازہ کھلتے ہی وہ حیران رہ گیا۔ ایک بار پھر وہ بت بن کر رہ گیا.....

.....X.....

گاؤں میں سناٹا تھا۔ ادھر ادھر گھومنے والے آوارہ کتوں کے سوا کہیں کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ بھی اچھا تھا کہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کو جمال دین کے دروازے پر جاتے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ اس وقت متضاد جذبوں کا اسیر تھا۔ اس نے زندگی میں کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا تھا۔ کبھی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی کچھ مانگنے کی اسی لئے پہلی بار جب اولاد کیلئے منت ماننے وہ مندر گیا تو اسے عجیب سا لگا۔ اسے حیرت بھی ہوئی کہ اس سے پہلے اس نے کبھی بھگوان سے بھی کچھ نہیں مانگا تھا۔ وہ راج پوت تھا اور اس کے پاس دو طرح کی طاقت تھی۔ ایک دولت کی، جس کے زور پر کچھ بھی خریدا جا سکتا تھا۔ اور دوسری طاقت اپنے بازوؤں کی تھی۔ لیکن ان دونوں کے استعمال کی بھی اسے کبھی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ طبعاً وہ نیک اور شریف النفس تھا۔ اس نے کبھی ایسی کوئی خواہش ہی نہیں کی۔ وہ تو ہمیشہ دوسروں کو دیتا ہی رہا تھا۔

تو جب پہلی بار مندر میں اس نے بھگوان (مورتی) کے سامنے ماتھا ٹیک کر اولاد کیلئے پرارتھنا کی تو وہ اپنے اندر بہت شرمندہ ہوا۔ شرمندگی اس بات کی بھی تھی کہ وہ کچھ مانگ رہا ہے اور اس بات کی بھی کہ اس سے پہلے اس نے بھگوان سے کسی بھی طرح کا تعلق رکھا ہی نہیں تھا۔ اس نے کبھی پوجا بھی نہیں کی تھی۔ اور اس وقت اپنی غرض سے اس کے سامنے سر جھکائے ہوئے بھی اس کے دل میں کوئی جذبہ نہیں تھا عبودیت کا احساس تک نہیں تھا اسے۔

پہلی بار اسے پتا چلا کہ منش کے پاس کتنی ہی طاقت ہو، وہ بہر حال غرض مند ہوتا ہے اور اس پر بے بسی طاری ہوتی ہے۔ اگلے اٹھارہ برسوں کون سی ایسی چوکھٹ تھی، جہاں اس نے سر نہ جھکایا ہو۔ اس نے سادھوؤں کے پیر چھوئے۔ درختوں کے سامنے ماتھا ٹیکا۔ اولاد کی طلب نے اسے بھکاری بنا دیا۔ کبھی کبھی راج پوت کی انا کے زخم سے ٹیسیں اٹھتیں تو وہ سوچتا..... کوئی بات نہیں۔ بھگوان کے سامنے ہی تو ہاتھ پھیلائے ہیں نا، جس سے راجے مہاراجے بھی بھیک مانگتے ہیں۔ یہی ایک مقام تو ہے، جہاں پر منش جھکنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

وہ بھکاری بن کر پھرتا رہا۔ آخر اسے بیٹا مل گیا۔ اور اب وہ بیٹا اس سے ایک ایسی چیز مانگ رہا تھا، جو اس کے اور اس کی پتنی کے پاس نہیں تھی۔ وہ چیز بھگوان کے پاس بھی نہیں تھی۔ ہاں..... ایک منش کے پاس تھی۔ سو اس کیلئے اب اسے ایک منش کے سامنے ہاتھ پھیلانا تھا۔ اور منش بھی وہ جس کا دھرم ہی دوسرا تھا۔ ''وہ اس کا مزارتھا، جسے اس نے زمین بخش دی تھی۔ وہ منش آج تک اس کا احسان مانتا تھا۔ مگر آج کے بعد صورتحال الٹ جائے گی۔ اب وہ چور اس کا احسان مانے گا..... مانتا رہے گا..... جیون بھر!

یہ سوچتے ہوئے ٹھاکر کا جی چاہا کہ پلٹ جائے۔ مگر کم وقت میں اتنا کچھ ہو چکا تھا، اس نے اتنا کچھ دیکھ لیا تھا کہ مشکل باتیں بھی اس کی سمجھ میں آنے لگی تھیں..... بھگوان کی باتیں! اور وہ اتنی مشکل سے ہاتھ آنے والے بیٹے کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ یہ سچ سہی کہ جس نے چراغ جلایا ہے، وہ اسے بجھنے نہیں دے گا۔ لیکن وہ اسے ناقدرا سمجھ کر اس سے چھین لے اور کسی قدرداں کو دے دے تو.....؟ کون روک سکتا ہے اسے؟ پھر اس کی حویلی میں تو اندھیرا ہوگا، اور چراغ کسی اور کے گھر کو روشن کر دے گا۔ نہیں..... یہ تو وہ گوارا نہیں کر سکتا۔ اتنے برسوں کے بعد تو کہیں پردے میں روشنی ہوئی ہے.....

اور یہ کتنی عجیب بات تھی کہ اس کے گاؤں میں وہی ایک مسلمان پریوار تھا۔ وہ خود اس پریوار کو دور کے گاؤں سے، ان پر مہربانی کر کے، انہیں بچا کے یہاں لایا تھا..... اس دن کیلئے! یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ مگر بھگوان تو جانتا تھا۔ یہ تو وہ اب سمجھ رہا تھا کہ اس وقت اس نے ان پر نہیں، خود پر احسان کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کا احسان مانتے ہیں۔ اس کیلئے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ شاید اگر وہ جمال دین سے جان بھی مانگ لے تو وہ انکار نہ کرے۔ لیکن وہ..... ٹھاکر پرتاب سنگھ مانگنے والا تو نہیں تھا۔ یہ الگ بات کہ مانگنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ چھوٹے نے..... اس کے چھوٹے ٹھاکر نے اپنے لئے اگر کی عزت کو پسند کیا تھا۔

www.alkurdu.com

ٹھاکر نے جمال دین کو بہت غور سے دیکھا۔ دروازہ کھلنے میں دیر لگی تو اس نے سوچا کہ وہ لوگ یقیناً سو رہے ہوں گے۔ کام اتنا ضروری نہ ہوتا تو وہ واپس چلا جاتا مگر اسے نہ چاہتے ہوئے بھی دوبارہ دستک دینی پڑی۔ لیکن جمال دین کا چہرہ دیکھ کر اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ سوتے سے اٹھا ہے۔ وہاں تو جگار ہی جگار تھی۔

ٹھاکر کو اس طرح گھورتے دیکھ کر جمال دین اور گڑبڑا گیا۔ اسے بس یہی خیال آیا کہ ٹھاکر کو حمیدہ کی خواہش اور ارادے کا پتا چل گیا ہے۔ اور اب وہ انہیں سزا دینے کے لئے آیا ہے۔ ورنہ اتنی رات کو وہ یہاں کیوں آتا۔ ''حکم کریں ٹھاکر جی''۔ اس نے کہا۔ پھر فوراً ہی اسے اپنی بدتمیزی کا احساس ہوا۔ وہ بیچ دروازے میں کھڑا تھا اور اس نے ٹھاکر کو اندر آنے کیلئے بھی نہیں پوچھا تھا۔ اس نے جلدی سے دروازے سے ہٹ کر ٹھاکر کو راستا دیا۔ ''اندر آئیں نا ٹھاکر جی''۔

ٹھاکر نے چوکھٹ پار کی اور صحت میں آیا۔ جمال دین نے صحن میں پڑی چارپائی کی طرف اشارہ کیا۔ ''بیٹھیں ٹھاکر جی''۔

ٹھاکر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ مگر وہ مضطرب تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کس طرح شروع کرے۔

جمال دین اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''میں کیا خدمت کروں آپ کی ٹھاکر جی؟''۔

''وہ..... میں..... تمہاری بیوی کہاں ہے جمال دین؟''۔ ٹھاکر کو کہتے کہتے خود بھی اپنی بات کے احمقانہ ہونے کا احساس ہونے لگا۔ ظاہر ہے، وہ سو رہی ہو گی۔

لیکن جمال دین بیوی کے حوالے پر اور بوکھلا گیا۔ اس کا خدشہ سچ ثابت ہو رہا تھا۔ ''..... معاف کر دیں ٹھاکر جی۔ وہ نادان ہے..... دیوانی ہے۔ جو سوچنا بھی نہیں چاہئے، وہ، وہ کرنا چاہتی ہے۔ آپ معاف کر دیں اسے۔ میں اب اسے ایسا سوچنے بھی نہیں دوں گا''۔

ٹھاکر اچنبھے میں پڑ گیا۔ اس نے کہا۔ ''مجھے نہیں پتا جمال دین کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ پر میں تو حمیدہ سے ملنے آیا ہوں۔ مجھے ایک ضروری بات کرنی ہے اس سے۔ ایک بنتی کرنی ہے۔ وہ سو رہی ہے کیا؟''۔

''جج..... ہاں..... جی..... نہیں۔ وہ سو رہی ہے''۔ جمال دین بوکھلا گیا۔

''میں اتنی تکلیف دینا نہیں چاہتا۔ پر یہ ضروری ہے، تم جگا دو اسے''۔

ٹھاکر کے جملے کا پہلا حصہ تو جمال دین کے سر پر سے گزر گیا۔ اس نے آخری حصہ سنا اور دہل گیا۔ وہ جلدی سے لپکا اور ٹھاکر کے پاؤں پکڑ لئے۔ ''معاف کر دیں ٹھاکر جی۔ وہ تو پاگل ہے۔ آپ ہمیں معاف کر دیں''۔

ٹھاکر جھنجھلا گیا۔ یہ آدمی نہ سیدھی بات کرتا ہے، نہ اس کی سنتا ہے۔ مگر اس نے فوراً ہی خود کو یاد دلایا کہ غرض مند لوگ ان لوگوں پر غصہ نہیں کرتے، جن سے کوئی غرض ہو۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے جمال دین''۔ اس نے لہجہ نرم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''چلو خیر۔ حمیدہ کو چھوڑو۔ اصل بات تو تم سے ہی کرنی ہے''۔

جمال دین پوری جان سے لرزنے لگا۔ ''رحم کر دیں ٹھاکر جی۔ ہم ہمیشہ سے آپ کے وفادار ہیں''۔

''اسی لئے تو تمہارے پاس آیا ہوں سوالی بن کر۔ مجھے تم سے کچھ مانگنا ہے''۔

جمال دین کو یوں لگا جیسے ٹھاکر کی پوری حویلی اس کے سر پر آ گری ہے۔ چند لمحے تو وہ گنگ رہا۔ پھر بولا۔ ''آپ کیسی بات کرتے ہیں ٹھاکر جی۔ میرے پاس ہے ہی کیا۔ اور جو کچھ ہے، وہ آپ چھیننے کا اختیار رکھتے ہیں''۔

''لیکن میں مانگ رہا ہوں''۔

''شرمندہ نہ کریں ٹھاکر جی''۔ جمال دین نے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''حکم کریں''۔

''مجھے اپنے بچے کا جیون چاہئے''۔

''زندگی دینے والا تو رب ہے ٹھاکر جی.....''۔ جمال دین نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی۔

''میں دھرتی کی بات کرتا ہوں جمال دین۔ یہاں تم اور حمیدہ ہی اسے جیون دان کر سکتے ہو۔ حمیدہ اسے دودھ پلا کر۔ اور تم حمیدہ کو دودھ پلانے کی اجازت دے کر''۔

جمال دین کا ذہن شکوک و شبہات سے بھر گیا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ٹھاکر اس سے سچ اگلوانے کے لئے جال بچھا رہا ہو۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے ٹھاکر جی؟ یہ تو دھرم کا معاملہ ہے''۔

''یہ نہ ہوا تو میرا بچہ بھوک سے مر جائے گا جمال دین۔ وہ کل سے بھوکا ہے۔ اور وہ صرف حمیدہ کا دودھ مانگ رہا ہے۔ اسے کچھ ہو گیا تو میں بھی مر جاؤں گا جمال دین''۔

ٹھاکر کے لہجے کی تڑپ اور سچائی نے جمال دین کو ہلا کر رکھ دیا۔ پھر بھی وہ ہچکچا رہا تھا۔ ''لیکن..... لیکن ٹھاکر جی.....''۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ کے لئے وہ لمحہ بہت کڑا تھا۔ اس کے پرکھوں کی آن، راج پوتوں کی شان..... اس نے سب کو جھٹک دیا اور جمال دیا کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ''میں تم سے بنتی کرتا ہوں جمال دین۔ مجھے خالی ہاتھ مت.....''۔

جمال دین نے جھپٹ کر اس کے دونوں ہاتھ کھولے اور انہیں بے تابانہ چومنے لگا۔ ''ایسا نہ کریں ٹھاکر جی..... ایسا نہ کہیں۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''چھوٹے ٹھاکر کے لئے تو ہم سب کی جان حاضر ہے۔ لیکن.....''۔

اسی لمحے حمیدہ کمرے سے نکل آئی۔ ''اب تو آپ اجازت دے دو نا جی۔ اب تو کوئی حرج، کوئی ڈر نہیں۔ مالک خود کہہ رہے ہیں''۔ اس کے لہجے میں بے تابی تھی۔

''ٹھیک ہے حمیدہ''۔

ٹھاکر نے حمیدہ کے لہجے کی بے تابی محسوس کی۔ پھر اسے غور سے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ حمیدہ کی آنکھوں میں نیند کا نشان بھی نہیں تھا۔ یہ طے تھا کہ وہ بھی سوئی ہوئی نہیں تھی۔ اسے یہ بات عجیب لگی کہ وہ دونوں جاگ رہے تھے۔ ''اجازت دے دو جمال دین''۔ ٹھاکر نے کہا۔ ''یہ مجھ پر اپکار ہو گا تمہارا''۔

''مجھے گناہ گار نہ کریں ٹھاکر جی۔ یہ تو ہمارا فرض ہے''۔ جمال دین نے گڑگڑا کر کہا۔ پھر وہ بیوی سے مخاطب ہوا۔ ''جاؤ حمیدہ۔ تم ٹھاکر جی کے ساتھ چلی جاؤ''۔

''نہیں جمال دین۔ مجھے اپنی آن کا خیال بھی رکھنا ہے اور تمہاری عزت کا بھی۔ تم بھی اپنے بچے کو ساتھ لے کر چلو۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی اکیلی حمیدہ کو میرے ساتھ دیکھے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ بات کسی کو پتا نہ چلے کہ حمیدہ اوتار سنگھ کو دودھ پلاتی ہے''۔

''کبھی کسی کو پتا نہیں چلے گا مالک''۔ حمیدہ نے جلدی سے کہا۔

جمال دین کو ٹھاکر کا بڑا پن بہت اچھا لگا۔ وہ اپنی آن کی فکر کرتا تھا تو دوسروں کی عزت کا بھی اسے دھیان رہتا تھا۔ وہ کمرے میں گیا اور سوتے ہوئے وصال دین کو گود میں اٹھا لایا۔ پھر وہ گھر سے نکل آئے۔

راستے میں ٹھاکر نے کہا۔ ''آج جیسی بے وقت تکلیف تمہیں کبھی نہیں ہو گی.....''۔

''تکلیف کیسی ٹھاکر جی۔ یہ تو ہمارے لئے خوشی کی بات ہے''۔ جمال دین نے کہا۔

ٹھاکر کو پھر اس بات کا خیال آ گیا، جو اسے رہ رہ کر چبھ رہی تھی۔ ''ایک بات بتاؤ''۔ اس نے کہا۔ ''تم دونوں اتنی رات کو جاگ کیوں رہے تھے؟''۔

''حمیدہ تو کل سے بے کل ہے ٹھاکر جی۔ یہ چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلانے کو تڑپ رہی تھی اور.....''۔ جمال دین کہتے کہتے رک گیا۔

یہ ٹھاکر کیلئے انکشاف تھا۔ حمیدہ چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلانے کے لئے..... ''اور کیا۔ بتاؤ مجھے''۔

لیکن جمال دین چپ رہا۔

''بتاؤ نا جمال دین''۔ ٹھاکر نے اصرار کیا۔

''آپ خفا ہو جائیں گے ٹھاکر جی۔ اور یہ میں نہیں چاہتا''۔

''تم بتاؤ۔ میں خفا نہیں ہوں گا''۔

www.allurdu.com

جمال دین چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''یہ حمیدہ اس وقت ضد کر رہی تھی..... کہتی تھی، حویلی جاؤں گی''۔

ٹھاکر کی حیرت دوچند ہوگئی۔ ''کیوں؟''۔

''کہتی تھی، اس وقت سب سو رہے ہوں گے۔ چپکے سے جا کر چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلا دوں گی۔ وہ بھوکے ہوں گے''۔

ٹھاکر کے دل کو اس لمحے کچھ ہوگیا۔ وہ پگھلنے لگا۔ یہ عورت جو اس کی کچھ نہیں لگتی، اس کے بچے کے لئے تڑپ رہی ہے۔ یہ جانتی ہے کہ اس کو کسی نے دیکھ لیا تو اس کا پورا پریوار ختم کر دیا جائے گا۔ پھر بھی.....! یہ کون سا جذبہ ہے؟ اس نے بڑی ممنونیت سے حمیدہ کو دیکھا۔ اب اس کی سمجھ میں حمیدہ کی اس وقت کی پہلی بات بھی آ گئی، جو اس نے کمرے سے باہر آ کر جمال دین سے کہی تھی..... اب تو اجازت دے دو نا جی۔ مالک خود کہہ رہے ہیں۔ وہ سمجھ گیا کہ حمیدہ حویلی جانے اور بچے کو چھپ کر دودھ پلانے پر اصرار کر رہی تھی اور جمال دین جو اس بات کے نتائج سمجھتا تھا، بجا طور پر اسے روک رہا تھا۔ لیکن کیا وہ.....

اسی لمحے جمال دین نے ٹھاکر پرتاپ سنگھ کے من میں آئی ہوئی بات اپنے منہ سے کہہ دی۔ ''یہ تو پاگل ہو رہی تھی ٹھاکر جی۔ مجھے ڈر تھا کہ میری آنکھ لگ گئی تو یہ چپکے سے نکل جائے گی، اور اپنے دل کی کر کے رہے گی۔ اور پھر.....''۔ جمال دین نے جھرجھری لی اور جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

ٹھاکر کو کوئی شبہ نہیں تھا کہ حمیدہ ایسا ہی کرتی۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ یہ بھگوان کے کھیل ہیں۔ بچے کے من میں جس کے دودھ کی طلب ڈالی، اس کے من میں بچے کو دودھ پلانے کی طلب بھی ڈال دی۔ اسے خوشی ہوئی کہ یہ عورت صرف اس کے حکم کی وجہ سے اس کے بچے کو دودھ نہیں پلائے گی۔ بلکہ محبت سے پلائے گی۔ ''دیکھو..... اس کا صلہ تو میں کیا، کوئی بھی نہیں دے سکتا۔ مگر میں تم دونوں کا یہ اپکار ہمیشہ یاد رکھوں گا''۔ اس نے کہا۔

وہ حویلی کی طرف بڑھتے رہے۔

پورا گاؤں نیند بھی ڈوبا ہوا تھا۔ وہاں وہ منظر دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ لیکن کوئی دیکھتا تو حیران ہوئے بغیر نہ رہتا۔ اور تجسس سے بھی نہ بچ جاتا۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ اکیلا آگے آگے چل رہا تھا۔ اس کے پیچھے جمال دین اور حمیدہ قدم سے قدم ملائے چل رہے تھے۔ اور جمال دین کی گود میں ننھا وصال دین تھا۔

وہ حویلی میں داخل ہوئے۔ وہاں بھی سناٹا تھا۔ در و دیوار بھی لگتا تھا کہ بے خبر سو رہے ہیں۔ راہداری میں ٹھاکر رکا۔ ''حمیدہ، وہ رہا میرے اوتار سنگھ کا کمرا''۔ اس نے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم جاؤ۔ جمال دین میرے ساتھ ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں تمہاری خبر لینے آؤں گا''۔

حمیدہ تیز قدموں سے کمرے کی طرف بڑھی۔ مگر تیزی کے باوجود اس کے قدموں میں ہچکچاہٹ تھی۔ ذرا آگے جا کر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ٹھاکر وہیں کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ بچے کو گود میں اٹھائے جمال دین اس کے پیچھے تھا۔ ٹھاکر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''جاؤ حمیدہ۔ ڈرو مت۔ اندر تمہارا انتظار ہو رہا ہوگا''۔

حمیدہ کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ٹھاکر پلٹا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ ''آؤ جمال دیا۔ تم میرے ساتھ چلو''۔

.....X.....

ٹھاکرانی کے کمرے میں جو کچھ ہوا، ٹھاکر پرتاپ سنگھ دیکھ لیتا تو راج پوتوں کی ایک روایت ٹوٹ جاتی۔ وہ یہ کہ راج پوت کبھی نہیں روتے۔

حمیدہ کمرے میں داخل ہوئی۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ ٹھاکرانی مسہری پر بیٹھی پہلو میں لیٹے بچے کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر خوف جیسے جم کر رہ گیا تھا۔ اس کی محویت ایسی تھی کہ دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سے بھی نہیں ٹوٹی۔ ''سلام مالکن''۔ حمیدہ نے کہا۔

اس پر ٹھاکرانی نے چونک کر سر گھمایا۔ حمیدہ کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ ''آ جا حمیدہ۔ ہم کب سے تیری راہ تک رہے ہیں..... میں اور میرا بچہ''۔ اس کے لہجے میں بے تابی تھی۔ ''مگر سن، دروازے کی چٹخنی لگا دے پہلے''۔

حمیدہ کچھ سمجھی نہیں۔ مگر حکم کی تعمیل کرنا اس کے خون میں شامل تھا۔ چٹخنی چڑھا کر وہ واپس آئی اور مسہری کے پاس کھڑے ہو کر ایک نظر بچے پر ڈالی۔ پھر اس نے ٹھاکرانی سے پوچھا۔ ''کیسے ہیں چھوٹے ٹھاکر''۔

''پوری رات، پورا دن گزر گیا۔ بھوکا ہے میرا بچہ۔ تو جلدی سے یہاں بیٹھ جا حمیدہ''۔ ٹھاکرانی نے مسہری کے پائینتی والے حصے کی طرف اشارہ کیا۔

حمیدہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''نہیں مالکن، یہ مجھ سے نہیں ہوگا''۔

''جیسا میں کہتی ہوں، ویسا کر''۔ ٹھاکرانی نے درشت لہجے میں کہا۔ پھر لہجہ نرم رکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ تو بھگوان کی دیا ہے تجھ پر۔ جب میرے حصے کا کام کرے گی تو میری جگہ پر ہی بیٹھے گی نا''۔

حمیدہ نے ٹھاکرانی کے تیور بھانپے اور سہمتے جھجکتے مسہری پر بیٹھ گئی۔ اس کے پاؤں نیچے لٹکے ہوئے تھے۔

''پاؤں اوپر کر کے آرام سے بیٹھ۔ لگتا ہے، تجھے تو دودھ پلانا بھی نہیں آتا''۔

حمیدہ کو یہ بات کوڑے کی طرح لگی۔ بات غلط اور توہین آمیز بھی تھی۔ وہ اپنے وصال کو دس ماہ سے دودھ پلا رہی تھی۔ اور ٹھاکرانی کہہ رہی تھی کہ اسے دودھ پلانا بھی نہیں آتا۔ مگر وہ عورت تھی۔ ٹھاکرانی کے اندر کا دکھ سمجھ گئی۔ وہ محروم عورت جو برسوں سے اپنے بچے کو دودھ پلانے کی آرزو کر رہی تھی، اب اسے بچہ بھی میسر تھا اور پلانے کے لئے دودھ بھی۔ لیکن اس کا بچہ اس کا دودھ پینے سے انکاری تھا۔ ایسے میں اسے حسد تو ہونا ہی تھا۔ یہ تو مامتا کی عظمت تھی کہ وہ اسے اپنے بچے کو دودھ پلانے کی اجازت دے کر اتنی بڑی شکست قبول کر رہی تھی۔ ورنہ عورت محبت کے معاملے میں ہمیشہ کی محرومی کو سامنے پر ترجیح دیتی ہے۔

حمیدہ مسہری پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اس نے بچے کو دیکھا۔ اس پر غشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس کی ادھ کھلی آنکھوں میں نقاہت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں دیکھ پا رہا۔ اسے خوف آنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ جلدی سے اسے گود میں لے اور دودھ پلانے لگے۔ لیکن اس نے یہ بات کہی بھی نہیں۔ بس وہ منتظر بیٹھی رہی۔

کچھ لمحے یونہی اس انتظار میں گزر گئے۔ اور وہ بہت طویل لمحے تھے۔ حمیدہ کو لگتا تھا کہ کسی بھی لمحے ٹھاکرانی کا ارادہ بدل جائے گا، اور وہ اسے رخصت کر دے گی۔ وہ اپنے حصے کا اعزاز اسے کبھی نہیں دے گی۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ نظریں اٹھا کر ٹھاکرانی کے چہرے کا تاثر ہی دیکھ لیتی۔

بالآخر ٹھاکرانی نے بڑی نرمی سے بچے کو اپنی گود میں اٹھایا اور جیسے خود سے بولی۔ ''بہت ہٹیلے بالک ہو راج کمار جی''۔ پھر اس نے بڑی نزاکت سے بچے کو حمیدہ کی گود میں لٹا دیا۔ پھر وہ عجیب سی نظروں سے بچے کو دیکھنے لگی۔

حمیدہ کی گود کا لمس پاتے ہی بچے کے ننھے سے وجود میں جیسے کرنٹ سا دوڑ گیا۔ اس کی ادھ کھلی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ کم زوری کے ساتھ سہی، مگر اس کے ننھے منے ہاتھ مچلے اور حمیدہ کے سینے کو چھونے لگے۔

حمیدہ کا دل پھٹنے لگا۔ بچہ صاف صاف دودھ مانگ رہا تھا اسی سے۔ مگر وہ حکم کی منتظر تھی

www.allurdu.com

معاملے کی نزاکت اور راج پوتوں کی آن، دونوں کو سمجھتی تھی۔ بغیر حکم کے وہ دودھ کیسے پلاتی۔ وہ نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔

ٹھاکرانی نے بھی بچے کا کیمیاوی ردعمل دیکھا۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنے سینے کی طرف لپکا۔ ہے بھگوان۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ میرا پوت تو سب کچھ جانتا ہے۔ پھر یہ اسی طرح مجھے کیوں نہیں چھوتا۔ اور یہ..... ان جان ناری! اس نے حقارت سے سوچا۔ اور وہ بھی دوسرے دھرم کی۔ اس سے کیسے لپٹ رہا ہے۔

ایک دم سے رقابت کی آگ بھڑک اٹھی۔ آگ بھی ایسی کہ ٹھاکرانی کو کبھی اس سے واسطہ ہی نہیں پڑا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ بچے کو اپنی گود میں اٹھالے اور حمیدہ کو دھکے دے کر کمرے سے نکال دے۔ مگر فوراً ہی یہ خیال بھی آ گیا کہ بچے کی زندگی خطرے میں ہے۔ مگر اس لمحے اسے حمیدہ سے نفرت..... شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی اور اسی نفرت کو اظہار کی ضرورت بھی تھی۔ ورنہ ٹھاکرانی کو کچھ ہو جاتا۔ چناں چہ اس نے اس نفرت کو کسی اور طریقے سے نکالا۔ ''میں نے بچے کو تیری گود میں اس کا منہ دیکھنے کے لئے نہیں دیا ہے حمیدہ۔ دودھ کیوں نہیں پلاتی اسے''۔ اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

حمیدہ اسی کی منتظر تھی۔ نفرت سے سہی، مگر حکم تو ہو!

شاید کوئی بھی انسان دو متضاد کیفیات کے درمیان اس قدر برابر سے کبھی تقسیم نہیں ہوا ہوگا، جیسا اس وقت ٹھاکرانی ہوئی تھی۔ اس نے منقسم وجود کا ایک حصہ اس پر مصر تھا کہ وہ دودھ پیتے بچے کو چھوڑ کر کمرے سے نکل جائے کیوں کہ جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اسے دیکھنا..... بلکہ سننا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اور منقسم وجود کا دوسرا حصہ وہی سب کچھ دیکھنے اور سننے پر اصرار کر رہا تھا۔ پہلا حصہ اس کے اندر کی عورت کے قبضے میں تھا اور دوسرا اس کے اندر کی ماں کے تصرف میں تھا۔ رقابت کی آگ میں جلتی ہوئی عورت کے لئے بچہ اس کا محبوب تھا، جو اس سے بے وفائی کر رہا تھا۔ وہ اس کی مسرت بھری چہکاریں سننا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس کی بے تابیاں دیکھنا نہیں چاہتی تھی جب کہ ماں اپنے بچے کی پہلی سچی خوشی کے اظہار کے ایک ایک لمحے کو اپنی یادداشت پر نقش کر لینا چاہتی تھی۔

اس جنگ میں ماں کو ہی جیتنا تھا..... اور وہ جیت گئی۔

ٹھاکرانی رنجیتا جو کر نہیں سکتی تھی، اسے محسوس تو کر سکتی تھی۔ چناں چہ اس وقت وہ ٹھاکرانی نہ رہی، حمیدہ بن گئی۔ اب وہ اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ اور وہ محبت ہی محبت تھی..... ماتا ہی ماتا۔ رقابت کی آگ سرد پڑ گئی۔ خود سے بھی کوئی رقابت کرتا ہے۔

ننھا ٹھاکر بے سدھ ہو کر سو گیا۔ پیٹ بھرنے کی لذت اسے پہلی بار ملی تھی۔

سکون صرف ننھے بچے کو نہیں ہوا تھا۔ سکون تو شاید اس کمرے میں مینہ کی طرح برسا تھا۔ وہاں موجود دونوں عورتیں بھی شرابور ہو گئی تھیں۔ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھیں۔ ان کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں تھی۔ ان کے مذہب جدا تھے۔ ان کی حیثیتیں جدا تھیں تو ان کا سکون بھی الگ الگ تھا۔ حمیدہ کا حال اس بستی کا سا تھا، جس کے پاس بہتا ہوا دریا چڑھ گیا ہو اور حفاظتی پشتے کو خطرہ ہو کہ کسی بھی لمحے پانی کا بہاؤ اسے توڑ دے گا۔ اور پھر چڑھا ہوا دریا پشتے کو توڑ کر بستی پر سے گزر گیا ہو..... لیکن معجزاتی طور پر بستی کو کوئی نقصان پہنچائے بغیر۔ ایک فرض تھا، جو اسے پورا کرنا تھا..... اور وہ اس کے اختیار میں بھی نہیں تھا۔ اور وہ اتنا سنگین تھا کہ اسے پورا کرنا آگ کے دریا کو پار کرنے کے برابر تھا فرض پورا کر کے وہ صرف پرسکون نہیں ہوئی، ڈھیر ہو گئی۔ دو دن کے تنے، چٹخے ہوئے اعصاب جیسے سو گئے۔ اس میں سکت ہی نہیں رہی۔ بھوکے ننھے بچے نے دودھ کیا، اسے نچوڑ ڈالا۔ اب وہ صرف سو جانا چاہتی تھی۔

ادھر ٹھاکرانی کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس پر کیا گزرتی رہی ہے۔ نیند اور آرام کجا، وہ تو سکون کو بھی ترستی رہی تھی۔ اتنے برسوں کے بعد خزاں میں کھلنے والا پھول کھلنے سے پہلے مرجھا جانے کے خطرے سے دوچار تھا۔ اس کا بچہ اب تک صحیح معنوں میں سویا بھی نہیں تھا۔ اس کی تو جان سولی پر ٹنگی ہوئی تھی۔

وہ دودھ پیتے بچے کو دیکھتی، اس کی مسرت بھری آوازیں سنتی رہی تھی۔ وہ دیدا اس کی آنکھوں میں، وہ آوازیں اس کی سماعت میں بس گئی تھیں۔ خاصی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ بچے کی آواز معدوم ہو گئی ہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ بچہ دودھ پیتے پیتے سو گیا ہے۔ اس کے ہونٹ اب ہل نہیں رہے ہیں۔

اس نے بڑی نرمی، بڑی آہستگی سے بچے کو حمیدہ کی گود سے اٹھایا۔ حالاں کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ بچہ اتنی گہری نیند میں تھا کہ کسمسایا تک نہیں۔ ٹھاکرانی نے اسے سینے سے بھینچ لیا۔ پہلی بار ٹھاکرانی نے سکون کی سانس لی۔ اس کا بچہ زندہ رہے گا۔ اس کا پیٹ بھر گیا ہے اور وہ سو رہا ہے۔ یہ سوچتے سوچتے اس کی اپنی آنکھیں بھی مندنے لگیں۔

ادھر حمیدہ کو ایسا لگ رہا تھا کہ جسم بے جان ہو گیا ہے۔ ہلنے کی سکت بھی نہیں تھی۔ لیکن اسے احساس تھا کہ وہ ٹھاکرانی کی مسہری پر بیٹھی ہے۔ اور یہ بے ادبی ہے۔ ٹھاکرانی کو جلال آ گیا تو خیر نہیں۔ اسے نیں معلوم تھا کہ ٹھاکرانی کو اس کا احساس تک نہیں ہے۔

جیسے تیسے وہ مسہری سے اتری ''چٹخنی گرا دوں مالکن؟''۔ اس نے ٹھاکرانی سے پوچھا۔

ٹھاکرانی نے بڑی مشکل سے اثبات میں سر ہلایا..... اور نندسی آواز میں بولی۔ ''کھول دے حمیدہ''۔ اور یہ کہتے ہی وہ سو گئی۔

حمیدہ نے چٹخنی گرائی۔ پھر وہ آ کر فرش پر، دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

.....x.....

جمال دین نے ٹھاکر کی خواب گاہ جیسی کوئی جگہ خواب میں بھی نہیں دیکھی تھی۔ اور وہ مسہری تو اتنی بڑی تھی کہ اس پر گاؤں کے آدھے لوگ سو سکتے تھے۔

''اپنے بیٹے کو یہاں لٹا دے جمال دین''۔ ٹھاکر نے مسہری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

جمال دین کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ''یہ..... یہ کیسے ہو سکتا ہے ٹھاکر جی؟''۔

''کیوں نہیں ہو سکتا؟''۔

''یہ سوتے میں پیشاب بھی کر سکتا ہے ٹھاکر جی''۔

ایک لمحے کو ٹھاکر کو اس خیال سے گھن آئی۔ مگر فوراً ہی اس کے اندر سے کسی نے للکار کر کہا..... اس بچے کے حصے کا دودھ جیون بن کر تیرے پتر کو مل سکتا ہے ٹھاکر۔ لیکن یہ تیرے بستر کو گندا کرنے کا حق نہیں رکھتا!

ٹھاکر نے جھرجھری سی لی اور تحکمانہ لہجے میں جمال دین سے کہا۔ ''جیسا میں کہتا ہوں، کر جمال دین۔ اسے یہاں لٹا دے''۔

جمال دین میں انکار کی ہمت نہیں تھی۔ اس نے بیٹے کو لٹا دیا۔ لیکن اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔

وہ نیچے بیٹھنے لگا تو ٹھاکر نے نرم لہجے میں کہا۔ ''تو بھی یہاں پاؤں پھیلا کر لیٹ جا بچے کے ساتھ''۔

جمال دین کی تو جان پر بن آئی۔ ''مجھے اس پر مجبور نہ کریں ٹھاکر جی۔ میں اپنی جگہ پر ٹھیک ہوں''۔

''اب یہ نہیں ہو سکتا۔ تجھے میری بات ماننا ہوگی''۔ ٹھاکر کے لہجے میں قطعیت تھی۔

جمال دین نے تعمیل کی۔ لیکن اس کی کوشش تھی کہ اس کا جسم گدے سے نہ ٹکنے پائے۔

ٹھاکر نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ ''نیند آ رہی ہے جمال دین تو سو جا''۔ اس نے ہم دردانہ لہجے میں کہا۔

''نہیں ٹھاکر جی۔ مجھے نیند نہیں آ رہی ہے''۔

ٹھاکر کو اس پر ترس آنے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ لحاظ میں جھوٹ بول رہا ہے۔ ''جھوٹ مت بول جمال دین۔ نیند تیری آنکھوں میں بھری ہوئی ہے''۔ ٹھاکر اس کے معمولات سے واقف تھا۔ صبح سویرے اٹھنے والے تو جلدی سوتے ہیں۔ اور یہاں تو رات آدھی سے زیادہ ہو چکی تھی۔ ''سو جا۔ یہ میرا حکم ہے''۔ اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''کیسے سو جاؤں ٹھاکر جی۔ کوئی آ گی تو؟''۔

ٹھاکر کو ہنسی آ گئی۔ ''یہ میرا خاص کمرا ہے۔ سوائے ٹھاکرانی کے یہاں کوئی نہیں آ سکتا، بس تو سو جا''۔

جمال دین نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں۔ ٹھاکر کو اندازہ ہو گیا، تو سوتا کیوں نہیں؟'' اس نے ڈپٹ کر کہا۔

''یہاں نیند نہیں آئے گی ٹھاکر جی''۔ جمال دین نے بے بسی سے کہا۔

''کیوں نہیں آئے گی؟''۔

''میں اپنی کھاٹ پر سونے کا عادی ہوں مالک۔ یہاں تو لگتا ہے کہ میں ڈوب رہا ہوں''۔

یہ بات ٹھاکر کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔ آرام دہ بستر پر تو اور گہری نیند آنی چاہئے۔ تاہم اس نے اتمام حجت کے طور پر کہا ''اچھا..... تو کہاں نیند آئے گی تجھ کو؟''۔

''نیچے شاید آ جائے''۔ جمال دین کے لہجے میں یقین نہیں تھا۔

''تو چل۔ نیچے آ جا''۔

جمال دین نیچے آ گیا۔ لیٹنے لگا تو ٹھاکر نے مسہری سے تکیہ اٹھا کر اسے دیا۔ جمال دین میں انکار کی جرات نہیں تھی۔

www.allurdu.com

اس نے تکیہ سر کے نیچے رکھا اور قالین پر لیٹ گیا۔لیکن نیند آنے کے باوجود وہ سو نہیں سکا۔

ٹھاکر بھی نیچے بیٹھ گیا۔جمال دین کی وجہ سے اسے اوپر بیٹھنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

کوئی ایک گھنٹے بعد وہ اٹھا اور بچے کے کمرے کی طرف گیا۔دروازے پر چند لمحے وہ ہچکچاتا رہا۔اسے لگتا تھا کہ وہ مداخلت بے جا کا مرتکب ہو رہا ہے۔کہیں حمیدہ بچے کو دودھ نہ پلا رہی ہو۔پھر اسے خیال آیا کہ اس صورت میں دروازہ اندر سے بند ہوگا۔ٹھاکرانی یہ خطرہ کبھی مول نہیں لے گی کہ کوئی اتفاقاً بھی حمیدہ کو چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلاتے دیکھ لے۔

اس نے ہلکے سے دھکیلا تو دروازہ کھل گیا۔اور وہاں سچ مچ رات کا تیسرا پہر تھا صرف بچہ ہی نہیں، دونوں عورتیں بھی بے خبر سو رہی تھیں۔حمیدہ تو دیوار سے ٹکے ٹکے ہی فرش پر نیم دراز ہو کر سو گئی تھی۔اس نے اندر جا کر بچے کو دیکھا۔اس کے چہرے پر سکون ہی سکون تھا۔اور وہ بے خبر سو رہا تھا۔ٹھاکر مطمئن ہو گیا۔

اسی لمحے حمیدہ کو دیکھ کر ٹھاکر نے بہت کچھ سوچا۔پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا کہ راجا کون ہوتا ہے اور بھکاری کون۔دینے والا ہاتھ راجا کا ہوتا ہے اور لینے والا ہاتھ بھکاری کا۔اور دینے والا ایسا کچھ دے کہ جو کہیں اور سے نہ مل سکتا ہو تو وہ مہاراجا ہوا۔تو یہ حمیدہ مہارانی ہے.....اور بھکاریوں کی طرح فرش پر سو رہی ہے۔اس کا دل کٹنے لگا۔اس نے فیصلہ کیا کہ پہلی فرصت میں اس سلسلے میں کچھ کرے گا۔

اس وقت مخل ہونا مناسب نہیں تھا۔وہ باہر نکلا، دروازہ بند کیا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔وہاں جمال دین بھی سو چکا تھا۔شاید ٹھاکر کی موجودگی ہی اس کی نیند میں حارج تھی۔وہ کمرے سے گیا تو فوراً ہی اسے نیند آ گئی۔

ٹھاکر وہیں نیچے لیٹ گیا.....تکیے کے بغیر۔وہ خود کو یاد دلا رہا تھا کہ اصل میں وہ بھکاری ہے۔کبھی زندگی چپکے چپکے راستا بدل لیتی ہے اور آدمی کو پتا بھی نہیں چلتا۔

اور اس کی آنکھوں میں نیند کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔

.....x.....

یہ دودھ کا مسئلہ ٹھاکر کے لئے بہت بڑی الجھن بن گیا!

زندگی میں پہلی بار اس نے کسی کا احسان لیا تھا۔اور اب وہ اس کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔اتنا تو اس کی سمجھ میں آتا تھا کہ احسان کا صلہ دینا ہے۔مگر کتنا اور کیسے؟ یہ اندازہ وہ کیسے کرتا۔

راج پوتوں کے ہاں بچے کو کسی اور سے دودھ پلوانے کی کوئی روایت نہیں تھی۔بلکہ ان کے نزدیک تو یہ بہت بڑی برائی ہی ہوتی۔یہ تو خون کی طاقت کو کم کرنے کی بات تھی۔

تاہم ٹھاکر یہ سمجھتا تھا کہ دودھ ان مول شے ہے۔اس کا کوئی مول نہیں۔اس کی قیمت چکائی نہیں جا سکتی۔مگر پھر بھی کچھ کرنا تو تھا۔وہ اس معاملے کو روایت کی روشنی میں دیکھنا اور سمجھنا چاہتا تھا۔

اب وہ یہاں گاؤں میں، قریب کے لوگوں سے تو کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا۔اس کے لئے اسے کسی مسلمان کی ضرورت تھی.....اور وہ بھی صاحب ثروت اور پڑھے لکھے مسلمان کی۔وہ سوچتا رہا۔آخر اسے امان اللہ کا خیال آیا۔وہ دہلی کا رہنے والا تھا۔کالج میں اس کے ساتھ پڑھا تھا اور اس کا گہرا دوست رہا تھا۔

چناں چہ ٹھاکر اس سے ملنے کے لئے دہلی چلا گیا۔

امان اللہ اس سے پہلے جیسی گرم جوشی سے ملا۔لیکن وہ حیران بھی بہت تھا۔''اتنے برسوں کے بعد میری یاد کیسے آ گئی پرتاپ سنگھ؟''۔

ٹھاکر تھوڑا سا کھسیایا۔پھر بولا۔یاد کی بات نہیں امان۔یاد تو میں نے تمہیں ہمیشہ رکھا۔بس یہ ہے کہ جاگیر کے معاملات میں الجھا رہا۔کبھی نکلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔بس اب ایک کام سے دہلی آنا ہو گیا۔سوچا تم سے مل کر پرانی یادیں ہی تازہ کر لی جائیں''۔

''اچھا کیا''۔امان اللہ نے بے حد خلوص سے کہا۔''پرانے دوستوں سے مل کر آدمی بڑھاپے میں بھی جوان ہو جاتا ہے''۔

''ہاں۔بیس برس بعد مل رہے ہیں ہم۔تمہیں تو میرا خیال کبھی نہیں آیا ہوگا''۔ٹھاکر نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''خیر.....ایسی بات بھی نہیں۔لیکن تم تو جانتے ہو کہ نوکری میں آدمی کو فرصت کم ہی ملتی ہے''۔

دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔پرانی یادوں سے کھیلتے رہے۔پھر ٹھاکر نے پوچھا۔''بچوں کا کیا حال ہے؟''۔

''سب مزے میں ہیں۔تین بیٹوں اور ایک بیٹی کی شادی کر دی۔چھوٹا بیٹا ابھی باقی ہے''۔

''واہ تم تو دادا بھی بن گئے اور نانا بھی''۔ٹھاکر کے لہجے میں رشک تھا۔

''ہاں۔اللہ کا شکر ہے۔تم سناؤ پرتاپ سنگھ''۔

ٹھاکر مسکرایا۔''ابھی چند دن پہلے ہی تو بھگوان نے دیا کی ہے مجھ پر''۔اس نے کہا۔''بیٹا ہوا ہے میرے ہاں''۔

امان اللہ حیران رہ گیا۔''پہلا بچہ! شادی کو تو تمہاری مجھے یاد پڑتا ہے، بائیس تئیس برس ہو گئے''۔

''ہاں امان۔اب تو میں نراش ہی ہو گیا تھا۔پر بھگوان نے دیا کر دی''۔

''بہت بہت مبارک ہو میرے دوست''۔امان اللہ نے گرم جوشی سے کہا۔''اس کا مطلب ہے کہ تم تو ابھی جوان ہوئے ہو''۔

''مجھے ایسا ہی لگتا ہے''۔

پھر باتوں باتوں میں ٹھاکر نے دودھ کی بات چھیڑ دی۔''تم لوگوں میں تو دودھ باہر سے بھی پلوا دیتے ہیں بچے کو''۔اس نے کہا۔

''کوئی مجبوری آن پڑے تو اور بات ہے''۔امان نے کہا۔''ورنہ کون ماں اپنے بچے کو دودھ پلانا نہیں چاہے گی۔میرے ہاں تو ایسا نہیں ہوا۔اللہ کا شکر ہے''۔

''میرا یہ مطلب نہیں تھا''۔ٹھاکر نے جلدی سے کہا۔''میرا مطلب ہے، تم لوگوں میں ایسا ہوتا تو ہے نا''۔

''عرب میں یہ رواج عام ہے''۔امان اللہ نے کہا۔''مگر ہمارے ہاں ایسا کم ہی ہوتا ہے۔لیکن تمہیں یہ خیال کیسے آیا ٹھاکر''۔

''ایسے ہی۔میں اکثر سوچتا ہوں اس پر۔مجھے عجیب سا لگتا ہے۔یہ تو خون میں ملاوٹ کرنا ہوا''۔

ٹھاکر کی امید کے مطابق امان اللہ اپنے ہاں کے اس رواج کا دفاع کرنے پر اتر آیا۔''ایسا نہیں ہے''۔اس نے پرجوش لہجے میں کہا۔''عرب اس معاملے میں تم راج پوتوں سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ایسے ہی کسی کے پاس نہیں بھیج دیتے اپنے بچے کو۔ان کی شرائط ہوتی ہیں۔حسب نسب بھی دیکھتے ہیں۔پھر عورت صحت مند ہو۔یعنی اسے کوئی بیماری نہ ہو۔اور وہ اعلیٰ کردار کی پاکیزہ عورت ہو''۔

''تو اس عورت کو کیا فائدہ؟''۔ٹھاکر نے کہا اور دل میں سوچا، اسے تو بن مانگے ہی دودھ پلانے والی میں یہ خوبیاں مل گئیں۔

''بچے کا باپ اس عورت کو اپنی حیثیت کے مطابق طے شدہ محنتانہ دیتا ہے''۔

''نا بھئی۔دودھ کا تو کوئی مول ہی نہیں ہو سکتا''۔ٹھاکر نے حتمی لہجے میں کہا۔

''بجے شک دودھ کا کوئی مول نہیں''۔ایسی عورتیں عام طور پر غریب ہوتی ہیں۔اور پرتاپ سنگھ، عورت اچھا کھائے پیئے گی تو دودھ اترے گا نا۔بھوکی عورت بچے کو کیا دودھ پلائے گی۔تو کسی کے بچے کو دودھ پلائے گی تو اسے خرچا بھی ملے گا۔اور دودھ ہوگا تو اس کا اپنا بچہ بھی دودھ پیئے گا۔ہوا نا فائدہ''۔

ٹھاکر کی معلومات میں اب اضافہ ہونا شروع ہوا۔مگر ابھی اسے اور کرید کرنی تھی۔''مگر اس بے چاری کو کوئی حیثیت تو نہیں ملے گی''۔اس نے کہا۔

''یہ کس نے کہہ دیا''۔امان اللہ نے تیز لہجے میں کہا۔''اس بچے کے لئے اس کا مرتبہ ماں کا ہوتا ہے۔اور محنتانہ اپنی جگہ۔دودھ پلانا اس کا ایسا احسان ہے، جس کا بدلہ چکایا نہیں جا سکتا''۔

تو حمیدہ ننھے ٹھاکر اودتار سنگھ کے لئے ماتا سمان ہے! ٹھاکر نے سوچا۔پھر بولا۔''تو وہ دوسرا بچہ.....دودھ پلانے والی کا بچہ.....''؟

''ایسے بچے دودھ شریک بہن بھائی ہوتے ہیں.....سگوں کے جیسے''۔

تو وصال دین ٹھاکر اودتار سنگھ کا بھائی ہے.....دودھ شریک بھائی! ٹھاکر آگ کی کھال پر تھا۔

www.allurdu.com

''مگر پرتاپ سنگھ، تمہیں اس میں اتنی دل چسپی کیوں ہے''؟ امان اللہ کے لہجے میں تجسس تھا۔ اس لمحے اسے خیال آیا کہ ابھی ذرا دیر پہلے خود ٹھاکر نے ہی بتایا تھا کہ چند روز پہلے اس کے ہاں بیٹا ہوا ہے..... پہلی اولاد۔ اور ٹھاکر کی عمر پچاس کے قریب تو ہے۔ تو ٹھاکرانی بھی 45 سے کم تو نہیں ہوگی۔ ہوسکتا ہے کہ دودھ نہیں اترا ہو۔ ''کہیں تمہارے ساتھ یہ مسئلہ تو نہیں''؟ اس نے پوچھا۔

''نہیں امان۔ میری پتنی کو تو بھگوان نے اتنا دودھ دیا ہے کہ سات بچے ہوتے تو بھی کمی نہ ہوتی''۔ ٹھاکر نے جلدی سے کہا۔ جو بات اسے سب سے چھپانی تھی، اس میں وہ کسی کو رازدار کیسے بنا سکتا تھا۔

امان اللہ کے اصرار پر وہ رات وہاں رکا اور اگلے روز واپس چلا آیا۔ معلومات تو اسے حاصل ہو چکی تھیں۔ اب ان کی روشنی میں عمل کرنا تھا۔ اور سب سے اہم بات ٹھاکرانی کو سمجھانا تھا۔

ٹھاکرانی پہلے ہی اپنے بچے کے معمولات طے کر چکی تھی۔ شروع میں تو وہ ڈر رہی تھی کہ شیر خوار بچے تو بار بار دودھ پیتے ہیں۔ یوں راز کو راز رکھنا ممکن نہ ہوتا۔ بہرحال اب وہ اٹھنے، چلنے پھرنے اور اپنے بچے کا خیال رکھنے کے قابل ہوگئی تھی۔ اور یہ تو اس کا جیون بھر کا ارمان بھی تھا۔ چناں چہ پہلے مرحلے میں اس نے دائی راجو سے چھٹکارا حاصل کیا۔ اسے کہہ دیا کہ جب کوئی ضرورت ہوگی تو اسے بلا لیا جائے گا۔ دوسرے مرحلے میں اس نے شانتا کو دن کی ڈیوٹی سے آزاد کر دیا۔ وہ رات کو آتی اور صبح سویرے ہی چلی جاتی۔ یوں حمیدہ کے لئے دن بھر کی گنجائش نکل آئی۔

ان معمولات کے ساتھ حمیدہ کے بھی نئے معمولات بن گئے۔ جمال دین کھیتوں پر جانے کے لئے نکلتا تو وہ وصال کو لے کر اس کے ساتھ حویلی آجاتی۔ سات بجے وہ ننھے ٹھاکر کو دودھ پلاتی۔ ٹھاکرانی کے ساتھ رہتی اور ننھے ٹھاکر کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹاتی۔ دس بجے وہ پھر بچے کو دودھ پلاتی۔ اس کے بعد وہ گھر واپس جاتی۔ کھانا پکاتی۔ جمال دین آتا تو اسے کھانا دیتی۔ جمال دین ذرا دیر کے لئے کمر ٹکاتا۔ تب وہ پھر حویلی جاتی ایک بجے اور پھر چار بجے ٹھاکر کے بچے کو دودھ پلاتی۔ پھر گھر واپس آکر رات کے کھانے کی فکر کرتی۔ شام سات بجے وہ ننھے ٹھاکر کو دن میں آخری بار دودھ پلانے کے لئے جاتی۔ اور اس کے بعد گھر واپسی۔

پہلے دن ٹھاکرانی رنجیتا کو شام سات بجے سے صبح سات بجے تک کے وقفے سے بہت خوف آیا۔ رات کے وہ بارہ گھنٹے بڑی آزمائش کے تھے۔ اگر ضدی بچہ بھوک سے اٹھا اور اس نے دودھ مانگا تو کیا ہوگا۔ اس کی ضد سے وہ خوب واقف تھی۔

اس خوف سے اس رات اسے نیند ہی نہیں آئی۔ نیند سے لڑتی ہوئی شانتا فرش پر پڑ کر سو گئی۔ مگر ٹھاکرانی جاگتی رہی۔ ادھر ننھا ٹھاکر بے سدھ سو رہا تھا۔ ٹھاکرانی کو بھی جھونک آگئی۔

مگر وہ رات ٹھاکرانی کے لئے زندگی کی سب سے بڑی خوشی لانے والی رات تھی!

ٹھاکرانی کی آنکھ اس احساس سے کھلی کہ ننھے ننھے ہاتھ کسی جستجو میں اس کی چھاتیوں کو ٹٹول رہے ہیں۔ وہ گھبرا کر اٹھی۔ یہ طے تھا کہ بچے کو بھوک لگی ہے۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ اب حمیدہ کو اس وقت تو نہیں بلایا جا سکتا تھا۔ ٹھاکرانی کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ خود کوشش کرے۔

اس سے پہلے اس طرح کی کوششوں کے نتیجے میں ماں کی تذلیل کے سوا اس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ وہ تماشا بننے سے گھبراتی تھی۔ چناں چہ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ شانتا سو رہی تھی۔ کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

اس نے بچے کو گود میں لٹاتے ہوئے کہا۔ ''اب تو ماں کی بھینٹ سویکار کر لو میرے ضدی بچے۔''

اگلے ہی لمحے اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ ننھا ٹھاکر بڑی رغبت سے اس کا دودھ پی رہا تھا۔

وہ ٹھاکرانی کی زندگی میں آنے والی سب سے بڑی، سب سے سچی خوشی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ ساری دنیا کو وہ منظر دکھائے۔ ڈھنڈورا پٹوائے کہ اس کے بچے نے اس کا دودھ قبول کر لیا ہے۔

بچے کے ماں کے دودھ کو رد کرنے کے تو بہت سے گواہ تھے۔ مگر اس کی قبولیت دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔ شانتا تھی۔ مگر وہ سو رہی تھی۔ ٹھاکرانی جھنجلا گئی۔ پھر اسے خیال آیا کہ یہ تو بہت اچھا موقع ہے۔ بچے کے دودھ کے معاملے میں تمام شکوک و شبہات ہمیشہ کے لئے دھل سکتے ہیں۔

اس نے کرخت آواز میں شانتا کو پکارا۔ ''مردار..... یہاں سونے کے لئے آئی ہے تو۔''

''شانتا گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔'' آنکھ لگ گئی تھی مالکن۔ چھوٹے ٹھاکر بھی تو سو رہے تھے۔''

''بچے کو رات میں ایک بار ضرور بھوک لگتی ہے۔ میں جاگ نہ رہی ہوتی تو یہ روتے نا۔'' ٹھاکرانی نے کہا۔

اس بات پر شانتا نے وہ منظر دیکھا اور گنگ رہ گئی۔ پھر بولی۔ ''بہت بدھائی ہو مالکن۔ چھوٹے ٹھاکر دودھ پی رہے ہیں۔''

''روز پیتے ہیں۔ تبھی تو خوش رہتے ہیں۔'' ٹھاکرانی نے بڑے ٹھسے سے کہا۔ ''اور اپنی ماں کا دودھ کون بچہ نہیں پیتا۔''

''پہلے تو نہیں پیتے تھے مالکن۔'' شانتا نے دبے لہجے میں کہا۔

''میرے دودھ میں کوئی خرابی تھی۔'' ٹھاکرانی بولی۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس وقت ہر بات نبھائی جا سکتی ہے۔ اس نے کہا۔ ''حمیدہ نے ایک بوٹی لا کر دی تھی مجھے، جس سے دودھ کی کڑواہٹ دور ہوگئی۔ اسی لئے تو میں نے حمیدہ کو قریب کر لیا ہے۔''

اچانک ٹھاکرانی کو احساس ہوا کہ ننھا ٹھاکر دودھ پیتے پیتے سو چکا ہے۔ اس نے شانتا کو پکارا۔ ''انہیں پنگھوڑے میں لٹا دے شانتا۔''

چند منٹ میں ٹھاکرانی بہت پراعتماد ہوگئی تھی۔ اس نے بچے کو اپنے پاس سلایا تھا۔ تاکہ تماشا نہ بنے۔ اب اسے یقین تھا کہ بچہ اس کا دودھ بھی پی لے گا۔ شانتا نے ٹھاکر کو پنگھوڑے میں لٹا دیا۔ ٹھاکرانی بھی بستر پر دراز ہوگئی۔

لیکن خاصی دیر وہ سو نہ سکی۔ خوشی اور فتح کا احساس اسے ہیجان میں مبتلا کر رہا تھا۔ اس دوران اس نے بہت کچھ سوچا بھی۔ اسے بہت سارے گواہ بنانے ہوں گے۔ پھر کوئی بھی حمیدہ پر دودھ پلانے کا شبہ بھی نہیں کر سکے گا۔ اس نے کہا۔ ''کل سے تیرے ساتھ یہاں کوئی اور بھی ہوگا۔ ایک سوئے تو ایک جاگے۔''

شانتا گھبرا گئی۔ ''اب ایسا نہیں ہوگا مالکن۔''

''میں غصے سے نہیں کہہ رہی ہوں۔'' ٹھاکرانی نے نرم لہجے میں کہا۔ ''تو ہر روز ہوگی۔ باقی نوکرانیاں روز بدلتی رہیں گی۔''

''ٹھیک ہے مالکن۔'' شانتا نے شکر گزاری سے کہا۔

اس لمحے ٹھاکرانی کو ایک خیال اور آیا۔ اب جب کہ بچے نے اس کا دودھ قبول کر لیا ہے تو ممکن ہے کہ اس کے دودھ میں ہی کوئی خرابی رہی ہو، جو اب دور ہوگئی ہو۔ ایسا ہے تو حمیدہ سے دودھ پلوانے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔

یہ سوچتے سوچتے اسے نیند آگئی۔

وہ جانتی تھی کہ ننھا ٹھاکر ٹھیک چھ بجے اٹھ جاتا ہے۔ اس کی بھی آنکھ کھل گئی۔ شانتا بچے کے کپڑے بدل رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''شانتا، چھوٹے ٹھاکر کو میرے پاس لٹا دے اور تو اب چلی جا۔''

شانتا کے جانے کے بعد ٹھاکرانی نے بچے کو دودھ پلانے کی کوشش کی۔ اسے خوشی تھی کہ اس نے شانتا کے جانے کے بعد وہ کوشش کی تھی۔ ورنہ بھرم ٹوٹ جاتا۔ اب ننھا ٹھاکر پھر اس کے دودھ سے انکاری تھا۔

اور سات بجے حمیدہ کے آتے ہی وہ مشینی انداز میں بہت تیز تیز ہاتھ پاؤں چلانے لگا۔ وہ اس سے دودھ مانگ رہا تھا۔ ٹھاکرانی نے سمجھ لیا کہ اس کے غیر معمولی طور پر سمجھ دار بچے نے اسے صرف رات کا اعزاز دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ دن میں اس کی ضد برقرار ہے۔ مگر اسے رنج نہیں ہوا۔ یہ خوشی کم نہیں تھی کہ بچے نے اس کی ماں کو بے عزتی سے بچا لیا تھا اور پردہ بھی رکھ لیا تھا۔

اگلے چند روز میں سب کو معلوم ہوگیا کہ چھوٹے ٹھاکر نے ٹھاکرانی کا دودھ سویکار کر لیا ہے!

ٹھاکر چند روز بہت مصروف رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ رنجیتا سے بات کرنے سے پہلے کچھ ضروری کارروائیاں مکمل کر لے۔ کچہری کے کام لمبے ہوتے ہیں۔

ٹھاکر کی بڑی بات تھی۔ مگر رسمی کارروائی میں بھی وقت تو لگتا ہے۔

کاغذات مکمل ہوگئے تو اس رات اس نے ٹھاکرانی کو اپنے کمرے میں بلا لیا اب ایسا کم ہی ہوتا تھا۔ کیوں کہ وہ خود دن میں کئی بار ٹھاکرانی کے کمرے میں چلا جاتا تھا۔ اس تبدیلی کی وجہ بیٹا تھا، جسے دیکھے بغیر اسے چین نہیں آتا تھا۔ اور اب وہ بیٹے کو دودھ پیتا دیکھ کر خوش بھی بہت ہوتا تھا۔ دودھ کا مسئلہ حل ہو جانے کے بعد ننھا ٹھاکر اوتار سنگھ بہت مختلف، بہت پیارا اور من موہنا بچہ ثابت ہو رہا تھا۔ اس کی ادائیں دل جیتنے والی تھیں۔ وہ ابھی بہت چھوٹا تھا..... بولنے کی منزل سے بہت دور۔ مگر اس میں اظہار کی غیر معمولی قدرت تھی۔ خوشی، غصہ، محبت، خفگی..... بچوں کے لئے یہی جذبے ہوتے ہیں۔ ننھا ٹھاکر ان کا بھرپور اظہار کرنا جانتا تھا۔

ٹھاکرانی خاص کمرے میں پہنچی تو ٹھاکر مسہری پر نیم دراز تھا۔ ٹھاکرانی اس کے پیروں کے پاس بیٹھ گئی اور پیر چھوتے ہوئے بولی ''کیا سیوا کروں سوامی جی؟ پیر دبا دوں آپ کے؟''

''مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے رنجیتا''

''حکم کریں ناتھ'' ٹھاکرانی مسکرائی۔ ''ویسے مجھے وشواس ہے کہ بات آپ کے پوت سے متعلق ہی ہوگی''

ٹھاکر پرتاپ سنگھ بھی مسکرا دیا ''اب اور کوئی بات تو جیسے ہم کر ہی نہیں سکتے''

''سو تو ہے۔ مگر مجھے اچھا لگتا ہے۔ آپ کمرے میں آتے ہیں تو اوتار سنگھ کے سوا کہیں نظر ہی نہیں ٹھہرتی آپ کی''

''برسوں کی پیاسی ہے نا''۔ ٹھاکر نے کہا۔ پھر بولا ''جو میں کرنے والا ہوں، بات بہت بڑی ہے۔ سمجھنے کی کوشش کرنا''

''سمجھ میں چاہے نہ آئے، پر آپ کی بات ماننا میرا دھرم ہے''

ٹھاکر چند لمحے سوچتا رہا کہ بات کہاں سے شروع کرے، کس طرح کرے۔ بالآخر اس نے کہا ''یہ دودھ جو معاملہ ہے، ہمارے لئے تو بالکل نیا اور انوکھا ہے۔ ہمیں تو اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ مگر جاننا بھی ضروری ہے''

ٹھاکرانی منہ سے کچھ نہ بولی۔ بس مستفسرانہ نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔

''تم جانتی ہو کہ راج پوتوں کو پکار راس نہیں۔ سر کا جھکنا قبول نہیں ہوتا ہمیں۔ اور احسان سر جھکا دیتا ہے۔ راج پوت کے لئے سر جھکا موت کے برابر ہے۔ پر جیون بھی عجیب چیز ہے۔ منش کتنا ہی طاقت ور ہو، بھگوان کی اچھا کے آگے بے بس ہو جاتا ہے۔ منش کا منش سے کام نکلتا ہے۔ پر راج پوت تو کسی سے کچھ نہیں لیتا۔ جیون بھی نہیں۔ لینا پڑ جائے تو اس کا بڑھ چڑھ کر بدلہ دیتا ہے۔ تاکہ سر تھوڑا سا اٹھانے کی گنجائش نکل آئے۔ بس یہ راج پوت کی آن کی بات ہے۔ ورنہ سر کسی کے آگ جھک جائے تو کبھی نہیں اٹھتا۔ تم سمجھ رہی ہوں نا رنجیتا؟''

ٹھاکرانی رنجیتا خوب سمجھ رہی تھی۔ اس کی رگوں میں بھی تو راج پوت خون تھا۔ ''جی ناتھ''۔

''ہمارا یہی حال ہے۔ ہم پر کسی نے اپکار کیا ہے۔ چھوٹا موٹا نہیں، جیون جیسی چیز دان کرنے کا اپکار..... اور وہ بھی ہمارے اس پوت کیلئے جو برسوں سے ہمارا سپنا تھا اور لگتا تھا، پورا کبھی نہیں ہوگا۔ اب اوتار سنگھ کے لئے تو ہم کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ ہے نا رنجیتا''۔

''اوش کر سکتے ہیں ناتھ''

''میں اس پر سوچتا رہا ہوں ٹھاکرانی۔ میں نے اس کے لئے جان کاری بھی ہے۔ مسلمانوں میں ایسے دودھ پلوایا جاتا ہے۔ اس کی اجرت بھی دی جاتی ہے۔ ہر آدمی اپنی حیثیت کے مطابق اجرت دیتا ہے۔ مگر دودھ پلانی کا احسان اپنی جگہ رہتا ہے۔

www.allurdu.com

تو رنجیتا، ہم جمال دین اور زبیدہ کے سامنے سر کبھی نہیں اٹھا سکتے۔ ہمیں ان کو اپنے برابر کا مقام دینا ہے''

ٹھاکرانی سوچتی رہی۔ یہ خیال کئی دن سے اسے بھی ستاتا رہا اور جو کچھ بھی کہہ رہا تھا، وہی اس نے بھی سوچا تھا۔ وہ تو ماں تھی۔ یہ کام اس کے لئے کچھ مشکل نہیں تھا۔ لیکن ٹھاکر کے لئے آسان نہیں تھا۔ اسے بس یہی فکر تھی۔ اب بھی وہ جو کچھ سوچ رہی تھی، ٹھاکری نکتہ نظر سے سوچ رہی تھی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا'' پر وہ تو ہماری رعیت ہیں نا ناتھ، ہم انہیں برابری کیسے دے سکتے ہیں''

''ٹھیک کہتی ہو، یہی میں نے سوچا تھا'' ٹھاکر نے پرجوش لہجے میں کہا۔''میں نے اس کا اپائے بھی سوچ لیا ہے''۔

''وہ کیا ہے ناتھ؟''

''ہم انہیں دودھ کی اجرت دیں گے، اتنی کہ وہ ہماری رعیت نہیں رہیں گے۔ ہمارے برابر کے ہو جائیں گے''

ٹھاکرانی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ بولی''میں مطلب نہیں سمجھی ناتھ''

''میں اپنی ساری زمین، جائیداد، نقدی، زیورات، سب آدھے سے کچھ زیادہ جمال دین کے نام کر رہا ہوں۔ یہ ان کا حق بھی ہے۔ پھر ان کے سامنے ہمیں بھی بڑائی کا احساس نہیں ہوگا''

ٹھاکرانی تو حمیدہ کے سامنے اپنے احساس برتری کو پہلے ہی ہار چکی تھی، اسے فکر تھی تو بس ٹھاکر کی۔ یہ سن کر اس نے سکون کا سانس لی۔ ٹھاکر بڑھ خلوص سے سر جھکانے کا سامان کر رہا تھا۔ مسئلہ حل ہو گیا تھا۔

ٹھاکر بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔''تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں رنجیتا؟'' اس نے بہت نرن لہجے میں پوچھا۔

''یہ کیسی بات کی ہے ناتھ۔ میرے لئے تو آپ کے چرنوں کی دھول ہی بات ہے۔ رہے چھوٹے ٹھاکر، تو ان فکر آپ کو مجھ سے زیادہ ہوگی۔ اور یہ تو میں جانتی ہوں کہ بھگوان کا دیا اتنا ہے کہ چھوٹے ٹھاکر کی نسلوں کے لئے کافی ہے''

ٹھاکر نے اسے گلے سے لگا لیا''تم بہت اچھی پتنی ہوں رنجو''

''یہ بتائیں، آپ نے کاغذات بنوا لئے ہیں'' ٹھاکرانی نے اچانک کہا۔

''ہاں۔ اور نقدی اور زیورات تو گھر کی بات ہے''

ٹھاکرانی سوچ میں پڑ گئی۔ ٹھاکر اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے بعد ٹھاکرانی نے سر اٹھایا اور دبے دبے لہجے میں بولی۔''ابھی آپ نے یہ سب کچھ انہیں دیا تو نہیں''

''نہیں''۔ ٹھاکر نے کہا۔''پر یہ تو بتاؤ، کیا بات ہے؟''

''دیکھیں، اب یہ سب کچھ کریں گے تو سب کو کھوج ہوگی کہ یہ کس بات کا انعام ہے۔ بہت لوگ سمجھ بھی جائیں گے۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے''۔

ٹھاکر نے بھی ایک لمحے سوچا''تم عقل والی ہو رنجو۔ بات تو ٹھیک ہے۔ پر میں اب یہ کام کر کے رہوں گا''۔

''آپ کریں گے تو ٹھیک ہی ہوگا''۔ ٹھاکرانی نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔

''تم فکر نہ کرو۔ میں جمال دین سے کہہ دوں گا کہ تین چار سال تک کسی کو پتا نہ چلے''۔

''اپنی بڑائی کوئی نہیں چھپاتا ناتھ''۔

''میں آدمی پہچانتا ہوں رنجو۔ جمال دین تو شاید یہ بات کبھی بھی کسی کو نہیں بتائے گا۔ وہ یہ سب کچھ آسانی سے لے گا بھی نہیں''۔

''ٹھیک ہے ناتھ، میرے لئے کوئی اور حکم؟''

''حکم نہیں، بنتی ہے۔ تم حمیدہ کو کبھی خود سے کم نہ سمجھنا۔ ہمیشہ اس کی عزت کرنا۔ اور اپنے بیٹے کو بھی یہی کچھ سکھانا۔ حمیدہ اس کے لئے ماتا سمان ہے اور وصال دین بھائی جیسا ہے''۔

''ایسا ہی ہوگا سوامی جی''

.....×.....

ٹھاکر کا یہ دعویٰ غلط نہیں تھا کہ اسے آدمی کی پہچان ہے!

اسی رات جب پورا گاؤں سو رہا تھا تو ٹھاکر، جمال دین کے گھر میں بیٹھا تھا۔ اس کے کہنے پر جمال دین نے حمیدہ کو بلایا۔ حمیدہ آئی تو ٹھاکر نے نقدی کے زیورات کی گٹھری اس کے قدموں میں ڈال دی۔

حمیدہ تو گنگ ہو کر رہ گئی۔ جمال دین نے گھبرا کر پوچھا۔''یہ کیا ہے ٹھاکر جی؟''

''کھول کر دیکھو۔ یہ سب حمیدہ کا ہے''

حمیدہ بت بنی بیٹھی تھی۔ جمال دین نیچے بیٹھا اور اس نے کانپتے ہاتھوں سے گٹھری کھولی۔ گٹھری کھلی تو ان دونوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''یہ..... یہ سب.....؟'' جمال دین نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ حمیدہ اب بھی چپ تھی۔

''یہ اس دودھ کا حق ہے جو حمیدہ نے میرے بچے کو پلایا ہے''۔ ٹھاکر نے کہا۔

پھر حمیدہ پہلی بار بولی۔ اور اس کے لہجے میں اذیت تھی۔''قیمت ادا کر رہے ہیں ٹھاکر جی؟''

ٹھاکر تڑپ گیا''نہیں۔ یہ تمہارے ہی ہاں کے رواج کے مطابق ہے'' اس نے مسلمان دوست سے جو کچھ سنا تھا، اسے استعمال کیا''قیمت تو ادا ہو ہی نہیں سکتی''۔ اس نے آخر میں کہا''یہ بات بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں''۔

''ٹھاکر جی، میں نے آپ کے کہنے پر نہیں، اپنے دل کے کہنے پر دودھ پلایا ہے چھوٹے ٹھاکر کو۔ میں تو تڑپ رہی تھی۔ مر رہی تھی اس کے لئے۔ آپ نے تو اجازت دے کر احسان کیا ہے مجھ پر۔ اور میں اس کا صلہ نہیں دے سکتی۔ اس لئے میں یہ سب کچھ نہیں لے سکتی'' حمیدہ نے کہا۔

''مگر اس کا صلہ تو تمہارے رواج کے مطابق تمہارا حق ہے''

''یہ ویسی بات نہیں مالک۔ میں سچ کہتی ہوں کہ اگر چھوٹے ٹھاکر کو دودھ نہ پلاتی تو مر جاتی شاید''

غیر عورت کی یہ اپنائیت..... بلکہ محبت بھری بات سن کر شاکر کو کچھ ہو گیا۔ اس کے دل میں اس غیر عورت کے لئے عجیب طرح کی محبت پھوٹی''تو حمیدہ، میرے بچے سے کوئی ناتا ہے تو ناتا تمہارا۔ کوئی کسی کے لئے یوں نہیں تڑپتا، یوں نہیں مرتا۔ اب میں تم سے کہتا ہوں حمیدہ کہ آج سے تم میری بہن ہو۔ اور بہن ہونے کا حق تم پہلے ہی ادا کر چکی ہو''

''یہ کیا کہہ رہے ہیں مالک؟''

''اب مجھے کبھی مالک نہ کہنا۔ میں بھائی ہوں تمہارا۔ ہم ٹھاکر کبھی کسی سے رشتہ نہیں جوڑتے۔ جوڑ لیں تو جیون بھر نبھاتے ہیں''

''ہم اس قابل نہیں مالک'' اب کے جمال دین ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا۔

''اب تم کیا چاہتے ہو۔ یہ کہ میں اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا کاٹ لوں'' ٹھاکر غرایا۔

www.allurdu.com

جمال دین تھر تھر کانپنے لگا۔حمیدہ سر جھکا کر بولی ''ٹھیک ہے ویر جی، پر یہ بوجھ ہم نہیں اٹھا سکتے'' اس نے گٹھری کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ تو اب تمہارا ہے۔ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی بہن کا حصہ اور اس کے علاوہ بہت کچھ ہے'' ٹھاکر نے جیب سے کاغذات نکال کر زیورات پر رکھ دیئے۔''یہ زمین کے کاغذات ہیں''۔

حمیدہ رونے لگی۔''یہ میں کیسے مان لوں.....''

''تو بھائی کی ارتھی اٹھنے پر مانو گی'' ٹھاکر نے کڑے لہجے میں کہا۔

جمال دین کا چہرہ فق ہو گیا۔''چلو حمیدہ.....اٹھاؤ اسے۔اب کوئی بات نہ کرنا'' اس نے حمیدہ کو ڈانٹا۔پھر وہ ٹھاکر کی طرف مڑا''اب کوئی بری بات منہ سے نہ نکالنا مالک۔ ہم جاں نثار لوگ ہیں۔یہ سب نہیں سن سکتے''۔

''تم بھی آئندہ مجھے مالک نہ کہنا'' ٹھاکر نے جمال دین سے کہا۔

''تت.....تو.....کیا؟''

''تم میرے کون ہو؟''

''میں آپ کا وفادار غلام ہوں''

''نہیں۔حمیدہ بہن کے رشتے سے اب تم میرے جیجا ہو''

''تو میں کیا کہوں مالک؟''

ٹھاکر نے چند لمحے سوچا''بس ٹھاکر جی کہہ لینا۔اس سے آگے کچھ نہیں''

''ٹھیک ہے ٹھاکر جی''

''اب میں چلتا ہوں'' ٹھاکر نے کہا۔مگر دروازے پر پہنچ کر وہ مڑا۔''سنو.....اس رشتے سے میرے گھر، میرے پورے پریوار پر تمہارا ادھیکار ہے۔یہ بات کبھی نہ بھولنا۔ اور میرے گھر میں کوئی بھی اس سے انکار نہیں کرے گا۔یہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی زبان ہے'' پھر وہ گھر سے نکل گیا

.....×.....

آنے والے وقت میں یہ ثابت ہوتا گیا کہ ننھے ٹھاکر اوتار سنگھ کو کسی کی تربیت کی ضرورت نہیں تھی۔وہ دودھ کے حق کو اور اس کے رشتوں کو خوب پہچانتا تھا۔اس کی بے معنی غوں غاں بامعنی لفظوں سے قریب ہونے لگی تو کیا ٹھاکرانی اور کیا ملازم، سبھی اسے سکھانے پر تل گئے۔ٹھاکر کے لئے پتا جی اور ٹھاکرانی کے لئے ماتا جی''

بس ان ہی دو لفظوں کی تلقین کی جا رہی تھی اسے.....لیکن خود اس نے دودھ کا احترام ملحوظ رکھا۔پہلا لفظ جو اس کی زبان سے ادا ہوا، وہ اماں تھا.....اور حمیدہ کے لئے تھا۔اور پہلا لفظ ادا کرنے کے بعد وہ دو ماہ تک اور کچھ نہیں بولا۔سکھانے والوں کو لگتا تھا کہ وہ دیوار سے سر پھوڑ رہے ہیں اور حمیدہ کو اماں کہتے ہوئے اس کی آواز میں لپک، لہجے میں مٹھاس اور آنکھوں میں وارفتگی ہوتی تھی۔

پھر دو ماہ بعد وہ بولا تو خوب بولا۔ابتدا میں ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ بلا کا ذہین ہے۔ایک بار سننے کے بعد کوئی لفظ کبھی اس کے حافظے سے محو نہیں ہوا۔اس کی سیکھنے کی رفتار بہت تیز تھی۔

بچے کی بڑھوتی کا عمل اتنا خوب صورت ہوتا ہے کہ مائیں اس کے سحر میں گرفتار رہتی ہیں۔اور ٹھاکرانی رنجیتا تو وہ ماں تھی، جسے نا امیدی کی انتہا پر پہنچ کر معجزانہ طور پر بیٹا ملا تھا۔وہ تو زندگی کا سب سے خوب صورت وقت گزار رہی تھی۔اسے ہوش ہی نہیں تھا۔وہ تو جب چھوٹا ٹھاکر پٹ پٹ بولنے لگا اور بولتا چلا گیا تو اچانک ایک دن اسے خیال آیا کہ اب وہ کسی دن، کسی کے بھی سامنے حمیدہ سے دودھ مانگ سکتا ہے۔تب اس نے پہلی بار اسے سمجھایا۔''پتر.....کبھی کسی کے سامنے اماں سے دودھ نہ مانگنا۔اور کبھی کسی کو بتانا بھی نہیں''۔

ننھا ٹھاکر ٹکر ٹکر ماں کو دیکھتا رہا۔منہ سے کچھ نہیں بولا۔اس نے وجہ بھی نہیں پوچھی۔

وہ تو ٹھاکرانی کو بعد میں احساس ہوا کہ چھوٹے ٹھاکر کی زبان چلے چھ ماہ ہو چکے ہیں۔اور وہ اب اسے یہ بات سمجھا رہی ہے۔اس نے یہ نہیں سوچا کہ ان چھ ماہ میں اب تک چھوٹے ٹھاکر نے ایسا نہیں کیا ہے۔ورنہ تو اس کی بے خبری میں بھانڈا پھوٹ چکا ہوتا۔یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔

چھوٹے ٹھاکر اوتار سنگھ کے دو سال کا ہوتے ہوتے بہت کچھ واضح ہو چکا تھا۔وہ حمیدہ کو اپنی ماتا جی سے کم نہیں سمجھتا تھا۔بلکہ شاید ماتا جی کی نسبت اس سے زیادہ محبت کرتا تھا۔دوسرے وہ وصال دین سے بہت قریب تھا۔اتنا قریب کہ اس سے دوری اسے گوارا نہیں تھی۔وہی ایک اس کا ہم جولی تھا۔اپنی ہر چیز، ہر کھلونے میں وہ اسے شریک کرتا تھا۔اس کے بغیر کھیلتا ہی نہیں تھا۔اور وہ اپنے سے دس ماہ بڑے وصال دین کو ویر جی کہتا تھا۔لیکن حمیدہ اور وصال دین سے اس کے تعلق سے بڑھ کر غیر معمولی اس کا جمال دین سے تعلق تھا۔جمال دین سے اس کا سامنا بہت کم ہوتا تھا۔لیکن جب بھی ہوتا، وہ جمال دین سے بڑے احترام اور ادب سے ملتا۔اور کسی کے سمجھائے بغیر وہ خود سے اسے چاچا جی کہتا تھا۔ہاں ٹھاکر پرتاپ سنگھ سے اسے بے حد محبت تھی۔اور وہ جانتا تھا کہ ان سے ناز برداری کرانا اس کا حق ہے۔اور لطف یہ کہ اس کے خیال میں ان پر ویر جی.....یعنی وصال دین کا بھی اتنا ہی حق تھا۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ ان دو برسوں میں بہت بدل گیا تھا۔اس کا بس چلتا تو وہ حویلی سے باہر ہی نہ نکلتا۔ہر وقت اپنے بیٹے کو دیکھتا رہتا۔اپنے بچوں کو جسمانی محبت اور قربت دینا راج پوت کا مزاج نہیں۔لیکن ٹھاکر مختلف تھا۔وہ بیٹے کو گود میں اٹھاتا، زانو پر بٹھاتا، اسے چومتا، پیار کرتا اور ٹھاکرانی یہ دیکھ کر نہال ہوتی یہ بیٹا اس کی زندگی میں بہار لایا تھا۔

ٹھاکر کی ایک بات عجیب تھی۔وہ اپنے ننھے سے بیٹے سے بڑے احترام سے بات کرتا تھا۔وہ ہمیشہ اسے آپ کہتا۔اس نے کبھی اسے تم کہہ کر مخاطب نہیں کیا۔سچ یہ ہے کہ اتنی عزت اس نے بھی کسی کو نہیں دی تھی۔شاید اس کا سبب وہ واقعات تھے، جو ننھے ٹھاکر کی پیدائش سے پہلے اور فوراً بعد پیش آئے تھے۔ٹھاکر کے دل میں یہ خیال راسخ ہو گیا تھا کہ اس کا بیٹا بہت خاص ہے.....کوئی آسمانی چیز۔

ٹھاکر نے بیٹے کیلئے کوئی کمی نہیں چھوڑی۔کوئی کھلونا ایسا نہیں، جو وہ اس کے لئے نہیں لایا ہو۔اور اسے خوشی تھی کہ اس کا بیٹا اپنے دودھ شریک بھائی کو اپنی ہر چیز میں شریک کرتا ہے۔وہ بہت خوش، مطمئن اور آسودہ تھا۔

ننھے ٹھاکر کو لکڑی کا گھوڑا بہت پسند تھا۔وہ اس پر بیٹھ کر جھولتا رہتا۔آگے پیچھے، آگے پیچھے۔پھر ایک دن اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اس محرک کے باوجود وہ اور اس کا گھوڑا وہیں کے وہیں رہتے ہیں، ذرا سا بھی آگے نہیں بڑھتے۔شاید اس کا غیر شعوری احساس اسے ویر جی کو گھوڑے پر سواری کرتے دیکھ کر ہو گیا تھا۔لیکن شعوری طور پر اس نے یہ بات اپنے ہی حوالے سے سمجھی اور پھر اس نے اس گھوڑے کو چھوڑ دیا۔وہ اس کے دل سے اتر گیا تھا۔

تب چھوٹے سے ٹھاکر اوتار سنگھ نے ایک بڑی بات سمجھی۔لکڑی کا وہ گھوڑا اسے بہت محبوب تھا۔اور اب وہ دل سے اترا تو جیسے اس کے اندر کوئی کمی ہو گئی۔کوئی خلا پیدا ہو گیا۔اس کے نتیجے میں بہت کچھ ہوا۔وہ چڑچڑا اور اداس ہو گیا۔اسے جھنجھلاہٹ تھی کہ گھوڑا اس کی توقع پر پورا نہیں اترا۔وہ بے کیف اور ناخوش ہو گیا۔

یہ بات ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے محسوس کر لی۔''کیا بات ہے پتر، آپ چپ چپ کیوں ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''پتا نہیں پتا جی''۔تین سالہ اوتار سنگھ نے جواب دیا۔

ٹھاکر نے متروک گھوڑے کو دیکھا۔اسے حیرت ہوئی۔کیوں کہ پچھلے کافی دنوں سے اس کے بیٹے کا محبوب ترین مشغلہ اس پر سواری کرنا تھا۔''اور آج آپ اس گھوڑے پر بیٹھ کر سیر کو بھی نہیں گئے''۔اس نے کہا۔

''یہ گھوڑا بہت خراب ہے پتا جی''۔

''کیوں بھئی؟ کیا خرابی ہے اس میں؟'' ٹھاکر نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''یہ ایک جگہ کھڑا رہتا ہے۔اپنی جگہ سے آگے نہیں بڑھتا''۔

''تو پھر؟''۔

''میں اس پر بیٹھ کر سیر کرنا چاہتا ہوں۔یہ نہیں کرا سکتا۔اب میں اس پر نہیں بیٹھوں گا''۔

''تو پتر، یہ اصلی گھوڑا تو نہیں ہے۔یہ تو لکڑی کا گھوڑا ہے''۔

''آپ مجھے اصلی گھوڑا لا دیں۔میں اس پر بیٹھوں گا''۔

''ابھی آپ بہت چھوٹے ہو پتر۔اس پر نہیں بیٹھ سکتے۔بڑے ہوں گے تو میں خود آپ کو گھڑ سواری سکھاؤں گا''۔

''نہیں پتا جی۔مجھے تو ابھی گھوڑے پر بیٹھنا ہے''۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ سوچ میں پڑ گیا۔اس نے دیکھا تھا کہ اس کا بیٹا ضد کم کرتا ہے۔لیکن ضد کرے تو پھر پیچھے نہیں ہٹتا۔اب مزید سمجھانے کا مطلب یہ ہوتا کہ اس کی ضد بڑھے گی۔چناں چہ اس سے بچنا ضروری ہے۔پر اب اسے بہلایا کیسے جائے۔

اچانک وہ مسکرایا۔وہ کسی بھی رنگ، نسل اور مذہب سے تعلق رکھتا ہو، ہر باپ کے اندر ایک گھوڑا چھپا ہوتا ہے۔اس لمحے ٹھاکر پرتاپ سنگھ کے اندر بھی ایک گھوڑا ہنہنایا۔

''میں آپ کو ابھی ایک ایسا گھوڑا لا کر دیتا ہوں پتر''۔اس نے کہا اور کمرے کی طرف چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک لمبی ڈوری تھی۔اس ڈوری کو اس نے درمیان میں سے اپنے دانتوں سے گزارا اور زمین پر گھٹنے ٹیکا کر گھوڑا بن گیا۔''آؤ پتر، بیٹھ جاؤ۔اور یہ لگام تھام لو''۔اس نے بیٹے سے کہا۔

ننھا ٹھاکر بڑے اشتیاق سے اس کی پیٹھ پر بیٹھ گیا۔وہ اصلی گھوڑے کے مسئلے کو بھول ہی گیا تھا۔''یہ لگام کس لئے ہیں پتا جی؟''۔اس نے پوچھا۔

''انہیں سیدھے ہاتھ کی طرف جھٹکو گے تو گھوڑا داہنی جانب مڑے گا۔الٹے ہاتھ کی طرف جھٹکو گے تو گھوڑا بائیں جانب مڑے گا۔اور لگام اپنی طرف کھینچو گے تو گھوڑا رک جائے گا''۔ٹھاکر نے اسے سمجھایا۔

''ٹھیک ہے گھوڑے میاں، اب چلو''۔ننھے ٹھاکر نے ڈھیلی لگام کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

اور ٹھاکر نے اپنے لاڈلے بیٹے کو بٹھا کر گھوڑے کی طرح دوڑنا شروع کر دیا۔بیٹا بھی اپنے اختیار کو چیک کرنے کے لئے بھی لگام ایک طرف جھٹکتا، کبھی دوسری طرف جھٹکتا اور کبھی کھینچ لیتا۔وہ بہت خوش تھا۔

وہ دونوں حویلی کے بہت بڑے دالان میں اس طرح دوڑ لگاتے رہے۔ٹھاکر کو حیرت ہوئی کہ اسے تھکن کیوں نہیں ہوئی ہے۔اسے احساس تھا کہ حویلی کے سارے نوکر یہ تماشا دیکھ رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں۔سب خوش ہیں۔ٹھاکرانی کے چہرے سے تو روشنی پھوٹ رہی تھی۔

''چھوٹے ٹھاکر، اب گھوڑا تھک گیا ہوگا۔اسے آرام کرنے دو''۔ٹھاکرانی نے پکار کر کہا۔

ننھے ٹھاکر نے لگام کھینچی اور گھوڑا رک گیا۔ننھے ٹھاکر نے اوپر بیٹھے بیٹھے پوچھا۔''پتا جی، گھوڑے تھک بھی جاتے ہیں؟''۔

''کیوں نہیں پتر۔محنت کرنے سے ہر جان دار تھکتا ہے۔گھوڑے بھی [illegible] جلدی تھک جاتے ہیں''

www.allurdu.com

ننھا ٹھاکر باپ کی پیٹھ سے اتر آیا۔ ''آپ بڈھے ہیں پتا جی؟'' اس نے پوچھا۔

''میں بڈھا تھا پتر''۔ ٹھاکر نے بلا جھجک کہا۔ ''پر آپ کے آنے کے بعد میں جوان ہو گیا ہوں''۔

ٹھاکرانی جلدی سے لسی کا بڑا پیالہ لے کر پہنچی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں تولیا تھا۔ ''میرے چھوٹے ٹھاکر، تمہارے پتا جی تو تمہیں نہیں بتائیں گے۔ مجھے بتانا پڑے گا''۔ اس نے بیٹے سے کہا۔ ''گھوڑے کا کچھ حق بھی ہوتا ہے اپنے سوار پر۔ وہ ہمیشہ پورے کیا کرو''۔

ننھے ٹھاکر نے کچھ نہیں کہا۔ بس ماں کو استفسار طلب نظروں سے دیکھتا رہا۔

''گھوڑے کے رکتے ہی اس کا پسینہ خشک کرتے ہیں، اس کے جسم کی مالش کرتے ہیں اور اسے کھلاتے بھی ہیں''۔ یہ کہہ کر ٹھاکرانی نے ٹھاکر کے پسینے میں نہائے ہوئے جسم کو تولئے سے پونچھا۔ پھر لسی کا پیالہ اس کی طرف بڑھایا۔ ''لو ناتھ، یہ پی لو''۔

ٹھاکر نے ممنونیت سے پتنی کو دیکھا۔ وہ پیالہ منہ سے لگا ہی رہا تھا کہ ننھے ٹھاکر نے اسے ٹوک دیا۔ ''پتا جی، گھوڑے تو گھاس کھاتے ہیں''۔

''یہ تو تمہارے پتا جی ہیں پتر''۔ ٹھاکرانی نے جلدی سے کہا۔ ''تمہاری محبت میں تھوڑی دیر کے لئے گھوڑا بن گئے ہیں''۔

''ٹھیک ہے ماتا جی''۔ ننھے ٹھاکر نے کہا اور دودھ کے پیالے کو بڑی محبت سے ہاتھ لگایا۔ ''پی لیں پتا جی''۔ اس کے لہجے میں بھی محبت تھی۔

ٹھاکر کے لئے وہ بڑی خوشی کا دن تھا۔ پہلی بار اس نے اپنے جسم و جاں سے بیٹے کے لئے کچھ کیا تھا۔

دوسرے دن بیٹے نے صبح سویرے ہی ٹھاکر سے گھوڑا بننے کی فرمائش کر دی۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اس نے باگیں کھینچ لیں۔ ''بس پتا جی''۔ اس نے کہا اور اس کی پیٹھ سے اتر آیا۔

''کیوں پتر، بس اتنی سی دیر؟ مجھے تو مزہ نہیں آیا''۔ ٹھاکر نے شکایت کی۔

''پتا جی، میں آپ کو بہت تھکانا نہیں چاہتا''۔ ننھے ٹھاکر نے کہا۔ ''اور اب ویر جی کی باری ہے''۔

گھوڑے کی طرح بیٹھا ہوا تھا کر صرف چند لمحوں کے لئے ہچکچایا۔ کوئی دیکھتا تو اس ہچکچاہٹ کا سبب بھی نہ سمجھ پاتا۔ یہی سمجھتا کہ اپنے سے نیچے کسی شخص کے بچے کو پیٹھ پر بٹھانے سے جھجک رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ نہیں تھی۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے ان چند لمحوں میں بہت کچھ سوچا۔ یہ تو اس نے پہلے ہی لمحے میں سمجھ لیا کہ یہ بھگوان نے اسے بہت اچھا موقع دیا ہے۔ پھر اس نے آگے غور کیا۔ جمال دین کے گھرانے پر اس کے پریوار کی عنایت پر سب لوگ سرگوشیوں میں بات کرتے ہوں گے یہ اسے معاملات کو فطری رخ پر لے جانے کا موقع ملا تھا۔ اب وہ وصال دین کا گھوڑا بنے گا تو سب ملازم دیکھیں گے اور سمجھ لیں گے کہ ٹھاکر جی کو بیٹا ملا ہے تو وہ ایسے نرم ہو گئے ہیں کہ اپنے کارندوں کے بچوں کو بھی بچہ سمجھتے ہیں۔ یہ تاثر ایک بار جم گیا تو آگے کے تمام معاملات کو بھی اسی روشنی میں دیکھا جائے گا۔ پھر کسی کو بھی کوئی شبہ نہیں ہوگا۔

چنانچہ ٹھاکر نے سر اٹھا کر بڑی محبت سے وصال دین کو دیکھا اور بولا۔ ''آؤ وصال دین، گھوڑے پر بیٹھ جاؤ۔ گھوڑا چلانا آتا ہے تمہیں؟''۔

پونے چار سال کا وصال دین معصوم بچہ ہی تو تھا۔ اتنے چھوٹے بچوں کو کسی کے مقام اور مرتبے کا کہاں پتا ہوتا ہے۔ اور پھر وہ اوتار سنگھ کے تمام کھلونوں سے کھیلتا رہا تھا۔ تو یہ کھلونا کیوں چھوڑتا۔ ''آتا ہے ٹھاکر جی''۔ اس نے گردن اکڑا کر بڑے فخر سے کہا اور ٹھاکر کی پیٹھ پر چڑھ گیا۔ ''چلو..... گھوڑے میاں''۔ اس نے اوتار سنگھ کی طرح آواز لگائی۔

ادھر ٹھاکر نے دوڑ لگائی، ادھر پوری حویلی میں ہلچل مچ گئی۔ سب کو پتا چل گیا کہ ٹھاکر جی جمال دین کے بیٹے وصال دین کا گھوڑا بن گئے ہیں۔ سب سے پہلے تو ٹھاکرانی دوڑی آئی۔ وہ منظر دیکھ کر وہ بت بن کر رہ گئی۔ ٹھاکر جی سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ بس ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔

حمیدہ نے یہ سنا تو ننگے پاؤں دالان کی طرف لپکی۔ ٹھاکر سب سے بے نیاز گھوڑا بن کر دوڑ رہا تھا۔ حمیدہ ایسے بوکھلا کر آئی تھی کہ اسے کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ ٹھاکر کے قریب پہنچ کر وہ وصال دین پر گرجی۔ ''یہ کیا کر رہا ہے منحوس۔ تجھے تمیز نہیں۔ یہ ٹھاکر جی ہیں''۔

وصال دین سہم گیا۔ ماں ہمیشہ لاڈ پیار کرتی تھی۔ اس طرح پہلے کبھی نہیں ڈانٹا تھا اس نے۔ اس نے گھبرا کر جلدی سے باگیں کھینچ لیں۔ ٹھاکر رک گیا۔ اس نے سر اٹھا کر حمیدہ کو دیکھا۔ ''کیوں ڈانٹتی ہو اسے؟''۔

''میں تو اسے جان سے مار دوں گی''۔ حمیدہ غرائی۔ پھر وصال دین کی طرف پلٹی۔ ''اترتا ہے کہ نہیں''۔

وصال دین اترنے لگا تو ٹھاکر نے خود کو اونچا کر لیا۔ ''نا وصال دین، ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ بیٹھا رہ۔ میں تیری ماں کو سمجھا لوں گا''۔ اس نے کہا۔

حمیدہ کو بھی کچھ ہوش آیا۔ ''اسے یوں سر نہ چڑھائیں ٹھاکر جی''۔

ٹھاکر جی نے تنبیہی لہجے میں دہرایا۔ ''ٹھاکر جی! ایسے بات کرتے ہیں بھلا''۔

حمیدہ اس کی بات سمجھ گئی۔ سرگوشی میں بولی۔ ''یہ کیا کرتے ہیں ویر جی''۔

ٹھاکر نے بلند آواز میں کہا تا کہ سب ملازم سن لیں۔ ''سن حمیدہ، تیرا بیٹا میرے اوتار سنگھ کا دوست ہے۔ اس ناتے یہ اس کا حق ہے مجھ پر۔ اور میں اپنے اوتار سنگھ کی بات کیسے ٹال سکتا ہوں''۔

''مگر یہ گستاخی ہے مالک''۔ حمیدہ نے بھی بلند آواز میں کہا۔

اس پر ٹھاکر نے اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔ لفظ مالک سننا اسے گوارا نہیں تھا۔ ''تو چنتا نہ کر حمیدہ۔ میں نے خود اسے اٹھایا ہے۔ یہ میرے حکم کی تعمیل کر رہا ہے اور گستاخی تو میرا حکم نہ ماننے میں ہوتی۔ تو بھی مجھ سے بحث نہ کر۔ جا چلی جا''۔ یہ کہہ کر ٹھاکر اوپر بیٹھے وصال دین سے مخاطب ہوا۔ ہاں بھئی، چلا گھوڑے کو''۔

مگر وصال دین اب چوکڑی بھول چکا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس نے ضرور کوئی غلطی کی ہے۔ وہ بیٹھا تو رہا۔ مگر اکھڑا اکھڑا تھا۔ دو چکروں کے بعد ٹھاکر نے اسے اتار دیا۔ ٹھاکرانی تو لیا اور لسی لے کر آ گئی۔

یہ سچ ہے کہ اس روز ٹھاکر نے سب لوگوں کو بہت کچھ سمجھا دیا۔ مالک کے تیور پہچاننے والوں نے سمجھ لیا کہ جمال دین، حمیدہ اور وصال دین کی کوئی حیثیت ہے۔ اور اب انہیں اس حیثیت کا خیال رکھنا ہے۔

.....x.....

اس رات حمیدہ نے یہ روداد جمال دین کو سنا دی۔ جمال دین پریشان ہو گیا۔ ''یہ تو بہت خطرناک بات ہے حمیدہ''۔ اس نے متوحش ہو کر کہا۔ ''ہم لوگ برسوں سے آگ سے کھیل رہے ہیں۔ یہ تو اللہ کی مہربانی ہے کہ اب تک کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔ اب تم نے شروع کیا ہے''۔

www.allurdu.com

''میں نے کیا کیا ہے؟''۔حمیدہ نے بھڑک کر کہا۔

''چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلانے کا شوق تمہیں ہوا تھا۔یہ سب وہیں سے شروع ہوا ہے''۔

''تم مرد ہو۔میری مجبوری کیا سمجھو گے''۔حمیدہ بولی۔''لیکن یہ تو سوچہ کہ صرف میرے چاہنے سے کیا ہوتا۔چھوٹے ٹھاکر نے خود ضد باندھ لی تھی کہ دودھ میرا ہی پئیں گے''۔یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں فخر تھا۔''اب یہ تو اللہ کی مرضی ہی تھی۔ورنہ اتنے چھوٹے بچے ایسی ضد نہیں کر سکتے''۔

''یہ بات تو ٹھیک ہے۔مگر.....''۔

''آپ پریشان کیوں ہو''۔حمیدہ نے کہا۔''اب یہ بھی بڑے ٹھاکر خود ہی کر رہے ہیں''۔

''وہ تو ٹھیک ہے۔مگر ہمارے بیٹے کی تو عادتیں بگڑ جائیں گی۔اور کسی دن راج پوت کا خون جوش مار گیا تو کیا ہوگا۔سوچو تو حمیدہ۔کچھ بھی ہوسکتا ہے مجھے اپنی فکر نہیں۔لیکن میرا بیٹا.....''۔

حمیدہ بھی پریشان ہوگئی۔''ڈر تو مجھے بھی لگتا ہے۔مگر ہم کر کیا سکتے ہیں''۔

''اپنے بیٹے کی تربیت تو کر سکتے ہیں۔اسے سمجھا تو سکتے ہیں کہ اپنی حیثیت ہمیشہ یاد رکھے۔وہ سر چڑھائیں تو بھی نہ چڑھے''۔

''کوئی کسی کو کچھ نہیں سکھا سکتا۔وقت آپ ہی سکھا دیتا ہے۔اوپر سے گرے گا تو خود سمجھ جائے گا''۔

''سکھانا تو ہوتا ہے حمیدہ''۔جمال دین نے آہ بھر کے کہا۔''ورنہ اللہ تربیت کا حکم کیوں دیتا۔پھر آدمی بے خبری میں گرے تو چوٹ لگتی ہے۔بہت تکلیف ہوتی ہے۔میں نہیں چاہتا کہ میرے بیٹے کو کوئی تکلیف ہو۔اسے گرنے کے لئے ہمیشہ تیار رہنا ہوگا''۔

''پر یہ سب کچھ اسے کیسے سمجھاؤ گے؟''۔

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔اب بے فکر ہو کر سو جاؤ۔میں دیکھ لوں گا''۔جمال دین نے کہا اور کروٹ بدل لی۔

.....x.....

جمال دین پر حویلی کے دروازے بہت پہلے کھل چکے تھے۔وہ حویلی میں جب چاہے آسکتا تھا اور جہاں چاہے جا سکتا تھا۔اس پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ٹھاکر کے خاص کمرے میں بھی وہ بغیر بتائے جا سکتا تھا۔چھوٹے ٹھاکر کا پہلا جنم دن بڑی دھوم دھام سے منایا گیا تھا۔اور اس روز ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے اپنے تمام رشتے داروں پر واضح کر دیا تھا کہ وہ اس مسلمان پریوار کو اپنے رشتے داروں سے کم نہیں سمجھتا۔

لیکن جمال دین نے اس رعایت سے کبھی استفادہ نہیں کیا تھا۔وہ اپنی کھال میں رہنے والا آدمی تھا۔جانتا تھا کہ آسانی اپنے مقام پر رہنے میں ہے۔انسان کی عنایت کا کچھ اعتبار نہیں۔کون جانے کب عتاب میں تبدیل ہو جائے۔چناں چہ وہ کبھی کبھار ہی حویلی میں جاتا تھا۔

مگر اس صبح وہ حمیدہ اور وصال دین کے ساتھ حویلی میں چلا گیا۔وہ دونوں تو ہر روز حویلی میں جاتے تھے۔چھوٹے ٹھاکر کا دودھ چھڑا دیا گیا تھا۔مگر معمول پھر بھی نہیں بدلا تھا۔حیرت انگیز بات یہ تھی کہ دودھ چھڑانے پر چھوٹے ٹھاکر نے بالکل واویلا نہیں کیا تھا۔کوئی ضد نہیں کی تھی۔بس ایک صبح حمیدہ نے اس سے کہا تھا۔''چھوٹے ٹھاکر،اب آپ خیر سے بڑے ہو گئے ہیں۔اب آپ کو ایسے دودھ نہیں پینا ہے''۔

اودتار سنگھ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔بس وہ ٹکر ٹکر اماں کو دیکھتا رہا۔

وصال دین نے کہا۔''اور کیا چھوٹے ویر۔دیکھو میں تو پہلے ہی ماں کا دودھ چھوڑ چکا ہوں۔اب میں بڑا ہو گیا ہوں نا''۔اس نے پنجوں کے بل کھڑے ہو کر قد اونچا کر کے دکھایا۔

اودتار سنگھ نے بھی اس کی نقل کی اور پھر طمانیت سے سر ہلایا،جیسے اپنے بڑے ہو جانے کا یقین آ گیا ہو۔''اب میں ایسے دودھ نہیں پیوں گا اماں''۔اس نے کہا۔

انداز ایسا تھا کہ حمیدہ نے اس کی بلائیں لے لیں۔پھر وہ بولی۔''آپ کو بھوک لگ رہی ہوگی چھوٹے ٹھاکر۔دودھ نہیں پئیں گے؟''۔

''نہیں اماں۔بھوک تو لگ رہی ہے۔پر میں دودھ نہیں پیوں گا''۔

''دودھ نہیں پئیں گے تو اور بڑے کیسے ہوں گے''۔

''پر آپ ہی تو کہہ رہی تھیں کہ.....''۔

''ٹھہریں۔میں آپ کو بتاتی ہوں کہ اب آپ کو دودھ کیسے پینا ہے''۔یہ کہہ کر حمیدہ چلی گئی۔ذرا دیر بعد وہ ٹھاکرانی کے ساتھ واپس آئی۔اس کے ہاتھ میں چاندی کا کٹورہ تھا،جس میں دودھ تھا۔اس نے کٹورہ ٹھاکرانی کو دیا۔''لیں مالکن،چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلا دیں''۔

ٹھاکرانی دودھ پلانے لگی تو ننھے ٹھاکر انی نے ہاتھ سے کٹورے کو پرے کر دیا۔بولا۔''اماں کے ہاتھ سے پیوں گا''۔

ٹھاکرانی ہنسنے لگی۔''وقت کے بڑے پکے ہیں میرے چھوٹے ٹھاکر۔لے حمیدہ،یہ وقت تو تیرا ہی ہے''۔

حمیدہ نے دودھ پلا دیا۔یوں معمول وہی رہا،وقت وہی رہا،بس دودھ پینے کا انداز بدل گیا۔

سو اس صبح جمال دین بیوی اور بیٹے کے ساتھ حویلی میں چلا گیا۔اس سے پہلے حویلی میں اتنی صبح وہ کبھی نہیں گیا تھا۔اس نے ٹھاکرانی کو بڑے ادب سے سلام کیا۔ٹھاکرانی بڑے تپاک سے مسکرائی۔''آؤ جمال دین،آج کیسے رستہ بھول پڑے۔تم تو کبھی آتے ہی نہیں''۔

''بس مالکن،مصروفیت ہی اتنی ہے۔زمین فرصت ہی نہیں دیتی''۔

''جل پان کرو گے۔کچھ لاؤں؟''۔

''شکریہ مالکن۔ابھی ناشتہ کر کے نکلا ہوں''۔

''ٹھاکر جی تو اپنے کمرے میں ہیں۔اور راستا تمہیں معلوم ہی ہے''۔ٹھاکرانی نے کہا۔اس نے یہ نہیں کہا کہ ٹھاکر جی سو رہے ہیں۔جانتی تھی کہ ٹھاکر نے اپنے طور پر جمال دین کو یہ ادھیکار دے رکھا ہے کہ وہ جب چاہے،اس کے کمرے میں آئے اور وہ سو رہا ہو تو اسے جگا دے۔یہ الگ بات کہ جمال دین نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔

جمال دین کا اب بھی ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔اس نے کہا۔''مالکن،اس وقت تو میں چھوٹے ٹھاکر کے دیدار،ان کی سیوا کے لئے آیا ہوں''۔

''ابھی بلاتی ہوں انہیں''۔ٹھاکرانی نے کہا۔

لیکن حمیدہ تڑپ گئی۔وہ جانتی تھی کہ ننھا ٹھاکر اس وقت بھوکا ہوگا اور اس کے ہاتھ سے ناشتے کا منتظر۔اس نے شوہر سے کہا۔''سنو جی،ابھی چھوٹے ٹھاکر کو ناشتہ کرنا ہے۔تم ذرا دیر انتظار کر لو''۔

جمال دین نے اسے نظر انداز کر دیا اور ٹھاکرانی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔''مالکن،چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔پر مجھے ایک بات کہنی ہے''۔

''کہو جمال دین''۔

''ناشتہ کھیل کود کے،کسرت کے بعد اچھا ہوتا ہے۔پورے کا پورا جسم کو لگ جاتا ہے۔ناشتے کے بعد کھیل کود اور کسرت صحت کے لئے نقصان دہ ہے''۔

''میں سمجھی نہیں''۔ٹھاکرانی بولی۔

''میرا مطلب ہے،چھوٹے ٹھاکر پہلے مجھ سے مل لیں،کھیل کود لیں،پھر ناشتہ کریں گے تو اچھا ہوگا''۔

حمیدہ احتجاج کرنا چاہتی تھی۔مگر اسی لمحے ٹھاکرانی نے اس سے کہا۔''جاؤ حمیدہ،چھوٹے ٹھاکر کو لے آؤ''۔پھر وہ خود بھی حمیدہ کے ساتھ اندر چلی گئی۔

ننھا ٹھاکر وصول دین کے ساتھ دالان میں آیا تو جمال دین لکڑی کے گھوڑے کے پاس کھڑا اس کی پیٹھ سہلا رہا تھا۔ننھا ٹھاکر دوڑ کر آیا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

''آپ کب آئے چاچا جی؟ یہاں کیا کر رہے ہیں؟''۔اس نے چہک کر کہا۔

''یہ آپ کا گھوڑا رو رہا تھا۔میں اس کے آنسو پونچھ رہا ہوں''۔جمال دین بولا۔

''یہ رو رہا تھا؟ ننھے اودتار سنگھ نے حیرت سے کہا۔

''جی ہاں۔آپ اس سے محبت کرتے تھے نا۔روز اسے صاف کرتے تھے۔اس پر بیٹھتے تھے۔خوش ہوتا تھا۔اس کا عادی ہو گیا تھا۔اب آپ نے اسے چھوڑ دیا ہے۔

www.aiurdu.com

دیکھیں اس پر کتنی مٹی گرد جمی ہے''۔ جمال دین نے گھوڑے پر ہاتھ پھیرا اور اپنا گرد آلود ہاتھ اسے دکھایا۔''اس لئے یہ اداس رہنے لگا ہے''۔

''اداس رہنے لگا ہے''۔ ننھے ٹھاکر نے دہرایا۔اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

''آپ خود غور سے دیکھ لیں۔آپ کو نظر آ جائے گا''۔

ننھے ٹھاکر نے غور سے دیکھا۔اداسی کا مطلب تو اسے معلوم نہیں تھا۔لیکن لکڑی کا وہ گھوڑا اجڑا اجڑا سا لگ رہا تھا۔اسے افسوس ہونے لگا۔''لیکن چاچا جی، یہ میرے کام کا نہیں۔یہ وہیں کا وہیں رہتا ہے۔مجھے کہیں لے جاتا نہیں''۔

''یہ سچ ہے میرے چھوٹے ٹھاکر۔لیکن ہر چیز کی اپنی اوقات ہوتی ہے، اپنی طاقت ہوتی ہے۔اس میں یہ طاقت نہیں۔اس لئے اس سے ناراض ہونا ٹھیک نہیں۔پہلے تو یہ آپ کا دل بہلاتا تھا نا، اب آپ بڑے ہو گئے۔لیکن اس کا تو قصور نہیں۔اسے سزا نہیں ملنی چاہئے۔محبت کرتے وقت دیکھ لینا چاہئے کہ کس کی طاقت کتنی ہے۔پھر محبت نہ رہے تو بھی ظاہر نہیں ہونے دینا چاہئے۔دوسرے کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔کچھ چھن جانے کا دکھ بڑا ہوتا ہے''۔ جمال دین عدم تحفظ کے احساس کے تحت اپنے بیٹے کے حوالے سے بات کر رہا تھا۔یہ جانتے ہوئے بھی کہ ننھے بچے کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔''ہاتھ تھام کر چھوڑتے نہیں چھوٹے ٹھاکر''۔

ننھا ٹھاکر کچھ سمجھا اور کچھ نہیں سمجھا۔مگر اس نے جمال دین کی ہر بات پلے سے باندھ لی۔رائیگاں تو کوئی بات نہیں جاتی۔بہت سی باتیں بعد میں وقت سمجھاتا ہے۔لیکن بہر حال وہ اداس ہو گیا۔اسے لکڑی کے گھوڑے پر ترس آنے لگا۔''پھر میں کیا کروں چاچا جی؟''۔اس نے پوچھا۔

''روز صبح سویرے اسے کپڑے سے صاف کریں اور اس پر بیٹھیں، چاہے تھوڑی دیر کے لئے بیٹھیں''۔

''پھر یہ اداس نہیں ہوگا۔روئے گا تو نہیں؟''۔

''بالکل نہیں''۔پھر یہ اگلی صبح تک خوش رہے گا''۔

ننھے ٹھاکر نے جلدی سے کپڑا لا کر اپنے گھوڑے کو صاف کیا، اس کی پیٹھ تھپتھپائی اور پھر اس پر بیٹھ کر جھولنے لگا۔اسے مزہ تو نہیں آ رہا تھا۔لیکن اس بات کی خوشی تھی کہ لکڑی کا گھوڑا خوش ہو رہا ہوگا.....اور اب اگلے دن تک خوش رہے گا۔

دو منٹ بعد وہ گھوڑے سے اتر گیا۔''اتنا ٹھیک ہے چاچا جی؟''۔اس نے پوچھا۔

''جی میرے راج کمار۔آیئے، اب اصل گھوڑا حاضر ہے''۔ جمال دین نے جواب دیا اور گھوڑا بن گیا۔

وہ چھوٹے ٹھاکر کو اٹھا کر دوڑتا رہا۔اس دوران میں ٹھاکرانی اور حمیدہ بھی باہر دالان میں آ گئی تھیں اور یہ تماشا دیکھ رہی تھیں۔کافی دیر بعد ننھے ٹھاکر کے اصرار پر جمال دین نے اسے اتارا۔

''اب میری باری ہے ابا''۔وصال دین نے کہا۔

''نہیں بیٹے۔میں تھک گیا ہوں۔تجھے بعد میں سیر کرا دوں گا''۔ جمال دین نے اسے ٹالا۔اس نے سوچا تھا کہ اسے بعد میں سمجھائے گا۔

ننھے ٹھاکر نے ادھر ادھر دیکھا۔پھر پہلے ٹھاکرانی کو اور پھر حمیدہ کو دیکھتے ہوئے تڑپ کر بولا۔''اماں.....جلدی سے تولیا لاؤ اور دودھ بھی''۔

جمال دین کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔لیکن دونوں عورتیں سمجھ گئیں۔ٹھاکرانی نے حمیدہ کو آنکھ کا اشارہ کیا۔حمیدہ چلی گئی۔واپس آئی تو اس کے ایک ہاتھ میں تولیا اور دوسرے میں دودھ کا پیالہ تھا۔

ننھے ٹھاکر نے چند لمحے ماتا جی اور اماں کو دیکھا۔پھر تولیہ لیا اور ننھے ننھے ہاتھوں سے جمال دین کا چہرہ اور بازو خشک کرنے لگا۔جمال دین بوکھلا گیا۔''یہ..... یہ آپ کیا کر رہے ہیں چھوٹے ٹھاکر''۔

ننھے ٹھاکر نے ہاتھ نہیں روکے۔''پتا جی کہتے ہیں، گھوڑے کا خیال رکھنا چاہئے''۔

اس دوران ٹھاکرانی مسکراتی رہی اور حمیدہ دودھ کا پیالہ لئے کھڑی رہی۔ننھے ٹھاکر نے ہاتھ روکا اور حمیدہ سے بولا۔''اب اپنے ہاتھ سے چاچا جی کو دودھ پلاؤ اماں''۔

''وہ میں پلا دوں گی۔اب آپ ناشتہ کر لیں چھوٹے ٹھاکر''۔

ننھا ٹھاکر جمال دین کی طرف مڑا۔''میں جاؤں چاچا جی۔بہت بھوک لگ رہی ہے''۔

''ضرور جائیں چھوٹے ٹھاکر۔پر پہلے ایک بات کر لیں۔آج سے میں آپ کا گھوڑا ہوں۔مگر یہ بتائیں، جب میں بڈھا ہو جاؤں گا اور آپ بڑے ہو جائیں گے تو میں آپ کو پیٹھ پر بٹھا کر دوڑ نہیں سکوں گا۔تب آپ مجھے لکڑی کے اس گھوڑے کی طرح چھوڑ تو نہیں دیں گے''۔

''نہیں چاچا جی۔کبھی نہیں۔کبھی نہیں چاچا جی''۔

''شکریہ ٹھاکر۔اب آپ جائیں۔ناشتہ کر لیں''۔

.....x.....

اس روز دوپہر کو جمال دین کھانے کے لئے گھر آیا تو اس نے وصال دین کو اپنے پاس بٹھا لیا۔''بیٹا.....اب میں تجھے بتاؤں گا کہ میں نے حویلی میں تجھے اپنی پیٹھ پر کیوں نہیں بٹھایا تھا''۔

وصال دین استفہامیہ نظروں سے باپ کو دیکھتا رہا۔''دیکھ بیٹے، تو میرا بیٹا ہے۔میرا سب کچھ ہے۔میں اور تیری ماں تیرے لئے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ہم تجھ سے محبت کرتے ہیں۔تو ہمارے لئے شہزادہ ہے۔ماں باپ کیلئے ان کی اولاد ایسی ہی ہوتی ہے۔لیکن ایک حقیقت اور ہوتی ہے۔یہ کہ کوئی دنیا کے لئے کیا ہے۔اس کی دنیا میں کیا حیثیت ہے۔تیری سمجھ میں میری بات آسانی سے نہیں آئے گی۔لیکن غور سے سننا اور ہر بات کو یاد رکھنا۔آدمی کو اپنی حیثیت ہر جگہ اور ہر حال میں یاد رکھنی چاہئے۔کوئی اس سے بڑھ کر سمجھے تو یہ اس کی مہربانی، اس کا احسان۔اور بندے کو احسان کبھی نہیں بھولنا چاہئے۔تو سمجھ رہا ہے میری بات''۔

چار سال کے وصال دین نے انکار میں سر ہلایا۔''نہیں ابا''۔

''کوئی بات نہیں۔بس غور سے سن اور یاد رکھ''۔ جمال دین نے کہا''اسے بے بسی کا احساس ہو رہا تھا۔چار سال کا بچہ تو لفظ حیثیت کا مطلب بھی نہیں سمجھ سکتا۔لیکن سمجھانا ضروری ہے۔گستاخی تو گستاخی ہوتی ہے۔چاہے چار سال کا بچہ کرے۔بتانا تو پڑے گا۔اس نے گہری سانس لی، اور بولا۔''تو بیٹے، تیری حیثیت کیا ہے۔ابھی تو چھوٹا ہے۔جب تو دنیا میں کچھ کرے گا تو تیری حیثیت بنے گی۔اس وقت تک میری حیثیت وہ ہے جو میری ہے۔اور میری حیثیت کیا ہے؟ میں کسان ہوں بیٹے.....غریب کسان۔مجھ پر ٹھاکر جی نے مہربانی کی کہ مجھے کچھ زمین دے دی۔میں ویسے ہی ٹھاکر جی کا مزارعہ تھا۔ان کی مہربانی کے بعد میں ان کا غلام ہو گیا۔میں نے کہا نا، بندے کو احسان نہیں بھولنا چاہئے۔تو ٹھاکر جی نے میرے ابا، تیرے دادا پر بھی احسان کیا تھا۔میں اسے کبھی نہیں بھولتا۔میں ٹھاکر جی کا کمی ہوں۔وہ ایسا نہیں سمجھتے۔مجھے برابری کا، زمیندار والا مقام دیتے ہیں۔مگر اس سے میری حیثیت نہیں بدلتی۔تو بتا بیٹے، میری حیثیت کیا ہے، میں کون ہوں؟''۔

چار سال کے لڑکے نے دماغ پر پورا زور دیا.....باپ کو خوش کرنے کیلئے۔ایسے میں قدرت راہ نمائی کرتی ہے۔جواب اس کے اندر ابھرا۔اس نے کہا۔''آپ بڑے ٹھاکر جی کے کمی ہیں ابا۔آپ کسان ہیں''۔

جمال دین اس کے جواب سے بہت خوش ہوا۔''شاباش وصال دین شاباش''۔اس نے بیٹے کی پیٹھ تھپکی۔''اب یہ بتا کہ میری اپنی زمین نہیں ہے۔میں نے زمین کمائی نہیں ہے۔اب کوئی مجھے زمین دے دے تو کیا میں زمین دار ہو جاؤں گا؟''۔

''نہیں ابا''۔

''بالکل ٹھیک ہے''۔ جمال دین نے پر جوش لہجے میں کہا۔''ٹھاکر جی چاہے مجھے اپنے برابر میں جگہ دیں۔مگر میرا مقام تو ان کے قدموں میں ہے نا''۔

''جی ہاں ابا''۔

''اور جو میری حیثیت ہے، تیری بھی وہی ہے۔تو تو کون ہے؟''

وصال دین نے سینہ پھلا کر بڑے فخر سے کہا۔''ابا.....میں کمی ہوں.....کسان ہوں.....آپ کا بیٹا ہوں''۔

''شاباش۔میں چاہتا ہوں، تو یہ بات کبھی نہ بھولنا۔اب تجھے ٹھاکر جی اور مالکن چھوٹے ٹھاکر کے برابر سمجھیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔تو کبھی خود کو چھوٹے ٹھاکر کے برابر نہ سمجھنا۔دیکھ تیرے دادا پر جو احسان تھا، وہ مجھ پر ہے۔کیونکہ میں ان کا بیٹا ہوں۔اور جو احسان مجھ پر ہے، وہ تجھ پر ہے۔کیونکہ تو میرا بیٹا ہے۔میں اس احسان کے بدلے کیا کرتا ہوں؟ ٹھاکر جی کی ہر بات مانتا ہوں۔خود کو ان کا غلام سمجھتا ہوں.....اور ہمیشہ سمجھوں گا''۔

''اب حیثیت کی بات سمجھ۔وہاں حویلی میں تو اور میں دونوں غلام ہیں۔یہاں اس گھر میں ٹھاکر جی نہ ہوں تو میں بادشاہ ہوں اور تو شہزادہ ہے۔تجھ سے بڑھ کر دنیا میں میرے لئے کچھ بھی نہیں۔یہاں میں تیرا گھوڑا ہوں۔جب تو کہے میں تجھے سواری کراؤں گا۔لیکن حویلی میں، میں صرف چھوٹے ٹھاکر کا گھوڑا ہوں۔وہاں تجھے سوار کروں تو تجھے چھوٹے ٹھاکر کے برابر سمجھوں گا۔اور یہ غلط ہے۔ٹھیک ہے نا''۔

''میں سمجھ گیا ابا''۔

''اب تیرا دل چاہے تو میں تیرا گھوڑا بن جاؤں؟''۔ جمال دین نے پوچھا۔

''نہیں ابا۔مجھے تو اس کا شوق ہی نہیں''۔

''یہ بھی اچھا ہے۔اب میری آخری بات غور سے سن۔چھوٹے ٹھاکر نے تیری ماں کا دودھ پیا ہے۔اسی طرح وہ تیری ماں کا بیٹا ہے۔تیرا بھائی ہے۔لیکن تو اس کا بھائی نہیں۔تو غلام ہی رہنا۔کبھی اس کی برابری نہ کرنا۔وہ تجھے اپنا بھائی سمجھے تو یہ اس کی بڑائی ہے۔پر تو کبھی خود کو اس کا بھائی نہ سمجھنا۔وہ تجھے کھیل میں، کسی بھی چیز میں شریک کرے، تجھے یہ خیال رکھنا ہے کہ تو زمین ہے اور وہ آسمان۔اور زمین اور آسمان کبھی نہیں ملتے''۔

چار سال کے بچے نے فوراً چیلنج کیا۔''ابا، آسمان اور زمین تو ملتے ہیں۔وہ دیکھیں''۔

جمال دین نے اس طرف دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی۔''اس جگہ کی کوئی نشانی مقرر کر لے بیٹے، جہاں زمین اور آسمان مل رہے ہیں''۔

وصال دین نے غور سے دیکھا اور بولا۔''وہ جو بڑا پیڑ ہے برگد کا، وہاں ابا''۔

جمال دین اٹھ کھڑا ہوا۔''چل بیٹے۔دیکھ کر آتے ہیں''۔

دونوں گھر سے نکل آئے۔وہ پیڑ کوئی میل سوا میل کے فاصلے پر تھا۔''تو بس پیڑ پر نظر رکھنا بیٹے''۔

دھوپ میں وہاں تک پہنچتے پہنچتے وہ پسینے میں نہا گئے۔''اب دیکھ بیٹے، آسمان کہاں ہے اور زمین کہاں ہے''۔ جمال دین نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

وصال دین شرمندہ نظر آ رہا تھا۔اور وہ آگے کی طرف دیکھ رہا تھا۔''وہ دیکھو ابا۔کرتارے کے گھر کی چھت پر''۔

''چل، وہاں بھی دیکھ لیتے ہیں''۔ جمال دین نے نرمی سے کہا۔

www.allurdu.com

ننھے بچے کے حصے میں وہاں پہنچ کر بھی شرمندگی ہی تھی۔ مگر وہ اب بھی آگے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''دیکھ بیٹے، یہ نظر کا دھوکا ہے۔ زمین آسمان کبھی نہیں ملتے۔ دیکھنے والے کو ایسا لگتا ہے۔ لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے تو چھوٹے ٹھاکر کے ساتھ کھیلے تو دیکھنے والوں کو لگے کہ تو اور وہ دوست ہیں۔ لیکن اصل میں وہ مالک ہیں اور تو غلام۔ تجھے یہ بات یاد رکھنی چاہئے بیٹے''۔

''ٹھیک ہے ابا''۔ وصال دین نے کہا۔ اس نے زمین اور آسمان کا فلسفہ بہت اچھی طرح سمجھ لیا تھا..... اور ہمیشہ کے لئے سمجھ لیا تھا۔

کہتے ہیں کہ ہر بیٹا اپنے باپ پر جاتا ہے۔ کچھ چیزیں تو پیدائش کے وقت ورثے میں خود بخود مل جاتی ہیں۔ وصال دین بھی جمال دین کا بیٹا تھا۔ جو باپ نے سمجھایا تھا، وہ اپنی جگہ۔ لیکن کچھ تو اس کے اندر پہلے سے موجود تھا۔ ''ابا..... آپ بڑے ٹھاکر جی کی ہر بات مانتے ہو۔ انکار نہیں کرتے؟''۔ اس نے پوچھا۔

''بالکل بیٹا۔ میں انکار کر ہی نہیں سکتا''۔

''تو میں بھی کبھی انکار نہ کروں''۔

''یہی تو میں سمجھا رہا ہوں تجھے''۔

''وہ گھوڑا بنیں اور مجھ سے بیٹھنے کو کہیں تو''۔

جمال دین لاجواب ہو گیا۔ ''ٹھیک ہے۔ پر اپنی حیثیت ہمیشہ یاد رکھنا''۔ اس نے بجھے دل سے کہا۔

.....x.....

وہ تیسرا سال تھا کہ ٹھاکر فصلوں کی آمدنی میں جمال دین کا حصہ لے کر اس کے گھر آیا تھا۔ اس نے رقم کی پوٹلی جمال دین کو دیتے ہوئے کہا۔ ''تم کب تک اپنے حصے کا کام مجھ سے کراتے رہو گے جمال دین۔ مجھے ہلکا کر دو''۔

جمال دین کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ پوٹلی ہاتھ میں لئے نظریں جھکائے بیٹھا رہا۔

''تم تو کچھ بولتے ہی نہیں۔ بھئی اپنی زمینوں کا انتظام آپ سنبھالو نا''۔

''مجھے یہ سب کچھ آتا ہی نہیں ٹھاکر جی''۔ جمال دین نے دبی آواز میں کہا۔

''چلو ٹھیک ہے۔ مگر یہ تو بتاؤ، اس پیسے کا کیا کرتے ہو؟''۔

''کچھ بھی نہیں۔ صندوق میں رکھ دیتا ہوں ٹھاکر جی''۔

''اب یہ نہ کہنا کہ تمہیں پیسہ خرچ کرنا بھی نہیں آتا''۔

''سچ ہے ٹھاکر جی۔ مجھے یہ بھی نہیں آتا''۔

''یہ کون سا مشکل کام ہے۔ اچھا سا مکان بنواؤ۔ مال مویشی خریدو۔ میری بہن کیلئے زیور گہنا بنواؤ۔ اب تمہارے پاس کمی تو نہیں ہے''

''نہیں ٹھاکر جی۔ اب تو زیادتی ہے جی۔ مکان کی ضرورت نہیں۔ یہ مکان کافی ہے ہمارے لئے۔ ابا کے ساتھ یہاں برسوں رہا ہوں میں۔ یہ ابا کی نشانی ہے''۔

''تو زمین کی کمی نہیں تمہارے پاس۔ کسی دوسری جگہ مکان بنوالو''۔

''ہم یہاں خوش ہیں ٹھاکر جی۔ تو دوسرا مکان کس کیلئے بنواؤں۔ اور مال مویشی رکھوں تو اکیلی جان۔ کیسے دیکھ بھال کروں گا ان کی''۔

''نوکر ملازم رکھ لینا''۔

''نہیں ٹھاکر جی۔ میں تو خود نوکر ہوں۔ یہ کام میرے لئے اچھا نہیں۔ اور حمیدہ کو زیور سے دل چسپی نہیں''۔

ٹھاکر کو حیرت ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ اب جمال دین کے پاس لاکھوں روپے ہیں، جائیداد ہے۔ لیکن وہ وہیں کا وہیں ہے۔ اس میں اوپر جانے کی لگن تھی ہی نہیں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو اب تک ٹھاکر کے مقابلے میں کھڑا ہو چکا ہوتا۔ اس نے یہ بات جمال دین سے کہہ دی۔

''میں آپ کے سائے میں رہنا چاہتا ہوں ٹھاکر جی۔ مجھے بڑا نہیں بننا۔ جیسا مجھے رب نے بنایا ہے، میں ویسا ہی اچھا ہوں''۔ جمال دین نے کہا۔ ''جو زمین آپ نے میرے ابا کو دی تھی، وہ ہماری ضرورت کیلئے بہت کافی ہے۔ باقی سب کچھ تو میں نے صرف آپ کی خوشی کے لئے رکھا ہے۔ ورنہ اس کی ضرورت نہیں تھی''۔

''اتنا مانتا ہے مجھے''۔ ٹھاکر نے اسے بہت غور سے دیکھا۔

''اتنا مانتا ہوں ٹھاکر جی کہ بتا نہیں سکتا''۔ جمال دین نے کہا۔ ''آپ کے حکم پر میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ جان بھی حاضر ہے''۔

ٹھاکر چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''اچھا۔ میں کہوں، نماز چھوڑ دے تو، تو نماز چھوڑ دے گا''۔

''نہیں ٹھاکر جی۔ نہیں چھوڑوں گا''۔

''تو پھر کیا مانتا ہے مجھے''۔

''ہر ایک کا اپنا مقام ہے ٹھاکر جی۔ اللہ کا حکم سب سے بڑا ہے۔ اسی کے حکم پر تو آدمی دوسروں کو مانتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا مقام سمجھتا ہے۔ جیسے آپ کے مقابلے میں، میں کسی اور کی بات نہیں مانوں گا۔

www.allurdu.com

ویسے ہی اللہ کے مقابلے میں آپ کی بات نہیں مانوں گا''۔

ٹھاکر کے تجسس کی کوئی حد نہیں تھی۔اس نے جمال دین کو ہمیشہ وفاداری، عاجزی اور فرماں برداری میں لپٹا دیکھا تھا۔یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہا تھا۔اور اس نے صاف انکار کیا تھا۔''یہ کیا بات ہوئی جمال دین''۔

''اللہ سب سے بڑا ہے ٹھاکر جی۔سب کچھ اس کے حکم سے ہے''۔

''اور میں اپنا حکم نہ ماننے کی سزا میں تجھے یہاں سے نکال دوں تو''۔

''میں یہاں سے چلا جاؤں گا ٹھاکر جی''۔جمال دین نے ٹھاکر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔''اللہ کی زمین بہت بڑی ہے''۔

''اور جو تیرے اپنے گاؤں میں زمین تیرے باپ پر تنگ ہوئی تھی، تو کس نے اسے سہارا دیا تھا''۔

''آپ نے''۔

''تو تجھے اللہ کے مقابلے میں میرا حکم نہیں ماننا چاہئے؟''۔ٹھاکر نے بے حد رسان سے کہا۔

''نہیں ٹھاکر جی۔آپ کو اللہ نے ہمارا وسیلہ بنایا تھا۔آپ کے دل میں ہماری مدد کا خیال اللہ نے ڈالا تھا۔ہمیں تو پہلے اللہ کا حکم ماننا ہے''۔

''اور میں تجھے یہاں سے نکال دوں تو تم لوگ بھوکے نہیں مر جاؤ گے''۔

''نہیں سرکار۔اللہ رزق دینے والا ہے''۔

''تجھے یہ یقین کیسے ہے؟''۔

''اللہ نے رزق کا وعدہ فرمایا ہے ٹھاکر جی۔اور دیکھ لیں۔کہیں کال پڑ جائے تو لوگ بھوک سے مرتے ہیں۔یہ اللہ کا قہر ہے۔ورنہ کہیں بھوک سے کوئی نہیں مرتا۔اور پھر ہم جانتے ہیں کہ زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ ہے۔مرنا ہے تو مرنا ہے۔یہ تو ایمان ہے ہمارا ٹھاکر جی''۔

ٹھاکر بہت حیران تھا۔اس نے دیکھا تھا کہ راج پوت آن کی خاطر بھگوان سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ ذرا سے فائدے کے لئے بھگوان کے حکم کا انکار کر دیا جاتا ہے۔پھر یہ جمال دین کس مٹی کا بنا ہے۔پہلی بار اس کے دل کی گہرائیوں میں مسلمان کی عزت پیدا ہوئی۔اس نے سوچا، ارے یہ تو ہم سے بڑھ کر اصول کے پکے ہیں۔

''چھوڑ ان باتوں کو جمال دین''۔اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔''میں تو یوں ہی تجھے آزما رہا تھا۔لیکن میں چاہتا ہوں کہ تو اچھی طرح رہے۔اب پیسے کی تو کمی نہیں ہے تجھے۔تو بڑا زمین دار ہے۔تجھے شان سے رہنا چاہئے''۔

''ساری شان اس رب کی ہے ٹھاکر جی''۔جمال دین نے آسمان کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔''میرے لئے تو اوپر وہ ہے اور نیچے آپ ہیں''۔

''اچھا۔میں چلتا ہوں جمال دین''۔ٹھاکر اٹھ کھڑا ہوا۔

.....x.....

جمال دین کی اس ملاقات اور گفتگو نے ٹھاکر پرتاپ سنگھ پر بہت گہرا اور ان مٹ نقش چھوڑا تھا۔اس رات وہ دیر تک اس سلسلے میں سوچتا اور غور کرتا رہا۔اسے یاد تھا کہ بچپن ہی سے اس نے مسلمانوں کیلئے لفظ ملیچھ سنا تھا۔ہندو ان کا ذکر حقارت سے کرتے تھے۔اب ملیچھ کا مطلب ہی گندا ہے۔تو ٹھاکر پرتاپ سنگھ اسی سوچ کے ساتھ بڑا ہوا تھا راج پوتوں میں تو ویسے ہی برتری کا احساس بہت ہوتا ہے۔وہ اپنے سامنے کسی کو نہیں گردانتے۔اور ایسے ہی نہیں۔ان میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں۔وہ بات کے سچے، کھرے اور صاف گو ہوتے ہیں۔بہادر ہوتے ہیں۔پیچھے سے وار نہیں کرتے اور کمزور پر ہاتھ اٹھانا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔آن کے مقابلے میں جان کی بھی انہیں پروا نہیں ہوتی۔وعدہ وہ بھی نہیں توڑتے اور دوستی ہر قیمت پر نبھاتے ہیں۔اور انہیں اپنے ان اوصاف پر فخر ہوتا ہے۔فخر انہیں اپنے نسب پر بھی ہوتا ہے۔اور اسی لئے وہ اپنے خون میں ملاوٹ پسند نہیں کرتے۔اسے خالص رکھنا چاہتے ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ جب چھوٹے کے دودھ کا مسئلہ سامنے آیا تو ٹھاکر پرتاپ سنگھ آگ بگولا ہو گیا۔اس کا بیٹا ایک مسلمان عورت کا دودھ پی کر اس کے خالص خون میں ملاوٹ کرے، یہ وہ کیسے گوارا کر سکتا تھا۔مگر وہ بچہ اس کے لئے زندگی، آن، دھرم، ہر چیز سے بڑھ کر تھا۔وہ اسے بائیس برس کی منتوں، مرادوں کے بعد ملا تھا۔اور وہ جانتا تھا کہ اس کے بعد وہ کبھی صاحب اولاد نہیں ہو سکے گا۔یہ بچہ نہ رہا تو اس کی نسل اسی پر ختم ہو جائے گی۔چنانچہ اسے بچے کی ضد کے آگے ہارنا پڑا۔

اوتار سنگھ کی پیدائش سے پہلے اسے اور ٹھاکرانی کو خواب میں بہ یک وقت بشارت دینے والا بھی مسلمان تھا۔اور انہوں نے دیکھ لیا کہ بشارت سچی تھی۔پھر اس کی پیدائش والے دن جو مجذوب آیا، وہ بھی مسلمان تھا۔پھر اس کے بعد اس نے خواب میں اسی مسلمان بزرگ کو دیکھا تھا۔اسے ان کی ہر بات، ہر تنبیہ یاد تھی۔اور وہ بچہ نہیں تھا۔چاہے وہ شعوری طور پر اعتراف کرنے سے بچے، لیکن اس نے جان لیا تھا کہ اس کے بچے کا مسلمانوں سے کوئی تعلق ہے اور اس کا جھکاؤ بھی مسلمانوں کی طرف ہے۔یہی سمجھنے کے بعد تو اس نے مسلمانوں کے لئے اپنا رویہ تبدیل کیا تھا۔بلکہ ٹھاکرانی کو بھی تنبیہ کی تھی۔

بچے کی دودھ کی ضد کے سامنے ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے بری طرح شکست کھائی تھی۔لیکن ایک سچے اور اچھے راج پوت کی طرح اس نے سر جھکایا تو پوری طرح جھکایا اس نے اس دن کے بعد حمیدہ کو اپنے من میں بہن کا درجہ دیا اور وہ سب کچھ کیا جو ایک احسان مند راج پوت کر سکتا تھا۔لیکن برسوں کے نظریات جو اس کے باطن میں جڑ پکڑے ہوئے تھے، ایک دم سے نہیں مٹ سکتے تھے۔چناں چہ یہ خلش اسے ہمیشہ ستاتی رہی کہ اس کا خالص خون خالص نہیں رہا۔اس میں ملاوٹ ہو گئی ہے۔

قدرتی بات ہے کہ وہ اس پر غور کرتا تھا کہ اس کے خون میں ملاوٹ آخر کس قسم کی ہوئی ہے۔اس کے نتیجے میں اس کے بیٹے میں کیسی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔اس کے پاس مسلمانوں کے بس دو ہی حوالے تھے۔ایک اپنے پرانے کلاس فیلو امان اللہ کا اور دوسرا مہر دین اور اس کے گھرانے کا۔مگر پہلے اسے ان کے بارے میں غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔مگر اب یہ ضروری ہو گیا تھا۔چناں چہ اس نے وقت میں پیچھے جا کر یاد کرنے اور سمجھنے کی کوشش کی۔اور اس نے امان اللہ کو نظر انداز کر دیا۔ایک تو اس کا ساتھ بہت پرانی اور بھولی بسری بات تھی۔دوسرے اس سے کوئی بلا واسطہ تعلق ہی نہیں تھا۔جب کہ مہر دین کے بیٹے جمال دین سے تھا۔اس کا بیٹا اسی کی بیوی کا دودھ تو پی رہا تھا۔

سب سے پہلے تو ٹھاکر پرتاپ سنگھ کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ مسلمان گندے ہرگز نہیں ہوتے۔اس لئے انہیں ملیچھ کہہ کر پکارنا غلط ہے۔بلکہ اس کے برعکس وہ ہندوؤں سے کہیں زیادہ صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ہر نماز سے پہلے، یعنی دن میں کئی مرتبہ تو وہ آدھا اشنان کرتے ہیں۔اس کے بغیر تو وہ نماز پڑھ ہی نہیں سکتے۔پھر اپنی عادات میں بھی وہ پاکیزہ ہوتے ہیں۔اور یہ کھلی ہوئی بات تھی۔

پھر ٹھاکر کو مہر دین سے ملاقات یاد آئی۔وہ جب اس سے ملا تو مہاجن اس کے گھر پر قبضہ کر رہا تھا۔اور پوری بات ٹھاکر کی سمجھ میں آ گئی تھی۔گاؤں کا زمین دار مہر دین کی بیٹی کے چکر میں تھا اور اس سلسلے میں مہاجن کے قرضے کو استعمال کر رہا تھا۔ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے ایسے کھیل بہت دیکھے تھے۔وہ جانتا تھا کہ ہندوستان کے گاؤں، دیہاتوں بلکہ شہروں میں یہ کھیل کروڑوں بار کھیلا جا چکا ہے اور ہر بار غریب کسان نے شکست کھائی ہے اور ظالم زمین دار فتح یاب ہوا ہے۔غریب نے ہمیشہ عزت اور آبرو کے بدلے اپنا گھر، اپنے معاش بچایا ہے۔لیکن مہر دین اس پر آمادہ نہیں تھا۔اس نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔ٹھاکر کو اس کی یہی ادا تو بھائی تھی۔راج پوت اپنے کردار کے اوصاف پر فخر کرتا ہے۔مگر اور کسی میں کردار دیکھے اور اوصاف نظر آئیں تو اسے بھی عزت دیتا ہے۔

پھر وہ گھرانہ اس کے گاؤں میں آباد ہو گیا تھا۔تب اس نے ان کے اور اوصاف دیکھے۔مگر ان پر غور اب کر رہا تھا۔وہ وفادار تھے۔بات کے پکے تھے۔احسان ماننے والے تھے۔مطلبی نہیں تھے۔احسان کرنے والے کیلئے جان دینے میں بھی انہیں عار نہیں تھی۔یہ چھوٹی خوبیاں نہیں ہوتیں۔

یہ سب پرانی باتیں تھیں۔مگر اب ٹھاکر پرتاپ سنگھ جمال دین سے اپنی تازہ ترین گفتگو کے حوالے سے سوچ رہا تھا۔وہ اپنا اور جمال دین کا موازنہ کر رہا تھا۔اور موازنہ کرنے کے لئے آئینہ دیکھنا ضروری ہے۔ٹھاکر کو خود کو بھی سمجھنا تھا۔پہلے ہی مرحلے میں اسے یہ اعتراف کرنا پڑا کہ مسلمانوں کیلئے اس کی ناپسندیدگی کی کوئی ٹھوس اور معقول وجہ نہیں تھی۔

www.allurdu.com

بلکہ اس کا سبب نسل در نسل ورثے میں ملنے والا تعصب تھا۔ اور وہ خود کوئی اچھا ہندو نہیں تھا۔ اس کے خیال میں یہ دیوی دیوتا سب فرسودہ باتیں تھیں۔ اس نے زندگی میں کبھی پوجا نہیں کی تھی۔ مگر جب اسے بیٹے کی آرزو ہوئی اور وہ پوری ہوتی نظر نہیں آئی تو وہ مندروں میں گیا، پوجا کی، چڑھاوے دیئے۔ درختوں تک سے اولاد مانگی۔ اس نے یہ سب کچھ کیا تو اپنی غرض، اپنے مطلب سے۔ اس وقت اگر کوئی اس سے کہہ دیتا کہ اپنے گاؤں میں مندر گرا دینے سے، کوئی مورتی توڑ دینے سے اس کی مراد پوری ہو سکتی ہے تو وہ یقیناً ایسا کر گزرتا۔

اور اصل راج پوت ٹھاکر پرتاپ سنگھ کے برعکس ایک عام مسلمان جمال دین تھا، جس کی ذات کا، حسب نسب کا پتا نہیں تھا، بلکہ یقیناً وہ اونچی ذات کا نہیں تھا۔ لیکن وہ اس کے ہندو ہونے کے باوجود اس کے احسان کے حوالے سے اس کی ایسی عزت کرتا تھا کہ اس کے لئے جان دے سکتا تھا۔ اس نے خود کہا تھا کہ وہ اللہ کے بعد اسے سب سے بڑا مقام دیتا ہے..... اسے..... ایک ہندو کو! اس کی طاقت کی وجہ سے نہیں۔ صرف اس لئے کہ اس کے اللہ نے احسان ماننے کا حکم دیا ہے اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ چاہے اس سے روزگار چھن جائے، گھر بار چھن جائے، بیوی بچے حتیٰ کہ زندگی چھن جائے، پھر بھی وہ نماز چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ اگر وہ اس سے مورتی کی پوجا کرنے کو کہتا، تب بھی وہ انکار کر دیتا۔ اور وہ منافق بھی نہیں تھا کہ گھر بچانے کیلئے نماز چھوڑنے کی حامی بھر لیتا۔ بعد میں چاہے چھپ کر نماز پڑھتا رہتا یعنی وہ بزدل نہیں تھا۔ بہادر تھا کمزور ہونے کے باوجود طاقت ور کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انکار کرتا تھا۔

اور ایک بہت بڑی خوبی جمال دین کا ایمان تھا۔ اللہ رزق دے گا۔ سب کچھ اسی کے حکم سے ہے۔ اس کا حکم ہوگا تو وہ مر جائے گا۔ زندگی بچانے کیلئے اس کے حکم کے خلاف کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ ایمان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ مگر اسے ایمان میں بڑی کشش محسوس ہوئی۔ اسے جمال دین پر رشک آیا۔ یہ ایمان اس کے پاس ہوتا تو وہ کہتا..... میرے چھوٹے ٹھاکر بھگوان کی مرضی ہوئی تو جئیں گے۔ میں انہیں مسلمان عورت کا دودھ نہیں پینے دوں گا۔ ٹھاکر کو نامعلوم طور پر احساس ہو رہا تھا کہ ایمان والے کو کوئی نہیں ہرا سکتا۔ کیسے؟ یہ وہ نہیں جانتا تھا۔

اور سب سے بڑی بات یہ کہ اب جمال دین کے پاس ٹھاکر سے زیادہ زمین تھی، زیادہ پیسہ تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ٹھاکر کی نکالنے کی دھمکی سن کر کہتا، تم مجھے کیا نکالو گے۔ میں مالک ہوں اس زمین کا۔ میں تمہیں نکال دوں گا یہاں سے۔ لیکن جمال دین نے اس کے نکالنے کا حق تسلیم کیا تھا۔ اس نے اپنا ناتا اللہ سے ہی جوڑا۔ اور وہ کیسا آدمی ہے کہ اتنی زمین، اتنے پیسے کا مالک ہونے کے باوجود اپنے حال میں مست ہے۔ اس نے کسی سے نہیں کہا کہ اب میں بہت بڑا زمین دار ہوں۔ اس میں بڑائی نہیں۔ عاجزی ہی عاجزی ہے۔ اور اس نے آخر میں کیسے کہا کہ میرے لئے تو اوپر اللہ ہے اور یہاں آپ ہیں ٹھاکر جی۔

اس عاجزی کے سامنے ٹھاکر کا سر جھک گیا۔ اس نے دل میں تسلیم کر لیا کہ جمال دین اس سے بڑا آدمی ہے۔ اس میں راج پوتوں سے زیادہ خوبیاں ہیں۔ پہلی بار اسے یہ اطمینان ہوا کہ حمیدہ کے دودھ نے اس کے بیٹے کو اور بہتر انسان بنایا ہوگا اور یہ کہ وصال دین کے ساتھ کھیل کر اسے خوبیاں ہی ملیں گی خرابیاں نہیں۔

اس رات ٹھاکر پرتاپ سنگھ سویا تو اس کی شخصیت میں ایک بہت بڑا انقلاب رونما ہو چکا تھا۔

.....✘.....

ٹھاکرانی رنجیتا ان دنوں بہت پریشان تھی۔ پریشان بھی اور خوف زدہ بھی۔ پریشان وہ اس لئے تھی کہ اس کا ننھا بیٹا حمیدہ اور وصال دین سے بہت قریب ہو گیا تھا بلکہ یوں کہئے کہ وہ انہیں دیکھ کر جیتا تھا۔ اس کی طبیعت ایسی تھی کہ وہ زیادہ لوگوں سے گھلتا ملتا نہیں تھا۔ اور جن لوگوں سے تعلق جڑے تو وہ بہت گہرائی میں جڑتا تھا اس کی زندگی میں ماتا جی، پتا جی، اماں، ویر جی اور چاچا جی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ گھر میں اتنے ملازم، اتنی نوکرانیاں تھیں۔ مگر اسے کسی سے غرض نہیں تھی۔

اب جب کہ اس کا دودھ چھڑایا جا چکا تھا، تو ٹھاکرانی چاہتی تھی کہ اسے حمیدہ اور اس کے پریوار سے دور کر دے۔ لیکن چھوٹا جس طرح ان کا دیوانہ تھا، اس میں یہ ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ اور یہ تعلق اسی طرح بڑھتا رہا تو ٹھاکرانی کو خوف تھا کہ کسی دن ٹھاکر بری طرح بھڑک جائے گا۔

ویسے ٹھاکرانی کو اپنے چھوٹے سے بچے پر ترس بھی آتا تھا۔ اپنے بھائی بہن ہوں تو بچہ اتنا تنہا نہیں ہوتا۔ لیکن ننھا اوتار سنگھ تو بالکل اکیلا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ حمیدہ اور وصال دین نہ ہوتے تو نہ جانے کیا ہوتا۔ ٹھاکرانی سوچتی تو اسے اس پر شرمندگی ہوتی کہ وہ انہیں بھی اس سے چھیننے کی کوشش کر رہی ہے۔

پھر اس کا خوف تھا۔ اوتار سنگھ ساڑھے تین سال کا ہو چکا تھا۔ ٹھاکر پڑھا لکھا آدمی تھا۔ یہ طے تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو تعلیم دلائے گا۔ اور گاؤں میں کوئی اسکول تھا بھی نہیں۔ تو تعلیم کے لئے چھوٹے کو گھر سے دور جانا ہوگا۔ ابھی تک تو ٹھاکر نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ لیکن ٹھاکرانی جانتی تھی کہ اس کے سر پر جدائی کی تلوار لٹک رہی ہے۔ یہ خیال ہی اس کے لئے تڑپا دینے والا تھا کہ ننھا راج کمار اس سے دور ہو جائے گا۔ برسوں کی تنہائی کے بعد وہ اسے ملا تھا۔ وہ تو اسے ایک لمحے کے لئے بھی خود سے دور کرنا نہیں چاہتی تھی۔

ٹھاکرانی کو بیٹے سے اپنی جدائی کا خیال آتا تو وہ بے رحم ہو جاتی۔ وہ سوچتی کہ وہ عمر بھر کی ترسی ہوئی ماں ہو کر بھی اپنے بیٹے کی جدائی برداشت کر سکتی ہے تو اس کا بیٹا جو صرف ساڑھے تین سال کا ہے، حمیدہ اور وصال دین کی جدائی برداشت کیوں نہیں کر سکتا۔

یوں سوچتے سوچتے اسے ایک دن اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ مسئلے دو نہیں رہے، ایک ہو گیا۔ اس کے ایک مسئلے میں دوسرے مسئلے کا حل تھا۔ اوتار سنگھ پڑھنے کیلئے شہر جاتا تو وہ حمیدہ اور وصال دین سے بھی دور ہو جاتا۔ لیکن اس سے ٹھاکرانی کی تسلی نہیں ہوئی۔ یوں وہ بھی تو محروم ہو جائے گی اپنے بیٹے سے، ایسا کیوں ہو۔ اس کا دودھ کا مطلب نکل چکا تھا تو وہ پھر سے رقابت کی آگ میں جلنے لگی تھی۔

آدمی جس چیز سے ڈرتا ہے، ڈر بڑھ جائے تو خود اس کی طرف لپکتا ہے۔ ٹھاکرانی کی پریشانی اور خوف اتنا بڑھا کہ اس نے خود ہی آگ میں کودنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس رات ننھے ٹھاکر کو سلانے کے بعد وہ بڑے ٹھاکر کے کمرے کی طرف چل دی۔

اوتار سنگھ کی پیدائش کے بعد بڑے ٹھاکر میں بڑی تبدیلیاں آئی تھیں۔ اس کی باہری مصروفیات کم ہو گئی تھیں۔ شام ہوتے ہی وہ گھر میں آ جاتا اوتار سنگھ کے سونے تک وہ اس کے ساتھ وقت گزارتا۔ یہ اس کا ٹھاکرانی پر احسان تھا۔ کیوں کہ ننھا اوتار سنگھ سوال بہت کرتا تھا..... اور زیادہ تر سوال ایسے ہوتے تھے کہ ٹھاکرانی ان کا جواب نہیں دے سکتی تھی۔ بلکہ وہ دیکھتی تھی کہ بعض اوقات تو ٹھاکر بھی پریشان ہو جاتا ہے کہ کیا جواب دے۔

تو ٹھاکرانی پورے یقین کے ساتھ ٹھاکر کے کمرے کی طرف گئی۔ اور اس کا یقین غلط بھی نہیں تھا۔ ٹھاکر اپنی مسہری پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ وہ ایسا منہمک تھا کہ اسے ٹھاکرانی کی آمد کا پتا بھی نہیں چلا۔ ٹھاکرانی کے پکارنے پر اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ ''رنجو تم؟ کب آئیں؟''۔

''دیر ہو گئی ناتھ۔ پر آپ تو ایسے کھوئے ہوئے ہیں''۔ ٹھاکرانی نے شکایتاً کہا۔ اسے حیرت ہوتی تھی کہ پچھلے چند ماہ سے ٹھاکر کو کتابیں پڑھنے کا شوق ہو گیا تھا۔ ہر ہفتے پندرہ دن میں وہ شہر جاتا اور کتابیں خرید کر لاتا۔ اوتار سنگھ کے سونے کے بعد وہ اپنے کمرے میں بیٹھا پڑھتا رہتا تھا۔

ٹھاکر نے کتاب الٹ کر رکھ دی۔ ''ہاں، پڑھتے ہوئے کچھ ہوش ہی نہیں رہتا''۔

''یہ آپ کو اب پڑھنے کا شوق ہوا ہے''۔

''بڑھاپے میں''۔ ٹھاکر نے ہنستے ہوئے ٹکڑا لگایا۔ ''تمہیں حیرت ہوتی ہے؟''۔

''ہاں ناتھ، میری سمجھ میں اس کی ضرورت نہیں آتی۔ پڑھتے کیا ہیں آپ؟''۔

''کچھ نہیں۔ زندگی کو، دنیا کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں''۔

''مگر کس لئے؟''۔

''تمہارے بیٹے کیلئے رنجو''۔ ٹھاکر مسکرایا۔ ''دیکھتی نہیں، کیسے کیسے سوال کرتا ہے۔ میں جواب نہ دے پاؤں تو سمجھے گا کہ اس کا پتا جاہل ہے''۔

''بھگوان نہ کرے''۔ ٹھاکرانی نے جلدی سے کہا۔ ''ویسے وہ سوال بڑے عجیب کرتا ہے''۔ ٹھاکرانی کے لہجے میں فخر تھا۔

''تو ایسے بچے کیلئے تیاری کرنا ضروری ہے نا۔ ایسی تو میں نے کبھی اپنے امتحان کیلئے بھی تیاری نہیں کی تھی''۔ ٹھاکر ہنسنے لگا۔ پھر بولا۔ ''یہ بتاؤ، تم کیسے آئی ہو۔ ویسے تو کبھی خیال ہی نہیں آتا میرا۔ چھوٹے کے بعد تو بس تم اسکی ہو گئیں۔ مجھے تو چھوڑ ہی دیا تم نے''۔

''ایسی باتیں نہ کریں ناتھ''۔ ٹھاکرانی کھسیا گئی۔ ''پر اس وقت تو میں کام سے ہی آئی ہوں''۔

اردو فینز ڈاٹ کام

''تو کہہ دو جلدی سے''۔

''میں چاہتی ہوں کہ اپنے چھوٹے کو حمیدہ اور وصال دین سے دور کر دیا جائے''۔

''کیوں بھئی؟''۔ ٹھاکر حیران رہ گیا۔

''ناتھ، بچہ اب سیکھنے کی عمر میں ہے۔ مسلمانوں کے ساتھ رہے گا تو انہی کی باتیں سیکھے گا''۔

''یہ تو پہلے سوچنے کی بات تھی ٹھاکرانی''۔ ٹھاکر نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اس نے تو دودھ ہی مسلمان عورت کا پیا ہے۔ اب اتنی فکر کاہے کو کرتی ہو''۔

''وہ تو مجبوری تھی ناتھ۔ بچے کی ضد کے آگے ہارنا پڑا۔ پر اب تو وہ دودھ چھوڑ چکا ہے۔ اب تو اسے آسانی سے ان سے دور کیا جا سکتا ہے''۔

''تم بھول رہی ہو ٹھاکرانی کہ ہم راج پوت آن کے مقابلے میں کسی مجبوری کو نہیں مانتے''۔ ٹھاکر کے تیور بہت خراب تھے۔ ''اور احسان لینا ہمیں منظور نہیں ہوتا۔ لیکن احسان لے لیں تو جیون بھر یاد رکھتے ہیں۔ سر جھک جائے تو جیون بھر نہیں اٹھتا۔ کیا ہم راج پوت عام لوگوں کی طرح مطلبی ہو سکتے ہیں کہ مطلب نکل جانے کے بعد منہ پھیر لیں۔ نہیں..... ہرگز نہیں۔ تم نے ایسا کیا تو ہم میں اور ایک نیچ منش میں کیا فرق رہ جائے گا''۔

ٹھاکرانی اس کے تیور دیکھ کر سہم گئی۔ ''شما کر دیں ناتھ۔ میں تو سب کا بھلا سوچ رہی تھی''۔

''اچھا..... یہ تو بتاؤ، تم اس سلسلے میں کیا کرنا چاہتی تھیں تمہارے خیال میں چھوٹے ٹھاکر کو ان لوگوں سے کیس دور کیا جا سکتا ہے؟''۔

''حمیدہ اور اس کے بیٹے کو حویلی آنے سے روک دیا جائے''۔ ٹھاکرانی نے کہا۔ اس کے دل میں امید جاگ اٹھی تھی۔

''تم بڑی نادان ہو رنجو۔ اپنے بیٹے کو بھی نہیں جانتیں''۔ اس بار ٹھاکر کے لہجے میں پیار تھا۔ ''جب اسے بولنا نہیں آتا تھا، کچھ بھی نہیں آتا تھا، طاقت بھی نہیں تھی اس میں، تب بھی اس کی ضد نے ہمیں ہرا دیا تھا۔ اب کیا ہو سکتا ہے، یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا''۔

ٹھاکرانی کچھ نہ بولی۔ یہ بات اس کے دل کو لگی تھی۔ لیکن اس کے ترکش میں ایک تیر ابھی باقی تھا۔ ''اور ناتھ۔ دوسری فکر مجھے چھوٹے کی پڑھائی کی ہے۔ اب پڑھنے کی عمر میں آ رہا ہے وہ''۔

''ہاں..... بلکہ آ چکا ہے''۔ ٹھاکر نے پرخیال لہجے میں کہا۔ ''اس کے سوال، اس کی پوچھ تاچھ سے یہی پتا چلتا ہے۔ میرا خیال ہے، کچھ ہی دن بعد میں اس کے سوالوں کے جواب دینے سے ہار جاؤں گا۔ ہاں، اب اسے کسی گیانی استاد کی ضرورت ہے''۔

''لیکن یہاں قریب میں کوئی اچھا اسکول نہیں ہے''۔

''یہ درست ہے۔ تو پھر؟''۔

''اسے شہر بھیجنا پڑے گا''۔

ٹھاکر دل ہی دل میں پتنی کی عقل مندی پر مسکرایا۔ وہ ہر بات بہت اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ اس نے بڑی معصومیت سے کہا۔ ''میں نہیں سمجھتا کہ تم اس سے دوری سہہ سکتی ہو۔ اور تم چاہے سہہ لو، یہ میرے بس کی بات نہیں''۔

اب کے سوال اٹھانے کی بھاری ٹھاکرانی کی تھی۔ ''تو پھر؟ اسے پڑھانا تو ضروری ہے''۔ ''ہاں۔ لیکن میں بھی تو اسے خود سے دور نہیں کر سکتا۔ کچھ بڑا ہو جائے تو دیکھیں گے''۔

''تو پھر؟''۔

''تم یہ مجھ پر چھوڑ دو رنجو''۔ ٹھاکر نے بڑے پیار سے کہا۔ ''میں خود دہلی جاؤں گا۔ اس مسئلے کا کوئی حل نکل آئے گا''۔

اب ٹھاکرانی کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ ''جو آپ کی اچھا سوامی جی''۔ اس نے کم زور آواز میں کہا۔

.....x.....

ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے اپنے بچے کو ایک کڑی آزمائش سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ٹھاکرانی کو اس سے تسلی نہیں ہو سکتی تھی۔ اب ہمیشہ یہ خیال رہتا کہ اس سلسلے میں کوشش ہی نہیں کی گئی۔ اور وہ ہمیشہ افسوس کرتی اور ہاتھ ملتی۔ لیکن قدرت نے اسے اس کشٹ سے بچا لیا۔

اس بات کو چند ہی روز ہوئے ہوں گے کہ پہلی بار معمول میں فرق آیا۔ حمیدہ اور وصال دین حویلی نہیں آئے۔ اس روز جمال دین اکیلا ہی آیا تھا۔

چھوٹے ٹھاکر اوتار سنگھ نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ''چاچا جی، اماں نہیں آئیں۔ ویر جی نہیں آئے؟''۔

''نہیں چھوٹے ٹھاکر۔ وہ نہیں آسکیں گے۔ وصال دین کو بخار ہے..... بہت تیز بخار''۔

ننھے ٹھاکر نے پہلے بخار کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ وہ اپنی ماں اور ویر جی کے نہ آنے کو بھی بھول گیا۔ فطری تجسس ہر بات پر حاوی آ گیا۔ ''یہ بخار کیا ہوتا ہے چاچا جی؟''۔

جمال دین گڑبڑا گیا۔ وہ اس طرح کے سوالات کا عادی نہیں تھا۔ اب بخار کے بارے میں کیا بتائے۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے کہا۔ ''ایک بیماری ہوتی ہے''۔

''اور بیماری کیا ہوتی ہے؟''۔

جمال دین اور گڑبڑا گیا۔ اس دوران ٹھاکرانی بھی آ گئی تھی اور یہ سب کچھ سن رہی تھی۔

www.allurdu.com

وہ جمال دین کی مدد کو بڑھی۔ ''شریر میں جو خرابی ہوتی ہے، اسے بیماری کہتے ہیں''۔ اس نے ننھے بیٹے کو سمجھایا۔

''تو بیماری سے کیا ہوتا ہے؟''۔ ننھے ٹھاکر کے پاس سوالوں کی کمی نہیں تھی۔

''بیماری سے شریر کی شکتی کم ہو جاتی ہے''۔

''اور بخار کیا ہوتا ہے؟''۔

''اس میں شریر کی گرمی بہت بڑھ جاتی ہے۔ شریر دکھتا ہے اور منش چل پھر نہیں سکتا''۔

اس طرف سے تسلی ہوئی تو ننھے ٹھاکر کو اپنی محرومی کا خیال آیا۔ ''تو ویر جی کب آئیں گے؟''۔

''پتا نہیں چھوٹے ٹھاکر۔ بہت تیز بخار ہے اسے۔ دعا کریں کہ شام تک اتر جائے''۔

''خود بخود اتر جائے گا؟''۔

''نہیں چھوٹے ٹھاکر۔ ابھی میں وید جی کے پاس جا کر دوا لوں گا اس کیلئے''۔ جمال دین نے کہا۔ پھر زمین پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''آیئے چھوٹے ٹھاکر۔ گھوڑا حاضر ہے''۔

ننھے ٹھاکر نے سواری تو کی۔ لیکن انداز سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ خوش نہیں ہے۔ اور ناشتے سے تو اس نے انکار ہی کر دیا۔ ٹھاکرانی کو تو پرانے دن یاد آ گئے، جب اس نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔

بہر حال بڑے ٹھاکر کے سمجھانے پر اس نے بڑی بے دلی سے ناشتہ کر لیا۔ لیکن وہ دن اس نے جس طرح گزارا، اسے دیکھ کر ٹھاکر اور ٹھاکرانی دونوں کو ترس آنے لگا۔ وہ تو اس بچے کی طرح تھا، جو بارونق میلے میں اپنے لوگوں سے بچھڑ گیا ہو۔ پورے دن اس نے کسی کھلونے میں، کھیل کود میں دلچسپی نہیں لی۔ بس وہ بیٹھا خطاؤں میں گھورتا رہا۔ بیٹھے بیٹھے اکتا جاتا تو مشینی انداز میں ادھر ادھر چلنے پھرنے لگتا۔ وہ اتنا بیزار اور اکتایا ہوا تھا کہ ٹھاکرانی کا دل کٹنے لگا۔

''چلو..... بھگوان نے تمہاری منو کامنا پوری کر دی''۔ ٹھاکر نے رنجیتا سے کہا۔ ''تمہارا ننھا بیٹا حمیدہ اور وصال دین سے دور ہو گیا''۔

''مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ حال ہو جائے گا میرے راج کمار کا''۔ ٹھاکرانی نے تاسف سے کہا۔

''مگر میں جانتا تھا۔ اس لئے منع کیا تھا''۔

ننھے ٹھاکر نے کھانا بھی برائے نام کھایا۔ ٹھاکرانی کے اصرار پر اس نے کہا۔ ''ماتا جی، کھایا نہیں جاتا۔ گلے میں کچھ پھنس رہا ہے''۔

اس کے لہجے میں ایسی بے چارگی اور دکھ تھا کہ ٹھاکرانی کے اپنے حلق میں کچھ پھنسنے لگا۔

اور سر شام ہی چھوٹا ٹھاکر منہ لپیٹ کر پڑ گیا۔ ورنہ اس وقت ہر روز وہ اپنے پتا جی سے کھیلتا، ان سے باتیں کرتا تھا۔ ٹھاکر نے اس سے پوچھا کہ وہ اتنی جلدی کیوں لیٹ گیا ہے تو اس نے کہا۔ ''میں سو جاؤں گا پتا جی۔ صبح اٹھوں گا تو اماں اور ویر جی آ جائیں گے''۔

یعنی وہ اپنے بچھڑے ہوؤں کا انتظار کر رہا تھا۔

ٹھاکرانی کو تو ہول اٹھنے لگا۔ ''ناتھ..... بھگوان نہ کرے، اس کی طبیعت خراب نہ ہو جائے''۔ اس نے گھبرا کر کہا۔

ٹھاکر خود بھی پریشان تھا۔ ''اگر وہ لوگ کل بھی نہیں آ سکے تو؟''۔

''بھگوان نہ کرے''۔ ٹھاکرانی نے بڑے خلوص سے کہا۔ یہ سوال خود اسے بھی پریشان کر رہا تھا۔ ''اور اگر ایسا ہوا تو؟''۔

''کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا''۔

''کسی بھی طرح ان کو آنا ہی ہوگا''۔

ٹھاکر کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ ''کیسی بات کرتی ہو رنجیتا۔ وہ بھی منش ہیں''۔

وہ دونوں بار بار بیٹے کے پاس جاتے۔ وہ لیٹا ہوا تو تھا لیکن اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بار بار کروٹیں بدل رہا تھا۔ انہوں نے کئی بار اسے پکارا۔ لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ ظاہر یہی کر رہا تھا کہ سو رہا ہے۔ ٹھاکرانی بار بار اس کا ہاتھ تھام کر دیکھتی کہ کہیں اسے بخار تو نہیں ہے۔

دونوں کی وہ رات سوتے جاگتے گزری۔ کیوں کہ ان کا بیٹا بھی اسی حال میں تھا۔ ایک جھپکی آتی اور پانچ منٹ بعد وہ چونک کر اٹھ جاتا۔ ''ماتا جی..... صبح ہو گئی؟''۔

''نہیں پتر۔ ابھی تو آدھی رات ہے۔ صبح تو بہت دور ہے''۔

''یہ صبح اتنی دیر میں کیوں ہوتی ہے''۔ ننھا بچہ جھنجھلا کر کہتا۔

ٹھاکرانی اسے کیا بتاتی کہ صبح تو اپنے وقت پر ہوتی ہے۔ لیکن انتظار ہو تو وقت جیسے ٹھہر جاتا ہے۔

ٹھاکر بھی رات بھر اسی کمرے کے چکر لگاتا رہا۔ وہ بہت پریشان تھا۔ سوچے جا رہا تھا کہ اس مسئلے کا کیا حل ہے۔

صبح کے قریب کا وقت ایسا ہوتا ہے کہ نیند آ ہی جاتی ہے۔ اور گہری نیند آتی ہے۔ اس وقت ٹھاکرانی بھی سو گئی۔ ذرا ہی دیر ہوئی ہوگی کہ اوتار سنگھ نے اسے جھنجھوڑ کر اٹھا دیا۔

''اٹھیں ماتا جی، اٹھ جائیں۔ صبح ہو گئی ہے''۔

ٹھاکرانی گھبرا کر اٹھی۔ کھڑکی کے پاس گئی۔ پردہ ہٹا کر باہر جھانکا تو گہرا اندھیرا تھا۔ ''نہیں پتر جی، ابھی تو رات ہے''۔ اس نے کہا۔

''نہیں ماتا جی۔ سنیں تو۔ چڑیاں بول رہی ہیں''۔

ٹھاکرانی نے کان لگا کر سنا۔ کہیں ایک آدھ چہکار سنائی دے رہی تھی۔ مگر ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ ''سو جاؤ پتر۔ ابھی تھوڑی دیر ہے صبح ہونے میں''۔ اس نے بیٹے کو سمجھایا۔

لیکن ننھے ٹھاکر کیلئے انتظار کی رات کی صبح ہو چکی تھی۔ یہ الگ بات کہ انتظار اب بھی کرنا تھا۔ وہ اس کے بعد نہ سویا، نہ ٹھاکرانی کو سونے دیا۔

وہ ایسی صبح تھی، جس میں سب کیلئے انتظار ہی انتظار تھا۔ ٹھاکر اور ٹھاکرانی بھی آنے والوں کے منتظر تھے۔ لیکن ان کے آنے کا وقت ابھی دور تھا۔

اور جب وہ وقت آیا تو مایوسی لے کر آیا۔ اس صبح بھی جمال دین اکیلا ہی آیا۔ ''وصال دین کا بخار کل سے اب تک نہیں اترا ہے''۔ اس نے بتایا۔

ننھے ٹھاکر کی مایوسی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اس روز اس نے جمال دین پر سواری کرنے سے بھی انکار کر دیا اور ناشتے کو تو وہ ہاتھ لگانے کا روادار بھی نہیں تھا۔

ٹھاکر اور ٹھاکرانی پریشان تھے کہ اب کیا کریں۔

اچانک ننھے ٹھاکر نے کہا۔ ''پتا جی..... مجھے ویر جی کے پاس جانا ہے۔ مجھے لے کر چلیں''۔

ٹھاکر کے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ اسے حیرت ہوئی اور خود پر غصہ بھی آیا۔ اتنے سامنے کی بات اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ اس مسئلے کا واحد حل یہ تھا کہ ننھے ٹھاکر کو وصال دین کے پاس لے جایا جائے۔

لیکن ٹھاکر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ٹھاکرانی بول اٹھی۔ ''یہ نہیں ہو سکتا پتر''۔

''کیوں نہیں ہو سکتا ماتا جی؟''۔

''بس..... نہیں ہو سکتا''۔

''تم چپ رہو ٹھاکرانی''۔ ٹھاکر نے بے حد سخت لہجے میں کہا۔ پھر بیٹے کی طرف مڑا۔ ''یہ ٹھیک ہے پتر۔ ہم خود تمہارے ویر جی کے گھر چلیں گے''۔

ننھا ٹھاکر خوش ہو گیا۔ چوبیس گھنٹے میں پہلی بار اس کے چہرے پر خوشی نظر آئی تھی۔ اسے دیکھ کر ٹھاکرانی کا دل بھی موم ہو گیا۔ ''ٹھیک ہے ناتھ''۔

''تم ناشتہ تیار کرو رنجو۔ ہم ناشتہ ساتھ لے کر جائیں گے۔ اور تم جمال دین''۔ ٹھاکر جمال جمال دین کی طرف مڑا۔ ''تم وید جی کو لے کر اپنے گھر پہنچو''۔

''وید جی سے تو مجھے دوا لینی ہے''۔ جمال دین نے حیرت سے کہا۔ ''وہ کب کہیں جاتے ہیں''۔

''ان سے کہنا، یہ میرا حکم ہے''۔ ٹھاکر نے سخت لہجے میں۔

جمال دین چلا گیا۔ ٹھاکر گاڑی تیار کرانے لگا۔ جمال دین کا گھر گاؤں کے آخری سرے پر تھا۔ بچے کو اتنی دور پیدل تو نہیں لے جایا جا سکتا تھا۔

ٹھاکر نے گاڑی تیار تو کرا لی۔ مگر اس کے بعد وہ دوسرے انداز میں سوچنے لگا۔ اسے یاد تھا کہ اپنی غرض کے لئے جب وہ پہلی بار جمال دین کے گھر گیا تھا تو اس نے یہ خیال رکھا تھا کہ غرض مندوں کی طرح جائے۔ سو وہ آدھی رات کو پیدل ہی اس کے گھر گیا تھا۔ اور آج بھی بات غرض کی تھی۔ تو پھر یہ اہتمام اور کروفر کیسا۔ دوسری بات یہ کہ اوتار سنگھ کا حمیدہ سے دودھ کا تعلق جڑنے کے بعد اس نے اس کے گھرانے کو ہر اعتبار سے برابری کا درجہ دیا تھا۔ اب اسے خیال آ رہا تھا کہ یہ برابری تو نہیں۔ وصال دین اپنی ماں کے ساتھ ہر روز پیدل چل کر حویلی آتا تھا۔ جب کہ اس کا بیٹا تو پہلی بار حمیدہ کے گھر جا رہا تھا۔ اسے بھی پیدل ہی جانا ہے۔

اور اس برابری کے خیال کے تحت ٹھاکر نے ایک فیصلہ اور کیا۔ یہ کیا کہ وصال دین اپنی ماں کے ساتھ ہر روز حویلی آئے۔ یہ بھی برابری تو نہیں۔ برابری تو یہ ہے کہ ایک دن وصال دین حویلی آئے اور دوسرے دن اوتار سنگھ اس کے گھر جائے اور وہاں وقت گزارے۔ یہ فیصلہ کر کے وہ پرسکون ہو گیا۔

ٹھاکرانی ناشتے کا سامان لے کر آئی تو ٹھاکر نے دونوں فیصلے اسے سنا دیئے۔ ٹھاکرنی جز بز تو ہوئی۔ لیکن اختلاف کرنے کی جرات نہ کر سکی۔ تاہم اس نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ ''میرا بچہ اتنا چھوٹا ہے۔ پیدل چلے گا تو تھک جائے گا''۔

''نہیں تھکوں گا ماتا جی۔ ویر جی سے ملنے تو میں خوشی خوشی جاؤں گا''۔ ننھے ٹھاکر نے کسی کیلئے کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔

وہ چلنے لگے تو ٹھاکرانی بھی ساتھ ہو لی۔ ''آج تو میں بھی چلوں گی''۔

ٹھاکر نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ وہ جانتا تھا کہ ٹھاکرانی دیکھنا چاہتی ہے کہ اس کا بچہ کہاں جایا کرے گا۔

.....x.....

اس سے پہلے ننھے ٹھاکر کی دنیا صرف اس کی آبائی حویلی تھی۔ وہ کبھی باہر نکلا ہی نہیں تھا۔ سو اب وہ حیران ہی تھا اور خوش بھی۔ یہ باہری دنیا بہت بڑی تھی۔ تا حد نظر لہلہاتے ہوئے ہرے بھرے کھیت اور ان میں کام کرتے ہوئے کسان۔ یہ سب کچھ اسے بہت اچھا لگا۔ وہ ہر چیز کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ اور ہر سوال کے ساتھ وضاحتیں بھی تھیں ٹھاکر جواب دیتے دیتے تھک گیا۔ ''باقی باتیں پھر پوچھ لینا پتر''۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

اسی لمحے اسے ایک درخت کے پاس وہی مجذوب کھڑا نظر آیا، جسے اس نے اوتار سنگھ کی پیدائش کے دن دیکھا تھا۔ اس نے ٹھاکرانی کا ہاتھ دباتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔

''رنجو..... آج تمہیں بھی اس بابا کے درشن ہونے والے ہیں، جسے تم نے خواب میں دیکھا تھا''۔

ٹھاکرانی نے نظریں اٹھا کر اس طرف دیکھا۔ مجذوب ان سے کوئی بیس قدم کے فاصلے پر تھا۔ ٹھاکر نے اسکے تھامے ہوئے ہاتھ سے اس کے جسم کی تھرتھراہٹ محسوس کر لی۔

''کیا بات ہے رنجو؟''۔

''مجھے ڈر لگ رہا ہے ناتھ''۔ ٹھاکرانی کی آواز بھی لرز رہی تھی۔

''دینے والوں سے ڈر کیسا؟''۔ ٹھاکر نے اسے تسلی دی۔

''دینے والے لے بھی تو سکتے ہیں''۔

وہ مجذوب کے پاس پہنچ کر رک گئے۔ ٹھاکر اور ٹھاکرانی نے ہاتھ جوڑ کر اسے پرنام کیا۔ ٹھاکرانی کا پورا جسم لرز رہا تھا۔

مجذوب ٹھاکرانی کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ جو نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ ''نظریں تو اٹھا ٹھاکرانی''۔ مجذوب نے دھیمی آواز میں کہا۔

ٹھارانی نے ایک لمحے کو نظر اٹھائی اور فوراً ہی جھکا لی۔ ان آنکھوں میں دیکھنے کی تاب نہیں تھی اس میں۔

''دینے والے بہت سے نہیں ہوتے نا سمجھ۔ دینے والا ایک ہی ہوتا ہے''۔ مجذوب نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔ ''اور دینے والا اتنا بڑا ہے کہ کسی بات پر خفا ہو کر دی ہوئی چیز واپس نہیں لیتا''۔

www.allurdu.com

ٹھاکرانی تو یہ سن کر دہل گئی۔ اتنے فاصلے سے اس کی سرگوشی میں کہی ہوئی بات مجذوب نے کیسے سن لی۔

''بھول ہوگئی مہاراج۔ میری پتنی نادان ہے۔ شما کردیں اسے'' ٹھاکر نے جلدی سے کہا۔

''بھول تو ہوتی ہے۔ معافی بھی مل جاتی ہے۔ لیکن نشانیاں دیکھ کر سمجھنا تو چاہئے۔ یہ بات تو تو بھی نہیں سمجھا کہ دینے والا صرف ایک ہے''۔ مجذوب کے لہجے میں ہلکی سی سرزنش تھی۔ تم کہاں کہاں مانگتے پھرے۔ مگر تمہیں کچھ نہیں ملا۔ پھر دینے والے نے تمہیں کچھ دینے سے پہلے برگد کے اس پیڑ کو جلا دیا، جس سے تم نے آخری بار اولاد مانگی تھی۔ اس میں نشانی تھی کہ برگد کا پیڑ تو خود اپنی مرضی سے رہ بھی نہیں سکتا۔ دینے والا کوئی اور ہے جو تمہیں نظر نہیں آتا۔ مگر تم بدنصیب سمجھتے ہی نہیں''۔

اس بار ٹھاکر پر بھی تھرتھری چڑھ گئی۔ اس پیڑ کا جلنا پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا تھا۔ ''بھول ہوگئی مہاراج''۔ وہ گڑگڑایا۔

''کب تک بھولے رہو گے۔ کب تک بھول ہوتی رہے گی۔ خیر، بھول ہوگی تو معافی بھی ملے گی۔ وہ تو بہت معاف کرنے والا ہے۔ مگر بھولے رہو گے تو وہ بھی تمہیں بھول جائے گا''۔

ان لفظوں میں جانے کیا تھا کہ ٹھاکر اور ٹھاکرانی اندر سے تھرا کر رہ گئے۔

''اور سنو۔ میں نے سب کچھ تو سمجھا دیا تھا''۔ مجذوب کا لہجہ اب بھی نرم تھا۔ ''ٹھاکرانی، تو سمجھتی کیوں نہیں۔ چھوٹے کی خوشی کے آڑے نہ آیا کر۔ تو اس کا راستا کھوٹا نہیں کر سکتی۔ بس خود کو دکھی کرلے گی اس کوشش میں۔ محبت کی ہے تو محبت کرنا بھی سیکھ۔ دل بڑا رکھ۔ اس نے تجھے قیمتی چیز دی۔ تو اسے سب کے ساتھ بانٹے گی تو وہ تیرا ہوگا۔ ورنہ تیرا نہیں رہے گا۔ اور سن..... اسے اپنا راستا معلوم ہے۔ اسے چلنے دے اس کے راستے پر۔ تب تیری ٹیڑھ بھی دور ہوجائے گی''۔

اس بار مجذوب کی بات پوری طرح ٹھاکرانی کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے نظریں اٹھائیں اور ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ ''اب غلطی نہیں ہوگی مہاراج''۔

اتنی دیر تک ننھا ٹھاکر مجذوب کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا تھا۔ اچانک مجذوب گھٹنوں کے بل بیٹھا اور اس نے ننھے ٹھاکر کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ ''آپ کیسے ہیں بیٹے''۔ اس نے کہا اس کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔

''میں ٹھیک ہوں بابا۔ بس میرے ویرجی بیمار ہیں''۔ ننھے ٹھاکر نے کہا۔

''ٹھیک ہوجائے گا وہ۔ اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔ بس آپ خوش رہیں۔ خوش رہنے والی باتوں میں۔ اللہ آپ کے ساتھ ہے''۔ یہ کہہ کر مجذوب نے اس کے دونوں ہاتھوں کو محبت سے چوما اور آنکھوں سے لگایا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اب میں چلتا ہوں''

مجذوب حویلی کی سمت چل دیا۔ وہ تینوں کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا تو وہ جمال دین کے گھر کی طرف چلے۔

راستے میں ننھے ٹھاکر نے باپ سے پوچھا۔ ''یہ کون تھے پتاجی؟'' اس کے لہجے میں احترام تھا۔

''یہ بہت بڑے گیانی ہیں پتر..... بڑی شکتی والے''۔

ننھے ٹھاکر نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ اس نے یہ نہیں پوچھا کہ گیانی کیا ہوتا ہے اور شکتی کسے کہتے ہوں۔ جیسے وہ یہ بات پہلے سے جانتا ہو۔

چند منٹ بعد وہ جمال دین کے گھر پہنچ گئے۔

.....x.....

ویدجی وصال دین کو دوا دے کر جا چکے تھے۔ ننھا ٹھاکر جاتے ہی وصال سے لپٹ گیا۔ ''اٹھنا ویرجی۔ میرے ساتھ کون کھیلے گا''۔

وصال دین کراہ کر رہ گیا۔

''پتاجی، ویرجی کا شریر تو آگ ہو رہا ہے''۔ چھوٹے ٹھاکر نے باپ سے فریاد کی۔

''دوا پیئے گا تو ٹھیک ہوجائے گا پتر''۔ ٹھاکر نے اسے دلاسہ دیا۔

''اب ناشتہ تو کرلو چھوٹے''۔ ٹھاکرانی نے کہا۔

''ویرجی کے ساتھ کروں گا۔ اماں کے ہاتھ سے کروں گا''۔

دونوں شرطیں پوری کردی گئیں۔ وصال دین سے کچھ کھایا تو نہیں گیا۔ اس نے دودھ پی لیا۔ ناشتے کے بعد چھوٹا ٹھاکر وصال دین سے لپٹ کر لیٹ گیا۔ ٹھاکرانی پریشانی ہوئی۔ مگر ٹھاکر نے اسے بڑے یقین سے کہا۔ ''ڈرو مت ٹھاکرانی۔ تمہارے بیٹے کو کچھ نہیں ہوگا''۔

ٹھاکرانی کو مجذوب یاد آیا۔ وہ مطمئن ہوگئی۔

ایک گھنٹے بعد ٹھاکر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اب ہم جائیں گے جمال دین''

''آپ آئے سرکار۔ بڑی مہربانی آپ کی''۔ جمال دین نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''میں نہیں جاؤں گا پتاجی''۔ اوتار سنگھ نے کہا۔

ٹھاکر مسکرایا۔ ''تم سے کون کہہ رہا ہے جانے کو۔ تمہیں میں شام کو آکر لے جاؤں گا''۔

یہ سن کر حمیدہ ہکا بکا رہ گئی۔ ٹھاکرانی نے اس کی کیفیت بھانپ کر جلدی سے نرم لہجے میں کہا۔ ''جب تک وصال دین ٹھیک نہیں ہوجاتا، چھوٹے ٹھاکر خود تمہارے گھر آیا کریں گے''۔

''اور ٹھیک ہوجانے کے بعد ایک دن وصال دین حویلی آئے گا تو دوسرے دن میرا پتر تمہارے گھر آئے گا''۔ ٹھاکر بولا۔ ''تمہیں بوجھ تو نہیں لگے گا حمیدہ''۔

''بوجھ کیسا ٹھاکر جی سرکار۔ ہماری تو کٹیا کے بھاگ جاگ گئے ہیں جی۔ سر آنکھوں پر''۔

ٹھاکر اور ٹھاکرانی اپنے بیٹے کو وصال دین سے لپٹا چھوڑ کر باہر نکل آئے۔ راستے میں ٹھاکر نے پتنی سے کہا۔ ''تمہاری سمجھ میں آیا کہ تم آج یہاں کیوں آئیں''۔

ٹھاکرانی نے نفی میں سر ہلایا۔

''تمہیں آج مجذوب سے ملنا تھا''۔

ٹھاکرانی سوچ میں پڑ گئی۔ ''پر ناتھ، اس کی بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں''۔

''نہ سہی۔ بس یاد رکھنا، اور عمل کرنا۔ سمجھ میں خود آجائیں گی''۔

''یہ کیسا بھید ہے ناتھ؟''۔

''بھید کے چکر میں نہ پڑنا رنجو۔ بھگوان کی باتیں بھگوان جانے''

''سچ کہتے ہو ناتھ''۔

.....x.....

پہلے تین دن تو چھوٹا ٹھاکر مسلسل حمیدہ کے گھر گیا۔ وصال دین کا بخار تو اتر گیا تھا۔ لیکن کمزوری بہت تھی پھر بھی وہ صحن میں چھوٹے ٹھاکر کے ساتھ کھیلتا رہا۔ تیسرے دن وہ گھر سے باہر نکل کر مٹی میں خوب کھیلے۔ چھوٹے ٹھاکر کو بہت مزہ آیا۔ بلکہ یہ جان کر اسے افسوس ہوا کہ اگلے روز وصال دین حویلی آئے گا۔ اسے گھر سے باہر کھلی فضا میں کھیلنے کا چسکا لگ گیا تھا۔

پھر وہ دوسرا معمول شروع ہوگیا۔ ایک دن وصال دین حویلی آتا اور اگلے دن چھوٹا ٹھاکر اس کے گھر جاتا۔

ایک ہفتے بعد ٹھاکر پرتاپ سنگھ بیٹے کی تعلیم کی فکر میں دہلی چلا گیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ بیٹے کی تعلیم شروع ہوچکی ہے۔

ننھا ٹھاکر بے حد متجسس فطرت کا مالک تھا۔ اس کا مشاہدہ بہت اچھا تھا اور چیزوں کو دیکھ کر وہ ان کے بارے میں غور و فکر بھی کرتا تھا۔ اب وہ باہر نکلا تو پتا چلا کہ دنیا بہت بڑی ہے..... اتنی بڑی کہ اس کی نظر اسے نہیں دیکھ سکتی۔

اب وہ سوال پہلے سے زیادہ کرتا تھا۔ لیکن اسے جواب بھی ملتا تھے۔ حمیدہ ٹھاکرانی اور جمال دین دونوں سے مختلف تھی۔ اس میں تعلیم کی تو کمی تھی۔ لیکن گرد و پیش سے مکمل آگہی اسے حاصل تھی۔ اور اس کے پاس دانش بھی تھی۔ وہ مشین کی طرح لگی بندھی زندگی گزارتی تو تھی۔ لیکن اس کے پاس سوچتا ہوا دماغ بھی تھا۔ اور ننھے ٹھاکر کے لئے یہ بہت بڑی نعمت تھی۔

اس روز حمیدہ کو کھانا تیار کرنے میں دیر ہوگئی۔ چھوٹا ٹھاکر بھوک سے بے تاب ہوکر چلایا۔ ''اماں..... مجھے ابھی روٹی چاہئے۔ جلدی سے دو''۔

حمیدہ آٹا گوندھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''بس ذرا دیر رک جاؤ بیٹے۔ ابھی دیتی ہوں''۔

''مجھے ابھی چاہئے''۔

''اچھا..... یہاں آجاؤ۔ دیکھو تو کہ روٹی کیسے بنتی ہے''۔

ننھا ٹھاکر اس کے پاس جا بیٹھا۔ حمیدہ اسے قصے سناتی، بہلاتی رہی۔ اس کے سوالوں کے جواب دیتی رہی۔ پھر اس نے پہلی گرم گرم روٹی اتاری، اس پر مکھن رکھا اور تھالی میں ساگ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ''لو چھوٹے ٹھاکر، اب کھاتے جاؤ۔ میں گرم گرم روٹی اتارتی رہوں گی''۔

ننھا ٹھاکر بہت بھوکا تھا۔ مگر اس عالم میں بھی وصال دین کو نہیں بھولا۔ ''آؤ ویرجی..... کھانا کھائیں''۔

''ابھی نہیں۔ دو روٹیاں اور اتر جائیں تو پھر وصال دین بھی بیٹھ جائے گا''۔ حمیدہ نے کہا۔

لیکن چھوٹا ٹھاکر نہیں مانا۔ اس نے وصال دین کے بغیر لقمہ نہیں توڑا۔ اتنی بحث میں حمیدہ کو مہلت مل گئی۔ روٹی کا تسلسل بھی نہیں ٹوٹا۔ دونوں بچے کھانا کھا کر نمٹے تو چھوٹے ٹھاکر نے حمیدہ کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ ''تم کتنی اچھی ہو اماں''۔ اس نے کہا اور وصال دین کو دیکھا جو ہاتھ پھیلا کر دعا کرنے کے بعد چہرے پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ ''یہ تم کھانے کے بعد کیا کرتے ہو ویرجی؟''۔ اس نے وصال دین سے پوچھا۔

وصال دین گھبرا گیا۔ اسے اپنے گھر میں ہمیشہ کھانے کے بعد ایسا کرنے کی عادت تھی۔ ماں نے اس سکھایا تھا۔ لیکن ماں نے کہا تھا کہ حویلی میں کچھ کھاؤ تو ایسا نہ کرنا۔ دل میں ہی اللہ کا شکر ادا کردینا۔ ''کچھ نہیں چھوٹے ٹھاکر''۔ اس نے کہا۔

''نہیں ویرجی۔ مجھے بتاؤ نا''۔

وصال دین نے گھبرا کر ماں کو دیکھا۔ حمیدہ نے جلدی سے کہا۔ ''اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا بیٹے''۔

''کون اللہ؟''۔

اب حمیدہ بھی گڑبڑا گئی۔ ''وہ جسے تم بھگوان کہتے ہو''۔

''اچھا۔ اور شکر کیا ہوتا ہے؟''۔

''ابھی تم خوش ہوکر مجھ سے لپٹ گئے تھے نا..... اور کہا تھا..... تم کتنی اچھی ہو اماں۔ تو یہ شکر تھا''۔

''میں سمجھ گیا اماں۔ کوئی کسی کو کچھ دے، کسی کو کسی سے کچھ فائدہ ہو تو وہ اس کا شکر ادا کرتا ہے۔ ہے نا اماں''۔

حمیدہ اسے شکریئے اور شکر کا فرق بتانے کی ہمت نہیں کرسکی۔ ''ہاں چھوٹے ٹھاکر..... میرے بیٹے''۔

''تو ویرجی نے اللہ کا شکر کیوں ادا کیا۔ روٹی تو انہیں تم نے دی تھی اماں''۔

اب حمیدہ کو کون روک سکتا تھا۔ وہ چپ رہتی تو اس کا بیٹا خراب ہوتا..... ایمان سے دور ہوتا۔ ''اس کے لئے تمہیں یہ سمجھنا ہوگا بیٹے کہ روٹی کتنی مشکل سے بنتی ہے''۔

''مشکل سے بنتی ہے''۔ چھوٹے ٹھاکر نے حیرت سے دہرایا۔ ''آٹا گوندھا، چولہا جلایا، توا چڑھایا اور روٹی تیار''۔

''کبھی یہ بھی سوچو کہ آٹا کہاں سے آتا ہے''۔

''مکئی سے بنتا ہے''۔ چھوٹے ٹھاکر نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ ''اور گیہوں سے بنتا ہے۔ پر مجھے مکئی کی روٹی زیادہ پسند ہے''

''اور مکئی اور گیہوں کہاں سے آتے ہیں؟''۔

چھوٹے ٹھاکر کا تجسس بھڑک اٹھا۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ ''تم بتاؤ نا اماں''

www.allurdu.com

''کھیتوں سے''۔حمیدہ نے کہا۔''کسان پہلے زمین میں ہل چلاتا ہے۔پھر بیج بوتا ہے۔چار پانچ مہینے اس کی دیکھ بھال،اس کی رکھوالی کرتا ہے۔اللہ دھوپ سے گرمی دیتا ہے۔وقت پر بارش برساتا ہے۔تب فصل تیار ہوتی ہے۔پھر بہت سے لوگ مل کر کٹائی کرتے ہیں۔تب کہیں گندم یا مکئی ملتی ہے۔اب سوچو،تمہاری ایک روٹی کے لئے کتنے لوگ مہینوں محنت کرتے ہیں۔اور اللہ بارش روک دے تو فصل خراب ہو جاتی ہے۔کبھی بہت دن سورج نہ نکلے تو بھی فصل خراب ہو جاتی ہے۔اب سوچو،کتنا کچھ ہوتا ہے ایک روٹی کے لئے''

اس روز چھوٹے ٹھاکر کیلئے سوچ کے نئے دروازے کھل گئے۔دنیا اس کے لئے کچھ اور بڑی،کچھ اور ناقابل فہم ہوگئی۔جسے سمجھنے کی کوشش کرنی تھی۔

.....x.....

ٹھاکر پرتاپ سنگھ دہلی سے کافی رات گئے واپس آیا۔چھوٹا ٹھاکر اس وقت سو چکا تھا۔ٹھاکرانی کھانا لے کر ٹھاکر کے کمرے میں گئی۔ٹھاکر نے کھانا کھایا۔پھر پتنی سے بولا۔

''میں پورا بندوبست کر آیا ہوں چھوٹے کی پڑھائی کا''۔

ٹھاکرانی کا تو دل دھک سے رہ گیا۔اسے لگا کہ ٹھاکر نے بچے کو دہلی میں داخل کرانے کی بات کر لی ہے۔

ٹھاکر اس کے چہرے کے تاثر سے سمجھ گیا۔''نہیں ٹھاکرانی۔چھوٹا گھر پر ہی پڑھے گا۔میں نے اسکول والوں سے بات کر لی ہے ہم چھوٹے کو گھر پر ہی تیاری کرائیں گے۔آٹھویں جماعت سے اسے اسکول میں جانا ہوگا۔پہلے وہ امتحان لیں گے۔پھر داخلہ دیں گے۔پھر اسے وہیں رہنا ہوگا۔صرف چھٹیوں میں گھر آیا کرے گا''

ٹھاکرانی کو اس وقت سے خوف آنے لگا۔''اس وقت کتنا بڑا ہوگا ہمارا چھوٹا؟''۔

''بارہ تیرہ سال کا ہوگا''۔

ٹھاکرانی نے سکون کی سانس لی۔''تب تو ٹھیک ہے''۔مگر فوراً ہی وہ پریشان ہوگئی۔''تو یہاں گھر پر اسے کون پڑھائے گا؟''۔

''اسی اسکول کے ایک ریٹائرڈ ماسٹر ہیں کانتی پرشاد۔میں نے ان سے بات کی ہے۔ہفتہ دس دن میں وہ یہاں آئیں گے۔حویلی میں ہی رہیں گے۔وہ اسکول کے نصاب سے واقف ہیں۔صحیح تیاری کرائیں گے''۔

''یہ تو بہت اچھا ہے''۔ٹھاکرانی نے کہا۔اس کے دل سے بوجھ ہٹ گیا تھا۔

ٹھاکر نے اگلا روز اس سلسلے میں جمال دین سے بات کی۔جمال دین کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ٹھاکر اسے کیوں بتا رہا ہے۔''میرا اوتار سنگھ وصال دین کے بغیر نہیں پڑھے گا''۔ٹھاکر نے وضاحت کی۔''وہ وصال دین کے بغیر کچھ نہیں کرتا''۔

''تو ٹھیک ہے ٹھاکر جی''۔

''تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں''۔

''احسان فراموش نہیں ہوں سرکار''۔جمال دین نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔''یہ تو آپ کا ایک اور احسان ہوگا مجھ پر.....اور وصال دین پر۔ورنہ میں اسے کہاں پڑھاتا بھلا''۔

ٹھاکر کے لئے دل کی بات زبان پر لانا مشکل ہو رہا تھا۔تاہم اس نے دل کڑا کر کے کہہ ہی دیا۔''وہ ماسٹر کانتی پرشاد ہندو جاتی کا ہے جمال دین۔تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں''۔

جمال دین نے حیرت سے اسے دیکھا۔''کیسی بات کرتے ہیں ٹھاکر جی۔علم تو کوئی بھی کسی کو دے سکتا ہے۔اس کا تو احسان ہوتا ہے جی''۔

ٹھاکر کو حیرت ہوئی۔یہ وہی جمال دین تھا،جو مذہب کا پکا تھا۔اس کے لئے کچھ بھی کھونے کو تیار تھا۔کیا اسے ڈر نہیں لگتا کہ ہندو ماسٹر اس کے بچے کا دھرم خراب کر دے گا۔جب کہ ٹھاکرانی تو صرف صحبت سے ڈر رہی تھی اور بچے کو اس مسلمان پریوار سے دور کرنا چاہتی تھی۔

اس نے ٹھاکرانی کو یہ بات بتائی تو وہ بہت شرمندہ ہوئی۔

.....x.....

دہلی سے ماسٹر کانتی پرشاد آ گئے۔دونوں بچوں کی پڑھائی شروع ہوگئی۔

کانتی پرشاد پڑھے لکھے،لائق اور روشن خیال آدمی تھے۔دھرم کو انہوں نے بہت پہلے فرسودہ پا کر طاق نسیاں پر رکھ دیا تھا۔عمر ان کی تدریس میں گزری تھی۔اب ریٹائر ہو چکے تھے۔پریشانی کوئی نہیں تھی۔گھر بچوں نے سنبھالا ہوا تھا۔ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی پینشن انہیں بہت بڑی نعمت محسوس ہوئی۔پتنی کے دیہانت کے بعد ان کا کہیں من نہیں لگتا تھا۔بے کاری کا احساس ستاتا تھا۔ٹھاکر کی مہربانی سے ان کا بے وقعتی کا احساس بھی دور ہوگیا۔گرد و پیش بھی تبدیل ہوگیا اور مصروفیت بھی مل گئی۔یہ طے تھا کہ انہیں پیسہ بھی بہت ملے گا۔لیکن پیسے کی انہیں پروا نہیں تھی۔

انہیں دو شاگرد ملے۔ابتدا میں ہی انہیں اندازہ ہوگیا کہ ٹھاکر کا بیٹا نہ صرف ذہین ہے بلکہ اسے علم کی جستجو بھی ہے۔جب کہ دوسرا لڑکا بس ٹھاکر کے بیٹے کی محبت میں پڑھ رہا تھا۔اسے جو پڑھایا جاتا،توتے کی طرح رٹ لیتا۔جب کہ ٹھاکر کا بیٹا بڑھ چڑھ کر سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔کانتی پرشاد کو اندازہ ہوگیا کہ اس کا میلان طبع سائنس کی طرف ہے۔پھر جیسے جیسے دن گزرتے گئے،کانتی پرشاد کی اوتار سنگھ میں دلچسپی بڑھتی گئی۔وہ جتنا اسے پڑھانے کی کوشش کرتے تھے،اس سے زیادہ وہ پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتا تھا،یعنی استاد اور شاگرد کے درمیان ایک دوڑ لگی تھی.....اور شاگرد ہمیشہ استاد پر فوقیت لے جاتا تھا۔تجسس سے علم کی لگن بڑھتی ہے۔اوتار سنگھ متجسس بھی تھا اور غور و فکر بھی کرتا تھا۔

چناں چہ وصال دین اس سے بہت پیچھے رہ گیا

دوسری طرف ٹھاکرانی رنجیتا نے بھی اپنے طور پر ایک ذمے داری سنبھال لی تھی۔وہ اپنے بیٹے سے دھرم کی،دیوی دیوتاؤں کی باتیں کرتی تھی۔اور تو اور اس نے حویلی میں ہی ایک چھوٹا سا مندر بنا لیا تھا۔خود اسے دھرم کے بارے میں زیادہ جان کاری نہیں تھی۔لیکن جتنا وہ جانتی تھی،اتنا بیٹے کو بتانا ضروری سمجھتی تھی۔وہ اوتار سنگھ سے روز پوجا کراتی تھی۔

تیسری طرف حمیدہ تھی۔اوتار سنگھ کے ذہن میں جو سوال ابھرتا،وہ اس کا جواب دینے کی کوشش کرتی۔اس کے لہجے میں عجیب سی سچائی اور دل نشینی تھی۔بات آسانی سے سمجھ میں آ جاتی تھی۔مگر اس کی باتیں ماتا جی کی باتوں سے متصادم ہوتی تھیں۔

آپس میں ایک دوسرے سے ملنے والے یہ تینوں ضلعے ایک مثلث بناتے تھے،اور اس مثلث کے درمیان میں بیٹھا ہوا اوتار سنگھ یہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا کہ سچائی کیا ہے۔ساتھ ہی وہ گرد و پیش کی ہر چیز پر غور کرتا۔سوچتا کہ وہ کیا ہے،کیوں ہے اور کیسے ہے۔یہ سوال وہ تینوں سے کرتا اور تینوں کے جواب مختلف ہوتے۔وہ حیران ہوتا کہ ایک ہی چیز کے بارے میں تین افراد کے تین نظریے ہیں۔اس سے اس نے یہ سمجھ لیا کہ کثرت میں ابہام ہے،الجھاؤ ہے۔اور یہ کہ نظریے ضروری نہیں کہ درست ہوں۔بلکہ ان کے غلط ہونے کا امکان زیادہ ہے۔

اوتار سنگھ اس پر غور کرتا کہ صبح کیا ہے۔اپنے طور پر اس نے سمجھ لیا کہ سورج نکلتا ہے تو صبح ہوتی ہے۔اور جب تک سورج رہتا ہے دن رہتا ہے۔سورج غروب ہو تو رات ہو جاتی ہے۔اس نے یہ بھی دیکھا کہ سورج حرکت کرتا ہے۔مشرق سے نکلتا ہے تو ہلکی ہلکی دھوپ پھیلتی ہے اور سورج اوپر آتا رہتا ہے تو دھوپ میں تیزی بڑھتی جاتی ہے اور ساتھ ہی گرمی بھی۔پھر عین سر پر پہنچنے کے بعد سورج مغرب کی طرف جھکتا ہے تو دھوپ ہلکی ہونے لگتی ہے۔روشنی کم ہوتی جاتی ہے۔یہاں تک کہ سورج غروب ہوتا ہے اور رات ہو جاتی ہے۔

سوال یہ تھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔اس کی ضرورت کیا ہے۔اس نے تینوں معلموں سے یہ بات پوچھی۔ہمیشہ کی طرح جواب مختلف ملے۔ماتا جی نے بتایا کہ سورج دیوتا کا کام ہی روشنی دینا ہے۔دن بھر دھوپ بانٹنے کے بعد تھک جائیں تو آرام کرتے ہیں۔ماسٹر جی نے بتایا کہ سورج نہیں چلتا۔بلکہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔جس میں ہم موجود ہیں،وہ جب گھومتا ہوا سورج کے سامنے آتا ہے تو صبح ہوتی ہے۔جب تک سامنے رہتا ہے،دن رہتا ہے اور جب گھومتا ہوا سورج سے اوجھل ہوتا ہے تو رات ہو جاتی ہے۔انہوں نے یہ بھی بتایا کہ دراصل سورج غروب نہیں ہوتا۔جس وقت ہمارے ہاں سورج غروب ہوتا دکھائی دیتا ہے تو وہ دوسری طرف طلوع ہوتا نظر آتا ہے اور وہاں صبح ہوتی ہے۔انہوں نے یہ بھی بتایا کہ زمین پر زندگی سورج کے دم سے ہے۔اگر سورج سے حرارت نہ ہو تو زمین پر کوئی فصل نہ اگے اور سردی ہی سردی ہو۔

www.alurdu.com

اوتار سنگھ کو یاد تھا کہ یہ بات اماں نے بھی کہی تھی کہ دھوپ نہ نکلے تو فصلیں خراب ہو جائیں۔

اماں نے کہا کہ سورج اللہ کی ایک بڑی نعمت ہے۔اس سے زندگی ہے۔اور وہ اپنے وقت پر طلوع اور غروب ہوتا ہے۔یہ اللہ کا بنایا ہوا نظام ہے۔اور اماں نے ایک بات ایسی بتائی، جو اس کی سمجھ میں سب سے زیادہ آئی۔اماں نے کہا کہ اللہ نے دن اور رات بنائے ہیں تا کہ انسان دن میں کام اور رات میں آرام کریں۔

''وہ کیسے اماں؟''۔

''چھوٹے ٹھاکر، یہ بتاؤ کہ تم دن میں کیوں نہیں سوتے؟''۔اماں نے پوچھا۔

''مجھے اندھیرے میں نیند آتی ہے اماں۔کمرے میں ذرا سی بھی روشنی ہو تو میں سو نہیں سکتا''۔

''تو سوچو، سورج ہر وقت نکلا رہتا تو تم کیسے سوتے۔اور نہیں سوتے تو تھکن بڑھتی رہتی۔سوئے بغیر رہ سکتے ہو تم؟''۔

''نہیں اماں۔کبھی میں زیادہ تھک جاؤں تو بستر پر لیٹتے ہی سو جاتا ہوں''۔

''اور سوچو کہ سورج نکلتا ہی نہیں اور ہر وقت اندھیرا رہتا تو لوگ کام کیسے کرتے، فصلیں کیسے ہوتیں۔کھانا کیسے پکتا۔زندگی تو ختم ہو جاتی نا''۔

اوتار سنگھ نے بڑے فخر سے سوچا کہ اماں کتنی عقل والی ہیں۔یہ بات تو ماسٹر جی نے بھی نہیں بتائی تھی۔

اوتار سنگھ نے سمجھ لیا کہ سورج دیوتا بہت شکتی مان ہے۔زمین پر زندگی اسی کے دم سے ہے۔جب وہ غصے میں ہوتا ہے تو گرمی بڑھ جاتی ہے۔انسان اور جانور پسینے میں نہا جاتے ہیں، ہانپنے لگتے ہیں۔لیکن پھر ایک دن سورج نہیں نکلا۔آسمان پر گھٹا چھائی ہوئی تھی۔اس نے غور کیا تو اندازہ ہوا کہ یہ بات نہیں کہ صبح نہیں ہوئی۔صبح تو ہوئی ہے۔سورج بھی نکلا ہے۔لیکن اس کی دھوپ، اس کی روشنی کا راستہ بادلوں نے روک رکھا ہے۔وہ سوچ میں پڑ گیا۔بادل تو معمولی چیز تھے۔اور وہ سورج جیسے شکتی مان کا راستہ روک سکتے تھے۔یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔

پھر اس نے موسموں کا مشاہدہ کیا۔ماسٹر جی نے اس کی بڑی رہنمائی کی۔ورنہ ماتا جی اور اماں تو ہر بات کے جواب میں .....بھگوان کی اچھا.....اور اللہ کی مرضی کہہ دیتی تھیں۔سردی آتی ہے۔بس آتی ہے۔گرمی آئے گی۔اسے آنا ہے۔ماسٹر جی نے اسے بتایا کہ موسموں کے پیچھے بھی سورج کا دخل ہے۔زمین سورج سے دور ہٹتی ہے تو سردی آتی ہے اور قریب ہوتی ہے تو گرمی آتی ہے۔پھر اس نے بارش کو سمجھا۔یہ بھی سمجھا کہ بارش کتنی اہم ہے۔صرف دھوپ سے فصلوں کا تعلق نہیں تھا۔بارش نہ ہو تو بھی فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں۔

اگلے دو برس میں اس نے بہت کچھ سمجھ لیا۔جس میں شکتی ہو اور جو سمجھ میں نہ آئے، وہ ماتا جی کے نزدیک دیوی تھی یا دیوتا۔اور اماں ہر چیز کو اللہ سے جوڑ دیتی تھیں۔وہ کہتی تھیں۔یہ سب اللہ کے کام ہیں۔کچھ سمجھ میں آ جاتے ہیں، کچھ نہیں آتے۔سب طاقت اللہ کی ہے۔

پہلے بچوں کو کھیل کود سے فرصت نہیں تھی۔اب ان کیلئے دن چھوٹا پڑتا تھا۔تین وقت تو ماسٹر جی پڑھاتے تھے۔اسلئے معمولات کچھ بدل گئے تھے۔وہ اوتار سنگھ کے ایک دن چھوڑ کر حمیدہ کے ہاں جانے کا سلسلہ جاری تھا۔لیکن اب وہ کم وقت کے لئے جاتا تھا۔

چھوٹا ٹھاکر آٹھ سال کا ہوا تو ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے اسے سچ مچ کا گھوڑا دیا۔گھوڑا وصال دین کو بھی ملا۔کیوں کہ ٹھاکر جانتا تھا کہ اس کا بیٹا اکیلا یہ تحفہ قبول نہیں کرے گا۔پھر وہ ان دونوں کو گھڑ سواری سکھانے لگا۔اور وہ بیٹے سے باتیں بھی کرتا تھا وہ اسے راج پوتی آن کے بارے میں بتاتا۔ان کے اوصاف سے متعارف کراتا۔اسے پرکھوں کی بہادری کے قصے سناتا۔

باپ ہونے کے ناتے جمال دین بھی پیچھے نہیں تھا۔وہ لٹھیا چلانے کا ہنر جانتا تھا۔اس نے ان دونوں کو لٹھیا چلانا سکھانا شروع کر دیا۔یوں وقت اور سمٹنے لگا۔دونوں لڑکے ان نئی مصروفیات میں بہت خوش تھے۔ان کے نزدیک وہ نئے کھیل تھے۔نئے بھی اور دلچسپ بھی۔

مگر پھر ایک دن یہ ہوا کہ چھوٹے ٹھاکر اوتار سنگھ پر معلومات کا ایک دروازہ بند ہو گیا۔اب تک وہ یہ سمجھتا تھا کہ اللہ اور بھگوان ایک ہی ہیں۔فرق صرف زبان کا ہے.....اور لفظوں کی طرح۔جیسے ماتا جی شما کہتی ہیں اور اماں معافی۔جیسے ماتا جی بنتی کہتی ہیں اور اماں التجا۔اور اماں نے اسے تاثر بھی یہی دیا تھا۔

اس دن اس نے اماں سے کہا۔''اماں.....تم بھی اللہ کی پوجا کرتی ہو؟''۔

اماں نے جھرجھری سی لی۔ایک لمحے ہچکچائیں اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

''مجھے بھی دکھاؤ اماں۔میں بھی اس کی پوجا کروں گا''۔

اماں تو ہکا بکا رہ گئیں۔ان سے کچھ بولا بھی نہیں گیا۔

''مجھے اللہ کی مورتی دکھاؤ نا اماں''۔اس نے ضد کی۔

''وہ تو نہیں ہوتی چھوٹے ٹھاکر''۔

''کیوں اماں۔بھگوان کی تو ہوتی ہے''۔

''اللہ کی نہیں ہوتی۔کیوں کہ اسے کسی نے دیکھا نہیں ہے''۔

یہ چھوٹے ٹھاکر کو ہلا دینے والی بات تھی۔''تو اللہ اور بھگوان ایک نہیں ہیں''۔

اماں نے نفی میں سر ہلایا اور بولیں۔''دیکھو چھوٹے ٹھاکر، تم اب مجھ سے یہ نہ پوچھنا، ٹھاکر جی اور ٹھاکرانی کو پتا چل گیا کہ میں تم سے ایسی باتیں کرتی ہوں تو وہ ہم سب کو مروا دیں گے۔اور یہ نہ بھی ہوا تو تمہیں کبھی ہم سے ملنے نہیں دیں گے''۔

چھوٹا ٹھاکر ڈر گیا۔اس کے لئے تو ان سے نہ ملنے کا تصور بھی ناقابل قبول تھا۔کجا یہ کہ مر جانے کی بات۔اس نے غور سے اماں کے چہرے کو دیکھا، جو پیلا پڑ گیا تھا۔وہ بہت خوف زدہ لگ رہی تھی۔''سچ اماں؟''۔اس نے پوچھا۔

''ہاں بیٹے۔تم ہمیں زندہ دیکھنا چاہتے ہو تو یہ بات کبھی نہ پوچھنا۔اور میری کہی ہوئی بات اپنے ماتا پتا کے سامنے نہ دہرانا۔اللہ کا نام بھی نہ لینا ان کے سامنے۔ورنہ وہ سمجھیں گے کہ ہم تمہیں خراب کر رہے ہیں۔وہ ہمیں مروا دیں گے بیٹے''۔

''ٹھیک ہے اماں میں کبھی ایسا نہیں کروں گا''۔چھوٹے ٹھاکر نے بڑے خلوص سے وعدہ کیا۔''مگر آج جو میں پوچھوں، وہ بتا دو''۔

حمیدہ نے بادل نخواستہ ہامی بھر لی۔

تب حمیدہ نے اسے بتایا کہ اس کا اللہ ایک ہے۔وہ ہر جگہ موجود ہے۔کسی کو نظر نہیں آتا۔مگر اس کی قدرت نظر آتی ہے۔وہ زبردست ہے۔سب کچھ اس نے بنایا ہے، اسی نے پیدا کیا ہے۔

''تو ماتا جی اور پتا جی اسے کیوں نہیں مانتے؟''۔

''ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔سب کا اپنا اپنا عقیدہ ہوتا ہے''۔

اسی لمحے نو سالہ ٹھاکر اوتار سنگھ کے نتائج اخذ کرنے والے ذہن نے ایک بڑی بات سمجھ لی۔اس نے جان لیا کہ ماننے نہیں ماننے سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔جو سچ ہے، وہ سچ ہے۔نہ ماننے سے وہ تبدیل نہیں ہو گا۔اور جو نہیں ہے، اسے مان لینے سے وہ ہو نہیں جائے گا۔ماننے میں اتنی طاقت نہیں ہے۔ساتھ ہی اس نے یہ بھی سمجھ لیا کہ یہ سب کچھ اسے خود سمجھنا ہو گا۔

وہ اس کی تلاش حق کا نکتہ آغاز تھا۔

.....x.....

اس صبح پوجا کے بعد اوتار سنگھ نے ماں سے پوچھا۔''ماتا جی، آپ نے بھگوان کو دیکھا ہے؟''۔

''روز دیکھتی ہوں پتر، تم بھی دیکھتے ہو۔یہ بھگوان ہیں نا''۔ٹھاکرانی نے مورتی کی طرف اشارہ کیا۔

''تو یہ سچ مچ کے بھگوان ہیں؟''۔اوتار سنگھ کے لہجے میں حیرت تھی۔

ٹھاکرانی کو غلطی کا احساس ہو گیا۔''میرا مطلب ہے، یہ بھگوان کی مورت ہے۔ہم روز اس کے درشن، اس کی پوجا کرتے ہیں''۔

''تو یہ سچ مچ کے بھگوان تو نہیں ہیں نا''۔

ٹھاکرانی چوکنا ہو گئی۔''بھگوان کی مورت بالکل ایسی ہے''۔

''یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں ماتا جی۔آپ نے بھگوان کو دیکھا ہے؟''۔

''نہیں۔دیکھا تو نہیں۔پر مجھے معلوم ہے، یہ بھگوان کی مورت ہے''۔

''تو ماتا جی۔ہمیں بھگوان کی پوجا کرنی چاہئے۔اس مورت کی نہیں''۔

ٹھاکرانی گھبرا گئی''دیکھو پتر۔ایسی باتیں نہیں کرتے۔ہمارے باپ دادا صدیوں سے اس مورتی کی پوجا کرتے آئے ہیں وہ غلط تو نہیں ہو سکتے''۔

چھوٹے ٹھاکر کی ذہانت پوری طرح کام کر رہی تھی۔''ماتا جی، آپ کے باپ دادا کہاں ہیں؟''۔اس نے پوچھا۔

''ان کا تو دیہانت ہو گیا''۔

''دیہانت کیا ہوتا ہے ماتا جی؟''۔

''منش ہے نا۔وقت پورا کرتا ہے تو مر جاتا ہے''۔

''تو آپ کا وقت پورا ہو گا تو آپ کا دیہانت ہو جائے گا۔اور اپنا وقت پورا کر کے میں بھی مر جاؤں.....''۔

ٹھاکرانی نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔''ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالتے پتر''۔

''منہ سے نہ نکالنے سے کچھ بدل جاتا ہے ماتا جی''۔اوتار سنگھ نے بے حد معصومیت سے پوچھا۔''مجھے بتائیں نا۔ایسا ہی ہو گا نا؟''

''ہاں''۔ٹھاکرانی نے بات مختصر کرنے کی کوشش کی۔

''تو پھر جو دوسرے لوگ ہوں گے، وہ بھی اپنے بچوں سے یہی کہیں گے کہ ہمارے باپ دادا اس مورتی کی پوجا کرتے تھے۔مگر ماتا جی، آپ کے باپ دادا بھی غلطی تو کر سکتے تھے نا۔آپ کو کیسے پتا کہ وہ درست تھے۔آنے والوں کو بھی یہ پتا نہیں ہو گا کہ آپ درست تھیں''۔

''تم کہنا کیا چاہتے ہو پتر؟''۔

''یہی کہ ہمیں بھگوان کی پوجا کرنی چاہئے، اس کی مورتی کی نہیں''۔

ٹھاکرانی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔''سامنے مورتی ہے۔مگر ہم پوجا تو بھگوان کی کرتے ہیں''۔

''تو ہم مورتی کے بغیر بھی پوجا کر سکتے ہیں ماتا جی۔آپ کہتی ہیں، بھگوان سب جانتے ہیں''۔

''سو تو ہے پتر۔مگر ہمارے باپ دادا.....''۔

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ غلطی کرتے رہے ہوں''۔

''یہ نہیں ہو سکتا اوتار سنگھ''۔ٹھاکرانی نے سخت لہجے میں کہا۔

''اچھا ماتا جی۔میرے.....آپ کے جو پرکھے تھے، وہ منش تھے نا؟''۔

''اوش تھے''۔

''اور منش غلطی کرتا ہے۔اس سے بھول بھی ہوتی ہے بلکہ جیون بھر ہوتی رہتی ہے''۔

ٹھاکرانی کو احساس ہوا کہ وہ بری طرح پھنس گئی ہے۔انکار بھی نہیں کر سکتی تھی۔

www.allurdu.com

انکار کرتی تو ڈر تھا کہ آگے کہیں اس سے بری پھنس جائے گی۔انہوں نے نرم لہجے میں کہا۔''یہ باتیں چھوڑو نا چھوٹے''۔

''نہیں ماتا جی۔بتائیں نا''۔

ٹھاکرانی بے بس ہوگئی۔شکست خوردہ لہجے میں بولی۔''ہاں پتر۔منش غلطی کرتے ہیں''۔

''تو ہوسکتا ہے کہ ہمارے پرکھوں سے بھول ہوئی ہو''۔اوتار سنگھ نے کہا اور یہ سوال نہیں تھا۔وہ ماں سے اس کی تصدیق بھی نہیں چاہ رہا تھا۔وہ تو سیدھا سا بیان تھا۔''تو اس کو ٹھیک کرنا ہماری ذمے داری ہے۔اچھا تو ماتا جی، یہ تو بتاؤ کہ بھگوان کہاں رہتے ہیں''۔

''اوپر آکاش پر..... پرلوک میں''۔

''میں انہیں دیکھ سکتا ہوں.....ان سے مل سکتا ہوں ماتا جی''۔

''نا پتر۔بھگوان کو کسی نے دیکھا ہے بھلا!''۔

اوتار سنگھ نے تیزی سے اس کی بات پکڑ لی۔''کسی نہیں نہیں دیکھا؟''۔

''نا پتر''۔

''تو پھر یہ مورتی کیسے بنالی''۔اوتار سنگھ نے نپا تلا اعتراض کیا۔''اس کا مطلب ہے ماتا جی کہ یہ خیالی ہے۔ضروری نہیں کہ بھگوان ایسے ہوں''۔

''دیکھو پتر۔ہمیں تو اس مورتی کی ہی پوجا کرنی ہے۔ہمارے پرکھوں سے یہ ریت چلی آرہی ہے''۔ٹھاکرانی نے خوشامدانہ لہجے میں۔

''بھلے وہ غلطی پر ہیہ پہوں''۔

''بھلے وہ غلطی پر ہی ہوں''۔ٹھاکرانی کے لہجے میں قطعیت تھی

''ماتا جی، اس نظر آنے والی خیالی مورتی کے مقابلے میں نظر نہ آنے والے سچے بھگوان کے سامنے سر جھکانا مجھے اچھا لگتا ہے''۔

''ہوا کرے۔پر تمہیں پوجا روز کرنی ہے''۔

اوتار سنگھ اٹھ کھڑا ہوا۔سوچنے کو بہت سامان مل چکا تھا۔

.....x.....

فطری بات تھی کہ اوتار سنگھ نے اس کے بعد ماتا جی اور اماں کے نظریات کا موازنہ کیا۔اسے ایک بات مشترک نظر آئی۔بھگوان بھی نظر نہیں آتا تھا اور اللہ بھی۔اس سے آگے فرق ہی فرق تھا۔ماتا جی کا کہنا تھا کہ بھگوان آکاش کے اوپر، پرلوک میں رہتا ہے۔جبکہ اماں کہتی تھیں کہ اللہ ہر جگہ موجود ہے۔حتیٰ کہ انسان کے اندر بھی۔پھر اماں کہتی تھیں کہ سب کچھ اللہ ہی کرتا ہے۔اس کی قدرت ایسی ہے کہ وہ جو چاہتا ہے ایک پل میں ہو جاتا ہے۔اس کے برعکس اماں بہت سے دیوی دیوتاؤں کو مانتی تھیں۔بھگوان نے بہت سے دیوی دیوتاؤں کو کام سپرد کر رکھے تھے۔انہیں اختیار دے رکھے تھا۔

اور ماسٹر جی بتاتے تھے کہ سب کچھ جو نظر آتا ہے، جسے آپ چھو سکتے ہیں، مادہ ہے اور مادہ کبھی فنا نہیں ہوتا۔ہاں..... وہ شکل بدل لیتا ہے۔پانی ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔اس کی مختلف شکلیں ہیں۔سمندر، دریا، جھیل، ندی اور چشمے۔پانی پر دھوپ پڑتی ہے تو عمل تبخیر ہوتا ہے۔بادل بنتے ہیں۔پھر جب بادل کسی پہاڑ سے، درختوں سے ٹکرائیں تو بارش ہوتی ہے۔یہ بات اوتار سنگھ کی سمجھ میں آتی تھی۔اس نے چولہے پر رکھی پانی سے بھری دیگچی میں بھاپ بنتے دیکھی تھی۔اور دیگچی کو ڈھکنے سے بند کر کے چولہا بجھانے کے کچھ دیر بعد ڈھکنا اٹھا کر دیکھا تھا تو ڈھکنے کے اندرونی حصے پر پانی کے بے شمار قطرے جمے ہوئے دیکھے تھے۔وہ بھاپ سے پانی بنا تھا۔

اور غذا جو ہم کھاتے ہیں، اس کا ایک حصہ جسم میں شامل ہوتا ہے۔باقی فضلہ ہوتا ہے۔کھاد بن جاتا ہے۔کھاد زمین میں ڈالی جاتی ہے تو فصل بہتر ہوتی ہے۔

اوتار سنگھ نے ندی تو دیکھی تھی۔دریا اور سمندر نہیں دیکھا تھا۔اس نے انکے بارے میں ماسٹر جی سے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

''دریا بڑا بھی ہوتا ہے اور چھوٹا بھی۔پر سمندر تو بہت ہی بڑا ہوتا ہے۔اتنا بڑا کہ تم جہاں تک دیکھ سکو، پانی ہی پانی نظر آئے''۔

اوتار سنگھ کی آنکھیں پھیل گئیں۔''اتنا پانی''۔

''اور سمندر کا پانی اتنا کھاری، اتنا کڑوا ہوتا ہے کہ تم ایک گھونٹ بھی نہیں پی سکتے''۔

''کھاری کیا ماسٹر جی؟''۔

''کھاری کا مطلب نمک ملا ہوا''۔

''نمک ملا ہوا''۔

اس کی حیرت ایسی تھی کہ ماسٹر جی کے دل کو کچھ ہونے لگا۔اور وہ اسے پانچ سال سے پڑھا رہے تھے۔اس کا مزاج جانتے تھے۔وہ تو بہت بڑھے ہوئے تجسس والا بچہ تھا۔ایسے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر زیادہ سیکھتے ہیں ورنہ تو آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والا معاملہ ہوتا ہے۔انہوں نے اس سلسلے میں ٹھاکر سے بات کی بچوں کو سیر کرانا، دنیا دکھانا بھی ضروری ہے۔

''تو انہیں کہاں لے جانا ہے؟''۔

''میں چاہتا ہوں کہ یہ پہاڑ بھی دیکھ لیں، اور سمندر بھی''۔

ٹھاکر کے لئے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔اس نے ٹھاکرانی کو بھی ساتھ لے لیا۔ماسٹر جی کو تو ساتھ جانا ہی تھا۔

اس ایک ماہ میں اوتار سنگھ نے جو کچھ دیکھا، وہ اس کے لئے چشم کشا تھا۔سمندر دیکھ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ماسٹر جی کے بتانے میں وہ بات نہیں تھی، جو اپنی آنکھوں سے دیکھنے میں تھی، کنارے پر کھڑے ہو کر جو اس نے دیکھا تو جہاں تک نظر جاتی تھی، پانی ہی پانی تھا۔اور سمندری آواز! اسے سن کر خوف آتا تھا۔پتا چلتا تھا کہ وہ بہت طاقت ور ہے۔مگر اس میں ٹھہراؤ تھا۔اور اوتار سنگھ نے ایک بار ندی کی باڑھ دیکھی تھی۔معمولی سی ندی چڑھی تو گاؤں کے گاؤں ڈبو گئی۔اب سمندر کو دیکھ کر وہ سوچ رہا تھا کہ یہ چڑھ گیا تو کیا ہوگا۔یہ تو اتنا پانی ہے کہ دنیا ڈبو دے گا۔اور اس نے ایک گھونٹ حلق سے اتارنے کی کوشش کی تو دل بگڑ گیا۔پھندا لگ گیا۔وہ زہر جیسا پانی تھا، کڑوا، کھاری۔

پھر اس نے پہاڑ دیکھے تو اسے خوف آیا، پہاڑ گر جائے، لڑھک جائے تو کتنی تباہی ہوگی۔مگر اس نے یہ بھی دیکھا کہ دنیا کتنی خوب صورت ہے۔اس نے چشمے دیکھے، آبشار دیکھے، پہاڑی ندیاں، جھیلیں اور دریا دیکھے۔شور مچاتے تند خو دریا۔اور کیسے کیسے درخت، پھل پھول اس ایک ماہ میں اس نے ماسٹر جی سے ایک سوال بھی نہیں کیا.....ان کے اکسانے پر بھی نہیں۔وہ تو سحر زدہ تھا۔صرف دیکھ رہا تھا اور جذب کر رہا تھا۔

اس سفر میں بھی اسے ایک کمی محسوس ہوئی۔بہت کچھ دیکھنے کے بعد اسے ہوش آیا کہ وہ بہت سی قیمتی چیزیں پیچھے چھوڑ آیا ہے۔ویر جی، اماں اور چاچا جی.....اور گاؤں۔اسے گھر یاد آنے لگا۔سب لوگ یاد آنے لگے۔تب اسے واپسی کی لگ گئی۔

وہ واپس پہنچے تو اس کے سوالات کا سلسلہ شروع ہوا۔مشاہدے کی کوکھ سے سوال ہی سوال جنم لے رہے تھے۔''یہ دنیا تو بہت بڑی ہے ماسٹر جی''۔اس نے کہا۔

''اتنی بڑی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے''۔ماسٹر جی نے کہا۔''جو کچھ تم نے دیکھا، وہ تو ہمارے دیس کا ایک چھوٹا سا..... بہت چھوٹا سا حصہ ہے۔صرف ہمارا دیس ہی اس سے سینکڑوں گنا بڑا ہے۔اور دنیا میں ایسے سینکڑوں دیس ہیں۔آدمی پوری زندگی گھومتا پھرتا رہے تو بھی پوری دنیا نہیں دیکھ سکتا''۔

''ماسٹر جی، یہ زمین کیسے بنی؟''۔

''سائنس بتاتی ہے کہ زمین سورج کا حصہ تھی۔پھر یہ ٹوٹ کر علیحدہ ہوئی۔لاکھوں برس یہ کھولتا ہوا کرہ زندگی سے محروم رہا۔بارشیں ہوتی رہیں۔لاکھوں برس میں یہ ٹھنڈا ہوا۔پھر اس میں زندگی کا آغاز ہوا۔نباتات اور جاندار پیدا ہوئے''۔

''کیسے پیدا ہوئے؟''۔اوتار سنگھ نے جھٹ پوچھا۔

''کھولتی ہوئی زمین پر ٹھنڈا پانی برستا رہا۔یہ ایک بہت وسیع اور ہمہ پہلو کیمیاوی عمل تھا۔اس کے نتیجے میں زندگی شروع ہوئی''۔

''آدمی بھی ایسے ہی پیدا ہوا؟''۔

کانتی پرشاد پریشان ہوگئے۔انہوں نے کہا۔''سائنس بتاتی ہے کہ بندر ترقی کر کے انسان بنا۔غور سے دیکھو تو بندر انسان سے مشابہ بھی ہے''۔

اوتار سنگھ کو ہنومان کا خیال آگیا۔ماتا جی کہتی تھیں، ہنومان دیوتا ہے۔اسی لئے بندروں کو نہ مارنا چاہئے نہ ستانا چاہئے۔لیکن اسے یہ خیال کچھ اچھا نہیں لگا کہ بندر اور انسان ایک جیسے ہوتے ہیں۔بلکہ ایک ہی ہیں۔''تو پھر باقی باندر ایسے کیوں رہ گئے۔آدمی کیوں نہیں بنے؟''۔

''عمل میں کوئی کمی رہ گئی ہوگی۔جو عمل سے گزر گئے وہ آدمی بن گئے''۔

''مگر ماسٹر جی، اصل چیز تو دماغ ہے، بندر کا دماغ تو آدمی جیسا نہیں۔آدمی بولتا ہے، سوچتا ہے، چیزیں بناتا ہے، کپڑے پہنتا ہے''

''کیمیاوی تبدیلی تو ایسی ہی ہوتی ہے۔کچھ پتا نہیں کہ کہاں کہاں کیا کچھ بدل جائے''۔

اوتار سنگھ کی تسلی تو نہیں ہوئی۔لیکن اس نے اس بات کو یہیں چھوڑ دیا اور دوسرے زاویئے سے حملہ کیا۔''تو کیمیاوی عمل اب بھی ہوتا ہے؟''۔

''اب تو ویسا عمل نہیں ہوتا''۔کانتی پرشاد نے کہا۔''زمین تو ٹھنڈی ہو چکی ہے نا''۔

''تو پھر اب درخت، پودے، انسان اور جانور کیسے پیدا ہوتے ہیں''۔

کانتی پرشاد کی سمجھ میں نہیں آیا۔''وہ تو افزائش کا عمل چل رہا ہے''۔

''کیوں ماسٹر جی۔آپ نے بتایا کہ تپتی ہوئی زمین پر ٹھنڈی بارش کے کیمیاوی عمل سے سب کچھ پیدا ہوا۔تو اب اس عمل کے بغیر سب کچھ کیسے پیدا ہو رہا ہے۔ہمارے پرکھے دادا پردادا مر گئے۔ہم پیدا ہو گئے۔یہ سب کیسے؟''۔

''یہ تو لیدی نظام ہے.....خود کار نظام۔ایک سسٹم ہے، جس کے تحت تمام جانداروں اور نباتات کی افزائش ہوتی ہے''۔

''لیکن ماسٹر جی، پہلا درخت، پہلا جانور، پہلا انسان.....وہ تو اس سسٹم سے پیدا نہیں ہوئے ہوں گے نا''۔اوتار سنگھ نے اعتراض کیا۔

کانتی پرشاد بوکھلا گئے۔''دیکھو چھوٹے ٹھاکر، ابھی تم چھوٹے ہو۔خود کو اتنا نہ الجھاؤ۔بعد میں ان پر بات کریں گے''۔انہوں نے ذہین شاگرد کو ٹالا۔وہ سوچ رہے تھے کہ اب تو خود انہیں بہت کچھ پڑھنا ہوگا۔

.....x.....

چھوٹے ٹھاکر نے ماں سے پوچھا۔''ماتا جی.....یہ سنسار کس نے بنایا ہے؟''۔

''بھگوان نے''۔

''کیسے؟''۔

''یہ تو بھگوان کو ہی معلوم ہوگا''۔

''اور یہ بھگوان کی مورتی کے تین سر کیوں ہیں؟''۔

''ایک بھگوان برہما ہے، دوسرا بھگوان وشنو اور تیسرا بھگوان شیو''۔

www.allurdu.com

''تینوں کا جسم ایک کیوں ہے؟''۔

''تینوں مل کر بھگوان ہیں نا، اس لئے''۔

''بھگوان تین ہیں۔ میں تو ایک سمجھتا تھا''۔

''ایک ہی ہے۔ پرنتو روپ تین ہیں۔ برہما، وشنو اور شیو۔ تینوں کے کام الگ الگ ہیں۔ برہما نے سنسار بنایا۔ وشنو نرمی اور محبت کا بھگوان ہے اور شیو جی غضب غصہ اور ہلاکت ہیں''۔

تب اوتار سنگھ کو پتا چلا کہ تمام دیوی دیوتا ان تینوں میں سے کسی نہ کسی کے ماتحت ہیں۔ اور دیوی دیوتاؤں کی تعداد بہت بڑی تھی، جو سنسار میں مختلف ذمے داریاں سنبھالتے تھے۔ اور ماں کہتی تھی کہ کسی کی مورتی کے سامنے بھی پوجا کرو، پوجا بھگوان کی ہی ہوتی ہے اب اوتار سنگھ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ پوجا کرنے کیلئے کسی مورتی کی ضرورت ہی کیا ہے۔

اس نے ٹھاکرانی سے یہ بات کہی تو وہ بھڑک گئی۔ ''دیکھو پتر، یہ صرف مورتی نہیں۔ یہ خود بھگوان ہے''۔

''پر ماتا جی، آپ تو کہتی ہیں، وہ آکاش پر رہتے ہیں''۔

''رہتے ہیں۔ پر جہاں چاہے آسکتے ہیں۔ ان کی شکتی مہان ہے۔ تم الٹا سیدھا بولو گے تو وہ تمہیں شراپ بھی دے سکتے ہیں''۔

اوتار سنگھ کو تھوڑا سا ڈر لگا۔ تین سر والی مورتی سے اسے ویسے بھی ڈر لگتا تھا۔ ''اور رام چندر جی اور کرشن جی کون تھے؟''۔

''رام چندر جی بھگوان وشنو کے اوتار تھے۔ ساتویں اوتار۔ اور کرشن جی آٹھویں اوتار تھے''۔

''مطلب؟''۔

''ان کے اندر وشنو بھگوان کی آتما تھی۔ وہ منش کے روپ میں وشنو بھگوان تھے۔'' ٹھاکرانی نے کہا۔ ''ویدوں میں لکھا ہے کہ دس اوتار آئیں گے۔ نو آچکے ہیں اور ایک باقی ہے''۔

''ماتا جی، یہ کیسے پتا چلتا ہے کہ کسی منش میں بھگوان کی آتما موجود ہے''۔

''ان کی شکتی سے پتا چلتا ہے اور گیانیوں کو پتا چل جاتا ہے''۔

اوتار سنگھ اور الجھ گیا۔ یہ گورکھ دھندہ کیا ہے، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

چند روز بعد اس نے ماسٹر جی کو گھیر لیا۔ ''ماسٹر جی، یہ دیوی دیوتا کیا سچ مچ ہوتے ہیں؟''۔ اس نے ریاضی پڑھتے پڑھتے اچانک پوچھ لیا۔

ماسٹر جی کا ذہن ریاضی میں تھا۔ انہوں نے بے دھیانی میں کہا۔ ''بھئی لوگ کہتے ہیں تو ہوتے ہی ہوں گے''۔

اس جملے سے اوتار سنگھ کی سمجھ میں آگیا کہ ماسٹر جی دیوی دیوتاؤں پر اتنا یقین نہیں رکھتے۔ ''آپ کا اپنا خیال کیا ہے ماسٹر جی؟''

''بھئی میں تو سائنس کا آدمی ہوں۔ اور سائنس ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتی''۔

''تو پھر آپ کے خیال میں یہ دیوی دیوتا کہاں سے آئے؟ ان کی ضرورت کیا تھی؟''۔

''آنا تو ان کا ثابت ہی نہیں ہوتا۔ ہاں میں اس سلسلے میں کچھ بتا سکتا ہوں کہ ان کی ضرورت کیوں تھی''۔

''تو بتائیے نا''۔

''دیکھو، خوف انسان کی بنیادی جبلتوں میں سے ہے۔ ہے نا؟''

''شاید ہو۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا''۔ دس سالہ اوتار سنگھ نے ذہانت سے کام لیا۔ ورنہ وہ خوف کو سمجھتا تھا۔ لیکن اس جواب سے وہ ماسٹر جی کو بھڑکانا چاہتا تھا۔ وہ بھڑکیں گے تو بھید کھولیں گے۔

اور کانتی پرشاد سچ مچ بھڑک گئے۔ ''یقین سے کیسے نہیں کہہ سکتے۔ ابھی اس کمرے میں کوئی اجنبی آواز تمہیں پکارے اور دیکھنے پر کوئی نظر نہ آئے تو تم لازمی ڈرو گے''۔

''جی ہاں۔ مگر اس کا دیوی دیوتاؤں سے کیا تعلق؟''۔ اوتار سنگھ نے انہیں چیلنج کیا۔

''تعلق میں بتاتا ہوں''۔ کانتی پرشاد بڑے جوش سے بولے۔ ''اب تو منش نے بڑی ترقی کر لی ہے۔ ذرا بہت پرانے، ابتدائی دور کے منش کا سوچو۔ اس وقت کی بات سوچو، جب اس نے پتوں سے شریر ڈھانپنا بھی نہیں سیکھا تھا۔ جب وہ ننگا رہتا تھا۔ جب اس نے سورج کو نکلتے دیکھا ہوگا تو ہلکی ہلکی دھوپ اسے نعمت لگی ہوگی۔ پھر سورج چڑھا ہوگا، دھوپ تیز ہوئی ہوگی اور اس نے اس کے جسم میں کانٹے چبھوئے ہوں گے تو اس نے سوچا ہوگا کہ اس میں تو قہر بھی ہے اور طاقت بھی۔ اس کی اطاعت کرنی ہوگی۔ ورنہ یہ نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اور شروع ہی سے جھکنا اطاعت کی علامت رہا ہے۔ سو اس نے سورج کو سجدہ کیا ہوگا۔ پھر تیز دھوپ میں چلتے چلتے وہ کسی درخت کے ٹھنڈے سائے میں رکا ہوگا تو اس نے درخت کی طاقت کو تسلیم کیا ہوگا۔ ارے..... یہ تو سورج دیوتا کے قہر سے بچاتا ہے۔ پھر بارش ہوئی ہوگی اور اس کے ننگے جسم پر تیز بارش کے ٹھنڈے نیزے برسے ہوں گے اور کہیں امان نہیں ملی ہوگی تو اس نے بارش کو اور بعد میں بادل کو دیوتا مانا ہوگا۔ ایک بار پھر درخت نے اسے تیز بارش سے بچایا ہوگا۔ تب اس کے ذہن میں آیا ہوگا کہ درخت کی طرح پتوں سے اپنے جسم کو ڈھانپ کر وہ بھی بارش دھوپ اور ہوا سے بچ سکتا ہے اور سوچو کہ ہوا سے وہ کتنا ڈرا ہوگا کیونکہ وہ تو نظر بھی نہیں آتی ہے۔ اور جب پہلی بار بجلی کڑکی ہوگی اور اس نے چمک دیکھی ہوگی تو اس کے خوف کا کیا عالم ہوگا۔ وہ بس سجدے میں گر گیا ہوگا۔ اب تم سمجھ سکتے ہو کہ اس طرح دیوی دیوتا وجود میں آئے ہوں گے''۔

اوتار سنگھ سانس روکے ماسٹر جی کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ ایک کیفیت میں تھے۔ ان کی گفتگو میں زور تھا، بہاؤ تھا۔ اوتار سنگھ نے زور سے سانس بھی نہیں لی کہ کہیں وہ کیفیت ختم نہ ہو جائے۔

''دراصل منش کے اندر، بہت گہرائی میں اول دن سے ان سے ایک احساس کمتری بیٹھا ہوا ہے۔ یہ اس کی فطرت ہے کہ وہ اپنے سے بہت برتر کسی نامعلوم طاقت سے ڈرتا ہے۔ معلوم قوت سامنے آتی ہے تو وہ کسی نہ کسی طرح اسے تسخیر کر لیتا ہے۔ اور جب بھی وہ خوف مٹ جائے، چاہے اوپری سطح پر مٹے تو وہ فرعون بن جاتا ہے''۔

''تو ماسٹر جی، اس خوف کا فائدہ تو ہے نا، اس سے انسان اچھا بنا رہتا ہے''۔

''ہاں۔ اخلاقی طور پر تو فائدہ ہے''۔ کانتی پرشاد نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ کہہ رہا تھا کہ یہ خوف بہت اہم ہے۔ انسان..... ہر انسان زندگی میں بارہا بے بسی محسوس کرتا ہے جب اپنے مسائل اس سے حل نہیں ہوتے۔ جب اپنی ضرورتیں وہ پوری نہیں کر پاتا۔ ایسے میں اسے ایک برتر، ایک مشکل کشا کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بیمار ہے اور شفا چاہئے، بے اولاد ہے اور اولاد کی ضرورت ہے۔ اور دنیا میں ایسا کوئی نہیں، جس سے وہ یہ چیزیں مانگ سکے اور اسے مل بھی جائیں۔ تو اس کے لئے وہ ایک برتر نامعلوم تخلیق کر لیتا ہے۔ کہیں وہ بھگوان ہے تو کہیں خدا''۔

''کہتے ہیں کہ بھگوان آکاش پر رہتا ہے''۔ اوتار سنگھ نے کہا۔

''وہ کسی ایسی ہی جگہ رہ سکتا ہے، جو منش کی نظروں سے اوجھل ہو اور آکاش سے اچھی ایسی جگہ اور کون سی ہوگی''۔ ماسٹر جی نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

''پر لوگوں نے بھگوان کو دیکھا ہوگا۔ تبھی تو مورتی بنائی ہے ان کی''۔

''نہیں چھوٹے ٹھاکر۔ ایسے منش ہر دور میں رہے ہیں، جو بہت اچھے تھے۔ اخلاق میں اعلیٰ، لوگوں کے کام آنے والے۔ ایسے کہ لوگ ان سے محبت کرنے لگیں۔ اب کوئی مجسمہ تراشنے والا کسی سے محبت کرے گا تو اس کی مورتی تو بنائے گا ہی۔ اور محبت کرے تو آدمی آدمی کو اوتار مان لیتا ہے۔ بلکہ بھگوان بھی بنا دیتا ہے اسے''۔

یہ بات معقول تھی۔ اوتار سنگھ نے بارہا ماتا جی کو پتا جی سے کہتے سنا تھا کہ آپ تو میرے بھگوان ہیں۔ اگر ماتا جی کو بت بنانا آتا تو وہ یقیناً پتا جی کا بت بناتیں۔ پھر ہزاروں برس بعد لوگ پتا جی کو بھگوان کہتے۔

''اور مسلمانوں اور انگریزوں کے بھارت میں آنے کے بعد ہندو دھرم کے بہت سے نظریات تبدیل ہوئے ہیں۔ تری مورتی کا تصور عیسائیوں کے عقیدہ تثلیث سے لیا گیا ہے۔ اور مسلمانوں سے متاثر ہو کر بھگوان کے تصور کو مرکزیت دینے کی کوشش کی گئی ہے''۔

''تو یہ دیوی دیوتا، یہ سب خوف کی پیداوار ہیں..... وہم ہیں منش کا؟''۔ اوتار سنگھ نے پوچھا۔

ایک پل میں کانتی پرشاد کی کیفیت ختم ہوگئی۔ انہیں اچانک ہی احساس ہوا کہ وہ بہت خطرناک گفتگو کر رہے ہیں..... بلکہ کر چکے ہیں۔ اگر ٹھاکر جی کو پتا چل گیا کہ وہ ان کے بیٹے کو دھرم کے خلاف کر رہے ہیں تو وہ انہیں نکال باہر کریں گے۔ اور کانتی پرشاد کا یہاں دل بھی لگ گیا تھا اور برسوں بعد ان کے جیون کو ایک مقصد مل گیا تھا۔ وہ یہاں سے جانا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے گھبرا کر کہا۔ ''یہ میں نے کب کہا چھوٹے ٹھاکر''۔

''جو باتیں آپ نے کہیں، ان کا یہی مطلب نکلتا ہے''۔

اتنی دیر میں کانتی پرشاد نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ ''نہیں۔ وہ تو میں سائنس کے حوالے سے بات کر رہا تھا۔ ورنہ میں کوئی ناستک تو ہوں نہیں''۔

''یہ ناستک کون ہوتا ہے؟''۔

''جو نہ بھگوان کو مانے نہ خدا کو، وہ ناستک ہوتا ہے''۔ کانتی پرشاد نے یوں بدمزہ ہو کر کہا جیسے ناستک کوئی گالی ہو۔ پھر پوچھا۔ ''چھوٹے ٹھاکر، تمہیں میں کیسا لگتا ہوں''۔

''اچھے لگتے ہیں''۔

''کیا تم یہ چاہو گے کہ میری جگہ کوئی اور ماسٹر تمہیں پڑھانے کے لئے آئے؟''۔

''نہیں۔ لیکن ایسا کیوں ہوگا؟''۔

''اگر ٹھاکر جی یا ٹھاکرائن کو پتا چل گیا کہ میں تمہیں ایسی باتیں بتا رہا ہوں تو وہ شاید مجھے مروا دیں۔ نہ بھی مروایا تو نکال ضرور دیں گے''۔

اوتار سنگھ سوچ میں پڑ گیا۔ اس سے پہلے اماں نے بھی یہی بات کہی تھی۔ اور وہ اماں سے کچھ پوچھنے سے محروم ہو گیا تھا۔ اب کیا ماسٹر جی بھی.....؟ نہیں۔ وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔ ''میں پتا جی اور ماتا جی کو کبھی کچھ نہیں بتاؤں گا۔ لیکن ایک شرط ہے ماسٹر جی''۔

کانتی پرشاد تو گویا سولی پر لٹک گئے۔ ''وہ کیا ہے اوتار سنگھ جی؟'' انہوں نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

''میں جب بھی کچھ پوچھوں گا، آپ مجھے بتائیں گے۔ وہ جو آپ کے خیال میں سچ ہے''۔

کانتی پرشاد مطمئن ہو گئے۔ وعدہ کرنے میں کیا جاتا ہے۔ انہوں نے سوچا۔ لیکن دل میں یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ اب وہ محتاط رہیں گے۔ ''ضرور چھوٹے ٹھاکر''۔ انہوں نے اوتار سنگھ سے کہا۔ ''یہ تو میرا فرض ہے''۔

.....x.....

چھوٹے ٹھاکر اوتار سنگھ کے دماغ میں دو صندوق تھے۔ ایک میں معلومات جمع ہوتی رہتی تھیں۔ دوسروں کے نظریات۔ وہ درست ہوں یا غلط۔ معقول ہوں یا احمقانہ۔ وہ اس صندوق میں جمع ہو جاتے تھے اور دوسرے صندوق میں اس کے مشاہدات۔

www.allurdu.com

اوراب یہ ہوا کہ اسے تنہائی کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ تا کہ وہ ان معلومات، نظریات اور مشاہدات کا تجزیہ کر کے ان سے نتائج اخذ کر سکے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تنہائی کے موقع تلاش کرنے لگا۔ کھیل سے اس کا دل بالکل ہٹ گیا۔ جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ سب سے اچھی اور طویل تنہائی رات کو بستر پر میسر آتی ہے۔ سو دیر سے سونا اس کا معمول بن گیا۔ وہ بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیتا اور سوچتا رہتا۔ ماتا جی اور پتا جی سمجھتے کہ وہ سو رہا ہے۔

تنہائی کی ضرور اس لئے اور بڑھ گئی تھی کہ ماسٹر جی نے اسے ایک بہت وسیع مشغلہ دے دیا تھا۔ وہ تصور میں دیکھتا کہ وہ بہت پرانے.....ابتدائی زمانے کا انسان ہے۔ وہ یہ کیفیت خود پر طاری کرتا۔ اس کی مشکلات، اس کی پریشانیاں اور اس کی بے بسی محسوس کرنے کی کوشش کرتا۔ یوں وہ انسان کے ارتقا کو محسوس کر رہا تھا۔ سمجھ رہا تھا اور یہ میدان بہت بڑا تھا۔

اس وقت تک وہ مطالعہ بھی بہت کر چکا تھا۔ ماسٹر جی خود بہت لائق انسان تھے۔ ان کا شاگرد ہونے کی حیثیت سے وہ علم میں اپنی عمر کے مقابلے میں بہت آگے تھا۔ اس پر مستزاد اس کا فطری تجسس.....اس کے سوال۔ اسی حساب سے اس کا تصور بھی بہت زرخیز تھا۔

سو بیسویں عیسوی کا اوتار سنگھ زمانہ ماقبل تاریخ کی وسیع و عریض دنیا میں آزادی سے گھومتا پھرا۔

بالکل ابتدا میں انسان کا معاش شکار تھا۔ اور زندگی صرف پیٹ بھرنا اور اپنی بقا کا خیال رکھنا۔ چنانچہ وہ کہیں ٹکتا نہیں تھا۔ گھومتا پھرتا تھا۔ حرکت میں رہتا تھا۔ رات ہوتی تو کسی درخت کے نیچے یا کھلے میدان میں پتھر پر سر رکھ کر سو جاتا۔ اس کے لئے شکار کرنا بھی آسان نہیں تھا۔ پانی میں ہاتھ سے مچھلی پکڑنا۔ پرندے اور زیادہ دشوار تھے۔ بکری اور ہرن وغیرہ کے لئے بہت مشقت کرنا پڑتی تھی۔ بڑے جانوروں سے تو وہ گھبراتا تھا۔

ایک بار دو دن ہو گئے اور کوئی شکار نہیں ملا۔ بھوک نے اس نڈھال کر دیا۔ چلنے پھرنے کی طاقت بھی نہیں رہی۔ اب تو شکار کا کوئی امکان بھی نہیں رہا تھا تب پہلی بار اس نے ڈرتے ڈرتے جنگلی بیریاں کھائیں۔ کچھ کڑوی کسیلی، کچھ میٹھی۔ ذائقہ اسے اچھا لگا۔ توانائی بھی ملی۔ یوں وہ پھلوں سے متعارف ہوا۔ اب بھی شکار نہ ملتا تو وہ جنگلی پھل کھا لیتا۔ اس نے درختوں سے پھل توڑنا سیکھ لیا

پھر ایک دن بڑے نکیلے دانتوں والا گیدڑ اس کے پیچھے لگ گیا۔ وہ بھاگا، گیدڑ اس کے پیچھے تھا۔ وہ بھاگتے بھاگتے تھک گیا اور ہانپنے لگا۔ گیدڑ اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور وہ بے بس تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ ایک پتھر نظر آیا۔ اس نے پتھر اٹھایا اور کھینچ مارا۔ پتھر گیدڑ کے منہ پر لگا اور گیدڑ کے منہ سے خون نکلا۔ گیدڑ بھاگ گیا۔

اس اتفاق سے اس نے سمجھا کہ وہ پتھر سے کام لے سکتا ہے۔ اگلی بار گیدڑ چپکے سے اس کے قریب آیا اور اس پر حملہ کر دیا۔ پتھر اس کے پاس تھا اور کھینچ کر مارنے کا موقع نہیں تھا۔ وہ ہاتھ میں پتھر تھام کر گیدڑ کو مارتا رہا۔ یہاں تک کہ گیدڑ ختم ہو گیا۔ اس دن اس نے پتھر کا فرق بھی سمجھ لیا۔ نکیلا پتھر زیادہ کام آتا ہے۔ اس نے پتھر کو پتلا اور نکیلا کر کے ہتھیار بنائے۔ تحفظ کا تحفظ.....اور شکار کرنا آسان ہو گیا۔

فاقے کا خطرہ دور ہوا تو دماغ زیادہ کام کرنے لگا۔ پیٹ کی طرف سے بے فکری ہوئی تو مشاہدہ شروع ہوا۔ اس نے مکئی دیکھی اور دیکھا کہ اسے پرندے شوق سے کھاتے ہیں۔ وہ خود بھی شوق سے کھاتا تھا۔ پھر وہ بیمار ہو گیا۔ مجبور ہو گیا کہ وہیں پڑا رہے۔ آگے جانے کی طاقت نہیں تھی۔ راستہ دشوار تھا اور سامنے پہاڑ تھا۔ اس کا جسم گرم ہو رہا تھا۔ اس نے مکئی کے دانے جہاں تک پھیلا سکتا تھا، پھیلا دیئے کہ پرندے آئیں گے اور وہ پتھر سے ان کا شکار کر کے پیٹ بھرے گا اور طاقت بحال ہو گی تو آگے نکل جائے گا۔

تیس چالیس سورج نکلے اور ڈوبے تو اس نے دیکھا کہ جہاں اس نے مکئی کے دانے پھیلائے تھے، وہاں پودے نکل رہے ہیں۔ پھر اس نے ان پودوں کو بڑھتے دیکھا۔ ہر پودے میں مکئی کے بہت سارے پھل تھے۔ بہت سارے سورج نکلے اور ڈوبے تو مکئی تیار ہو گئی۔ اس نے سوچا تو ان دانوں سے پودے نکلتے ہیں۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ وہ صحت یاب ہو گیا تھا۔ مگر وہ آگے نہیں گیا۔ اس نے پھر دانوں کو پھیلا کر تجربہ کیا۔ پھر فصل ہوئی۔ مگر اس نے سمجھ لیا کہ اس کیلئے یہاں رہنا ضروری ہے۔ سو اس نے گھومنے پھرنے کو خیر باد کہا۔ اور وہیں ایک غار میں رہنے لگا۔ پھر اس نے پرندوں کو گھونسلا بناتے دیکھا اور اپنے لئے گھر بنایا، جہاں وہ دھوپ اور بارش سے اور ہوا سے محفوظ تھا۔ وہ زراعت اور تمدن کا آغاز تھا۔

اہم ترین عناصر چار تھے.....مٹی، پانی، ہوا اور آگ۔ ان کے بغیر زندگی کا تصور نہیں تھا۔ ہوا اور مٹی ہر جگہ موجود تھی۔ پانی کا ایک سسٹم تھا۔ اور آگ نہ ہوتی تو انسان جانوروں کی طرح کچا کھاتا رہتا۔ پہلی بار وہ کھانا پکا کر ہی جانوروں سے ممتاز ہوا تھا۔

ان سب باتوں پر غور کرتے ہوئے اوتار سنگھ کے ذہن میں دو باتوں نے جڑ پکڑی، جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ راسخ ہوتی گئیں۔ ایک یہ کہ دنیا میں کوئی کام خود بہ خود نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ اتفاق کوئی چیز نہیں ہوتا۔ اور اس کا سبب اس کا عمیق مشاہدہ تھا۔

وہ ہر چیز کو علم کی کسوٹی پر پرکھتا ضرور تھا۔ لیکن اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ کہیں کہیں سائنس بھی بے بس ہو جاتی ہے۔ جیسے دنیا کی ابتدا کے بارے میں وہ یہ کہہ کر الگ ہو جاتی تھی کہ ایک کیمیاوی عمل کے نتیجے میں زمین بنی اور اس پر زندگی کا آغاز ہوا۔ اور وہ کہتی تھی کہ وہ عظیم کیمیاوی عمل خود کار تھا۔ یہ بات اس کے حلق سے نہیں اترتی تھی۔ یہ طے ہے کہ کیمیاوی عمل عناصر کے درمیان ہوتا ہے۔ اور یہ بھی طے ہے کہ عناصر خود بہ خود پیدا نہیں ہوتے۔ ہر چیز کی، ہر عمل کی کوئی نہ کوئی علت ہے۔ جو آدمی کی سمجھ میں نہیں آتا، وہ اس پر اتفاق کا لیبل چپکا دیتا ہے۔ سو جہاں سائنس بے بس دکھائی دیتی تھی، وہ وہیں سے غور و فکر کرتا تھا۔

انسانی ارتقا کی تاریخ سے اوتار سنگھ نے یہ سمجھ لیا تھا کہ انسان کا علم بہت محدود اور نا قابل اعتبار ہے۔ ابتدا میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ پھر اسے اپنی عقلی صلاحیت کا ادراک ہوا تب اس نے سمجھنا شروع کیا اور تب سے اب تک کتنے ہی نظریات ایسے ہیں، جن پر وہ مدتوں راسخ رہا۔ مگر بعد میں انہیں غلط ماننے پر مجبور ہو گیا۔ تو یہ طے ہے کہ جو بھی انسان کو معلوم ہے جو کچھ بھی اس نے سمجھا ہے، اس کے درست ہونے کی کوئی ضمانت نہیں۔ کوئی بھی نظریہ کسی بھی وقت غلط ثابت ہو سکتا ہے۔

سائنس کی بنیاد انسان کی عقل اور اس کے جاننے کی خواہش ہے۔ اور اوتار سنگھ نے سمجھ لیا تھا کہ عقل خام ہے۔ بہت سی چیزیں ہیں، جنہیں عقل سمجھنے سے قاصر ہے۔ تو اس وجہ سے ان کا انکار تو نہیں کیا جا سکتا۔ جو کچھ انسان کو جب تک معلوم نہیں، تب تک وہ نا موجود ہے۔ لیکن اس سے فرق کیا پڑتا ہے۔ وہ موجود تو ہوتی ہے۔ کسی کے وجود کا انکار کرنے سے وجود ختم تو نہیں ہو جاتا۔ اور جب انسان اسے دریافت کرتا ہے تو اس کا مطالعہ شروع کرتا ہے۔ حالانکہ وہ بہت عرصے سے موجود ہوتی ہے۔

www.allurdu.com

ابھی ماسٹر جی نے بتایا تھا کہ ایک اور ستارہ دریافت ہوا ہے، جس کا نام پلاٹو ہے۔ دریافت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اب انسان کو نظر آیا ہے۔ اس کی سمجھ میں اب آیا ہے۔

خود ماسٹر جی نے بتایا تھا کہ نظام شمسی بہت بڑا ہے۔ اور ہوسکتا ہے کہ اس میں اور ستارے بھی ہوں، جو ابھی انسان کو نظر نہ آئے ہوں۔ اور یہ بھی کہ کائنات میں اسے سے کہیں بڑے ہزاروں..... بلکہ شاید لاکھوں نظام موجود ہوں۔ تو کائنات بہت بڑی ہے..... اتنی بڑی کہ انسان اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ وہ تو ابھی تک اپنے نظام شمسی کو بھی پورے طور پر نہیں سمجھ پایا ہے۔ اور یہ جو کچھ انسان نے سمجھا ہے، ہزاروں برسوں میں سمجھا ہے۔ اور جو سمجھا ہے، وہ بھی مکمل نہیں ہے۔ ہزاروں، لاکھوں سوال ایسے ہیں، جن کے وہ ابھی تک جواب نہیں دے پایا ہے۔

پھر عقل کے ساتھ حواس بھی ہیں۔ انسان دیکھتا ہے تو مانتا ہے۔ سب سے زیادہ وہ آنکھوں پر اعتبار کرتا ہے۔ مگر اور حسیں بھی ہیں۔ وہ سن سکتا ہے۔ سونگھ سکتا ہے چھو سکتا ہے۔ چکھ سکتا ہے۔ یہ تمام حسیں عقل کی مددگار ہیں۔ تبھی تو اس نے بہت سی ایسی چیزوں کا وجود تسلیم کیا، جنہیں وہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ ان میں ہوا بھی تھی اور خوشبو بھی۔

اوتار سنگھ دنیا کے نظام پر غور کرتا تھا۔ سورج ہر روز اپنے مقررہ وقت پر نکلتا اور غروب ہوتا تھا۔ چاند تھا۔ اس کی گردش کا دائرہ ایک خاص مدت میں مکمل ہوتا تھا۔ نیا چاند نکلتا، روز تھوڑا تھوڑا بڑھتا۔ مکمل ہوتا۔ پھر تھوڑا تھوڑا گھٹتا۔ دو دن غائب ہوجاتا اور پھر نیا چاند نکلتا۔ موسم تھے جو اپنے اپنے وقت پر آتے جاتے تھے۔ کچھ مہینے بارشوں کے تھے۔ گرمی سردی تھی۔ بہار خزاں تھی۔ تمام ستارے اپنی مخصوص رفتار سے آگے پیچھے گردش کرتے تھے۔ ایسے کہ اس میں بھی ایک سیکنڈ کا فرق بھی نہیں پڑتا تھا۔ تبھی تو جنتریوں سے پتا چلتا تھا کہ کب کون سا ستارہ کہاں ہے۔ زہرہ، مشتری، مریخ، عطارد اور زحل۔ یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ کب سے کب تک طلوع رہیں گے۔ یعنی زمین سے دیکھے جاسکیں گے۔ سب کچھ ایسے حساب کتاب سے تھا کہ نجومیوں کو پہلے سے معلوم ہوتا تھا کہ کس سال کس مہینے میں کتنے بج کر کتنے منٹ اور کتنے سیکنڈ پر سورج یا چاند گرہن ہوگا۔

سائنس بہت سی چیزوں کو نہیں مانتی تھی۔ ان میں آتما بھی تھی اور خدا بھی۔ اور بھی بہت کچھ تھا، جسے وہ توہمات قرار دے کر مسترد کردیتی تھی۔ دراصل سائنس بہت مجبور تھی۔ اس کی کچھ حدود تھیں۔ وہ مختلف چیزوں پر، ان کی ماہیت، ان کے اجزائے ترکیبی کے حساب سے تجربے کر کے نتائج اخذ کرتی تھی۔ اور ایسا صرف ان چیزوں پر ہوسکتا تھا، جو اس کی دسترس میں ہوں۔ جو انسانی حسوں کی حدود میں ہوں۔ ایسی چیزیں بھی تھیں، جو انسان دیکھ سکتا تھا، محسوس کرسکتا تھا۔ مگر وہ اس کی پہنچ سے دور تھیں۔ ان چیزوں کو وہ ریاضی کی مدد سے سمجھتی تھی۔ فلکیات کا پورا علم ایسا ہی تھا اور اس کی براہ راست تصدیق نہیں کی جاسکتی تھی۔

انسان نے بہت ترقی کرلی تھی۔ ثابت ہوچکا تھا کہ تمام جانداروں میں وہ سب سے برتر ہے۔ اس نے بہت کچھ تسخیر کرلیا تھا۔ بہت کچھ جان لیا تھا۔ بہت کچھ ایجاد کرلیا تھا۔ اس نے اپنے نظام شمسی کے سسٹم کو بھی بڑی حد تک سمجھ لیا تھا۔ لیکن اپنی قوتوں اور اختیارات کے باوجود بہت سے مقامات پر بے بس تھا۔

آسمانی بجلی، زلزلے، طوفان۔ ان کے سامنے اس کی نہیں چلتی تھی۔ اور وہ سسٹم میں تبدیلی کی قدرت نہیں رکھتا تھا۔ وہ سورج کو نہ پانچ منٹ پہلے نکال سکتا تھا نہ پانچ منٹ بعد۔ موسم بھی اس کے اختیار میں نہیں تھے۔

اور ایک اہم چیز وقت تھا۔ اس پر کسی چیز کا اثر و اختیار نہیں تھا۔ اور اس کے اثرات سے کوئی چیز محفوظ نہیں تھی۔ اس کا تعلق سورج سے تھا اور وہ آگے ہی آگے بڑھتا تھا۔ کبھی رکتا نہیں تھا۔ اوتار سنگھ نے بیج سے پودے کو نکلتے اور پھر پودے کو بڑھتے دیکھا تھا۔ اس نے خود کو بھی بڑھتے دیکھا تھا۔ وہ لمبا بھی ہوا تھا اور بڑھا بھی تھا۔ اس نے چیزوں کو پرانی اور بوسیدہ ہوتے دیکھا تھا۔ اس نے ماتا جی کی آنکھوں کے نیچے چڑیوں کے پنجوں کے سے نشان آتے دیکھے تھے اور پتا جی کے چہرے پر جھریاں پڑتے بھی دیکھا تھا۔ وقت کے اثرات بے جان چیزوں پر اور طرح کے تھے۔ وہ بڑھتی نہیں تھیں۔ پرانی، وقت کے ساتھ ساتھ بوسیدہ ہوتی چلی جاتی تھیں۔ لگتا تھا کہ گزرتا وقت ان میں توڑ پھوڑ کرتا ہے۔ انہیں کم زور کرتا ہے۔ جان دار چیزوں کے ساتھ معاملہ اور تھا۔ وہاں تعمیر بھی تھی۔ وقت پہلے جان دار چیزوں کو بڑھاتا تھا۔ اور جان دار چیزوں کے بڑھنے کی ایک حد تھی اس حد کو پہنچ کر بڑھوتی کا ہر عمل رک جاتا تھا۔ اور ایک مدت کے ٹھہراؤ کے بعد زوال کا عمل شروع ہوجاتا تھا۔

وقت ایک ایسی طاقت تھی، جو نظر نہیں آتی تھی۔ لیکن ہر چیز پر اس کے اثرات نظر آتے تھے۔ وہ ایک ایسا دھارا تھا، جو کبھی رک نہیں سکتا تھا۔ اوتار سنگھ نے غور کیا تو سمجھا کہ جان دار چیز کے لئے ایک مہلت مقرر ہے اور وقت اس کا پیمانہ ہے۔ ہر چیز کو فنا ہے۔ جو جیتا ہے، وہ آخر کار مرجاتا ہے۔ اور اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ سب کی مہلت الگ الگ ہے۔ یہ نہیں کہ آدمی بوڑھا ہو کر مرے۔ گنگا رام کا بچہ دو سال کا مرگیا تھا۔ اور گنگا رام کا باپو 80 سال کا تھا، مگر زندہ تھا۔ یہی حال نباتات کا تھا۔ کوئی پودا بڑا ہوتے ہوتے اچانک سوکھ جاتا تھا۔ اور کوئی درخت برسوں سے ہرا بھرا تھا۔

وہ بارہ سال کا ہونے والا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اب اسے گھر سے دور جانا ہے۔ اسکول میں داخل ہونا ہے۔ اس خیال سے وہ گھبراتا نہیں تھا۔ بلکہ خوش ہوتا تھا۔ اس کے تجسس کو گاؤں کے چھوٹے سے منظر نے مہمیز کردیا تھا۔ وہ سوچتا کہ بڑے منظر میں جاکر وہ زیادہ دیکھے گا اور زیادہ سمجھے گا۔

پتا جی نے جب اسے اس بارے میں بتایا تو گویا دلاسا دینے کے لئے کہا۔ ''وصال دین بھی تمہارے ساتھ جائے گا..... اور ماسٹر جی بھی''۔

وہ خوش ہوگیا۔ ویر جی نے کبھی اس کے تجسس میں اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ مگر پھر بھی ان کے بغیر وہ خود کو ادھورا محسوس کرتا تھا۔

لیکن پتا جی اداس ہوگئے۔ ''پتا نہیں، تمہارے بغیر ہم کیسے جئیں گے''۔

''کیوں پتا جی۔ اپنے بچوں کو تعلیم کے لئے سبھی لوگ دور بھیجتے ہوں گے''۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے گہری سانس لی۔ ''مگر تم تو میرے ایک بیٹے ہو..... اور وہ بھی منتوں مرادوں والے.....''۔

''یہ کیا ہوتا ہے پتا جی..... منتوں مرادوں والا؟''۔ اوتار سنگھ نے اپنا پسندیدہ جملہ دہرایا۔

اس کے جواب میں ٹھاکر نے اسے سب کچھ بتایا۔ بلکہ اسے لے جاکر برگد کا وہ درخت بھی دکھایا، جو جل چکا تھا۔ مگر اب بھی کھڑا تھا۔ ''یہاں ہم نے آخری بار تمہیں مانگا تھا۔ منت چڑھائی تھی''۔

''تو اس کے بعد ہی میں پیدا ہوا تھا؟''۔

''ہاں''۔

''تو اس کا مطلب ہے کہ اس درخت نے آپ کو مراد دی''۔ اوتار سنگھ نے کہا۔

ٹھاکر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بیٹے کو اس معاملے کی تفصیل نہیں بتانا چاہتا تھا۔ لیکن چند لمحے بعد نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے منہ سے نکلا۔ ''یہ درخت تو ہمارے منت ماننے کے کچھ دن بعد ہی سوکھ گیا تھا''۔

''میرے پیدا ہونے سے بھی پہلے''۔

''ہاں پتر اس سے بہت پہلے''۔

ماتا جی اکثر اسے بتاتی تھیں کہ انہوں نے کیسے طویل برس اولاد کی آرزو میں گزارے تھے۔ کیا گزرتی تھی ان پر۔ انہیں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ ہر چیز میسر تھی۔ لیکن انہیں کسی چیز سے غرض نہیں تھی۔ وہ بس ہر جگہ اولاد کی پرارتھنا کرتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ انہوں نے بائیس برس اولاد سے محرومی کا کشٹ اٹھایا ہے۔ اور جب انہیں وہ مل گیا تو جیسے سب کچھ مل گیا۔

تو اوتار سنگھ نے سوچا کہ وہ ہستی جس نے مجھے پیدا کیا، یقیناً زبردست ہے۔ اور وہ یہ درخت تو ہرگز نہیں ہوسکتا، جو خود ہی زندگی سے محروم ہوگیا ہے۔ پھر اسنے مجھے پیدا کیا تو میرے ماں باپ پر بڑا احسان کیا۔ مجھ پر بھی احسان کیا کہ مجھے ایسے محبت کرنے والے ماں باپ دیئے، اور انہیں اتنا کچھ دیا کہ وہ میری ہر خواہش پوری کرسکتے ہیں، تو مجھے کیا کرنا چاہئے؟

وہ اس سوال پر سوچتا رہا۔ اسے یاد آیا کہ ایک دن اس نے ماتا جی سے پوچھا تھا۔ ''آپ میرا اتنا خیال رکھتی ہیں۔ ہر چیز دیتی ہیں مجھے۔ اور پتا جی بھی کیا کچھ کرتے ہیں میرے لئے تو مجھے کیا کرنا چاہئے ماتا جی۔ میں کیا کروں آپ کے لئے؟''۔

''کچھ بھی نہیں۔ بس تم اچھے رہو۔ خوش رہو۔ میرے لئے یہی سب کچھ ہے''۔ ماتا جی نے کہا تھا۔

''اچھے رہنے کا کیا مطلب ہے؟''۔

''اچھے پرش بنو۔ اچھے کام کرو۔ تاکہ تمہارے پتا جی کا نام روشن ہو۔ لوگ خوشی سے کہیں کہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کا پوت مہاپرش ہے''۔

''او کیا کروں۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ اور کچھ بتایئے..... کوئی مشکل سا کام''۔

ماتا جی چند لمحے سوچتی رہیں۔ اس دوران پتا جی بھی آگئے تھے۔ ''بس تم ہمیشہ ہم سے محبت کرو''۔ انہوں نے کہا۔

اور اوتار سنگھ ماں سے لپٹا اور انہیں پیار کیا۔ پھر پتا جی سے لپٹ گیا اور انہیں چومنے لگا۔ ''وہ تو میں کرتا ہوں۔ اور یہ بھی بہت آسان ہے میرے لئے''۔

''محبت کرنا بھی آسان نہیں ہوتا''۔ پتا جی نے کہا۔ ''مگر یہ بات تم ابھی نہیں سمجھو گے''۔

تو اب اوتار سنگھ نے سوچا کہ اسے اپنے پیدا کرنے والے سے محبت کرنی چاہئے..... دنیا میں سب سے..... ماتا جی، پتا جی، اماں اور ویر جی سے بڑھ کر۔ کیوں کہ اس نے اسے پیدا نہ کیا ہوتا تو نہ وہ ان سب کو ملتا اور نہ یہ سب اسے ملتے۔ اس نے سمجھ لیا کہ شکر ادا کرنا اور محبت کرنا سب سے زیادہ اس کے لئے ہونا چاہئے، جس نے اسے پیدا کیا ہے۔

مگر محبت کیسے کرے؟ وہ تو اسے جانتا بھی نہیں۔ تو پھر پہلے اسے جاننے کی کوشش کرے۔ اسے تلاش کرے۔ پھر اس سے دنیا کی ہر ہستی اور ہر چیز سے بڑھ کر محبت کرے۔

''اے تو کہ جو بھی ہے، میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں، اس سب پر جو تو نے مجھے اور میرے ماں باپ کو دیا''۔ اوتار سنگھ نے سرگوشی میں کہا۔ ''اب میں تجھے تلاش کروں گا۔ تجھے ڈھونڈوں گا اور پھر تجھ سے محبت کروں گا۔ یہ میں جانتا ہوں کہ میں بس اتنا ہی کرسکتا ہوں، کوشش کرسکتا ہوں۔ مگر تو مجھے اسی وقت ملے گا، جب تو چاہے گا۔

www.aiurdu.com

جب تیری مرضی ہوگی۔ میں تجھ سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ میری مدد کر، اور مجھے مل جا''۔

یہ دعا کر کے اسے ایک پل کو سکون آیا۔ مگر وہ فوراً ہی مضطرب ہو گیا۔ اسے تو ڈھونڈنا ہے..... ان تھک کوشش کرنی ہے۔ سکون تو اس کے بعد کی چیز ہے۔ بعد میں ہی اچھا لگے گا۔

اب وہ سراپا عزم تھا!

.....x.....

''درخت کیسے سوکھ جاتے ہیں ماسٹر جی؟''۔ اوتار سنگھ نے ماسٹر جی سے پوچھا۔

''ایک وجہ تو یہ ہوتی ہے کہ اردگرد کی زمین خشک ہو جائے..... ایسی کہ درخت کی جڑیں درخت کے لئے غذا حاصل نہ کر سکیں۔ مگر بہت پرانے اور بہت بڑے درختوں کے ساتھ ایسا کم ہی ہوتا ہے کیوں کہ ان کی جڑیں بہت دور تک..... بعض اوقات میلوں تک پھیلی ہوتی ہیں''۔ کانتی پرشاد نے کہا۔

''اور دوسری وجہ؟''۔

''تم جانتے ہو کہ جڑیں زمین سے غذا حاصل کر کے تنے کی طرف بڑھاتی ہیں۔ اس سے درخت ہرا رہتا ہے۔ نئی کونپلیں، نئے پتے نکلتے رہتے ہیں۔ غذا نہ ملے تو یہ عمل رک جاتا ہے اور دھیرے دھیرے سوکھ جاتا ہے۔ اب جڑوں میں کوئی بیماری پھیل جائے اور زمین سے غذا چوسنے اور آگے بڑھانے کا ان کا عمل معطل ہو جائے تو درخت ختم ہو جاتا ہے''۔

''تو سوکھنے کے بعد بھی درخت کھڑا رہتا ہے؟''۔

''کچھ عرصہ۔ اس وقت تک، جب تک جڑوں میں اس کا بوجھ اٹھانے کی طاقت ہو۔ اور پھر درخت اندر سے کھوکھلا ہونے لگتا ہے۔ پھر یا تو وہ کھڑے کھڑے ختم ہو جاتا ہے یا گر جاتا ہے۔ جڑیں زمین چھوڑ دیتی ہیں..... ٹوٹ جاتی ہیں''۔

''سوکھنے کے کتنے عرصے بعد درخت گر جاتا ہے؟''۔

''مہینہ..... دو مہینے..... چھ مہینے..... اور زیادہ سے زیادہ سال بھر بعد''۔ کانتی پرشاد نے کہا۔ ''مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''۔

''یوں ہی کوئی خاص بات نہیں''۔

سہ پہر کو ان کا کھیلنے کا وقت تھا۔ وصال دین اور اوتار سنگھ حویلی سے نکل جاتے تھے اور کانتی پرشاد اپنے کمرے میں آرام کرتے تھے۔ اس سر پہر اوتار سنگھ نے کانتی پرشاد سے کہا۔ ''آپ آج ہمارے ساتھ چلیں ماسٹر جی''۔

کانتی پرشاد کو معمول میں اس تبدیلی کا تصور خوش گوار لگا۔ انہوں نے ہامی بھر لی۔ وہ دونوں لڑکوں کے ساتھ حویلی سے نکل آئے۔ اوتار سنگھ آگے آگے چل رہا تھا۔ وہ بستی سے باہر نکل آئے۔ کچھ دور کانتی پرشاد کو وہ سوکھا ہوا برگد کا بہت بڑا درخت نظر آیا۔ انہیں اپنے شاگرد پر فخر ہونے لگا۔ وہ صحیح طالب علم تھا، سائنسی ذہن والا، تجسس سے بھرا ہوا اور تحقیق کے جذبے سے مالا مال۔

اوتار سنگھ نے انہیں لے جا کر وہاں کھڑا کر دیا۔ ''اس درخت کو دیکھئے ماسٹر جی''۔

کانتی پرشاد نے درخت کو دیکھا۔ پھر گردوپیش کا جائزہ لیا۔ قریب ہی پانی کا ایک تالاب تھا۔ اور ہر طرف خودرو گھاس اور جنگلی پھولوں کے پودے موجود تھے۔ ''دیکھ رہا ہوں۔ یہ جڑوں کی بیماری والا معاملہ ہے کیوں کہ اردگرد تو بہت ہریالی ہے''۔

''یہ درخت مر چکا ہے نا''۔

''بالکل''۔ کانتی پرشاد نے درخت کی زمین سے باہر نکلی ہوئی مردہ جڑوں کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایسا مر چکا ہے کہ اب کبھی ہرا نہیں ہوگا''۔

''مگر ماسٹر جی، یہ درخت تقریباً تیرہ برس سے اس حال میں ہے''۔

کانتی پرشاد کے چہرے پر بے یقینی کا تاثر ابھرا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا''۔ انہوں نے بے حد وثوق سے کہا۔

''آپ پتا جی سے پوچھ لیں''۔

ٹھاکر کے حوالے پر کانتی پرشاد کو سانپ سونگھ گیا۔ ''تو پھر یہ اتنے برسوں سے کھڑا کیسے ہے؟''۔

''یہ تو میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں''۔

''میرے خیال میں تو اسے اب ایک انگلی کے دھکے سے بھی گر جانا چاہئے''۔ کانتی پرشاد نے کہا اور درخت کے تنے پر سچ مچ ایک انگلی سے ہی دباؤ ڈالا۔ پھر انہوں نے پہلے ایک ہاتھ سے اور پھر دوسرے ہاتھ سے درخت کو دھکیلا۔ وہ زور لگاتے رہے۔ دونوں لڑکے بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے۔ مگر درخت اپنی جگہ کھڑا رہا۔

بالآخر کانتی پرشاد نے کوشش ترک کر دی۔ وہ بری طرح ہانپ رہے تھے۔ ''اس کی جڑیں یقیناً زندہ ہوں گی''۔

''تو پھر درخت کو غذا بھی ملنی چاہئے''۔ اوتار سنگھ نے اعتراض کیا۔

''ہو سکتا ہے، درخت کا جڑوں سے رابطہ نہ رہا ہو''۔

''تو پھر درخت کو گر جانا چاہئے۔ اور زندہ جڑوں سے دوبارہ درخت اگنا چاہئے۔ سائنس تو یہی بتاتی ہے نا''۔

''ممکن ہے، جڑ کے ایک مضبوط مگر چھوٹے حصے سے درخت کا رابطہ ہو''۔

''تو اسے تھوڑی بہت غذا تو مل رہی ہوگی۔ کہیں تو نمو کے آثار نظر آئیں''۔

کانتی پرشاد لاجواب ہو گئے۔ ''اس کی بھی کوئی وجہ ہوگی، جو ہمیں معلوم نہیں''۔

''سائنس کو بھی معلوم نہیں؟''۔

''سائنس کو معلوم ہوگا۔ ہمارا علم کم ہے''۔ کانتی پرشاد نے بات بنائی۔ لیکن ان کا لہجہ کم زور تھا۔ ''آؤ، اب چلیں''۔ انہوں نے کہا اور واپس چل دیئے۔

دونوں لڑکے ان کے پیچھے تھے۔ ماسٹر جی کا جواب اوتار سنگھ کو مطمئن نہیں کر سکا تھا۔ مگر اسے خوشی تھی کہ ماسٹر جی نے اس معاملے کو توہم قرار نہیں دیا۔

.....x.....

پھر ماتا جی بیمار ہو گئیں۔ ایسی بیمار کہ دیکھتے ہی دیکھتے بستر سے لگ گئیں۔ چلنے پھرنے کے قابل بھی نہیں رہیں۔ پہلے تو ویدجی آتے رہے۔ پھر شہر سے ڈاکٹر آنے لگے۔ ٹھاکر جی بھی بہت پریشان رہنے لگے تھے۔

بہت دن سے ماتا جی پوجا والے کمرے میں نہیں گئی تھیں۔ جب پہلی بار ایسا ہوا تو انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''دیکھو پتر، آج میں اٹھ نہیں سکتی۔ لیکن تم روز کی طرح جاؤ گے اور پوجا کرو گے''۔

اوتار سنگھ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اور جب تک میں نہ جا سکوں، تم ہر روز پوجا کرتے رہو گے''۔

''جی ماتا جی''۔

اوتار سنگھ اکیلا ہی پوجا کے کمرے میں جانے لگا۔ ایک دن اس نے بھگوان کے سامنے رکھے پرشاد پر ایک مکھی کو منڈلاتے دیکھا۔ وہ کبھی کسی پھل پر بیٹھتی تو کبھی مٹھائی پر۔ اوتار سنگھ کو گھن آنے لگی۔ اس نے ہاتھ ہلا کر مکھی کو اڑایا۔ مگر اگلے ہی پل وہ پھر وہاں آ بیٹھی۔ اوتار سنگھ نے پھر اسے اڑایا۔ مگر پھر وہی ہوا۔ ذرا دیر میں ہی وہ عاجز ہو گیا۔ بری طرح سے جھنجلانے لگا۔ ایک اتنی سی مکھی پر اس کا بس نہیں چل رہا۔ اور ماسٹر جی کہتے ہیں کہ منش میں بڑی شکتی ہے۔ دنیا کی ہر مخلوق سے زیادہ۔

وہ عاجز آ گیا تو اس نے ہاتھ جوڑ کر بھگوان سے کہا۔ ''بھگوان، اس بدتمیز مکھی کو شراپ دیجئے۔ یہ آپ کے پرشاد کو گندا کر رہی ہے''۔

لیکن بھگوان کب جواب دیتا ہے۔

اوتار سنگھ نے اب مکھی کو مارنے کی کوشش کی۔ اس کی جھنجلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ ''کیسے بھگوان ہو۔ تم تو کچھ بولتے ہی نہیں۔ اس مکھی کو شراپ دو نا۔ ماتا جی کہتی ہیں، تم بدتمیزی کرنے والوں کو شراپ دیتے ہو۔ یہ مکمل تمہارا پرشاد گندا کر رہی ہے۔ ماتا جی کہتی ہیں، کوئی بدتمیزی کرے تو تم اسے بہت برا شراپ دیتے ہو''۔

اس نے ہاتھ روک لیا۔ اب وہ منتظر تھا کہ بھگوان مکھی کو شراپ دے گا۔ لیکن بدبخت مکھی اسی طرح پرشاد پر دندناتی رہی۔ بلکہ وہ بار بار بھگوان کی مورتی پر بھی جگہ جگہ بیٹھ رہی تھی۔

''تم کچھ بھی نہیں کر سکتے''۔ اوتار سنگھ نے جھنجلا کر کہا۔ ''بولتے بھی نہیں۔ اپنے پرشاد کی حفاظت بھی نہیں کر سکتے۔ تو دنیا کا نظام کیسے چلاتے ہو؟''۔

اب کے اوتار سنگھ نے وہیں رکھی گیتا اٹھائی اور مکھی کے درپے ہو گیا۔ مگر مکھی بہت پھرتیلی، بہت شریر تھی۔ ایک بار جو وہ بھگوان کی مورتی پر بیٹھی تو اس نے گیتا سے اسے مارا۔ مکھی تو اڑ گئی۔ گیتا بھگوان کے منہ پر لگی۔ مورتی الٹ کر گر گئی۔

اوتار سنگھ پر تو لرزہ چڑھ گیا۔ اس کے ذہن میں بس ایک خوف تھا۔ اب بھگوان اسے شراپ دے گا۔ کئی منٹ گزر گئے اور کچھ نہیں ہوا، تو اس کا خوف کم ہونے لگا۔ اس نے سوچا کہ اس نے جان بوجھ کر بدتمیزی نہیں کی۔ جب کہ مکھی تو دانستہ بدتمیزی کر رہی تھی۔ اور بھگوان نے اسے شراپ نہیں دیا۔ تو مجھے کیوں دے گا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ شاید کسی کو شراپ دے ہی نہیں سکتا۔

چند روز بعد ایک اور واقعہ ہوا۔ اس بار بدتمیزی کرنے والا ایک چوہا تھا۔ اوتار سنگھ نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ بس پوجا بھول کر چپ چاپ تماشا دیکھتا رہا۔ چوہے نے پرشاد سے من پسند چیزیں اڑائیں۔ اور اس کے بعد اس نے گستاخی کی حد کر دی۔ بھگوان سے بدتمیزی کرنے لگا۔

www.allurdu.com

وہ اپنے نکیلے دانتوں سے شیو جی کی ناک کتر رہا تھا..... غیض وغضب والے، قہر کے دیوتا، تباہی کے دیوتا شیو جی کی ناک!

شیو جی کے بارے میں اس نے بہت کچھ سن رکھا تھا۔ وہ خوف سے شل ہو گیا۔ اب اس چوہے کی خیر نہیں۔ لیکن چوہے کو کچھ بھی نہیں ہوا۔ شیو کی ناک کترنے کے کھیل سے اس کا دل بھر گیا تو وہ مورتی سے اترا اور نہایت آسودگی کے ساتھ چلتے ہوئے ایک طرف چلا گیا۔

اس روز بھگوان سے تو نہیں، لیکن اس کی مورتی سے اوتار سنگھ کا دل برا ہو گیا۔ اس نے سوچا، اس کی پوجا کرنا، اس سے کچھ مانگنا، جو خود اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتا، پرلے درجے کی حماقت ہے۔ انسان کی توہین ہے۔ لیکن ماں باپ سے ملا ہوا نسلی ورثہ اور ان کی دی ہوئی تعلیم اتنی کم زور نہیں ہوتی کہ آسانی سے مٹ جائے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اگلے روز وہ پوجا کے لئے چلا آیا۔ اور ناگواری کے باوجود اس نے پوجا بھی کی۔ اس شام ٹھاکر جی بہت پریشان تھے۔ اس نے پہلی بار ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ ''کیا ہوا پتا جی؟ کیا بات ہے؟''۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔ ''کچھ نہیں پتر۔ بس ایسے ہی''۔

''کچھ تو ہے پتا جی۔ مجھے بائیں نا''۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے چند لمحے سوچا اور فیصلہ کیا کہ بیٹے کو بتانا ضروری ہے۔ ''پتر..... تمہاری ماں کی حالت اچھی نہیں۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے''۔

اوتار سنگھ گھبرا گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ ماتا جی کی مہلت ختم ہونے والی ہے۔ ویسے جب سے وہ بیمار ہوئی تھیں، ہر گزرتے دن کے ساتھ اسے یہ احساس ستاتا رہا تھا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ کبھی نہ رکنے والا وقت ان کے لئے ختم ہو رہا ہو۔ اسی لئے اس نے ان کے ساتھ بہت وقت گزارا تھا۔ پڑھائی میں تو اس کی کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ لیکن کھیلنے کے وقت میں اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ وہ جلدی واپس آ جاتا اور بستر پر ماتا جی سے لپٹ جاتا اور انہیں پیار کرتا۔ وہ بھی جواب میں اسے پیار کرتیں۔ مگر پچھلے ایک ہفتے میں اسے احساس ہونے لگا تھا کہ اب ان میں اسے پیار کرنے کی طاقت نہیں رہی ہے۔ وہ بس نگاہوں میں بے بسی اور حسرت لئے، پیاسی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہتی تھیں۔ اسے ڈر لگتا تھا..... مگر شعور کی سطح پر نہیں۔ وہ لاشعور میں تھا۔

''تو اب کیا ہو گا پتا جی؟''۔ اس نے متوحش لہجے میں پوچھا۔

''کچھ نہیں ہو سکتا پتر۔ جو بھگوان کی اچھا''۔ ٹھاکر اوتار سنگھ نے اداسی سے کہا۔ پھر ذرا ٹھہر کر بولے۔ ''تم تو روز پوجا کرتے ہو۔ بھگوان سے پرارتھنا کرو کہ تمہاری ماتا جی اچھی ہو جائیں''۔

اگلے روز اوتار سنگھ پوجا کے لئے گیا تو بھگوان کے لئے عقیدت سے بھرا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر بھگوان سے پرارتھنا کی تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور آواز لرز رہی تھی۔ ''ہے بھگوان۔ میری ماتا جی کو اچھا کر دو۔ انہیں جیون دے دو۔ میں جیون بھر تمہاری پوجا کروں گا..... آرتی اتاروں گا۔ بس تم میری ماتا جی کو پہلے جیسا کر دو۔ ماتا جی کہتی تھیں کہ تمہاری شکتی مہان ہے۔ تم کچھ بھی کر سکتے ہو۔ مجھے بھینٹ دے دو بھگوان۔ میری ماتا جی کا جیون مجھے بھینٹ دے دو۔ میں تمہارا یہ اپکار کبھی نہیں بھولوں گا''۔

وہ پوجا کے کمرے سے نکلا تو بہت پر یقین تھا۔ اسے اعتماد تھا کہ بھگوان نے اس کی سن بھی لی ہے اور مان بھی لی ہے۔ اس وقت تک ڈوبتے کو تنکے کا سہارا والا محاورہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ بحران میں آدمی کسی موہوم سہارے سے بھی آس لگا لیتا ہے۔ وہ اپنے تمام شکوک وشبہات بھول گیا۔ اس نے بھگوان سے کھرے من کے ساتھ لو لگائی تھی۔

اس روز ماسٹر جی نے پڑھانے سے انکار کر دیا۔ ''آج چھٹی ہے چھوٹے ٹھاکر۔ آپ اپنی ماتا جی کے پاس جائیں''۔

اوتار سنگھ کا دل ہولنے لگا۔ وہ اس کمرے میں چلا گیا، جو شروع ہی سے اس کا اور ماتا جی کا تھا۔

وہ دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ ٹھاکر جی باہر آئے۔ اسے دیکھتے ہی انہوں نے کہا۔ ''میں تمہیں ہی بلانے کے لئے آ رہا تھا''۔

''پتا جی، خیر تو ہے؟''۔ اوتار سنگھ نے گھبرا کر پوچھا۔

''نہیں پتر۔ تمہاری ماتا جی کی حالت بہت خراب ہے۔ نہ کچھ بول رہی ہیں، نہ کسی کو پہچان رہی ہیں۔ چلو تم ان سے مل لو''۔

اوتار سنگھ ماں کے پاس چلا گیا۔ ایک پنڈت بیٹھا بلند آواز میں اشلوک پڑھ رہا تھا۔ ٹھاکرانی کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ لیکن بے نور لگ رہی تھیں۔ لگتا تھا، اسے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ اوتار سنگھ نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ وہ برف کی طرح سرد تھا۔

''ماتا جی..... ماتا جی..... مجھے دیکھیں۔ یہ میں ہوں اوتار سنگھ''۔ اوتار سنگھ نے اسے پکارا۔

ٹھاکرانی نے جھرجھری سی لی۔ ایک لمحے کو اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے بمشکل بیٹے کو کھینچ کر لپٹا لیا۔ اس کا جسم بری طرح لرز رہا تھا۔ اس کے ہونٹ تھرتھرائے۔ لیکن کوئی آواز نہ نکلی۔

''ماتا جی، مجھے چھوڑ کر نہ جانا''۔ اوتار سنگھ گڑگڑایا۔ ''میں نے بھگوان سے بات کر لی ہے وہ تمہارا جیون نہیں لیں گے۔ ماتا جی.....'' بولتے بولتے اسے احساس ہوا کہ ماں کے جسم کی لرزش ختم ہو گئی ہے۔ وہ ساکت ہو گیا ہے۔ اس کا دل بری طرح گھبرانے لگا۔

اسی لمحے کسی نے اس کے کندھے پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔ ''اٹھو چھوٹے ٹھاکر، تمہاری ماتا جی جا چکیں''۔ یہ ٹھاکر جی کی آواز تھی۔

www.allurdu.com

اوتار سنگھ ہٹا اور اس نے ماں کے چہرے کو دیکھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ مر چکی ہے۔ پھر ٹھاکر نے اسے لپٹا لیا..... اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

حویلی میں کہرام مچا تھا۔ سب ہی رو رہے تھے۔ پھر مصروفیات بھی تھیں۔ ٹھاکرانی کی آخری رسومات کی تیاری ہو رہی تھی۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ سائے کی طرح بیٹے کے ساتھ لگا تھا۔ مگر پھر اسے اطمینان ہو گیا۔ اوتار سنگھ پہلے تو بہت رویا تھا۔ مگر اب پرسکون ہو گیا تھا۔ البتہ اس کی آنکھوں میں عجیب سی ویرانی تھی..... خالی پن تھا۔ ٹھاکر نے پرکھنے کی غرض سے اس سے کچھ باتیں پوچھیں۔ اس نے درست جواب دیئے..... لیکن اس کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔ ٹھاکر مطمئن ہو کر اس کے پاس سے ہٹ گیا۔ اسے بہت کچھ کرنا تھا۔ رشتے داروں کو اطلاع کرانی تھی اور بہت سے بندوبست کرنے تھے۔

مگر باہر جاتے ہوئے اس نے وصال دین سے کہا کہ وہ اس کا خیال رکھے۔

وصال دین اس کے قریب چلا گیا۔ ''چھوٹے ٹھاکر، کیا کر رہے ہو؟''۔

''کچھ نہیں ویر جی''۔

''تو کچھ سوچ رہے ہو؟''۔

اوتار سنگھ چند لمحے خاموش رہا۔ پھر بولا۔ ''میں کچھ سوچنا چاہتا ہوں۔ مگر مجھے یہ معلوم نہیں کہ کیا۔ اور میں سوچ بھی نہیں پا رہا ہوں''۔

''دماغ پر زیادہ زور نہ دو بھائی''۔ وصال دین نے بے ساختہ کہا۔

اوتار سنگھ نے چونک کر اسے دیکھا۔ وصال دین کی آنکھوں میں محبت تھی، دکھ تھا، آنسو تھے۔ اور اتنی خراب کیفیت میں بھی اوتار سنگھ کو ایک لمحے میں اس غیر معمولی بات کا احساس ہو گیا۔ ویر جی نے پہلی بار..... ہاں، پہلی بار اسے بھائی کہہ کر پکارا تھا۔ وہ اس سے لپٹ گیا۔ ''بس ویر جی، ایک وعدہ کرو''۔ اس نے کہا۔ ''اب مجھے ہمیشہ ایسے ہی پکارو گے''۔

وصال دین کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ''کیسے پکاروں گا!''۔

''ایسے ہی..... بھائی کہہ کر''۔

وصال دین نے اسے محبت سے دیکھا۔ ''میں تمہیں کچھ بھی کہوں، سمجھتا تو یہی ہوں''۔

''بس اب مجھے کچھ اور نہ کہنا''۔

جب آدمی کسی بہت بڑے غم سے شل ہوتا ہے تو اس کیفیت سے نکلنا اس کے لئے آسان نہیں ہوتا۔ بعض اوقات تو لوگ ہفتوں اس کیفیت میں الجھے رہتے ہیں۔ اوتار سنگھ کا بھی یہی حال تھا۔ لیکن وصال دین کا بھائی کہنا اسے ہوش میں لانے کا بہانہ بن گیا۔ اس کی غم کی کیفیت ختم ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ کیا سوچنا، کیا کرنا چاہ رہا تھا۔ اور ایک لمحے میں غصہ اس کے اندر یوں امنڈا کہ وہ تھر تھر کانپنے لگا۔

وصال دین اس کی یہ تبدیلی دیکھ کر گھبرا گیا۔ ''کیا ہوا بھائی؟''۔

''کچھ نہیں ویر جی، ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے۔ ابھی آتا ہوں''۔ یہ کہہ کر اوتار سنگھ کمرے سے نکل گیا۔

وصال دین کو یہ خیال تھا کہ بڑے ٹھاکر جی اس کا خیال رکھنے کو کہہ کر گئے ہیں۔ چناں چہ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ لیکن اسے پوجا کے کمرے میں جاتے دیکھ کر اس کے قدم رک گئے۔ وہ اندر تو نہیں جا سکتا تھا۔

اوتار سنگھ اندر گیا اور بھگوان کی مورتی کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ ''او بے جان مورت، غلطی میری تھی۔ میں نے تجھ سے ماں کے جیون کی بھیک مانگی، میں جانتا تھا کہ تو تو اپنی حفاظت بھی نہیں کر سکتی۔ چوہا تو بڑی چیز ہے۔ تو مکھی سے بھی خود کو نہیں بچا سکتی۔ پھر تو میری ماں کو کیا جیون دے گی۔ میں نے تجھ سے مانگا تو اس لئے کہ میری ماں تجھ پر یقین رکھتی تھی..... اور ہم منش لوگ اپنے ماں باپ، دادا پردادا کے یقین پر یقین رکھتے ہیں، چاہے وہ غلط ہوں۔ مگر اب میں ایسا نہیں کروں گا۔ آج کے بعد میں تجھ سے واسطہ نہیں رکھوں گا''۔

یہ کہہ کر وہ پلٹا، کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اس نے پلٹ کر آخری بار مورتی کو دیکھا۔ ''اگر تجھ سے بن پڑے تو مجھے شراپ ضرور دینا۔ میں انتظار کروں گا''۔

اور وہ باہر نکل آیا۔ اس کے بعد وہ کبھی اس کمرے میں نہیں گیا!

.....X.....

ایک آدمی کی موت سے زندگی بدل سکتی ہے..... دنیا بھی بدل سکتی ہے۔ اوتار سنگھ کے لئے یہ ایک نیا اور بہت بڑا تجربہ تھا۔ اس کی مشاہدے کی قوت غیر معمولی تھی۔ لیکن یہ مشاہدہ بے حد غیر معمولی تھا کیوں کہ اس کی دو جہتیں تھیں۔ وہ دیکھتا تو کچھ بھی پہلے جیسا نہیں لگتا تھا۔ حویلی کی چہل پہل ختم ہو گئی تھی وہ رونق نہیں رہی تھی، جو پہلے ہوتی تھی۔ سب ملازم وہی تھے۔ گھر میں کام کرنے والی نوکرانیاں وہی تھیں۔ مگر اب خاموشی رہتی تھی۔ کوئی ہنستا بولتا نہیں تھا۔ اور ماتا جی کے دیہانت کے بعد حویلی کا ایک کمرا بالکل اجڑ گیا تھا۔ وہ کمرا جو حویلی کا سب سے آراستہ و پیراستہ کمرا تھا، اب وہاں کوئی جاتا ہی نہیں تھا۔ اور وہ ماتا جی کا کمرا نہیں تھا جو کہ اس کا بھی تھا۔ اجڑا تو پتا جی کا کمرا تھا۔ وہ اپنا کمرا چھوڑ کر اس کے پاس آ گئے تھے اور ماتا جی کی جگہ سوتے تھے..... اس کے پاس۔

وہ باہر دیکھتا تو وہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ سورج اسی طرح اپنے وقت پر طلوع و غروب ہوتا۔ پرندے اسی طرح چہچہاتے۔ ندی اسی طرح بہتی۔ ہوا ویسے ہی چلتی۔ لیکن اسے لگتا کہ ہر شے اداس ہے۔ اس نے یہ بات وصال دین سے کہی تو وہ ہنس کر بولا۔ ''نہیں بھائی، سب کچھ ویسا ہی ہے۔ تمہیں ایسا لگتا ہے''۔

تو اوتار سنگھ نے سمجھ لیا کہ دنیا کا نظام کبھی تبدیل نہیں ہوتا۔ کسی کے ہونے نہ ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بس اس سے تعلق رکھنے والوں پر اثر پڑتا ہے۔ اور اس نے یہ بھی سمجھ لیا کہ بنیادی طور پر آدمی بہت خود پسند ہے۔ وہ سب کچھ اپنے حوالے سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ وہ خوش ہے تو جھلسا دینے والی تیز دھوپ پرور ہے۔ تپتی ہوئی ریت سونا ہے۔ پتوں سے محروم خزاں رسیدہ درخت خوب صورت ہیں اور وہ ناخوش ہے تو چاندنی جھلساتی ہے بہتے پانی کی آواز ڈراؤنی لگتی ہے اور مہکتے ہوئے پھولوں کا نظارہ آنکھوں میں چبھتا ہے۔ خوشبو سے سر میں درد ہونے لگتا ہے۔

ہے میرے دل سے تعلق تمام عالم کا
فضا اداس بہت چاندنی نراس بہت

پھر اس نے دیکھا کہ دھیرے دھیرے حویلی کی رونق بحال ہو رہی ہے۔ نوکروں اور داسیوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آنے لگی ہے۔ وہ ہنستے بولتے ہیں۔ لیکن وہ سامنے آ جائے تو ایک دم چپ ہو جاتے ہیں۔ لگتا ہے خود کو مجرم سمجھ رہے ہیں۔ اسے عجیب سا لگا۔ مگر کچھ عرصے بعد خود اس میں بھی تبدیلی آئی۔ وہ ہنسنے بولنے مسکرانے لگا۔ تو یہ یوں ہے۔ اس نے سوچا۔ تعلق رکھنے والے بھی مرنے والے کو بھول جاتے ہیں۔ ابتدا میں یہ سوچنا اسے برا لگا۔ اس نے سوچا، آدمی کتنا بے وفا ہوتا ہے۔ اور میں کتنا بے وفا ہوں کہ محبت کرنے والی، خیال رکھنے والی ماں کو بھول رہا ہوں۔ اس احساس جرم کے تحت اس نے خود پر سوگواری طاری کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

اس نے پوجا تو چھوڑ دی تھی۔ لیکن آکاش پر بیٹھے بھگوان کو وہ پہلے سے زیادہ ماننے لگا تھا۔ ماتا جی کے دیہانت کے بعد اس پر بہت سوچا تھا۔ اور بات سمجھ میں آتی تھی۔ وہ تو مہانوں کا مہان تھا، جو دنیا کا نظام چلا رہا تھا، تو وہ بے جان مورتی نہیں ہو سکتا، جو اپنے پرشاد پر بیٹھنے والی مکھی کو بھی نہ اڑا سکے۔ کسی گستاخ چوہے کو سزا بھی نہ دے سکے۔ بلکہ وہ مورتی بھی اس کی نہیں ہو سکتی۔ وہ اس طرح اپنی بے عزتی کیوں کرائے گا۔ جب کہ سب سے زیادہ عزت اسی کا حق ہے۔ اور یہ طے ہے کہ عبادت کی بنیاد خوف ہے۔ اور سب سے بڑا خوف ہمیشہ نامعلوم کا ہوتا ہے۔ جان لیا، سمجھ لیا تو رفتہ رفتہ خوف ختم۔ سامنے آ گئے تو خوف ختم۔ تو وہ مہانوں کی مہان ہستی جس نے یہ سب کچھ بنایا ہے، یہ کیوں چاہے گی کہ کسی کے سامنے آئے اور اس کا خوف ختم ہو۔ وہ یہ کیوں چاہے گا کہ انسان اسے دیکھے، اس کی مورت بنائے اور حقیر جانور بھی اس کی توہین کریں۔ تو یہ مورتی انسان کی اختراع ہے اور وہ لوگ بے وقوف اور نہایت درجے کے جاہل ہی ہو سکتے ہیں، جو مکھی اور چوہے کے ہاتھوں اس مورت کا اپمان ہوتے دیکھیں، اور پھر بھی اس کی پوجا کرتے رہیں۔ ان سے بہتر تو وہ جانور ہیں، جو مورت کا اپمان کرتے ہیں۔ چوہے کو دیکھو، کبھی جاگتے انسان پر چڑھنے کی جرات نہیں کرتا۔ مورت پر چڑھتا ہے تو اس سمجھ کے ساتھ کہ یہ بے جان ہے اور اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ تو جس سے جانور بھی نہ ڈریں، اس سے عقل مند انسان کیسے ڈر سکتا ہے۔ وہ تو کبھی ایسا نہیں کرے گا۔

تب سے اوتار سنگھ کا معمول ہو گیا کہ دن میں دو ایک بار وہ کھلے آسمان کے نیچے کھڑا ہوتا، احترام سے سر جھکاتا اور عقیدت اور احترام سے کہتا۔ ''اے سب کچھ بنانے والے، میں تیرے سامنے، تیری بڑائی کے سامنے سر جھکاتا ہوں''۔ یہ اس کی پوجا تھی۔

ماسٹر جی تاریخ پڑھا رہے تھے۔ ہندوستان کی تاریخ!

''یہ کیا بات ہے ماسٹر جی کہ پورے بھارت پر جب بھی کسی ایک راجا کی حکومت رہی تو پورے دیش میں خوش حالی تھی''۔ اوتار سنگھ نے ان سے پوچھا۔ ''اور جب بھی بہت سارے رجواڑے بنے، ریاستیں بنیں تو بدامنی اور بدحالی رہی''۔

''یہ تو اصول ہے۔ وحدت میں ارتکاز ہے، کثرت میں انتشار''۔ ماسٹر جی نے جواب دیا۔ ''کم وبیش ایک جیسی طاقت کے بہت سے حکمراں ہوں گے تو وہ اپنی طاقت بڑھانے اور دوسرے کو زیر کرنے کی کوشش کریں گے یوں جنگیں ہوں گی۔ بدامنی ہو گی۔ پیسہ جنگوں پر خرچ ہو گا تو رعایا پر ٹیکس کا بوجھ بڑھے گا اور غربت ہو گی''۔

''مگر جنگیں کیوں؟ سب اپنی اپنی جگہ حکومت کرتے رہیں''۔

''یہ انسان کی فطرت ہے۔ طاقت اور اقتدار ملتا ہے تو اس کی ہوس بڑھتی ہے۔ اور ہوس کی کوئی حد نہیں۔ تبھی تو کہتا ہوں کہ کثرت میں انتشار ہے۔ اب کسی کی پورے دیس پر حکومت ہو تو بھی وہ اپنی راج دھانی میں بیٹھ کر حکومت کرتا ہے۔ ریاستوں میں وہ اپنے نائب مقرر کرتا ہے، جو اس کے ماتحت ہوتے ہیں۔ حکم اس کا ہوتا ہے نافذ گورنر کرتے ہیں سکہ اس کے نام کا چلتا ہے۔ وصولی اور تقسیم کا کام گورنر کرتے ہیں۔ وحدت میں مرکزیت ہے۔ اس لئے خوش حالی ہے۔ معمولی سی شورش ہوئی جو فرو کر دی گئی۔ کوئی جنگ نہیں۔ کوئی چیلنج نہیں۔ رعایا سکون سے اپنا کام کرتی ہے۔ پیداوار زیادہ ہوتی ہے''۔

اوتار سنگھ پر سوچوں کے نئے دروازے کھل گئے۔ کثرت میں انتشار ہے، وحدت میں ارتکاز۔ یہ تو واقعی سامنے کی بات ہے۔ اگر بھارت میں یہ معاملہ ہے تو کائنات تو بہت بڑی ہے..... منش کے تصور سے بھی بڑی۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس پر بے شمار دیوی دیوتاؤں کی حکمرانی ہو۔ ایسا ہوتا تو لڑائی جھگڑے ہوتے۔ انتشار ہوتا۔ بلکہ یہ نظام چلانے والے تین بھی نہیں ہو سکتے۔ ایک ہی ہو سکتا ہے۔ چندر گپت موریہ، اشوک، ہرش اکبر اعظم، اورنگ زیب بڑے حکمراں تھے۔ پورے بھارت کے مالک۔ بہت طاقت ور۔ لیکن بغاوتیں تو ان میں سے ہر ایک کے خلاف ہوئیں۔ یعنی کیسی ہی مرکزیت ہو، اور کوئی کتنا ہی طاقت ور ہو، اس کے خلاف سر اٹھانے والے موجود ہوتے ہیں اور سر اٹھاتے بھی ہیں۔

اس کے برعکس کائنات کے نظام میں کبھی خلل نہیں پڑتا۔ سورج اپنے وقت پر نکلتا اور غروب ہوتا ہے۔ کوئی موسم وقت سے پہلے آتا ہے نہ بعد میں۔ اپنے وقت پر آتا ہے۔ سب کچھ ایک سسٹم کے تحت ہو رہا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ جس نے یہ نظام قائم کیا اور چلا رہا ہے، نہ صرف واحد ہے۔ بلکہ مطلق العنان بھی ہے۔ اس کا اختیار و اقتدار ایسا ہے کہ کوئی اسے چیلنج نہیں کر سکتا۔ کوئی اس کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کر سکتا۔ اور اس کے پاس ایسی قوتیں ہیں کہ وہ دور بیٹھ کر بھی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

یہ سب کچھ سوچنے اور سمجھنے کے بعد اس پر ہیبت طاری ہو گئی۔ لرزہ چڑھ گیا۔ اس روز اس نے کھلے آسمان کے نیچے کمر کے بل جھک کر بہت عاجزی سے پکارا۔ ''تو جو کوئی بھی ہے اے سب کچھ بنانے والے، میں تیرا اعتراف کرتا ہوں اور تیرے سامنے خود کو جھکاتا ہوں''۔

اس وقت اسے معلوم نہیں تھا کہ رکوع کیا ہوتا ہے!

.....X.....

کئی دن گزر گئے۔ اوتار سنگھ کو احساس بھی نہیں ہوا کہ اب وہ خود بھی ہنس بول رہا ہے۔ بلکہ ان کئی دنوں میں اس نے ماتا جی کو ایک بار بھی یاد نہیں کیا ہے اور جب اسے احساس ہوا تو پھر احساس جرم بھی ہوا۔ ارے..... وہ اتنی چاہنے والی ماں کو بھول گیا! احساس جرم ہو تو پھر آدمی تاویلیں بھی تلاش کرتا ہے۔ وہ تو واقعی بہت مصروف ہو گیا تھا۔ اسکول میں داخلے کے دن قریب آ گئے تھے۔ ماسٹر جی نے پڑھائی کا وقت بڑھا دیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ بڑے ٹھاکر نے خود ماسٹر جی سے فرمائش کی تھی کہ وہ اسے زیادہ مصروف کر دیں تا کہ وہ ماں کا غم بھول سکے۔

www.allurdu.com

اوتار سنگھ کو یاد تھا کہ اسے پہلے بھی احساس ہوتا تھا کہ وہ ماں کو بھول رہا ہے۔ اور اس نے خود پر سوگواری طاری کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ تو کیا وہ کوشش بھی ناکام ہو گئی..... اور وہ بھی ایسے کہ اسے پتا بھی نہیں چلا۔ اور اس کا مطلب ہے کہ اس کے اندر کوئی خودکار نظام حرکت میں آ گیا ہے جو اس کی کوشش پر حاوی ہے۔

اب کے ماتا جی کا خیال آیا تو اسے محرومی کا احساس اور دکھ تو ہوا۔ مگر اس بار وہ گہرائی میں نہیں تھا۔ بلکہ سطحی تھا۔ ایسا لگا کہ اندر کوئی زخم تھا..... گہرا زخم، جو چپکے چپکے بھر گیا تھا۔

یہ تو اوتار سنگھ نے بہت پہلے سمجھ لیا تھا کہ دنیا میں کوئی کام خود بہ خود نہیں ہوتا۔ سائنس جس چیز، جس بات اور جس عمل کی توجیہہ نہیں کر پاتی، اسے یا تو ایک عظیم واقعہ قرار دے دیتی ہے یا اتفاق کہتی ہے یا پھر کہتی ہے کہ یہ ایک سسٹم ہے۔ اور اوتار سنگھ کا دل اور عقل اس بات پر متفق تھے کہ جہاں سسٹم نظر آتا ہے، وہیں سسٹم بنانے والی ایک عظیم اور سب سے طاقت ور ہستی کا وجود پکا ہو جاتا ہے۔

اب اوتار سنگھ نے اپنے وجود کے حوالے سے سمجھا کہ ہر جان دار شے کے وجود میں اس عظیم ہستی کی نشانیاں موجود ہیں۔ اور اسی حوالے سے اسے اس کی کچھ صفات بھی سمجھ میں آئیں۔ وہ یقیناً بہت مہربان ہے۔ بہت شفیق ہے۔ اپنی مخلوق کی فکر کرتا ہے۔ اس نے سب کو زندگی کے لئے وقت کی ایک خاص مقدار دی ہے۔ اس عرصے تک ہر ایک کو جینا ہے۔ اب کسی کو کوئی بہت بڑا دکھ یا غم لگ جائے تو وہ اپنا جیون تو جیئے گا۔ لیکن مردوں سے بدتر۔ اب یہ اس کی مہربانی ہے کہ وہ آتما کے گہرے زخم بغیر کسی دوا، کسی ظاہری مرہم کے بھر دیتا ہے۔ اب یہی دیکھو کہ ماں کے دیہانت والے روز اسے لگتا تھا کہ اس کی سانس غم کی شدت سے رک جائے گی۔ دل بند ہو جائے گا۔ جیسے وہ ماں کے بغیر جی نہیں سکے گا۔ اگلے دن غم کچھ ہلکا ہوا۔ پھر ہر گزرتے دن کے ساتھ اور ہلکا ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اسے بے وفائی کے مجرمانہ احساس کے تحت اس غم کو زبردستی خود پر طاری کرنا پڑا۔ اور اس کے باوجود اب وہ زخم بھر چکا ہے۔ بس یاد کے ساتھ ہلکی سی ٹیس اٹھتی ہے۔ اور بس۔

تو وہ مہربان ہے۔ اپنی مخلوق کا خیال رکھتا ہے۔ ان کے غم دور کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ اپنی مخلوق کی..... ہر منش کی الگ الگ خبر رکھتا ہے۔ ان سے واقف ہے۔ کیوں نہ ہو، اس نے انہیں بنایا ہے۔ اور اس کا مطلب ہے کامل علم کے ساتھ بنایا ہے۔ وہ ان کی ہر کمزوری، ان کی ہر خوبی سے آگاہ ہے۔

اس لمحے اوتار سنگھ کا احساس جرم مٹا گیا۔ اس نے اس ان دیکھی مہان ہستی کا شکر ادا کیا کہ اس نے اس کا غم دور کیا۔ تاکہ وہ اپنا جیون جاری رکھ سکے۔ تو ضرور اس جیون کا کوئی مقصد بھی ہے۔ یقیناً ہے۔ لیکن یہ وہ مقام تھا، جہاں اوتار سنگھ ہار جاتا تھا۔

بہرحال اس نے اپنا جیون پھر سے جینا شروع کر دیا!

.....x.....

چھ ماہ بعد اسکول میں داخلے کا مرحلہ آ گیا!

ٹھاکر پرتاپ سنگھ کے لئے وہ مرحلہ بہت کڑا تھا۔ ابھی تو وہ بیوی کی دائمی جدائی کے صدمے سے بھی پوری طرح نہیں سنبھلا تھا۔ اس چہیتے بیٹے کے سوا اس کے پاس کچھ بھی تو نہیں تھا۔ وہ نہ ہوتا تو شاید جیون میں اس کی دلچسپی ہی نہ رہتی۔ اسے خود سے دور کرنے کا حوصلہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بری طرح ڈانواں ڈول ہو گیا۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ اوتار سنگھ کو اسکول میں داخل کرنے کا خیال ہی دل سے نکال دے۔ لیکن وہ خود تعلیم یافتہ تھا۔ بیٹے کو تعلیم سے محروم رکھ کر وہ اس پر ظلم کیسے کر سکتا تھا۔ پھر اس کے ذہن میں ایک اور حل آیا۔ کیوں نہ وہ بھی بیٹے کے ساتھ دہلی چلا جائے۔ اب اس کا یہاں دل نہیں لگے گا۔ لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ اتنی بڑی جاگیر کے معاملات دیکھنا کوئی معمولی کام نہیں۔ یہ نہیں کہ اسے جاگیر سے کوئی دلچسپی رہ گئی ہو۔ مگر یہ سب کچھ اس کے چھوٹے ٹھاکر کا تھا۔ جب تک وہ تعلیم مکمل کر کے واپس آئے اور یہ سب کچھ سنبھالنے کے قابل ہو، تب تک اسے ہی یہ ذمے داری نبھانا تھی۔

پھر اسے ایک اور خیال آیا اور وہ جمال دین کے گھر چلا گیا۔ رنجیتا کی موت کے بعد وہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس کے گھر گیا تھا۔ وقت ایسا تھا کہ اوتار سنگھ اور وصال دین ماسٹر جی سے پڑھ رہے تھے۔

حمیدہ نے جلدی جلدی چارپائی پر گدا بچھایا، چادر پھیلائی اور تکیہ لگایا۔ ''بیٹھئے ویر جی''۔

لیکن ٹھاکر اصرار کے باوجود چارپائی پر نیم دراز بھی نہیں ہوا۔ پاؤں لٹکا کر ہی بیٹھ گیا۔ جمال دین اور حمیدہ چارپائی کے پاس موڑھے رکھ کر ان پر بیٹھ گئے۔ ''آپ نے کیوں تکلیف کی ٹھاکر جی''۔ جمال دین نے عاجزی سے کہا۔ ''مجھے بلوا لیا ہوتا''۔

''کام مجھے ہے تو میں ہی آؤں گا''۔ ٹھاکر نے کہا۔ ''کیسی عجیب بات ہے کہ مجھے تم سے کام پڑتا ہی رہتا ہے''۔

''کیا حکم ہے ٹھاکر جی۔ میں آپ کے کسی کام آ سکوں، اس سے بڑی خوشی میرے لئے کیا ہو گی''۔ جمال دین بولا۔

''حکم نہیں، درخواست ہے''۔ ٹھاکر کے لہجے میں عاجزی تھی۔ ''رنجیتا کے دیہانت کے بعد میرے پاس اوتار سنگھ کے سوا کچھ نہیں رہا ہے۔ اور اب اوتار سنگھ کے اسکول میں داخلے کا وقت آ گیا ہے''۔

جمال دین اور حمیدہ پریشان ہو گئے۔ تو یہ بات ہے۔ ان کی بھی وصال دین سے جدائی کا وقت آ گیا ہے۔ وہ پہلے بھی اس سلسلے میں آپس میں بات کرتے رہے تھے۔ لیکن ان میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وصال دین کو دہلی بھیجنے سے انکار کرتے۔ حمیدہ تو اب بھی کچھ نہ بولی۔ لیکن جمال دین نے بے حد خوش دلی سے کہا۔ ''میں نے تو پہلے بھی آپ سے کہا تھا ٹھاکر جی کہ یہ بھی آپ کا ہم پر احسان ہے۔ ورنہ ہم وصال دین کو کہاں پڑھوا سکتے تھے۔ وہ چھوٹے ٹھاکر کے ساتھ دہلی ضرور جائے گا سرکار۔ آپ بالکل فکر نہ کریں''۔

''وہ تو جائے گا جمال دین۔ مگر میں تمہارے پاس ایک اور کام سے آیا ہوں''۔

اب تو جمال دین اور حمیدہ کی تشویش کی کوئی حد نہیں تھی۔ ''کیا حکم ہے سرکار۔ فرمائیں تو''۔ جمال دین نے مرے مرے لہجے میں پوچھا۔

''اب میں اوتار سنگھ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں بھی اس کے ساتھ دہلی جانا چاہتا ہوں''۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے ٹھاکر جی۔ جاگیر کا کیا ہو گا''۔ جمال دین نے اچنبھے سے کہا۔

''ہو سکتا ہے۔ اسی لئے تو میں تمہارے پاس آیا ہوں''۔

جمال دین کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ خالی نظروں سے ٹھاکر کو تکتا رہا۔

''اب یہ سب کچھ تم سنبھالو گے جمال دین''۔

یہ جمال دین کے لئے دھماکا تھا۔ وہ اضطراری طور پر موڑھے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''مم..... میں..... میں سنبھالوں گا!''۔ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ آدھی زمین جائیداد تمہاری ہے۔ اور میں برسوں سے تمہارے حصے کا کام بھی کرتا رہا ہوں۔ اب سے آ گیا ہے کہ تم اپنا بوجھ اٹھاؤ۔ بلکہ میرے حصے کی ذمے داری بھی نبھاؤ''۔

جمال دین کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو جسم میں خون نہیں۔ ''ٹھاکر جی، آپ کے حکم پر میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ لیکن اس کام کی تو مجھ میں اہلیت ہی نہیں ہے۔ سب کچھ تباہ ہو جائے گا ٹھاکر جی۔ یہ کام تو میرے بس کا نہیں''۔ وہ بری طرح گڑگڑایا تھا۔

''آدمی کوشش کرے تو کچھ بھی کر سکتا ہے''۔

''ٹھاکر جی، اللہ نے ہر آدمی کو ہر کام کے لئے پیدا نہیں کیا''۔ جمال دین رونے لگا۔ ''میں کسان ہوں۔ زمین میں بس ہل چلا سکتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں، سب کچھ ہم نے صرف آپ کی خاطر لیا۔ آپ کا حکم نہیں ٹال سکتے تھے۔ آپ ہر سال ہمیں حصہ لا کر دیتے رہے۔ ہم سنبھال کر رکھتے رہے۔ ہم آپ کے کہنے پر بھی زمین دار نہیں بن سکے۔ صرف اس لئے کہ یہ ہمارے بس کا کام نہیں۔ پر حکم آپ کا تھا، اس لئے ٹال نہیں سکے۔ صرف آپ کی خوشی کی خاطر میں نے یہ سب قبول کیا۔ انکار کرتا تو گستاخی ہوتی۔ مگر کیا معلوم تھا کہ ایک دن آئے گا، جب مجھے آپ کو انکار کرنا پڑے گا، آج تو لگتا ہے، زندگی اکارت ہو گئی۔ کاش..... کاش ٹھاکر جی..... کاش میں آپ کے کام آ سکتا۔ پر مجھے تو کسی پر حکم چلانا آتا ہی نہیں۔ اور آپ کا کام تو بادشاہ کا کام ہے ٹھاکر جی''۔

جمال دین اب ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ ٹھاکر تڑپ کر اٹھا اور اسے گلے سے لگا لیا۔ ''چلو جمال دین، تم چنتا نہ کرو''۔ اس نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''جب تک میں موجود ہوں، سنبھال لوں گا۔ لیکن میرے بعد کیا ہو گا؟''۔

''ایسی باتیں نہ کریں ویر جی''۔ حمیدہ نے تیز لہجے میں کہا۔ ''اللہ آپ کو بہت عمر دے گا''۔

''پھر بھی، جانا تو ہر منش کو ہے کب کس کا بلاوا آ جائے''۔

''تب چھوٹے ٹھاکر ہوں گے نا''۔

''ٹھیک ہے بہنا۔ جو بھاگ میں ہے، سو تو ہو گا''۔ ٹھاکر نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

.....x.....

اب ٹھاکر پرتاپ سنگھ کو ایک ہی پریشانی تھی۔ اس کا بیٹا داخلے کا ٹیسٹ پاس کرے گا یا نہیں، اس کا داخلہ ہو بھی سکے گا۔ اس نے اس سلسلے میں کانتی پرشاد سے بات کی۔

''ماسٹر جی..... اوتار سنگھ ٹیسٹ پاس کر لے گا؟''۔ اس کے لہجے میں شک تھا۔

''کیسی بات کرتے ہیں ٹھاکر جی''۔ ماسٹر جی گویا برا مان کر بولے۔ ''چھوٹے ٹھاکر کو ابھی میٹرک کا امتحان دلوائیں تو وہ ٹاپ کریں گے۔ آپ اس ٹیسٹ کی بات کر رہے ہیں۔ آپ نے اپنے بیٹے کی لیاقت دیکھی ہی نہیں''۔

ٹھاکر کو فخر کا احساس ہوا۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ ماسٹر جی مبالغے سے کام لے رہے ہوں۔ ''آپ کو پکا یقین ہے ماسٹر جی؟''۔

''اگر اس کے خلاف ہوا تو میں پڑھانا چھوڑ دوں گا''۔

اب ٹھاکر مطمئن ہو گیا۔ اسے بیٹے سے اپنی بے خبری پر افسوس ہونے لگا۔ وہ بس اتنا جانتا تھا کہ اس کا بیٹا سوال بہت کرتا ہے۔

''لیکن ایک مسئلہ ہے ٹھاکر جی''۔ کانتی پرشاد نے اچانک کہا۔

ٹھاکر کا دل بری طرح دھڑکا۔ اب وہ مطمئن ہوا ہے تو ماسٹر جی نے جانے کون سا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ ''مجھے صرف اس بات کی فکر ہے کہ میرے بیٹے کو اسکول میں داخلہ مل جائے گا''۔

''اس طرف سے تو بے فکر رہیں۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ وصال دین وہ ٹیسٹ پاس کر سکتا ہے''۔

''کیا مطلب؟''۔

''ٹھاکر جی، چھوٹے ٹھاکر کے برعکس وصال دین کو پڑھائی میں کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ تو بس چھوٹے ٹھاکر کا سایہ ہے۔ ان کی محبت میں ان کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے اور مارے جانے سے پڑھ بھی لیتا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ اس ٹیسٹ میں کامیاب نہیں ہو سکتا''۔

''یہ تو الجھن کی بات ہے''۔ ٹھاکر نے تفکر آمیز لہجے میں کہا۔ ''اوتار سنگھ بھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اچھا ماسٹر جی، کچھ اپائے ہے اس کا؟''۔

کانتی پرشاد کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر بولے۔ ''میری تو سمجھ میں نہیں آتا''۔

''بہت بڑا فرق ہے دونوں کی قابلیت میں؟''۔ ٹھاکر نے پوچھا۔

''میں نے عرض کیا نا کہ چھوٹے ٹھاکر ابھی میٹرک کا امتحان دیں تو ٹاپ کر لیں۔ جبکہ وصال دین کی قابلیت بمشکل پانچویں تک کی ہے''۔

ٹھاکر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ تب تو مسئلہ حل ہو سکتا ہے ماسٹر جی''۔

''جی..... میں سمجھا نہیں''۔

''آپ مجھے ایک بات بتائیں۔ وصال دین کو چھٹی جماعت کے ٹیسٹ میں بٹھایا جائے تو وہ کامیاب ہو سکتا ہے؟''۔

کانتی پرشاد نے پھر کچھ دیر سوچا۔ ''میرے خیال میں یہ ممکن ہے''۔

''بس تو ٹھیک ہے۔ ہم اوتار سنگھ کو آٹھویں میں اور وصال دین کو چھٹی میں داخلہ دلائیں گے''۔ ٹھاکر نے سکون کی سانس لی۔ ''ابھی ایک ہفتہ باقی ہے۔ آپ اتنے دن میں وصال دین کو کم از کم اس حد تک پکا کر دیں''۔

www.allurdu.com

''میں کوشش کروں گا ٹھاکر جی''۔کانتی پرشاد نے کہا۔مگران کے لہجے میں یقین کی کمی تھی۔

اس شام کانتی پرشاد نے کہا۔''وصال دین،ایک ہفتہ ہے۔اس میں تیاری کرلو۔میں دیکھتا ہوں کہ تم پڑھنے میں پوری دل چسپی نہیں لیتے ہو۔تمہیں پتا ہے،اگر تمہیں داخلہ نہیں ملا تو تمہارا ایک بہت بڑا نقصان ہوجائے گا''۔

وصال دین نے کچھ کہا نہیں۔بس مستفسرانہ نظروں سے انہیں دیکھتا رہا۔

''تم گاؤں واپس آجاؤ گے اور پھر برسوں چھوٹے ٹھاکر سے نہیں مل سکوں گے''۔

یہ سن کر وصال دین ہی نہیں دہلا۔اوتار سنگھ کا چہرہ بھی فق ہوگیا۔اس نے وصال دین سے کہا۔''ویر جی،کچھ کرو۔میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا''۔

وصال دین خود بھی یہی کچھ سوچ رہا تھا۔خوف بہت بڑا محرک ہوتا ہے۔اس دن سے وصال دین کی پڑھائی کو پر لگ گئے۔

.....x.....

اس رات کسی کو نیند نہیں آرہی تھی۔حویلی میں ٹھاکر اور اوتار سنگھ کروٹیں بدل رہے تھے تو گاؤں کے اس سرے پر جمال دین،حمیدہ اور وصال دین بھی نیند سے محروم تھے۔

سونے کا ڈھونگ نبھانا ناممکن ہوگیا تو جمال دین اٹھ بیٹھا۔''حمیدہ.....تم جاگ رہی ہو نا؟''۔اس نے سرگوشی میں کہا۔

''ہاں جی۔اب تو بس اللہ کی مہربانی ہوگی،تبھی نیند آئے گی''۔حمیدہ بھی اٹھ بیٹھی۔

''ہاں۔آج تو میں سو ہی نہیں سکتا''۔

''مجھے تو لگتا ہے،اب مجھے کبھی گہری نیند نہیں آئے گی''۔حمیدہ نے آہ بھر کے کہا۔پھر رندھی ہوئی آواز میں بولی۔''کیا ضروری تھا کہ ہمارا بیٹا بھی پڑھنے کے لئے اتنی دور جاتا؟''۔

''یہ تو نصیب کی بات ہے۔جانا ہے تو جانا ہے۔اللہ صبر دیتا ہے''۔جمال دین نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔''میری نیند تو کسی اور ہی خیال سے اڑی ہے''۔

حمیدہ چونکی۔''کیا بات ہے؟''۔

''ہمارا گھر اس گاؤں میں اکیلا مسلمان گھر ہے''۔جمال دین کے لہجے میں فکرمندی تھی۔''مجھے ہمیشہ ڈر لگتا تھا کہ میرا بیٹا اچھا مسلمان نہیں بنا تو میں قیامت کے دن اللہ کو کیا منہ دکھاؤں گا۔اسی لئے میں نے خود اسے قرآن پڑھایا۔کم عمری میں نماز سکھائی۔ہمیشہ اپنی نظروں کے سامنے رکھا۔اللہ کا شکر ہے کہ وہ نماز میں کوتاہی نہیں کرتا۔مگر اب وہ دور جارہا ہے تو ڈر لگتا ہے۔قیامت کے دن شرمندگی کا سامان نہ ہوجائے''۔

''کیوں پریشان ہوتے ہو جی۔اب وہ بچہ تو نہیں ہے''۔حمیدہ نے اسے دلاسہ دیا۔''ہم ابھی اسے تاکید کریں گے تو وہ انشااللہ نہ کبھی نماز چھوڑے گا،نہ قرآن پڑھنا''۔

''یہ بات اتنی سادہ نہیں ہے حمیدہ۔چھوٹے ٹھاکر وصال دین کے بہت قریب ہے۔وہ اسے نماز،قرآن پڑھتے دیکھے گا تو پوچھے گا۔وہ سوالات بہت کرتا ہے نا۔اور میں نہیں چاہتا کہ وہ متاثر ہو۔یوں مجھے ٹھاکر جی کے سامنے شرمندگی ہوگی۔جان بھی جاسکتی ہے''۔

''تم فکر نہ کرو۔میں اسے سمجھادوں گی۔آؤ میرے ساتھ''۔

وصال دین صحن میں سو رہا تھا۔وہ دونوں وہاں چلے آئے۔حمیدہ نے نرمی سے اسے ہلایا۔''اٹھ بیٹے۔کچھ بات کرنی ہے تجھ سے''۔

وصال دین بھی سو نہیں رہا تھا۔لیکن اس کی بے قراری ماں باپ جتنی نہیں تھی۔اس کے لئے معاملہ انیس بیس کا تھا۔ایک طرف ماں باپ تھے تو دوسری طرف اوتار سنگھ تھا،جس سے وہ سوائے سونے کے وقت کے کبھی دور نہیں ہوتا تھا۔جو اس کا واحد ہم جولی،واحد دوست تھا۔اور وہ ذہنی طور پر تیار بھی تھا۔کیوں کہ اس پہلو پر غور کرتا رہا تھا۔اگر اوتار سنگھ سے دور رہنا مشکل نہ ہوتا تو اس مسئلے کا حل اس کے لئے بہت آسان تھا۔وہ پڑھائی میں دل چسپی ہی نہ لیتا۔یوں اسے اسکول میں داخلہ بھی نہ ملتا اور وہ ماں باپ سے دور بھی نہ ہوتا۔لیکن اس نے اس ایک ہفتے میں پڑھائی میں بہت زیادہ محنت کی تھی۔صرف اوتار سنگھ کی محبت میں۔اور یہی نہیں،اسے ابا کی سمجھائی ہوئی بات اچھی طرح یاد تھی۔احسان کا رشتہ.....اسے تو چھوٹے ٹھاکر سے غلام جیسی محبت کرنی ہے۔کبھی انکار نہیں کرنا کسی بات سے۔تو وہ اسے اکیلا کیسے چھوڑ دے۔

مگر اس کے باوجود ماں باپ سے دور ہونا آسان نہیں تھا۔اس کا دل بہت بوجھل تھا۔وہ اداس تھا۔اس جدائی کا خیال اسے سونے نہیں دے رہا تھا۔ماں نے ہلایا تو وہ اٹھ بیٹھا۔''کیا بات ہے اماں''۔

''کچھ ضروری باتیں سمجھانی ہیں تجھے''۔

''بولو اماں''۔

''دیکھ۔اب تو جائے گا۔ہم سے،گاؤں سے دور،چھوٹے ٹھاکر کے ساتھ رہے گا۔اب تیرے ابا پریشان ہورہے ہیں کہ کہیں تو قرآن سے،نماز سے دور نہ ہوجائے''۔

حمیدہ نے کہا۔

وصال دین نے جمال دین کو دیکھا۔''نہیں ابا۔انشااللہ ایسا نہیں ہوگا''۔اس نے مستحکم لہجے میں کہا۔''میں اس کا یہاں سے زیادہ خیال وہاں رکھوں گا''۔

تب جمال دین نے زبان کھولی۔''تو نماز کہاں پڑھے گا۔قرآن کہاں پڑھے گا؟''۔

وصال دین نے حیرت سے باپ کو دیکھا۔''کیا مطلب ابا۔جہاں رہوں گا،وہیں پڑھوں گا''۔

''چھوٹے ٹھاکر کے سامنے؟''۔

''تو اور کیا۔اس میں کوئی حرج ہے ابا؟''۔

''ہاں،حرج ہے۔میں نہیں چاہتا کہ چھوٹے ٹھاکر کے سامنے یہ سب کچھ کرے''۔جمال دین نے سخت لہجے میں کہا۔''چھوٹا ٹھاکر سوال بہت کرتا ہے،تجھے نماز پڑھتے،تلاوت کرتے دیکھے گا تو تجھ سے بھی سوال کرے گا۔اور میں نہیں چاہتا کہ تو اس سے اپنے دین کی کوئی بات کرے۔اس لئے کہ یہ بات ٹھاکر جی کو اچھی نہیں لگے گی۔ہمیں خیال رکھنا ہے کہ انہیں ہم سے کوئی شکایت نہ ہو۔ان کے احسان ہیں ہم پر''۔

''تو کوئی بات نہیں ابا۔میں اکیلے میں پڑھ لیا کروں گا''۔وصال دین نے سادگی سے کہا۔''ٹھاکر جی نے ہمارے رہنے کے لئے بڑے مکان کا بندوبست کیا ہے۔مجھے وہاں الگ کمرا ملے گا۔چھوٹے ٹھاکر کو پتا بھی نہیں چلے گا اور میں نماز بھی پڑھ لیا کروں گا اور قرآن بھی''۔

''تب تو ٹھیک ہے''۔جمال دین نے پہلی بار سکون کی سانس لی۔''لیکن وعدہ کر کہ تو نماز کبھی قضا نہیں کرے گا۔اور ہر روز قرآن بھی پڑھے گا''۔

''تم پریشان نہ ہوا ابا۔یہ میرا وعدہ ہے''۔

جمال دین نے محبت سے اسے لپٹالیا۔''بس بیٹا،مجھے اللہ کے سامنے شرمندہ نہ کرانا''۔اس نے بیٹے کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

.....x.....

وہ دہلی گئے تو ٹھاکر پرتاپ سنگھ اور جمال دین بھی ان کے ساتھ تھے۔کانتی پرشاد کی توقع کے عین مطابق اوتار سنگھ نے داخلے کا ٹیسٹ بڑی شان سے پاس کیا۔مگر اصل کارنامہ یہ تھا کہ وصال دین کو بھی چھٹی جماعت میں داخلہ مل گیا۔

ٹھاکر نے ان لوگوں کے لئے جامع مسجد کے علاقے میں مکان کا بندوبست کیا تھا۔وہ اوپری منزل کا چھ کمروں کا مکان تھا۔اوپر ایک کوٹھا تھا،جس کے ساتھ بڑی ساری چھت تھی۔وہاں پھولوں کے پودے رکھے تھے۔چنبیلی بیل دیوار پر چڑھی تھی۔مکان صاف ستھرا اور بہت اچھا تھا۔

جمال دین کو اطمینان ہوگیا کہ اس کے بیٹے کو تنہائی میسر ہے۔وہ ٹھاکر کے ساتھ گاؤں واپس گیا تو بہت مطمئن تھا۔

اس مکان میں کانتی پرشاد،اوتار سنگھ اور وصال دین کے علاوہ دو افراد اور تھے،جنہیں ٹھاکر پرتاپ سنگھ گاؤں سے لایا تھا۔کھانا پکانے کے لئے رنجنا تھی اور باہر کے کام کرنے اور سودا سلف لانے کے لئے رگھو تھا۔

www.allurdu.com

چند ہی دنوں میں زندگی کے نئے معمولات بن گئے۔

اوتار سنگھ اور وصال دین کے لئے تو دہلی میں ایک جہان حیرت تھا۔ وصال دین نے تو شہر ہی پہلی بار دیکھا تھا جب کہ اوتار سنگھ تو ایک مہینے گھوما پھرا تھا۔ چند روز بمبئی میں بھی رہا تھا۔ لیکن بہر حال وہ گاؤں میں زندگی گزارنے کا عادی تھا۔ اب دہلی شہر میں رہا تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔

دہلی بڑا بارونق شہر تھا..... خاص طور پر شام کے وقت۔ یہاں اوتار سنگھ کو گھومنے پھرنے کا شوق ہو گیا۔ اس نے ماسٹر جی سے بات کر کے ایسا معمول بنایا کہ شام کے وقت وہ آزاد ہوتا۔ اسکول سے واپسی پر وہ کھانا کھاتے، ایک گھنٹا آرام کرتے اور پھر ماسٹر جی سے پڑھنے بیٹھے جاتے۔ شام کو وہ سیر کے لئے نکلتے۔ واپس آ کر رات کا کھانا کھاتے اور سو جاتے صبح وہ بہت سویرے اٹھتے اور ماسٹر جی سے پڑھتے۔ اس کے بعد اسکول جاتے۔

ایک سال میں وہ دہلی کے چپے چپے سے واقف ہو گئے۔ اوتار سنگھ نے آٹھویں پاس کر لی اور وصال دین نے چھٹی۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ گاؤں واپس گئے۔ اوتار سنگھ اب 14 سال کا ہو چکا تھا۔

شہر میں ایک سال گزارنے کے بعد گاؤں انہیں پہلے سے بھی اچھا لگا۔ وہاں شور وغل نہیں، سکون تھا۔ وہاں آ کر اوتار سنگھ کو احساس ہوا کہ دہلی نے اسے کتنا تبدیل کر دیا ہے۔ اس ایک سال میں اس کا تجسس صرف مادی اور ظاہری چیزوں تک محدود ہو گیا تھا۔ اس نے سوچنا اور غور کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اس کے ذہن میں بہت سے سوال تھے، جن کے جواب اسے کھوجنے تھے۔ لیکن دہلی میں یہ عمل رک گیا تھا۔ اسے افسوس ہونے لگا۔ تنہائی..... اور تنہائی میں بیٹھ کر سوچنا اسے کتنا اچھا لگتا تھا۔ دہلی میں اس تنہائی کو اس نے خود چھوڑ دیا تھا۔

گاؤں میں اس نے پھر سے سوچنا شروع کر دیا۔ تبھی اسے احساس ہوا کہ دہلی میں اس نے گھومنے پھرنے، سیر کرنے میں جو وقت صرف کیا، وہ ضائع نہیں ہوا۔ اس سے تو اس کے مشاہدات میں زبردست اضافہ ہوا تھا۔ اور وہ ہمیشہ مشاہدات ہی کی بنیاد پر سوچتا آیا تھا۔ البتہ ایک کمی ضرور تھی۔ ماسٹر جی سے اس کا تعلق صرف پڑھائی تک محدود ہو گیا تھا۔ ورنہ پہلے وہ ان سے ہر طرح کی باتیں کرتا تھا۔

گاؤں میں اس کی چھٹیاں صرف اپنے نظریات کو تازہ کرنے میں گزر گئیں۔ بہر حال ایک سال کا ٹوٹا ہوا رابطہ پھر سے جڑ گیا۔

.....x.....

دہلی میں ان کا دوسرا سال بالکل مختلف تھا۔

شام کے وقت وہ گھومنے کے لئے ضرور نکلتے۔ کبھی چاندنی چوک کی طرف اور کبھی جمنا کے کنارے۔ مگر اوتار سنگھ اکھڑا اکھڑا رہتا تھا۔ اور ذرا ہی دیر کے بعد گھر واپس پہنچنے کی بات کرتا تھا۔ گھر پہنچنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں بند ہو جاتا تھا۔

وصال دیا نے باپ کی بات کا پوری طرح خیال رکھا تھا۔ وہ تنہائی میں ہی نماز پڑھتا اور تنہائی میں ہی قرآن۔ اس کے نتیجے میں نماز میں بے قاعدگی بھی ہوتی تھی۔

اسکول کا چوکی دار مسلمان تھا۔ ایک دن اس نے اسے ٹوک دیا۔ ''تم تو مسلمان ہو۔ نماز کیوں نہیں پڑھتے؟''۔

وصال دین کے لئے تو وہ گالی تھی۔ اسے بہت برا لگا۔ تاہم اس نے تحمل سے کہا۔ ''نماز تو میں پڑھتا ہوں''۔

احمد علی نے کہا۔ ''میں نے تو تمہیں کبھی دیکھا نہیں نماز پڑھتے''۔

''تو نماز کیا دکھا کر پڑھتے ہیں؟''۔ وصال دین نے چڑ کر کہا۔

''دکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مگر سب کو پتا چل جاتا ہے''۔

''وہ کیسے؟''۔

''بھئی تمہارا گھر بھی جامع مسجد کے قریب ہے۔ مسجد میں نماز پڑھو گے تو دوسروں سے ملو گے۔ انہیں پتا بھی چل جائے گا''۔ احمد علی بولا۔ ''لیکن میں نے تو تمہیں کبھی مسجد میں نہیں دیکھا''۔

اب وصال دین حیران تھا۔ ''میں مسجد کبھی گیا ہی نہیں''۔

''تو نماز کہاں پڑھتے ہو؟''۔ احمد علی نے حیرت سے پوچھا۔

''گھر میں پڑھتا ہوں''۔

''یہ تو بہت بری بات ہے۔ اتنے قریب مسجد ہے اور تم وہاں نہیں جاتے۔ پتا ہے، جماعت سے نماز پڑھنے کا اجر 70 گنا زیادہ ہے''۔

وصال دین کو یہ سب معلوم ہی نہیں تھا۔ باپ نے بھی بتایا ہی نہیں۔ گاؤں میں مسجد تھی بھی نہیں۔ اس نے احمد علی کو یہ سب بتایا۔

احمد علی نے تاسف سے سر ہلایا۔ ''وہ تو مجبوری تھی، تمہارا باپ بڑا آدمی ہے کہ اس نے اس حال میں بھی تم کو یہ سب کچھ سکھا دیا مگر یہاں اور بات ہے۔ مسلمان بہت ہیں۔ مسجد میں بھی ہیں۔ اذان ہوتی ہے جو کہ بلاوا ہے۔ چلو، میں تمہیں سکھاؤں گا۔ آج ظہر کے وقت مجھے مسجد کے باہر ملنا''۔

اس روز وصال دین ظہر پڑھنے احمد علی کے ساتھ گیا۔ اس کا دل خوش ہو گیا۔ یہ تو بہت آسان تھا۔ مسجد گئے اور نماز پڑھ لی۔ مسجد میں قرآن بھی تھا۔ وہیں بیٹھ کر پڑھ لیا۔ گھر میں تو اوتار سنگھ کی وجہ سے نماز کبھی قضا بھی ہو جاتی تھی۔

اس کی مشکل آسان ہو گئی۔ بس اسے یہ فکر رہتی تھی کہ وہ چپکے سے نماز پڑھنے کے لئے نکلتا تھا۔ اگر اس دوران اوتار سنگھ اس کی غیر حاضری کو محسوس کر لے اور اس سے پوچھے کہ وہ کہاں تھا، تو اسے جھوٹ بولنا پڑے گا۔ لیکن اس کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ اوتار سنگھ تو خود میں گم رہنے لگا تھا۔

اوتار سنگھ نے سلسلہ وہیں سے جوڑا جہاں چھوڑا تھا۔ یہ تو وہ سمجھ چکا تھا کہ کثرت میں انتشار ہے اور وحدت میں ارتکاز۔ اس نے بہت سارے دیوتاؤں کے وجود سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے نزدیک یہ یقینی تھا کہ کائنات کا نظام ترتیب دے کر، اسے قائم کرنے والا کوئی ایک ہے..... صرف ایک۔ اس کی کچھ صفات بھی وہ جان چکا تھا۔ ورنہ یہ سب کچھ اتنا منظم نہ ہوتا۔

وہ ایک شہر کی، ایک ملک کی مثال پر غور کرتا۔ تاریخ کے اوراق گواہی دیتے تھے کہ بادشاہ قانون بناتا تھا۔ اس پر عمل درآمد کے لئے کارندے ہوتے تھے۔ قانون پر کبھی پوری طرح عمل درآمد نہیں ہوتا تھا۔ کارندے کبھی رشوت کی خاطر، کبھی کسی بڑے آدمی کی سفارش پر اور کبھی اپنے کسی عزیز رشتے دار کی خاطر لوگوں کو قانون سے مستثنا کرتے رہتے تھے۔ اب ظاہر ہے، بادشاہ کیسا ہی عادل و منصف ہو، ان کے پل پل کی اور اپنی مملکت کے چپے چپے کی خبر تو نہیں رکھ سکتا تھا۔ اور یہ خرابی طاقت کے ارتکاز اور وحدت اقتدار کے باوجود تھی۔

یہاں سے سوچ کے اور دروازے کھلے۔ کائنات بہت بڑی تھی۔ آدمی کو تو اس کے بہت چھوٹے سے حصے کا علم تھا۔ تو جو کائنات کا نظام چلا رہا تھا، اس کے تو کارندے اتنے ہوں گے کہ ان کا شمار ہی نہیں ہوگا۔ تو پھر کہیں کوئی بدنظمی کیوں نہیں ہوتی؟ کیوں؟

اس کے جواب کا سراغ اسے اپنے دکھ سے ملا۔ اسے یاد تھا جب ماں کا موت کا غم وہ بھولا تھا، تب اس نے سمجھا تھا کہ اوپر والا اپنی مخلوق کی، ہر منش کی الگ الگ خبر رکھتا ہے۔ وہ ان سے واقف ہے۔ ان کی ہر کم زوری ہر خوبی سے آگاہ ہے۔

تو اس کا مطلب تھا کہ وہ پوری کائنات پر، ہر چیز پر نظر رکھتا ہے۔ اپنے کارندوں پر بھی، جن کے سپرد کائنات کا نظام ہے۔ اور اس کے کارندے یہ بات جانتے بھی ہیں۔ تبھی تو کوئی گڑبڑ نہیں ہوتی۔

تو یہ طے ہو گیا کہ وہ ایسا دیکھنے والا ہے کہ ہر پل ہر جگہ کا علم رکھتا ہے۔ بہ یک وقت سب پر نظر رکھتا ہے۔ اس کے دیکھنے، اس کے سننے اور اس کے جاننے کی کوئی حد نہیں۔ اس سے کچھ چھپا نہیں۔ اس کے ساتھ ہی اوتار سنگھ کو عجیب خیال آیا۔ اس کا مطلب ہے کہ اوپر والے کی کوئی ذاتی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔ نہ کھانے پینے کی، نہ آرام کی، نہ سونے کی۔ اور اسے تھکن بھی نہیں ہوتی ہوگی۔ اور اس کا دیکھنا آنکھ کا، منش کا دیکھنا نہیں۔ منش کی نظر تو محدود ہے۔ ایک حد سے آگے نہیں جاتی۔ ایسے ہی اس کا سننا کان کا سننا نہیں۔ فاصلہ زیادہ ہو تو منش تک آواز نہیں پہنچتی۔ ان کا دیکھنا، اس کا سننا اور اس کا جاننا لامحدود ہے۔ آدمی صرف ایک طرف دیکھتا ہے جب کہ وہ ہر طرف دیکھتا ہے۔ وہ زمین کے اندر تک دیکھتا ہے۔ تب ہی تو پوری کائنات سے باخبر رہتا ہے۔

اردو فینز ڈاٹ کام
www.allurdu.com

چند روز بعد اوتار سنگھ نے ایک اور زاویئے سے سوچنا شروع کیا۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ سائنس اس اوپر والے کی سوچ ہو۔ وہی اصل سائنس دان ہو۔ اس صورت میں اسے بہت کارندوں کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔ زمین پر چلنے والے سب جان دار، چاند ستارے، سورج..... یہ پورا نظام..... یہ سب اس کی ایجاد ہے۔ یہ سب کچھ جیسے چابی سے چل رہا ہے۔ سورج، چاند، ستارے سب اپنے وقت پر نکلتے ہیں۔ اپنے طے شدہ راستے پر چلتے ہیں۔ اپنے وقت پر غروب ہوتے ہیں۔ ایک سیکنڈ کا بھی فرق نہیں پڑتا۔ تو یہ کون سی بڑی بات ہے۔ منش نے کتنی چیزیں ایسی بنائی ہیں۔ چابی سے چلنے والے کھلونے۔ جب تک چابی ختم نہ ہو چلتے رہتے ہیں۔ اور گھڑی..... جس وقت کا الارم لگا ہو، اس وقت گھنٹی بجنے لگتی ہے۔ اگر منش یہ سب کچھ بنا سکتا ہے تو وہ کیا کچھ بنائے گا، جس نے خود منش کو بنایا ہے۔

مہینوں وہ اس پر سوچتا رہا۔ اردگرد..... مظاہر فطرت کو دیکھتا تو وہ اس تھیوری کا اور قائل ہو جاتا۔ اسے اس بات پر یقین ہو گیا کہ انسان کی سائنس کا آغاز ہی مظاہر فطرت کے بارے میں سوچنے سے ہوا ہے۔ اور اشارے اسے اپنے وجود کے اندر سے ملے ہوں گے۔

اس آخری خیال کی اس کے پاس کوئی وضاحت نہیں تھی۔ مگر یہ خیال خود ایک وضاحت تھا۔ یہ خیال اسے کیوں آیا۔ سب کو تو یہ خیال نہیں آیا۔ ورنہ دنیا میں ماسٹر جی جیسے سائنس کے لوگ نہیں ہوتے۔ یہ خیال بھی اس کے وجود کے اندر سے ملنے والا اشارہ ہے۔ اسے سوچنے کی دعوت دے رہا ہے۔

وہ مظاہر فطرت پر سوچتا رہا۔ زندگی کی سب سے پہلی ضرورت..... بلکہ شرط ہوا تھی۔ اور وہ سب کے لئے مفت تھی۔ اس پر کسی کی اجارہ داری نہیں تھی۔ اس پر کوئی قبضہ نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی کسی کی ہوا نہیں روک سکتا تھا۔ کیوں؟ اس لئے کہ زندگی اوپر والے کا حکم تھا۔ اس نے اسے منقطع کرنے کا اختیار کسی کو نہیں دیا تھا۔

سائنس بتاتی ہے کہ انسان سانس کے ذریعے ہوا میں سے آکسیجن اندر لیتا ہے اور باہر کاربن ڈائی آکسائیڈ نکالتا ہے۔ ہوا ایک ایسا عنصر جو زمین کی فضا پر محیط ہے۔ ہوا مستقل طور پر گردش میں رہتی ہے۔ اس کے دباؤ میں کمی بیشی سے موسم پر اثر پڑتا ہے۔ اس کی ایک خاص مقدار ہے، جو گردش میں ہے۔

اب ایسے میں اربوں انسانوں کے سانس لینے کے نتیجے میں قدرتی طور پر ہوا کی ترکیب بری طرح بگڑتی۔ اربوں انسان ہر لمحے ہوا میں سے آکسیجن چوس کر کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کرتے ہیں۔ اگر یہ معاملہ یونہی چلتا رہے تو آکسیجن ختم ہو جائے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ بہت بڑھ جائے۔ نتیجہ؟ انسانوں سمیت تمام جان دار ختم ہو جائیں۔

اس مقام پر پہنچ کر اوتار سنگھ اش اش کر اٹھا۔ اسے کہتے ہیں نظام..... ایک مکمل اور مربوط نظام۔ اس نظام کو قائم کرنے والا سب کچھ جانتا ہے۔ وہ وقت کے، صدیوں کے آر پار دیکھتا ہے۔ اسی لئے ہر مسئلے کا حل اس کے پاس ہوتا ہے۔ اس نے درخت، پودے، پھل پھول، ہر طرح کی نباتات سے دنیا کو آراستہ بھی کیا اور آکسیجن کا مسئلہ بھی حل کر دیا۔ کتنی سادہ اور آسان ترکیب تھی..... مگر صرف ایک زبردست اور ہر علم پر حاوی ہستی کے لئے! نباتات کا سسٹم اس نے یہ رکھا کہ وہ جان داروں کے برعکس ہوا سے کاربن ڈائی آکسائیڈ جذب کرتی ہیں اور آکسیجن خارج کرتی ہیں۔ لیجئے..... مسئلہ حل ہو گیا۔ ہوا میں آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائیڈ کے تناسب میں معمولی سی..... بہت معمولی سی کمی بیشی تو ہو سکتی ہے۔ مگر ان کی مقدار میں بڑا فرق نہیں پڑ سکتا۔

اوتار سنگھ نے دیکھا کہ یہ سارا چکر کا معاملہ ہے۔ ایک چیز سے دوسری چیز بنتی ہے اور دوسری چیز سے پھر پہلی چیز۔ رات کے پیچھے دن لگا ہے اور دن کے پیچھے رات۔ اسے اماں کی بات یاد آئی۔ انہوں نے کہا تھا رات نہ ہوتی تو ہم آرام کیسے کرتے۔ اور دن نہ ہوتا تو ہم کام کیسے کرتے۔ اماں پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ لیکن عقل مند تھیں۔ کیسی سادہ، مگر سچی بات کہی تھی انہوں نے۔ ہاں..... اب وہ اس بات سے اور باتیں سمجھ سکتا تھا۔ اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ دن اور رات نہ ہوتے تو وقت کی پیمائش نہیں ہو سکتی تھی۔ دن رات نہ ہوتے تو کیلنڈر نہ ہوتا۔ یکسانیت ہوتی، ٹھہراؤ ہوتا، جو کہ زندگی کی نہیں، موت کی علامت ہے..... زندگی کی رونق، اس کا لطف تو تغیر اور تبدل سے ہے۔

پھر موسم تھے۔ گرمی..... گرمی کے بعد سردی اور پھر گرمی۔ اور وہ بھی ایک دوسرے کے بعد ایک دم نہیں آتے تھے۔ ورنہ آدمی کے لئے ایک کے بعد دوسرے کو قبول کرنا آسان نہ ہوتا۔ گرمی کے بعد موسم میں ہلکی سی، بتدریج تبدیلی تا کہ آدمی کے لئے قبول کرنا آسان ہو جائے۔ وہ خزاں ہوتی تھی۔ اور سردی کے بعد ہلکی سی بتدریج تبدیلی بہار تھی۔ یہ ایک سال میں وقت کے چار ذائقے تھے۔ پھر اس میں بھی تنوع تھا۔ گرمی کی بارش اور سردی کی بارش۔ اوپر والا کتنا مہربان تھا۔ اس نے انسان کو اکتاہٹ کا شکار ہونے سے بچانے کے لئے کتنا اہتمام کیا تھا۔ اوتار سنگھ نے باری باری تصور کیا کہ صرف ایک موسم میں جی رہا ہے۔ صرف تصور میں ہی اس پر مر جانے کی حد تک گھبراہٹ اور اکتاہٹ طاری ہو گئی۔

چکر کی..... سائیکل کی ایک اور بہت بڑی مثال پانی تھا۔ پانی کا سب سے بڑا ذخیرہ سمندر تھا۔ اتنا بڑا ذخیرہ کہ سمندر میں پانی کی مقدار کا اندازہ کرنا بھی ناممکن تھا۔ اس کی گہرائی بھی نامعلوم تھی۔ لیکن اس کا پانی بہت کھاری، بلکہ کڑوا تھا۔ کسی کام بھی نہیں آ سکتا تھا۔ نہ پینے کے، نہ گھریلو کام کاج کے اور نہ آب پاشی کے۔ اس نے خود چکھ کر دیکھا تھا۔

کام کا پانی دریا، جھیل، ندی اور چشموں کی شکل میں تھا۔ یہ سب چیزیں آبادی کے، بستیوں کے درمیان بہتی تھیں۔ ان کے پانی سے انسانوں کی مختلف ضرورتیں پوری ہوتی تھیں۔ پانی ایک ایسی بنیادی ضرورت تھا، جس کے بغیر زندگی ناممکن تھی۔ مگر پانی کا استعمال بہت زیادہ تھا۔ جب کہ ذرائع بہت محدود تھے۔ یہاں اوپر والے سائنس دان کا بنایا ہوا ایک اور عظیم نظام سامنے آتا تھا۔

سمندر پر دھوپ پڑتی تو عمل تبخیر ہوتا۔ پانی بخارات میں تبدیل ہوتا۔ ہلکے ہونے کی وجہ سے بخارات اوپر اٹھتے اور بادلوں کی شکل اختیار کرتے۔ پھر پانی کو اٹھائے ہوئے یہ بادل ہوا کے دوش پر سفر کرتے۔ اور ان کے پاس میٹھا اور صاف پانی ہوتا۔ کیوں کہ نمک اور دیگر کثافتیں عمل تبخیر کے نتیجے میں ساحل پر ہی رہ گئی ہوتی تھیں۔ یوں بارش کے ذریعے یہ صاف ستھرا میٹھا پانی انسانوں تک پہنچتا۔ یہ گویا ایک عظیم فلٹر پلانٹ تھا۔ اور اتنا عظیم منصوبہ کوئی زبردست اور ذی علم ہستی ہی بنا سکتی تھی۔

پھر اوتار سنگھ نے ارتقائے انسان پر غور کرنا شروع کیا۔ یہ تو اس نے بہت پہلے سمجھ لیا تھا کہ اتفاق کوئی چیز نہیں۔ جو آدمی کی سمجھ میں نہ آئے۔ جس کی کوئی ظاہری وجہ نظر نہ آئے، وہ اسے اتفاق قرار دیتا ہے..... صرف اپنی کم علمی چھپانے کے لئے۔ انسان کی ترقی ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ بہت محدود علم رکھتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ بے علم تھا۔ پھر بتدریج اسے علم حاصل ہوتا گیا۔ مگر اب اتنی ترقی کے باوجود وہ یہ دعوا نہیں کر سکتا تھا کہ سب کچھ جان چکا ہے اور وہ یہ دعوا کبھی نہیں کر سکے گا۔

سوال یہ تھا کہ انسان نے علم کیسے حاصل کیا۔ انسانی ارتقا کی تاریخ گواہی دیتی تھی کہ انسان کے کسب علم کی بنیاد مشاہدے اور اتفاق پر ہے۔ ہمیشہ انہی کی وجہ سے اسے کوئی خیال سوجھا۔ پھر اس نے اسے تجربات کی کسوٹی پر پرکھ کر اس کی تصدیق کی اور اسے دوسروں کی طرف بڑھایا۔ اب ان میں سے اتفاق کو اوتار سنگھ مانتا ہی نہیں تھا۔ اس کے نزدیک اتفاق کائنات کا نظام قائم کرنے اور چلانے والے کی منصوبہ بندی تھی، جو نہ دکھائی دیتی تھی اور نہ ہی سمجھ میں آتی تھی۔

اتفاق کو نہ ماننے کی معقول وجہ تھی اس کے پاس۔ بچپن سے اس کے ساتھ ایسا ہوتا تھا..... اور اکثر ہوتا تھا۔ اس کے دل میں بیٹھے بیٹھے خیال آتا کہ راجو آئی ہے۔ راجو سے اسے بڑی انسیت تھی۔ اگلے ہی لمحے بند دروازہ کھلتا اور راجو نمودار ہوتی۔ ایسا بہت سے لوگوں کے معاملے میں ہوا۔ بارہا اس نے اعلان کر دیا۔ پھر کسی نے پوچھا..... تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ ''پتا نہیں۔ بس مجھے خیال آیا تھا''۔ وہ جواب دیتا۔

پھر اس نے خود لوگوں سے پوچھنا شروع کیا کہ اسے کیسے معلوم ہو جاتا ہے۔ سب اس پر متفق تھے کہ یہ اتفاق ہے، جو اس کے ساتھ ہوتا ہے۔ بلکہ یہ تقریباً سبھی کے ساتھ ہوتا تھا۔ کسی کے ساتھ کم اور کس کے ساتھ زیادہ۔

اب اوتار سنگھ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی۔ اتفاق ایک بار ہو جائے، دو بار ہو جائے۔ بار بار ہو تو اسے اتفاق نہیں کہتے۔ اور پھر اس کا اندازہ ایک بار بھی غلط نہیں ہوا تھا۔ اس نے ماسٹر جی سے اس پر بحث کی تھی۔ مگر وہ بس ''اتفاق ہے'' کہہ کر بات ختم کر دیتے تھے۔

پھر ایک دن وہ اماں اور ویر جی کے پاس ان کے گھر میں بیٹھا تھا۔ اچانک اس کے منہ سے نکلا۔ ''اماں، چاچا جی آ رہے ہیں، ویر جی، دروازہ کھولو''۔

حمیدہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''نہیں بیٹا، ابھی ان کے آنے کا وقت نہیں ہوا ہے''۔

''نہیں اماں، چاچا جی آ رہے ہیں''۔

حمیدہ نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ ''تمہارے کان بج رہے ہیں بیٹا''۔

مگر اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔ وصال دین نے دروازہ کھولا۔ سامنے چاچا جی آ گیا

www.allurdu.com

حمیدہ اٹھ کر اس کی طرف لپکی۔ ''کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟''۔

''کچھ نہیں۔ صبح ہلکا سا بخار تھا۔ اب تیز ہو گیا۔ مس ویدجی سے دوا لیتا ہوا آیا ہوں۔ انہوں نے کہا ہے کہ آرام کروں''۔

جمال دین اندر کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔

حمیدہ اوتار سنگھ کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ ''تمہیں کیسے پتا چل گیا تھا بیٹے؟''۔ اس نے اس سے پوچھا۔

''پتا نہیں اماں۔ بس مجھے معلوم ہو جاتا ہے خود بخود''۔

''قدموں کی چاپ سنائی دی تھی؟''۔

''نہیں اماں۔ بس میرے دل میں خیال آیا تھا اچانک''۔ اوتار سنگھ نے کہا۔

''پہلے بھی ایسا ہوا ہے کبھی؟''۔ حمیدہ تفتیش کرتی رہی۔

''ہوتا رہتا ہے اماں''۔ اوتار سنگھ نے بے پروائی سے کہا۔ ''کوئی نہیں بتاتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ سب کہتے ہیں، یہ اتفاق ہے''۔

حمیدہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اسے کیا کیا کچھ یاد آ گیا۔ ننھا اوتار سنگھ، جو بھوکا تھا۔ مگر ماں کی چھاتیوں سے ابلتا ہوا دودھ قبول نہیں کر رہا تھا۔ اور اس نے حمیدہ کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ جیسے قسم کھائی ہوئی ہو کہ دودھ پیئے گا تو بس اس کا پیئے گا۔ اور اس نے اپنی ضد پوری کر کے چھوڑی۔ ہاں، اس کے بعد ماں کا دودھ بھی قبول کر لیا۔

تو وہ شروع ہی سے غیر معمولی بچہ تھا۔ ورنہ کون سوچ سکتا ہے کہ راج پوت کا بچہ مسلمان عورت کا دودھ پیئے۔ اور اتنا سا ناسمجھ بچہ..... اور ضد ایسی سمجھ داری کی۔ اللہ کے بھید اللہ ہی جانے۔

''تم ہی بتاؤ اماں، میرے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے؟''۔ اوتار سنگھ نے کہا۔

''اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں بیٹے''۔ حمیدہ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''جو لوگ صاف ستھرے ہوں، صاف ستھرے رہیں، اللہ ان سے خوش ہوتا ہے اور ان کے بہت قریب ہوتا ہے۔ اور جس سے وہ خوش ہوتا ہے اسے اپنے علم میں سے جتنا چاہے دے دیتا ہے۔ تم خوش نصیب ہو بیٹے۔ اللہ نے تمہیں اپنے علم میں سے کچھ دے دیا ہے''۔

اس بیان سے اوتار سنگھ کے ذہن میں کئی سوال اٹھے۔ وہ ذہنی طور پر بہت مرتب بچہ تھا۔ اس نے ان سوالوں کو ترتیب میں رکھ کر بات شروع کی۔ ''ہاں اماں، صاف ستھرا تو میں رہتا ہوں۔ یہ اتنی بڑی بات ہے کیا؟''۔

''تم صاف ستھرا رہنا کسے سمجھتے ہو؟''۔ حمیدہ نے اس سے الٹا سوال کیا۔

''میں تنی دن بعد نہاتا ہوں۔ کپڑے میلے ہونے سے پہلے بدل کر صاف ستھرے کپڑے پہنتا ہوں''۔

''یہ تو ایک حصہ ہے صاف ستھرے پن کا''۔ حمیدہ بولی۔ ''اپنے جسم کو پاک صاف رکھنا، روز نہانا، اور صاف کپڑے پہننا۔ لیکن آدمی کو اندر سے بھی صاف ستھرا رہنا چاہئے''۔

''اندر سے؟''۔ اوتار سنگھ نے حیرت سے کہا۔

''ہاں بیٹے۔ خیال اندر ہی تو پیدا ہوتا ہے.....''۔

یہ بات اوتار سنگھ کی سمجھ میں آ گئی۔ یہ سچ تھا۔ خیال تو دل میں آتا تھا.....

''دل میں..... اور اس کے لئے خون کا صاف ستھرا ہونا بھی ضروری ہے''۔ حمیدہ نے اپنی بات پوری کی۔

''تو دل کو اور خون کو کیسے صاف کیا جا سکتا ہے۔ دھویا تو نہیں جا سکتا انہیں''۔ اوتار سنگھ نے اعتراض کیا۔

''خون غذا سے بنتا ہے۔ خون کی صفائی اس میں ہے کہ آدمی حلال کھائے۔ حرام نہ کھائے''۔

''یہ حلال حرام کیا ہوتا ہے اماں؟''۔

''اپنی محنت کی کمائی حلال ہے۔ کسی کی چیز بغیر اجازت لینا، چوری ہے، بے ایمانی، کوئی بھی ناجائز کام..... یہ سب حرام ہے''۔ حمیدہ نے کہا۔ ''پھر اندر روح بھی ہوتی ہے.....''۔

''آتما؟''۔ اوتار سنگھ نے جلدی سے کہا۔

''ہاں۔ آتما کو پاک صاف رکھنے کے لئے اچھے کام، نیکیاں ہوتی ہیں۔ آدمی سچ بولے، لوگوں کے کام آئے..... اور برے کاموں سے بچے۔ جھوٹ نہ بولے۔ کسی انسان کو تکلیف نہ پہنچائے۔ یوں آدمی صاف ستھرا ہوتا ہے۔ تو پھر اللہ اس سے خوش ہوتا ہے۔ اس کے قریب ہوتا ہے۔ اس پر مہربان ہوتا ہے اور اسے کچھ بھی دے دیتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے علم میں سے بھی کچھ دے دیتا ہے''۔

''علم میں سے کچھ؟''۔ اوتار سنگھ نے دوسرا نکتہ اٹھایا۔

''ہاں، کچھ۔ بہت تھوڑا''۔

''تو اللہ کے پاس بہت علم ہے؟''۔

''بہت نہیں، سارا علم''۔ حمیدہ کے لہجے میں خفگی تھی۔ ''علم سارے کا سارا اللہ کا ہے۔ اور جو وہ بہت تھوڑا علم دیتا ہے تو وہ بھی بندے کے لئے بہت زیادہ ہوتا ہے''۔

''تو اللہ مجھ سے خوش ہے؟ میرے بہت قریب ہے؟''۔

''ہاں بیٹے۔ بس تم ہمیشہ اچھے رہنا''۔

وہ ساری باتیں اوتار سنگھ کے دل میں اتر گئی تھیں۔ اس دن کے بعد وہ صفائی پر اور توجہ دینے لگا۔ وہ دن میں دو بار نہاتا۔ سچ بولتا۔ تاکہ اللہ اس سے خوش رہے۔ مگر پھر کچھ عرصے کے بعد اماں نے اس سے اللہ کی باتیں کرنا چھوڑ دیا۔ بہرکیف اس کے ساتھ جب بھی ایسی کوئی بات ہوتی۔ وہ خوش ہوتا کہ اللہ اب بھی اس سے خوش ہے..... اس کے قریب ہے۔ یہ نکتہ وہ بھی نہیں بھولا۔

تو وہ اتفاق کو کیسے مان سکتا تھا۔ انسانی ارتقا کی تاریخ بتاتی تھی کہ اوپر والے نے دنیا بنائی، جاندار پیدا کئے، نباتات اگائی اور ایک مکمل سسٹم بنایا۔ اس نے انسان کو پیدا کر کے یونہی نہیں چھوڑ دیا۔ اس نے اسے سکھایا بھی۔ وہ قدرت والا، بہت زبردست اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اس لئے اسے آدمی کے سامنے آنے، اس سے اپنی آواز میں بات کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے مظاہر فطرت کے ذریعے اسے بہت کچھ سکھایا۔ اور اس کا تعلیم دینے کا سب سے بڑا ذریعہ خیال ہے، جو وہ جب چاہے، کسی کے دل میں ڈال دیتا ہے۔ کم علم لوگ جو صرف اپنی حسوں پر یقین کرتے ہیں، اسے اتفاق کہتے ہیں۔

آدمی کو کشش ثقل کا علم کیسے ہوا؟ نیوٹن کو کتاب پڑھنی تھی۔ وہ اتفاق سے ایک درخت کے نیچے جا بیٹھا۔ اتفاق سے ایک سیب شاخ سے ٹوٹ کر اس کے سر پر گرا۔ تب نیوٹن نے غور کیا اور زمین کی کشش کو دریافت کیا۔ یہ بیان سائنس کا ہے۔ لیکن دوسرے زاویئے سے دیکھیں تو اوپر والے کو یہ منظور تھا کہ آدمی کو زمین کی کشش کے بارے میں بتائے۔ وہ نیوٹن کو کتاب پڑھنے کے لئے درخت کے نیچے لے گیا۔ ورنہ نیوٹن اپنے کمرے میں بیٹھ کر بھی پڑھ سکتا تھا۔ پھر اس نے سیب گرایا۔ پھر نیوٹن کے دل میں خیال پیدا کیا۔ تب یہ دریافت ہوئی۔ اب اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی انسانوں کے سامنے درخت سے پھل گرتے رہے ہیں۔ کتنوں نے غور کیا کہ ایسا زمین کی کشش کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہ تو اب بھی کوئی نہیں سوچتا۔

اور ایسے ہی اتفاق سے ارشمیدس نے کثافت کا اصول دریافت کیا۔ ورنہ آج بھی کتنے لوگ روز دریا میں، سمندر میں نہاتے ہیں۔ کسی کو یہ خیال نہیں آتا۔ لیکن ارشمیدس کا دریافت کردہ کلیہ تمام انسانوں کے لئے کتابوں میں محفوظ ہو گیا۔

علم سے محروم انسان مشقت کی زندگی گزارتا تھا۔ اس نے پرندوں سے گھر بنانا سیکھا۔ درختوں سے اسے لباس کا خیال آیا۔ جھنجلاہٹ میں کسی جانور کو پتھر مارا اور اس کا نتیجہ دیکھ کر اس نے پتھر سے ہتھیار اور اوزار بنائے۔ پرندوں کو اڑتے دیکھ کر اسے اڑنے کا شوق ہوا۔ لکڑی کو پانی میں نہ ڈوبتے دیکھا تو کشتی کا خیال سوجھا۔ چیونٹی کو بوجھ اٹھا کر چلتے دیکھا تو جانوروں سے بار برداری کا کام لیا۔ غرض ہر دریافت، ہر ایجاد کے پیچھے صرف اور صرف مشاہدے اور خیال کی طاقت تھی۔ اور خیال کبھی اجتماعی نہیں تھا۔ ہمیشہ کسی فرد کو خیال سوجھا اور اس نے کچھ دریافت یا ایجاد کیا اور پھر اپنی تعریف کے لئے، خود کو نمایاں کرنے کے لئے اس کے بارے میں دوسروں کو بتایا۔ اگر خیال کوئی عام چیز ہوتا تو بہ یک وقت بہت سارے لوگوں پر اترتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی قوت ہے، جو کسی منتخب شخص کو کوئی ایسا خیال سونپتی ہے۔ یہ علم کا ذریعہ ہے۔

اوتار سنگھ کی سمجھ میں اماں کی بات پوری طرح آ گئی کہ علم سارے کا سارا اللہ کا ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے، اسے بہت..... بہت تھوڑا سا علم دیتا ہے۔ آدمی کو وہ بہت زیادہ لگتا ہے۔ لیکن وہ علم کے سمندر کے ایک قطرے سے زیادہ نہیں ہوتا۔ مگر بے خبر انسان کو بہت زیادہ لگتا ہے۔

خیال کی طاقت کے بارے میں سوچتے ہوئے اوتار سنگھ کے سامنے ایک اور رخ آیا۔ انسان کی ترقی خیال کے دم سے تھی۔ تو دوسری طرف اس کے مصائب اور دنیا میں شر اور فساد کا ذمے دار بھی خیال ہی تھا..... خیال بد۔ اس کے تحت آدمی برے کام کرتا تھا۔ دوسروں سے ان کا حق چھیننے اور اپنی ہوس کی خاطر سازشیں سوچتا اور کرتا۔ دوسروں کو اپنا غلام بنانے کی کوشش میں ہی جنگیں ہوتی تھیں۔ چوری، ڈاکے، قتل، یہ سب میرے خیال کی وجہ سے تھا۔

اس بارے میں سوچ کر وہ الجھنے لگا۔ کیا اوپر والے کے علاوہ کوئی اور طاقت بھی ہے..... اس سے متصادم اس کی مخالف، جو انسان کے دل میں برا خیال ڈالتی ہے؟ یہ تسلیم کرتا تو اس کے اب تک کے اخذ کئے ہوئے نتیجے پر اثر پڑتا۔ کائنات کے منتظم اعلیٰ کی اپنی تلاش میں وہ یہاں تک پہنچا تھا کہ وہ ایک مطلق العنان ہستی ہے، جسے چیلنج کرنے والا کوئی نہیں۔ اب وہ اس میں ترمیم کرتا تو سب کچھ بکھر جاتا۔ اور اس کا ذہن اس طرح کا تھا کہ وہ ہر چیز پر سوچتا تھا۔ نظریں کبھی نہیں چراتا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی اب تک کی تلاش رائیگاں ہونے والی ہے۔

وہ سوچتا رہا!

اچانک اسے ایک خیال آیا۔ اماں نے کہا تھا کہ آدمی صاف ستھرا رہے، اچھے کام کرے، برے کاموں سے بچے تو اللہ اس سے خوش ہوتا ہے، اس کے قریب ہوتا ہے اور اسے انعام دیتا ہے۔ تو اگر معاملہ برعکس ہو تو کیا ہو گا؟ یعنی آدمی گندا رہے، برے کام کرے اور اچھے کاموں سے بچے تو اللہ اس سے ناراض ہو گا، اس سے دور ہو جائے گا اور اسے سزا دے گا۔ تو یہ برا خیال سزا بھی ہو سکتا ہے۔

یہ دلیل معقول اور موثر تھی۔ اس سے اوپر والے کی اور صفتیں بھی سامنے آتی تھیں۔ وہ انتقام لینے والا بھی ہے۔ برے کو اور برا کر دیتا ہے۔ وہ غصے والا بھی ہے سزا بھی دیتا ہے۔ علم دیتا ہے۔ مگر گمراہ بھی کر دیتا ہے۔

وہ مطمئن تو ہوا، مگر پوری طرح نہیں۔ برائی کی قوت والا تصور وہ مسترد نہیں کر سکا تھا۔

پھر اس کی تلاش حق کی گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔ اس کا بنیادی سبب اردو شاعری بنی تھی..... اور اس کے بعد عشق!

.....x.....

صحیح معنوں میں اردو شاعری سے اس کا واسطہ اب نویں جماعت میں پڑا تھا۔ میر کو پڑھا تو پہلی بار اسے اندازہ ہوا کہ شاعری میں کتنی زیادہ قوت ہے اور وہ کیا تحرک پیدا کرتی ہے۔ اور میر کی شاعری تو عجیب تھی۔ سکوت بھی طاری کرتی اور اس کے ساتھ تحرک بھی دیتی۔ آدمی شعر پڑھتا اور بیٹھے کا بیٹھا رہ جاتا۔ وقت سمیت گردوپیش کی ہر چیز جیسے ساکت ہو جاتی۔ پھر اندر ایک تحرک جاگتا۔ دل چاہتا کہ اداس ہو جائیں

www.allurdu.com

اور وہ اداس ہو جاتا..... بغیر کسی وجہ کے جیسے میری شاعری اس کے اندر موجود اداس کر دینے والی کسی مشین میں چابی بھر دیتی۔

شاعری میں اس کے لئے کشش کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ شاعری کا بنیادی موضوع اور نفیس مضمون محبت تھی..... عشق تھا۔ اور وہ محبت اور عشق کو سمجھنا چاہتا تھا۔ اس کی خاطر تو اس نے تلاش حق کا آغاز کیا تھا۔ کئی برس پہلے اس نے سوچا تھا کہ اوپر والے نے یہ دنیا بنائی، اسے وجود دیا، اس پر بڑی بڑی مہربانیاں کیں۔ تو اسے ماں باپ سے بڑھ کر اس سے محبت کرنی چاہئے۔ لیکن بغیر دیکھے، سمجھے اور جانے کوئی کسی سے اتنی محبت نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اس نے اوپر والے کو کھوجنا شروع کر دیا۔ اور اب شاعری کے ذریعے اسے محبت کو سمجھنے کا موقع ملا تھا۔

پھر میر کے بعد وہ غالب تک پہنچا اور حیران رہ گیا۔ غالب کا تجسس، اس کی فکر..... وہ تو جیسے اس کا ہی عکس تھا۔ جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود۔ پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟ سبزہ وگل کہاں سے آئے ہیں۔ ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟ یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟ عشوں وغمزہ وادا کیا ہے؟

اور غالب کا ایک شعر تو اس پر چھا گیا۔ نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا۔ ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا۔

شاعری کے مطالعے کا شوق بڑھ گیا۔ وہ کتابیں خرید کر لانے لگا۔ نصاب کی شاعری بہت پیچھے رہ گئی۔

پھر شاعری کے حوالے سے اس نے محبت کو سمجھنے کی کوشش شروع کر دی۔ کیسا طاقت ور ہے یہ جذبہ جو آدمی کو تخلیق کے راستے پر لے جاتا ہے۔ کیسی کیسی کیفیتیں آتی ہوں گی، تب کہیں شاعر ایسے شعر کہتا ہوگا۔

یہ دروازہ کھلا تو اس کے آگے اور دروازے تھے۔ وہ نثر کی طرف چلا گیا۔ اس نے عشق کی داستانیں پڑھیں۔ شیریں فرہاد، قیس اور لیلیٰ، سسی پنوں، ہیر رانجھا، ہتی مراد، سوہنی مہیوال اور انگریزی میں رومیو جولیٹ۔ اور یہ سب پڑھ کر اسے محبت سے محبت ہو گئی..... عشق سے عشق ہو گیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ یکسر تبدیل ہو گیا۔ سائنس میں اس کی دلچسپی صرف نصاب تک محدود ہو گئی۔ وہ فنون میں اور بالخصوص ادب میں دلچسپی لینے لگا۔ اوپر والے کی تلاش بھول کر وہ زمین پر کسی کی تلاش میں مصروف ہو گیا۔ کوئی ایسا ہو، جس سے اسے محبت ہو جائے۔ وہ بڑی حسرت سے سوچتا، کیا مجھے بھی کسی سے محبت نہیں ہو گی۔ کیا مجھے کوئی ایسا نہیں ملے گا، جس کے لئے میں آہیں بھروں، شعر کہوں۔

وہ طبعاً شرمیلا تھا۔ لڑکیوں کو دیکھتے ہوئے اس کی نظریں جھک جاتیں۔ لیکن اب تلاشی کا مرحلہ تھا۔ چنانچہ اس کی نظریں اٹھنے لگیں۔ یہ الگ بات کہ بے خبر لڑکی کی نظریں اٹھاتی تو وہ نظریں نہ ملا پاتا۔ جھکا لیتا۔ لیکن بہر حال اب وہ دیکھتا تھا۔ تلاش جو تھی۔ وہ یہ سوچ کر بازار میں، جمنا کے کنارے، دیگر تفریحی مقامات پر لڑکیوں کو دیکھتا کہ شاید کسی کو دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوں گی۔ تب اسے پتا چل جائے گا کہ اسے اس لڑکی سے محبت ہو گئی ہے۔ لیکن ایسا کبھی ہوا نہیں۔

شاعری کے ذریعے اس نے بہت کچھ سمجھا اور سیکھا تھا۔ شاعری میں بوس وکنار بھی تھا اور جسمی اختلاط بھی۔ ایسے شعر پڑھ کر وہ ہیجان میں مبتلا ہوتا۔ جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگتی۔ اندر وحشت سی امنڈتی۔ وہ اس سے لطف اندوز ہوتا۔ لیکن پھر ایک جھٹکا لگتا۔ اسے احساس ہوتا کہ اس وحشت میں خوب صورتی نہیں، اس میں لطافت نہیں۔ کثافت ہے۔ جبکہ محبت کو تو بہت خوب صورت اور لطیف ہونا چاہئے۔ اس نے محبت کی تھی..... اپنے ماتا پتا سے، اماں سے، چاچا سے اور ویر جی سے۔ لیکن اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ یہ محبت ناکافی ہے۔ اس میں کمی ہے۔ وہ مکمل محبت کرنا چاہتا تھا..... اپنے خالق سے اس کا خیال تھا کہ محبت آدمی کو سکون دیتی ہے، خوشی دیتی ہے۔ مگر یہ وحشت..... یہ اندر جو کسی کو توڑ پھوڑ دینے کی خواہش ابھرتی ہے..... یہ خوشی کیسے دے سکتی ہے۔

وہ اردو کے پیریڈ میں اردو کے استاد کو اپنے سوالات سے تنگ کرنے لگا۔ اس سے اسے فائدہ بھی ہوا۔ اسے پتا چلا کہ عشق بھی دو طرح کا ہے۔ عشق حقیقی اور عشق مجازی۔ عشق حقیقی وہ ہے جو بندہ اپنے معبود سے کرتا ہے۔ اور عشق مجازی بندہ بندے سے۔

''لیکن سر، یہ محبت میں وحشت کیوں ہے؟ اسے تو لطیف ہونا چاہئے''۔

''محبت تو لطیف ہی ہوتی ہے''۔ سر نے کہا۔ ''محبت کی تعریف پر غور کرو''۔

''اور محبت کی تعریف کیا ہے سر؟''۔

''محبت کرنے والے کو اپنے محبوب سے کوئی غرض، کوئی طلب نہیں ہوتی۔ وہ اپنے محبوب سے بدلے میں کچھ بھی نہیں مانگتا..... محبت بھی نہیں، التفات کی ایک نظر بھی نہیں۔ وہ تو بس محبت کئے جاتا ہے۔ کیونکہ محبت ایک خود کار جذبہ ہے، جو دل میں خود بخود ابھرتا ہے۔ تو محبت کرنے والا تو محبت کرنے پر مجبور ہے۔ وہ کوئی شرط عائد نہیں کر سکتا۔ یہ محبت نہیں کہ محبوب جواب میں محبت نہ دے تو اسے چھوڑ کر کسی اور سے محبت کر لو۔ یہ تو پھر کاروبار ہوا''۔

اب اوتار سنگھ جو اتفاق کو نہیں مانتا تھا، خود کار جذبے کو کیسے مان لیتا۔ اس کا تو مطلب یہ ہے کہ اوپر والا خیال کی طرح کسی کو کسی کی محبت بھی سونپ دیتا ہے۔ لیکن تجربہ کرنا بھی ضروری تھا۔ اس نے کئی لڑکیوں سے بالارادہ محبت کرنی چاہی۔ لیکن ناکام رہا۔ بات سمجھ میں آ رہی تھی۔

ایک اور موقعے پر سر نے اسے کہا کہ وہ چھٹی کے بعد ان سے ملے۔ وہ چھٹی کے بعد ان سے ملا۔ ''جی سر؟''۔

''بات یہ ہے اوتار سنگھ کہ تم ایسی باتیں جاننا چاہتے ہو، جو ابھی کلاس میں پڑھانا مناسب نہیں''۔ سر بولے۔ ''لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں بتانا بھی ضروری ہے۔ ورنہ تم گمراہی میں پڑ سکتے ہو۔ اس لئے تم کلاس میں سوال کرنے کے بجائے مجھ سے اکیلے میں مل لیا کرو اور جو پوچھنا ہو پوچھ لیا کرو''۔

''شکریہ سر''۔

''میں دیکھ رہا ہوں کہ محبت میں تمہیں خاص دلچسپی ہے، اور تم شاعری کے حوالے سے اسے سمجھنے کی کوشش کرتے ہو''۔

''جی سر، یہ درست ہے''۔

''اس لئے غلط فہمی کا امکان بھی بڑھ جاتا ہے۔ بہتر ہے کہ محبت کو سمجھ لو۔ محبت بہت پاک اور بلند جذبہ ہے۔ اور یہ محدود بھی نہیں۔ ماں بیٹے سے محبت کرتی ہے۔ بندہ معبود سے محبت کرتا ہے۔ محبّ کسی کو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ کسی مرد کو عورت سے اور عورت کو مرد سے محبت ہو سکتی ہے۔ لیکن محبت کی بنیاد جسم کبھی نہیں ہوتا۔ اس کی بنیاد اچھے اوصاف بھی نہیں ہوتے۔ محبوب کا ظاہر بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ محبت لافانی جذبہ ہے۔ آدمی بوڑھا ہو جائے تو جسم ڈھل جاتا ہے۔ اس جسم سے محبت ہو تو محبت ختم ہو جائے گی۔ محبوب کی کوئی بری عادت سامنے آئے تو محبت ختم ہو جائے گی.....''۔

''جی سر''۔

''نہیں۔ محبت ہے تو کبھی ختم نہیں ہو گی''۔

اوتار سنگھ نے انہیں کئی اشعار کے حوالے دیئے۔

سر مسکرائے۔ ''یہی تو میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ محبت نہیں، ہوس ہے''۔

''لیکن سر.....''۔

سر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''کوئی دن کو رات کہے تو وہ رات تو نہیں ہو جائے گا۔ بدی کو نیکی کہنے سے کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ اسی طرح محبت کو اس کی تعریف پر، اس کی پاکی، اس کی بے غرضی اور بے طلبی پر تولو گے تو پتا چل جائے گا کہ وہ محبت ہے یا ہوس۔ چیزیں اپنے نام سے نہیں، خواص سے پہچانی جاتی ہے۔ اور دعوے پرتال کے بغیر بے معنی ہوتے ہیں''۔

بعد میں اوتار سنگھ ان باتوں پر غور کرتا رہا۔ سر نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

پھر مومن کے ایک شعر نے اس پر محبت کی کیفیات کی خوب صورتی کسی حد تک واضح کر دی۔ شعر تھا.....

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

پہلی بار یہ شعر پڑھنے کے بعد کئی دن تک اوتار سنگھ اس شعر کے طلسم کا اسیر رہا۔ اسے اس شعر میں ایک جہان معنی آباد نظر آتا تھا۔ یہ تھا محبت کا احترام اور اس کی پاکیزگی۔ خلوت..... ایسی تنہائی، جس میں کوئی بھی نہ ہو۔ تب محبوب آ جائے، جسمی طور پر نہیں، خیالوں میں۔ تنہائی میں مخل ہو جائے۔ اور آلودگی کا شائبہ بھی نہ ہو۔ وہ ایسی ہی محبت کا تو متمنی تھا۔

مجھے محبت..... سچی محبت کب ملے گی؟ اس نے خود کلامی کی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ محبت اسے ملنے ہی والی ہے!

.....x.....

امتحان ہونے والے تھے۔ اس شام وہ سکون سے پڑھائی کی غرض سے کوٹھے پر چلا گیا۔ اوپر جاتے ہی اسے افسوس ہونے لگا۔ اب تک یہاں نہ آ کر اس نے بڑی ناقدری کی تھی۔ وہ تو بڑا خوب صورت ماحول تھا۔ فضا میں چنبیلی کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔

سورج غروب ہونے میں ابھی دیر تھی۔ کوٹھے پر بید کی بنی ہوئی کرسیاں پڑی تھیں۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ کتاب کھولی اور پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ سچ یہ ہے کہ وہاں پڑھنے میں اسے بہت لطف آ رہا تھا۔

www.allurdu.com

بید کی کرسی پر بیٹھ کر اس نے کتاب کھولی اور پڑھنے کی کوشش کی۔لیکن اس کا دھیان تو کہیں اور تھا۔اس کی تمام حسوں کی طاقت سماعت میں مجتمع ہوگئی تھی۔اس کی نظریں کتاب کے کھلے صفحے پر تھیں۔مگر اسے ایک حرف بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

لیکن وہاں ہر طرف خاموشی تھی.....ایک غیر معمولی خاموشی! وہ مضطرب ہوا اور اٹھ کر ٹہلنے لگا۔کیا ہوا؟ کیا اب وہ آواز سنائی نہیں دے گی؟ وہ پریشانی سے سوچتا رہا۔کیا وہ اتفاق تھا.....؟بس ایک دن کی بات تھی؟

ہاں.....بالکل ممکن ہے۔اس کے اندر سے کسی نے جواب دیا۔اب کیا ضروری ہے کہ روز اسی وقت وہ آواز سنائی دے۔

اس خیال سے وہ اتنی تیزی سے اور اتنا زیادہ مایوس ہوا کہ اسے حیرت ہونے لگی۔کیا صرف ایک بار سننے کے بعد وہ آواز اس کے لئے اتنی اہم ہوگئی کہ وہ اتنا مایوس ہوگیا۔ایسا ہوتا تو نہیں۔

وہ یہ سب کچھ سوچتا رہا.....ٹہلتا رہا۔اس کے اندر عجیب سی کشمکش تھی۔دل کہتا تھا.....ابھی وہ آواز سنائی دے گی۔اور دماغ کہتا تھا..... یہ ضروری نہیں۔لمحے بہت سست رفتاری سے گزر رہے تھے۔اس کی بے چینی بہت تیزی سے بڑھ رہی تھی۔

پھر وہ بے چینی وحشت میں تبدیل ہوگئی۔اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔پورا جسم اینٹھنے لگا۔اس کے اندر ایک خواہش مچلی۔جی چاہا کہ وہ پوری قوت سے چلائے.....اے نیچے والی،تم چپ کیوں ہو؟ بولتی کیوں نہیں؟ اور اس خواہش کا گلا گھونٹنا بہت مشکل تھا۔وجود کی پوری طاقت صرف کرنے کے باوجود اس کے ہونٹ بری طرح لرز رہے تھے۔بے تاب زبان دہن میں اینٹھی جا رہی تھی۔

اوتار سنگھ نے گھبرا کر اپنا دھیان ہٹانے کی کوشش کی۔اس نے پڑھائی کے بارے میں سوچا،ماسٹر جی،اور ویر جی کے بارے میں سوچا،پتا جی اور اماں کے بارے میں سوچا۔لیکن اس سے سوچا نہیں گیا۔دماغ گراموفون کی سوئی کی طرح اسی آواز پر اٹھا ہوا تھا۔اس نے ماتا جی کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی۔اس سے پوری طرح سوچا تو نہیں گیا۔البتہ وحشت قدرے کم ہوگئی۔مگر اب بھی صورت حال تسلی بخش نہیں تھی۔

اچانک اسے خیال آیا کہ وہ کیوں نہ اس آواز والی کے بارے میں سوچے۔

یہ اس کے پاس آخری ترکیب تھی۔خوش قسمتی سے وہ کارگر ثابت ہوئی۔اس خیال سے ہی اس کا مضطرب وجود پرسکون ہوگیا۔چند لمحوں میں وہ سب کچھ بھول کر اسی کے بارے میں سوچنے لگا۔

نیچے والوں کے بارے میں اسے بتایا گیا تھا۔لیکن اس نے کبھی دل چسپی نہیں لی تھی۔دھیان سے نہیں سنا تھا۔رنجنا نیچے جاتی رہتی تھی۔کبھی کبھی وہ ان کی باتیں کیا کرتی تھی۔اب تعلق جڑا تھا تو اوتار سنگھ رنجنا کی باتوں کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔مگر دشواری ہو رہی تھی۔کیوں کہ وہ رنجنا کی باتیں دھیان سے سنتا ہی نہیں تھا۔سو اب اسے اس چیونٹی کی سی مشقت کرنی پڑ رہی تھی،جو اپنی طاقت سے زیادہ بوجھ اٹھا کر بل تک جاتی ہے۔وہ بڑی مشکل سے رنجنا سے حاصل ہوئی معلومات کو یاد کرتا اور پھر ترتیب دیتا۔

یہ گھر ایک بہت بڑے سرکاری افسر کا تھا۔خاندانی لوگ تھے۔ان کے ہاں بیٹا کوئی نہیں تھا۔بیٹیاں تین تھیں۔ایک چودہ سال کی،دوسری بارہ اور تیسری دس سال کی۔ان کے یہاں آنے سے ایک سال پہلے سرکاری افسر کا انتقال ہوگیا۔اب گھر میں ان ماں بیٹیوں اور دو نوکروں کے سوا کوئی نہیں تھا۔چھمن بوا اور بہادر علی دونوں پشتینی ملازم تھے اس گھر کے۔مرنے والے کے واجبات میں بڑی رقم ملی تھی۔باقاعدگی سے پنشن آتی تھی۔اور اب اوپر کے مکان کا کرایہ بھی۔چناں چہ تنگی کوئی نہیں تھی۔وہ خوش حال لوگ تھے۔ماں کو بس یہی فکر تھی کہ تینوں بیٹیوں کے ہاتھ پیلے ہو جائیں تو بوجھ ہلکا ہو۔

اوتار سنگھ کو خوشی ہوئی۔دھیان سے نہ سننے کے باوجود اتنا کچھ اسے یاد تھا۔ہاں وہ متاسف ضرور تھا کہ پتا نہیں کتنی اہم باتیں حافظے میں نہیں رہی ہوں گی۔بہر حال اسے اتنا پتا چل گیا کہ وہ آواز ان تین لڑکیوں میں سے کسی کی ہے۔کس کی؟ یہ فی الوقت اسے معلوم نہیں تھا۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اس کا دھیان پوری طرح بٹ چکا تھا اور وہ پرسکون ہوگیا تھا۔ایسا پرسکون کہ نہ اسے اپنا اضطراب یاد تھا اور نہ ہی اس کا سبب۔وہ ذہن پر زور دے رہا تھا.....نیچے والوں کے بارے میں سنی ہوئی اور باتیں یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا.....

پھر اسے ایک اور اہم بات یاد آئی۔نیچے رہنے والے سب لوگ مسلمان تھے.....ویر جی،اماں اور چاچا جی کی طرح!

اسی لمحے وہ آواز ابھری.....اور اس کے ساتھ ہی وہ سب کچھ بھول گیا۔وہ مترنم،دل نشیں آواز لحہ بہ لحہ بلند ہو رہی تھی۔وہی اجنبی زبان،وہی مخصوص لحن۔وہ نہیں سمجھ سکا کہ آواز بلند نہیں ہو رہی تھی۔دراصل وہ اس کے پورے وجود میں دوڑ رہی تھی.....گونج رہی تھی۔اس کے وجود میں اس آواز کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

وہ جیسے کسی طلسم کا اسیر،ہاتھ میں کھلی کتاب لئے،سامنے کے صفحے پر نظریں جمائے ساکت وصامت بیٹھا تھا۔لیکن وہ کچھ دیکھ نہیں رہا تھا۔وہ صرف سن رہا تھا۔ایسے کہ وہ اپنی مرضی سے ہاتھ بھی نہیں ہلا سکتا تھا۔

پھر آواز کی وہ ڈور اچانک ہی ٹوٹ گئی۔ہر طرف سکوت چھا گیا۔اسے لگا کہ اس کا وجود بالکل خالی ہوگیا۔زندگی جیسے اس آواز سے لپٹ کر،اس آواز کے ساتھ رخصت ہو گئی ہے۔

وہ بیٹھا رہا۔اسے امید تھی کہ وہ آواز پھر سنائی دے گی۔لیکن چند لمحوں کے بعد اذان کی آواز سنائی دی۔اندھیرا ہوگیا تھا۔وہ اس آواز کا انتظار کئے جا رہا تھا۔

پھر اچانک اسے اندھیرے کا احساس ہوا۔اور اس کے ساتھ ہی یاد آیا کہ گزشتہ روز ویر جی اوپر آئے تھے اور انہوں نے کہا تھا.....لائٹ ہی نہیں جلائی۔تو لائٹ جلانا اب ضروری ہے۔اس نے سوچا۔یہ ضروری تھا۔اب اس کے پاس ایک مقدس راز تھا،جسے افشا نہیں ہونے دینا تھا۔سب کو یہی سمجھنا چاہئے کہ وہ سکون سے پڑھنے کی غرض سے کوٹھے پر آتا ہے۔

انتظار کی اس کیفیت نے اس کے وجود کو شکل کر دیا تھا۔اس پر عجیب سی کسلمندی طاری تھی۔اٹھنا اور کچھ کرنا تو بہت دور کی بات ہے،ایسے میں تو انگلی ہلانے کو بھی دل نہیں چاہتا۔لیکن بات اپنے مقدس ومحترم راز کی پردہ داری کی تھی۔وہ یونہی بیٹھا نہیں رہ سکتا تھا۔اس کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ایک تو یہ کہ وہ اٹھے،کتابیں لے اور نیچے چلا جائے۔لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔کون جانے،وہ آواز پھر جادو جگائے۔وہ اسی انتظار میں تو تھا۔

دوسرا راستا یہ تھا کہ وہ اٹھ کر لائٹ جلائے اور کتاب کھول کر پڑھنے کی اداکاری کرتا رہے۔

اس نے اٹھ کر لائٹ جلا دی۔اب کتاب کے صفحے پر نظریں جمائے وہ اس آواز کا منتظر تھا۔

لیکن وہ آواز نہیں آئی!

.....x.....

نہ جانے کتنے دن گزر گئے۔اتنا ہوش کسے تھا کہ دنوں کی گنتی کرتا۔ایک سحر تھا،جس میں اوتار سنگھ گرفتار تھا۔اندھیرا ہوتے ہی اس کا انتظار شروع ہوتا۔وہ شام کے اس مخصوص وقت کے انتظار میں وقت گزارتا،جب وہ آواز ابھرتی تھی۔حالاں کہ وہ انتظار بے معنی تھا۔وہ ذرا سا غور کر لیتا تو یہ بات خود اس کی سمجھ میں بھی آ جاتی لیکن وہ تو خود فراموشی کی کیفیت میں تھا۔اس نے یہ نہیں سوچا کہ اب وہ آواز تو ہر قت،ہر پل اس کے ساتھ رہتی ہے۔وہ تو جیسے اس کی سماعت ہے،اس کے وجود سے جڑ گئی ہے۔وہ کلاس روم میں ہو یا گھر میں،کلاس میں لیکچر ہو یا گھر میں ماسٹر جی پڑھا رہے ہوں،وہ آواز اس کے کانوں میں بسی رہتی تھی،اس کے وجود میں گونجتی رہتی تھی۔

اور اتنے دنوں میں اسے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ وہ آواز صرف اس مخصوص وقت میں آتی ہے۔اس کے باوجود اس کا بس چلتا تو وہ چوبیس گھنٹے کوٹھے پر بیٹھا اس کا انتظار کرتا۔اس انتظار میں ایسی انوکھی لذت تھی،جس سے وہ پہلی بار آشنا ہوا تھا۔

ابتدا میں وہ آواز سنتے ہوئے اسے جھنجھلاہٹ ہوتی تھی.....اس بات پر کہ وہ زبان.....ادا کئے جانے والے الفاظ اس کیلئے اجنبی ہیں۔کاش وہ ایک ایک لفظ سمجھتا تب تو کچھ اور ہی بات ہوتی۔لیکن چند چندوں بعد یہ احساس خود بخود مٹ گیا۔وہ آواز اس پر یوں حاوی ہوئی کہ اسے کچھ سوچنے کا خیال ہی نہ آتا۔ہاں،اسے یہ احساس ہوتا کہ جو بات بھی کہی جا رہی ہے،وہ سمجھ میں نہ آنے کے باوجود اس کے اعصاب کو پرسکون کر دیتی ہے۔اس کے دل ودماغ کو طمانیت سے بھر دیتی ہے۔اس کا پورا وجود جیسے ایک بہت خوب صورت کیفیت میں جھومنے لگتا ہے۔اور یہ کیفیت صرف اس کی داخلی نہیں۔باہر بھی ایسا ہی کچھ ہوتا ہے،بیلیں،پودے،پھول سب جھوم رہے ہوتے ہیں ہر شے میں حتی کہ بے جان دیواروں میں بھی ایک سپردگی آمیز ارتعاش محسوس ہوتا ہے۔

امتحان شروع ہوئے اور ختم بھی ہوگئے۔اب نتیجہ آنے تک چھٹیاں تھیں۔یہ دن اس کیلئے آزمائش بن گئے۔اس کا جی چاہتا کہ صبح ہی سے کوٹھے پر چلا جائے رات تک کے لئے!لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ ایک غیر معمولی بات ہوگی،جس پر سب غور کریں گے اور بالآخر اس کا راز افشاں ہو جائے گا۔اور یہ وہ گوارا نہیں کر سکتا تھا چناں چہ اس نے معمول سے ہٹ کر کچھ نہیں کیا۔لیکن وقت گزارنا اس کے لئے دوبھر ہوگیا۔وہ شام تک کا وقت گزارنے کیلئے باؤلوں کی طرح مضطرب ادھر ادھر پھرتا رہتا اور شام ہوتے ہی کتابیں اٹھا کر کوٹھے کا رخ کرتا.....

وصال دین چھوٹے ٹھاکر کے اس نئے معمول سے بے خبر نہیں تھا۔لیکن اس نے اس معاملے میں تجسس نہیں کیا۔کچھ تو یہ کہ اس کی فطرت میں تجسس تھا ہی کم۔دوسرے یہ کہ یہ معمول اس کے لئے بہت بہتر تھا۔اسے اماں اور ابا کی نصیحت یاد تھی۔جب اوتار سنگھ نیچے ہوتا تھا تو اسے عصر اور مغرب کی نماز کے لئے نظر بچا کر جانا ہوتا تھا۔اور قرآن شریف کی تلاوت ایک الگ مسئلہ تھی۔اب اوتار سنگھ کے اس نئے معمول نے اس کا مسئلہ حل کر دیا تھا۔

تجسس نہ کرنا اپنی جگہ،مگر وصال دین کا مشاہدہ بہر حال برا نہیں تھا۔یہ تو اس سے نہیں چھپ سکا کہ اوتار سنگھ اب بہت مضطرب رہتا ہے۔اس میں کچھ مشاہدے کا کمال بھی نہیں تھا۔اوتار سنگھ کا اضطراب ایسا تھا کہ اس کے انگ انگ سے چھلکتا نظر آتا تھا۔تاہم غیر متجسس وصال دین نے اس پر زیادہ غور نہیں کیا۔یہ کیفیت گاؤں جانے کی خواہش کی وجہ سے بھی ہو سکتی تھی۔اور امتحان دینے کے بعد نتیجے کے انتظار میں بھی ایسا ہوتا ہے۔

کچھ بھی ہو،وصال دین کے لئے تو وہ معمول نعمت تھا۔اوتار سنگھ اوپر ہوتا تو وہ بڑے سکون سے اپنے معمولات میں مگن رہتا۔وہ اوپر جاتا تو صرف کھانے کے وقت..... کھانے پر اوتار سنگھ کو بلانے کے لئے۔چناں چہ اوتار سنگھ سکون سے اپنے راستے پر چلتا رہا۔

مگر اس شام بڑے ٹھاکر کا ٹیلی گرام آ گیا۔انہوں نے اطلاع دی تھی کہ اگلے روز وہ آ رہے ہیں۔

وصال دین نے ٹیلی گرام پڑھا۔اس کے جسم میں سنسنی دوڑنے لگی۔،وشی کی یہ خبر سنانے کے لئے وہ آندھی طوفان کی طرح کوٹھے کی طرف دوڑا۔

اوتار سنگھ اپنی محبوب آواز میں اس طرح گم تھا کہ کوئی طوفان بھی اسے نہیں چونکا سکتا تھا۔اسے وصال دین کی آمد کا پتا ہی نہیں چلا۔

وصال دین اوپر پہنچا تو اوتار سنگھ کتاب کھولے بیٹھا تھا۔مگر اس کی نظریں کتاب پر نہیں تھیں۔وہ سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا۔مگر ایک لمحے میں وصال دین کو احساس ہوگیا کہ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔مگر وہ سامنے کی کوئی چیز بھی نہیں دیکھ رہا ہے۔وہ ڈر گیا کہ کیا ہوگیا بھائی کو۔لیکن چند لمحوں میں اس کا ڈر دور ہوگیا۔اسے احساس ہوگیا کہ بھائی کہیں کھویا ہوا ہے.....دنیا ومافیا سے بے خبر۔

وصال دین نے ادھر ادھر دیکھا۔کہیں کوئی نہیں تھا۔وہاں بہت پرسکون ماحول تھا۔

www.allurdu.com

اچانک اسے آواز کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ نسوانی آواز نیچے سے آرہی تھی مگر اس میں اسے کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں ہوئی۔

وہ اوتار سنگھ کی آنکھوں کے سامنے سے گزرا اور برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ لیکن شاید اوتار سنگھ نے اسے نہیں دیکھا۔ یا دیکھا بھی تو بہر حال اس کی محویت نہیں ٹوٹی۔ اس نے اوتار سنگھ کو پکارنے کا ارادہ کیا۔ اسے خود بہ خود یہ احساس ہوا کہ اسے زور سے نہیں پکارنا چاہئے۔ جیسے یہ کوئی بے ادبی ہوگی۔ چناں چہ اس نے تین چار بار اسے دھیرے سے پکارا۔ ''بھائی..... بھائی..... ٹھاکر جی کا ٹیلی گرام آیا ہے''۔

لیکن اوتار سنگھ کی محویت نہیں ٹوٹی۔

پریشان ہو کر اس نے اوتار سنگھ کو نرمی سے ہلایا۔ ''بھائی کیا ہو گیا ہے تم کو؟ کہاں کھوئے ہوئے ہو؟''۔

پہلی بار اوتار سنگھ کی محویت ٹوٹی۔ اس نے وصال دین کو دیکھا۔ مگر اس کی نگاہوں میں بیگانگی تھی۔ ''کیا بات ہے؟''۔ اس نے درشت لہجے میں کہا۔

وصال دین کو جھٹکا لگا۔ اوتار سنگھ نے پہلے کبھی اس سے اس طرح بات نہیں کی تھی۔ وہ سہم گیا۔ ''وہ..... وہ..... چھوٹے ٹھاکر.....''

اوتار سنگھ نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''کچھ مت بولو۔ بس سنتے رہو''۔

اب وصال دین میں بولنے کی ہمت نہیں تھی۔ نہ جانے اوتار سنگھ اسے کیا سننے کو کہہ رہا تھا۔ وہاں نیچے سے آنے والی اس نسوانی آواز کے سوا سننے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ اسے سنتے سنتے وہ خود بھی اس آواز میں کھو گیا۔

نہ جانے کتنی دیر ہو گئی۔ پھر اوتار سنگھ نے ہی اسے چونکایا۔ ''سن رہے ہو نا ویر جی''۔ اس بار اس کے لہجے میں نرمی اور اپنائیت تھی۔

''جی چھوٹے ٹھاکر، سن رہا ہوں''۔

''کیسا جادو ہے اس آواز میں''۔

''جی ہاں''۔

''پتا نہیں زبان کون سی ہے۔ ایک لفظ بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ کاش.....''۔

''یہ عربی زبان ہے''۔ وصال دین نے بے ساختہ کہا۔

اوتار سنگھ تو اچھل پڑا۔ ''عربی! سچ کہہ رہے ہو؟''۔

''ہاں بھائی۔ یہ عربی ہے''۔

''تمہیں پکا معلوم ہے ویر جی''۔ اوتار سنگھ کی کیفیت ہیجانی تھی۔

''ہاں بھائی''۔ وصال دین نے کہا۔ اور فوراً ہی اسے ڈر لگنے لگا۔ وہ تو بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ اوتار سنگھ اس سے پوچھے کہ اسے کیسے معلوم کہ یہ عربی ہے..... تو وہ کیا جواب دے گا۔

لیکن اوتار سنگھ ایسے عالم میں تھا کہ اور کچھ پوچھ ہی نہیں سکتا تھا۔

ادھر اوتار سنگھ کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ وہ مگن تھا۔ یہ تو بہت بڑی بات معلوم ہو گئی۔

چند لمحے اوتار سنگھ اس خوشی کی لذت میں گم رہا۔ مگر پھر سوچنے کا عمل شروع ہوا اور سوالات ابھرنے لگے۔ عربی تو عرب میں بولی جاتی ہے۔ تو کیا یہ نیچے رہنے والے لوگ عرب کے ہیں؟ نہیں..... ایسا تو نہیں؟ تو پھر؟ اس کا جی چاہا کہ یہ بات وصال دین سے پوچھے۔ لیکن فوراً ہی اس نے خود کو روک لیا۔ یہی کیا کم ہے کہ وصال دین کو اس کی محویت اور اس آواز کے درمیان رشتے کا احساس ہو گیا ہے۔ وہ زیادہ پوچھ گچھ کرے گا تو یہ راز کھل جائے گا۔ نہیں..... یہ نہیں ہونا چاہئے۔ اور جو تھوڑی بہت بات کھلی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس کے بدلے یہ تو معلوم ہو گیا کہ یہ کون سی زبان ہے۔ اب وہ یہ زبان سیکھ سکتا ہے یہ تو بہت بڑی بات معلوم ہوئی ہے۔ مگر اب اور کچھ نہیں پوچھنا۔ دراصل اوتار سنگھ کی سوچ کا محور صرف وہ آواز تھی..... اور صاحب آواز۔ ورنہ یہ سامنے کی بات وہ ضرور سوچتا کہ پڑھائی میں اس کے پیچھے چلنے والے وصال دین کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ زبان عربی ہے۔ اور یہ سوچتا تو اس کا تجسس ضرور بھڑکتا۔ وہ وصال دین سے پوچھتا..... اور وصال دین کے لئے وہ بہت بڑی آزمائش ہوتی۔ لیکن اوتار سنگھ کے ارتکاز نے یہ نوبت ہی نہیں آنے دی۔

دوسری طرف وصال دین کو یہ شک تو ہوا کہ شاید اوتار سنگھ اوپر یہ آواز سننے کے لئے ہی آتا ہے۔ لیکن اس نے فوراً ہی اس خیال کو رد کر دیا۔ کیوں کہ اوتار سنگھ تو رات کے کھانے تک کوٹھے پر بیٹھا رہتا تھا جب کہ یہ آواز تو تھوڑی دیر کی ہی ہے۔

اوتار سنگھ اس آواز کی اہمیت کے تاثر کو زائل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''یہاں پڑھائی کیلئے بہت اچھا ماحول ہے۔ بہت سکون ہے۔ آج اس آواز نے ڈسٹرب کر دیا۔ ورنہ یہاں پڑھائی میں ایک لمحے کو بھی خلل نہیں پڑتا''۔ یہ کہہ کر وہ ڈرا کہ وصال دین نے بھی پڑھائی کے لئے یہاں آنا شروع کر دیا تو کیا ہوگا۔

''ٹھیک کہتے ہو بھائی۔ لیکن میں یہاں نہیں پڑھ سکتا۔ میں تو یہاں کے ماحول میں کھو جاؤں گا''۔ وصال دین نے کہا۔

اوتار سنگھ نے خطرہ ٹل جانے پر سکون کی سانس لی۔ پھر بولا۔ ''ارے ہاں ویر جی، تم یہاں کیوں آئے تھے؟ کچھ کہہ رہے تھے؟''۔

''ہاں بھائی۔ کل ٹھاکر جی یہاں آرہے ہیں''۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ دوپہر کو وہاں پہنچ گیا۔ پتنی کو کھونے کے بعد اس کے پاس اس بیٹے کے سوا بچا ہی کیا تھا۔ اس کے تو دل میں بارہا آتی تھی کہ اوتار سنگھ کو اسکول سے اٹھا لے۔ اچھی سے اچھی پڑھائی کا وہ گھر پر بھی بندوبست کر سکتا ہے۔ لیکن یہ سوچ کر رہ جاتا تھا کہ یہ تو انتہا درجے کی خود غرضی ہوگی۔ صرف علم سے کیا ہوتا ہے۔ اسکول کالج سے آدمی اور بھی بہت کچھ سیکھتا ہے۔ ٹھاکروں کی گڑھی میں بند رہے گا اس کا بیٹا علم حاصل کرنے کے باوجود کنویں کا مینڈک ہی رہے گا۔

اب مہینوں سے وہ بیٹے کی صورت دیکھنے کو ترس رہا تھا۔ جانتا تھا کہ اب گرمیوں کی چھٹیاں ہونے والی ہیں۔ اس کے باوجود اس سے رہا نہیں گیا۔ تین دن بیٹے کے ساتھ گزارنے کی نیت سے وہ دہلی چلا آیا۔

اور اب اس کا رویہ ایسا تھا کہ وہ بیٹے کو ایک پل کے لئے بھی نظروں سے دور نہ ہونے دیتا۔

شام کو اوتار سنگھ کتابیں لے کر اوپر جانے لگا تو ٹھاکر نے اسے ٹوکا۔ ''کہاں جا رہے ہو پتر؟''۔

اوتار سنگھ چور سا ہو گیا۔ ''اوپر کوٹھے پر پتا جی۔ وہاں پڑھائی اچھی ہوتی ہے''۔

''پر اب تو امتحان ہو چکے ہیں نا۔ پھر پڑھائی کیسی؟''۔

''اب بڑی کلاسیں ہیں پتا جی۔ اور میں کلاس کے مقابلے میں ایڈوانس رہنا چاہتا ہوں''۔

ٹھاکر کا سینہ فخر سے چوڑا ہو گیا۔ ''ابھی پڑھائی کو چھوڑو۔ تین دن تو میرے ساتھ گزارو''۔

www.allurdu.com

''ٹھیک ہے پتا جی''۔اوتار سنگھ نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

ٹھاکر کو فرض شناس اور ذمے دار بیٹے پر پیار آ گیا۔''اچھا چلو۔میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔تم پڑھائی کرنا، میں تمہیں دیکھتا رہوں گا''۔

مایوس اوتار سنگھ کیلئے یہ بہت غنیمت تھا۔دونوں اوپر چلے گئے۔

ابھی آواز کے طلوع ہونے کا وقت نہیں ہوا تھا۔اوتار سنگھ ترسے ہوئے باپ سے باتیں کر سکتا تھا۔ویسے بھی اسے احساس جرم ہو رہا تھا وہ کتنا خود غرض تھا۔باپ اس کے ساتھ وقت گزارنے کے لئے اتنی دور سے آیا تھا اور وہ اس آواز کی وجہ سے اسے ٹال رہا تھا۔

اس نے کتابیں بے پروائی سے رکھ دیں اور باپ کی طرح متوجہ ہوا۔''گاؤں کا کیا حال ہے پتا جی؟''۔

''ٹھیک ہے۔سب ٹھیک ہے''۔ٹھاکر نے کہا۔''لیکن تم پڑھتے کیوں نہیں؟''۔

''پڑھ لوں گا پتا جی۔پہلے آپ سے باتیں تو کر لوں۔میں بہت مس کر رہا تھا آپ کو''۔

ٹھاکر کا دل خوش ہو گیا۔لیکن اسے بیٹے کی پڑھائی کا احساس بھی تھا۔وہ بولا۔''تم پڑھتے رہو۔میں بس تمہیں دیکھ کر ہی خوش ہو لوں گا''۔

''لیکن میں تو آپ کو نہیں دیکھ سکوں گا''۔احساس جرم کے شکار بیٹے نے کہا۔''اور پڑھائی کی کوئی بات نہیں پتا جی۔امتحان تو ہو چکے ہیں''۔

''ہاں..... یہ تو ہے''۔

اچانک اوتار سنگھ کو بہت کچھ یاد آ گیا۔اس کا احساس جرم اور بڑھ گیا۔ارے.....اس آواز کے چکر میں وہ سب کو..... کیسے کیسے محبت کرنے والوں کو بھول گیا۔اتنے دن اسے کسی کی یاد نہیں آئی، کسی کا خیال نہیں آیا۔واقعی، یہ تو خود غرضی کی انتہا ہے۔اسے اماں بھی یاد نہیں آئیں!

''پتا جی.....اماں کیسی ہیں.....چاچا کا کیا حال ہے؟''۔اس نے پوچھا۔

''سب ٹھیک ہیں پتر۔تمہیں بہت یاد کرتے ہیں''۔ٹھاکر نے بتایا۔''اور تم سناؤ، یہاں کا کیا حال ہے؟''۔

''سب ٹھیک ہیں پتا جی۔بس مجھے ایک ٹیچر کی ضرورت ہے''۔

ٹھاکر چونکا۔''خیریت؟ کانتی پرشاد جی تو ہیں نا''۔

''مجھے عربی پڑھنی ہے پتا جی''۔یہ کہتے ہوئے اوتار سنگھ اپنے آپ میں چور سا ہو گیا۔''اور کم وقت میں عبور حاصل کرنا ہے۔اس لئے کسی کامل استاد کی ضرورت ہے''۔

ٹھاکر کچھ چوکنا سا ہو گیا۔''مگر عربی کیوں پتر؟''۔

''بس.....جی چاہتا ہے میرا''۔اوتار سنگھ نے سادگی سے کہا۔

ٹھاکر نے چند لمحے سوچا۔پھر بولا۔''یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔میں جانے سے پہلے اس کا بندوبست کر دوں گا۔مگر اب گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہونے والی ہیں۔پھر تم گاؤں چلے آؤ گے۔کیوں نہ گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد کے لئے بات کی جائے''۔

اوتار سنگھ گڑبڑا گیا۔اب تو وہ ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔اور پتا جی تین ماہ کی بات کر رہے تھے۔''پتا جی، اس بار میں چھٹیاں یہیں گزاروں گا''۔

''کیوں پتر.....ایسا کیوں؟''۔ٹھاکر نے بوکھلا کر کہا۔

''پتا جی، مجھے عربی شروع سے پڑھنی ہے یوں سمجھیں کہ عربی میں، میں دس سال پیچھے ہوں۔بہت محنت کروں اور چھٹیوں میں بھی پڑھوں تو کچھ بات بنے گی''۔

ٹھاکر نے شکایتی نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔لیکن پھر اس کی علم کی تڑپ پر پیار آ گیا۔''تم چھٹیوں میں بھی پڑھنا چاہتا ہو نا؟''۔

''جی پتا جی''۔

''ٹھیک ہے، یہ سب مجھ پر چھوڑ دو''۔ٹھاکر نے اٹھتے ہوئے کہا۔

.....x.....

اوتار سنگھ کی چھٹیوں کے وہ دو مہینے ٹھاکر کیلئے اب بڑی اہمیت رکھتے تھے۔وہی ایک عرصہ تو تھا، جس میں اسے بیٹے کی قربت ملتی تھی۔راج پوت تھا۔محبت میں بھی آن کا خیال رکھتا تھا۔وہ خود کو بیٹے پر تھوپتا نہیں تھا۔ہر وقت اس سے چپکے رہنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔بلکہ وہ تو اس کے اور اپنے درمیان فاصلہ رکھتا تھا۔لیکن وہ اس کے ہر پل کی خبر رکھتا تھا وہ اسے چپکے چپکے دیکھتا تھا۔اس کے لئے یہ بہت بڑی خوشی تھی کہ اس عرصے میں اس کا بیٹا ہر وقت اس کی نگاہوں کے سامنے ہے ان دو مہینوں میں وہ رات کو کم..... بہت ہی کم سوتا تھا۔بعض اوقات تو وہ رات بھر بیٹھا سوتے ہوئے بیٹے کو دیکھتا رہتا تھا۔

تو اب اس عرصے کو کھو دینا کیسے گوارا کر سکتا تھا۔مگر بیٹے کی بات ٹالنا بھی ممکن نہیں تھا۔وہ بیٹھ کر اس مسئلے پر سوچتا رہا۔بالآخر اسے اس کا حل مل گیا۔

اگلے روز وہ اسکول گیا اور اس نے پرنسپل کے سامنے یہ مسئلہ رکھا۔

''یہ کوئی بڑی بات نہیں''۔پرنسپل نے سب کچھ سننے کے بعد مسکراتے ہوئے کہا۔''مولوی برکت علی عربی میں استاد کامل ہیں۔مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کے بیٹے کو عربی کی کیا سوجھی''۔

''من موجی ہے سروہ تو۔اور علم کی بڑی لگن ہے اسے''۔

''چلیں، ٹھیک ہے۔میں کل مولوی صاحب کو آپ کی طرف بھیج دوں گا''۔

''ایک مسئلہ اور ہے''۔ٹھاکر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''فرمائیں ٹھاکر صاحب''۔

''اوتار سنگھ گرمی کی چھٹیوں میں بھی پڑھنا چاہتا ہے''۔

''آپ کا مطلب ہے، گاؤں میں.....''۔

''جی ہاں''۔ٹھاکر نے کہا۔پھر جلدی سے بولا''فیس کا کوئی مسئلہ نہیں۔جو حکم کریں گے.....''۔

''میں بات کر لوں گا مولوی صاحب سے۔میرا خیال ہے، یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں''۔پرنسپل نے کہا۔

اور واقعی کوئی مسئلہ نہیں ہوا۔مولوی برکت علی دو ماہ کی چھٹیاں ٹھاکروں کی گڑھی میں گزارنے کے لئے بخوشی تیار ہو گئے۔

مولوی برکت علی نہ صرف باشرع مسلمان تھے۔بلکہ بہت بڑے عاشق رسول بھی تھے۔عربی اور فارسی ان کے لئے مادری زبان کی طرح تھیں۔لیکن عربی سے تو انہیں عشق تھا۔کیوں نہ ہوتا۔وہ ان کے محبوبؐ کی زبان جو تھی۔اور پھر علوم دین کے تمام خزانے اسی زبان میں تھے۔اللہ نے کیسی عزت، کیسا شرف عطا فرمایا ہے اس زبان کو کہ اپنا کلام پاک بھی اسی زبان میں عطا فرمایا ہے۔

مگر مولوی صاحب کیلئے وہ دور بڑا دکھ دینے والا تھا۔قدریں بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہی تھیں۔سب کچھ بدل گیا تھا۔تعلیم کا انداز بدل گیا تھا۔جب سرسید احمد خان نے پہلی بار آواز اٹھائی تھی کہ مسلمانوں کے لئے انگریزی زبان سیکھنا بہت ضروری ہو گیا ہے تو مسلمانوں کا ردعمل بہت منفی تھا۔سرسید کو کیسے کیسے خطابات دیئے گئے۔انگریزوں کا پٹھو، ٹوڈی کہا گیا انہیں۔انہیں جوتوں کا ہار پہنایا گیا لیکن وہ اپنی جگہ ڈٹے رہے۔انہوں نے صرف زبان سے نہیں، عمل سے بھی ثابت کیا کہ ان کا موقف درست ہے اور مسلمانوں کی بقا اسی میں ہے۔

شروع میں مولوی برکت علی بھی سرسید کے مخالف تھے۔مگر پھر بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔جیسے انگریز ہندوستان میں آئے تھے، ویسے دنیا کے بہت سے ملکوں پر قابض ہوئے تھے۔اس کے نتیجے میں انگریزی کو پوری دنیا میں فروغ حاصل ہوا تھا۔اب اس زبان میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف زہریلا اور بے بنیاد پروپیگنڈا ہو رہا تھا..... اور وہ بہت موثر تھا۔کیوں کہ یک طرفہ تھا۔اس کی تردید کرنے والا، اس کا مدلل جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔کیوں کہ مسلمان تو انگریزی سے ناواقف تھے۔انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ حضورؐ کے اور اسلام کے خلاف کیسی کیسی ہرزہ سرائیاں ہو رہی ہیں۔اور تردید نہ ہونے کے نتیجے میں، جہاں انگریزی پڑھی اور سمجھی جاتی تھی، وہاں اسلام کے متعلق لغو تصورات فروغ پا رہے تھے۔اسلام کو ظالمانہ دین سمجھا جا رہا تھا۔

سرسید نے ایک طرف تو علی گڑھ یونیورسٹی قائم کی اور دوسری طرف انہوں نے اور انکے رفقا نے اس مذموم اور جھوٹے پروپیگنڈے کا جواب دینا شروع کیا.....اور وہ بھی منہ توڑ مدلل جواب۔

یہی فرماتے رہے، تیغ سے پھیلا اسلام
یہ نہ ارشاد ہوا، توپ سے کیا پھیلا ہے

تب مسلمانوں کو احساس ہوا کہ بے خبری میں ان کے اور ان کے دین کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔جہالت کی دھند چھٹنے لگی۔

پھر قرآن پاک کا انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں میں ترجمے کا سلسلہ شروع ہوا۔جاہل مولویوں نے اس پر بڑا واویلا مچایا، فتوے لگائے۔لیکن برکت علی کو ہوش آ گیا۔وہ تو ہر چیز کو قرآن پاک کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔اور قرآن میں اللہ نے جگہ جگہ فرمایا تھا کہ یہ قرآن سراسر ہدایت ہے تمام انسانوں کے لئے۔روشنی ہے پوری انسانیت کیلئے۔تو پھر یہ مسلمانوں کا فرض نہیں کہ تمام انسانوں تک پہنچانے کا اہتمام کریں۔اسی زبان میں اللہ کے اس پیغام کو منتقل کر کے پہنچائیں، جو زبان لوگوں کی ہو۔تو یہ دوسری زبانوں میں قرآن کا ترجمہ گناہ نہیں، فرض ہے۔اور فرض کو پورا نہ کرنا گناہ۔

دوسری بات مولوی برکت علی نے قرآن سے یہ سمجھی کہ کسی زبان سے نفرت کرنا کوئی اچھا نہیں

www.allurdu.com

اللہ نے سورۃ الرحمٰن میں فرمایا ہے۔ہم نے انہیں بولنا سکھایا۔گویا دنیا میں جتنی بھی زبانیں بولی جاتی ہیں،سب اللہ نے ہی انسان کو سکھائی ہیں۔

سرسید کی تحریک کامیاب رہی۔دشمنان اسلام کو پہلی بار احساس ہوا کہ ان کی لغو اور بے بنیاد باتوں کو بآسانی رد کیا جاسکتا ہے۔اور اتنی آسانی سے رد کئے جانے کے نتیجے میں ان کی پوزیشن خراب ہورہی ہے۔اسکے نتیجے میں وہ محتاط ہوئے اور ان کی ہرزہ سرائیاں محدود ہوئیں۔ترجمے کے نتیجے میں قرآن پاک اور اسلامی لٹریچر دنیا بھر میں پہنچا اور ہزاروں انسانوں نے اللہ کی ہدایت سے استفادہ کیا۔وہ صحیح معنوں میں احیائے اسلام کی تحریک تھی۔

خود مولوی برکت علی نے بڑے ذوق وشوق سے انگریزی سیکھی۔تب ان کی آنکھیں کھلیں کہ دشمنان اسلام غیر جانب دار لوگوں کے سامنے اسلام کا کتنا خراب امیج بنا رہے تھے۔

لیکن مسلمانوں میں ایک خرابی ہے.....بھیڑ چال کی۔وہ آنکھیں بند کر ایک راستے پر چلتے ہیں تو چلتے ہی جاتے ہیں۔انہوں نے انگریزی کو قبول کیا تو اس کے ساتھ انگریزی کلچر کی تقلید اندھا دھند کرنے لگے۔شعار میں انگریزوں کی نقالی ہونے لگی۔عربی کو غیر ملکی زبان سمجھ لیا گیا۔جو تعلیم ضروری سمجھی جاتی تھی،اسے غیر ضروری سمجھ لیا گیا۔وہ انگریزی پڑھانے کا بنیادی مقصد اور غرض وغایت بھول گئے۔اس کے نتیجے میں وہ خود دین سے دور ہونے لگے۔

مولوی برکت علی جلنے کڑھنے کے سوا کیا کر سکتے تھے۔ان کے لئے اپنے روزگار کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔دو چار ٹیوشن پکڑ لیتے تو کشادگی کے ساتھ گزر بسر ہوسکتی تھی۔یہ اسکول بہت بڑا تھا۔اسلئے یہاں پھر بھی عربی کے اسٹوڈنٹ موجود تھے۔ورنہ عام اسکولوں میں تو عربی کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہی ہو چکا تھا۔

ایسے میں پرنسپل صاحب کی وساطت سے انہیں اس ٹیوشن کی آفر ہوئی تو وہ افسردہ بھی ہوئے،خوش بھی اور متجسس بھی۔انہیں بتایا گیا کہ عربی پڑھنے کا یہ شوقین طالب علم راج پوت ہے۔یہ ان کے لئے عبرت کی بات تھی۔افسردگی کی بات تھی کسی مسلمان کے بچے کو یہ شوق پیدا نہیں ہوا۔ایک ہندو عربی پڑھنا چاہتا ہے،اس پر انہیں خوشی بھی ہوئی۔مگر ان کا تجسس بڑا تھا۔ایک ہندو کو عربی پڑھنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔بہر حال انہوں نے اس پیشکش کو قبول کر لیا۔

چھٹیاں شروع ہونے سے ایک دن پہلے وہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ اور اوتار سنگھ سے ملے۔ٹھاکر نے اس سے فیس کے بارے میں استفسار کیا تو وہ بولے۔''فیس کی کوئی بات نہیں۔جو آپ خوشی سے دیں گے،میرے لئے بہت کافی ہوگا''۔

ٹھاکر ان کے اس جواب سے بہت متاثر ہوا''تو آپ گرمی کی چھٹیاں ہمارے ساتھ گزاریں گے؟''

''جی ہاں۔لیکن پہلے میں برخودار سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں''۔

''ضرور''۔

مولوی صاحب نے اوتار سنگھ کو بہت غور سے دیکھا۔وہ انہیں بہت اچھا لگا۔اس کی کشادہ پیشانی غیر معمولی طور پر روشن تھی۔آنکھیں بے حد چمکدار اور متجسس۔اور ان کے چہرے پر عجیب سی پاکیزگی تھی۔وہ انہیں غیر متوقع نظروں سے دیکھ رہا تھا،جیسے ان کی پوچھ گچھ کا منتظر ہو۔اور لگتا تھا کہ وہ ڈر رہا ہے کہ کہیں وہ اسے منع نہ کر دیں۔

''بیٹا.....آپ کو اچانک یہ خیال کیوں آیا کہ آپ کو عربی پڑھنی چاہئے''۔مولوی صاحب نے پوچھا۔

وہ سٹپٹا گیا۔''جی.....وہ.....بس میرا دل چاہتا ہے عربی پڑھنے کو''۔

''بغیر کسی وجہ کے؟''۔

''جی نہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ آدمی کو زیادہ سے زیادہ زبانیں سیکھنی چاہیں''۔اس بار اوتار سنگھ نے اعتماد سے کہا۔

مولوی صاحب کے لئے یہ جواب تسلی بخش تھا۔لیکن ابھی ان کے پاس ایک اعتراض اور موجود تھا۔''تو یہ اسکول کھلنے کے بعد بھی ہوسکتا تھا۔گرمی کی چھٹیوں میں ہی کیوں؟ اب تم دس ماہ بعد گھر جاؤ گے وہاں لوگوں سے ملنے،جلنے،کھیلنے کودنے کو دل نہیں چاہے گا''۔

''جی میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔میں جلد سے جلد عربی پر دسترس حاصل کرنا چاہتا ہوں''۔

''برخودار،میں آپ کو بتا دوں کہ عربی جلد بازی میں سیکھی جانے والی زبان نہیں''۔مولوی صاحب کا لہجہ سخت ہوگیا۔''دنیا میں سب سے سخت اور منضبط قواعد اس زبان کی ہے۔اسے سرسری طور پر نہیں پڑھا جاسکتا۔اور یہ دو ماہ کا کام نہیں۔برسوں لگیں گے اس میں۔اور یہ بڑی محترم زبان ہے''۔

''میں شاید اپنی بات واضح نہیں کر سکا''۔اوتار سنگھ نے بے حد عاجزی سے کہا۔''میں بس بے تاب ہوں۔میرے اندر بڑی لگن ہے اس کے لئے''۔

مولوی صاحب کے چہرے پر نرمی چھا گئی۔یہ بے تابی تو انہوں نے پہلے ہی دیکھ لی تھی۔انہیں احساس ہو رہا تھا کہ انہیں ایک مثالی شاگرد مل رہا ہے۔''ٹھیک ہے اوتار سنگھ، ہم بھی آپ کو پوری لگن سے پڑھائیں گے''

''تو کل آپ ہمارے ساتھ چل رہے ہیں؟''۔ٹھاکر نے جلدی سے کہا۔

''جی ہاں انشاءاللہ۔میں کل صبح اپنا ضروری سامان لے کر یہاں آ جاؤں گا''۔مولوی صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

ٹھاکر نے جیب سے کچھ رقم نکالی اور گن کر ان کی طرف بڑھائی۔

مولوی صاحب نے نوٹوں کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔''یہ کیا؟''انہوں نے پوچھا۔

''چار سو روپے آپ کی دو ماہ کی فیس اور یہ دو سو روپے ضروری کتابوں لغات وغیرہ کی خریداری کے لئے''۔

مولوی صاحب مسکرائے''جو رقم میں نے ابھی کمائی نہیں،وہ کیسے لوں گا''انہوں نے کہا۔''فیس تو مہینہ پورا ہونے کے بعد لوں گا۔ہاں کتابوں کے پیسے دے دیجئے۔وہ میں آج خرید لوں گا''۔

ٹھاکر مسکرا دیا''مجھے خوشی ہے کہ میرے بیٹے کو آپ جیسا استاد ملا''۔

www.allurdu.com

پڑھائی شروع ہوئی تو مولوی برکت علی کو صحیح معنوں میں اندازہ ہوا کہ انہیں کیسا شاگرد ملا ہے۔ان کی زندگی درس وتدریس میں گزری تھی۔انہیں بہت اچھے،علم کی لگن رکھنے والے،محنتی شاگرد بھی ملے تھے،جن پر وہ آج بھی فخر کرتے تھے۔مگر وہ سب اس شاگرد کے سامنے ہیچ تھے۔وہ حصول علم کے لئے پڑھتے تھے۔لیکن یہ لڑکا تو جیسے پڑھتا نہیں تھا۔یہ عربی سے عشق کرتا تھا۔وہ پڑھاتے اور وہ والہانہ انداز میں سنتا۔اس کا ذہن ایسا تھا،یا پھر یہ عشق کا کمال تھا کہ انہیں کبھی کوئی بات دہرانے کی ضرورت نہیں پڑی۔وہ جو سنتا،اسے ذہن نشین کر لیتا۔

سوز بان رسولؐ سے عشق کرنے والے مولوی برکت علی کو اپنے اس شاگرد سے محبت ہوگئی۔مگر وہ متجسس تھے۔عربی زبان سے اس ہندو لڑکے کی محبت ان سمجھ سے بالاتر تھی۔یہ اسے کیسے ہوگئی،کہاں سے مل گئی؟ان کے پاس اس سوال کا اس کے سوا کوئی جواب نہیں تھا کہ یہ بس اللہ کی عطا ہے۔وہ جسے چاہے نواز دے۔کبھی کبھی انہیں خیال آتا کہ یہ لڑکا مسلمان ہوتا تو یقیناً اسے بڑا مرتبہ ملتا۔

وہ شہر کے رہنے والے تھے۔گڑھی کو دیکھ کر انہیں حیرت ہوئی۔وہاں ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی حیثیت بادشاہ جیسی تھی اور اوتار سنگھ گویا کوئی شہزادہ تھا۔لیکن ان دونوں کے ہی مزاج میں حاکمیت نہیں تھی۔ٹھاکر کا دبدبہ تھے۔سب اس سے ڈرتے تھے۔لیکن وہ کبھی کسی پر حکم نہیں چلاتا تھا۔اور اوتار سنگھ کو تو پڑھنے کے سوا کسی چیز سے غرض نہیں تھا۔

مولوی صاحب کو عربی پڑھانے کا شوق تھا۔لیکن اوتار سنگھ کا عربی پڑھنے کا شوق ان سے کہیں زیادہ تھا۔ایک ہفتے میں یہ نوبت آگئی کہ وہ پڑھانے سے تکھنے لگے۔لیکن لڑکا کسی جن کی طرح آدھمکتا۔وہ تو جیسے تھکتا ہی نہیں تھا۔

ایک ہفتے میں مولوی صاحب نے اسے اتنا پڑھایا تھا کہ ذہین ترین شاگرد کو وہ پڑھنے میں ایک ماہ لگتا۔انہیں اس کی رفتار غیر فطری لگی۔وہ جانتے تھے کہ ایسا شوق تیزی سے ختم بھی ہوجاتا ہے۔اور وہ یہ نہیں چاہتے تھے۔پھر یہ بھی ان کی ذمہ داری تھی کہ دیکھیں کہ پڑھایا ہوا اسے ہضم بھی ہوا ہے یا نہیں۔اور وہ اس سرکش تیز رفتار دریا کے سامنے بند بھی باندھنا چاہتے تھے۔

چنانچہ دسویں دن انہوں نے اسے پڑھنے کے بجائے اس کا ٹیسٹ لینے کا فیصلہ کیا۔''میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ جو کچھ پڑھا ہے،وہ تمہارے اندر اترا بھی ہے یا نہیں''انہوں نے اس سے کہا۔''میں امتحانی پرچا بناتا ہوں۔اسے حل کر کے دکھاؤ''۔

اوتار سنگھ اعتراض کرنا جانتا ہی نہیں تھا۔وہ تو سراپا سپردگی تھا۔

مولوی صاحب نے بڑا طویل پرچا بنایا۔جو کچھ پڑھایا تھا،وہ سب کچھ اس میں موجود تھا۔اتنے طویل تو امتحانی پرچے بھی نہیں ہوتے۔

وہ پرچا اسے تھما کر وہ مطمئن ہوگئے اور اطمینان سے پاؤں پھیلا کر لیٹ گئے۔ان کا خیال تھا کہ اب اس دن کے لئے فرصت ہی فرصت ہے۔دس دن میں پہلی بار انہوں نے سکون سے پاؤں پھیلائے تھے۔ان پر غنودگی طاری ہوگئی۔

نہ جانے کتنی دیر ہوگئی۔غنودگی میں انہیں احساس ہوا کہ کوئی ان کے پاؤں دبا رہا ہے۔ہاتھوں کا لمس جانا پہچانا تھا۔ان کا یہ شاگرد ہر اعتبار سے عجیب تھا۔پہلی رات سے اس نے معمول بنالیا تھا کہ وہ سونے کے لئے لیٹتے تو وہ ان کے پاؤں دباتا۔انہیں نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کب ان کے کمرے سے گیا۔کیوں کہ اس وقت تک وہ سو چکے ہوتے۔

تو اس غنودگی کے عالم میں انہیں یہی خیال ہوا کہ یہ رات کا وقت ہے۔وہ سونے کے لئے لیٹے ہیں اور اوتار سنگھ ان کے پاؤں دبا رہا ہے۔مگر کچھ دیر کے بعد انہیں یاد آیا کہ انہوں نے تو اسے پرچا بنا کر دیا تھا.....ایسا پرچا،جسے حل کرنے میں دو دن لگتے۔

شاید کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہوگا۔یہ سوچ کر وہ اٹھ بیٹھے۔''کیا بات ہے اوتار سنگھ۔کچھ مشکل ہو رہی ہے''۔انہوں نے نند اسی آواز میں پوچھا۔

''نہیں مولوی صاحب''۔

''تو پھر کام کیوں نہیں کرتے؟''

''جی.....کام تو میں نے کر لیا ہے''۔

مولوی صاحب کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔غنودگی ہوا ہوگئی''دکھاؤ مجھے''۔انہوں نے کہا۔

اوتار سنگھ نے کاپی ان کی طرف بڑھادی۔

مولوی صاحب نے کام چیک کرنا شروع کیا اور حیران رہ گئے۔کہیں کوئی غلطی نہیں تھی اور اس نے پورا ہر چا حل کرالیا تھا۔

مولوی صاحب سوچ میں پڑ گئے۔اس لڑکے میں کوئی بات ہے.....بھڑک کر تیز جلنے والے چراغ جیسی،جو جلدی بجھ بھی جاتا ہے۔وہ تشویش میں پڑ گئے۔ان کا باندھا ہوا بند بھی اسے روکنے میں ناکام رہا تھا۔تو اب اور کیا کریں؟پھر انہوں نے سوچا کہ یہی طریقہ کافی ہے۔بس اس کی رفتار کم کرنی ہوگی۔

اس کی حوصلہ شکنی کرنا زیادتی ہوتی۔بلکہ اس کی تو حوصلہ افزائی ضروری تھی۔چناں چہ انہوں نے کہا۔''شاباش اوتار سنگھ۔تم ہونہار اور قابل فخر شاگرد ثابت ہو رہے ہو۔لیکن ایک کمی ہے تمہارے اندر''؟

اوتار سنگھ نے کچھ نہیں کہا۔بس انہیں مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

''رائٹنگ کی طرف توجہ دو۔تحریر کی خوب صورتی بھی بہت اہم ہے''۔یہ کہتے ہوئے مولوی صاحب کو خود احساس ہوا کہ وہ زیادتی کر رہے ہیں۔مگر یہ ضروری تھا۔''کام کرتے ہوئے کبھی جلدی نہ کرو۔ہاتھ روک کر لکھو۔خوب سوچ کر جواب دو۔کام میں خوب صورتی ہونی چاہئے''۔

''جی مولوی صاحب۔آئندہ خیال رکھوں گا''۔

مولوی صاحب کو ادراک ہوگیا کہ اب وہ مزید پڑھانے کی فرمائش کرنے والا ہے۔اس سے پہلے ہی انہوں نے کہا کہا۔''تم نے بہت اچھا کام کیا ہے۔اب تم جاؤ۔آج کی چھٹی،اب کل پڑھائیں گے''۔

اوتار سنگھ ہچکچایا اور بادل نخواستہ اٹھ گیا۔

لیکن مولوی صاحب عصر پڑھ کر بیٹھے ہی تھے کہ وہ پھر آگیا۔یہ بھی ایک عجیب بات تھی۔عصر اور مغرب کے درمیان اس کی عجیب کیفیت ہوتی تھی۔اور وہ اس وقت میں لازمی طور پر ان کے پاس آتا تھا۔اس وقت میں وہ کھویا کھویا رہتا تھا۔لگتا تھا،ہمہ تن سماعت ہے۔کہیں دوسری کوئی آواز سن رہا ہے۔

''کیسے آئے اوتار سنگھ''؟مولوی صاحب نے بڑی بے رخی سے کہا۔

''یونہی مولوی صاحب.....''۔

''میں نے کہا تھا نا کہ آج کی چھٹی''۔

''میں پڑھنے نہیں آیا۔کچھ سنائیں مجھے عربی میں''۔

شام کے اس وقت میں وہ ہمیشہ یہی فرمائش کرتا تھا۔مولوی صاحب کو پہلے دن اس کا اس وقت آنا بہت گراں گزرا تھا۔کیوں کہ وہ ان کی تلاوت قرآن پاک کا وقت تھا۔وہ بہت جھنجھلائے۔پھر انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ بلند آواز میں قرآن پڑھا جائے۔اپنا معمول بھی پورا ہوجائے گا اور شاگرد کی فرمائش بھی۔

www.alluidu.com

اس خیال پر پہلے تو وہ ڈرے۔ وہ ایک راج پوت کے گھر میں تھے۔ مگر پھر انہوں نے سوچا کہ یہ کسے پتا چلے گا کہ وہ قرآن پڑھ رہے ہیں۔ چناں چہ وہ قرآن سنانے بیٹھ گئے۔ پھر یہ روز کا معمول بن گیا۔

اس وقت بھی انہوں نے قرآن پاک کی تلاوت شروع کر دی۔

مولوی برکت علی حافظ قرآن بھی تھے۔ بڑی خوب صورت قرات کرتے تھے۔ قرات کرتے کرتے ان پر کیفیت طاری ہو جاتی۔ تاہم اس کیفیت سے پہلے وہ اوتار سنگھ کو بہت غور سے دیکھتے۔ اس کے چہرے پر انہماک ہوتا۔ آنکھیں کسی غیر مرئی شے پر جمی ہوتیں اور ان میں چمک ہوتی۔ مگر اسے دیکھ کر احساس ہوتا کہ وہ یہاں نہیں ہے۔ کہیں اور بیٹھا، کچھ اور سن رہا ہے۔

اس روز بھی اسے دیکھتے دیکھتے ان پر کیفیت طاری ہو گئی۔

.....x.....

گرمی کی چھٹیوں کیلئے دہلی سے روانہ ہوتے وقت اوتار سنگھ کا عجیب حال تھا۔ آخری رات وہ بہت دیر تک کوٹھے پر بیٹھا۔ وہ پورے چاند کی رات تھی۔ ہر چیز چاندنی میں نہائی ہوئی اور روشن تھی۔ وہ بہت اداس تھا۔ دو ماہ کی جدائی کا خیال روح فرسا تھا۔ اس شام اس نے وہ آواز سنی اور سوچا کہ اب وہ دو ماہ تک یہ آواز نہیں سن سکے گا۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کے وجود میں تیر گئی۔ دو ماہ..... ساٹھ دن! یہ تو بہت بڑا عرصہ ہے۔ کون جانے، اس عرصے میں کیا ہو جائے۔

پھر اسے خود بھی اس بات پر حیرت ہوئی کہ جس کیلئے وہ تڑپ رہا ہے، جس کی جدائی سے وہ ڈر رہا ہے، وہ اس سے کبھی نہیں ملا ہے۔ نہ کبھی اسے دیکھا ہے۔ اس رات اس نے پہلی بار یہ سوچا کہ اگر وہ بدصورت ہوئی تو کیا ہوگا۔

اس پر وہ دیر تک سوچتا رہا۔ بنیادی طور پر وہ حسن پرست تھا۔ خوب صورتی کسی بھی شکل، کسی بھی روپ میں ہو، اسے بہت زیادہ متاثر کرتی تھی۔ کوئی حسین منظر دیکھتا تو اس کی آنکھیں خود بخود بھیگ جاتیں۔ اندر عجیب سی کیفیت ہو جاتی۔ پھر وہ اندر سے بھی بھیگ جاتا۔ اس کے اندر ستائش، بے پایاں ستائش ابھرتی..... اس منظر کے خالق کیلئے، جس نے وہ خوب صورتی پیدا کی۔ پھر وہ شکر ادا کرتا۔ زندگی دینے والے کا۔ اگر اسے زندگی نہ ملی ہوتی تو وہ یہ خوب صورت منظر کیسے دیکھتا۔ اتنی خوب صورت کیفیت کا اسے کیسے تجربہ ہوتا۔ سب نعمتیں زندگی کے ہی دم سے تو ہیں۔ زندگی نہیں تو کسی نعمت سے اس کا کیا واسطہ۔

پہلے اس نے اس پر سوچا..... اور ایک لمحے میں اپنے اس خیال کو پوری شدت سے مسترد کر دیا۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ جس کی آواز اتنی خوب صورت ہے، وہ بدصورت نہیں ہو سکتی۔ مگر پھر اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی اس محبت کی بنیاد اس امکان پر رکھ رہا ہے کہ وہ اپنی آواز کی ہی طرح خوب صورت ہوگی۔ جب کہ یہ امکان ہے، یقینی امر نہیں۔ اسے لگا کہ وہ کسی بہت بڑے محل کی بنیاد پانی پر رکھ رہا ہے۔

پہلے تو یہ سوچنا ضروری تھا کہ وہ محبت ہے بھی یا نہیں۔ پہلے تو یہ خیال اسے بے حد توہین آمیز لگا۔ مگر پھر اس کی اہمیت اس کی سمجھ میں آئی۔ اس نے شاعری کی مدد سے اور اپنے خیالات اور تصورات کی بنیاد پر جو محبت کا خاکہ بنایا تھا، یہ اس کا جذبہ اس پر پورا اترتا تھا۔ اس میں بے تابی تھی، تڑپ تھی، پاکیزگی تھی اور صورت حال کیسی ہی ہو..... اور چاہے تکلیف ہو، اس میں بھی خوب صورتی تھی۔ اب اس وقت کے جدائی کے دکھ ہی کو لے لو۔ یہ بھی خوب صورت ہے۔ اس سے دور جانے کے خیال سے جو اذیت ہوتی ہے، اس میں بھی خوب صورتی ہے۔ نہیں بھئی، یہ تو سراسر محبت ہے۔ اس نے طمانیت سے سوچا۔ میرا جی تو چاہتا ہے کہ اس آواز والی کو دیکھوں۔ مگر دیکھنے کی ایسی تڑپ نہیں کہ پاگل کر دے۔

سوال وہی تھا کہ اگر وہ بدصورت ہوئی تو کیا اس کے محسوسات، اس کے جذبات یہی رہیں گے اور یہ بڑا مشکل سوال تھا۔ ایک دلیل اس کے حق میں تھی۔ وہ اسے دیکھنے کیلئے کبھی تڑپا نہیں تھا۔ اس نے کبھی چھپ کر اسے دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گویا اس کی صورت شکل کی اتنی اہمیت نہیں تھی۔

بہر حال بہت سوچنے پر بھی اسے اس کا حتمی جواب نہیں مل سکا۔ اس نے سوچا کہ یہ فکر بے کار ہے۔ اس کا فیصلہ آنے والا وقت ہی کرے گا۔ جب وہ اسے دیکھے گا۔ اگر وہ بدصورت ہوئی اور اس کا جذبہ اسے دیکھنے کے بعد کمتر ہو گیا تو یہ ثابت ہو جائے گا کہ وہ محبت نہیں ہے اور ایسا ہوا تو اسے بہت دکھ ہوگا۔ وہ صدمہ ہوگا اس کے لئے۔

اس دوران اس کی حقیقت پسندی نے اسے یہ احساس بھی دلایا تھا کہ وہ ایک کم عمر لڑکا ہے، جو محبت کے بارے میں محض نظریات قائم کئے بیٹھا ہے۔ یہی نہیں، وہ محبت کا متمنی بھی ہے۔ گویا وہ ایک ایسا نوجوان ہے، جسے محبت سے محبت ہے۔ جو پہلا موقع ملتے ہی کسی سے بھی محبت کر سکتا ہے۔ یہ خیال بھی کچھ حوصلہ افزا نہیں تھا۔

www.allurdu.com

بہرکیف دہلی میں اس آخری رات وہ ایک پل کیلئے بھی نہیں سویا۔اسے ڈر تھا کہ صبح روانگی کے وقت وہ رو پڑے گا اور یوں شاید اس کا بھید کھل جائے۔لیکن روانگی کا وقت آیا تو اس کی کیفیت بالکل مختلف تھی۔اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ خوش ہے اور اس خوشی کا سبب مولوی برکت علی تھے۔یہ خیال تھا کہ وہ دور جارہا ہے۔لیکن وہاں وہ اجنبی زبان سیکھ سکے گا، جو اس کی محبت کی زبان ہے۔پھر ایک دن آئے گا کہ وہ اس کی بات سمجھ سکے گا۔یہ کم خوشی کی بات نہیں۔یہ تو مولوی صاحب نے اسے بتادیا تھا کہ عربی بڑی مشکل زبان ہے۔کوئی بات نہیں۔میری محبت، میری لگن، میری تڑپ اس مشکل کو آسان کردے گی۔

دہلی سے نکلتے ہی وہ گھر پہنچنے کے لئے تڑپنے لگا۔پڑھائی جو شروع کرنی تھی۔

پڑھائی شروع ہوئی تو اس کی دنیا ہی بدل گئی۔اب جیسے عربی پڑھنے اور سیکھنے کے سوا دنیا میں اس کیلئے کچھ نہیں تھا۔وہی اس کیلئے وصال یار تھا اور وہی عبادت۔پہلی بار جب اس نے مولوی صاحب کو عربی بولتے سنا تو اسے ان سے محبت ہوگئی۔اس نے سوچا، یہ اس کیلئے کتنا بڑا کام کررہے ہیں۔اسے محبوب کی بات سمجھنے کے قابل بنارہے ہیں۔اس خدمت کا تو کوئی صلہ ہو ہی نہیں سکتا۔

پھر گڑھی میں پہلی شام آئی.....وہ وقت جب وہ کوٹھے پر جاتا تھا.....وہ آواز سنتا تھا۔وہ وقت آیا تو وہ بے تاب ہوگیا۔وہ اپنے کمرے سے نکلا.....کھوٹے پر لے جانے والے زینے کی طرف بڑھنے کیلئے۔لیکن وہ تو وہاں تھا ہی نہیں۔وہ گڑھی میں تھا، دہلی میں نہیں۔اس کے بے تابی وحشت میں بدل گئی۔اس کا جی چاہا کہ اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔دیوار سے سر ٹکرائے۔بس ایسا ہوجائے کہ وہ آنکھیں بند کرے اور کھولے تو وہ دہلی میں ہو.....اس کوٹھے پر اور وہ آواز سورج کی طرح طلوع ہو.....دھوپ کی طرح پھیلتی.....چڑھتی جائے۔یہاں تک کہ ہر چیز پر چھا جائے۔دنیا میں کچھ بھی نہ رہے اس کے سوا۔

اس وحشت میں بھی اسے احساس تھا کہ یہ ان ہونی ہے۔وحشت سے فاصلے نہیں مٹتے۔وحشت تو حد درجہ بے بسی کا ردعمل ہے.....بے بسی کی آخری حد، جس کو پہنچ کر آدمی نقصان تو اٹھا سکتا ہے، دوسروں کو نقصان پہنچا بھی سکتا ہے۔لیکن جو وہ چاہتا ہے، وہ کسی طرح نہیں ہوسکتا۔مگر اس احساس میں بھی کوئی تسکین نہیں تھی۔اس نے جان لیا کہ یہ وحشت دور کرنا اس کے اختیار میں نہیں ہے۔

اسے احساس بھی نہیں ہوا اور وہ اس کمرے کی طرف چل دیا، جو مولوی صاحب کیلئے مخصوص کردیا گیا تھا۔اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔بس ایک اندھی، گونگی، بہری خواہش تھی جو طوفان کی طرح اس کے اندر اودھم مچا رہی تھی.....اسے دہلی جانا ہے، وہ آواز سننی ہے۔

مولوی صاحب اپنے کمرے میں کھڑے کسی کپڑے کو تہہ کررہے تھے (اس وقت اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ جاءنماز ہے) انہوں نے چونک کر اسے دیکھا.....اور دیکھتے رہ گئے شاید اس کے چہرے پر انہیں اس کے اندر امنڈنے والے طوفان کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔

''کیا بات ہے اوتار سنگھ''؟انہوں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

اوتار سنگھ کے اندر بے تابی کی آگ بھڑک رہی تھی۔لفظ اسے مل ہی نہیں سکتے تھے۔''وہ مولوی صاحب.....عربی.....''اس نے بمشکل کہا۔

مولوی صاحب کے چہرے پر سرد مہری اور بے رخی کی سختی ابھر آئی۔تاہم انہوں نے لہجے کو سخت نہیں ہونے دیا۔''میں نے تمہیں صبح ہی بتادیا تھا بیٹے کی پڑھائی ٹائم ٹیبل کے مطابق ہوگی اور یہ کہ پڑھانے والا میں ہوں۔ہر فیصلہ میرا ہوگا''۔

لہجہ نرم تھا۔لیکن لفظ بہت سخت تھے اور ان میں قطعیت تھی۔کوئی اور وقت ہوتا تو اوتار سنگھ میں آگے بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔لیکن اس وقت تو وہ ایک ایک ٹرانس میں تھا۔یہی بہت بڑی بات تھی کہ اس وحشت میں بھی وہ حفظ مراتب کو نہیں بھولا۔حد ادب اسے یاد رہی۔''جی مولوی صاحب، مجھے یاد ہے''۔اس نے بھڑکتی آواز میں کہا۔

''لیکن.....''

''لیکن کیا''؟

''میں پڑھنے نہیں آیا ہوں۔آپ مجھے عربی میں کچھ سنادیجئے.....شاعری.....کوئی کہانی.....کچھ بھی''۔

مولوی صاحب کیلئے وہ فرمائش خلاف توقع تھی۔''لیکن ابھی تم اس قابل کہاں ہو کہ عربی میں کچھ سمجھ سکو۔ابھی تو تم نے پورے حروف بھی نہیں پڑھے ہیں''۔

''بس آپ مجھے سنادیجئے کچھ، آپ کی مہربانی ہوگی مجھ پر''۔

چند لمحے کیلئے مولوی صاحب سوچ میں پڑ گئے۔پھر انہوں نے کہا۔''ٹھیک ہے۔میں سناتا ہوں۔مگر ادب سے سننا۔کوئی آواز نہ ہو''۔

''جی مولوی صاحب''۔

اور مولوی صاحب نے پڑھنا شروع کردیا۔

جیسے ہی وہ اجنبی الفاظ اوتار سنگھ کے کان میں پڑے، اس کے اندر کا منظر بدلنے لگا۔اندر بھڑکتی ہوئی وحشت کی آگ آہستہ آہستہ سرد ہونے لگی۔

www.allurdu.com

بے تابی سکون سے بدلنے لگی۔ تڑپ ختم ہوتی گئی اور اس کی جگہ سپردگی نے لے لی۔ اندر کا ہی نہیں، باہر کا منظر بھی بدلنے لگا۔ وہ کمرا غائب ہو گیا۔ اب اس کی جگہ بے کراں صحرا تھا..... متحرک صحرا، جو آگے بڑھتا ہوا کہیں اور جا رہا تھا۔ پھر صحرا تھم گیا۔ اب وہ خود متحرک تھا۔ چند لمحے بعد اسے دہلی کی جامع مسجد کے مینار نظر آئے..... اور اگلے ہی لمحے وہ اس کوٹھے پر تھا، جو اس آواز سے معمور تھا اور اب وہ پوری طرح پر سکون تھا..... اور وہ آواز سن رہا تھا، جو لگتا تھا کہ پوری کائنات پر چھائی ہوئی ہے۔

اسے دبا دبا سا سہی، مگر یہ احساس تھا کہ وہ اپنی حویلی میں، مولوی صاحب کے کمرے میں ہے اور جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے، حقیقت نہیں، تصور ہے۔ مگر وہ اتنا حقیقی لگ رہا تھا کہ اس نے زور زور سے آنکھیں مل کر دیکھا۔ اصولاً کوٹھے کے اس منظر کو ہٹ جانا تھا اور مولوی صاحب کے کمرے کو نظر آنا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ تو کیا میں سچ مچ اس کوٹھے پر ہوں۔ اس نے خود سے پوچھا۔ مولوی صاحب اور ان کا کمرا نظر نہیں آ رہا ہے اور تو اور مولوی صاحب کی آواز بھی نہیں ہے۔ یہ تو وہی آواز ہے۔ لیکن اس کے ذہن کا ایک چھوٹا سا حصہ اس کی تردید کر رہا ہے۔

چند لمحے اور گزرے تو اس نے خود کو اس رو کے سپرد کر دیا۔ اب کہیں کوئی خیال، کوئی احساس نہیں تھا۔ بس وہ کوٹھے پر بیٹھا وہ آواز سن رہا تھا۔

اس کیفیت میں جیسے زمانے گزر گئے۔ پھر اچانک ہر طرف خاموشی چھا گئی۔ وہ آواز معدوم ہو گئی تھی۔ کائنات جیسے تھم گئی اور وہ بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا۔

پھر جیسے پر سکون جھیل میں کوئی چھوٹا سا کنکر گر کر اسے متاثر کر دیتا ہے، اس کی سماعت کو ایک آواز نے جھنجھوڑ دیا۔ ''اوتار سنگھ''۔

اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ مولوی صاحب تھے۔ مگر وہ خود ابھی تک اس سحر انگیزی میں گرفتار تھا۔ مولوی صاحب کا کمرا نظر آیا تو اسے اچھا نہیں لگا۔ وہ خاموشی سے، کھوئی کھوئی آنکھوں سے انہیں تکتا رہا۔

''اب تم جاؤ۔ نماز کا وقت ہو گیا ہے''۔

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بس وہ اٹھ کر کچھ کہے بغیر کمرے سے نکل آیا۔

اس شام وہ مولوی صاحب کے بارے میں سوچتا رہا۔ اسے مولوی صاحب سے ایسی محبت محسوس ہو رہی تھی کہ اس نے آواز والی کے سوا کسی سے نہیں کی تھی۔ وہ بار بار سوچتا کہ آج مولوی صاحب نہ ہوتے تو کیا ہوتا۔ وہ تو اس کوٹھے پر پہنچنے کی لگن میں پاگل ہو جاتا۔

پھر وہ اپنی اس کیفیت کے بارے میں سوچنے لگا۔ مولوی صاحب جب پڑھ رہے تھے تو وہ کتنا پر سکون، کتنا شانت ہو گیا تھا اور مولوی صاحب بالکل اسے نیچے والی کے انداز میں پڑھ رہے تھے۔ پھر کیا ہوا کہ آواز کا فرق مٹ گیا۔ وحشت ختم ہو گئی اور وہ پر سکون ہو گیا۔

تو کیا یوں ہے کہ اہمیت آواز کی نہیں۔ آواز تو محض ایک وسیلہ، ایک بہانہ ہے۔ تو کیا یوں ہے کہ اصل اہمیت الفاظ کی ہے، جنہیں وہ سمجھتا نہیں، نفس مضمون کی ہے، جس کا مفہوم وہ نہیں سمجھتا، پھر بھی وہ اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ تو وہ کیسے لفظ ہوں گے۔ وہ کیسا مضمون ہوگا، جو سمجھ میں نہ آنے پر بھی آدمی کی دنیا بدل دے۔!

بات بہت بڑی، مگر بہت آسان تھی۔ کم از کم اس کے لئے کیوں کہ وہ بچپن ہی سے سوچنے اور تجزیہ کرنے کا عادی تھا۔ لیکن آنکھوں پر محبت کا رنگ چڑھ جائے تو سامنے کی چیز بھی دکھائی نہیں دیتی۔ شاید ابھی وہ اس بڑی بات کے لئے بہت چھوٹا تھا۔

بلکہ اصل بات شاید یہ تھی کہ ابھی سمجھنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ سمجھنے کا بھی تو ایک وقت مقرر ہے۔

بہر حال اوتار سنگھ کی سمجھ میں یہ ضرور آ گیا کہ مولوی صاحب اسے وہ کچھ دے رہے ہیں اور دینے والے ہیں، جو بہت بڑا ہے..... جو کوئی کسی کو نہیں دیتا۔ اور اس کے صلے میں وہ جو کم سے کم انہیں دے سکتا ہے، محبت ہے اور محبت تو اسے ان سے خود بخود ہو گئی تھی۔

وہ آواز کو بھول کر مولوی صاحب کی محبت میں سرشار ہو گیا۔ رات کو وہ مولوی صاحب کے کمرے میں گیا۔ وہ سونے کیلئے لیٹے ہی تھے۔ مگر شاید اجنبی جگہ ہونے کی وجہ سے انہیں نیند نہیں آ رہی تھی۔ پہلی بار وہ اپنی بیوی اور بچوں سے دور ہوئے تھے..... اس کی وجہ سے۔ انہیں عجیب لگ رہا ہوگا۔ اس کی محبت اور فزوں ہو گئی۔

وہ ان کے پاؤں دبانے لگا۔

مولوی صاحب کسمسائے۔ ''کیا کرتے ہو اوتار سنگھ۔ اس کی ضرورت نہیں''۔

''آپ کو ضرورت نہیں۔ مگر مجھے ہے''۔

''کیا مطلب''؟

''آپ مجھے جو کچھ دے رہے ہیں، اس کے بدلے میں، میں زندگی سمیت سب کچھ آپ کو دے دوں تو کم ہے۔ یہ تو بہت معمولی خدمت ہے''۔

مولوی صاحب حیران رہ گئے۔ کیا یہ غیر مسلم لڑکا اس کی اہمیت کو سمجھتا ہے؟ کیسے؟ یہ تو کچھ جانتا ہی نہیں۔ بہر حال اوتار سنگھ کے سچے جذبے نے ان کے دل کو چھو لیا تھا۔ ان کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ''تم بہت اچھے ہو اوتار سنگھ''۔ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''اللہ تمہیں ہدایت سے نوازے اور اپنی راہ دکھائے''۔

اوتار سنگھ ان کی ٹانگیں دباتا رہا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ سوچتے ہیں تو کہ نکل آیا

www.allurdu.com

اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے وہ ٹھٹھک گیا۔ اسے پتا جی کا خیال آ گیا۔ وہ بھی تو اپنے کمرے میں اکیلے ہوں گے اور جاگ رہے ہوں گے۔ ابھی وہ مولوی صاحب کی خدمت کر کے آیا ہے۔ لیکن اسے کبھی پتا جی کا خیال نہیں آیا۔ کتابیں بتاتی ہیں کہ ماں باپ اور استاد کا ایک ہی درجہ ہوتا ہے اور وہ دنیا میں سب سے زیادہ محترم ہوتے ہیں۔

اس خیال کے ساتھ ہی اس کے اندر ملامت ابھری۔ وہ فرض ادا کرنے میں، دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں کتنا پیچھے ہے۔ وہ بس خود میں ہمیشہ گم رہا۔ اس نے کبھی کسی کے بارے میں نہیں سوچا۔ ارے پتا جی نے تو برسوں پہلے اپنی پتنی، میری ماتا کو کھو دیا تھا اور ان کے پاس تو میرے سوا کوئی بھی نہیں اور میں دہلی چلا گیا۔ میرے اور ماتا جی کے بغیر ان پر کیا گزری ہوگی۔ مولوی صاحب کو آج بیوی بچوں سے جدا ہوئے پہلا دن ہے تو انہیں نیند نہیں آ رہی ہے۔ تو کیا میرے پتا جی برسوں سے نہیں سوئے ہوں گے اور میں نے کبھی سوچا بھی نہیں۔ بلکہ میں تو گرمی کی یہ چھٹیاں دہلی میں گزارنا چاہتا تھا۔ صرف اس لئے کہ ہر روز وہ آواز سنتا رہوں۔ تو کیا محبت آدمی کو خود غرض اور بے پروا بنا دیتی ہے۔ نہیں..... محبت تو بہت عظیم جذبہ ہے۔

اوتار سنگھ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ محبت سچی ہو تو آدمی کو ہر شخص کے حقوق اور اپنے فرائض یاد دلاتی ہے۔ دل کو گداز اور عمل کو پھولوں کی سی نرمی بخشتی ہے۔ وہ لمحہ اوتار سنگھ کے لئے بہت بڑے انقلاب کا تھا۔

اس نے آنسو پونچھے اور ٹھاکر کے کمرے کی طرف چلا دیا۔

ٹھاکر کے کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ وہ بیٹھا ڈائری میں کچھ لکھ رہا تھا۔ اس نے بیٹے کو کمرے میں دیکھا تو اس کا چہرہ جگمگا اٹھا۔ اس نے ڈائری بند کی، قلم ایک طرف رکھا اور مسکرایا۔ ''کیسے ہو پتر''؟

''ٹھیک ہوں پتا جی''۔ اوتار سنگھ نے کہا۔ پھر پوچھا۔ ''آپ سوئے نہیں''۔

''نیند تو مجھے کم ہی آتی ہے پتر''۔ ٹھاکر نے سادگی سے کہا۔

اوتار سنگھ کا دل کٹنے لگا۔ اس چھوٹے سے جملے میں بہت کچھ تھا۔ ماں کی موت کے بعد کے، اس کے تعلیم کے سلسلے میں دہلی چلے جانے کے بعد کے باپ کے شب و روز کی پوری داستان تھا وہ جملہ۔ اسے دکھ ہوا کہ اس نے کبھی باپ کے تنہائی کے دکھ اور کرب کو محسوس کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ کچھ اسکے بارے میں سوچا بھی نہیں۔

ٹھاکر اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ ''کیا بات ہے پتر''؟

''کچھ نہیں پتا جی۔ آپ پاؤں پھیلا کر لیٹ جائیں۔ مجھے آپ کے پاؤں دبانے ہیں''۔ وہ بیڈ پر بیٹھ گیا۔

''نہیں پتر، اس کی ضرورت نہیں۔ تم جا کر سو جاؤ''۔

''پتا جی، آپ مجھے معاف کر دیں''۔ اوتار سنگھ نے شرمندگی سے کہا۔ ''مجھے آپ کا خیال رکھنا چاہئے تھا۔ لیکن میں نے نہیں رکھا۔ مجھ سے بہت بڑی بھول ہو گئی''.....

ٹھاکر نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ نا پتر..... ایسی کوئی بات نہیں۔ تمہاری پڑھائی میں میری بہت بڑی خوشی ہے''۔

''آپ لیٹیں تو۔ آپ کے پاؤں دبانے میں میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہوگی''۔

ٹھاکر چند لمحے ہچکچایا۔ پھر لیٹ گیا۔ اوتار سنگھ اس کے پاؤں دبانے لگا۔ اس سے پہلے اس نے روشنی گل کر دی تھی۔

بہت دیر ہو گئی۔ اوتار سنگھ پاؤں دباتا رہا۔ ٹھاکر کروٹیں بدلتا رہا۔ نیند اسے آ ہی نہیں رہی تھی۔ یہ احساس الگ ستا رہا تھا کہ وہ بیٹے کو تکلیف دے رہا ہے۔ ذرا دیر بعد اس نے کسمساتے ہوئے کہا۔ ''اب بس کرو پتر۔ تم تھک گئے ہو گے''۔

''اس کام میں تھکن نہیں ہو سکتی پتا جی''۔ اوتار سنگھ کے لہجے میں سچی خوشی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ ایسا سکون، ایسی خوشی، ایسے طمانیت اسے کبھی نہیں ملی تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے بہت وقت ضائع کر دیا ہے۔ ''آپ سو جائیں۔ پھر میں چلا جاؤں گا''۔

''مجھے نیند کہاں آتی ہے پتر''۔ ٹھاکر نے بے بسی سے کہا۔ ''تم جا کر سو جاؤ''۔

''نہیں پتا جی۔ جب تک آپ سو نہیں جاتے، میں آپ کی ٹانگیں دباؤں گا''۔

کچھ دیر اور گزر گئی۔ پھر ٹھاکر نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا پتر۔ میری ایک بہت بڑی خوشی ہے۔ وہ پوری کرو گے''۔

''بولیں پتا جی''۔

''تم یہاں آ کر میرے ساتھ سو جاؤ''۔

اوتار سنگھ کو بہت حیرت ہوئی۔ لیکن اس نے جان لیا کہ ٹھاکر صرف اسے پاؤں دبانے سے روکنے کو، اسے ٹالنے کو یہ بات نہیں کر رہا ہے۔ اس کے لہجے میں سچائی تھی۔ جیسے وہ واقعی اس کے لئے بہت بڑی خوشی ہو۔ اس نے ہاتھ روک دیئے اور بستر پر باپ کے ساتھ جا لیٹا۔

چند لمحے دونوں ذرا سے فاصلے پر لیٹے رہے۔ لیکن ان دونوں کے درمیان بہت بڑا فاصلہ تھا۔ اتنے قریب لیٹنے کے باوجود وہ اپنی اپنی جگہ تنہا تھے۔ دونوں ایک دوسرے طرف رخ کئے لیٹے تھے۔ ٹھاکر بیٹے کے چہرے کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

پھر ٹھاکر نے ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کو چھوا اور بولا۔ ''او یار اوتار سنگھ، ساتھ ایسے تو نہیں سوتے۔ مجھ سے لپٹ جا نا یار''۔

اوتار سنگھ کی حیرت کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ ٹھاکر کی ٹوٹتی بکھرتی آواز اور لہجے کی وہ تڑپ اس کے لئے بالکل نئی چیز تھی..... اس کی فرمائش کی طرح۔ باپ کی محبت کا اسے ہمیشہ احساس رہا تھا لیکن اس کا اظہار اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

وہ باپ سے لپٹ گیا..... چھوٹے سے بچے کی طرح!

''پتا جی کہتے تھے، ٹھاکر ہونا بڑا بھاری کام ہے''۔ اس نے باپ کی بھرائی ہوئی آواز سنی۔ ''ٹھاکر کو سخت ہونا چاہئے..... نرمی سے دور۔ ایک ٹھاکر کیلئے سب سے بڑی چیز آن ہے''۔ اس کی زبان ہے۔ محبت ٹھاکروں کیلئے نہیں بنی۔ کیوں کہ یہ کمزور کرنے والی شے ہے۔ محبت کرو تو اسے چھپا کر رکھو۔ اس کا اظہار مت کرو کبھی۔ پتر اوتار سنگھ پتا جی کی آگیہ کا پالن کرنا میرا دھرم تھا۔ میں نے ہمیشہ اچھا ٹھاکر بننے کی کوشش کی''.....

اوتار سنگھ حیرت سے باپ کی باتیں سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ٹھاکر تو میں بھی ہوں۔ مگر مجھے محبت کتنی عزیز ہے۔ کیسے میں محبت پر جان دیتا ہوں..... اور کس طرح کی محبت ہوتی ہے مجھے۔ اگر پتا جی کو اس کا پتا چل جائے تو؟ وہ غصہ ہوں گے؟

ٹھاکر اپنی کہے جا رہا تھا۔ ''..... لیکن میں اچھا ٹھاکر تھا ہی نہیں۔ کوشش کے باوجود بن بھی نہیں سکا۔ شاید اگر تم مجھے شادی کے ایک دو سال بعد مل جاتے تو میں اچھا ٹھاکر بن جاتا۔ مگر تم تو برسوں کی منتوں مرادوں اور ماتھا رگڑنے کے بعد ملے۔ ایسے میں کہیں آن رہ پاتی ہے! پھر بھی میں اچھا ٹھاکر بننے کی کوشش کرتا رہا۔ پر ہوا یوں کہ نہ میں ادھر رہا نہ ادھر۔ ٹھاکروں کو دوستی بہت راس آتی ہے۔ بدقسمتی سے میرا کوئی میتر بھی نہیں تھا۔ جمال دین سے دوستی کو بہت من کرتا تھا۔ پر میں جانتا تھا کہ وہ اپنے حال میں مست ہے۔ سدا میرا تمی رہے گا۔ متر کبھی نہیں بنے گا۔ سو جیون اکیلے ہی بیت گیا۔ میں تمہاری ماتا جی سے بہت پریم کرتا تھا۔ پر بھی اس پر ظاہر نہیں ہونے دیا، یہاں تک کہ وہ چلی گئی۔

www.allurdu.com

''اوراوتار سنگھ،تم سے میں نے محبت نہیں کی۔تم تو میری جان تھے۔تم میں میری جان تھی۔ پر میں نے تمہیں کبھی بتایا نہیں۔آج بھی نہیں بتا رہا ہوں کبھی بھی نہیں بتاؤں گا۔ ٹھاکر کبھی یہ بات بتایا نہیں کرتے۔مگر میں تم سے یہ ضرور کہوں گا کہ تمہیں ٹھاکر بننے کی ضرورت نہیں۔تم آزاد ہو۔جو چاہو،کر سکتے ہو.....اور کرو''۔

ٹھاکر عجیب سے ڈوبتے لہجے میں بول رہا تھا اور اوتار سنگھ اس سے لپٹا ہوا اس کی باتیں سن رہا تھا۔وہ حیران بھی تھا۔لیکن پتاجی کی آخری بات سن کر اسے خوشی ہوئی تھی۔ انہوں نے اس کی ایک بڑی مشکل آسان کر دی تھی۔

وہ یہ سوچتا رہا۔اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ ٹھاکر کی آواز تھم گئی ہے۔جب اسے احساس ہوا اور اس نے باپ کے سینے سے سر ہٹا کر دیکھا تو پتا چلا کہ ٹھاکر سو چکا ہے۔اس نے سوچا،اب وہ جب بھی یہاں ہوگا،پتاجی کے ساتھ ہی سویا کرے گا۔

.....x.....

کیدار ناتھ کی ٹھاکر پرتاپ سنگھ سے دور پرے کی رشتے داری تھی۔وہ ٹھاکر کے دیہانت کے بعد گڑھی میں وارد ہوا تھا۔اسے زمین بھی دی گئی تھی رشتے داری کے ناتے اس کا شمار زمین داروں میں ہوتا تھا۔مگر وہ زمین داری بہر حال ٹھاکر پرتاپ کی دی ہوئی تھی۔ٹھاکر خون کے اعتبار سے اسے اپنا ہم رتبہ نہیں سمجھتا تھا۔بس لحاظ کر لیتا تھا۔کیدار ناتھ کو اس کی پروا بھی نہیں تھی۔اس کا خواب تو بڑا تھا۔ٹھاکر کے اولاد نہیں تھی۔کیدار ناتھ کو یقین تھا کہ ایک دن وہی ٹھاکر کا وارث ہوگا۔ٹھاکر کے قریبی رشتے دار سب زمین جائیداد والے تھے۔ان کو ٹھاکر کی زمینوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ٹھاکر کی موت کے بعد وہ اسی کے حصے میں آتی۔

لیکن اوتار سنگھ کی پیدائش نے اس کے سب سپنے بکھیر دیئے۔اوتار سنگھ سے اس کا الگ ہی تعلق بن گیا۔نفرت کا تعلق۔اوتار سنگھ کو پتا نہیں تھا کہ کیدار ناتھ نے اس کی پیدائش کے لمحے سے لے کر آج تک اس سے صرف نفرت کی ہے.....خالص نفرت!وجہ یہ تھی کہ اوتار سنگھ اس کے راستے کی دیوار بن گیا تھا۔کیدار ناتھ ہر وقت سوچتا رہتا تھا کہ اس دیوار کو کیسے گرائے۔لیکن کوئی اپائے نہیں سوجھتا تھا۔براہ راست وار کرنے سے وہ ڈرتا تھا۔بات کھل جائے،یہ اسے کسی طور گوارا نہیں تھا۔لیکن اب ایسا لگتا تھا کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

اس روز کیدار حویلی چلا آیا۔ٹھاکر پرتاپ تو موجود نہیں تھا۔اوتار سنگھ سے ملاقات ہوگئی۔

''کہو چاچا جی،کیسے ہو؟''۔اوتار سنگھ نے اس سے پوچھا۔

''بھگوان کی کرپا ہے۔اچھا ہوں''۔

''ہماری یاد کیسے آ گئی؟''۔

کیدار ناتھ نے دل میں کہا.....تم کو میں بھولتا ہی کب ہوں چھوٹے ٹھاکر کہ یاد آنے کا سوال ہو۔پیدائش سے لے کر آج تک تم میرے دل و دماغ پر بوجھ بنے ہوئے ہو۔ لیکن اوپر سے وہ مسکرا دیا۔''تم تو ہمیشہ یاد رہتے ہو پتر''۔وہ بولا۔''آج میں جے پور جا رہا ہوں.....میلے میں۔سوچا تمہیں بھی پوچھ لوں''۔

''نہیں چاچا جی۔میں تو نہیں جا سکتا''۔اوتار سنگھ نے صاف انکار کر دیا۔

کیدار ناتھ کو بے حد مایوسی ہوئی۔یہ ایک کوشش تو وہ برسوں سے کرتا رہا تھا۔اس نے ہمیشہ چاہا کہ اوتار سنگھ سے قریب ہو جائے۔وہ اس سے محبت اور شفقت جتاتا۔تاکہ کبھی اسے اپنے ساتھ کہیں لے جائے۔ایسے ہی کسی حادثے کا اہتمام کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔لیکن اوتار سنگھ کبھی اس سے بہت قریب نہیں ہوا۔اس کی وجہ وہ مسلا بچہ وصال دین تھا۔بلکہ اس کا پورا پریوار۔اوتار سنگھ ان کی قربت میں ایسا مگن تھا کہ اسے کسی اور کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

اس وقت بھی کیدار ناتھ اوتار سنگھ کے انکار پر اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔تاہم اس نے لہجے پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔''کیوں نہیں جا سکتے پتر؟اب تو چھٹیاں ہیں تمہاری''۔

گھر پر پڑھائی کر رہا ہوں چاچا۔دیکھتے نہیں،مولوی صاب کو ساتھ لایا ہوں''۔

''دیکھتا تو ہوں۔پر سمجھ نہیں آتی''۔کیدار ناتھ بولا۔''اس مسلے سے تم کیا پڑھتے ہو؟''۔

''عربی پڑھتا ہوں''۔اوتار سنگھ نے جلدی سے کہا۔پھر ذرا سخت لہجے میں بولا۔''ان کے متعلق ایسی خراب بات مت کرو چاچا۔وہ میرے استاد ہیں''۔

''تمہیں تو پتر مسلوں سے شروع ہی سے محبت ہے''۔کیدار ناتھ نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔''یہ استاد ہے۔وہ وصال دین تمہارا بھائی ہے۔اور حمیدہ کو تم ماتا سمجھتے ہو۔اور میں نے تو کوئی خراب بات نہیں کی۔پر مسلے کو تو مسلا ہی کہیں گے اور پتر اوتار سنگھ،اس سے کوئی اچھی چیز تو تم پڑھ اور سیکھ نہیں سکتے''۔کیدار ناتھ بہت ڈھٹائی سے بات کر رہا تھا۔ اوتار سنگھ کو غصہ آ گیا۔''یہ بات تو تم پتاجی سے کرنا چاچا۔وہ تمہیں بہتر طور پر سمجھا سکیں گے''۔

پرتاپ سنگھ کے نام پر کیدار ناتھ کا چہرہ دھواں ہو گیا۔''اس کی ضرورت نہیں۔میں چلتا ہوں''۔اس نے کہا اور وہاں سے نکل آیا۔

www.aiurdu.com

کیدار ناتھ بہت عیار اور شاطر آدمی تھا۔ اس وقت اسے احساس ہو رہا تھا کہ اوتار سنگھ کا مسلوں کی طرف جو جھکاؤ ہے، وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ مگر یہ بس موہوم سا احساس تھا..... جزئیات کے بغیر۔ کیسے؟ کیا کرے؟ ان سوالوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ ذہن پر زور دیتا رہا، لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

اب انگلیاں ٹیڑھی کرنی ہی پڑیں گی۔ وہ سر جھٹکتے ہوئے بڑبڑایا۔

.....x.....

گھٹا تو کئی دن سے چھائی ہوئی تھی۔ مگر برستی نہیں تھی۔ اور گرمی کے موسم میں گھٹا ہو اور نہ برسے تو حبس ہو جاتا ہے۔ حور بانو کو برسات جتنی اچھی لگتی تھی، حبس اتنا ہی برا لگتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کئی دن سے وہ بولائی بولائی پھر رہی تھی۔

اس صبح بوندا باندی شروع ہوئی تو سب سے خوش حور بانو ہی تھی۔ اس کے اندر جیسے بجلیاں چمکنے لگیں۔ ''امی جان..... پھوار پڑ رہی ہے''۔ اس نے ماں کو ہلا ڈالا۔

''ہاں..... نظر آ رہا ہے مجھے''۔ سرفراز بیگم نے کہا۔ ''جمعرات کی جھڑی ہے۔ ایک ہفتے سے پہلے نہیں ٹلے گی''۔

''اسے جھڑی تو نہ کہیں''۔ حور بانو نے اعتراض کیا۔ ''بوندا باندی ہے..... وہ بھی ہلکی سی''۔

''جھڑی تو کہلائے گی۔ چاہے روں روں برسے''۔

لیکن حور بانو کو تو موسلا دھار بارش پسند تھی۔ بہر حال حبس کے مقابلے میں تو یہ بوندا باندی بھی بہت بڑی نعمت تھی۔ وہ ماں کے پاس سے اٹھی تو بہنوں کی طرف لپکی۔ نور بانو حسب معمول اپنے مطالعے میں کھوئی ہوئی تھی۔ اور گلنار بیٹھی اپنی گڑیا کے کپڑے سی رہی تھی۔

''ارے تم لوگ یہاں بیٹھی ہو۔ پتا ہے، بوندا باندی ہو رہی ہے''۔ حور بانو نے انہیں ہلایا۔

دونوں بہنوں کا ردعمل مختلف تھا۔ ان کی طبیعتوں کے عین مطابق۔ نور بانو نے کتاب سے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور بڑی بے نیازی سے بولی۔ ''تو کیا ہوا یہ موسم ہی برسات کا ہے''۔ یہ کہہ کر وہ پھر کتاب پر جھک گئی۔

مگر گلنار نے گڑیا کے کپڑے ایک طرف پھینک دیئے۔ ''سچ باجی۔ واہ اب مزہ آئے گا''۔ اس نے کہا۔ ''دل گھبرانے لگا تھا اس حبس سے''۔ اور وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''چلیں باجی، جولا لگائیں گے''۔

حور بانو اور گلنار دالان کی طرف چلی گئیں۔ نور بانو بیٹھی پڑھتی رہی۔

حور بانو سب سے بڑی تھی اور گلنار سب سے چھوٹی۔ ان دونوں کے مزاج ایک سے تھے۔ شوخ و شنگ اور زندگی سے لبریز۔ حور بانو بے حد حسین تھی۔ گلنار ابھی کم عمر تھی لیکن ایک نظر دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ حور بانو سے کم ثابت نہیں ہوگی۔ بیچ کی نور بانو ہر اعتبار سے دونوں بہنوں سے مختلف تھی۔ بلکہ ضد کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا۔ شکل و صورت کے اعتبار سے وہ واجبی بھی نہیں تھی۔ اس کا رنگ سانولا بھی نہیں، پکا تھا۔ چہرے کے نقوش بھی موٹے تھے۔ آنکھیں بہت چھوٹی تھیں۔ مگر ان میں بلا کی چمک تھی۔ جسمانی اعتبار سے بھی وہ بہت کم تھی۔ بدن پر گوشت تھا ہی نہیں۔ لگتا تھا، ہڈیوں پر کھال منڈھ دی گئی ہے۔ دونوں بہنوں سے اس کا تضاد یہیں تک محدود نہیں تھا۔ طبیعت بھی اس کی بالکل الگ تھی۔ وہ بہت سنجیدہ، بردبار، کم گو اور کم آمیز تھی۔ ہنسنا تو جیسے اسے آتا ہی نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ مسکرا دیتی۔ بس اسے ایک ہی شوق تھا..... مطالعہ کرنا۔ لگتا تھا، اس کی دوستی صرف کتابوں سے ہے۔

حور بانو اور گلنار نے مل کر جھولا باندھا۔ پھر اس کی مضبوطی کو جانچا۔ دہری رسی کے اوپر انہوں نے ایک بڑے گدے کو باندھ دیا۔ اب وہ بہت آرام دہ جھولا تھا۔

''پہلی باری میری''۔ گلنار نے چہک کر کہا۔

''واہ..... بڑی تو میں ہوں۔ پہلے تم مجھے جھولا جھلاؤ گی''۔ حور بانو بولی۔

گلنار مان گئی۔ حور بانو جھولے پر بیٹھ گئی۔

دالان کی چھت کافی اونچی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جھولا وہاں باندھا جاتا تھا۔ دالان کے سامنے خاصا کشادہ صحن تھا۔ صحن کے اختتام پر غسل خانہ، بیت الخلا اور اسٹور تھے۔ اور ان کے اوپر کوٹھا تھا..... وہ کوٹھا جو پچھلے کچھ عرصے سے حور بانو کو بہت محبوب ہو گیا تھا۔

گلنار نے پینگ دی۔ جھولا قوسی شکل میں اوپر اٹھا اور دالان سے ذرا باہر صحن تک گیا۔ اگلی پینگ اسے صحن کے وسط تک لے گئی۔ صحن میں پھوار حور بانو کے جسم اور رخساروں سے ٹکرائی تو حور بانو کے اندر کا سماں ایک دم تبدیل ہو گیا۔ وہ اداس ہو گئی۔

یہ اداسی ہونا بھی اس نے حال ہی میں سیکھا تھا۔ ورنہ وہ تو بڑی معصوم، بے فکر اور شوخ لڑکی تھی۔ اداسی کا سبب وہ لڑکا تھا، جو ان کے مکان کے اوپری حصے میں کرائے دار کی حیثیت سے رہتا تھا۔

ویسے تو ان کرائے داروں کو ان کے ہاں دو سال ہو گئے تھے۔ لیکن اس نے ان میں سے کسی کو دیکھا نہیں تھا..... سوائے ان کی ملازمہ رنجنا کے کہ وہ اکثر نیچے آ جاتی تھی۔ وہ بس اتنا جانتی تھی کہ وہ لوگ ہندو ہیں اور بہت بڑے زمین دار ہیں۔

مگر چھ ماہ پہلے ایک اتفاق کے تحت اس نے لڑکے کو دیکھ لیا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اس نے رنجنا کو کوئی چیز لانے کیلئے بھیجا تھا۔ دیر ہو گئی تھی اور وہ واپسی نہیں آئے تھے۔

www.alkurdu.com

نجانے کیا چیز تھی کہ وہ اس کیلئے بے تاب ہو رہی تھی۔اسی بے تابی میں وہ چلمن تک پہنچ گئی۔

چلمن کی درزوں سے اس کی نظریں آکامیاں کو تلاش کر رہی تھیں کہ اسے وہ دونوں لڑکے آتے نظر آئے۔ایک بڑا تھا۔وہ عام سا لڑکا تھا۔مگر دوسرے لڑکے کو وہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔پتا نہیں، کچھ عجیب سی بات تھی اس میں۔کھڑا قد، بے حد متناسب جسم اور چہرہ ایسا خوب صورت کہ نظر ہی نہ ہٹے۔ترشے ہوئے نقوش، متناسب کھڑی ناک، بڑی بڑی روشن آنکھیں، بہت کشادہ، دمکتی ہوئی پیشانی اور سرخ و سپید رنگت، چہرے پر روئیدگی تھی، جو جوانی کی آمد کا اعلان کر رہی تھی۔

پتا نہیں، وہ کیسا جادوئی لمحہ تھا۔دونوں لڑکے زینے کی طرف چلے گئے۔لیکن حور بانو وہیں کھڑی رہ گئی۔چھوٹے لڑکے کا سراپا اب بھی اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔اور اسے پلکیں جھپکانا بھی برا لگ رہا تھا۔وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ ایک پل کے لئے بھی سامنے سے ہٹے۔

کم عمر اور معصوم حور بانو نہیں جانتی تھی کہ یہ سب کیا ہے۔جو بھی تعلیم اس نے حاصل کی تھی، گھر پر ہی کی تھی۔اور گھر میں اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ کون سی کتاب گھر میں رکھی جانی چاہئے اور کون سی نہیں۔محبت کے بارے میں وہ کچھ جانتی ہی نہیں تھی۔

وہ وہیں کھڑی خلا میں اس حسین سراپا کو دیکھتی رہی۔آکامیاں نے آکر اسے چونکایا تو وہ ہٹی۔

اس لمحے سے ایک مستقل بے چینی، ایک عجیب سا اضطراب اس کے اندر رہنے لگا۔یہ بے چینی بس اس بات کی تھی کہ وہ اس لڑکے کو بار بار دیکھنا چاہتی تھی۔بلکہ درحقیقت وہ تو ہر وقت اسے دیکھنا چاہتی تھی۔اور یہ ممکن نہیں تھا۔

حور بان بچپن ہی سے بہت ضدی تھی۔جو مانگتی، وہ جب تک نہ ملتا، بے چین رہتی۔جو کرنا چاہتی کر کے رہتی۔اب اس معاملے میں بھی یہی کیفیت تھی۔مگر ایک فرق بھی تھا۔وہ جس چیز کی ضد کرتی، جب تک وہ نہ ملتی، اسے جھنجلاہٹ ہوتی رہتی۔لیکن اس معاملے میں یہ بات نہیں تھی۔وہ جھنجلا نہیں رہی تھی۔اور اس اضطراب میں بھی عجیب سی لذت تھی۔صرف اسے دیکھنے کی خواہش کرنا بھی بہت پر لطف تھا۔عجیب سا سرور تھا اس میں۔

چلمن کے قریب وہ کم..... بہت ہی کم جاتی تھی۔مگر اب اس کا چلمن سے کوئی بہت گہرا تعلق قائم ہو گیا تھا۔مضطرب تو وہ ہر وقت رہتی تھی۔مگر جب بھی اضطراب کی کوئی اونچی لہر اٹھتی، اس کے قدم خود بہ خود چلمن کی طرف اٹھ جاتے۔پھر وہ ناکام واپس آجاتی۔

چند دن میں اس معاملے میں بھی ٹھہراؤ آگیا۔آدمی تجسس کرے تو اسے معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں۔اسے پتا چل گیا کہ وہ صرف دو اوقات میں اس لڑکے کو یقینی طور پر دیکھ سکتی ہے۔ایک صبح کے وقت جب وہ اسکول جاتا ہے اور پھر دوپہر کے وقت جب وہ اسکول سے آتا ہے۔اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ دوسرا لڑکا مسلمان ہے۔وہ ایسے کہ وہ نماز کے وقت نکلتا تھا اور نماز پڑھ کر واپس آتا تھا۔بظاہر تو گھر سے نکلتے وقت وہ کوئی ایسا اہتمام نہیں کرتا تھا کہ جس سے لگے، وہ نماز پڑھنے جا رہا ہے۔سر پر ٹوپی بھی نہیں ہوتی تھی۔شروع میں تو حور بانو یہی سمجھی کہ وہ کسی کام سے کچھ خریدنے کے لئے نکلا ہے۔اذان کے بعد گھر سے نکلنا ایک اتفاق ہو سکتا ہے۔لیکن دن میں پانچ بار اور ہفتے کے ساتوں دن یہ اتفاق نہیں ہو سکتا۔پھر ایک دن وہ نماز پڑھ کر واپس آیا تو اس کے پائنچے اوپر تھے۔شاید ہر بار آتے ہوئے وہ انہیں نیچے کر لیتا تھا۔مگر اس بار وہ ایسا کرنا بھول گیا تھا۔

حور بانو بہت ذہین لڑکی تھی۔اور جس طرح کا اسے تجسس تھا، ایسے میں ذہین لوگ معمولی سی بات سے بہت سارے نتائج اخذ کر لیتے ہیں۔حور بانو کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ دوسرا لڑکا مسلمان ہے اور نماز کیلئے جاتا ہے..... مگر چوروں کی طرح، جیسے یہ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا ہو کہ وہ نماز پڑھنے جا رہا ہے۔اس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ جن ہندوؤں کے ساتھ وہ رہ رہا ہے، ان کی طرف سے اسے یہ آزادی نہیں۔اسی لئے وہ چھپ کر نماز پڑھتا ہے۔

اس احساس کے ساتھ اسے اس پر ترس آیا اور ان ہندوؤں پر غصہ، جنہوں نے اسے پابند کر رکھا تھا۔لیکن ان ہندوؤں میں وہ لڑکا شامل نہیں تھا، جس کی دید کو وہ ترستی تھی۔اس کے نزدیک اس کا اس معاملے سے کوئی تعلق ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

دونوں گھروں کے درمیان وہ تعلق تھا، جو پڑوسیوں کے درمیان ہوتا ہے۔کبھی اوپر سے رنجنا کھانے پینے کی کوئی چیز لاتی اور کبھی ان کے ہاں کوئی خاص چیز پکتی تو چھمن بوا اوپر لے جاتیں۔چیزوں کے اس تبادلے میں معلومات کا تبادلہ بھی قدرتی طور پر ہوتا رہتا تھا۔پہلے حور بانو اس میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی تھی۔مگر اب وہ غور سے سننے لگی تھی۔امی جان البتہ بڑے سوال جواب کرتی تھیں۔

رنجنا تھی بھی بڑی باتونی۔کتنی باتیں تو وہ بغیر پوچھے ہی بنا دیتی تھی۔حور بانو کو معلوم ہو گیا کہ چھوٹا لڑکا چھوٹا ٹھاکر کہلاتا ہے۔رنجنا نے اس کا نام کبھی نہیں بتایا۔کہتی تھی، بس وہ چھوٹے ٹھاکر ہیں۔البتہ مسلمان لڑکے کا نام اس نے بتا دیا..... وصال دین!

''مگر یہ مسلمان لڑکا تمہارے ساتھ کیوں رہتا ہے؟''۔امی جان نے ایک دن پوچھا۔

''وہ بھی اسکول میں پڑھتا ہے''۔رنجنا نے بے حد سادگی سے جواب دیا۔

''وہ تو ٹھیک ہے۔مگر تمہارے ٹھاکروں کے ساتھ اس کا کیا جوڑ؟''

رنجنا نے امی جان کو یوں دیکھا، جیسے ان کی سادگی اور کم علمی پر کڑھ رہی ہو۔''جوڑ تو کوئی نہیں بی بی۔لیکن وہ چھوٹے ٹھاکر کا بچپن کا دوست ہے..... چھوٹے ٹھاکر اس کے بغیر رہ نہیں سکتے۔وہ نہیں آتا تو چھوٹے ٹھاکر یہاں کبھی نہیں آتے''۔

''مگر تعلق کیا ہے ان سے؟''۔امی جان بھی پیچھے ہی پڑ گئیں۔

''تعلق تو مجھے بھی نہیں پتا''۔رنجنا نے بے بسی سے کہا۔''اس کا باپ جمال دین کی ہے ہمارے بڑے ٹھاکر کا۔مگر بڑے ٹھاکر اس پر بڑی دیا کرتے ہیں۔شاید چھوٹے ٹھاکر کی وجہ سے۔پر ہنتو یہ لوگ ہیں بھی اچھے اور وفادار''۔

www.allurdu.com

ویسے اوپر والے روشن خیال ہندو تھے۔ گوشت کا پرہیز نہیں کرتے تھے۔ بس گائے کا گوشت کھانے سے بچتے تھے۔ بقول رنجنا کے ماسٹر جی تو گوشت کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے تھے اور چھوٹے ٹھاکر کا بھی یہی حال تھا۔ رہ گئے رنجنا اور رگھو..... تو وہ ملازم تھے۔ اور ملازم آقاؤں کا عقیدہ اپناتے ہیں۔

حور بانو کو اچانک احساس ہوا کہ بارش تیز ہوگئی ہے۔ جس ٹانیئے میں جھولا صحن سے گزرا اور واپس آیا تھا، بارش کی بوچھار نے اس کو بھگو ڈالا تھا وہ چونک کر خیالوں سے نکل آئی۔ ساتھ ہی اسے احساس ہوا کہ گلنار کچھ کہہ رہی ہے۔

''باجی..... بس اب اتریں بھی، اب میری باری ہے''۔

حور بانو نے پاؤں فرش سے ٹکائے۔ رکتے رکتے جھولا رک گیا اور وہ نیچے اتر آئی۔

گلنار نے حیرت سے اسے دیکھا۔ عام طور پر ایسا ہوتا نہیں تھا۔ حور بانو بڑے ہونے کا پورا فائدہ اٹھاتی تھی اور جب تک اپنا جی نہیں بھرتا تھا، اسے جھولنے کا موقع نہیں دیتی تھی۔

اس نے مشتبہ نظروں سے بہن کو دیکھا اور جلدی سے جھولے پر بیٹھ گئی۔ ''پینگ دیں باجی''۔ اس نے کہا۔

حور بانو نے جھولے کو دھکیلا۔ مگر دو تین پینگیں دینے کے بعد رک گئی۔ جھولے کا ردھم ٹوٹنے لگا۔ ''کیا کرتی ہیں باجی۔ پینگ دیں نا''۔ گلنار نے احتجاج کیا۔

''بھئی میرا دل نہیں چاہ رہا اس وقت''۔

''یہ تو بے ایمانی ہے باجی۔ آپ کی باری آئے گی تو میں بھی پینگ نہیں دوں گی''۔

''نہیں دینا۔ میرا دل بھی نہیں چاہ رہا ہے جھولنے کو''۔

تو یہ بات ہے۔ گلنار نے سوچا۔ اس لئے جھولا اتنی آسانی سے خالی ہوگیا۔ باجی کا بھی پتا نہیں چلتا۔ اب تو پل پل رنگ بدلتی ہیں۔ پہلے ایسا نہیں تھا۔ پھر اس نے خوشامدانہ لہجے میں پکارا۔ ''اچھی باجی، بس دو تین لمبی لمبی پینگیں دے دیں۔ پھر میں آپ سے نہیں کہوں گی''۔

حور بانو نے جھنجلا کر جھولے پر ہاتھ رکھا اور اسے دھکیلتی ہوئی صحن تک لے گئی۔ پھر وہ ایک طرف ہٹی اور دالان سے واپس صحن کی طرف آتے ہوئے جھولے کو اور زور سے دھکیلا۔ دو بار میں ہی گلنار کے پاؤں اسٹور کی دیوار سے جا لگے۔ اب وہ خود بھی پینگیں لے سکتی تھی۔

حور بانو اندر ماں کے پاس چلی گئی۔ ''امی جان..... بہت زور کی بارش ہو رہی ہے.....''۔

سرفراز بیگم نے مسکراتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں جانتی ہوں، تم کیا کہو گی''۔ انہوں نے کہا۔ ''میں بہادر علی کو پہلے ہی آلو لانے کے لئے بھیج چکی ہوں بیسن گھول کر رکھ دیا ہے۔ چھمن بوا ابھی گرم گرم پھلکیاں اتاریں گی۔ تم ذرا چٹنی پیس لو''۔

وہ چٹنی پیسنے بیٹھ گئی۔ مگر اس کا دھیان چھوٹے ٹھاکر کی طرف تھا۔ وہ گزرے ہوئے وقت میں کھو گئی۔

دن میں دو بار وہ چھوٹے ٹھاکر کو آتے جاتے دیکھتی تھی۔ اور اس کے بعد وہ اس کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔ نیند بھی اس کی پہلے جیسی نہیں رہی سوتی تو وہ خوابوں میں آجاتا۔ نیند اچٹ جاتی۔ مگر نیند کا وہ اچٹنا بھی خوش گوار تھا۔ کیونکہ وہ بہت سرشار اور خوش خوش اٹھتی تھی۔ پھر کچھ دیر بعد دوبارہ نیند آجاتی اور خوابوں کا سلسلہ پھر شروع ہو جاتا۔ اب اس کا جی چاہتا کہ ہر وقت وہ سوتی ہی رہے۔

پھر تین ماہ پہلے اس کی پیاسی نگاہوں کی مزید ضیافت کا سامان ہوگیا۔

اس کے حواس تو مکان کے اوپری حصے کی آوازوں پر ہی مرکوز رہتے تھے۔ اس روز اسے کوٹھے کی طرف جانے والے زینوں پر قدموں کی آہٹ سنائی دی تو وہ کوٹھے کی طرف لپکی۔ عام طور پر رنجنا کے سوا کوئی کوٹھے پر نہیں جاتا تھا۔ لیکن یہ رنجنا کے قدموں کی آہٹ نہیں تھی۔ حور بانو کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اتنے زور سے کہ اسے لگا، اس کے دل کے دھڑکنے کی آواز امی جان تک بھی پہنچ جائے گی۔

کوٹھے کے چاروں طرف دیوار نہیں تھی۔ بلکہ منڈیروں پر جالیاں چن کر دیواریں بنا دی گئی تھیں۔ جالیوں کے درمیان سوراخ تھے، جن سے دونوں طرف کا منظر پوری طرح تو نہیں، کچھ کچھ نظر آتا تھا۔

چند لمحے بعد اس نے چھوٹے ٹھاکر کو دیکھا اسکے ہاتھ میں کتابیں تھیں۔ اوپر کرسیاں پڑی تھیں۔ وہ وہاں بیٹھ گیا اور کتابیں میز پر رکھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا جالیوں کے سوراخوں سے بالکل صاف تو نہیں دکھائی دے رہا تھا لیکن انداز سے لگتا تھا کہ وہ وہاں پہلی بار آیا ہے اور جو کچھ اس نے دیکھا ہے اسے دیکھ کر وہ خوش ہوا ہے۔

وہ دالان میں کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ اس وقت کی غیر متوقع دید اسے بہت بڑی نعمت محسوس ہوئی تھی۔ اس نے تصور میں کوٹھے کو دیکھا۔ کرایہ پر اٹھنے سے پہلے تو وہ اکثر کوٹھے پر جاتی رہتی تھی۔ حور بانو کو پھولوں کا بہت شوق تھا۔ اس نے وہاں چنبیلی لگائی تھی جو خوب پھلی پھولی تھی۔ اس کے علاوہ موسمی پھولوں کے بھی کئی پودے تھے۔ اسے یاد تھا کہ اسے کوٹھا بہت اچھا لگتا تھا۔ شام کے وقت خاص طور پر وہ وہاں جایا کرتی تھی

www.allurdu.com

اوپر کوٹھے پر چھوٹے ٹھاکر نے کتاب کھول لی تھی اور اس پر جھک گیا تھا۔

حور بانو بڑی محویت سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر امی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ''حور بانو''۔ وہاں کیا کر رہی ہو۔ چلو عصر کی نماز پڑھو اور پھر قرآن پاک کی تلاوت کے لئے بیٹھو۔ عصر مغرب کے درمیان اعمال کی قبولیت کا وقت ہوتا ہے''۔

''آئی امی جان..... وضو کرنے کے لئے ہی آئی ہوں یہاں''۔ حور بانو نے جواب دیا اور غسل خانے کی طرف چل دی۔ لیکن اس کا دل وہیں کوٹھے پر اٹکا رہا۔ وضو کر کے اس نے نماز پڑھی۔ پھر قرآن پاک کی تلاوت کی..... یہ روز کا معمول تھا اور اس کے معاملے میں امی جان بہت سخت تھیں۔ پھر عادت بھی تھی۔ سو وہ عصر سے مغرب تک کا یہ وقت بڑے شوق سے گزارتی تھی۔ قرآن شریف پڑھنے میں اسے بہت لطف آتا تھا۔ بلکہ تلاوت کرتے ہوئے وہ کھو جاتی تھی۔ مگر اس شام وہ ارتکاز سے محروم تھی۔ وہ قرآن شریف پڑھ رہی تھی۔ مگر اس کا دل کہیں اور تھا۔ وہ کوٹھے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ بلکہ تصور میں کوٹھے کو دیکھ رہی تھی، جہاں چھوٹا ٹھاکر بیٹھا پڑھائی کر رہا تھا۔ کئی بار اسے شرم آئی کہ یہ کتنی بری بات ہے۔ اس نے دل کو کوٹھے سے ہٹایا اور توجہ قرآن پر مرکوز کرنے کی کوشش کی۔ مگر اسے پتا بھی نہیں چلا کہ کب بے ایمان دل چپکے سے پھر کوٹھے پر جا اٹکا ہے۔ وہ اندر سے پانی پانی ہوئی جا رہی تھی۔ مگر بے بس تھی۔ یہ تو بہت بڑی بے ادبی ہے۔

یہ خیال دل میں آیا تو وہ اٹھ گئی۔

''کیا بات ہے۔ تلاوت میں دل نہیں لگتا''۔ امی جان نے ملامت بھرے لہجے میں کہا۔

''امی جان..... وضو کرنے جا رہی ہوں''۔

یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔ دالان سے گزرتے ہوئے اس کی نظر کوٹھے کی طرف اٹھی۔ مغرب ہونے والی تھی۔ جھٹ پٹے کا سماں تھا۔ آسمان اپنے ٹھکانوں کی طرف لوٹنے والے پرندوں کے چہچہوں سے گونج رہا تھا۔ اتنا اجالا نہیں تھا کہ وہ اسے صاف دیکھ سکتی۔ مگر چھوٹا ٹھاکر اسے ہیولا سا نظر آ رہا تھا۔ پھر بھی اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ پڑھ نہیں رہا ہے۔ بلکہ بڑے ارتکاز کے ساتھ خلا میں گھور رہا ہے۔

وہ وضو کر کے آئی تو مغرب کی اذان شروع ہو چکی تھی۔ اس بار نماز میں بھی اس کا دل نہ لگا۔ جلدی جلدی نماز پڑھ کر وہ دالان میں تخت پر جا بیٹھی اب اندھیرا ہو چکا تھا۔ چھوٹے ٹھاکر کا ہیولا اور گہرا ہو گیا تھا۔ اسے حیرت ہوئی کہ پڑھائی کے لئے اوپر آنے والے چھوٹے ٹھاکر نے روشنی کیوں نہیں کی۔ اور روشنی نہیں کی تو اندھیرے میں بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے۔

وہ بیٹھی رہی۔ اوپر چھوٹا ٹھاکر بھی بیٹھا رہا۔

کچھ دیر بعد اچانک اوپر روشنی ہو گئی۔ روشنی اسی دوسرے لڑکے وصال دین نے کی تھی۔ ذرا دیر دونوں باتیں کرتے رہے۔ پھر نیچے چلے گئے۔

اگلے روز شام کا وہ وقت ہوا تو حور بانو کا دل مچلنے لگا۔ کاش وہ آج بھی آ جائے۔ شاید وہ وقت دعا کی قبولیت کا تھا۔ وہ آ گیا۔ اور اس کے آنے کے ذرا دیر بعد ہی عصر کی اذان ہو گئی۔

پھر تو یہ روز کا معمول بن گیا۔ حور بانو بہت خوش تھی۔ رات کو وہ خواب میں اسے دیکھتی۔ پھر صبح وہ اسکول جاتا۔ صبح سے دوپہر اس کی واپسی کا انتظار رہتا۔ دوپہر کو وہ اسے دیکھتی اور پھر شام کا انتظار کرتی۔ شام کو وہ کوٹھے پر آتا..... کتابیں لے کر۔ لیکن کچھ پڑھے بغیر رات کو واپس جاتا۔ اور کوٹھے پر رہ کر پڑھائی وہ کبھی نہیں کرتا تھا

وہ عرصہ حور بانو کے لئے سرشاری کا تھا۔ وہ بے خود، کھوئی کھوئی، مگر بہت خوش رہتی۔ بات بات پر ہنستی۔ آپ ہی آپ مسکراتی۔ مگر کسی کی بات دھیان سے نہ سن پاتی۔

مگر ساتھ ہی ایک خلش اسے بار بار ستاتی۔ اس کے ضمیر پر بوجھ بڑھتا جاتا۔ قرآن پاک پر لاکھ کوشش کے باوجود وہ پوری توجہ مرکوز نہیں کر پاتی اسے تو بس انتظار رہتا تھا کہ کب مغرب ہو اور وہ نماز پڑھ کر دالان کا رخ کرے۔ اسے دیکھنے کے چکر میں وہ عصر کی نماز کے لئے کھڑے ہونے میں بھی تساہل کرنے لگی تھی۔

پھر ایک روز حور بانو نے تلاوت کرتے ہوئے قرآن پاک کی ایک آیت مبارکہ پڑھی، جس میں برتر مشرک مردوں پر کم تر مومن مردوں کی قوت اور برتری کو بیان کیا گیا تھا۔ وہ آیت سن کر وہ چور ہو گئی۔ مگر اس کا دل نہیں مانتا تھا کہ وہ مشرک ہو سکتا ہے۔ بار بار اس کے ذہن میں ایک دلیل ابھرتی..... کسی مشرک کی پیشانی اتنی روشن کیسے ہو سکتی ہے!

اچانک سرشاری کی وہ کیفیت ایسے ختم ہو گئی، جیسے ٹھہرے ہوئے پانی میں کسی نے کنکر پھینک دیا ہو۔

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوئیں اور وہ لوگ چلے گئے۔ وہ پہلا موقع تھا کہ حور بانو اداسی سے آشنا ہوئی۔ یوں تو وہ اداس پہلے بھی ہوتی رہی تھی کون ایسا ہے جو کبھی اداس نہ ہوتا ہو۔ اور اس نے بہت کم عمری میں شفیق باپ کی موت کا دکھ بھی جھیلا تھا مگر یہ اداسی مختلف تھی۔

www.alkurdu.com

بیٹھے بٹھائے کسی بھی لمحے اچانک اوپری سطح سے شروع ہوتی اور تیزی سے اس کے وجود کی نامعلوم گہرائی تک سرایت کر جاتی۔اور اس اداسی میں کوئی تکلیف، کوئی اذیت نہیں تھی۔اس کے برعکس اس میں لذت تھی۔یہ اداسی اسے سوچنے پر اکساتی.....ایسی ایسی باتیں جو پہلے اس کے گمان میں بھی نہیں تھیں۔یہ اداسی تصور کو مہمیز کرتی.....اسے وہاں لے جاتی، جہاں چھوٹا ٹھاکر تھا۔حالانکہ اس نے وہ جگہ دیکھی نہیں تھی۔بلکہ کبھی اس کا نام بھی نہیں سنا تھا۔

کبھی وہ حیران ہو کر سوچتی کہ ایک اجنبی لڑکا، جس سے کبھی اس نے بات بھی نہیں کی، تھوڑے سے دنوں میں اتنا اہم کیسے ہو گیا کہ سامنے ہوتے ہوئے بھی اسے امی جان اور اپنی بہنوں کا خیال نہیں آتا۔جبکہ وہ اس کی یادوں، اس کے خیالوں میں کھوئی رہتی ہے۔وہ اتنا اہم کیسے ہو گیا کہ اس کے چلے جانے کے بعد زندگی بے کیف اور اپنا وجود نامکمل لگتا ہے۔

''اے ہے حور بانو.....یہ چٹنی پیس رہی ہو یا سفوف بنا رہی ہو؟''

امی جان کی آواز نے اسے بری طرح چونکا دیا۔اس نے پہلے امی کو اور پھر سل کو دیکھا۔پھر بڑی شرمندگی سے اس نے چٹنی پر پانی کے چھینٹے دیئے اور دو چار بار بٹا چلانے کے بعد چٹنی کو سمیٹ کر پیالے میں گرا دیا۔

وہ دالان میں چلی آئی۔گلنار اب بھی جھولا جھول رہی تھی۔''آئیں باجی.....جھولیں گی؟''۔اس نے پوچھا۔

''نہیں.....دل نہیں چاہ رہا ہے''۔

گلنار نے حیرت سے اسے دیکھا۔یہ جواب اس کے لئے بے حد خلاف توقع تھا۔مگر آج کل باجی ایسی ہی ہو رہی تھیں۔

حور بانو تخت پر بیٹھ کر کوٹھے کو تکنے لگی، جہاں کوئی نہیں تھا۔ان لوگوں کے جانے کے بعد بھی اس کا اپنا معمول وہی رہا تھا۔عصر سے پہلے وہ یہاں آ کر ضرور بیٹھتی اور کوٹھے کو تکتی۔پھر عصر کے بعد وہ قرآن پاک پڑھتی تو مغرب سے پہلے وضو کے بہانے اٹھ جاتی۔وضو کے لئے جاتے وقت وہ پھر کوٹھے کی طرف دیکھتی۔اور مغرب کے بعد رات کے کھانے تک وہ پھر دالان میں تخت پر بیٹھی رہتی۔اس دوران کبھی کبھی تو اسے چھوٹا ٹھاکر نظر آتا.....ایسا جیتا جاگتا کہ وہ خوش ہو جاتی.....ارے، یہ لوگ واپس آ گئے۔مگر پلکیں جھپکتیں تو اندھیرا ویران کوٹھا سامنے ہوتا۔اور کبھی کبھی تو اسے سچ مچ ایسا لگتا کہ وہ لوگ کہیں نہیں گئے۔یہیں موجود ہیں۔

اب زندگی کی مرکزی کیفیت انتظار کی تھی۔بلکہ یوں کہیے کہ زندگی نام ہی انتظار کا تھا۔ویسے تو جب سے یہ دیکھنے کا کھیل شروع ہوا تھا، وہ حالت انتظار میں تھی۔پہلے اس انتظار میں لمحے گنے جاتے تھے۔مگر اب وہ دن گن رہی تھی.....دو مہینے کے ساٹھ دن۔اور گرمیوں کے دن تو ویسے بھی بڑے ہوتے ہیں۔ایک ایک پل مشکل سے گزرتا ہے۔

''گلنار.....کہاں ہو؟ آ کر دسترخوان بچھاؤ''۔امی جان نے پکارا۔''چلو حور بانو نور بانو.....آ جاؤ بھئی۔گرم گرم پراٹھے اترتے جائیں، کھاتی جاؤ''۔

دسترخوان بچھ گیا۔چھمن بوا گرم پراٹھے اتار کر لا رہی تھیں۔حور بانو نے پہلا لقمہ توڑا۔مگر کچھ سوچ کر رک گئی۔''بوا.....پہلے چند پراٹھے اوپر دے آؤ نا''۔اس نے پکارا۔

''اے بولا گئی ہو کیا''۔امی جان نے اسے گھورا۔''پتا بھی ہے کہ وہ لوگ گئے ہوئے ہیں''۔

اب وہ کیا کہتی۔کھسیائی اور دسترخوان پر جھک گئی۔

.....x.....

کیدار ناتھ جے پور کے میلے میں ہر سال جاتا تھا۔مگر اس بار اس کے دماغ میں کھچڑی سی پک رہی تھی۔اس بار اس نے اوتار سنگھ کو بہت بدلا بدلا پایا تھا۔اس نے ایک دم سے قد نکالا تھا۔وہ بہت بڑا بڑا اور بہت طاقت ور لگ رہا تھا۔اسے دیکھ کر کیدار ناتھ کو نفرت تو ہمیشہ محسوس ہوتی تھی مگر اس بار وہ احساس کمتری میں بھی مبتلا ہو گیا۔اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پرتاپ سنگھ سے بڑھ کر دبدبے والا نکلے گا۔

کیدار ناتھ نے سمجھ لیا کہ اب بھی اس نے کچھ نہ کیا تو اس کا سپنا سپنا ہی رہ جائے گا۔وہ کبھی ٹھاکروں کی گڑھی کا بڑا ٹھاکر نہیں بن سکے گا۔اب تو کوئی قدم اٹھانا ہی تھا۔

جے پور سے اس کا گہرا تعلق تھا۔اس کے بیشتر رشتے دار جے پور میں ہی رہتے تھے۔خود اس کی اپنی عمر کا بڑا حصہ بھی جے پور میں ہی بسر ہوا تھا ٹھاکروں کی گڑھی تو وہ صرف ٹھاکر بننے کے لالچ میں گیا تھا۔جے پور ایک اعتبار سے اس کیلئے گھر کی طرح تھا۔رشتے داروں کے علاوہ اس کے وہاں بہت تعلقات تھے۔ہر طرح کے۔اور اب اس نے ان تعلقات کو کام میں لانے کا فیصلہ کیا تھا۔

وہ میلے میں بھی شریک ہوا اور اپنے کام کے لوگوں سے بھی ملا۔اس نے ان کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا۔

''او یار جی، یہ کون سی بڑی بات ہے''۔اسکے بچپن کے دوست جسونت نے سنتے ہی کہا۔

''نہیں جسونت، بات تو بڑی ہے''۔کیدار ناتھ نے گہری سانس لے کر کہا۔''اس سلسلے میں مجھ پر شبہ کیا جا سکتا ہے۔اور شبہ کر لیا گیا تو سارا کھیل ختم سمجھو''۔

''تم پر کیوں شبہ کیا جائے گا؟''۔

''اسلئے کہ اس کی موت سے فائدہ صرف مجھ کو پہنچ سکتا ہے''۔

''چلو ٹھیک ہے۔تب بھی کوئی بڑی بات نہیں''۔جسونت نے کہا۔''اس کا کانٹا نکل جائے گا''۔

www.allurdu.com

بیٹھے بٹھائے کسی بھی لمحے اچانک اوپری سطح سے شروع ہوتی اور تیزی سے اس کے وجود کی نامعلوم گہرائی تک سرایت کر جاتی۔ اور اس اداسی میں کوئی تکلیف، کوئی اذیت نہیں تھی۔ اس کے برعکس اس میں لذت تھی۔ یہ اداسی اسے سوچنے پر اکساتی..... ایسی ایسی باتیں جو پہلے اس کے گمان میں بھی نہیں تھیں۔ یہ اداسی تصور کو مہمیز کرتی..... اسے وہاں لے جاتی، جہاں چھوٹا ٹھاکر تھا۔ حالانکہ اس نے وہ جگہ دیکھی نہیں تھی۔ بلکہ کبھی اس کا نام بھی نہیں سنا تھا۔

کبھی وہ حیران ہو کر سوچتی کہ ایک اجنبی لڑکا، جس سے کبھی اس نے بات بھی نہیں کی، تھوڑے سے دنوں میں اتنا اہم کیسے ہو گیا کہ سامنے ہوتے ہوئے بھی اسے امی جان اور اپنی بہنوں کا خیال نہیں آتا۔ جبکہ وہ اس کی یادوں، اس کے خیالوں میں کھوئی رہتی ہے۔ وہ اتنا اہم کیسے ہو گیا کہ اس کے چلے جانے کے بعد زندگی بے کیف اور اپنا وجود نامکمل لگتا ہے۔

''اے ہے حور بانو..... یہ چٹنی پیس رہی ہو یا سفوف بنا رہی ہو؟''

امی جان کی آواز نے اسے بری طرح چونکا دیا۔ اس نے پہلے امی کو اور پھر سل کو دیکھا۔ پھر بڑی شرمندگی سے اس نے چٹنی پر پانی کے چھینٹے دیئے اور دو چار بار بٹا چلانے کے بعد چٹنی کو سمیٹ کر پیالے میں گرا دیا۔

وہ دالان میں چلی آئی۔ گلنار اب بھی جھولا جھول رہی تھی۔ ''آئیں باجی..... جھولیں گی؟''۔ اس نے پوچھا۔

''نہیں..... دل نہیں چاہ رہا ہے''۔

گلنار نے حیرت سے اسے دیکھا۔ یہ جواب اس کے لئے بے حد خلاف توقع تھا۔ مگر آج کل باجی ایسی ہی ہو رہی تھیں۔

حور بانو تخت پر بیٹھ کر کوٹھے کو تکنے لگی، جہاں کوئی نہیں تھا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد بھی اس کا اپنا معمول وہی رہا تھا۔ عصر سے پہلے وہ یہاں آ کر ضرور بیٹھتی اور کوٹھے کو تکتی۔ پھر عصر کے بعد وہ قرآن پاک پڑھتی تو مغرب سے پہلے وضو کے بہانے اٹھ جاتی۔ وضو کے لئے جاتے وقت وہ پھر کوٹھے کی طرف دیکھتی۔ اور مغرب کے بعد رات کے کھانے تک وہ پھر دالان میں تخت پر بیٹھی رہتی۔ اس دوران کبھی کبھی تو اسے چھوٹا ٹھاکر نظر آتا..... ایسا جیتا جاگتا کہ وہ خوش ہو جاتی..... ارے، یہ لوگ واپس آ گئے۔ مگر پلکیں جھپکتیں تو اندھیرا ویران کوٹھا سامنے ہوتا۔ اور کبھی کبھی تو اسے سچ مچ ایسا لگتا کہ وہ لوگ کہیں نہیں گئے۔ یہیں موجود ہیں۔

اب زندگی کی مرکزی کیفیت انتظار کی تھی۔ بلکہ یوں کہیے کہ زندگی نام ہی انتظار کا تھا۔ ویسے تو جب سے یہ دیکھنے کا کھیل شروع ہوا تھا، وہ حالت انتظار میں تھی۔ پہلے اس انتظار میں لمحے گنے جاتے تھے۔ مگر اب وہ دن گن رہی تھی..... دو مہینے کے ساٹھ دن۔ اور گرمیوں کے دن تو ویسے بھی بڑے ہوتے ہیں۔ ایک ایک پل مشکل سے گزرتا ہے۔

''گلنار..... کہاں ہو؟ آ کر دسترخوان بچھاؤ''۔ امی جان نے پکارا۔ ''چلو حور بانو نور بانو..... آ جاؤ بھئی۔ گرم گرم پراٹھے اترتے جائیں، کھاتی جاؤ''۔

دسترخوان بچھ گیا۔ چھمن بوا گرم پراٹھے اتار کر لا رہی تھیں۔ حور بانو نے پہلا لقمہ توڑا۔ مگر کچھ سوچ کر رک گئی۔ ''بوا..... پہلے چند پراٹھے اوپر دے آؤ نا''۔ اس نے پکارا۔

''اے بولا گئی ہو کیا''۔ امی جان نے اسے گھورا۔ ''پتا بھی ہے کہ وہ لوگ گئے ہوئے ہیں''۔

اب وہ کیا کہتی۔ کھسیائی اور دسترخوان پر جھک گئی۔

.....x.....

کیدار ناتھ جے پور کے میلے میں ہر سال جاتا تھا۔ مگر اس بار اس کے دماغ میں کھچڑی سی پک رہی تھی۔ اس بار اس نے اوتار سنگھ کو بہت بدلا بدلا پایا تھا۔ اس نے ایک دم سے قد نکالا تھا۔ وہ بہت بڑا بڑا اور بہت طاقت ور لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر کیدار ناتھ کو نفرت تو ہمیشہ محسوس ہوتی تھی مگر اس بار وہ احساس کمتری میں بھی مبتلا ہو گیا۔ اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پرتاپ سنگھ سے بڑھ کر دبدبے والا نکلے گا۔

کیدار ناتھ نے سمجھ لیا کہ اب بھی اس نے کچھ نہ کیا تو اس کا سپنا سپنا ہی رہ جائے گا۔ وہ کبھی ٹھاکروں کی گڑھی کا بڑا ٹھاکر نہیں بن سکے گا۔ اب تو کوئی قدم اٹھانا ہی تھا۔

جے پور سے اس کا گہرا تعلق تھا۔ اس کے بیشتر رشتے دار جے پور میں ہی رہتے تھے۔ خود اس کی اپنی عمر کا بڑا حصہ بھی جے پور میں ہی بسر ہوا تھا ٹھاکروں کی گڑھی تو وہ صرف ٹھاکر بننے کے لالچ میں گیا تھا۔ جے پور ایک اعتبار سے اس کیلئے گھر کی طرح تھا۔ رشتے داروں کے علاوہ اس کے وہاں بہت تعلقات تھے۔ ہر طرح کے۔ اور اب اس نے ان تعلقات کو کام میں لانے کا فیصلہ کیا تھا۔

وہ میلے میں بھی شریک ہوا اور اپنے کام کے لوگوں سے بھی ملا۔ اس نے ان کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا۔

''او یار جی، یہ کون سی بڑی بات ہے''۔ اسکے بچپن کے دوست جسونت نے سنتے ہی کہا۔

''نہیں جسونت، بات تو بڑی ہے''۔ کیدار ناتھ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''اس سلسلے میں مجھ پر شبہ کیا جا سکتا ہے۔ اور شبہ کر لیا گیا تو سارا کھیل ختم سمجھو''۔

''تم پر کیوں شبہ کیا جائے گا؟''۔

''اسلئے کہ اس کی موت سے فائدہ صرف مجھ کو پہنچ سکتا ہے''۔

''چلو ٹھیک ہے۔ تب بھی کوئی بڑی بات نہیں''۔ جسونت نے کہا۔ ''اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا''۔

''مجھے پوری بات سنے بغیر اطمینان نہیں ہوگا''۔

''یار جی..... ڈاکو تو ہر جگہ ہوتے ہیں نا''۔

''ہوتے ہیں۔ پر ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی حویلی میں گھسنے کی ہمت کسی میں نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ وہاں انہیں موت کے سوا کچھ نہیں ملے گا''۔

''پر گاؤں میں تو ڈاکو کسی پر بھی حملے کر سکتے ہیں''۔

''ہاں یہ تو ہے''۔ کیدار ناتھ نے پرخیال لہجے میں کہا۔ ''لیکن ایک بات کا خیال رکھنا ہوگا۔ چھوٹے ٹھاکر کو کچھ ہوا تو سب سے پہلے مجھ پر شبہ کیا جائے گا؟''۔

''وہ کیوں کیدے؟''۔

''اس لئے کہ اس کی موت سے سب سے زیادہ فائدہ مجھے ہی پہنچے گا۔ اور یہ بات نہ ہوتی تو میں اس سلسلے میں کچھ کرتا ہی کیوں''۔

جسونت سوچ میں پڑ گیا۔ پھر سر ہلا کر بولا۔ ''تم چنتا مت کرو۔ میں ایسا بندوبست کروں گا کہ تم پر آنچ نہیں آئے گی''۔

''جو کچھ بھی کرو، میرے واپس جانے کے کچھ دن بعد کرنا''۔ کیدار ناتھ نے کہا۔ ''اور آدمی بھروسے کے ہونے چاہئیں۔ بات بگڑے تو بھی کسی قیمت نہ کھلے۔ ورنہ سب کچھ ختم ہو جائے گا''۔

''میں نے کہا نا، تم چنتا نہ کرو۔ یہ سب مجھ پر چھوڑ دو''۔

دو دن بعد کیدار ناتھ گاؤں واپس چلا آیا۔

.....x.....

مہیش پور جمال دین کے باپ مہر دین کا وہ آبائی گاؤں تھا، جہاں سے ہجرت کر کے وہ ٹھاکروں کی گڑھی میں آیا تھا۔ ٹھاکروں کی گڑھی کی نسبت مہیش پور بڑا گاؤں تھا۔ اس کی آبادی بھی زیادہ تھی۔ وہاں چند گھر مسلمانوں کے بھی تھے۔

مہیش پور کے زمین دار ایشور لال کی ٹھاکروں سے بہت لگتی تھی۔ ایک تو مزاج کا فرق بھی تھا۔ دونوں زمین دار ایک دوسرے کی ضد تھے۔ ٹھاکر پرتاپ اپنے کمیوں میں بہت پسند کیا جاتا تھا۔ بلکہ اس کی رعیت اس سے محبت کرتی تھی۔ اس کے برعکس ایشور لال روایتی زمین دار تھا۔ اس میں وہ سارے گن تھے، جن کا کسی زمین دار میں تصور بھی کیا جا سکتا ہے۔ وہ بہت شوقین مزاج آدمی تھا۔ ساتھ ہی ظالم بھی تھا۔ اس کے مزارعین میں اس سے کھل کر نفرت کرنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ وہ اس سے بہت ڈرتے تھے۔

ٹھاکروں کی گڑھی مہیش پور سے چھوٹا گاؤں تھا۔ وہی نہیں، اردگرد کے تمام گاؤں مہیش پور سے چھوٹے تھے۔ سال کے سال پھولوں کے موسم میں بہت بڑا میلہ لگتا تھا۔ اس میں مردانہ کھیلوں کے مقابلے ہوتے تھے۔ ایشور لال کی بڑی تمنا تھی کہ کسی بار اس کے گاؤں کے جوان جیت جائیں۔ لیکن جیت ہر بار ٹھاکروں کی گڑھی کے حصے میں آتی تھی۔ لٹھیا بازی ہو، گھڑ سواری ہو، نیزے بازی ہو، دوڑ ہو یا کشتی، ٹھاکر کی گڑھی کے جوان ہر فن میں طاق تھے یہ ایک اور وجہ تھی ایشور لال کے ٹھاکر پرتاپ سنگھ سے چڑنے کی۔

اور ایک بار ندی کے پانی پر دونوں گاؤں میں تنازعہ ہوا تھا۔ مسئلے کو بات چیت سے حل کرنے کے بجائے ایشور لال نے نفری کے زور پر طاقت کے استعمال پر بھروسہ کیا تھا اور بری طرح منہ کی کھائی تھی۔ ٹھاکر کے گاؤں کے لوگ فطری طور پر بہادر تھے..... ڈٹ جانے والے۔ اس دن کے بعد ایشور لال کی نفرت اور بڑھ گئی تھی۔ مگر وہ کر کچھ بھی نہیں سکا تھا۔

اس رات آدھی رات کے قریب آٹھ جوان ایشور لال کی حویلی پہنچے۔ جسونت نے خط کے ذریعے پہلے ہی ایشور لال سے معاملات طے کر لئے تھے ان کے ٹھہرانے کا بندوبست حویلی کے تہہ خانے میں کر لیا گیا تھا۔ ایشور لال کے خاص معتمد جانکی داس کے سوا وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔

جانکی داس انہیں تہہ خانے میں لے گیا، جہاں ضرورت کی ہر چیز پہلے سے ہی موجود تھی۔ ایشور لال نے جانکی داس کو پہلے ہی سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ ان آنے والوں کے بارے میں اپنے گاؤں میں بھی کسی کو پتا نہ چلے۔

اشور لال نے جانکی داس کو بتا دیا تھا کہ وہ آٹھوں صرف رات کو یہاں آرام کریں گے اور ان کے بھوجن کا انتظام کرنا ہوگا۔ وہ رات کو گاؤں والوں کے سونے کے بعد آیا کریں گے اور پو پھٹے نکل جایا کریں گے۔ دن بھر وہ کیا کریں گے، کہاں رہیں گے، کس لئے آئے ہیں..... یہ سب اسے معلوم نہیں تھا۔ اور اسے معلوم کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ایشور لال کے پاس رہ کر اس نے اپنے کام سے کام رکھنا سیکھ لیا تھا۔

آنے والے خود بھی رازداری سے کام لے رہے تھے۔ انہوں نے اپنے چہرے بڑے سیاہ رومالوں میں چھپائے ہوئے تھے۔ تہہ خانے میں پہنچنے کے بعد بھی انہوں نے چہرے نہیں کھولے۔ انہوں نے تنقیدی نظروں سے اس خفیہ اقامت گاہ کا جائزہ لیا اور جیسے مطمئن ہو گئے۔

''بھوجن کرنا ہے مہاراج؟''۔ جانکی داس نے پوچھا۔

انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیئے۔ کسی نے منہ سے کچھ نہیں کہا

جانکی داس ان کے لئے بھوجن لے کر آیا۔ وہ آٹھوں بھوجن کے لئے بیٹھے۔ تب ان میں سے ایک جانکی داس سے مخاطب ہوا۔ ''اب تم چلے جاؤ''۔

اس کی آواز کرخت تھی اور لہجے میں تحکم تھا۔ جانکی داس کو اچھا تو نہیں لگا۔ لیکن اسے زیادہ پروا بھی نہیں ہوئی۔ اسے تو بس اپنی ذمے داری پوری کرنی تھی۔ ''میں یہاں قریب ہی ہوں''۔ اس نے کہا۔ ''کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ گھنٹی بجا دینا''۔

www.allurdu.com

''اب ہمیں ضرورت صبح نکلتے سے ہی پڑے گی''۔اسی شخص نے کہا۔''دھنے واد''۔

جانکی داس کمرے سے نکل آیا۔وہ برابر والے چھوٹے کمروں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

.....x.....

اس شام گھٹا خوب گھر کر آئی۔اوتار سنگھ کا دل جیسے کھل اٹھا۔ساون کا وہ کب سے انتظار کر رہا تھا۔

صحرا میں بہار موسم بہار میں نہیں آتی۔صحیح معنوں میں بہار کا آغاز ساون کی پہلی جھڑی سے ہوتا ہے۔ساون کی محبت اوتار سنگھ کے لئے بچپن کی محبت تھی۔یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ ہر چیز پر غور کرتا تھا.....تجسس کرتا تھا۔

وہ باہر نکلتا اور گاؤں کے آخری سرے تک جاتا۔وصال دین اس کے ساتھ ہوتا تھا۔جہاں گاؤں ختم ہوتا تھا،وہاں سے صحرا شروع ہوتا تھا۔ریت ہی ریت.....لہریں لیتی ہوئی ریت۔دھوپ ہوتی اور ہلکی سی بھی ہوا چلتی تو ریت کی جگہ پانی نظر آتا.....اور وہ پانی باقاعدہ لہریں لیتا،آگے بڑھتا نظر آتا۔ریت تو صحرا کا خاص عنصر تھی۔اسکے علاوہ وہاں ریت کے سینے پر خاردار جھاڑیوں اور کچھ سوکھے درختوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔

ریت کا عجیب مزاج تھا۔وہ محض ایک لمحے کیلئے دباؤ قبول کرتی تھی۔پھر پہلے جیسی ہو جاتی تھی۔اس نے ریت پر چل کر دیکھا۔پیر تھوڑے سے اندر دھنستے تھے۔پیروں کے نشان بنتے۔ذرا آگے جا کر وہ پلٹ کر دیکھتا تو پیچھے والے نشان معدوم ہو چکے ہوتے۔جیسے اس نے وہاں پاؤں رکھا ہی نہ ہو۔اور وہاں بھٹکنے کا امکان بہت زیادہ تھا۔وجہ یہ تھی کہ وہاں سب کچھ ایک جیسا تھا۔کہیں کوئی خاص نشانی نظر نہیں آتی تھی۔اس کی وجہ سے سمتوں کا اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا۔ایک بار وہ دونوں سورج غروب ہونے تک واپس نہیں ہوئے۔اس کے بعد وہ راستہ بھٹک گئے۔اور بڑی مشکل سے انہیں بستی کے نشان نظر آئے۔ان کا اعتماد بحال ہوا۔مگر وہ چند لمحوں کی بات تھی۔بستی میں داخل ہونے سے پہلے ہی انہیں احساس ہو گیا کہ وہ ان کا گاؤں نہیں ہے۔بعد میں انہیں پتا چلا کہ وہ شیو پور میں ہیں۔

زمین دار کی گاڑی میں انہیں ٹھاکروں کی گڑھی بھجوایا گیا،جہاں ان کی ڈھونڈ مچی تھی۔لالٹینیں اٹھائے ہوئے گاؤں کے لوگ انہیں صحرا میں ڈھونڈ رہے تھے۔پتا جی بہت پریشان تھے۔انکے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

اسے دیکھتے ہی انہوں نے اسے لپٹا لیا۔''کہاں چلے گئے تھے تم اوتار سنگھ؟''۔

''گھومنے گیا تھا پتا جی۔پھر راستہ بھول گیا''۔

''صحرا میں راستہ بھولنا بہت آسان ہوتا ہے پتر۔اور ایک بار راستہ بھول جائے تو صحرا منش کو نگل جاتا ہے۔میں تو ڈر ہی گیا تھا''۔ٹھاکر نے کہا۔''پر نتو مجھے کچھ یاد آ گیا۔پھر مجھے وشواس ہو گیا کہ تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔میں شانت ہو گیا۔پر من میں ہلکی سی چنتا لگی رہی''۔

''آپ کو کیا یاد آیا تھا پتا جی؟''۔

''کچھ نہیں۔کچھ بھی نہیں''۔ٹھاکر نے تیزی سے کہا۔پھر بات بدل دی۔''اور تم بھٹک کر مہیش پور نکل جاتے تو اچھا نہ ہوتا۔اب ایسے نہ نکلنا کبھی''۔

''واہ پتا جی.....بھٹکنے کے ڈر سے میں گھومنا چھوڑ دوں''۔اوتار سنگھ نے کہا۔

ٹھاکر چند لمحے سوچتا رہا۔پھر بولا۔''ٹھیک ہے۔جو من میں آئے کرو پتر۔پر مہیش پور کے معاملے میں احتیاط کرنا''۔

صحرا کے مشرق کی طرف شیو پور تھا اور جنوب کی طرف مہیش پور۔اوتار سنگھ نے گھومنا پھرنا تو نہیں چھوڑا۔مگر جنوب کی سمت کا وہ خاص خیال رکھتا تھا۔یہ اس کی فطرت تھی کہ پتا جی کی نافرمانی وہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

تب ایک دن اس نے وہ جادوئی منظر دیکھا،جس کے بعد اسے ساون سے محبت ہو گئی۔

وہ منظر اسے آج بھی یاد تھا۔مگر اس منظر میں ایک جادو اور تھا۔وہ یہ کہ اسے جب بھی دیکھو،لگتا تھا کہ پہلی بار دیکھ رہے ہیں۔اس لئے آج ساون کی گھٹا گھر کر آئی تو اوتار سنگھ وصال دین کی طرف چل دیا

حمیدہ اسے دیکھ کر کھل اٹھی۔''آؤ چھوٹے ٹھاکر،تم تو کبھی آتے ہی نہیں''۔

''پڑھائی میں لگا رہتا ہوں نا اماں''۔اوتار نے کہا۔پھر شکایتی لہجے میں بولا۔''تم ایسے پکارتی ہو اماں تو اچھا نہیں لگتا''۔

''کیسے پکارتی ہوں میں؟''۔حمیدہ نے حیرت سے پوچھا۔

''میں تمہارے لئے ٹھاکر ہوں اماں''۔اوتار کے لہجے کی شکایت اور بڑھ گئی۔

حمیدہ سمجھ گئی۔مسکراتے ہوئے بولی۔''تم تو بیٹے ہو میرے۔اچھا لسی لاؤں تمہارے لئے''۔

''نہیں اماں۔اس وقت تو میں بس ویر جی کو لینے آیا ہوں''۔

''تو جلدی کیا ہے؟ کہاں جا رہے ہو؟''۔

''بس اماں،سورج غروب ہونے سے پہلے کچھ دیکھنا ہے''۔

اتنے میں وصال دین کمرے سے نکل آیا تھا۔''بھائی.....تم کب آئے؟''۔

اوتار سنگھ نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما اور اسے دروازے کی طرف کھینچنے لگا۔''بس چلو نا ویر جی۔دیر نہیں کرنی ہے''۔

وہ دونوں صحرا کی طرف چل دیئے۔

گاؤں کے آخری سرے پر کھڑے ہو کر انہوں نے صحرا کی طرف دیکھا۔ڈوبتے سورج کی دم توڑتی روشنی میں ریت لوہے کے ذرات جیسی لگ رہی تھی.....سیاہی مائل۔لیکن چمک دار اور حد نظر تک صحرا ہی صحرا تھا۔کہیں کسی آبادی کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔بس ایک مقام تھا،جہاں آسمان ریت کو چومتا دکھائی دے رہا تھا۔وہ نظروں کی آخری حد تھی۔لیکن اوتار سنگھ جانتا تھا کہ کل نظر وہاں تک نہیں پہنچ سکے گی۔

اچانک ایک خیال نے اوتار سنگھ کو بری طرح چونکا دیا۔اس کے وجود میں خود ملامتی کی ایک تند اونچی لہر اٹھی اور اسے اندر سے بھگو گئی۔ارے.....کیا میں اس آواز والی کو بھول گیا؟اس کی آواز کو بھول گیا؟''۔

بس اس کے بعد ایک ہی خیال تھا،جو اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔اسے فوری طور پر مولوی صاحب کے پاس پہنچنا ہے.....سورج ڈوبنے سے پہلے!

''آؤ ویر جی چلیں''۔اس نے وصال دین کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''ایسی جلدی کیا ہے بھائی''۔وصال دین نے بے پروائی سے کہا۔

''جلدی ہے ویر جی۔مجھے سورج ڈوبنے سے پہلے حویلی پہنچنا ہے.....مولوی صاحب کے پاس''۔

سورج ڈوبنے کے حوالے پر وصال دین کو مغرب کا خیال آیا اور وہ شرمندہ ہو گیا۔اسے تو خیال ہی نہیں رہا تھا۔لیکن فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔ابھی مغرب میں کچھ وقت تھا۔لیکن اوتار سنگھ کو بہت جلدی تھی۔پہلے تو وہ تیز قدموں سے چلا۔پھر باقاعدہ دوڑنے لگا۔وصال دین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسی کیا افتاد آن پڑی ہے۔پھر اسے احساس ہوا کہ اوتار سنگھ تو حویلی کی طرف جا رہا ہے جبکہ اسے ابھی مغرب کی نماز ادا کرنا تھی۔وہ حویلی جاتا تو نماز قضا ہو جاتی۔

''بھائی.....میں گھر جاؤں؟''۔اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔کیونکہ اوتار سنگھ اسے چلنے کو کہتا تو وہ انکار نہیں کر سکتا تھا۔

مگر خلاف توقع اوتار سنگھ نے اس سے کہا۔''ٹھیک ہے ویر جی۔تم گھر جاؤ''۔

وصال دین نے سکون کی سانس لی اور اپنا رخ گھر کی طرف کر لیا۔وہ کم سوچنے والا سادہ طبیعت کا لڑکا تھا۔اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ کچھ مخصوص اوقات میں اوتار سنگھ اسے ساتھ رکھنے سے گریز کرتا ہے۔

اوتار سنگھ پوری قوت سے حویلی کی طرف دوڑ رہا تھا۔وہ اس وقت نیچے والی اور اس کی آواز کے بارے میں سوچ رہا تھا۔وہ اس کا ایسا راز تھی،جس میں وہ کسی کو بھی شریک نہیں کر سکتا تھا.....ویر جی کو بھی نہیں۔یہی وجہ تھی کہ ہر معاملے میں وصال دین کو شریک کرنے کی خواہش کے باوجود اس نے اسے مولوی صاحب کی پڑھائی میں شریک نہیں کیا تھا۔اور اس وقت جبکہ اسے مولوی صاحب سے عربی سننا تھی تو وہ وصال دین کو ساتھ لے جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

حویلی میں داخل ہونے سے پہلے اس نے سورج کو دیکھا۔سورج اب بھی ایک بڑے زرد گولے جیسا دکھائی دے رہا تھا.....یعنی وہ ابھی غروب ہونے کے عمل میں داخل نہیں ہوا تھا۔اس نے سکون کی سانس لی اور مولوی صاحب کے کمرے کی طرف لپکا۔

مگر مولوی صاحب کا کمرا خالی تھا۔وہ پریشان ہو ہی رہا تھا کہ مولوی صاحب غسل خانے کی طرف سے آتے نظر آئے۔ان کا چہرہ اور ہاتھ پاؤں بھیگے ہوئے تھے۔''ارے اوتار سنگھ،خیریت تو ہے،ہانپ کیوں رہے ہو؟''۔انہوں نے اس سے پوچھا۔

اوتار سنگھ کی سانس سینے میں نہیں سما رہی تھی۔''وہ.....مولوی صاحب .....مجھے۔عربی میں.....کچھ سنا دیجئے''۔

مولوی صاحب کو روز کا معمول یاد آ گیا۔''آج وقت کچھ کم ہے.....'' انہوں نے کہا

www.allurdu.com

اوتار سنگھ نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ یہ احساس اس سے زیادہ کسی کو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے تو احساس جرم ہو رہا تھا ساون کی محبت میں گھٹا کو امنڈتے دیکھ کر وہ اپنی اصل محبت کو بھول گیا تھا۔

''مگر ٹھیک ہے''۔ مولوی صاحب نے مزید کہا۔ ''ادب سے بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں کچھ سناتا ہوں''۔

اوتار سنگھ بیٹھا اور ہمہ تن سماعت ہو گیا۔

مولوی صاحب نے قرات شروع کی.....اور پھر وہی ہوا۔ احساس جرم معدوم ہو گیا۔ اس پر سپردگی اور خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔

اب وہ پھر دہلی میں اسی کوٹھے پر تھا!

.....x.....

رات ہو گئی تھی۔ اوتار سنگھ مولوی صاحب کے پاؤں دبا رہا تھا۔ باہر تیز بارش ہو رہی تھی۔ سورج غروب ہونے کے ذرا دیر بعد ہی بارش شروع ہوئی تھی۔ تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ رکنا تو دور کی بات، بارش کے زور میں معمولی سی کمی تک نہیں ہوئی تھی۔ اور اوتار سنگھ نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو آسمان بالکل سیاہ تھا۔ یعنی گھٹا اسی طرح چھائی ہوئی تھی۔

مولوی صاحب کسمسائے۔ اوتار سنگھ جانتا تھا کہ وہ کیا کہیں گے۔ وہ پاؤں دباتا رہا۔

''بس بیٹے، اب مجھے نیند آ رہی ہے''۔ مولوی صاحب نے کہا۔

''تھوڑی دیر اور مولوی صاحب'' اوتار سنگھ کے لہجے میں لجاجت تھی۔

''ٹھیک ہے بیٹے۔ مگر یہ یاد رکھنا کہ جب مجھے نیند آتی ہے تو جسم پر ہلکا سا دباؤ بھی نیند کو دور کر دیتا ہے''۔

اوتار سنگھ نے فوراً ہی ہاتھ روک لئے۔ کہیں مولوی صاحب کی نیند اڑ نہ جائے۔ وہ بہت آہستگی سے بستر سے اترا اور دبے پاؤں دروازے کی طرف چلا روشنی گل کرنے کے بعد وہ کمرے سے نکل آیا

اس کا رخ پتاجی کے کمرے کی طرف تھا، جو اب اس کی خواہ گاہ بھی تھا۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو وہ معمول کے مطابق بیٹھے اپنی ڈائری میں کچھ لکھ رہے تھے۔ انہوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور دوبارہ لکھنے لگے۔ چند لمحے بعد انہوں نے ڈائری ایک طرف رکھی اور قلم بھی رکھ دیا۔ ''آؤ پتر، سناؤ کیسا دن گزرا''۔

''ہمیشہ کی طرح اچھا پتاجی''۔ اوتار سنگھ نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''اور تمہاری پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟''۔

''بہت اچھی۔ مولوی صاحب بہت اچھے استاد ہیں''۔

''سو تو ہیں ہی۔ پر میرا پتر دنیا کا سب سے اچھا شاگرد ہے''۔

اوتار سنگھ شرمندہ ہو گیا۔ اپنی تعریف سننا اسے کبھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ مگر اگلے ہی لمحے اسے احساس ہوا کہ یہ الفاظ پتاجی کے نہیں ہیں۔ ضرور انہوں نے مولوی صاحب سے بات کی ہو گی اور یہ مولوی صاحب نے کہا ہو گا۔ ''آپ نے مولوی صاحب سے بات کی تھی؟''۔ اس نے پوچھا۔

''اوش کی تھی''۔ ٹھاکر نے کہا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری پڑھائی کے لئے میں بہت چنتا کرتا ہوں۔ تمہاری طرف سے نہیں، بلکہ اس بات کی کہ کہیں کوئی کمی نہ رہ گئی ہو''۔

اوتار سنگھ کو ان پر بڑی شدت سے پیار آیا۔ وہ ان کا بیٹا تھا۔ مگر وہ اس کی عزت بڑوں کی طرح سے کرتے تھے۔ کیوں؟ یہ بات وہ کبھی نہیں سمجھ سکا تھا۔ ''پتا آپ بہت اچھے ہیں۔ آپ نے مجھے ہمیشہ بہت اچھے استاد دیئے ہیں''۔

''اس میں میرا کچھ نہیں پتر۔ یہ سب تو بھاگیہ کی باتیں ہیں۔ اور تم بھاگیہ وان ہو''۔ ٹھاکر نے کہا۔ پھر اس کی آنکھوں سے تجسس جھلکنے لگا۔ ''مولوی صاحب سے تم کیا پڑھتے ہو پتر؟''۔

اوتار سنگھ نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ''عربی پڑھتا ہوں''۔

''سو تو میں بھی جانتا ہوں۔ پر تو عربی میں کیا پڑھتے ہو؟''۔

''عربی زبان.....اس کے قواعد۔ بس ابھی تو یہی پڑھ رہا ہوں''۔ اوتار سنگھ نے جواب دیا۔ ''جو میں نے ابھی تک سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے قواعد بہت منظم اور ذخیرہ الفاظ بہت بڑا ہے۔ ایک چیز کے لئے اس زبان میں کئی کئی لفظ ہیں''۔ اوتار سنگھ کہنا چاہتا تھا کہ وہ اس زبان کا ادب، اس کی شاعری پڑھنا چاہتا ہے، لیکن مولوی صاحب اسے صرف قواعد میں الجھائے ہوئے ہیں۔ مگر یہ شکایت ہوتی.....اور استاد کی شکایت گستاخی ہوتی ہے۔ پھر سچی بات یہ کہ مولوی صاحب ہی سمجھ سکتے تھے کہ کس چیز کی کیا اہمیت ہے۔ وہ تو نہیں جانتا تھا۔

''یہ بتاؤ پتر کہ تمہیں عربی پڑھنے کا خیال کیسے آیا؟''۔

یہ وہ بات تھی جو اوتار سنگھ سچائی کے ساتھ کسی کو نہیں بتا سکتا تھا۔ ''بس پتاجی، ایک دن نصاب نامے میں یہ نام دیکھا تو میرا جی چاہا کہ میں یہ زبان پڑھوں، ہندی، اردو، فارسی اور انگلش بھی تو پڑھتے ہیں ہم''۔

''ہوں.....''۔ ٹھاکر نے ہنکارا بھرا۔ پھر پرخیال لہجے میں بولا۔ ''من میں کوئی بات بے سبب نہیں آتی۔ کبھی کبھی نامعلوم شکتیاں منش کو کسی اور طرف لے جانا چاہتی ہیں تو من میں خود بہ خود خیال آتا ہے''۔

''میں سمجھا نہیں پتاجی''۔ اوتار سنگھ بری طرح چونکا۔

www.allurdu.com

''کچھ نہیں پتر۔ پوری طرح تو میں بھی نہیں سمجھا ہوں۔ بس منہ سے نکل گئی تھی یہ بات''۔ ٹھاکر اپنے کم عمر بیٹے کو ابھی سمجھانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ کہیں وہ الجھ نہ جائے۔ لیکن اوتار سنگھ کو وہ بات معنی خیز لگی تھی اور وہ اسی پر غور کر رہا تھا۔

''آج ساون کی جھڑی لگی ہے''۔ ٹھاکر نے بات بدلنے کی غرض سے کہا۔

''جی پتا جی۔ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے''۔

''ساگر بھی برس جائے تو صحرا کی پیاس نہیں بجھتی''۔

''اچھا اب آپ لیٹ جائیں..... میں آپ کے پیر دبا دوں''۔

''روز روز کیوں تکلیف کرتے ہو پتر''۔

''تکلیف نہیں پتا جی، یہ تو میرا دھرم ہے۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

ٹھاکر شرمندہ ہو گیا۔ اس نے تو کبھی اپنے پتا کے پاؤں نہیں دبائے تھے۔ دبانے کی کوشش کرتا تو بھی وہ دبانے نہ دیتے۔ کہتے، یہ اتنے نوکر چاکر کس لئے ہیں۔'' تم نے شاستروں میں پڑھی ہے یہ بات؟'' اس نے پوچھا۔

''شاستروں کا تو مجھے نہیں پتا۔ بس میرا من کہتا ہے۔ اوتار سنگھ نے سادگی سے کہا۔

ٹھاکر لیٹ گیا اور اوتار سنگھ اس کی ٹانگیں دبانے لگا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ ٹھاکر کو اس سے بڑا سکون ملتا تھا۔ لیکن جب اوتار سنگھ اس کے ساتھ لیٹتا اس سے لپٹتا تو وہ اس کیلئے دنیا کی سب سے بڑی راحت ہوتی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ نیند کوتر سے ہوئے ٹھاکر کو اب پرسکون نیند آنے لگی تھی۔

''بس اب لیٹ جاؤ پتر۔'' تھوڑی دیر بعد ٹھاکر نے کہا۔ ''اب نیند آ رہی ہے۔''

اوتار سنگھ ٹھاکر سے لپٹ کر لیٹ گیا۔ چند منٹ بعد ہی اسے اندازہ ہوا کہ پتا جی سو چکے ہیں۔ وہ مسکرایا۔ کتنی اچھی بات ہے کہ وہ سونے لگے ہیں۔ اس نے اس عرصے میں ٹھاکر میں بہت بڑا فرق دیکھا تھا۔ اس کی صحت بہتر ہو گئی تھی۔ کاش..... یہ خیال مجھے پہلے ہی آ گیا ہوتا۔ پچھتاوے کا کانٹا اس کے دل میں چبھنے لگا۔

اس نے آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کی۔ لیکن اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وجہ اسے معلوم تھی۔ بارش! اس کا بس چلتا تو اسی وقت وہ صحرا کی طرف چل دیتا۔ اب وہ صبح کا منتظر تھا۔

اس نے پتا جی کے اچھی طرح سونے کا اطمینان کیا۔ پھر اٹھ کر روشنی گل کی اور کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے کھڑکی کے شیشے سے چہرہ لگایا۔ شیشہ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ ٹھنڈا بھی اور دھندلا بھی۔ اس کے باوجود نظر آ رہا تھا کہ بارش بہت تیز ہو رہی ہے۔ ویسے تو یہ بتانے کے لئے بارش کا شور ہی بہت تھا۔

کچھ دیر وہ کھڑکی کے پاس کھڑا رہا۔ پھر اسے خیال آیا کہ پتا جی اس سے لپٹ کر سونے کے عادی ہیں۔ کہیں اس کے نہ ہونے سے ان کی نیند نہ اچٹ جائے۔ دل نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مسہری کی طرف چل دیا۔

مولوی برکت علی بڑی الجھن میں تھے۔ کبھی تو وہ یہ تک سوچنے لگتے تھے کہ یہ ٹیوشن قبول کر کے انہوں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔ خود کو ایسی آزمائش میں ڈال دیا ہے، جس سے صحیح وسلامت نکلنا ممکن نہیں ہے۔ الجھن کی وجہ ان کا شاگرد تھا۔

وہ پورا معاملہ ہی پیچیدہ تھا۔ ابتدا میں انہیں اس کا احساس نہیں ہوا تھا۔ لیکن اب ان کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ ان کے شاگرد کی اہلیت، لیاقت اور اس کی سیکھنے کی لگن کی شدت..... بلاشبہ یہ سب لائق تعریف عوامل تھے۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ غیر مسلم تھا اور اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا سیکھ رہا ہے اس سے تو خود اس کیلئے بھی پیچیدگیاں پیدا ہوتیں۔ مگر وہ اس سے بے خبر تھا۔ جبکہ مولوی صاحب باخبر تھے۔ اس لئے پریشانی بھی ان کے لئے تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ عربی ایسی زبان نہیں کہ آدمی یونہی سیکھ لے اور وہ اسے آ بھی جائے۔ کوئی بھی زبان، جب تک اسے اندر نہ اتارا جائے، اس پر دسترس نہیں ہوتی۔ لیکن عربی زبان اس معاملے میں سب سے آگے ہے۔ برسوں کی ریاضت کے بعد ہی کوئی اس پر دسترس حاصل کر سکتا ہے۔

مگر اوتار سنگھ کا ذہن بہت تیز تھا اور سیکھنے کی خواہش بے حد توانا۔ فہم کے اعتبار سے وہ غیر معمولی لڑکا تھا۔ اگر وہ مسلمان ہوتا تو مولوی برکت علی خود کو بہت خوش نصیب سمجھتے کہ انہیں ایسا شاگرد ملا ہے۔ پھر اس کا خاندانی پس منظر الگ ایک مسئلہ تھا۔ وہ ایک متمول راج پوت گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ مولوی صاحب جانتے تھے کہ ذرا سی بھی چوک ہو گئی تو ان کے جینے کے لالے پڑ جائیں گے۔ وہ تو مصیبت میں پھنس گئے تھے۔

ابھی تو انہوں نے اسے حروف اور قواعد کے پھیر میں الجھایا ہوا تھا۔ مگر وہ جانتے تھے کہ اس طرح کام نہیں چلے گا۔ اوتار سنگھ کی رفتار کم کرنے کے لئے ان کے پاس ایک ہی ہتھیار تھا، جو اس نے خود انہیں دیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اسے اس زبان پر قدرت حاصل کرنی ہے۔ انہوں نے اس کی یہ بات پکڑ لی تھی۔ جب بھی وہ تیزی کی کوشش کرتا، وہ اسے ٹوک دیتے۔'' بیٹے، عربی تو اس طرح تم سیکھ لو گے لیکن اس پر قدرت نہیں حاصل کر سکو گے۔ آہستہ چلو آہستہ۔''

اور شاید اوتار سنگھ کے لئے یہ بات بڑی اہم تھی۔ کیونکہ وہ فوراً ہی تیز رفتاری ختم کر دیتا۔

www.allurdu.com

مولوی برکت علی کے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ قواعد سے نمٹنے کے بعد اوتار سنگھ لازمی طور پر عربی لٹریچر پڑھنے کی خواہش کرتا۔ دور جاہلیت کا عربی ادب وہ اسے پڑھانا نہیں چاہتے تھے۔ جدید عہد کا عربی لٹریچر ہندوستان میں دستیاب نہیں تھا۔ کچھ یوں بھی تھا کہ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ عربی میں دلچسپی صرف مسلمانوں کو تھی اور اس کا سبب، اس کا محرک صرف اور صرف دین تھا۔ لہٰذا صرف اپنی کتب مل سکتی تھیں۔ قرآن پاک، حدیث اور سنت، پر کتابوں کی کمی نہیں تھی۔ لیکن اوتار سنگھ کو وہ یہ سب کچھ پڑھا نہیں سکتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کسی کو پتا چل جاتا تو ان کی زندگی تک خطرے میں پڑ جاتی یہی کہا جاتا کہ وہ اس کا دھرم بھرشٹ کر رہے ہیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ بہر حال مشرک تھا۔ جبکہ ان کتابوں کو تو وہ خود بھی وضو کیے بغیر نہیں چھوتے تھے۔ وہ انہیں ہاتھ لگائے، اس کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

تو سوال یہ تھا کہ یہ مرحلہ آنے پر وہ اسے پڑھنے کو کیا دیں اور ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔

اس وقت خود کو سوتا ظاہر کر کے انہوں نے اسے رخصت کیا اور خود اس مسئلے پر سوچتے رہے۔ وہ بہت اچھا شاگرد تھا۔ صرف پڑھنے کے معاملے میں نہیں۔ شاگردی کے آداب بھی اسے خوب آتے تھے۔ وہ نہ صرف احترام کرنیوالا تھا، بلکہ بے حد خدمت گزار بھی تھا۔ وہ احسان مانتا تھا کہ وہ اسے پڑھا رہے ہیں ایسی خدمت تو مولوی صاحب کی کسی نے کبھی نہیں کی تھی۔

مولوی صاحب نے ایک بات سمجھ لی تھی۔ درحقیقت انہوں نے بہت غلط عرصے میں یہ ٹیوشن قبول کی تھی۔ گرمی کی سالانہ چھٹیاں، یہی وجہ تھی کہ وہ جن کی طرح ان کے سر پر سوار رہتا تھا۔ اسکول کے دن ہوتے تو اوتار سنگھ کے پاس اتنی فرصت ہی نہ ہوتی۔ عربی کو وہ بہت کم وقت دیتا۔

اس خیال کے ساتھ ہی ایک ترکیب ان کی سمجھ میں آ گئی۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ کل اس پر عمل کریں گے۔ یوں اوتار سنگھ کی رفتار اور کم ہو جائے گی۔ وہ ایسے مطمئن ہوئے کہ انہیں نیند آ گئی!

.....X.....

صبح ہوتے ہوتے بارش تھم گئی تھی!

اوتار سنگھ ایسا بے تاب ہو رہا تھا کہ ناشتہ کیے بغیر ہی حویلی سے نکل آیا اور وصال دین کے گھر کی طرف چل دیا۔ گاؤں کو دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ کسی نے اسے دھو کر بالکل نیا کر دیا ہے..... نیا اور اجلا اجلا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ آسمان پر اب بھی گھٹا چھائی ہوئی تھی۔ یہ طے تھا کہ ابھی بارش اور ہو گی۔

وصال دین بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بولا۔ ''مجھے معلوم تھا بھائی، آج تم ضرور آؤ گے''۔

''تم نے ناشتہ کیا ہے چھوٹے ٹھاکر؟''۔ حمیدہ نے پوچھا۔

''نہیں اماں''۔

''تو وصال دین کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ میں گرم گرم روٹی ڈال رہی ہوں۔ مکھن موجود ہے''۔

اوتار سنگھ کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن حمیدہ کے کہنے پر بیٹھ گیا۔ وہ تو اس وقت بس یہ چاہتا تھا کہ اڑ کر صحرا میں پہنچ جائے۔ مگر اماں کی اتاری ہوئی گرم گرم روٹی، اماں کا بلویا ہوا مکھن اور لسی..... اس کی بھوک بھڑک اٹھی۔ وہ کھانے بیٹھا تو کھاتا ہی چلا گیا۔ عجیب سواد تھا اماں کے ہاتھ کے کھانے میں۔

وصال دین پہلے ہی اٹھ گیا تھا۔ اوتار سنگھ کو احساس ہوا کہ وہ کچھ زیادہ ہی کھا گیا ہے۔ اس نے لسی کا گلاس خالی کر کے رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ''چلو..... ویر جی اب چلنا ہے''۔ اس نے وصال دین کو پکارا۔

''آتا ہوں بھائی''۔ وصال دین نے کمرے سے جواب دیا۔

''ابھی ذرا دیر رکو''۔ حمیدہ نے کہا۔

''کیوں اماں؟''۔ اوتار سنگھ نے بے صبرے پن سے کہا۔

''بس کہہ جو دیا کہ رکو۔ ابھی تک لوگ نہیں جا سکتے۔ میں اجازت دوں گی تو جاؤ گے نا''۔

اوتار سنگھ بیٹھ گیا۔ مگر وہ اندر ہی، اندر مچل رہا تھا۔ ایک ایک پل اسے گراں گزر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد حمیدہ ایک پوٹلیا لئے ہوئے آئی۔ ''لو یہ رکھ لو''۔ اس نے پوٹلیا وصال دین کی طرف بڑھائی۔

''یہ کیا ہے اماں؟''۔ اوتار سنگھ نے پوچھا۔

''روٹی مکھن اور ساگ ہے''۔ حمیدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس کے لئے روکا تھا تمہیں''۔

''اس کی کیا ضرورت ہے اماں؟''۔

''بچے ہو میرے۔ جانتی نہیں ہوں کیا تمہیں''۔ حمیدہ نے بڑے مان سے کہا۔ ''اب نکلو گے تو گھر کا ہوش تھوڑی رہے گا تمہیں۔ شام سے پہلے تو لوٹو گے نہیں۔ ساون میں بھوک بہت لگتی ہے''۔

اوتار سنگھ نے دل میں حمیدہ کو اس کی عقل مندی پر سراہا۔ واقعی وہ ان کا مزاج خوب سمجھتی تھی۔

وہ دونوں چلنے لگے۔ دروازے تک پہنچے تو حمیدہ نے پکارا۔ ''سنو..... لٹھیاں لیتے جاؤ۔ آج کل سانپ بہت نکل آتے ہیں بلوں سے''۔

وصال دین خاموشی سے جا کر کوٹھری سے دو لاٹھیاں نکال لایا۔ ایک لاٹھی اس نے اوتار سنگھ کی طرف بڑھا دی اور دوسری خود رکھ لی۔

''اور ہاں، خیال رکھنا کہ سورج ڈوبنے سے پہلے واپس آ جاؤ۔ ورنہ ٹھاکر بھیا مجھ پر بہت خفا ہوں گے''۔

اوتار سنگھ مسکرایا۔ یہ اماں کا خاص ہتھیار تھا۔ اس سے کوئی ایسی بات منوانی ہوتی، جس کے بارے میں انہیں خدشہ ہوتا کہ وہ بھول جائے گا تو وہ یہ جملہ بڑے اہتمام سے کہتیں۔ حالانکہ اوتار سنگھ نے پتا جی کو کبھی اماں پر خفا ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انہوں نے پتا جی کو غصہ کرتے ہی نہیں دیکھا تھا۔

''ٹھیک ہے اماں۔ ہم شام سے پہلے آ جائیں گے''۔ اس نے کہا۔

وہ دونوں گھر سے نکل آئے۔

.....X.....

وہ گاؤں کی سرحد پر سحر زدہ سے کھڑے سامنے کا منظر دیکھے جا رہے تھے!

صحرا کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ وہاں تو اب ایک جنگل کھڑا تھا۔ رنگا رنگ پھولوں کے پودے راتوں رات دھرتی سے نکل آئے تھے۔ ٹنڈ منڈ درخت ہرے بھرے ہو گئے تھے۔ ان پر نئی کونپلیں پھوٹی تھیں اور وہ نکھرے ہوئے پتوں سے بج گئے تھے۔ کیکٹس کے تمام پودوں پر پھول نکل آئے تھے..... نازک اور خوش رنگ پھول! اور تو اور خاردار جھاڑیاں بھی ریشم جیسی نرم لگ رہی تھیں، جیسے کسی نے ان پر مخمل کا غلاف چڑھا دیا ہو۔

یہ وہ منظر تھا کہ جب بھی دیکھو، نیا لگتا تھا۔ یہ منظر اس شعر کی تصویر تھا.....

یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا
کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا

اوتار سنگھ نے جب پہلی بار یہ شعر پڑھا تو حیران رہ گیا۔ جب اس نے پہلی بار صحرا کو لباس تبدیل کرتے دیکھا تھا تو اس کے ذہن میں یہی خیال آیا تھا۔ وہ شاعر نہیں تھا کہ اسے شعور میں ڈھال لیتا۔ یہ شعور پڑھ کر اس نے سوچا تھا کہ یہ شعر وہی کہہ سکتا ہے جس نے صحرا کو پل میں روپ بدلتے دیکھا ہو۔ اور اسے سمجھ بھی وہی سکتا تھا، جس کی صحرا سے شناسائی ہو۔

وہ جادو لگتا تھا اور صحرا جادو نگری تھا۔ کسی نے جادو کی چھڑی گھمائی اور جادو کے زور سے سب کچھ بدل گیا۔ بدلنے کا اس سے تیز، اس سے بھرپور مفہوم کسی اور نظارے میں ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ بارش سے پہلے کے ٹنڈ منڈ درخت تعداد میں بہت کم لگتے تھے۔ لیکن بارش کے بعد ان کی تعداد بہت زیادہ لگتی تھی۔ یا شاید زیادہ ہو ہی جاتی تھی۔ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کیونکہ بارش کے نتیجے میں ایک دن میں یہ تو ممکن نہیں تھا کہ کچھ اگے بھی..... اور فوراً ہی درخت بھی بن جائے۔ وہ دونوں دیر تک سحر زدہ سے کھڑے وہ منظر دیکھتے رہے۔

اوتار سنگھ پیچھے..... بہت پیچھے پہنچ گیا تھا..... زندگی کے اس ابتدائی دور میں جب اس نے غور و فکر..... تجسس کرنا سیکھا تھا۔

www.allurdu.com

جب وہ ہر وقت سوالوں سے بھرا رہتا تھا اور ہر وقت جواب کھوجتا تھا۔ آج پھر اس کی وہی کیفیت ہوگئی۔ ایک اہم سوال کا جواب جو ملنا تھا۔

ایک بات اس نے سمجھ لی تھی۔ زندگی چار عناصر کی مرہون منت تھی۔ مٹی، پانی، آگ اور ہوا۔ ان میں سے کوئی ایک بھی کم ہو جاتا تو زندگی ختم ہو جاتی۔ وہ ہمیشہ سوچتا تھا کہ چاروں میں اہم ترین عنصر کون سا ہے۔

اس نے یہ بات اپنے تینوں معلموں سے پوچھی تھی۔

''دیکھ پتر، ہر دیوتا کو اپنا کام کرنا ہے۔ سو وہ کرتے ہیں''۔ ماتا جی نے کہا تھا۔ ''بات صرف اتنی ہے کہ جیون کو چلتے رہنا ہے''۔

''تو جیون کو کبھی رکنا بھی ہوگا''۔ اوتار سنگھ نے پوچھا۔

''نا پتر۔ جیون تو دھارا ہے۔ جنموں کا چکر ہے''۔

''جنموں کا چکر؟''۔

''ہاں پتر۔ جیون کا کوئی انت نہیں۔ سے کی دھارا میں منش بار بار آتا ہے..... بھیس بدل کر''۔

''کیا مطلب ماتا جی؟''۔

''یہ سب کرموں کا کھیل ہے۔ کرم اچھے ہوں تو بہتر روپ ملتا ہے اگلے جیون میں۔ کرم برے ہوں تو برا روپ ملتا ہے۔ منش جانور بن کر بھی پیدا ہوتا ہے''۔

ماتا جی کے ساتھ یہ معاملہ تھا۔ سیدھی بات کو بھی الجھا دیتی تھیں۔ وہ عناصر پر تجسس کر رہا تھا اور انہوں نے اسے آواگون کا فلسفہ تھما دیا تھا۔ وہ کئی دن اس پر غور کرتا رہا۔ گائے کو دیکھتا تو سوچتا کہ کیا پچھلے جنم میں یہ عورت رہی ہوگی اور اس نے بہت اچھے کرم کئے ہوں گے۔ تبھی تو یہ گئو ماتا بنی۔ ماتا جی کہتی تھیں کہ گائے سب سے اچھا روپ ہے۔ اور وہ کتے کو دیکھتا تو اس کے پچھلے جنم کے کرموں کا سوچتا۔ یہ سزا اس کی سمجھ میں بھی نہیں آئی اور اچھی بھی نہیں لگی کہ کسی نے اچھے کرم نہیں کئے تو بھگوان نے اسے کتا بنا دیا۔ اور گئو ماتا کی پوتر تا بھی اس کے حلق سے نہیں اترتی تھی۔ گائے جانور تھی، اور وہ بھی بے وقوف۔ جہاں چاہتی، گوبر کر دیتی۔ اسے ماتا کا درجہ کیسے دیا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد اس نے ماسٹر جی سے رجوع کیا۔

''سب اپنی جگہ اہم ہیں''۔ ماسٹر جی نے کہا۔ ''کوئی ایک بھی کم ہو جائے تو زندگی ختم ہو جائے۔ سائنس بتاتی ہے کہ زمین جب سورج سے ٹوٹ کر علیحدہ ہوئی تو تپ رہی تھی۔ اس کی تپش سے ابخرات بنے۔ بارش ہوئی..... اور لاکھوں سال برستی رہی۔ تب زمین ٹھنڈی ہوئی۔ پھر بارش کے نتیجے میں نباتات کی افزائش ہوئی۔ وہ زمین پر زندگی کا آغاز تھا۔ سورج نے توانائی دی۔ نباتات کی افزائش ہوئی۔ ہوا نے بیج ادھر ادھر بکھیرے۔ پھر بارش ہوئی تو بیجوں سے پودوں نے سر اٹھایا۔ اب کوئی بھی عنصر کم ہو جائے تو زندگی ختم''۔

''زندگی اس طرح شروع ہوئی تو ماسٹر جی، انسان کسی درخت پر اگا تھا؟''۔

ماسٹر جی بری طرح گڑبڑا گئے۔ ''منش کی نسل بڑھنے کا سسٹم الگ ہے''۔

''میں یہ پوچھ رہا ہوں ماسٹر جی کہ دنیا کا پہلا منش کیسے پیدا ہوا؟ وہ کسی درخت پر ہی اگا ہوگا نا''۔

ماسٹر جی کا چہرہ تمتما اٹھا۔ ''نہیں اوتار سنگھ، سائنس بتاتی ہے کہ منش بندر تھا۔ ہزاروں سال کے ارتقائی عمل کے بعد وہ بندر سے منش کے روپ میں آیا''۔

''تو پھر لاکھوں کروڑوں بندر، بندر کیسے رہ گئے۔ ان پر ارتقا کا عمل کیوں ناکام ہو گیا''۔ اوتار سنگھ نے اعتراض کیا۔ ''اور اب تو میں آپ سے یہ پوچھوں گا کہ پہلا بندر، پہلا ہاتھی، پہلا کتا، ہر پہلا جاندار کیسے وجود میں آیا۔ مان لیا کہ بندر ترقی کر کے انسان بن گیا۔ مگر یہ تو بتائیں کہ بندر کہاں سے آیا؟''۔

ماسٹر جی تو ناچ کر رہ گئے۔ ''ہم بات عناصر کی کر رہے تھے''۔ انہوں نے جلدی سے کہا۔ پھر اس کا دھیان ہٹانے کی غرض سے عناصر کے بارے میں بے حد طویل تقریر کر ڈالی۔ آخر میں انہوں نے فیصلہ سنایا کہ چاروں عناصر یکساں طور پر اہم ہیں۔ کسی کو کسی پر فوقیت نہیں دی جا سکتی۔

اوتار سنگھ بے حد معاملہ فہم تھا۔ اور اس میں خوبی تھی کہ وہ کسی بات کے پیچھے نہیں پڑتا تھا۔ اس کا مقصد کسی کو عاجز کرنا، بے بسی میں مبتلا کرنا نہیں تھا۔ وہ تو صرف جاننا اور سمجھنا چاہتا تھا۔ جب وہ سمجھ لیتا کہ اب یہاں سے معلومات حاصل نہیں ہو سکیں گی تو وہ بات ختم کر دیتا۔ اس وقت بھی اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔ مگر اس نے سمجھ لیا کہ اب ماسٹر جی کچھ بتا نہیں سکیں گے۔ چنانچہ اس نے بات آگے نہیں بڑھائی۔

مگر اس کے دماغ میں آواگون کی پھانس بھی چبھی ہوئی تھی۔ اس نے ماسٹر جی کو اس سلسلے میں اکسانے کی کوشش کی۔

''یہ سب بکواس ہے''۔ ماسٹر جی نے تند لہجے میں کہا۔ وہ بہت محتاط تھے۔ یہ جواب ہرگز نہیں دیتے۔ مگر پچھلی گفتگو نے انہیں جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا اس جھنجلاہٹ میں انہوں نے یہ جواب دیا۔ ''منش مر گیا تو سب کچھ ختم''۔

اوتار سنگھ نے سمجھ لیا کہ اب ماسٹر جی سے کچھ حاصل نہیں ہو سکے گا۔

آخر میں وہ حمیدہ کے پاس گیا۔

''چھوٹے ٹھاکر، میرے بیٹے..... میں پڑھی لکھی نہیں ہوں''۔ حمیدہ کے لہجے میں معذرت تھی۔

''اس سے کیا ہوتا ہے اماں''۔ اوتار سنگھ بولا۔ ''میں پڑھتا ہوں، مگر تم مجھ سے زیادہ جانتی ہو۔ بتاؤ نا اماں''۔

حمیدہ چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ ''مجھ جاہل کی سمجھ میں یہ تو آتا ہے کہ ترتیب بہر حال ہوتی ہے۔ مٹی کے پیٹ میں بیج پڑا ہوتا ہے۔ لیکن پانی کے بغیر بیج سے کلا نہیں پھوٹتا۔ زندگی پانی سے شروع ہوتی ہے۔ پھر مٹی کام آتی ہے۔ اس کے بعد سورج بڑھوتی کرتا ہے۔ بیج کی۔ اسے درخت بناتا ہے۔ ہوا بیج بکھیرتی ہے''۔

وہ جواب بھی تسلی بخش نہیں تھا۔ اوتار سنگھ دوسرے مرحلے کی طرف بڑھ گیا۔ ''یہ بتاؤ اماں، پہلا آدمی کیسے پیدا ہوا؟''۔

حمیدہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''اللہ نے پیدا کیا تھا''۔

اوتار سنگھ مایوس ہو گیا۔ اب اماں کہیں گی، خود بخود پیدا ہو گیا تھا۔ تاہم پوچھے بغیر وہ نہ مانا۔ ''کیسے؟''۔

''مٹی سے۔ اللہ نے مٹی سے اس کا پتلا بنایا''۔

''جیسے مورت ہوتی ہے''۔ اوتار سنگھ نے کہا۔ ''مگر اس میں تو زندگی نہیں ہوتی''۔

''اس لئے کہ اسے اللہ نے نہیں بنایا، آدمی نے بنایا ہے۔ اللہ نے پہلے پتلا بنایا۔ پھر اس میں روح پھونک دی''۔

''اچھا اس کا کوئی نام بھی تو ہوگا''۔

''ہاں۔ وہ حضرت آدم تھے..... پہلے انسان''۔

''مگر اب جو اتنے سارے منش ہیں''۔

''حضرت آدم اکیلے تھے۔ ان کا ہم جنس، ان جیسا کوئی نہیں تھا، ان کی تنہائی دور کرنے کیلئے اللہ نے ان کی پسلی سے عورت کو پیدا فرمایا۔ وہ حضرت حوا تھیں۔ ان دونوں کی اولاد تمام انسان ہیں''۔

اوتار سنگھ کی دلچسپی کہیں کی کہیں پہنچ گئی۔ ''یعنی ان کے بعد تمام انسان ویسے پیدا ہوئے، جیسے ہوتے ہیں۔ یہ بات تو دل کو لگتی ہے اماں''۔

مگر وہی لمحہ تھا کہ حمیدہ بھڑک گئی۔ ارے..... وہ ٹھاکر اوتار سنگھ کو دین پڑھا رہی ہے۔ یہ تو آگ سے کھیلنا ہوا۔ ''بس بیٹے، تم مجھ سے ایسی باتیں نہ پوچھا کرو''۔

''اچھا، اب نہیں پوچھوں گا''۔ اوتار سنگھ نے نہایت سعادت مندی سے کہا۔ ''بس ایک بات اور بتا دو۔ یہ تمہارا کون سا جنم ہے؟''۔

حمیدہ دونوں ہاتھوں سے رخسار پیٹنے لگی۔ ''توبہ توبہ۔ ہر آدمی کو زندگی بس ادو بار ملتی ہے۔ ایک بار پیدا ہوتا ہے۔ اللہ نے جتنی عمر اسے دی ہوتی ہے، اتنی جیتا ہے۔ پھر وقت آنے پر مر جاتا ہے اور مٹی میں مل جاتا ہے''۔

اوتار سنگھ خوش ہو گیا۔ دو جنم کی بات تو اماں بھی کر رہی ہیں۔ اس نے سوچا۔ پھر بولا۔ ''وہی تو میں بھی پوچھ رہا ہوں اماں۔ یہ تمہارا پہلا جنم ہے یا دوسرا؟''۔

''زندگی بس ایک ہی ہوتی ہے۔ دوسری زندگی تو قیامت کے دن سب کو ایک ساتھ ملے گی۔ اور قیامت ابھی نہیں آئی ہے۔ دوسری زندگی جب ملے گی تو اسے موت کبھی نہیں آئے گی۔ تب ہر آدمی ہمیشہ زندہ رہے گا''۔

اب اوتار سنگھ الجھ گیا۔ یہ معاملہ زیادہ پیچیدہ معلوم ہو رہا تھا۔ ''یہ قیامت کیا ہوتی ہے اماں؟''۔

''میں نہیں بتا سکتی چھوٹے ٹھاکر۔ اور جو کچھ میں نے کہا ہے، وہ بھی کسی سے نہ کہنا۔ لوگ سنیں گے تو کہیں گے کہ ہم سب کو زندہ زمین میں گاڑ دیں گے''۔ حمیدہ کے لہجے میں خوف تھا۔

www.allurdu.com

''میں کسی سے نہیں کہوں گا اماں۔تم بتاؤ تو''۔

مگر حمیدہ نے چپ سادھ لی۔ایسا ہمیشہ ہوتا تھا۔اب وہ اس کی زبان نہیں کھلوا سکتا تھا۔

''کہاں کھوئے ہوئے ہو بھائی''۔وصال دین کی آواز اوتار سنگھ کو حال کی دنیا میں کھینچ لائی۔''چلو نا..... بیر بہوٹیاں پکڑیں''۔

مگر وصال دین اس وقت ہل بھی نہیں سکتا تھا۔اس کے ذہن میں ایک جسیم خیال کے خدوخال واضح ہو رہے تھے۔اس نے بے دھیانی سے کہا۔''جلدی کیا ہے۔ابھی چلتے ہیں''۔

وصال دین نے اسے بہت غور سے دیکھا۔پھر سر جھٹک دیا۔

اوتار سنگھ سامنے دیکھتا رہا۔مگر درحقیقت وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔موہوم سے اس خیال کے خدوخال واضح ہوتے جا رہے تھے۔

اس نے صحرا کا تصور کرنے کی کوششوں کی.....صحرا جو کل تھا۔لیکن کھلی آنکھوں کے ساتھ سامنے دیکھتے ہوئے یہ کام آسان نہیں تھا۔ہرے بھرے جنگل کو دیکھتے ہوئے اس مردہ صحرا کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔اس نے آنکھیں موند لیں۔

اس بار مردہ صحرا کا منظر اس کے سامنے تھا۔واقعی! وہ تو جیسے مردہ زمین تھی۔اور اب..... بارش کے بعد.....اب وہ زندہ ہو گئی تھی۔واضح طور پر وہ سانسیں لیتی محسوس ہو رہی تھی۔اس کے سینے پر سبزہ لہلہا رہا تھا۔درخت تیز تیز سانسیں لے رہے تھے۔پتے ہل رہے تھے۔پھول جھوم رہے تھے۔رنگ مسکرا رہے تھے۔خوشبوئیں مل جل کر.....ایک دوسری کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر تالیاں بجاتی محسوس ہو رہی تھیں۔

اس لمحے اوتار سنگھ نے سمجھ لیا کہ پانی بہت اہم ہے۔زندگی پانی کے دم سے ہے۔پانی سے ہی شروع ہوئی ہوگی۔جب کچھ بھی نہیں رہا ہوگا،تب بھی سب پہلے پانی ہی رہا ہو گا۔

اس آواز اور اس آواز والی کی محبت میں گرفتار ہونے کے بعد وہ پہلا موقع تھا کہ وہ یہ سب کچھ سوچ رہا تھا۔غور و فکر کر رہا تھا۔پہلی بار اسے احساس ہوا کہ اس محبت نے اسے اپنی جستجو اور تلاش سے دور کر دیا تھا۔اسے بہت اچھا لگا۔لیکن چند ہی لمحے بعد وہ بلا ارادہ پھر اس آواز کے بارے میں سوچنے لگا۔باقی سب اس کے ذہن سے نکل گیا۔

''آؤ ویر جی،چلیں''۔اس نے وصال دین سے کہا۔

دونوں صحرا کی حدود میں داخل ہو گئے۔وصال دین نے جلدی سے شیشی میں تھوڑی سی ریت بھر لی۔اوتار سنگھ نے بھی گھٹنوں کے بل بیٹھ کر ریت کو چھوا اس کا دل خوشی سے بھر گیا۔ریت بھیگی ہوئی تو نہیں تھی۔لیکن ٹھنڈی ہو رہی تھی۔جبکہ عام دنوں میں اس پر ننگے پاؤں چلنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔اسے پتا جی کی کہی ہوئی رات کی بات یاد آئی.....ساگر بھی برس جائے تو صحرا کی پیاس نہیں بجھتی۔

وہ بیر بہوٹیاں تلاش کرتے ہوئے آگے بڑھے۔چھوٹی بیر بہوٹیوں کو وہ نظر انداز کر رہے تھے۔مگر انہیں دیکھنے کی خوشی بھی بہت بڑی تھی۔سرخ.....خوب صورت سرخ رنگ کی یہ ننھی سی مخلوق جیسے نرم ملائم ریشم سے بنی تھی۔ایسی کہ اسے دیکھ کر حیرت ہو کہ بھگوان نے کیا کیا بنایا ہے اور کیسا بنایا ہے۔اپنی پتلی لمبی ٹانگوں پر چلتی وہ بہت عجیب لگتی تھی۔عجیب اور خوب صورت۔مگر جب وہ اپنے پنجے بند کر لیتی تو اسے دیکھ کر سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ وہ کوئی مخلوق ہے۔ایسے میں اسے دیکھ کر اوتار سنگھ کو پتا جی کی انگوٹھی یاد آتی تھی،جس میں بہت خوب صورت سرخ پتھر جڑا تھا۔اوتار سنگھ کو وہ بہت اچھا لگتا تھا۔وہ اکثر اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا کرتا تھا۔

ایک دن ٹھاکر کو اس بات کا احساس ہو گیا۔اس نے انگوٹھی اتار کر اس کی طرف بڑھائی۔''لو پتر.....اچھی طرح دیکھ لو اسے''۔

اوتار سنگھ نے پتھر کو بہت غور سے دیکھا۔وہ بہت خوش رنگ اور بے داغ تھا۔

''یہ یاقوت ہے پتر۔بہت اچھی کوالٹی کا پتھر بہت مہنگا اور بہت خوب صورت ہوتا ہے تم پہنو گے''۔

''نہیں پتا جی۔دیکھنا اچھا لگتا ہے۔انگوٹھی پہننے کا مجھے شوق نہیں''۔

مگر پنجے سمیٹے ہوئے،ساکت بیر بہوٹی یاقوت سے ہزار گنا خوب صورت لگتی ہے۔اور دوسرے زاویے سے دیکھو تو یاقوت جتنا سخت ہوتا ہے،بیر بہوٹی اتنی ہی نازک ہوتی ہے۔اسے بڑی نزاکت اور احتیاط سے پکڑا جاتا ہے۔ایک بار انگلی اور انگوٹھے کا دباؤ ذرا سا بڑھ گیا تھا تو اس کے ہاتھ میں موجود بیر بہوٹی پھچ سے پچک گئی تھی،جیسے بہت پکا ہوا انگور ذرا سے دباؤ سے پھٹ جاتا ہے۔اس کی انگلیوں پر سیال سا چپک گیا تھا۔اس کا دل برا ہو گیا۔

انہوں نے آٹھ دس بڑی بڑی بیر بہوٹیاں پکڑ کر شیشی میں ڈال لیں۔پھر وہ مزید رنگ جمع کرنے میں مصروف ہو گئے۔وہ رنگ پھولوں کی شکل میں تھے جنہیں وہ شیشی میں لگا رہے تھے۔

وہ دن ہی رنگوں سے کھیلنے کا تھا۔ان کے ہاتھ ایک مشغلہ اور آ گیا۔وہ تتلیوں کے پیچھے بھاگتے پھرے۔بڑی مشکل سے بھاگ دوڑ کر کے وہ کسی تتلی کو پکڑتے۔مگر فوراً ہی چھوڑ دیتے۔پھر وہ انگلی اور انگوٹھے کے پوروں پر موجود ریشمی لمس کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے محسوس کرتے۔وہ عجیب جادوئی لمس تھا۔دل میں پھول کھلتے محسوس ہوتے تھے۔

دوپہر ہوئی تو انہیں بھوک کا احساس ہوا۔انہوں نے ندی کے کنارے بیٹھ کر کھانا کھایا۔پھر وہیں بیٹھ کر انہوں نے اپنا محبوب مشغلہ شروع کیا۔انہوں نے شیشی میں سے اپنے لئے ایک ایک بیر بہوٹی منتخب کی۔انہوں نے ریت پر ایک لکیر کھینچی اور دونوں بیر بہوٹیوں کو اس لکیر پر رکھ دیا۔پھر انہوں نے کچھ فاصلے پر ایک اور لکیر کھینچ دی۔وہ گویا ونگ پوسٹ تھی۔جس کی بیر بہوٹی پہلے وہ لکیر پار کر جاتی وہ جیت جاتا۔

بیر بہوٹی کی عجیب فطرت ہے۔ہاتھ میں لینا تو بڑی بات ہے،وہ کسی کی موجودگی بھی محسوس کر لے تو اپنے پنجے سمیٹ کر ایک خول کی صورت میں بند ہو جاتی ہے اس وقت بھی دونوں کی بیر بہوٹیوں کی یہی پوزیشن تھی۔وہ ساکت تھیں۔

www.allurdu.com

ان کے اندر جنبش تک نہیں تھی۔

اس کا منتر ان دونوں کے پاس تھا۔ دونوں اپنی اپنی بیر بہوٹی پر جھک کر وہ منتر گنگنانے لگے۔ ''بیر بہوٹی اپنے انجے پنجے کھول۔ تیرا ماموں لڈو پیڑے لایا۔ بیر بہوٹی اپنے انجے پنجے کھول.....''۔

چند ہی لمحوں میں بیر بہوٹیوں نے اپنے پنجے کھول دیئے۔ لیکن وصال دین کی بیر بہوٹی نے فوراً ہی اپنا رخ تبدیل کیا اور دوسری لکیر کی طرف بڑھنے کی بجائے اسی لکیر پر چلنے لگی۔

''ارے یہ کیا''۔ وصال دین چلایا۔ ''ادھر کہاں جا رہی ہو۔ ادھر چلو''۔ اس نے جلدی سے اپنی بیر بہوٹی کو پکڑ کر اس کی سمت درست کی۔ مگر بیر بہوٹی پھر اپنے پنجے بند کر کے بیٹھ گئی۔

دوسری طرف اوتار سنگھ کی بیر بہوٹی ذرا ٹیڑھی سمت سہی، بہرحال دوسری لکیر کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ''شاباش..... تھوڑا تیز چلو..... کچھ اور تیز..... شاباش میری بیر بہوٹی.....''۔ اوتار سنگھ اسے بڑھاوا دے رہا تھا، جیسے وہ سب کچھ سن اور سمجھ رہی ہو۔

ادھر وصال دین اپنی بیر بہوٹی کی سمت درست کرنے کے بعد التجائیہ لہجے میں منتر گنگنا رہا تھا۔ ''بیر بہوٹی اپنے انجے پنجے کھول.....''۔

بالآخر وصال دین کی بیر بہوٹی نے اپنے پنجے کھولے اور چلنا شروع کیا۔ چلنا کیسا، وہ تو اب دوڑ رہی تھی، جیسے سچ مچ کسی دوڑ میں حصہ لے رہی ہو۔ جبکہ اوتار سنگھ کی بیر بہوٹی خراماں خراماں چل رہی تھی۔ اور اس نے ٹیڑھا چل کر اپنی مسافت اور بڑھا لی تھی۔

دونوں بیر بہوٹیوں کے درمیان فاصلہ تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ ادھر دوسری لکیر بھی زیادہ دور نہیں رہ گئی تھی۔ دونوں لڑکے چیخ چیخ کر اپنی اپنی بیر بہوٹی کو بڑھاوا دے رہے تھے۔ وہ اپنے اس کھیل میں اتنے منہمک تھے کہ انہوں نے بھاری قدموں کی قریب آتی ہوئی آہٹیں بھی نہیں سنیں۔

ہاں انہیں اس پر حیرت ضرور ہوئی کہ دونوں بیر بہوٹیوں نے اچانک ہی اپنے پنجے سمیٹ لئے۔

''یہ کیا؟''۔ وصال دین نے کہا۔ اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔ اب پھر منتر پڑھنا ہوگا۔ اور نجانے بیر بہوٹیاں پنجے کھولنے میں کتنی دیر لگائیں۔

.....X.....

ان آٹھوں کو یہاں آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ اور اب وہ مایوس ہونے لگے تھے۔ ویسے تو وہ آئے ہی ناخوش تھے۔ جسونت کا لحاظ نہ ہوتا تو وہ آتے ہی نہیں پندرہ سال کے ایک عام سے لڑکے کو ٹھکانے لگانے کیلئے آٹھ آدمی۔ ان کے خیال میں یہ بات ذلت آمیز تھی۔

''یا..... یہ کام تو میں اکیلا ہی کر آؤں گا''۔ کرتارے نے جسونت سے کہا۔ ''کیوں ہم سب کو ذلیل کرتے ہو''۔

''دیکھو..... میں بہت سوچ سمجھ کر کام کر رہا ہوں''۔ جسونت نے نرم لہجے میں کہا۔ ''اس میں احتیاط ضروری ہے صرف ٹھکانے لگانا کافی نہیں ہے۔ کام ایسے ہو کہ کوئی نشان بھی نہ چھوڑا جائے۔ کسی کو کچھ پتا نہ چلے۔ ورنہ ایک نشان ہی ٹھاکر پرتاپ کو اصل آدمی تک پہنچا دے گا''۔

''اور اصل آدمی کون ہے؟''۔

''یہ تمہیں پتا نہ ہو، اسی میں بھلائی ہے''۔

اس پر کرتار آپے سے باہر ہو گیا۔ ''او یار جسونت، صاف بول نا کہ ہم کو زنانی سمجھتا ہے۔ او کوئی ہم سے کچھ اگلوا سکتا ہے بھلا''۔

''کام میری مرضی کے مطابق کرنا ہے''۔ جسونت نے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں نے کسی کو وچن دیا ہے کہ اونچ نیچ نہیں ہوگی۔ تو مجھے اس وچن کا پالن کرنا ہے''۔

''تو یار، مکھی کو مارنے کے لئے توپ چلاؤ گے''۔ اس بار گوپال نے زبان کھولی۔

''تو تم لوگ رہنے دو۔ میں کسی اور سے بات کر لوں گا''۔

یہ سن کر کرتار اتیر کی طرح سیدھا ہو گیا۔ یہ تو بہت بڑی بے عزتی تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے اس کا یار کسی اور سے کام لے۔ ''پر یارا، سمجھا تو۔ یہ سب کیوں؟''۔

''بات یہ ہے کہ وہاں چھپنا آسان نہیں۔ وہ کوئی شہر تو ہے نہیں''۔

''یہی تو میں کہتا ہوں''۔ کرتارے نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ ''یہ ایک آدمی کا کام ہے۔ ایک آدمی کا چھپنا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ آٹھ آدمیوں کی کیا ضرورت ہے۔ اور آٹھ آدمی کہاں چھپ سکتے ہیں''۔

''بدھی سے کام لے کرتارے۔ مجھ کو بتایا گیا ہے کہ لڑکا من موجی ہے۔ کسی بھی وقت کسی بھی طرف نکل کھڑا ہوتا ہے۔ اور نہیں نکلتا تو کئی کئی دن حویلی سے باہر بھی نہیں آتا۔ ایک بار تو وہ راستہ بھول کر دوسرے گاؤں پہنچ گیا تھا۔ میں چاہتا ہوں، تم لوگ ڈاکو بن کر جاؤ۔ موقع ملے تو بے شک کسی کو لوٹ بھی لو۔ اور تم لوگ الگ الگ رہو۔ یوں تم پورے علاقے پر نظر رکھ سکو گے۔ میں نے کہا نا کہ وہ کسی بھی وقت کہیں بھی نکل سکتا ہے۔ ایک آدمی ہو تو وہ برسوں بھی کسی کو نہیں ملے گا''۔

بات کچھ کچھ سمجھ میں آتی تھی۔ پھر بھی دل نہیں مانتا تھا۔ یہ تو واقعی مکھی کو توپ کے گولے سے مارنے والی بات تھی۔ لیکن دوستی کا لحاظ تھا۔ کرتارے کو ماننا پڑا۔

یہاں آ کر وہ ایشور لال کی حویلی میں ٹھہرے۔ صبح سویرے جانکی داس انہیں کھانا دے کر رخصت کرتا اور وہ نکل کھڑے ہوتے۔ وہ اونٹوں پر سوار ہوتے اور صحرا میں پہنچ کر الگ ہو جاتے۔ دو وقت ان کی یکجائی کے ہوتے تھے۔ دوپہر میں کھانا کھانے کے لئے وہ ندی کے کنارے اکٹھا ہوتے اور رات کو واپس جاتے سمے بھی وہ وہیں ملتے۔ وہاں سے وہ ساتھ ہی مہیش پور جاتے۔

اس ایک ہفتے میں انہوں نے چند افراد کو لوٹا تھا۔ مگر قسمت کی بات کہ وہ سب دور پرے کے گاؤں دیہاتوں کے لوگ تھے۔ جو یا تو شہر کی طرف جا رہے تھے یا شہر سے گاؤں واپس آ رہے تھے۔ یوں قریب کے دیہاتوں میں ڈاکوؤں کی آمد کا چرچا نہ ہو سکا، جو وہ چاہ رہے تھے۔

بہرحال اس ایک ہفتے میں ان کا دل اچاٹ ہو گیا۔ من موجی لڑکا جس کی وجہ سے وہ یہاں آئے تھے، اس کی تو ایک جھلک بھی انہیں دکھائی نہیں دی تھی بس دو دن پہلے تو وہ تہہ خانے میں بیٹھ کر اس پر گفتگو کر رہے تھے کہ کیا اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے انہیں ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی حویلی میں ہی گھسنا پڑے گا۔

''یہ تو بھول جاؤ''۔ کرتارے نے کہا تھا۔ ''دل تو میرا ابھی یہی کرتا ہے۔ لیکن مجبوری ہے''۔

پھر کل شام موسلا دھار بارش شروع ہوئی۔ ان کے لئے تو وہ مسئلہ بن گئی۔ کہاں پناہ لیتے۔ مجبوراً ایک ایک کر کے وہ معمول سے پہلے مہیش پور چلے گئے تاہم کسی نے انہیں نہیں دیکھا۔ بارش کے نتیجے میں لوگ اپنے گھروں میں دبکے ہوئے تھے۔

بارش ان کے لئے بڑی شبھ ثابت ہوئی تھی۔ صحرا ہرا بھرا ہونے کے بعد ایسا مقام نہیں رہا تھا کہ جہاں چھپنا کچھ مشکل ہو۔ بعض جگہوں پر تو وہ گھنا جنگل بن گیا تھا۔ ادھر موسم سے ان کی طبیعت بھی جولانی پر تھی۔

دوپہر کے وقت وہ یکجا ہوئے اور ندی کی طرف چل دیئے۔ کرتارا آگے تھا۔ جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلتے ہی انہیں وہ دونوں نظر آئے۔ اوتار سنگھ کو اس نے پہلی نظر ہی میں پہچان لیا۔ وہ اپنی تصویر کے عین مطابق تھا۔

کرتارے نے جھٹکے سے اپنے اونٹ کو روکا اور ہاتھ اٹھا کر ساتھیوں کو رکنے کا اشارہ کیا۔ پھر پلٹ کر سرگوشی میں بولا۔ ''شکار بھٹ سے نکل آیا ہے''۔

ان سب کے چہرے کھل اٹھے۔

''اونٹ یہیں باندھ دو۔ میں اور راجو آگے جائیں گے۔ باقی یہیں رکیں گے''۔

''تم سردار ہو کرتارے۔ موقع ہمیں ملنا چاہئے''۔ اس کے ایک ساتھی نے کہا۔

کرتارے نے چند لمحے سوچا۔ بحث کرنا مناسب نہیں تھا۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ یہ کام راجو اور گوپال کریں گے''۔

راجو اور گوپال نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں نے اپنے ہتھیاروں کو چھوا اور آگے بڑھ گئے۔

.....X.....

اوتار سنگھ نے آہٹیں سنی تو تھیں۔ مگر اس کا دھیان بیر بہوٹی کی طرف تھا اس لئے اس نے ان پر توجہ نہیں دی۔

www.allurdu.com

دونوں بیر بہوٹیوں کے پنجے بند کرنے کے بعد اس کی چھٹی حس نے اچانک ہی اسے نامعلوم خطرے کا احساس دلایا۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ ڈھاٹے باندھے ہوئے دو افراد تھے۔ ایک کے ہاتھ میں بڑا بلم تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں خنجر تھا، جسے وہ بار بار دونوں ہاتھوں میں تول رہا تھا اوتار سنگھ نے سمجھ لیا کہ وہ دشمن ہیں۔

وہ دونوں ابھی کوئی بیس قدم کے فاصلے پر تھے۔ اوتار سنگھ نے سرگوشی میں وصال دین کو پکارا۔ ''ویر جی.....جلدی کرو۔ لٹھیا سنبھالو''۔

وصال دین نے چونک کر ایک نظر اسے اور پھر ان دونوں کو دیکھا۔ انداز ایسا تھا جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہو۔

ان کی لاٹھیاں کچھ دور پیچھے کی طرف پڑی تھیں۔ اوتار سنگھ تیزی سے جھپٹا اور لاٹھی اٹھالی۔ اسی لمحے وصال دین بھی جیسے سب کچھ سمجھ گیا۔ وہ بھی لاٹھی کی طرف لپکا۔ دونوں دوست لاٹھیاں اٹھانے کے بعد ایک دوسرے سے خاصا دور چلے گئے۔

ڈھاٹا باندھے ہوئے دونوں افراد نپے تلے انداز میں آگے بڑھ رہے تھے۔ لیکن ان دونوں نے جس انداز میں لاٹھیاں سنبھالی تھیں اس سے وہ کچھ جھجک گئے۔ انہوں نے پلٹ کر اس سمت دیکھا، جدھر سے وہ آئے تھے۔

ادھر کرتارے کی نگاہوں سے تشویش جھلکنے لگی تھی۔ لڑکوں نے جس انداز میں لاٹھیاں سنبھالی تھیں، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں لٹھیا چلانی آتی ہے۔ اور یہ خطرناک بات تھی۔ اگر وہ اوسط درجے کے لٹھیا باز بھی تھے تو راجو اور گوپال ان کیلئے ناکافی تھے۔

''دو آدمی اور چلے جائیں''۔ کرتارے نے اپنے ساتھیوں سے سرگوشی میں کہا۔

دو آدمی اور آگے بڑھ گئے۔

دونوں لڑکے لاٹھی سنبھالے کھڑے تھے۔ انہوں نے دو اور آدمیوں کو جھنڈ سے نکل کر آتے دیکھا۔ ان کے ہاتھوں میں بھی نیزے تھے۔ دونوں لڑکوں کی ملی جلی کیفیت تھی۔ وہ پراعتماد بھی تھے۔ انہیں جمال دین جیسے ماہر فن نے یہ فن سکھایا تھا۔ لیکن کچھ ڈر بھی تھا۔ کیوں کہ آپس میں مشق کرنا اور بات ہے اور مسلح دشمنوں کا سامنا کرنا اور بات ہے۔ وہ پہلا موقع تھا کہ ان کا واسطہ سچ مچ کے کسی دشمن سے پڑا تھا۔

نئے آنے والے دونوں آدمی اپنے پہلے ساتھیوں سے آملے۔ اب ان میں سے دو وصال دین کی طرف بڑھ رہے تھے اور دو اوتار سنگھ کی طرف۔

درمیانی فاصلہ کم ہوتے ہی دونوں لڑکے تیزی سے حرکت میں آئے۔ لاٹھیاں اتنی تیزی سے گردش کر رہی تھیں کہ نظر ہی نہیں آ رہی تھیں۔

پھر جو کچھ ہوا، وہ لمحوں میں ہوا۔ پہلے خنجر والا لپیٹ میں آیا۔ اس کا خنجر ہاتھ سے نکلا اور اڑتا ہوا دور جا گرا۔ وہ ہاتھ پکڑ کر چیخ رہا تھا اور اس کا ہاتھ پہنچے کے پاس سے لٹک رہا تھا۔ دوسرا شکار کرپان والا تھا۔ اوتار سنگھ کی لاٹھی اس کی کنپٹی پر لگی اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ڈھیر ہو گیا۔

دونوں نیزے والے بھی گھبرا گئے تھے۔ وہ نیزے سے لاٹھی کا کام لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن لٹھیا بازی کے فن سے نابلد تھے۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ زیادہ دیر نہیں ٹک سکیں گے۔ دشواری یہ تھی کہ انہیں پلٹ کر بھاگنے کا موقع بھی نہیں مل رہا تھا۔

وصال دین کچھ نروس تھا۔ اس کا ارتکاز مکمل نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نیزہ اس کے بازو کو چھو کر گزرا۔ اس کی قمیص پھٹ گئی اور بازو پر ایک لکیر سی کھنچ گئی، جو دیکھتے ہی دیکھتے خون سے بھر گئی۔

''تم ہٹ جاؤ ویر جی''۔ اوتار سنگھ نے اسے پکارا۔ ''انہیں میں سنبھال لوں گا''۔

لیکن زندگی بھر وفاداری کا سبق پڑھنے والا اس آزمائش سے منہ نہیں پھیر سکتا تھا۔

ادھر جھنڈ میں صورت حال اور خراب تھی۔ دو ساتھیوں کو گرتے دیکھ کر باقی لوگ میدان میں اترنا چاہتے تھے۔ جوش تو کرتارے کا خون بھی مار رہا تھا۔ لیکن اسے اپنے وچن کی فکر بھی تھی۔ وہ بہت تیزی سے سوچ رہا تھا۔ ''تم میں سے کوئی آگے نہیں بڑھے گا''۔ وہ سرگوشی میں پھنکارا۔

''تو اپنے ساتھیوں کو پٹتا دیکھتے رہیں''۔ رگھبیر نے غرا کر کہا۔

''اور کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا۔ لٹھیا چلانی آتی ہے تم میں سے کسی کو''۔ کرتارے نے چیلنج کیا۔

وہ تینوں خاموش رہے۔

''ہم بیس بھی ہوتے تو ان کیلئے کم تھے''۔ کرتارے نے کہا۔ ''اور سوچنے کی کوشش کرو۔ ہمیں اپنے کسی ساتھی کو یہاں چھوڑ کر نہیں جانا ہے.....زندہ نہ مردہ۔ اور میں اکیلا سات آدمیوں کو لے کر نہیں جا سکتا''۔

اتنی دیر میں لڑکوں سے لڑنے والے ان کے دوسرے دو ساتھی بھی ڈھیر ہو چکے تھے۔

''چلو ویر جی گاؤں کی طرف''۔ اوتار سنگھ نے وصال دین سے کہا۔ ''ہمیں وہاں سے لوگوں کو لے کر آنا ہے''۔

''میں یہیں رک جاتا ہوں''۔ وصال دین نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

اوتار سنگھ اس کا مطلب سمجھ گیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ان کی فکر نہ کرو ویر جی۔ یہ اٹھنے والے نہیں۔ آؤ میرے ساتھ۔ ہمیں جانے اور واپس آنے میں بس دس منٹ لگیں گے''۔

بات ماننے والا وصال دین اوتار سنگھ کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

لڑکوں کے اوجھل ہوتے ہی کرتارا اور اس کے ساتھی اپنے گرے ہوئے ساتھیوں کی طرف لپکے

www.allurdu.com

وہ بے سدھ تھا۔ باقی تین ہوش میں تھے۔ مگر اٹھنے کے قابل نہیں تھے۔ ''جلدی کرو''۔ کرتارے نے کہا۔

انہوں نے چاروں ساتھیوں کو اونٹوں پر لادا۔ ''اب کرنا کیا ہے؟''۔ رگھبیر نے پوچھا۔

''نکلنا ہے یہاں سے''۔

''مہیش پور چلیں گے؟''۔

''بے وقوف نہ بنو۔ اب اس علاقے میں ہمیں ایک پل بھی نہیں رکنا ہے''۔ کرتارے نے جھنجلا کر کہا۔

.....x.....

ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے وید کو وصال دین کی مرہم پٹی کرنے کو کہا اور اپنے ساتھ کچھ آدمیوں کو لے کر اودتار سنگھ کے ساتھ چل پڑا۔ کیدارناتھ بھی ان کے ساتھ تھا۔

وہ وہاں پہنچے تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ بیر بہوٹیوں کی شیشی ایک طرف الٹی پڑی تھی۔ اس کے منہ میں اٹکائے گئے پھول مسلے ہوئے تھے۔ بیر بہوٹیاں شیشی سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ لیکن ان سے نکلا نہیں جا رہا تھا۔

اس کے علاوہ وہاں کوئی ایسی نشانی نہیں تھی، جو اس واقعے کی گواہی دے۔

کیدارناتھ نے ادھر ادھر دیکھا اور تمسخرانہ لہجے میں اودتار سنگھ سے بولا۔ ''پتر..... کہیں ایسا تو نہیں کہ تم دونوں نے خواب دیکھا ہو۔ یہاں تو ایسا کچھ بھی نہیں ہے''۔ اس کا لہجہ فاتحانہ تھا۔

اودتار سنگھ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے اسے گھور کر دیکھا۔ ''وصال دین کے بازو کا زخم تو اصلی ہے۔ یا وہ بھی خواب میں لگا ہے''۔

''کسی درخت کی شاخ سے خراش لگی ہوگی ٹھاکر ویر''۔ کیدارناتھ نے بڑے ادب سے کہا۔ ''ورنہ سوچو تو۔ اتنی سی دیر میں چار زخمی آدمی کہاں جا سکتے ہیں۔ جبکہ پتر اودتار سنگھ کا کہنا ہے کہ وہ اٹھنے کے قابل نہیں تھے''۔

ٹھاکر پرتاپ کے ساتھ ایک کھوجی بھی تھا۔ ٹھاکر نے اس سے کہا۔ ''تو ادھر ادھر دیکھ۔ مجھے لگتا ہے، ان کے اور ساتھی بھی ہوں گے''۔

اس دوران اودتار سنگھ متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا رہا تھا۔ ندی کے کنارے ایک چمکتی ہوئی چیز نظر آئی تو وہ اس طرف لپکا۔ وہ ایک حملہ آور کا خنجر تھا۔ ''یہ دیکھیں پتا جی''۔ اس نے پکارا۔

ٹھاکر پرتاپ اس کی طرف بڑھا۔ کھوجی چند لمحے ادھر ادھر جائزہ لینے کے بعد جھنڈ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

ٹھاکر نے وہاں پہنچ کر وہ خنجر اٹھایا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ''یہ لو کیدارناتھ، خواب کا خنجر خواب سے باہر بھی آ گیا ہے''۔

''میں تو یوں ہی کہہ رہا تھا ٹھاکر ویر''۔ کیدارناتھ نے کھسیا کر کہا۔ ''یہ نشانی تو نہیں دیکھی تھی نا میں نے''۔

ذرا ہی دیر میں کھوجی واپس آ گیا۔ ''وہ آٹھ اونٹوں پر سوار آٹھ منش تھے ان داتا''۔ اس نے کہا۔

''چار نے حملہ کیا اور چار تماشا دیکھتے رہے''۔ ٹھاکر نے پرخیال لہجے میں کہا۔ ''انہیں دشواس ہوگا کہ دو لڑکوں کے لئے چار آدمی کافی ہیں۔ مگر جب انہوں نے چار ساتھیوں کو گرتے دیکھا تو حملہ کیوں نہیں کیا''۔ اس کے لہجے میں الجھن تھی۔

''ڈاکوؤں کے دل بہت چھوٹے ہوتے ہیں ٹھاکر ویر''۔ کیدارناتھ نے جلدی سے کہا۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ ڈاکو تھے؟''۔ ٹھاکر نے تیکھے لہجے میں کہا۔

کیدارناتھ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اودتار سنگھ بول اٹھا۔ ''ان کے چہروں پر ڈھاٹے تھے پتا جی''۔

''دیکھا ٹھاکر ویر، میں نے کہا تھا نا''۔

''میں نہیں مانتا کیدارناتھ کہ وہ ڈاکو تھے''۔

''لیکن کیوں ٹھاکر ویر؟''۔

''پچھلے دنوں ادھر ادھر کے گاؤں دیہاتوں میں ایسا کچھ نہیں سنا گیا۔ ورنہ آٹھ ڈاکو آ جائیں تو شور مچ جاتا ہے علاقے میں۔ پھر وہ ڈاکو ہوتے تو میرے چھوٹے اور وصال دین پر حملہ کیوں کرتے۔ ڈاکو تو مال دیکھ کر حملہ کرتے ہیں''۔ ٹھاکر نے دلیل دی۔

''تو ٹھاکر ویر، تمہارے خیال میں وہ کون تھے؟''۔

''وہ جو کوئی بھی تھے، میرے پتر کی جان لینا چاہتے تھے''۔ ٹھاکر نے کہا۔ ''صرف جان! مال سے انہیں کوئی غرض نہیں تھی''۔

''اگر وہ ڈاکو نہیں تھے تو انہوں نے ڈھاٹے کیوں باندھ رکھے تھے''۔ کیدارناتھ نے اعتراض کیا۔

''خود کو چھپانے کیلئے۔ اور اسی لئے انہوں نے چار آدمی گرنے کے بعد مزید کوشش نہیں کی۔ بلکہ ان چاروں کو اٹھا کر لے جانا زیادہ ضروری سمجھا۔ وہ جو بھی تھے، شناخت سے بچنا چاہتے تھے''۔

''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے ٹھاکر ویر''۔ کیدارناتھ نے لہجے میں بے بسی سموتے ہوئے کہا۔

''مگر میری سمجھ میں بہت کچھ آ رہا ہے''۔ ٹھاکر بولا۔ ''خیر، اب اس پر حویلی میں بات ہوگی''۔

کیدارناتھ کے من میں کھد بد ہو رہی تھی۔ وہ ٹھاکر کے ساتھ حویلی چلا آیا۔

وہ لوگ کچھ دیر ڈیوڑھی میں بیٹھے۔ ٹھاکر اپنے بیٹے کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ''پتر اودتار سنگھ''۔ بالآخر اس نے کہا۔ اس کا لہجہ بھی محبت سے چھلک رہا تھا۔ ''مجھے تم پر فخر ہے پتر، تم نے ثابت کر دیا کہ تم ٹھاکر ہو..... اصل ٹھاکر''۔

اودتار سنگھ نے کچھ نہیں کہا۔ بس باپ کو دیکھتا رہا۔ اسے ڈر تھا کہ اب اس پر پابندیاں لگیں گی۔ وہ جانتا تھا کہ پتا جی اس سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اب وہ اسے اسکول نہ بھیجیں۔

''دیکھو پتر، جیون اوپر والے نے جتنا دیا ہے، منش اتنا ہی جیتا ہے۔ نہ ایک پل کم نہ ایک پل زیادہ''۔ ٹھاکر نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''راج پوت موت سے نہیں ڈرتے۔ ہاں جنگ وہ جان لینے کے لئے لڑتے ہیں، جان دینے کے لئے نہیں۔ پر جانتے ہیں کہ اس کھیل میں جان جا بھی سکتی ہے۔ سو وہ بہادروں کی طرح جیتے اور بہادروں کی طرح مرتے ہیں''۔

اودتار سنگھ اب بھی چپ تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھنے والا ہے۔

''میں تم سے یہی کہوں گا پتر کہ جو ہوا، اسے بھول جاؤ۔ پر ہر بات کے لئے ہر وقت تیار رہو۔ جیسے چاہو جیو، جو چاہو کرو، جہاں چاہو جاؤ۔ بس یہ یاد رکھو کہ تم راج پوت ہو اور راج پوت دشمن پر دیا کبھی نہیں کرتے''۔

''جی پتا جی''۔

ٹھاکر نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ ''کیا بات ہے؟ کچھ بے کل ہو پتر؟''۔

''جی پتا جی، وہ پڑھنے کے لئے جانا ہے''۔

ٹھاکر بے ساختہ مسکرایا۔ پھر ہنسنے لگا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ خوامخواہ بیٹے کو پڑھا رہا ہے۔ جب کہ بیٹا اس سے بھی بڑھ کر پکا ہے۔ ابھی ان پر جان لیوا حملہ ہوا تھا اور وہ..... وہ پڑھائی کی فکر میں بے حال ہو رہا تھا۔ ''تو تم جاؤ..... پڑھو۔ شاباش پتر''۔ اس نے کہا۔

اودتار سنگھ چلا گیا۔

www.allurdu.com

کیدارناتھ کی بے چینی کی کوئی حد نہیں تھی۔اوتار سنگھ کے جاتے ہی اس نے ٹھاکر سے کہا۔''ٹھاکر ویر، تمہارے خیال میں چھوٹے ٹھاکر کے جیون کو کوئی خطرہ ہے؟''۔

''جیون کے ساتھ مرن کا دھڑکا تو لگا ہی رہتا ہے کیدارناتھ۔جیون کا انت تو مرن ہی ہے نا۔ پل میں ہو یا برسوں میں''۔ٹھاکر نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔''پر مجھے خوشی ہے کہ میرا پتر جانتا ہے..... جانتا ہے کہ ٹھاکر موت سے نہیں ڈرتے''۔

''پر ٹھاکر ویر، دھڑکا ہے تو اس کا اپائے تو سوچنا ہوگا''۔کیدارناتھ نے کہا۔''اور دشمنی ہے تو اس کا کارن بھی ہوگا''۔

''ہوگا.....اوش ہوگا''۔ٹھاکر نے بے پروائی سے کہا۔

کیدارناتھ کو اس کی بے پروائی بہت عجیب اور غیر فطری لگی۔''میں دیکھتا ہوں ٹھاکر ویر کہ تم کچھ بے پروائی کر رہے ہو۔چھوٹا ٹھاکر تمہارا ایک ہی پتر ہے.....تمہاری نسل چلانے والا۔اگر اسے خطرہ ہے تو تمہیں اس کی حفاظت کی فکر کرنی ہوگی۔ پر تم تو اسے اور آزادی دے رہے ہو۔جیسے چاہو جیو، جو چاہو کرو، جہاں چاہو جاؤ۔یہ کیا بات ہوئی؟''۔

ٹھاکر مسکرایا۔''مجھے اس کی کوئی چنتا نہیں''۔

''پر کیوں؟''۔

''یوں کہ اسے کچھ نہیں ہوگا۔کچھ نہیں ہوگا میرے پتر کو۔وہ لمبا جیون جئے گا''۔

ٹھاکر کے لہجے کے یقین نے کیدارناتھ کو ہلا کر رکھ دیا۔''اس کا اتنا وشواس کیوں ہے تمہیں؟''۔

''تم نہیں جانتے کیدارناتھ کہ وہ مجھے کیسے ملا ہے''۔ٹھاکر نے کہا۔''مجھے بتا دیا گیا تھا کہ کوئی اس کا بال بانکا نہیں کر سکے گا''۔

''پھر بھی ٹھاکر ویر.....''۔

''چھوڑو اس بات کو کیدارناتھ۔ یہاں ایک تم ہی تو ہو، جس سے من کی بات کر سکتا ہوں۔جب تک اوتار سنگھ پیدا نہیں ہوا تھا، میں سوچتا تھا کہ ساری زمین اپنے کارندوں میں بانٹ دوں گا۔لیکن جب وہ پیدا ہوا تو مجھے جیون اچھا لگنے لگا''۔ٹھاکر کہتے کہتے رکا۔چند لمحے وہ کیدارناتھ کو غور سے دیکھتا رہا۔''میں اپنی وصیت تیار کر چکا ہوں۔اگر میرے پتر کو کچھ ہو گیا تو میرا سب کچھ سرکار کے پاس چلا جائے گا۔اوتار سنگھ کو کچھ نہ ملا تو کسی کو بھی کچھ نہیں ملے گا۔اور بھگوان نے اسے جیون دیا تو میں نے اپنی وصیت میں سب کا خیال رکھا ہے۔کوئی محروم نہیں رہے گا''۔

کیدارناتھ کو لگا کہ ٹھاکر جان بوجھ کر اسے یہ سنا رہا ہے..... جتا رہا ہے..... سمجھا رہا ہے کہ اوتار سنگھ کے جینے میں ہی اس کا فائدہ ہے۔اوتار سنگھ کو راستے سے ہٹا کر اسے کچھ نہیں ملے گا۔

''ایسی باتیں نہ سوچو ٹھاکر ویر''۔کیدارناتھ نے بجھے دل سے کہا۔من میں وہ سوچ رہا تھا کہ اب اسے جے پور جا کر جسونت سے بات کرنی پڑے گی۔

.....x.....

مولوی برکت علی اس کے لئے تیار بیٹھے تھے۔انہوں نے کہا۔''اوتار سنگھ، استاد ہونے کے ناتے ایک بات کا مجھے شروع ہی میں خیال رکھنا چاہئے تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہیں پڑھانے کی فکر میں اسے میں بھول ہی گیا''۔

''میں سمجھا نہیں مولوی صاحب''۔

''بھئی اسکول میں تمہیں ہوم ورک بھی تو ملا ہوگا نا''۔

''جی ہاں۔ملا ہے''۔

''اور میں نے اس کی فکر ہی نہیں کی۔بس اپنا مضمون پڑھانے میں لگا رہا۔بڑی غیر ذمے داری ہوئی مجھ سے۔مگر خیر۔ابھی کچھ دن کی چھٹیاں باقی ہیں۔اس کی تلافی اب کرنی ہوگی''۔

''آپ کیا کہہ رہے ہیں مولوی صاحب؟''۔اوتار سنگھ کے لہجے میں حیرت تھی۔

''اب پہلے تم اپنا ہوم ورک مکمل کرو گے''۔

''وہ تو میں پہلے ہی مکمل کر چکا ہوں''۔

مولوی صاحب کو ایسا شاک لگا کہ وہ گنگ ہو کر رہ گئے۔ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔بڑی کوشش کے بعد انہوں نے خود کو سنبھالا۔''کک.....کیا.....کیا مطلب! تم ہوم ورک پہلے ہی کر چکے ہو؟''

''جی.....جی ہاں''۔

''ہر مضمون کا.....تمام مضامین کا''۔

''جی مولوی صاحب، تمام مضامین کا۔لا کر دکھاؤں آپ کو''۔

''ہاں.....دکھاؤ تو''۔

''ابھی لاتا ہوں''۔اوتار سنگھ نے کہا اور کمرے سے چلا گیا۔

مولوی صاحب نے پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ہوم ورک دیکھنے میں انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔انہیں یقین تھا کہ اوتار سنگھ نے کہا ہے کہ تو ٹھیک ہی کہا ہوگا۔بس اس بہانے انہیں کچھ مہلت مل گئی۔اب تو وہ یہ سوچ رہے تھے کہ کہیں یہ لڑکا جن تو نہیں۔

کچھ دیر بعد اوتار سنگھ ہوم ورک کی کاپیاں لے آیا اور ہوم ورک چیک کرانے لگا۔مولوی صاحب بے دلی سے دیکھتے رہے۔پھر بولے۔''ٹھیک ہے، شکر ہے کہ میں شرمندگی سے بچ گیا''۔

''چلیں.....پڑھائی شروع کریں''۔اوتار سنگھ نے خوش ہو کر کہا

اب مولوی صاحب اور کیا کر سکتے تھے۔وہ اسے پڑھانے لگے

اس رات مولوی صاحب پھر الجھے ہوئے تھے۔ان کے سامنے وہی مسئلہ تھا۔اب اوتار سنگھ جب عربی میں کچھ پڑھنا چاہے گا تو وہ کیا کریں گے؟اس سوال کا تو کوئی جواب انہیں نہیں سوجھ رہا تھا۔البتہ یہ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنے پڑھائے ہوئے کو بار بار ری وائز کراتے رہیں گے۔اوتار سنگھ ایسا شاگرد تو ہے نہیں کہ کوئی اعتراض کرے۔اس سے یہ ہوگا کہ اس کی بنیاد اور مضبوط ہو جائے گی۔

لیکن اصل مسئلے کا حل ابھی تلاش کرنا تھا۔ری وائز کرانا اس مسئلے کا حل نہیں تھا۔سوچتے سوچتے بالآخر ایک بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔ان کے سامنے ایک ہی راستا تھا.....یہ کہ وہ اردو کی کہانیاں اور داستانیں خود عربی میں منتقل کریں۔

یہ سوچنے کے بعد وہ مطمئن ہو گئے۔مگر ساتھ ہی انہیں احساس ہوا کہ ان کا یہ شاگرد ان کے لئے کتنا فائدہ مند ثابت ہو رہا ہے۔اس کی وجہ سے وہ اپنی صلاحیتوں سے متعارف ہو رہے تھے۔ورنہ شاید انہیں کبھی اردو سے عربی میں ترجمہ کرنے کا خیال نہ آتا۔

اس رات وہ سوئے تو بے حد مطمئن تھے!

.....x.....

چھٹیاں اب ختم ہو رہی تھیں۔اسکول کھلنے سے تین چار دن پہلے وہ دہلی کے لئے روانہ ہو جاتے تھے۔تاکہ وہاں رہنے کھانے کا بندوبست کر لیا جائے۔چنانچہ وہ گڑھی میں ان کی آخری رات تھی۔

اوتار سنگھ معمول کے مطابق پتاجی کے پاؤں دبا رہا تھا۔لیکن ٹھاکر پرتاپ سنگھ بہت بے چین تھا۔بار بار کروٹیں بدل رہا تھا۔

''کیا بات ہے پتاجی؟ طبیعت تو ٹھیک ہے آپ کی؟''۔اوتار سنگھ نے پوچھا

www.allurdu.com

''اب طبیعت کا کیا پوچھتے ہو پتر۔اب سال بھر ایسے ہی رہنا ہے''۔

''ایسی باتیں نہ کریں پتا جی''۔

''چھوڑو پتر۔تم بس مجھ سے لپٹ کر لیٹ جاؤ''۔

اوتار سنگھ ٹھاکر سے لپٹ گیا۔اسے احساس ہو رہا تھا کہ اب پتا جی کو اس نئے معمول کی.....اس سے لپٹ کر سونے کی عادت ہو گئی ہے۔یہ سال تو انہیں بہت ہی بھاری لگے گا۔اسے یاد آیا کہ جب پہلی بار وہ ان سے لپٹ کر سویا تھا تو انہوں نے کہا تھا کہ مدت سے وہ نیند کو ترسے ہوئے ہیں۔تو کیا اب وہ پھر رات رات بھر جاگا کریں گے۔

اس خیال سے وہ تڑپ کر رہ گیا۔اب وہ کیا کرے؟ کیا علاج ہے اس کا؟

''کیا یہ نہیں ہو سکتا پتر کہ تم دو دن اور رک جاؤ''۔ٹھاکر کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

''ٹھیک ہے پتا جی۔جو آپ کی اچھا''۔اوتار سنگھ نے بلا جھجک کیا۔''اس بار تو میرا بالکل دل نہیں چاہتا ہے جانے کو''۔

ٹھاکر کو اس پر شدت سے پیار آیا۔اس نے اسے بھینچ لیا۔''تم بہت اچھے ہو پتر۔میں تو بچوں کی سی بات کر بیٹھا اس سے۔ارے جانا ہے تو جانا ہے۔دو دن سے کیا فرق پڑے گا۔سال تو اکیلے ہی بتانا ہے نا''۔

اوتار سنگھ کا دل کٹنے لگا۔''پتا جی.....ایسا ہے کہ میں اسکول نہیں جاتا''۔اوتار سنگھ نے بے حد خلوص سے کہا۔ کہنے کو تو وہ باپ کی محبت میں یہ بات کہہ گیا۔لیکن فوراً ہی اس کی نگاہوں سے وہ کوٹھا پھر گیا۔سماعت میں وہ آواز گونجنے لگی.....

لیکن وہ آزمائش بس ایک لمحے کی تھی۔ٹھاکر نے کہا۔''ایسی بات نہ کرو پتر۔تمہاری تعلیم میرا شوق ہے۔اسکول تو تمہیں جانا ہے''۔

اوتار سنگھ اب شرمندہ تھا۔اسکول جائے بغیر تو وہ خود بھی نہیں رہتا۔یہ خیال اسے شرمندہ کر رہا تھا کہ اس آواز والی کی محبت باپ کی محبت کے منہ لگ رہی ہے۔

''تو پتا جی،آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔وہیں رہیں''۔اس نے کہا۔

''نہیں پتر.....یہ کہاں ممکن ہے،جیون کی بندشوں سے کہاں چھوٹتا ہے منش۔چھوڑو اس بات کو''۔

مگر بات چھوڑ دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔آنکھیں بند کر لینے سے مسائل ختم نہیں ہو جاتے۔یہ وہ رات تھی کہ وہ دونوں ہی نہیں سو سکتے تھے۔یہ ان کے لئے جاگنے کی رات تھی۔دونوں کو معلوم تھا کہ وہ جاگ رہے ہیں۔لیکن وہ سونے کی اداکاری کرتے رہے۔

وقت گزرتا ہی جاتا ہے۔وہ رات بھی گزر گئی۔صبح روانگی تھی۔وہ دو راج پوتوں کے لئے سخت آزمائش کا وقت تھا۔بہر حال وہ وقت بھی گزر ہی گیا۔

.....x.....

دہلی میں سب کچھ پہلے جیسا ہی تھا۔بس ایک تبدیلی رونما ہوئی تھی۔سرفراز بیگم کو ایک دن بیٹھے بٹھائے خیال آیا کہ انہوں نے بچیوں کو قرآن کی تعلیم تو دلا دی تھی۔لیکن ان کی دینی تعلیم ابھی نامکمل ہے۔حدیث شریف اور سیرت مبارکہ کے علم کے بغیر تو وہ مکمل نہیں ہو سکتی۔

محلے میں ایک خاتون تھیں.....مہر النسا۔سنا تھا کہ وہ ان علوم میں طاق ہیں۔سرفراز بیگم نے ان سے رابطہ کیا۔وہ اپنے گھر میں ہی بچیوں کو تعلیم دیتی تھیں۔لیکن سرفراز بیگم نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی بچیاں گھر سے باہر قدم رکھیں۔

''آپ گھر پر آنے کی زحمت نہیں کر سکتیں؟''۔سرفراز بیگم نے مہر النسا سے کہا۔

مہر النسا کچھ ہچکچائیں۔وہ جانتی تھیں کہ یہاں اس زحمت کی انہیں معقول فیس بھی ملے گی۔''آپ انہیں میرے گھر ہی بھجوا دیں نا۔اجتماعی تعلیم زیادہ موثر اور دل نشیں ہوتی ہے''۔انہوں نے کہا۔

''آپ میری بچیوں کے لئے وقت نکال لیں نا''۔سرفراز بیگم نے اصرار کیا۔

مہر النسا سوچ میں پڑ گئیں۔''ان بہت ساری بچیوں کو میں نہیں چھوڑ سکتی جو میرے گھر پڑھنے کے لئے آتی ہیں''۔انہوں نے کہا۔

''یہ تو میں چاہتی بھی نہیں۔آپ الگ سے کوئی وقت دے دیں''

کچھ سوچ بچار کے بعد مہر النسا نے کہا۔''تو ٹھیک ہے میں عصر اور مغرب کے درمیان انہیں پڑھا دیا کروں گی''۔

تینوں لڑکیاں اس نئی مصروفیت سے بہت خوش تھیں۔ان کی روز و شب کی یکسانیت میں یہ معمول انہیں بہت خوش گوار لگا تھا۔

دوسری طرح حور بانو اوپر والوں کی آمد کا ایک ایک دن گن رہی تھی۔اسکول کھلنے میں ایک ہفتہ رہ گیا تو اس نے ان کا انتظار شروع کر دیا۔لیکن اس انتظار میں نہ کوفت تھی نہ اداسی۔کیوں کہ یہ یقینی انتظار تھا۔اسکول کھلنے سے پہلے انہیں بہر حال آنا تھا۔سو اب حور بانو کے لئے ہر لمحہ ان کے انتظار کا تھا۔وہ آپ ہی آپ مسکراتی رہتی۔بار بار چلمن کی طرف جاتی۔چند لمحے وہاں کھڑی رہتی اور پھر لوٹ آتی۔وہ بہت کم گو لیکن بے حد خوش مزاج ہو گئی تھی۔

چار دن اس انتظار میں گزر گئے اور وہ نہیں آئے۔لیکن حور بانو خوش تھی۔آج نہیں تو کل.....وہ آ ہی جائیں گے۔

اور پانچویں دن وہ آ گئے۔

www.allurdu.com

ان کی آمد سے چند لمحے پہلے حور بانو کا دل عجیب سے انداز میں دھڑکا اور اس کے قدم خود بہ خود چلمن کی جانب اٹھے۔ وہ وہاں جا کر کھڑی ہوئی ہی تھی کہ ایک بگھی اور تانگا سامنے آ کر رکا۔

تب حور بانو نے دو ماہ کے بعد پہلی بار چھوٹے ٹھاکر کو دیکھا۔ ان دو مہینوں میں وہ پہلے سے اونچا ہو گیا تھا۔ یا شاید یہ اس کا گمان تھا!

.....x.....

اودتار سنگھ کے دہلی جانے کے بعد وہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی پہلی رات تھی!

دن تو جیسے تیسے ادھر ادھر کی مصروفیت میں گزر گیا۔ مگر اب رات..... پہاڑ جیسی رات منہ پھاڑے کھڑی تھی۔ یہ رات جس سے وہ بہت پہلے سے خوف زدہ تھا۔ سوچتا رہتا تھا کہ یہ رات آئے گی تو وہ کیا کرے گا..... کیا گزرے گی اس پر۔ اور اب یہ رات آ گئی تھی۔

سارے معاملات نمٹانے کے بعد وہ مجبوراً اپنے کمرے میں چلا آیا۔

اپنا سیف کھول کر اس نے وہ کتابیں نکالیں جو وہ چھپا کر رکھتا تھا۔ اس مطالعے میں اس کا خوب دل لگتا تھا۔ لیکن اس روز معاملہ مختلف تھا۔ وہ کتاب کھول کر پڑھ رہا تھا۔ لیکن درحقیقت وہ کچھ بھی نہیں پڑھ رہا تھا۔ اسے ایک لفظ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اس نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔ پھر وہ گہری سانس لے کر کچھ دیر سوچتا رہا۔ یہ تو پہلی رات ہے۔ اس نے سوچا۔ اور ایک سال میں 365 راتیں ہوتی ہیں۔ کیا بنے گا میرا؟

اس کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ بہت ناخوش تھا۔ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل بھی نہیں تھا وہ۔ حد یہ ہے کہ اس نے اودتار سنگھ کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی۔ مگر اس سے اس کے بارے میں بھی نہیں سوچا گیا۔

اس نے اپنی ڈائری نکالی اور بڑی بے دلی سے قلم اٹھایا۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ لکھنے میں محو ہو گیا۔

اس ڈائری لکھنے کے شغل کی کہانی بھی بڑی عجیب تھی۔ راج پوت ویسے بھی تلوار کے دھنی ہوتے ہیں، قلم کے نہیں۔ پھر زمین داری کا بکھیرا الگ۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ڈائری لکھے گا۔

زمانہ تعلیم میں اس کا روم میٹ امان ڈائری لکھا کرتا تھا۔ ٹھاکر اسے ڈائری لکھتے دیکھ کر ہمیشہ الجھتا تھا۔ ''یہ تم کیا لکھتے رہتے ہو ڈائری میں؟''۔ اس نے امان سے پوچھا۔

''بس یونہی''۔ امان نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

''اچھا مجھے دکھاؤ''۔

''کیا کرو گے دیکھ کر؟''۔

''دیکھوں گا کہ تم اس میں کیا لکھتے ہو''۔

''یہ ڈائری ہے پرتاپ سنگھ۔ اور ڈائری بڑی ذاتی چیز ہوتی ہے۔ سوری..... یہ میں تمہیں نہیں دکھا سکتا''۔

''کیوں بھئی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ میں بس یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم اس میں کیا لکھتے ہو''۔

''یہ تو میں تمہیں سمجھا رہا ہوں''۔ امان نے کہا۔ اس کی مسکراہٹ میں معذرت تھی۔ ''ڈائری میں آدمی وہ باتیں لکھتا ہے جو وہ کسی سے نہیں کر سکتا..... کسی سے بھی نہیں۔ تو جو باتیں وہ کسی سے کر نہیں سکتا، وہ کسی کو پڑھوا بھی نہیں سکتا۔ اس لئے ڈائری بڑی ذاتی چیز ہوتی ہے''۔

ٹھاکر کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا۔ ''میں تو نہیں سمجھ پایا تمہاری بات''۔

''بھئی سیدھی سی بات ہے۔ ڈائری خود کلامی ہے..... ایک طرح سے خود سے گفتگو''۔

''تو کان گھما کر کیوں پکڑتے ہو؟ خود سے باتیں کر لیا کرو''۔

امان ہنسنے لگا۔ ''یہ بتاؤ، تم مجھے خود سے باتیں کرتے دیکھو گے تو کیا سمجھو گے''۔

ٹھاکر نے چند لمحے غور کیا۔ پھر بولا۔ ''پاگل ہی سمجھ سکتا ہوں''۔

''بس اس لئے میں خود سے باتیں نہیں کر سکتا۔ وہ باتیں ڈائری میں لکھ لیتا ہوں''۔

''میری سمجھ میں ایک بات اور نہیں آتی''۔ ٹھاکر نے کہا۔ ''ایسی کون سی باتیں ہو سکتی ہیں، جو منش کسی سے نہیں کر سکتا''۔

اس بار امان کو حیرت ہوئی۔ ''کمال کرتے ہو۔ ارے آدمی سوچنے والا جانور ہے۔ دماغ ہر وقت کام کرتا رہتا ہے۔ اس میں کیسے کیسے خیال آتے ہیں۔ اگر وہ کسی سے کہے تو وہ اسے برا..... بہت برا سمجھنے لگے۔ آدمی تمام باتیں کسی سے نہیں کر سکتا''۔

''اپنے سب سے اچھے دوست سے بھی نہیں؟''۔

امان نے نفی میں سر ہلایا۔

www.allurdu.com

''میں تمہارا بہت اچھا دوست ہوں۔ اور تم جانتے ہو کہ راز رکھنا بھی جانتا ہوں۔ تم مجھے کوئی ایسی بات بتاؤ گے تو مجھ سے آگے کبھی نہیں جائے گی''۔

''میں جانتا ہوں یہ بات''۔ امان نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''مگر بھائی، بہت سی باتیں میں تم سے بھی نہیں کر سکتا''۔

''بھروسا نہیں ہے مجھ پر''۔ ٹھاکر کے لہجے میں خفگی تھی۔

''یہ بات نہیں۔ بھروسا ہے۔ لیکن بہت سی باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو آدمی خود سے بھی کرے تو شرمندہ ہو جاتا ہے۔ میں وہ باتیں خود سے نہیں کر سکتا۔ تم سے کروں گا تو پھر کبھی تم سے نظر بھی نہیں ملا سکوں گا۔ تمہارا سامنا کرنے سے گھبرانے لگوں گا۔ شاید تمہیں چھوڑ ہی بیٹھوں''۔

''تب تو مجھے بتانے کی ضرورت بھی نہیں''۔ ٹھاکر نے جلدی سے کہا۔ ''میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا''۔

''چلو بات تمہاری سمجھ میں تو آئی''۔ امان بولا۔ ''اب یہ بتاؤ کہ ایسا تمہارے ساتھ بھی ہوتا ہوگا۔ تو تم کیا کرتے ہو؟''۔

''مجھے کبھی اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ ہم ٹھاکر لوگ تو ہر بات صاف کرنے کے قائل ہیں۔ میرے دل میں جو بھی آتی ہے، میں کسی سے بھی کہہ دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ مجھے کسی سے ڈر نہیں لگتا''۔

امان نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ ''اتنا مت اکڑو۔ ابھی تم اس سے محفوظ ہو۔ لیکن یہ وقت ہر انسان پر آتا ہے''۔

''مجھ پر نہیں آئے گا''۔ ٹھاکر نے بڑے یقین سے کہا۔

اس کے بعد بھی برسوں گزرے۔ ٹھاکر کا یقین سلامت رہا۔ اس کی زندگی میں کبھی کوئی پوشیدہ..... خفیہ موڑ نہیں آیا۔ دوسرے وہ صاحب اقتدار تھا۔ کسی سے کچھ بھی کہہ سکتا تھا۔ مگر اوتار سنگھ کی پیدائش سے پہلے ایسا ایک سلسلہ شروع ہوا کہ وہ اس پر بات کرنا بھی چاہتا تھا اور کسی سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

پھر جب ٹھاکرانی کا دیہانت ہوا اور اوتار سنگھ تعلیم کے سلسلے میں دہلی چلا گیا تو وہ اکیلا رہ گیا۔ وہ ایسی تنہائی تھی، جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ زندگی جیسے رینگ رینگ کر چلنے لگی۔ اور وہ رینگنا بھی برائے نام تھا۔ وقت گزرتا ہی نہیں تھا۔ صبح سے شام کا انتظار رہتا۔ شام رات کے خوف میں گزرتی اور رات صبح کی آرزو میں کٹتی۔ چند ہی دنوں میں وہ اندر سے بیمار ہو گیا۔

گاؤں میں جمال دین کے علاوہ کوئی ایسا نہیں تھا، جس سے وہ قربت محسوس کرتا ہو۔ شام کے بعد جمال دین کا اس کے پاس آنا اور وقت گزارنا معمول بن گیا۔

اوتار سنگھ کی پیدائش سے پہلے کا ایک ہی خواب جو اس نے اور رنجیتا نے ایک ہی رات دیکھا تھا، درخت کا سوکھنا، مجذوب کی آمد اور اس کی باتیں اوتار سنگھ کا اس کے کمرے میں پہنچنا، پھر اوتار سنگھ جس خاص حال میں پیدا ہوا تھا، جس کی وجہ سے دائی راجو اور شانتا کی شامت آ گئی تھی، پھر اوتار سنگھ کا دودھ سے انکار اور حمیدہ کا دودھ پینا..... یہ سب ایسے معاملات تھے، جنہیں وہ برسوں سے سینے میں چھپائے بیٹھا تھا..... وہ ان پر کسی سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں بے شمار سوالات تھے۔ وہ بہت کچھ واضح طور پر جاننا..... سمجھنا چاہتا تھا۔

ایک اعتبار سے جمال دین اس کا ہم راز تھا۔ ان میں سے کم از کم ایک معاملے سے واقف تھا۔ پھر اپنی فطرت، اپنی عادات اور اپنے کردار سے اس نے ٹھاکر کا دل جیت لیا تھا۔ ٹھاکر تو اسے اپنا دوست ہی سمجھتا تھا۔ لیکن وہ خود اسے زمین دار کا اور خود کو رعیت کا درجہ دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے درمیان کبھی بے تکلفی کی فضا پیدا نہیں ہو سکی۔

ٹھاکر نے کئی بار جمال دین سے اس موضوع پر بات کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن ہمت نہ ہوئی۔ اسے امان کی بات یاد آئی اور تسلیم کرنا پڑا کہ وہ ٹھیک کہتا تھا۔ کچھ باتیں آدمی کسی سے نہیں کر سکتا..... خود سے بھی نہیں۔

یوں پہلی بار اس نے ڈائری لکھنی شروع کی۔

گاؤں میں رات جلدی ہو جاتی ہے۔ ٹھاکر کے حساب سے جمال دین جلدی گھر چلا جاتا تھا۔ وجہ یہ بھی تھی کہ ٹھاکر کو نیند آتی ہی نہیں تھی۔ یہ کمی اسے مطالعے کی طرف لے گئی۔ اور مطالعے نے ڈائری کی اہمیت اور بڑھا دی۔ اب تو تقریباً سبھی کچھ ایسا تھا، جس پر وہ کسی سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ ڈائری لکھنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

ڈائری لکھنے کی افادیت تو وہ پہلے ہی سمجھ چکا تھا۔ ڈائری لکھنے کے بعد وہ ہلکا پھلکا نہیں رہتا، ہلکا پھلکا ہو جاتا تھا۔

www.allurdu.com

مگر آج اس پر ڈائری لکھنے کا ایک اور فائدہ کھلا۔ جس وقت وہ کمرے میں آ کر بیٹھا تھا تو سب سے پہلے اس نے مطالعے کی کوشش کی تھی۔ مگر وہ ارتکاز سے محروم تھا۔ پڑھنے کے باوجود اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ دل لگ ہی نہیں رہا تھا۔ لیکن اب ڈائری لکھنے کے بعد وہ ہلکا ہوا تو اس نے کتاب اٹھائی اور سرسری طور پر اسے دیکھا۔ فوراً ہی اس کا دل کتاب میں لگ گیا۔ وہ مطالعے میں محو ہو گیا۔

جو کتابیں وہ پڑھتا تھا۔ اپنے نفس مضمون کے اعتبار سے بہت بھاری تھیں۔ شوق ہونے کے باوجود وہ ایک دو سے زیادہ مطالعہ نہیں کر سکتا تھا اس حد سے بڑھ کر مطالعہ کرتا تو سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ لگتا خالی لفظوں سے سر ٹکرا رہا ہے۔ ایسے میں وہ سمجھ جاتا کہ اب مطالعہ چھوڑنے کا وقت آ گیا ہے۔ اب اسے مطالعے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکے گا۔

اس وقت بھی یہی ہوا اور اس نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی۔

اس نے گہری سانس لے کر گھڑی میں وقت دیکھا۔ ابھی رات سے زیادہ باقی تھی اور اس کے پاس کرنے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ وہی پرانا والا مسئلہ اس کے سامنے منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ اوتار سنگھ کے جانے کے بعد اسے نیند کم ہی آتی تھی۔

وہ کمرے میں بے چینی سے ادھر سے ادھر ٹہلتا رہا۔ یہاں تک کہ اسے تھکن کا احساس ہونے لگا۔ دماغی طور پر تو وہ پہلے ہی تھک چکا تھا۔ ڈائری لکھنے اور مطالعے کے بعد دماغی تھکن تو ہونا ہی تھی۔ اور اب جسم بھی تھک گیا تھا۔

تھکن کا تقاضا تھا کہ وہ لیٹ جائے۔ سو وہ لیٹ گیا۔ اس کے بعد وہی کروٹیں بدلنے کا پرانا معمول۔ کچھ دیر وہ کروٹیں بدلتا رہا۔ اس وقت اوتار سنگھ اسے شدت سے یاد آ رہا تھا۔ کیسے وہ اس سے لپٹ کر لیٹتا تھا۔ اس نے ہاتھ پھیلائے..... اور جیسے اس کے ہاتھ نے اوتار سنگھ کو چھو لیا۔

اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ اوتار سنگھ کا تکیہ تھا۔ مگر اس میں حرارت تھی۔ اوتار سنگھ کے جسم کا لمس تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کا ہاتھ تکیے پر نہیں، اوتار سنگھ کے دھڑکتے ہوئے سینے پر رکھا ہے۔

اس کا دل طمانیت سے بھر گیا۔ اس نے تکیے کو اپنی طرف کھینچا اور یوں سینے سے لگا لیا، جیسے وہ اوتار سنگھ ہے۔

اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ سکون اس کے لئے ناقابل یقین تھا۔ اوتار سنگھ جاتے جاتے مجھے یہ تحفہ دے گیا ہے۔ اس نے سوچا۔ شاید اب اس کی جدائی کا سمے اتنا سخت نہیں گزرے گا۔

اس کا خیال درست تھا۔ کچھ دیر وہ اس تکیے کو لپٹا کے لیٹا رہا۔ پھر کب اسے نیند آئی، یہ اسے پتا ہی نہ چلا۔ اور وہ بہت گہری نیند تھی!

.....x.....

مولوی صاحب گھر ان سب کے ساتھ آئے تھے۔ وہ کچھ دیر بیٹھے بھی۔ پھر انہوں نے کہا۔ ''اوتار سنگھ، اب میں چلتا ہوں''۔

''کہاں مولوی صاحب؟ کہاں جائیں گے آپ؟''۔ اوتار سنگھ نے حیرت سے کہا۔

مولوی صاحب کو اس کی حیرت پر حیرت ہوئی۔ ''ارے بھئی، اپنے گھر۔ اور کہاں جاؤں گا''۔ انہوں نے کہا۔

''گھر؟''۔ اوتار سنگھ نے حیرت سے دہرایا۔

''ہاں بھئی گھر، جہاں میں رہتا ہوں، میرے بچے رہتے ہیں''۔

اوتار سنگھ کو شاک لگا۔ اتنے دن مولوی صاحب اس کے ساتھ رہے تھے کہ وہ یہ سب بھول ہی گیا تھا۔ وہ بھول گیا تھا کہ مولوی صاحب دہلی میں رہتے ہیں۔ ان کا گھر ہے۔ بیوی بچے ہیں۔ اور وہ اسی اسکول میں پڑھاتے بھی ہیں، جہاں وہ تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اب وہ اپنے گھر تو جائیں گے ہی۔ اور وہیں رہیں گے۔ وہ اداس ہو گیا۔ تو اب وہ ان کی خدمت سے ان کے پاؤں دبانے سے محروم ہو جائے گا!

''کچھ دیر اور رکیں نا مولوی صاحب''۔ اس نے کہا۔

مولوی صاحب نے جواب نہیں دیا۔ بس بیٹھ گئے۔ لیکن اضطراب ان کے صرف چہرے پر نہیں تھا۔ ان کا جسم تک مرتعش تھا۔ اوتار سنگھ نے انہیں غور سے دیکھا۔ اس بار بات ایک لمحے میں اس کی سمجھ میں آ گئی۔ گھر کو اور بیوی بچوں کو ترسے ہوئے مولوی صاحب کے لئے اس وقت ایک پل یہاں رکنا بھی دوبھر تھا۔ ان کا بس چلتا تو اڑ کر گھر پہنچ جاتے۔

www.allurdu.com

اس کو احساس ہوا کہ اس وقت اس نے ان پر بڑا ظلم کیا تھا۔

''مجھے معاف کر دیجئے مولوی صاحب۔آپ جائیے.....گھر جائیے آپ''۔اس نے کہا۔

''چلا جاؤں گا۔اب تین دن بعد اسکول کھل رہے ہیں۔اس کے بعد یہ دیکھنا ہوگا کو میں تمہیں کب وقت دے سکوں گا''۔

''جی.....جی ہاں''۔

''تو اب یہ سمجھ لو کہ ایک ہفتے کی چھٹی۔اس کے بعد پڑھائی کا وقت طے کریں گے''۔

ایک ہفتے کیلئے عربی پڑھنے کی چھٹی! یہ اوتار سنگھ کیلئے تکلیف دہ بات تھی۔لیکن اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ مولوی صاحب کو اپنے بچھڑے ہوئے بیوی بچوں کے لئے کچھ وقت تو ملنا چاہئے۔پھر اسے کوٹھے کا خیال آ گیا۔وہ بھی تو بے تاب ہو رہا تھا کہ شام ہو اور وہ کوٹھے پر جائے۔

''جی مولوی صاحب،جیسا آپ مناسب سمجھیں''۔اس نے کہا۔''میں اتنے دن اپنا سبق دہراتا رہوں گا''۔

مولوی صاحب چلے گئے۔

اگلے چند گھنٹوں میں زندگی کے معمولات پھر سے جاری ہو گئے۔رگھو بازار جا کر سودا لایا۔اتنی دیر میں رنجنا نے گھر کی صفائی کر ڈالی۔رگھو سودا لے کر آیا تو وہ رسوئی میں جا گھسی۔تین گھنٹے بعد وہ دہلی میں پہلا کھانا کھا رہے تھے۔

اوتار سنگھ کی عجیب کیفیت تھی۔وہ بہت بے چین، بہت مضطرب تھا۔اس وقت اسے نہ اسکول کا خیال تھا نہ اسکول کی پڑھائی کا۔نہ ہی اسے عربی کی پڑھائی کی فکر تھی۔اس کے دماغ پر تو صرف کوٹھا سوار تھا۔وہ یونہی وقت گزاری کے لئے کانتی پرشاد جی سے اور کبھی وصال دین سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔اس کی بے تابی ایسی تھی کہ وقت سے کچھ پہلے ہی وہ کوٹھے پر چلا گیا۔

رنجنا اوپر آ کر صفائی کر گئی تھی۔کرسیاں اس نے جھاڑ پونچھ کر ترتیب سے رکھ دی تھیں۔اس لئے کوٹھا ویسا ہی لگ رہا تھا،جیسا وہ اسے چھوڑ کر گیا تھا۔وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔اس بار اس نے کتابیں ساتھ لانے کا تکلف بھی نہیں کیا تھا۔

وہ بیٹھ کر ادھر ادھر دیکھتا.....جائزہ لیتا رہا۔لیکن گرد و پیش سے درحقیقت اسے ایسی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔وہ محض وقت گزاری تھی۔چند منٹ میں ہی وہ اکتا گیا تو اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

دیر ہو گئی۔مگر وہ آواز سنائی نہیں دی،جس کا انتظار وہ دو ماہ سے کر رہا تھا۔پہلے تو وہ یہی سمجھتا رہا کہ وہ وقت سے کافی پہلے اوپر آ گیا ہے۔مگر پھر اسے گڑبڑ کا احساس ہونے لگا۔اس کا دل اندیشوں سے بھر گیا۔ان دو مہینوں کی دوری میں ایسا کیا ہو گیا کہ آج وہ آواز سنائی نہیں دے رہی۔کہیں وہ.....!اس کہیں وہ کے آگے متعدد امکانات تھے،جن پر وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ اس کے ٹہلنے کی رفتار دوڑنے کے برابر ہو گئی ہے۔اسے یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ نیچے سے کوئی اسے دیکھ رہا ہے!

.....x.....

دو ماہ سے ترسی ہوئی حور بانو کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔وہ چھوٹے ٹھاکر کی ایک جھلک دیکھ چکی تھی اور اس جھلک نے اسے اور بے تاب کر دیا تھا۔وہ بار بار دالان کے چکر لگا رہی تھی۔

پھر اس نے اون کا گولا،اپنی سلائیاں اور ادھ بنا سویٹر اٹھایا اور دالان میں پڑے تخت پر آ بیٹھی۔لیکن اس کی سلائیاں حرکت میں نہیں تھیں۔اس کیفیت میں وہ بننے کی کوشش کرتی تو یقیناً غلط پھندے ہی ڈالتی۔

وہ وہاں بیٹھی رہی۔اس کی نظریں نامکمل سویٹر پر تھیں۔لیکن سماعت اوپر والے مکان کی آوازوں پر مرکوز تھی۔عقل اسے کہتی تھی کہ وہ شام کو اسی مخصوص وقت میں کوٹھے پر جائے گا۔مگر دل مصر تھا کہ وہ یہاں بیٹھ کر انتظار کرے۔کون جانے،آج وہ جلدی ہی آ جائے۔

زینے پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔بغیر دیکھے وہ بتا سکتی تھی کہ وہ رنجنا ہے۔لیکن پھر بھی اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔وہ رنجنا ہی تھی،جو ہاتھ میں جھاڑو لئے کوٹھے پر جا رہی تھی۔

اس کا وہاں بیٹھنا فائدہ مند ثابت ہوا۔اس بار قدموں کی آہٹ وہ تھی،جس کے ساتھ اس کا دل بے ترتیب ہو کر دھڑکتا تھا۔اور وہ اس کی توقع سے خاصا پہلے اوپر جا رہا تھا۔ورنہ اس کے اوپر جانے کا وقت مخصوص تھا۔

اس کی نظریں اوپر اٹھیں اور جم کر رہ گئیں۔چند لمحے بعد چھوٹا ٹھاکر اس کے حلقۂ نگاہ میں داخل ہوا۔اس کے ہاتھ میں کتابیں نہیں تھیں۔وہ اوپر پہنچا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

www.aiuudu.com

اب وہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا، جیسے گردوپیش سے دوماہ کا ٹوٹا ہوا تعلق پھر سے جوڑ رہا ہو۔

پھر وہ اٹھا اور ٹہلنے لگا!

حور بانو کی نگاہیں اس کی ایک ایک حرکت پر جمی تھیں۔ وہ والہانہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

کچھ اور وقت گزر گیا۔ وہ اب بھی ٹہل رہا تھا۔ مگر اب حور بانو کو ایک غیر محسوس تبدیلی کا احساس ہو رہا تھا۔ اپنی وارفتگی کی وجہ سے وہ شعوری طور پر تو اسے محسوس نہیں کر سکی تھی۔ لیکن اس کے لاشعور نے اسے سمجھ لیا تھا۔ چناں چہ اب وہ غور کر رہی تھی۔

پھر بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ چھوٹے ٹھاکر کی رفتار بڑھ گئی تھی۔ یہی نہیں، اس کے جسم کا ایک ایک عضو اس کے اندرونی اضطراب کا اظہار کر رہا تھا۔

حور بانو سوچ میں پڑ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے محض چند لمحوں میں یہ تبدیلی کیسی؟ وہ آ کر بیٹھا تو پرسکون تھا۔ پھر اس نے ٹہلنا شروع کیا، تب بھی وہ پرسکون تھا۔ مگر اچانک ہی وہ مضطرب ہو گیا۔ کیوں؟

وہ اس پر سوچتی۔ مگر اسے موقع ہی نہیں ملا۔ ''حور بانو، عصر پڑھ لو۔ استانی جی آتی ہی ہوں گی''۔ امی نے اسے پکارا۔

''جی امی، وضو کر کے آتی ہوں''۔

اس نے اٹھ کر سلائیاں، اون کا گولا اور ادھ بنا سویٹر رکھا اور کاہلی سے غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔ وضو کرتے ہوئے بھی وہ کھوٹے کی طرف دیکھتی رہی۔ چھوٹے ٹھاکر کی رفتار اور اس کا اضطراب اور بڑھ گیا تھا۔ وہ کسی عجیب ہی کیفیت میں تھا۔ اور حور بانو اسے سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ یہ اچانک ہو کیا گیا ہے۔

وہ نماز پڑھ رہی تھی کہ استانی جی آ گئیں۔ تینوں بہنیں ان سے پڑھنے بیٹھ گئیں۔

استانی جی بہت اچھا پڑھاتی تھیں۔ ان کا انداز بڑا دل نشیں تھا۔ وہ ایسی فضا بناتی تھیں کہ اس سے باہر نکلنا ممکن نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اس دن حور بانو کا دل کوٹھے پر اٹکا ہوا تھا اور وہ چھوٹے ٹھاکر کے اچانک مضطرب ہونے پر غور کر رہی تھی۔

پڑھائی ختم ہوئی تو مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ انہوں نے مغرب کی نماز پڑھی۔ نماز پڑھتے ہی حور بانو دالان کی طرف لپکی۔ اس نے سلائیوں کو اٹھانے کا تکلف بھی نہیں کیا۔ تخت پر بیٹھتے ہی اس نے نظریں اٹھا کر کوٹھے کی طرف دیکھا۔

وہاں اندھیرا تھا۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ کچھ دیکھ نہ پاتی۔ چھوٹا ٹھاکر وہاں موجود تھا۔

.....x.....

آس ایک بہت پتلے اور کم زور دھاگے کی طرح تھی۔ اور وہ کہتی تھی کہ کسی بھی لمحے وہ آواز ایک بار پھر فضا میں ابھرے گی۔ لیکن ہر گزرتے لمحے کے ساتھ وہ کم زور دھاگا بھی اوتار سنگھ کے ہاتھ سے پھسلا جا رہا تھا۔

اور پھر مغرب کی اذان شروع ہوئی۔ اوتار سنگھ یہ تو نہیں جانتا تھا کہ یہ کیسی آواز ہے اور اس کا کیا مطلب ہے۔ مگر وہ اتنا جانتا تھا کہ جس آواز سے اسے عشق ہوا تھا، وہ نسوانی آواز اس آواز سے پہلے خاموش ہو چکی ہوتی تھی۔

آس کا وہ کم زور دھاگا بھی ٹوٹ گیا!

اوتار سنگھ کی کیفیت بہت عجیب تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی بہت اہم چیز اس سے چھن گئی ہے۔ مایوسی ایسی تھی، جیسے دنیا میں کچھ بچا ہی نہ ہو باہر جھٹ پٹے کا سماں تھا۔ لیکن اس کے اندر تو جیسے گھپ اندھیرا چھا گیا تھا۔ ٹہلنا موقوف کر کے وہ بیٹھ گیا۔ اور یوں بیٹھا، جیسے مر گیا ہو۔ خود اسے بھی اس بات کا احساس تھا۔ اس نے ہاتھ ہلانے کی کوشش کی۔ مگر ہاتھ تو کیا، اس سے ایک انگلی بھی نہیں ہلائی گئی۔

یہ کیا ہوا ہے میرے ساتھ؟ یہ کیا ہو گیا ہے مجھے؟ اس نے گھبرا کر سوچا۔ یہ کیا ہو رہا ہے مجھے؟ وہ نہایت خوف زدہ تھا۔ کیا یہی موت ہے؟ کیا میں مر گیا ہوں؟ موت ساکت ہو جانے کا ہی تو نام ہے!

لیکن وہ سوچتے ہوئے ذہن کا آدمی تھا۔ بدترین صورت حال میں بھی اس کا ذہن تجزیہ کرنے کی راہیں نکال لیتا تھا۔ ماں کی موت جیسے صدمے پر بھی اس کا ذہن سوچتا رہا تھا۔ اس وقت بھی اس کا ذہن سوچ رہا تھا۔

چناں چہ اس کے اندر ایک تردید ابھری۔ نہیں، یہ موت نہیں۔ موت تو سب کچھ ختم کر دیتی ہے۔ ماسٹر جی کہتے تھے کہ موت مکتی ہے۔ زندگی کے تمام دکھوں، تمام پریشانیوں کو مٹا ڈالتی ہے۔ منش تمام بکھیڑوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ نجات پا لیتا ہے۔ جب کہ وہ تو اس وقت بہت زیادہ دکھی، بہت زیادہ مایوس ہو رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ زندہ ہے۔

www.allurdu.com

پھر جس طرح بالکل اچانک اس کے اندر گھپ اندھیرا ہوا تھا، ویسے ہی بالکل اچانک اس گھپ اندھیرے میں روشنی کی ایک ننھی سی کرن چمکی۔ وہ ننھا سا ایک روشن نقطہ تھا۔ اس کے دل میں ایک امید جاگی۔ شاید ایسا ہے کہ نیچے والی لڑکی نے وقت تبدیل کر دیا ہے۔ ابھی کچھ دیر بعد..... یا زیادہ دیر بعد..... بہر حال وہ آواز ابھرے گی اور یہ اندھیرا روشنی سے تبدیل ہو جائے گا۔

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کے دل اور دماغ دونوں اس پر متفق تھے کہ یہ بہت موہوم امید ہے..... بے حد دور از کار۔ اس کے باوجود اس کے اندر اس امید کے لئے قبولیت پیدا ہو گئی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے فضا بدلی اور دل نے بھی اس امید کے دھاگے کو تھام لیا۔

پڑوس کے گھروں میں، کوٹھوں پر روشنی ہوئی تو اس کا کوٹھا بھی کچھ روشن ہو گیا۔ ساتھ ہی اندر کے اندھیرے میں بھی کچھ کمی ہوئی۔ کچھ یوں بھی تھا کہ اس نے اپنا دھیان اصل مسئلے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔

مگر وہ مایوس اب بھی تھا۔ دو ماہ وہ اس آواز سے محروم رہا تھا۔ اور ان دو مہینوں کے ہر دن، اور ہر دن کے ہر لمحے اس نے یہی سوچا تھا کہ چھٹیاں ختم ہوں گی، وہ دہلی جائے گا اور وہ آواز سنے گا۔ لیکن آنے کے بعد پہلے ہی دن اسے مایوسی ہوئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہاں سب کچھ بدل گیا ہے۔ کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہا ہے۔ اور زیادہ مایوسی کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ سوچ رہا تھا۔ شاید یہ تبدیلی مستقل ہے۔ شاید اب وہ کبھی یہ آواز نہیں سن سکے گا اور اس کا یہ سوچنا فطری بھی تھا۔

اس موہوم امید کے تحت وہ اب بھی انتظار کر رہا تھا۔ لیکن وہ نیم دلانہ انتظار تھا۔ اندر کی مایوسی کا عکس اس کے چہرے پر صاف نظر آ رہا تھا۔

پھر اس کی سوچ کا رخ بدلا۔ اسے ایک خیال آیا۔ یہ اس کے اندر گھپ اندھیرے میں امید کی وہ ایک کرن کہاں سے آئی؟ اسے ماں کی موت یاد آئی۔ کیسے اسے لگ رہا تھا کہ سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ وہ جی ضرور رہا ہے، سانس بھی لے رہا ہے۔ لیکن زندہ ہو کر بھی زندہ نہیں ہے۔ پھر چند ہی دنوں میں وہ اتنا بڑا غم خود بہ خود بھول گیا تھا۔ اس نے پھر سے ہنسنا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت اس نے سوچا تھا کہ وہ مہانوں کا مہان جو دنیا کا نظام چلا رہا ہے، بہت مہربان ہے۔ وہ آتما کے گہرے زخم بغیر کسی دوا کے بھر دیتا ہے اور آج اس نے دیکھا تھا کہ وہ مہربان گہری مایوسی کے اندھیروں کو امید کی روشنی دیتا ہے۔ جیسے وہ کسی کو مایوس نہیں دیکھنا چاہتا۔

اس کے ساتھ ہی اوتار سنگھ کو خیال آیا کہ بہت دنوں سے اس نے اس انداز میں..... اس اوپر والے بھگوان کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ حالاں کہ وہ تو اس کی جستجو کر رہا تھا۔ وہ اسے جاننا، اسے سمجھنا چاہتا تھا۔ تاکہ وہ اس سے محبت کر سکے، کیوں کہ سب سے زیادہ محبت تو صرف اسی کا حق ہے۔

آخر وہ اپنی اس جستجو سے دور کیسے ہوا..... کیوں ہوا؟ اس پر اس نے سوچا تو وہ حیران رہ گیا۔ یہ تبدیلی تو اسی دن سے آئی تھی، جب اس نے پہلی بار نیچے والی لڑکی کی آواز سنی تھی۔ یہ تو طے ہے کہ اسے نہ صرف اس آواز سے..... بلکہ آواز والی سے بھی محبت ہو گئی تھی۔ تو اس محبت نے اسے بدل ڈالا تھا۔ اس کے معمولات تک کو بدل دیا تھا۔ واقعی محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔

پھر اسے ایک اور خیال آیا۔ اگر وہ اوپر والے بھگوان سے محبت کرنے کے قابل ہو جائے تو وہ محبت یقیناً دنیا کی سب سے بڑی محبت ہو گی۔ اس کے دل نے فوراً اس کی تائید کی۔ بے شک، وہ اس محبت سے بہت بڑی ہو گی، جو اسے اس آواز والی لڑکی سے ہے۔ اور اس لڑکی کی محبت میں وہ اتنا کچھ بھول گیا کہ اسے اپنی جستجو بھی یاد نہ رہی تو اس محبت میں اس کا کیا ہو گا۔ کیا وہ سب کچھ بھول جائے گا۔ حتیٰ کہ زندگی بھی اسے یاد نہیں.....

''بھائی، کب سے یہاں بیٹھے ہوئے ہو۔ تمہیں ہوش ہی نہیں۔ کب سے تمہیں آواز دے رہا ہوں۔ تم ٹھیک تو ہو''۔

اس نے چونک کر وصال دین کو دیکھا، جو عین اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ''کیا..... کیا بات ہے ویر جی؟ کیا کہہ رہے ہو؟''۔ اس نے گڑبڑا کر کہا۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے بھائی''۔ وصال دین کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کیا ہو گا''۔

''اتنی آوازیں دیں۔ تم نے سنی ہی نہیں۔ میں تمہارے سامنے کھڑا تھا اور تم مجھے دیکھ بھی نہیں رہے تھے''۔

اب اوتار سنگھ کو احساس ہوا کہ یہ بات وصال دین نے شروع میں بھی کہی تھی۔

www.allurdu.com

لیکن یہ بھی سچ تھا کہ اس کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ اور بے شک، وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ لیکن نظر اٹھا کر دیکھنے سے پہلے اسے احساس بھی نہیں تھا۔

شاید وہ اپنے آپ میں بہت زیادہ کھویا ہوا تھا!

''اچھا اب چلو۔ کھانا کھالو''۔ وصال دین نے کہا۔

''ٹھیک ہے چلتا ہوں''۔ اوتار سنگھ اٹھ کھڑا ہوا۔

سچ یہ ہے کہ اسے بھوک بالکل نہیں تھی۔ اور وہ یہاں سے جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن وہ کھانا نہیں کھاتا تو سب لوگ اور خاص طور پر ویر جی کو تشویش ہوتی۔

امید کیلئے قبولیت پیدا ہوگئی تھی۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے فضا بدلی اور دل نے بھی اس امید کے دھارے کو تھام لیا۔

پڑوس کے گھروں میں، کوٹھوں پر روشنی ہوئی تو اس کا کوٹھا بھی کچھ روشن ہوگیا۔ ساتھ ہی اندر کے اندھیرے میں بھی کچھ کمی ہوئی۔ کچھ یوں بھی تھا کہ اس نے اپنا دھیان اصل مسئلے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔

مگر وہ مایوس اب بھی تھا۔ دو ماہ وہ اس آواز سے محروم رہا تھا۔ اور ان دو مہینوں کے ہر دن، اور دن کے ہر لمحے اس نے یہی سوچا تھا کہ چھٹیاں ختم ہوں گی، وہ دہلی جائے گا اور وہ آواز سنے گا۔ لیکن آنے کے بعد پہلے ہی دن اسے مایوسی ہوئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہاں سب کچھ بدل گیا ہے۔ کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہا ہے۔ اور زیادہ مایوسی کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ سوچ رہا تھا..... شاید یہ تبدیلی مستقل ہے..... شاید اب وہ کبھی یہ آواز نہیں سن سکے گا۔ اور اس کا یہ سوچنا فطری بھی تھا۔

اس موہوم امید کے تحت وہ اب بھی انتظار کر رہا تھا۔ لیکن وہ نیم دلانہ انتظار تھا۔ اندر کی مایوسی کا عکس اس کے چہرے پر صاف نظر آ رہا تھا۔

پھر اس کی سوچ کا رخ بدلا۔ اسے ایک خیال آیا۔ یہ اس کے اندر گھپ اندھیرے میں امید کی وہ ایک کرن کہاں سے آئی؟ اسے ماں کی موت یاد آئی۔ جیسے اسے لگ رہا تھا کہ سب کچھ ختم ہوگیا ہے۔ وہ جی ضرور رہا ہے، سانس بھی لے رہا ہے۔ لیکن زندہ ہو کر بھی زندہ نہیں ہے۔ پھر چند ہی دنوں میں وہ اتنا بڑا غم خود بہ خود بھول گیا تھا۔ اس نے پھر سے ہنسنا بولنا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت اس نے سوچا تھا کہ وہ مہانوں کا مہان جو دنیا کا نظام چلا رہا ہے، بہت مہربان ہے۔ وہ آتما کے گہرے زخم بغیر کسی دوا کے بھر دیتا ہے اور آج اس نے دیکھا تھا کہ وہ مہربان گہری مایوسی کے اندھیروں کو امید کی روشنی دیتا ہے۔ جیسے وہ کسی کو مایوس نہیں دیکھنا چاہتا۔

اس کے ساتھ ہی اوتار سنگھ کو خیال آیا کہ بہت دنوں سے اس نے اس انداز میں..... اس اوپر والے بھگوان کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ وہ تو اس کی جستجو کر رہا تھا۔ وہ اسے جاننا، اسے سمجھنا چاہتا تھا۔ تاکہ وہ اس سے محبت کر سکے، کیونکہ سب سے زیادہ محبت تو صرف اسی کا حق ہے۔

آخر وہ اپنی اس جستجو سے دور کیسے ہوا۔ کیوں ہوا؟ اس پر اس نے سوچا تو وہ حیران رہ گیا۔ یہ تبدیلی تو اسی دن سے آئی تھی، جب اس نے پہلی بار نیچے والی لڑکی کی آواز سنی تھی۔ یہ تو طے ہے کہ اسے نہ صرف اس آواز سے..... بلکہ آواز والی سے بھی محبت ہوگئی تھی۔ تو اس محبت نے اسے بدل ڈالا تھا۔ اس کے مزاج، اس کے معمولات تک کو بدل دیا تھا۔ واقعی محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔

پھر اسے ایک اور خیال آیا۔ اگر وہ اوپر والے بھگوان سے محبت کرنے کے قابل ہو جائے تو وہ محبت یقیناً دنیا کی سب سے بڑی محبت ہوگی۔ اس کے دل نے فوراً اس کی تائید کی۔ بے شک، وہ اس محبت سے بہت بڑی ہوگی، جو اسے اس آواز والی لڑکی سے ہے۔ اور اس لڑکی کی محبت میں وہ اتنا کچھ بھول گیا کہ اسے اپنی جستجو بھی یاد نہ رہی تو اس محبت میں اس کا کیا ہوگا۔ کیا وہ سب کچھ بھول جائے گا۔ حتیٰ کہ زندگی بھی اسے یاد نہیں.....

''بھائی، کب سے یہاں بیٹھے ہوئے ہو۔ تمہیں ہوش ہی نہیں۔ کب سے تمہیں آواز دے رہا ہوں۔ تم ٹھیک تو ہو''۔

اس نے چونک کر وصال دین کو دیکھا، جو عین اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ''کیا..... کیا بات ہے ویر جی؟ کیا کہہ رہے ہو؟'' اس نے گڑبڑا کر کہا۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے بھائی''۔ وصال دین کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''میں ٹھیک ہوں۔ مجھے کیا ہوگا''۔

''اتنی آوازیں دیں۔ تم نے سنی ہی نہیں۔ میں تمہارے سامنے کھڑا تھا اور تم مجھے دیکھ بھی نہیں رہے تھے''۔

اب اوتار سنگھ کو احساس ہوا کہ یہ بات وصال دین نے شروع میں بھی کہی تھی۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

لیکن یہ بھی سچ تھا کہ اس کی آواز سنائی نہیں دی تھی۔اور بے شک، وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔لیکن نظر اٹھا کر دیکھنے سے پہلے اسے احساس بھی نہیں تھا۔

شاید وہ اپنے آپ میں بہت زیادہ کھویا ہوا تھا!

''اچھا اب چلو۔کھانا کھالو''۔وصال دین نے کہا۔

''ٹھیک ہے چلتا ہوں''۔اوتار سنگھ اٹھ کھڑا ہوا۔

سچ یہ ہے کہ اسے بھوک بالکل نہیں تھی۔اور وہ یہاں سے جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔لیکن وہ کھانا نہیں کھاتا تو سب لوگ اور خاص طور پر ویر جی کو تشویش ہوتی۔

اور تشویش ہوتی تو وہ اس کی وجوہات پر غور کرتے۔اور یہ اوتار سنگھ نہیں چاہتا تھا۔

وہ دونوں نیچے چلے آئے۔

.....x.....

دہلی آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا!

اوتار سنگھ کیلئے وہ بدترین محرومی کے سات سخت ترین دن تھے۔ان سات دنوں میں نہ صرف یہ کہ وہ اس آواز کو سننے کی ہر امید کھو بیٹھا تھا اور پوری طرح مایوس ہو چکا تھا۔بلکہ ہر لمحے اس کا دل بدترین اندیشوں سے لرزتا رہتا تھا۔کہیں اسے کچھ ہو تو نہیں گیا۔

وہ اس راز کو راز رکھنا چاہتا تھا۔اس لئے پوچھ گچھ کرنے کی ہمت بھی نہیں ہوتی تھی۔لیکن یہ معاملہ بہت سنگین اور اس کیلئے بہت اہم ہو گیا تھا۔

کہتے ہیں، جہاں چاہ ہے وہاں راہ ہے۔پھر وہ تو تھا بھی بہت ذہین۔اس نے ایک ترکیب سوچ ہی لی۔

اس شام وہ چاندنی چوک گیا اور وہاں سے رس ملائیاں لایا۔پھر اس نے رنجنا سے کہا۔''نیچے بھی دے آؤ''۔

''جی چھوٹے ٹھاکر''۔

''سنو، ہر ایک کیلئے دو تو ہونی چاہئیں نا۔تو تم ایسا کرو کہ دس رس ملائیاں قاب میں ڈال کر نیچے دے آؤ''۔

رنجنا نے چند لمحے سوچا، حساب لگایا، پھر بولی۔''دو کے حساب سے تو نیچے بارہ دینی ہوں گی چھوٹے ٹھاکر''۔

''وہ کیسے؟''اوتار سنگھ نے معصومیت سے پوچھا''

''وہ چھ ہیں سرکار۔تین لڑکیاں، ایک ماں اور دو نوکر''۔

''اوہ.....میں سمجھا تھا کہ آج کل کوئی ایک ان میں سے گھر میں نہیں ہے۔شاید کہیں گیا ہوا ہو''۔

''نہیں چھوٹے ٹھاکر۔سب لوگ موجود ہیں''۔

''چلو تو بارہ دے آؤ''۔اوتار سنگھ کے لہجے میں اطمینان تھا۔اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔سب ٹھیک ہے۔

رنجنا نیچے چلی گئی۔اوتار سنگھ سوچتا رہا۔اس کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔پہلی بار اسے احساس ہوا تھا کہ وہ بغیر کسی تردد کے کسی بھی طرح کی پوچھ گچھ کر سکتا ہے۔آخر وہ لوگ اس کے ملازم ہیں اور اس کے سامنے چوں و چرا نہیں کر سکتے۔وہ تو اس سے ڈرتے ہیں۔تو وہ ان سے کیوں ڈرے۔بس اسے ذرا احتیاط سے کام لینا ہوگا۔

مگر تھوڑی ہی دیر میں وہ پھر خوف زدہ ہو گیا۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو اس پر.....اس کی محبت کے بارے میں موہوم سا بھی شک ہو۔ایسا ہوا تو ملازم جو اس سے ڈرتے ہیں، کہیں گے تو کچھ بھی نہیں۔لیکن دل میں تو سوچیں گے۔اور اسے یہ بھی گوارا نہیں تھا۔

اسے خیال آیا کہ پچھلے ایک ہفتے میں پریشان ہو کر وہ خاصی بے احتیاطی کر چکا ہے۔اس کی وجہ اس کا یہ خیال تھا کہ ممکن ہے، نیچے والی نے وقت بدل لیا ہو۔چنانچہ وہ کھانا کھانے کے بعد دوبارہ کوٹھے پر چلا جاتا تھا۔وہ وہاں بیٹھا رہتا۔یہاں تک کہ نیچے اندھیرا ہو جاتا اور رات کے سناٹے کے سوا کوئی آواز نہ رہتی۔اسے یقین ہو جاتا کہ وہ سب سو چکے ہیں۔تب وہ مایوس واپس آ جاتا۔وہ اس آواز کیلئے ترس رہا تھا۔مگر اس سے زیادہ اب وہ آواز والی کیلئے پریشان تھا۔اسے رہ رہ کر ہول اٹھتے تھے کہ کہیں اسے کچھ ہو تو نہیں گیا۔

اسی لئے آج اس نے یہ ہمت کر لی تھی۔ اور اس کے نتیجے میں اسے معلوم ہو گیا تھا کہ لڑکی بہر حال اپنے گھر میں ہی ہے اور خیریت سے ہے۔

مگر اب وہ گومگو کی کیفیت میں تھا۔کیا مزید پوچھ گچھ مناسب رہے گی۔کچھ بھی ہو، بس اس کا راز افشا نہیں ہونا چاہئے۔

رنجنا واپس آئی تو اس سے رہا نہیں گیا۔اس نے بڑے سرسری انداز میں کہا۔''رنجنا..... یہ نیچے والے شام کے وقت کیا کرتے ہیں؟ کیا مصروفیت ہوتی ہے ان لوگوں کی؟''

اس کی توقع کے خلاف رنجنا بالکل نہیں چونکی۔''بچیاں پہلے بھی پڑھتی تھیں شام کو۔اور اب بھی پڑھتیں ہیں۔فرق یہ ہے چھوٹے مالک کہ پہلے خود پڑھتی تھیں، اب ایک ماسٹرنی آتی ہے پڑھانے۔اور ان کی ماتا اور چھمن بوا رسوئی میں ہوتی ہیں۔''

اوتار سنگھ ایک دم مطمئن ہو گیا۔بلکہ وہ خوش ہو گیا۔حالانکہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اب وہ آواز وہ شاید ہی کبھی سن سکے۔لیکن خوشی اس بات کی تھی کہ وہ لڑکی خیریت سے ہے۔پریشانی کی کوئی بات نہیں۔البتہ یہ بات اداس کن تھی کہ جب تک وہ ماسٹرنی سے پڑھیں گی، وہ اس آواز کو سننے سے محروم رہے گا۔یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ ایسا کب تک ہوگا۔

مگر اس خوشی اور اطمینان کے سامنے کہ وہ لڑکی خیریت سے ہے، اس اداسی کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

اس روز اوتار سنگھ پر محبت کی ایک اور عظمت عیاں ہوئی۔محبت ہو تو آدمی کی سب سے بڑی خوشی اس میں ہوتی ہے کہ اس کا محبوب خوش و خرم ہو اور خیر و عافیت سے رہے۔اپنی خوشی کہیں پیچھے چلی جاتی ہے۔اور اوتار سنگھ جانتا تھا کہ بے غرضی بہت بڑا انسانی وصف ہے۔

اگلے روز مولوی برکت علی نے اسکول میں اس سے رابطہ کیا۔''برخوردار اوتار سنگھ، اب پڑھائی کا ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑنا چاہئے''۔انہوں نے کہا''جو آپ کا حکم مولوی صاحب''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

"میں نے بہت سوچا۔اسکول کی چھٹی کے فوراً بعد پڑھانا مناسب نہیں۔ہم دونوں ہی تھکے ہوئے ہوں گے۔اس لئے میرے خیال میں شام کا وقت مناسب رہے گا۔یہ بتاؤ، اس وقت تمہاری کوئی مصروفیت تو نہیں"۔

اوتار سنگھ نے چھٹیوں سے پہلے کی شام کے بارے میں سوچا۔وہ تو اس کیلئے مقدس ترین مصروفیت کا وقت ہوتا تھا۔لیکن اب سب کچھ بدل چکا تھا۔وہ دن ہوتے تو وہ مولوی صاحب کو انکار کر دیتا۔

مولوی صاحب اسے بہت غور سے دیکھ رہے تھے۔"کیا بات ہے اوتار سنگھ۔ بتاؤ نا، شام کا وقت مناسب رہے گا۔نہیں تو کچھ اور سوچتے ہیں"۔

"جی نہیں مولوی صاحب۔یہ وقت بہت مناسب ہے"۔اوتار سنگھ نے کہا۔دل میں اس نے کہا.....اس سے مناسب وقت کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔

"تو ٹھیک ہے۔آج شام کو میں آؤں گا"۔مولوی صاحب یہ کہہ کر چلے گئے۔

اوتار سنگھ گھر پر اس بارے میں سوچتا رہا۔جتنا غور کرتا، یہ آنے والی مصروفیت اسے بہت بڑی نعمت معلوم ہوتی۔آخر مولوی صاحب سے وہ عربی ہی تو سیکھ رہا تھا.....اور محض اس آواز کی وجہ سے سیکھ رہا تھا۔اب وہ اس خاص وقت میں اس آواز کو سننے سے محروم ہو گیا تھا۔تو اس وقت کا اس سے اچھا مصرف اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ اس میں مولوی صاحب سے پڑھے۔اور آخر میں وہ ان سے کچھ سنا بھی کرے گا۔واہ.....محروم ہوتے ہی محرومی کا مداوا بھی ہو گیا تھا۔

ادھر مولوی صاحب کچھ سوچ کر جھجک رہے تھے۔وہ اوتار سنگھ کو اس کی حویلی میں پڑھاتے رہے تھے، جہاں ان کا اپنا ایک کمرا تھا اور پڑھائی کے درمیان انہیں مکمل تنہائی میسر تھی۔مگر یہاں معاملہ مختلف تھا۔بہر حال پڑھانا تو تھا۔

شام کو مولوی صاحب آئے۔وہ وہی خاص وقت تھا، جب چھٹیوں سے پہلے اوتار سنگھ کوٹھے پر جاتا تھا اور وہ آواز سنتا تھا۔اب جبکہ آواز کا سلسلہ رک چکا تھا تو اب بھی یہ حال تھا کہ یہ وقت ہوتا تو اس کے قدم اوپر جانے کیلئے تھرکنے لگتے۔

"مولوی صاحب، میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کوٹھے پر مجھے پڑھائیں"۔اس نے کہا۔

"جو تم مناسب سمجھو اوتار سنگھ"۔

"جی نہیں۔فیصلہ تو آپ ہی کریں گے۔چلیں.....میں آپ کو کوٹھا دکھا دوں"۔

اوتار سنگھ مولوی صاحب کو اوپر لے گیا۔کوٹھا دیکھ کر مولوی صاحب کا دل خوش ہو گیا۔انہوں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور طمانیت سے سر ہلاتے ہوئے بولے۔"اس سے مناسب جگہ تو ہو ہی نہیں سکتی"۔

اوتار سنگھ بھی خوش ہو گیا۔ایک خوشی سے.....بہت بڑی خوشی سے وہ محروم ہوا تھا۔مگر اس کا جو بہترین مداوا ممکن تھا، وہ ہو گیا تھا۔"اور آخر میں آپ مجھے کچھ سنا دیا کریں گے"۔یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں التجا تھی۔

مولوی صاحب نے ایسا تو نہیں بتایا۔مگر انہوں نے سوچا تھا کہ عصر پڑھ کر یہاں آیا کریں گے اور یہاں سے جاتے ہوئے جامع مسجد میں مغرب پڑھ لیا کریں گے۔یہ فرمائش انہیں اور اچھی لگی۔انہوں نے سوچا کہ یوں وہ مغرب کی اذان تک تلاوت بھی کر لیا کریں گے۔

"کیوں نہیں اوتار سنگھ"۔انہوں نے شفقت سے کہا۔"اب میں چلتا ہوں۔کل سے اسی وقت آؤں گا"۔

"کل سے ہی کیوں مولوی صاحب؟ آج سے کیوں نہیں"۔

مولوی صاحب نے بہت غور سے اسے دیکھا۔اس کی بے تابی پر انہیں پیار آ گیا۔"ٹھیک ہے اوتار سنگھ۔آج ہی سے سہی"۔

یوں ایک معمول دوسرے معمول میں ڈھل گیا!

.....x.....

حور بانو بہت اداس تھی۔اسے لگتا تھا کہ اس کی کوئی بے حد قیمتی چیز اس سے چھن گئی ہے۔اوپر والے جب واپس آئے تھے تو وہ بہت خوش تھی لیکن اب وہ مایوس بھی تھی اور اسے محرومی کا احساس بھی ستا رہا تھا۔

بظاہر تو معمول میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔وہ مغرب پڑھتے ہی دالان میں جاتی۔چھوٹا ٹھاکر اسے کوٹھے پر بیٹھا نظر آتا۔لیکن وہ بہت بجھا بجھا لگتا تھا اسے دیکھ کر لگتا کہ جیسے اس کی کوئی بہت قیمتی چیز چھن گئی ہے، وہ بس اداس بیٹھا کچھ سوچتا رہتا۔اور چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی خوش کن بات نہیں سوچ رہا ہے۔

اسے دیکھ کر حور بانو کو پہلے جیسی خوشی ہوتی تھی۔شاید اسی لئے کہ اس کی دید دوبارہ مل گئی ہے۔لیکن اس کی اداسی دیکھ کر اس کا دل کٹنے لگتا تھا۔وہ خود بھی اداس ہو جاتی تھی۔وہ دعا کرتی کہ چھوٹے ٹھاکر کی اداسی دور ہو جائے۔

ایک تبدیلی اور آئی تھی۔چھوٹا ٹھاکر اب دیر تک کوٹھے پر بیٹھا رہتا تھا۔یہاں تک کہ مسلمان لڑکا اسے بلانے کیلئے آتا تھا اور پھر وہ نیچے چلے جاتے تھے۔تیسرے چوتھے دن ایک ضرورت کے تحت حور بانو اٹھی اور بیت الخلا کی طرف گئی۔اس وقت رات کافی ہو چکی تھی۔اتفاقیہ طور پر ہی اس کی نظر اٹھی اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ چھوٹا ٹھاکر کوٹھے پر بیٹھا ہے۔

وہ بیت الخلا سے آ کر کچھ دیر دالان میں بیٹھی اور چھوٹے ٹھاکر کو دیکھتی رہی۔وہ اس وقت زیادہ ہی مضطرب تھا۔بیٹھے ہوئے بھی اس کے چہرے کا تاثر پل پل بدلتا رہتا۔اور ہر دو منٹ بعد وہ اٹھ کر ٹہلنے لگتا۔

حور بانو کا بس چلتا تو وہ وہاں بیٹھی رہتی۔لیکن وہ بے وقت تھا۔اور وہ ڈرتی تھی۔کہیں امی کی آنکھ کھل جائے اور وہ اسے یہاں بیٹھا دیکھ لیں تو وہ انہیں کیا جواب دے گی۔وہ کیا سوچیں گی اس کے بارے میں۔اس خوف نے دل چاہنے کے باوجود اسے ٹھہرنے نہیں دیا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

یہ سلسلہ دو تین رات تک یونہی چلا۔ مگر اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ اس کیلئے بہت بڑا دھچکا تھا۔

ایک شام مغرب پڑھ کر وہ دالان میں گئی تو دیکھا کہ کوٹھا اجڑا ہوا ہے چھوٹا ٹھاکر وہاں موجود نہیں تھا۔ اسے حیرت تو ہوئی۔ مگر کسی غیر معمولی پن کا احساس نہی ہوا۔ وہ وہیں بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔

لیکن چھوٹا ٹھاکر نہیں آیا۔ کچھ دیر گزری تو وہ بے چین ہوگئی۔ اب ہر گزرتا لمحہ اسے مایوسی میں مبتلا کر رہا تھا۔ اگرچہ ہر لمحہ رک رک کر گزر رہا تھا۔ پھر بھی اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔

امی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ ''حور بانو.....عشا کب پڑھو گی؟''

''اٹھتی ہوں امی''۔

اس نے اٹھ کر وضو کیا، نماز پڑھی۔ پھر خلاف معمول وہ دالان میں واپس آئی۔ لیکن چھوٹا ٹھاکر اب بھی کوٹھے پر نہیں تھا۔ بہر حال وہ بیٹھ گئی۔

''حور بانو.....چلو اب سو جاؤ۔ پھر صبح اٹھنے میں پریشان کرتی ہو''۔

وہ بغیر ایک لفظ کہے اٹھ گئی، لیکن بستر پر لیٹ کر وہ کروٹیں بدلتی رہی۔ نیند آ ہی نہیں رہی تھی۔ وہ انتظار کرتی رہی۔ پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ امی، بہنیں اور سب لوگ سو گئے ہیں تو وہ اٹھ کر دالان میں چلی آئی۔

مگر چھوٹا ٹھاکر اب بھی کوٹھے پر موجود نہیں تھا!

اس بار وہ زیادہ دیر نہیں رکی۔ ایک تو وہ اس بات سے ڈرتی تھی کہ امی اٹھیں، اسے یہاں دیکھیں اور انہیں اس پر کسی بھی طرح کا شک ہو۔ دوسرے نجانے کیسے اس نے یہ جان لیا تھا کہ اب وہ چھوٹے ٹھاکر کو کوٹھے پر کبھی نہیں دیکھ سکے گی۔ اس کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ چھوٹے ٹھاکر کی کیفیت میں جو فرق اس نے دیکھا تھا، اس کا کوئی بڑا سبب تھا۔ وہ سبب کوئی بھی رہا ہو، اس نے چھوٹے ٹھاکر کو اس کے کسی خاص معاملے میں مایوس کر دیا تھا..... بہت مایوس! اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب چھوٹا ٹھاکر کوٹھے پر کبھی نہیں آئے گا۔ لیکن دل کہاں مانتا ہے۔ حور بانو اس کے بعد بھی تقریباً ایک ہفتہ اس کی جستجو کرتی رہی۔ اس نے آدھی رات کو وہاں آ کے دیکھا۔ لیکن چھوٹا ٹھاکر نہیں تھا۔

بالآخر وہ مایوس ہو گئی!

اب چھوٹے ٹھاکر کی دید کے وہی دو اوقات رہ گئے تھے۔ اسکول جاتے وقت اور اسکول سے آتے وقت اسے دیکھنا۔ حور بانو یہ موقعے کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔ اس کے باوجود وہ ناخوش تھی۔ دن بھر ناخوش رہتی۔ وہ چڑچڑی ہو گئی۔ بات بات پر جھنجلاتی۔ نیند بھی اس کی کم ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ خوابوں سے بھی محروم ہو گئی تھی۔ اور جب آدمی پر جھنجلاہٹ طاری رہنے لگے تو جاگتی آنکھوں تو وہ خواب دیکھ ہی نہیں سکتا۔

لیکن آدمی کے اندر امید کبھی ختم نہیں ہوتی۔ خراب صورتحال میں وہ اندر..... بہت نیچے، دبک کر، چھپ کر بیٹھ جاتی ہے۔ پھر اچانک کسی دن وہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ حور بانو کو بھی وہ امید اچانک کبھی دالان میں لے آتی کہ شاید چھوٹا ٹھاکر کوٹھے پر موجود ہوگا۔ کبھی وہ رات کو بستر سے اٹھ کر دالان میں چلی آتی۔ مگر مایوس جاتی۔ اور ہر بار موہوم سی وہ امید زیادہ دن کیلئے سر جھکا کر، منہ چھپا کر بیٹھ جاتی۔ مگر وہ ختم بہر حال کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ہاں ہر بار اس کے سر اٹھانے کا دورانیہ بڑھ جاتا تھا۔

اسی طرح دو مہینے گزر گئے۔ پھر ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ استانی جی انہیں پڑھانے کیلئے نہیں آئیں۔ یوں کافی عرصے کے بعد حور بانو کو اس خاص وقت میں آزادی ملی۔ عصر پڑھنے کے بعد وہ بلاوجہ ہی دالان میں چلی آئی۔ وہاں بیٹھ کر وہ چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں سوچنا چاہتی تھی۔

مگر وہاں تو اسے بن مانگے بہت بڑی خوشی مل گئی۔ چھوٹا ٹھاکر وہاں موجود تھا،

خوشی ایسی تھی کہ کچھ دیر تو وہ کچھ سننے، سوچنے اور سمجھنے کے قابل ہی نہیں رہی، پھر اسے احساس ہوا کہ چھوٹا ٹھاکر اکیلا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ کوئی ہے۔ اور یہ غیر معمولی بات تھی۔ ورنہ وہ تو اکیلا ہی وہاں آتا تھا۔

اس نے اچک اچک کر دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن دوسرا شخص جو بھی تھا، اس کی پیٹھ اس طرف تھی۔ البتہ چھوٹا ٹھاکر اس رخ پر بیٹھا تھا۔

اب حور بانو سماعت پر زور دے رہی تھی۔ اوپر سے آواز آتی تو تھی۔ لیکن بالکل صاف نہیں ہوتی تھی۔ بہر حال وہ سننے کی کوشش کرتی رہی۔ پہلے مرحلے میں اسے یہ اندازہ ہو گیا کہ دوسرا شخص کوئی استاد ہے اور وہ چھوٹے ٹھاکر کو پڑھا رہا ہے۔

پھر اچانک اس کے کانوں میں کچھ لفظ پڑے اور اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ وہ تو عربی زبان کے الفاظ تھے۔ وہ سماعت پر اور زور دیتی رہی۔ ذرا دیر بعد اسے یقین ہو گیا کہ چھوٹا ٹھاکر عربی ہی پڑھ رہا ہے۔

اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ جسم میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ چھوٹا ٹھاکر..... ہندو..... مشرک..... یہی اس کی شرمندگی تھی۔ مگر اب وہ مشرک، وہ ہندو عربی زبان پڑھ رہا ہے۔ کیوں؟ ایک ہندو کا عربی سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ پتا نہیں کیوں، اسے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ بہت اچھی علامت ہے۔ کیسے.....؟ اس کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔

وہ بیٹھی اوپر کی آوازیں سنتی رہی۔ خوشی اس کے وجود میں موج در موج اٹھ رہی تھی۔ محبت تو اسے خود بہ خود، بغیر کسی ارادے کے ہو گئی تھی۔ یہ سوچ کر اسے شرمندگی ہوتی تھی کہ اس کا محبوب مشرک ہے۔ اب وہ عربی پڑھ رہا تھا تو اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ جیسے اس کے راستے کی کوئی رکاوٹ دور ہو رہی ہو۔

لیکن وہ کسی اور کو نہ بتاتی تو وہ خوشی ادھوری رہ جاتی۔ وہ اٹھ کر اندر گئی۔ نور بانو کچھ پڑھ رہی تھی۔ ''نور.....نور.....اٹھ تو۔ کچھ دکھانا ہے تمہیں''۔

اس کے لہجے میں بھی سنسنی تھی۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

نور بانو نے چونک کر، سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ''کیا ہے باجی؟''

''میرے ساتھ چلو''۔

''کہاں؟''

''دالان میں۔ اور کہاں لے جا سکتی ہوں میں تمہیں''۔

''میں پڑھ رہی ہوں باجی۔ یہیں بتا دو نا، کیا بات ہے''۔

''بہت عجیب بات ہے۔ بتانے میں مزہ نہیں آئے گا۔ آؤ نا''۔ حور بانو اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگی۔

''تم بہت اول جلول ہو باجی۔ پڑھنے بھی نہیں دیتیں چین سے''۔

نور بانو کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن بہن کے اصرار پر وہ اٹھ گئی۔

وہ دونوں دالان میں چلی آئیں۔ ''آؤ یہاں بیٹھو''۔ حور بانو نے تخت پر بیٹھتے ہوئے نور بانو سے کہا۔

نور بانو بیٹھ تو گئی۔ لیکن وہ ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ ''یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے باجی''۔ بالآخر وہ مایوس لہجے میں بولی۔

''جو میں دکھانا چاہتی ہوں، وہ یہاں نہیں، اوپر ہے..... کوٹھے پر''۔

''کوٹھے پر!''۔ نور بانو نے حیرت سے دہرایا۔ پھر اس نے کوٹھے کی طرف دیکھا۔ ''وہاں دو آدمی بیٹھے ہیں۔ مگر اس میں کیا خاص بات ہے؟''۔

''دیکھنا اتنا ضروری نہیں۔ تم ذرا کان لگا کر سنو''۔

نور بانو نے چند لمحے سماعت پر زور دیا۔ پھر بولی۔ ''پڑھائی ہو رہی ہے''۔

''بالکل ٹھیک۔ مگر یہ سنو کہ کیا پڑھایا جا رہا ہے''۔

اس بار چند لمحے گزرے تو نور بانو کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''ارے ہاں..... یہ تو عربی پڑھا رہے ہیں''۔

''ہاں''۔ حور بانو نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ ''مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ عربی کیوں پڑھ رہے ہیں''۔

''اس میں کیا خاص بات ہے باجی۔ لوگ عربی بھی پڑھتے ہیں اور فارسی بھی''۔

''لیکن ایک ہندو عربی کیوں پڑھنے لگا؟''۔ حور بانو نے اعتراض کیا۔

''ہندو! یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو باجی''۔ نور بانو نے کہا۔ ''ایک مسلمان لڑکا بھی تو رہتا ہے وہاں''۔

''وہ تو ہے۔ لیکن اس وقت جو پڑھ رہا ہے، وہ مسلمان لڑکا نہیں، چھوٹا ٹھاکر ہے''۔

نور بانو نے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ انہیں نہیں پہچانتی تھی۔ ''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو باجی؟''۔

حور بانو چور سی ہو گئی۔ لیکن اب وہ پہلو نہیں بچا سکتی تھی۔ ''میں پہچانتی ہوں ان دونوں کو''۔ اس نے محجوب لہجے میں کہا۔ پھر جلدی سے صفائی پیش کی۔ ''کبھی کبھی اسکول جاتے آتے نظر آ جاتے ہیں دونوں۔ یہ چھوٹا ٹھاکر ہے''۔

نور بانو چند لمحے سوچتی رہی۔ پھر بولی۔ ''واقعی یہ تو غیر معمولی بات ہے''۔ پھر وہ چند لمحے خاموش رہی۔ ''لیکن باجی، میں نے سنا ہے، ہندو بھی عربی فارسی پڑھتے ہیں۔ دیکھو نا، علم تو کسی کی میراث نہیں''۔

حور بانو سوچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن اسے کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ اصل میں وہ اسے غیر معمولی بات ثابت کرنا چاہتی تھی..... کسی اور کے لئے نہیں، اپنے لئے۔ اور اس کیلئے ضروری تھا کہ کوئی اور اس کی تائید کرے۔

لیکن اسی لمحے ایک عجیب بات ہوئی۔ اوپر موجود پڑھانے والے نے تلاوت شروع کر دی۔ اس کی آواز بھی بہت اچھی تھی اور وہ بے حد خوب صورت قرات کر رہا تھا۔ اور وہ سورہ یاسین کی تلاوت کر رہا تھا۔

لمحوں میں سماں بندھ گیا۔ اب جیسے اس آواز کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔ دونوں بہنیں مبہوت ہو کر سن رہی تھیں۔

تلاوت کرنے والے نے صدق اللہ العظیم کہہ کر تلاوت ختم کی اور خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں خالی خالی نظروں سے سامنے کی طرف کسی غیر مرئی چیز کو تک رہی تھیں۔ پھر انہوں نے بیک وقت ایک دوسری کو دیکھا۔ حور بانو نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ ''اب کیا کہتی ہو نور بانو۔ بات صرف عربی پڑھنے کی نہیں۔ یہ تو قرآن کی تلاوت تھی''۔

''یہ تو واقعی غیر معمولی بات ہے''۔ نور بانو نے کہا۔

حور بانو مسکرانے لگی۔ وہ کسی کو یہ بات بتا نہیں سکتی تھی۔ لیکن درحقیقت وہ بہت خوش تھی۔ اور وہ خوشی اس کے لئے بہت غیر متوقع تھی۔ اس نے تو چھوٹے ٹھاکر کو عربی پڑھتے سنا تھا اور نور بانو کو گواہ بنانے کے لئے لے آئی تھی۔ لیکن یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ بات قرآن پاک کی تلاوت تک پہنچے گی۔ یہ تو بہت بڑا معاملہ تھا۔ اب تو وہ آگے کے امکانات پر غور کر رہی تھی۔ کیا چھوٹا ٹھاکر مسلمان ہو گیا ہے؟ یہ سوچتے ہوئے اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔

اسی وقت مغرب کی اذان شروع ہوئی۔ کوٹھے پر پڑھنے والا اور پڑھانے والا دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ تب انہوں نے پہلی بار پڑھانے والے کو دیکھا۔ ان کی آدھی کالی آدھی سفید لمبی داڑھی تھی۔ چہرہ نورانی تھا اور سر پر ٹوپی تھی۔

وہ دونوں بھی نیچے چلی آئیں۔ وضو کر کے نماز پڑھنی تھی۔

نماز کے بعد حور بانو پھر دالان میں گئی۔ لیکن کوٹھا سنسان پڑا تھا۔

مگر اس بار حور بانو کو کوئی مایوسی نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ تو خوش تھی۔ اس خوشی کے لئے تو وہ چھوٹے ٹھاکر کی دید بھی قربان کر سکتی تھی۔

اس دن کے بعد اس کے خواب خوب صورت ہوتے چلے گئے۔!

.....x.....

ابتدا میں اوتار سنگھ کو اس آواز کی محرومی بہت بڑی لگی تھی۔ لیکن مداوا ہو گیا تو محرومی کا وہ زخم دھیرے دھیرے مندمل ہونے لگا۔ انہی اوقات میں مولوی صاحب کا عربی پڑھانا اس کیلئے بہت بڑی نعمت ثابت ہوا تھا

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

پھر آخر میں وہ مولوی صاحب سے کچھ سنانے کی فرمائش کرتا تھا۔ اور مولوی صاحب سناتے تو ان کی آواز کہیں دور چلی جاتی اور وہی نسوانی آواز اس کی سماعت میں شہد انڈیلنے لگتی۔

پھر پڑھائی کا بوجھ بھی بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس سال اسے میٹرک کا امتحان دینا تھا۔ اس امتحان کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ صرف طلبا کے نزدیک ہی نہیں، اساتذہ کے لئے بھی وہ بہت بڑا چیلنج تھا۔ اسکول کے میٹرک کے نتائج اس کی ساکھ سے کم نہیں ہونا چاہئے تھے۔ وہ ایک چیلنج تھا اساتذہ کے لئے۔ چنانچہ انہوں نے پڑھائی کا دباؤ بڑھا دیا تھا۔

یہ اوتار سنگھ کے لئے کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ وہ اپنی جماعت کا ہونہار ترین طالب علم تھا۔ لیکن کانتی پرشاد جی اسکول کے اساتذہ سے بڑھ کر اس امتحان کو چیلنج بنائے ہوئے تھے۔ ایک بات ماننے والی تھی۔ پچھلے برسوں کی طرح وہ اس بار بھی اوتار سنگھ کو پڑھائی کے معاملے میں اسکول پر سبقت دلائے ہوئے تھے۔ لیکن اوتار سنگھ کے لئے وقت مسئلہ بن گیا تھا۔ اس کے پاس فرصت کے لمحے کم..... بہت ہی کم ہوتے تھے۔

ہر آدمی کے لئے ہر محرومی کا ایک مثبت نتیجہ بھی نکلتا ہے۔ بلکہ محرومی جتنی بڑی ہو، مثبت نتیجہ بھی اتنا ہی بڑا ہوتا ہے۔ اس آواز نے اوتار سنگھ کو اس کے طبعی تجسس سے اور اس کی زندگی کی ایک بہت بڑی جستجو سے محروم کر دیا تھا۔ اب وہ اس آواز سے محروم ہوا تو اس کی فطرت کے وہ دبے ہوئے عناصر پھر ابھر آئے۔ وہ پھر پہلے کی طرح تجسس، غور و فکر کرنے لگا..... وہ پھر سے سوچنے لگا۔

اسکول میں تفریحی پروگرام بھی ہوتے تھے۔ ایک اتوار کو اوتار سنگھ کی جماعت آم کے ایک باغ میں گئی۔ باغ شہر کے ایک بڑے رئیس کا تھا، جس کا بیٹا اسکول میں پڑھتا تھا۔ یہ دعوت اس کی طرف سے تھی۔

باغ دیکھ کر اوتار سنگھ کی آنکھیں کھل گئیں۔ زمین تو اس نے بہت دیکھی تھی۔ بڑے بڑے کھیت بھی دیکھے تھے اور صحرا بھی، جس کا کوئی انت نظر نہیں آتا تھا۔ جہاں تک نظر جاتی، آسمان جھک کر ریت کو چومتا دکھائی دیتا۔ لیکن پھلوں کا اتنا بڑا باغ اس نے نہیں دیکھا تھا۔

اس کے ہم جماعت تو آم کھانے میں مگن تھے۔ مگر وہ ادھر ادھر گھومتا پھر رہا تھا۔ کچھ لڑکے درختوں پر چڑھے ہوئے تھے اور آم توڑ توڑ کر نیچے کھڑے اپنے ساتھیوں کو دے رہے تھے۔ ایک ٹولی اس کام سے فارغ ہونے کے بعد آم کھانے میں مصروف تھی۔

باغ کے رکھوالے نے اسے الگ تھلگ دیکھا تو ہنس کر بولا۔ ''میاں، آم کھاؤ۔ پیڑ کیوں گنتے ہو''۔

اوتار سنگھ کر بھی یہی رہا تھا۔ اس نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک باغ کا جائزہ لیا تھا اور پیڑوں کو غور سے دیکھتا رہا تھا۔ ہر پیڑ دوسرے سے مختلف تھا۔ کچھ اونچے تھے، کچھ بہت چھوٹے تھے اور کچھ درمیانے۔ پھر یہی ایک فرق نہیں تھا۔ کچھ پیڑ زیادہ گھنے تھے، کچھ چھدرے تھے۔ کچھ پیڑ آموں سے لدے ہوئے تھے اور کچھ پر بہت کم آم تھے یہی نہیں، ایک پیڑ کی مختلف شاخوں کا معاملہ تک مختلف تھا۔ کوئی ڈال آموں سے محروم تھی اور کوئی آموں کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھی۔ پھر گزرتے ہوئے اس نے آموں کے ڈھیر کو دیکھا، جو اس کے چند ساتھیوں نے جمع کیا تھا۔ ان میں ہر طرح کے آم تھے، چھوٹے، بڑے، پیلے، ہرے، ملی جلی رنگت والے۔

''گن نہیں رہا ہوں۔ دیکھ رہا ہوں''۔ اس نے رکھوالے کو جواب دیا۔

''کھانے کی چیز کھانے کے لئے ہوتی ہے میاں۔ دیکھنے کیلئے نہیں''۔ رکھوالے نے کہا۔ ''ویسے یہ تو بتاؤ کہ تم دیکھ کیا رہے ہو''۔

''دیکھ رہا ہوں کہ پیڑ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ پھل بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں''۔

''وہ تو ہوتے ہی ہیں۔ کھا کر دیکھو میاں تو پتا چلے گا کہ ہر آم کا ذائقہ بھی جدا ہے اور خوشبو بھی''۔

''یقیناً ہوگی''۔ اوتار سنگھ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن ایسا کیوں ہے؟''۔

''اللہ کی شان ہے میاں۔ اللہ کی قدرت ہے۔ ہر آدمی دوسرے آدمی سے مختلف کیوں ہے۔ شکل و صورت الگ۔ کسی ایک آدمی کی آواز تک دوسرے کی آواز سے نہیں ملتی۔ پھر عادتیں، مزاج اور فطرت تو ہیں ہی الگ''۔

اوتار سنگھ نے سوچا، واقعی یہ تو سامنے کی بات ہے۔

''اور اللہ نے سب کو ایک سا بنایا ہوتا تو پہچان کیسے ہوتی۔ نام رکھنے کی ضرورت کیوں پیش آتی''۔

اس بار اوتار سنگھ نے باغ کے رکھوالے کو احترام کی نظروں سے دیکھا۔ وہ بڑی عقل کی باتیں کر رہا تھا۔ ''لیکن جانور تو سب ایک جیسے ہیں''۔ اس نے وہ مخصوص انداز اختیار کیا، جو وہ ماسٹر جی سے باتیں اگلوانے کے لئے کرتا تھا۔

''نہیں میاں۔ ایسا نہیں ہے۔ جانور بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں''۔

''میری سمجھ میں نہیں آئی یہ بات۔ کسی بھی بندر کو دیکھ لو۔ سب ایک جیسے ہوتے ہیں''۔

''ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ہمیں لگتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہم ان میں دلچسپی نہیں لیتے۔ انہیں غور سے نہیں دیکھتے۔ ہاں جو جانور ہمارے ہوتے ہیں، انہیں تو ہم پہچانتے ہیں نا۔ اپنی بھینس کو ہر آدمی کو پہچانتا ہے۔ کوئی چوری کر لے، تب بھی شناخت کر لیتا ہے۔ ہزاروں گھوڑوں میں بھی آدمی اپنے گھوڑے کو پہچان لیتا ہے۔ ہے کہ نہیں؟''۔

اب اوتار سنگھ کو اس گفتگو میں لطف آ رہا ہے، وہ بات بڑھانا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''ہاں، یہ تو ہے۔ لیکن.....''۔

''جنگل کی بات تو''۔ رکھوالے نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''جانور ایک دوسرے کو الگ الگ پہچانتے ہیں..... بہت اچھی طرح۔ ان میں دوستیاں بھی ہوتی ہیں اور دشمنی بھی۔ ایک دوسرے کو شناخت نہ کر پائیں تو بھلا ایسا ہو سکتا ہے''۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ مگر یہ بے جان درخت.....''۔

''درخت بے جان نہیں ہوتے۔ یہ جان دار ہیں۔ سانس لیتے ہیں۔ کھاتے پیتے ہیں ہماری طرح۔ کسی درخت کو نظر انداز کریں تو وہ اداس ہو جاتا ہے۔ کسی کو غذا نہ ملے تو سوکھ جاتا ہے۔ غذا اچھی نہ ملے تو اس کے پھل کا ذائقہ خراب ہو جاتا ہے۔ میں اس باغ کے ایک ایک درخت کو جانتا ہوں..... پہچانتا ہوں''۔

اس بار اوتار سنگھ کو سچ مچ حیرت ہوئی۔ ''واقعی! کیسے؟''۔

''یہاں کا ایک ایک بوٹا میرے ہاتھوں لگا ہے۔ میرے ہاتھوں پروان چڑھا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کس کے پھل کا ذائقہ کیسا ہے''۔

''تو مجھے بتائیں ان کے بارے میں۔ کچھ درخت چھوٹے کیوں رہ گئے۔ کسی میں پھل کم اور کسی میں زیادہ کیوں ہے؟''۔

''یہاں دو طرح کے پیڑ ہیں میاں۔ ایک تخمی اور دوسرے قلمی۔ تخمی تو وہ ہیں، جو گٹھلی بوئی گئی اور اس سے کلا پھوٹا اور درخت بن گیا۔ اور قلمی وہ ہیں، جو ہم نے زمین میں قلم لگائی.....''۔

''قلم کیا؟''۔ اوتار سنگھ نے پوچھا۔ وہ تو بس لکھنے والے قلم سے واقف تھا۔

''کسی درخت کی پتلی ٹہنی کو تراشا جاتا ہے، جیسے تم لکھنے والے قلم کو تراشتے ہو۔ اسی لئے اسے قلم کہتے ہیں۔ وہ قلم لگائی جاتی ہے۔ اس کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ پھر وہ درخت بن جاتا ہے''۔

''مگر اس کی ضرورت کیا ہے؟ جبکہ گٹھلی سے بھی وہی کچھ حاصل ہوتا ہے؟''۔ اوتار سنگھ نے اعتراض کیا۔

''قلمی آم تخمی آم سے کہیں زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ تخمی آم میں رس ہوتا ہے۔ اسے چوسا جاتا ہے۔ جبکہ قلمی آم میں آم تیار ہوتے ہوتے اس گودے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسے کھایا جاتا ہے۔ پھر اس میں تجربوں کی گنجائش بھی ہوتی ہے۔ دو آموں کو ملا کر ایک بنایا جاتا ہے۔ پیوند کاری کی جاتی ہے۔ میں ابھی تمہیں دکھاؤں گا''۔

اوتار سنگھ بہت حیران تھا۔ ''دو آموں کو ملانے کا..... پیوند کاری کا کیا مطلب ہے؟''۔

''دو مختلف قسم کے درختوں کی قلمی بنائی جاتی ہیں اور انہیں ایک دوسرے سے ملا کر زمین میں لگایا جاتا ہے۔ یوں ایک نئی قسم وجود میں آتی ہو، جس کے پھل میں ان دونوں قسموں کی خاصیتیں اور ذائقے گھلے ملے ہوتے ہیں''۔

اوتار سنگھ کے ذہن میں شادی کا خیال آ گیا۔ انسانوں میں شادی اسی طرح تو ہوتی ہے۔

''آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہیں آم بھی کھلاؤں گا اور کچھ دکھاؤں گا بھی''۔

اوتار سنگھ باغ کے رکھوالے کے ساتھ چل دیا۔

''یہ دیکھو۔ یہ سب تخمی آم کے درخت ہیں''۔ رکھوالے نے چلتے ہوئے کہا۔ ''آگے میں نے الگ الگ قلمیں لگائی ہیں۔ ابھی سب دکھاؤں گا''۔

وہ بڑھتے رہے۔ باغ کے آگے والے حصے میں جو درخت تھے، وہ دیکھنے میں ہی مختلف لگ رہے تھے۔ وہ زیادہ اونچے نہیں تھے۔ کچھ تو اتنے چھوٹے تھے کہ ہاتھ بڑھا کر ہی آم توڑے جا سکتے تھے۔ لیکن اونچے درختوں کے مقابلے میں وہ آموں سے لدے ہوئے تھے۔

اوتار سنگھ نے اس کی وجہ پوچھی۔

''دیکھو۔ درخت کو غذا تو اتنی ہی ملنی ہے۔ اب اگر درخت اونچا ہوگا تو وہ خوراک اس کے لئے نسبتاً کم ثابت ہوگی۔ جبکہ چھوٹے درخت کو اتنی ہی خوراک فراوانی کے ساتھ ملے گی۔ اس لئے اس پر پھل زیادہ ہوں گے''۔

اوتار سنگھ کچھ شرمندہ ہوا.....

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

اگر وہ سوچتا، غور کرتا تو یہ بات خود بھی سمجھ سکتا تھا۔

''دیکھو، یہ سرخاب ہے۔اور وہ انور رٹول ہے''۔رکھوالا درختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتائے جا رہا تھا۔''اور وہ آگے میں نے دونوں کا ملاپ کیا ہے۔ابھی ان میں پھل نہیں آئے ہیں''۔

رکھوالے نے آم توڑے، اپنے کندھے پر پڑا کپڑا زمین پر پھیلایا اور بیٹھ گیا۔پھر اس نے جیب سے چھوٹا سا چاقو نکالا اور ایک قاش کاٹ کر اوتار سنگھ کی طرف بڑھائی۔

اوتار سنگھ نے کھایا اور اس کا دل خوش ہو گیا۔وہ بہت میٹھا آم تھا۔مگر اسی درخت کے دوسرے آم میں ہلکی سی کھٹاس تھی۔ذرا دیر میں اسے اندازہ ہو گیا کہ تمام آموں کا بنیادی ذائقہ ایک سا ہے۔لیکن ہر آم دوسرے آم سے کچھ مختلف ہے۔

''یہ تو ہوتا ہے۔کسی ڈال پر دھوپ کم پڑتی ہے تو اس سے فرق پڑتا ہے۔نیچے کی ڈالیوں کے آم عام طور پر زیادہ میٹھے ہوتے ہیں۔کیونکہ غذا ان تک پہلے پہنچتی ہے اور بھرپور بھی ملتی ہے۔مگر ذائقے کا فرق تو ایک ڈال کے آم میں بھی ہوتا ہے۔ایسے ہی جیسے ایک باپ کے بیٹے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔صورت میں بھی اور مزاج اور فطرت میں بھی''۔

اس روز اوتار سنگھ نے اپنے ہم جماعتوں سے زیادہ اور بہتر آم کھائے۔اور سوچنے کو جو کچھ ملا، وہ اضافی انعام تھا۔

اس رات اپنے بستر پہ لیٹ کر وہ اسی حوالے سے سوچتا رہا۔کیسی عجیب بات ہے کہ دنیا کو دیکھو تو ایک حوالے سے دوسری اور تیسری..... بلکہ ان گنت باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔بس آدمی غور تو کرے۔دیکھے تو، سوچے تو۔یہ فرق صرف آم کا نہیں۔یہ تو ہر پھل میں ہوگا۔جیسے ہر پھل اپنی جگہ ایک فرد ہے۔اس کی سمجھ میں یہ تو آ رہا تھا.....کوئی اس کے اندر بیٹھا کہہ رہا تھا..... یہ سب نشانیاں ہیں، اس ہستی کی جس نے یہ سب کچھ بنایا ہے۔یہ مربوط نظام قائم کیا ہے۔مگر اس سے آگے وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

پھر ایک دن اس نے کیلنڈر پر غور کیا۔وہ تو بہت اہم چیز تھا۔اس سے آدمی وقت کا حساب رکھتا تھا۔زندگی میں ترتیب اور تنظیم کیلنڈر کے دم سے تھی۔اس پر اس نے کانتی پرشاد سے گفتگو بھی کی۔''جب کیلنڈر نہیں ہوگا تو کیسے کام چلتا ہوگا ماسٹر جی؟''۔

''کام تو چلتا تھا اوتار سنگھ۔اس لئے کہ اس وقت زندگی بہت سست رفتار تھی۔گھنٹے، منٹ اور سیکنڈ پرانے زمانے کا آدمی نہیں جانتا تھا۔اس کی اسے اتنی ضرورت بھی نہیں تھی۔اسے تو بس بنیادی ضروریات کی فکر کرنا اور زندہ رہنا تھا۔تو سورج اور چاند تو موجود تھے نا۔دن اور رات کا تو اسے معلوم تھا۔پھر اس کے پاس اور پیمانے بھی تھے..... موسم کے پیمانے۔سردی، گرمی، بہار اور خزاں۔تب لوگ کہتے ہوں گے.....او بہار پہلے میرا یہ بیٹا پیدا ہوا تھا۔پھر آدمی نے مشاہدے سے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ کب بیج بونا فائدہ مند ہوتا ہے۔کب فصل کٹنی چاہئے''۔

''کیلنڈر مختلف کیوں ہیں ماسٹر جی؟''۔

''ایک شمسی کیلنڈر ہے اور دوسرا قمری''۔

''فرق کیا ہے دونوں میں؟''۔

''زمین سورج کے گرد چکر لگاتی ہے۔365 دن اور چند گھنٹوں میں زمین کا ایک چکر مکمل ہوتا ہے۔اس لئے شمسی سال 365 دن کا ہوتا ہے''۔

''تو چند گھنٹوں کے فرق کا کیا بنتا ہے؟''۔

ماسٹر جی مسکرائے۔''وہ اضافی گھنٹے تین سال میں ایک دن بن جاتے ہیں۔اس لئے تو ہر چوتھا سال لیپ ہوتا ہے.....366 دن کا''۔

''اور قمری کیلنڈر؟''۔

''چاند زمین کے گرد چکر لگاتا ہے۔وہ 28 دن اور چند گھنٹوں میں اپنا ایک چکر مکمل کرتا ہے۔تو قمری مہینہ 29 یا 30 دن کا ہوتا ہے۔اور سال وہی بارہ مہینوں کا''۔

''مگر یہ معلوم کیسے ہوا ماسٹر جی؟''۔

''گڈنتھ سے.....جسے علم ریاضی کہا جاتا ہے۔یہ بہت بڑا علم ہے.....دیوتاؤں کا علم۔اسی سے آدمی نے زمین کا، سورج کا اور چاند کا قطر معلوم کیا۔درمیانی فاصلہ بھی معلوم کیا۔زمانہ قبل از مسیح میں یونانیوں نے چاند اور سورج گرہن کا حساب لگایا تھا۔انہوں نے دو ہزار عیسوی تک کے تمام گرہنوں کا وقت لکھ دیا تھا، اور اس میں سیکنڈ کے دسویں حصے تک کا فرق نہیں ہے''۔

بعد میں اوتار سنگھ اس پر غور کرتا رہا۔واقعی دنیا کا نظام اتنا مربوط تھا کہ لگتا تھا، حساب کتاب سے قائم کیا گیا ہے۔لگتا تھا کہ ہر چیز علم ریاضی کے تحت ایک خاص رفتار سے حرکت کر رہی ہے۔چاند، سورج، ستارے ایک سسٹم کے تحت چل رہے ہیں اور وہ سسٹم ایسا ہے کہ اس میں کبھی ایک سیکنڈ کا فرق بھی نہیں پڑتا۔یہی وجہ ہے کہ علم رکھنے والے انسانوں کو معلوم ہوتا ہے کہ کب چاند کہاں ہے اور کوئی اور ستارہ کہاں ہے۔اس کا ثبوت جنتریاں ہیں، جن میں چاند سورج اور تمام ستاروں کی آگے کے وقت تک کی ہر لمحے کی پوزیشن موجود ہے۔یہ علم فلکیات ہے، جو علم نجوم میں بھی کام آتا ہے۔

وہ خیال اور راسخ ہو گیا کہ جس نے یہ پورا نظام قائم کیا ہے، وہ ہستی بہت مہان ہے۔اس کی شکتی کی کوئی حد نہیں۔اور منش جو کچھ بھی جانتا ہے، وہ اسی مہان ہستی نے اسے سکھایا ہے۔مگر جو کچھ منش نہیں جانتا، وہ بہت زیادہ ہے۔

.....x.....

اس شام ٹھاکر پرتاپ سنگھ بیٹھا اپنے کارندوں سے باتیں کر رہا تھا کہ پنڈت روپ سہائے آ گیا۔اس کے ساتھ ایک بہت بوڑھا آدمی تھا، جس کی بھویں تک سفید تھیں۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

ٹھاکر نے سر اٹھا کر ذرا خفگی سے اسے دیکھا اور سرد لہجے میں بولا۔ ''روپ سہائے، تم تو اس دن آنے کا وعدہ کر کے ایسے غائب ہوئے کہ میں تمہاری صورت بھی بھول گیا''۔

''شما کردو ٹھاکر جی۔ پر میں نے وعدہ پورا کر دیا ہے''۔

''سو تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ پر بیچ میں سولہ سال ہیں..... پورے سولہ سال''۔

''میں نے کہا تھا نا ٹھاکر جی کہ میں اپنے گرو جی کو لے کر آؤں گا۔ تو میں انہیں تلاش کر رہا تھا۔ یہ ہیں میرے گرو جی''۔ روپ سہائے نے اپنے ساتھ آئے ہوئے بوڑھے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔ ''بڑے گیانی ہیں۔ مگر سیلانی بھی ہیں۔ بڑی مشکل سے ہاتھ آئے ہیں''۔

ٹھاکر نے بوڑھے کو غور سے دیکھا۔ ''آپ کا شبھ نام؟''۔

بوڑھے نے ہاتھ جوڑ کر اسے نمسکار کیا۔ ''میں رام دیال ہوں ٹھاکر جی''۔

''آپ نے بڑی کرپا کی ہمیں درشن دیئے''۔

''نا ٹھاکر جی۔ یہ تو میرا سوبھاگیہ ہے کہ آپ کے درشن ہوئے۔ میں تو تڑپ رہا تھا یہاں آنے کے لئے''۔

ٹھاکر کی نگاہوں میں ایک لمحے کو حیرت جھلکی۔ پھر اس نے سوالیہ نظروں سے روپ سہائے کو دیکھا۔

''میں نے گرو دیو کو چھوٹے ٹھاکر کی جنم کنڈلی دکھائی۔ تب سے یہ بے چین ہیں انہیں دیکھنے کو''۔ روپ سہائے نے کہا۔ ''اب تو وہ جوان ہو گئے ہوں گے''۔

''مجھے راج کمار کے درشن تو کرا دیجئے ٹھاکر جی''۔ رام دیال کی آواز لرز رہی تھی۔

''اوتار سنگھ تو دہلی میں رہتا ہے۔ وہیں اسکول میں پڑھتا ہے''۔ ٹھاکر نے کہا۔ ''بس گرمی کی چھٹیوں میں گھر آتا ہے''۔

پنڈت رام دیال نراش نظر آنے لگا۔ ''میں سوچتا تھا کہ ان کی دید ہو گی تو بھاگ جاگ جائیں گے۔ پرنتھ مجھے سمجھنا چاہئے تھا کہ میرے ایسے بھاگ کہاں۔ ٹھیک ہے ٹھاکر جی، چلتے ہیں''۔

وہ اٹھنے لگا تو ٹھاکر نے اس کا ہاتھ تھام کر بٹھا لیا۔ ''اب میں آپ کو ایسے تو نہیں جانے دوں گا''۔ اس نے کہا۔ ''یہ تو بتائیں، آپ کہاں سے آ رہے ہیں''۔

''بنارس سے''۔

''اتنی دور سے''۔ ٹھاکر کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''اتنا کشٹ اٹھا کر آپ یہاں آئے میرے پتر کو دیکھنے کو۔ اور میں نہ روکتا تو ایسے ہی واپس چلے جاتے!''۔

''ٹھاکر جی، میں اسی کی خاطر تو آیا ہوں اتنی دور سے''۔ پنڈت رام دیال بولا۔ ''جب چاند ہی نہیں نکلا تو رکنا کیسا؟''۔

''نہیں پنڈت جی۔ آپ دو چار دن یہاں رکیں۔ مجھے خدمت کا موقع دیں۔ آپ ایسے نہیں جا سکتے''۔

ٹھاکر کے بے حد اصرار پر پنڈت رام دیال نے ایک رات رکنے کی ہامی بھر لی۔ مگر اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ محض مروت میں آمادہ ہوا ہے۔ ورنہ وہ رکنا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ پنڈت روپ سہائے رکنا چاہ رہا تھا۔ اور وہی اسے لے کر آیا تھا۔

ٹھاکر نے مہمان خانے میں ان کے ٹھہرنے کا بندوبست کر دیا۔ رات بھوجن بھی اس نے ان کے ساتھ کیا۔

بھوجن کے بعد اس نے کہا۔ ''آپ مجھے اوتار سنگھ کے بارے میں نہیں بتائیں گے؟''۔

''کیا بتاؤں؟ کیا بتا سکتا ہوں؟''۔ پنڈت رام دیال کے لہجے میں بے بسی بھی تھی اور عاجزی بھی۔ ''میں تو خود سمجھنا چاہتا ہوں''۔

''مگر مہاراج، اس کی کنڈلی دیکھ کر کچھ تو سمجھ میں آیا ہو گا''۔ ٹھاکر نے کہا۔

''بہت مشکل ہے۔ ایسی ہی کنڈلیاں تو گیان دیتی ہیں۔ مگر جیون میں ایک ایسی کنڈلی بھی مل جائے تو بڑی بات ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے ایسی کنڈلی کبھی نہیں دیکھی''۔ پنڈت رام دیال عجیب سی کیفیت میں بول رہا تھا۔ ''میرے بے شمار چیلے ہیں۔ میں روپ سہائے کو اپنا اچھا چیلا مانتا ہوں۔ پر نتو یہ کنڈلی دیکھی تو مجھے اس پر شک ہونے لگا۔ مجھے لگا کہ اس سے کوئی غلطی ہوئی ہے کنڈلی بنانے میں یا پھر جنم کا وقت اور تاریخ غلط ہے''۔

''دیکھیں مہاراج، اس کے جنم کی تاریخ اور وقت تو میں بھول ہی نہیں سکتا''۔ ٹھاکر نے تیز لہجے میں کہا۔

''میری آپ سے ایک بنتی ہے ٹھاکر جی''۔

''آپ حکم کریں مہاراج''۔

''میں آپ کی اور چھوٹے ٹھاکر کی..... دونوں کی کنڈلی بنانا چاہتا ہوں''۔ رام دیال نے کہا۔ ''بلکہ آپ کی پتنی کی بھی.....''۔

''ضرور بنائیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں''۔ ٹھاکر نے کہا۔ پھر اپنی رنجیتا کی اور اوتار سنگھ کی تاریخ پیدائش اور وقت بتایا۔

پنڈت رام دیال کنڈلیاں بنانے میں مصروف ہو گیا۔ روپ سہائے پر تشویش نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

رام دیال نے پہلے اوتار سنگھ کی کنڈلی بنائی۔ پھر اس نے اپنے تھیلے سے ایک اور کنڈلی نکالی اور تازہ کنڈلی سے اس کا موازنہ کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھتی جا رہی تھی۔

پھر اس نے سر اٹھایا اور روپ سہائے کو ستائشی نظروں سے دیکھا۔ ''تمہاری کنڈلی میں رتی بھر فرق نہیں ہے''۔ اس نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔

روپ سہائے پہلی بار مسکرایا۔ ''جو بھی سیکھا ہے، آپ ہی سے سیکھا ہے مہاراج''۔ وہ بولا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

رام دیال دوسری اور تیسری کنڈلی میں مصروف ہوگیا۔وہ کنڈلیاں بنانے کے بعد اس نے اوتار سنگھ کی کنڈلی سامنے رکھی اور اسے بہت غور سے دیکھنے لگا۔لگتا تھا، اسے دنیا و مافیہا کی خبر نہیں ہے۔

ٹھاکر اسے متوقع نظروں سے دیکھے جا رہا تھا۔اس کے جسم میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔لگتا تھا، کچھ بھید کھلنے والے ہیں۔بڑے بھید!

پھر اچانک پنڈت رام دیال نے کئی بار سر جھٹکا اور بولنا شروع کیا۔اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ اپنے آپ میں نہیں ہے۔اور وہ کسی کو سنا نہیں رہا تھا۔لگتا تھا کہ وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہے۔''عجیب.....بہت عجیب''۔وہ کہہ رہا تھا۔''اس جنم کنڈلی میں راج یوگ ہے.....اور بہت شکتی والا راج یوگ ہے۔تو چھوٹے ٹھاکر راج تو کریں گے۔راجا تو بنیں گے۔لیکن اس کنڈلی میں سنت یوگ بھی ہے.....اور وہ بھی بڑا شکتی والا ہے۔ایسی کوئی بات نہیں کہ یہ کوئی ان ہونی ہو۔میں نے سینکڑوں جنم کنڈلیاں دیکھی ہیں، جن میں یہ دونوں یوگ موجود تھے۔پر نتو ہوتا یوں ہے کہ دونوں یوگ ایک دوسرے کو ناکارہ کر دیتے ہیں۔منش نہ راجا رہتا ہے نہ بھکاری۔بس عام سا منش بن کر رہ جاتا ہے۔یا یوں ہوتا ہے کہ وہ من کا راجا ہوتا ہے اور بھاگیہ کا فقیر۔یوں سمجھ لو کہ دونوں یوگ شکتی میں برابر ہوں تو ایک دوسرے کو صفر کر دیتے ہیں۔اگر راج یوگ کی شکتی 4 ہو اور سنت یوگ کی 3 تو راج یوگ کا اثر ایک درجے کا رہ جاتا ہے''۔

''اوتار سنگھ کی کنڈلی میں راج یوگ کی شکتی کتنی ہے؟''۔ٹھاکر نے پوچھا۔

رام دیال نے اسے یوں چونک کر دیکھا، جیسے اب تک اس کی موجودگی سے بے خبر رہا ہو۔''بہت ہے ٹھاکر جی، بہت ہے۔مگر سنت یوگ کی شکتی بھی اتنی ہی ہے''۔اس نے کہا۔

''یعنی دونوں نے ایک دوسرے کو کاٹ دیا؟''۔ٹھاکر بولا۔

''نہیں ٹھاکر جی۔ہونا تو یہی چاہئے تھا۔لیکن کنڈلی میں کچھ اور یوگ بھی ہیں۔سہارا دینے والے یوگ۔جنہوں نے انہیں کٹنے نہیں دیا۔سو میں کہتا ہوں کہ دونوں یوگ پورا اثر ڈال رہے ہیں۔دونوں اپنی اپنی جگہ کام کر رہے ہیں۔میرے لئے یہ عجیب بات ہے۔میں نے ایسا کبھی نہیں دیکھا۔اور پھر یہی نہیں، اس کنڈلی میں ایسی بہت سی باتیں ہیں''۔

''مطلب کیا ہے۔مجھے تو یہ بتائیں''۔ٹھاکر کے لہجے میں تشویش بھی تھی اور بے چینی بھی۔

''چھوٹے ٹھاکر راجا ہوں گے۔لیکن جیون غلامی کا گزاریں گے۔اور روپ سہائے سچ کہتا ہے۔اس کنڈلی میں روشنی اتنی زیادہ ہے کہ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔کچھ نظر آنے لگتا ہے تو روشنی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ سب کچھ چھپ جاتا ہے''۔

''تو آپ اس سے زیادہ نہیں بتائیں گے جو روپ سہائے نے بتایا تھا''۔ٹھاکر کے لہجے میں مایوسی تھی۔

''روپ سہائے میرا سب سے گیانی چیلا ہے ٹھاکر جی''۔رام دیال نے فخریہ لہجے میں کہا اور روپ سہائے کا سینہ چوڑا ہوگیا۔''پر نتو میں آپ کو جو کچھ بتا سکتا ہوں، بتاؤں گا۔چھوٹے ٹھاکر کی زندگی کئی بار خطرے میں پڑے گی۔مگر خطرے ہار جائیں گے اور چھوٹے ٹھاکر لمبا جیون پائیں گے۔اور چھوٹے ٹھاکر پریم کریں گے.....دو بار۔اور وہ سچا پریم ہوگا۔دونوں میں وہ پھل ہوں گے۔چھوٹے ٹھاکر کے بھاگیہ میں بدیشی سفر نہیں ہے۔مگر ان کا دیہانت اپنے دیس میں نہیں ہوگا''۔

''کیسی باتیں کرتے ہیں آپ؟''۔ٹھاکر جھنجلا گیا۔''جب بھاگیہ میں بدیشی سفر ہے ہی نہیں تو دیہانت بدیش میں کیسے ہوگا؟''۔

پنڈت رام دیال نے ہاتھ جوڑ دیئے۔''شما چاہتا ہوں ٹھاکر جی۔جو دیکھ رہا ہوں، سمجھ رہا ہوں، وہی بتا رہا ہوں۔سمجھ میں تو میری بھی نہیں آتا۔پر نتو کنڈلی یہی بتاتی ہے۔اور ٹھاکر جی، چھوٹے ٹھاکر بڑے گیانی ہوں گے۔ودیا رتھی ہوں گے۔پر نتو ان کا پریم زیادہ بڑا ہوگا''۔وہ کہتے کہتے رکا۔چند لمحے وہ جنم کنڈلی کو یوں دیکھتا رہا، جیسے اس میں اتر رہا ہو۔پھر اس نے سر اٹھایا اور بولا۔''ٹھاکر جی، ہوتا یوں ہے کہ منش جیون میں بہت کچھ کماتا ہے۔دولت، عزت، شہرت۔پر جب وہ مرتا ہے تو اوش راکھ رہ جاتا ہے۔سب کچھ ختم۔چھوٹے ٹھاکر کو جیون میں سب کچھ ملے گا۔دولت بھی، عزت بھی اور شہرت بھی۔پر وہ ہر چیز سے بھاگیں گے.....صرف پریم کی تلاش میں۔وہ ہر چیز کو ٹھکرا دیں گے۔اور جب ان کا سمے آئے گا تو موت ہی انہیں سب کچھ دے گی۔وہ مرنے کے بعد بڑا مقام پائیں گے۔ان کی بڑائی ان کے جینے سے بڑھ کر ان کے مرنے میں ہو گی''۔

ٹھاکر کو اکلوتے بیٹے کے مرنے کی باتیں بہت گراں گزر رہی تھیں۔اس کے چہرے پر درشتی ابھر آئی۔مگر اسے یاد تھا۔پنڈت رام دیال نے شروع میں ہی بتا دیا تھا کہ چھوٹے ٹھاکر کو لمبا جیون ملے گا۔

''اب میں ذرا آپ کی اور سورگ باش ٹھاکر ائن کی کنڈلی دیکھ لوں''۔پنڈت نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

''ہماری کنڈلیاں کیوں دیکھتے ہیں مہاراج۔ٹھاکر ائن تو جا چکی۔اور میرا بھی کیا ہے.....''۔ٹھاکر نے اعتراض کیا۔

''بات یہ ہے ٹھاکر جی کہ جب کوئی کنڈلی سمجھ میں نہ آئے تو اس کے لئے ماتا پتا کی یا پتری کی کنڈلی دیکھی جاتی ہے''۔پنڈت نے وضاحت کی۔''میں چھوٹے ٹھاکر کی کنڈلی کو ان دونوں کنڈلیوں سے سمجھوں گا تو زیادہ سمجھ سکوں گا''۔

ٹھاکر خاموش ہوگیا۔پنڈت دونوں کنڈلیوں کو بہت غور سے دیکھنے لگا۔

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

اس کے چہرے پر گہرے وچار کا تاثر تھا۔مگر پھر اچانک اس نے جھرجھری لی اور بری طرح چونکا۔اس کے چہرے پر بے یقینی تھی۔اس نے سر اٹھایا۔ایک لمحے کو نظریں اٹھائیں۔مگر فوراً ہی جھکا لیں۔''شما چاہتا ہوں ٹھاکر جی۔پرنتو میں اور کچھ نہیں بتا سکتا''۔

ٹھاکر اسے بغور دیکھتا رہا تھا۔اس نے پنڈت کے چہرے کے تاثر کی تبدیلی دیکھی تھی۔اس نے جان لیا کہ کوئی بہت بڑی بات سامنے آئی ہے اور وہ بات ایسی ہے کہ پنڈت بتانا نہیں چاہتا۔جبکہ وہ جاننا چاہتا تھا۔''مہاراج،آپ کو بتانا ہوگا۔میں بے خبر نہیں رہنا چاہتا''۔

پنڈت نے ہاتھ جوڑ لئے۔''ایسی کوئی بات نہیں ٹھاکر جی جو بتانے کے قابل ہو''۔

''بتانے کے قابل نہیں،تب بھی بتائیں۔میں اپنے پتر کے متعلق سب کچھ جاننا چاہتا ہوں''۔

''یہ بات چھوٹے ٹھاکر کے متعلق نہیں۔میرا وشواس کریں ٹھاکر جی''۔

اس پر ٹھاکر کا تجسس اور بھڑک اٹھا۔یعنی بات اس کے یار نجو کے متعلق تھی۔''تب تو ضرور بتائیں مہاراج''۔

''میں شما چاہتا ہوں ٹھاکر جی''۔پنڈت نے پھر ہاتھ جوڑ دیئے۔

''آپ اتنا بچ کیوں رہے ہیں مہاراج؟''۔

پنڈت واضح طور پر ہچکچا رہا تھا۔جیسے یہ سوچ کر الجھ رہا ہو کہ کچھ بولے یا نہیں۔لیکن تجسس تو اسے بھی تھا۔اور وہ تجسس اسے اکسا رہا تھا کہ جو دل میں ہے،کہہ دے۔بالآخر تجسس جیت گیا۔''بات یہ ہے ٹھاکر جی کہ آپ کی اور ٹھاکرائن کی کنڈلی دیکھ کر میری ودیا نے مجھے ایک ایسی بات بتائی ہے،جو سننا آپ کو اچھا نہیں لگے گا۔اور میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا''۔

ٹھاکر نے چند لمحے سوچا۔پھر بولا۔میں وچن دیتا ہوں کہ آپ سے ناراض نہیں ہوں گا۔اور پھر یہ تو علم کی بات ہے۔علم آپ کو کچھ بتاتا ہے تو وہ آپ کی ذاتی بات تو نہیں''۔

''وہ تو ٹھیک ہے ٹھاکر جی پر.....''۔پنڈت اب بھی ہچکچا رہا تھا۔اور روپ سہائے پریشان نظر آ رہا تھا۔

''آپ چنتا نہ کریں مہاراج۔آپ کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔میں برا نہیں مانوں گا''۔

پنڈت ہچکچایا۔مگر پھر اس کے چہرے پر استقلال نظر آنے لگا۔''میں آپ سے ایک بات پوچھوں ٹھاکر جی؟''۔

''ضرور پوچھیں مہاراج؟''۔

''چھوٹے ٹھاکر آپ کے اپنے پتر تو نہیں ہیں؟''۔

ٹھاکر کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔لگا پنڈت نے اسے گالی دی ہے۔شدت غیظ و غضب سے وہ اندر ہی اندر لرزنے لگا۔لیکن ایسے میں بھی اسے یاد رہا کہ وہ ناراض نہ ہونے کا وچن دے چکا ہے۔''کیا مطلب ہے آپ کا؟''۔اس نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''وہ لے پالک تو نہیں؟ آپ نے کسی کا بچہ لے کر پالا ہو۔اسے اپنا بیٹا بنا لیا ہو''۔

ٹھاکر کا چہرہ تمتما اٹھا۔اس کا پتر.....ٹھاکر اودتار سنگھ.....بھگوان کا آشیرباد.....بھگوان کا سب سے بڑا تحفہ۔وہ یہ کیسے گوارا کرتا کہ دنیا میں کوئی ایک شخص بھی اس تحفے کو کچھ اور سمجھے.....اس کے بارے میں کچھ اور گمان کرے۔مگر اسے اپنے وچن کا بھی احساس تھا۔چنانچہ اسے اپنے لہجے پر بھی قابو رکھنا تھا۔بڑی مشکل سے اس نے اپنی آواز اور لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے کہا۔''ہم راجپوت اپنے خون پر بہت ناز کرتے ہیں مہاراج۔ہم اپنے خون میں ملاوٹ گوارا نہیں کر سکتے''۔یہ کہتے ہوئے وہ اداس ہو گیا۔اسے یاد تھا کہ پتر تو اودتار سنگھ اس کا اور رنجو کا تھا۔پر دودھ اس نے حمیدہ کا پیا تھا۔خون میں ملاوٹ تو ہوئی تھی۔

''جانتا ہوں ٹھاکر جی،پر کوئی ایسا مل راجپوت بچہ بھی مل سکتا ہے.....''۔

''یہ خیال آپ کو کیسے آیا مہاراج''۔

''آپ کے اور سورگ باشی ٹھاکرائن کے بھاگیہ میں اولاد ہے ہی نہیں۔جنم کنڈلیاں یہی بتاتی ہیں ٹھاکر جی''۔

ٹھاکر کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا۔''آپ سے کوئی غلطی تو نہیں ہوئی ہے مہاراج؟''۔

''میں نے بڑی احتیاط سے کام کیا ہے ٹھاکر جی''۔

ٹھاکر کا غصہ غائب ہو گیا۔اس کی جگہ عاجزی نے لے لی۔''اودتار سنگھ میرا ہی پتر ہے مہاراج۔اس کی پیدائش سے پہلے میں نے اور ٹھاکرائن نے ایک ہی رات ایک جیسا سپنا دیکھا تھا۔اس سپنے میں ہمیں خوش خبری ملی تھی۔اور وہ نو ماہ میری پتنی کی کوکھ میں رہا اور اس کی کوکھ سے جنم لیا۔میرے پاس اس کا پورا ریکارڈ موجود ہے۔پورا گاؤں گواہ ہے اس کا''۔

''میرے لئے آپ کا کہنا ہی کافی ہے ٹھاکر جی''۔پنڈت رام دیال نے کہا۔''پرنتو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔جو بھاگیہ لگتا ہے،وہ اسے کبھی بدل بھی دیتا ہے اور ہمیں پتا نہیں چلتا۔اسی لئے تو کہتے ہیں کہ پرارتھنا میں بڑی شکتی ہے۔اس سے بھاگیہ بھی بدل جاتا ہے۔ٹھیک ہے ٹھاکر جی۔میں اور دیکھتا ہوں''۔

ٹھاکر نے سکون کی سانس لی۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ پنڈت مزید کھوج کرے۔مگر وہ اسے روک بھی نہیں سکتا تھا۔

پنڈت سر جھکائے کنڈلیوں میں الجھا رہا۔پھر اچانک اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔''آپ کی پتنی کا دیہانت تین ورش پہلے.....ہوا تھا''۔اس نے تاریخ تک بتاتے ہوئے کہا۔

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

ٹھاکر وہ دن بھی نہیں بھول سکتا تھا۔ وہ تو اس کے دل پر لکھی تھی۔ اس نے اداسی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پنڈت نے کنڈلیوں کو مزید چند لمحوں تک بغور دیکھا۔ پھر بولا۔ یہ سچ ہے کہ کنڈلی کے حساب سے آپ دونوں کے بھاگیہ میں اولاد نہیں۔ لیکن آپ کی کنڈلیوں میں چھوٹے ٹھاکر کی آمد کی گواہی ملتی ہے''۔

ٹھاکر نے چونک کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''چھوٹے ٹھاکر کے جنم ک ساتھ آپ کا اور آپ کی پتنی کا نیا دور شروع ہوا۔ آپ کے جیون کی دشا بدل گئی۔ آپ کا راستہ بدل گیا۔ آپ کی پتنی کے لئے تو یہ آسان نہیں تھا۔ لیکن آپ نے ہنسی خوشی اسے مان لیا۔ بلکہ آپ خود ہی نئے راستے پر چل پڑے''۔

ٹھاکر گھبرا گیا۔ پنڈت رام دیال خطرناک حد تک سچی بات بتا رہا تھا۔ ٹھاکر جانتا تھا کہ وہ تبدیل ہوا ہے۔ مگر پنڈت نہیں جانتا تھا کہ تبدیلی کا اصل عمل تو اب شروع ہوگا۔ اس نے بات ہی ایسی بتائی ہے۔ بچہ نہ اس کے بھاگیہ میں تھا نہ رنجو کے۔ پردینے والے نے اسے اوتار سنگھ دیا۔ اس پر کتنی بڑی دیا کی۔ اس نے اپنا لکھا ہوا اس کا بھاگیہ بدل دیا۔ تو کیا وہ نہ بدلے۔ اسے تو بدلنا ہے..... ہنسی خوشی!

''آپ لوگ اب آرام کریں''۔ ٹھاکر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''صبح آپ کے درشن ہوں گے''۔

ٹھاکر نے اگلے روز انہیں بہت کچھ دے کر رخصت کر دیا!

.....x.....

مصروفیت بہت زیادہ ہو تو وقت کے پر لگ جاتے ہیں۔ اوتار سنگھ کو پتا ہی نہیں چلا کہ وہ سال کب اور کیسے بیت گیا۔ میٹرک کا آخری پرچا دے کر آیا تو اس نے بڑی بے یقینی سے سوچا..... ارے، امتحان ختم!

پھر ٹھاکر پرتاپ سنگھ خود دہلی آ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے بیٹے کی زندگی کا یہ اہم مرحلہ ہے۔ اب اس کے بیٹے کو کالج جانا تھا۔ وہ آیا تو اسے کالج میں داخلہ دلانے کے لئے تھا۔ لیکن انعام بہت بڑا تھا۔ بیٹے سے لپٹ کر سونے کے لئے اسے کئی راتیں مل گئیں۔ کیسی شانتی تھی اس کے ساتھ۔

امتحان کا نتیجہ نکلا۔ اوتار سنگھ نے امتیازی نمبروں کے ساتھ امتحان پاس کیا۔ اس دوران ٹھاکر پرتاپ سنگھ کالجوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے کوئین میری کالج کو اپنے بیٹے کیلئے چن لیا۔ داخلہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اوتار سنگھ کے نمبر ایسے تھے کہ اسے کہیں بھی داخلہ مل سکتا تھا۔

اوتار سنگھ کا کالج میں داخلہ ہوا۔ پھر وہ کالج جانے لگا۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کا دل تو نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اسے واپس جانا ہی تھا۔ فصلوں کا حساب کتاب، گاؤں کی دیکھ بھال کا کام وہ کیدار ناتھ پر چھوڑ کر آیا تھا۔ اور کیدار ناتھ پر اسے بھروسہ نہیں تھا۔

چناں چہ وہ واپس چلا گیا!

اوتار سنگھ کو اس نئی تبدیلی کو قبول کرنے میں کچھ دن لگے۔ وہ تبدیلی تھی بھی بہت بڑی۔ اب وہ کالج کا اسکول سے موازنہ کرتا تو ایسا لگتا کہ وہ ایک چھوٹے سے تالاب سے نکل کر ایک بڑے دریا میں آ گیا ہے۔ اسکول میں رہ کر کالج کا جو تصور اس نے قائم کیا تھا، حقیقت میں کالج اس سے یکسر مختلف تھا، ترتیب اور نظم وضبط کی ضرورت وہاں بھی تھی اور یہاں بھی۔ لیکن اسکول میں ڈسپلن اساتذہ کی ذمے داری تھا جبکہ کالج میں وہ طالب علم کی ذمے داری تھا۔ اسکول میں ہر پیریڈ لینا ضروری تھا۔ جبکہ کالج میں وہ آزاد تھا۔ یہاں خالی پیریڈ بھی ہوتے تھے، جنہیں طالب علم اپنی مرضی کے مطابق استعمال کر سکتا تھا۔ چاہے وہ لائبریری میں جا بیٹھے اور مطالعہ کرے۔ چاہے وہ کامن روم میں چلا جائے اور کھیل لے۔ چاہے وہ لان میں جائے اور دوسرے طلبا کے ساتھ گپ شپ کرے۔ بلکہ کالج میں تو وہ اپنی مرضی سے کوئی پیریڈ چھوڑ بھی سکتا تھا۔ یعنی وہ آزاد تھا۔

ایک اور اعتبار سے بھی کالج بڑا دریا تھا۔ وہاں لڑکے لڑکیاں ساتھ پڑھتے تھے۔ یہی نہیں، طلبا اور طالبات کی اس کمیونٹی میں تمام رنگ موجود تھے۔ مذہب کے اعتبار سے بھی اور زبان اور علاقے کے اعتبار سے بھی۔ انگریز، ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، پنجابی، گجراتی، بنگالی، مدراس..... اور نجانے کیا کیا۔

ایک اور بات بھی تھی۔ اوتار سنگھ کو اسکول میں دوست بنانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ سنجیدہ طالب علم تھا۔ کلاس میں جان پہچان تو ہوئی۔ مگر باقاعدہ دوستی نہیں ہوئی۔ صرف ہاف ٹائم میں موقع ملتا تھا۔ لیکن وہ وقت وہ وصال دین کے ساتھ گزارتا تھا۔

اب معاملہ مختلف تھا۔ کالج میں سوشل لائف ضروری تھی۔ اور وصال دین وہاں تھا نہیں۔ پھر اوتار سنگھ کی فطرت میں تجسس دوسروں سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ اب اسے مختلف لوگوں کے ساتھ گھلنے ملنے اور بہت کچھ جاننے کا موقع مل رہا تھا تو وہ اسے کیسے ضائع کرتا۔ اس کے لئے موقع اسے فوراً ہی مل گیا۔ کالج کی یونین کے الیکشن ہو رہے تھے۔ وہاں پہلی بار اسے پتا چلا کہ سیاست کیا ہوتی ہے..... نیچے سے اوپر تک۔ کالج میں ایک اور کام کا رویہ اسے ملا، جو اسکول میں نہیں تھا۔ اور وہ تھا اختلاف رائے۔ ابتدا ہی میں اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اختلاف رائے سے معلومات میں بیش بہا اضافہ ہوتا ہے۔

کالج لائف میں آتے ہی پہلے تو اسے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ لڑکیوں کے لئے ایک خاص کشش رکھتا ہے۔ ایف اے سال اول کی تمام لڑکیاں اس سے دوستی کی..... اس کی قربت کی متمنی تھیں۔ بلکہ سال دوم کی بھی کئی لڑکیوں نے اس سے دوستی کی کوشش کی۔ پھر اسے اندازہ ہوا کہ لڑکیوں کے اس کی طرف کھنچنے کی وجہ سے لڑکے بھی اس کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔

(جاری ہے)

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

یعنی لڑکے ان لڑکوں سے دوستی کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں، جن کی طرف لڑکیاں کھنچتی ہوں۔

بہت جلد اوتار سنگھ کو اندازہ ہو گیا کہ صحیح معنوں میں تعلیم اب شروع ہو رہی ہے۔ اس کے لئے جاننے اور سیکھنے کے مواقع بڑھ گئے ہیں۔ وہ سوالوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور یہاں سب کے جواب موجود تھے۔

اوتار سنگھ بہت خوب صورت اور وجیہہ لڑکا تھا۔ وہ بے حد متناسب الاعضا تھا۔ ساکت رہتا، تب بھی جسم توانائی کا پاور ہاؤس نظر آتا۔ پھر وہ خوش لباس بھی تھا..... اور اس کا لباس اس کے تمول کا مظہر تھا۔ خود اعتمادی کی اس میں کمی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ساری زندگی اس نے کبھی ''نا'' نہیں سنی تھی۔ اس کی کوئی بات کبھی ٹالی نہیں گئی تھی..... رد نہیں کی گئی تھی۔ اس نے خود ہی کو کبھی کسی سے کم تر نہیں جانا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس کے فطرت میں عاجزی تھی، انکسار تھا، لیکن پر اعتماد انکسار!

ابتدا میں ہی اس نے دیکھا کہ سب لوگ اس کی دوستی کے خواہاں ہیں..... کیا لڑکے، کیا لڑکیاں۔ یعنی اس کے پاس دوست منتخب کرنے کے لئے بڑی ورائٹی تھی۔ اور وہ کوئی سطحی انداز میں دیکھنے اور سوچنے والا لڑکا نہیں تھا۔ چنانچہ لپکنا تو درکنار، اس نے گرم جوشی تک نہیں دکھائی۔ وہ اپنے دوستوں میں کچھ خوبیاں ضروری سمجھتا تھا۔ اور اس کے لئے پرکھنا ضروری تھا۔

دہلی میں تین سال گزارنے کے باوجود بنیادی طور پر وہ گاؤں کا لڑکا تھا۔ مطالعہ اس کا وسیع تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے۔ وہ ہندوستان کی تاریخ سے خوب واقف تھا۔ لیکن موجودہ سیاسی منظر سے وہ اتنا باخبر نہیں تھا۔ کالج میں اس کی سمجھ میں بہت کچھ آنے لگا۔

اسے معلوم تھا کہ ہندوستان پر انگریز حکومت کر رہے ہیں۔ مگر اس سے زیادہ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ کیونکہ کورس کی کتابوں میں جنگ آزادی کا تذکرہ نہیں تھا۔ ان میں اسے غدر کہا جاتا تھا..... بغاوت! اور وہ جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا، وہاں انگریزوں کی مذمت نہیں کی جاتی تھی۔ تاہم وہ اپنے طور پر اس بات پر غور کرتا تھا کہ انگریز اتنی دور سے یہاں آئے اور اب اتنے بڑے ملک پر، اتنی بڑی آبادی پر حکومت کر رہے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ کہ اس ملک کے لوگ نااہل ہیں؟ ان میں اپنا ملک سنبھالنے کی، اسے چلانے کی اہلیت نہیں؟ اور ان میں غیرت بھی نہیں؟ وہ یہ نہیں سوچتے کہ دوسرے باہر سے..... اتنی دور سے آئے، ان کے ملک پر قابض ہوئے اور ان پر حکومت کر رہے ہیں۔ اس کے ذہن میں غدر کا تصور بھی مختلف تھا۔ بغاوت! کیسی بغاوت؟ بنیادی طور پر انگریزوں کو یہاں حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ اگر کچھ لوگوں نے ان کا اقتدار ختم کرنے کی کوشش کی تو وہ بغاوت کیسے ہوئی۔ وہ تو اپنا حق چھیننے کی جائز کوشش تھی۔ اور جنہوں نے کوشش کی، وہ غیرت مند لوگ تھے۔ انہیں مجرم تو نہیں کہا جا سکتا۔

یہ سب کچھ وہ سوچتا رہا تھا۔ اب کالج میں یہ سب کچھ سمجھنے کے لئے فضا موجود تھی۔ چند دنوں میں ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ ملک میں آزادی کے لئے تحریک چل رہی ہے یہی نہیں، انگریز بھی ذہنی طور پر اس کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ یونین کے الیکشن میں مقابلہ دو پارٹیوں کے درمیان تھا اور دونوں پارٹیوں کا اختلاف نظریاتی تھا در حقیقت وہ ملک کی دو بڑی سیاسی جماعتوں کی ذیلی جماعتیں تھیں۔ ایک کانگریس تھی، جس میں سبھی مذاہب کے لوگ تھے۔ دوسری مسلم لیگ تھی، جو صرف مسلمانوں کی جماعت تھی۔ کانگریس ملک کی آزادی کا مطالبہ کر رہی تھی۔ جبکہ مسلم لیگ مسلمان کے لئے علیحدہ مسلمان مملکت چاہتی تھی۔

اوتار سنگھ کی سمجھ میں مسلمانوں کی منطق نہیں آئی۔ اگر مذاہب کی بنیاد پر الگ الگ مملکتیں بنائی جاتیں تو ہندوستان میں سکھ بھی تھے، عیسائی بھی اور پارسی بھی۔ تاریخ بتاتی تھی کہ ملک پر سینکڑوں برس سے مسلمان حکومت کر رہے تھے حالانکہ اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ اس وقت ہندوستان ایک تھا تو اب وہ تقسیم کیوں ہو؟

دوستی اور تعلقات کے معاملے میں اوتار سنگھ کی کچھ ترجیحات تھیں۔ اسے ذہین، علم دوست اور متجسس لوگ اچھے لگتے تھے۔ اسی اعتبار سے اس نے اپنے لئے دوستوں کا انتخاب کیا۔ اور اس کے دوستوں میں سبھی لوگ تھے..... انگریز، ہندو، مسلمان اور سکھ۔ ذہانت، علم کی لگن اور تجسس ان سب کے درمیان قدر مشترک تھا۔

ان سب کے درمیان بہت شدید نظریاتی اختلافات تھے۔ اور ان کے درمیان تند و تیز بحثیں ہوتیں۔ کبھی تو ایسا لگتا کہ اب لڑائی ہو جائے گی۔ لیکن ذہین، علم دوست اور متجسس لوگوں میں یہ خوبی بھی ہوتی ہے کہ وہ روشن خیال ہوتے ہیں۔ اختلاف اپنی جگہ۔ لیکن وہ ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست تھے۔

کالج یونین کا الیکشن ہوا اور کانگریس کی ذیلی جماعت جیت گئی۔ اوتار سنگھ نے انہی کو ووٹ دیا تھا۔

الیکشن کے بعد اس روز وہ لان میں بیٹھے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کے دو پیریڈ خالی تھے۔ رام گوپال نے محمود کو چھیڑ دیا۔ ''دیکھا تم نے۔ اس الیکشن نے دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دیا''۔ اس نے فاتحانہ لہجے میں محمود سے کہا۔ ''اس ملک میں اکثریت ہوش مندوں کی ہے، جو آزادی چاہتے ہیں۔ ملک کو تقسیم کرنا نہیں چاہتے''۔

''میں تم سے اتفاق نہیں کرتا''۔ محمود نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ ''یہ کالج کی یونین کا الیکشن تھا۔ اور بس''۔

''او یار، یہ تو وہی بات ہوئی نا کہ انگور کھٹے تھے''۔ فتح سنگھ بولا۔ ''یہ بات تھی تو الیکشن کیوں لڑا تم نے؟''۔

''یہ دیکھنے کیلئے کہ ہمارے لوگ ہمارے اس موقف کی تائید کرتے ہیں یا نہیں۔ دوسرے ہم رائے عامہ ہموار کرنا چاہتے ہیں''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''تو تمہیں پتا چل گیا کہ لوگ تمہارے ساتھ نہیں ہیں''۔رام گوپال نے کہا۔''اس شکست نے تمہاری آنکھیں کھول دیں؟''۔

''ہاں ہمیں پتا چل گیا کہ قوم جاگ رہی ہے''۔محمود کا لہجہ اب بھی نرم تھا۔''کالج میں 58 طلبا اور طالبات مسلمان ہیں۔اور ہمیں 56 ووٹ ملے''۔

رام گوپال کا منہ اتر گیا۔''یہ تو تنگ نظری ہے تمہاری۔56 ووٹوں نے تمہیں جتوا تو نہیں دیا''۔

''یہ تنگ نظری نہیں، حقیقت پسندی ہے۔ہمیں اپنی طاقت کا اندازہ ہونا چاہئے''۔

تب اوتار سنگھ نے پہلی بار مداخلت کی۔''ویسے محمود، میری سمجھ میں تم لوگوں کی منطق نہیں آتی۔اصل مسئلہ آزادی ہے۔ملک کو تقسیم کرنے کی کیا ضرورت ہے''۔

''یہ فہم و فراست کی بات ہے۔جب ایک جنگ سے کام چل سکتا ہے تو پے در پے دو جنگیں لڑنے کی کیا ضرورت ہے''۔

''کیا مطلب؟''۔رچرڈ پارسن نے بھویں اچکائیں۔

''بھئی ابھی ہم آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں۔اور آزادی کے فوراً بعد ہمیں علیحدگی کے لئے لڑنا ہوگا۔تو یہ کام ابھی کیوں نہ کر لیں''۔

''بنیادی سوال یہ ہے کہ علیحدگی کی ضرورت کیا ہے''۔رام گوپال بولا۔

''ضرورت اس لئے ہے کہ ہمیں اپنا دینی اور قومی تشخص برقرار رکھنا ہے''۔محمود نے جواب دیا۔

''یہ بات سمجھ میں نہیں آتی''۔رام گوپال نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔''تمہارا قومی تشخص کیا ہے؟ یہی نا کہ تم ہندوستانی ہو''۔

''نہیں۔ہم ہندوستانی مسلمان ہیں۔ہمارا قومی تشخص دینی تشخص سے جڑا ہوا ہے''۔محمود نے مسکراتے ہوئے کہا۔''ہم اگر صرف ہندوستانی رہ گئے تو گویا ہم نے اپنی شناخت کھو دی۔اور یہ ہم گوارا نہیں کر سکتے''۔

''تو بھائی، اتنی صدیوں سے جو تم اسی ہندوستان میں رہ رہے ہو، پہلے کبھی تمہیں یہ فکر نہیں ہوئی۔نہ تم اپنی شناخت سے محروم ہوئے''۔رام گوپال نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

''قسم واہگورو کی رامو، تو تو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ابے اتنی صدیوں یہ صرف حکومت ہی تو کرتے رہے ہیں۔یہ فکر کیوں ہوتی انہیں''۔فتح سنگھ بولا۔

''یہ ہوئی نا بات''۔رام گوپال کا لہجہ فاتحانہ تھا۔''جب تک حکومت کرتے رہے، یہ پریشانی نہیں رہی۔اب ہماری باری آئی تو دم نکل رہا ہے ان کا''۔

''ہاں یہی بات ہے۔اچھا ہوا کہ تم نے خود ہی کہہ دیا''۔

اوتار سنگھ کی توقع کے برعکس محمود کا لہجہ فاتحانہ تھا۔ورنہ وہ تو سمجھا تھا کہ اس دلیل کے بعد محمود مدافعانہ انداز اختیار کرے گا۔مگر وہ تو اس دلیل کی تائید کر رہا تھا۔

اب وہ سب محمود کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''اب ذرا اس کی وجہ بھی تو بتاؤ کہ تمہاری حکومت آنے سے پہلے ہی..... تجربہ ہونے سے پہلے ہی مسلمان عدم تحفظ کا شکار کیوں ہو گئے''۔

''اسے کہتے ہیں قبل از مرگ واویلا''۔فتح سنگھ نے چوٹ کی۔

''اور یہ ضروری ہے۔ورنہ بعد میں کوئی ماتم کرنے والا بھی نہیں ملتا''۔محمود نے ترکی بہ ترکی کہا۔

''بھیا ہم ٹھہرے جاہل اور ناسمجھ۔وجہ بھی تم ہی بتا دو''۔رام گوپال نے جل کر کہا۔''مسلمانوں نے صدیوں یہاں حکومت کی۔مگر ہمارا قومی اور مذہبی تشخص تو خطرے میں نہیں پڑا''۔

''حکمرانوں کے معاملے میں ظرف، رواداری اور وسیع النظری کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔یہ سب کچھ مسلمانوں میں تھا۔اسی لئے مندر سلامت رہے۔سب کو پوجا پاٹ کی آزادی تھی.....''۔

''کیا بات کرتے ہو''۔رام گوپال تنک کر بولا۔''رواداری، ظرف، وسیع النظری! سب کہنے کی باتیں ہیں۔محمود غزنوی نے.....''۔

''محمود غزنوی نے کبھی ہندوستان پر حکومت نہیں کی۔وہ کبھی ہندوستان کا حکمراں نہیں رہا۔اکبر کے عہد کی تاریخ بھی یاد ہے؟''۔

''ہاں یاد ہے۔اور اورنگ زیب کے عہد کی تاریخ بھی یاد ہے ہمیں''۔رام گوپال اب تلخ ہو رہا تھا۔

''اورنگ زیب ویسا مسلمان تھا، جیسا مسلمان کو ہونا چاہئے۔اس سے تو شکایتیں مسلمانوں کو بھی ہیں۔بڑے بڑے بزرگوں کے مزار ڈھا دیئے اس نے۔وہ مزار پرستی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔بت پرستی تو بہت آگے کی بات ہے۔اور میری بات کی سچائی اس سے ثابت ہے کہ کئی صدیوں تک مسلمان حکومت کرتے رہے۔لیکن آج بھی ہندوستان میں ہندو بھاری اکثریت میں ہیں''۔

''کروڑوں ہندوؤں کو مسلمان کرنا ان کے بس میں نہیں تھا۔مگر یہ تو بتاؤ کہ اس دیس میں کروڑوں مسلمان کہاں سے آئے؟''۔

''اسلام میں تو زبردستی ہی نہیں''۔محمود پھر مسکرا دیا۔''یہ سب حسن اخلاق کا، محبت کا، سلوک کا کمال ہے۔محمد بن قاسم سندھ میں کتنا کم عرصہ رہا۔لیکن لوگ اس کی پوجا کرنے لگے تھے۔کیوں؟

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

ایک طاقت ور کا اتنے کم وقت میں دل جیت لینا سمجھ میں آتا ہے؟ جو مسلمان ہوا، اپنی خوشی سے ہوا۔ کردار اور اخلاق دیکھ کر ہوا۔ تم نے تو شودروں کو جانوروں سے بدتر بنا رکھا تھا۔ زندگی عذاب تھی ان کی۔ وہ مسلمان ہوئے تو انہیں عزت ملی۔ برابری کا درجہ ملا۔ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ برتری ہے تو صرف اعمال کی ہے۔ یہ اسلام کا کمال ہے۔ اسی لئے تو اسے پھیلنے سے نہیں روکا جا سکا۔ تو بھائی، میں ظرف، رواداری اور وسیع النظری کی بات یونہی نہیں کر رہا ہوں''۔

''تمہارے خیال میں ہندوؤں میں یہ خوبیاں نہیں ہیں؟ ان کی حکومت ہوئی تو تم اپنی پہچان کھو بیٹھو گے؟''۔

''ہاں۔ یہی بات ہے۔ اس لئے پاکستان ضروری ہے''۔

''میں نہیں سمجھتا کہ ایسی کوئی بات ہے۔ تم ثابت کر کے دکھاؤ''۔ رام گوپال نے چیلنج کیا۔

''ثابت کرنا کیا مسئلہ ہے''۔ محمود نے کہا۔ ''یہ شدھی تحریک کون چلا رہا ہے؟ ہندو ہی چلا رہے ہیں نا.....''

''وہ تو انتہا پسند ہندو ہیں'' رام گوپال نے تلملا کر کہا۔

''ہیں تو ہندو نا۔ اور ابھی تو ان کے پاس اقتدار بھی نہیں ہے۔ اقتدار آئے گا تو کیا کچھ نہیں کریں گے وہ۔ مسلمان گائے ذبح کرتے ہیں۔ ہندوؤں کے لئے گائے ماں کے برابر ہے۔ اب بتاؤ، جھگڑا ہوگا کہ نہیں۔ ارے خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ مسلمان اس خطے میں امن کی خاطر پاکستان کا مطالبہ کر رہے ہیں''۔

''بات تو سچ ہے''۔ رچرڈ پارسن نے دھیرے سے کہا۔

''تم تو سچ ہی کہو گے''۔ رام گوپال رچرڈ پر الٹ پڑا۔ ''تم انگریزوں کو یہ اقتدار مسلمانوں سے ہی تو ملا ہے۔ ورنہ یہ سونے کی چڑیا تمہارے ہاتھ کہاں آتی''۔

''ہاں، یہ سچ ہے۔ میں مانتا ہوں کہ مسلمان حکمرانوں کی کمزوری کے نتیجے میں انگریز تجارت کے بہانے یہاں آئے اور پورے ہندوستان پر قابض ہو گئے۔'' محمود نے کہا۔ ''لیکن یہ تو بتاؤ کہ ان کمزور حکمرانوں کو ہٹا کر ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم نہیں کرنا کس کی کمزوری تھی۔ جس میں جتنی طاقت تھی، اسی حساب سے وہ کوئی علاقہ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ مرکزیت کی کمی تو پورے ہندوستان کی تھی۔ صرف مسلمانوں کو قصوروار ٹھہرانا تو زیادتی ہے''۔

بات طول پکڑتی۔ لیکن ان کا پیریڈ شروع ہونے والا تھا۔ یہ بات فتح سنگھ نے یاد دلائی۔ وہ اٹھ گئے، محمود نے رام کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا دوست، مائنڈ نہ کرنا۔ پھر کبھی بات ہوگی''۔

رام نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ''نہیں..... کبھی نہیں ہوگی۔ میں تم سے بات کرنا ہی نہیں چاہتا''۔

''ارے نہیں۔ دوستوں میں یہ جھگڑے اچھے نہیں ہوتے''۔ اوتار سنگھ نے مداخلت کی۔ ''دیکھو نا، یہ تو ایک علمی گفتگو تھی، نالج بڑھانے کے لئے، ذہن کو وسعت.....''

''مجھے یہ پسند نہیں''۔ رام نے تنک کر کہا۔

''اوکم آن، تم میں اسپورٹس مین اسپرٹ نہیں ہے رام۔ اٹ واز آل ان گڈ اسپرٹ''۔ رچرڈ بولا۔ ''اور بات شروع تو تم نے ہی کی تھی''

''اور کیا۔ یاروں کے بیچ کوئی بات فرق نہیں ڈال سکتی''۔ فتح سنگھ سے بھی نہیں رہا گیا۔

لیکن رام گوپال بدستور اکڑا ہوا تھا۔ بالآخر محمود نے زبردستی اسے گلے لگا لیا۔

''اب مسکرا بھی دو''۔ رچرڈ نے کہا۔

رام گوپال مسکرایا۔ لیکن اس کی آنکھوں سے کینہ توزی جھلک رہی تھی۔ اوتار سنگھ اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

.....☆.....

اوتار سنگھ کے دماغ میں نئے نئے دریچے کھل رہے تھے!

دوستوں کے اس گروپ میں لڑکیاں بھی تھیں۔ ریٹا پارسن رچرڈ کی بہن تھی۔ پشپا تھی، جو ایک دولت مند ہندو گھرانے سے تھی۔ نادرہ تھی، جو ایک پڑھے لکھے اور آزاد خیال مسلمان گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔

تینوں لڑکیاں حسن و جمال میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھیں۔ پشپا اور نادرہ دوستوں کے اس گروپ میں اس لئے شامل ہو پائیں کہ ان کے ریٹا سے دوستی ہوگئی تھی..... اور ریٹا رچرڈ کی بہن تھی۔ تینوں بے حد حسین ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد ذہین بھی تھیں اور سوچنے والی بھی تھیں۔

دوستوں کے اس گروہ سے ملنے کے بعد اوتار سنگھ کی سوچ کا منظر بہت وسیع ہو گیا تھا۔ بہت کچھ جو وہ نہیں جانتا تھا، اب اس کے علم میں آ رہا تھا۔ اس کے بعض نظریات کی تردید ہو رہی تھی اور بعض کی اصلاح۔ ان میں ایک نظریہ وہ تھا، جو اس نے مسلمانوں کے بارے میں قائم کر رکھا تھا۔

مسلمانوں کی اس کے لئے بڑی اہمیت تھی۔ ماتا جی اور پتا جی کو چھوڑ کر اس کے سب سے پسندیدہ انسان، سب کے سب مسلمان تھے۔ اماں، جو اس کے لئے ماتا جی سے کم نہیں تھیں۔ وصال دین جو اس کے لئے بھائی تھا اور چاچا جمال دین، جس کی وہ پتا جی جیسی عزت کرتا تھا۔ پھر بعد میں اس میں مولوی صاحب بھی شامل ہو گئے، جو اسے عربی پڑھا رہے تھے۔ کیسی عجیب بات تھی کہ ماسٹر کانتی پرشاد کو اس نے کبھی اس درجے میں شمار نہیں کیا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

اماں، چاچا اور وصال دین کو وہ اس وقت سے دیکھ رہا تھا، جب اس نے ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا۔ اسی لئے وہ سمجھتا تھا کہ مسلمانوں کو وہ بہت اچھی طرح سمجھتا ہے۔ ان کے مزاج سے خوب واقف ہے اور ان تینوں کے حوالے سے اس نے مسلمانوں کے بارے میں ایک نظریہ قائم کیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مسلمان بہت صلح جو، بہت نرم خو اور بہت منکسر المزاج ہوتے ہیں۔ وہ کم سے کم اظہار کے قائل ہوتے ہیں۔ اپنی بات پر زور نہیں دیتے، اصرار نہیں کرتے۔ بحث سے گریز کرتے ہیں۔ بے حد تابع دار اور ڈرپوک ہوتے ہیں۔

اس نے مسلمانوں کو ایسا ہی دیکھا تھا۔ اماں سب سے زیادہ کھل کر بات کرتی تھیں۔ مگر بات کرتے کرتے اچانک چپ ہو جاتی..... گھبرا کر بات نامکمل چھوڑ دیتیں اور پھر کہتیں کہ ٹھاکر جی کو پتا چل گیا تو وہ ان سب کو ختم کرا دیں گے۔ اس کے بعد وہ لاکھ کریدنے کی کوشش کرتا، ان کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلتا اور چاچا جمال دین اور ویر جی دونوں ایک سے تھے۔ پتا جی چاچا کی کتنی عزت کرتے، لیکن چاچا کے انداز کی عاجزی وہی رہتی۔ چاچا اور ویر جی میں ایک بات مشترک تھی، دونوں اپنے خیالات کا اظہار کم ہی کرتے تھے۔ ان کا عمومی رویہ یہ تھا کہ جو کہا جاتا، اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے۔ حالانکہ چاچا جی کا کوئی بات سمجھانے کا طریقہ بے حد سادہ اور حد درجہ دل نشیں تھا۔ اوتار سنگھ کو آج بھی یاد تھا کہ انہوں نے لکڑی کے گھوڑے کو نظر انداز کرنے کے بارے میں اسے کیسے موثر انداز میں سمجھایا تھا اور پھر وہ اس کا گھوڑا بنے تھے۔ اسے پیٹھ پر بٹھا کر دالان میں دوڑتے رہے تھے۔ اس روز انہوں نے اسے وفاداری کا سبق ایسے دل نشیں انداز میں سکھایا تھا کہ وہ آج تک نہیں بھولا تھا۔ انہوں نے کہا تھا..... ہاتھ تھام کر چھوڑتے نہیں چھوٹے ٹھاکر۔ کچھ چھن جانے کا دکھ بڑا ہوتا ہے۔

اوتار سنگھ کو اس دن کی ایک ایک بات آج بھی یاد تھی۔ چاچا جی نے کہا تھا کہ ہر چیز کی ایک اوقات ہوتی ہے۔ کسی سے محبت کرتے وقت اس کی اوقات ضرور دیکھنی چاہئے، اس کے باوجود بھی محبت ضرور کرو۔ لیکن جب محبت نہ رہے، تب بھی یہ بات اس پر ظاہر نہ ہونے دو، کیونکہ کچھ چھن جانے کا دکھ بڑا ہوتا ہے۔

اس سے پتا چلتا تھا کہ چاچا جی عقل والے ہیں۔ لیکن وہ دبو بھی تھے، اپنی عقل کا اظہار کم ہی کرتے تھے۔ جمال دین اس معاملے میں ان سے بھی آگے تھا۔ اس کے بارے میں تو اوتار سنگھ عقل مندی کا گمان کر بھی نہیں سکتا تھا۔ کبھی ایسی کوئی علامت ظاہر ہی نہیں ہوئی تھی۔

مگر اب کالج میں محمود کو دیکھنے کے بعد اوتار سنگھ کو مسلمانوں کے بارے میں اپنی رائے پر نظر ثانی کرنی پڑی، محمود جرأت مند بھی تھا اور سلجھے ہوئے ذہن کا مالک بھی۔ جس طرح ٹھنڈے دل اور دماغ سے اس نے اپنے موقف کا دفاع کیا تھا، وہ قابل رشک تھا۔

لیکن اس بحث نے اوتار سنگھ کو الجھا بھی دیا تھا۔ اس کے ذہن میں کئی سوالات ابھرے تھے۔ یہ احساس بھی ہوا تھا کہ ملک کے سیاسی منظر نامے سے وہ ناواقف ہے۔ یہ تو پتا چل گیا تھا کہ مسلمان ہندوستان میں اپنے لئے الگ خطۂ زمین کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ بھی طے تھا کہ انگریز ہندوستان سے رخصت ہونے والے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اقلیت میں ہونے کے باوجود مسلمانوں نے صدیوں ہندوستان پر حکومت کی ہے..... اور وہ بھی مرکزیت کے ساتھ..... پورے ہندوستان پر!۔

اوتار سنگھ نے اس بات پر غور کیا تو وہ یہ ماننے پر مجبور ہو گیا کہ یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ اتنی بھاری اکثریت پر اقلیت کا حکومت کرنا ایک غیر معمولی بات تھی۔ یوں تو انگریز بھی اقلیت میں ہونے کے باوجود مدت سے ہندوستان پر حکومت کر رہے تھے۔ لیکن ہندوستان کی تاریخ بتاتی تھی کہ مسلمانوں کے دور حکومت میں امن و امان تھا، خوش حالی تھی، لوگوں کو انصاف ملتا تھا اور طوائف الملوکی پھیلنے سے پہلے رعایا مسلمان حکمرانوں سے محبت کرتی تھی، اس حکومت میں طاقت تو تھی، لیکن جبر نہیں تھا، جبکہ انگریز بہ جبر حکومت کر رہے تھے، انہیں ایک بہت بڑی اور ملک گیر بغاوت کا سامنا کرنا پڑا تھا، جسے انہوں نے بڑی سختی اور بے رحمی سے کچل دیا تھا۔ اوتار سنگھ کے خیال میں اسے بغاوت کہنا زیادتی تھی۔ ہندوستانی لوگ..... کیا ہندو، کیا مسلمان..... بجا طور پر اسے تحریک آزادی کہتے ہیں۔

اوتار سنگھ کے لئے مسلمانوں کی کشش اور بڑھ گئی۔ ان میں خوبیاں تو ہوں گی۔ تبھی تو انہوں نے اتنے طویل عرصے حکومت کی تھی۔ شیر شاہ سوری نے صرف پانچ سال میں اتنی اصلاحات کی تھیں..... اور اتنی بڑی اور اہم اصلاحات کے اس کے مختصر دور کو بلاشبہ سنہرا دور کہا جا سکتا تھا۔

گزشتہ بحث کے بعد اوتار سنگھ کے اندر کا طالب علم بری طرح بھڑک چکا تھا۔ اب وہ جلد سے جلد سب کچھ جان لینا اور سمجھ لینا چاہتا تھا۔ گزشتہ بحث میں دو فریق تھے..... محمود اور رام گوپال۔ اس نے فیصلہ کیا کہ دونوں سے الگ الگ گفتگو کرے گا۔

پھر اسے رام گوپال سے بات کرنے کا موقع مل گیا، وہ اسے کینٹین میں لے گیا، چند لمحے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد اس نے مطلب کی بات چھیڑی۔ ''اس روز تمہاری اور محمود کی جو بحث ہوئی، وہ مجھے بڑی دلچسپ لگی''۔

''کچھ بھی ہو، مسلا تو مسلا ہی رہے گا''۔ رام نے بے حد نفرت سے کہا۔ ''اور یہ مسلے سالے ہوتے ہی مطلبی ہیں''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''بالکل''۔

''مگر اس دن تم کہہ رہے تھے کہ وہ انتہا پسند ہندوؤں کی تحریک ہے۔ایک طرح سے تم نے اس سے بے تعلقی ظاہر کی تھی''۔

''ارے یار، اسے ڈپلومیسی کہتے ہیں''۔رام گوپال آنکھ مارتے ہوئے مسکرایا۔''ورنہ ہر ہندو انتہا پسند ہے''۔پھر وہ ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔''اس دھرتی پر بڑے پاپ کئے ہیں ان مسلوں نے۔اب یہ سب کچھ نہیں ہوگا۔ہم گئو ماتا کی رکشا کریں گے''۔

بات ختم ہوگئی۔کیونکہ ان کا پیریڈ شروع ہونے والا تھا۔

اس گفتگو سے اوتار سنگھ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ رام گوپال تنگ نظر بھی ہے اور مکار بھی۔لیکن بہر حال وہ فرد تھا۔ضروری نہیں کہ ہندوؤں کی اکثریت ایسی ہی ہو۔آخر وہ خود بھی تو ہندو ہی تھا۔لیکن نہیں.....اس نے سوچا۔میرا معاملہ مختلف ہے۔میں بتوں کو نہیں پوجتا۔میں انہیں مانتا بھی نہیں۔میں تو اس مہان ہستی کی کھوج میں ہوں، جس نے یہ دنیا بنائی، اس کا مربوط نظام قائم کیا۔

اس کے بعد کافی دنوں تک اسے محمود سے تنہائی میں گفتگو کا موقع نہیں ملا۔تاہم اس دوران اس نے متعدد ہندو طلبا سے بات کی۔ان کا نکتہ نظر بالکل وہی تھا، جو رام گوپال کا تھا۔اس بات نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔

.....x.....

پارسن فیملی طویل عرصے سے ہندوستان میں تھی۔رچرڈ اور ریٹا یہیں پیدا ہوئے تھے۔دونوں میں صرف ایک سال کا فرق تھا۔یہی وجہ تھی کہ زیادہ تر لوگ انہیں جڑواں بہن بھائی سمجھتے تھے۔

جیمز پارسن دہلی کی انتظامیہ میں ایک کلیدی عہدے پر فائز تھے۔دونوں بچوں کو تعلیم کیلئے انہوں نے نینی تال بھجوا دیا تھا۔جہاں وہ پڑھتے تھے، وہ ایک بڑا کانونٹ اسکول تھا۔وہاں اکثریت انگریزوں کی تھی۔لیکن مسلمان اور ہندو بھی بہر حال موجود تھے۔

رچرڈ اور ریٹا دونوں کو ہندوستان بہت پرکشش لگتا تھا۔ہندوستان کی رنگا رنگ ثقافت ان کیلئے مسحور کن تھی۔انہیں یہاں کی زبان میں بھی شروع ہی سے دلچسپی تھی۔یہ دلچسپی ہی کی بات تھی کہ انہوں نے ادھر ادھر سے سیکھ سمجھ کر اردو میں اچھی خاصی استعداد بنالی تھی۔

اسکول میں عام طور پر انگریز بچوں کا رویہ ایسا تھا کہ وہ بس ایک دوسرے سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ویسے بھی ان کی اکثریت تھی۔یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ہندوستانی بچے سب سے الگ تھلگ، ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے۔مگر کچھ بچے ایسے بھی تھے جو فطرت کے اعتبار سے گھلنے ملنے والے تھے۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

وہ انگریز بچوں کی طرف بڑھتے تھے۔مگر رچرڈ اور ریٹا کے سوا ان کی حوصلہ افزائی کرنے والا کوئی نہیں تھا۔رچرڈ اور ریٹا کیلئے اپنے ہم نسلوں سے بڑھ کر ان میں کشش تھی۔ اور ان سے وہ بہت کچھ سیکھتے تھے۔ان کی معلومات میں اضافہ ہوتا تھا۔پھر یہی نہیں،انہیں جب بھی موقع ملتا،وہ اسکول سے نکلتے اور مقامی لوگوں میں گھلتے ملتے۔انہوں نے دیکھ لیا کہ مقامی لوگ بہت سادہ اور ملنسار ہیں۔

دونوں بہن بھائیوں کو ہندوستان سے گہری دلچسپی تھی۔وہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے بارے میں سوچتے تھے۔ان کا مشاہدہ بھی بہت اچھا تھا۔انہوں نے دیکھا تھا کہ چند اکا دکا افراد کو چھوڑ کر ہندوستانیوں میں ایک اجتماعی احساس کمتری تھا۔یہ فطری تھا۔وہ باہر سے آنے والے اور خود سے ہر اعتبار سے مختلف انگریزوں کی رعایا تھے۔کچھ انگریزوں کا حد سے بڑھا ہوا احساس برتری بھی ان کے احساس کمتری کو اور بڑھا دیتا تھا۔

بہر حال رچرڈ اور ریٹا نے اسکول میں بھی خود کو اپنے ہم نسلوں تک محدود نہیں کیا۔بلکہ انہوں نے ہندوستانیوں سے بھی دوستی کی۔

اسکول کی تعلیم مکمل ہوئی تو جیمز پارسن نے انہیں دہلی واپس بلانے کا فیصلہ کیا۔حالانکہ وہ نینی تال میں مزید پڑھ سکتے تھے۔لیکن ایک تو وہ اور الزبتھ اپنے بچوں کو بہت زیادہ مس کرنے لگے تھے۔اور دوسرے سیاسی صورتحال بہت تیزی سے بدل رہی تھی۔انگریزوں کا ہندوستان سے رخصت ہونا اب نوشتہ دیوار تھا۔جیمز پارسن کے بس میں ہوتا تو وہ ابھی انگلینڈ واپس چلا جاتا۔ایسے میں وہ کم از کم یہ تو کر سکتا تھا کہ اپنے بچوں کو اپنے پاس واپس بلا لے۔تا کہ انگلینڈ واپسی کا فیصلہ ہو تو کوئی پیچیدگی نہ ہو۔

دہلی بڑا شہر تھا۔وہاں انگریزوں کی اپنی سوشل لائف تھی۔اب بچے جوانی کی سرحد میں قدم رکھ چکے تھے۔چنانچہ جیمز اور الزبتھ نے انہیں کلب لے جانا شروع کیا اور انہیں ان کے ہم نسلوں سے متعارف کرانے لگے۔لیکن رچرڈ اور ریٹا کو کلب میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ریٹا بالخصوص پیدائشی رومینٹک تھی۔اس کی جمالیاتی حس بڑی توانا تھی۔وہ نازک طبع،نازک خیال اور آرٹسٹک تھی۔وہ اتنی رومان پرست تھی کہ بچپن ہی سے اس نے اپنا ایک آئیڈیل بنا رکھا تھا۔اس کے خوابوں کا ایک شہزادہ تھا،جس کی وہ راہ تکتی تھی۔

کلب میں لوگوں نے جس طرح اس کی پزیرائی کی،وہ اسے اچھا نہیں لگا۔جبلی طور پر ہر عورت بوالہوس نگاہوں کو پہچان لیتی ہے۔وہ تو پھر ایسی لڑکی تھی،مشرقیت اچھی لگتی تھی۔اور وہ رومان پسند بھی تھی۔چنانچہ وہ کلب سے بے زار ہو گئی۔

کالج کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ خوش تھی۔کالج میں نئے دوست ہونگے۔نئی دلچسپیاں ہوں گی۔اچھا وقت گزرے گا اور کون جانے.....

لیکن ابتدا میں اسے بڑی مایوسی ہوئی۔کالج میں ہندوستانیوں کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی۔مگر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ نینی تال کے مقابلے میں یہاں ہندوستانیوں کا احساس کم تری بڑھا ہوا تھا۔ اور جو لوگ اس سے محفوظ تھے، وہ انگریزوں کو غاصب سمجھتے تھے۔یہاں دوست بنانا زیادہ دشوار ہو گیا۔ریٹا حیرت سے سوچتی،جذباتی اعتبار سے یہ کتنے غیر متوازن لوگ ہیں۔یا تو احساس کم تری میں مبتلا ہوں گے۔ یا اپنے بدیسی حکمرانوں کے ہر ہم نسل سے نفرت کریں گے، جیسے وہ بھی اپنے ہم نسلوں کے ساتھ شریک استحصال ہو،جیسے وہ بھی ان کے جرم حکمرانی میں برابر کا شریک ہو۔

مگر پھر دھیرے دھیرے رچرڈ کے دوستوں کا ایک حلقہ بن گیا۔اور اس حلقے میں ہر رنگ موجود تھا، قدرتی طور پر وہ ریٹا کا حلقہ بھی تھا۔اس میں پشپا،نادرہ اور امرتا بھی تھیں اور محمود،رام گوپال،اوتار سنگھ اور فتح سنگھ بھی تھے۔پہلی بار وہ خوش ہوئی۔

اور جب پہلی بار اس نے اوتار سنگھ کو دیکھا تو اسے ایسا لگا کہ اس کے خوابوں کا شہزادہ اس کے سامنے کھڑا ہے۔مگر اس نے پہلی نظر کے اس تاثر کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے نزدیک آدمی کی ظاہری شخصیت سے زیادہ اہم اس کی باطنی شخصیت تھی۔اور باطنی شخصیت ذرا دیر میں ہی کھلتی ہے۔

لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس کی شخصیت کے سحر میں الجھتی گئی۔اوتار سنگھ ظاہری طور پر جتنا خوب صورت تھا،باطنی طور پر اس سے زیادہ خوب صورت تھا۔اس کی شخصیت غیر معمولی طور پر متوازن تھی۔وہ بنیادی طور پر طالب علم تھا.....زندگی کا طالب علم۔ کالج کا چپراسی ہو یا لیکچرار،اپنا کوئی ہم جماعت ہو یا دوست، وہ سب کی بات ایسی توجہ سے سنتا کہ لگتا عبادت کر رہا ہے۔جیسے ہر اہم،غیر اہم بات سے وہ کچھ سیکھ رہا ہے۔اس کے مزاج میں عجیب سا انکسار اور عاجزی تھی۔لیکن وہ ڈرپوک نہیں تھا۔جس بات کو درست سمجھتا،اس کا برملا اظہار وہ کسی کے بھی سامنے کر سکتا تھا۔خود اعتمادی کی اس میں کمی نہیں تھی۔مگر وہ بات نظریں جھکا کر کرتا تھا اس کی نگاہیں نہ چوری نگاہیں تھیں اور نہ ہی کسی بوالہوس کی۔ان میں عجیب سی پاکیزگی،معصومیت اور جستجو تھا۔وہ ایک طالب علم متجسس نگاہیں تھیں۔ایسا طالب علم جو سب کچھ جان لینا چاہتا تھا۔ سب کچھ سمجھ لینا چاہتا تھا۔

مگر ایک بات تھی،دوستوں کے حلقے میں بھی وہ بہت ریزرو رہتا تھا۔کبھی بہت زیادہ بے تکلیف نہیں ہوتا تھا۔یہ بات نہیں کہ اس سے اسکے بارے میں بات کی ائے تو وہ اس سے بچے۔نہیں.....اپنے بارے میں وہ کھل کر بات کرتا تھا۔البتہ دوسروں کے معاملے میں وہ پرائیویسی کا بہت خیال رکھتا تھا۔وہ کسی کی نجی زندگی کے بارے میں تجسس نہیں کرتا تھا۔اس کا تجسس خالصتاً علمی تھا۔

ریٹا کو پتا بھی نہیں چلا کہ کب وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔کب وہ اسے مختلف نظر سے دیکھنے لگی۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

جب اسے اس بات کا احساس ہوا تو اسے کوئی پریشانی بھی نہیں ہوئی۔ وہ مغرب کی لڑکی تھی۔ اپنی زندگی کے فیصلے کرنا، اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزارنا اس کا حق تھا۔ بس اہمیت اس بات کی تھی کہ اوتار سنگھ کے نزدیک بھی اس کی کوئی اہمیت ہے یا نہیں۔

اس معاملے میں اسے مایوسی ہوئی۔ اوتار سنگھ سب سے ایک طرح سے ملتا تھا۔ بلکہ کبھی تو ایسا لگتا کہ دوستوں میں اس کے نزدیک جنس کی تفریق تھی ہی نہیں۔ وہ بہت خوش اخلاق تھا۔ مہذب تھا۔ اس کے اندر رکھ رکھاؤ تھا۔ بس اس سے زیادہ کچھ نہیں

وہ مایوسی وقتی تھی۔ ریٹا نے سمجھ لیا کہ اوتار سنگھ ایک ایسا لڑکا ہے، جس نے ابھی جوانی کی سرحد میں قدم رکھا ہے اور ابھی وہ جوانی کے تقاضوں سے نا آشنا ہے۔ وہ اسے اہمیت نہیں دیتا تو کوئی بات نہیں۔ اسے خود کوشش کرنی ہوگی کہ وہ اسے اہم سمجھنے لگے۔ وہ بہت خوبصورت اور شاداب لڑکی تھی۔ اسے خود پر بہت بھروسہ تھا۔ کلب میں وہ دیکھ چکی تھی کہ مرد کیسے دیوانہ وار اس کی طرف لپکتے ہیں۔

اس نے فیلہ کرلیا کہ اب اس سلسلے میں اسے کچھ کرنا ہے۔ لیکن اس سے پہلے ہی اس پر ایک دھماکہ خیز انکشاف ہوگیا۔ اس نے دیکھ لیا کہ وہ تو ایک انار سو بیمار والا معاملہ ہے۔ اس معاملے میں لڑکیوں کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ اس نے دیکھ لیا کہ دوستوں کے اس حلقے میں تمام لڑکیاں صرف اور صرف اوتار سنگھ کی تمنائی ہیں۔ کیا پشپا، کیا امرتا اور کیا نادرہ۔ گویا مقابلہ بہت سخت تھا۔ مگر ریٹا کو یقین تھا کہ جیت اسی کی ہوگی۔

.....x.....

اوتار سنگھ کو اکیلے میں محمود سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن اس دوران ایک اور اہم واقعہ ہوگیا۔ ہفتے کے روز خالی پیریڈ میں وہ مل بیٹھے۔ چند لمحے ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں۔ پھر رچرڈ نے کہا۔ ''آج ریٹا کا برتھ ڈے ہے۔''

اس پر سب نے چونک کر ریٹا کو دیکھا۔ ریٹا مسکرائی۔ اسے سب کی توجہ کا مرکز بننا بہت اچھا لگتا تھا۔ سب نے اسے ہیپی برتھ ڈے کہا

''نہیں..... مجھے یہ مبارک باد نہیں چاہئے''۔ ریٹا نے کہا۔ ''ہر چیز کا، ہر بات کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ یہ کیا کہ یہاں پتا چلا اور ہیپی وش کردیا''۔

''تو پھر؟'' محمود نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

ریٹا کو احساس تھا کہ محمود اسے خصوصی توجہ دیتا ہے۔ وہ پھر مسکرائی۔ ''اب یہ تو تم سوچو''۔ اس کے لہجے میں چیلنج تھا۔

''چلو..... میں تمہیں تحفہ دوں گا۔ تب وش کرلوں گا''۔ محمود بولا۔

''میں بتاتا ہوں''۔ رچرڈ نے مداخلت کی۔ ''آج ہمارے گھر پر ریٹا کی برتھ ڈے پارٹی ہے۔ تم سب کو آنا ہے''۔

''برتھ ڈے پارٹی!'' رام گوپال نے فکرمندی سے کہا۔

پھر وہی احساس کمتری! ریٹا نے سوچا۔

''اس پارٹی میں ہم دوستوں کے علاوہ کوئی نہیں ہوگا''۔ رچرڈ نے وضاحت کی۔

''اوہ..... ویری گڈ''۔ پشپا نے چہک کر کہا۔

رام گوپال نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ وہاں بہت سارے لوگ ہوں گے..... بے شمار انگریز۔ ''کیوں نہیں۔ ہم ضرور آئیں گے''۔

''پارٹی کا وقت کیا ہے؟'' محمود نے پوچھا۔

''رات آٹھ بجے۔ ڈنر دس بجے۔ پھر ڈانس اینڈ میوزک''۔ ریٹا بولی۔

''یہ تو لمبا پروگرام ہے''۔ نادرہ کے لہجے میں فکرمندی تھی۔

''تو کیا؟ آج سیٹرڈے ہے۔ کل کالج کی چھٹی ہوگی۔ رات اپنی ہی ہے''۔ رچرڈ نے کہا۔

''نا بابا..... میں رات بھر نہیں رک سکتی''۔ نادرہ بولی۔ ''مجھے تو پارٹی میں شرکت کی اجازت بھی آسانی سے نہیں ملے گی۔ ہم لوگ ایسے آزاد خیال نہیں ہیں''۔

''اوکم آن۔ ڈونٹ بی سو بیک ورڈ''۔ ریٹا نے کہا۔

''نادرہ ٹھیک کہہ رہی ہے''۔ محمود نے تائید کی۔ ''میں بھی جلدی جانا چاہوں گا''۔

رچرڈ نے غور سے ان دونوں کو دیکھا۔ اسے اندازہ ہوگیا کہ ان کے موقف میں لچک نہیں ہوگی۔ ''اوکے۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ جب تم کہو گے، میں تم دونوں کو گاڑی میں تمہارے گھر ڈراپ کرادوں گا''۔

''تب تو ٹھیک ہے''۔ نادرہ نے کہا۔

ریٹا نے اوتار سنگھ کو دیکھا۔ ''تم نے کچھ نہیں کہا۔ کیا بات ہے، آؤ گے نا؟''

''ضرور آؤں گا، میں تو آزاد آدمی ہوں''۔ اوتار سنگھ نے کہا۔ ''اور اچھا لگا تو پوری رات بھی رک سکتا ہوں''۔

''میں بھی'' فتح سنگھ اور امرتا نے بیک آواز کہا۔

''میں بھی آؤں گی۔ اور پوری رات رکوں گی''۔

.....x.....

حور بانو ان دنوں بہت پریشان تھی!

پہلے تو استانی صاحبہ کی پڑھائی نے اس کا معمول تبدیل کیا۔ پھر اوپر چھوٹے ٹھاکر کا معمول بھی بدل گیا۔ اس نے مغرب کے بعد اوپر کوٹھے پر آنا اور دیر تک بیٹھنا چھوڑ دیا۔ کیوں؟ اس نے اس پر سوچا۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ پھر اتفاق سے استانی جی نے چھٹی کی تو اسے پتا چلا کہ چھوٹا ٹھاکر عربی پڑھ رہا ہے۔ یہی نہیں، وہ اپنے مولوی صاحب سے قرآن قاک کی تلاوت بھی سنتا ہے۔

اس انکشاف نے حور بانو کے سامنے امکانات کی ایک روشن دنیا لاکر رکھ دی۔ خوش فہمی کے سرسبز باغ اسے نظر آنے لگے۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

اسے لگا کہ نجانے کیسے.....مگر چھوٹا ٹھاکر بھی اس سے محبت کرنے لگا ہے۔اور اسی کی خاطر وہ عربی سیکھ رہا ہے۔اور تلاوت سننے کے بعد اگلا مرحلہ تو قبول اسلام ہی کا ہے۔

معصوم لڑکی اس معاملے میں کسی کو راز دار بنا سکتی تھی، نہ کسی سے مشورہ لے سکتی تھیں۔آپ ہی آپ سوچتی، اندازے لگاتی اور خوش ہوتی۔اور عربی پڑھنے والی بات سے تو وہ اتنی خوش ہوئی تھی کہ اس نے چھوٹے ٹھاکر کی دید سے محرومی پر بھی صبر کر لیا تھا۔بڑے کام کے لئے بڑی قربانی بھی دینی پڑتی ہے۔یہ دید سے محرومی تو بہت چھوٹی بات تھی۔

لیکن ایک صبح اسے بڑا دھچکا لگا۔اس نے دیکھا کہ وصال دین اکیلا اسکول جا رہا ہے۔وہ پریشان ہوگئی۔کہیں چھوٹے ٹھاکر کی طبیعت تو خراب نہیں ہوگئی؟ وہ بے چین رہی۔مگر چھٹی کے وقت وہ دروازے پر پہنچ گئی۔وصال دین اسکول سے اکیلا ہی واپس آیا تھا۔

اس معمول کو ایک ہفتہ ہوگیا۔حور بانو کی پریشانی کی کوئی حد نہیں تھا۔اسے یقین ہوگیا کہ چھوٹا ٹھاکر زیادہ ہی بیمار ہے۔لیکن اوپر بظاہر سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔کافی دنوں سے رنجنا بھی نیچے نہیں آئی تھی۔

وہ پہلا موقع تھا کہ حور بانو نے ایک ہفتے تک چھوٹے ٹھاکر کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی۔اس شام وہ پڑھائی کے دوران پانی پینے کے بہانے سے اٹھی اور برآمدے میں چلی آئی۔اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔اوپر کوٹھے پر چھوٹا ٹھاکر اپنے مولوی صاحب سے عربی پڑھ رہا تھا۔

حور بانو کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہاں سے ہٹے۔لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو شبہ ہو۔چنانچہ وہ پانی پی کر واپس چلی آئی۔اسے یہ اطمینان تو ہوگیا کہ چھوٹا ٹھاکر بیمار نہیں ہے۔لیکن یہ الجھن برقرار رہی کہ وہ اسکول کیوں نہیں جا رہا ہے۔

اس روز رنجنا نیچے آئی تو حور بانو ہر احتیاط بھول بیٹھی۔''اتنے دن بعد آئی ہو؟ کیا بات ہے؟''۔اس نے رنجنا سے پوچھا۔

''بس موقع ہی نہیں ملا''۔

''سب خیریت ہے نا؟'' حور بانو نے بے تابی سے پوچھا۔

''ہاں.....سب ٹھیک ہے''۔

اس سے زیادہ پوچھنے کا موقع نہیں تھا۔رنجنا بیٹھ کر اماں سے بات کرتی رہی۔اور حور بانو بے تاب سی ادھر سے ادھر پھرتی رہی۔

رنجنا جانے لگی تو حور بانو اس کے پیچھے برآمدے تک چلی آئی۔''رنجنا.....تمہارے چھوٹے ٹھاکر نے پڑھنا چھوڑ دیا ہے کیا؟''اس نے بے حد سرسری انداز میں پوچھا۔لیکن اسے احساس تھا کہ بات سرسری نہیں ہے۔

رنجنا بہت بری طرح چونکی۔پھر بولی''لو.....انہیں تو پڑھنے کے سوا کچھ کام ہی نہیں ہے۔ہر وقت پڑھتے ہی رہتے ہیں''۔

''تو گھر پر ہی پڑھتے ہیں؟ اسکول چھوڑ دیا کیا؟''۔

''نہیں تو۔روز جاتے ہیں''۔رنجنا نے کہا۔پھر بہت غور سے اسے دیکھا۔''پر تم نے یہ کیسے سوچ لیا؟''

حور بانو چور سی ہوگئی۔مگر اب پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتی تھی۔''آکا میاں کہہ رہے تھے کہ اب وصال دین اسکول اکیلا جاتا ہے''۔

''ارے ہاں.....وہ چھوٹے ٹھاکر تو پاس ہوگئے ہیں نا''۔اچانک رنجنا کو خیال آیا۔''اب وہ اسکول نہیں.....وہ کیا کہتے ہیں.....ماسٹر جی بتا رہے تھے.....ہاں کالج! اب چھوٹے ٹھاکر کالج جاتے ہیں''۔

''یہ کالج کیا ہوتا ہے؟'' حور بانو نے مزید ٹٹولا۔

''ماسٹر جی کہہ رہے تھے، بڑا اسکول ہوتا ہے.....بہت بڑا''۔رنجنا نے دونوں ہاتھ آخری حد تک پھیلاتے ہوئے بتایا۔''اور ماسٹر جی یہ بھی بتا رہے تھے کہ وہاں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتے ہیں''۔

''ہائے اللہ''۔حور بانو نے بے ساختہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا''ہم تو آکا میاں کے سوا کبھی کسی کے سامنے نہیں آئے''۔

''وہاں تو انگریز لڑکیاں بھی ہوتی ہیں۔پر میری سمجھ میں نہیں آتا۔صبح چھوٹے ٹھاکر ذرا دیر سے جاتے ہیں اور واپسی کا کچھ پتا نہیں۔کبھی جلدی بھی آجاتے ہیں۔لیکن زیادہ تر دیر ہی ہوتی ہے۔کبھی تو شام بھی ہو جاتی ہے۔پھر واپس آکر پڑھتے ہی رہتے ہیں۔سوکھ کے کانٹا ہوگئے ہمارے چھوٹے ٹھاکر۔ارے میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنا پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔اپنی زمین داری ہی سنبھالنی ہی نا انہیں۔اچھا.....اب میں چلتی ہوں''۔

رنجنا چلی گئی۔حور بانو دیر تک بت بنی وہیں کھڑی رہی۔ایک مسئلہ تو حل ہوگیا تھا۔یعنی اب وہ چھوٹے ٹھاکر کو جاتے آتے دیکھنے کی کوشش تو کر سکتی تھی۔لیکن دوسری پریشانی لاحق ہوگئی۔کالج میں لڑکے لڑکیاں ساتھ پڑھتے تھے!

یہ بات اس کے دل کا بوجھ بن گئی۔اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ اس بوجھ کو کسی دوسرے کے سامنے ہلکا کیسے کرے خود ہی سوچتے رہنے سے الجھن اور بڑھ جاتی ہے۔

اگلے روز اسے موقع مل گیا۔استانی جی پردے کی اہمیت کے متعلق ایک حدیث شریف پڑھا رہی تھیں''مگر استانی جی، میں نے تو سنا ہے کہ کالج میں لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ پڑھتے ہیں''۔اس نے بات نکالی۔

''ہاں، یہ انگریزوں کی لائی ہوئی لعنت ہے''۔استانی نے تلخ لہجے میں کہا۔''اب ہندوؤں کے ہاں پردہ تو ہے نہیں۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

وہ بھی آنکھیں بند کر کے انگریزوں کے پیچھے چل پڑے ہیں۔ یہ تو بے حیائی ہے۔ میں نے تو سنا ہے کہ کالج میں لڑکیاں سرخی پوڈر لگا کر جاتی ہیں۔ بے حیائی کے کپڑے پہنتی ہیں۔ اور لڑکوں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر گھومتی ہیں''۔ استانی جی نے تو گویا آگ پر تیل کا چھڑکاؤ کر دیا۔

''کچھ موئے مسلمان ہیں جو انگریزوں کے ٹوڈی بنے پھرتے ہیں''۔ استانی جی بھنا کر بولیں۔''ان کی اولادیں ہی ایسے کالجوں میں پڑھتی ہوں گی۔ وہ کم بخت اپنی پہچان ہی کھو بیٹھے۔ بس کلمہ پڑھنے کے مسلمان رہ گئے ہیں وہ''۔

''پھر بھی استانی جی، ہیں تو وہ مسلمان ہیں''۔

''ہاں، یہ تو ہے''۔ استانی جی نے سرد آہ بھر کر کہا۔ پھر ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔''صحبت کا اثر تو ہوتا ہے۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ اسی لئے تو مسلمان پاکستان بنا رہے ہیں۔ تاکہ وہاں پوری آزادی سے اپنے طریقے کی زندگی گزار سکیں۔ کسی کی نقالی نہ کریں۔ اچھے مسلمان بن کر رہیں''۔

استانی جی سے بات کر کے حور بانو اور پریشان ہوگئی۔ یہ کالج اس کے لئے تو سوہان روح بن گیا۔

اگلی صبح وہ وصال دین کے جانے کے بعد دروازے پر منڈلاتی رہی۔ بالآخر اس نے چھوٹے ٹھاکر کو جاتے دیکھ لیا۔ وہ انگریزی کی طرح کا سوٹ پہنچے ہوئے تھا اور بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر یہ احساس بھی ہوا کہ وہ اور بڑا ہو گیا ہے۔

چند روز میں یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اسے کالج سے آتے دیکھنا بہت مشکل ہے۔ اس کی واپسی کا کوئی وقت ہی نہیں تھا۔

اب رات کے وقت حور بانو سونے کے لئے لیٹتی تو تصور میں اسے کالج نظر آتا۔ حالانکہ کالج اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کالج میں بس وہ ایک ہی منظر دیکھتی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہاں چھوٹے ٹھاکر کے سوا کوئی لڑکا نہیں ہے اور وہ اسے بھانت بھانت کی لڑکیوں میں گھرا نظر آتا۔ لڑکیاں جو عجیب و غریب لباس پہنے ہوتیں اور چھوٹے ٹھاکر کا ہاتھ تھامے کی کوشش کرتیں۔ وہ بے چارہ انہیں جھٹکتا رہتا۔

لیکن تصور سے ہٹ کر جب وہ سوچتی تو خوف زدہ ہو جاتی۔ وہ سوچتی کہ چھوٹا ٹھاکر کتنا ہی اچھا ہی سہی، ہے تو انسان۔ کب تک ان لڑکیوں سے بچے گا۔ جبکہ وہ لڑکیاں تو ہیں ہی بے حیا۔ اور چھوٹا ٹھاکر لاکھوں میں ایک ہے۔ کوئی نہ کوئی لڑکی اسے لبھا ہی لے گی، اور پھر ہو سکتا ہے وہ خود بھی ایک کو چھوڑ کر دوسری اور تیسری کے چکر میں پڑ جائے اور اسے بھول جائے۔ تو کیا وہ اتنی آسانی سے اسے کھو بیٹھے گی۔

اس آخری بات پر اسے خود بھی ہنسی آ گئی۔ لو سوت نہ کپاس اور جلاہے سے لٹھم لٹھا۔ اسے بھولنے کا کیا سوال، جبکہ اسے تو معلوم ہی نہیں کہ کہیں حور بانو بھی ہے جو اس سے محبت کرتی ہے۔ اس نے تو اس کی جھلک بھی کبھی نہیں دیکھی۔ وہ تو اسے جانتا بھی نہیں۔ اور کھونے کا کیا سوال، جبکہ وہ اس کا ہے ہی نہیں۔ اس مقابلے میں وہ تو کہیں ہے ہی نہیں۔

اس سوچ کے بعد بس وہ اس فکر میں لگ گئی کہ کسی طرح چھوٹے ٹھاکر کے سامنے آ جائے..... وہ اسے دیکھ لے۔ تب شاید وہ ان بے حیا لڑکیوں سے محفوظ رہ سکے۔

براہ راست چھوٹے ٹھاکر کے سامنے جانے کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ہاں وہ چلمن کے پیچھے سے یا جالیوں کے عقب سے اسے اپنی جھلک دکھا سکتی تھی۔ سو اس نے اس کا اہتمام کر لیا۔

اس روز اس نے اپنا سرخ کامدانی کا جوڑا پہنا۔ چھوٹا ٹھاکر دو بجے سے پہلے کبھی کالج سے نہیں آتا تھا۔ چنانچہ وہ دو بجے تیار ہو کر ڈیوڑھی میں آ گئی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اسے کتنا انتظار کرنا ہوگا۔ وہ تمام وقت کیا، زیادہ دیر بھی ڈیوڑھی میں کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ چنانچہ وہ بمشکل پانچ منٹ کھڑی ہوتی اور پھر ہٹ جاتی۔ پھر پانچ منٹ بعد وہ ڈیوڑھی میں چلی جاتی۔ اور اس دوران اسے یہ الجھن ستاتی کہ شاید چھوٹا ٹھاکر آ کر اوپر جا بھی چکا ہے..... اس دوران جب وہ گھر میں تھی۔

خوش قسمتی سے چھوٹا ٹھاکر اس روز کالج سے جلدی آ گیا۔ ورنہ حور بانو پر نہ جانے کی بیتتی۔ اور خوش قسمتی سے اس وقت وہ ڈیوڑھی میں آئی تھی..... یہی سوچتی ہوئی کہ شاید چھوٹا ٹھاکر اوپر جا چکا ہوگا۔

آتے ہوئے چھوٹے ٹھاکر کی پہلی جھلک دیکھی تو حور بانو کا دل سینے میں یوں دھڑ دھڑایا، جیسے پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ اور سانسیں اتنی تیز ہوئیں کہ ان کے شور سے اسے خود بھی گھبراہٹ ہونے لگی۔ اس کا جسم یوں سنسنا رہا تھا، جیسے رگ رگ میں کوئی برقی رو دوڑ رہی ہو۔ اس کے ہاتھ پاؤں کیا، پورا جسم کانپ رہا تھا۔

چھوٹے ٹھاکر کو آتے جاتے اس نے بارہا دیکھا تھا۔ مگر اس کا یہ حال پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ آج جو کرنے کا اس نے ارادہ کیا تھا، وہ پہلے کبھی سوچا تک نہیں تھا۔ آج وہ چاہتی تھی کہ چھوٹا ٹھاکر اسے دیکھے۔ وہ اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی تھی۔

مگر اب موقع ملا تو وہ پریشان کھڑی تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے! ایسا کیا کرے وہ؟ کیسے کرے؟ اسکے ہاتھ پاؤں جواب دینے لگے۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے چلمن کی طرف بڑھی۔ لیکن ٹانگوں کی لرزش اتنی بڑھ گئی کہ اسے لگتا تھا، وہ گر جائے گی۔

اور وہ صرف چند لمحوں کا کھیل تھا۔ اس موقع کی طوالت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اور اختصار ایسا تھا کہ مشکل سے چار بار پلکیں جھپکی جا سکتی تھیں۔

(جاری ہے)

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

لچھوٹا ٹھاکر دور سے آتا دکھائی دے رہا تھا اور وہ بید مجنون کی طرح لرزاں تھی۔اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔وہ قریب تر ہوتا جا رہا تھا اور اب ایک پل کی بات تھی۔پل گزرتا اور وہ آگے نکل جاتا۔

حور بانو سوچ رہی تھی کہ کیا کرے۔وہ گنگ تھی۔ہونٹ سوکھ گئے تھے۔اس نے آواز نکالنے کی کوشش کی۔مگر آواز ندارد تھی۔اور وہ پل نکلنے ہی والا تھا۔

اس نے پھر بولنے کی کوشش کی۔اور اسے پھندا لگ گیا!

چھوٹے ٹھاکر نے آواز سن کر نظر اٹھائی۔لیکن پوری طرح اٹھنے سے پہلے ہی اس کی نظر جھک گئی۔اور پھر وہ آگے نکل گیا۔

حور بانو کی مایوسی کی کوئی حد نہیں تھی۔اس نے دیکھ لیا تھا کہ چھوٹے ٹھاکر کی نظر اضطراری طور پر اٹھ رہی تھی.....مگر درمیان میں ہی اس نے خود پر قابو پا لیا تھا اور نظر جھکا لی تھی۔معصوم لڑکی نہیں جانتی تھی کہ وہ نظر بھر کر دیکھ لیتا تو بھی اسے نہ دیکھ پاتا۔باہر دھوپ تھی اور اندر اندھیرا۔پھر درمیان میں چلمن،ایسے میں چھوٹے ٹھاکر کو متحرک سرخ رنگ کے سوا کیا نظر آ سکتا تھا۔

اس رات وہ بستر پر لیٹی یہی کچھ سوچتی رہی۔وہ منظر اس کے تصور میں بار بار آتا.....چھوٹے ٹھاکر کا اضطراری طور پر نظر اٹھانا.....اور فوراً ٹھٹھک کر نظر جھکا لینا۔اچانک اس کے ذہن میں روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ارے..... یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں۔یہ تو چھوٹے ٹھاکر کی شرافت کا ثبوت ہے۔وہ تو نگاہ سنبھالنے والا آدمی ہے۔اس رویے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کالج میں وہ کس طرح رہتا ہوگا۔حور بانو کے دل کو ایک اطمینان سا ہو گیا۔

لیکن محبت میں خطرے کا احساس بہت توانا ہوتا ہے۔اس کا سکون محض وقتی تھا۔بعد میں اس نے مختلف انداز میں سوچا تو بے سکون ہو گئی۔وہ تو چلمن کے پیچھے تھی۔چھوٹے ٹھاکر نے اٹھتی نظر پر قابو پا لیا۔لیکن کالج میں تو بے حجاب لڑکیاں دھڑ سے اس کے سامنے آ جاتی ہوں گی۔تب تو نظر جھکتے جھکتے بھی پڑ ہی جاتی ہوگی۔اور پھر یہ معمول ہو تو کیا کوئی ہر وقت.....بار بار نظریں جھکا تا رہے گا۔نہیں.....یہ تو ممکن نہیں۔

کچھ بھی ہو،حور بانو نے یہ تسلیم کر لیا کہ اس کے پاس اس کا کوئی توڑ نہیں۔وہ کچھ بھی کر لے،کبھی چھوٹے ٹھاکر کے سامنے نہیں آ سکے گی۔اور اسے ایک اور خیال آیا۔اس نے وجود کی پوری سچائی کے ساتھ اس پر سوچا۔یہ حقیقت تھی.....بہت بڑی سچائی تھی کہ اس محبت میں اس کا کوئی اختیار نہیں تھا،یہ اس نے کی نہیں تھی،اسے خود بہ خود ہوئی تھی۔اس میں اس کے ارادے کا کوئی دخل نہیں تھا۔تو یہ محبت اللہ نے اسکے دل میں ڈالی تھی۔تب اسے یہ سوچ کر شرمندگی ہوئی کہ چھوٹے ٹھاکر کے سامنے کی،خود کو دکھانے کی کوشش اس کی اپنی تھی اور بالارادہ تھی۔یہی نہیں،اس کا ارادہ اور اس کی کوشش اللہ کے حکم سے متصادم تھی۔اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔اور وہ خود کو چھوٹے ٹھاکر کو دکھا دے،تب بھی اس بات کی ضمانت نہیں کہ چھوٹا ٹھاکر کالج میں بے پردہ

لڑکیوں کے شر سے محفوظ رہے گا۔یہ ضمانت تو وہی دے سکتا ہے،جس نے اس کے دل میں چھوٹے ٹھاکر کی محبت ڈالی ہے۔وہ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتی۔

اس سوچ کے بعد بس یہ ہوا کہ وہ کئی دن تک اللہ سے توبہ کرتی رہی۔پھر اس کے دل کو سکون ہو گیا۔جس نے اس کے دل میں وہ محبت ڈالی ہے،وہی جانے۔وہی فیصلہ کرنے والا ہے۔اب اسے کچھ نہیں کرنا۔جو ہو سو ہو۔

.....✖.....

پارٹی میں شریک ہونے کے لئے وہ سبھی ٹھیک وقت پر پہنچے۔سب سے پہلے آنے والا محمود تھا اور امرتا سب سے آخر میں آئی تھی۔اوتار سنگھ سب سے زیادہ پر اعتماد تھا۔ورنہ اس کے علاوہ سبھی کا یہ خیال تھا کہ وہاں بہت سے انگریز مہمان ہوں گے۔بلکہ وہ تو ریٹا اور رچرڈ کے والدین کا سامنا کرتے ہوئے بھی احساس کمتری میں مبتلا ہو رہے تھے۔جبکہ اوتار سنگھ کو اس سے غرض نہیں تھی کہ وہاں کون کون ہوگا۔

لیکن وہاں پہنچ کر ان سب کے دل خوش ہو گئے۔اس پارٹی میں سوائے ان لوگوں کے کوئی اور شریک نہیں ہو رہا تھا۔رچرڈ کے ممی اور ڈیڈی بھی گھر میں موجود نہیں تھے۔وہاں نوکروں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ان سب کی جھجھک دور ہو گئی۔وہ پرسکون اور خوش نظر آنے لگے۔

پھر بھی ایک پھانس دلوں میں چبھ رہی تھی۔مسٹر اور مسز پارسن نجانے کب آ جائیں۔اوتار سنگھ ان سب کی اس کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔وہ ان کے اندر چھپے احساس کمتری سے تو پہلے ہی واقف تھا۔اور وہ اس پر غور کرتا رہتا تھا۔

پھر وہ پھانس بھی نکل گئی!

''تمہارے ممی ڈیڈی کہاں گئے ہیں؟''امرتا نے ریٹا سے پوچھا۔

''کلب گئے ہیں''۔ریٹا نے جواب دیا۔

''واپس کب آئیں گے؟''نادرہ نے سوال اٹھایا۔

''آج سیٹرڈے نائٹ ہے''۔ریٹا مسکرائی''آدھی رات کے بعد ہی واپسی ہوگی''۔

اجتماعی طور پر سکون کی سانس لی گئی۔

''تو کیک کاٹنے کیلئے تم ان کا انتظار کرو گی؟''فتح سنگھ نے پوچھا۔

''ارے نہیں یوسلی''۔ریٹا نے آنکھیں نکالیں''میں نے انہیں بتا دیا تھا یہ ایک پرائیوٹ پارٹی ہوگی۔صرف ہمارے منتخب دوست اس میں شریک ہوں گے۔اور کیک تو ابھی ذرا دیر میں کاٹا جائے گا''۔

اس کے بعد ماحول ہلکا پھلکا ہو گیا۔سب کے سب بے حد خوش مزاج ہو گئے۔کالج کی،پڑھائی کی،کالج کے ساتھیوں کی باتیں ہونے لگیں۔تھوڑی دیر بعد بٹلر کیک لے آیا۔پارٹی کی فضا بن گئی۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

کیک کے گرد سولہ موم بتیاں روشن کر دی گئیں۔

ریٹا نے کیک کاٹا۔ سب نے اسے مبارک باد دی اور تحفے پیش کیے۔ کیک کاٹنے اور اس سے نمٹنے کے بعد تحفے کھولنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ ایک دوسرے کے تحفوں پر فقرے چست کیے گئے۔

''ارے واہ.....رامو نے تاج محل کا ماڈل دیا ہے''۔ نادرہ بولی۔

رام گوپال کا چہرہ تمتما اٹھا۔

''اوہ.....اٹس بیوٹی فل''۔ ریٹا نے مسحور ہو کر کہا۔

''اینڈ اٹ اس سمبل آف لوؤ''۔ امرتا نے وضاحت کی۔

رام گوپال بری طرح کھسیا رہا تھا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا دوں''۔ وہ بولا ''اور یہ مجھے بہت خوب صورت لگا''۔

''ایسے صفائی کیوں پیش کر رہے ہو، جیسے تم نے کوئی جرم کیا ہے''۔ محمود نے کہا۔

''مجھے تو یہ بہت اچھا لگا ہے''۔ ریٹا بولی۔

رام گوپال کے چہرے پر رنگ دوڑ گیا۔ تحفہ کھلنے کے بعد پہلی بار اس نے سکون کی سانس لی تھی۔

اس کے بعد پارٹی اگلے دور میں شامل ہو گئی۔ بٹلر میں برف میں لگی شمپین کی بوتلیں اور جام لا کر میز پر رکھ دیئے اور باہر چلا گیا۔

تب رچرڈ ہونٹوں پر مسکراہٹ اور ہاتھ میں شمپین کی بوتل لئے کھڑا ہوا اور اعلان کرنے والے انداز میں بولا ''لیڈیز اینڈ جنٹلمین'' آج کی یہ خوب صورت شام، میری سوئیٹ بہن ریٹا کے نام اور اس شام کا آغاز ہم شمپین کی بوتل سے کریں گے۔ کہتے ہیں کہ شمپین کی بند بوتل جوانی کے جوش کی نمائندگی کرتی ہے، جیسے جوان آدمی زندگی کے جوش کو دبائے بیٹھا ہوتا ہے، ویسے ہی کارک ہونے تک شمپین کی بوتل بھی اپنا ابال چھپائے رہتی ہے اور کارک ہٹتے ہی.....'' اس نے بوتل کا کارک کھول دیا۔ شراب یوں اچھل کر، مچل کر نکلی، جیسے اس کا ضبط جواب دے گیا ہو۔ وہ سب تالیاں بجانے لگے۔ وہ منظر انہیں خوب صورت لگا تھا۔

رچرڈ جام بھرنے میں مصروف ہو گیا۔ پھر اس نے پہلا جام ریٹا کو پیش کیا ''ناؤ لم آن، ایوری باڈی'' اس نے دعوت دی۔

جام اٹھانے کے لئے بڑھنے والوں میں نادرہ، محمود اور اوتار سنگھ نہیں تھے۔ پشپا، امرتا، رام گوپال اور فتح سنگھ نے جام اٹھا لئے۔

رچرڈ کی نظروں میں الجھن تھی ''کیا ہوا؟ تم لوگ شامل نہیں ہو گے؟'' اس نے پوچھا۔

''جانتے ہو رچرڈ، ہم شراب نہیں پیتے''۔ محمود نے کہا۔

''اور تم اوتار سنگھ؟ تمہارا مذہب تو تمہیں منع نہیں کرتا''۔ رچرڈ نے اوتار سنگھ کو دیکھا۔ ''ہاں۔ مگر مجھے یاد ہے۔ پتا جی نے ایک بار مجھے سمجھایا تھا اور میں کبھی نہیں بھولا''۔ اوتار سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا ''پتا جی کہتے ہیں، دنیا میں سب سے قیمتی چیز آدمی کی عزت ہوتی ہے اور انہوں نے کہا تھا، آدمی نشے میں ہوش و حواس گنوا بیٹھتا ہے۔ نہ اسے اپنی عزت کا خیال رہتا ہے، نہ بے عزتی کا پتا چلتا ہے۔ اسی طرح اسے دوسروں کی عزت کی بھی پروا نہیں ہوتی۔ بس اسی لئے پتا جی نے کبھی شراب نہیں پی اور میں بھی کبھی نہیں پیوں گا''

اس دوران سب اسے غور سے دیکھتے رہے تھے۔ سب کے تاثرات مختلف تھے۔ پشپا، امرتا، رام گوپال اور فتح سنگھ کی نگاہوں میں استہزا تھا۔ نادرہ اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ محمود کی نگاہوں میں اس کے لئے عزت تھی۔ ریٹا سحر زدہ سی نظر آ رہی تھی اور اس کی نگاہوں میں دلچسپی تھی۔ رچرڈ کا انداز ایسا تھا، جیسے اسے یقین نہیں آ رہا ہو۔ ''ربش.....بکواس'' رام گوپال بڑبڑایا۔

''یہ تو امرت رس ہے ٹھاکر جی۔'' فتح سنگھ نے چٹخارا لیتے ہوئے کہا۔

لڑکیوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ بہر حال وہ سب اپنے اپنے جام ہاتھ میں لئے کھڑے تھے۔

رچرڈ نے ابھی تک جام نہیں اٹھایا تھا۔ ''بہر حال یہ تو مہمان نوازی کے اصول کے خلاف ہو گا کہ ہم پیئں اور تم دیکھتے رہو'' رچرڈ نے کہا۔

''تو ہم باہر چلے جاتے ہیں۔'' نادرہ بولی۔

''ارے نہیں، تم غلط سمجھ رہی ہو۔'' رچرڈ بے ساختہ مسکرایا ''میرا مطلب ہے، تم لوگوں کو تمہارے ذوق کے مطابق کچھ ملنا چاہئے۔'' یہ کہہ کر اس نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ چند لمحوں کے بعد بٹلر اندر آیا ''کیا حکم ہے ساب؟''

''اورنج جوس لے کر آؤ.....بڑے جگ میں۔''

اورنج جوس آیا تو رچرڈ نے ان تینوں کے لئے گلاسوں میں جوس انڈیلا اور انہیں دیا ''تھینک یور چرڈ'' نادرہ نے کہا۔

اب رچرڈ نے اپنے لئے جام اٹھایا اور اسے فضا میں بلند کیا ''لیٹ اس ٹوسٹ ناؤ.....ریٹا کی صحت اور خوشیوں کے نام۔''

سب نے گھونٹ لئے اور پارٹی شروع ہو گئی۔ جوس والے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہے تھے جبکہ شراب والے کھل کر پی رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب تیسرے جام پر پہنچ گئے۔ چہرے تمتمانے لگے۔ آوازیں لڑکھڑانے لگیں۔

''اب یہ دیکھو رچرڈ.....'' رام گوپال نے کہا ''یہ میرا بے وقوف دوست ملک کا بٹوارا اس لئے چاہتا ہے تا کہ یہ آزادی کے ساتھ شراب نہ پیئے۔'' اس کا اشارہ محمود کی طرف تھا ''اب بتاؤ، کیا ہم نے اس کے ساتھ زبردستی کی؟ بھئی نہیں پیتا تو نہ پیئے۔ کوئی پابندی نہیں ہے۔ اتنی سی بات کے لئے ملک کا بٹوارا.....یہ تو کوئی بات نہیں۔''

اس نے بات اس انداز میں کی تھی کہ سب ہنسنے لگے۔ لیکن محمود سنجیدہ تھا ''تم غلط سمجھے ہو رام۔ ہم پاکستان اس لئے بنا رہے ہیں کہ وہاں اسلامی قانون ہو۔ نہ کوئی شراب پیئے، نہ کسی دوسرے کو شراب کی ترغیب دے۔ ہم اس لئے پاکستان بنا رہے ہیں۔ تا کہ تم ہندوستان میں آزادی سے شراب پیو اور ہم پاکستان میں شراب نہ پیئیں۔''

''شراب پینے والے تو پھر بھی پیئیں گے.....دیکھ لینا، پاکستان میں بھی پیئیں گے۔'' فتح سنگھ نے انگلی نچاتے ہوئے کہا۔ اس کے انداز میں چیلنج تھا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

لیکن رام گوپال نے جیسے محمود کی بات سنی ہی نہیں ''اب ہمارے ہندو بھائی اوتار سنگھ کو ہی دیکھ لو۔'' وہ بولا ''اسے تو دھرم منع نہیں کرتا۔ مگر اس کے پتا جی منع کرتے ہیں۔ یہ نہیں پی رہا ہے۔ تو کیا ہم نے اسے مجبور کیا؟ نہیں کیا؟ اور کیا ہم نے کسی کی بے عزتی کی یا اپنی عزت کا خیال نہیں رکھا؟ نہیں ایسا کچھ بھی نہیں کیا ہم نے۔ اس لئے کہ اب ہمارا ہندوستان سیکولر ہوگا اور یہاں جمہوریت ہوگی۔''

اوتار سنگھ مسکراتا رہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ''تم خاموش ہو اوتار سنگھ۔ کچھ بولتے کیوں نہیں۔'' فتح سنگھ نے اسے اکسایا۔

''میں وقت آنے پر بولوں گا۔'' اوتار سنگھ نے نرم لہجے میں کہا ''اور مجھے لگتا ہے کہ آج میرے پتا جی کی بات درست ثابت ہو جائے گی۔''

''اب یہ سوچو دوست کہ میرا دھرم مجھے شراب پینے سے نہیں روکتا۔'' رام گوپال رچرڈ سے مخاطب تھا ''اور تمہارا دھرم بھی تمہیں نہیں روکتا۔ مگر محمود کا دھرم کچھ عجیب ہے..... ہے نا۔ زندگی کو انجوائے کرنے سے روکتا ہے۔''

محمود نے کچھ کہا نہیں۔ لیکن رچرڈ پارسن کو ایسی چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا کہ وہ شرمندہ ہو کر رہ گیا ''نہیں رامو، تمہارا خیال غلط ہے۔'' رچرڈ نے نظریں جھکاتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا ''شراب کی ممانعت تو ہمارے مذہب میں بھی ہے۔''

رام گوپال چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر شریر سی مسکراہٹ نظر آئی ''تو یہ ثابت ہو گیا کہ ہمارا دھرم سب سے بہتر ہے۔'' اس نے کہا۔

اس کا لہجہ ایسا تھا کہ رچرڈ کا چہرہ تمتمانے لگا۔ اس نے محمود کو دیکھا۔ وہ بڑی بے نیازی سے مسکرا رہا تھا۔ اس کے انداز میں بے پروائی اور درگزر تھا۔

اوتار سنگھ اپنی جگہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ آج اسے بہت کچھ معلوم ہو جائے گا۔ اسے کئی مذاہب کے بارے میں قیمتی معلومات حاصل ہوں گی۔ یہ موقع اس کے لئے خوش آئند تھا۔

رام گوپال نے بڑھ کر اپنے لئے ایک اور جام بنایا۔ ''تو آپ سب نے میری بات کی سچائی کو تسلیم کر لیا۔'' اس نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

رچرڈ نے محمود کی طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھا۔ محمود نے کندھے جھٹک دیئے۔ ''میرا مذہب مجھے دوسروں کے مذہب پر تنقید کرنے سے بھی روکتا ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں میزبان ہونے کے خیال سے خاموش تھا۔'' رچرڈ رام گوپال کی طرف متوجہ ہوا ''لیکن اب بولنے پر مجبور ہوں۔ ورنہ تمہارا بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔ یہ مجھے گوارا نہیں۔''

''کیا مطلب؟ کس نقصان کی بات کر رہے ہو تم؟''

''تم اپنے دھرم کے بارے میں بہت بڑی غلط فہمی کا شکار ہو جاؤ گے۔'' رچرڈ نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ''تم جسے بڑے فخر سے اپنا دھرم کہتے ہو، وہ ہمیں عجیب و غریب اور ناقابل فہم لگتا ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ اسے حماقتوں کا مجموعہ کہنا چاہئے۔ اس بیسویں صدی میں جبکہ دنیا ترقی کر رہی ہے، تم لوگ اپنی دیومالا میں الجھے ہوئے ہو۔ جہالت پر فخر کرتے ہو تم لوگ.....''

''پلیز رچرڈ..... اوتار سنگھ کا اور دوسروں کا تو خیال کرو۔'' ریٹا نے بھائی کو ٹوکا۔ وہ اوتار سنگھ کو معذرت طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ''نو..... ایس آل رائٹ۔ آئی ڈونٹ مائنڈ۔ بلکہ مجھے اچھا لگ رہا ہے۔'' اوتار سنگھ نے جلدی سے کہا ''علمی تبادلۂ خیال بہت فائدہ مند ہوتا ہے اس سے نالج بڑھتی ہے۔ رچرڈ پلیز۔ اپنی بات جاری رکھو۔''

رام گوپال سناٹے کی کیفیت میں تھا۔ اس کا نشہ کچھ کم ہو گیا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ نشے میں اس سے بہت بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ اس نے آقاؤں کو چھیڑ دیا تھا۔

''تھینک یو اوتار سنگھ۔ بے شک یہ علمی تبادلۂ خیال ہے۔'' رچرڈ نے کہا۔ پھر وہ رام گوپال کی طرف مڑا ''رامو..... تم اپنے دیوی دیوتاؤں کی درست تعداد بتا سکتے ہو؟''

رام گوپال منہ کھولے کھڑا تھا۔ اسے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ وہ تو محمود کو نیچا دکھانا چاہتا تھا۔ لیکن رچرڈ سے الجھ بیٹھا تھا۔

''نہیں معلوم..... تمہیں بھی نہیں معلوم۔ میرا خیال ہے، ان کی تعداد ہزاروں میں تو ہوگی۔ بلکہ شاید لاکھ سے اوپر ہو۔ تو تمہارے دھرم میں کوئی اپنے دھرم پر پورا اتر ہی نہیں سکتا۔ تمام دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرنا تو دور کی بات ہے، کسی کو سب کے نام بھی معلوم نہیں ہوں گے۔ ہر جانور کو ہر چیز کو تو تم نے دیوتا بنا رکھا ہے۔ گائے، بندر، ہاتھی، سورج، چاند، درخت اور نجانے کیا کیا۔ اگر تم اپنے تمام دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرنے لگو تو زندگی میں پوجا کے سوا کچھ کر ہی نہ سکو۔ گندگی اور غلاظت کا یہ عالم ہے کہ گائے کے گوبر اور پیشاب کو تم مقدس کہتے ہو۔ میں نے تو سنا ہے کہ پی بھی لیتے ہو۔ شراب کی کیا بات کرتے ہو اور جہالت کا یہ عالم ہے کہ بیواؤں کو ان کے شوہر کی لاش کے ساتھ زندہ جلا دیتے ہو۔ علم کے فروغ کی اس صدی میں تم اس جہالت کو دھرم کہتے ہو۔ اس دور میں بھی تم لوگ زندہ انسانوں کو دیوی دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھا دیتے ہو۔ تم غار کے زمانے کے انسان کی طرح جی رہے ہو اور تمہیں درست اور غلط کا احساس بھی نہیں۔''

رچرڈ خاموش ہو گیا۔ دیر تک خاموشی رہی۔ کوئی کچھ نہیں بولا۔ اوتار سنگھ سوچ رہا تھا۔ جو کچھ رچرڈ نے کہا تھا، وہی سب کچھ وہ سوچتا رہا تھا۔ اب رچرڈ نے کہہ دیا تھا اور کسی کے پاس اس کا جواب نہیں تھا۔

اور یہاں اس کے سامنے دو مذاہب آئے تھے..... دو مختلف طرز عمل۔ رچرڈ کرسچن تھا۔ اس نے اعتراف کیا کہ اس کا مذہب شراب کو ممنوع قرار دیتا ہے لیکن وہ شراب پیتا ہے۔ دوسری طرف محمود تھا..... مسلمان۔ اس کا مذہب بھی شراب کو منع کرتا ہے اور وہ اس کی پابندی بھی کرتا ہے اور اس نے کہا کہ اس کا مذہب اسے دوسروں کے مذہب پر تنقید سے روکتا ہے۔ یہ ہوئی رواداری اور اس کے نتیجے میں انسان تحمل سیکھتا ہے۔

اس لمحے اوتار سنگھ اپنے دھرم سے پوری طرح بیزار ہو گیا۔ لیکن اب اسے دوسرے مذاہب کو سمجھنا تھا۔

''یہ کیا باتیں لے بیٹھے تم لوگ۔'' اچانک ریٹا نے خاموشی کو توڑا ''تمہیں یہ احساس بھی نہیں کہ یہ میری برتھ ڈے پارٹی ہے۔''

''سوری ریٹا۔'' رام گوپال نے جلدی سے کہا۔

''کسی کی دل آزاری ہوئی ہو تو میں اس کے لئے معافی چاہتا ہوں۔'' رچرڈ نے نرم لہجے میں کہا ''لیکن یہ سچ ہے کہ کسی پر اٹیک کرنا بہت آسان ہوتا ہے اور مشتعل ہونے کے بعد تحمل برقرار رکھنا بہت مشکل۔ بہرحال جو ہوا اسے بھول جائیں۔ آفٹر آل، ہم سب دوست ہیں۔ چلیں..... اب پارٹی شروع کرتے ہیں۔''

رچرڈ کونے میں رکھے گراموفون کی طرف گیا اور ایک ریکارڈ منتخب کر کے لگا دیا۔

کمرے میں مدھر موسیقی کی آواز بھر گئی۔ رچرڈ ریٹا کی طرف بڑھا اور ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا ''کم آن ڈیئر، لیٹ اس ڈانس۔''

وہ دونوں ناچنے لگے۔ باقی سب لوگ انہیں دیکھ رہے تھے۔ لیکن ان میں لڑکیاں نہیں تھی۔ وہ سب چوری چوری چپکے چپکے اوتار سنگھ کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کی آنکھ میں اس کی قربت کے خواب تھے۔

ریکارڈ ختم ہوا تو رچرڈ اور ریٹا الگ ہو گئے۔ رچرڈ ریکارڈ تبدیل کرنے کے لئے گراموفون کی طرف بڑھ گیا۔ ریٹا اوتار سنگھ کی طرف چلی آئی ''آؤ میرے ساتھ رقص کرو'' اس نے کہا۔

اوتار سنگھ گڑبڑا گیا ''لیکن مجھے تو رقص کرنا نہیں آتا۔''

''اوکم آن۔ کچھ ایسا مشکل بھی نہیں۔ میں سکھا دوں گی۔''

اس دوران دوسرا ریکارڈ بجنے لگا تھا۔ ریٹا اوتار سنگھ کا ہاتھ تھام کر کھلی جگہ کی طرف چل دی۔ دوسری طرف رچرڈ پشپا سے رقص کی درخواست کر رہا تھا۔ ''میں اور ریٹا آج تم سب کو ناچنا سکھا دیں گے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اب ایک کی جگہ دو جوڑے میدان میں تھے۔

ریٹا نے اوتار سنگھ کا ہاتھ پکڑ کر اپنی کمر پر رکھا ''دوسرا ہاتھ بھی لاؤ اور مجھے اس طرح تھام لو۔'' اس نے کہا۔ اوتار سنگھ نے جھجکتے جھجکتے اسکی ہدایت کی تعمیل کی۔ ریٹا نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ دیئے ''اب موو کرو..... ایسے۔'' اس نے اسٹیپ لیکر دکھائے۔

اوتار سنگھ کو چند لمحوں میں اندازہ ہو گیا کہ ڈانس کرنا کچھ مشکل نہیں ہے۔ یہ الگ بات کہ رقص کرنا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بس مروتاً ریٹا کا ساتھ دے رہا تھا۔ کیونکہ وہ اس کی خوشی خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

لیکن وہ لمحے بڑے بھرپور تھے۔ اس درجہ نسوانی قربت کا وہ تجربہ اس کے لئے نیا تھا۔ ذرا سی دیر میں وہ بے حد مختلف اور متضاد کیفیات سے گزر گیا۔ بنیادی طور پر بہرحال وہ 17 سال کا جوان لڑکا تھا۔ نسوانی لمس کا وہ پہلا تجربہ اپنی ابتدا میں اس کے لئے بے حد سنسنی خیز تھا۔ اس کا پورا وجود مرتعش ہو گیا تھا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

ریٹا بے حد حسین لڑکی تھی.....قد میں اس سے تھوڑی سی کم۔ان کے چہروں کے درمیان بہت تھوڑا فاصلہ تھا۔اور ریٹا اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

قربت کے ابتدائی لمحوں میں وہ مسحور ہوگیا۔اسے اچھا لگ رہا تھا۔لیکن پھر اچانک اس کی سماعت میں وہ نسوانی آواز گونجی،جس کی وجہ سے اس نے عربی پڑھنی شروع کی تھی۔وہ آواز، جسے سن کر اسے آواز والی سے محبت ہوگئی تھی۔اس پر اسے محبت کا خیال آیا۔محبت جس کی اسے کب سے جستجو تھی۔پھر اسے محبت کے بارے میں اپنے اسکول کے استاد کی گفتگو یاد آئی.....

وہ ابتدائی سحر ایک سے زیادہ مرحلوں میں ٹوٹا تھا۔سب سے پہلے تو اس لڑکی کی آواز نے اسے احساس دلایا۔اس کے باوجود وہ محبت ابھی تک ویسی ہی تازہ اور توانا ہے۔بلکہ سماعت میں وہ آواز ابھری تو اس کا دل ویسے ہی دھڑکا،جیسے اس آواز کو پہلی بار سن کر دھڑکا تھا۔اور قربت کا وہ سحر ٹوٹ گیا۔جس نے چند لمحوں میں اسے اسیر کرلیا تھا۔اور اچانک اسے ریٹا پارسن بری لگنے لگی۔اس کے لباس سے اسے کراہت آنے لگی۔

پھر اسے خوشی ہوئی کہ اس کی پہلی محبت سچی ثابت ہوئی ہے۔آزمائش کے ان لمحوں میں سرخروئی ہوئی ہے۔جسمانی قربت اپنی جگہ ایک بڑی سچائی سہی،لیکن وہ پاکیزہ آواز، جس کے الفاظ تک کو وہ نہیں سمجھ سکتا،مفہوم تک سے ناواقف ہے،آج بھی اتنی اثر انگیز ہے کہ اس سچائی کی بدصورتی کا احساس دلا سکتی ہے؟اسے رد اور بے معنی کرسکتی ہے۔اس کی محبت اردو کے استاد کی بیان کی تعریف پر پوری اتری تھی،وہ محبت ہی تھی،ہوس نہیں۔بلکہ اس نے تو ہوس کے امکان کو بھی باطل کردیا تھا۔

اس کے ہاتھ وہیں رہے،جہاں تھے۔لیکن اس کی نگاہوں کا تاثر بدل گیا۔ریٹا نے بھی وہ تبدیلی دیکھ لی۔لیکن وہ جس کیفیت میں تھی،اس میں اس تبدیلی کی معنویت کو وہ نہیں سمجھ سکی۔اسے تو آج پہلی بار اظہار محبت کا موقع ملا تھا۔وہ اسے گنوا نہیں سکتی تھی۔''کیوں اوتار سنگھ،تمہیں یہ اچانک کیا ہوگیا؟''۔اس نے سرگوشی میں اوتار سنگھ سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔مجھے کیا ہوگا''۔

''نہیں،تم اچانک دور سے ہوگئے''۔

''وہ.....یہ.....دراصل تمہارا لباس اچھا نہیں لگا مجھے''۔

''اوہ.....مجھے تمہاری یہ بات اچھی لگی۔آئندہ میں.....''۔ریٹا کچھ اور بھی کہتی۔مگر اسی لمحے ریکارڈ ختم ہوگیا۔اچانک خاموشی کی وجہ سے وہ کہتے کہتے رک گئی۔

اوتار سنگھ نے اپنے ہاتھ اس کی کمر سے ہٹا لئے۔لیکن ریٹا نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔''اتنی جلدی کیا ہے اوتار سنگھ۔آج میرا برتھ ڈے ہے۔ابھی تم میرے ساتھ رہو.....اور کچھ دیر''۔اس کے لہجے میں التجا تھی۔

اسی لمحے رام گوپال ان کی طرف چلا آیا۔''مے آئی ہیو دی آنر.....''۔

ریٹا نے اوتار سنگھ کے ہاتھ اور مضبوطی سے پکڑ لئے۔''یو ول ہیو ٹو ویٹ فور سم ٹائم''۔اس نے رام گوپال سے کہا''پلیز.....ڈونٹ مائنڈ''

رام گوپال کا چہرہ کھسیاہٹ سے سیاہ ہوگیا۔چند لمحے بعد وہ وہیں ساکت کھڑا رہا۔پھر پلٹ گیا۔

اسی وقت رچرڈ نے دوسرا ریکارڈ لگا دیا۔وہ بہت رومان انگیز سلو ٹیون تھی۔رچرڈ کے ساتھ اب امرتا تھی۔لیکن اس کی نظروں کا مرکز اوتار سنگھ اور ریٹا تھے۔دوسری طرف رام گوپال کے پاس بیٹھی ہوئی پشپا بھی انہی دونوں کو دیکھ رہی تھی۔

''ریٹا ٹھاکر جی کو چھوڑ ہی نہیں رہی ہے''۔اس نے سرسری انداز میں کہا۔

''وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں''۔رام گوپال بولا''تم یہ بتاؤ،تم کس میں انٹرسٹڈ ہو؟''۔

''میں صرف خود میں انٹرسٹڈ ہوں''۔پشپا نے نخوت سے کہا۔

''بہتری بھی اسی میں ہے۔سراب کے پیچھے بھاگنے والوں کو پیاس کے سوا کچھ نہیں ملتا''۔

''تمہیں یہ بات ریٹا سے کہنی چاہئے۔اوتار سنگھ کے تاثرات دیکھ رہے ہو۔وہ بے چارہ بس مروت کررہا ہے''۔

''اوتار سنگھ کو میں نے کبھی کسی لڑکی میں دلچسپی لیتے نہیں دیکھا'' رام گوپال نے سرد لہجے میں کہا۔

''دیکھتے رہو۔جونک پتھر میں بھی لگتی ہے''۔

''وہ مجھے پتھر نہیں لگتا۔اور تم بھی جونک نہیں لگتیں''۔رام گوپال نے سادگی سے کہا۔

''پلیز.....تم خاموش ہی رہو''۔پشپا نے بھنا کر کہا۔''آج پہلے ہی تم بہت شرمندہ کرا چکے ہو''۔

ادھر ریٹا نے بھی اوتار سنگھ سے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔''مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے اوتار سنگھ''۔اس نے مخمور آواز میں کہا۔''مجھے کبھی کسی کے ساتھ رقص کرنا اتنا اچھا نہیں لگا۔جانتے،میں تمہیں بہت پسند کرتی ہوں''۔

''میں بھی تمہیں پسند کرتا ہوں۔یو آر اے گڈ فرینڈ''۔

''مگر میں تم سے محبت کرتی ہوں۔وہ محبت جو ایک عورت ایک مرد سے کرتی ہے۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

وہ محبت میں نے پہلی بار تم سے کی اور اب کسی اور سے کبھی نہیں کر سکوں گی۔ میں تمہارے لئے کچھ بھی کر سکتی ہوں اوتار سنگھ۔ میں خود کو بدل بھی سکتی ہوں"۔

بات اس قدر اچانک اور اتنی صاف گوئی اور دوٹوک انداز میں کی گئی تھی کہ اوتار سنگھ ششدر رہ گیا۔ چند لمحے تو وہ کچھ سوچنے..... کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ پھر اس نے بڑی تیزی سے خود کو سنبھالا۔ "سوری ریٹا..... وہ محبت تو مجھے بھی پہلے ہی ہو چکی ہے کسی سے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اب میں کبھی کسی سے اس طرح محبت نہیں کر سکوں گا"۔ اس نے کہا۔

ریٹا کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ "مائی لک"۔ اس نے آہ بھر کر کہا۔ پھر بولی "کون ہے وہ خوش نصیب؟ بہت..... بہت خوب صورت ہوگی"۔

"پتا نہیں۔ میں نے بھی اسے دیکھا نہیں"۔

"کیا مطلب"۔ ریٹا کی آنکھیں فرط حیرت سے پھیل گئیں۔ "دیکھا نہیں تو محبت کیسے ہوگئی؟"

"میں نے بس اس کی آواز سنی ہے"۔

ریٹا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "تب تو اس محبت کا کوئی اعتبار نہیں۔ کبھی تم اسے دیکھو اور وہ تمہیں اچھی نہیں لگے تو تمہاری محبت ختم ہو جائے گی"۔

"میں بھی یہی سوچتا تھا۔ لیکن ایسا نہیں ہے"۔ اوتار سنگھ نے کہا

"اسے دیکھے بغیر تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو"۔

"میں حسن پرست ہوں۔ خوب صورتی ہر روپ میں مجھے اچھی لگتی ہے۔ اسی لئے مجھے شبہ ہوتا تھا کہ اگر وہ خوب صورت نہ ہوئی تو میری محبت ختم ہو جائے گی۔ لیکن ریٹا، میں سچ کہہ رہا ہوں کہ تم بہت خوبصورت ہو، اس کے باوجود مجھے تم سے محبت نہیں ہوئی۔ تو میں نے سمجھ لیا کہ محبت میں کوئی شرط نہیں ہوتی۔ وہ تو بس ہو جاتی ہے۔ اور ہو گئی۔ اب تو مجھے اس کی آواز سنے ہوئے بھی عرصہ ہو گیا۔ لیکن وہ آواز اب بھی میری سماعت میں گونجتی ہے، اور اسے سن کر میری اب بھی وہی کیفیت ہوتی ہے۔ یہ بات نہ ہوتی تو شاید آج میں تمہاری محبت کا جواب محبت سے دیتا"۔

"تم بہت عجیب، بہت انوکھے آدمی ہو اوتار سنگھ"۔

"اوہ ریٹا..... اصل میں تو محبت میں کسی اور سے کرنا چاہتا تھا"۔ اوتار سنگھ نے گہری سانس لے کر کہا۔ "بہت برسوں سے! میں اس دنیا کے نظام پر غور کرتا رہا ہوں۔ میں نے بہت پہلے سمجھ لیا تھا کہ کوئی کامل قوت ہے، جس نے یہ سب کچھ بنایا اور مکمل سسٹم کے ساتھ یہ نظام ترتیب دیا۔ وہ قوت والی ہستی واحد ہے..... مطلق العنان اور خود مختار۔ اس جیسا کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ وہ بہت مہربان ہے..... ماں سے زیادہ شفیق..... باپ سے زیادہ عنایت کرنے والی اور ضرورت پوری کرنے والی۔ میں نے بہت غور کیا اور سمجھا کہ میرے پاس جو کچھ بھی اچھا ہے..... میرے ماں باپ سمیت، وہ اسی کا دیا ہوا ہے۔ میں والدین کی مہربانیوں کے جواب میں ان کا شکر گزار ہوتا ہوں اور اس کے اظہار کے لئے ان سے محبت کرتا ہوں۔ تو ان سے زیادہ..... سب سے زیادہ شکر گزاری اور محبت تو اس کا حق ہے۔ مگر سمجھے بغیر تو محبت نہیں ہوتی۔ یا مجھے نہیں ہو سکی۔ چنانچہ میں اسے سمجھنے کی جستجو میں لگ گیا۔ اب درمیان میں مجھے یہ محبت ہو گئی۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اس محبت کو ختم کر دیتا۔ کیونکہ میری اصل منزل تو وہ بڑی محبت ہے"۔

ریٹا سحر زدہ سی ہو کر سن رہی تھی۔ "مجھے یقین نہیں آتا"۔ اس نے کہا۔ "تمہیں ہمارے مذہب کے بارے میں سمجھنا چاہئے۔ میں تمہیں بتاؤں گی"۔

اسی وقت ریکارڈ ختم ہو گیا۔ رچرڈ نے کہا "اب ذرا وقفہ کر لیں"

وہ چاروں واپس آ گئے۔

کچھ دیر ستانے کے بعد دوبارہ سلسلہ شروع ہوا تو اس بار میدان میں تین جوڑے تھے۔ اوتار سنگھ اور امرتا، رچرڈ اور پشپا، رام گوپال اور ریٹا۔ نادرہ اور محمود نے رقص میں دلچسپی ہی نہیں لی۔ اس پر رام گوپال زہریلے انداز میں مسکرایا تھا، انداز ایسا تھا، جیسے ان پر مذہب کے حوالے سے طنز کرنا چاہتا ہو۔ لیکن پچھلے تجربے کے پیش نظر اسے تبصرے کی ہمت نہیں ہوئی۔

رقص کا سلسلہ کافی دیر چلتا رہا۔ اوتار سنگھ نے محض مروتاً ایک ایک راؤنڈ امرتا اور پشپا کے ساتھ رقص کیا اور پھر اپنی جگہ فتح سنگھ کو دے دی۔ اسی دوران محمود رچرڈ سے اجازت لے کر اس کی لائبریری میں چلا گیا تھا۔ نادرہ اکیلی بیٹھی تھی۔ اوتار سنگھ اس کے پاس چلا گیا۔ اسے وہ رات بہت طویل لگ رہی تھی۔ امرتا اور پشپا نے بھی رقص کے دوران اس سے اظہار محبت کیا تھا۔ نجانے کیوں اس نے ریٹا کی طرح ان سے تفصیلی بات نہیں کی تھی۔ بس یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ وہ پہلے ہی کسی سے محبت کرتا ہے۔

"کیا بات ہے، تم نے رقص نہیں کیا؟"۔ اوتار سنگھ نے نادرہ سے پوچھا۔

"مجھے دلچسپی نہیں ہے"۔ نادرہ نے جواب دیا۔

"تمہارا مذہب تمہیں اس سے روکتا ہے"۔

"ہاں روکتا ہے۔ لیکن ہم بہت سے ایسے کام کرتے ہیں، جن سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔ اس وقت میرے انکار کا اصل سبب یہ ہے کہ مجھے رقص میں کوئی دلچسپی نہیں ہے"۔

"اللہ تمہیں کن کن باتوں سے روکتا ہے"۔

"اب تمہیں کیا بتاؤں۔ بہر حال سب سے بڑا گناہ شرک ہے..... اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا"۔

اوتار سنگھ چند لمحے سوچتا رہا۔

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

پھر بولا۔ ''مجھے کوئی ایسی بات بتاؤ، جو تم اللہ کے منع کرنے کے باوجود کرتی ہو''۔ اسے احساس ہوا کہ وہ بار بار اللہ کہہ رہا ہے۔ اور اللہ کہنا اسے اچھا بھی لگ رہا ہے۔

مگر اس سوال پر نادرہ کھسیا گئی۔ ''بہت ساری باتیں ہیں۔ ہم کوئی بہت اچھے مسلمان تو نہیں ہیں۔ ماحول ہم پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ہمارے ایمان کی کمزوری کی وجہ سے۔ اب اسی وقت دیکھ لو۔ میں اس محفل میں شریک ہوں۔ حالانکہ اللہ نے مرد اور عورت کے اختلاط کو منع فرمایا ہے''۔

اس جواب سے اوتار سنگھ کو لمبی ڈور کا وہ سرا مل گیا، جسے تھام کر اس کے اندر کا متجسس انسان دور تک جا سکتا تھا۔ ''اس میں کیا برائی ہے''۔ اس نے پوچھا۔

''عورت اور مرد جتنا قریب ہوں گے، بے حیائی اور گناہ کا امکان یقین کی حد تک بڑھ جائے گا''۔

''مگر دونوں کے درمیان کشش تو قدرتی ہے، فطری ہے'' اوتار سنگھ نے اعتراض کیا۔ اس کا ذہن الجھ رہا تھا۔

''اس کے لئے شادی ہے۔ شادی گناہ اور بے حیائی کا راستہ بند کر دیتی ہے''۔

''اور محبت کے بارے میں تمہارا مذہب کیا کہتا ہے؟''۔

''محبت پاکیزگی کے ساتھ ہو تو برائی نہیں۔ مگر حل شادی ہی ہے''

اوتار سنگھ کا دماغ روشن ہو گیا۔ اسی وقت اسے ایک بات یاد آ گئی۔ اس کا مشاہدہ شروع ہی سے غیر معمولی تھا۔ محسوس اس نے پہلے بھی کیا تھا۔ لیکن آج اسے پختہ یقین ہو گیا تھا۔ ''ایک بات بتاؤں تمہیں''۔ اس نے کہا۔

''رچرڈ تم میں غیر معمولی دلچسپی رکھتا ہے۔''

نادرہ کچھ محجوب ہو گئی۔ اس کی نظریں جھک گئیں ''میں جانتی ہوں۔ وہ مجھے بتا چکا ہے۔'' وہ بولی۔

''اب یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔ میں تم سے کچھ پوچھ نہیں سکتا۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔

''مگر میں تمہیں بتا سکتی ہوں۔ مجھے اس سے کوئی لگاؤ نہیں۔'' نادرہ بولی۔ ''اور اگر ایسا کچھ ہوتا تو بھی میں اس کی حوصلہ افزائی نہ کرتی۔ کیونکہ میں اس سے شادی نہیں کر سکتی۔''

''کیوں؟'' اوتار سنگھ نے پوچھا۔ ''مذہب کے فرق کی وجہ سے؟''

''ہاں، مشرکوں سے شادی کرنا ناجائز ہے۔ یہ لوگ اہل کتاب ہیں۔ لیکن شرک کرتے ہیں۔''

شرک کے بارے میں نادرہ نے شروع میں بھی کہا تھا اور وضاحت بھی کی تھی۔ لیکن یہ اہل کتاب کی اصطلاح اوتار سنگھ کے لئے نئی تھی۔ ''اہل کتاب کا مطلب؟''

''وہ لوگ جن کے پاس اللہ کا کلام موجود ہے۔ ایسی تین ہی قومیں موجود ہیں۔ یہودی، عیسائی اور مسلمان۔''

''تینوں کے پاس اللہ کا کلام ہے تو وہ الگ الگ کیوں ہیں؟''

''یہ بہت لمبی بحث ہے۔ چھوڑو اسے۔ بہرحال میں کسی مشرک سے شادی نہیں کر سکتی۔''

''لیکن محبت تو ہو سکتی ہے تمہیں۔''

نادرہ یوں چونکی، جیسے اسے کرنٹ لگا ہو۔ پھر سنبھل کر بولی۔ ''ہاں'' ہو سکتا ہے۔ لیکن اس صورت میں، میں اس محبت سے لڑوں گی۔ اسے دل سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کروں گی اور دعا کروں گی کہ وہ مسلمان ہو جائے۔''

''کوئی مسلمان کیسے ہو سکتا ہے؟''

''دو کلمے ہیں ہمارے ہاں۔ ایک ناپاکی کا دور کرنے والا کلمہ ہے۔ لا الہ الا اللہ، محمد الرسول اللہ۔ اور دوسرا گواہی دینے والا اشھد ان لا الہ الا اللہ وا اشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ۔ آدمی دل کی گہرائیوں سے ایمان لائے، زبان سے یہ کلمے پڑھے تو مسلمان ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اسے اللہ کے احکامات پر عمل کرنا ہوتا ہے جو اللہ کی کتاب میں موجود ہیں۔''

اوتار سنگھ چونکا۔ ''یہ تو عربی زبان میں ہیں۔''

''ہاں، اللہ کا کلام بھی عربی زبان میں ہی نازل ہوا ہے۔''

اوتار سنگھ کا حافظہ بلا کا تھا۔ دونوں کلمے اسے یاد ہو گئے۔ اب وہ ان کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ابھی اس کی استعداد اتنی نہیں تھی اور پھر مشق بھی نہیں تھی۔ اس نے اٹک اٹک کر ترجمہ کیا۔ ''اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں اور دوسرا میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا.....'' وہ اٹک گیا۔

نادرہ اسے بہت غور سے..... بڑی عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی''.....کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔'' اس نے جملہ پورا کیا۔ وہ اب بھی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ ''تم غیر معمولی آدمی ہو اوتار سنگھ، کاش.....کاش تم.....'' یہ کہتے ہوئے اس نے نظریں جھکا لیں۔

اوتار سنگھ اتنا ناسمجھ نہیں تھا کہ اس کا جملہ مکمل نہ کر پاتا۔ اس رات وہ چوتھا اظہار محبت تھا، جو اس سے کیا گیا۔ لیکن یہ آخری اظہار مشروط تھا۔

اسی وقت رقص کا سلسلہ موقوف ہو گیا۔ وہ سب یکجا ہو گئے۔ ''بس ذرا دیر ستا لیں۔ پھر کھانا کھائیں گے۔'' رچرڈ نے اعلان کیا

وہ پارٹی اوتار سنگھ کو سوچنے کیلئے بہت کچھ دے گئی۔ یہی نہیں، اس نے اس آواز والی کی محبت کو پھر سے توانا کر دیا۔ یہ بات نہیں کہ وہ محبت کبھی ہلکی پڑی ہو۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ مصروفیات نے اسے دبا دیا تھا۔ اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں بچتا تھا۔ دوسرے اب وہ اس آواز سے محروم بھی ہو چکا تھا۔

نادرہ کی بات سنتے ہوئے اسے احساس ہوا تھا اور اب وہ اس پر سوچ رہا تھا۔

محبت ایک آفاقی جذبہ تھا۔ اس کے بے شمار روپ تھے۔ ایک انسان کی دوسرے انسان سے محبت، دوستوں کی محبت، بھائی بہن کی محبت، ماں باپ کی محبت، اولاد کی محبت اور سب سے بڑھ کر مخلوق کی اپنے خالق سے محبت۔ یہ سب محبتیں ہیں، جو انسان کرتا ہے۔ کرتا رہے گا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

غور کرو تو ان میں سے کوئی بھی محبت بے غرض نہیں ہے۔ انسان کتنا ہی بے غرض ہو، مگر کسی دوسرے انسان سے محبت کرتے ہوئے مکمل طور پر بے غرض نہیں ہوسکتا۔ کوئی غرض نہ ہو تو تنہائی دور کرنے کی غرض تو ہے۔ اکیلا تو کوئی نہیں رہ سکتا۔ انسان معاشرتی جانور ہے تو تعلق رکھنے کی غرض تو ایک بڑی سچائی ہے۔ دوستی کا بھی یہی حال ہے۔ کوئی ہم خیال، جو اچھا بھی لگتا ہو۔ اس سے مل کر، بات کر کے دل خوش ہوتا ہے۔ غرض تو ہوئی نا اور اختلاف ہو جائے..... سنگین نوعیت کا اختلاف تو آدمی اس دوست کو چھوڑ دیتا ہے۔ کوئی اور دوست تلاش کر لیتا ہے بھائی بہن کی محبت کا اسے تجربہ نہیں تھا۔ یہ نعمت اسے ملی ہی نہیں تھی۔ لیکن وصال دین کے حوالے سے وہ اسے سمجھ سکتا تھا۔ بھائی دوست سے بڑی ضرورت ہوتا ہے۔ ایک بہت اپنا، جو ہر کڑے وقت میں ساتھ رہے، ہمارا دکھ بانٹے، ہمیں تسلی دے۔ اب اولاد کی محبت کو لیں۔ تو ماں باپ سے تو اولاد کی غرض ہوتی ہی ہے۔ بلکہ اسکی کوئی حد نہیں ہوتی۔ آدمی کو اتنا کچھ ملتا ہے ماں باپ سے۔ وہ ان سے محبت نہ کرے تو کیا کرے اور خدا کی محبت! وہ تو ہے ہی محتاج کی محبت جو وہ اس سے کرتا ہے، جو اس کی ہر ضرورت پوری کرتا ہے۔ وہ ماں باپ سے بڑھ کر خیال رکھنے والا، ضرورتیں پوری کرنے والا ہے۔ بس ماں باپ کی اولاد سے محبت سب سے مختلف ہے۔ مگر نہایت بے غرض ہونے کے باوجود غرض سے بالکل پاک وہ بھی نہیں ہے۔ باپ کو اولاد سے ایک معصوم سی غرض ہوتی ہے کہ وہ اس کی نسل کو آگے بڑھائے، مرنے کے بعد بھی اس کے نام کو زندہ رکھے۔ ہاں ماں کی محبت شاید بالکل بے غرض ہوتی ہے۔ اس کا بس چلے تو اولاد کا ہر دکھ خود لے لے اور اسے اس دکھ سے محفوظ کر دے۔

ماں باپ کی محبت پر اس نے سوچا تو اسے سب کچھ بنانے والے کی..... خالق کی اپنی مخلوق کے لئے محبت کا خیال آیا۔ وہی سب سے خالص، سب سے بے غرض اور پاک محبت ہے۔ کیونکہ اسے تو کسی سے کچھ نہیں چاہئے۔ وہ جو سب کچھ بنانے والا ہے، ہر چیز کا مالک ہے۔ کوئی اسے کچھ دے نہیں سکتا اور اسے ضرورت بھی نہیں۔ اس پر سوچتے ہوئے اوتار سنگھ کو ماں باپ کی محبت میں اس عظیم ہستی کی محبت کی جھلک نظر آئی۔ اس کے ذہن میں خیال آیا کہ غرض کا مارا، مطلبی انسان خود تو ایسی محبت کر ہی نہیں سکتا۔ تو کیا یہ محبت اسے اس طرح سونپی گئی ہوگی، جیسے اس خالق نے سائنس دانوں اور موجدوں کو خیال سونپا، جس کے نتیجے میں ایجادات ہوئیں۔ ضرور یہی بات ہے۔ کیونکہ یہ تو طے ہے کہ وہ جو بھی ہے، اس کی ذات محبت کا سرچشمہ ہے۔ دوسری نعمتوں کی طرح وہ انسانوں کو ایک دوسرے کے لئے محبتیں بھی عطا کرتا ہے۔ اس نے ماں باپ کو اولاد کے لئے اپنی جیسی محبت عطا کی۔ کیونکہ اس کا بنایا ہوا سسٹم ہے کہ بچہ بے بس، لاچار اور کمزور ہوتا ہے۔ اپنے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ عاقل و بالغ ہونے تک برے بھلے میں تمیز نہیں کر سکتا۔ نہیں سمجھ سکتا کہ کون سی چیز سود مند ہے اور کون سی ضرر رساں۔ کہاں خطرہ ہے، اسے نہیں معلوم ہوتا۔ تو اگر اس نے ماں باپ کو وہ محبت نہ دی ہوتی تو انسانی نسل تو ختم ہو چکی ہوتی۔

اور پھر خدا کی محبت کیسی ہے۔ وہ سب کچھ ایسے دیتا ہے کہ مخلوق کو پتا بھی نہیں چلتا کہ وہ اسے دے رہا ہے۔ وہ تو سوچتا ہے کہ فصل میں نے محنت کر کے اگائی۔ اماں نے کہا تھا نا کہ بارش نہ ہو تو محنت کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ گھٹا چھائی رہے، دھوپ نہ نکلے تو گندم پک نہیں سکتی۔ مگر اس بات پر غور کون کرتا ہے اور اس مہان ہستی کو اس کی پروا بھی نہیں۔ شکر ادا نہ کرو، تب بھی وہ دیتا ہی رہتا ہے۔ وہ نہیں کہتا کہ میری بات نہیں مانو گے تو تمہیں کھانا نہیں ملے گا۔ وہ تو بس نوازتا ہی رہتا ہے۔

برسوں سے اوتار سنگھ یہ بات سوچتا رہا تھا کہ وہ اس مہان ہستی کو سمجھے گا۔ اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانے گا۔ تا کہ دنیا میں ہر چیز سے بڑھ کر وہ اس مہان ہستی سے محبت کر سکے۔ مگر اب تک وہ کچھ بھی نہیں جان سکا تھا اور محبت کا وہ ارادہ تو رکھا رہ گیا۔ اسے ایک لڑکی سے محبت ہوگئی..... صرف اس کی آواز سن کر!

بہت پہلے وہ اس محبت کا تجزیہ بھی کر چکا تھا۔ اس نے خوب ٹٹول لیا تھا کہ اسے اس لڑکی سے کوئی غرض نہیں۔ یہ بھی طے تھا کہ وہ بدصورت ہو، تب بھی اس کی محبت میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔ البتہ وہ یہ ضرور سوچتا تھا کہ اس محبت کا انت کیا ہے..... یہ کہاں تک جائے گی؟

اب نادرہ کی گفتگو نے اس کے لئے اور دروازے کھول دیئے تھے۔ مرد اور عورت کی اس محبت کا منطقی انجام شادی ہوتا ہے۔ تا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ، ایک دوسرے کے قریب رہیں اور مل کر اپنی نسل آگے بڑھائیں اور اب وہ محبت اور ہوس کے فرق کو سمجھ سکتا تھا۔ اسکول میں اردو کے استاد نے شاعری کے حوالے سے محبت اور ہوس کا جو فرق سمجھایا تھا، وہ اتنی وضاحت سے اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ لیکن اب وہ سمجھ گیا تھا۔ قربت شادی کے بغیر ہو تو پاپ ہے محبت اور ہوس میں وہی فرق ہے جو پاپ اور پن میں ہے

اور اوتار سنگھ نے یہ بھی سمجھ لیا کہ محبت آدمی اوپر والے سے کرے یا اس کی کسی مخلوق سے، وہ عبادت ہوتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ پاک ہو اور محبت کرنے والا ہر پل یہ یاد رکھے کہ اسے اور اس کے محبوب کو اوپر والے نے بنایا..... احسان کیا..... اور یہی نہیں، ان کے دلوں میں محبت بھی ڈالی، ورنہ وہ یک جا نہیں ہو سکتے تھے۔ تو یہ اوپر والے کا احسان ہے۔ اس خیال کے ساتھ محبت عبادت ہوگی اور اس کے بغیر ہوس۔

(جاری ہے)

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

پہلی بار وہ مطمئن ہوا کہ اس نے محبت اور ہوس میں فرق کرنا سیکھ لیا ہے اور اب اس سلسلے میں کبھی دھوکہ نہیں کھائے گا۔

اس نے پہلے کبھی اس آواز والی کے بارے میں اس انداز سے نہیں سوچا تھا۔لیکن اب سوچ رہا تھا۔شادی کے بارے میں وہ کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا۔اب اس کا جی چاہا کہ اس کی شادی اسی لڑکی سے ہو۔مگر نادرہ کی طرح وہ لڑکی بھی مسلمان تھی اور یقیناً وہ نادرہ سے اچھی مسلمان ہوگی اور مسلمان لڑکی کسی مشرک سے شادی نہیں کرسکتی۔جبکہ ہندو مشرک ہوتے ہیں!

کیا میں مشرک ہوں؟ یہ سوال اس کے ذہن میں ابھرا۔

مشرک کون ہوتا ہے، یہ نادرہ نے اسے بتایا تھا۔اس نے خود کو اس تعریف پر پرکھا۔اس اعتبار سے وہ مشرک نہیں تھا۔کیونکہ اس نے ازخود یہ نتیجہ نکالا تھا کہ کائنات کا یہ مربوط نظام قوت کے ارتکاز کے بل پر قائم ہے۔اقتدار ایک سے زیادہ قوتوں کے پاس ہوتا تو اس میں خلل پڑتا۔اس نے ہمیشہ اس مہان ہستی کو ایک مانا تھا۔وہ بلاشرکت غیرے یہ نظام چلا رہا تھا۔تو وہ مشرک تو نہیں۔اس نے اطمینان کی سانس لی۔اس نے تو ماں کی موت والے دن مورتی کو چیلنج کیا تھا۔اسے بھگوان ماننے سے انکار کیا تھا۔بلکہ وہ تو بتوں کی پوجا کے سلسلے میں بہت پہلے سے ماتا جی سے بحث کیا کرتا تھا۔

اب وہ پوری طرح سمجھ گیا کہ بتوں کی پوجا کرنا شرک ہے۔تو وہ مشرک تو نہیں۔

لیکن یہ سچ ہے کہ وہ ہندو تھا اور ہندو مشرک ہوتے ہیں۔پہلی بار اس نے سوچا کہ وہ بتوں کو نہیں مانتا، ان کی پوجا نہیں کرتا اور وہ ایک مہان ہستی پر یقین رکھتا ہے۔تب تو اسے ہندو دھرم کو چھوڑ دینا چاہئے۔مگر کیا دھرم یونہی چھوڑا جاسکتا ہے۔

اس لڑکی کو تو اب تک شاید اس کے وجود کا علم بھی نہیں ہوگا۔اس کی محبت کا تو خیر گمان بھی نہیں ہوسکتا۔لیکن اگر کسی طرح اسے معلوم ہو بھی جائے تو وہ اس سے محبت تو نہیں کرسکتی۔وہ بھی نادرہ کی طرح یہی سوچے گی کہ میں کسی مشرک سے محبت کیسے کرسکتی ہوں اور اگر اوپر والا اپنی عنایت سے اس کے دل میں اس کی محبت ڈال دے، تب بھی وہ یہ دعا کرے گی کہ میں مسلمان ہوجاؤں۔

تو میں مسلمان ہوسکتا ہوں! اس نے سوچا۔بس وہ کلمہ ہی تو پڑھنا ہوگا۔اس نے دل میں دونوں کلمے دہرائے۔وہ اسے پوری طرح یاد تھے پھر اس نے ان کے معنیٰ دہرائے۔اسے معنیٰ بھی یاد تھے۔

تو کیا میں مسلمان ہوگیا؟ یہ دونوں کلمے پڑھ لیے میں نے۔کیا آدمی اتنی آسانی سے ایک دھرم چھوڑ کر دوسرا دھرم اپنا سکتا ہے۔کیا مسلمان ہونا اتنا آسان ہے؟

مگر فوراً ہی اس کے اندر ایک بے چینی ابھری۔میرا مقصد مسلمان ہونا تو نہیں۔میں تو اس مہان مہربان ہستی کو کھوج رہا ہوں۔میرا مقصد تو اس سے محبت کرنا ہے۔دھرم میرا مسئلہ نہیں۔میں اس لڑکی کی خاطر مسلمان ہوجاؤں تو یہ تو بے ایمانی ہوگی۔

وہ سوچتا اور الجھتا رہا۔آخر اس نے فیصلہ کیا کہ اب وہ مذاہب کے بارے میں جاننے کی کوشش کرے گا۔لفظ اللہ کے بارے میں اسے تجسس تھا۔اسے زبان سے ادا کرنا اسے اچھا..... بہت اچھا لگتا تھا۔بڑی اپنائیت کا احساس ہوتا تھا۔اللہ سوچتا بھی تو اس کے اندر بڑے خوب صورت جذبے جاگتے تھے۔یہ اللہ کیا ہے.....کون ہے.....کیسا ہے؟

وہ اٹھا اور کوٹھے پر چلا گیا۔اس کے اندر ایک عجیب سا اضطراب مچل رہا تھا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

کوٹھے پر آسمان کے نیچے کھڑے ہو کر اس نے کمر کے بل جھکتے ہوئے آسمان کا تصور کر کے بڑی عاجزی سے پکارا۔ ''تو جو کوئی بھی ہے اے سب کچھ بنانے والے، میں تیرا اعتراف کرتا ہوں اور تیرے سامنے خود کو جھکاتا ہوں۔ میں تیری جستجو کر رہا ہوں۔ تو مجھے مل جا۔ مجھے اپنا راستہ دکھا دے۔ مجھے اپنا بنا لے کہ میں تجھ سے محبت کرنا چاہتا ہوں''۔

یہ اس کی پوجا تھا.....اور ماتا جی کے دیہانت کے بعد سے اب تک اس کا معمول رہا تھا۔ اس روز یہ پوجا کر کے اس نے سر اٹھایا تو وہ مطمئن تھا..... بے حد مطمئن! بھلے وہ ہندو ہو لیکن وہ مشرک ہرگز نہیں ہے۔

.....x.....

پڑھائی کا شیڈول بہت سخت تھا۔ اس پر مستزاد عربی کی پڑھائی، جسے اوتار سنگھ کورس سے زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ پھر مولوی صاحب نے اسے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی پہلی کہانی لا کر دی جو عربی زبان میں تھی۔ اوتار سنگھ بہت خوش ہوا۔ مگر اسے پڑھ کر اسے اندازہ ہو گیا کہ ابھی وہ عربی کو پوری طرح سمجھنے کی اہلیت سے بہت دور ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی قواعد بڑی مضبوط تھی۔ لیکن اس کا ذخیرہ الفاظ فی الحال بہت محدود تھا۔ لیکن اسے یہ یقین بھی ہو گیا کہ ذخیرہ الفاظ ایسی کہانیاں پڑھنے سے بنے گا۔ اور جوں جوں ذخیرہ الفاظ بڑھے گا، اس کی عربی کی استعداد بھی بڑھتی رہے گی۔

مذاہب کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی اس کی خواہش شدید ہو گئی تھی۔ لیکن کسی سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ خالی پیریڈز میں سب ادھر ادھر کی باتیں کرتے تھے۔ زیادہ ہوتا تو پڑھائی پر بات ہو جاتی۔ بہرحال اوتار سنگھ موقع نکالنے کی تلاش میں تھا۔

پہلا موقع اسے رچرڈ سے بات کرنے کا ملا۔ اس روز خالی پیریڈ میں وہ سب لائبریری میں موجود تھے۔ وجہ یہ تھی کہ امتحان قریب آ رہے تھے اور سب بڑی سنجیدگی سے پڑھائی میں مصروف تھے۔

اچانک رچرڈ نے کہا ''میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔ کسی کا کافی پینے کا موڈ ہے؟''۔

سب نے انکار کر دیا ''میں چلتا ہوں''۔ اوتار سنگھ نے کہا۔

''تو آؤ.....چلیں''۔

وہ دونوں لائبریوں سے نکلے اور کینٹین کی طرف چل دیئے۔

کینٹین میں رچرڈ نے کافی کا آرڈر دیا۔ اوتار سنگھ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کیسے شروع کرے۔ پھر اس نے بلا واسطہ بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ''رچرڈ..... مجھے اپنے مذہب کے بارے میں بتاؤ''۔

رچرڈ نے چونک کر اسے پوچھا ''یہ خیال کیسے آ گیا تمہیں؟''۔

''اس روز پارٹی میں تم نے ہندو دھرم کے بارے میں جو کچھ کہا، وہ میں بہت پہلے سے سوچتا رہا ہوں''۔

''ہر معقول آدمی کو سوچنا چاہئے''۔ رچرڈ نے پرجوش لہجے میں کہا ''میں تو غور کرتا ہوں تو تم لوگوں کا دھرم مجھے مذہب کہیں سے نہیں لگتا۔ ہاں اسے ثقافت کہا جا سکتا ہے۔ بھلا بتاؤ تو، پتھر کے بتوں کی پوجا کرنا، انہیں بھینٹ دینا اس عہد کے شایان شان تو نہیں، تم لوگ اتنے وہمی اور ضعیف الاعتقاد ہو کہ درختوں تک سے اولاد مانگتے ہو۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

اوتار سنگھ کو یاد آیا کہ اس کے ماتا اور پتا نے اس کیلئے برگد کے درخت پر منت مانی تھی۔ اور وہ پیڑ ہی سوکھ گیا تھا۔ ''میں اس سلسلے میں بہت شروع سے سوچتا رہا ہوں؟ میں نے کبھی دل سے پوجا نہیں کی۔ اور چار سال سے تو میں نے مورتیوں کو ماننا ہی چھوڑ دیا''۔

''تم مجھے شروع سے ہی غیر معمولی لگے تھے''۔ رچرڈ کے لہجے میں ستائش تھی۔

''مگر رچرڈ۔ یہ کائنات کا نظام خود بخود تو نہیں چل رہا ہے۔ کوئی تو ہے جو اسے چلا رہا ہے''۔

''بے شک۔ اور وہ خدا ہے جس نے چھ دن میں یہ نظام قائم کیا''۔

''تو تم اسے خدا کہتے ہو۔ کیوں؟''۔

''آسمانی کتاب میں یہی نام ہے اس کا..... گاڈ..... خدا۔ اس نے اپنے بیٹے مسیح مصلوب کو دنیا میں اپنی کتاب دے کر بھیجا کہ انسانوں کو محبت کی تعلیم دے اور دکھوں سے نجات کا راستہ دکھائے''۔

اوتار سنگھ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''خدا کا بیٹا بھی ہے! یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''۔

''اسے مقدس کنواری ماں نے جنم دیا تھا..... پاک دامن میری نے۔ چرچ کے باہر بڑی صلیب پر تم نے ان کا مجسمہ دیکھا ہوگا۔ اور ورجن میری کی شبیہہ بھی دیکھی ہو گی..... کم سن مسیح کو گود میں لئے ہوئے۔ چہرے کے گرد نور کا ہالہ''۔

اوتار سنگھ نے دونوں چیزیں دیکھی تھیں۔ ''میں نے دیکھا ہے''۔ وہ بولا۔ ''یہ بتاؤ کہ یہ کتنی پرانی بات ہے''۔

''ہمارا سن عیسوی مسیح کی پیدائش سے شروع ہوتا ہے۔ یہ 19 صدی پہلے کی بات ہے''۔

''تو تمہیں کیسے معلوم کہ مقدس ماں اور مسیح ایسے تھے''۔ اوتار سنگھ نے اعتراض کیا۔

''اس کی کیا اہمیت ہے۔ اس زمانے میں کوئی مصور ہوگا، جس نے انہیں دیکھ کر ان کی تصویر بنالی ہوگی''۔

اوتار سنگھ کی تسلی نہیں ہوئی۔ ایک تو یہ خدا اس کے تصور کے خدا سے بہت مختلف تھا۔ اس پر یہ شبیہہ اور مورتی والی بات۔ ''تمہارا مذہب ہم سے کچھ زیادہ مختلف تو نہیں''۔ اس نے کہا۔ ''بت تو تم بھی بناتے ہو''۔

''مگر ہم بت پرست نہیں ہیں''۔ رچرڈ نے سخت برا مان کر کہا۔

''پہلے بت بنتا ہے۔ پھر بت پرستی ہی ہوتی ہے''۔

''میں ایسی باتیں نہیں سن سکتا''۔ رچرڈ بدمزہ ہوگیا۔

''کیوں؟ میں نے جب پہلی بار بھگوان کی مورت دیکھی تھی تو اپنی ماتا جی سے یہی سوال کیا تھا۔ اور ان کے جواب سے مجھے تسلی نہیں ہوئی تھی۔ پھر میں نے کبھی بھگوان کو دل سے نہیں مانا۔ تم کیوں برا مانتے ہو۔ میں تو ایک معقول بات کر رہا ہوں''۔

''خیر..... چھوڑو اس بات کو''۔

''اور یہ تمہیں کیسے پتا چلا کہ مسیح خدا کے بیٹے تھے''۔

''ہمارے پاس آسمانی کتاب بائبل ہے نا''۔

''اس میں یہ لکھا ہے؟''۔

رچرڈ گڑبڑا گیا۔ ''ظاہر ہے۔ اس میں لکھا ہوگا۔ تبھی تو ہم یہ بات مانتے ہیں''۔

''تم نے نہیں پڑھی بائبل؟''۔

''نہیں''۔ رچرڈ کچھ شرمندہ نظر آرہا تھا۔ اس نے کافی کی پیالی خالی کر کے ہٹادی۔ ''آؤ..... اب چلیں۔ پیریڈ شروع ہونے والا ہے''

اوتار سنگھ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

اب اسکے پاس سوچنے کا کافی سامان تھا۔ کئی دن تک وہ سوچتا رہا۔ اس کا جو خدا کا تصور تھا، وہ رچرڈ کے تصور سے بالکل مختلف تھا۔ اس کا خدا سب سے الگ، سب سے منفرد اور مختلف اور ہر چیز پر قدرت رکھنے والا تھا۔ یہ اولا دوالا معاملہ تو اسے بہت برا لگا۔ کیا خدا نے شادی بھی کی ہوگی؟ اور اگر کی ہوگی تو کس سے.....؟ کسی عورت سے؟ اپنی مخلوق سے؟ یا اپنی ہی جیسی کسی ہستی سے؟

دونوں ہی امکان اس کے تصور سے متصادم تھے۔ اس کے نزدیک خدا جیسا تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ہوتا تو اس کی انفرادیت ختم ہوجاتی۔ اور اگر مسیح خدا کے بیٹے تھے تو یہ تو طے ہے کہ وہ انسان تھے۔ ان کی ماں انسان ہی ہوگی۔ خدا تو انسان نہیں ہوسکتا۔

اسے ہندوؤں پر ترس آنے لگا۔ ہندو مشرک تھے۔ دیوی دیوتاؤں کی..... بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ اس لئے انہیں مشرک کہا جاتا ہے اور شرک کا جو مطلب نادرہ نے اسے بتایا تھا، اس کے مطابق تو عیسائی بھی مشرک تھے۔ انہوں نے خدا کی فیملی بنادی تھی۔ اور مورتیاں تو وہ بھی بناتے تھے۔ مگر نادرہ کا کہنا تھا کہ وہ اہل کتاب ہیں۔ تو کسی کے پاس آسمانی کتاب ہو تو شرک کرنا اس کے لئے جرم نہیں رہتا۔ یہ تو بے انصافی ہے۔

اور یہ آسمانی کتاب والا معاملہ بھی وہ پوری طرح نہیں سمجھ پایا تھا۔ کیا وہ کتاب خدا کی لکھی ہوئی تھی؟ خدا کی تحریر تھی؟ اور ایسی کتنی کتابیں ہیں دنیا میں؟ ہندوؤں کو کوئی کتاب نہیں ملی؟ سوچنا ختم ہوا تو اس کے پاس سوال ہی سوال تھے۔ جواب اسے تلاش کرنا تھے۔

وصال دین کے امتحان بھی ہو چکے تھے اور نتیجہ بھی نکل آیا تھا۔ وہ پاس ہوگیا تھا۔

''مبارک ہو ویر جی۔ تمہیں تو آزادی مل گئی''۔ اوتار سنگھ نے اس سے کہا۔

''آزادی کیسی؟ میں تو تمہارے ساتھ ہی آزاد ہوں گا'' وصال دین نے کہا۔

''نہیں ویر جی۔ اب یہ ممکن نہیں''۔ اوتار سنگھ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''دیکھو نا..... اب تمہاری دو مہینے کی چھٹیاں شروع ہو رہی ہیں۔ اور میرے امتحان میں ابھی بیس دن باقی ہیں۔ مجھے تو کوئی ڈیڑھ ماہ بعد آزادی ملے گی۔ اس کے بعد امتحان کا نتیجہ آنے تک چھٹیاں ہوں گی۔ لیکن میری آزادی کے چند دنوں کے بعد ہی تمہارا اسکول کھل جائے گا۔ اور تمہیں واپس آنا پڑے گا''۔

وصال دین کی سمجھ میں یہ پے چیدہ حساب نہیں آیا۔ ''میں نہیں سمجھا بھائی۔ کیا اس بار ہم گاؤں صرف دس بارہ دن کے لئے جائیں گے؟''۔ اس نے پوچھا۔

''ارے نہیں۔ گھبراؤ نہیں ویر جی۔ تم ابھی گاؤں چلے جاؤ گے۔ میں ڈیڑھ ماہ بعد گاؤں آؤں گا۔ ہم دس بارہ دن ساتھ رہیں گے۔ پھر تم دہلی واپس آجاؤ گے۔ اور میں وہیں رکوں گا رزلٹ آنے تک''۔

''تو ہم صرف دس بار دن ساتھ رہیں گے''۔ وصال دین نے تاسف سے کہا۔ ''ڈیڑھ مہینے تم یہاں اکیلے رہوں گے۔ نہیں بھائی، میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ میں تمہارے ساتھ ہی گاؤں چلوں گا''۔

اوتار سنگھ کو اس پر پیار آگیا۔ ''نہیں ویر جی۔ یہ زیادتی ہوگی۔ وہاں اماں اور چاچا تمہارا انتظار کریں گے۔ ان کی خوشیوں کے یہ اتنے سارے دن میں تم سے نہیں چھین سکتا۔ تمہیں جانا ہوگا''۔

(جاری ہے)

اردو فینز ڈاٹ کام

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

وصال دین نے اماں اور ابا کے بارے میں سوچا اور کشمکش میں پڑ گیا۔ وہ اوتار سنگھ کو اکیلا بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا اور اماں اور ابا کی یاد بھی ستانے لگی تھی۔ پھر اس نے فیصلہ کر ہی لیا۔ وہ سر جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''نہیں بھائی، میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گا''۔

اس لمحے وصال دین کی خالص محبت کو اوتار سنگھ نے اپنے دل میں اترتا محسوس کیا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ''تم بہت اچھے ہو ویر جی.....اور مجھے بہت پیارے ہو۔ لیکن یہ میں نہیں ہونے دوں گا۔ تمہیں جانا ہی ہوگا''۔

اوتار سنگھ کا لہجہ فیصلہ کن تھا اور وصال دین نے بھی اس کی بات نہیں ٹالی تھی۔ ''بھائی.....صرف تمہاری خاطر میں نے پڑھائی میں دل چسپی لی۔ ورنہ میرا دل نہیں لگتا تھا پڑھنے میں''۔ اس نے اداس لہجے میں کہا۔ ''لیکن اب میں پچھتا رہا ہوں۔ کاش میں نے پڑھائی میں دل چسپی لی ہوتی تو آج یوں تمہیں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاتا۔ یہ سزا ملی ہے مجھے بے دلی کی''۔

''میں سمجھا نہیں ویر جی''۔

''میں دل لگا کر پڑھتا تو کالج میں تمہارے ساتھ ہوتا نا''۔

یہ بھی اس کی محبت تھی۔ اوتار سنگھ کا دل خوش ہو گیا۔ ''اب پچھتائے کیا ہووت ویر جی''۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''لیکن بھائی، میں اکیلا تو گاؤں جا بھی نہیں سکتا''۔ وصال دین نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''مجھے تو راستے بھی نہیں معلوم''۔

''تو تم اکیلے تھوڑا ہی جاؤ گے۔ رگھو ساتھ جائے گا اور تمہیں گاؤں چھوڑ کر واپس آ جائے گا''۔

''مگر پھر یہاں رگھو کا کام کون کرے گا؟''۔ وصال دین پریشان ہو گیا۔

''تم فکر بہت کرتے ہو ویر جی۔ ارے ایک ہی دن کی تو بات ہے۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا''۔

وصال دین نے ذہن تو بنا لیا۔ لیکن جاتے وقت وہ اوتار سنگھ سے لپٹ کر اتنا رویا کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ ''میں تمہارے بغیر کیسے رہوں گا بھائی۔ میرا وہاں دل نہیں لگے گا''۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

اوتار سنگھ کو بھی رونا آ رہا تھا۔ لیکن اس نے آنسو پی لئے۔ جانتا تھا کہ وہ رو دیا تو وصال دین کو گاؤں نہیں بھیج سکے گا۔ وہ جائے گا ہی نہیں۔ ورنہ سچی بات یہ ہے کہ اس کا بھی برا حال تھا۔ آج تک وہ ایک دوسرے سے جدا ہوئے ہی نہیں تھے۔ ''تم اماں سے میری باتیں کیا کرنا ویر جی۔ اور ہاں، میرے پتا جی کا بہت خیال رکھنا۔ وہ بہت اکیلے ہیں۔ ان کے پاس روز جایا کرنا''۔ اوتار سنگھ نے اسے گاؤں جانے کا گویا ایک اور مقصد بھی دے دیا۔ ''پتا جی کو تمہاری صورت میں میری صورت نظر آیا کرے گی''۔

''یہ تو میں کروں گا ہی بھائی۔ یہ کہنے کی تو ضرورت ہی نہیں''۔

یوں وصال دین گاؤں چلا گیا۔ اگلے روز رگھو اسے چھوڑ کر واپس آیا تو ٹھاکر کے تحفوں سے لدا پھندا تھا، جو اس نے اوتار سنگھ کے لئے بھیجے تھے۔ مگر اوتار سنگھ کو سب سے قیمتی چیز وہ حلوہ لگا جو اماں نے اس کے لئے اپنے ہاتھوں سے بنا کر بھیجا تھا۔

جب سے اوتار سنگھ کالج گیا تھا، اس کا وصال دین سے ملنا بہت کم ہو گیا تھا۔ کالج کا طویل دورانیہ، پھر زیادہ پڑھائی کی وجہ سے مصروفیت۔ اتوار کو چھوڑ کر بس وہ کھانے پر ہی ساتھ ہوتے تھے۔ لیکن اب وہ چلا گیا تو اوتار سنگھ کو گھر سونا لگنے لگا۔ امتحانوں کی وجہ سے پڑھائی کی بہت زیادہ مصروفیت نہ ہوتی تو شاید وہ بہت تڑپتا۔ جدائی کی پہلی رات وہ اپنے کمرے کی تنہائی میں جی بھر کے رویا۔ اس نے وہ آنسو بھی بہا دیئے، جو وہ ویر جی کے سامنے نہیں بہا سکا تھا، پھر بہر حال پڑھائی نے جدائی کے اس احساس کو کم..... بہت ہی کم کر دیا۔

.....x.....

وصال دین گاؤں پہنچا تو سب سے پہلے اس کی ملاقات ابا سے ہوئی جو کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ اس نے ابا کو سلام کیا۔ رگھو نے انہیں پرنام کیا۔

''کب آیا وصال دین؟''۔ جمال دین نے پوچھا۔

''ابھی آ رہا ہوں ابا''۔

جمال دین کی نظریں ادھر ادھر بھٹکیں۔ پھر ان میں مایوسی اور حیرت کا تاثر ابھرا۔ ''چھوٹے ٹھاکر کہاں ہیں؟''۔

''وہ تو نہیں آئے ابا۔ ابھی تو ان کے امتحان بھی نہیں ہوئے ہیں۔ مہینہ ڈیڑھ کے بعد آئیں گے وہ''۔

''تب تو تجھے بھی نہیں آنا چاہئے تھا وصال دین۔ تو چھوٹے ٹھاکر کو اکیلا چھوڑ آیا''۔ جمال دین نے سخت لہجے میں کہا۔

''میں نہیں آ رہا تھا ابا۔ چھوٹے ٹھاکر نے زبردستی بھیجا ہے مجھے''۔ وصال دین نے ندامت سے کہا۔ ''چاہے رگھو سے پوچھ لو ابا''

جمال دین نے سوالیہ نظروں سے رگھو کو دیکھا۔ ''وصال دین ٹھیک کہہ رہا ہے چاچا''۔ رگھو نے کہا۔

لیکن جمال دین کے رویئے میں نرمی نہیں آئی۔ ''اور تو رگھو کو بھی لے آیا۔ انہیں بالکل اکیلا کر دیا تو نے''۔

''میں تو چاچا وصال دین کو چھوڑنے آیا ہوں۔ کل واپس چلا جاؤں گا''۔ رگھو نے کہا۔

''تجھے تو بالکل نہیں آنا چاہئے تھا رگھو''۔ جمال دین بیٹے کی طرف مڑا۔ ''اب پہلے گھر نہ جانا۔ ٹھاکر جی کے پاس جانا''۔

''میں وہیں جا رہا ہوں ابا''۔

جمال دین نے پہلی بار بیٹے کو نظر بھر کر دیکھا۔ وہ بڑا..... جوان ہو گیا تھا۔ قد بھی اونچا ہو گیا تھا اور جسم بھی بھر گیا تھا۔ اس نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ وہ اس کے جسم کو چھو کر دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کا لرزتا ہوا ہاتھ سر سے اترا۔ لیکن کندھے تک آتے آتے ٹھٹھک کر رہ گیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ ''بس تو اب چلا جا۔ یہاں دیر نہ کر''۔ وہ سخت لہجے میں بولا۔

وصال دین سال بھر کے بچھڑے باپ سے لپٹ جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے خود کو روک لیا۔ باپ کا حکم ماننے کی عادت جو تھی۔ وہ رگھو کے ساتھ حویلی کی طرف چل دیا۔ جمال دین نہ کہتا تو بھی وہ پہلے حویلی ہی جاتا۔ اس کی تربیت ہی ایسی ہوئی تھی۔

جمال دین اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا..... شکر اور مسرت سے چھلکتی آنکھوں سے۔ اس کا وصال دین اب مرد بن چکا ہے۔ اے اللہ..... تیرا شکر ہے۔ اس نے زیر لب کہا۔ یہ سب تیرا ہی فضل ہے۔ تیری عنایت ہے۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ دیوان خانے میں تھا۔ منیم جی اسے کچھ حساب کتاب بتا رہے تھے۔ وصال دین کو دیکھ کر وہ کھڑا ہو گیا۔ ''آؤ پتر وصال دین، کب آئے؟ کیسے ہو''۔ اس نے وصال دین کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہوں ٹھاکر جی''۔ وصال دین نے جواب دیا۔ اب وہ امید کر رہا تھا کہ ٹھاکر بھائی کے بارے میں حیرت سے پوچھے گا کہ وہ کیوں نہیں آیا۔

''اوتار سنگھ تو امتحان کی تیاری میں لگا ہوگا''۔ ٹھاکر نے اسے حیران کر دیا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

وصال دین کو احساس جرم ہونے لگا۔کاش وہ نہ آیا ہوتا۔''میں نہیں آرہا تھا ٹھاکر جی۔پر بھائی نے مجھے مجبور کر دیا۔مجھے معاف.....''۔

''ارے کیسی بات کرتے ہو پتر''۔ٹھاکر نے اس کی بات کاٹ دی۔''یہ تو زیادتی ہوتی تمہارے ساتھ۔دیکھو نا.....اوتار سنگھ دیر میں آئے گا تو دیر سے جائے گا بھی۔یہاں اتنے ہی دن رکے گا وہ جبکہ تمہیں جانا بھی اس سے پہلے ہی ہوگا۔اس نے اچھا کیا کہ تمہیں بھیج دیا۔یہ بتاؤ.....وہ ٹھیک تو ہے نا؟''۔

''جی ٹھاکر جی۔ٹھیک ہیں۔بس آج کل فرصت نہیں ہے انہیں''

''میں جانتا ہوں۔پر اس کا پھل بھی اچھا ملے گا اسے۔اچھا وصال دین،آؤ بیٹھو تو''۔

''جی.....میں.....میں یہیں ٹھیک ہوں ٹھاکر جی''۔

ٹھاکر نے اسے بہت غور سے دیکھا۔بیٹے کیسے باپ پر جاتے ہیں۔جمال دین بھی بیٹھنے سے گھبراتا تھا۔اس نے سوچا۔پھر اچانک اسے ایک خیال آیا۔''ارے وصال دین،تم گھر بھی گئے ہو یا نہیں؟''۔اس نے چونک کر پوچھا۔

''سیدھا یہیں آیا ہوں ٹھاکر جی''۔

''حمیدہ بہن سے نہیں ملے۔جمال دین سے نہیں.....''۔

''ابا سے تو کھیت میں ملاقات ہوگئی تھی''۔

''اور.....پر پہلے ماں سے ملنا تھا نا''۔ٹھاکر نے تڑپ کر کہا۔''بس تم فوراً گھر جاؤ اپنے''۔

''جاتا ہوں ٹھاکر جی۔پر ایک بات کرنی ہے آپ سے''۔

''بولو.....کیا بات ہے''۔

''مجھے اجازت دے دیں کہ میں ہر روز کچھ دیر کے لئے آپ کے پاس آجایا کروں''۔

ٹھاکر کھل اٹھا۔''اجازت کی کیا بات ہے پتر۔یہ تمہارا گھر ہے۔جب چاہے،آسکتے ہو''۔اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔پھر اچانک کسی خیال سے سنجیدہ ہوگیا۔''پر اپنے ماں باپ کا حق نہ مارنا۔وہ کب سے ترس رہے ہیں تمہیں''۔

''جی ٹھاکر جی.....میں خیال رکھوں گا''۔

''بس اب جاؤ تم''۔ٹھاکر نے شفقت سے کہا۔

وصال دین چلا گیا۔مگر ٹھاکر دیر تک دروازے پر نظریں جمائے رہا۔کیا میرا اوتار سنگھ بھی ایسا ہی بڑا ہو گیا ہوگا۔وہ سوچ رہا تھا۔پچھلی بار جب وصال دین کو دیکھا تھا تو وہ اتنا بڑا نہیں تھا۔اس کا دل مچلنے لگا اوتار سنگھ کو دیکھنے کے لئے۔پھر اس نے سوچا.....تھوڑے ہی دن کی تو بات ہے۔امتحان ختم ہوں گے اور وہ آجائے گا۔

اس کا جی چاہا کہ دہلی چلا جائے اور اوتار سنگھ کو جی بھر کر دیکھے۔یہ کوئی ایسی بڑی بات بھی نہیں تھی۔لیکن امتحان کے دنوں میں مناسب نہیں تھا۔وہ بھی پیاسا رہ جاتا اور اوتار سنگھ کی پڑھائی میں بھی خلل پڑتا۔

اس نے چونک کر سر گھمایا تو رگھو پر نظر پڑی۔''میرے لئے کیا حکم ہے مالک؟ چھوٹے ٹھاکر کا حکم تھا کہ وصال دین کو پہنچا کر آؤں۔اب حکم ہو تو واپس چلا جاؤں''۔

''نہیں۔تم کل صبح واپس جانا۔اب جاؤ اور شانتا کو یہاں بھیج دو''۔ٹھاکر نے کہا۔

رگھو نے ہاتھ جوڑ دیئے۔''جو حکم ان داتا''۔

باہر وصال دین گھر کی طرف بھاگ رہا تھا۔اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ اڑ کر ماں کے پاس پہنچ جائے۔

.....x.....

امتحان شروع ہونے میں ایک ہفتہ رہ گیا تھا۔گھر پر تیاری کا موقع دینے کے لئے کالج سے چھٹیاں مل گئی تھیں۔محمود اپنی ریاضی کی تیاری سے مطمئن نہیں تھا اور وہ جانتا تھا کہ اس مضمون میں اوتار سنگھ بہت اچھا ہے۔

کالج کے آخری دن اس نے اس سلسلے میں اوتار سنگھ سے بات کی۔مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے دوست''۔

''میں حاضر ہوں۔بتاؤ مجھے کیا کرنا ہے''۔اوتار سنگھ نے کہا۔

''مجھے ریاضی کی تیاری کرادو''۔

''بالکل کرادوں گا۔مگر تمہیں میرے گھر آنا ہوگا''۔

''جب کہو،آجاؤں گا''۔

اوتار سنگھ نے چند لمحے سوچا۔یوں اسے محمود سے بات کرنے کا موقع بھی مل جاتا۔''لیکن میں منہ مانگی فیس لوں گا''۔وہ بولا۔

''فیس میں تو مجھے اعتراض نہیں۔لیکن منہ مانگی فیس سے ڈر لگ رہا ہے۔نجانے تم کیا مانگ بیٹھو''۔محمود نے ہنستے ہوئے کہا۔''خیر.....مجھے منظور ہے۔بولو،کب آجاؤں''۔

''کل صبح کالج کے وقت پر آجاؤ۔میں سمجھوں گا کہ کالج کی چھٹیاں پرسوں سے شروع ہو رہی ہیں''۔

''یہ ٹھیک ہے۔پھر پرسوں سے پڑھائی کا اپنا اپنا شیڈول بنالیں گے''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

بات طے ہوگئی۔دونوں آخری پیریڈ اٹینڈ کرنے کیلئے چل دیئے

اگلے روز صبح نو بجے محمود اوتار سنگھ کے گھر پہنچ گیا۔

اوتار سنگھ کا پڑھائی کا کمرا گھر سے الگ تھلگ تھا۔دونوں وہاں جا بیٹھے۔اوتار سنگھ نے رنجنا سے کہہ دیا کہ ہر ایک گھنٹے کے بعد انہیں چائے کے لئے پوچھ لے۔

''اب بتاؤ،کہاں سے شروع کروں؟''۔اوتار سنگھ نے محمود سے پوچھا۔

''تم استاد ہو۔تم ہی فیصلہ کرو''۔محمود نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اوتار سنگھ چند لمحے سوچتا رہا۔''ایسا کرو کہ جو تمہیں مشکل لگتا ہو،اس پر نشان لگا دو۔وہ میں تمہیں سمجھا دوں گا''۔

''ٹھیک ہے''۔محمود نے کتاب میں نشان لگا کر کتاب اوتار سنگھ کی طرف بڑھا دی۔

''میتھس میں یہ آسانی ہے کہ ایک سوال میں تمہیں اچھی طرح سمجھا دوں.....ایسے کہ تم میتھڈ اچھی طرح سمجھ جاؤ تو اس کے بعد تم ہر سوال حل کر سکتے ہو۔بس میتھڈ سمجھتے وقت تکلف نہ کرنا۔کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو بار بار پوچھو۔یہاں تک کہ پوری طرح سمجھ جاؤ''۔

پڑھائی شروع ہوگئی۔محمود دل میں سوچ رہا تھا کہ یہاں کتنا سکون ہے۔اور وہ پڑھائی سے مطمئن بھی تھا۔اوتار سنگھ کو ریاضی پر مکمل دسترس تھی اور اس کا سمجھانے کا طریقہ بھی بہت سادہ اور دل نشیں تھا۔

وہ منہمک تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔''آجاؤ رنجنا''۔اوتار سنگھ نے سر اٹھائے بغیر ہا۔

رنجنا ان کے لئے چائے لے آئی تھی۔

.....x.....

اس روز صبح ہی سے حور بانو باورچی خانے میں گھسی ہوئی تھی۔عام حالات میں اس موسم میں باورچی خانے میں زیادہ دیر رکنا اسے گوارا نہیں تھا۔گرمی اسے دوسروں سے کچھ زیادہ ہی لگتی تھی۔

اس روز بھی گرمی کافی تھی۔وہ پسینے میں نہا رہی تھی۔چہرہ تمتما رہا تھا۔لیکن چولہے کے پاس سے ہٹنا اسے گوارا نہیں تھا۔بوا نے کئی بار کہا.....تم جاؤ بیٹا،ہم سنبھال لیں گے۔لیکن وہ نہ مانی۔

''نہیں بوا.....آج سبھی کچھ میں خود پکاؤں گی''۔اس نے کہا۔

''ہمیں تو لگتا ہے،گرمی سے بولا گئی ہو''۔بوا نے اسے ہمدردانہ نظروں سے دیکھا۔

بوا ہی نہیں،اماں بھی حیران تھیں۔حور بانو نے کھانا پکانے میں ایسی دل چسپی بھی نہیں لی تھی۔بلکہ اماں تو یہ سوچ سوچ کر اکثر بولتی رہتی تھیں کہ سسرال میں جا کر اس لڑکی کا کیا بنے گا۔پکانا تو یہ سیکھنا ہی نہیں چاہتی۔

''پریشان نہ ہوں بڑی بیگم۔وقت آئے گا تو سب کرنے لگیں گی بٹیا''۔بوا اماں کو دلاسا دیتیں۔

مگر آج اماں اس پر پریشان تھیں کہ تین چار قسم کے کھانے.....اور یہ لڑکی مصر ہے کہ سب کچھ خود ہی پکائے گی۔وجہ بھی ان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

یہ سچ تھا کہ حور بانو کو کھانا پکانے میں دل چسپی نہیں تھی۔لیکن یہ تو چھوٹے ٹھاکر کے لئے کھانا پکانے کا اعزاز تھا۔اسے وہ کیسے کسی کے ساتھ بانٹ لیتی۔یہ موقع تو قسمت نے اسے دیا تھا۔ایسا موقع جس کے بارے میں اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔

اور وہ مطمئن تھی کہ اماں کو نہیں معلوم.....نہیں معلوم کہ اسے بھی معلوم ہے۔اس نے تو بس اتفاقاً ہی اماں سے رنجنا کی گفتگو سن لی تھی۔

رنجنا پچھلی رات آئی تھی اور اماں کے پاس بیٹھ گئی تھی۔حور بانو اس وقت معمول کے مطابق برآمدے میں تھی۔

''بڑی بیگم.....میں اپنے چھوٹے ٹھاکر کی ایک بنتی لے کر آئی ہوں''۔رنجنا نے جھجکتے ہوئے کہا۔

چھوٹے ٹھاکر کا نام سن کر حور بانو کے کان کھڑے ہوئے۔وہ ہمہ تن سماعت ہوگئی۔لفظ''بنتی''نے اس کے تجسس کو اور بھڑکا دیا تھا

''کیسی بنتی؟''۔اماں نے کہا۔

''چھوٹے ٹھاکر کہتے ہیں کہ آپ ان پر اپکار کریں.....''۔

''ارے.....تم لوگ اتنا تکلف کیوں کرت ہو ہم سے۔کہو نا،کیا بات ہے۔دیکھو نا،کرائے دار ہونے کے علاوہ تم لوگ پردیسی ہونے کے ناطے ہمارے مہمان بھی ہو۔اور پڑوسی بھی ہو۔تمہارا تو بہت حق ہے ہم پر''۔

رنجنا اب بھی ہچکچا رہی تھی۔کچھ اصرار کے بعد وہ بولی تو اس کے لہجے میں شرمندگی تھی۔''بڑی بیگم،کھانا تو میں اچھا بناتی ہس۔آپ نے بھی کھای ہے نا میرے ہاتھ کا۔آپ ہی بتائیں.....''۔

''بہت اچھا پکاتی ہو تم۔پر بات کیا ہے؟''۔

''کل چھوٹے ٹھاکر کا کوئی دوست آرہا ہے۔لگتا ہے،چھوٹے ٹھاکر کو مجھ پر بھروسا نہیں۔وہ کہتے ہیں کہ آپ کل ان دونوں کے لئے کھانا بھجوا دیں''۔

''ارے تو اس میں اتنا جھجکنے کی کیا بات ہے''۔

''وہ دوست مسلمان ہے نا۔تو آپ ایسا کھانا بھجوائیں جو آپ کے ہاں پکتا ہے۔بے شک ماس ہو''۔

اماں کی سمجھ میں بات آگئی۔''تمہارے چھوٹے ٹھار بہت اچھے ہیں''۔انہوں نے کہا۔''تمہارے کھانے میں خرابی نہیں۔مسلمان دوست کے لحاظ میں انہوں نے ہم سے فرمائش کی ہے کہ ممکن ہے ان کا دوست تمہارے ہاتھ کا کھانا نہ کھائے''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

''اوہو.....یہ بات ہے''۔رنجنا نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ تو بڑی بیگم،آپ کردیں گی نا یہ کام''۔

''سر آنکھوں پر۔اور مجھے خوشی ہوگی۔تم بے فکر ہو جاؤ اور چھوٹے ٹھاکر سے کہنا کہ پریشان نہ ہوں۔انشااللہ انہیں شرمندگی نہیں ہوگی''۔

یہ سن کر حور بانو نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ سب کچھ وہ خود اپنے ہاتھوں سے بنائے گی۔اس رات وہ سو ہی نہیں سکی۔صبح نماز اور تلاوت قرآن کے بعد وہ معمول کے مطابق کچھ دیر لیٹنے کے بجائے باورچی خانے میں چلی آئی،جہاں اماں آکا میاں کو سودے کی تفصیل بتا رہی تھیں،جو انہیں لانا تھا۔

''اماں.....آج کھانا میں پکاؤں گی''۔اس نے اماں سے کہا۔

اماں خوش ہوگئیں۔مگر ان کی نگاہوں میں حیرت تھی۔''یہ شوق تمہیں کب سے ہوگیا؟''۔

''بس اماں،آج جی چاہ رہا ہے''۔

''آج نہیں.....یہ شوق پھر بھی کبھی پورا کر لینا۔آج زیادہ چیزیں پکانی ہیں نا''۔

''کیا کیا پکے گا؟''۔

''پلاؤ،کوفتے،شامی کباب اور میٹھے میں کھیر''۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔میں ایک ہی دن میں اتنا کچھ سیکھ لوں گی''۔حور بانو نے خوش ہو کر کہا۔

''نہیں بھئی۔یہ تجرباتی کھانا نہیں ہے۔کہیں بھیجنا ہے''۔

''آپ بس مجھے ترکیب بتا دیجئے گا۔سارا کام میں ہی کروں گی''

اماں نہیں مان رہی تھیں۔مگر اس نے انہیں منا کر ہی دم لیا۔اماں نے بھی شاید یہ سوچ کر مان لیا کہ ''شوق کا بھوت گرمی میں ذرا دیر میں اتر جائے گا۔لیکن حور بانو باورچی خانے میں ایسی ڈٹی کہ نکلنے پر آمادہ ہی نہیں ہوئی۔

اب صورت حال یہ تھی کہ کوفتے تیار ہو چکے تھے۔کھیر برف میں لگا دی گئی تھی۔پلاؤ دم پر تھا۔

''اچھا.....اب تم کچھ دیر ہوا میں جا بیٹھوں بیٹا۔صرف کباب رہ گئے ہیں۔وہ میں تل لوں گی''۔بوا نے پھر پیش کش کی۔

''واہ بوا.....سب کچھ کرنے کے بعد میں آخر میں کیوں ہٹوں۔کباب بھی میں ہی تلوں گی''۔اس نے جواب دیا۔

''اے دیکھو تو.....انگارہ ہو رہی ہو''۔

''ہونے دو بوا۔بس اب کام ہی کتنا ہے''۔

آدھے گھنٹے کے بعد سب کچھ تیار ہوگیا۔اس نے اپنے ہاتھوں سے کھانا قابوں میں منتقل کیا۔روٹیاں دسترخوان میں لپیٹیں اور سینی تیار کر دی۔''لو بوا.....اب یہ کھانا اوپر لے جاؤ''۔اماں نے سینی کو خوان سے ڈھانپتے ہوئے کہا۔

.....x.....

محمود نے ہاتھ پھیلا کر انگڑائی لی اور اوتار سنگھ کو بڑی ممنونیت سے دیکھا۔''میں تمہارا شکر گزار ہوں اوتار سنگھ''۔

''اس کی ضرورت نہیں''۔اوتار سنگھ مسکرایا۔''یہ بتاؤ کہ اب تم مطمئن ہوں''۔

''بالکل۔مطمئن بھی اور پر اعتماد بھی۔تم نے دیکھا نہیں کہ طریقہ میری سمجھ میں آگیا ہے۔تمہارے دیئے ہوئے سوال میں نے تمہاری مدد کے بغیر حل کر لئے''۔

''ہاں۔میں بھی مطمئن ہوں''۔

''بس اب میں چلوں گا''۔

''ایسے کیسے جا سکتے ہو۔ابھی تو تمہیں میری فیس دینی ہے''۔

''کب لوگے؟''۔

''میں تو آج ہی لینا چاہتا ہوں''۔

''اچھا بتاؤ تو،تمہاری فیس کیا ہے''۔

''ابھی نہیں۔کھانے کے بعد بتاؤں گا''۔

''کھانا! سنو اوتار سنگھ اس تکلف کی ضرورت نہیں۔میں نے ناشتا بہت اچھا کیا تھا۔ابھی بھوک بھی نہیں ہے۔کھانا گھر جا کر کھاؤں گا''۔

''تب تو میری فیس بھی نہیں دے سکو گے۔مجھے تم سے جو کچھ لینا ہے،اس میں بھی وقت لگے گا''۔

''کوئی بات نہیں۔تم بتاؤ تو۔مگر کھانا میں نہیں کھاؤں گا''۔

''یہ کیسے ممکن ہے۔ہم راج پوتوں کی روایت ہے کہ مہمان کو کھانا کھلائے بغیر نہیں جانتے دیتے''۔

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی۔پھر رنجنا نے دروازہ کھول کر جھانکا۔''بھوجن لے آؤں چھوٹے ٹھاکر؟''۔

''ہاں.....لے آؤ''۔

رنجنا دروازہ بند کر کے جانے کے بجائے اندر چلی آئی۔اس کے ہاتھ میں پانی کی سلفچی اور تولیا تھا۔

''لو.....ہاتھ دھولو محمود''۔

محمود ہچکچا رہا تھا۔تاہم اس نے ہاتھ دھوئے اور تولئے سے خشک کئے۔''میں سچ کہہ رہا ہوں اوتار سنگھ،مجھے بھوک نہیں ہے''۔

''چلو دو چار لقمے لے لینا''۔اوتار سنگھ نے تولئے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا۔پھر رنجنا کی طرف مڑا۔''جاؤ.....کھانا لے آؤ''

رنجنا چلی گئی۔محمود اب بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا۔اس کے چہرے پر کشمکش تھی۔''برا مت ماننا اوتار سنگھ۔میں کھانا نہیں کھا سکتا''۔

اوتار سنگھ نے اسے بہت غور سے دیکھا۔''دھرم کی وجہ سے؟''۔اس نے پوچھا۔

محمود نے جواب نہیں دیا۔بس اثبات میں سر ہلا دیا۔اوتار سنگھ کی نظریں اسے اپنے وجود میں چبھتی محسوس ہو رہی تھیں۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''تمہیں پتا ہے، میرے ساتھ ایک مسلمان رہتا ہے۔ بچپن سے ہم ساتھ رہے ہیں۔ کبھی جدا نہیں ہوئے۔ میں اسے ویر جی کہتا ہوں، اپنا بھائی مانتا ہوں۔ اس کے امتحان ختم ہو چکے ہیں اور وہ گاؤں چلا گیا ہے۔ ورنہ میں اس سے تمہیں ملواتا''۔

''اپنی اپنی سوچ ہوتی ہے۔ کسی کا دل نہ مانے تو وہ کیا کرے''۔ محمود نے مدافعانہ انداز میں کہا۔

اتنے میں رنجنا سینی لے آئی اور کھانا میز پر سلیقے سے رکھنے لگی۔ پھر وہ جا کر پانی لے آئی۔

''چلو محمود..... آ جاؤ''۔ رنجنا کے جانے کے بعد اوتار سنگھ نے کہا

''میں معذرت خواہ ہوں اوتار سنگھ''۔

''ہم راج پوت مہمان نوازی جانتے ہیں محمود''۔ اوتار سنگھ نے کہا۔ ''یہ کھانا میرے گھر میں نہیں پکا ہے۔ یہ کسی ہندو نے نہیں، مسلمان نے پکایا ہے۔ اب بس تمہیں میرے ساتھ بیٹھنے پر اعتراض ہو سکتا ہے۔ یہ بات ہے تو میں بعد میں کھا لوں گا۔ تم اطمینان سے بیٹھ جاؤ''۔

محمود شرمندہ ہو گیا۔ ''اتنی زحمت کی تم نے.....''۔

''میں نے کی نہیں، زحمت دی۔ یہ جن کے مکان میں ہم رہ رہے ہیں، مسلمان ہیں۔ میں نے رات کو کہلوا دیا تھا۔ یہ سب کچھ انہوں نے ہی پکا کر بھیجا ہے۔ اور کھانے بھی تم لوگوں کے ہی ہیں''۔

محمود کھانے کی میز پر جا بیٹھا۔ ''آؤ نا اوتار سنگھ''۔

''تم کھاؤ۔ میں بعد میں کھا لوں گا''۔

''جو تم سمجھ رہے ہو، وہ بات نہیں ہے''۔ محمود نے کہا۔ ''آؤ۔ تمہارے بغیر میں کھانا نہیں کھاؤں گا''۔

اوتار سنگھ بھی کھانے پر بیٹھ گیا۔

کھانا بہت لذیذ اور خوش ذائقہ تھا۔ ہر چیز اپنی جگہ لاجواب تھی۔ ایسی کہ چھوڑنے کو دل ہی نہ چاہے۔ دونوں نے خوب ڈٹ کر کھایا۔

''پیٹ بھر گیا۔ نیت نہیں بھری''۔ محمود نے کہا۔

''ادھر بھی یہی حال ہے''۔ اوتار سنگھ بولا۔ ''ویسے تم لوگوں کے کھانے بہت مزے دار ہوتے ہیں''۔

''اب تو نیند آنے لگی۔ کچھ کرنے کے قابل ہی نہیں رہا میں''۔

''تو چلو۔ پاؤں پھیلا کر لیٹ جاؤ ذرا دیر''۔

دونوں مسہری پر نیم دراز ہو گئے۔ ''ہاں..... اب اپنی فیس کی بات کرو''۔ محمود نے کہا۔

''میں تمہارے مذہب کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں''۔ اوتار سنگھ نے سادگی سے کہا۔

محمود کے لئے اس کی بات یکسر خلاف توقع تھی۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ''کیوں جاننا چاہتے ہو؟''۔

''صحیح اور غلط میں تمیز کرنے کے لئے''۔ اوتار سنگھ نے کہا۔ پھر پوچھا۔ ''تمہیں کوئی اعتراض ہے؟ تمہارا مذہب منع کرتا ہے تمہیں اس سے''۔

''نہیں، ہرگز نہیں۔ بلکہ اللہ کا حکم ہے کہ اسکے دین کو پھیلانے کے لئے کام کیا جائے۔ لوگوں کو بتایا جائے تا کہ وہ سیدھی راہ اختیار کریں''۔

''تو مجھے بتاؤ''۔

محمود چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا۔ ''یوں بتانا تو بہت مشکل ہے۔ اور میں کوئی عالم بھی نہیں ہوں۔ ایسا کرو، تم مجھ سے پوچھتے رہو، جو مجھے معلوم ہو گا اور جتنا معلوم ہو گا، میں بتا دوں گا''۔

''ٹھیک ہے۔ پہلے تم مجھے اللہ کے بارے میں بتاؤ۔ تم اپنے خدا کو اللہ کیوں کہتے ہو؟''۔

''یہ اللہ کا اسم ذات ہے اور خود اللہ نے ہمیں یہ بات بتائی ہے.....''

اوتار سنگھ پوچھتا رہا اور محمود بتاتا رہا۔ اس نے اللہ کی صفات اور اس کی کتابوں کے بارے میں بتایا۔ فرشتوں کے..... انبیائے کرام اور پیغمبروں کے بارے میں بتایا۔ اسلام کی تعلیم اور احکامات کے بارے میں بتایا۔ اوتار سنگھ جس دل چسپی سے سن رہا تھا اور سمجھ بھی رہا تھا وہ اس کے لئے حیران کن بھی تھا اور خوش کن بھی۔ محمود کو اندازہ ہوا کہ کچھ کچھ یہ سب اوتار سنگھ کے ذہن میں پہلے سے ہے۔

''اللہ کی کتاب تو عیسائیوں کے پاس بھی ہے''۔ اوتار سنگھ نے کہا

''اس وقت تین قومیں ایسی ہیں، جن کے پاس اللہ کا کلام موجود ہے۔ مسلمان، عیسائی اور یہودی''۔ محمود نے جواب دیا۔

''تو ان کو تو ایک ہونا چاہئے تھا''۔ اوتار سنگھ نے اعتراض کیا۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کا ظاہری سبب قوموں کا تعصب اور ان کی اجتماعی فطرت کی کمزوریاں ہیں۔ اللہ کی کتاب بھی اس کے متعلق بتاتی ہے اور تاریخ بھی اس کی تائید کرتی ہے''۔

''لیکن اللہ نے تین کتابیں کیوں اتاریں۔ ایک کتاب ہوتی تو یہ تقسیم اور تفریق ہوتی ہی نہیں''۔

محمود گھبرایا..... لرز کر رہ گیا۔ اوتار سنگھ کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے اسے یہ احساس ہو گیا کہ یہ سوال بدنیتی سے نہیں، بلکہ خلوص سے کیا گیا ہے۔ لیکن اپنے عجز علم کی وجہ سے وہ اس کا جواب دینے سے معذور تھا۔

اچانک اس بے بسی کے عالم میں اسے اپنے اندر روشنی سی پھوٹتی محسوس ہوئی۔ اس نے بے ساختہ کہا۔ ''اوتار سنگھ، تم تو زمین دار گھرانے سے تعلق رکھتے ہو۔ یہ بتاؤ، فصل کس چیز سے تیار ہوتی ہے''

''بیج سے''۔ اوتار سنگھ نے بلا جھجک کہا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''سخت پتھریلی زمین میں بیج ڈالا جائے تو فصل اترے گی؟''۔

''نہیں''۔

''تو اس کے لئے کیا کرنا ہوگا؟''۔

''پہلے اس زمین پر محنت کرنی ہوگی۔ پتھر نکالنے ہوں گے۔ زمین نرم ہوگی تو اس میں ہل چلائیں گے۔ اسے پانی دیں گے۔ تاکہ زمین بیج قبول کرنے کے لئے تیار ہو جائے''۔

''اور زمین تیار ہوتے ہی بوائی کر دیں گے؟''۔

اوتار سنگھ نے چند لمحے سوچا۔ پھر بولا۔''نہیں.....موسم کا انتظار کرنا ہوگا''۔

''یعنی مناسب وقت کا''۔ محمود نے وضاحت کی۔ پھر بولا۔''اب میں تمہیں سمجھا سکتا ہوں۔ اللہ نے حضرت آدمؑ اور بی بی حوا کو زمین پر اتارا اور ان کی نسل میں برکت عطا فرمائی۔ لیکن جلد ہی انسان گمراہی میں پڑنے لگا۔ اور اس کی گمراہی بہت تیزی سے بڑھتی گئی۔ تاریخ کا مطالعہ کریں تو پتا چلتا ہے کہ معاشرے کس درجہ خراب ہو گئے تھے۔ ارباب اقتدار سفاک تھے۔ انسانوں کو انسان نہیں سمجھا جاتا تھا۔ انسان کو انسان سے اور بھوکے درندوں سے لڑانا امرا کی تفریح تھی۔ اخلاقی انحطاط آخری حدوں کو پہنچ چکا تھا۔ مختصر یہ کہ معاشرے سنگلاخ زمین سے زیادہ بری حالت میں تھے۔ ایسے میں ہدایت کا بیج کیسے پنپتا۔ پھر اللہ کی صفات میں رحمت اور حد درجہ نرمی ہے۔ اللہ انسان کو آسانیاں عطا فرماتا ہے اور بتدریج بہتری اور اصلاح کی طرف لے جاتا ہے۔ یہاں یہ بھی بتا دوں کہ آسمانی کتابیں صرف چار ہیں۔ لیکن تقریباً ہر پیغمبر پر صحیفے اترے۔ وہ مختصر اور غیر جامع تھے اور محفوظ نہ رہ سکے۔ رہ گئیں آسمانی کتابیں تو تورات بار بار تلف بھی ہوئی اور یہودی علما نے اس میں تحریف بھی کی۔ اسی طرح انجیل بھی اپنی اصل شکل میں موجود نہیں۔ البتہ قرآن پاک میں آج تک زیر زبر کا فرق بھی نہیں ہوا۔ اس لئے کہ اللہ نے خود اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا تھا''۔ محمود نے گہری سانس لی۔ پھر کچھ سوچنے کے بعد گویا ہوا۔'' کہنے کا مطلب یہ کہ معاشروں کے حد سے بڑھے ہوئے بگاڑ کی وجہ سے شاید اللہ نے اپنی شریعت بتدریج اور قسطوں میں اتاری۔ یہاں تک کہ ہمارے آخری پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو اللہ نے دین اور شریعت کو مکمل کر دیا۔ شریعت کے بتدریج مکمل ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ نزول اسلام کے ابتدائی عرصے میں شراب پی جاتی رہی۔ لیکن بعد میں قرآن پاک میں اسے حرام قرار دینے کا حکم آیا اور اس پر عمل درآمد ہوا''۔

''یہ بات اللہ نے بتائی؟''۔

محمود تھرا اٹھا۔'' یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ یہ میرا عقلی قیاس ہے اور اگر غلط ہے تو میں اس پر اللہ سے توبہ کرتا ہوں۔ وہ نیت کا حال جانتا ہے۔ میں نے صرف تمہیں سمجھانے کی غرض سے سوچا تو یہ بات میرے ذہن میں آئی۔ دیکھو نا.....اگر آدمی کو بہت ساری بری عادتیں ہوں تو انہیں ایک دم نہیں چھڑوایا جاتا کہ وہ گھبرا کر اصلاح قبول کرنے سے انکار کر دے گا۔ ایک ایک کر کے بری عادتیں چھڑائی جائیں تو اس کیلئے آسانی ہوگی۔ اور ایک برائی چھوڑنے اور ایک اچھائی اپنانے کے نتیجے میں آدمی میں برائی کے لئے کراہت اور اچھائی کے لئے قبولیت پیدا ہوتی ہے۔ ہر مزید برائی چھوڑنے کے بعد وہ قبولیت بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ آدمی کی مکمل اصلاح ہو جاتی ہے۔ میری سمجھ میں تو یہی آتا ہے''۔

اوتار سنگھ نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھا۔'' بات تو میری سمجھ میں بھی آ گئی''۔

محمود نے اوتار سنگھ کو وحی کے بارے میں بتایا۔ اوتار سنگھ کے لئے وحی کو سمجھنا اور اس تصور کو قبول کرنا فطری طور پر آسان تھا۔ سائنسی ایجادات اور دریافتوں پر غور کرتے ہوئے برسوں پہلے اس نے سوچا تھا کہ اوپر والے نے ذہن میں خیال پیدا کر کے رہنمائی کی ہوگی۔ وحی کی وضاحت سے اس کے قیاس کی تائید ہوتی تھی۔

''اچھا.....ہم ہندو تو مشرک ہیں۔ بتوں کو پوجتے ہیں''۔ اوتار سنگھ نے کہا۔''لیکن عیسائی تو اہل کتاب ہیں۔ تم لوگ بھی یہ کہتے ہو۔ انہیں تو ایک خدا کو ماننا چاہئے۔ مگر وہ بھی بت بناتے ہیں۔ تصویروں کو پوجتے ہیں''۔

''اسی لئے تو اللہ نے تصویروں اور بتوں کو بنانے سے منع فرمایا ہے''۔ محمود نے کہا۔

''یہ مجسمے اور تصویریں فرضی ہوں گے۔ میں نے یہ بات رچرڈ پارسن سے بھی پوچھی تھی۔ وہ برا مان گیا۔ میرا کہنا یہ ہے کہ یہ تصویریں اور مجسمے بعد میں بنائے گئے ہوں گے۔ ابتدائی زمانے میں تو یہ فنون ڈیولپ ہی نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے یہ اصلی تو نہیں ہو سکتے''۔

''نہیں اوتار سنگھ، تاریخ بتاتی ہے کہ مصوری اور بت تراشی قدیم ترین فنون میں سے ہیں۔ انسان نے بولنا بعد میں سیکھا۔ تصویر اور بت بنانا پہلے شروع کیا تھا۔ اہمیت اس بات کی نہیں کہ وہ مجسمے اور تصویریں فرضی ہیں۔ اصلی نہیں۔ اللہ نے ان کی ممانعت اسی لئے فرمائی ہے کہ شرک کا امکان پیدا ہوتا ہے اور شرک وہ گناہ ہے، جسے اللہ بھی معاف نہیں کرتا''۔

''کبھی بھی نہیں، کسی بھی صورت میں نہیں؟''۔ اوتار سنگھ کی آواز میں لرزش تھی۔

محمود نے چونک کر اسے دیکھا اور فوراً ہی بات سمجھ گیا۔''مطلب یہ ہے کہ جو ایمان لے آیا، اس کو اللہ نے اس شرک پر معاف کر دیا جو وہ پہلے کرتا رہا۔ لیکن ایمان لانے کے بعد شرک کیا تو اس پر اسے معاف نہیں کیا جائے گا اور جو مشرک جیا اور مشرک ہی مر گیا، وہ تو ہے ہی مجرم''۔

''اور یہ جو عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں.....''

''یہ تو بدترین شرک ہے۔ اس کی تفصیل میں جانے کی میں ضرورت نہیں سمجھتا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ اللہ نے بتایا ہے کہ وہ واحد ہے، احد ہے۔ اس کی کوئی مثال نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ نہ وہ کسی سے ہے اور نہ کوئی اس سے ہے۔ ہم اسکے بارے میں اتنا ہی جانتے ہیں، جتنا اس نے ہمیں بتایا ہے۔ ہم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ ہاں اسے ہر جگہ، خود اپنے اندر محسوس کر سکتے ہیں''۔

اوتار سنگھ کو حیرت ہوئی۔ کم و بیش اس کا تصور بھی یہی تھا۔

''اب وقت کافی ہو گیا ہے اوتار سنگھ''۔ محمود نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔''اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ اس موضوع پر پھر کبھی امتحانوں کے بعد بات کرینگے بلکہ میں تو کہوں گا کہ اگر تم مذاہب کے بارے میں اور خاص طور اسلام کے بارے میں جاننا چاہتے ہو تو کسی عالم سے بات کرو۔ میری معلومات تو بہت محدود ہیں''۔

''تمہارا بہت شکریہ دوست۔ جو کچھ تم نے مجھے آج دیا، وہ میرے لئے بہت قیمتی ہے''۔ اوتار سنگھ نے اٹھتے ہوئے کہا۔''آؤ چلیں''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

اوتار سنگھ محمود کو رخصت کر کے آیا تو اس کی سوچوں کو ایک نیا رخ مل چکا تھا۔

ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وصال دین نگاہیں نیچی کیے بیٹھا تھا۔ پچھلے ایک ہفتے میں ٹھاکر اس معمول کا عادی ہو چکا تھا۔ وصال دین پہلے دن دو بار اس کے پاس آیا تھا۔ ایک بار شام کے وقت اور دوسری بار رات کا کھانا کھانے کے بعد۔

پہلی بار وہ آیا تو زمین پر بیٹھ گیا۔ ''اوپر بیٹھ پتر وصال دین''۔ ٹھاکر نے بڑی شفقت سے کہا۔

''نہیں ٹھاکر جی، میں یہیں ٹھیک ہوں''۔ وصال دین نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔

''میں جو کہہ رہا ہوں.....''۔

''معاف کیجئے ٹھاکر جی، ابا نے مجھے یہی حکم دیا ہے''۔

ٹھاکر مسکرا دیا۔ بیٹا باپ سے آگے جا رہا تھا۔ اسے وہ رات یاد آ گئی، جب جمال دین پہلی بار اس کی خواب گاہ میں تھا۔ وصال دین اس وقت بہت چھوٹا تھا اور باپ کے ساتھ آیا تھا۔ یہ وہ رات تھی، جب ٹھاکر ان تینوں کو سوتے سے اٹھا کر اپنے ساتھ حویلی لایا تھا..... جب حمیدہ نے پہلی بار اوتار سنگھ کو دودھ پلایا تھا۔ جمال دین اوپر بستر پر لیٹنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ بلکہ اس کا بس چلتا تو سوتے ہوئے وصال دین کو بھی بستر سے اٹھا کر نیچے فرش پر لٹا دیتا۔

''اور میں حکم دے رہا ہوں کہ تم اوپر بیٹھو''۔ ٹھاکر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وصال دین کشمکش میں پڑ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔ بالآخر اس نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ ''آج معاف کر دیجئے۔ کل میں ابا سے پوچھ کر آؤں گا''۔

ٹھاکر کو اس کی عقل مندی پر ہنسی آ گئی۔ تاہم اس نے خود کو بڑی مشکل سے روکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں ابھی جا کر جمال دین سے شکایت کرتا ہوں کہ وصال دین میرا حکم ماننے سے انکار کر رہا ہے''۔

''ایسا نہ کریں ٹھاکر جی''۔ وصال دین بھی گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اچھا جی، میں بیٹھ جاتا ہوں''۔ وہ کرسی پر بیٹھا کیا، بس ٹک گیا۔ انداز ایسا تھا کہ کسی بھی لمحے اٹھ کر بھاگ کھڑا ہوگا۔ نگاہیں اس کی اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔

ٹھاکر بھی بیٹھ گیا اور غور سے اسے دیکھتا رہا۔ ''دیکھ وصال دین، جیسے اوتار سنگھ میرا پتر ہے، ویسے ہی تو بھی ہے۔ میں تجھے اپنا بیٹا ہی سمجھتا ہوں''۔

''یہ تو آپ کی بڑائی ہے ٹھاکر جی''۔

''اچھا یہ بتا، تعلیم نے تجھے یہ نہیں سکھایا کہ سب انسان برابر ہوتے ہیں''۔

''تعلیم تو اچھی چیز ہے ٹھاکر جی۔ ادب لحاظ ختم نہیں کرتی۔ اور ٹھاکر جی، عزت سب کی ایک جیسی نہیں ہوتی، کسی کو اللہ نے زیادہ عزت دی ہے اور کسی کو کم۔ اور پھر ماں باپ کا حکم ماننا تو ضروری ہے۔ تعلیم بھی یہی سکھاتی ہے''۔

ٹھاکر کو اپنے بیٹے کا خیال آ گیا۔ کیا وہ بھی ایسا ہی ہے..... باپ کا حکم ماننے والا۔ میرے اندر جو تبدیلی آئی ہے، کیا اوتار سنگھ اسے قبول کر لے گا؟ کیا وہ خود بھی اپنے اندر وہ تبدیلی لائے گا؟ ان سوالوں کا جواب تو وقت ہی دے سکتا تھا۔ اور ٹھاکر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بیٹے کو اپنی تبدیلی کے بارے میں بتانے کو بے تاب تھا۔ مگر وہ بیٹے کے اختلاف کے امکان سے ڈر بھی رہا تھا۔ اگر اس نے اختلاف کیا تو کیا ہوگا؟ وہ تو بہت بڑی آزمائش ہوگی اسکے لئے۔

ٹھاکر نے اس سے پہلے نہ تو وصال دین کو کبھی بہت غور سے دیکھا تھا، نہ ہی اس کے ساتھ کبھی اتنا وقت گزارنے کا اتفاق ہوا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اسے بہت قریب سے دیکھ رہا تھا۔

پہلے دن ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ بیٹا باپ سے بہت آگے ہے۔ جمال دین بہت کم گو تھا لیکن وصال دین سے موازنہ کرتے ہوئے اسے بڑی آسانی سے باتونی قرار دیا جا سکتا تھا۔ وہ تو بولتا ہی نہیں تھا۔ سوال کیا جاتا تو مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو جاتا۔ ایک فرق تھا۔ جمال دین کی نظریں اس کے سامنے ہمیشہ جھکی رہتی تھیں جبکہ وصال دین کی موجودگی میں اسے دیکھے جانے کا احساس مسلسل ہو رہا تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ نظریں اسے اپنے وجود میں چبھتی ہوئی محسوس نہیں ہو رہی تھیں۔ بلکہ اسے سہلائے جانے کا..... گدگدی کا احساس دلا رہی تھیں۔ وہ ناگوار ہرگز نہیں تھیں۔

کئی بار ٹھاکر نے اچانک نظریں اٹھا کر وصال دین کو دیکھا۔ مگر وصال دین کو بدستور فرش کی طرف دیکھتے پایا۔ اسے خود بھی شبہ ہونے لگا کہ دیکھے جانے کا احساس محض اس کا وہم تھا۔ لیکن نظریں ہٹانے کے بعد وہ احساس پہلے سے زیادہ توانا ہو جاتا تھا۔

دیر تک نظروں کی چوری کا معاملہ چلتا رہا۔ مگر بالآخر ایک موقع پر نظروں کی وہ چوری پکڑی گئی۔ وصال دین کو نظریں جھکانے میں ایک ثانیئے کی تاخیر ہو گئی تھی ٹھاکر کو اپنی طرف متوجہ پایا تو اس نے گڑبڑا کر نظریں جھکا لیں۔

مگر ٹھاکر اسے دیکھ چکا تھا۔ اور ٹھاکر کو خوش گوار حیرت ہوئی تھی۔ اس ایک ثانیئے میں اس نے وصال دین کی آنکھوں سے چھلکتی، برستی محبت دیکھ لی تھی۔ ایسی نظروں سے تو کوئی بیٹا اپنے باپ کو ہی دیکھ سکتا ہے۔

ٹھاکر کے اپنے احساسات بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ اس ذرا سی دیر میں اس نے سمجھ لیا تھا کہ وصال دین کا پاس بیٹھنا اسے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ اس پر اسے اوتار سنگھ جیسی ہی محبت آ رہی تھی۔ اور اس کی موجودگی میں اوتار سنگھ کی یاد جدائی والی..... تکلیف دہ یاد نہیں تھی۔

''پتر وصال دین، کچھ کھاؤ گے؟''۔ اس نے غیر معمولی شفقت سے پوچھا۔

''نہیں ٹھاکر جی، شکریہ''۔ وصال دین نے مختصر سا جواب دیا۔

''تم تکلف کرتے ہو پتر؟''۔

''نہیں ٹھاکر جی۔ میں گھر سے کھانا کھا کر آیا تھا''۔

اس پر ٹھاکر کو حمیدہ اور جمال دین کا خیال آ گیا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

ایک سال بعد وہ گھر آیا تھا اور پہلے ہی دن ماں باپ کے ساتھ گزارنے کے بجائے اس کی دل جوئی کے لئے حویلی چلا آیا تھا۔ ٹھاکر جانتا تھا کہ وصال دین کے آنے میں اس کے ماں باپ کی مرضی بھی شامل ہوگی۔ وہ جانتا تھا کہ ان کی طبیعت میں کتنا ایثار ہے۔

ٹھاکر نے خود کو ان کی جگہ رکھ کر سوچا۔ اوتار سنگھ چھٹیوں میں گھر آتا تھا تو اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ہر پل اس کی نظروں کے سامنے رہے۔ اور اوتار سنگھ چھٹیوں میں گھر سے کم ہی نکلتا تھا۔ ہاں اس کی پڑھائی کی مصروفیات جاری رہتی تھیں۔ خود ٹھاکر بھی اپنے کاموں میں لگا رہتا تھا کہ زندگی یہی ہے۔ وہ اس میں خوش رہتا تھا کہ اس کا بیٹا گھر میں موجود ہے اور وہ جب چاہے، جا کر اسے دیکھ سکتا ہے۔

وہ جانتا تھا کہ حمیدہ نے اوتار سنگھ کو دودھ پلایا ہے اور وہ اس سے کتنی محبت کرتی ہے۔ لیکن اس نے کبھی اوتار سنگھ سے نہیں کہا کہ ہر روز جا کر حمیدہ سے ضرور مل آیا کرے۔

اسے شرمندگی ہونے لگی۔ جمال دین اور حمیدہ کے مقابلے میں وہ کتنا کم ظرف تھا!

''پتر وصال دین، تم حمیدہ اور جمال دین کے ساتھ وقت گزارنے کے بجائے میرے پاس چلے آئے۔ یہ تو زیادتی ہے''۔ اس نے کہا۔

''نہیں ٹھاکر جی۔ پورا دن تو میں اماں اور ابا کے ساتھ رہا ہوں۔ ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا ہے''۔

''پھر بھی۔ ان کا دل تو نہیں بھرتا ہوگا تمہیں دیکھتے سے''۔

''اماں تو مجھ سے کہتی ہیں ٹھاکر جی کہ ہمارے ساتھ زیادہ وقت نہیں گزارا کر۔ نہیں تو عادت ہو جائے گی۔ کہہ رہی تھیں، عادت ہو جائے تو شہر جانے کے بعد کے بہت سے دن بڑے سخت لگتے ہیں۔ بڑی مشکل سے عادت ہوتی ہے۔ وہ کہتی ہیں..... جا کہیں گھوم پھر آ وصال دین''۔

ٹھاکر اس دلیل کو جانتا تھا۔ جب اسکول جانے کے بعد اوتار سنگھ پہلی بار چھٹیوں میں گاؤں آیا تھا تو اس نے یہی سوچ کر اپنی مصروفیات اور بڑھا لی تھیں کہ عادت نہ ڈالنا ہی اچھا ہے۔

تھوڑی دیر اور بیٹھنے کے بعد وصال دین پہلو بدلنے لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن کہنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ ٹھاکر نے یہ بات بھانپ لی اور اس کی مشکل آسان کر دی۔

''کیا بات ہے پتر وصال دین؟''۔

''مجھے اجازت دیں ٹھاکر جی۔ میں گھر جاؤں گا''۔

''اجازت کی کیا بات ہے پتر۔ چلے جاؤ''۔

وصال دین اٹھا۔ جاتے جاتے وہ پلٹا اور ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''ٹھاکر جی، رات کو میں آپ کے پاس آؤں تو آپ کو برا تو نہیں لگے گا؟''۔

''میں نے کہا نا پتر، یہ تمہارا گھر ہے۔ جب چاہو آؤ''۔

''میں رات کو کھانے کے بعد آؤں گا''۔

''کھانا یہیں کھا لینا پتر..... میرے ساتھ''۔ ٹھاکر نے بے ساختہ کہا۔ کہتے ہی اسے غلطی کا احساس ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ فرماں برداری میں اگر وصال دین مان بھی گیا تو بھوکا ہی اٹھے گا۔ وہ اس کی موجودگی میں بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ کھانا کیا کھاتا۔

''وہ ٹھاکر جی..... جب سے آیا ہوں، ابا میرے بغیر کھانا نہیں کھاتے''۔ وصال دین کے لہجے میں معذرت تھی۔

''مجھے خیال نہیں رہا تھا پتر۔ ٹھیک ہے۔ تم کھانا کھا کر آنا''۔

وصال دین کے چہرے پر تشکر کا تاثر بے حد واضح تھا۔ پھر وہ پلٹا اور کمرے سے نکل گیا۔

رات کو وہ پھر آیا اور اس طرح نظریں جھکا کر بیٹھ گیا۔ ٹھاکر کے لئے وہ مطالعے کا وقت تھا۔ وہ بیٹھا پڑھتا رہا۔ اسے بداخلاقی کا احساس ہو رہا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ وصال دین بات کرنے والا ہے ہی نہیں۔ وہ صرف اس کے سوالوں کا جواب دے گا۔ اور سوال وہ کتنے کر سکتا ہے۔ اصل میں ان کے درمیان مشترک کچھ تھا ہی نہیں۔ وہ بات کیا کرتے۔

پھر بھی بداخلاقی کے احساس کو کم کرنے کے لئے ٹھاکر نے کئی بار اس سے چائے شربت کا پوچھا۔ مگر وصال دین نے ہر بار یہی کہا کہ اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ ضرورت ہوئی تو وہ خود مانگ لے گا۔

یوں وہ قربت ٹھاکر پرتاب سنگھ کو بوجھل لگنے لگی۔ اس حد تک کہ مطالعے میں بھی اس کا انہماک متاثر ہونے لگا۔ بلکہ ایسا ہوا کہ آخر میں جو وہ پڑھ رہا تھا، وہ اس کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا۔

بالآخر اس نے کتاب بند کر کے رکھ دی۔ بات کرنے کو اوتار سنگھ کے سوا کوئی موضوع نہیں تھا۔ چنانچہ وہ وصال دین سے اوتار سنگھ کے بارے میں پوچھنے لگا۔ وہ کیا کرتا ہے..... کیا مصروفیات ہیں..... صحت کیسی ہے..... کھانے پینے کا خیال رکھتا ہے یا نہیں۔

یہ ایک موضوع تھا، جس پر اوتار سنگھ اعتماد سے بات کر سکتا تھا۔ اوتار سنگھ کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے لہجے میں محبت چھلک رہی تھی۔ اس کے انداز میں وہ اپنائیت تھی، جو کسی بہت محبوب ہستی کے لئے ہوتی ہے۔

کچھ دیر گزری اور پھر وہی خاموشی۔ لیکن اتنی سی گفتگو ٹھاکر کو بتا گئی کہ وصال دین اوتار سنگھ کو کتنا چاہتا ہے۔

مزید کچھ دیر گزری تو ٹھاکر کو خیال آیا کہ کہیں وصال دین گھر جانے کے لئے اس کے حکم کا انتظار تو نہیں کر رہا ہے۔ کیونکہ رات کافی ہو چکی تھی۔ بات بہت نازک تھی۔ ٹھاکر کو یہ گوارا نہیں تھا کہ وصال دین کی دل آزاری ہو۔ اس نے لہجے میں دنیا جہان کی نرمی سموتے ہوئے کہا۔ ''پتر وصال دین، رات بہت ہو گئی ہے۔ حمیدہ اور جمال دین تمہارے انتظار میں جاگ رہے ہوں گے''۔

''جب تک آپ جاگ رہے ہیں، میں کیسے جا سکتا ہوں''۔ وصال دین نے جواب دیا۔

ٹھاکر کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ اس کے جاگنے اور وصال دین کے بیٹھے رہنے میں اس کے نزدیک کوئی ربط نہیں تھا۔

''آپ کب سوتے ہیں ٹھاکر جی؟''۔ وصال دین نے اچانک پوچھا۔

''میرا کیا پتا ہے پتر۔ کوئی وقت نہیں ہے سونے کا۔ پر آج کل نیند آ جاتی ہے۔ پہلے تو رات رات بھر جاگتا تھا''۔ ٹھاکر نے جواب دیا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اسے وصال دین کو گھر بھیجنا ہے۔ ''پتر..... اب تم گھر جاؤ''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

''آپ سوئیں گے تو میں گھر جاؤں گا ٹھاکر جی''۔

''کیوں پتر؟''۔

''مجھے آپ کے پاؤں دبانے ہیں''۔

ٹھاکر کا دماغ جیسے بھک سے اڑ گیا۔''یہ اوتار سنگھ نے کہا ہے تم سے؟''۔

''جی ہاں''۔ وصال دین نے کہا۔ پھر جلدی سے وضاحت کی۔''بھائی نے.....میرا مطلب ہے چھوٹے ٹھاکر نے چلتے وقت مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ کا خیال رکھوں۔ لیکن میں اس سے بھی پہلے یہ سب سوچ چکا تھا۔ میری چھٹیاں پہلے ہو رہی تھیں اور چھوٹے ٹھاکر کی بعد میں۔ پہلے تو میں آنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ چھوٹے ٹھاکر نے زبردستی مجھے بھیجا۔ ورنہ میں انہیں چھوڑ کر کبھی نہ آتا۔ پھر میں نے سوچا کہ چھوٹے ٹھاکر ہر رات آپ کے پاؤں دباتے تھے اب میں دباؤں گا.....''۔

ٹھاکر حیرت سے گنگ تھا۔ اس نے سب کچھ سنا تھا۔ وہ بھی جو کہا گیا اور وہ بھی جو نہیں کہا گیا۔ وصال دین اوتار سنگھ کو بھائی کہنے کا عادی تھا۔ یہ اس کے لئے انکشاف تھا۔ پھر وصال دین نے اس کے لحاظ میں جلدی سے بھائی کو چھوٹے ٹھاکر بنا دیا تھا۔ اور وصال دین کا یہ کہنا کہ وہ اکیلا آنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ یعنی وہ اوتار سنگھ کو اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اوتار سنگھ نے زبردستی اسے بھیجا تھا اور کہا تھا کہ پتا جی کا خیال رکھنا۔ پھر وصال دین نے یہ بھی بتا دیا کہ اوتار سنگھ نے صرف اسے پتا جی کا خیال رکھنے کو کہا تھا یہ خیال کس طرح رکھا جائے، یہ فیصلہ وصال دین کا اپنا تھا۔

اس وقت ٹھاکر تک وصال دین کی اپنے لئے اور اپنے بیٹے کے لئے بے پایاں محبت بہ کمال و تمام پہنچ گئی تھی۔ اور وہ ایسی محبت تھی کہ خود پر قابو رکھنے والے راج پوت کی آنکھیں تو نہیں بھیگیں۔ لیکن اسے اپنے سینے میں دل پگھل کر سیال بنتا ضرور محسوس ہوا۔

تمہیں کیسے پتا کہ تمہارا بھائی اوتار سنگھ میرے پاؤں دباتا تھا؟''۔ اس نے لفظ بھائی پر خاص طور پر زور دیتے ہوئے کہا۔

وصال دین نے بھی بے ساختہ جواب دیا۔''یہ بات تو بھائی نے مجھے خود ہی بتائی تھی.....بہت پہلے''۔ اور اس بار وصال دین کو احساس بھی نہیں ہوا کہ اس نے ٹھاکر جی کے سامنے ان کے بیٹے کو بھائی کہا ہے۔

''مگر بھائی نے تمہیں یہ تو نہیں کہا تھا کہ ہر رات میرے پاؤں دبانا''۔

''جی یہ تو نہیں کہا تھا۔ لیکن میں نے خود سوچ لیا تھا کہ یہ ضرور کروں گا''۔

اس لمحے ٹھاکر کو احساس ہوا کہ گاؤں کے اس مسلمان گھرانے نے راج پوت پتھر میں جونک لگا دی ہے۔ وہ بہت نرم دل ہو گیا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ ابھی وہ منع کر دے کہ مجھے پاؤں نہیں دبوانے، تو وصال دین چوں بھی نہیں کرے گا۔ وہ اسے جانے کا حکم دے گا تو وہ فوراً واپس چلا جائے گا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ وصال دین کا دل دکھے گا۔ وہ ایک بڑی خوشی سے محروم ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے کہا۔''چلو وصال دین''۔

وہ وصال دین کو اپنے ساتھ اپنے خاص کمرے میں لے گیا۔ وہاں پہنچ کر بلا ارادہ اس نے اپنی ڈائری نکالی اور قلم کھولا۔''اگلے ہی لمحے اسے احساس ہوا کہ وصال دین کی موجودگی میں ڈائری لکھنا اس کے بس کی بات نہیں۔ اب وہ کیا کرے؟

آخر اس نے ڈائری کو واپس رکھ دیا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ وصال دین اس کے پاؤں دبانے لگا۔

تھوڑی دیر بعد وہ کسمسایا۔''وصال دین، اب تم جاؤ''۔

''آپ سو جائیں گے تو میں چلا جاؤں گا''۔

اب ٹھاکر کو سوچنا پڑا۔ وصال دین کی دل جوئی اپنی جگہ۔ لیکن اس مروت میں اس کا اور جمال دین کا.....دونوں کا نقصان تھا۔ آج وصال دین نے اس کے ساتھ کم از کم چار پانچ گھنٹے گزارے تھے۔ اس کا مطالعہ گیا، اس کا ڈائری لکھنا گیا۔ دوسری طرف وصال دین کو اس تمام وقت میں کوفت کے سوا کیا ملا ہو گا.....سوائے اس وقت کے۔ پاؤں دباتے ہوئے اسے کچھ کرنے کا احساس ہوا ہو گا۔ کچھ خوشی ملی ہو گی۔ ورنہ دو افراد خاموش بیٹھے رہیں۔ ان کے درمیان بات کرنے کو کچھ بھی نہ ہو تو ایسی قربت بوجھ ہی ہوتی ہے۔ یہ تو دونوں کا نقصان ہے۔

وہ سوچتا رہا کہ اس سے بچنے کے لئے کیا کرے۔ بالآخر بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ وصال دین کے لئے صرف اتنا کافی تھا کہ اسے پاؤں دبانے کا موقع مل جائے۔ باقی قربت کا بوجھ اس پر سے اتار دیا جائے تو وہ زیادہ خوش رہے گا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

''سنو وصال دین''۔اس نے پکارا۔

وصال دین اس کے پاؤں دباتا رہا۔''جی ٹھاکر جی.....''۔

''دراصل میں بہت مصروف ہوتا ہوں۔تم ایسا کرو،بس ایک وقت آیا کرو،رات کو نو بجے آیا کرو''۔

''جی.....بہت بہتر''۔

''تمہیں برا تو نہیں لگا وصال دین''۔

''نہیں ٹھاکر جی۔آپ کا حکم ماننے میں تو خوشی ہے''۔

ٹھاکر مطمئن ہوگیا۔اب اسے پاؤں دبانے کے اس دورانیئے کو مختصر کرنا تھا۔اس کی واحد صورت یہ تھی کہ وہ سوتا بن جائے۔کیونکہ نیند آنی تو آسان نہیں تھی۔وصال دین کو یقین ہوگیا کہ وہ سو رہا ہے تو وہ چلا جائے گا۔پھر وہ اٹھ کر ڈائری لکھے گا۔اس نے اٹھ کر اوتار سنگھ کا تکیہ لیا اور اسے لپٹا کر لیٹ گیا۔

لیکن وصال دین اس کے پاؤں دباتا رہا۔نجانے کیسے.....مگر اسے معلوم تھا کہ وہ سویا نہیں ہے۔

اب کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ٹھاکر نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔پھر پتا نہیں کیسے.....بہر حال تھوڑی دیر میں وہ گہری نیند سو گیا۔

آنکھ کھلی تو صبح ہو رہی تھی۔وصال دین کب گیا،اسے معلوم نہیں تھا۔بس وہ یہ جانتا تھا کہ اس نے بہت اچھی نیند لی ہے اور تازہ دم بیدار ہوا ہے۔اور یہ کہ رات اس نے ڈائری نہیں لکھی تھی۔

اس روز ٹھاکر نے اپنے کچھ معمولات بدلے۔رات کا کھانا وہ سات بجے کھا لیتا تھا۔اس معمول میں تبدیلی ممکن نہیں تھی۔البتہ معمول کے مطالعے کے لئے وہ پانچ بجے بیٹھ گیا۔کھانے کے بعد اس نے چہل قدمی کی۔پھر اپنی خواب گاہ میں جا کر ڈائری لکھی اور واپس آ گیا۔

نو بجے وصال دین آیا تو وہ مطالعہ کر رہا تھا۔حالانکہ اصل مطالعہ تو وہ کر چکا تھا۔اس نے پندرہ بیس منٹ وصال دین کو اپنے سامنے بیٹھنے کا موقع دیا۔پھر وہ ایک جماہی لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔''چلو وصال دین،اب میں سوؤں گا''۔اس نے کہا۔

اپنے کمرے میں وہ اوتار سنگھ کے تکیے کو سینے سے لگا کر لیٹ گیا۔وصال دین اس کے پاؤں دبانے لگا۔اس رات کیونکہ وہ ذہنی طور پر تیار تھا۔اس لئے ذرا ہی دیر میں اسے نیند آ گئی۔

سو اب یہی اس کا معمول تھا۔اس نے کتاب بند کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔''چلو وصال دین،اب مجھے نیند آ رہی ہے''۔

.....x.....

جس روز محمود ریاضی پڑھنے آیا تھا،اس دن کے بعد اوتار سنگھ کا دل پڑھائی میں نہیں لگا۔اس روز اس کے اندر ایسی خوشی،ایسا دبا دبا ہیجان تھا،جیسے اسے کوئی خزانہ مل گیا ہو۔کسی چیز میں دل نہیں لگ رہا تھا۔

وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ کیفیت کیا ہے۔اس کی سمجھ میں بس اتنا آیا کہ وہ جس مہان ہستی کی برسوں سے جستجو کر رہا تھا،اب اسے پانے کے بہت قریب پہنچ گیا ہے۔یہ یقین اسے کیوں ہوا۔یہ وہ نہیں جانتا تھا۔بس وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اب وہ اسے مل جائے گا اور پھر وہ اس سے وہ محبت کر سکے گا،جو کرنی چاہئے۔جو وہ برسوں سے کرنی چاہتا ہے۔

اس شام مولوی صاحب نہیں آئے۔انہوں نے کہہ دیا تھا کہ امتحان کے عرصے میں وہ اسے پڑھانے نہیں آئیں گے۔

''اور چھٹیاں ہوتے ہی میں گاؤں چلا جاؤں گا''۔اوتار سنگھ نے کہا

مولوی صاحب نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔''تم اس بار بھی چھٹیوں میں مجھ سے پڑھنا چاہتے ہو؟''۔

''جی مولوی صاحب''۔وہ بولا۔''تو آپ میرے ساتھ ہی گاؤں چلے چلیں''۔

مولوی صاحب اسکول میں پڑھاتے تھے اور اسکول میں چھٹیاں ہو چکی تھیں۔''تم گاؤں کب جاؤ گے؟''۔انہوں نے پوچھا۔

''18 تاریخ کو میرا آخری پرچا ہے۔میں 19 تاریخ کو گاؤں چلا جاؤں گا''۔

''تو تم چلے جانا۔مجھے 19 تاریخ کو اپنی بھتیجی کی شادی میں شرکت کرنی ہے۔میں 20 تاریخ کو خود گاؤں پہنچ جاؤں گا''۔

یہ بات طے ہو چکی تھی۔مگر اب شام ہوئی تو اوتار سنگھ مولوی صاحب کو مس کرنے لگا۔وصال دین بھی نہیں تھا۔اسے بڑی شدت سے تنہائی کا احساس ہو رہا تھا آخر وہ اٹھا اور کوٹھے پر چلا گیا۔

وہاں بیٹھ کر وہ محمود سے حاصل ہونے والی معلومات کے بارے میں سوچنے لگا۔اسے لگ رہا تھا کہ کسی نادیدہ قوت نے اسے درست راستے کی طرف لگا دیا ہے۔اس کا پہلا قدم صحیح راستے پر اٹھ گیا ہے۔

ایک تو یہ نام اللہ اسے بہت اچھا لگا تھا۔وہ اسے نیا نہیں لگا،ایسا تھا جیسے وہ پہلے سے اس کے اندر موجود رہا ہو،بلکہ اب تو اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس مہان ہستی کو اسی نام سے پکارے گا،اسی نام سے سوچے گا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

محمود سے گفتگو کر کے اس کی ایک بڑی خلش دور ہوگئی۔ شرک کے مفہوم کو بہت گہرائی میں تو نہیں، لیکن ایک اہم پہلو اور زاویئے سے اس نے سمجھ لیا۔ وہ تو خود سوچتا تھا کہ اللہ کا کوئی بیٹا، کوئی رشتے دار نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس کے اندر موجود کوئی کہتا تھا کہ اس جیسا کوئی نہیں ہوسکتا۔ ورنہ بیٹا کسی حد تک تو باپ جیسا ہوتا ہے، محمود نے بتایا کہ اللہ واحد اور احد ہے۔ اب اتنی عربی تو وہ سمجھتا تھا کہ واحد ہونا اس بات کی ضمانت نہیں کہ جسے واحد کہا جا رہا ہے، اس جیسا کہیں کوئی اور نہیں ہے، لیکن احد ہونا اس بات کا ضامن ہے۔

دوسری بات جو اس کی سمجھ میں آئی، وہ پاک اور ناپاکی کے حوالے سے تھی۔ محمود نے بتایا تھا کہ کلمۂ طیبہ ہر ناپاکی کو دور کرتا ہے، خواہ وہ ظاہری ہو یا باطنی۔ یہ بات بھی اوتار سنگھ کی سمجھ میں اپنے اندر سے آتی تھی۔ اپنے باطن میں وہ ایسے کسی کلمے کی ضرورت پہلے سے محسوس کرتا تھا۔ رفع حاجت کے بعد صابن سے خوب رگڑ رگڑ کر ہاتھ دھونے کے بعد بھی اس کی تسلی نہیں ہوتی تھی۔ اسے گندگی کا احساس ستاتا رہتا تھا۔ یہ کلمہ اسے کیا ملا، بہت بڑا خزانہ مل گیا۔ اس نے سوچ لیا کہ اب اپنے ہاتھ کیا، پورے جسم کو اس کلمے کی برکت سے پاک کیا کرے گا۔ یہ سوچتے ہوئے اسے خیال آیا کہ آدمی کے اندر اس کی بے خبری میں بھی تو ناپاکی ہوسکتی ہے۔ یہ کلمہ تو اس ناپاکی کو بھی دور کر دے گا۔

البتہ آسمانی کتابوں کے بارے میں وہ الجھن میں تھا۔ وحی کا تصور تو اس کی سمجھ میں آتا تھا۔ بلکہ وحی پر اسے سنتے ہی یقین آ گیا تھا، لیکن سوال یہ تھا کہ وہ پہلے کون سی کتاب پڑھے۔ محمود نے قرآن کا تذکرہ کیا تھا۔ لیکن اس کے بارے میں زیادہ تفصیل سے بات نہیں کی تھی۔ ہاں اس نے ایک بہت اہم بات کہی تھی، اس نے بتایا تھا کہ پیغمبر حضرت محمد روئے زمین پر آنے والے اللہ کے آخری پیغمبر ہیں اور قرآن اللہ کی آخری کتاب ہے، کیونکہ دین مکمل کر دیا گیا ہے۔ اس بات کی اہمیت وہ نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ بہرحال اتنا وہ سمجھ گیا تھا کہ کسی بھی کتاب کا آخری ایڈیشن ہی مکمل ترین ہوتا ہے۔ جو کچھ پہلے ایڈیشنز میں رہ گیا ہوتا ہے، وہ آخری ایڈیشن میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے اسے قرآن ہی پڑھنا چاہئے تھا۔

لیکن اسکے ساتھ ہی اسے ڈر لگنے لگا۔ جس نے زمین آسمان، چاند، سورج، ستارے بنائے ہیں۔ نباتات اگائی ہیں۔ پورا نظام قائم کیا ہے۔ اس کا کلام کیسا ہوگا! یہ تو نہیں ہوسکتا کہ وہ کسی کی رہنمائی کے بغیر اسے پڑھ سکے اور اللہ پاک ہے تو اس کا کلام بھی پاک ہوگا۔ اسے پڑھنے کیلئے ناپاکی دور کرنے کے علاوہ بھی کچھ شرائط ہوں گی۔ کون جانے، وہ ان شرائط پر پورا اترتا بھی ہے یا نہیں۔ اس پر ایسا خوف طاری ہوا کہ اس کا جسم بری طرح لرزنے لگا اور اس خوف سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ خوف بے سبب نہیں۔ یہ بھی اللہ کی طرف سے ہے اور تنبیہہ ہے کہ وہ بغیر اہلیت حاصل کئے ان کا کلام پڑھنے کی کوشش نہ کرے۔

اس لمحے اوتار سنگھ نے فیصلہ کر لیا کہ ابھی وہ قرآن نہیں پڑھے گا۔ حالانکہ یہ ناممکن نہیں تھا۔ وہ قرآن حاصل بھی کر سکتا تھا اور پڑھ بھی سکتا تھا۔ لیکن اس کے اندر سے اشارہ موصول ہو رہا تھا کہ اس سے اس کی اجازت نہیں، ہاں ابھی وہ کلمۂ طیبہ سے استفادہ کر کے خود کو پاک کرنے کی پیہم کوشش کرتا رہے گا۔

ان فیصلوں کے بعد اس کے اندر ایسی طمانیت ابھری، جو اس کے لئے بالکل نیا تجربہ تھی۔ اس کے نزدیک وہ بھی ایک اشارہ تھا۔ اللہ اس کے فیصلوں کی تائید کر رہا تھا..... اسے بتا رہا تھا کہ اس نے درست فیصلے کئے ہیں۔

''مالک..... چھوٹے ٹھاکر!'' رنجنا کی آواز سے اسے چونکا دیا۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ''کیا بات ہے رنجنا''؟

''رات ہوگئی ہے مالک۔ بھوجن کر لیں''۔

اس لمحے اوتار سنگھ کو شدت سے وصال دین یاد آیا۔ جس روز وہ نیچے والی کی آواز سن کر بے خود ہوا تھا، وصال دین نے ہی آ کر اسے چونکایا تھا۔ وہ اداس ہوگیا، آج وصال دین اس کے ساتھ نہیں ہے۔ ''چلو..... میں آتا ہوں''۔

رنجنا چلی گئی۔ وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ زینے سے اترتے ہوئے اسے محمود کی ایک اور بات یاد آئی۔ محمود نے کہا تھا کہ اسلام کے بارے میں جاننا چاہتے ہو تو کسی عالم سے بات کرو۔ مولوی صاحب یقیناً عالم ہیں۔ اس نے سوچا، اب میں ان سے معلومات حاصل کروں گا۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ اوپر کچھ اور فیصلہ ہو چکا ہے۔ اب وہ مولوی برکت علی کی آواز کبھی نہیں سن سکے گا!

.....X.....

کانتی پرشاد جی کھانا کھا کر اٹھ گئے۔ اوتار سنگھ نے رنجنا سے پوچھا۔ ''دوپہر والا کھانا بچا ہے''؟

''جی مالک..... لاؤں''؟

''ہاں لاؤ''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

رنجنا شامی کباب اور کوفتے لے آئی۔''میٹھا بعد میں دوں گی چھوٹے ٹھاکر''۔

اوتار سنگھ کو وہ کھانا اب بھی اچھا لگ رہا تھا۔''کیسا لگا چھوٹے ٹھاکر'' رنجنا نے اس سے پوچھا۔

''بہت اچھا.....بہت مزے دار''۔اوتار سنگھ نے کہا۔''ان کا میری طرف سے شکریہ ادا کر دینا''۔

''موسی بول رہی تھیں، یہ تو تم لوگوں کا حق ہے۔تم ہمارے مہمان بھی ہو اور پڑوسی بھی''۔

''بڑی محنت کی ہوگی بوا نے''۔

''بوا نے؟ ہر چیز حور بانو نے اپنے ہاتھوں سے بنائی تھی چھوٹے ٹھاکر''۔

''حور بانو کون ہے''؟

''سب سے بڑی بہن''۔

اب اوتار سنگھ اس سے زیادہ کچھ پوچھ نہیں سکتا تھا۔وہ جانتا تھا کہ وہ تین نہیں ہیں۔لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ جس آواز سے اسے محبت ہوئی ہے، وہ کس کی تھی۔

اور کچھ ہوا نہ ہوا، اسے سوچنے کے لئے بہت کچھ مل گیا.....اور وہ بھی خوش امیدی ابھارنے والا۔رنجنا اسے بتاتی تھی کہ نیچے کھانا پکانا بوا کی ذمے داری ہے یا گھر کی مالکن کی۔لڑکیاں کھانا پکانے میں دل چسپی نہیں لیتیں۔اس اعتبار سے یہ غیر معمولی بات تھی کہ اس کی طرف سے فرمائش ہونے پر ایک ایسی لڑکی، جسے کھانا پکانے میں کوئی دل چسپی نہ ہو، اکیلی اتنی محنت کرے اور کئی طرح کے کھانے تیار کرے۔اس کا کیا سبب ہوسکتا ہے؟ یہ کہ وہ اس میں دل چسپی لیتی ہو؟ اس سے محبت کرنے لگی ہو؟

اوتار سنگھ نے خود کو ٹوکا۔یہ خیال خوش فہمی کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔ایسی کوئی وجہ سامنے نہیں ہے کہ نیچے رہنے والی کسی لڑکی کو اس سے محبت ہو جائے۔نہ اس نے ان میں سے کسی کو دیکھا ہے، نہ اس میں سے کسی نے اسے دیکھا ہے۔

لیکن بنیادی طور پر اوتار سنگھ کا محبت کا تصور حقیقی بالکل نہیں تھا، بلکہ یکسر افسانوی تھا۔خوش فہمی والی تنبیہہ اس کے حلق سے کیسے اتر سکتی تھی۔اسے خود بھی تو ایسے ہی.....ناقابل یقین انداز میں محبت ہوئی تھی.....صرف آواز سن کر۔اسے جس سے محبت تھی، اس نے آج تک اسے دیکھا نہیں تھا۔تو ایسی محبت کسی اور کو بھی اس سے ہوسکتی ہے۔

اور اوتار سنگھ محبت کو آسمانی جذبہ سمجھتا تھا۔اس کا نظریہ تھا کہ اوپر والا خود کسی کے دل میں کسی کی محبت ڈالتا ہے۔یہ ایسی دلیل تھی، جس کا خوش فہمی کی تنبیہہ کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتی تھی۔

چناں چہ اوتار سنگھ نے اس گمان کو قبول کر لیا۔اس کے نتیجے میں پہلی بار اسے ایسی سرشاری ملی، جس نے اسے بے خود کر دیا۔سرشار تو وہ اپنی یک طرفہ محبت میں بھی تھا۔مگر دو طرفہ محبت کے تصور کا تو لطف ہی اور تھا۔وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا۔امتحانوں کی فکر رہی نہ پڑھائی کی لگن۔خوش قسمتی یہ تھی کہ وہ سارا سال پوری لگن کے ساتھ محنت کرنے والا تھا۔اس لئے نقصان کا احتمال نہیں تھا۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ۔مگر پاکی کا تصور اس کے ذہن پر چھا چکا تھا۔رفع حاجت کا تو معاملہ ہی اور تھا۔اس میں تو ہاتھ پاک کرنا لازم تھا۔وہ تو عام حالات میں بھی ہاتھ دھوتا تو کلمۂ طیبہ پڑھتا۔منہ دھوتا تو بھی کلمہ پڑھتا۔نہاتا تو بھی کلمہ پڑھتا اور کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے اسے خیال آتا کہ اسے تو معلوم ہی نہیں کہ اس کے وجود کی کون سی کوٹھری میں، کون سے گوشے میں ناپاکی گھسی ہوئی ہے۔یہ خیال آتے ہی وہ دل کی گہرائیوں سے کلمۂ طیبہ مسلسل پڑھنا شروع کر دیتا۔پڑھتا ہی چلا جاتا۔یہاں تک کہ اسے احساس ہونے لگتا کہ وہ بہت ہلکا پھلکا اور اندر سے بہت صاف ستھرا ہوگیا ہے۔

اور دن میں کئی بار وہ آسمان کی طرف سر اٹھا کر پکارتا۔''اے اللہ، تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے اپنا راستہ دکھایا۔اپنی طرف بلایا۔اے اللہ، اب مجھے چھوڑ نہ دینا۔مجھے سیدھا راستہ دکھاتے رہنا۔گمراہ نہ ہونے دینا مجھے''۔

پہلے وہ ایک ان دیکھی ہستی کو بغیر اس کا نام جانے پکارتا تھا۔مگر اب یہ نام اس کے وجود کی، دل و دماغ کی گہرائیوں میں اتر گیا تھا.....اسے بھا گیا تھا۔اب وہ اسے اسی نام سے پکارتا تھا۔

.....X.....

امتحان شروع ہوگئے۔ایک دن پرچا ختم ہونے کے بعد اوتار سنگھ اور ارجن ایک ساتھ باہر آئے۔ارجن اوتار سنگھ کا کلاس فیلو تھا اور جے پور میں رہتا تھا۔اوتار سنگھ کی اس سے اچھی خاصی علیک سلیک تھی۔

''امتحان کے بعد کیا ارادہ ہے''؟ ارجن نے پوچھا۔

''گاؤں چلا جاؤں گا''۔

''تو میرے ساتھ جے پور ہوتے ہوئے جاؤ''۔

اوتار سنگھ نے چونک کر اسے دیکھا۔''کیوں.....کوئی خاص بات ہے''؟

''بڑا میلہ شروع ہونے والا ہے نا''۔

اوتار سنگھ کو یاد آیا۔کیدو چاچا پچھلے سال اسے میلے میں لے جانا چاہتا تھا۔لیکن اس نے منع کر دیا تھا۔اس وقت اس کا جی چاہنے لگا۔کیوں نہ وہ میلہ دیکھ کر گاؤں جائے۔ماسٹر جی کو رگھو اور رنجنا کے ساتھ گاؤں بھیج دیا جائے۔اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اوتار سنگھ اب پوری آزادی اور خود مختاری کے ساتھ نقل و حرکت کرنا چاہتا تھا۔یہ کیا کہ ویرو جی کی طرح ہو کہ وہ اکیلے گاؤں بھی نہیں جاسکتے۔

پھر اسے ایک خیال اور آ گیا۔تاج محل کے بارے میں بہت کچھ پڑھا تھا اس نے اور اسے تاج محل دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔تاج محل، جسے دنیا میں محبت کی سب سے بڑی نشانی قرار دیا جاتا ہے۔اس نے سوچا، کالج میں پہنچنے کے بعد آدمی کی عملی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔اس کے ثبوت کے طور پر اور اپنا اعتماد بڑھانے کے لئے وہ اکیلا میلہ دیکھنے جے پور جاسکتا ہے۔تو لگے ہاتھوں تاج محل کیوں نہ دیکھ لے۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''تمہارے جے پور سے آگرہ کتنی دور ہے''؟اس نے ارجن سے پوچھا۔

''تھوڑی ہی دور ہے، بلکہ بہت قریب کہو''۔ارجن نے جواب دیا۔پھر وہ مسکرایا۔''تاج محل دیکھنے کا ارادہ ہے''؟

''ہاں''۔

''تو ٹھیک ہے۔جے پور سے آگرہ چلے جانا''۔

اوتار سنگھ نے اپنے دل میں یہ پروگرام طے کرلیا۔

لیکن آخری پرچے سے دو دن پہلے ماسٹر جی کی طبیعت بہت خراب ہوگئی۔انہیں بہت تیز بخار تھا اور الٹیاں بھی لگ گئی تھیں۔اوتار سنگھ انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔

''بخار ایک دم نہیں اترے گا۔وقت لگے گا''۔ڈاکٹر نے ماسٹر جی کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔''دوا میں دے رہا ہوں۔کمزوری بہت ہوجائے گی۔انہیں کم از کم دو ہفتے مکمل آرام کی ضرورت ہے''

اوتار سنگھ ماسٹر جی اور رگھو کو اپنے پروگرام کے متعلق پہلے ہی بتا چکا تھا۔لیکن اب ماسٹر جی کو اسی حال میں چھوڑ کر جانے کو اس کا دل نہیں مانتا تھا۔

''تم اپنا پروگرام خراب مت کرو''۔ماسٹر جی نے نقاہت بھرے لہجے میں کہا۔''کوئی بڑی پریشانی کی بات نہیں۔طبیعت سنبھلے گی تو میں رگھو کے ساتھ گاؤں آجاؤں گا۔ویسے بھی تو مجھے ان کے ساتھ ہی آنا تھا''۔

''لیکن ماسٹر جی،آپ کو اس حال میں.....''

ماسٹر جی نے اس کی بات کاٹ دی۔''میرا خیال رکھنے کو رگھو اور رنجنا یہاں ہیں نا''۔

''ہاں چھوٹے مالک،آپ چنتا نہ کرو''۔رگھو بولا۔

مگر استاد کا معاملہ تھا۔اوتار سنگھ کا دل نہیں مانتا تھا۔ماسٹر جی اور رگھو کے پیہم اصرار پر وہ جانے کیلئے راضی تو ہوگیا۔لیکن اس سے پہلے اس نے ڈاکٹر سے تفصیلی بات کی۔اس سے ماسٹر جی کے ٹھیک ہونے تک ہر روز گھر پر آکر انہیں دیکھنے کا وعدہ لیا اور پیشگی فیس ادا کردی۔پھر اس نے ماسٹر جی کو بھی کچھ رقم دی اور رگھو کو بھی۔اس کے باوجود اسے یہ احساس ستا رہا تھا کہ وہ کڑے وقت میں انہیں اکیلا چھوڑ کر جا رہا ہے۔

بہر حال اب وہ جے پور جانے کے لئے تیار تھا!

.....X.....

سہ پہر کے وقت وہ جے پور پہنچ گئے۔ارجن اوتار سنگھ سے اپنے گھر چلنے پر اصرار کر رہا تھا۔لیکن اوتار سنگھ اس کے لئے تیار نہیں تھا۔

''پھر کبھی کچھ دن کے لئے آؤں گا تو تمہارے ہاں رکوں گا''۔اوتار سنگھ نے کہا۔

''تو آج کہاں قیام کرو گے''؟

''کیوں،تمہارے شہر میں ہوٹل نہیں ہیں''؟اوتار سنگھ نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔

''کیوں نہیں۔ہر طرح کے ہوٹل ہیں۔آؤ،تمہیں لے چلوں''۔

اوتار سنگھ کے لئے ہوٹل کی کوالٹی کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔اسے تو بس رات گزارنی تھی.....اور رات کیا،رات کے بھی صرف چند گھنٹے۔صبح ہی اس کا ارادہ آگرہ کے لئے نکلنے کا تھا۔

ارجن اسے ایک ہوٹل میں لے گیا۔وہاں اس نے کمرا لیا۔ارجن دو گھنٹے بعد آنے کا کہہ کر چلا گیا۔اوتار سنگھ نہانے کیلئے بے چین ہو رہا تھا۔اس نے سامان رکھتے ہی کپڑے نکالے اور باتھ روم میں گھس گیا۔

نہاتے ہی اسے بھوک لگنے لگی۔حالانکہ دوپہر کا کھانا وہ کھا چکا تھا۔اس نے سوچا کہ کمرے میں ہی چائے کے ساتھ بسکٹ منگوالے۔لیکن اس نے فوراً ہی اس خیال کو رد کردیا۔ارجن کے آنے میں ابھی کافی وقت تھا۔وہ اس وقت سے استفادہ کرسکتا تھا۔اس نے سوچا،کچھ دیر ادھر ادھر گھومے پھرے گا۔راستے میں ہی کہیں بھوک کا سامان بھی ہوجائے گا۔

یہ سوچ کر وہ ہوٹل سے نکل آیا۔

جے پور اسے پہلی ہی نظر میں اچھا لگا تھا.....بہت اپنا اپنا۔شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ صحراؤں کا پروردہ تھا اور جے پور صحرائی شہر تھا۔شہر میں داخل ہوتے ہی وہاں کی گرمی نے اسے گاؤں کی یاد دلائی تھی۔گلابی شہر(Pink City) کہلانے والے اس شہر کو ایک نظر دیکھ کر ہی اسے احساس ہوگیا تھا کہ یہ ثقافت سے چھلکتا ہوا شہر ہے.....رنگین ثقافت کا نمائندہ شہر!

چھوٹے سے ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر اس نے چائے کے ساتھ بسکٹ کھائے۔پھر سب سے پہلے اس نے پوچھ پوچھ کر بس کے اڈے کا رخ کیا۔وہاں سے اسے پتا چلا کہ آگرہ جانے والی پہلی بس صبح چھ بجے روانہ ہوتی ہے۔وہ اس کے لئے بہت مناسب تھی۔آگرہ میں اسے کافی وقت گزارنے کا موقع مل جاتا۔

ہاں سے وہ بازار آیا اور وہاں گھومتا پھرا۔بازار بارونق تھا۔دکانیں آراستہ بھی تھیں اور ہر طرح کے مال سے بھری ہوئی بھی۔کپڑے کی دکانیں دیکھ کر وہ ٹھٹھکا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

دہلی سے تو وہ کچھ نہیں لے سکا تھا۔لیکن یہاں اس نے سوچ لیا کہ وہ پتا جی، اماں، چاچا جی اور ویر جی کے لئے کچھ خریدے گا۔مگر ابھی وہ کچھ خریدنے کے ارادے سے نہیں نکلا تھا۔اس نے سوچا، خریداری رات کو کر لے گا۔

وہاں مورتیوں کی ایک بہت بڑی دکان بھی تھی۔بھگوان، ہنومان، کالی ماتا، سرسوتی.....سبھی کی مورتیاں وہاں موجود تھیں.....اور ہر سائز میں۔بعض بت تو بہت بڑے بڑے بھی تھے، وہ یونہی تفریحاً دکان میں چلا گیا۔اس نے مختلف مورتیوں کی قیمت معلوم کی۔خریدنا تو اسے کچھ تھا نہیں۔وہ دل میں اس مضحکہ خیز تصور پر سوچ رہا تھا اور ہنس رہا تھا کہ بھگوان بھی بازار میں بکتا ہے اور دوسرے خدا بھی۔جو چاہے خرید لے۔وہ بھگوان، وہ دیوتا، جن سے جاہل لوگ پرارتھنا کرتے ہیں، اپنی منوکامنائیں جن سے مانگتے ہیں، وہ تو خود کو بکنے کی حقارت اور ذلت سے بھی نہیں بچا سکتے۔کیا اس میں کوئی قدرت ہو سکتی ہے، جو خود کو بکنے سے بھی نہیں بچا سکے۔یہ تو بھگوان کی توہین ہے کہ وہ چند سکوں میں بک جاتا ہے۔

دکان سے نکل کر اوتار سنگھ دل ہی دل میں کلمۂ طیبہ پڑھتا رہا۔اس کا خیال تھا کہ مورتیوں کی دکان میں جا کر شاید وہ ناپاک ہو گیا ہو گا۔اس لمحے اس کے دل میں عجیب سا جذبہ پیدا ہوا.....اللہ کے لئے محبت کا جذبہ۔اس کا جی چاہا کہ وہ اللہ کے لئے کچھ ایسا کرے، جس سے اللہ خوش ہو.....بہت خوش۔اس کے ذہن میں موہوم سا خیال تھا کہ وہ ایسا کچھ کر سکتا ہے۔کیا؟ یہ وہ فی الحال نہیں جانتا تھا لیکن اسے لگتا تھا کہ کوشش کرے گا تو وہ آسانی سے جان بھی جائے گا۔وہ ہوٹل پہنچا تو ارجن اس کا انتظار کر رہا تھا!

.....x.....

اس سے پہلے اوتار سنگھ نے صرف اپنے گاؤں کا میلہ دیکھا تھا۔درحقیقت وہ ٹھاکروں کی گڑھی کا میلہ نہیں تھا۔بلکہ اردگرد کے تین اور گاؤں بھی اس میں شریک ہوتے تھے۔لیکن جے پور کا میلہ دیکھ کر اوتار سنگھ کی آنکھیں پھیل گئیں۔اتنے بڑے میلے کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

وہاں ہر طرح کی تفریحات تھیں۔کھیل تماشے تھے۔سرکس بھی تھا۔کرتب بھی دکھائے جا رہے تھے۔جسمانی مقابلے بھی ہو رہے تھے۔اونٹوں کی دوڑ ہونے والی تھی۔کبڈی اور کشتی کے مقابلے دیکھنے والوں کا بڑا ہجوم تھا۔

دوسری طرف میلے میں بازار سے بھی بڑا بازار لگا تھا۔وہاں بلاشبہ سینکڑوں اسٹال تھے۔ہر چیز کا اسٹال تھا۔کہیں کپڑا بک رہا تھا تو کہیں عورتیں چوڑیاں پہن رہی تھیں اور زیورات دیکھ رہی تھیں۔وہاں کئی جوتشی بھی تھے۔ایک بوڑھی عورت تھی، جو لوگوں کا ہاتھ دیکھ کر ان کی قسمت کا حال بتا رہی تھی۔

عورتوں کی دلچسپی یا تو خریداری میں تھی یا جھولوں میں۔لیکن جھولوں کے پاس بچوں کا ہجوم سب سے زیادہ تھا۔اس کے علاوہ کھانے پینے کی چیزوں کے اسٹالز پر سب سے زیادہ رش تھا۔

اوتار سنگھ اس رونق میں ارجن کے ساتھ گھوم پھر رہا تھا۔لیکن وہ بہت کھویا کھویا تھا۔اس کے ذہن میں بس ایک ہی خیال تھا، جو اسے ادھر ادھر توجہ نہیں کرنے دے رہا تھا.....یہ کہ اسے کچھ کرنا ہے.....اللہ کو خوش کرنے کیلئے.....اس سے اظہار محبت کے لئے! بس وہ یہ سوچ جا رہا تھا کہ کیا کرے۔

بس ایک چیز ایسی تھی، جس پر وہ توجہ دیئے بغیر نہ رہ سکا۔اور وہ تھا لٹھیا بازی کا مقابلہ۔شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ لٹھیا بازی میں اسے خود کمال حاصل تھا۔چاچا جمال دین نے یہ ہنر اسے اور ویر جی کو سکھایا تھا۔وہ اس فن میں استاد کا درجہ رکھتے تھے۔اور ان کا کہنا تھا کہ وہ دونوں بہت اچھے شاگرد ہیں اور ان کے اندر اس فن کی قدرتی صلاحیت ہے۔ان دونوں کو کارکردگی دکھانے کا ایک موقع مل چکا تھا، جب انہوں نے اپنے اوپر حملہ کرنے والوں کو نہ صرف مار بھگایا تھا۔بلکہ انہیں زخمی کر کے اٹھنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔اس موقعے پر ان کی صلاحیت ثابت ہو گئی تھی۔

اس نے لٹھیا بازی کا مقابلہ ہوتے دیکھا تو مسحور ہو کر رہ گیا۔وہ جس طرح داد دے رہا تھا اور تنقید کر رہا تھا، اس نے ارجن کو چونکا دیا۔''لگتا ہے، تم لٹھیا بازی جانتے ہو؟''۔اس نے پوچھا۔

''بس یونہی تھوڑی سی شد بد ہے''۔اوتار سنگھ نے بے دھیانی میں کہا۔

''تمہارے تبصروں سے تو لگتا ہے کہ تم اس کی فنی باریکیوں سے بھی واقف ہو''۔ارجن بولا۔

''میں نے کہا نا، تھوڑا بہت سیکھا ہے میں نے''۔

''کہاں.....کس سے سیکھا؟''۔

''گاؤں میں.....چاچا جمال دین سے''۔

''تو تم مقابلے میں حصہ کیوں نہیں لیتے''۔

سچ تو یہ ہے کہ مقابلے میں حصہ لینے کے لئے اوتار سنگھ کا دل مچل رہا تھا۔اب تک جو اس نے دیکھا تھا، وہ لٹھیا بازی کا کوئی اچھا معیار نہیں تھا۔اپنی فطری انکساری کے باوجود وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہاں اس کے جوڑ کا کوئی نہیں ہے۔

لیکن دل کے مچلنے کے باوجود اس کا میدان میں اترنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔نمایاں ہونا اسے یوں بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔مگر یہاں جے پور میں اسے لگ رہا تھا کہ اس کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ نمایاں نہ ہو۔وجہ اسے معلوم نہیں تھی۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''نہیں.....میں اتنا اچھا بھی نہیں ہوں''۔اس نے منکسرانہ لہجے میں کہا۔

ارجن کو مایوسی ہوئی۔

وہ میلے میں گھومتے پھرے۔اوتار سنگھ نے خریداری وہیں سے کرلی۔اس نے پتاجی اور چاچا جمال دین کے لئے پگڑی خریدی۔اماں کے لئے چادر.....اور ویر جی کے لئے کپڑے اور ایک قلم۔

آخر اوتار سنگھ نے میلے سے واپسی کا ارادہ کیا۔ارجن کو اس سے اختلاف تھا۔''ابھی تو بہت وقت ہے''۔اس نے کہا۔''ابھی تو رونق اور بڑھے گی''۔

''میں کل صبح چھ بجے والی گاڑی سے آگرہ جانا چاہتا ہوں۔اس کے لئے مجھے ساڑھے چار، پانچ بجے اٹھنا ہوگا''۔اوتار سنگھ نے معذرت کی۔

اسی وقت ارجن کے چند دوست اسے مل گئے۔''تم واپس جارہے ہو.....ابھی سے!''۔ان میں سے ایک نے کہا۔

ارجن نے اوتار سنگھ کو ان سے متعارف کرایا۔وہ لوگ ارجن کو روک رہے تھے۔لیکن ارجن اوتار سنگھ کو اکیلا چھوڑنے کو بداخلاقی سمجھ رہا تھا۔چناں چہ وہ انکار کررہا تھا۔

''تم رک جاؤ نا۔میں تو ہوٹل جا کر سو جاؤں گا''۔اوتار سنگھ نے اسے سمجھایا۔''تم اپنی تفریح کیوں خراب کرتے ہو''۔

''ایسی کوئی بات نہیں۔میں بھی تھکا ہوا ہوں۔جلدی سو جاؤں گا۔اور میلہ تو کل بھی رہے گا''۔ارجن نے کہا۔

لیکن اوتار سنگھ اصرار کرتا رہا۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ ارجن مروت میں اس کی وجہ سے اپنی تفریح خراب کرے۔اسے یہ احساس بھی تھا کہ ارجن کے دوستوں کو کئی مہینوں کے بعد اس سے ملاقات کا موقع ملا ہے۔اور وہ ان کے بیچ دیوار بن رہا ہے۔

آخر اوتار سنگھ نے ارجن کو قائل کرلیا۔دونوں گلے ملے۔ارجن نے وعدہ کیا کہ اگلی بار وہ چند روز کیلئے آئے گا اور اس کے گھر مہمان ہوگا۔پھر اوتار سنگھ ارجن کو میلے میں چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

اب اس کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا.....وہی اللہ کے لئے کچھ کرنے کا خیال۔اور وہ خیال اس کے لئے بہت بے چین کردینے والا تھا۔کیوں کہ اسے اس سلسلے میں کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

سڑک پر چلتے چلتے وہ ایک بڑے مندر کے سامنے رک گیا۔چند لمحے کھڑا وہ دیکھتا رہا۔پھر مندر کے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔لیکن مندر میں داخل ہوتے ہوئے اس کے قدم ہچکچا رہے تھے۔اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ وہاں کیوں جارہا ہے۔پوجا کرنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔اس کے اندر جانے کی وجہ عقیدت نہیں ہوسکتی تھی۔اسے جذبے سے تو وہ برسوں پہلے جان چھڑا چکا تھا۔

اس نے بے اختیار زیر لب کلمہ پڑھنا شروع کردیا۔مندر میں گھسنے کے بعد اسے باطنی طور پر ناپاکی کا احساس ہورہا تھا۔اور اسے دور کرنے کی ایک بے حد موثر ترکیب اس کے پاس تھی۔

اندر جا کر اس نے جائزہ لیا۔مندر میں کوئی بھی نہیں تھا۔سامنے بھگوان کا ایک بہت بڑا بت تھا۔سائیڈ والی دیوار کے ساتھ دیگر کئی دیوتاؤں کے نسبتاً چھوٹے بت رکھے تھے۔بھگوان کے بڑے بت کے پہلو میں ایک دروازہ تھا، جو یقیناً مندر کے اندرونی حصے کی طرف کھلتا تھا۔اس طرف پجاری اور اس کے چیلوں کے کمرے ہوں گے۔

بڑے بت کو دیکھتے ہوئے اسکے اندر شدید ناپسندیدگی ابھری۔ان چند لمحوں میں اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔اس کی بے چینی دور ہوگئی تھی۔اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ اللہ سے اظہار محبت کیلئے، اسے خوش کرنے کیلئے وہ کیا کرسکتا ہے۔محمود نے بتایا کہ اللہ سب سے زیادہ شرک کو ناپسند کرتا ہے اور اس گناہ کو کبھی معاف نہیں کرتا۔اور مندر شرک کا اجتماعی مقام ہے اور بت شرک کا ذریعہ۔تو اگر وہ یہاں شرک پر وار کرے گا تو اللہ اس عمل کو پسند کرے گا۔ایک دم ہی وہ پرجوش ہوگیا۔اس نے ادھر ادھر دیکھا۔وہ یہاں اکیلا تھا۔اس نے آگے بڑھ کر بڑے بت کا جائزہ لیا۔اسے چھو کر دیکھا۔اسے تھوڑی سی تشویش ہوئی۔بت نہ صرف بھاری تھا۔بلکہ بہت سخت اور مضبوط بھی لگ رہا تھا۔

اب وہ صورت حال پر غور کررہا تھا۔فی الوقت تو وہ کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔پہلا قدم تو یہ تھا کہ وہ اپنی صبح کی روانگی منسوخ کرے۔کل کا دن یہاں گزارے، تیاری کرے اور پھر یہاں واپس آئے۔اپنا کام کرے اور نکل جائے۔

اسے اندازہ تھا کہ وقت بہت مناسب ہے۔وہ ایسا مندر تھا، جو عام دنوں میں سونا نہیں رہتا ہوگا۔اس کے سونے پن کا سبب میلہ تھا اور میلہ کل بھی جاری رہے گا۔مندر میں ہجوم ہوتا تو اس کا کام دشوار ہوجاتا۔

اب اسے بڑی احتیاط سے منصوبہ بنانا تھا۔

ضروریات کیا تھیں؟ کچھ چیزیں تو اسے کل بازار سے خریدنی تھیں۔اصل چیز مندر میں اس کیلئے سازگار ماحول کا ہونا تھا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

اس کے لئے اسے کچھ سوچنا اور کرنا تھا کہ مندر میں اس کیلئے کوئی رکاوٹ نہ ہو اور وہ سکون سے اپنا کام کر سکے۔اس کیلئے اس کے ذہن میں ایک منصوبے کے خدوخال واضح ہو رہے تھے۔

بت کے پہلو والا دروازہ کھلا اور پجاری اندر آیا۔موٹے تازے بڑے پیٹ والے پجاری نے اسے بہت غور سے دیکھا۔''آؤ بالک.....پوجا کر لی؟''۔

اوتار سنگھ نے اثبات میں سر ہلایا۔

پجاری نے تھالی اٹھائی،اس کے ماتھے پر تلک لگایا اور اسے پرشاد دیا۔

اوتار سنگھ کو کراہت کا احساس ہوا۔تلک کا تو وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔لیکن پرشاد وہ ہرگز نہیں کھاتا۔اور وہ جلدی جلدی کلمہ پڑھنے لگا تھا۔اس نے جیب سے کچھ بڑے نوٹ نکالے اور پجاری کی طرف بڑھا دیئے۔

پجاری کی آنکھیں چمکنے لگیں۔تاہم س نے بڑی بے نیازی سے پوچھا۔''یہ کس لئے بالک؟''۔

''آپ کیلئے''۔اوتار سنگھ نے کہا۔''میں بہت دور سے آیا ہوں پنڈت جی۔میں نے آپ کو سپنے میں دیکھا تھا''۔

پنڈت کی باچھیں کھل گئیں۔لڑکا اسے کوئی بڑی آسامی لگ رہا تھا۔''کیا دیکھا تھا بالک؟''۔اس نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

''میں نے سپنے میں اپنی سورگ باشی ماتا جی کو دیکھا۔وہ کہہ رہی تھیں.....جے پور جاؤ۔وہاں کے بڑے مندر کے پجاری کو بھینٹ دو۔اور اس سے گیتا کا پاٹھ سنو.....مگر اکیلے میں.....''۔

''تم نے کہا تھا بالک کے تم نے مجھے سپنے میں دیکھا تھا؟''۔

''جی مہاراج۔پھر میں نے دیکھا کہ میں مندر کے اندر کسی کمرے میں ہوں۔شاید آپ کا کمرا ہے۔وہاں میں آپ کے کچھ چیلوں کے ساتھ بیٹھا ہوا آپ سے گیتا کا پاٹھ سن رہا ہوں۔اس کے بعد آپ اور آپ کے چیلے میری لائی ہوئی مٹھائی کھا رہے ہیں۔پھر میں آپ کو ماتا جی کے کہنے کے مطابق آپ کو پانچ سو روپے دے رہا ہوں۔بس اتنا ہی دیکھا تھا میں نے''۔

پنڈت تو نہال ہو گیا۔دو سو روپے اسے پہلے ہی مل چکے تھے۔اور پانچ سو روپے ملنے کا امکان سامنے تھا۔اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔''تم بہت بھاگیہ وان ہو بالک۔تمہارا سپنا اوش سچا ہے۔تم نے مجھے سپنے میں ایسا ہی دیکھا تھا''۔

''جی وہ آپ ہی تھے مہاراج۔پرنتو آپ کا کمرا.....''۔اوتار سنگھ کے لہجے میں ہلکا سا شک تھا۔

اب وہ شک دور کرنا پجاری کی ذمے داری تھی۔پانچ سو روپے کا سوال تھا۔''چلو.....میں تمہیں اپنا کمرا دکھاتا ہوں''۔

''یہ مندر کا دروازہ کھلا رہتا ہے؟''۔

''یہ بھگوان کا گھر ہے بالک.....یہاں بری نیت سے کوئی نہیں آ سکتا''۔پجاری نے بڑے یقین سے کہا۔

اوتار سنگھ دل ہی دل میں ہنسا۔بھگوان اس کی نیت سے بے خبر تھا۔دل کا حال تو صرف اللہ جانتا ہے۔

''دروازہ ہم رات گیارہ بجے بند کرتے ہیں۔آؤ میرے ساتھ''

پجاری اسے اندر لے گیا۔وہاں ایک بڑا احاطہ تھا،جس کے دو اطراف کمرے بنے ہوئے تھے۔تیسری سمت ایک اور دروازہ تھا۔وہ شاید مندر میں رہنے والوں کے لئے باہر نکلنے کا راستہ تھا۔اوتار سنگھ کو سارے کام آسان ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔

پجاری کا کمرا دوسرے کمروں سے بہت بڑا تھا۔اتنا بڑا کہ اس میں پچاس سے زیادہ افراد آسانی سے بیٹھ سکتے تھے۔

''تم نے سپنے میں یہی کمرا دیکھا تھا نا بالک؟''۔پجاری کے لہجے میں اصرار تھا۔

''لگتا تو یہی ہے''۔

''اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا''۔پنڈت نے زور دے کر کہا۔

''آپ کے چیلے کتنے ہیں؟''۔

''نو ہیں''۔

''مجھے لگتا ہے کہ میں نے چیلے زیادہ دیکھے تھے''۔اوتار سنگھ کوئی کمی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

''لگتا ہے نا۔پرنتو دیکھے نو ہی ہوں گے''۔

''ہو سکتا ہے''۔اوتار سنگھ نے بے دلی سے کہا۔پھر بولا۔''مگر یہاں کمرے تو زیادہ ہیں''۔

''تو چھ دیو داسیاں بھی ہیں نا بالک''۔پجاری نے جلدی سے کہا۔

اوتار سنگھ کو غلطی کا احساس ہو گیا۔اب اسے نبھانا تھا۔''ارے ہاں مہاراج،میں نے سپنے میں چھ دیو داسیاں بھی دیکھی تھیں۔وہ بھی گیتا کا پاٹھ سن رہی تھیں اور انہوں نے بھی میرے ہاتھ سے پرشاد کھایا تھا''۔

''اوش دیکھا ہوگا۔سچے سپنے میں بھول تو ہو سکتی ہے پرنتو کوئی کمی نہیں رہتی''۔پانچ سو روپے کیلئے پجاری سب کچھ قبول کر سکتا تھا۔

''جی مہاراج''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''میں اپنے چیلوں اور داسیوں کو بلاتا ہوں۔ پھر پاٹھ سناؤں گا''

اوتار سنگھ کے لئے یہ ممکن نہیں تھا۔ ابھی تو اسے بہت تیاری کرنا تھی۔ ''آج نہیں مہاراج، یہ کام کل کریں گے''۔

پنڈت بے صبرا ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''کیوں بالک۔ آج کا دن تو شبھ ہے''۔

''میں نے سپنے میں گردوار کا دن دیکھا تھا اور رات گیارہ بجے کے بعد کا وقت''۔ اوتار سنگھ نے کہا۔ ''اور سپنا سچا ہے تو سب کچھ ویسے ہی ہوگا، جیسے میں نے سپنے میں دیکھا تھا۔ آپ، چیلے اور دیو داسیاں میرے ہاتھ سے مٹھائی بھی کھائیں گی۔ پھر میں آپ کو بھینٹ دوں گا''۔

''اوش ویسا ہی ہوگا بالک''۔

''اور میں نے سپنے میں مندر کا دروازہ بھی بند دیکھا تھا''۔

''وہ تو گیارہ بجے کے بعد بند ہوتا ہی ہے''۔

''تو میں کل گیارہ بجے آؤں گا مہاراج''۔

''میں انتظار کروں گا بالک''۔

اوتار سنگھ مندر سے نکلا تو اس کے رگ و پے میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ اس کی بے چینی دور ہو چکی تھی اور وہ بہت خوش تھا۔ وہ ہوٹل گیا اور نہا دھو کر سونے کے لئے لیٹ گیا۔ لیکن سونے سے پہلے بہت دیر تک وہ اپنے منصوبے کی نوک پلک درست کرتا رہا۔ یہ سوچتا رہا کہ کلا اسے کیا کیا کرنا ہے۔

سوتے وقت وہ مطمئن تھا کہ اس نے کہیں کوئی جھول نہیں چھوڑا ہے۔ البتہ اگلا دن بڑی مصروفیت کا تھا۔

.....x.....

اگلی صبح سب سے پہلے اوتار سنگھ ایک مٹھائی کی دکان پر گیا۔ ''مجھے پانچ سیر لڈو بنوانے ہیں''۔ اس نے حلوائی سے کہا۔

''دو روپے سیر ہوں گے''۔ حلوائی نے کہا۔

''پیسوں کی مجھے کوئی پروا نہیں۔ لڈو ایسے ہوں کہ کوئی کھائے تو اس کا ہاتھ ہی نہ رکے''۔

حلوائی نے اسے غور سے دیکھا۔ ''پھر قیمت بڑھ جائے گی۔ تین روپے سیر دوں گا۔ لڈو ایسا ہوگا کہ آدمی کھائے تو کھاتا ہی چلا جائے''۔

''مجھے منظور ہے۔ مگر ایک بات اور ہے''۔ اوتار سنگھ نے رازدارانہ انداز میں کہا۔

''بولو مہاراج''۔

''اصل میں ہم کچھ دوست ہیں کالج کے۔ ساتھ ہی یہاں آئے ہیں میلہ دیکھنے۔ میں انکے ساتھ شرارت کرنا چاہتا ہوں..... یونہی مذاق میں''۔

''میں سمجھ گیا۔ لڈوؤں میں بھنگ ملا دوں؟''۔ حلوائی مسکرایا۔

''نہیں۔ یہ تو پرانا ہو چکا''۔ اوتار سنگھ بولا۔ ''میں تمہیں منہ مانگی قیمت دوں گا۔ لڈوؤں میں بے ہوشی کی دوا ملانی ہوگی۔ تیز اثر کرنے والی..... ایسی کہ رات کو آدمی کھائے تو پھر دوپہر کو ہی اٹھے''

حلوائی نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا۔ ''کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے بابو جی؟''۔

''ارے نہیں۔ بتایا نا، میرے کالج کے دوست ہیں۔ پچھلی بار میں ان کے مذاق کا نشانہ بنا تھا''۔

حلوائی چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ لیکن دس روپے سیر دوں گا''۔

''منظور ہے''۔

''کب چاہئیں لڈو؟''۔

''رات ساڑھے دس بجے''۔

''تیار ملیں گے۔ پر نقد پورے پچاس روپے پیشگی لوں گا''۔

''نہیں۔ آدھے ابھی اور آدھے لڈو لے جانے کے وقت''۔

''نہیں بابو جی۔ میں تو پورے پیسے پیشگی لوں گا۔ دیکھو نا، تمہارا ارادہ بدل گیا تو میرا تو نقصان ہوگا نا۔ وہ لڈو تو میں کسی کو بیچ بھی نہیں سکتا''۔

اوتار سنگھ نے کچھ دیر ہچکچانے کی اداکاری کی۔ حلوائی اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اتنا تگڑا گاہک ہاتھ سے نکلے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر لڑکا پھسلنے لگا تو آدھے پیسے ہی پکڑ لے گا۔ وہ نہیں آیا، تب بھی فائدہ ہی ہے۔ دس روپے کے لڈو ہوں گے اور پچیس پہلے ہی مل رہے ہیں۔

بالآخر اوتار سنگھ نے جیب سے پچاس روپے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔ ''اچھا..... بے ہوشی کی دوا سے لڈو کے ذائقے میں تو فرق نہیں پڑے گا؟''۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا بابو جی۔ تم بے فکر رہو۔ کھانے والے کو پتا بھی نہیں چلے گا''۔

''بس تو میں ساڑھے دس بجے آؤں گا۔ دکان بند تو نہیں کرتے تم؟''۔

''میلے کے دنوں میں تو آدھی رات تک دکان کھلی رہتی ہے بابو جی۔ تم بے فکر ہو کر جاؤ''۔

اگلا مرحلہ زیادہ مشکل تھا۔ اس کے لئے اوتار سنگھ کو بہت دوڑ دھوپ کرنا پڑی۔ اسے ایک کلہاڑی اور ایک ہتھوڑا خریدنا تھا۔ لیکن اس کے لئے اس کی کچھ شرائط تھیں۔ یہ ضروری تھا کہ دونوں چیزیں سائز میں چھوٹی ہوں۔ تاکہ وہ انہیں اپنے لباس میں بہ آسانی چھپا کر لے جا سکے۔ ہلکی ہوں تو اور بھی بہتر ہے۔ لیکن کلہاڑی بہت تیز ہو۔ کیوں کہ بت بہت بھاری تھا..... اور سخت بھی معلوم ہوتا تھا۔

وہ درجنوں دکانوں میں گیا۔ لیکن موثر ترین کلہاڑی وہ تھی جو بڑی بھی تھی اور بھاری بھی۔ اور اسے تو اس پر بھی شبہ تھا کہ وہ بڑی اور بھاری کلہاڑی بھی اس بت کا کچھ بگاڑ سکے گی۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

دوسرے وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ زیادہ آواز ہو اور لوگ متوجہ ہوں۔ اسے تو بڑی خاموشی سے اپنا کام کر کے نکل آنا تھا۔

بالآخر ایک دکان پر اسے اپنے مطلب کی چیزیں مل گئیں۔ دونوں چیزیں باہر کی تھیں اور دیکھنے میں بے ضرر لگتی تھیں۔ پہلی نظر میں تو وہ بھی دھوکہ کھا گیا۔ ''نہیں بھئی، اس کلہاڑی سے تو لکڑی بھی نہیں پھٹے گی''۔ اس نے دکان دار سے کہا۔

''بابو جی، غور سے دیکھو اس کی دھار''۔ دکان دار بولا۔ ''یہ تو لوہا بھی کاٹ دے گی''۔

اوتار سنگھ نے دھار پر انگلی رکھی ہی تھی کہ سرخ رنگ کی لکیر نمودار ہو گئی۔ کلہاڑی کی دھار بلاشبہ بہت تیز تھی۔ لیکن اہم سوال یہ تھا کہ اس بت کا بھی کچھ بگاڑ سکے گی یا نہیں۔

''میں ذرا اور دیکھ لوں۔ شاید اس سے بہتر کچھ مل جائے''۔ اس نے کہا۔

''دیکھ لو بابو جی، بازار موجود ہے۔ پر نتو اس سے اچھی چیز ملے گی نہیں''۔

اوتار سنگھ نے پورا بازار چھان مارا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ دکان دار کا چیلنج بجا تھا۔ آخر اسے لوٹ کر وہیں جانا پڑا۔

کلہاڑی اور ہتھوڑا خریدنے کے بعد اس کی تیاری مکمل ہو گئی۔ وہ ہوٹل جا کر سکون سے سو گیا۔

شام کو وہ میلے کے لئے تیار ہو کر نکلا۔ اس کی مہم میں تو ابھی کافی وقت پڑا تھا۔

گزشتہ روز کے برعکس اس روز میلے میں اس کا دل لگا اور اس نے خوب تفریح کی۔ وجہ یہ تھی کہ پچھلے روز وہ ایک الجھن میں تھا۔ جبکہ آج نہ صرف وہ الجھن دور ہو چکی تھی بلکہ وہ خوش تھا کہ آج کچھ کرنے والا ہے..... ایک ایسا کام جو شاید اللہ کو پسند آئے۔

وہ گھومتا پھرا۔ اس نے جسمانی مقابلے دیکھے۔ لیکن ان میں حصہ لینے کے خیال کو اس نے رد کر دیا۔ جو اصل کام وہ کرنے والا تھا، اس کے لئے اس کا یہاں نمایاں ہونا نقصان دہ ثابت ہو سکتا تھا۔ یہاں کوئی اسے نہیں جانتا تھا۔ بعد میں بات کھلے گی تو ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ اسے کہاں ڈھونڈیں۔

اسے ڈر تھا کہ کہیں ارجن سے سامنا نہ ہو جائے۔ مگر خوش قسمتی سے ایسا نہیں ہوا۔

نو بجے وہ میلے سے نکل آیا، اور ہوٹل کی طرف چل دیا۔ اب اسے اصل کام کے لئے تیاری کرنی تھی۔

.....x.....

اوتار سنگھ کو نہیں معلوم تھا کہ اس کا یہ سوچنا کہ اس شہر میں کوئی اسے جانتا پہچانتا نہیں، کتنا غلط ہے۔ یہ درست ہے کہ وہ اس شہر میں پہلی بار آیا تھا۔ لیکن اس شہر میں آٹھ افراد ایسے تھے جو نہ صرف یہ کہ اسے جانتے تھے، پہچانتے تھے، بلکہ اس کیلئے جذبات بھی رکھتے تھے۔ یہ اس کے وہ کرم فرما تھے جو اس کی خاطر گڑھی تک آئے تھے، مہیش پور میں رہے تھے، جنہوں نے اس پر حملہ کیا تھا۔ مگر اپنے زخمی ساتھیوں کو اٹھا کر فرار ہونے پر مجبور ہو گئے تھے۔

ان میں سے تین افراد اس وقت میلے میں موجود تھے۔ کرتارا، رگھبیر اور بنسی دھر۔ اوتار سنگھ کا ان سے سامنا نہیں ہوا تو محض اس لئے کہ ی کا تب تقدیر کی اسکیم میں نہیں تھا۔ ورنہ ان تینوں کو بھی دارو کے بعد سب سے زیادہ جسمانی مقابلوں میں دلچسپی تھی۔ جو مقابلے اوتار سنگھ نے بڑی دلچسپی سے دیکھے، انہیں دیکھنے والے تماشائیوں میں وہ تینوں بھی شامل تھے۔ فرق یہ تھا کہ وہ دائرے کے ایک جانب تھے اور اوتار سنگھ دوسری جانب۔

دنیا کے بارے میں دو محاورے ہیں۔ ایک تو یہ کہ دنیا اتنی بڑی ہے کہ کوئی بچھڑ جائے تو اس کے دوبارہ ملنے کی کوئی ضمانت نہیں۔ دوسرا یہ کہ دنیا اتنی چھوٹی ہے کہ لوگ بار بار ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں..... بغیر ارادے کے ملتے ہیں۔ اس معاملے میں دونوں محاوروں کو درست ثابت ہونا تھا..... مگر مختلف اوقات میں۔

نو بجے تو انہیں اپنا سب سے بڑا شوق یاد آیا۔ دارو! میلے میں اس کا بندوبست بھی تھا۔ وہ تینوں اس طرف چل دیئے۔

شراب کی ایک سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ تمام منفی چیزوں کو ابھارتی ہے۔ دماغ پر اثر انداز ہوتی ہے تو شعور کو بیکار کر کے لاشعور اور تحت الشعور کو اجاگر کرتی ہے۔ یہ جن منفی جذبوں کو ابھارتی ہے، ان میں سب سے ہلکا اور شریفانہ جذبہ دکھ ہے۔ شرابیوں کو پینے کے بعد اپنے ایسے ایسے دکھ یاد آتے ہیں، جن کا ان کی موجودہ زندگی سے کوئی واسطہ ہی نہیں رہا ہوتا۔ نشے میں وہ دکھ انہیں بہت اہم اور بہت بڑے لگتے ہیں۔ اسکے علاوہ نفرت، حسد، بغض، کینہ اور بڑی محرومیاں خواہ وہ ان کیلئے اچھی ہی ہوں، انہیں ستانے لگتی ہیں۔ شاید شراب کو حرام قرار دیئے جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہو۔

پہلے جام کے بعد ان تینوں کو وہ عورتیں یاد آئیں، جو انہیں نہیں مل سکی تھیں۔ دوسرے جام نے انہیں باتونی کر دیا۔ وہ دنیا جہان کی بے سروپا باتیں کرنے لگے۔ کیونکہ شراب ان کے شعور کو معطل کر کے لاشعور کو کریدرہی تھی تیسرے جام نے ان کی نفرتیں اور دشمنیاں ابھار دیں۔

ان کے درمیان ایک نفرت، ایک دشمنی قدر مشترک تھی..... اور وہ تھی اوتار سنگھ سے نفرت اور اس سے دشمنی۔ لیکن تینوں کیلئے اس کی شدت کے درجے الگ الگ تھے، کرتارے کے لئے اس کی اہمیت سب سے کم تھی۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

اس لئے کہ وہ اس کا ذاتی معاملہ نہیں تھا۔ وہ جسونت کا دوست تھا۔ اور جسونت کی کیدار ناتھ سے دوستی تھی۔ اور کرتارا یاروں کا یار تھا۔ جب اسے پتا چلا کہ کوئی اوتار سنگھ نامی لڑکا کیدار ناتھ کے راستے کی رکاوٹ ہے اور اسے دور کرنا ہے تو اس نے ہامی بھر لی۔ حالانکہ اس نے لڑکے کو دیکھا تک نہیں تھا۔ بات وہی تھی۔ وہ اس کا ذاتی معاملہ نہیں تھا۔ اس نے اپنے دوستوں سے بات کی اور انہیں لے کر چل دیا۔ یہ الگ بات کہ وہ وہاں سے ناکام واپس آئے۔ کرتارے کو اس بے عزتی کی وجہ سے اوتار سنگھ سے نفرت تھی۔ رگھبیر کی نفرت اور دشمنی کرتارے سے زیادہ تھی۔ وہ کرتارے کی دوستی کی وجہ سے اس اسکیم میں شامل ہوا تھا۔ اس نے اپنے چار جواں مرد ساتھیوں کو دو عام سے کم عمر لڑکوں سے مار کھاتے دیکھا تھا۔ وہ میدان میں کودنا چاہتا تھا۔ لیکن کرتارے نے اسے روک دیا تھا۔ کرتارا اپنے دوست جسونت کی ہدایت پر محتاط تھا۔ اس لئے گرمی کے ان لمحوں میں بھی دماغ سے سوچ رہا تھا۔ تو وہ لڑکا اوتار سنگھ رگھبیر کی مردانگی کے جسم پر لگا ہوا وہ زخم تھا، جو کسی بھی مرہم سے ٹھیک نہیں ہو رہا تھا۔

لیکن سورج کو اوتار سنگھ سے کبھی نہ مٹنے والی دشمنی تھی۔ اسے اس سے ایسی شدید نفرت تھی کہ وہ اس کے چہرے کو بھی کبھی نہیں بھلا سکا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ ان دو کم عمر اور بظاہر عام سے نظر آنے والے لڑکوں کو ختم کرنے کے ارادے سے حملہ آور ہونے والوں میں شامل تھا۔ اور اوتار سنگھ کی لاٹھی نے پہلا وار اسی پر کیا تھا۔ اس کے بعد وہ لڑنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ وہ ایسی ذلت تھی، جسے وہ کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔

ان سب کو وہ ذلت آمیز مہم یاد تھی۔ وہ آٹھ افراد اس مہم پر گئے تھے اور آٹھ ہی واپس بھی آئے تھے۔ مگر اس طرح کہ ان میں چار ناکارہ ہو چکے تھے اور دیگر چار انہیں اونٹوں پر لاد کر وہاں سے فرار ہوئے تھے۔

واپس آنے کے بعد ان کے درمیان تند و تیز بحثیں ہوئی تھیں۔ کیونکہ شریر کے گھاؤ تو بھول گئے تھے۔ لیکن آتما کے گھاؤ بھرنے والے نہیں تھے۔ چاروں مقابلہ کرنے والے دوسرے چاروں پر برہم تھے کہ انہوں نے بزدلی دکھائی۔ ان چار میں سے تین کرتارے پر برہم تھے کہ کرتارے نے انہیں میدان میں اترنے نہیں دیا۔

لیکن کرتارا اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا۔ اصل میں ایک فرق تھا۔ اس نے اپنے چار جسونت کے کہنے پر اس کام کا بیڑا اٹھایا تھا۔ جبکہ اس کے دیگر ساتھیوں کے لئے انعام مقرر تھا۔ وہ کام پورا کر کے آتے تو مالا مال ہو جاتے۔ تو اوتارے کو تو جسونت کی ہدایت پر عمل کرنا تھا۔ کرتارے کی منطق اپنی جگہ پکی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ وہ آٹھواں بیک وقت بھی میدان میں اترتے تو دونوں لٹھیا باز لڑکے انہیں لٹا دیتے۔ پھر وہ پکڑے جاتے۔ وہ ٹھاکر کے قہر کا شکار ہوتے۔ اور ٹھاکر انہیں کبھی نہ بخشتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جسونت کے یار کیدار ناتھ کا پول کھل جاتا۔ اور یہ کیدار ناتھ کو گوارا نہیں تھا۔

اس وقت چار جام حلق سے اترتے ہی سب سے پہلے سورج کو اوتار سنگھ کی یاد آئی۔ وہ بھاں بھاں کر کے رونے لگا۔

''او تجھے کیا ہو گیا یارا؟''۔ رگھبیر نے لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا۔

''مجھے کیا ہونا ہے۔ پہلے سے ہوا ہے..... مجھے اوتار سنگھ ہوا ہے۔ میں اس کا خون پینا چاہتا ہوں''۔

''اسے بھول جا سورج''۔ رگھبیر نے اسے تھپکی دی۔ ''سمجھ لے، ہم نے اسے کبھی دیکھا ہی نہیں''۔

''کیسے بھول جاؤں؟ اس کا چہرہ تو ہمیشہ میری نظر میں رہتا ہے''

''تو ٹھیک ہے''۔ رگھبیر نے انگلی نچاتے ہوئے کہا۔ ''چل..... ہم دونوں اس کے گاؤں چلتے ہیں۔ اب اسے ٹھکانے لگا کر ہی آئیں گے۔ اب تو ہم نے لٹھیا بازی بھی سیکھ لی ہے۔ دیکھ لیں گے اسے''۔

''ہاں..... چلو.....''۔ سورج اٹھنے لگا۔

کرتارے نے ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھا دیا۔ وہ جب بھی پینے کے لئے بیٹھتے تھے، یہی کچھ ہوتا تھا۔ کرتارے کو یاد تھا کہ اسے کب کیا کرنا ہے۔ اسے یاد تھا کہ جب وہ ناکام ہو کر واپس آئے تھے تو انہوں نے فوراً ہی دوسرے حملے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ انہوں نے ایک ماہر لٹھیا باز کی شاگردی اختیار کر لی تھی۔ لیکن تیاری مکمل ہونے سے پہلے ہی کیدار ناتھ جسونت سے بات کرنے جے پور آیا تھا۔ اور اس کے بعد جسونت نے کرتارے سے کہا تھا۔ ''اب اس لڑکے کی طرف دیکھنا بھی نہیں۔ بات الٹ گئی ہے۔ اسے کچھ ہو گیا تو میرے یار کا بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔ کرتارا جسونت کی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ اس نے اپنے سب ساتھیوں سے وچن لے لیا تھا۔ لیکن وہ جب بھی پی کر بہکتے تو اس وچن کو بھول جاتے۔ اور اسے یاد دلانا پڑتا۔

اس وقت بھی اس نے یہی کیا۔ ''مجھ سے کیا ہوا وچن یاد ہے؟''۔ اس نے سورج کو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ''اس لڑکے کو چھونا بھی نہیں ہے''۔

''تو میں کیا کروں؟ یہاں سینے میں ہر وقت آگ جلتی رہتی ہے''۔ سورج نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔

''جلنے دے، جلنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ پر جب تو دارو پیتا ہے تو یہ بھڑکتی ہے''۔

''تو میں کیا کروں؟''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''یا تو پیا نہ کر۔یا اتنی پیا کر کہ یہ آگ اس سے بجھ جائے''۔کرتارے نے بے پروائی سے کہا۔''یہ لے اور پی''۔

وہ پیتے رہے۔کرتارے نے گفتگو کا رخ بدل دیا۔

کچھ دیر بعد سورج اٹھ کھڑا ہوا۔

''تو کہاں چلا میرے یار''۔رگھبیر نے لہک کر پوچھا۔

''بس میں جاؤں گا۔اسے ڈھونڈوں گا۔کیا پتا،وہ مل ہی جائے''۔سورج نے کہا۔

کرتارا کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ رگھبیر نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے دبا کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔پھر وہ سورج سے بولا۔''ٹھیک ہے۔تو جا کر اسے ڈھونڈ۔مل جائے تو مجھے بھی بتانا''۔

''ضرور بتاؤں گا''۔سورج نے کہا اور لڑکھڑاتے قدموں سے ایک طرف چل دیا۔

کرتارے نے سوالیہ نظروں سے رگھبیر کو دیکھا۔''تم نے کیوں جانے دیا اسے؟''۔

''جانے دو یارا۔ڈھونڈے گا تو کچھ دل ہی بہل جائے گا۔آگ تو ٹھنڈی ہوگی۔اب وہ یہاں اسے ملنے سے تو رہا''۔

اس پر دونوں ہنسنے لگے۔

.....x.....

ٹھاکر پرتاپ سنگھ اب بڑی بے چینی سے بیٹے کا انتظار کر رہا تھا۔اب وصال دین کو دیکھ کر اسے سکون کا احساس نہیں ہوتا تھا۔بلکہ بڑی شدت سے اوتار سنگھ کی یاد آتی تھی۔

گزشتہ رات اس نے وصال دین سے پوچھا تھا۔''میرے پتر کے امتحان کب ختم ہو رہے ہیں؟''۔

وصال دین نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔''آج ان کا آخری پرچا تھا؟''۔

یہ سن کر ٹھاکر بے چین ہو گیا۔''تب تو اسے آجانا تھا۔وہ رکنے والا تو نہیں''۔

''کسی وجہ سے رک گئے ہوں گے ٹھاکر جی۔کل آجائیں گے''

سو آج صبح ہی سے ٹھاکر بیٹے کی راہ تک رہا تھا۔دوپہر کو اس سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔اب تو اوتار سنگھ کے ساتھ ہی کھاؤں گا۔اس نے سوچا۔

شام ہو گئی۔وہ حویلی کے باہر چھڑکاؤ کرا کے،کرسیاں لگوا کے بیٹھ گیا۔اس کی نظریں آنے والے راستے پر جمی تھیں۔

پھر ٹھاکر نے مولوی برکت علی کو اکیلے آتے دیکھا تو اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔وہ خود اٹھ کر ان کی طرف لپکا۔''کیا بات ہے مولوی صاحب؟ اور لوگ کہاں ہیں؟''۔اس نے پوچھا۔

''وہ لوگ تو نہیں آسکے ہیں''۔

''پر کیوں؟''۔

''کانتی پرشاد جی بیمار ہو گئے ہیں۔وہ آنہیں سکتے۔اوتار سنگھ نے رگھو اور رنجنا کو ان کے پاس رکنے کو کہا ہے''۔

ٹھاکر اور پریشان ہو گیا۔''تو آپ اوتار سنگھ کو تو اپنے ساتھ لے آتے''

''میں گھر ہوتا ہوا آیا ہوں۔اوتار سنگھ وہاں تھا ہی نہیں۔وہ تو کل ہی روانہ ہو گیا تھا''۔

ٹھاکر کی پریشانی کی کوئی حد نہیں تھی۔''پر وہ یہاں نہیں آیا''۔

''اس نے کہا تھا کہ وہ جے پور جا رہا ہے۔میلہ دیکھے گا۔پھر آگرہ جائے گا.....تاج محل دیکھنے''۔مولوی صاحب نے وضاحت کی۔''میرا اندازہ ہے کہ وہ کل یا پرسوں یہاں پہنچے گا۔

اس طرف سے اطمینان ہوا تو ٹھاکر کو دوسری فکر لگ گئی۔''پہلی بار وہ اکیلا نکلا ہے''۔اس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

''آپ پریشان نہ ہوں ٹھاکر صاحب،وہ بہت عقل مند ہے۔اب وہ کالج میں ہے۔اسے پریکٹیکل لائف کے لئے تیار ہونا ہے۔ساری عمر انگلی پکڑ کر تو نہیں چلے گا۔اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ بہت سمجھدار اور اہل ہے''۔

ٹھاکر کو فخر کا احساس ہوا۔واقعی.....اس کا بیٹا کالج میں پڑھتا ہے۔جوان ہو چکا ہے۔

ٹھاکر نے مولوی صاحب کی خوب تواضع کی۔اوتار سنگھ کی فکر کم ہوئی تو اسے خیال آیا کہ ابھی دو رات پہلے اس نے ایک بہت بڑا فیصلہ کیا تھا۔اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس پر عمل پیرا کیسے ہو۔اس سلسلے میں وہ کسی سے بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اب اس نے سوچا کہ وہ اس سلسلے میں مولوی صاحب سے مدد لے سکتا ہے۔پہلے اسے ان کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔شاید اس لئے کہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اس سال بھی آئیں گے۔

اپنی زندگی کے اہم ترین فیصلے کے بارے میں کسی سے بات کرنے کا تصور ہی اس کے لئے سنسنی خیز تھا۔مولوی صاحب یقیناً اس کی مدد کر سکیں گے۔اس نے سوچا،رات کو وہ ان سے بات کرے گا۔

(جاری ہے)

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

اس رات وصال دین آیا تو ٹھاکر نے اس سے کہا۔ ''پتر وصال دین، آج مجھے ایک بہت ضروری کام کرنا ہے۔ آج تم چلے جاؤ''۔

''جی ٹھیک ہے''۔ وصال دین نے کہا۔ پھر اسے اوتار سنگھ کا خیال آیا۔ ''بھائی..... میرا مطلب ہے چھوٹے ٹھاکر نہیں آئے''۔

''نہیں پتر۔ وہ میلہ دیکھنے چلا گیا ہے۔ شاید کل آئے''۔

وصال دین چلا گیا۔

رات کے کھانے کے بعد ٹھاکر مولوی صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ ''مولوی صاحب، مجھے آپ سے ایک ضروری کام ہے.....''۔

مولوی صاحب نے اس کام کے بارے میں سنا تو پہلے تو ان کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ پھر انہوں نے ہیجان سے لرزتی آواز میں کہا۔ ''کیا آپ کو پورا یقین ہے؟''۔

ٹھاکر نے اثبات میں سر ہلا دیا!

.....x.....

کلہاڑی بہت تیز تھی۔ اوتار سنگھ نے اس کیلئے چمڑے کا میان نما غلاف بھی خرید لیا تھا۔ اب وہ بے فکر ہو کر اسے اپنے لباس میں چھپا سکتا تھا۔ زخمی ہونے کا خطرہ بھی نہ رہتا۔ دوسری طرف اس نے ہتھوڑا بھی رکھ لیا تھا۔

پوری تیاری کے ساتھ وہ ٹھیک وقت پر ہوٹل سے نکل آیا۔

مٹھائی والے کے پاس وہ ٹھیک ساڑھے دس بجے پہنچا۔ مٹھائی والا اسے دیکھ کر خوش ہو گیا۔ ''تمہارے لڈو تیار ہیں بابو جی'' اس نے مٹھائی کے ایک ٹوکرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اوتار سنگھ نے جیب سے پیسے نکال کر اس کی طرف بڑھائے۔

''چکھ کر نہیں دیکھو گے بابو جی؟'' مٹھائی والے نے پوچھا۔

اوتار سنگھ کو لگا کہ وہ اس سے مزاق کر رہا ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ یہ لڈو میں نے اپنے لئے نہیں، دوسروں کیلئے بنوائے ہیں۔''

''پر نتو تمہیں کیسے پتا چلے گا کہ لڈو کتنے عمدہ ہیں۔''

''مجھے تمہاری بات پر بھروسہ ہے۔''

''پر میں تعریف سننا چاہتا ہوں۔'' حلوائی نے ایک لڈو اس کی طرف بڑھایا۔

''میں نے کہا نا، مجھے نہیں چکھنا۔''

''گھبراؤ نہیں بابو جی۔ یہ لڈو بے ہوش کرنے والا نہیں ہے۔''

اوتار سنگھ نے اب بھی لڈو لینے کیلئے ہاتھ نہیں بڑھایا۔

''اصل میں آرڈر کی مٹھائی ہم کچھ زیادہ ہی بناتے ہیں۔'' حلوائی نے وضاحت کی۔ ''یہ لڈو بھی زیادہ بنے تھے۔ پانچ سیر تولنے کے بعد میں نے ان میں بے ہوشی کی دوا ملا دی اور انہیں ٹوکرے میں رکھ دیا۔ یہ لڈو صاف ہے۔ کہا کر دیکھو۔ تا کہ پتا چلے کہ میں نے قیمت غلط نہیں لی ہے۔ ایسا لڈو پورے جے پور میں کوئی نہیں بنا سکتا۔''

اوتار سنگھ ہچکچا رہا تھا۔ پہلی بار وہ اسمبلا پردیس میں نکلا تھا۔ اور اس کی جیب میں خاصی رقم بھی تھی۔ اب وہ لڈو کھا لیتا اور اس میں بے ہوشی کی دوا ہوتی تو وہ لٹ بھی سکتا تھا۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ چلتا پھرتا بے ٹھکانہ آدمی تو ایسی حرکت کر سکتا ہے۔ لیکن مستقل دکان کرنے والا دکان دار ایسی حرکت کبھی نہیں کرے گا۔ البتہ وہ لڈو نہیں کھائے گا تو دکان دار اس پر شک بھی کر سکتا ہے۔

ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد بالآخر اس نے لڈو لیا اور کھا کر دیکھا۔ لڈو واقعی بہت عمدہ تھا۔ ''واقعی تم نے کمال کر دیا۔'' اس نے دل کی گہرائی سے تعریف کی۔

اتنا لذیذ لڈو تو میں نے دہلی میں نہیں کھایا۔''

دکاندار خوش ہو گیا۔ ''تو تم دہلی سے آئے ہو بابو جی؟''

''ہاں''

اوتار سنگھ نے مٹھائی کا ٹوکرا لیا اور چل دیا۔ اب بس اسے مندر پہنچنا تھا۔

.....x.....

سورج جھومتا جھامتا میلے سے باہر آیا اور سڑک پر چلنے لگا۔ ٹھنڈی ہوا نے اس کے نشے کو اور تیز کر دیا۔ وہ اس وقت صرف اور صرف اس لڑکے اوتار سنگھ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بس ایک بار وہ مل جائے اور وہ اسے ٹھکانے لگا کر اپنا بدلہ لے لے تو اس کی آتما کو شانتی مل جائے۔ لڑکے کے مل جانے کے خیال پر وہ مٹھیاں بھینچتا، دانت پیستا اور ہاتھ کو یوں لہراتا، جیسے لاٹھی گھما رہا ہو۔

''مل جائے تو دیکھ لوں گا اسے۔'' وہ بہ آواز بلند غرایا۔ ''اب تو مجھے بھی لٹھیا چلانی آتی ہے۔''

قریب سے گزرتے ہوئے راہ گیروں نے اسے بلند آواز میں خود کلامی کرتے دیکھا تو مسکرا دیے، انشے میں آدمی کیا کچھ نہیں کرتا۔

سورج مندر کے سامنے سے گزرا اور بڑھتا چلا گیا۔ مندر سے کافی آگے جانے کے بعد اچانک اس نے نظر اٹھائی تو وہ لڑکا آتا دکھائی دیا، جس کی اسے تلاش تھی۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

اس کا نشہ جیسے ہرن ہوگیا۔ ''یہ یہاں کہاں''؟ وہ بڑبڑایا۔ نشے میں وہ اسے جے پور میں تلاش کررہا تھا۔لیکن ذرا سا ہوش آیا تو اسے یہ بات ناقابل یقین لگی۔ ''کہیں مجھے چڑھ تو نہیں گئی''؟

وہ جہاں تھا وہی رک گیا۔لڑکا ابھی خاصا دور تھا۔اس کے ہاتھ میں مٹھائی کا ٹوکرا تھا۔اور وہ اپنی دھن میں چلا آرہا تھا۔

سورج نے کئی بار ہاتھوں سے آنکھوں کو مل ڈالا۔مگر لڑکا سچ مچ وہی تھا۔وہ وہیں کھڑا اس کے پاس سے گزرنے کا انتظار کرتا رہا۔قریب سے دیکھوں گا تو پتا چلے گا۔اس نے دل میں کہا۔

لڑکا ہر قدم اس سے قریب تر ہوتا جارہا تھا۔اور ہر قدم پر سورج کو احساس ہورہا تھا کہ یہ نشے کا دھوکہ نہیں۔ یہ سچ مچ وہی لڑکا ہے۔نشہ ہوتا تو قریب آتے ہوئے لڑکے کی صورت بدلتی۔

اب لڑکا عین اس کے سامنے تھا.....اور وہ وہی تھا۔اس کی صورت تو وہ آج تک نہیں بھول سکا تھا۔

وہ ایک پل کی بات تھی۔وہ وہیں کھڑا رہ گیا اور لڑکا مٹھائی کا ٹوکرا لئے آگے نکل گیا۔

سورج بہت تیزی سے پلٹا اور اضطراری طور پر اس نے ہاتھ بڑھایا۔لیکن لڑکا اس کے ہاتھ کی پہنچ سے دور جاچکا تھا۔

سورج لڑکے کے پیچھے پیچھے چل دیا۔وہ سوچ رہا تھا کہ یہ انتقام کا موقع ہے جو قسمت نے اسے دیا ہے۔آج.....اسی وقت وہ اسے ختم کرسکتا ہے۔

لیکن کیسے؟ نشے سے نکلنے کی کوشش میں الجھتے ذہن نے سوال اٹھایا۔

واقعی!اس نے سوچا۔اس وقت میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔نہ ٹھیانہ خنجر۔

کوئی بات نہیں۔دل نے کہا۔اس کے پاس بھی تو کچھ نہیں۔وہ تو مٹھائی کا ٹوکرا اٹھائے ہوئے ہے۔اسے جسمانی طور پر زیر کیا جاسکتا ہے۔

اس ایک پل میں سورج پر اپنے کتے ہی بھید کھل گئے۔اتنے عرصے سے وہ صرف اس لڑکے کی نفرت، انتقام کی آرزو ہی اپنے اندر نہیں پال رہا تھا۔اس کی بے خبری میں ایک اور چیز بھی اس کے اندر پل رہی تھی.....اور وہ تھا اس لڑکے کا خوف۔پچھلے معرکے نے اسے اس لڑکے سے خوف زدہ کردیا تھا۔کیونکہ اس نے دیکھا تھا کہ اس لڑکے نے اس جیسے تین شہ زوروں کو اس دن زمین چٹادی تھی۔آٹھ افراد کو بھاگنے پر مجبور کردیا تھا۔

اس نے پوری طرح سمجھ لیا۔ہاں.....وہ اس سے خوف زدہ ہے۔وہ اکیلا اس سے نہیں لڑسکتا۔لاٹھی ہوتی، خنجر ہوتا، تب بھی وہ اس سے نہ لڑ پاتا۔

لیکن ایک اچھی بات تھی۔لڑکا اس کے شہر میں تھا اور اکیلا تھا۔یہ اس سے نمٹنے کا بہت اچھا موقع تھا۔سوال یہ تھا کہ اب وہ کیا کرے۔

وہ اس کے پیچھے چلتا رہا۔اس نے سمجھ لیا کہ اسے یہ معلوم کرنا ہے کہ لڑکا یہاں کہاں رہ رہا ہے۔دوسرے مرحلے میں وہ اپنے ساتھیوں کو اس کے اور اس کے ٹھکانے کے بارے میں بتائے۔لیکن کرتارا اس معاملے میں اعتبار کے قابل نہیں۔جسونت نے اسے منع کردیا ہے۔کہا ہے کہ لڑکے کو بھول جائے۔اور یاروں کا یار کرتارا اپنے یار کی بات نہیں ٹالے گا۔وہ انہیں کچھ نہیں کرنے دیگا۔

ہاں رگھبیر کام کا آدمی ہے۔وہ اس سے اتنی ہی نفرت کرتا ہے، جتنی وہ کرتا ہے۔اور راجو اور گوپال ہیں، جنہوں نے اس دن لڑکے سے زخم کھائے تھے۔بس تو وہ جاکر رگھبیر کو بتائے گا۔پھر وہ راجو اور گوپال سے بات کریں گے۔اور اس کے بعد انتقام!

وہ چلتے چلتے ٹھٹھک گیا۔لڑکا بڑے مندر میں چلا گیا تھا اور پجاری سے بات کررہا تھا۔

پانچ منٹ ہوگئے۔ لڑکا تو باہر نہیں آیا۔البتہ مندر کا دروازہ بند کردیا گیا۔

سورج وہیں کھڑا رہا۔اسے یقین تھا کہ لڑکا باہر آئے گا۔تب وہ اس کا پیچھا کرکے اس کا ٹھکانہ معلوم کرے گا۔

دیر ہوگئی۔آدھا گھنٹا گزرا.....پھر ایک گھنٹا ہوگیا۔لڑکا باہر نہیں آیا۔کھڑے کھڑے، پہلو بدلتے بدلتے اس کی ٹانگیں دکھ گئیں۔مگر نہ دروازہ کھلا، نہ لڑکا باہر آیا۔اب سورج اور امکانات پر غور کررہا تھا۔اس کے خیال میں لڑکے کا ٹھکانہ معلوم ہوگیا تھا۔جس انداز میں وہ مندر میں گیا اور وہیں رک گیا، اس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ مندر ہی میں ٹھہرا ہوا ہے۔

اب بس اسے جاکر رگھبیر سے بات کرنی تھی۔رگھبیر بھی یقیناً خوش ہوگا۔پھر وہ مل کر کچھ کریں گے۔

وہ میلے کی طرف جانے کیلئے چلا۔لیکن اسے خیال آیا کہ اب تک تو میلہ اجڑ چکا ہوگا۔یار لوگ گھر جاچکے ہوں گے۔بہتر یہی ہے کہ وہ رگھبیر کے گھر جائے۔وہ وہیں ملے گا۔یہ سوچ کر وہ رگھبیر کے گھر کی طرف چل دیا۔

بڑے پجاری نے بے حد پرتپاک انداز میں اوتار سنگھ کا خیر مقدم کیا۔''آؤ بالک، پدھارو۔''

اوتار سنگھ نے بہ اکراہ اسے نمسکار کیا۔''میں ٹھیک وقت پر آیا ہوں نا مہاراج۔''

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

"آؤش بالک آؤش۔"

چند لمحے گزر گئے۔ دونوں اپنی اپنی جگہ کھڑے تھے۔ اداسنگھ اس بات کا منتظر تھا کہ پجاری مندر کا دروازہ بند کرے اور اسے اندر لے کر چلے۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ پجاری کو بھی اس سے کوئی توقع ہے۔ جو پوری نہیں ہو رہی ہے۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ بات کیا ہے

"اب دیر کس بات کی ہے مہاراج"؟ بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا

"کچھ بھی نہیں بالک۔ تم بس پوجا کرلو، بھگوان کی آرتی اتارلو۔ پھر ہم اندر چل کر بات کریں گے۔"

اداسنگھ کو اب دکھاوے کیلئے بھی وہ شرک گوارا نہیں تھا۔ پوجا تو وہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن مصلحت ضروری تھی۔ ایسا نہ ہو کہ پنڈت اس کی طرف سے مشتبہ ہو جائے۔ "پوجا بھی ضرور کروں گا مہاراج اور آرتی بھی اتاروں گا"۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "پر تو پہلے مجھے اپنی سورگ باشی ماتا جی کی منوکامنا پوری کرنی ہے۔ تاکہ ان کی آتما کو شانتی ملے۔ پہلے مجھے اپنا پاپ اتارنا ہے۔ پوجا تو میں پاٹھ سننے کے بعد کروں گا۔"

"جو اچھا تمہاری بالک۔ میں دروازہ بند کرلوں۔" پجاری دروازے کی طرف بڑھا۔

مندر کا دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد پجاری نے بڑے بت کے ساتھ والا دروازہ کھولا۔ "آؤ بالک"۔

اداسنگھ اس کے ساتھ اسکے کمرے میں چلا آیا۔ وہاں پجاری کے چیلے اور دیوداسیاں پہلے ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ پجاری ایک موٹے گدے پر پھیل کر بیٹھ گیا۔

"آؤ بالک، تم یہاں میرے سامنے بیٹھ جاؤ"۔

اداسنگھ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ اب اسے یہ فکر تھی کہ اس وقت کمرے میں موجود لوگوں کے سوا اور کوئی مندر میں موجود تو نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کا کھیل خراب ہونے کا خطرہ تھا۔ اب یہ بات وہ پوچھ تو کیسے!

"مہاراج، اور کوئی موجود ہو تو اسے بھی بلالیں۔" بالآخر اسی نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ مندر میں موجود سبھی منش اس پاٹھ میں شریک ہوں۔"

پجاری مسکرایا۔ "اس وقت ان لوگوں کے سوا مندر میں کوئی نہیں ہے بالک۔"

"تو ٹھیک ہے مہاراج"

پجاری نے گیتا کا پاٹھ شروع کیا اور ادھر اداسنگھ کو راہب کا شدید احساس ہونے لگا، جو ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتا جا رہا تھا۔ چند منٹ میں ہی اس کی یہ کیفیت ہوگئی کہ اٹھ کر بھاگ جانے کو جی چاہنے لگا۔ اچانک ہی اسے خیال آیا اور وہ دل ہی دل میں کلمہ طیبہ پڑھنے لگا۔ اس سے اسے کچھ قرار آیا۔ لیکن گھبراہٹ اس کے باوجود رہی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ پاٹھ جلد از جلد ختم ہو اور اسے اس مصیبت سے نجات ملے۔

ادھر پجاری کے ذہن میں پانچ سو روپے کی خطیر رقم کا تصور تھا۔ چنانچہ وہ اس کو خوش کردینا چاہتا تھا۔ اس لئے وہ بہت جم کر گیتا پڑھ رہا تھا۔

لمحے گزرتے رہے۔ کلمہ پڑھتے پڑھتے اداسنگھ اونگھنے لگا۔ اب وہ سب کچھ اسے خواب جیسا لگ رہا تھا۔

.....x.....

رگھبیر کو میلے سے واپس آئے بہ مشکل آدھا گھنٹا ہوا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ وقت کی اس دستک نے اسے حیران کردیا۔ وہ اٹھ کر دروازے پر گیا۔ اس نے دروازہ کھولا تو سورج اس کے سامنے کھڑا تھا۔ سورج کے چہرے سے اسے اندازہ ہوگیا کہ اس کے پاس کوئی سنسنی خیز خبر ہے۔ "کیا بات ہے یار۔ تو ابھی گھر نہیں گیا"؟ اس نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"بات کیا ہے؟"

"اندر بیٹھ کر بتاؤں گا۔ بڑی خبر ہے۔"

رگھبیر نے بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔ "آجا..... پر تو نے نیند خراب کردی"

"خبر سنے گا تو تیری نیند اڑ جائے گی۔"

"اب سنا بھی دے۔ آدھی رات ہو چکی ہے"۔ رگھبیر جھنجلا گیا۔

"خبر یہ ہے کہ وہ لڑکا اداسنگھ ہے پورا یا ہوا ہے"۔

"کس نے بتایا تجھے؟ جھوٹ نے؟"۔

"ارے میں نے خود دیکھا ہے اسے..... اپنی آنکھوں سے۔"

"تب تو تو نے اسے ختم بھی کردیا ہوگا"۔ رگھبیر نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ "پر تیرے کپڑوں پر خون کے داغ نظر نہیں آرہے ہیں"۔

"تو مذاق سمجھ رہا ہے؟"۔

"تو اور کیا سمجھوں؟"۔

"میرے پاس خنجر نہیں تھا۔ ورنہ میں اسے مار کر ہی آتا۔ اور کپڑوں پر خون کے داغ بھی ہوتے"۔ سورج نے غصے سے کہا۔

"دیکھ سورج، ہمیں پہلے ہی پتا تھا کہ تو آج اس چھوکر کے ہمراہ دیکھے گا"۔

سورج بہت سوچ سمجھ کر رگھبیر کے پاس آیا تھا۔ لیکن وہ اس کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لے رہا تھا۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں"۔

رگھبیر جانتا تھا کہ اس کے دوستوں میں شراب کی سب سے کم سہار سورج ہی کو ہے۔ وہ بہت جلدی بہک جاتا تھا۔ اور وہ لڑکا تو ہمیشوں سے اس کے سر پر سوار تھا۔ "سن سورج، گھر جا کر سو جا۔ صبح آ کے بتانا۔ تب میں ضرور دھیان دوں گا"۔

"میں نشے میں ضرور تھا۔ لیکن اسے دیکھ کر میرا نشہ ختم ہوگیا تھا"۔ سورج نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں رگھبیر۔ میں نے اسے دیکھا ہے"۔

"اچھا..... ذرا مجھ کو بتا۔ اسے کہاں دیکھا تو نے؟"۔

سورج نے پوری تفصیل سنادی۔

رگھبیر سوچ میں پڑ گیا۔ جو کچھ سورج نے بتایا تھا، وہ ناممکن نہیں تھا۔ یہ میلے کے دن تھے۔ عجیب نہیں کہ اداسنگھ میلہ دیکھنے آیا ہو۔ لیکن یہ امکان اپنی جگہ تھا۔ رگھبیر نشے میں کچھ بھی دیکھ سکتا تھا..... اور خاص طور پر اس لڑکے کو!

اس نے پوری تفصیل کی بار سنی۔ کریدتے ہوئے سوالات کئے کہ کہیں بیان میں فرق ہو۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔

"اور تجھے یقین ہے کہ وہ مندر سے باہر نہیں آیا"۔ رگھبیر نے پوچھا

"میں پورا ایک گھنٹا مندر کے دروازے کے سامنے کھڑا رہا۔ دروازہ بند ہوگیا تھا"۔

"اگر وہ اداسنگھ ہی تھا تو یقیناً مندر میں مقیم ہوا ہے۔ میں کرتا رے سے بات کروں گا"۔

"کرتا رے سے نہیں۔ وہ ہمیں کچھ کرنے نہیں دے گا۔ راجا اور گوپال کے پاس چل"۔

"اس وقت؟"۔ رگھبیر نے آنکھیں نکال کر کہا۔ "دیکھ یار، وہ مندر میں ہی ہے نا۔ ہم صبح مل کر طے کریں گے۔ پھر چل کر اسے دیکھیں گے۔ اگر وہ وہی ہے....."۔

"میں جو کہہ رہا ہوں کہ میں نے اسے دیکھا ہے"۔ سورج نے برہان کر کہا۔

"تو ٹھیک ہے۔ کل کوئی ترکیب سوچ لیں گے۔ جا گھر جا کر سو جا۔ صبح آنا۔ پھر راجا اور گوپال کے پاس چلیں گے"۔

سورج کا دل تو نہیں چاہ رہا تھا۔ لیکن رگھبیر کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

.....x.....

پجاری بہت جم کے گیتا پڑھ رہا تھا!

اداسنگھ کے لئے ایک ایک پل بھاری تھا۔ وہ اس وقت عجیب کیفیت میں تھا۔ جو کچھ کرنے کا اس نے سوچا تھا، اس کا تصور ہی اس کے جسم میں سنسنی دوڑا رہا تھا۔ جسم میدان عمل میں اترنے اور عمل کرنے کو مچل رہا تھا۔ ایسے میں ساکت بیٹھنا اس کے لئے بے حد مشکل تھا۔ مگر مجبوری تھی۔ اسے پاٹھ ختم ہونے کا انتظار کرنا تھا۔

دوسری طرف پجاری اداسنگھ کو خوش کرنا چاہتا تھا۔ مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کی اصل خوشی کیا ہے۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ تو اسے کوفت میں مبتلا کر رہا ہے۔

اداسنگھ اس دوران کلمہ طیبہ پڑھتا رہا تھا۔ ورنہ پاٹھ سن کر تو اس کا دل گھبرا رہا تھا۔

جیسے جیسے پاٹھ ختم ہوا اور اداسنگھ نے سکون کی سانس لی۔ "لو بالک تمہارا پاٹھ پورا ہوا"۔ پجاری نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

"ابھی کہاں مہاراج۔ ابھی تو مجھے بہت کچھ کرنا ہے"۔ اداسنگھ معنی خیز لہجے میں بولا۔

پجاری مسکرادیا۔ اسے پانچ سو روپے کا خیال آگیا تھا۔ اس نے لڈو نکال کر تھالی پر رکھے اور ایک لڈو اداسنگھ کی طرف بڑھایا۔

"نہیں مہاراج۔ یہ کام تو میرا ہے"۔ اداسنگھ نے کہا۔ اور تھالی اسکے ہاتھ سے لے لی۔ "یہ لیجئے"۔ اس نے لڈو پجاری کی طرف بڑھایا۔

پجاری نے لڈو کھایا اور پتاشے لیتے ہوئے کہا۔ "واہ بالک..... بہت مزے کا ہے"۔

"خاص طور پر بنوایا ہے مہاراج۔ ایک اور لیں"۔

پجاری نے ایک لڈو اور لیا۔ اداسنگھ نے وہاں بیٹھے پجاری کے چیلوں اور دیوداسیوں کو بڑے احترام سے لڈو پیش کئے۔ لڈو تھے ہی لذیذ۔ سبھی نے دوسرا لڈو بھی لیا۔ اب اسے لڈو کی تاثیر کا انتظار تھا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر طوطی نے سچ کام نہیں دکھایا تو.....

"تم بھی تو لو بالک"۔ پجاری نے اس سے کہا۔

"میں تو اپنے پیٹ پر عمل کر رہا ہوں مہاراج"۔ اداسنگھ کا لہجہ مضحکہ اڑانے والا تھا۔ "اور میں نے پیٹ میں خود لڈو نہیں کھایا تھا"

پجاری نے اسے یوں دیکھا، جیسے اس کی بات سمجھ نہیں پا رہا ہو۔ اسی لمحے اس کی آنکھیں دھندلانے لگیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ لڑھک گیا۔

"ارے..... یہ کیا ہوگیا مہاراج کو؟"۔ ایک چیلا گھبرا کر اٹھا۔

"کوئی خاص بات نہیں۔ نیند آرہی ہوگی مہاراج کو"۔ اداسنگھ نے بے پروائی سے کہا۔

لیکن چیلے اور دیوداسیاں پجاری کو پرتشویش نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کبھی وہ اداسنگھ کو بھی سوالیہ نظروں سے دیکھتے۔ پھر ان میں سے دو ڈھیر ہوئے تو باقی سراسیمہ ہو گئے۔ اب انہیں کسی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔

دیوداسیاں زیادہ گھبرائی ہوئی تھیں۔ ان میں سے کچھ نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن گر پڑیں۔

دس منٹ کے اندر اندر وہ سب بے ہوش ہو چکے تھے۔ پھر بھی اداسنگھ نے اپنے اطمینان کے لئے ایک ایک کو ہلا جلا کر دیکھا۔ لیکن کسی کو ذرا بھی ہوش نہیں تھا۔

اداسنگھ کمرے سے نکل آیا۔ پجاری نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہاں موجود سب لوگ اس کے کمرے میں موجود ہیں۔ لیکن وہ بے احتیاطی کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے اندر دیئے جلائے، اس کے ایک ایک کمرے کو دیکھا۔ تب کہیں وہ مطمئن ہوا۔ وہاں واقعی کوئی نہیں تھا۔ جو لوگ تھے، سب پجاری کے کمرے میں بے ہوش پڑے تھے۔ یعنی اب وہ بغیر کسی رکاوٹ کے اپنا کام کرسکتا تھا۔

اس نے مندر کے بیرونی ہال کی طرف کھلنے والا دروازہ کھولا اور ہال میں چلا آیا۔ چند لمحے وہ بھگوان کے بڑے بت کے سامنے کھڑا اسے گھورتا رہا۔

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''تو تم بھگوان ہو؟''۔اس نے چیلنج کرنے والے لہجے میں کہا۔''تم یہ پوری کائنات چلا رہے ہو۔یہ نظام تم نے قائم کیا ہے۔یہی بات ہے نا''۔

ہال میں خاموشی سنسنا رہی تھی۔اوتار سنگھ کی سانسوں کے سوا وہاں کوئی آواز نہیں تھی۔

''تب تو تمہاری شکتیوں کی کوئی حد نہیں ہونی چاہئے۔تم زندگی اور موت دیتے ہو۔تو تم کسی کو بھی بچا سکتے ہو۔اور تمہیں تو دل کا حال بھی معلوم ہونا چاہئے۔تمہیں علم ہونا چاہئے کہ میں یہاں کس نیت سے آیا ہوں''۔اوتار سنگھ سرگوشی میں کہے جا رہا تھا۔

چند لمحے وہ بت کو یوں دیکھتا رہا، جیسے اس کے جواب کا انتظار کر رہا ہو۔مگر بتوں میں جنبش کہاں ہوتی ہے۔

''بول نہیں سکتے تو کم از کم اشارہ ہی کر دو۔تم پلکیں جھپکو گے تو میں سمجھوں گا کہ تم ہاں کہہ رہے ہو''۔

پتھر کا بت خاموش اور بے حس و حرکت تھا۔

''کیسے بھگوان ہو تم؟ تم میں تو اظہار کی قوت بھی نہیں۔تمہیں نہیں معلوم کہ میں یہاں کیوں.....کس لئے آیا ہوں۔کیا سوچ کر آیا ہوں''۔اوتار سنگھ کے لہجے میں ملامت تھی۔

چند لمحے خاموشی رہی۔پھر اوتار سنگھ نے کہا۔''چلو.....میں خود ہی بتا دیتا ہوں۔یہ جو تمہارے شریک ہیں.....''۔اس نے چھوٹے بتوں کی طرف اشارہ کیا''یہ تمہارے حلیف، تمہارے ساتھی.....میں انہیں توڑنے کیلئے آیا ہوں۔مجھے یقین ہے کہ تم انہیں بچانے کے لئے کچھ نہ کچھ کرو گے۔ہو سکتا ہے، تم مجھے موت دے دو''۔

اوتار سنگھ نے اپنے لباس میں سے کلہاڑی اور ہتھوڑا نکالا۔''یہ دیکھو.....میں یہ ہتھیار لایا ہوں۔میں انہیں توڑ ڈالوں گا۔روک سکتے ہو تو روک لو''۔

اوتار سنگھ کلہاڑی اور ہتھوڑا لیکر چھوٹے بتوں کی طرف بڑھا۔سب سے پہلے اسے چھوٹے بت کو شانہ بنانا تھا۔اور اس کے خیال میں اس کیلئے کلہاڑی کی ضرورت نہیں تھی۔

اس نے کلہاڑی زمین پر رکھ دی اور ہتھوڑا سنبھال لیا۔

اس نے پلٹ کر بڑے بت کو دیکھا۔''تم تو کچھ بھی نہیں کر رہے ہو۔آخر یہ تمہارا کارندہ ہے۔اسے بچاؤ نا''۔اس نے چیلنج کیا۔

پھر اس نے ہتھوڑے سے سب سے چھوٹی مورتی پر وار کیا۔مورتی ایک ہی وار میں ٹوٹ گئی۔اوتار سنگھ ٹھٹھکا۔لیکن اگلے ہی لمحے مطمئن ہو گیا۔آواز اتنی زیادہ نہیں ہوئی تھی۔پھر بھی اسے محتاط رہنا تھا۔رات کے سناٹے میں آوازوں کا حجم بڑھ جاتا ہے اور وہ دور تک جاتی ہیں۔

اس کی اس احتیاط کا سبب خوف ہرگز نہیں تھا۔بات صرف اتنی سی تھی کہ وہ مداخلت نہیں چاہتا تھا۔کام ادھورا چھوڑنا اسے گوارا نہیں تھا۔اسے یہ ڈر نہیں تھا کہ اس کارروائی کے بعد وہ پکڑا گیا تو لوگ اسے ختم کر ڈالیں گے۔اس کی تو اسے پروا ہی نہیں تھی۔اسے تو بس یہ خیال تھا کہ نادان لوگ جن بتوں کو اللہ کا شریک ٹھہرا کر شرک کر کے اللہ کو ناخوش کرتے ہیں، انہیں توڑ دے۔تا کہ اللہ خوش ہو کہ اس نے بساط بھر سامان شرک کا خاتمہ کیا ہے۔اور اس کی ایک غرض بھی تھی جو پہلی مورتی کو توڑنے کے بعد اس کی سمجھ میں آئی۔آدمی کے اندر بھی بت ہوتے ہیں۔اس نے بچپن سے اب تک اپنے اندر کے بتوں کو توڑنے کی کوشش کی تھی۔مگر آج وہ اپنے اندر کے بچے کھچے بت بھی توڑ دینا چاہتا تھا۔

اس نے ٹوٹی ہوئی مورتی پر مزید ضربیں لگائیں۔''دیکھو.....میں نہیں چاہتا کہ یہ قابل شناخت رہیں''۔اس نے بڑے بت کی طرف رخ کر کے کہا۔''میں ان کو پہچانے جانے کے قابل ہی نہیں چھوڑوں گا''۔

پہلی مورتی کو چورا چورا کرنے کے بعد وہ دوسری مورتی کی طرف بڑھا۔چند لمحوں میں وہ بھی چورا چورا ہو گئی۔

اب وہ ہنومان کی مورتی کے سامنے کھڑا تھا۔''تم اگر اللہ کے بنائے ہوئے بندر ہوتے تو کبھی میرے ہاتھ نہ آتے۔میں تمہیں پکڑ ہی نہیں سکتا تھا۔ کیوں.....غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں نا؟''۔

چند لمحے سناٹا رہا۔اوتار سنگھ بت کو متوقع نظروں سے گھور رہا تھا۔

''جواب نہیں دے سکتے نا۔بھاگو گے کیسے؟ تمہیں تو منش نے بنایا ہے نا۔لو اب بچو''۔

اس نے وار کیا۔مورتی ٹوٹ گئی۔وہ اسے اور کوٹتا رہا۔

اب وہ گنیش کی مورتی کے سامنے تھا۔''تم اگر اللہ کے بنائے ہوئے ہاتھی ہوتے تو تمہارے سامنے ٹھہرنے کی مجھے مجال بھی نہ ہوتی۔تم سامنے آتے تو میں جان بچانے کیلئے بھاگ کھڑا ہوتا۔لیکن تم منش کے بنائے ہوئے ہو اور منش تمہیں توڑ بھی سکتا ہے''۔

یہ کہہ کر اس نے گنیش کی مورتی بھی توڑ ڈالی۔

اب وہ کالی کے بت کے سامنے کھڑا تھا۔''اور تم؟ تمہارا شراپ تو مشہور ہے۔تم تو جیون بھینٹ لیتی ہو۔تم مجھے شراپ نہیں دو گی؟ میں تمہیں توڑنے والا ہوں''۔

وہ بت کافی بڑا تھا۔ہتھوڑے کا وار نا کافی ثابت ہوا۔تب اوتار سنگھ نے پہلی بار کلہاڑی اٹھائی۔کلہاڑی کے ایک ہی وار نے بت کو زمیں بوس کر دیا۔اس کے بعد اوتار سنگھ نے ہتھوڑا استعمال کیا۔مورتی کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے وہ اس سے باتیں بھی کئے جا رہا تھا۔''سنو.....میں تمہارے شراپ کا انتظار کروں گا''۔

اس بت کے بعد اب وہاں بس ایک ہی بت سلامت رہ گیا تھا.....بھگوان کا بت۔''اب میں ذرا اس بڑے کی خبر لوں''۔اس نے کالی کے ملبے سے کہا۔

وہ بھگوان کے بت کے سامنے جا کھڑا ہوا۔''یہ سب تو گئے''۔اس نے حقارت سے کہا۔''اور تم نے ان کی کوئی مدد نہیں کی۔کیا اب یہ کبھی تمہارا اعتبار کریں گے؟''۔

پتھر کا بت، ظاہر ہے نہ تو دیکھ سکتا تھا اور نہ ہی سن سکتا تھا۔

''چلو، ان کی چھوڑو۔دیکھیں، تم خود کو بچا سکتے ہو یا نہیں''۔

وہ بت بیٹھی ہوئی حالت میں بھی اس سے اونچا تھا۔اوتار سنگھ نے کلہاڑی سے اس کی گردن پر وار کیا۔اس کے ہاتھ کو زبردست جھٹکا لگا۔ایسا لگا تھا کہ کلہاڑی کسی دھات سے ٹکرائی ہے۔اوتار سنگھ نے دیکھا، بت کا کچھ بھی نہیں بگڑا تھا۔

اس نے دوبارہ وار کیا۔مگر وہی کیفیت تھی۔اس نے تیسری بار کوشش کی۔پھر وہ دیوار وار کلہاڑی گھماتا گیا۔اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ کافی آواز ہو رہی ہے باہر کسی کو گڑبڑ کا احساس بھی ہو سکتا ہے۔یہ اس کا آخری کام تھا اور اب اسے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔وہ تو بس اس بات کو زمیں بوس کرنا چاہتا تھا۔

وہ پوری قوت سے کلہاڑی گھما رہا تھا.....گھمائے جا رہا تھا۔اس کا جسم پسینے میں نہا گیا۔وہ ہانپنے لگا۔اس کے بازو دکھ رہے تھے۔اس نے ہاتھ روکا اور بت کو غور سے دیکھا۔بت کی گردن پر، جہاں وہ وار کر رہا تھا، بس ہلکا سا نشان تھا۔ایسا لگتا تھا کہ وہ بت کسی چٹان سے تراشا گیا ہے اور بعد میں اس پر پینٹ کر دیا گیا ہے۔

اوتار سنگھ ہاتھ روک کر سوچنے لگا۔جو کلہاڑی اس کے پاس تھی، اس کی دھار بہت تیز تھی۔اور پتھر بھی ایسے نہیں ہوتے کہ ٹوٹ ہی نہ سکیں۔دھاتیں بھی کٹ جاتی ہیں۔پتھر کی تو بساط ہی کیا ہے۔پھر یہ کیا بات ہے کہ یہ بت نہیں ٹوٹ رہا ہے۔

اچانک اس کے دل میں خیال آیا کہ اسے اللہ سے مدد مانگنی چاہئے۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

اس نے دل میں اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ، میری مدد فرما۔ پھر اسے کچھ اور خیال آیا۔ اس نے کلہاڑی ہاتھ میں لی اور بلند آواز میں لا الہ الا اللہ، محمد الرسول اللہ کہتے ہوئے کلہاڑی کا وار کیا۔

جو کچھ ہوا، اس کے نتیجے میں وہ خود کو سنبھال نہ سکا۔ اس کا جسم غیر متوازن ہوا اور وہ گر پڑا۔ وجہ یہ تھی کہ کلہاڑی نے بت کی گردن کو ایسے کاٹ دیا تھا، جیسے چھری مکھن کو کاٹ ڈالتی ہے۔ بت کا سر بہت بھاری تھا۔ پرشور انداز میں دھڑ سے فرش پر گرا۔

اس آواز نے زمین پر گرے ہوئے اوتار سنگھ کو دہلا دیا۔ چند لمحے وہ ساکت و سامت زمین پر پڑا رہا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جو شور ہوا ہے، اس کا کوئی ردعمل ظاہر ہوتا ہے یا نہیں۔

لیکن اندر باہر، ہر طرف سناٹا تھا۔ بت کا سر فرش پر گرنے کی بازگشت بھی دم توڑ چکی تھی۔

بالآخر وہ اٹھا اور اس نے سر کٹے بت کو دیکھا۔ اسے حیرت تھی کہ بت پر جو ناکام وار اس نے پہلے کئے تھے، وہ اس آخری وار سے زیادہ کاری اور طاقت ور تھے۔ اس بار تو اس کے بازوؤں میں پہلے جیسی طاقت بھی نہیں تھی۔ اس کے باوجود اس وار نے کام کر دکھایا۔ تو یہ اس کی دعا کا نتیجہ تھا یا کلمہ طیبہ کی طاقت!

اوتار سنگھ نے ادھر ادھر سے کچھ کچھ سن کر حاصل کیا تھا۔ مگر وہ یقینی طور پر کچھ نہیں جانتا تھا۔ اللہ پر وہ یقین رکھتا تھا۔ لیکن اس نے باقاعدہ اسلام تو قبول نہیں کیا تھا۔ کلمہ طیبہ کو وہ بجا طور پر پاکی کا ضامن سمجھتا تھا۔ لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ کلمہ حق ہے جو باطل کی بڑی سے بڑی قوت کو لمحوں میں پاش پاش کر دیتا ہے۔ اسے اس کلمے کی باطل شکنی کی قوت کا ادراک نہیں تھا۔

وہ کلمہ طیبہ پڑھ کر بڑے بت پر وار کرتا رہا اور بت کے ٹکڑے اڑتے رہے۔ یہاں تک کہ بت زمیں بوس ہو گیا۔ وہ مزید وار کر کے اسے ناقابل شناخت بنانے کی کوشش کرتا رہا اور بالآخر کامیاب ہو گیا۔

اب مندر ایک ایسی تباہی کا منظر پیش کر رہا تھا، جو دیکھنے والوں کو ناقابل یقین لگتی۔

اوتار سنگھ کے بازو شل ہو چکے تھے۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ لیکن خوش اور مطمئن تھا۔ اس نے اللہ کو خوش کرنے کیلئے ایک کام کیا تھا۔ اور اسے یقین تھا کہ اللہ اس سے خوش ہے۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ بڑا بت اس سے نہیں ٹوٹ رہا تھا۔ وہ اللہ کی تائید اور مدد ہی کے نتیجے میں ٹوٹا تھا۔

چند لمحے وہ وہاں بیٹھ کر سانسیں درست کر رہا تھا۔ دل تو چاہتا تھا کہ وہ وہیں لیٹ کر سو جائے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اسے فوراً یہاں سے نکلنا ہے۔ ہوٹل جا کر وہ آرام کر سکتا ہے۔ لیکن وہ بھی تھوڑی دیر۔ کیوں کہ اسے صبح چھ بجے آگرہ جانے والی گاڑی پکڑنی ہے۔

اس نے کلہاڑی اور ہتھوڑا اپنے کپڑوں میں چھپایا اور مندر کے اندرونی حصے میں چلا آیا۔ وہاں بھی سناٹے کا راج تھا۔ وہ پجاری کے کمرے میں گیا۔ وہاں سب لوگ ویسے ہی پڑے تھے۔ جیسا وہ انہیں چھوڑ کر گیا تھا۔

وہ گلی میں کھلنے والے دروازے کو کھول کر باہر نکل آیا۔ باہر نکل کر اس نے دروازے کو بھیڑ دیا۔ پھر وہ گلی سے نکل کر سڑک پر آ گیا۔ سڑک بالکل سنسان تھی۔ انسان تو درکار اسے راستے میں کوئی کتا بھی نظر نہیں آیا۔ وہ ہوٹل کی طرف بڑھتا رہا۔

ہوٹل پہنچ کر وہ نہایا۔ پھر اس نے پانچ بجے کا الارم لگایا اور سو گیا

.....x.....

وہ ایسی رات تھی کہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ مولوی صاحب کے کمرے سے آنے کے بعد اس نے ڈائری اٹھائی اور اس میں لکھنا شروع کر دیا۔

نیند نہ آنے کی وجہ کوئی پریشانی نہیں تھی۔ بلکہ آج تو وہ بہت خوش تھا..... اتنا خوش جتنا وہ صرف اوتار سنگھ کی پیدائش پر ہوا تھا۔ پہلی بار اسے معلوم ہوا تھا کہ خوشی نیند بھی اڑا دیتی ہے۔

اس نے ڈائری بند کر کے رکھی، لائٹ آف کی اور بستر پر دراز ہو گیا۔ لیکن آنکھوں میں نیند کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ اس نے اوتار سنگھ کا تکیہ اٹھایا اور اسے سینے سے لگا لیا۔

وہ تکیہ سینے سے لگتے ہی اسے نیند آ جاتی تھی۔ مگر اس رات ایسا نہیں ہوا۔ یہ الگ بات کہ وہ اوتار سنگھ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کا انتظار ختم ہونے والا تھا۔ اوتار سنگھ کو آج آنا تھا۔ اور جب وہ آئے گا تو وہ اس سے وہ اہم بات کرے گا۔

اس خیال سے اس کا دل غیر معمولی رفتار سے دھڑکنے لگا۔ دماغ میں اندیشے سرسرانے لگے۔ وہ کسی بھی طرح یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس کی بات سن کر اوتار سنگھ کا ردعمل کیا ہو گا۔ کیا وہ بغاوت پر آمادہ ہو جائے گا؟ کیا وہ اسے چھوڑ دے گا؟ کیا وہ اس بڑھاپے میں منتوں مرادوں والے اکلوتے بیٹے سے محروم ہو جائے گا؟ یہ سوالات اسے پریشان کر رہے تھے۔

لیکن ایک خیال بے خد خوش آئند تھا۔ اوتار سنگھ اسے ایک غیر معمولی نعمت کی طرح غیر معمولی حالات میں ملا تھا۔ اور اس کے بعد جو واقعات پیش آئے، وہ بھی غیر معمولی تھے، اور ٹھاکر پیچھے پلٹ کر دیکھتا تو یہ اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ اس کا بیٹا بہت نیک، سعادت مند اور فرماں بردار تھا۔ یہی نہیں، وہ فیض رساں بھی تھا۔ آج ٹھاکر پرتاپ سنگھ جو کچھ بھی تھا، پہلے سے بہت اچھا تھا..... اور وہ بیٹے کے فیض ہی کی وجہ سے تھا۔ تو وہ اس بیٹے کو حقیقت بتائے گا تو امکان تو یہی ہے کہ وہ ناراض نہیں ہو گا۔ بلکہ شاید وہ بھی.....

لیکن اگر ایسا نہیں ہوا تو؟ ایک نکیلے سوال نے اس کے ذہن میں سر اٹھایا۔

بے ساختہ جواب بھی فوراً ہی ابھرا۔ تو کوئی بات نہیں۔ میں اس بیٹے کو خود چھوڑ دوں گا..... اس بیٹے کو جو میرے لئے وجہ زندگی ہے اور جب اس کو چھوڑوں گا تو سانس لینے کے سوا سبھی کچھ چھوڑ دوں گا۔ میں نکل جاؤں گا کسی لمبے سفر پر..... اور کہیں نہیں رکوں گا۔ کبھی نہیں رکوں گا۔

پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس نے خود سے کہا۔ اللہ مالک ہے۔ جو وہ چاہے گا، وہی ہو گا۔ پھر پروا کیا کرنی۔

اور اس خیال سے اس کا دل مطمئن بھی ہو گیا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بج رہے تھے۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ اب سونے کا وقت تو نہیں رہا۔ اب تو اسے اٹھنا تھا اور ایک بہت اہم کام کرنا تھا۔ اس کام کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کا دل خوشی سے بھر گیا۔

وہ اٹھا اور کمرے سے نکل آیا!

.....x.....

الارم کی آواز پہلے تو اسے خواب کا ہی حصہ لگی..... لیکن ان مل اور بے جوڑ حصہ! اس نے بے چینی سے کروٹ بدلی اور اسی وقت اس کی آنکھ کھل گئی۔

چند لمحے تو اس کی سمجھ میں کچھ آیا ہی نہیں۔ خواب کا تاثر ایسا گہرا تھا کہ اسے نکلنے ہی نہیں دے رہا تھا۔ الارم کی آواز نہ ہوتی تو شاید وہ اس سے نکل ہی نہ پاتا۔ اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ ہوٹل کے کمرے میں تھا۔ الارم کی آواز سرہانے کی طرف سے آ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر گھڑی کا الارم بند کر دیا۔

وہ اٹھ کر بیٹھا۔ مگر اس کے دماغ پر وہ خواب طاری تھا۔ وہ اس کے بارے میں سوچنے لگا۔

خواب میں اس نے ایک بے حد روشن چہرے اور دمکتی پیشانی والے بزرگ کو دیکھا تھا۔ وہ ایک صحرا میں کھڑا تھا۔ تا حد نظر ریت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا..... نہ کوئی راستا، نہ کسی راستے کا نشان۔ اور پیاس ایسی تھی کہ زبان میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ وہ پریشان ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ کچھ فاصلے پر وہ بزرگ اسے نظر آئے۔

اس نے ان کی طرف بڑھنے کا ارادہ کیا۔ لیکن اس میں ایک قدم بڑھانے کی طاقت بھی نہیں تھی۔ نجانے کب سے وہ اس صحرا میں بھٹک رہا ہو گا۔ اور صحرا نے اس کی ساری طاقت نچوڑ لی تھی۔

وہ بے بسی محسوس کر رہا تھا کہ وہ بزرگ اس کی طرف بڑھنے لگے۔ چند لمحوں میں وہ اس کے قریب آ گئے۔ تب وہ گھٹنوں کے بل بیٹھے اور اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

''آپ کیسے ہیں بیٹے؟''۔ ان کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔

اوتار سنگھ کو ایسا لگا کہ یہ سب کچھ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ ''میں ٹھیک ہوں بابا''۔ اس نے کہا اور پھر اسے یاد آ گیا۔ وہ بچپن میں ان سے ملا تھا۔ ''میں آپ سے پہلے بھی مل چکا ہوں نا بابا؟''۔

''ہاں۔ تمہاری یادداشت بہت اچھی ہے''۔

اوتار سنگھ بھی ریت پر بیٹھ گیا۔ بزرگ نے اب بھی اس کے دونوں ہاتھ تھامے ہوئے تھے۔ ''تمہیں بہت پیاس لگ رہی ہے نا؟''۔ انہوں نے پوچھا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

اوتار سنگھ نے انہیں اپنی زبان دکھائی۔ وہ موٹی بھی ہو رہی تھی اور اس پر کانٹے بھی ابھرے ہوئے تھے۔

''بہت مبارک ہے یہ پیاس''۔ بزرگ نے کہا۔

''مگر بہت ستا رہی ہے''۔

''بجھ جائے گی۔ اور جتنی دیر میں بجھے گی، اتنا ہی نفع ہوگا تمہیں۔ بجھنے کو تو یہ ابھی بجھ جائے۔ اس ریت کو پانی بننے میں دیر نہیں لگے گی۔ لیکن ابھی مالک کی مرضی نہیں ہے۔ اس نے تو ہر کام کا مناسب ترین وقت مقرر کیا ہوا ہے۔ اس پیاس کو برداشت کرنے کا بہت بڑا صلہ ملے گا۔ یہ تمہاری عبادت ہے، ریاضت ہے''

''میں کیا کروں بابا؟''۔ اوتار سنگھ نے بے بسی سے پوچھا۔

''چلتے رہو۔ منزل پر پہنچو گے تو پیاس بھی بجھ جائے گی''۔

''مگر مجھے تو راستا بھی معلوم نہیں۔ مجھے صحیح اور غلط کی تمیز بھی نہیں''۔

''جس پر تم چل رہے ہو، وہی تمہارا راستا ہے۔ اور درست راستا ہے''۔

''کتنی دیر لگے گی بابا؟''۔

''یہ تو وہی جانتا ہے۔ اس کی مرضی ہو تو برسوں کی مسافت پل بھر میں طے ہو جائے۔ تم پلک جھپکو تو منزل کے سامنے کھڑے ہو۔ یہ بھی اس کی نعمت ہے۔ اور مسافت کا طویل ہو جانا بھی اس کی نعمت ہے۔ کیوں کہ اس میں سختی اور ریاضت ہے۔ اب یہ اس کی مرضی کہ کسی کو وہ پہلی نعمت دیتا ہے اور کسی کو دوسری۔ دونوں صورتوں میں بندے کو بس شکر ادا کرنا چاہئے۔ یاد رکھو، پریشانی بھی نعمت ہے اور آسانی بھی۔ اور ہر نعمت اس کی آزمائش بھی ہے۔ ایک نعمت سے بندہ گھبرا کر شکایت پر آجاتا ہے اور ناشکری کرتا ہے۔ دوسری نعمت ہی تکبر کرتا ہے اور ناشکری اور اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ عافیت صرف شکر ادا کرتے رہنے میں ہے''۔

''مگر مجھے تو کچھ بھی نہیں آتا بابا۔ مجھے تو کچھ علم ہی نہیں''۔

''علم تو تمہیں ہر قدم پر ملتا رہا ہے۔ اور ملتا رہے گا''۔

''مگر میں کچھ بھی نہیں جانتا''۔

''وقت آنے پر سب کچھ جان جاؤ گے۔ بس چلتے رہو۔ اسی طرح قدم بڑھاتے رہو''۔

''ٹھیک ہے بابا۔ میں بس اللہ کو خوش کرنا چاہتا ہوں''۔

''وہی تو میں خوش خبری لایا ہوں تمہارے لئے۔ تم نے جو کچھ اللہ کے لئے کیا، اللہ اس سے خوش ہوا۔ اس نے قبول فرمایا''۔

اوتار سنگھ خوش ہو گیا۔ وہ اپنی پیاس اور زبان کے کانٹے بھول کر مسکرا دیا۔

''لیکن میں تمہیں خبردار کرنے بھی آیا ہوں ایک لمحے میں آدمی اپنے کئے کرائے پر پانی بھی پھیر دیتا ہے''۔ بزرگ نے کہا۔

اوتار سنگھ گھبرا گیا۔ ''میں سمجھا نہیں بابا''۔

''بندے کو اپنے کسی عمل پر پھولنا نہیں چاہئے۔ اس لئے کہ وہ اس کے رب کی طرف سے ہوتا ہے۔ توفیق بھی وہی دیتا ہے، قوت عمل بھی اسی کی دی ہوئی ہے، راستا بھی وہی بناتا ہے اور بندے کے اندر عمل کی تلقین بھی وہی ڈالتا ہے۔ بندے کا تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اچھا عمل کر کے خود پر فخر کر لیا تو سب کچھ تباہ کر لیا۔ دوسری بات یہ کہ اللہ کیلئے کچھ کرو تو اس کی قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ جتنی بھاری قیمت ادا کرو گے، عمل اتنا ہی مقبول ہوگا۔ مگر قیمت ادا کرنے کے بعد کے آداب بھی ہیں۔ قیمت ادا کر کے پچھتائے، غم کیا، افسوس کیا تو سب کچھ ختم۔ جتنی بڑی قیمت ادا کرو، اتنی ہی خندہ پیشانی سے رہو۔ اللہ کے عام بندوں میں اور خاص بندوں میں یہی فرق ہوتا ہے''۔

''میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا بابا''۔

''ابھی کیسے سمجھ سکتے ہو۔ وقت آئے تو میری یہ بات یاد رکھنا۔ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ تم نے جو کچھ کیا، وہ اللہ نے قبول فرمایا۔ اس کا بہت بڑا صلہ ملے گا۔ لیکن اس کی بہت بھاری قیمت بھی ادا کرنی ہوگی۔ وہی تمہاری آزمائش ہوگی۔ اور اس میں اللہ ہی تمہاری مدد کرے گا''۔

یہ کہہ کر بزرگ نے اس کے دونوں ہاتھوں کو چھوا اور آنکھوں سے لگایا۔ وہی وہ وقت تھا، جب الارم کی آواز اس کی سماعت میں پڑی.....

اوتار سنگھ خوش ہو گیا۔ اے اللہ، آپ کا شکر ہے۔ میں نے آپ کو خوش کرنے کے لئے کچھ کرنا چاہا۔ آپ نے مجھے راستا دکھایا اور کچھ کرنے کا موقع دیا۔ میں آپ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ بے شک سب کچھ آپ کی طرف سے ہے۔

وہ چونکا۔ اسے یاد آیا کہ اسے تو آگرہ جانا ہے۔ وہ تازہ دم اور خوش وخرم تھا۔ وہ اٹھا اور اس نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ صبح چھ بجے وہ آگرہ جانے والی گاڑی میں بیٹھا تھا!

.....x.....

سورج سنگھ کیلئے وہ سونے کی رات نہیں تھی۔ یہ بات نہیں کہ اس نے سونے کی کوشش نہ کی ہو۔ کیونکہ جاگنے کا کچھ حاصل نہیں تھا۔ لیکن نیند آ ہی نہیں رہی تھی۔ چار بجے کے قریب اس نے سونے کا ارادہ ختم کر دیا۔ اس نے سوچا تھا کہ صبح سات بجے وہ رگھبیر کے پاس جائے گا۔

لیکن پانچ بجے تو وہ سو گیا۔ آنکھ کھلی تو دس بجے تھے۔ دن چڑھ گیا تھا۔

اس نے منہ ہاتھ دھویا، دانت صاف کئے اور ناشتہ کیے بغیر ہی گھر سے نکل آیا۔

وہ رگھبیر کے گھر پہنچا تو رگھبیر نے اسے تمسخرانہ نگاہوں سے دیکھا۔ ''میں تو سمجھ رہا تھا کہ تو سویرے ہی آ دھمکے گا۔ مگر تو نے اتنی دیر کر دی۔ لگتا ہے، نشہ اتر گیا تیرا''

''مجھے نشہ تھا ہی نہیں۔ بس صبح ہوتے ہوتے نیند آ گئی تھی''

''تجھے یاد ہے، رات کو میرے پاس آیا تھا''؟

''کہہ تو رہا ہوں کہ میں نشے میں نہیں تھا۔ مجھے سب یاد ہے''۔ سورج نے جھنجھلا کر کہا

''یہ بھی یاد ہے کہ تو نے مجھ سے کیا بات کی تھی''۔

''ہاں ہاں، یاد ہے۔ وہ لڑکا اوتار سنگھ یہاں آیا ہوا ہے''۔

''چل پھر راجو اور گوپال کے ساتھ چلتے ہیں''۔

وہ دونوں راجو کے گھر جانے کے ارادے سے نکل آئے۔ لیکن آدھے راستے میں ہی راجو انہیں مل گیا۔ اور وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ گوپال، کرتارا اور جسونت بھی تھے۔

''کہاں چل دیے تم دونوں''؟ کرتارے نے ان سے پوچھا۔

''تم لوگوں سے ہی ملنے کیلئے نکلے تھے۔ رگھبیر نے کہا۔

کرتارے نے بہت غور سے انہیں دیکھا۔ ''کیا بات ہے؟ خیر تو ہے''؟

اردو فینز ڈاٹ کام

''ایک بڑی بات ہے''۔رگھبیر جھجکنے لگا۔

''کچھ بول تو سہی''۔

مگر رگھبیر ہچکچا رہا تھا۔کرتارے کے اصرار پر اس نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔''یہ سورج کہتا ہے کہ اس نے رات اس لڑکے اوتار سنگھ کو دیکھا ہے''۔

''تو پھر؟''

''یہ رات نشے میں تھا۔ہم سب ساتھ ہی بیٹھے پی رہے تھے۔اسے چڑھنے لگی تو یہ، یہ کہہ کر اٹھ گیا کہ اوتار سنگھ کو تلاش کرے گا۔شراب چڑھتی ہے تو یہ ہمیشہ یہی کرتا ہے۔ پھر آدھی رات کو یہ میرے گھر آیا اور کہنے لگا کہ اس نے اسے بڑے مندر میں جاتے دیکھا ہے''۔

کرتارا ہنسنے لگا۔مگر جسونت بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔''تو اب تو اتر گیا ہوگا نشہ''؟ کرتارے نے پوچھا۔

''نہیں یارا۔یہ کہتا ہے، وہ سچ مچ وہی تھا''۔

''تو پھر''؟اس بار کرتارے کا لہجہ کڑا تھا۔

رگھبیر کے بولنے سے پہلے ہی سورج بول اٹھا۔''پھر یہ کہ ہمارے لئے یہ بدلہ لینے کا بہت اچھا موقع ہے''۔

''میں نے کہا تھا نا کہ اسے بھول جاؤ''۔کرتارا بولا۔

''راج پوت کیلئے بے عزتی بھولنے کی چیز نہیں ہوتی یارا''۔

''سورج ٹھیک کہہ رہا ہے کرتارے''راجو اور گوپال نے بہ یک آواز تائید کی''

''کرتارے..... میں نے کہا تھا کہ اب اسے کوئی ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ان سے کہو کہ اسے بھول جائیں''۔جسونت نے پہلی بار زبان کھولی۔وہ بے حد سخت لہجے میں کرتارے مخاطب ہوا تھا۔

''ہمارے درمیان یہ فیصلہ ہو چکا تھا''۔کرتارے نے دوستوں سے کہا۔

رگھبیر نے کرتارے کا ہاتھ پکڑا اور بڑی لجاجت سے بولا۔''یارا..... میری ایک بات سن لے الگ چل کر''۔

کرتارا چند لمحے اسے گھورتا رہا۔پھر جسونت کی طرف متوجہ ہوا۔''چلو یارا، بات سننے میں کیا جاتا ہے اپنا''۔

کرتارا ان دونوں کو الگ لے گیا۔''دیکھو مجھے یقین نہیں ہے کہ سورج کی بات پکی ہے۔میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ وہ نشے میں تھا۔اور نشے میں وہ اپنے باپ کو بھی اوتار سنگھ سمجھ سکتا ہے''۔

''تو ہم کیا کریں؟''جسونت نے بگڑ کر کہا۔

''عقل سے کام لو۔اگر وہ اوتار سنگھ تھا اور مندر میں ٹھہرا ہوا تھا تو اب تک جا چکا ہوگا۔اور اوتار سنگھ نہیں تھا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں''۔رگھبیر نے انہیں سمجھایا۔''سورج کی تسلی کیلئے مندر تک جانے میں ہمارا کیا بگڑ جائے گا''۔

''اور اگر وہ اوتار سنگھ ہی ہے اور اس وقت بھی مندر میں موجود ہے تو''جسونت نے سوال اٹھایا۔

''اس کا کوئی امکان نہیں۔لیکن ایسا ہوا تو دیکھ لیں گے''۔

''جب امکان ہی نہیں ہے تو ضرورت کیا ہے''۔

''دوست کی تسلی تو ہو جائے گی۔یاری میں فرق نہیں آنا چاہئے''۔

''ٹھیک ہے یارا''کرتارے ان جسونت سے کہا۔''رگھبیر کی بات مان لینی چاہئے''۔

”تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں“۔ جسونت نے بے دلی سے کہا۔

.....x.....

صبح سویرے پوجا کیلئے آنے والے آئے اور انہیں مندر کا دروازہ بند ملا تو وہ بہت حیران ہوئے۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ مندر کا دروازہ تو صبح ہی کھل جاتا تھا۔ بہر حال انہوں نے سوچا کہ کسی وجہ سے دیر ہوگئی ہے۔ ابھی دروازہ کھل جائے گا۔ وہ بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔

ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ مشکل سے آٹھ دس افراد ہوں گے۔ ان میں بھی ایک کے سوا سب عورتیں تھیں۔ دروازے پر دستک دینے کی ان میں ہمت نہیں تھی کہ کہیں پجاری ناراض نہ ہو جائے۔

ایک گھنٹا انتظار کرنے کے بعد وہ لوگ واپس چلے گئے۔

کچھ دیر بعد پوجا کیلئے آنے والے آٹھ دس افراد پھر جمع ہو گئے۔ اب دن چڑھ آیا تھا۔ وہ لوگ بھی تبصرے کرتے رہے۔ لیکن دروازہ کھلوانے کی کوشش انہوں نے بھی نہیں کی۔ اسی طرح لوگ آتے اور جاتے رہے۔ مجمع لگنے کی نوبت بہر حال نہیں آئی۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

لیکن ساڑھے دس بجے جو لوگ مندر کے بند دروازے کے سامنے کھڑے تھے، وہ واضح طور پر تشویش میں مبتلا تھے۔ انہیں یہ بند دروازہ بہت غیر معمولی بات لگ رہا تھا اور وہ اسے نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ اس بار ان میں مردوں کی تعداد تین تھی۔

وہ چھ دوست مندر کے پاس پہنچے تو انہوں نے لوگوں کو مندر کا دروازہ پیٹتے پایا۔ ''یہ کیا معاملہ ہے''؟ جسونت بڑبڑایا۔

''کوئی گڑبڑ معلوم ہوتی ہے''۔ سورج نے سنسنی آمیز لہجے میں کہا

''چل کر پوچھیں گے تو پتا چلے گا''۔

دروازہ پیٹا جاتا رہا۔ لیکن اندر نقل و حرکت تھی نہ کوئی آواز۔ وہاں تو موت کا سا سکوت طاری تھا۔

''گلی میں دروازہ ہے۔ اسے دیکھیں''۔ گوپال نے کہا۔

''ہاں.....ضرورت پڑی تو اسے توڑا بھی جا سکتا ہے''۔ راجو بولا

وہ گلی کی طرف چل دیے۔ ان کے ساتھ وہ تینوں مرد بھی تھے، جو مندر کا دروازہ پیٹ رہے تھے۔ عورتیں وہیں رہ گئیں۔

انہوں نے چھوٹے دروازے پر دستک دی۔ مگر وہ ہاتھ کا دباؤ پڑتے ہی کھل گیا۔

''ضرور کوئی گڑبڑ ہے''۔ اس بار کرتارا بڑبڑایا۔

وہ سب چند لمحے ہچکچاتے رہے مگر بالآخر اندر داخل ہو گئے۔

ایک ایک کر کے وہ رز کمروں میں جھانکتے پھرے۔ مگر وہ خالی تھے۔ آخر بڑے پجاری کے کمرے میں انہیں وہ سب لوگ نظر آئے

وہ بڑا عجیب منظر تھا۔ دیوداسیاں اور چیلے بے ترتیب بکھرے پڑے تھے۔ بڑا پجاری بھی بے ہوش تھا۔ اگر سانسوں کی وجہ سے اس کا موٹی توند اوپر نیچے نہ ہو رہی ہوتی تو وہ یہی سمجھتے کہ وہ مر گیا ہے۔

انہوں نے ادھر دیکھا۔ وہاں لڈوؤں کا ایک ٹوکرا رکھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی سورج سنگھ نے ہیجانی لہجے میں کہا۔ ''یہ اسی کی حرکت ہے''۔

جسونت نے اسے گھور کر دیکھا۔ ''دوسرے لوگوں کی موجودگی میں تم اس کی بات نہیں کرو گے''۔ اس نے سرگوشی میں کہا۔

لیکن سورج نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔ ''میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ وہ مٹھائی کا ٹوکرا لے کر مندر میں داخل ہوا تھا۔ یہ وہی ٹوکرا ہے''۔ وہ رگھبیر سے مخاطب تھا۔

دوسرے تین مرد اس کی بات بڑی دلچسپی سے سن رہے تھے۔ ''پر نتو ہوا کیا ہے؟'' ان میں سے ایک نے پوچھا۔

''اسے سمجھاؤ۔ ہم بعد میں اکیلے میں بات کریں گے''۔ کرتارے نے رگھبیر سے کہا۔

مگر اتنی دیر میں سورج پوچھنے والے کو جواب دے رہا تھا۔ ''جو ہوا ہے، نظر آ رہا ہے۔ وہ بھنگ کے لڈو لایا تھا۔ یہ سب لوگ اسی کے اثر میں ہیں''۔

''تم نے اسے دیکھا تھا''؟ دوسرے آدمی نے پوچھا۔

''ہاں، کہہ تو رہا ہوں۔ دیکھا تھا''۔

''تم اسے جانتے ہو''؟ یہ تیسرا تھا۔

رگھبیر نے سورج کا ہاتھ تھاما اور اسے تقریباً کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔ ''سورج، جو بات ہمیں دوستوں کو اکیلے میں کرنی ہے، وہ سب کے سامنے نہ کر''۔ اس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''ابھی تو ہمیں یہ بھی نہیں معلوم کہ کیا ہوا ہے''۔

''میں کیوں چپ رہوں''؟

''میں کہہ رہا ہوں نا''۔ رگھبیر کے لہجے میں سختی تھی۔

''ٹھیک ہے''۔

وہ دونوں اندر آئے۔ وہاں باہر کے تین آدمیوں سے ایک جسونت سے کہہ رہا تھا۔ ''تمہارے متر کی بات ٹھیک لگتی ہے۔ پرنتو اس نے ایسا کیوں کیا''؟

''ہمیں کچھ نہیں معلوم''۔ جسونت نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اب انہیں ہوش میں لایا جائے، تبھی کچھ پتا چلے گا''۔

ان میں سے دو آدمی باہر نکل گئے۔ ایک وہیں رہ گیا۔ وہ بے ہوش لوگوں کو ہوش میں لانے کی کوشش میں ان لوگوں کا ہاتھ بٹا رہا تھا۔ راجو باہر سے پانی کی بالٹی لے کر آیا تھا اور وہ سب ان لوگوں پر پانی ڈالتے ہوئے انہیں ہلا رہے تھے۔

مگر بے ہوش لوگوں کی آنکھیں کسی طرح کھل ہی نہیں رہی تھیں۔ ادھر گلی کے دروازے سے اور لوگ بھی اندر آ گئے تھے اور مزید لوگ مسلسل آتے جا رہے تھے۔ سب اپنی اپنی کہے جا رہے تھے۔ مندر کا اندرونی حصہ آوازوں سے بھر گیا تھا۔

بالآخر سب سے پہلے پجاری ہی کو ہوش آیا۔ ہوش میں آتے ہی اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر چیخا۔ ''ارے..... میرے پانچ سو روپے!''

''ہوش میں آؤ پنڈت جی''۔ راجو نے اسے ہلا ڈالا۔ ''بتاؤ، یہ سب کیا ہے''۔

پجاری شروع ہو گیا۔ ''وہ ایک بالک تھا.....''

''میں نے کہا نا، وہ وہی تھا''۔ سورج نے سنسنی آمیز لہجے میں کہا

''چپ رہو۔ بات سننے اور سمجھنے دو''۔ کرتارے نے اسے ڈپٹا۔

پنڈت کا دماغ اب بھی چکرا رہا تھا۔ لیکن سنبھل سنبھل کر اس نے بتانا شروع کیا۔ دوسروں کو ہوش میں لانے کی کوشش کرنے والے بھی اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ ادھر ہجوم کافی بڑھ گیا تھا۔ جسونت کافی پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ بار بار کرتارے سے سرگوشی میں بات کرتا۔ کرتارا بھی متفکر تھا۔

پجاری نے اپنی پوری کتھا سنا ڈالی۔ ''لڈو کھانے کے بعد میں دیکھتے ہی دیکھتے بے ہوش ہو گیا۔ اس کے بعد مجھے کچھ یاد نہیں''۔

''پرنتو اس کا کچھ مطلب تو ہے''۔ کسی نے کہا۔ ''میرا خیال ہے، یہ چوری کا معاملہ ہے۔ یہاں قیمتی چیزیں بھی تو ہوں گی''۔

''یہ بات نہیں۔ اسے پیسے کی ضرورت نہیں''۔ سورج نے جلدی سے کہا۔ ''وہ بڑے پیسے والے لوگ ہیں''۔

''تم اسے جانتے ہو؟''۔

''ہاں..... اچھی طرح۔ وہ ٹھاکروں کی گڑھی کے پرتاپ سنگھ کا بیٹا اوتار سنگھ تھا''۔

لیکن پنڈت کو چوری کی بات لگ گئی تھی۔ وہ جلدی سے کمرے میں رکھی تجوری کی طرف لپکا۔ اس نے چابی لگائی اور تجوری کھول کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اس نے سر ہلایا اور آسودہ آواز میں بولا۔ ''بھگوان کی کرپا سے سب ٹھیک ہے''۔

''سب ٹھیک تو ہو نہیں سکتا''۔ کسی نے کہا۔ ''اس نے سب کو مذاق میں بے ہوش تو نہیں کیا ہوگا''۔

''تم اس کا حلیہ بتاؤ''۔ سورج نے پجاری سے فرمائش کی۔

اردو فینز ڈاٹ کام

پجاری اوتار سنگھ کا حلیہ بتا رہا تھا اور سورج اپنے ساتھیوں کو فاتحانہ نظروں سے دیکھے جا رہا تھا، جسونت کے علاوہ وہ سبھی اثبات میں سر ہلا رہے تھے۔

''مان گئے نا کہ وہ اوتار سنگھ ہی تھا''۔ سورج نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

''یہ تو دیکھ لو کہ وہ کیا کر کے گیا ہے''۔ راجو بولا۔

اس پر پجاری کو کچھ خیال آیا۔ دراصل ابھی وہ دوا کے اثر سے پوری طرح آزاد نہیں ہوا تھا۔ اس کا دماغ دھندلایا ہوا سا تھا۔ بہرحال وہ کمرے سے نکلا اور مندر کے بیرونی حصے کی طرف کھلنے والے دروازے کی جانب بڑھا۔ سب لوگ اس کے پیچھے تھے۔

پجاری دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے حلق سے ایک کریہہ چیخ نکلی اور وہ پاگلوں کی طرح اپنے سر کے بال نوچنے لگا۔

دوسرے لوگ بھی اندر گھسے۔ اور ان سب کا بھی برا حال ہو گیا۔ اب لوگ اندر گھستے جا رہے تھے اور واویلا بڑھتا جا رہا تھا۔

مندر کا منظر بہت عجیب تھا۔ لگتا تھا کہ لوہے کے کسی ہاتھی نے اسے روند ڈالا ہے۔ بات صرف اتنی سی نہیں تھی کہ وہاں کوئی بت سلامت نہیں تھا۔ معاملہ یہ تھا کہ وہاں یہ بتانا بھی مشکل تھا کہ کہاں کون سا بت رہا ہوگا۔ وہاں تو صرف ملبہ تھا۔

ان سب کیلئے وہ گویا قیامت تھی۔ ردعمل سب کا الگ الگ تھا۔ کوئی فرش سے سر ٹکرا رہا تھا تو کوئی دیوار سے۔ کوئی ماتھا ٹیکے بیٹھا تھا تو کوئی دہاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ پجاری پاگلوں کی طرح ادھر سے ادھر بھاگتا پھر رہا تھا، جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہو کہ وہ کیا کرے۔

جسونت نے کرتارے کو اشارہ کیا اور کرتارے نے دوسرے ساتھیوں کو۔ وہ سب خاموشی سے باہر نکل آئے۔ مندر میں آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ بتوں کو توڑے جانے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی تھی۔

.....x.....

دوستوں کی میٹنگ زیادہ دیر نہیں چلی۔ جسونت کے لئے اب بھی اس بات کی اہمیت تھی کہ کیدارناتھ نے اسے منع کیا تھا..... بتایا تھا کہ اگر اوتار سنگھ کو کچھ ہو گیا تو اس کا معاملہ بننے کے بجائے بالکل ہی بگڑ جائے گا۔ وہ اب بھی یہی چاہتا تھا کہ اوتار سنگھ کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے۔

پہلے تو کرتارے نے معاملہ سنبھال لیا تھا۔ ورنہ جو لوگ وہاں سے زخمی ہو کر آئے تھے، وہ تو بدلہ لینے پر مصر تھے۔ مگر کرتارے نے انہیں سمجھایا کہ یاری دوستی ہی کی خاطر وہ اس کام کے لئے تیار ہوئے تھے اور اب یاری دوستی ہی کی خاطر اس سے بچنا ہے۔

لیکن اب خود کرتارے نے جسونت کو سمجھایا۔ ''دیکھ یارا، دھرم دوستی سے بڑا ہوتا ہے۔ اب میں کسی کو سمجھا نہیں سکتا''۔

''پھر بھی.....''۔

''بات صرف ہم لوگوں کی نہیں، پورے شہر کی، اپنے دھرم کی عزت کی ہے''۔ گوپال نے جسونت کی بات کاٹ دی۔ ''اب اگر ہم چاہیں بھی تو اس معاملے سے الگ نہیں رہ سکتے''۔

''گوپال ٹھیک کہہ رہا ہے''۔

''یقین نہ آئے تو باہر چل کر دیکھ لو''۔ گوپال نے چیلنج کیا۔

وہ سب باہر آ گئے۔ باہر فضا ہی بدلی ہوئی تھی۔ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں لوگ جمع تھے اور اس موضوع پر باتیں کر رہے تھے۔ وہ لوگ ان کے پاس سے گزرتے رہے اور ان کے کانوں میں باتیں پڑتی رہیں۔

''پردہ تھا کون؟''۔

''وہ کوئی بھی تھا، ہمارے شہر کا ایک آدمی اسے جانتا ہے''۔

''اور وہ آدمی کون ہے؟''۔

''یہ تو مجھے نہیں معلوم۔کوئی بتا رہا تھا کہ ایسا ایک آدمی ہے''۔

انہیں نہیں معلوم تھا کہ اس وقت وہ آدمی ان کے پاس سے گزر کر جا رہا ہے۔

''سورج کو بے سوچے سمجھے زبان نہیں کھولنی چاہئے تھی''۔جسونت نے تاسف سے کہا۔

''واہ.....کوئی ہمارے دیوی دیوتاؤں کا اپمان کرے اور میں اسے جانتے ہوئے ہونٹ سی لوں''۔سورج نے چیخ کر کہا۔

''سورج کا کوئی دوش نہیں''۔کرتارا بولا۔

وہ کچھ دور ہی گئے ہوں گے کہ ایک شخص نے سورج کو پہنچا لیا۔وہ لپک کر ان کے پاس آیا۔''تم نے ہی کہا تھا نا کہ تم اس مورکھ کو جانتے ہو''۔

ان کے گرد لوگ جمع ہونے لگے۔''ہاں.....میں جانتا ہوں کہ وہ کون تھا''۔سورج نے کہا۔

''وہ کوئی مسلا ہے؟''۔کسی نے پوچھا۔

''نہیں.....راج پوت ہے۔اوتار سنگھ نام ہے اس کا۔پتا کا نام ٹھاکر پرتاپ سنگھ ہے''۔

''چھی چھی چھی.....راج پوت ہو کر ایسی حرکت!''۔

''کل یگ اسی کو کہتے ہیں بھائی''۔کوئی بولا۔

''اچھا.....وہ رہتا کہاں ہے؟''۔

''ایک گاؤں ہے.....ٹھاکروں کی گڑھی''۔سورج نے بتایا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

لوگ پوچھے جا رہے تھے اور سورج جواب دے رہا تھا۔ اسی دوران جسونت اور کرتارا وہاں سے چلے گئے۔ اصل میں جسونت نے اسے اشارے سے وہاں سے ہٹنے کو کہا تھا۔

''کتنے گھر ہوں گے اس گاؤں میں؟''۔ کسی نے سورج سے پوچھا۔

''سو سے اوپر ہی ہوں گے۔ بڑا گاؤں ہے''۔ سورج نے کہا۔

''تم ہمیں راستا دکھاؤ گے؟''۔ ایک جوشیلا جوان آگے بڑھا۔ ''ہم اس گاؤں کا نام ونشان مٹا ڈالیں گے''۔

اسے دیکھ کر چند اور جوان آگے بڑھ آئے۔ ''ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں''۔

''کیوں نہیں۔ کوئی جائے نہ جائے، میں اور میرے متر وہاں جائیں گے اور اس لڑکے کو ختم کر کے ہی آئیں گے''۔ سورج نے اپنے دوستوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ مگر اسے جسونت اور کرتار سنگھ وہاں نظر نہیں آ رہے تھے۔

''اوش جائیں گے''۔ راجو نے کہا۔ ''پرنتو پورا گاؤں پھونکنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں صرف دوشی کو سزا دینی ہے''۔

اب چاروں دوستوں کو خیال آ رہا تھا کہ انہیں جسونت اور کرتارے کی بات بھی رکھنی ہے۔ معاملہ کافی پیچیدہ ہو گیا تھا۔ ''بالکل ٹھیک۔ گاؤں کے نردوش لوگوں کو کیوں سزا دی جائے''۔ رگھبیر نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ ہم ان سے کہیں گے کہ دوشی کو ہمارے حوالے کر دیں''۔ جوشیلے جوانوں میں سے ایک نے کہا۔

''اور ایسا نہ ہوا تو ہم پورا گاؤں پھونک ڈالیں گے''۔ دوسرا بولا۔

''تو کب چلو گے؟''۔ تیسرے نے سورج سے پوچھا۔

سورج نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیئے۔ ''ہم تو تیار ہیں''۔ اس نے جواب دیا۔ ابھی نکل کھڑے ہوں گے''۔

''ہمیں ایک گھنٹا دو۔ ہم تیار ہو کر آتے ہیں۔ چوک پر ملیں گے''۔

''خیال رکھنا۔ ٹھاکروں سے مقابلہ ہے''۔ کسی نے چیلنج کیا۔

''دیکھ لیں گے''۔ کئی غراہٹیں ابھریں۔

مجمع چھٹنے لگا۔ چاروں دوست گوپال کے گھر کی طرف چل دیئے۔ ''یہ کرتارا کہاں گیا؟''۔

''جسونت کے ساتھ ہوگا۔ وہ اس معاملے میں ہمارا ساتھ نہیں دیں گے''۔

''کوئی بات نہیں۔ ہمیں تو موقع مل گیا ہے۔ آج وہ نہیں بچے گا''۔

.....x.....

جسونت کرتارے کا ہاتھ پکڑ کر تیز قدموں سے چل رہا تھا۔ ''جلدی کیا ہے یارا؟''۔ کرتارے نے احتجاج کیا۔

''جلدی تو ہے''۔جسونت نے کہا۔''ہمیں ان لوگوں سے پہلے ٹھاکروں کی گڑھی پہنچنا ہے''۔

''کن لوگوں سے پہلے؟''۔

''تم نہیں سمجھ رہے، یہ لوگ وہاں حملہ کرنے جائیں گے''۔

''تو پھر؟''۔

''کیدر نے کہا تھا کہ اس لڑکے کو کچھ ہو گیا تو اس کا بڑا نقصان ہو جائے گا۔اور اب اس لڑکے کی زندگی خطرے میں ہے۔ہمیں جا کر کہہ دو کو خبردار کرنا ہے۔تا کہ وہ لوگ اسے پہلے ہی اسے چھپا دیں یا اسے کہیں بھیج دیں''۔جسونت نے کہا۔

''یہ بڑا ٹیڑھا معاملہ ہے جسونت۔اچھا یہی ہے کہ ہم اس معاملے سے الگ رہیں''۔کرتارے نے اسے سمجھایا۔

''تو بے شک نہ چل۔میں تو جاؤں گا۔تو جانتا ہے کہ میرے لئے یاری دھرم سے بڑھ کر ہے''۔

''تو مجھے کیوں گالی دیتا ہے۔چل میں ہر حال میں تیرے ساتھ ہوں''۔کرتارے نے بڑے پیار سے کہا۔''بول کیا ارادہ ہے''۔

''بس سیدھے ٹھاکروں کی گڑھی چلیں گے''۔

''گھر پر تو کہہ دوں''۔

''اس وقت ہم ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کر سکتے۔ہمیں اسی وقت نکلنا ہے۔دیر ہو گئی تو ہم کچھ بھی نہیں کر سکیں گے''۔

''ٹھیک ہے یارا''۔کرتارے نے سپر ڈال دی۔

.....x.....

ایک گھنٹے بعد وہ چاروں چوک میں پہنچے تو وہاں تین جوان آدمی پہلے سے موجود تھے۔انہیں کچھ مایوسی ہوئی۔''صرف تین!''گوپال بولا۔

''انتظار کرو۔ابھی اور آ جائیں گے''۔راجو نے کہا۔

گوپال ان تینوں کی طرف متوجہ ہوا۔ان میں سے ایک کے پاس تلوار نظر آ رہی تھی۔''تم لوگ کیا لائے ہو؟''۔اس نے باقی دونوں سے پوچھا۔

''میرے پاس خنجر ہے''۔

''میرے پاس طمنچہ ہے''۔تیسرا بولا۔

''حملہ کرنے کے لئے کتنے آدمی ہونے چاہئیں تمہارے خیال میں؟''۔پہلے نے سورج سے پوچھا۔

سورج چند لمحے سوچتا رہا۔اب اسے خیال آ رہا تھا کہ پچھلی بار وہ آٹھ کڑیل جوان گھات لگا کر اس لڑکے کو شکار کرنے گئے تھے۔اور وقت آیا تو چار زخمیوں کو لے کر واپس آئے تھے۔بلکہ کرتارے کا کہنا تھا کہ اگر وہ جذباتی ہو جاتا تو وہ آٹھوں وہیں شکار ہو جاتے اور پکڑے جاتے۔تو چھپ کر وار کرنے میں یہ حال تھا۔مگر اب تو وہ کھل کر حملہ کرنے جا رہے تھے۔اس کے دل میں وسوسے آنے لگے۔جانے والوں میں کون تھڑولا ہے، کب بھاگ کھڑا ہو گا، یہ کسی کو معلوم نہیں تھا۔

مگر اب وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا تھا۔بات غیرت کی.....اور اس سے بڑھ کر دھرم کی تھی۔''سو ڈیڑھ سو آدمی ہونے چاہئیں''۔اس نے کہا۔

''پر ہم تو صرف سات ہیں''۔

''آدھا گھنٹا اور دیکھ لیتے ہیں''۔سورج نے کہا۔

''اب تو چاہے اکیلے جانا پڑے، میں ضرور جاؤں گا''۔راجو تاؤ کھاتے ہوئے بولا۔

وقت گزرنے لگا۔پھر لوگ ایک ایک دو دو کر کے آنے لگے۔کسی کے ہاتھ میں لاٹھی تھی تو کسی کے پاس بلم تھا۔سورج کو مایوسی ہونے لگی۔اس نے تو سوچا تھا کہ تعداد میں کمی کا بہانہ بنا کر مہم کو منسوخ کر دے گا۔

آدھے گھنٹے بعد اس نے دیکھا۔ تعداد چالیس پر پہنچ چکی تھی۔ ''یہ تو ناکافی ہیں''۔ اس نے رگھبیر سے کہا۔

''تو پھر؟''۔

''میرا خیال ہے آج رہنے دیں''۔

''چوٹ وقت پر ہی اچھی لگتی ہے''۔ رگھبیر بولا۔ ''ورنہ رات گئی تو بات گئی''۔

''لیکن کم تعداد میں ڈر ہے.....''۔

''میں جانتا ہوں۔ ابھی اور انتظار کرتے ہیں''۔

ایک گھنٹے میں تعداد سو سے بڑھ گئی۔ اب ہتھیاروں کا جائزہ لیا گیا۔ حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ طمنچوں اور بندوقوں کی تعداد زیادہ تھی۔ سورج کو متفقہ طور پر سردار چن لیا گیا۔

اب سوال یہ تھا کہ سفر کیسے کیا جائے۔ کسی نے کہا کہ اس کے پاس دو ٹرک ہیں۔ یوں یہ بات بھی بن گئی۔

بالآخر انہوں نے سفر شروع کر دیا۔

.....x.....

جسونت اور کرتارا کیدارناتھ کے گھر پہنچے۔ پتا چلا کہ وہ کسی کام سے قریبی گاؤں گیا ہوا ہے۔ ''وہ آتے ہی ہوں گے ویر جی''۔ کیدارناتھ کی بیوی نے کہا۔

دونوں سوچ میں پڑ گئے۔ ان کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ اب بہتر یہی تھا کہ وہ براہ راست ٹھاکر پرتاپ سنگھ کو خبردار کریں۔

''آپ اندر آجائیں نا''۔ کیدارناتھ کی بیوی نے کہا۔

''نہیں۔ ہم حویلی جا رہے ہیں۔ کیدو آجائے تو اسے ادھر ہی بھیج دینا''۔

وہ دونوں حویلی کی طرف چل دیئے۔ ٹھاکر پرتاپ سنگھ وہاں موجود تھا۔ اسے پتا چلا کہ جے پور سے مہمان آئے ہیں تو اس نے انہیں بلوا لیا۔

وہ آئے تو وہ انہیں غور سے دیکھتا رہا۔ ''میں نے آپ لوگوں کو پہچانا نہیں''۔

''ہم کیدارناتھ جی کے دوست ہیں''۔ جسونت نے کہا۔

تمہید کا موقع نہیں تھا۔ کرتارے نے کہا۔ ''ہم خبردار کرنے آئے ہیں۔ چھوٹے ٹھاکر کی جان خطرے میں ہے''۔

ٹھاکر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ چہرے پر سختی چھا گئی۔ ''کیسے؟ اور کیوں؟''۔

جسونت نے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔ اس دوران ٹھاکر کو دیکھ کر انہیں بار بار ایسا لگا کہ وہ اپنی مسکراہٹ دبانے کی کوشش کر رہا ہے۔

''تمہیں وشواس ہے کہ وہ اوتار سنگھ ہی تھا''۔

''پکا وشواس ٹھاکر جی۔ پر آپ چھوٹے ٹھاکر کو بلا کر پوچھ لیں''۔

''وہ تو ابھی تک واپس ہی نہیں آیا ہے''۔ ٹھاکر نے اطمینان سے کہا۔

جسونت اور کرتارے کو یقین نہیں آیا۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ ٹھاکر جھوٹا اور بزدل بھی نہیں ہو سکتا۔ پر اکلوتے بیٹے کی محبت بڑی چیز ہوتی ہے۔

''اب آپ کیا کریں گے؟''۔ جسونت نے پوچھا۔

''تیاری کریں گے۔ اور حملہ آوروں کے دانت کھٹے کر دیں گے''۔

''وہ بڑی تعداد میں آئیں گے''۔

''ہم لڑائی کے دوران گنتی نہیں کرتے۔ ہاں لڑائی کے بعد کٹے ہوئے سر گنتے ہیں''۔

ٹھاکر حویلی کے باہر آ بیٹھا اور اس نے اپنے ملازم ادھر ادھر دوڑا دیئے۔ تھوڑی ہی دیر میں گاؤں کے تمام مرد وہاں جمع ہو گئے۔ ان میں جمال دین اور وصال دین بھی تھے۔ مولوی صاحب بھی باہر نکل آئے تھے۔

''یہ لوگ جے پور سے خبر لائے ہیں کہ ہمارے گاؤں پر حملہ ہونے والا ہے''۔ ٹھاکر نے کہا۔ اس نے ہاتھ سے جسونت اور کرتارے کی طرف اشارہ کیا۔

''تو مالک، ہم نے چوڑیاں تو نہیں پہن رکھی ہیں''۔ ایک مزارعہ بولا۔

''ہم ان کا مقابلہ کریں گے''۔ دوسرے نے کہا۔

''ہمیں ان کی تعداد کا اندازہ نہیں۔ وہ بہت زیادہ بھی ہو سکتے ہیں''۔

''ٹھاکر جی، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمیں تو لڑنا ہے''۔ جمال دین بولا۔

ٹھاکر نے ایک گہری سانس لی۔ ''تم لوگوں نے یہ نہیں پوچھا کہ حملے کا کارن کیا ہے''۔ اس نے کہا۔ ''لیکن میں تمہیں اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ میرے پتر اوتار سنگھ نے جے پور کے بڑے مندر میں تمام بت توڑ ڈالے ہیں۔ تم سب جانتے ہو کہ اوتار سنگھ واپس نہیں آیا ہے کہ میں اس سے پوچھوں کہ یہ آرودھ سچا ہے یا جھوٹا۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اگر یہ سچ بھی ہے تو میں اوتار سنگھ کا بال بانکا نہیں ہونے دوں گا۔ میں لڑوں گا''۔

ٹھاکر کی بات سن کر سب سناٹے میں آ گئے تھے۔ کوئی کچھ بھی نہیں بولا۔

''اب میرا کہنا یہ ہے کہ تم میں سے جس کا جی چاہے، گاؤں چھوڑ دے۔ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ اور جس کا جی نہ چاہے وہ لڑائی میں حصہ نہ لے۔ ہم ٹھاکر لوگ ویسے بھی اپنی جنگ آپ ہی لڑتے ہیں''۔

یہ سن کر جہاں کچھ لوگوں نے سکون کی سانس لی، وہاں کچھ لوگ تڑپ گئے۔ ''ہم آپ کو چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں ان داتا''۔ ان میں سے ایک نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''جیون بھر نمک کھایا ہے آپ کا''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

"تو جو میرے ساتھ ہیں، وہ اس طرف آجائیں"۔ فخا کرنے کہا۔

کچھ لوگ اس طرف آگئے۔ دوسرے لوگ نظریں چرا رہے تھے۔

فخا کرنے مٹی دھر کو حکم دیا کہ عویلی سے اسلحہ نکال کر لائے۔ اسلحہ ہر طرح کا تھا۔ ان میں پستول، بندوقیں اور کارتوس بھی تھے اور نیزے، تلواریں اور کلہاڑیاں بھی۔ "جس کا جو جی چاہے، لے لے"۔

لوگوں نے اپنی پسند کے ہتھیار اٹھالئے۔

"ہم گاؤں کے باہر ان کا مقابلہ کریں گے"۔ فخا کرنے اعلان کیا۔ "تم سب وہاں پہنچ جاؤ۔ میں آتا ہوں"۔

وہ سب لوگ چلے گئے۔ فخا کرنے مولوی صاحب سے کہا۔ "آپ اندر حویلی میں جائیں"۔

"لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ میں لڑائی میں آپ کا ساتھ نہ دوں"۔ مولوی صاحب نے جوش سے کہا۔

"آپ مہمان ہیں۔ مجھ پر کرپا کریں اور اندر چلے جائیں"۔

مولوی صاحب اندر چلے تو گئے۔ لیکن ان کی کیفیت عجیب تھی۔ ان کے لئے تو یہ بہت بڑی خوش خبری تھی۔ اقتدار سنگھ ان سے عربی پڑھتا رہا تھا۔ اور اب اس پر بت شکنی کا الزام تھا۔ انہیں تو ایسا لگ رہا تھا کہ اس گاؤں میں الله نے ان کے لئے سعادتیں ہی سعادتیں لکھ دی ہیں۔ انہوں نے سوچ لیا کہ بت شکنوں کی اس لڑائی میں وہ ہر حال میں بت شکنوں کا ساتھ دیں گے۔

ادھر فخا کر کی گاؤں والوں سے بات چیت کے دوران جمنوت اور کرتار سنگھ نے مولوی صاحب کو دیکھا تو ان کے درمیان معنی خیز نظروں کا تبادلہ ہوا۔ دونوں ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ بیٹے نے بھگوان اور دیوتاؤں کا ایمان کیا اور باپ گھر میں ایک مسئلے کو لئے بیٹھا ہے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ اقتدار سنگھ پر جو آردھ لگایا گیا ہے، وہ سچا ہے۔

پھر جب فخا کر نے اعلان کیا کہ اگر اس گاؤں میں الله نے ان کے لئے سعادتیں لکھ دی ہیں، تو ان دونوں کا دل بڑا ہو گیا۔ ان کا بس چلتا تو وہ اسی وقت وہاں سے نکل جاتے اور حملہ آوروں سے جا ملتے۔ لیکن کرتار جمنوت کا لحاظ کر رہا تھا۔ اور جمنوت کیدار ناتھ کے مفاد میں چپ تھا۔

مولوی صاحب اندر گئے تو جمنوت نے پوچھا۔ "یہ مسلمان کون ہے آپ کے ہاں؟"۔

"یہ میرے پتر کے استاد ہیں"۔ فخا کر کے لہجے میں بدمزگی تھی۔

ان دونوں کو احساس ہو گیا کہ فخا کر کو ان کا مسلمان کہنا برا لگا ہے۔

اسی وقت کیدار ناتھ چلا آیا۔ وہ گھر گیا تھا، جہاں اس کی ماتی نے اسے دونوں دوستوں کے متعلق بتایا تھا۔ وہ فوراً ہی حویلی چلا آیا اور وہاں پہنچا تو خاصا پریشان اور وحشت زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ باہر بھی اسے غیر معمولی سرگرمیاں دکھائی دی تھیں۔

اس نے جمنوت اور کرتار کے نظر انداز کر دیا۔ "کیا بات ہے فخا کر وہ، یہ لڑائی کی تیاری کیسی؟"۔ اس نے فخا کر سے پوچھا۔

"تمہارے ستروں نے جو بتایا ہے، اس کے بعد ہم اور کیا کر سکتے ہیں"۔ فخا کر نے جواب دیا۔

کیدار ناتھ نے جمنوت کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ جمنوت نے اسے سب ماجرا سنا دیا۔ "ٹھیک ہے فخا کر وہ"۔ کیدار ناتھ نے فخا کر سے کہا۔ "ہم لڑیں گے۔ پر اقتدار سنگھ پتر کہاں ہے؟"۔

"وہ تو واپس ہی نہیں آیا ہے ابھی"۔ فخا کر نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ حالاں کہ وہ تشویش بس ظاہری تھی۔ اس کے لئے تو یہ مقام شکر تھا کہ اقتدار سنگھ یہاں موجود نہیں ہے۔ لیکن اس نے کیدار ناتھ کی آنکھوں میں ابھرتی چمک دیکھ لی تھی۔ ویسے بھی کیدار پر بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ اب اس صورت حال میں وہ اسے یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اقتدار سنگھ کہاں ہے۔ اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ یہ بے حد نامناسب ہے۔

"بھگوان چھوٹے فخا کر کی سہائتا کرے۔ میں چلتا ہوں فخا کر وہ۔ مجھے بھی تیاری کرنی ہے۔ ان دونوں کو ساتھ لے جاؤں"۔

فخا کر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

کیدار ناتھ ان دونوں کو ساتھ لے کر چلا گیا۔

فخا کر تھوڑی دیر صورت حال پر غور کرتا رہا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اسے دوستوں کی طرف سے بھی محتاط رہنا ہوگا۔

جو ہونا ہے، وہ ہونا ہے۔ دیکھا جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ سر جھٹکتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب اسے تیاری کرنی تھی۔

تہہ خانے میں جا کر اس نے اپنے ہتھیار جسم پر سجائے اور باہر نکل آیا۔

.....x.....

کیدار ناتھ کے گھر میں تینوں دوست سر جوڑے بیٹھے تھے۔ کیدار ناتھ بار بار ہاتھ ملتا تھا اور تاسف سے سر ہلاتا تھا۔ "کاش..... میں اس وقت موجود ہوتا۔ کاش میں تمہیں مل جاتا"۔ وہ بار بار یہی کہے جا رہا تھا۔

"تم نے تو مجھ سے یہی کہا تھا کہ اس معاملے سے ہاتھ اٹھالیں۔ اس میں تمہارا نقصان ہے"۔ جمنوت نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔

"سے سے کی بات ہوتی ہے یار"۔ کیدو نے ہاتھ ملتے کہا۔ "مجھے کیا پتا تھا کہ بھگوان ایسا موقع دے گا"۔

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے"۔

"وقت نہیں ہے۔ ورنہ میں تمہیں سمجھا دیتا"۔

"پر تم چاہتے کیا ہو؟"۔

"جو میں چاہتا ہوں، وہ تو اب ہو کر رہے گا۔ اور میں دونوں باپ بیٹوں کو جیتا نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس لڑائی میں دونوں مر جائیں گے تو یہاں سب کچھ میرا ہوگا"۔

"پاپی نہیں، کیا ہوگے۔ پر میں تو تمہاری خاطر یاروں کا بھی برا بن گیا اور دھرم کا بھی"۔ جمنوت نے افسوس سے کہا۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہاری بگڑی بات بھی بن جائے گی۔ اب میری بات دھیا سے سنو۔ تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔ گاؤں سے دور رک کر تم آنے والوں کا انتظار کرو۔ وہ آئیں تو انہیں بتاؤ کہ تم یہاں فخا کر کی طاقت دیکھنے آئے تھے اور وہ تم نے دیکھ لی۔ اب تم ان کے ساتھ ہو"۔

"اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا"۔

"میں صرف فخا کر اور چھوٹے فخا کر کی موت چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ لوگ یہاں اور خاص طور پر حویلی میں لوٹ مار کریں۔ تمہیں ان کو اس سے روکنا ہوگا۔ انہیں سمجھانا کہ انہیں بس اس لڑائی کا بدلہ لینا ہے۔ صرف فخا کر اور اس کے پتر کی جان لینی ہے"۔

"ضروری نہیں وہ مان ہی لیں"۔

"تب تو کوشش اور ضروری ہے"۔

.....x.....

فخا کر کی گفتگو سننے کے بعد گاؤں کی آبادی تین دھڑوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ گاؤں میں سو اسو کے قریب مرد تھے۔ ایک دھڑا یہ کہتا تھا کہ بے پر کے سمندر میں جو کچھ ہوا، اگر وہ اقتدار سنگھ نے کیا تو فخا کر پرادو گاؤں پر بھگوان کا شراپ آ کر رہے گا۔ وہ گاؤں چھوڑ دینا چاہتے تھے۔

دوسرا دھڑا اسی پہلے گروہ کا ہم نوا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ گاؤں چھوڑنے کے حق میں نہیں تھے۔ وہ اس لڑائی میں غیر جانب دار رہنا چاہتے تھے اور تیسرا وہ دھڑا تھا جو فخا کر پر جان قربان کرنے کے لئے تیار تھا۔

ان تینوں گروہوں کے درمیان بات ہوتی۔ فخا کر کے وفادار دوسرے لوگوں کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اس کڑے وقت میں فخا کر کا ساتھ نہ چھوڑیں۔

"بات دھرم کی ہے۔ چھوٹے فخا کر کا دھرم ہڑپ لیا گیا ہے"۔ پہلے گروہ میں سے ایک شخص نے کہا۔ "ان کی کرنی ہم کیوں بھگتیں"۔

"دھرم کی بات نہ ہوتی تو ہم جان دے دیتے۔ پر فخا کر کی ساتھ نہ چھوڑتے"۔ دوسرے نے کہا۔

"ہمارے لئے تو فخا کر کی سیدھی دھرم ہے"۔ فخا کر کے وفاداروں میں سے ایک بولا۔

مفاہمت نہ ہوئی تو فخا کر کے تمام وفادار فخا کر کی سرحد کی طرف چل پڑے۔ جمال دین اور وصال دین ان کے ساتھ تھے۔ ان کے جانے کے بعد گاؤں میں رہنے کی حامی لوگوں میں سے ایک نے پہلے گروہ سے پوچھا۔ "بتاؤ، گاؤں چھوڑ کر تم جاؤ گے کہاں؟"۔

اس پر خاموشی چھا گئی۔ اس سوال کا کوئی جواب ان کے پاس نہیں تھا۔

"یہاں تمہارے گھر بار ہیں، زمینیں ہیں"۔ دوسرے نے کہا۔ "تم جانتے ہو تمہیں کہیں بنا نہیں ملے گی۔ سوچو، بال بچوں کو لے کر کہاں جاؤ گے۔ کیا کرو گے۔ بھوکے مر جاؤ گے"۔

"سچ کہتے ہو۔ پر ہم کیا کریں"۔

"گاؤں مت چھوڑو۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے گھروں پر سفید جھنڈے لگا دیں گے"۔

"لڑائی ہوتی ہے تو سفید جھنڈا کسی کو نظر نہیں آتا۔ پھر یہ تو دھرم کی لڑائی ہے"۔

اس بات نے گاؤں میں رہنے والوں کو ہلا دیا۔ بات غلط نہیں تھی۔

کافی بحث کے بعد طے پایا کہ گھروں پر سفید جھنڈے لہرا دیئے جائیں۔ لیکن لوگ اپنے بال بچوں کو لے کر گاؤں سے باہر نکل جائیں۔ لڑائی میں اگر نقصان ہوا تو صرف گھروں کا ہوگا۔ لڑائی ختم ہونے کے بعد وہ واپس آسکتے ہیں۔ آگے ان کے نصیب۔

اس پر عمل شروع ہو گیا!

.....x.....

ہتھیار بند فخا کر گاؤں کی سرحد پر پہنچا تو لوگوں نے..... فخا کر کی بے..... کے نعرے لگا کر اس کا سواگت کیا۔ فخا کر نے جائزہ لیا۔ ان کی تعداد چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ جبکہ کیدو کے ستروں کا کہنا تھا کہ حملہ آور سو ڈیڑھ سو سے کم نہیں ہوں گے۔

فخا کر پریشان ہو گیا۔ حملہ آور شہر سے آرہے تھے۔ اسے یقین تھا کہ ان میں سے بیشتر کے پاس آتشی اسلحہ ہوگا۔ اور یہاں بیشتر لوگ وہ تھے جو مٹھ پر یا بندوق چلانا بھی نہیں جانتے تھے۔ تو یہ تھوڑے سے لوگ ان کے سامنے کتنی دیر ٹھہر سکیں گے۔

فخا کر موت سے نہیں ڈرتا تھا۔ لیکن جو اس کے وفادار تھے، وہ اس پر جان نچھاور کرنے چلے آئے تھے۔ ان کی یقینی موت کا خیال اسے پریشان کر رہا تھا۔ اس سے بہتر یہ تھا کہ وہ اکیلا لڑے اور اکیلا مرے۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ انہیں نہیں سمجھا سکتا۔

پھر بھی کوشش تو کرنی ہی تھی۔ اس نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ لیکن ناکام رہا۔ ان میں سے کوئی پیچھے ہٹنے پر آمادہ نہیں تھا۔

اب فخا کر کو کچھ سوچنا تھا۔ یہاں کھلے میں وہ چالیس افراد بڑی آسانی سے ختم ہو جاتے۔ تعداد کم ہو تو مدافعانہ جنگ لڑنی پڑتی ہے۔ ایسی جنگ کھلے میدان میں نہیں لڑی جا سکتی۔ ہاں جنگل میں کامیاب رہتی ہے۔ اب یہاں جنگل تو تھا نہیں۔ البتہ بستی تھی۔

"میں نہیں سمجھتا کہ یہاں ان سے الجھنا مناسب ہوگا"۔ حویلی کی طرف چلو"۔ فخا کر نے فیصلہ سنایا۔

حویلی پہنچ کر فخا کر کچھ سخت عملی غور کرنا تھا۔ لڑائی کس طرح لڑی جائے کہ جانی نقصان کم سے کم ہو،

"حویلی کا پھاٹک بند کر دیا جائے"۔ سندر داس نے تجویز پیش کی

"نہیں ہم باہر نکل نہیں ہیں"۔ فخا کر نے فوراً ہی اسے رد کر دیا۔

اسی وقت کیدار ناتھ بھی آگیا۔ وہ بھی مشاورت میں شریک ہو گیا۔

فخا کر کو سب سے ٹکرانے لوگوں کی تعداد اور جنگی ہتھیاروں سے لڑنے والے تھے۔ وہ ان کے بچاؤ کی ترکیب سوچ رہا تھا۔ وہاں اسے اور کیدار ناتھ کو ملا کر سترہ آدمی ایسے تھے، جو آتشی اسلحہ استعمال کر نا جانتے تھے۔

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

تو ایک صورت یہ تھی کہ وہ سترہ افراد حویلی میں بند ہو کر فائرنگ کر کے حملہ آوروں کا مقابلہ کریں۔ یہ طے تھا کہ کھلے میں ہونے کی وجہ سے حملہ آوروں کو بہت تیزی سے جانی نقصان اٹھانا ہوگا۔ اور امکان تھا کہ لاشیں دیکھ کر وہ بھاگ کھڑے ہوں۔ لیکن یہ انداز ٹھاکر کے مزاج کے خلاف تھا۔ وہ کھل کر لڑنے والا آدمی تھا۔ اس کے پاس راج پوت کا روایتی دماغ تھا۔ مگر یہ بات ہی سمجھ میں آ رہی تھی کہ تلوار، لاٹھی اور نیزے والے 25 افراد کی جان اس طرح بچ سکتی ہے۔ بشرطیکہ وہ انہیں لڑائی سے دست بردار ہونے پر آمادہ کر لے۔

اس نے یہ تجویز پیش کر دی ''یہ لڑائی صرف ان لوگوں کو لڑنے دی جائے جو بندوق یا طمنچہ چلا سکتے ہیں''۔

''میں بھی یہی سوچ رہا تھا ان داتا''۔ وکرانت نے جلدی سے کہا

لیکن جن لوگوں کے تحفظ کی بات ہو رہی تھی۔ وہ دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اور حویلی میں بند ہو کر وہ عضو معطل بن کر رہ جاتے۔ ''ایسا کرتے ہیں ٹھاکر جی کہ آپ بندوق والوں کو لے کر حویلی میں چلے جائیں۔ پہلے ہمیں مقابلہ کرنے دیں''۔ جمال دین نے کہا ''اللہ نے چاہا تو ہم انہیں بھگا دیں گے''۔

''وہ بہت زیادہ ہوں گے جمال دین''۔

''اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا ٹھاکر جی۔ حوصلہ تعداد سے بڑا ہو تو جیت جاتا ہے''۔

''یہ ٹھیک ہے مالک''۔ سندر داس نے کہا۔ ''اور ہم ختم ہو جائیں تو آپ اندر بند ہو کر لڑتے رہیں''۔

یہ ٹھاکر کو گوارا نہیں تھا۔

مگر دور سے نعروں کی قریب آتی آواز سنائی دی تو انہوں نے سمجھ لیا کہ اب بحث کا وقت نہیں رہا۔ عمل کا وقت آ پہنچا ہے۔

اسی وقت مولوی برکت علی بھی باہر آ گئے!

.....×.....

جسونت اور کرتار سنگھ گاؤں کے باہر جا کر کھڑے ہوئے تھے اور آنے والوں کا انتظار کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد سامنے سے گرد اڑتی دکھائی دی۔ پھر دو ٹرک نمودار ہوئے۔ وہ قریب آئے تو جسونت نے ہاتھ اٹھا کر انہیں رکنے کا اشارہ کیا۔

دونوں ٹرک رک گئے۔ اگلے ٹرک میں ڈرائیور کے ساتھ سورج بیٹھا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر نیچے اترا۔ عقبی حصے سے رگھبیر اور گوپال کود کر آ گئے۔ پچھلے ٹرک سے راجو بھی اتر آیا۔

''تم لوگ یہاں؟''۔ سورج نے حیرت سے کہا۔

''تمہیں دھرم کی لاج بھی نہیں رہی''۔ رگھبیر کے لہجے میں ملامت تھی۔

''تم غلط سمجھ رہے ہو''۔ کرتارے نے نرم لہجے میں کہا۔ ''ہم نے یہاں آ کر تمہارا کام آسان کر دیا ہے''۔

''ذرا ہمیں بھی سمجھاؤ''۔

''دیکھو.....ہم نے کیدار ناتھ سے بات کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اوتار سنگھ کو اس اپرادھ کی سزا ملنی ہی چاہئے''۔

''اس کے لئے ہمیں کیدار ناتھ کے آشیر باد کی ضرورت نہیں''۔

اس دوران اونٹوں پر سوار اور مسلح لوگ آئے اور وہاں رک کر ان کی باتیں سننے لگے۔

''ہم نے ٹھاکر پرتاپ سنگھ سے بات کی اور اس سے کہا کہ وہ اپنے اپرادھی بیٹے کو ہمارے حوالے کر دے۔ پر نتو اس نے انکار کر دیا۔ وہ لڑنے کی تیاری کر رہا ہے''۔

''تو ہم بھی یہاں اسی لئے آئے ہیں''۔ سورج نے کہا۔

''وہ تمہارا یار کیدار ناتھ یہاں نظر نہیں آ رہا ہے''۔ رگھبیر نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''وہ ٹھاکر کے ساتھ ہے۔ لیکن اصل میں وہ ہماری طرف ہے۔ وہ موقع پا کر ٹھاکر کو ختم کرنے کی کوشش کرے گا''۔

''اور تم کہہ رہے تھے کہ تم نے یہاں آ کر ہمارا کام آسان کر دیا ہے''

''ہاں۔ کام کی جان کاری لیکر آئے ہیں۔ ٹھاکر کے ساتھ مشکل سے پچاس آدمی ہوں گے لیکن ان کے پاس اسلحہ بہت ہے۔ طمنچوں اور بندوقوں کی کمی نہیں''۔

''پچاس آدمی، بس''۔ سورج نے حقارت سے کہا ''اور ادھر دیکھو۔ ہم دو سو سے اوپر ہیں''۔

جسونت نے جائزہ لیا اور سر ہلاتے ہوئے بولا ''نہیں۔ دو سو تو نہیں لگتے''۔

''اور لوگ گاڑی سے آ رہے ہیں۔ تم فکر نہ کرو۔ ہم اچھی طرح سے بدلہ لیں گے''۔

یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ گاڑی سے آنے والی ٹولیاں بھی آتی نظر آئیں۔

کرتارے نے کہا ''ذرا الگ تو چلو۔ کچھ بات کرنی ہے''۔

چاروں دوست ان کے ساتھ اکیلے میں چل دیئے ''کہو، کیا بات ہے؟''۔ سورج نے کہا۔

''بات یہ ہے کہ کیدر کی جان خطرے میں نہیں پڑنی چاہئے''۔ جسونت کے لہجے میں تشویش تھی۔

''اسے وہاں رکنا ہی نہیں چاہئے تھا''۔ سورج بولا ''اب یہ اتنے اسے پہچانتے تو نہیں ہیں نا''۔

''کیدر نے کہا ہے کہ ٹھاکر کو ختم کرتے ہی وہ جے بجرنگ بلی کا نعرہ لگائے گا۔ تب لڑائی ختم کر دی جائے''۔

رگھبیر نے جسونت کو غور سے دیکھا ''صاف صاف کہو، کیا کہنا ہے''

جسونت ہچکچا رہا تھا ''حویلی میں لوٹ مار نہیں ہونی چاہئے''۔

''اب اتنے لوگوں پر ہمارا زور تو نہیں چل سکتا ہے''۔ سورج نے بے بسی سے کہا ''پھر بھی میں کوشش کروں گا۔ یہ بتاؤ، وہ لڑکا اوتار سنگھ کہاں ہے؟''۔

''ٹھاکر کہتا ہے کہ وہ ابھی تک واپس نہیں آیا ہے''۔

''تب تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ لوگ اسے تلاش کرنے کے لئے حویلی میں ضرور گھسیں گے۔ انہیں نہیں روکا جا سکتا''۔

جسونت جانتا تھا کہ سورج ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس پہلو سے تو انہوں نے سوچا ہی نہیں تھا ''حملہ کب کرو گے؟''۔

''ابھی آنے والوں کا انتظار کرنا ہے۔ میں پوری طاقت سے ایک بار حملہ کرنا چاہتا ہوں''۔

دور سے آنے والوں کی ایک اور ٹولی آتی نظر آ رہی تھی۔

.....×.....

دیکھتے ہی دیکھتے پھاٹک کے باہر دو ٹرک آ کر رکے اور مسلح لوگ ٹرکوں سے کود کود کر اترنے لگے۔ ان میں وہ دونوں بھی تھے، جنہوں نے ٹھاکر کو آ کر خبردار کیا تھا۔

وہ آگے آئے اور انہوں نے پکار کر کہا ''ٹھاکر پرتاپ سنگھ۔ ہم تم سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اپنے اپرادھی پتر کو ہمارے حوالے کر دو۔ یہ جھگڑا یہیں ختم ہو جائے گا''۔

''میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں''۔ ٹھاکر نے پرسکون لہجے اور بلند آواز میں کہا ''ہم راج پوت جان دے دیتے ہیں۔ پر آن کا سودا نہیں کرتے۔ میں نے جو کہا، وہ پتھر پر لکیر ہے''۔

''تو پھر تمہیں بھی کوئی نہیں بچا سکتا''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

حویلی کے احاطے میں ٹھاکر کے جاں نثاروں نے دیکھا کہ اونٹوں پر سوار اور پیدل لوگ الگ آ رہے ہیں۔ وہ بہت بڑا مجمع تھا ان کی تعداد دو سو سے اوپر ہی ہوگی۔

''مالک.....آپ بندوق والے لوگ اندر چلے جائیں''۔ سندر داس نے گڑگڑا کر کہا۔

''جس کو جانا ہو وہ چلا جائے۔ میں نہیں جاؤں گا''۔ ٹھاکر کے لہجے میں عجیب سا جاہ و جلال تھا۔

اسی وقت باہر حملہ آوروں نے جے بجرنگ بلی کا نعرہ لگایا اور دھاوا بول دیا۔

حویلی کے اندر سے سب سے پہلے لاٹھیاں سنبھالتے ہوئے جمال دین اور وصال دین حملہ آوروں پر جھپٹے۔ ان کی رفتار اتنی تیز تھی اور وہ یوں پینترے بدل رہے تھے کہ ان پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ ایک بجلی سی کوند رہی تھی۔ ابھی وہ یہاں تھے اور اگلے پل وہاں۔ دوسری طرف حملہ آور تھے کہ پھاٹک سے احاطے میں گھسے چلے آ رہے تھے۔

لوگوں کے کسی بہت بڑے مجمعے میں لٹھیا باز کتنا کامیاب رہتا ہے، اس کا تصور کرنا ناممکن ہے، اسے وہی سمجھا سکتا ہے، جس کے اندر کسی ماہر فن لٹھیا باز کو سینکڑوں کے درمیان لاٹھی چلاتے دیکھا ہو۔ اور وہاں تو دو تھے۔ لاٹھی اسی طرح گھوم رہی تھی کہ ایک لکیر سی نظر آتی تھی۔ لیکن لاٹھی کو نہیں دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ اور مجمع زیادہ ہونے کی وجہ سے لاٹھی خالی نہیں گھوم رہی تھی۔ لوگ اس کی ضرب کا نشانہ بن رہے تھے۔

دوسری طرف ٹھاکر بھی تلوار سونت کو میدان میں اتر گیا اس کے جاں نثار بھی اس کے ساتھ تھے۔

دوستوں کی ٹولی باہر ہی تھی۔ وہ ایک بار لٹھیا باز بچوں کو بھگت چکے تھے۔ اور ویسے بھی وہ اندھا دھند میدان میں کود پڑنے کے قائل نہیں تھے۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ پہلے باہر رہ کر جائزہ لیں گے۔ انہیں ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنا تھا۔

ان جو نقشہ بنا، اس نے ان پر ثابت کر دیا کہ ان کا فیصلہ درست تھا۔ پچھلی بار مار کھانے کے بعد انہوں نے خود بھی لٹھیا بازی سیکھی تھی۔ مگر اب جمال دین کو دیکھ کر انہیں احساس ہو رہا تھا کہ وہ اس فن کی الف بے سے بھی واقف نہیں ہیں۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ اپنے زعم میں لاٹھیاں لے کر میدان میں نہیں اترے۔

''اب سمجھ میں آ رہا تھا کہ میں نے اس دن بزدلی کیوں دکھائی تھی؟''۔ کرتارے نے فاتحانہ لہجے میں کہا ''یاد ہے، میں نے کہا تھا کہ ہم بیس بھی ہوتے تو وہ ہمیں گرا دیتے''۔

''وہ تو ٹھیک ہے''۔ رگھبیر نے خجالت سے کہا۔ کیونکہ اس روز کرتارے سے بحث اس نے ہی کی تھی۔ ''مگر اس وہ کچھ کرو۔ ورنہ یہ دونوں تو تباہی مچا دیں گے''۔

کرتارے کو اندازہ تھا کہ دونوں لٹھیا باز اب تک بیس سے زائد افراد کو ناکارہ بنا چکے ہیں۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے کہا ''بس ایک ہی صورت ہے۔ بندوق سے انہیں نشانہ بنانے کی کوشش کرو''۔

ان میں سے صرف گوپال ہی ایسا تھا، جس کے پاس طپنچہ تھا۔ اس نے نشانہ لینے کی کوشش کی۔ لیکن وہ تو چھلاوہ بنے ہوئے تھے۔ گولی ایسے متحرک ہدف کا کیا بگاڑ سکتی ہے۔ الٹا ان کے تین افراد نشانہ بن گئے۔

''کیا کر رہے ہو؟ تم تو اپنوں ہی کی جان لے رہے ہو''۔ کرتارے نے جھنجھلا کر کہا۔

''میں گولی چلاتا ہوں۔ مگر اس سے پہلے ہی وہ جگہ چھوڑ چکے ہوتے ہیں''۔

''لڑکا اتنا تیز نہیں ہے۔ اس کا نشانہ لو''۔ جسونت نے مشورہ دیا۔

اسی چکر میں ان کے دو اور آدمی کام آ گئے۔

''واپس بلا لو لوگوں کو''۔ کرتارے نے کہا ''ہمیں خوب سوچ سمجھ کر اگلا قدم اٹھانا ہوگا''۔

سورج نے آسمان کی طرف دیکھا۔ تیزی سے اندھیرا ہو رہا تھا۔ اس نے حملہ آوروں کو پکارا ''واپس آ جاؤ''۔

لیکن پسپا ہو کر باہر آتے آتے ان کے چھ سات آدمی اور کام آ گئے

.....×.....

لڑائی رک گئی۔ ٹھاکر نے جائزہ لیا۔ احاطے میں انسانی جسموں کا ڈھیر تھا۔ ان میں پرائے کو تو پھر بھی شناخت کیا جا سکتا تھا۔ لیکن زندہ اور مردے کو پہچاننا بہت مشکل تھا۔

بہر حال اس کے لئے یہ مرحلہ اتنا مشکل نہیں تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو گنا۔ اور اسے اندازہ ہو گیا۔ اسی کے 14 ساتھی کم ہو چکے تھے۔ اب ان میں کتنے زندہ تھے، یہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس کے لئے احاطے میں پڑے لوگوں کو ٹٹولنا پڑتا۔ فی الحال یہ ممکن نہیں تھا۔ دشمن پسپا ضرور ہو گیا تھا۔ لیکن پھاٹک کے باہر موجود تھا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

اور اس کے پاس آتشی ہتھیار بھی تھے۔

مگر ایک بات بے حد حوصلہ افزا تھی۔ احاطے میں پڑے لوگوں میں اگر 14 اس کے ساتھی تھے، دشمنوں کی تعداد 60 سے کم نہیں تھی۔ ظفر کرنے دیکھا تھا اور جانتا تھا کہ جمال دین اور وصال دین نے دشمن کو بہت بھاری نقصان پہنچایا ہے۔

سورج غروب ہو چکا تھا اور اندھیرا بہت تیزی سے پھیل رہا تھا۔

"مالک..... اب اندر بند ہو کر لڑنا ہمارے لئے بہتر ہے گا"۔ وکرانت نے ظفر کرسے کہا۔

بات ظفر کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ اندھیرے میں فائرنگ ہوتی تو نقصان میں وہی لوگ رہتے۔ لیکن ظفر کا دل نہیں مان رہا تھا۔

ایسے میں جمال دین نے آہستہ سے کہا "ظفر کرجی، ہمیں اپنے زخمیوں کی فکر کرنی چاہئے"۔

ظفر کرنے سر گھما کر اسے دیکھا۔ وہ کچھ مضطرب اور اداس نظر آ رہا تھا۔ ظفر کو اچانک ہی وصال دین کا خیال آ گیا۔ "وصال دین کہاں ہے؟" اس نے تڑپ کر پوچھا۔

"وہ تو یہاں نہیں ہے ظفر کرجی"۔

"تو کیا..... تو کیا؟" ظفر کرسے جملہ پورا نہیں کیا گیا۔

جمال دین نے کچھ نہیں کہا۔ صرف اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو چلو..... دیکھتے ہیں۔ کوئی زخمی ملے تو اسے لے آئیں گے"۔

"نہیں ظفر کرجی۔ ایسے میں تو وہ آسانی سے ہمیں نشانہ بنا لیں گے"۔ وکرانت بولا۔

"تو کیا اپنے زخمیوں کو ایسے ہی چھوڑ دیں"۔ ظفر کرنے جھنجھلا کر کہا۔

"وکرانت ٹھیک کہہ رہا ہے ظفر کرجی"۔ جمال دین نے آہستہ سے کہا۔ "یا کیلئے آدمی کا کام ہے۔ میں کالی چادر اوڑھ کر احاطے سے جاؤں گا۔ انہیں اندھیرے میں پتا بھی نہیں چلے گا۔ اور ظفر کرجی، یہ بھی ٹھیک ہے کہ اب ہمیں بند ہو کر لڑنا پڑے گا۔ پر میں وہاں کسی کام نہیں آ سکوں گا۔ اس لئے مجھے اپنے حصے کا کام باہر ہی کرنے دیں"۔

وہ پہلا موقع تھا کہ ظفر کرنے جمال دین کو اتنا بولتے سنا تھا۔ اور وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ جمال دین بند ہو کر لڑنے سے پہلے ہی خود کو ہلاک کر پر قربان کر دینا چاہتا تھا۔ جمال دین باہر والوں پر ٹوٹ پڑنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ مر جائے گا۔ لیکن دس بیس آدمی ضرور گرائے گا۔

اسی لمحے ظفر کو پوری طرح اندازہ ہوا کہ وہ جمال دین سے کتنی محبت کرتا ہے۔ اس نے جمال دین کا ہاتھ تھام لیا "نہیں جمال دین۔ میں تمہیں اکیلے نہیں جانے دوں گا۔ ہم ساتھ لڑیں گے۔ ساتھ مریں گے"۔

"آج تو وفاداری کا حق ادا کرنے کا موقع ملا ہے ظفر کرجی۔ مجھے نہ روکیں"۔ جمال دین نے کہا۔ "اس وقت اپنی لاشیں دیکھ کر ان کے حوصلے پست ہو رہے ہوں گے۔ میں انہیں بھاری نقصان پہنچاؤں گا۔ پھر ممکن ہے کہ وہ بھاگ کھڑے ہوں"۔

"جمال دین ٹھیک کہہ رہا ہے، مالک"۔ سندر داس نے تائید کی۔ "میں اس کے ساتھ جاؤں گا۔ میں بھی حویلی میں بند ہو کر کسی کام کا نہیں رہوں گا"۔

جمال دین نے نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور ظفر کرسے بولا "بس کالی چادریں منگوا دیں"۔

ظفر کرتذبذب کا شکار تھا۔ مگر وہ بہرحال اندر گیا اور وہ کالی چادریں لے آیا۔ وہ جمال دین کو اکیلے نہیں بھیجنا چاہتا تھا۔

جمال دین اور سندر داس نے چاروں میں خود کو لپیٹا اور ظفر کرسے ہاتھ چومے۔ "ہمیں آشیرواد دیں ظفر کرجی"۔ سندر داس نے کہا۔

"خدا حافظ جمال دین"۔

.....x.....

اندھیرا ہو چکا تھا۔ وہ اماوس کی رات تھی۔ رشتی سے محرم رات۔ حملہ آوروں کے حوصلے بہت پست تھے۔ اصل میں وہ کوئی منظم گروہ نہیں تھا۔ وہ محض افراد تھے، جو قیادت اور منصوبہ بندی سے محروم تھے۔ سورج کی پکار پر احاطے سے باہر آنے کے بعد انہوں نے اندر کا منظر دیکھا تو وہ ڈر گئے۔ احاطہ لاشوں سے پٹا ہوا تھا۔ اور اب ایک گھنٹے بعد اندھیرے میں انہیں لاشیں اور زیادہ نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے بیشتر خوف زدہ تھے۔

"ہم نے اندھا دھند یلغار کر کے غلطی کی"۔ سورج کہہ رہا تھا۔

"تو یہ بات تمہیں پہلے کہنی چاہئے تھی"۔ ایک سورما نے جھنجھلا کر کہا "دیکھ لو۔ ہمارے کتنے لوگ مارے گئے"۔

"اور تم لوگ خود تو اندر گئے ہی نہیں"۔ ایک اور نے للکارا۔

"اسی لئے زندہ ہیں"۔ جسوت نے کہا۔ "لڑائی دماغ سے لڑی جاتی ہے"۔

"ایک دوسرے سے مت لڑو۔ یہ سوچو کہ اب کیا کرنا ہے"۔ کسی نے کہا۔

"ہمیں سب سے زیادہ نقصان طلبیا زوں سے پہنچا ہے"۔ سورج نے کہا۔ "وہ سامنے آئے تو دور دور بیٹھے کی کوشش کرو۔ اس طرح بندوق یا پھینکے والا کوئی انہیں آسانی سے نشانہ بنا سکے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جن لوگوں کے پاس بندوقیں اور پھینکے ہیں، وہ ایک جگہ ہو جائیں اور ایک جگہ رہیں۔ انہیں بھاگ کے پاس رہنا چاہئے۔ ابھی تھوڑی دیر بعد ہم اندھیرے میں گھسیں گے۔ تو یہ لوگ سب سے آگے ہوں گے۔ اور اب ہوں گے۔ انہیں ایک ایک کر کے نشانہ بنانا ہوگا۔ تب جیت ہماری ہوگی"۔

اس کا ثبت رد عمل ہوا۔ بندوقوں اور پھینکے والے لوگ آگے آئے اور پھاٹک کے پاس جمع ہو گئے۔ لیکن دشمن دھیان بھی کم نہیں تھا۔ روایتی ہتھیاروں والے لوگ پہلے الاؤ چلانے والوں سے خوف زدہ تھے۔ انہوں نے اپنے بے شمار لوگوں کو گرتے دیکھا تھا۔ سورج کی بات سن کر ان کا خوف اور بڑھ گیا۔ وہ مارنے کیلئے آئے تھے۔ لیکن مرنے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ان میں سے بیشتر جی چھوڑ چکے تھے۔ اب انہیں پیچھے ہٹنے کا موقع ملا تو انہوں نے سمجھ لیا کہ وہ یہاں سے نکل سکتے ہیں۔ اندھیرا ان کے لئے پردے کا کام کر رہا تھا۔

وہ لوگ ایک ایک دو دو کر کے پیچھے کھسکتے رہے۔ ان کی تعداد کم ہوتی رہی۔ جو خود کو پکا کے بیٹھے تھے۔ وہ انہیں بھاگتے دیکھ کر متزلزل ہو گئے اور خود بھی نکل بھاگنے کی سوچنے لگے۔

چند دستوں کی ٹولی اب پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی۔ انہیں پتا ہی نہیں چلا کہ پیچھے کیا ہو رہا ہے۔

.....x.....

وہ دونوں متحرک سائے کی طرح نظر آ رہے تھے۔ پھر وہ اندھیرے میں مدغم ہو گئے۔ ظفر کرآنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ جنگ کر بھاگتے ہوئے احاطے میں آگے بڑھے۔ پھر وہ کسی لاش سے ٹکرائے۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ اب انہیں سینے کے بل رینگنا ہوگا۔ سینے کے بل رینگتے ہوئے وہ آگے بڑھے۔ ابتدا میں جو لاشیں انہیں ملیں۔ وہ انہیں نہیں پہچان سکے۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ دشمنوں کی لاشیں ہیں۔ پھر جمال دین کو شناسا چہرہ نظر آیا..... خون میں نہایا ہوا۔ وہ رند میر تھا۔ جمال دین نے اسے ٹٹول کر دیکھا۔ وہ مر چکا تھا۔

جیسے جیسے وہ آگے بڑھے، جمال دین کا دل ڈوبنے لگا۔ بات پوری طرح سمجھ میں آ رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ احاطے میں کوئی زخمی نہیں ملے گا۔ وہ سب مر چکے ہیں۔ جو بھی زخم تھا کر ایک بار گرا، وہ اٹھ نہیں سکا ہوگا۔ دوسرے لوگ اسے روندتے ہوئے چلے گئے ہوں گے۔

جمال دین کا سینہ دکھ سے بھر گیا۔ تو میرا وصال دین اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ عمر بھر کی کمائی لٹ گئی۔ وہ بیٹا، جس کے بارے میں وہ سوچتا تھا کہ اس کی نسل کو آگے بڑھائے گا، وہ مر گیا۔ تو اب کیا بچا..... کچھ بھی نہیں!

پھر اس دکھ میں طمانیت کی ایک لہر اٹھی۔ اس کا دل شکر سے بھر گیا۔ اللہ نے عزت کی موت عطا کی ہے اس کے بیٹے کو۔ وہ ایک بہت طاقتور دشمن کے دشمنوں، بشمرکوں سے لڑتے ہوئے مرا ہے۔ اللہ کی مرضی ہوئی تو اسے شہید کا رتبہ ملے گا۔ اور یہی نہیں، اس نے جان دے کر حق نمک بھی ادا کر دیا۔

اچانک اسے وصال دین نظر آ گیا۔ اس کا چہرہ حیرت انگیز طور پر روشن لگ رہا تھا۔ اور اس کے سینے میں ایک نیزہ پیوست تھا۔ ایک لمحے کو اسے ایسا لگا کہ وصال دین سانس لے رہا ہے۔ اس نے اس کی نبض ٹٹولی، سینے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ مگر وہاں سناٹے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

جمال دین نے جھک کر بڑی محبت سے اس کی پیشانی چوم لی۔ "مجھے تم پر فخر ہے میرے بیٹے"۔ انہوں نے سرگوشی میں بیٹے سے کہا۔

جب وہ چلا تھا تو اسے افسوس تھا کہ وہ اپنی لاٹھی چھوڑ کر جا رہا ہے۔ لیکن مجبوری تھی۔ لاش اس کی راہ کی رکاوٹ بن جاتی۔ اسے جس طرح بڑھنا تھا، وہ لاش لے کر نہیں چل سکتا تھا۔ یہ بات نہیں کہ وہ موت سے ڈرتا ہو۔ بلکہ وہ تو مرنے کا مصمم ارادہ لے کر چلا تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ دشمنوں کو مارنا چاہتا تھا۔ اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ دشمنوں کی تلاشی کے دوران کوئی گولی بغیر ارادے سے زندگی سے محروم کر دے۔

مگر اب وہ سوچ رہا تھا کہ اللہ جو کرتا ہے، بہتر کرتا ہے۔ اچھا ہی ہوا کہ وہ لاٹھی لے کر نہیں آیا۔ اب وہ زندہ بھی ہے اور اسے لاٹھی بھی مل گئی ہے۔ اس نیزے سے بہتر کون سا ہتھیار ہو سکتا ہے جو اس کے بیٹے کے خون میں بھیگا ہوا ہے۔ وہ اسی نیزے سے دشمنوں کو مارے گا..... اپنے بیٹے کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب لے گا۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ حویلی کے پھاٹک کے بہت قریب تھا۔ اب احتیاط کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سیدھا کھڑا ہوا اور وصال دین کے سینے سے نیزہ نکالنے لگا۔ کام اتنا مشکل نہیں تھا۔ لیکن جس نزاکت سے وہ یہ کام کرنا چاہتا تھا، اس نے اسے دشوار بنا دیا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ نیزہ اس کے اپنے سینے میں گڑا ہے۔ نکالتے ہوئے اسے یہ خیال ستا رہا تھا کہ اس کے بیٹے کو تکلیف نہ ہو۔

پہلی گولی چلی تو وہ جیسے ہوش میں آ گیا۔ اور وہ گولی اس کے جسم کو تقریباً چھوتے ہوئے گزری تھی۔ وہ تیزی سے جھکا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ اس ایک ثانیے میں اس نے بہت کچھ سوچ لیا۔ کہ اب یا تو وہ نہیں رہے گا یا مارے گا۔ اور اسے مرنے سے پہلے بہت کچھ کرنا تھا۔ حملہ آور سمجھے نہ سمجھے۔ لیکن وہ انہیں اتنا نقصان پہنچائے کہ ان کی کمر ٹوٹ جائے۔ اور ظفر کر کا بوجھ ہلکا ہو کام آسان ہو جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ مرنے سے پہلے بیٹے کے سینے سے نیزہ نکالے اور دشمن کی گرفت کا نشانہ بھی نہ بنے۔

بیٹھے بیٹھے اس نے اپنا بیٹے کے سینے پر رکھا اور نیزے کو نیچے سے تھام کر پورا قوت سے اوپر کھینچا۔ نیزہ نکلا تو وہ خود کو سنبھال نہ سکا اور ایک طرف لڑھک گیا۔

اس لڑھکنے نے اسے بچا لیا۔ ورنہ وہ گولی اس کے ضرور لگتی۔ چند لمحے وہ ساکت پڑا رہا۔ پھر نیزے کو آگے کی طرف سرکاتے ہوئے وہ سینے کے بل آگے بڑھنے لگا۔ ساتھ ہی اس نے سمت بھی تبدیل کر لی تھی۔

کچھ آگے جا کر اس نے چادر کا بوجھ اتارا۔ اب اگلے مرحلے میں وہ اس کے لئے رکاوٹ ہی ثابت ہوتی۔ پھر وہ کھڑا ہوا۔ اس نے نیزے کو لاٹھی کے انداز میں پکڑا اور اسے گھما کر دیکھا۔

اس لمحے ایک گولی اور چلی۔ وہ بال بال بچا۔

اس نے بلند آواز میں نعرہ تکبیر بلند کیا..... اللہ اکبر! پھر وہ نیزے کو لاٹھی کی طرح گھماتا ہوا، پیشتر سے بدتر اچھالتے کی طرف بڑھا۔ اب اس کی رفتار ایسی تھی کہ اس کے جسم کو دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔ اس رفتار سے تو وہ بھی حرکت میں آیا ہی نہیں تھا۔

روشنی کی لکیر بنا وہ پھاٹک سے نکل آیا!

.....x.....

گوپال پھاٹک پر مچھ ایٹھے برادروں کی قیادت کر رہا تھا۔ وہ حملہ کرنے کے لئے تیار تھا۔ طے یہ پایا تھا کہ وہ لوگ آگے ہوں گے اور روایتی ہتھیار والے پیچھے۔ اب وہ سورج کی آواز کے منتظر تھے۔

(جاری ہے)

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

دوسری طرف سورج اور اس کے دوست عقب کی صورت حال دیکھ کر بھونچکا رہ گئے تھے، صاف نظر آرہا تھا کہ ان کے ساتھیوں کی بڑی تعداد پیچھے سے میدان چھوڑ گئی ہے۔

''ہمیں فوراً حملہ کرنا ہوگا''۔ کرتار نے کہا۔ ''ورنہ یہاں صرف ہم ہی رہ جائیں گے''۔

''کارتک کہاں ہے''۔ سورج کے لہجے میں مفارت تھی۔

یہ وہ وقت تھا کہ پھاٹک کے قریب کھڑے ایک بندوق بردار نے احاطے میں تحرک محسوس کیا۔ وہ تحرک بھی برائے نام تھا۔ کیونکہ جس شخص کو وہ دیکھ رہے تھے، وہ تو جیسے اندھیرے میں لپٹا ہوا تھا۔

''وہ..... وہ دیکھو''۔ بندوق بردار نے گوپال سے کہا۔

گوپال نے احاطے کی طرف دیکھا۔ اندازے سے گولی چلادی۔

تحرک اس بار نیچے کی سمت تھا۔

گوپال نے دوسری گولی چلائی۔ بندوق بردار نے بھی گولی چلانے کو اپنا حق سمجھا۔ آخر تحرک کو پہلی بار اس نے ہی دیکھا تھا۔

اب اندر پھر سکوت اور اندھیرا تھا۔ ''اس جگہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے فائر کرتے رہو''۔ گوپال نے ہدایت کی۔

انہوں نے چند فائر کئے۔ لیکن جواب میں کوئی چیخ نہیں سنائی دی۔ وہ رک گئے۔

پھر اچانک دلوں پر ہیبت طاری کرنے والا وہ نعرہ سنائی دیا اور اس کے ساتھ ہی ایک سایہ پورے قد سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی، جسے وہ گھما رہا تھا۔ پھر لاٹھی کی گرفت پر وہ مضبوطی سے گرفت ہوگئی۔ یہاں تک کہ اب وہ نظر نہیں آرہی تھی۔

نعرے کی ہیبت نے انہیں شل کر کے رکھ دیا تھا۔ اس میں ان کے وہ قیمتی سیکنڈ ضائع ہوگئے، جن میں وہ اسے نشانہ بنا سکتے تھے۔ پھر وہ سایہ حرکت میں آیا..... اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی حرکت بھی اتنی تیز ہوگئی کہ وہ ایک تاریک بگولہ بن کر رہ گیا، جو ان کی طرف لپک رہا تھا۔

''دور ہو..... تیزی سے ہٹو''۔ گوپال چلایا۔

سب نے اس ہدایت پر عمل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جمال دین بہت تیزی سے ان کے سروں پر پہنچ چکا تھا۔ لاٹھی کے انداز میں گھمایا جانے والا وہ نیزہ بہت تباہ کن ثابت ہوا۔ جمال دین پھاٹک سے گزر کر پیچھے کی طرف پہنچا، جہاں وہ لوگ تھے، جو پہلے ہی حنذیذ ب تھے۔ وہاں بھگدڑ مچ گئی۔ جسے موقع ملا، اس نے راہ فرار اختیار کیا۔

ادھر گوپال نے احاطے میں داخل ہو کر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ''اندر گھس جاؤ اور فائرنگ کرتے رہو''۔ اس نے پھاٹک پار کرتے ہوئے کہا۔

یوں یہ لڑائی دوسرخ رخ میں تبدیل ہوگئی۔ یہ حملہ آوروں کیلئے نقصان دہ تھا کیونکہ وہ دو جگہ تقسیم ہو چکے تھے۔ جن لوگوں کے پاس آتشی اسلحہ تھا، اب وہ احاطے میں تھے اور فائرنگ کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

دوسری طرف روایتی ہتھیاروں والے لوگ تھے، جن پر جمال دین قہر بن کر ٹوٹ پڑا تھا۔ اس کے جتنے میں کم وقت زیادہ لوگ ناکارہ ہوگئے اور اس سے بڑی بات یہ ہوئی کہ بڑی تعداد میں لوگ فرار ہو گئے۔

لیکن ابتدائی چند منٹ میں ٹھاکر کے ساتھیوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ وہ اچانک حملہ ان کے خلاف توقع تھا۔ اس لئے اندھا دھند فائرنگ ان کیلئے بے حد خطرناک ثابت ہوئی۔ ٹھاکر کو پیچھوں سے اندازہ ہو گیا کہ وہ کئی ساتھیوں سے محروم ہو گیا ہے۔

''فائرنگ کرو..... مسلسل''۔ اس نے پکار کر کہا۔

احاطے میں داخل ہونے والے حملہ آوروں کو سب سے زیادہ نقصان احاطے میں پڑی ہوئی لاشوں سے ہوا۔ وہ ان لاشوں سے الجھ کر گرے۔ دوسری طرف ٹھاکر کے ساتھی سنبھل گئے تھے اور جم کر فائرنگ کر رہے تھے۔ حملہ آوروں کا جانی نقصان بہت تیزی سے ہورہا تھا۔

جمال دین کو احساس ہوا کہ پھاٹک کے قریب کھڑے حملہ آوروں نے حویلی پر دھاوا بول دیا ہے تو وہ پلٹا۔ ویسے بھی یہاں میدان صاف ہو چکا تھا۔ اسے صرف گنتی کے حملہ آور نظر آرہے تھے

وہ پھاٹک کی طرف تیزی سے لپکا کہ ٹھاکر کی مدد کو پہنچے۔ اچانک وہ ایک لاش سے الجھ کر گرا۔ قریب ہی گرے ہوئے ایک زخمی حملہ آور نے ہاتھ میں تھاما ہوا خنجر بہت تیزی سے اس کے سینے میں گھونپ دیا تھا۔

باہر اب کیرا راتھ کے دوستوں کے سوا کوئی نہیں رہا تھا۔ باقی سب لوگ راہ فرار اختیار کر چکے تھے۔ انہوں نے جمال دین کو گرتے دیکھا تو اس کی طرف جھپٹے۔ راجو نے نیزہ جمال دین کے سینے میں اتار دیا۔

مرتے وقت جمال دین کے دل میں سکون اور ہونٹوں پر کلمہ تھا۔

جمال دین کو دم توڑتے دیکھ کر انہوں نے سکون کا سانس لیا اور ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں اب صرف وہ تین تھے..... راجو، کرتار اور سورج۔

''سب بھاگ گئے''۔ سورج نے نفرت میں بھیگے لہجے میں کہا۔

''جنموت اور کھیر بھی نظر نہیں آرہے ہیں''۔ راجو بولا۔

''وہ کار نہیں ہیں۔ کام آ گئے ہوں گے''۔ کرتار نے تڑپ کر کہا۔

''اب کرنا کیا ہے؟'' راجو سورج کی طرف مڑا۔

''ادھر چلو..... اپنے ساتھیوں کے پاس''۔

وہ تینوں پھاٹک پر پہنچے اور اندر داخل ہوئے۔ دو طرفہ فائرنگ ہو رہی تھی۔ کبھی کوئی چیخ سنائی دیتی..... کبھی دوری اور کبھی نزدیک کی۔ نزدیک کی چیخ سنائی تھی کہ ان کا کوئی ساتھی کم ہوا ہے۔ جبکہ دوری چیخ ان کے لئے ایک دشمن کے کم ہونے کی نوید تھی۔

دو دس قدم ہی بڑھے ہوں گے کہ سورج چیخ مار کر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے سینے سے خون کا فوارہ ابل رہا تھا۔

''لو..... سورج بھی گیا''۔ راجو نے اداس لہجے میں کہا۔

.....x.....

''ٹھاکر جی..... میں فائرنگ کر رہا ہوں۔ آپ اندر چلے جائیں'' کرانت نے کہا۔

''میں یہیں ٹھیک ہوں''۔

''مالک، اب ہم صرف تین رہ گئے ہیں..... آپ، میں اور رنجیت''

ٹھاکر نے پہلی بار سر گھما کر دیکھا۔ کرانت ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ لیکن دشمنوں کی فائرنگ میں بھی اب زور نہیں تھا۔ اس سے لگتا تھا کہ ان کی تعداد بھی بہت کم رہ گئی ہے۔

''ٹھیک ہے۔ تم لوگ بھی اندر چلو''۔

باہر اب پسپا وہ بھرموار ہو رہا تھا۔ ان کے لئے باہر رہنا اب خطرناک ثابت ہوتا، دشمن بھی انہیں اب سائے کی طرح نظر آرہے تھے۔ ان کی تعداد دس بارہ کے لگ بھگ تھی۔

پہلے ٹھاکر اندر گیا، پھر رنجیت اور آخر میں کرانت۔

اندر روشنی ہو رہی تھی اور کیدار ناتھ اور مولوی برکت علی وہاں موجود تھے۔

''میں دروازہ سنبھالتا ہوں ان داتا''۔ کرانت نے کہا۔ ''آپ اور رنجیت کھڑکی کی اوٹ میں رہ کر فائر کریں۔ ہم انہیں ایک ایک کر کے مار گرائیں گے''۔

''ٹھاکر وہ..... باقی سب لوگ کہاں ہیں؟'' کیدار ناتھ نے پوچھا۔

''بس ہم ہی بچے ہیں''۔ ٹھاکر نے کہا۔ ''لیکن دشمن بھی زیادہ نہیں ہیں''۔

رنجیت نے ایک کھڑکی سنبھال لی تھی اور وہ کرانت دروازے سے تاڑ کر رہا تھا۔ ٹھاکر دوسری کھڑکی کی طرف چلا گیا۔

وہ ایک ایک کے حملہ آوروں کو شکار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اب باہر صرف چار سائے نظر آرہے تھے۔ اچانک ان کی حرکت کا اعتماد بڑھا دیا۔ وہ غیر محتاط ہو کر دروازے سے نکلا۔ اگلے ہی لمحے فائر کی آواز کے ساتھ وہ الٹ کر واپس آگیا۔ حملہ آور دیوار سے چپکتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ کرانت کے باہر نکلنے ہی اس نے فائر کیا۔ لیکن کرانت کی گولی ہی کام کر گئی تھی۔

اس وقت رنجیت کی توجہ کرانت کی طرف تھی۔ اسے پتا بھی نہ چلا کہ گولی اب اس کے سر میں گھس گئی۔

یہ وہ موقع تھا، جس کا کیدار ناتھ کو انتظار تھا۔ اب ٹھاکر اکیلا رہ گیا تھا۔ اب صرف ایک لمحے کی بات تھی۔ اس کے بعد کیدار ناتھ کا برسوں کا خواب پورا ہو جاتا۔

اس نے جیب سے طمنچہ نکالا۔ ٹھاکر کھڑکی کی اوٹ میں کھڑا باہر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ایک فائر کیا۔ باہر سے ایک کربہ چیخ اور کسی کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ اب صرف دشمن زندہ تھے۔

کیدار ناتھ نے طمنچہ سیدھا کیا اور ٹھاکر کے سر کا نشانہ لیا۔ یہ وہ لمحہ تھا، جب مولوی برکت علی نے اسے دیکھا وہ کیدار ناتھ سے کافی دور تھے اور گولی چلنے سے پہلے اس تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ ہم وہ اس طرف جھپٹے اور ساتھ ہی انہوں نے چیخ کر کہا۔ ''ٹھاکر جی..... عقب میں دوستوں سے ہوشیار..... ٹھاکر جی''۔

ٹھاکر ان کی چیخ سن کر پلٹا۔ اس پلٹنے نے انہیں بچالیا۔ وہ سیدھا ہوا، گولی اس کے سر کے بجائے بائیں کندھے کے نیچے سینے کے اوپری حصے میں لگی۔ اس دوران مولوی صاحب کیدار ناتھ تک پہنچ چکے تھے۔ کیدار ناتھ نے تیزی سے رخ بدلتے ہوئے مولوی صاحب پر بہت قریب سے فائر کیا۔ اس دوران ٹھاکر کو کیدار ناتھ پر گولی چلانے کا موقع مل گیا۔

کیدار ناتھ گرنے سے پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ مولوی صاحب قریب ہی گرے ہوئے تھے۔ ٹھاکر ان کی طرف بھپٹا۔ ''مولوی صاحب، اتنے کم وقت میں آپ نے کتنے احسان کر دیئے مجھ پر''۔ وہ ان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا۔

''احسان کیا ٹھاکر جی''۔ مولوی صاحب نے اٹک اٹک کر کہا۔ ''میرے غیب میں یہ سعادت کبھی تھی، مجھے تو افسوس ہے کہ آپ کو بچا نہ سکا''۔

دروازے پر آہٹ سی محسوس کر کے ٹھاکر تیزی سے گھوما اور اس نے فائر بھی کر دیا۔ اس بار گرنے والا کیدار ناتھ کے ان دو دستوں میں سے ایک تھا، جنہوں نے اکر اسے حملے سے خبردار کیا تھا۔

ٹھاکر نے پلٹ کر دیکھا تو مولوی صاحب دم توڑ چکے تھے۔ خود اس کا حال یہ تھا کہ اس کے زخم سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور دروازے کے عین سامنے دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کے ذہن میں صرف دو باتیں تھیں، ایک تو یہ کہ باہر ایک حملہ آور ابھی موجود ہے اور اسے دھوکے لگاتا ہے، دوسری ایک خواہش تھی۔ کم از کم اپنے بیٹے کے آنے تک وہ زندہ رہے اور اس کے لئے وہ دعا بھی کر سکتا تھا۔

طلوع آفتاب کا وقت تو ابھی دور تھا۔ لیکن صبح ہو رہی تھی اور خون پینے کی وجہ سے ٹھاکر کو شدید کمزوری ہو رہی تھی۔ اس پر غشی کی کیفیت طاری ہونے لگتی تو وہ ہاتھ سے اپنے سینے کے زخم کو دبوچ لیتا۔ تکلیف اسے ہوش میں لے آتی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ آخری حملہ آور آئے تو وہ غشی میں ہو اور حملہ آور کا نشانہ بن جائے، وہ بیٹھے تھے اس آخری حملہ آور کا منتظر تھا۔

.....☆.....

دن چڑھ چکا تھا۔ گاؤں کے وہ لوگ جنہوں نے لڑائی میں حصہ نہیں لیا تھا، محض اس فاتح حملہ آوروں کی واپسی کے منتظر تھے۔ انہیں واپس جاتا دیکھتے تو وہ گاؤں واپس جاتے۔

''بہت دیر ہوگئی۔ اب تک تو انہیں آجانا چاہئے تھا''۔ رمیش نے کہا۔

''وہ لوگ لوٹ مار کر رہے ہوں گے''۔ ہردیال بولا۔

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''ایسا تو نہیں کہ وہ سب ختم کر دیئے گئے ہوں''۔ پوار نے کہا۔

''کیا بات کرتے ہو۔ وہ سینکڑوں تھے''۔ یشونت نے تڑپ کر کہا۔ وہ وہاں موجود لوگوں میں سب سے زیادہ با اثر تھا۔

''پر اپنے ٹھاکر جی تو شیر ہیں شیر''۔ پوار کے لہجے میں ستائش تھی۔

''کچھ بھی ہو، اب ہمیں گاؤں جانا ہی ہوگا''۔ یشونت نے کہا۔

''ٹھاکر جی کو کیا منہ دکھائیں گے''۔ رامو بولا۔

بہت سے لوگ شرمندہ نظر آنے لگے۔ ''سچ ہے، ہم نے بہت برا کیا''۔ بہت سی آوازیں ابھریں۔

''برا ہم نے نہیں کیا، چھوٹے ٹھاکر نے کیا ہے''۔ یشونت نے بھڑکتے لہجے میں کہا۔ ''ٹھاکر اور چھوٹا ٹھاکر بھگوان کے دوشی ہیں۔ انہوں نے مندر کا اپمان کیا۔ شرم انہیں آنی چاہئے۔ اب ایک بات طے کر لو، اگر اپنے گاؤں کو بھگوان کے شراپ سے بچانا ہے تو ہمیں اپرادھیوں کو سزا دینی ہوگی۔ ٹھاکر اور چھوٹا ٹھاکر اگر زندہ ہیں تو ہم انہیں ختم کر دیں گے''۔

اس پر وہاں ہلچل مچ گئی۔ ٹھاکر کی سب عزت کرتے تھے، وہ تو ٹھاکر کا ساتھ نہ دینے پر شرمندہ ہو رہے تھے، اتنے بڑے اقدام کی..... ٹھاکر کے خلاف بغاوت کی تائید کیسے کر سکتے تھے، لیکن ان کے دلوں میں یہ خوف بہر حال تھا کہ اوتار سنگھ نے بہت برا کیا ہے اور ان پر بھگوان کا شراپ آ کر رہے گا، وہ اودلی کا شکار ہو رہے تھے۔

یشونت نے ان کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھایا۔ وہ دھرم کے حوالے سے انہیں اکساتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ ''اور سوچو، ٹھاکروں کے ختم ہونے کے بعد جو زمین جس کے پاس ہے، وہ اسی کی ہوگی، وہ مالک ہوگا اس زمین کا''۔

زمین کا خواب بہت بڑا تھا، سب کی وفاداری ڈول گھما۔

یشونت نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''سوچو، ہم سب سے زیادہ وہ اس لئے جمال دین کی عزت کرتا تھا۔ اسے برابری کا درجہ دیتا تھا، اس کے بیٹے کو یہ سب کچھ تو کرنا ہی تھا''۔

خاصی بحث و تمحیص کے بعد بالآخر سب قائل ہو ہی گئے۔ یشونت جانتا تھا کہ ان میں سے بہت سے ٹھاکر کے خلاف ہتھیار نہیں اٹھا سکیں گے۔ لیکن کچھ لوگ تو اس کا ساتھ بہر حال دیں گے۔ اسے یقین تھا کہ اول تو ٹھاکر زندہ ہی نہیں ہوگا اور ہوا بھی تو اس کے ساتھ دو چار لوگ ہی ہوں گے۔

وہ گاؤں کی طرف چلنے کا ارادہ ہی کر رہے تھے کہ رمیش نے کہا۔ ''میرا خیال ہے، سے نکل چکا۔ اب تو بھگوان کا شراپ ہی جھیلنا ہوگا''۔

''کیا مطلب؟'' یشونت نے پوچھا۔

''آسمان کو دیکھ لو''۔

انہوں نے دیکھا۔ آسمان سرخ ہو رہا تھا اور ہوا ساکت تھی۔

''میرے پتا جی نے جو نشانیاں بتائی تھیں، ان کے مطابق یہ سرخ آندھی ہے۔ اب کچھ بھی نہیں رہے گا، سب ختم ہو جائے گا''۔ رمیش کی آواز لرز رہی تھی۔

''چلو..... گاؤں کی طرف چلو، اپنے گھروں تک تو پہنچو اور موقع ملے تو ٹھاکر کو ختم کر دو۔ شراپ ٹل جائے گا''۔

وہ گاؤں کی طرف چل دیئے۔

.....☆.....

اوتار سنگھ سے بیگ لٹکائے تیز قدموں سے بڑھ رہا تھا۔ اسے پریشانی بھی تھی اور تشویش بھی کہ گاؤں کے باہر زمینوں پر کوئی کام کرتا نہیں دکھائی دے رہا تھا، یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔

وہ گاؤں کی حد میں داخل ہوا تو اس کی تشویش اور بڑھ گئی۔ وہاں ہر طرف سناٹا تھا۔ زندگی کے آثار ہی نہیں تھے، پھر اس کی نظر فضا میں چکراتی ہوئی چیلوں پر پڑی اور وہ جگہ وہ تھی جہاں اس کے اندازے کے مطابق حویلی تھی۔

اوتار سنگھ کا دل چاہ رہا تھا کہ پہلے اماں کے پاس جائے اور انہیں وہ چادر دے جو وہ ان کیلئے جے پور سے لایا تھا، لیکن گاؤں میں قدم رکھتے ہی اس کا دل اندیشوں سے بوجھل ہو گیا تھا۔ کوئی نامعلوم حس اسے بتا رہی تھی کہ گاؤں میں کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہوئی ہے۔

اس احساس کے ساتھ اس کے قدم تیز ہو گئے، اس کا رخ حویلی کی طرف تھا۔

حویلی نظر آئی تو اس کا دل گویا اچھل کر حلق میں آ گیا۔ پھاٹک کے سامنے لاشیں ہی لاشیں تھیں، اب وہ تقریباً بھاگ رہا تھا، لاشوں کو پھلانگتے ہوئے وہ انہیں دیکھ کر پہچاننے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ لیکن وہ سب اس کیلئے اجنبی تھے۔ پھر اسے ان میں ایک جانی پہچانی لاش نظر آئی..... سندر داس کی لاش!۔

وہ پھاٹک سے گزرا۔ احاطہ بھی لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔ اب بھاگنا ممکن نہیں تھا، لاشوں کے اس ڈھیر میں اسے شناسا چہرے بھی نظر آ رہے تھے، پھر ایک لاش دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا۔ اس کے حلق سے چیخ نکلی۔ ''ویر جی''۔ اور وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

''ویر جی، ویر جی''۔ وہ اسے ہلا رہا تھا۔

لیکن وصال دین کے سینے میں بہت گہرا زخم تھا۔ خون اب جم کر سیاہ ہو چکا تھا۔ یہ جاننے کے لئے کہ وہ مر چکا ہے، اسے ٹٹولنے کی ضرورت نہیں تھی، لگتا تھا، وقت ٹھہر گیا ہے، وہ وصال دین کا سر اپنے زانو پر رکھے بیٹھا تھا۔ اس کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ''یہ کیا ہو گیا ویر جی، یہ کیا ہو گیا''۔ وہ بڑبڑا رہا تھا اور اسے اس کا احساس بھی نہیں تھا۔

پھر ایک چیل نیچے آ کر جھپٹی تو وہ چونکا۔ اس نے بڑی نرمی اور آہستگی سے وصال دین کا سر زمین پر رکھ دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ ویر جی کی کوئی مدد نہیں کر سکتا اور اسے جلد سے جلد دوسروں کی خبر لینی ہے۔

سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے ہوئے اسے کئی جانے پہچانے چہرے نظر آئے، وہ سب مر چکے تھے اور ان میں چاچا جمال دین بھی تھا۔

وہ آگے بڑھ گیا۔ وہ حویلی کے اندر کی صورت حال جاننے کے لئے بے تاب ہو رہا تھا۔

حویلی کا صدر دروازہ کھلا تھا۔ عین دروازے پر اندر کی جانب دو لاشیں پڑی تھیں۔ وہ انہیں نہیں جانتا تھا۔ لیکن اندر کے منظر نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ سامنے دیوار سے ٹک کر پتا جی بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے خون کا چھوٹا سا تالاب تھا۔ ان کے قریب ہی مولوی برکت علی اور چاچا کیدار ناتھ تھے، وہ دونوں مر چکے تھے۔

چند لمحے وہ ساکت کھڑا وہ منظر دیکھتا رہا۔ اس وقت بس ایک ہی بات اچھی لگ رہی تھی۔ پتا جی زندہ تھے، ان کے سینے کا زیر و بم ان کی زندگی کا ثبوت تھا۔ ان کی آنکھیں مندی ہوئی تھیں اور وہ غشی کی حالت میں تھے۔

''پتا جی!'' اس نے انہیں پکارا۔ اپنی آواز خود بھی اسے اجنبی لگی۔

ٹھاکر نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے ہونٹ لرزے۔ لیکن کوئی آواز نہ نکلی۔

اوتار سنگھ نے اپنا بیگ ایک طرف رکھا اور اس کی طرف لپکا۔

ٹھاکر بہت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے نیم جاں ہو رہا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھائے، باہیں پھیلائیں۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس کے دونوں ہاتھ بے جان ہو کر پہلو سے جا ملے۔

اوتار سنگھ نے اسے لپٹا لیا۔ ''یہ..... یہ سب کیا ہو گیا پتا جی؟''

ٹھاکر کے ہونٹ ہلے۔ کمزور سی آواز ابھری۔ لفظ بھی ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔ ''وہ..... جے پور..... جے پور..... والے.....''

اوتار سنگھ کو بات سمجھنے کے لئے کسی دانش کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سب سمجھ گیا تھا۔ ''آپ..... آپ ٹھیک ہو جائیں گے پتا جی''۔

ٹھاکر نے نقاہت سے سر ہلایا۔ سر کی وہ جنبش اس کی ناتوانی کی گواہ تھی۔ اس نے اشارے سے کان قریب لانے کو کہا۔ اوتار سنگھ کان اس کے ہونٹوں کے پاس لے گیا۔ ''میں بس..... تمہارے..... زندہ.....'' ٹھاکر سے جملہ پورا نہیں کیا جا رہا تھا۔ ''مجھے..... بہت باتیں..... پرنتو..... سمے..... نہیں.....''۔

''بولیں..... بولیں پتا جی''۔

''تہ خانے..... سب تمہارا..... دہلی جا..... پڑھو..... یہاں..... نہیں''۔

ٹھاکر اٹک اٹک کر کہے جا رہا تھا۔ اوتار سنگھ کی سمجھ میں سب کچھ آ رہا تھا۔ ''سچ کہنا..... بت تم..... نے..... توڑنے.....؟''

اوتار سنگھ صرف ایک لمحے جھکا۔ پھر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''جی پتا جی''۔

(جاری ہے)

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

ٹھاکر کی آنکھیں چمکیں۔ پھر بڑی کوشش کر کے اس نے اوتار سنگھ کا ماتھا چوم لیا۔ ''اب میں..... سکون..... مر.....''۔

ٹھاکر ہانپنے لگا۔ چند لمحے خاموش رہ کر بولا۔ ''بڑی بات..... تم سے..... سے نہیں..... جلانا نہیں..... دفن کرنا.....''۔

اتنا تو اوتار سنگھ کی سمجھ میں آ گیا کہ پتا جی اسے کوئی بڑی اور اہم بات بتانا چاہتے تھے۔ لیکن ان سے بولا نہیں جا رہا ہے، بعد کی بات میں تھوڑی الجھن تھی۔ شاید وہ چاچا جمال دین اور ویر جی کے بارے میں کہہ رہے تھے۔ شاید نہیں..... یقیناً یہی بات ہے۔

اسی لمحے ٹھاکر کی نظریں باہر آسمان پر پڑیں۔ اس کی نگاہوں میں چوکنا پن آ گیا۔ ''اوتا..... لال آندھی..... سب ختم..... تم جاؤ..... میرا حکم..... جاؤ.....''۔ لفظ اس کے ہونٹوں پر ٹوٹ گئے۔ ''تہ خانہ چھوڑ..... جاؤ..... میرا حکم.....''۔ اب اس کے ٹوٹے ہوئے لہجے میں بے تابی اور تحکم تھا۔ ''مت رکو..... جاؤ.....''۔

''میں جاؤں گا، آپ ٹھیک ہو جائیں۔ میں آپ کا حکم مانوں گا''۔ اوتار سنگھ نے کہا۔

ٹھاکر زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگا۔ اس کے ہونٹ بے آواز ہل رہے تھے۔ پھر ایک جھٹکا لگا اور سب کچھ ساکت ہو گیا۔

اوتار سنگھ پتھرائی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔ ٹھاکر مر چکا تھا۔ اب اوتار سنگھ کو صرف اس کے حکم کی تعمیل کرنی تھی۔ اس نے باپ کے پاؤں چھوئے۔ پھر اٹھا اور مولوی صاحب کے پاؤں چھوئے۔ ''آپ سے تو مجھے بہت کچھ سیکھنا سمجھنا تھا''۔ وہ بڑبڑایا۔

جانے سے پہلے وہ ٹھاکر کے جسم پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کلمہ پڑھتا رہا، جیسے اسے پاک کر رہا ہو۔

پھر وہ نکل آیا۔ باہر ہوا بند تھی، ہر طرف خوف ناک سکوت تھا اور آسمان سرخ ہو رہا تھا۔ اسے یاد آیا۔ پتا جی نے کہا تھا..... لال آندھی اور انہوں نے اسے چلے جانے کا حکم دیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ تہ خانے جا کر کچھ رقم لے لے، لیکن پتا جی کا آخری حکم ماننا زیادہ ضروری تھا۔

وہ تیز قدموں سے چلنے لگا۔ اچانک اسے اماں کا خیال آیا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اماں سے ملے بغیر چلا جائے، بلکہ وہ اماں کو ساتھ لیکر جائے گا۔ اس نے اپنا رخ ویر جی کے گھر کی طرف کر لیا۔

یہ دیکھ کر اسے حیرت ہوئی کہ اماں ایک پوٹلی ہاتھ میں لئے دروازے پر کھڑی ہیں۔ وہ جا کر ان سے لپٹ گیا۔ ''اماں..... چاچا اور ویر جی.....''۔

''مجھے پتا ہے، وہ شہید ہو گئے''۔ حمیدہ کے لہجے میں طمانیت اور ٹھہراؤ تھا۔ اس نے نرمی سے اوتار سنگھ کو خود سے علیحدہ کیا۔ ''وقت نہیں ہے بیٹے۔ تمہیں فوراً یہاں سے نکل جانا ہے''۔

اوتار سنگھ کو حیرت ہوئی۔ اماں بھی وہی کہہ رہی تھیں، جو پتا جی نے کہا تھا۔

''یہ پوٹلی لو اور فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ لال آندھی آ رہی ہے''۔

اوتار سنگھ نے پوٹلی لی۔ ''اس میں کیا ہے اماں''؟

''شہر پہنچ کر دیکھ لینا۔ وقت ضائع نہ کرو۔ جاؤ..... چلے جاؤ''۔

''اماں..... میں تو تمہیں لے کر جاؤں گا''۔

''میں نہیں جا سکتی بیٹے''۔

''تو میں بھی نہیں جاؤں گا''۔ اوتار سنگھ بچوں کی طرف پھل گیا۔ ''اب تمہارے سوا کون بچا ہے میرا۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا''۔

''دیکھ اوتار سنگھ، میری بات غور سے سن۔ تجھے شہر جانا ہے اور پڑھائی پوری کئے بغیر واپس نہ آنا''۔ وہ پہلا موقع تھا کہ حمیدہ کے لہجے میں اوتار سنگھ کے لئے سختی اور تحکم تھا۔

''میں تمہیں چھوڑ کر کیسے جاؤں اماں، میں تمہیں نہیں کھونا چاہتا''۔

''اللہ کی جو مرضی۔ بندے کا کام تو صرف قبول کرنا ہے''۔ حمیدہ کا لہجہ اور سخت تھا۔ ''اور تو تو سدا کا فرماں بردار ہے۔ میری بات کیوں نہیں مانتا۔ میں ماں ہوں تیری، اور پہلی بار تجھے حکم دے رہی ہوں''

حمیدہ کی یہ بات سن کر اوتار سنگھ مکھن کی طرح پگھل گیا۔ ''میں مانوں گا اماں۔ ضرور مانوں گا''۔

''وقت نہیں ہے۔ تجھے یہاں سے بھاگنا ہے، یہاں آفت آنے والی ہے.....''۔

''تو اماں تم.....''۔

''میں نہیں جا سکتی اوتار سنگھ۔ یہاں تیری کچھ امانتیں ہیں، ان کی رکھوالی کرنی ہے مجھے، یہ میرا وعدہ ہے، تو جب بھی واپس آئے گا، میں انشاء اللہ تجھے یہاں ملوں گی۔ تیری امانتیں تجھے دوں گی، میرا رب مجھے امانت واپس دیئے بغیر نہیں مرنے دے گا۔ اب تو جا''۔

اور اوتار سنگھ کے دل کو جیسے قرار آ گیا۔ وہ حمیدہ سے لپٹ گیا۔ ''ٹھیک ہے اماں، میں جا رہا ہوں''۔

حمیدہ نے اسے ذرا ہٹایا اور اس کی پیشانی چوم لی۔ ''جا بیٹا..... رب راکھا''۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''اب بھاگ کر جانا اور بج تک طاقت ہو، بھاگتے رہنا، رکنا نہیں''۔

اس کے لہجے میں کوئی بات تھی، جو اوتار سنگھ کو اس کے کہنے پر لفظ بہ لفظ عمل کرنے پر اکسا رہی تھی۔ اس نے پوٹلی سینے سے لگائی اور بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ پوری طاقت سے بھاگ رہا تھا۔ لیکن پلٹ پلٹ کر اماں کو دیکھ رہا تھا، جو اب بھی وہیں کھڑی تھی۔

پھر وہ مڑا اور اماں اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

وہ دوڑتا رہا..... دوڑتا رہا، اچانک اسے تبدیلی کا احساس ہوا۔ پہلے ہوا بالکل بند تھی اور فضا پر خوف ناک سکوت طاری تھا۔ مگر اب وہاں کی سنسناہٹ سنائی دے رہی تھی لگتا تھا کہ ہوا چل رہی ہے اور ہر لمحہ تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے، لیکن ایسا بس لگتا تھا۔ ہوا چلتی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ بلکہ اسے سانس لینے میں بھی دشواری ہو رہی تھی۔ بھاگنے کی وجہ سے وہ ہانپ رہا تھا، مگر اب بھاگنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ منہ کھول کر پھیپھڑوں میں ہوا کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر وہاں تو ہوا جیسے تھی ہی نہیں۔ سینے میں جیسے آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ زمین پر بیٹھ گیا اور سانس لینے کی کوشش کرتا رہا۔

ہوا کی سنسناہٹ اب شور میں تبدیل ہو گئی تھی اور وہ شور بھی بڑھتا جا رہا تھا، اوتار سنگھ حیران تھا کہ اس سے تو سانس بھی نہیں لی جا رہی ہے۔ ہوا ہے کہاں؟ اور ہوا نہیں تو ہوا کا یہ شور کیسا ہے؟

بیٹھے بیٹھے اس نے پلٹ کر دیکھا اور دہل کر رہ گیا۔ وہ منظر ہی ایسا تھا۔ اس لمحے کے بعد وہ اس منظر کو کبھی بھول نہیں سکا۔

اسے اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہ اتفاقیہ دوڑا ہے، اور اتنا دور نکل آیا ہے، گاؤں کے تو آثار بھی نہیں تھے، وہ بہت پیچھے رہ گیا تھا، اور اب وہ اندازہ ہی لگا سکتا تھا کہ گاؤں وہاں ہے۔

اور اوپر آسمان پر، جہاں اس کے اندازے کے مطابق اس کا گاؤں تھا، گاؤں سے بیس گنا بڑے حجم کا ایک سرخ بگولہ دھیرے دھیرے گھومتا ہوا نیچے اتر رہا تھا۔ وہ زمین سے بس کچھ ہی فاصلے پر تھا۔

اسے اماں کی بات یاد آئی۔ اماں نے کہا تھا..... رکنا نہیں، چلتے رہنا۔ وہ اٹھا اور چلنے لگا۔ اگرچہ ایک قدم اٹھانا بھی دوبھر ہو رہا تھا، وہ اٹھا اور آگے بڑھتا رہا۔ ہوا کی سنسناہٹ اب مہیب شور میں تبدیل ہو گئی تھی۔

پھر اچانک وہ شور ایک دھماکے میں تبدیل ہو گیا۔ اس لمحے اس کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ گرا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کی، مگر وہاں دیکھنے کو کچھ بھی نہیں تھا، آسمان سے جیسے خشک خون برس رہا تھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں بھر گیا۔ اس نے گھبرا کر سر جھکا لیا اور آنکھیں صاف کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن دیر تک وہ کچھ دیکھنے کے قابل نہیں ہوا۔

چند لمحوں میں اسے احساس ہوا کہ آسمان سے ریت برس رہی ہے اور وہ دب رہا ہے۔ دہشت اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ اماں نے کہا تھا..... یہاں آفت آنے والی ہے..... اور اماں نے کہا تھا..... اب بھاگ کر جانا اور جب تک طاقت ہو، بھاگتے رہنا، رکنا نہیں۔

اب اس کی سمجھ میں اماں کی کہی ہوئی ہر بات کی اہمیت آ گئی۔ اس نے سمجھ لیا کہ اگر وہ بیٹھا رہا تو زندہ ریت میں دفن ہو جائے گا۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی، لیکن لگتا تھا کہ ریت نے اسے جکڑ لیا ہے۔ اس سے ہلا بھی نہیں جا رہا تھا، بے بسی کے احساس نے اسے شل کر کے رکھ دیا۔ وہ ہانپ رہا تھا اور سانس کے ساتھ ریت اندر جا رہی تھی، دم گھٹنے لگا تھا اور سانس لینا ناممکن ہوا جا رہا تھا۔

اس نے سمجھ لیا کہ اب وہ بچ نہیں سکتا۔ اچانک اس بے بسی میں بے ساختہ اس کے ہونٹوں پر کلمہ پہلا..... لا الہ الا اللہ..... اور جیسے ریت نے اسے اپنی آ ہنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ سرخ ریت کے سمندر میں تیر رہا ہے، کچھ بھی دیکھنا ممکن نہیں تھا اور ایسے میں سمت کا احساس بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بس اسے اتنا خیال تھا کہ اسے ہوا کی مخالف سمت میں چلنا ہے۔ ہوا کے ساتھ ہوا کے رخ پر جائے گا تو ریت میں دفن ہونا مقدر بن جائے گا۔

نجانے کتنی دیر وہ اندھا دھند ہوا سے لڑتا آگے بڑھتا رہا۔ کلمہ زبان سے ادا کرنے کی تو اس میں طاقت نہیں تھی، البتہ دل میں وہ اسے پڑھے جا رہا تھا اور آگے بڑھتا ہوا ہر قدم اذیت ناک تھا۔

اس کی آنکھیں بند تھیں، اچانک اسے احساس ہوا کہ شور اور ہوا کا دباؤ بتدریج کم ہو رہا ہے..... کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے آنکھیں کھولیں، مگر اب بھی وہ کچھ دیکھنے کے قابل نہیں تھا، پھر بھی وہ بڑھتا رہا، ہر قدم پر کم ہوتے شور اور ہوا کے دباؤ نے اسے احساس دلا دیا تھا کہ وہ عافیت کی طرف بڑھ رہا ہے۔

پھر اچانک فضا پر سکون ہو گئی۔ اس کی ٹانگیں جواب دے رہی تھیں، وہ بیٹھ گیا۔ اسے احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ میں اماں کی دی ہوئی پوٹلی ہے۔ دوسرے ہاتھ سے وہ آنکھیں مسل رہا تھا، بالآخر دھندلا دھندلا سہی، اسے کچھ نظر آنے لگا۔

وہ سڑک کے قریب تھا اور دور سے ایک گاڑی آتی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ بڑھا، سڑک کے کنارے پہنچ کر اس نے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ گاڑی کی رفتار کم ہونے لگی.....

.....☆.....

اسے یاد نہیں کہ وہ گھر کیسے پہنچا اور وہ گھر پہنچا تو رگھو اور رنجنا پریشان ہو گئے۔ اس کا جسم بخار میں پھنک رہا تھا، اس کا سر اور تمام کپڑے سرخ ریت سے اٹے ہوئے تھے اور وہ ایک پوٹلی کو سینے سے دبوچے ہوئے تھا۔

رنجنا نے نیچے جا کر بتایا تو بہادر علی اور چھمن بوا اوپر آ گئے، انہوں نے گیلے کپڑے سے اس کا سر اور چہرہ صاف کیا۔ بخار بہت تیز تھا، وہ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتے بدلتے رہے، صبح کاذب کا وقت اس کا بخار اتر گیا۔ پھر وہ بے خبر سو گیا۔

دن چڑھے اس کی آنکھ کھلی۔ رنجنا اس کے سرہانے بیٹھی تھی۔ وہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ مگر فوراً ہی اسے کمزوری کا احساس ہونے لگا۔ ''میں..... میں یہاں کیسے پہنچا؟''

رنجنا کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ''آپ کا بہت برا حال تھا مالک۔ ساری رات بخار رہا ہے''۔

اوتار سنگھ کو اچانک سب یاد آ گیا۔ وہ خواب تھا یا..... اس کا ذہن الجھنے لگا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

اسی لمحے اسے اپنے کپڑوں پر اور بستر پر سرخ ریت نظر آئی۔ وہ گھبرا کر بستر سے اتر کر کھڑا ہو گیا تو وہ خواب نہیں تھا.....خوفناک حقیقت.....! اس کے ساتھ ہی اسے سب کچھ یاد آنے لگا۔

''میرے پاس ایک پوٹلی تھی''۔ وہ بولا۔

''ہاں مالک۔ میں نے رکھ دی ہے سنبھال کر۔ ابھی لاتی ہوں''

رنجنا اٹھی ہی رہی تھی کہ باہر سے کسی نسوانی آواز نے پکارا۔ ''رنجنا.....اور رنجنا.....''۔

''ارے.....نیچے والی بیگم صاحبہ ہیں''۔ رنجنا باہر لپکی۔

اوتار سنگھ اب سوچ رہا تھا کہ پوچھنے والوں کو کیا بتائے گا.....اور کس حد تک بتانا مناسب ہوگا۔ یہ تو وہ سمجھ گیا تھا کہ پوری حقیقت بتانا بے حد خطرناک ہے۔ سوال یہ تھا کہ جو کچھ وہ چھپائے گا، وہ بتانے کے لئے اور بہت لوگ بھی تو موجود ہیں۔ تب کیا ہوگا۔

وہ ان سوچوں میں الجھا ہوا تھا کہ رنجنا پوٹلی لئے اندر آئی۔ ''یہ لیجئے چھوٹے ٹھاکر''۔ اس نے اماں کی دی ہوئی پوٹلی اس کی طرف بڑھائی۔ ''اور وہ نیچے والی بیگم صاحبہ آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں''

اوتار سنگھ گھبرا گیا۔ یہ بھی ایک غیر معمولی بات تھی۔ کہیں انہیں.....''جی.....جی ماں جی؟''۔

''ہم تمہارے دکھ میں برابر کے شریک ہیں بیٹا''۔ دروازے کی اوٹ سے شفیق نسوانی آواز سنائی دی۔

اوتار سنگھ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس دکھ کی بات کر رہی ہیں۔

''ہم جانتے ہیں کہ تم اپنا سب کچھ کھو کر آئے ہو''۔ بیگم صاحبہ کہہ رہی تھیں۔ ''یہ دکھ بہت بڑا ہے۔ مگر بیٹے، اللہ میری دیتا ہے آدمی کو۔ تمہیں بھی صبر آجائے گا۔ دیکھو بیٹے، اللہ کی مرضی کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ یہ اس کا کرم ہے کہ تم زندہ سلامت بچ کر نکل آئے۔ اب اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔ اور ہم سے کوئی تکلف نہ کرنا۔ کچھ لینا کہ ان لوگوں کے بدلے میں ہم لوگ تمہیں مل گئے ہیں''۔

اوتار سنگھ حیران تھا۔ ''آ.....آپ کو یہ سب کیسے معلوم؟''۔

''اخبار میں چھپا ہے۔ ٹھاکروں کی گڑھی تھا تمہارے گاؤں کا نام؟''۔

''جی.....جی ہاں''۔

''وہ اور اس علاقے کے دس گاؤں سرخ آندھی نے تباہ کر ڈالے۔ لوگ زندہ دفن ہو گئے۔ کسی گاؤں کا نشان تک نہیں رہا''۔

اوتار سنگھ کے جسم میں سنسنی دوڑنے لگی۔ سب کچھ ساری دنیا کو معلوم ہو گیا۔ ''اخبار ہوگا آپ کے پاس؟''۔ اس نے کہا۔

''جی۔ رنجنا، یہ اخبار چھوٹے ٹھاکر کو دے دو''۔

رنجنا گئی اور اس نے اخبار لا کر اوتار سنگھ کو دیا۔

''اور بیٹے، جو کچھ میں نے کہا ہے، رسماً نہیں کہا ہے۔ یہ گھر تمہارا گھر ہے اور ہم سب لوگ تمہارا خاندان۔ اب میں چلتی ہوں''

اوتار سنگھ کا دل تشکر سے بھر گیا۔ کتنی پیاری، نرم دل اور دردمند خاتون ہیں یہ نیچے والی۔ اس نے سوچا۔ پھر وہ اخباری طرف متوجہ ہو گیا۔

سرخ آندھی اور اس کی تباہی کی خبر اخبار کے پہلے صفحے پر چھپی تھی۔ اخبار کے مطابق گیارہ گاؤں ریت کے نیچے دفن ہو گئے تھے۔

لیکن پورا اخبار چھاننے پر بھی اسے جے پور کے بارے میں کوئی خبر نظر نہیں آئی۔ نہ ہی کوئی ایسی خبر تھی کہ جے پور سے لوگوں کی بھاری تعداد ٹھاکروں کی گڑھی پر حملہ کرنے گئی تھی۔ وہ معاملہ کیسے دبا ہوا ہے، یہ اوتار سنگھ کی سمجھ سے باہر تھا۔

بہرحال اس نے ایک بات سمجھ لی۔ قدرت اس معاملے کو راز رکھنا چاہتی ہے تو اسے بھی زبان کھولنے سے گریز کرنا ہوگا۔

اس نے اخبار ایک طرف رکھا اور اماں کی دی ہوئی پوٹلی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

پوٹلی کھول کر وہ حیران رہ گیا۔ اس میں بہت سارے..... بہت سارے روپے تھے اور ان کے نیچے بہت بھاری، سونے کے زیورات!

اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ حویلی سے خالی ہاتھ نکلا تھا اور اماں..... پر یہ سب کچھ لے کر اس کا انتظار کر رہی تھیں تاکہ پردیس میں وہ مفلسی سے ہمیشہ محفوظ رہے۔

اس نے ایک بار پھر رقم کو اور زیورات کو دیکھا۔ وہ اتنا کچھ تھا کہ ساری زندگی عیش سے گزاری جا سکتی تھی!

.....x.....

سانحہ جتنا بڑا ہو، اس کا اثر اتنی ہی دیر تک رہتا ہے۔ یہاں سانحہ بہت بڑا تھا۔ لیکن اس حد تک افسانوی تھا کہ جھوٹ اور شواہد کی موجودگی کے باوجود بار بار محض ایک ڈراؤنا خواب لگنے لگتا تھا۔ مگر پھر جھوٹ سامنے آتے اور وہ حقیقت نظر آنے لگتا۔

چند روز وقت کے ساتھ اس آنکھ مچولی میں گزرے تو اوتار سنگھ نے تسلیم کر لیا کہ وہ خواب نہیں تھا، حقیقت تھی۔ لیکن جو کچھ ہو چکا تھا، جو کچھ وہ دیکھ چکا تھا، اسے قبول کرنے کے لئے اور وقت درکار تھا۔ آدمی بڑے المیوں کو بتدریج قبول نہ کرے تو پاگل ہی ہو جائے۔

چوتھے دن اوتار سنگھ مولوی برکت علی کے گھر گیا۔ مولوی صاحب کا بڑا لڑکا اس کا ہم عمر ہی تھا۔ اوتار سنگھ چلا تو گیا۔ مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کہنا کیا ہے اور بات کہاں سے شروع کرنی ہے۔

''میرا نام اوتار سنگھ ہے''۔ اس نے کہا۔

''جی..... بابا آپ کا بہت تذکرہ کرتے ہیں۔ بڑی تعریف کرتے ہیں آپ کی''۔

''بس ان کی محبت ہے''۔

''لیکن بابا تو آپ کے گاؤں گئے ہیں۔ کہہ رہے تھے، چٹھیوں میں آپ کو پڑھاتا ہے''۔ لڑکے کے لہجے میں الجھن تھی۔ ''آپ گاؤں نہیں گئے؟''۔

''میں گیا تھا۔ تین دن پہلے واپس آیا ہوں''۔ اوتار سنگھ نے کہا۔ پھر چند لمحے توقف کے بعد اٹک اٹک کر بولا۔ ''میں کوئی اچھی خبر نہیں لایا ہوں''۔

لڑکے کا چہرہ فق ہو گیا۔ تاہم اس نے کہا کچھ نہیں۔ سوالیہ نظروں سے اوتار سنگھ کو تکتا رہا۔

اوتار سنگھ اس مرحلے سے خوف زدہ تھا۔ پیغام رسانی کے لئے بالکل نئی..... اور بہت بڑی تھی۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ بڑا ہو گیا ہے..... بہت بڑا۔ جبکہ وہ ذہنی طور پر اس کے لئے تیار نہیں تھا۔ مگر یہ چیز اس کی فطرت میں تھی کہ وہ ذمے داری سے منہ موڑنے والا نہیں تھا۔

چند لمحے وہ کچھ کہنے کے لئے حوصلہ مجتمع کرتا رہا۔ لیکن ایک نوجوان لڑکے کو یہ بتانا کہ اس کا باپ مر چکا ہے، آسان کام نہیں تھا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ اسے لفظ نہیں مل رہے تھے۔

اس وقت کے لئے وہ اخبار ساتھ لایا تھا۔ اس نے لڑکے کی طرف اخبار بڑھا دیا۔

لڑکا اب ابھی اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شاید اخبار کی طرف دیکھنے کا اسے حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔

''یہ خبر پڑھیں..... سرخ آندھی والی''۔ اوتار سنگھ نے اشارہ کیا

لڑکے نے اخبار کھولا اور خبر پڑھنے لگا۔ چند لمحے بعد اس نے سر اٹھا کر اوتار سنگھ کو دیکھا۔ ''کوئی بھی نہیں بچا؟''۔

''اخبار میں تو یہی لکھا ہے۔ گیارہ گاؤں یوں ختم ہو گئے، جیسے تھے ہی نہیں''۔

''لیکن..... لیکن آپ.....؟''۔

اوتار سنگھ سمجھ گیا کہ لڑکا اس سے کیا پوچھنا چاہتا ہے۔ یہ وہ مرحلہ تھا، جہاں اسے متاثر ہونا تھا۔ وہ پوری حقیقت نہیں بتا سکتا تھا۔ وہ اسے یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ آندھی آنے سے پہلے وہ حویلی پہنچا تھا تو مولوی صاحب شہید ہو چکے تھے۔ اور انہیں گولی لگی تھی۔ وہ یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ وہاں گیا بھی تھا۔

''میں تاج محل دیکھنے آگرہ چلا گیا تھا''۔ اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''اوپر والے کو میری زندگی منظور تھی''۔

دیکھتے ہی دیکھتے لڑکے کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔ لیکن اس کی آنکھیں چھلکی نہیں۔ وہ ضبط کر رہا تھا۔ اس نے نارمل سے بلند آواز میں کہا۔ ''اللہ والا الیہ راجعون''۔

وہ جملہ عربی میں تھا۔ اوتار سنگھ کو سمجھ نہیں آیا تھا۔ ورنہ وہ عربی ابھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ اس نے سنا، ذہن میں دہرایا اور ترجمہ کرنے لگا۔ بے شک ہم اللہ کے ہیں اور ہمیں اسی طرف جانا ہے۔ وہ سمجھ کر رہ گیا۔ یہ کیسا صبر دینے والا جملہ ہے!

لڑکے نے اسے چونکا دیا۔ ''میں امی کو یہ خبر کیسے سناؤں گا''۔

اوتار سنگھ کو جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ اسی وقت اندر کی جانب کھلنے والے دروازے سے نسوانی آواز سنائی دی۔ ''صادق علی، ذرا بیساں آئیے''۔

''میں ابھی آتا ہوں''۔ لڑکے نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا اور دروازے سے اندر چلا گیا۔

ایک منٹ بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ ٹرے پر شربت کا ایک جگ اور دو گلاس تھے۔ اس نے ٹرے میز پر رکھی اور دونوں گلاسوں میں شربت انڈیلا۔ پھر اس نے ایک گلاس اوتار سنگھ کی طرف بڑھا دیا۔

اوتار سنگھ بری طرح گڑبڑا گیا۔ وہ یہاں ایک بری خبر لے کر آیا تھا۔ بلکہ ایک طرح سے وہ مولوی صاحب کی موت کا ذمے دار تھا۔ اگر وہ مولوی صاحب کو ساتھ لے کر گیا ہوتا تو..... ''یہ..... میں..... میں نہیں پی سکوں گا''۔

''دیکھیں..... آپ مہمان ہیں۔ اور امی کو ابھی کچھ معلوم نہیں''۔ صادق علی کے لہجے میں التجا تھی۔

''میں..... میں کیسے پی سکتا ہوں''۔ اوتار سنگھ کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔

''آپ دیکھیں۔ میں بھی تو پی رہا ہوں''۔ لڑکے نے گلاس اٹھایا اور شربت کا ایک گھونٹ لیا۔ ''بابا کہتے تھے..... موت اللہ کا حکم ہے۔ وہ تو مقررہ وقت پر، اللہ کے مقرر کردہ طریقے پر آتی ہے، آدمی نہ ایک پل زیادہ جی سکتا ہے نہ ایک پل کم''۔

اوتار سنگھ نے جیسے جیسے وہ شربت پی لیا۔

''اب مجھے امی کو بتانا ہے''۔ لڑکے نے کہا۔ ''آپ یہ اخبار مجھے دیں گے؟''۔

لڑکا بھی اسی کی طرح دشواری محسوس کر رہا تھا۔ اوتار سنگھ نے اخبار اسے دے دیا۔ وہ اندر چلا گیا۔

کوئی دس منٹ اوتار سنگھ اکیلا بیٹھا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اندر نجانے کیا حال ہوگا۔

پھر لڑکا واپس آگیا اور اس نے اخبار اسے دے دیا۔ اسی لمحے دروازے کے اس طرف سے نسوانی آواز میں کہا۔ ''بیٹے..... ہم تمہارے شکر گزار ہیں کہ تم نے یہ خبر ہم تک پہنچائی۔ ورنہ نجانے کب تک ہم بے خبر رہتے''۔

اوتار سنگھ کو حیرت ہوئی۔ ہندوؤں میں ہوتا تو اسے محض قرار دیا جاتا۔ یہاں شکریہ ادا کیا جا رہا تھا۔

''خالہ..... مولوی صاحب میرے لئے پتا سمان تھے۔ ان کا اس طرح سے جانا میرے لئے ذاتی نقصان ہے۔ لیکن آپ کا نقصان تو بہت بڑا ہے''۔

''اللہ جو کرتا ہے، بہتر ہوتا ہے۔ اور اللہ کی مرضی کو خوش دلی سے مان لینے ہی میں عافیت ہے''۔

اوتار سنگھ نے جیب سے دو سو روپے نکالے اور صادق علی کی طرف بڑھائے۔ ''یہ کیا ہے؟''۔

(جاری ہے)

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

صادق علی نے ہاتھ بڑھائے بغیر پوچھا۔

''یہ مولوی صاحب کی فیس ہے''۔

''اب اس پر ہمارا کوئی حق نہیں''۔دروازے کے اس طرف سے مولوی صاحب کی بیوہ نے کہا۔

''ایسا نہ کہیں۔میں ہر ماہ یہ رقم آپ کو دے کر جاؤں گا۔یہ میرے پتا جی اور مولوی صاحب کے درمیان معاہدہ تھا۔آپ یہ نہیں لیں گی تو میرے پتا جی کی آتما ہمیشہ بے چین رہے گی''۔

چند لمحوں کی ہچکچاہٹ آمیز خاموشی کے بعد خاتون نے بیٹے کو پکارا۔''صادق علی رقم لے لو بیٹے۔اور بیٹے اوتار سنگھ،تمہارا شکریہ۔میرے خاوند تمہارا تذکرہ ہمیشہ بہت اچھے الفاظ میں کرتے تھے۔دعا بھی کرتے تھے تمہارے لئے۔اب وہ نہیں تو ہم سب تمہارے لئے دعا کریں گے''۔

اوتار سنگھ وہاں سے نکلا تو اس کے سینے سے بہت بھاری بوجھ ہٹ چکا تھا۔

.....X.....

بعد میں اوتار سنگھ ہمیشہ سوچتا رہا کہ مولوی صاحب کے گھر جانا اس کے لئے بہت زیادہ فائدہ مند ثابت ہوا ہے۔وہ وہاں سے بہت کچھ سیکھ کر آیا تھا۔وہاں سے اسے زندگی اور موت کا واضح تصور ملا تھا اور صبر کا جو عملی مظاہرہ اس نے دیکھا تھا،وہ اس کے لئے مشعل راہ بن گیا تھا۔ورنہ شاید وہ صبر نہ کر پاتا۔

امتحان کا نتیجہ آنے تک چھٹیاں تھیں۔اس دوران وہ صرف سوچتا رہا.....سمجھنے کی کوشش کرتا رہا کہ واقعات کس طرح پیش آئے ہوں گے۔انہیں ترتیب دینے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ٹھاکروں کی گڑھی میں اس نے بہت کم وقت میں بہت زیادہ دیکھا تھا۔لیکن اسے سمجھنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔وہ اب وہ سب کچھ یاد کر کے سمجھنا چاہتا تھا۔

سب سے پہلے تو اس نے گاؤں کی ویرانی دیکھی تھی۔دن کے وقت ٹھاکروں کی گڑھی میں کھیت سنسان تھے۔ان میں کوئی کام کرنے والا نہیں تھا۔اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہاں غیر معمولی صورت حال ہے۔

پھر وہ بڑھا تو حویلی کے پھاٹک کے سامنے اسے لاشیں دکھائی دیں۔ان میں صرف ایک لاش جانی پہچانی تھی.....سندر داس کی لاش! پھر وہ آگے بڑھا تو اس نے دیکھا کہ احاطہ لاشوں سے بھرا ہوا ہے۔وہاں اسے ویر جی،چاچا جمال دین اور کئی شناساؤں کی لاشیں نظر آئیں۔

اسے حویلی کا منظر یاد آیا۔صدر دروازے پر دو اجنبیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔انہیں یقیناً پتا جی نے شوٹ کیا تھا۔اور پتا جی زخمی تھے۔لیکن زندہ تھے۔انہوں نے اس سے ٹوٹی پھوٹی گفتگو بھی کی تھی۔

اسے یاد آیا کہ پتا جی کی پشت پر بائیں کندھے کے نیچے گولی لگی تھی۔اس کا مطلب تھا کہ ان پر گولی پیچھے سے چلائی گئی تھی۔اور اس کا مطلب تھا کہ وہ گولی کسی دشمن کی طرف سے نہیں،بلکہ کسی دوست کی طرف سے آئی تھی۔اور وہاں صرف دو افراد ایسے تھے،جو پتا جی پر گولی چلا سکتے تھے.....چاچا کیدار ناتھ اور مولوی صاحب۔کیدار ناتھ کے ہاتھ میں طمنچہ تھا۔جبکہ مولوی صاحب کے ہاتھ خالی تھے۔

اب اوتار سنگھ کے لئے اصل صورت حال کا تصور کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔کیدار ناتھ کو اس نے کبھی پسند نہیں کیا تھا۔کبھی اسے دوستوں میں شمار نہیں کیا تھا۔وہ اسے کبھی قابل اعتبار نہیں لگا تھا۔اسی نے پتا جی پر پیچھے سے وار کیا ہوگا۔مولوی صاحب کی مداخلت کی وجہ سے اس کا نشانہ خطا ہوا ہوگا اور یوں مولوی صاحب پتا جی پر قربان ہو گئے ہوں گے اور پتا جی نے کیدار ناتھ کو شوٹ کیا ہوگا۔

اب وہ پتا جی کے ساتھ گزارے ہوئے آخری لمحوں کو پھر سے جی رہا تھا۔انہوں نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں بتا دیا تھا کہ جے پور والوں نے حملہ کیا تھا۔

اس سلسلے میں وہ صرف قیاس آرائی ہی کر سکتا تھا۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جے پور والوں کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ اس کا تعلق ٹھاکروں کی گڑھی سے ہے۔جبکہ جے پور میں کوئی اسے جانتا بھی نہیں تھا۔

وہ چونکا.....نہیں.....جے پور میں کوئی مجھے جانتا تھا۔اسی نے بتایا ہوگا۔وہ ارجن تھا.....اس کا اسکول کا دوست۔

اب بھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ارجن کس طرح اس معاملے میں ملوث ہوا ہوگا اور کیسے اس نے ٹھاکروں کی گڑھی کا پتا بتایا ہوگا۔

بہر حال جس طرح بھی ہوا ہو،یہی ہوا ہوگا۔جے پور سے مشتعل لوگوں کا لشکر گاؤں پر حملہ کرنے گیا ہوگا۔اوتار سنگھ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ گاؤں کے تمام لوگوں نے لڑائی میں حصہ نہیں لیا۔اور وہ گاؤں میں بھی نہیں تھے۔تو شاید وہ گاؤں چھوڑ گئے ہوں گے۔البتہ پتا جی کے وفاداروں نے ان کا ساتھ دیا تھا اور ان پر قربان ہو گئے تھے۔اور پتا جی.....!وہ ایک اپنے ہی کی مکاری کا شکار ہو گئے تھے۔

ٹھاکر کے ساتھ گزرے ہوئے وہ آخری لمحے اوتار سنگھ کی یادداشت پر پوری ترتیب اور صحت کے ساتھ نقش ہو گئے تھے۔وہ ان کی ٹوٹی ہوئی باتیں جوڑ کر پوری طرح سمجھ سکتا تھا۔پتا جی نے اس سے کہا تھا کہ بس وہ اس سے ملنے،اسے دیکھنے کے لئے زندہ تھے۔وہ جئیں گے نہیں۔اور انہوں نے کہا تھا کہ انہیں اس سے بہت ساری باتیں کرنی تھیں۔لیکن نہ ان کے پاس وقت ہے نہ طاقت۔

پھر انہوں نے کہا کہ تہہ خانے میں جو کچھ ہے،وہ اس کا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ وہ دہلی جا کر پڑھے۔گاؤں میں نہ رکے۔وہاں نہ رہے۔یہ الگ بات کہ آسمان کی سرخی دیکھ کر انہوں نے اس سے اصرار کیا کہ وہ تہہ خانے کے مال کو بھول جائے اور جان بچا کر نکل لے۔وقت کم ہے۔انہوں نے کہا.....رکو مت،چلے جاؤ۔اور ان کی بات درست ثابت ہوئی تھی وہ فوری طور پر نکلا،تب ہی بہ مشکل بچا تھا۔

پھر ٹھاکر نے اس سے پوچھا تھا کہ کیا جے پور میں بت واقعی اس نے توڑے ہیں۔اوتار سنگھ کو یاد تھا کہ وہ لمحہ اس کے لئے بڑی آزمائش کا تھا۔وہ جھجکا تھا۔اسے ڈر تھا کہ وہ سچ بولے گا تو مرتے ہوئے باپ کو تکلیف پہنچائے گا۔پتا جی کو صدمہ ہوگا۔لیکن آخر اس نے سچ بولنے کا فیصلہ کیا۔

لیکن اس کے اعتراف پر پتا جی کا ردعمل اس کی توقع کے بالکل برعکس تھا۔وہ خوش ہوئے تھے اور انہوں نے اس کی پیشانی چوم لی تھی۔یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ ایسا کیوں ہوا۔لیکن یہ بات صرف پتا جی ہی بتا سکتے تھے۔اور اب وہ اس دنیا میں نہیں۔تو یہ بات اب اسے کبھی معلوم نہیں ہو سکے گی۔بہر حال یہ طے تھا کہ اس کے بت توڑنے پر پتا جی خفا نہیں تھے،بلکہ خوش تھے۔

اس کے بعد پتا جی نے کہا تھا کہ وہ اسے ایک بڑی بات بتانا چاہتے ہیں لیکن وقت نہیں ہے۔وہ بڑی بات بھی اب اسے کبھی معلوم نہیں ہو سکتی تھی۔

پھر پتا جی نے ایک مبہم بات کہی تھی.....جلانا نہیں۔دفن کرنا۔اب یہ بات وہ اپنے لئے تو نہیں کہہ سکتے تھے۔اس نے یہی نتیجہ نکالا تھا کہ وہ ویر جی اور چاچا جمال دین کے بارے میں کہہ رہے ہوں گے۔

پھر انہوں نے لال آندھی کے آثار دیکھ کر اسے فوراً جانے کا حکم دیا تھا۔پھر مرنے سے پہلے آخری لمحے میں ان کے ہونٹ ہل رہے تھے۔لیکن کوئی آواز نہیں تھی۔اس لمحے وہ پتا جی کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ان کے ہونٹوں کی وہ جنبش اسے جانی پہچانی لگ رہی تھی،جیسے وہ جانتا ہو کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔اور ہونٹوں کی وہ جنبش اس کی یادداشت پر نقش ہو گئی تھی۔اس وقت بھی وہ چشم تصور سے دیکھتا تو اسے ہلتے ہوئے وہ ہونٹ نظر آ جاتے۔

اور پھر پتا جی کو ایک جھٹکا لگا تھا اور سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔پتا جی مر گئے تھے۔

اور اماں!اماں اس کے ساتھ آنے کے لئے تیار نہیں تھیں۔انہوں نے پہلی بار ماں بن کر اسے حکم دیا تھا.....انہوں نے کہا تھا.....تجھے شہر جانا ہے اور پڑھائی پوری کئے بغیر واپس نہیں آنا ہے۔اور انہوں نے کہا تھا کہ وہ اس کی امانتوں کی رکھوالی کریں گی۔اور انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ جب بھی واپس آئے گا،وہ اسے ملیں گی اور اس کی امانتیں اسے واپس دیں گی۔انہوں نے کہا تھا.....میرا رب امانت واپس کئے بغیر مجھے مرنے نہیں دے گا۔

اور اب خبر چھپی تھی کہ گیارہ گاؤں صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔اماں کیسے بچی ہوں گی؟اماں کیسے بچ سکتی ہیں!تو اماں کا وعدہ؟

کچھ بھی ہو،اس نے سوچا۔مجھے اماں سے کیا ہوا وعدہ نبھانا ہوگا۔پڑھائی مکمل کئے بغیر میں گاؤں واپس نہیں جاؤں گا۔مگر گاؤں ہے کہاں؟ گاؤں نہ سہی،مگر میں جاؤں گا تو۔دیکھنے کہ اماں وعدہ پورا کرتی ہیں یا نہیں۔

ان لمحوں سے دوبارہ گزرنے کے بعد اوتار سنگھ کی سمجھ میں آ گیا وہ اس کا سب کچھ کھو گیا ہے.....ایک ہی ہلے میں!محبت کرنے والا باپ،چاچا جمال دین،جس نے اسے محبت کا پہلا سبق سکھایا تھا.....چھوٹے ٹھاکر،جس سے محبت کریں،اس پر کبھی ظاہر نہ ہونے دیں کہ اب آپ کو اس سے محبت نہیں رہی ہے۔کچھ چھن جانے کا دکھ بڑا ہوتا ہے.....وصال دین،دنیا کی وہ واحد ہستی جسے وہ بھائی سمجھتا تھا۔اور مولوی صاحب،جن سے وہ عربی پڑھتا تھا۔اس نے سوچا تھا کہ وہ ان سے اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کرے گا۔اور اماں،جنہوں نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ واپسی پر اسے ضرور ملیں گی لیکن جہاں وہ تھیں،وہاں سے میلوں تک کوئی انسان زندہ نہیں بچا تھا۔

وہ سب لوگ اس کی زندگی کا محور و مرکز تھے.....زندگی کی رونق تھی۔اور وہ سب کے سب بیک وقت اس سے چھن گئے تھے۔یہ سوچ کر اس کے اندر غم کی ایسی مہیب موج اٹھی کہ اسے لگا کہ اس کا دل دھڑکنا چھوڑ دے گا۔سینہ چٹخنے لگا تھا۔اسے لگا تھا کہ وہ اندر سے پگھل رہا ہے.....سیال میں تبدیل ہو رہا ہے.....اور ذرا سی دیر میں اپنی آنکھوں سے بہہ کر ختم ہو جائے گا۔بشرطیکہ اس سے پہلے ہی آنکھیں نہ بہہ گئی ہوں۔

اور ایسا ہو جاتا۔کیونکہ وہ پہاڑ جیسا غم تھا.....اس کے وجود،اس کی طاقت سے بہت بڑا۔مگر اسی لمحے اس کی سماعت میں مولوی صاحب کے بیٹے کی آواز گونجی.....بابا کہتے تھے،موت اللہ کا حکم ہے۔وہ تو مقررہ وقت پر،اللہ کے مقرر کردہ طریقے پر آتی ہے۔آدمی نہ ایک پل زیادہ جی سکتا ہے نہ کم۔

اور اس کے اندر پگھلنے کا وہ عمل رک گیا۔ارے.....ہر کوئی اپنے مقررہ وقت پر گیا.....اللہ کے مقرر کردہ طریقے پر۔اور یہ تو اس نے ماں کے دیہانت پر ہی سمجھ لیا تھا کہ اوپر والا صبر نہ دے تو آدمی کسی اپنے کے مرنے کا غم نہ جھیل سکے اور خود بھی مر جائے۔

اس کے بعد ایک بار اور اس پر کڑا وقت آیا۔اس روز وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کتنا اکیلا رہ گیا ہے۔اس کے پاس کچھ بھی تو نہیں بچا۔اس کے سارے پسندیدہ لوگ ایک ساتھ ہی اس سے چھن گئے۔

یہ سوچتے ہوئے اسے غم کا شدید احساس ہوا اور دم گھٹنے لگا۔پھر اچانک ہی اس کے اندر ایک تلخی ابھری۔یہ سب ہوا کیوں؟ اس نے سوچا۔جے پور والوں نے اس کے گاؤں پر حملہ کیوں کیا؟ اگر اس نے اس روز جے پور کے اس مندر میں بتوں کو نہ توڑا ہوتا تو وہ حملہ نہ ہوتا۔اور وہ حملہ نہ ہوتا تو وہ سب لوگ.....اور ان کے علاوہ بہت سے لوگ مارے نہ جاتے۔

اس کے وجود میں خود سلامتی کی ایک تند لہر اٹھی۔قریب تھا کہ وہ اس میں بہہ جاتا۔مگر اسی لمحے اسے اس خواب کا خیال آ گیا،جو بتوں کو توڑنے والی رات اس نے جے پور کے ہوٹل میں دیکھا تھا۔

وہ خواب بھی اسے پوری جزئیات سمیت یاد تھا۔بابا نے کہا تھا.....پریشانی بھی نعمت ہے اور آسانی بھی۔اور ہر نعمت آزمائش بھی ہے۔عافیت صرف شکر ادا کرتے رہنے میں ہے۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

اورانہوں نے خوش خبری سنائی تھی کہ اس نے جو کچھ اللہ کے لئے کیا، اللہ اس سے خوش ہوا۔ اس نے قبول فرمالیا۔ مگر انہوں نے خبردار کیا تھا کہ آدمی ایک لمحے میں اپنے کئے کرائے پر پانی پھیر دیتا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ اللہ کے لئے کچھ کرو تو اس کی قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ جتنی بھاری قیمت ادا کرو گے، عمل اتنا ہی مقبول ہوگا۔ مگر قیمت ادا کرنے کے بعد کے آداب بھی ہیں۔ قیمت ادا کر کے پچھتائے، غم کیا، افسوس کیا تو سب کچھ ختم۔ جتنی بڑی قیمت ادا کرو، اتنی ہی خندہ پیشانی سے رہو۔ انہوں نے کہا تھا، وقت آئے تو یہ بات یاد رکھنا، تم نے جو کچھ کیا، اللہ نے قبول فرمایا۔ لیکن اس کی بہت بھاری قیمت بھی ادا کرنی ہوگی۔ وہی تمہاری آزمائش ہوگی۔ اور اس میں اللہ ہی تمہاری مدد کرے گا۔

ایک پل میں اوتار سنگھ کی سمجھ میں آ گیا کہ اس کا خواب سچا تھا۔ اس نے اللہ کو خوش کرنے کے لئے کچھ کیا اور اللہ اس سے خوش ہوا۔ اس کی اسے بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ اور اب وہ افسوس کر رہا تھا..... پچھتا رہا تھا کہ اس کی وجہ سے اس کے پیارے زندگی گنوا بیٹھے۔ تو اس کا وہ عمل تو ضائع ہونے والا تھا۔ وہ آزمائش میں ہارنے والا تھا۔ اور خواب ایسا سچا تھا کہ اس آزمائش میں اللہ نے ہی اس کی مدد کی تھی۔ اسے خواب یاد دلایا تھا۔

ایک پل میں اس کی سوچ بدل گئی۔ مولوی صاحب کے کہنے کے مطابق جو لوگ مرے تھے، انہیں اسی وقت، اسی طرح سے مرنا تھا۔ اگر وہ ان کی موت پر افسوس کرتا ہے، اس کا ذمے دار خود کو سمجھتا ہے تو وہ گویا اپنے اس عمل کی مذمت کر رہا ہے جو اس نے اللہ کو خوش کرنے کے لئے کیا۔

وہ پوری جان سے لرز کر رہ گیا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اللہ کو خوش کرنے کی کوشش کی تھی اور کامیابی کے باوجود اپنی ناکامی کا سامان کر رہا تھا۔ وہ تو بس اللہ نے ہی اسے بچا لیا۔ وہ دل میں اللہ سے معافی مانگتا رہا اور شکر ادا کرتا رہا۔

عجیب بات ہوئی کہ اس کے بعد اس نے کبھی کسی مرنے والے کا غم نہیں کیا!

.....x.....

نیچے والے اوتار سنگھ کے حق میں پوری طرح بدل گئے تھے۔ ان کے نزدیک وہ المیہ بہت بڑا تھا، جو رونما ہوا تھا۔ 18 سال کا نوجوان ایک ہی لمحے میں اپنا سب کچھ کھو بیٹھا تھا۔ اس کا باپ ہی نہیں ختم ہوا، اس کا گاؤں ہی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ وہ بے چارہ تو گھر کا تصور بھی کھو بیٹھا۔

سرفراز بیگم بہت حساس خاتون تھیں۔ جوانی میں انہیں بیوگی کا دکھ ملا تھا۔ بیٹے سے وہ محروم تھیں۔ انہیں اوتار سنگھ کا غم بہت بڑا لگا۔ حور بانو کی بھی یہی کیفیت تھی۔ بلکہ وہ تو اخبار میں وہ خبر پڑھنے کے بعد گھنٹوں روتی رہی تھی۔ نور بانو اور گلنار بھی اس کی ہمدردی سے سرشار تھیں۔ اور چھمن بوا کا تو یہ حال تھا کہ بیٹھے بیٹھے خیال آتا تو ان کی آنکھیں چھلک جاتیں۔

نیچے سب لوگ اپنے اپنے طور پر چھوٹے ٹھاکر کے دکھ کا تصور کرتے اور کڑھتے۔ لیکن حور بانو تو اس سے محبت کرتی تھی۔ وہ تو اب ہر وقت اسی کے بارے میں سوچتی رہتی۔ بار بار اسے اپنے آنسو پونچھنے پڑتے۔

اب ہر روز چھمن بوا نیچے سے چھوٹے ٹھاکر کے لئے کچھ نہ کچھ لے کر جاتیں۔ سرفراز بیگم کو معلوم تھا کہ وہ ان کے ہاں کے کھانے پسند کرتا ہے۔

چند روز بعد رنجنا اس واقعے کے بعد پہلی بار نیچے آئی۔ سرفراز بیگم اس کے پاس بیٹھ گئیں۔ وہ بہت لٹی پٹی اور غم زدہ لگ رہی تھی۔

''یہ تم نے اپنا کیا حال بنا لیا ہے رنجنا''۔ سرفراز بیگم نے کہا۔

''بس بڑی بیگم، من ہی نہیں لگتا کسی کام میں۔ مجھے تو وشواس ہی نہیں ہوتا کہ پورا گاؤں، سارے لوگ ختم ہو گئے۔ اور وشواس آئے تو دل پھٹنے لگتا ہے''۔ وہ بیٹھے بیٹھے رونے لگی۔

سرفراز بیگم نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ''صبر کرو رنجنا۔ وہاں تمہارے رشتے دار بھی تھے؟''۔

''میرے ماتا پتا بھی تھے اور میرے رگھو کے گھر والے بھی تھے۔ کچھ بھی نہیں بچا''۔ رنجنا ہاتھ ملنے لگی۔

''دکھ تو بہت بڑا ہے۔ لیکن صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں رنجنا''۔

''پر صبر آتا ہی نہیں بڑی بیگم''۔

''شکر کرو۔ تمہارے پاس رگھو تو ہے۔ اپنے چھوٹے ٹھاکر کو دیکھو۔ اس کے پاس تو کچھ بھی نہیں بچا''۔ سرفراز بیگم نے دکھ سے کہا۔ پھر پوچھا۔ ''یہ بتاؤ، تمہارے چھوٹے ٹھاکر کا کیا حال ہے۔ وہ تو بہت غم کرتا ہوگا''۔

''وہ تو مہان ہیں بڑی بیگم''۔ رنجنا کے لہجے میں فخر تھا۔ ''میں نے انہیں دکھ کرتے نہیں دیکھا۔ الٹا مجھے اور رگھو کو دلاسہ دیتے ہیں، سمجھاتے ہیں، کہتے ہیں، جو ہونا تھا وہ بھگوان کی اچھا تھی سو ہو گیا۔ وہ تو کہتے ہیں، شکر ادا کرو کہ کسی کا ساتھ اتنے دنوں تک مل گیا''۔

سرفراز بیگم یہ سن کر بہت حیران ہوئیں۔ ہندوؤں میں یہ تصور اور شکر کی بات۔ وہ انہیں ویسے بھی غیر معمولی لگا تھا۔

''کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے بڑی بیگم کہ ان کے شریر میں ہمارے ٹھاکر جی کی آتما آ گئی ہے۔ رنجنا بولی۔ ''ہم سے اتنے چھوٹے ہیں۔ بچے تھے ہمارے سامنے۔ مگر بات کرتے ہیں تو ہم لوگ خود کو بچہ سمجھنے لگتے ہیں''۔

''پھر بھی غم تو ہوگا انہیں''۔

''بھگوان جانے۔ میرے پتا جی کہتے تھے کہ ٹھاکر لوگ اپنے اندر کا حال کسی کو معلوم نہیں ہونے دیتے۔ کمزوری دکھانے کو توہین سمجھتے ہیں۔ ویسے بڑی بیگم، آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ دکھ تو ہوگا انہیں''۔

''یقیناً ہوگا۔ اچھا یہ بتاؤ، وہ باتیں بہت کرتے ہیں''۔

''نہیں بڑی بیگم۔ بات تو وہ بہت ہی کم کرتے ہیں۔ ہاں سوچتے بہت ہیں۔ اب تو پھر بھی بات کرنے لگے ہیں..... شاید ہمیں دلاسہ دینے کے لئے۔ پہلے تو بغیر کام کے بات ہی نہیں کرتے تھے۔ ہاں پڑھنے بیٹھیں تو بہت بولتے ہیں..... بہت سوال کرتے ہیں''۔

قریب بیٹھی حور بانو بہت غور سے یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ اس روز اس کی محبت دو چند ہو گئی۔ چھوٹے ٹھاکر میں تمام خوبیاں بڑے لوگوں والی تھیں۔

ادھر رنجنا کے جانے کے بعد سرفراز بیگم بھی چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں سوچتی رہیں۔ انہیں رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ کم از کم وہ اس لڑکے کی ایک محرومی تو کسی حد تک دور کر سکتی ہیں۔ وہ اسے ماں کی محبت دے سکتی ہیں۔

لیکن کیسے؟ انہوں نے سوچا۔ وہ اس کی ماں بن جائیں اور اسے کہیں کہ وہ اس گھر کو اپنا گھر اور گھر کے تمام لوگوں کو اپنا سمجھے۔ وہ اس کے لئے اپنا پردہ ختم کر سکتی ہیں۔ لیکن اس سے آگے.....! وہ تین جوان بیٹیوں کی ماں تھیں۔ بن باپ کی بیٹیاں ویسے بھی بہت بڑا بوجھ ہوتی ہیں۔ پھر یہاں تو مذہب کا فرق تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی بچیاں بہت اچھی، بہت نیک ہیں۔ لیکن جوانی ناقابل اعتبار ہوتی ہے۔ کوئی معصوم سی بھول بھی ہو گئی تو وہ اللہ کے ہاں اپنے مرحوم شوہر کو کیا منہ دکھائیں گی۔ اللہ کو کیا منہ دکھائیں گی۔

بس اس ایک خیال سے وہ جھجکتی رہیں۔ ورنہ ان کا دل تو چاہتا تھا کہ وہ جائیں اور چھوٹے ٹھاکر سے یہ سب کچھ کہہ دیں۔ وہ اس پر حیران بھی تھیں کہ ان کے دل میں اس کے لئے یہ کیسی محبت پیدا ہو گئی ہے۔ پھر انہیں خیال آیا کہ شاید اس کا سبب ان کی محرومی ہے۔ انہیں بیٹے کی کیسی آرزو تھی۔ لیکن وہ ان کے نصیب میں تھا ہی نہیں۔ تو اب وہ محرومی ان کیلئے چھوٹے ٹھاکر کی محبت بن گئی ہے۔

وہ بیٹیوں کی خاطر اس محبت سے منہ موڑے بیٹھی رہیں۔ خود سے لڑتی رہیں۔ لیکن پھر کچھ ایسا ہوا کہ ان کی ساری احتیاط دھری رہ گئی اور اس غیر مسلم کی محبت ایک منہ زور دھارے کی طرح انہیں بہا لے گئی۔

ہوا یہ کہ اس روز رنجنا ان کے پاس آئی اور انہیں کچھ نوٹ دیئے۔

انہوں نے حیرت سے نوٹوں کو دیکھا اور پوچھا۔ ''یہ کس لئے رنجنا؟''۔ ان کی سمجھ میں واقعی کچھ بھی نہیں آیا تھا۔

اپنی حیرت کے جواب میں انہیں رنجنا کے چہرے پر بھی حیرت نظر آئی۔ ''بھول گئیں بڑی بیگم۔ یہ کرائے کے پیسے ہیں۔ چھوٹے ٹھاکر نے بھجوائے ہیں''۔

''یہ..... اب میں یہ نہیں لے سکتی''۔ انہوں نے گھبرا کر کہا۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ یہ گھر اب تم لوگوں کا ہے۔ چھوٹے ٹھاکر کا ہے۔ لو یہ چھوٹے ٹھاکر کو واپس دے دو''۔

لیکن رنجنا کا ہاتھ مٹھی بن گیا۔ ''میں..... میں چھوٹے ٹھاکر کا حکم کیسے ٹال سکتی ہوں۔ ان کی بات ماننا تو میرا دھرم ہے بڑی بیگم''۔

''میں جو کہہ رہی ہوں''۔ سرفراز بیگم نے تیکھے لہجے میں کہا۔

''مجھے شما کر دیں بڑی بیگم''۔ رنجنا نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ آپ کا اور چھوٹے ٹھاکر کا معاملہ ہے۔ میں تو ان سے کچھ نہیں کہہ سکتی''۔

بات سرفراز بیگم کی سمجھ میں آ گئی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں خود بات کروں گی تمہارے چھوٹے ٹھاکر سے''۔ انہوں نے کہا۔

رنجنا چلی گئی۔ سرفراز بیگم نے وہ روپے ایک طرف رکھ دیئے۔ ہاتھوں میں انہیں ٹکاؤ سا لگ رہے تھے۔

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

اوراماں اس کے لئے بہت اہم تھیں۔تو اس کے لئے ایک امید تھی کہ کوئی اس کا ہے.....اوراس کی راہ تک رہا ہے۔یہ الگ بات کہ وہ عقل سے سوچتا تو یہ اسے ممکن نہ لگتا۔ اماں کیسے بچی ہوں گی۔جہاں گیارہ گاؤں ریت کے نیچے دفن ہو گئے ہوں، وہاں ان میں ایک گاؤں میں ایک عورت کیسے زندہ بچ سکتی ہے۔تو وہ امید وبیم کی کیفیت تھی۔ لیکن امید تھی تو سہی۔

ہاں.....اسے پچھتاوا ہوتا تھا کہ کیوں اماں کی بات مان کر، وہ اکیلا وہاں سے نکل آیا۔وہ اماں کو اپنے ساتھ لا سکتا تھا۔وہ اماں کو زبردستی گود میں اٹھا کر لے آتا۔کیسی عجیب بات تھی کہ وہ انہیں موت کے منہ میں اکیلا چھوڑ کر نکل آیا۔اس کے پاس اس کوتاہی کیلئے بس ایک عذر تھا۔اس نے حویلی کے باہر اور حویلی میں جو کچھ دیکھا تھا، وہ اس کے شاک میں تھا۔اس کی سمجھ بوجھ متاثر ہو چکی تھی۔ایسے میں آدمی نہ تو سوچ پاتا ہے، نہ درست فیصلہ کر سکتا ہے۔

اور ایک تیسرا فرق بھی تھا۔وہ سمجھتا تھا کہ اس نے اللہ کو خوش کرنے کی کوشش کی تھی۔جو کچھ اس نے کھویا، وہ اس کوشش کی قبولیت کی نشانی تھی، قربانی تھی۔اور خواب میں اسے یہ بات سمجھا بھی دی گئی تھی کہ اسے دکھ نہیں کرنا ہے۔اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ موت اپنے مقررہ وقت پر، طے شدہ طریقے سے آتی ہے اور اسے ٹالا نہیں جا سکتا۔آدمی کو صبر کرنا پڑتا ہے اور صبر اسے اللہ دیتا ہے۔جبکہ رنجنا اور رگھو کے پاس ایسا کوئی سہارا نہیں تھا۔ان کے لئے تو وہ غیر فطری موت تھی۔ایک ناگہانی مصیبت تھی، جس نے ان کا سب کچھ ختم کر دیا۔

چناں چہ وہ ان کی دل جوئی کی کوشش کرتا رہتا تھا۔سخت تو وہ کبھی تھا ہی نہیں۔لیکن اس سانحے کے بعد وہ ان کے لئے بہت نرم ہو گیا۔وہ ان کی ذاتی ضرورتوں کا خیال کرتا۔ انہیں چیزیں خرید کر لا دیتا۔ان سے باتیں کرتا اور صبر کی تلقین کرتا۔اب وہ کھانا ان کے ساتھ ہی بیٹھ کر کھاتا۔ویسے یہ مرحلہ اس کے لئے بڑا سخت ثابت ہوا تھا۔کیونکہ کھانا تو دور کی بات، وہ تو اس کے ساتھ بیٹھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

''سنو.....اب تم دونوں ہی میرا پریوار ہو''۔اوتار سنگھ نے نرم لہجے میں کہا۔

رگھو دونوں ہاتھوں سے اپنے رخسار پیٹنے لگا۔''نہیں چھوٹے ٹھاکر.....ہم تو آپ کے سیوک ہیں''۔

''سیوک تھے کہو۔اب تو میرا تم دونوں کے سوا کوئی نہیں۔میں نے کہا نا، تم میرا پریوار ہو''۔

''نا مالک.....یہ ہم سے نہیں ہوگا''۔رنجنا گڑگڑانے لگی۔''ہماری جگہ تو آپ کے پیروں میں ہے''۔

اوتار سنگھ نے سمجھ لیا کہ نرمی سے انہیں نہیں سمجھا سکتا۔چناں چہ اس نے تیور بدل کر کہا۔''تو تم میرے سیوک ہی رہنا چاہتے ہو نا۔پر تم تو اچھے سیوک بھی نہیں ہو''۔

یہ سن کر وہ دونوں پوری جان سے لرز گئے۔''مالک.....حکم کرو تو جان بھی دے دوں''۔رگھو بولا۔

''تو میرا حکم کیوں نہیں مانتے''۔اوتار سنگھ نے کڑے لہجے میں کہا۔

چار و ناچار وہ دونوں اس کے ساتھ بیٹھ گئے۔لیکن ان سے کھایا نہیں جا رہا تھا۔

اوتار سنگھ جانتا تھا کہ صدیوں پرانی نسلی عادت چھوٹنے میں وقت تو لگے گا۔مگر اسے اس مشکل کام کو آسان کرنے کا طریقہ بھی آتا تھا۔وہ ان ہی کے جیسے لقمے لے رہا تھا اور انہی کی رفتار سے کھا رہا تھا۔

وہ دونوں اس کے ساتھ بیٹھنے کی وجہ سے گھبرائے ہوئے تھے۔پہلے تو انہیں پتا ہی نہیں چلا۔لیکن آخر رنجنا کو اس کا احساس ہو گیا۔''مالک.....چھوٹے ٹھاکر، آپ نے ٹھیک سے بھوجن نہیں کیا ہے''۔وہ بولی۔

''جتنا تم نے کھایا ہے، اتنا ہی میں نے کھایا ہے''۔اوتار سنگھ نے کہا۔''اور روز یہی ہوگا۔مجھے کھلانے کے لئے تم دونوں کو ڈھنگ سے کھانا ہوگا''۔

''پر ٹھاکر جی، آپ کا بڑھتا ہوا شریر ہے۔آپ کی اور ہماری ضرورت میں فرق ہے''۔رگھو بولا۔

''وہ فرق میں جانتا ہوں۔تم لوگ پیٹ بھر کر کھاؤ گے تو میں بھی پیٹ بھر کر کھاؤں گا''۔

یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔ان دونوں نے جلدی ہی سمجھوتہ کر لیا۔اس کے باوجود رنجنا کو فکر لگی رہتی تھی کہ چھوٹا ٹھاکر کم زور ہو رہا ہے۔وجہ یہ ہے کہ وہ ٹھیک سے کھانا نہیں کھاتا ہے۔چناں چہ وہ رگھو سے کھانے پر اصرار کرنے لگی۔

پھر اوتار سنگھ نے رگھو کو چاچا اور رنجنا کو موسی کہنا شروع کر دیا۔وہ انہیں احساس دلا رہا تھا کہ اس کے لئے ان کے سوا کوئی نہیں ہے اور ان کے لئے اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔ لیکن نوکر اور مالک کے درمیان جو حجاب ہوتا ہے، وہ مٹنے والا نہیں تھا۔

اس رات وہ کھانے کے بعد معمول کے مطابق کچھ دیر کوٹھے پر چہل قدمی کرتا رہا۔پھر وہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر پڑھنے لگا۔

کچھ دیر بعد رنجنا کمرے میں آئی۔''چھوٹے ٹھاکر، وہ بڑی بیگم آپ سے ملنے آئی ہیں''۔

اوتار سنگھ نے چونک کر دیکھا۔اتنی دیر میں سرفراز بیگم اس کے کمرے میں داخل ہو گئیں۔وہ بوکھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ان کے اس طرح سامنے آنے کی اسے توقع نہیں تھی۔''ماں جی.....آپ.....؟''۔

''کیوں؟ میں آ نہیں سکتی تمہارے پاس؟''۔سرفراز بیگم کے لہجے میں اپنائیت تھی۔

''کیوں نہیں ماں جی۔گھر ہے آپ کا''۔

''مگر میں تو تمہارا گھر سمجھتی ہوں۔یہی شکایت لے کر آئی ہوں''

شکایت کا سن کر اوتار سنگھ اور گھبرا گیا۔''مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ماں جی؟''۔اس نے پوچھا۔پھر اسے احساس ہوا کہ وہ کھڑی ہوئی ہیں۔اس نے گھبرا کر کرسی اٹھائی اور ان کے پاس لے گیا۔''آپ بیٹھیں نا ماں جی''۔

سرفراز بیگم بیٹھ گئیں۔''تم بھی بیٹھو نا''۔

''آپ کے سامنے بیٹھنا اچھا نہیں لگے گا''۔

''کیوں؟ بیٹے ماں کے سامنے نہیں بیٹھتے کیا؟''۔سرفراز بیگم نے کہا۔

اوتار سنگھ جھجکتے جھجکتے بیٹھ ہی گیا۔''میں سوچ رہا ہوں ماں جی کہ مجھ سے کیا غلطی ہوئی ہے''۔

سرفراز بیگم نے بند مٹھی کھولی۔مڑے ہوئے نوٹ ان کی ہتھیلی پر پھیل گئے۔''میں اس غلطی کی بات کر رہی ہوں''۔انہوں نے کہا۔

''جی.....میں سمجھا نہیں۔یہ کیا ہے؟''۔

''یہ تم نے مجھے بھجوائے تھے۔رنجنا لائی تھی''۔

اوتار سنگھ کی سمجھ میں بات آ گئی۔''اوہ، یہ.....یہ تو مکان کا کرایا ہے''۔

''مگر میں نے پچھلی بار تم سے کہا تھا کہ اب یہ تمہارا گھر ہے۔میرا مکان نہیں''۔

اوتار سنگھ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔''میرے دل میں بڑی قدر ہے اس بات کی''۔وہ اٹک اٹک کر بولا۔''لیکن ماں جی، یہ لین دین کا معاملہ اس سے الگ ہے''۔

''لیکن اب میں تم سے یہ پیسے نہیں لے سکتی''۔

''آپ شاید غلط سمجھ رہی ہیں ماں جی۔ہمارا سب کچھ ختم ہو گیا۔لیکن ماں جی، میرے پاس اتنا ہے کہ زندگی بھر ختم نہیں ہوگا۔اگر میں مفلس ہو گیا ہوتا تو آپ سے تکلف نہ کرتا۔لیکن ہوتے ہوئے نہ دوں تو میرے پتا جی کی آتما اشانت رہے گی''۔

''غلط میں نہیں سمجھ رہی، تم سمجھ رہے ہو''۔سرفراز بیگم کے لہجے میں تلخی تھی۔''میں نے اس دن بھی کہا تھا کہ میں یہ سب رسماً نہیں کہہ رہی ہوں۔میں نے کہا تھا کہ اسے اپنا گھر ہی سمجھو اور ہم سے کوئی تکلف نہ کرنا۔سمجھ لینا کہ ان لوگوں کے بدلے تمہیں ہم لوگ مل گئے ہیں۔اب ہم سب لوگ تمہارا خاندان ہیں۔آج میں پھر کہہ رہی ہوں کہ میں نے وہ رسماً نہیں کہا تھا.....''۔

''میں نے ایسا سمجھا بھی نہیں ماں جی آپ کی سچائی مجھ تک پہنچ گئی تھی''۔

''افسوس تو یہی ہے کہ نہیں پہنچی۔کسی ماں کا بیٹا لکھ پتی ہو تو کیا ماں اس سے گھر میں رہنے کا کرایہ وصول کرتی ہے.....کر سکتی ہے؟ اور کوئی بیٹا لکھ پتی ہو تو کیا وہ گھر میں رہنے کے صلے میں ماں کو کرایہ ادا کرتا ہے؟ میں نے تمہیں مفلس نہیں سمجھا۔بس بیٹا سمجھنے کے بعد میں تم سے کرایہ نہیں لے سکتی۔ہاں میں نے تمہیں رسماً بیٹا کہا ہوتا تو لے لیتی۔بلکہ مجھے تو خوشی تھی کہ تم نے پہلی بار مجھے پکارا تو ماں جی کہہ کر پکارا۔لیکن آج تم نے میرا دل توڑ دیا.....''۔

''یہ بات نہیں ماں جی''۔اوتار سنگھ نے شرمندہ لہجے میں کہنے کی کوشش کی۔

''نہیں۔مجھے بات پوری کرنے دو''۔سرفراز بیگم نے اس کی بات کاٹ دی۔''آج تم نے رنجنا سے کرایہ بھجوایا تو میں نے سمجھ لیا کہ تم نے میری بات کو رسمی سمجھا تھا۔اسی لئے میں ثابت کرنے چلی آئی۔میں زندگی بھر بہادر علی کے سوا کسی نامحرم کے سامنے نہیں آئی۔اور بہادر علی اماں جان کے زمانے کا ملازم ہے۔گھر کے فرد جیسا۔مگر اپنے شوہر کے انتقال کے بعد میں نے بہادر علی سے بھی پردہ کیا۔لیکن آج میں تمہارے سامنے ہوں۔کیوں کہ تمہیں بیٹا سمجھتی ہوں''۔یہ کہتے کہتے ان کی آواز رندھ گئی۔''اور میں آج تم سے کہہ رہی ہوں کہ تم جب چاہو، نیچے آؤ۔میری بیٹیاں بھی تم سے پردہ نہیں کریں گی۔تم ہمارے لئے گھر کا فرد ہو۔تم میرے بیٹے ہو چھوٹے ٹھاکر''۔

اوتار سنگھ کو اپنے سینے میں دل پگھلتا محسوس ہوا۔وہ اٹھا اور اس نے جھک کر سرفراز بیگم کے پاؤں چھو لئے۔پھر وہ سیدھا ہوا اور اس نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''لائیے.....یہ پیسے مجھے دے دیجئے۔مجھے شرمندگی ہے کہ میں نے یہ گستاخی کی۔آپ کا دل دکھایا''

سرفراز بیگم آنسوؤں کے درمیان مسکرا دیں۔انہوں نے نوٹ اوتار سنگھ کی طرف بڑھا دیئے۔

''یہ بتائیں، آپ کیسی ماں ہیں کہ آپ کو اپنے بیٹے کا نام بھی نہیں معلوم''۔اوتار سنگھ نے کہا۔

''میں نے جاننا ہی نہیں چاہا بیٹے۔مجھے تم کو چھوٹے ٹھاکر پکارنا ہی اچھا لگتا ہے''۔

''دعا کیجئے گا کہ میں آپ کے لئے بیٹا ہی ثابت ہوں۔یہ بڑی ذمے داری ہے''۔

''بیٹوں کو خود کو بیٹا ثابت کرنا نہیں ہوتا۔بس وہ بیٹے ہوتے ہیں۔اب میں چلتی ہوں۔اور چھوٹے ٹھاکر، جو میں نے کہا ہے، وہ یاد رکھنا۔مجھے دہرانے پر مجبور کبھی نہ کرنا۔ سمجھ رہے ہو نا؟''۔

اوتار سنگھ سمجھ رہا تھا۔وہ اسے کہہ رہی تھیں کہ وہ جب چاہے، نیچے آ سکتا ہے۔اس سے کسی کا پردہ نہیں۔

.....x.....

سرفراز بیگم کی وہ دعوت اوتار سنگھ کی محبت کے لئے کسوٹی بن گئی۔بڑی بات یہ تھی کہ بالکل ابتدا ہی میں اسے اس بات کا احساس ہو گیا کہ یہ اس کی محبت کے لئے بہت بڑی آزمائش ہے۔شاید ایسا اس لئے ہوا کہ وہ بنیادی طور پر سوچنے والا آدمی تھا۔ہر بات پر سوچنا، غور کرنا، تجزیہ کرنا اور پھر فیصلہ کرنا اس کی فطرت میں تھا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

اب تک اس کی محبت بے سمت اور نظریاتی تھی۔اس کے عشق کا آغاز ایک آواز سے ہوا تھا۔اور ایک ہی پل میں وہ آواز اس کے حواس پر چھا گئی تھی۔اس آواز نے اس کے پورے وجود پر سپردگی طاری کر دی تھی۔وہ کیفیت اسے آج بھی یاد تھی۔اردو کے کسی رومانوی شعر میں وہ کیفیت نہیں تھی، جو اس آواز نے اسے دی تھی۔وہ ایسی کیفیت تھی، جسے وہ خود بھی لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا تھا۔

اس کے دل میں اس آواز والی کے لئے جو پہلا جذبہ ابھرا، وہ احترام کا تھا۔پھر وہ عقیدت تک پہنچا۔اسے لگا کہ وہ آواز اسے عبادت پر اکسا رہی ہے۔اس کے بعد یہ خواہش ابھری کہ وہ اس آواز والی کے روبرو بیٹھا ہو اور وہ آواز سن رہا ہو، اور وقت ٹھہر جائے۔یہاں تک کہ زندگی تمام ہو جائے۔اس کے بعد ہی تو اسے یہ احساس ہوا کہ وہ اس ان دیکھی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔

اسے آج بھی یاد تھا۔وہ اس بات پر جھنجلایا تھا کہ وہ جو کچھ پڑھ رہی ہے، وہ اس کے لئے نامانوس ہے۔اسے سمجھ نہیں سکتا۔اور یہ بات تو اس نے فوراً ہی سمجھ لی تھی کہ وہ پڑھ رہی ہے۔کیوں کہ وہ گفتگو کا انداز نہیں تھا۔

اس جھنجلاہٹ کے نتیجے میں اس کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ کاش وہ الفاظ بھی سمجھ سکتا۔وہ آواز بہت دل فریب تھی۔لیکن پڑھنے کا انداز اس سے بھی دل نشین تھا۔اور اسے یقین تھا کہ جو کچھ وہ پڑھ رہی ہے، وہ عمدہ ترین ہے۔کیوں کہ کچھ نہ سمجھنے کے باوجود آواز، لحن اور الفاظ کی وہ اکائی اس کے اندر خوب صورت ترین جذبے جگا رہی تھی۔

اسے سن کر اس کا جی چاہتا تھا کہ زمین پر ماتھا ٹیک دے اور ساکت ہو جائے۔کس کے سامنے.....؟ یہ اسے معلوم نہیں تھا۔تب اس نے سوچا تھا.....شاید اسی کو محبت کہتے ہیں

بچپن سے سوچنے والے اوتار سنگھ نے رومانوی شاعری سے، اپنے استاد کی تشریحات سے اور اپنے غور و فکر سے یہ بات سمجھ لی تھی کہ محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے۔اور ہو یوں جاتی ہے کہ اوپر والا کسی کے دل میں کسی کی بھی محبت ڈال دیتا ہے۔وہ سمجھتا تھا کہ انسانی نسل کا ارتقا محبت کے دم سے ہے۔دنیا میں سب سے سچی محبت ماں باپ کی محبت ہوتی ہے۔اور وہ اوپر والے کی عطا ہے۔محبت نہ ہوتی تو انسانی نسل ختم ہو چکی ہوتی۔بچے کو کوئی خطرہ لاحق ہو تو کم زور عورت ماں بن کر بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔اپنی جان کی بھی پروا نہیں کرتی۔انسان تو بڑی چیز ہے، اس نے ننھے چوزے کے لئے مرغی کو بلی کے سامنے ڈٹتے، لڑتے اور بھگاتے دیکھا تھا۔

تو اس کا نظریہ یہ تھا کہ محبت وہ ہوتی ہے، جو اوپر والا کسی بھی لمحے کسی کو کسی کے لئے دے دیتا ہے۔اور وہ بے لوث، بے غرض ہوتی ہے۔وہ کچھ مانگتی ہے، نہ شرطیں عائد کرتی ہے۔حد یہ ہے کہ وہ تو جواب میں محبت کی، ذرا سی توجہ کا مطالبہ بھی نہیں کرتی۔

جب اوتار سنگھ کو یہ گمان ہوا کہ اسے اس آواز والی سے محبت ہو گئی ہے تو قدرتی طور پر اس نے یہی سمجھا کہ وہ محبت اس کے دل میں اوپر والے نے ڈالی ہے۔لیکن اس بات کی تصدیق کی اس کے پاس کوئی سند نہیں تھی۔وہ طبعاً حسن پرست تھا۔ہر چیز میں خوب صورتی اور حسن دیکھنا چاہتا تھا اور خوب صورتی اسے اچھی بھی لگتی تھی۔اس نے اس لڑکی کی آواز سنی تھی، اسے دیکھا نہیں تھا۔وہ جانتا تھا کہ آواز کی خوب صورتی اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ لڑکی حسین بھی ہو گی۔چناں چہ اپنی محبت اس کی اپنی نظر میں مشتبہ ہو گئی۔اگر وہ لڑکی کبھی سامنے آئی اور وہ بدصورت ہوئی تو کیا وہ اس کے لئے پہلے جیسی محبت محسوس کر سکے گا؟

الفاظ سمجھنے کی خواہش پیدا ہوئی تو یہ جاننا ضروری ہو گیا کہ وہ کون سی زبان ہے۔لیکن وہ سمجھتا تھا کہ یہ بات شاید اسے کبھی معلوم نہیں ہو سکے گی۔کیوں کہ وہ اس کا تذکرہ کسی سے نہیں کر سکتا تھا تو پوچھتا کیسے۔وہ تو اتفاق سے اسے وصال دین سے معلوم ہو گیا کہ وہ عربی زبان ہے۔تب اسے پانی آرزو پوری کرنے کی کوشش کا موقع ملا اور وہ مولوی صاحب سے عربی سیکھنے لگا۔

اب اوتار سنگھ اتفاق کو نہیں مانتا تھا۔برسوں پہلے اس نے سمجھ لیا تھا کہ جسے انسان اتفاق سمجھتا ہے، وہ اوپر والے کی منصوبہ بندی ہوتی ہے، جو انسان کی سمجھ میں نہیں آتی۔بے بسی اور عاجزی میں وہ اسے اتفاق قرار دے دیتا ہے۔تو گویا اس کے علم میں یہ بات آنا کہ آواز والی لڑکی عربی پڑھتی ہے، درحقیقت اوپر والے کی منصوبہ بندی تھی۔اس کے نزدیک یہ اس کے اس اندازے کی تصدیق تھی کہ اس کے دل میں وہ محبت اوپر والے نے ڈالی ہے۔اسے اپنی محبت پر اعتماد ہو گیا۔تب اس نے یہ سمجھ لیا کہ وہ لڑکی کتنی ہی بدصورت کیوں نہ ہو، اس سے اس کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔

اس نے بڑی لگن سے عربی پڑھی۔مولوی صاحب بھی استاد کامل ثابت ہوئے۔لیکن مولوی صاحب اس کی رفتار پر حیران تھے۔وہ اس کی رفتار کم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔انہیں نہیں معلوم تھا کہ اس کی رفتار کے پیچھے محبت کی طاقت ہے۔وہ جلد سے جلد عربی زبان پر قدرت حاصل کرنا چاہتا تھا۔

پھر ایک دن اس کی سماعت اس آواز سے محروم ہو گئی۔شروع میں تو وہ بہت پریشان ہوا۔مگر پھر اسے پتا چلا کہ وہ آواز تو اس کے اندر موجود ہے۔جب اس کا جی چاہے تو اس کے اندر کوئی خودکار بٹن دب جاتا ہے اور وہ آواز اپنی تمام تر خوب صورتی اور رعنائی سمیت اس کی سماعت میں رس گھولنے لگتی ہے۔مگر وہ لفظوں سے محروم آواز تھی.....صرف آواز، لہجہ اور لحن!

اس محرومی سے اسے بس ایک نقصان ہوا۔وہ اپنی عربی کی استعداد نہ جانچ سکا۔وہ یہ نہ جان سکا کہ جو کچھ وہ لڑکی پڑھتی ہے، وہ اسے سمجھنے کے قابل ہوا ہے یا نہیں۔کیوں کہ اسی کے لئے تو وہ یہ سب جتن کر رہا تھا۔

اوتار سنگھ نے کبھی نہیں چاہا، کبھی نہیں سوچا کہ وہ آواز والی لڑکی کو دیکھے۔اسے محبت ہو گئی تھی اور وہ بس محبت کئے جا رہا تھا۔کالج میں اسے محبت کی سچائی کا یقین بھی مل گیا تھا۔امرتا، ریٹا اور پشپا بے حد حسین لڑکیاں تھیں۔اور وہ بچہ نہیں تھا، جانتا تھا کہ اس کے ایک اشارے پر وہ پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں آ گریں گی۔لیکن اس نے کبھی ایک پل کے لئے بھی ایسا نہیں سوچا۔بلکہ وہ جب بھی انہیں دیکھتا، اسے آواز والی لڑکی کا خیال آ جاتا اور اس کے اندر کا موسم ویسا ہی خوب صورت ہو جاتا، جیسا پہلی بار اس کی آواز سن کر ہوا تھا۔

سو وہ اپنی اس نظریاتی محبت کے سحر میں گم تھا۔وہ محبت اس کے وجود میں ایک پرسکون جھیل کی طرح تھی۔لیکن اب سرفراز بیگم نے اس جھیل میں ایک کنکرا چھال دیا تھا۔جھیل کا سکون درہم برہم ہو گیا۔جھیل کی سطح پر دائرے ہی دائرے نمودار ہوئے اور وہ بے چین ہو گیا۔

پہلی بار اس نے سوچا کہ وہ نیچے جا سکتا ہے۔کوئی اس سے پردہ نہیں کرے گا، تو وہ پریشان ہو گیا۔وہاں تین لڑکیاں تھیں۔وہ اسے کیسے پہچانے گا۔دل نے جھٹ کہا.....یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔اس کی آواز تو وہ لاکھوں میں پہچان سکتا ہے۔

وہ اسے دیکھ سکے گا۔اس کی محبت مکمل ہو جائے گی۔اس تصور نے ہی اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑا دی۔اس کا جی چاہا کہ اسی وقت نیچے چلا جائے.....اسے دیکھ لے۔وہ خوشی اس کے لئے بالکل نئی اور انوکھی تھی۔

لیکن وہ رکھ رکھاؤ والا آدمی تھا۔یہ رات کا وقت تھا۔اس وقت جانا مناسب نہیں۔اس نے سوچا.....کل دیکھیں گے۔

سرخ آندھی والے واقعے کے بعد سونا اس کے لئے مسئلہ بن گیا تھا۔قدرتی بات تھی کہ پتا جی، ویر جی اور چاچا جی اسے یاد آتے تھے۔اور اسے یہ بھی خیال تھا کہ اسے ان کا دکھ نہیں کرنا چاہئے۔ورنہ اس کی قربانی رائیگاں ہو سکتی ہے۔دوسری طرف دکھ ایک فطری چیز تھا۔دکھ پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا.....کسی کا زور نہیں چلتا۔وہ تو چپکے سے خیال کی طرح آتا ہے.....دبے پاؤں.....جیسے کوئی چور ہو۔پھر پتا بھی نہیں چلتا کہ کب اور کیسے وہ دل، دماغ پر.....پورے وجود پر چھا گیا ہے۔پتا چلتا ہے تو آنکھوں سے آنسو چھلک رہے ہوتے ہیں۔اس کا تجربہ اسے ماتا جی کی موت پر ہو چکا تھا۔چناں چہ وہ دکھ کی طرف سے چوکنا رہتا تھا۔ایک بار تو بے خبری میں اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔وہ تو بروقت اسے خیال آ گیا اور اس نے خود کو سنبھال لیا۔اس کے بعد سے وہ ان لوگوں کے بارے میں سوچنے سے بھی بچنے لگا تھا۔وہ شعوری طور پر اس کوشش میں لگا رہتا تھا کہ ان لوگوں کو یاد نہ کرے۔

لیکن سوتے وقت بچھڑے ہوئے لوگ خاص طور پر یاد آتے تھے۔یہ بات وہ کبھی نہیں سمجھ سکا کہ غم نہ کرنے کی جدوجہد میں اس نے غم کو خود پر طاری کر لیا ہے۔اگر وہ ایک بار کھل کر غم کر لیتا.....رو لیتا، تو اس کے بعد دھیرے دھیرے، بہ تدریج وہ غم اس کے دل و دماغ سے محو ہو جاتا۔لیکن اسے تو بس یہی فکر تھی کہ اس کی قربانی اکارت نہ ہو جائے۔اللہ کو خوش کرنے کے بجائے وہ اسے خفا نہ کر بیٹھے۔

سو بستر پر لیٹنے سے پہلے وہ سر اٹھا کر پکارتا.....اے اوپر والے، تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھے پیدا کیا.....وہ سب کچھ دیا جو میرے پاس ہے۔مجھے راستا دکھایا، جس کی وجہ سے میں نے تجھے خوش کرنے کی کوشش کی۔اب اسے قبول بھی فرما لے اور مجھے ناشکرے پن سے بچائے رکھ۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

اس کے باوجود بستر پر لیٹتے ہی اس کی آنکھوں میں کسی نہ کسی مرنے والے کا چہرہ پھر جاتا.....کبھی وہ پتا جی ہوتے تو کبھی ویر جی۔کبھی وہ مولوی صاحب ہوتے تو کبھی چاچا جی۔اور وہ گھبرا کر،خوف زدہ ہوکر زور سے سر جھٹکتا۔مجھے کسی کا دکھ نہیں کرنا ہے۔وہ خود کو یاد دلاتا۔

ایسے میں کلمہ ہی اس کی ڈھال بن گیا تھا۔وہ کلمہ پڑھنا شروع کرتا..... پورے دھیان سے.....ارتکاز کے ساتھ۔مفہوم کے شعور کے ساتھ۔اور کلمہ پڑھتے پڑھتے وہ سو جاتا۔

لیکن اس رات ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔وہ آواز والی لڑکی کے تصور میں کھویا ہوا تھا۔الفاظ کے بغیر اس کی آواز اس کی سماعت میں گونج رہی تھی۔لیکن اس کا تصور بے چہرہ تھا۔اس پردہ دار لڑکی کو اپنے تصور میں چہرہ دینے کی گستاخی وہ نہیں کرسکتا تھا۔

بالآخر اسی کیفیت میں وہ سو گیا۔رات بھر بغیر خدوخال،بغیر نین نقش کے وہ خواب میں اسی کو دیکھتا رہا!

.....x.....

اگلے روز اوتار سنگھ سو کر اٹھا تو وہ اسی کیفیت میں تھا،جس میں سویا تھا۔اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اڑ کر نیچے پہنچ جائے۔ناشتے تک وہ اپنی اس خواہش کو دبائے بیٹھا رہا۔مگر ناشتے کے بعد ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی بے چینی،اس کا اضطراب بڑھتا گیا۔بلکہ وہ ایک ایسی تڑپ میں تبدیل ہوگیا،جو اسے قدم اٹھانے پر اکسا رہی تھی۔

بالآخر اس کے قدم اٹھے اور وہ زینے پر آ گیا۔اس کی چال میں عجیب سی بے تابی اور مستانہ پن تھا،جو کم از کم اس کے لئے نیا تھا۔ان لمحوں میں اپنا آپ خود اسے بھی اجنبی لگ رہا تھا۔

مگر زینے پر اترتے اترتے اچانک وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔وہ کیا کر رہا ہے.....؟ کہاں جا رہا ہے؟ اور کیوں جا رہا ہے؟ یہ وہ چبھتے ہوئے سوال تھے،جنہوں نے اچانک ہی اس کے قدموں سے تحرک چھین لیا تھا۔

چند لمحے وہ ساکت کھڑا رہا،جیسے وہ سوال اس کی سمجھ میں ہی نہ آئے ہوں۔پھر اس کے اندر جواب ابھرا.....میں اسے دیکھنے جا رہا ہوں۔

اندر کی عدالت میں وکیل استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں ایک اور سوال کیا۔''تمہیں یہ حق کس نے دیا؟''۔

''ماں جی نے''۔

''تو تم ماں جی کے بیٹے کی حیثیت سے ماں جی کی بیٹی کو دیکھنے جا رہے ہو؟''۔

اس ایک لمحے میں اوتار سنگھ کے ہر مسام سے پسینہ بہہ نکلا۔اس کی شرمندگی نے اسے سمجھا دیا کہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں،جتنا نظر آتا ہے۔اس معاملے میں کوئی بڑی گڑبڑ ہے۔اور یہ عدالت زینے پر نہیں لگائی جاسکتی۔

وہ پلٹا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

اپنے کمرے میں،اپنی کرسی پر بیٹھ کر اس نے پہلی بار اس معاملے کو ہر رخ،ہر زاویئے سے دیکھنے کی کوشش کی۔

اب پہلی بار اسے احساس ہوا کہ ماں جی کے دل میں اس کے لئے کیسی سچی اور خالص محبت پیدا ہوئی ہے۔اس کا ثبوت ان کی قربانی تھی۔جو عورت پردہ کرنے والی ہو،جس نے شوہر کی موت کے بعد گھر کے آبائی ملازم سے بھی پردہ کیا ہو،وہ اس کے سامنے آ گئی۔اس نے برسوں کی ریاضت ترک کردی۔یہ اتنا بڑا ایثار تھا،جو صرف سچی محبت کی وجہ سے ہوسکتا ہے۔یہی نہیں،اس نے اپنے گھر کے تمام دروازے اس پر کھول دیئے۔اپنی بچیوں کا پردہ بھی اٹھا دیا۔تو جواب میں اسے کیا کرنا چاہئے۔اسے ایک اچھا اور سچا بیٹا بن کر دکھانا ہوگا۔

سوال یہ تھا کہ ماں جی کے رشتے سے ان کی بیٹیاں اس کے لئے کیا ہیں؟ بہن ہی نا! یہ الگ بات کہ ان میں سے ایک کی آواز سن کر وہ پہلے ہی اس کی محبت کا اسیر ہو چکا تھا۔لیکن اس نے یہ بات کبھی کسی کو نہیں بتائی تھی.....کسی کو بھی نہیں!اور یہ رازداری اس نے صرف اپنی محبت کو رسوائی سے بچانے کے لئے برتی تھی۔تو کیا اب اسے اس رسوائی کی کوئی پروا نہیں رہی ہے؟

اسے احساس ہوا کہ اب تو اس کی ذمے داری اور بڑھ گئی ہے۔ماں جی نے اتنے خلوص سے اسے بیٹا کہا ہے تو اسے بھی بیٹا بن کر دکھانا پڑے گا۔اس لحاظ سے اس کا نیچے جانا تباہ کن ثابت ہوگا۔

یہ وہ موقع تھا کہ اس نے بہت عرصے کے بعد اپنی محبت پر غور کیا۔اب تک اس کی محبت بے طلب تھی۔وہ جس سے محبت کرتا تھا،اس کی اس نے صرف آواز سنی تھی۔اور اسے دیکھنے کی کبھی آرزو بھی نہیں کی تھی۔

لیکن اس وقت اس کے پاس ایسا کوئی موقع بھی نہیں تھا۔جب کہ اب اسے موقع مل رہا ہے۔تو اب اسے دیکھنے کی آرزو اس کے دل میں چٹکیاں لے رہی ہے۔سوال یہ ہے کہ وہ اسے دیکھ بھی لے تو اس کا حاصل کیا ہے؟

یہ تو اسے اب بھی یقین تھا کہ وہ دیکھنے میں کیسی ہی ہو،اسے اس سے کوئی غرض نہیں۔کوئی فرق بھی نہیں پڑتا۔شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتا ہے کہ وہ اس کے لئے نہیں۔درمیان میں مذہب کی دیوار ہے۔وہ مسلمان ہے.....اور مسلمان اس معاملے میں بہت پکے ہوتے ہیں۔یہ بات اسے کالج کی ساتھی نادرہ نے سمجھا دی تھی۔اس کا ہر انداز بتاتا تھا کہ وہ اسے پسند کرتی ہے۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

لیکن دوسری لڑکیوں کے برعکس اس نے کبھی بلاواسطہ اس کا اظہار کسی طرح بھی نہیں کیا تھا۔ وہ کالج میں لڑکوں کے ساتھ پڑھتی تھی۔ یہاں تو معاملہ ایک پردہ دار لڑکی کا تھا۔ جو گھر سے باہر قدم بھی نہیں نکالتی تھی۔ اور وہ دیوی دیوتاؤں کو نہیں مانتا تھا۔ اللہ کا نام لیتا تھا۔ لیکن تھا تو وہ ہندو ہی۔ مسلمان اور ان کے طور طریقے اسے اچھے لگتے تھے۔ لیکن وہ مسلمان تو نہیں تھا۔ ہاں، ہوش سنبھالنے کے بعد سے اب تک وہ کائنات کا نظام چلانے والی مہان ہستی کو کھوجتا آیا تھا۔ اس کی جستجو، اس کی تلاش اب بھی جاری تھی۔ ایک طرح سے یہ اس کی زندگی کا مقصد تھا۔ لیکن وہ کسی لڑکی کی خاطر دھرم تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔ خواہ وہ اس سے کتنی ہی محبت کرتا ہو۔ اس تلاش کے سامنے اس محبت کی حیثیت ثانوی تھی۔

اگر وہ نیچے جاتا ہے، اس لڑکی کو دیکھتا ہے تو اس سے اسے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ امکان یہ ہے کہ وہ ماں کے حوالے سے اسے بھائی کا مقام دے گی۔ اور وہ اسے محبت کی نظر سے دیکھے گا۔ محبت میں وارفتگی ہوتی ہے۔ کہیں اس کی نظروں نے بھید کھول دیا تو وہ اس کے سامنے..... اور سب سے بڑھ کر ماں جی کے سامنے کتنا شرمندہ ہوگا۔ کوئی نہیں مانے گا کہ وہ پہلے سے اس سے محبت کرتا ہے۔ ماں جی تو یہی سمجھیں گی کہ اس نے ان کی دی ہوئی رعایت کا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ وہ ان کی نظروں میں حقیر ہو جائے گا اور اسکی محبت رسوا ہو جائے گی۔ پھر کوئی عورت کسی محروم کو بیٹا نہیں بنائے گی۔

اور اگر بالفرض محال اوپر والے نے اس لڑکی کے دل میں بھی اس کی محبت ڈال دی تو.....؟

یہ خیال بے حد خوش آئند تھا۔ اس کی دھڑکنوں کی لے بدلنے لگی۔

مگر اگلے ہی لمحے اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اس طرح پیچیدگی اور بڑھ جائے گی۔ اس میں تو ماں جی کے گھر کی بڑے پیمانے پر رسوائی کا خدشہ ہے۔ ان دنوں سیاسی صورت حال ویسے ہی خراب تھی۔ ہندوستان کی تقسیم کے معاملے پر اختلاف ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی خلیج بڑھا رہا تھا۔

نہیں..... بہتر یہی ہے کہ وہ اپنی محبت کو پہلے جیسا ہی رہنے دے۔ کسی کو چاند سے محبت ہو جائے تو وہ اس کی چاندنی میں نہا تو سکتا ہے، ہاتھ بڑھا کر اسے چھو تو نہیں سکتا۔ محبت سے جمالیاتی حس کی نمو ہے۔ بس اتنا کافی ہے۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ کبھی نیچے نہیں جائے گا۔ وہ خطرناک رعایتوں سے استفادہ نہیں کرے گا۔

اس نے فیصلہ کر تو لیا۔ لیکن جس بے چینی اور اضطراب سے وہ دوچار ہوا، وہ اس کے لئے نیا بھی تھا اور پریشان کن بھی۔ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ اپنی بے طلبی کھو بیٹھا ہے اور طلب کے عذاب میں گرفتار ہو گیا ہے۔

وہ کوئی کم زور آدمی نہیں تھا۔ لیکن طلب طاقت ور لوگوں کو بھی کم زور کر دیتی ہے۔ بیٹھے بیٹھے اس کے اندر اتنی شدت سے نیچے جانے کا خیال مچلتا کہ اس کے قدم خود بہ خود زینے کی طرف اٹھ جاتے۔ زینے پر ایک دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا۔ جب کہ دوسرا اس کے پہلو میں تھا اور نیچے والے گھر میں کھلتا تھا۔ بے اختیار کئی بار وہ اس دروازے تک پہنچ بھی گیا، جو شاید دونوں طرف سے بند رہتا تھا۔ ہر بار وہ خود کو روک کر..... باندھ کر اوپر لے آیا۔

تین دن میں اوتار سنگھ کو تجربہ ہو گیا کہ طلب کتنی طاقت ور ہوتی ہے۔ وہ مولوی محمد حسین آزاد کو پڑھ چکا تھا۔ جانتا تھا کہ طلب کی کوئی حد نہیں ہوتی اور انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا۔ ایک خواہش پوری ہو تو دو نئی خواہشیں سر اٹھاتی ہیں۔ اور دو پوری ہو جائیں تو چار۔ اس معاملے میں گربہ کشتن روز اول ضروری ہے۔ اگر وہ دل کے پہلے ہی مطالبے کے سامنے سپر ڈال دے گا تو ایک کے بعد ایک مطالبات اس کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو جائیں گے۔ انسان طلب کا عادی ہو جائے تو کسی حال میں مطمئن اور خوش نہیں رہتا۔ آج وہ نیچے جانے کو مچل رہا ہے تو کل اسے دیکھنے کو بے تاب ہوگا۔ پھر اظہار محبت کی بے چینی ہوگی۔ اس کے بعد اسے چھونے کی..... اور نہ جانے یہ سلسلہ کہاں رکے گا۔

وہ سمندر کی طرح بپھرتی بے چینی اور اضطراب سے لڑتا رہا۔ زینے پر جا کر واپس آتا رہا۔ لیکن اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ طلب کا گلا گھونٹ کر رہے گا!

.....x.....

سرفراز بیگم چھوٹے ٹھاکر کو پیسے لوٹ کر آئیں تو بہت ہلکی پھلکی تھیں۔ چھوٹے ٹھاکر کے لئے ان کی ممتا ایسے امنڈی تھی کہ اتنا پیار انہیں اپنی کسی بیٹی پر بھی نہیں آیا تھا۔ ان کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ لگتا تھا کہ ان کی برسوں پرانی بیٹے کی آرزو پوری ہو گئی ہے۔

لیکن اس رات وہ سونے کیلئے لیٹیں تو ان کا دل وسوسوں سے بھر گیا۔ بیٹا پانے کی خوشی میں انہیں احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ کتنی بڑی بات کہہ آئی ہیں۔ اسے نبھانا کتنا مشکل ہے، یہ وہ اب سوچ رہی تھیں۔

وہ چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں جو کچھ جانتی تھیں، اس کی روشنی میں سوچ رہی تھیں۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ وصال دین کو وہ بھائی کی طرح چاہتا تھا۔ لیکن بہن کیا ہوتی ہے، یہ اسے نہیں معلوم تھا۔ رنجنا بتاتی تھی کہ وہ کبھی لڑکیوں میں نہیں رہا۔ اس کا بہن کا خانہ خالی ہی رہا تھا۔ ماں سے بھی وہ کم عمری ہی میں محروم ہو گیا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ اسے لڑکیوں کا کوئی تجربہ نہیں۔ وہ ایک ایسے کالج میں پڑھتا تھا، جہاں لڑکے اور لڑکیاں ساتھ پڑھتے تھے۔ دوسرے انہوں نے تھوڑی دیر میں یہ بات سمجھ لی تھی کہ اس کی تربیت بہت اچھی ہوئی ہے۔ وہ بہت شائستہ مزاج اور خوش اطوار لڑکا تھا۔

مگر وہ اس کا کیا کرتیں کہ آگ اور تیل کی قربت کو ہمیشہ منع کیا گیا ہے۔ اور انہوں نے آگ اور تیل کو قریب کرنے کا سامان کر دیا تھا۔ اب بہر حال وہ کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ واپس نہیں آ سکتا تھا۔ انہوں نے یہ کہہ کر خود کو تسلی دے لی کہ اسے بیٹا بنانے کے بعد انہیں یہی کہنا تھا۔ ان کے سامنے دوسرا کوئی راستا نہیں تھا۔ بیٹا ہوگا تو گھر میں آئے گا بھی۔ ان کی نیت اچھی ہے تو انشا اللہ نقصان بھی نہیں ہوگا۔

اگلی صبح انہوں نے اس سلسلے میں بچیوں سے بات کی یہ بھی ضروری تھا کہ انہیں پہلے سے اس صورت حال کے لئے ذہنی طور پر تیار کیا جائے۔

انہوں نے تینوں بچیوں کو سامنے بٹھا کر کہا۔ ''میں نے چھوٹے ٹھاکر کو بیٹا بنا لیا ہے۔ اب وہ ہمارے گھر کا ایک فرد ہے۔ اس رشتے سے وہ تمہارا بھائی ہوا''۔

''اللہ، کتنا اچھا لگے گا اماں۔ مجھے تو ہمیشہ یہ سوچ کر افسوس ہوتا تھا کہ اللہ نے ہمیں بھائی نہیں دیا''۔ گلنار نے چہک کر کہا۔ وہ اس خبر سے کھل اٹھی تھی۔

''وہ گھر میں آئے گا تو تم لوگ اس سے پردہ نہیں کرو گی''۔ سرفراز بیگم نے مزید کہا۔ اب وہ غور سے لڑکیوں کے چہرے دیکھ رہی تھیں۔ گلنار تو خوش نظر آ رہی تھی۔ حور بانو کی آنکھوں میں ایک پل کو ایک تاثر سا چمکا تھا۔ لیکن اگلے ہی پل وہ بے تاثر ہو گئیں۔ اس تاثر کو سرفراز بیگم نے دیکھا تو لیکن سمجھ نہیں سکیں۔ بہر حال یہ طے تھا کہ اس کا ردعمل منفی نہیں تھا۔

لیکن نور بانو کی طرف دیکھ کر انہیں تشویش ہونے لگی۔ اس کے چہرے پر ناپسندیدگی کا تاثر بالکل واضح تھا۔ ''کیا بات ہے نور بانو۔ تم اتنی چپ کیوں ہو؟''۔ انہوں نے اس سے پوچھا۔

''کچھ نہیں اماں''۔

''تمہیں کوئی اعتراض ہے؟''۔

''آپ ماں ہیں۔ آپ کے فیصلے پر ہم اعتراض کیسے کر سکتے ہیں''۔

اس کا لہجہ صاف بتا رہا تھا کہ اسے اعتراض ہے۔ سرفراز بیگم عقل مند خاتون تھیں۔ جانتی تھیں کہ اعتراض کا دبا رہنا اچھا نہیں۔ اس کا اظہار ہونا چاہئے۔ اظہار معاملات کی سنگینی کو کم کر دیتا ہے۔ ''نہیں نور بانو، ایسا نہیں۔ تمہیں اعتراض کا حق ہے۔ تم کھل کر اعتراض کر سکتی ہو۔ کہو، کیا بات ہے؟''۔

نور بانو اب بھی ہچکچا رہی تھی۔ ''اماں..... یہ گستاخی ہوگی''۔

''میں اجازت دے رہی ہوں''۔

''اماں..... میں سمجھتی ہوں کہ آپ نے اچھا نہیں کیا''۔ نور بانو نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''یہ بات تم کیوں کہہ رہی ہو؟''۔ سرفراز بیگم نے نرم لہجے میں پوچھا

''ان رشتوں کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہوتی جو انسان خود بنا لیتا ہے''۔ نور بانو بولی۔ ''کسی کو بیٹا بنا لیا جائے تو وہ حقیقی بیٹا نہیں بن جاتا۔ اسے وہ حقوق حاصل نہیں ہو جاتے، جو حقیقی بیٹے کے ہوتے ہیں۔ نہ بیٹا بنانے والے پر اس کے تمام فرائض واجب ہوتے ہیں۔ یہ تو ایک جذباتی معاملہ ہے''۔

سرفراز بیگم سمجھ گئیں کہ وہ سورہ نور کے حوالے سے بات کر رہی ہے، جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منہ بولے بیٹے زید بن حارث کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے اپنا فیصلہ سنایا ہے۔ اب وہ اس سے اختلاف نہیں کر سکتی تھیں۔ چند لمحے سوچنے کے بعد انہوں نے کہا۔ ''لیکن بیٹا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم یتیموں پر خاص طور پر شفقت فرماتے تھے۔ اور یہ اللہ کا حکم بھی ہے''۔

''اماں، ہر معاملے میں اعتدال کا حکم بھی تو دیا گیا ہے۔ آپ چھوٹے ٹھاکر پر بے شک شفقت کریں۔ لیکن آپ کے بیٹا کہہ دینے سے وہ آپ کا بیٹا اور ہمارا بھائی نہیں بن جائے گا۔ ہمارے لئے اس کے سامنے آنا جائز نہیں''۔

''تم اماں سے بحث کر رہی ہو''۔ حور بانو نے اسے ٹوکا۔ ''ماں کی نافرمانی کو بھی تو منع کیا ہے اللہ نے''۔

''اماں نے مجھے اجازت دی ہے۔ بلکہ اصرار کیا ہے''۔ نور بانو نے کہا۔ ''اور والدین کا حکم اگر اللہ کے حکم سے متصادم ہو تو والدین کی نافرمانی بری بات نہیں۔ اللہ کے حکم کے سامنے تو کسی کی کوئی حیثیت نہیں''

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''تم بدتمیزی کر رہی ہو''۔حور بانو نے سخت لہجے میں کہا۔''ایک شخص پر جو کم عمر بھی ہے،اتنا بڑا سانحہ گزرا ہے کہ اس کا سب کچھ لٹ گیا۔دکھ سے اس کا کیا حال ہوگا۔ایسے میں اسے ہمدردی کی ضرورت ہے۔سچ تو یہ ہے کہ اب ہمارے سوا اس کا کوئی نہیں۔وہ کرائے دار کی حیثیت میں سہی،ہمارے ہی گھر میں رہتا ہے۔ہم اس کے نزدیک ترین پڑوسی ہیں۔اس کی دل جوئی ہماری انسانی ذمے داری ہے۔اللہ اس سے منع نہیں فرماتا''۔

''میں اس کی دل جوئی کے خلاف نہیں ہوں۔لیکن مجھے اس رشتے سے اختلاف ہے۔ہر بات کی کوئی حد ہوتی ہے۔سب سے بڑی بات یہ کہ کسی کافر اور مشرک سے رشتہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔میں پردہ ختم کرنے کے خلاف ہوں''۔نور بانو کے لہجے میں قطعیت تھی۔

حور بانو کا چہرہ تمتما اٹھا۔کافر اور مشرک کے حوالے نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔نور بانو نے اس کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی۔چھوٹے ٹھاکر کی محبت میں گرفتار ہونے کے بعد وہ خود بھی تو اسی پہلو سے سوچتی رہتی تھی۔لیکن جب اسے پتا چلا کہ وہ عربی پڑھتا ہے اور اپنے استاد سے قرآن سنتا ہے تو اس کے دل نے کہا تھا کہ وہ مشرک نہیں ہے۔بلکہ ممکن ہے کہ اسلام بھی قبول کر لے۔اور اس کے قرآن سننے کی گواہ تو خود نور بانو تھی۔

چناں چہ اس نے تڑپ کر کہا۔''تم تو ایسے بات کر رہی ہو،جیسے وہ انسان ہی نہیں ہے اور ذرا یہ تو بتاؤ،وہ کیسا کافر اور مشرک ہے جو قرآن کی تلاوت سنتا ہے اور عربی پڑھتا ہے''۔

یہ سن کر سرفراز بیگم چونکیں اور انہوں نے غور سے حور بانو کو دیکھا۔''کیا یہ سچ ہے؟''۔

''نور بانو سے پوچھ لیں''۔

سرفراز بیگم نور بانو کی طرف مڑیں۔ان کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی نور بانو نے کہا۔''یہ سچ ہے۔لیکن اماں،آپ ہی بتائیں،کیا اس بات سے اس کے کفر اور شرک میں کوئی فرق پڑتا ہے''۔

''فرق کیوں نہیں پڑتا''۔حور بانو بولی۔''اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اسلام کی طرف مائل ہے''۔

سرفراز بیگم اس اطلاع سے اچنبھے میں بھی تھیں اور خوش بھی ہوئی تھیں۔مگر وہ جانتی تھیں کہ نور بانو کا موقف درست ہے۔دین کے خلاف جانے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔اور انہیں نور بانو پر فخر ہو رہا تھا۔پڑھائی رائیگاں نہیں تھی۔اس نے بچیوں میں دین کی سمجھ پیدا کی تھی۔بلکہ عملی زندگی میں اس کی افادیت بھی ثابت کر دی تھی۔

چند لمحے سوچنے کے بعد انہوں نے کہا۔''مجھے احساس ہو گیا ہے کہ جذباتیت میں،میں حد سے گزر گئی تھی۔اب بات میرے منہ سے نکل چکی ہے۔اور میں نے چھوٹے ٹھاکر سے یہ بھی کہا تھا کہ میں نے رسماً یہ بات نہیں کہی ہے۔لیکن میں تم لوگوں کو مجبور نہیں کروں گی۔چھوٹے ٹھاکر کو میں سمجھا کر معذرت کر لوں گی''۔

''میں آپ کی بات رکھوں گی اماں''۔حور بانو نے کہا۔

''اور میں تو انہیں بھائی ہی سمجھوں گی''۔گلنار بولی۔

نور بانو خاموش رہی۔اس کے چہرے پر ناگواری کا تاثر تھا۔

.....x.....

ان کی سوچیں مختلف تھیں،محرکات جدا تھے۔لیکن مشترک بات یہ تھی کہ وہ سب حالت انتظار میں تھے۔انہیں اپنے گھر میں چھوٹے ٹھاکر کی آمد کا انتظار تھا۔

سرفراز بیگم ڈر رہی تھیں۔ان کا ڈر دو دھاری تلوار کی طرح تھا۔انہیں احساس تھا کہ انہوں نے گھر کی عزت کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔انہیں انگلیاں اٹھنے کا خوف بھی تھا اور یہ ڈر بھی تھا کہ انہیں چھوٹے ٹھاکر کے سامنے شرمندگی ہوگی۔کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ نور بانو اس کے سامنے ہرگز نہیں آئے گی۔لیکن یہ بھی سچ تھا کہ وہ چھوٹے ٹھاکر کی آمد کی منتظر تھیں۔ان کی کیفیت ایسی تھی،جیسے برسوں کے بعد ان کا بچھڑا ہوا بیٹا گھر آ رہا ہو۔

حور بانو کے لئے وہ بے حد ہیجانی خوشی میں لپٹا ہوا انتظار تھا۔لیکن اسے اپنا ہیجان چھپائے رکھنا تھا۔کیونکہ اس کے دل میں چور تھا۔اس کے لئے یہ تصور ہی بے حد سنسنی خیز تھا کہ چھوٹا ٹھاکر نیچے آئے گا.....گھر کے فرد کی طرح۔وہ اسے دیکھ سکے گی۔اس کی باتیں سن سکے گی۔اس سے باتیں کر سکے گی۔وہ جانتی تھی کہ اسے حجاب آئے گا۔وہ اس کے سامنے شاید چند لمحوں سے زیادہ نہیں بیٹھ سکے گی۔اور شاید اس کے روبرو اس کی زبان بھی نہ کھلے۔بہر حال وہ دور سے سہی،چپکے چپکے اسے دیکھتی تو رہے گی،اس کی باتیں سنتی تو رہے گی۔اس کے لئے یہ چھوٹی سی معصوم سی خوشی بھی بہت بڑی تھی۔اس سے آگے،اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے،یہ اسے معلوم ہی نہیں تھا۔

خوشی گلنار کو بھی اتنی ہی تھی۔مگر اسے کوئی ضرورت نہیں تھی کہ وہ اسے چھپائے۔وہ کھل کر اس کا اظہار کر رہی تھی۔بھائی اس کے لئے ایسی نعمت تھا،جس کی اسے بچپن سے آرزو تھی۔لیکن پھر اس نے اس پر صبر کر لیا تھا۔یہ تسلیم کر لیا تھا کہ یہ نعمت اس کے نصیب میں ہے ہی نہیں۔اب اسے بیٹھے بٹھائے ایک بھائی مل رہا تھا تو اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔وہ تو ہر لمحے اس کی آمد کا انتظار کر رہی تھی۔گھر میں وہ واحد ہستی تھی،جسے چھوٹے ٹھاکر کی آمد کے تصور سے کوئی خوف نہیں تھا۔صرف خوشی تھی۔اس کے بس میں ہوتا تو وہ خود اوپر جاتی اور چھوٹے ٹھاکر کا ہاتھ تھام کر کہتی.....ٹھاکر بھیا،آؤ میرے ساتھ گھر چلو۔

اور حور بانو تھی،جسے ماں پر افسوس ہو رہا تھا۔وہ حیران تھی کہ اماں نے اتنی بڑی بات کہہ کیسے دی۔اب وہ چھوٹا ٹھاکر نیچے آئے گا.....اور وہ اس کے سامنے نہیں آئے گی،تو اماں کی بات جائے گی۔انہیں شرمندگی ہوگی۔اور وہ ٹھاکر اس کے بارے میں کیا سوچے گا.....یہ کہ وہ کتنی نافرمان ہے۔ماں کی بات نہیں مانتی۔لیکن اللہ کے حکم کے سامنے وہ کسی سے کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتی تھی۔کسی کا لحاظ نہیں کر سکتی تھی۔اس کا فیصلہ اٹل تھا۔

اس روز ان سب کا عجیب حال تھا۔ان کے کان زینے کے بغلی دروازے پر لگے تھے۔شام کے وقت اس دروازے پر دستک ہوئی۔سب کے دل دھڑک اٹھے۔چھمن بوا دروازہ کھولنے چلی گئیں۔

مگر آنے والی رنجنا تھی!

رنجنا نے کچھ دیر ان لوگوں سے باتیں کیں۔پھر وہ چلی گئی۔

رات ہو گئی۔سرفراز بیگم کی اعصابی کشیدگی کا یہ حال تھا کہ اس روز انہیں چھوٹے ٹھاکر کے لئے آلو پالک میتھی کی بھجیا بھجوانے کا خیال بھی نہیں آیا،جس کے بارے میں وہ جانتی تھیں کہ وہ بہت شوق سے کھاتا ہے۔

اگلا دن پچھلے دن سے زیادہ سخت تھا۔گھر کی فضا کشیدہ تھی۔نور بانو نے خود کو بہنوں سے الگ تھلگ کر لیا تھا۔زیادہ بات تو وہ ویسے بھی نہیں کرتی تھی۔لیکن اس روز تو وہ ماں سے بھی ہم کلام نہیں ہوئی۔انہوں نے کچھ پوچھا تو اس نے جواب دے دیا۔اس کی ناراضی ایک کھلی ہوئی بات تھی۔

ویسے اس روز انہیں یقین تھا کہ چھوٹا ٹھاکر نیچے ضرور آئے گا۔لیکن اس روز تو دروازے پر کوئی دستک ہی نہیں ہوئی۔

شام کو گلنار سرفراز بیگم کے پاس آ بیٹھی۔''اماں.....ٹھاکر بھیا آئے کیوں نہیں؟''۔

سرفراز بیگم کو اس پر پیار آ گیا۔ان کے جوڑے ہوئے اس رشتے کے حوالے سے وہ بھائی کے لئے کیسے تڑپ رہی تھی۔''اب مجھے کیا پتا بیٹا۔وہ اپنی مرضی کا مالک ہے''۔

''کہیں انہوں نے ہماری بحث تو نہیں سن لی اماں؟''۔

سرفراز بیگم نے اسے بہت غور سے دیکھا۔تینوں بہنوں کے درمیان ڈیڑھ ڈیڑھ سال کا فرق تھا۔یعنی وہ حور بانو سے تین سال اور نور بانو سے ڈیڑھ سال چھوٹی تھی۔مگر کہتے ہیں نا کہ گھر کا سب سے چھوٹا بچہ ہمیشہ چھوٹا ہی رہتا ہے۔تو وہ اتنی بڑی ہو کر بھی چھوٹی سی بچی ہی تھی۔''اے ہے گلنار،کیا بولا گئی ہو۔نیچے کمرے میں ہونے والی بات اوپر والے کیسے سن سکتے ہیں''۔انہوں نے کہا۔

''تو پھر وہ کیوں نہیں آئے اماں؟''۔

''اب یہ تو مجھے نہیں معلوم''۔

''تو آپ خود انہیں بلا لیں نا''۔

''نہیں بیٹا۔مجھے اس سے جو کہنا تھا،وہ میں کہہ چکی۔اور اس پر شرمندہ بھی ہوں۔اب غلطی نہیں کروں گی''۔

''آپی بہت خراب ہیں اماں''۔گلنار کے لہجے میں سختی تھی۔

''ایسا مت کہو گلنار۔حور بانو نے جو کہا،وہ بالکل درست تھا''۔

تیسرے دن دوپہر کے وقت اچانک سرفراز بیگم کی شرمندگی اور ہر خوف مٹ گیا۔مامتا کے سوا کچھ نہیں رہا۔دو دن ہو گئے۔میں نے بچے کی خبر تک نہیں لی۔انہوں نے سوچا اور چھوٹے ٹھاکر سے ملنے کو بے تاب ہو گئیں۔

''میں ذرا اوپر جا رہی ہوں''۔انہوں نے اعلان کرنے والے انداز میں کہا۔

.....x.....

اوتار سنگھ خود پر جبر کئے بیٹھا تھا۔اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ بلانے پر بھی نیچے نہیں جائے گا۔اس کے لئے دھیان بٹانا کچھ مشکل بھی نہیں تھا۔ایک ایسا مسئلہ تھا جس پر وہ اکثر سوچتا رہتا تھا۔

جے پور میں جو کچھ ہوا تھا،وہ اس نے کسی کو نہیں بتایا تھا۔اخبار میں ٹھاکروں کی گڑھی کی لال آندھی میں تباہی کی خبر تو چھپی تھی۔لیکن جے پور والوں کے حملے کا کوئی تذکرہ نہیں تھا۔البتہ اسی نے اپنے گاؤں میں حویلی کے سامنے اور حویلی کے احاطے میں ان حملہ آوروں کی لاشیں دیکھی تھیں۔اس کا اندازہ تھا کہ ان کی تعداد سو سے اوپر ہی ہوگی۔اسے حیرت تھی کہ کسی شہر کے اتنے آدمی کہیں مارے جائیں اور ہلچل بھی نہ مچے،یہ کیسے ہو سکتا ہے۔بہر حال اس نے مناسب یہی سمجھا تھا کہ کسی سے ان واقعات کا تذکرہ نہ کرے۔

اب کچھ ہی دنوں میں امتحان کا رزلٹ آنے والا تھا۔اس کے بعد کالج کا سلسلہ پھر شروع ہو جاتا۔کالج جانے پر اس کی ملاقات ارجن سے ہونی تھی۔وہ اس وقت سے ڈر بھی رہا تھا اور اس کا سامنا بھی کرنا چاہتا تھا۔ارجن سے ملاقات پر سب کچھ واضح ہو جاتا۔

اس وقت بھی وہ اسی بارے میں سوچ رہا تھا کہ نیچے سے بڑی بیگم آ گئیں۔انہوں نے آ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور دعا دی۔

''ماں جی،کیسی ہیں آپ؟''۔

''میں ٹھیک ہوں چھوٹے ٹھاکر۔اللہ کا شکر ہے''۔

اوتار سنگھ کو ان کا جواب بہت اچھا لگا۔لیکن چھوٹے ٹھاکر کہہ کر پکارا جانا اچھا نہیں لگا۔''آپ مجھے بیٹا کہتی ہیں ماں جی اور چھوٹے ٹھاکر کہہ کر پکارتی ہیں''۔اس نے بڑے ادب سے اعتراض کیا۔''مجھے اچھا نہیں لگتا ماں جی''۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں نے خیال نہیں کیا اور تمہیں یہ تکلیف پہنچی۔اب ایسا نہیں ہوگا''۔سرفراز بیگم نے کہا۔''اچھا،یہ بتاؤ تمہاری ماں تمہیں کیسے پکارتی تھیں؟''۔

''ماتا جی!''اوتار سنگھ نے کہا اور چند لمحوں کے لئے ماتا جی کی یاد میں کھو گیا۔بہتر عرصے کے بعد اس نے انہیں اس طرح یاد کیا تھا۔ان کی صورت اس کی نگاہوں میں پھر گئی۔

''ماتا جی مجھے پتر کہہ کر بلاتی تھیں۔کبھی،چھوٹے ٹھاکر بھی کہتی تھیں''۔

''تب تو تمہیں میرا چھوٹے ٹھاکر کہنا برا نہیں لگنا چاہئے تھا''۔

''دیکھیں نا ماں جی،ایک فرق ہے۔ماتا جی کی زبان،ان کی بولی اور تھی۔وہ تو پتا جی کو بھی ٹھاکر جی کہہ کر پکارتی تھیں''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''میں سمجھ گئی۔ میں تمہیں چھوٹے ٹھاکر کہوں تو تمہیں اجنبیت کا احساس ہوتا ہے''۔

''جی ماں جی، یہی بات ہے''۔

''اچھا۔ مجھے بتاؤ تو، تمہاری ماتا جی کیسی تھیں؟''۔

''لفظ ماں تو اچھائی کی، بڑائی کی، محبت کی ضمانت ہے ماں جی''۔ اوتار سنگھ نے سادگی سے کہا۔

سرفراز بیگم اس کے جواب کی گہرائی سے حیران ہوگئیں۔ انہیں احساس ہوگیا کہ وہ بہت حساس، ذہین اور سوچنے والا لڑکا ہے۔

''ماتا جی مجھ سے بہت زیادہ پیار کرتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ میں ان کے لئے بھگوان کا سب سے بڑا تحفہ ہوں''۔ اوتار سنگھ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ پھر اس نے بتایا کہ وہ کس طرح منتوں مرادوں کا بیٹا تھا۔ ماتا جی کے بیاہ کے برسوں بعد اس وقت پیدا ہوا تھا، جب ماتا جی اولاد کی طرف سے مایوس ہو بیٹھی تھیں۔ وہ خوب اتیں کرتا رہا۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ ماتا جی کے متعلق بات کرنے کو ترسا ہوا تھا۔ کبھی کسی نے اس موضوع پر بات ہی نہیں کی تھی کہ ایسا موقع ملتا۔ اب موقع ملا تھا تو اسے ایک ایک بات یاد آرہی تھی۔ ''ماتا جی میرے لئے اپنے ہاتھ سے کھانا بناتی تھیں۔ میرا ہر کام خود کرتی تھیں۔ کسی کو نہیں کرنے دیتی تھیں''۔

''تمہیں تو ان کے انتقال کا بہت دکھ ہوا ہوگا؟''۔

''بہت زیادہ ماں جی، بہت زیادہ۔ پہلے تو لگا کہ میں بھی مر جاؤں گا۔ پھر جیسے آہستہ آہستہ زخم ٹھیک ہوتا جاتا ہے، میں انہیں بھولنے لگا۔ مجھے اس پر افسوس ہوا کہ میں اتنی اچھی ماتا جی کو اتنی آسانی سے بھول گیا.....''۔

''اللہ آدمی کو صبر دیتا ہے بیٹے۔ ورنہ آدمی کسی محبت کرنے والے کو کھو کر مر جائے''۔ سرفراز بیگم نے کہا۔

''تبھی تو پہلی بار میری سمجھ میں یہ بات آئی تھی''۔ اوتار سنگھ بولا۔

''کون سی بات؟''۔ سرفراز بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

''یہی کہ اوپر والا اپنی مخلوق سے بہت محبت کرتا ہے۔ آدمی کو زخم لگتا ہے تو زخم پر مرہم وہی رکھتا ہے''۔

سرفراز بیگم کی حیرت اور بڑھ گئی۔ ''تمہاری ماتا جی کا انتقال کب ہوا تھا؟''۔ انہوں نے پوچھا۔

''پانچ سال ہو چکے ہیں''۔

''اتنے عرصے سے تمہاں سے محروم ہو''۔ سرفراز بیگم نے تاسف سے کہا۔

''نہیں ماں جی۔ میں اس معاملے میں بہت خوش نصیب ہوں''۔ اوتار سنگھ نے کہا۔ ''میں پیدا ہوا تو میری ایک ماں تھی۔ لیکن تین دن بعد مجھے دوسری ماں بھی مل گئی''۔

''دوسری ماں! وہ کیسے؟''۔

''میرے ویر جی تھے نا، ان کی ماں میری دوسری ماں تھیں..... تھیں نہیں، ہیں''۔

''ویر جی تم وصال دین کو ہی کہتے تھے نا؟''۔

''جی ماں جی۔ وہ سچ مچ میرے بھائی تھے''۔ اوتار سنگھ وصال دین کے تذکرے پر اداس ہوگیا۔

''تو وہ تو مسلمان تھا''۔ سرفراز بیگم کے لہجے میں شاک تھا۔ ''تو کیا تمہارے پتا جی نے.....''۔

ایک شائیبہ میں اوتار سنگھ کی سمجھ میں آگیا کہ وہ کیا سمجھ رہی ہیں۔ اسے افسوس ہوا، اس نے بات ہی ایسے پیرائے میں کہی تھی۔ ''نہیں ماں جی..... ایسا سوچئے گا بھی نہیں''۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''ماں جی، سچی محبت کا رشتہ اوپر والا بناتا ہے۔ وہ دلوں میں محبت ڈالتا ہے۔ ایسے رشتے نہ کبھی ٹوٹتے ہیں، نہ خراب ہوتے ہیں پتا جی نے مجھے بتایا تھا کہ میری زبان سے جو پہلا لفظ ادا ہوا، وہ اماں تھا۔ اماں کہہ کر ہی میں نے بولنا سیکھا تھا''۔

''حیرت کی بات ہے''۔ سرفراز بیگم کے لہجے میں بھی بے پناہ حیرت تھی۔

اوتار سنگھ بہت تیزی سے سوچ رہا تھا۔ باتوں باتوں میں بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ ایک پل میں اس نے سمجھ لیا کہ ماں جی کیا سوچ رہی ہیں۔ اور جو کچھ وہ سوچ رہی تھیں، وہ غیر فطری نہیں تھا، وہ جانتی تھیں کہ اس کے پتا جی بڑے زمین دار تھے..... گاؤں کے مالک..... اور جاگیردار کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ تو گویا انہوں نے..... اماں..... اس سے آگے اس سے سوچا بھی نہیں گیا۔ اس کے مرے ہوئے باپ کی کردار کشی ہو رہی تھی۔ یہی نہیں، اماں کی پاک دامنی پر حرف آرہا تھا۔ اسے یہ سب نہیں ہونے دینا تھا۔ روکنا تھا۔

پچھلی بار گرمیوں کی چھٹیوں میں پتا جی نے اسے ایک راز کی بات بتائی تھی اور کہا تھا کہ وہ کبھی یہ بات کسی سے نہ کہے۔ ''میں تمہیں صرف اس لئے بتا رہا ہوں کہ تم بے خبر نہ رہو۔ بے خبری میں کوئی گستاخی نہ کر بیٹھو۔ حمیدہ بہن تمہاری ماتا جی کی طرح ہے.....''

لیکن اب اوتار سنگھ نے سمجھ لیا کہ اسے وہ بات ماتا جی کو بتانا پڑے گی۔ ''ماں جی، میں آپ کو ایک راز کی بات بتا رہا ہوں۔ کسی سے کہئے گا نہیں''۔

سرفراز بیگم سنبھل کر بیٹھ گئیں۔ جیسے خود کو کسی بڑے دھماکے کے لئے تیار کر رہی ہوں۔

اوتار سنگھ نے جو کچھ پتا جی سے سنا تھا، وہ انہیں بتا دیا۔ وہ حیرت سے منہ کھولے سنتی رہیں۔

سب کچھ سننے کے بعد چند لمحے تو وہ سناٹے کی سی کیفیت میں بیٹھی رہیں۔ پھر انہوں نے کہا ''کیسی حیرت انگیز اور ناقابل یقین بات ہے۔ میں نے سنا ہے کہ راج پوت اپنے خون میں ملاوٹ کسی طرح گوارا نہیں کرتے''۔

''بالکل ٹھیک ہے ماں جی۔ لیکن میں کچھ بھی نہیں لے رہا تھا اور رو رو کر الگ توانائی ختم کر رہا تھا۔ ڈاکٹروں نے کہہ دیا تھا کہ وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ اور اب میرے پیٹ میں کچھ نہیں گیا تو میں مر جاؤں گا۔ اور میں شاید بیس برس کی منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوا بچہ تھا۔ پتا جی کو ہار ماننا پڑی''۔ اوتار سنگھ نے کچھ توقف کیا۔ پھر بولا۔ ''اس بات کا علم میرے ماتا پتا اور ویر جی کے ماں باپ کے سوا کسی کو نہیں تھا۔ اور پتا جی نے اس کے بعد اماں، چاچا جی اور ویر جی کو اتنی عزت دی کہ اپنے کسی رشتے دار کو بھی نہیں دی تھی۔ اماں کو وہ حمیدہ بہن کہتے تھے اور اس عزت کی خاطر ہی انہوں نے یہ راز مجھے بتایا۔ انہوں نے کہا تھا، حمیدہ بہن تمہاری ماں ہے۔ اسے ماتا سمان سمجھنا۔ کبھی گستاخی نہ کرنا''۔

سرفراز بیگم نے جو کچھ سنا تھا، اسے ہضم کرنے، ترتیب دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔ چند لمحے بعد انہوں نے کہا۔ ''تمہارے پتا جی بلاشبہ بڑے آدمی تھے۔ احسان ماننا بڑی بات ہے۔ اللہ کو بہت پسند ہے''۔

اوتار سنگھ نے سکون کا سانس لیا۔ اس نے ایک غلط تاثر زائل کر دیا تھا۔

''تو اب تم دوسری ماں سے بھی محروم ہوگئے''۔ سرفراز بیگم نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن اللہ نے تمہیں ایک اور ماں دے دی''۔

''نہیں ماں جی، اماں زندہ ہیں۔ اماں مجھے چھوڑ کر نہیں گئیں''۔ اوتار سنگھ نے تڑپ کر کہا۔ ''اب بھی میری دو مائیں ہیں''۔

سرفراز بیگم نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔ ''پورا گاؤں ختم ہوگیا۔ آس پاس کا کوئی گاؤں نہیں بچا۔ پھر تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو''۔

''مجھے معلوم ہے ماں جی۔ میں ان سے.....''۔ اوتار سنگھ کہتے کہتے رک گیا۔ اسے بروقت احساس ہوگیا کہ وہ ایک اور راز فاش کرنے جا رہا تھا۔ ''میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ ان کی موجودگی محسوس کر سکتا ہوں''۔ اس نے جلدی سے بات بدل دی۔ پھر اس نے وہ سچی بات کہہ دی، جو وہ کہہ سکتا تھا۔ ''اور اماں جب آخری بار مجھ سے ملی تھیں تو انہوں نے مجھ سے انشا اللہ کہہ کر وعدہ کیا تھا کہ میں تعلیم مکمل کر کے واپس آؤں گا تو وہ مجھے ملیں گی۔ وہ اللہ پر بہت بھروسہ کرتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ ان کے وعدے کی شرم رکھے گا''۔

سرفراز بیگم نے ہمدردانہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ انہیں یقین ہوگیا کہ وہ اپنی اماں سے بے حد محبت کرتا ہے..... غیر معمولی محبت! اس کے پتا جی بھی اس گاؤں میں تھے اور اماں بھی۔ اس نے باپ کی موت کو تو تسلیم کر لیا۔ لیکن اماں کی موت کو تسلیم نہیں کرتا۔ حالانکہ دونوں کے امکانات ایک جیسے تھے۔ خیر..... ان کے لئے یہ ہرگز مناسب نہیں کہ وہ اس کی یہ امید توڑ دیں۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ''جو اللہ کرے گا، اسی میں تمہاری بہتری ہوگی بیٹے''۔

''جی ماں جی۔ مجھے بھی اس بات کا یقین ہے''۔

.....x.....

سرفراز بیگم اس بار نیچے آئیں تو سوچنے کا بہت سامان لے کر آئی تھیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اوتار سنگھ ان کے دل و دماغ پر چھا گیا تھا۔ انہوں نے بچیوں سے تو کچھ نہیں کہا۔ لیکن جب بھی وہ فرصت میں ہوتیں، اسی کے بارے میں سوچنے لگتیں۔

کیسی ناقابل یقین کہانی تھی..... پریوں کی کہانی! برسوں کی دعاؤں، منتوں اور مرادوں کے بعد ایک راج پوت جاگیردار کے ہاں بیٹا پیدا ہوتا ہے۔ اس کی ماں کے دستر خوان پر دودھ کی کوئی کمی نہیں۔ لیکن وہ ماں کا دودھ قبول نہیں کرتا۔ پھر وہ بے زبان بچہ دودھ مانگتا ہے تو ایک مسلمان عورت کا۔ اور ہندوؤں کے اس گاؤں میں وہ واحد مسلمان گھرانہ ہے۔ راج پوتوں کی آن یہ گوارا نہیں کرتی کہ بچہ ان کا ہو اور اسے دودھ کوئی اور پلائے۔ چلو وہ کسی عام ہندو عورت کا دودھ طلب کرتا تو بھی ماننے والی بات تھی لیکن وہ تو ایک مسلمان عورت کا دودھ مانگ رہا ہے۔ مسلمان، جسے عام ہندو بھی ملیچھ کہتے ہیں راج پوت یہ کیسے گوارا کرے۔

لیکن وہ بچہ بھی تو راج پوت ہے۔ ننھا سا بچہ اور ایسی ضد کو زبردستی بھی اس کے منہ میں کچھ نہیں ڈالا جا سکتا۔ وہ رو رو کر ہلکان ہوا جا رہا ہے، سست روی سے موت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ تین دن ہوگئے ہیں اور اس کے منہ میں کھیل بھی اڑ کر نہیں گئی۔ اس ماں پر کیا گزر رہی ہوگی، جو بیس برس سے بچے کو ترس رہی تھی۔ اب اس کی آرزو پوری ہوئی ہے۔ اس کے پاس بچہ بھی ہے اور دودھ بھی۔ لیکن بچہ اس کا دودھ قبول نہیں کر رہا ہے۔ یہ کیسی توہین ہے ممتا کی کہ دودھ میں کوئی خرابی نہیں۔ لیکن بچہ کسی اور کا دودھ مانگ رہا ہے..... وہ بھی ایک مسلمان عورت کا۔

آخر ممتا جیت جاتی ہے۔ ماں کو اپنا بچہ چاہئے۔ چاہے وہ کسی کا دودھ پیئے۔ چاہے وہ اس کی ممتا کی توہین کرے۔ بس وہ زندہ رہے۔ چاہے وہ اسے ماں بھی نہ کہے۔ یہ حوصلہ اور یہ ظرف اللہ نے صرف ماں کو دیا ہے۔

ماں بچے کی زندگی بچانے کے لئے اپنی ممتا میں شراکت برداشت کر لیتی ہے۔ اس کا بچہ چاہے اس کا نہ رہے، لیکن زندہ رہے۔ لیکن راج پوت باپ مزاحمت کرتا ہے۔ مگر کب تک۔ بچے کی زندگی اور موت کا سوال سامنے ہو تو وہ کچھ نہیں کر سکتا۔

راج پوت اپنی جان دے سکتا ہے، آن نہیں گنوا سکتا۔ چنانچہ بچے کی ضد پوری کی گئی..... لیکن رازداری کے ساتھ۔ دونوں فریقوں کے سوا کسی کو کچھ پتا نہ چلے۔ اسے اور اس کے بچے کو کوئی طعنہ نہ سننا پڑے۔

وہ پریوں کی کہانی لگتی تھی۔ لیکن سرفراز بیگم جانتی تھیں کہ وہ حقیقت ہے۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

اس کی مدد سے وہ بہت کچھ سمجھ رہی تھیں۔انہوں نے سمجھ لیا کہ چھوٹے ٹھاکر کا باپ بڑا انسان تھا۔ویسے تو اسے رنجنا ہی بتاتی رہی تھی کہ بڑے ٹھاکر میں جاگیرداروں والی کوئی بات نہیں تھی۔نہ وہ رعونت اور غرور نہ وہ جاگیرداروں والے شوق۔لیکن اب جو بات سامنے آئی تھی، وہ بڑے لوگوں والی تھی۔وہ یقیناً بہت اچھا انسان تھا۔اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اپنا مطلب پورا کرانے کے بعد اس پورے گھرانے کو قتل کرا دیتا.....اپنا راز رکھنے کے لئے۔لیکن نہیں۔اس نے یہ سمجھا کہ دودھ پلوانا اس کی مجبوری ہے اور دودھ پلانے والی کا اس پر اور بچے پر احسان ہے۔اس کے صلے میں اس نے عزت دی۔بلکہ اسے دودھ پلانے والی کی عزت کا اتنا خیال تھا کہ اس کی وجہ سے اس نے اپنے بیٹے کو بھی اس راز سے آگاہ کر دیا اور اس عورت کی ماں جیسی عزت کرنے کی تلقین بھی کی۔

اور یہ چھوٹا ٹھاکر اسی باپ کا بیٹا تھا!

پھر سرفراز بیگم نے ایک اور زاویئے سے سوچا۔اللہ کے بھید اللہ ہی جانتا ہے۔لیکن ایک نوزائیدہ بچے کا اس طرح کی ضد کرنا ایک بہت غیر معمولی بات ہے۔اور یہی نہیں، اس بچے نے وہ ضد پوری بھی کرائی۔اب حور بانو کے کہنے کے مطابق وہ عربی پڑھتا ہے، قرآن سنتا ہے تو اس میں حیرت کی بات نہیں۔جس بچے نے مسلمان عورت کا دودھ پیا ہو، اٹھارہ سال اس عورت سے ماں جیسی محبت کی ہو، وہ ایسا کر سکتا ہے۔کہتے ہیں، دودھ کی بڑی اہمیت ہے۔شخصیت کی تعمیر دودھ کی بنیاد پر ہوتی ہے۔عربوں میں تو اس بات کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔

ان کے دل میں چھوٹے ٹھاکر کی محبت اور بڑھ گئی۔ان کا جی چاہا کہ نور بانو سے سختی سے کہیں کہ اسے آئندہ کبھی مشرک نہ کہے کیونکہ ان کا دل کہتا ہے کہ ایک دن وہ اللہ پر ایمان لائے گا۔لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتی تھیں۔یہ دودھ والی دلیل کوئی سند نہیں تھی۔

.....x.....

حور بانو کی ان دنوں عجیب کیفیت تھی۔وہ ہر وقت غصہ اور جھنجھلاہٹ کا شکار رہتی۔بلکہ اسے چڑچڑا پن کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔کوئی بہت محبوب شے ملتے ملتے دور ہو جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔خاص طور پر اس صورت میں کہ آدمی اس پر اپنا ردعمل بھی ظاہر نہ کر پائے۔

اسے یقین ہو گیا تھا کہ اب چھوٹا ٹھاکر نیچے آیا کرے گا۔اس یقین نے اسے تصور کی دنیا میں پہنچا دیا تھا۔وہ سوچتی رہتی تھی کہ وہ نیچے آئے گا تو وہ کیا کیا کرے گی۔وہ شرم و حیا والی باپردہ لڑکی تھی۔اس کے دل میں معصوم سی خواہشیں تھیں۔وہ اماں کی طرح بیٹھ کر اس سے بات تو نہیں کر سکتی تھی۔دل چاہنے کے باوجود بھی نہیں کر سکتی تھی۔پھر بھی چھوٹے ٹھاکر کا اپنے گھر کا اپنے گھر کی طرح نیچے آنا جانا اس کے لئے ایک ایسی نعمت تھا، جسے مانگنے کا اس نے تصور تک نہیں کیا تھا۔اور وہ نعمت اسے بن مانگے مل رہی تھی۔

جس روز اماں نے انہیں یہ بات بتائی اور اس سے پردہ نہ کرنے کو کہا، وہ پورے دن تصور میں کھوئی رہی کہ وہ کیا کیا کرے گی۔مگر ابتدا ہی میں اسے کئی بہت عجیب جھٹکے لگے۔ایسی دشواریاں سامنے آئیں، جن کے بارے میں اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

چھوٹا ٹھاکر اماں کے پاس بیٹھا ان سے باتیں کر رہا ہے۔وہ سلیقے سے دوپٹہ اوڑھے اس کے پاس جاتی ہے۔''السلام علیکم.....''

اسے پہلا جھٹکا لگا۔ارے.....وہ تو ہندو ہے۔وہ اسے سلام نہیں کر سکتیں۔دور سے نور بانو کی مشتعل نگاہیں اس کے جسم میں چبھ رہی ہیں۔اب وہ کیا کرے.....؟

وہ تیزی سے کچھ سوچنے کی کوشش کرتی ہے۔ہاں.....یہ ٹھیک رہے گا۔''کیسے ہیں آپ.....''۔

یہ تو ٹھیک ہے۔لیکن میں اسے مخاطب کیسے کروں گی؟ امی نے اسے بیٹا بنایا ہے تو اسے رشتے سے اسے بھائی کہنا چاہئے۔لیکن صرف بھائی یا بھیا کہنے کا کوئی سوال نہیں۔یہ وہ کیسے گوارا کر سکتی ہے۔اور اس کا نام اسے معلوم نہیں۔ہاں.....وہ چھوٹے ٹھاکر کہلاتا ہے۔

''کیسے ہیں آپ چھوٹے ٹھاکر بھائی.....؟''۔وہ کہتی ہے۔

لیکن یہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔طویل بھی ہے۔اس سے اوپری پن چھلکتا ہے۔

''کیسے ہیں آپ چھوٹے ٹھاکر بھیا.....؟''۔وہ ترمیم کرتی ہے۔

یہ کچھ بہتر ہے۔اس میں روانی ہے لیکن اچھا اب بھی نہیں لگ رہا ہے۔ایک لفظ کم ہونا چاہئے.....اس سرے سے یا اس سرے سے۔

''ٹھاکر بھیا.....''۔

نہیں۔یہ بھی نہیں۔

''آپ کیسے ہیں چھوٹے ٹھاکر؟''۔

یہ اسے اچھا لگا۔بس یہ ٹھیک ہے۔اس میں وہ بھی خوش ہے اور کسی کو کوئی اعتراض بھی نہیں ہوگا۔

چھوٹا ٹھاکر سر اٹھا کر اسے دیکھتا ہے آنکھوں میں سوال ہے یہ میری بڑی بیٹی ہے.....حور بانو، اماں جلدی سے تعارف کراتی ہیں

''جی.....میں ٹھیک ہوں''۔چھوٹا ٹھاکر کہتا ہے۔

''چائے لاؤں آپ کے لئے؟''۔وہ اس سے پوچھتی ہے۔

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔چائے تو تمہیں بغیر پوچھے لانی چاہئے تھی، اماں بناوٹی خفگی سے کہتی ہیں۔

''میں نے سوچا، شاید یہ شربت پسند کریں''۔

''نہیں، چائے ہی ٹھیک ہے''۔

وہ باورچی خانے میں جاتی ہے، چائے بنا کر لاتی ہے اور اسے دیتی ہے۔پھر وہ وہاں سے ہٹ جاتی ہے۔

اب وہ دور ایک کتاب لئے بیٹھی ہے اور چپکے چپکے اسے دیکھ رہی ہے۔وہ کتنا اچھا لگ رہا ہے۔جی چاہتا ہے، وقت رک جائے، وہ یونہی سامنے بیٹھا رہے اور وہ چپکے چپکے اسے دیکھتی رہے۔

پھر اچانک وہ سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتا ہے۔اس کی چوری پکڑی جاتی ہے۔وہ یوں گڑبڑاتی ہے کہ اسے نظریں جھکانے کا خیال بھی نہیں آتا۔وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں۔پھر وہ گھبرا کر کتاب پر جھک جاتی ہے۔

اس پورے دن وہ جاگتی آنکھوں اسی طرح کے خواب دیکھتی رہی۔شام کو زینوں والے دروازے پر دستک ہوئی تو وہ چونکی۔اس کا بس چلتا تو وہ دوڑ کر جاتی اور دروازہ کھول دیتی۔بہر حال وہ خود کو سنبھالے بیٹھی رہی۔لیکن اس کا دل سینے میں جیسے پھڑ پھڑا رہا تھا۔

مگر وہ چھوٹا ٹھاکر نہیں تھا۔رنجنا تھی۔

رات ہوئی تو وہ مایوس ضرور تھی۔لیکن آس بہر حال نہیں ٹوٹی تھی۔

اگلے روز بھی وہی کچھ ہوا۔مگر شدت پچھلے روز جیسی نہیں تھی۔ہاں، رات ہونے پر مایوسی گزشتہ روز سے زیادہ تھی۔اور آس کمزور ہو گئی تھی۔

تیسرے روز اسے نور بانو پر غصہ آنے لگا۔نور بانو نے ہی ہنگامہ مچایا تھا کہ چھوٹے ٹھاکر کو گھر میں نہیں آنا چاہئے.....اور ان کا اس کے سامنے آنا کسی بھی طرح درست نہیں ہے۔ہو سکتا ہے کہ آواز اوپر گئی ہو اور چھوٹے ٹھاکر نے سن لیا ہو۔اتنا کچھ سننے کے بعد وہ بھلا نیچے آ سکتا تھا۔اور کوئی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

اس نے اماں سے بھی یہ بات کہی۔لیکن اماں نے یہ ماننے سے انکار کر دیا۔ان کا کہنا تھا کہ وہ گفتگو اندر والے کمرے میں ہوئی تھی۔اور وہاں کی آواز اوپر جانے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔بعد میں اس نے خود بھی غور کیا تو اسے تسلیم کرنا پڑا کہ اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں۔

کچھ بھی ہو، اس کے دل میں نور بانو کے لئے چڑ بیٹھ گئی۔حالانکہ وہ جانتی تھی کہ نور بانو نے غلط کچھ بھی نہیں کیا تھا۔اس نے جو کچھ کہا، ٹھیک کہا۔لیکن دل کے معاملات تو خود کار ہوتے ہیں۔وہ نور بانو سے کھنچ گئی۔اس نے کچھ پوچھا تو مختصر سا جواب دے دیا۔

اس روز اماں خود اوپر گئیں اور جا کر بیٹھ ہی گئیں۔دو گھنٹے بعد وہ واپس آئیں تو خوش نظر آ رہی تھیں۔لیکن انہوں نے کسی سے کوئی بات نہیں کی۔کچھ بھی نہیں بتایا۔حور بانو کو کچھ پوچھنے کی ہمت بھی نہیں ہوئی۔دل میں چور جو تھا۔

لیکن اس بار وہ مایوس ہو گئی۔اس کا دل کہہ رہا تھا کہ چھوٹا ٹھاکر کبھی نیچے نہیں آئے گا۔

.....x.....

دو دن اور گزر گئے۔سرفراز بیگم کو یقین ہو گیا کہ چھوٹا ٹھاکر نیچے نہیں آئے گا۔وجہ انہیں نہیں معلوم تھی۔انہیں تجسس بھی بہت تھا۔لیکن وجہ وہ اس سے پوچھنا نہیں چاہتی تھیں۔سچ تو یہ ہے کہ اس نے نیچے نہ آ کر ان کی غلطی کی تلافی کر دی تھی اور انہیں اللہ کے سامنے شرمندگی سے بچا لیا تھا۔اب پوچھنے میں یہ ڈر بھی تھا کہ اس کے نیچے آنے کی پھر نہ کھل جائے۔یہ بات نہیں کہ وہ ایسا نہ چاہتی ہوں۔دل تو ان کا اب بھی یہی چاہتا تھا کہ وہ بیٹا بن کر نیچے آئے اور ان کے پاس بیٹھے اور باتیں کرے۔لیکن ان کے منہ سے بچیوں کے پردہ نہ کرنے کی جو بات نکل گئی تھی، وہ اس پر پچھتا رہی تھیں۔

تیسرے دن انہوں نے بڑے اہتمام سے لوکی کا حلوہ بنایا اور چھمن بوا کے ہاتھ اوپر بھجوانے کے بجائے خود ہی لے گئیں۔اس بار ان کے انداز میں حقیقی ماؤں والا اعتماد تھا۔

انہوں نے رنجنا سے پوچھا۔''چھوٹے ٹھاکر کہاں ہیں؟''۔

''اپنے کمرے میں ہیں بڑی بیگم''۔رنجنا نے جواب دیا۔

وہ چھوٹے ٹھاکر کے کمرے کی طرف بڑھیں۔اسی لمحے وہ اپنے کمرے سے نکل آیا۔اس نے ان کی آواز اور رنجنا کا جواب سن لیا تھا۔''آیئے ماں جی، کیسی ہیں آپ؟''۔

اس نے پوچھا اور دروازے سے ہٹ کر انہیں راستہ دیا۔

''ٹھیک ہوں بیٹے۔تمہارے لئے لوکی کا حلوہ لائی ہوں''۔انہوں نے اپنے ہاتھ سے چمچہ بھر حلوہ اسے کھلایا۔

''واہ ماں جی، بہت مزے کا ہے''۔چھوٹے ٹھاکر نے چٹخارا لے کر کہا۔

''کیوں نہ ہو۔تمہارے لئے بنایا ہے۔اس میں محبت کا ذائقہ بھی ہے''۔سرفراز بیگم بولیں۔''ہر روز تھوڑا سا کھایا کرو۔یہ بہت فائدہ مند ہوتا ہے''۔

''شکریہ ماں جی۔اچھا اب بیٹھئے تو۔یہ بتائیں، کیا پئیں گی؟ چائے یا شربت؟''۔

سرفراز بیگم ایک لمحے کو ہچکچائیں۔پھر انہوں نے کہا۔''چائے پی لوں گی''۔

چھوٹا ٹھاکر ان کے سامنے بیٹھ گیا۔رنجنا حلوہ لے کر اندر چلی گئی۔اسے چائے بھی بنانی تھی۔

''اور سنائیں ماں جی، گھر میں سب ٹھیک ہیں؟''۔

''اللہ کا شکر ہے بیٹے۔سب ٹھیک ہیں''۔

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

چند لمحے ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ مگر سرفراز بیگم کو اب بھی اس کے ماں باپ کے بارے میں تشنگی تھی۔ انہوں نے گفتگو کا رخ اسی طرف موڑ دیا۔ ''تم یہاں آئے تو تمہاری ماتا جی کا انتقال ہو چکا تھا''۔

''جی ماں جی۔ میں ماتا جی کے دیہانت کے چھ ماہ بعد یہاں آیا تھا''۔

''مجھے یہ بتاؤ، تمہاری ماتا جی کیسی تھیں؟''۔

''ماں کے بارے میں تو اتنا کہنا ہی کافی ہے ماں جی کہ وہ ماں ہے''۔ چھوٹے ٹھاکر نے سادگی سے کہا۔ ''اس کے بعد تو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی''۔

کیسا خوب صورت اور سچا جواب ہے۔ سرفراز بیگم نے دل میں سوچا۔ پھر بولیں۔ ''تمہاری ماتا جی خوش نصیب تھیں کہ انہیں اتنے برسوں کے بعد ملا تو تم جیسا بیٹا ملا۔ کیسے خوش ہوتی ہوں گی وہ تمہیں دیکھ دیکھ کر''۔

''جی ماں جی۔ بہت خوش ہوتی تھیں۔ لیکن کبھی کبھی میں انہیں بہت پریشان کر دیتا تھا''۔

''وہ کیسے؟''۔ سرفراز بیگم کے لہجے میں حیرت اور بے یقینی تھی۔

''دراصل مجھ میں تجسس بہت تھا ماں جی۔ میں سوچتا بہت تھا۔ ہر چیز پر غور کرتا تھا اور سوال بہت کرتا تھا''۔

''یہ تو ذہانت کی دلیل ہے۔ اس میں پریشانی کیسی؟''۔

''ماتا جی سیدھی سادی اور دھرم کی پکی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں روز ان کی طرح پوجا کیا کروں۔ میں یہ پوچھتا تھا کہ یہ پوجا کیوں کی جاتی ہے۔ بھگوان کون ہے؟ کیا سچ مچ ایسا ہے؟ کیا اسے دیکھا جا سکتا ہے..... وہ سامنے آتا ہے؟ اگر اسے کسی نے نہیں دیکھا تو اس کا بت کیسے بنا لیا؟ یہ بھگوان کیسا شکتی والا ہے کہ اپنے بت پر بیٹھی بدتمیز مکھی کو بھی نہیں اڑا سکتا..... سزا نہیں دے سکتا!''۔

سرفراز بیگم حیران تھیں۔ ان کے سامنے چھوٹے ٹھاکر کی شخصیت کا یہ نیا رخ آ رہا تھا۔ ایسا آدمی مشرک کیسے ہو سکتا ہے..... اور ہو بھی تو مشرک رہ تو نہیں سکتا۔ شاید اسی لئے انہیں اس پر ایسا پیار آتا تھا۔

چھوٹا ٹھاکر ان کی کیفیات سے بے خبر اپنی دھن میں بولے جا رہا تھا۔ ''ماتا جی کے پاس علم نہیں تھا۔ ان کے پاس میرے اعتراضات کے جواب نہیں تھے۔ وہ میرے سوالات پر جھنجھلاتی تھیں۔ چڑتی تھیں..... کہتی تھیں، بس تم میری خوشی کے لئے پوجا کر لیا کرو۔ میں کہتا تھا، ماتا جی میں آپ کو خوش کرنے کے لئے پوجا کروں گا تو وہ بھگوان کی پوجا تو نہیں ہوگی''۔

بات ٹھیک تھی۔ بندہ کسی انسان کو خوش کرنے کے لئے اللہ کی عبادت کرے تو اللہ اسے قبول نہیں کرتا۔ وہ اس سے خوش بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ ناراض ہوتا ہے۔ سرفراز بیگم نے سوچا۔ پھر بولیں۔ ''کچھ تو کہتی ہوں گی تمہاری ماتا جی؟''۔

''وہ کہتی تھیں، پرکھوں سے یہ پوجا چلی آ رہی ہے۔ ہمارے دادے پردادے اسی طرح پوجا کرتے رہے ہیں۔ تو ہم کیسے چھوڑ دیں''۔

سرفراز بیگم کو یاد آیا کہ قرآن پاک میں کئی جگہ اللہ نے لوگوں کے کفر کی یہ وجہ بیان فرمائی ہے کہ وہ لوگ دلیل میں اپنے آباؤ اجداد کے عمل کو پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں، ہم ان دیوی دیوتاؤں کی پرستش کیسے چھوڑ دیں، جنہیں ہمارے آباؤ اجداد پوجتے آئے ہیں

''تو تمہیں اس میں کیا اعتراض تھا بیٹے؟''۔ انہوں نے پوچھا۔

''دیکھیں ماں جی، انسان تو زندگی بھر غلطی کرتا رہتا ہے۔ ایک وقت میں وہ ایک نظریہ قائم کرتا ہے۔ آگے جا کر وہ غلط ثابت ہو جائے تو اس کی اصلاح کر لیتا ہے۔ جو غلط ثابت ہونے کے باوجود اس نظریئے پر ڈٹا رہے، وہ جاہل ہوتا ہے۔ آدمی کے تسلیم نہ کرنے سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔ اور آدمی کے تسلیم کرنے سے کوئی غلط بات درست نہیں ثابت ہوتی۔ میں ماتا جی سے کہتا تھا کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ ہمارے دادے پردادے غلطی پر ہوں۔ ہمیں اس پر غور کرنا چاہئے۔ یہ سن کر ماتا جی کو غصہ آتا تھا۔ لیکن میری محبت میں وہ اسے پی جاتی تھیں۔ وہ مجھ سے خوشامد کرتی تھیں کہ بس میں ان کی خوشی کے لئے پوجا کر لیا کروں''۔

''تو پھر؟ تم کیا کرتے تھے؟''۔

''ماتا جی کی خاطر میں پوجا کر لیا کرتا تھا۔ جس روز ماتا جی کا دیہانت ہوا، پتا جی نے مجھے بلا کر کہا..... تمہاری ماتا جی کی حالت اچھی نہیں۔ بھگوان سے پرارتھنا کرو کہ وہ ٹھیک ہو جائے۔ اس روز میں پہلی اور آخری بار اپنی مرضی سے ماتا جی کے پوجا کے کمرے میں گیا۔ میں نے پوجا کی اور بھگوان سے پرارتھنا کی کہ میری ماتا جی کو جیون دے دو۔ اسے مرنے نہ دو۔ میں پوجا کر کے نکلا تو پتا چلا کہ ماتا جی جا چکی ہیں۔ پھر میں آخری بار پوجا کے کمرے میں گیا۔ میں نے بھگوان سے کہا..... میں نے کبھی تجھے نہیں مانا۔ میں نہیں مانتا کہ تجھ میں کوئی شکتی ہے۔ تو تو خود کو بھی نہیں بچا سکتا۔ کسی اور کو کیا بچائے گا۔ میں شرمندہ ہوں کہ میں نے تجھ سے کچھ مانگا۔ آج کے بعد تجھ سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ تجھ میں کوئی شکتی ہے تو مجھے شراپ ضرور دینا۔ میں تیرے شراپ کا انتظار کروں گا''۔ چھوٹے ٹھاکر نے گہری سانس لی۔ پھر دوبارہ سلسلہ کلام جوڑا۔ ''اس دن کے بعد ماں جی میں نے کبھی پوجا نہیں کی''۔

وہ سب کچھ سننا اتنا غیر متوقع اور اثر انگیز تھا کہ سرفراز بیگم سن ہو کر رہ گئیں۔ چھوٹا ٹھاکر بھی خاموش ہو گیا تھا۔ سرفراز بیگم کچھ دیر اسی کیفیت میں بیٹھی رہیں۔ پھر انہوں نے کہا ''تو تم اپنی ماتا جی کی موت کی وجہ سے بھگوان سے دور ہو گئے؟''۔

''نہیں ماں جی، یہ بات نہیں۔ میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا، بھگوان کو، دیوی دیوتاؤں کو کبھی مانا ہی نہیں۔ میری عقل نہیں مانتی تھی۔ وہ تو بس وقت پڑنے پر تنکے کے سہارے والی بات تھی۔ ایسے میں آدمی کسی سے بھی امید لگا لیتا ہے''۔ چھوٹے ٹھاکر نے کہا۔ پھر انہیں غور سے دیکھا۔ ''ایسا تو آپ بھی کرتی ہوں''۔

''میں تو بھئی سب کچھ اللہ سے مانگتی ہوں..... اور اس ایمان کے ساتھ مانگتی ہوں کہ وہ سب کچھ دے سکتا ہے۔ لیکن جانتی ہوں کہ اصل چیز اس کی مرضی ہے۔ وہ چاہے تو دے اور چاہے تو نہ دے۔ میں یہ بھی مانتی ہوں کہ وہ جو کچھ کرتا ہے، بہتر ہوتا ہے۔ میں مانگتی ہوں..... بھکاریوں کی طرح، غلاموں کی طرح..... عاجزی سے۔ میں اس سے شرطیں نہیں لگاتی''۔

چھوٹا ٹھاکر کچھ شرمندہ نظر آنے لگا۔ ''میں بھی اللہ سے شرطیں نہیں لگاتا ماں جی''۔ وہ بولا تو اس کے لہجے میں بھی شرمندگی تھی۔ ''وہ تو بھگوان کا معاملہ تھا۔ اس کے بارے میں جو کچھ بتایا جاتا ہے، میں نے اس پر کبھی یقین نہیں کیا۔ ویسے ماں جی، آپ نے بہت اچھی بات کہی۔ میں نے بھیک مانگنے والوں کو دیکھا ہے۔ اپنے جیسے انسانوں کے سامنے وہ ہاتھ پھیلاتے ہیں تو بھی عاجزی سے۔ اور وہ بھیک نہ دے تو اس سے لڑتے نہیں۔ میری سمجھ میں ایک بات آ گئی ماں جی۔ اللہ سے مانگتے ہوئے تو ایسی عاجزی ہونی چاہئے، ایسی کہ.....''۔ اسے کوئی مثال نہیں سوجھ رہی تھی۔ ''بس میں سمجھ سکتا ہوں۔ بیان نہیں کر سکتا''۔ چند لمحے بعد اس نے بے بسی سے کہا۔ ''اور اکڑ تو ہونی ہی نہیں چاہئے''۔

''بالکل''۔ سرفراز بیگم نے جوش سے کہا۔ ''اور یاد رکھو۔ اللہ کو اپنے بندے کا کچھ مانگنا بہت اچھا لگتا ہے۔ بلکہ اللہ سے مانگنا ہی تو بندگی ہے۔ لہٰذا بندے کو چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی ہر ضرورت کے لئے اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلانا چاہئے۔ اللہ دعا ضرور قبول کرتا ہے۔ ہاں اس کی حیثیت نہ ہو تو دعا کا صلہ دنیا میں نہیں ملتا۔ لیکن دعا رائیگاں نہیں ہوتی۔ وہ یہاں نہ دے تو آخرت میں اور بڑھا کر دیتا ہے''۔

''آپ نے مجھے بہت بڑی، بہت کام کی بات بتائی ہے ماں جی۔ اب تو میں ہر چیز اللہ سے مانگوں گا۔ مگر یہ بتائیں کہ یہ آخرت کیا ہے؟''۔

یہ وہ لمحہ تھا کہ سرفراز بیگم کو جھٹکا لگا۔ اپنے جوش میں انہیں یہ خیال ہی نہیں رہا تھا کہ وہ یہ ساری باتیں ایک ہندو سے کر رہی ہیں۔ اور لگتا بھی کیسے۔

وہ تو ایمان والوں کی طرح بول رہا تھا۔ اب انہیں اچانک احساس ہوا کہ وہ اللہ کا نام لے رہا ہے..... اور عقیدت اور احترام سے لے رہا ہے۔ وہ چند لمحے حیرت سے اسے دیکھتی رہیں۔ پھر بولیں۔ ''چھوٹے ٹھاکر، تم اللہ کو کیا جانو''۔

جواب میں چھوٹے ٹھاکر نے بڑی عاجزی سے کہا۔ ''نہیں جانتا ماں جی لیکن جب سے ہوش سنبھالا ہے، جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جستجو میں لگا ہوا ہوں۔ یہی تو مقصد ہے میری زندگی کا''

''لیکن اللہ! تمہیں تو بھگوان کہنا چاہئے تھا''۔

''نہیں ماں جی۔ میری عقل مجھے بتاتی ہے کہ یہ کائنات کا مربوط نظام ایک ہستی کا قائم کیا ہوا ہے۔ وہی اسے چلا رہا ہے۔ میں اسے کھوج رہا ہوں۔ مجھے اس کا نام بھی معلوم نہیں۔ لیکن یہ نام اللہ میرے دل کو اچھا لگا۔ اب میں اسے اللہ ہی کہتا ہوں''۔ چھوٹے ٹھاکر نے کہا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اس نے کچھ پوچھا تھا، جس کا جواب ماں جی نے اسے نہیں دیا ہے۔ ''ماں جی، یہ آخرت کیا ہے؟''

سرفراز بیگم سوچ میں پڑ گئیں۔ بتائیں، نہ بتائیں۔ پھر انہوں نے سوچا کہ اس نے پوچھا ہے تو بتانا ان پر فرض ہے انہوں نے کہا ''یہ ہم مسلمانوں کے ایمان کا حصہ ہے۔ جسے اللہ نے پیدا کیا ہے، اسے مرنا بھی ہے لیکن اللہ نے ایک دن مقرر کیا ہے، جس کا علم کسی کو نہیں۔ وہ دن آئے گا، جسے قیامت کہتے ہیں تو یہ دنیا ختم ہو جائے گی اور اللہ کے حکم سے تمام مردے جی اٹھیں گے۔ پھر ہر شخص کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ نیکیاں زیادہ ہوں گی تو جنت ملے گی۔ برے اعمال کے نتیجے میں دوزخ ملے گی۔ یہ آخرت ہے۔ اس کے بعد کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی ہے۔ اس میں جہنم نصیب ہوا تو اللہ ہی اپنی رحمت سے نکالے تو نکالے''۔

خاموشی چھا گئی۔ چھوٹے ٹھاکر کے چہرے پر خوف تھا۔ اور وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔ سرفراز بیگم اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔

چند لمحوں کے بعد انہوں نے کہا۔ ''تم یہ سوچ رہے ہو نا کہ مرنے کے بعد اللہ آدمی کو کیسے زندہ کرے گا؟''۔

چھوٹا ٹھاکر بری طرح چونکا۔ ''نہیں ماں جی۔ یہ بات اللہ نے ہی بتائی ہے نا؟''۔

''ہاں۔ اللہ نے قرآن پاک میں خود یہ فرمایا ہے''۔

''تو پھر میں یہ کیسے سوچ سکتا ہوں''۔ چھوٹے ٹھاکر نے کہا۔ ''اللہ نے کہا ہے تو یہ ہو کر رہے گا۔ وہ تو مہان شکتی والا ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے''۔

سرفراز بیگم کی حیرت کی کوئی حد نہیں تھی۔ قرآن پاک میں اللہ نے بتایا ہے کہ اس بات پر تو کافر سب سے زیادہ بحث کرتے تھے۔ ان کے خیال میں یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ اسی وجہ سے وہ اپنے کفر میں آگے بڑھتے گئے۔ وہ سوچ رہی تھیں، یہ کیسا مشرک ہے کہ اللہ کے کہنے پر ایسا یقین رکھتا ہے۔ یہ کیسی غیر معمولی بات ہے۔

''تو یہ بتاؤ کہ تم کس سوچ میں پڑ گئے ہو؟''۔ انہوں نے اس سے پوچھا۔

''میں یہ سوچ رہا ہوں کہ آخرت میں میرا کیا ہوگا۔ مجھے تو یہ معلوم ہی نہیں تھا۔ میں نے تو کچھ اچھا کام کیا ہی نہیں۔ اتنے برسوں سے تو میں بس کھوج میں لگا ہوا ہوں۔ کتنا وقت ضائع کر دیا میں نے''۔ چھوٹے ٹھاکر کے لہجے میں پریشانی تھی۔

سرفراز بیگم کو اس پر پیار آ گیا۔ ''حق کی تلاش میں صرف ہونے والا وقت ضائع نہیں ہوتا۔ اسے تو اللہ کے ہاں عبادت کا درجہ حاصل ہوتا ہے''۔ انہوں نے اسے سمجھایا۔ ''اور ابھی تمہاری عمر کیا ہے۔ اچھے کام کرنے کو تو عمر پڑی ہے اور برے تو تم ہو بھی نہیں''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

''جب سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے ماں جی کہ ہر شخص کی موت کا وقت مقرر ہے اور صرف اللہ کو معلوم ہے۔ تب سے مجھے ہر وقت یہ خیال رہتا ہے۔ ایسا کوئی قانون نہیں کہ آدھی بوڑھا ہو کر ہی مرے۔ موت تو کسی وقت بھی آسکتی ہے۔ آدمی کو اپنا ہوم ورک ہر لمحے کرنا چاہئے''۔

سرفراز بیگم لرز کر رہ گئیں۔ ارے..... انہیں تو مسلمان ہو کر موت کا خیال بھی نہیں آتا۔ اور یہ مشرک جوان لڑکا آخرت کی فکر کر رہا ہے۔ نہیں، اسے تو مشرک کہا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ تو گناہ ہے۔ وہ دل میں توبہ کرنے لگیں۔

''اچھا بیٹے، میں چلتی ہوں''۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

چھوٹا ٹھا کر بھی اٹھ گیا۔ اس نے سر جھکایا اور سرفراز بیگم نے بڑی محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

.....x.....

اس روز ماں جی اسے سوچنے کیلئے بہت کچھ دے گئیں۔ آخرت! اب وہ اسی بارے میں سوچ رہا تھا۔ ذہن کے وہ دریچے کھل رہے تھے، جن کی موجودگی کا اب تک اسے علم نہیں تھا۔

امتحان! امتحانوں کی وہ کیسی فکر کیا کرتا ہے! پاس ہونے کی کتنی اہمیت ہے اور فیل ہونے کا کتنا خوف ہے۔ مگر سب سے بڑے امتحان کی اسے کوئی فکر ہی نہیں تھی، اس میں فیل ہو گیا اور ہمیشہ کے لئے جہنم میں جا پڑا تو؟

مگر ابھی اسے جنت اور دوزخ کے بارے میں تفصیلی معلومات نہیں تھیں۔ اس لئے اس کا خوف بھی بڑا نہیں تھا۔

پھر بھی آخرت کی فکر اسے ستانے لگی۔ اب اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ یہ جو اللہ نے دنیا بنائی ہے تو یہ کوئی کھیل تماشہ تو نہیں۔ ایسا نہیں کہ آدمی کو اللہ نے بے مقصد پیدا کیا ہو کہ وہ یہاں زندگی گزارے، کبھی ہنسے کبھی روئے۔ کبھی خوشی سے سرشار ہو تو کبھی غم سے نڈھال۔ کبھی عیش میں گم ہو تو کبھی پریشان۔ اور وقت آنے پر مر جائے۔ کھیل ختم! اسے حیرت ہونے لگی کہ اس نے پہلے اس سلسلے میں کیوں نہیں سوچا۔ یہ تو بڑی اہم بات ہے۔ زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد تو ہے نا۔ اور اب وہ مقصد سامنے آ گیا ہے۔ زندگی دراصل ایک امتحان ہے۔ اللہ نے انسان کو زندگی دی..... بے شمار نعمتوں کے ساتھ۔ اور بتا دیا کہ یہ ایک امتحان ہے۔ پاس ہونے کا انعام ہے اور فیل ہونے کی سزا۔

اہم سوال یہ تھا کہ امتحان کیا ہے؟

جانوروں کو صرف جبلت دی گئی ہے، عقل نہیں۔ آدمی کو عقل دے کر تمام مخلوقات پر فوقیت دی گئی ہے۔ اسی عقل کی بنیاد پر امتحان ہے۔ اس کی وجہ سے تو حساب لیا جائے گا۔ تبھی تو جزا اور سزا ہو گی۔

وہ مشاہدے کا آدمی تھا۔ اس نے دیکھا تھا، عام جانوروں کی جبلت میں احسان مندی تھی۔ کتے کو ایک بار روٹی کھلا دو۔ زندگی بھر تمہارے سامنے دم ہلاتا رہے گا۔ بلی کو ایک بار دودھ دے دو، بار بار تمہاری طرف آئے گی۔ یعنی ان کی احسان مندی شکر گزاری ہے۔ جس کتے کو آپ نے ایک بار کھانے کو کچھ دے دیا، وہ آپ کے ایک اشارے پر کچھ بھی کر دے گا۔ جان بھی دے دے گا۔

اور ایک آدمی ہے۔ جانتا ہے کہ اللہ نے اسے پیدا کیا۔ تمام جان داروں میں عزت عطا فرمائی۔ مرتبہ دیا۔ عقل جیسی نعمت دی۔ لیکن وہ ان کا وفاداری اور تابعداری نہیں کرتا۔ یعنی وہ ناشکرا اور احسان فراموش ہے۔ کیا یہ عقل کی وجہ سے ہے۔ اس لئے کہ جبلت اور فطرت تو احسان ماننا ہے۔ ہاں..... یہی بات ہے۔ عقل کی وجہ سے تو نہیں، ہاں عقل کو غلط استعمال کرنے کی وجہ سے ہے۔

تو امتحان تو سمجھ میں آ گیا۔ زندگی کا مقصد ہے پیدا کرنے والے کی بندگی۔ اس کا شکر ادا کرنا۔ اس کی اطاعت کرنا۔ اس کا حکم ماننا۔

اب سوال یہ تھا کہ وہ کیا کرتا رہا ہے۔ وہ جو اپنے پیدا کرنے والے سے سب سے بڑھ کر محبت کرنا چاہتا تھا، ابھی تک اس کے کھوج میں لگا تھا۔ اسے ڈھونڈ نہیں پایا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کے احکامات کیا ہیں۔ وہ کن باتوں کا حکم دیتا ہے اور کن باتوں سے منع کرتا ہے۔ یہ سب اسے جاننا ہے۔ تبھی تو وہ امتحان دینے کے قابل ہو گا۔

اب وہ کیا کرے؟ اسے کیسے ڈھونڈے؟ اس کے بارے میں کیسے معلوم کرے؟ اب تک تو وہ اپنی عقل سے، اپنے اندر کی نشانیوں کی مدد سے اسے کھوجتا رہا ہے۔ لیکن ایسے تو کام نہیں چلے گا۔

اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اللہ کی کتابیں موجود ہیں۔ یہی سب سے اچھا اور معتبر ذریعہ ہے۔ لیکن قرآن کے بارے میں اسے خبردار کر دیا گیا تھا کہ اسے پاک ہوئے بغیر نہیں چھوا جا سکتا۔ البتہ بائبل کے بارے میں کسی نے ایسی کوئی شرط نہیں لگائی تھی۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ بائبل پڑھے گا۔

یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ بازار گیا اور کتابوں کی دکان سے ایک بائبل لے لی۔ پھر کچھ خیال آیا تو اس نے دکان دار سے کہا۔ ''مجھے جنت اور دوزخ کے موضوع پر کوئی اچھی اور جامع کتاب بھی چاہئے۔''

دکان دار نے کئی کتابیں نکال دیں۔ اس نے ان میں سے ایک کتاب منتخب کر لی۔ اب وہ مطالعے کے لئے تیار تھا!

.....☆.....

اس بار سرفراز بیگم ضبط نہیں کر سکیں۔ انہوں نے تینوں بچیوں کو اپنے پاس بٹھایا۔ ''میں تمہیں کسی بات پر مجبور نہیں کرنا چاہتی۔'' انہوں نے کہا۔ ''لیکن تمہیں بتانا ضروری سمجھتی ہوں۔''

وہ تینوں انہیں متوقع نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ نور بانو کے انداز میں چوکنا پن تھا۔

''میں تمہیں نصیحت کر رہی ہوں کہ چھوٹے شاکر کو کبھی مشرک اور کافر نہ کہنا۔ بلکہ ایسا سوچنا بھی نہیں۔''

''ایسا تو صرف آپی ہی کہتی ہیں۔'' گلنار نے چیخ کر کہا۔

''آپ یہ نصیحت کس بنیاد پر کر رہی ہیں۔'' نور بانو نے معترضانہ لہجے میں پوچھا۔

سرفراز بیگم کے کچھ کہنے سے پہلے ہی حور بانو بول اٹھی۔ ''صاف اور واضح حکم ہے کہ کافر کو بھی کافر نہ کہو۔ کسی بھی وقت اللہ کی ہدایت اسے نصیب ہو گئی تو وہ ایمان لے آئے گا اور تمہیں شرمندگی ہو گی۔ تمہیں نہیں معلوم کہ کون ایمان پر مرے گا اور کون کفر پر۔''

''مجھے کسی کو کافر اور مشرک کہنے کا شوق نہیں ہے۔ نہ میں نے کبھی کہا تھا۔'' نور بانو نے نرم لہجے میں کہا۔ ''بات پردے کی تھی۔ نامحرم مومن ہو تو اس سے بھی پردے کا حکم ہے۔ جب چھوٹے ٹھا کر کو گھر میں بلانے اور اس سے پردہ ختم کرنے کی بات ہوئی تو مجھے مجبوراً اس انداز میں بات کرنی پڑی۔ اور میں بھی اس پر قائم ہوں کہ جو میں نے کہا، درست تھا۔ اللہ کے حکم کے مطابق تھا۔''

''تم لوگوں نے آپس میں الجھنا شروع کر دیا۔'' سرفراز بیگم جھنجلا گئیں۔ ''میں نے تم لوگوں کی بھلائی کی خاطر تمہیں نصیحت کی تھی۔''

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

''میں پھر پوچھوں گی کہ آپ یہ نصیحت کس بنیاد پر کر رہی ہیں۔''

''جو کچھ میں نے چھوٹے ٹھاکر سے سنا ہے اور جتنا میں نے اسے سمجھا ہے اس کی بنیاد پر تمہیں سمجھا رہی ہوں۔'' سرفراز بیگم بولیں۔ ''وہ تو حق کی جستجو کر رہا ہے۔ وہ اللہ کا نام لیتا ہے۔ اس نے کبھی بتوں کی پوجا نہیں کی۔''

''یہ تو وہ کہہ رہا ہے نا۔'' نور بانو نے حقارت سے کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' سرفراز بیگم نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

''میرا مطلب ہے کہ وہ آپ کے دل میں جگہ بنانے، آپ کے گھر میں گھسنے کے لئے ایسا کہہ رہا ہے۔ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ وہ پیدائشی ہنود ہے۔''

''تم نے حد کر دی ہے بدگمانی کی.....'' حور بانو کو غصہ آ گیا۔

''تم لوگ آپس میں مت الجھو۔ مجھے بات کرنے دو۔'' سرفراز بیگم نے ہاتھ اٹھا کر حور بانو کو خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''نور بانو مجھے نہیں معلوم کہ تم یہ بدگمانی کس بنیاد پر کر رہی ہو۔ گھر میں گھسنا ہوتا تو وہ اب تک یہاں آ چکا ہوتا۔ خود میں نے اسے دعوت دی تھی۔ لیکن ایک ہفتہ ہو گیا اس بات کو۔ اور وہ اب تک نہیں آیا۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ وہ آئے گا بھی نہیں.....''

''یہ لوگ بڑے چالاک ہوتے ہیں اماں۔'' نور بانو اپنے موقف پر ڈٹی ہوئی تھی۔ ''وہ اپنا اچھا تاثر جمانا چاہتا ہے۔ وہ آپ سے اصرار کروانا چاہتا ہے.....

''اور میں اس سے اصرار کرتی۔ لیکن پچھلی بار تم لوگوں سے جو گفتگو ہوئی تو میں نے اس سے کہا بھی نہیں۔''

''اب دیکھ لیں۔'' نور بانو نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ ''اسے تو نہیں معلوم کہ ہمارے درمیان کیا بات ہوئی ہے۔ اسے حیرت ہو گی کہ آپ نے دوبارہ اس سے آنے کو کیوں نہیں کہا۔ اور وہ چاہتا ہے کہ آپ اس سے اصرار کریں۔''

نور بانو کی دلیل ایسی تھی کہ ایک لمحے کو تو سرفراز بیگم بھی ہل گئیں۔ پھر انہوں نے سنبھل کر کہا۔ ''میں اس سے ملی ہوں۔ میں نے گھنٹوں اس سے باتیں کی ہیں میں جانتی ہوں کہ وہ نہ جھوٹا ہے نہ مکار۔ اور اس نے جو پوجا پاٹھ نہ کرنے کی بات کی ہے تو مجھے متاثر کرنے کی غرض سے نہیں کی۔ وہ تو ایک قدرتی عمل ہے۔

اللہ کی طرف سے ہے، جو تفصیل مجھے معلوم ہے، وہ تو میں نے تمہیں نہیں بتائی۔''

''مجھے سنسنی بھی نہیں ہے۔'' نور بانو نے بے زاری سے کہا۔

حور بانو اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ ''مجھے تو ایسا لگتا ہے نور کہ تمہیں چھوٹے ٹھاکر سے چڑ ہے۔'' وہ بولی۔ ''بتاؤ تو ایسا کیوں ہے۔''

''تمہارے دماغ کی خرابی ہے باجی۔'' نور بانو نے سرد لہجے میں کہا۔

''تم لوگ پھر الجھنے لگیں آپس میں۔'' سرفراز بیگم جھنجلا گئیں۔ ''سنو..... میرا کام سمجھنا تھا۔ میں نے تمہیں سمجھا دیا۔ اب کس کی سمجھ میں نہ آئے تو میں کیا کروں۔'' ان کے لہجے میں بے بسی تھی۔ ''اب تم جانو۔''

.....☆.....

اوتار سنگھ نے بائبل کا مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس مطالعے میں ارتکاز نہیں تھا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ اس دوران اسے مسلسل ابہام کا خیال ستاتا رہتا تھا۔ اس کے نتیجے میں وہ جم کو مطالعہ کر پاتا تھا۔ اس کا دھیان اچٹ جاتا تھا۔

ایسے ہی ایک موقعے پر اس نے دوسری کتاب کی ورق گردانی کی۔ اس میں اس کا دل لگ گیا۔ اس نے وہ کتاب شروع کی تو اس سے چھوڑی نہیں گئی۔ وہ کتاب ختم کر کے ہی رکا۔ بلکہ رکا تو جب بھی نہیں۔ ایک ہفتے میں اس نے چار پانچ مرتبہ وہ کتاب شروع سے آخر تک پڑھ لی۔

اس کتاب نے اسے خوف زدہ کر دیا۔ دوزخ کی تفصیلات نے اسے لرزا دیا..... دہشت زدہ کر دیا۔ یہ تو اس نے سمجھ لیا تھا کہ زندگی ایک امتحان ہے۔ مگر یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنا بڑا امتحان ہے۔ فیل ہونے کی سزا اتنی ہولناک اور پاس ہونے کا انعام اتنا بڑا۔ جہنم کے فرشتوں کی جو اس نے تفصیل پڑھی تو کئی دن تک وہ اسے خواب میں ڈراتے رہے۔

نکیرین کے باب میں جو اس نے پڑھا۔ اس نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ قبر میں سوال جواب، وہ جانتا تھا کہ موت کسی کو بھی، کسی بھی لمحے دبوچ سکتی ہے۔ اگر وہ اسی وقت مر جائے تو قبر میں وہ کیا جواب دے گا۔ وہ کیا کہے گا؟ وہ تو نہ ادھر سے نہ ادھر۔ وہ تو بھٹک رہا ہے۔ کیا وہ تفتیش کرنے والے فرشتوں سے یہ کہے گا کہ اسے مہلت نہیں ملی۔ ابھی تو وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے موت آ گئی۔ یہ جواب اسے بچا تو نہیں سے گا۔

کتاب میں قیامت کا حال بھی تھا۔ وہ اس کی سمجھ میں زیادہ آسانی سے آ گیا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ جس نے کامل حساب کتاب سے سب کچھ بنایا ہے، سیاروں کی باہمی کشش سے یہ نظام قائم کیا ہے، وہ بنانے کی نسبت کہیں زیادہ آسانی سے وہ سب کچھ تباہ کر سکتا ہے۔ نظام میں ایک معمولی سا خلل واقع ہو جائے تو لمحوں میں سب کچھ ختم ہو جائے گا۔

چند روز تو وہ خوف زدہ رہا۔ لیکن انسانی فطرت ہے کہ خوف انتہا کو پہنچ کر مٹ جاتا ہے۔ اور اوتار سنگھ تو ویسے ہی سوچنے والا آدمی تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ سب افسانے ہیں۔ اللہ نے انسان کو نیک بنانے کے لئے اسے ڈرانے کا سامان کیا ہے۔ ورنہ مرنے کے بعد اسے دوبارہ زندہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک مرتا ہے تو دو پیدا ہوتے ہیں۔ زندگی جاری و ساری رہتی ہے اور رہے گی۔ بس اس کیلئے اتنا کافی تھا کہ وہ نیک عمل کرتا رہے اور برائیوں سے بچے۔ لیکن جو کچھ اس نے پڑھا تھا، وہ اسے مکمل طور پر رد نہیں کر سکا۔ اسے یہ خیال رہتا تھا کہ اس کے دونوں کندھوں پر حساب لکھنے والے موجود ہیں اور اس کا ایک ایک عمل تحریر کیا جا رہا ہے۔ اسے چوکنا رہنا چاہئے۔

دوسری طرف اسے خیال آیا کہ ماتا اور پتا جی سے فرشتوں نے سوال جواب کئے ہوں گا تو ان پر کیا گزری ہو گی۔ وہ لرز کر رہ گیا۔ وہ کم از کم حقیقت کو سمجھنے کی کوشش تو کر رہا ہے..... جستجو تو کر رہا ہے۔ وہ دونوں تو اس سے بھی محروم تھے۔ وہ تو بھگوان کو مانتے تھے..... برہما، وشنو اور شیو کو مانتے تھے..... گویا شرک کرتے تھے تب اسے ایک عجیب خیال آیا۔ ماتا جی تو بچ گئی ہوں گی۔ ان کی تو چتا جلائی گئی تھی۔ وہ دفن تھوڑا ہی کی گئی تھیں۔ اور سوال جواب تو قبر میں مردے کو اٹھا کر کئے جاتے ہیں۔ جہاں مردہ راکھ میں تبدیل ہو گیا ہو، وہاں یہ سب کچھ کیسے ممکن ہے۔ البتہ پتا جی کا معاملہ مختلف تھا۔ وہ ان کی چتا کو آگ نہیں دکھا سکتا تھا۔ وہ اس کے سامنے ہی ختم ہوئے تھے۔ اور وہ ریت کے تلے دفن ہوئے تھے.....

اس پر اسے یک بات یاد آئی۔ پتا جی نے اس سے کہا تھا..... جلانا نہیں، دفن کرنا..... یہ بات پہلے بھی ان کے لئے الجھن کا باعث بنی تھی۔ یہ بات پتا جی اپنے لئے تو نہیں کہہ سکتے تھے۔ کیسے کہہ سکتے تھے! اس کا خیال تھا کہ انہوں نے یہ بات چاچا جی اور ویر جی کے لئے کہی ہو گی۔

بہر حال اس نے پتا جی قدرتی طور پر سہی، لیکن دفن ہوئے تھے۔ اور وہ سوال جواب کے مرحلے سے گزرے ہوں گے۔ لیکن نہ وہ ان کے لئے کچھ کر سکا تھا، نہ اب کر سکتا ہے۔ ہاں وہ اپنی سمت درست کر لے تو ان کے لئے شاید کچھ کر سکے۔

ان دو کتابوں کے مطالعے نے (ایک کا جزوی اور دوسری کا تفصیلی مطالعہ) اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اب تک جو اپنے طور پر وہ جستجو کرتا رہا تھا تو اس کے انداز میں یک سوئی اور سکون تھا۔ یہی حال اس کی سوچوں کا تھا۔ ان میں ٹھنڈک تھی، سکون تھا، لیکن اب ان میں جہنم کی گرمی، اضطراب اور خوف در آیا تھا۔ وہ وہی تھا..... پہلے جیسا۔ لیکن اس کی کیفیت بدل گئی تھی۔

اس نے سوچا، کیا مطالعہ آدمی کو مضطرب اور بے سکون کر دیتا ہے؟ اس سوچ کے ساتھ دلیل بھی تھی۔ اس مطالعے نے اسے انتشار بھی دیا تھا اور مضطرب اور بے چین بھی کیا تھا۔ بلکہ اسے لگ رہا تھا کہ اس کے اب تک کے کئے کرائے پر پانی بھی پھر گیا ہے۔

اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ اس کا یہ سفر شروع کہاں سے ہوا تھا۔ اس وقت سے، جب اسے لکھنا پڑھنا بھی نہیں آتا تھا۔ اس کے سفر کا آغاز مشاہدے سے ہوا تھا۔ مشاہدے کے نتیجے میں اس کے ذہن میں سوالات ابھرے تھے۔ اس کے پاس جواب نہیں تھا۔ جواب اسے استادوں سے ملے تھے۔ ماسٹر جی اس کے پہلے استاد تھے۔ پھر ماتا جی اور اماں تھیں.....

ماسٹر جی کا خیال آیا تو وہ بری طرح چونکا۔ اسے شرمندگی ہونے لگی۔ کب سے اس نے ماسٹر جی کو نہیں دیکھا تھا۔ اور اسے ان کا خیال، ان کی یاد بھی نہیں آئی تھی۔ وہ جب گاؤں جا رہا تھا تو ماسٹر جی بیمار تھے۔ انکی ہی وجہ سے رگھو اور رنجنا بھی گاؤں نہیں جا سکے تھے۔

اور جب وہ واپس آیا اور اس کی طبیعت ذرا سنبھلی تو اس نے رگھو سے ماسٹر جی کے بارے میں پوچھا۔

''ان کی طبیعت آپ کے جانے کے دوسرے روز سنبھل گئی تھی مالک۔'' رگھو نے بتایا۔ ''اس نے اگلے روز انہوں نے اپنے گھر جانے کو کہا۔ کہتے تھے، بچے بہت یاد آ رہے ہیں۔ چھوٹے ٹھاکر کی واپسی تک ان کے ساتھ وقت گزار آؤں۔ کہہ رہے تھے، فکر نہ کرنا ..... میں آج ہی واپس آ جاؤں گا۔''

اب اتنے دن ہو گئے تھے اور وہ واپس نہیں آئے تھے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ میں نے ان کی فکر بھی نہیں کی۔ نجانے وہ کس حال میں ہوں۔ اوتار سنگھ کو افسوس ہونے لگا۔ اس نے سوچا، اب وہ پہلی فرصت میں ان کے بارے میں معلوم کرے گا۔

خیر، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ استاد کی رہنمائی کے بغیر مطالعہ نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ خاص طور پر دین کا مطالعہ!

یہ بات اس کے دل کو لگی۔ اس کا خوف اور اس کے اندر کی مایوسی اور پژمردگی ختم تو نہیں ہوئی۔ البتہ کم ضرور ہو گئی۔ وہ سوچ رہا تھا، مولوی صاحب زندہ ہوتے تو ان سے اسے مدد ملتی۔ اب وہ اپنے لئے استاد کہاں سے تلاش کرے۔ گرد و پیش میں اسے ایسا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔

پھر اس کا دھیان بٹ گیا۔ جس امتحان کا اسے خوف نہیں تھا، اس کا نتیجہ آ گیا تھا۔ وہ پاس ہو گیا تھا!

.....☆.....

سرفراز بیگم کرتے پر کڑھائی کر رہی تھیں۔ پائجامہ وہ پہلے ہی سی چکی تھیں۔ یہ کام کرتے ہوئے انہیں کیسی خوشی ہو رہی تھی، اس کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ بیٹے کیلئے کپڑے سینے کی خوشی ان کے لئے بالکل نئی تھی۔

کرتا مکمل کر کے انہوں نے استری کے لئے کوئلے دہکائے۔ بڑی محبت اور نفاست سے انہوں نے کپڑے استری کئے اور تہ کر کے رکھ دیئے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد انہیں خیال آیا کہ اگر چھوٹے ٹھاکر کو یہ کپڑے اچھے نہیں لگے تو کیا ہو گا۔ ویسے تو وہ گھر پر قمیض پائجامہ ہی پہنتا تھا۔ کم از کم دھوتی میں تو انہوں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

انہوں نے اس خیال پر دل ہی دل میں خود کو جھڑک دیا۔ آدمی اپنی خوشی کے لئے کوئی کام کرے اور اس کے بعد اندیشہ لے کر بیٹھ جائے، اب بھی کوئی بات ہے انہوں نے محبت سے لباس سیا ہے تو انشاء اللہ وہ اسے محبت ہی سے پہنے گا۔ محبت تو دل سے دل تک پہنچنے کا راستہ خود ہی بنا لیتی ہے۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

انہوں نے سوچا، شام کو یہ تحفہ لے کر جائیں گی۔ ویسے بھی اس کی صورت دیکھے کئی دن ہو گئے ہیں۔

لیکن شام کو رنجنا مٹھائی کا بڑا ڈبہ لے کر آ گئی۔ ''یہ لیجئے بڑی بیگم۔ چھوٹے ٹھاکر نے یہ ٹھائی بھجوائی ہے۔''

''اس کے ساتھ کوئی خوش خبری ہی تو ہوگی۔'' سرفراز بیگم نے ڈبہ لیتے ہوئے کہا۔

''جی بڑی بیگم۔ چھوٹے ٹھاکر امتحان میں پاس ہو گئے ہیں۔''

سرفراز بیگم کو خوشی تو بہت ہوئی۔ لیکن دھچکا بھی لگا۔ کیسا بے مروت لڑکا ہے یہ۔ کتنی غیریت برتتا ہے۔ کم از کم یہ خوش خبری تو خود آ کر سنا دیتا اس بہانے تو وہ نیچے آ سکتا تھا۔

انہوں نے مٹھائی کھلاتے ہوئے بیٹیوں سے بھی یہ بات کہی۔ ''اور تم کہتی ہو کہ وہ نیچے آنے کے لئے ہم سے اصرار کروانا چاہتا ہے۔'' انہوں نے نور بانو سے کہا۔ ''اس نے تو اس جواز سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا۔''

''اس سے تو میری بات کی تائید ہی ہوتی ہے اماں۔'' نور بانو نے دھیرے سے کہا۔ ''دل میں کوئی بات ہو، تبھی آدمی اتنی احتیاط کرتا ہے۔''

''تم پھر شروع ہو گئیں۔'' حور بانو نے اسے ٹوک دیا۔ پھر ماں سے بولی۔ ''اب اس مسئلے پر بات ہی نہ کیا کریں اماں۔ نور بانو کا تو وہی حال ہے۔ مرغے کی ایک ٹانگ۔ ویسے مجھے یقین ہو چلا ہے کہ چھوٹے ٹھاکر کو ہماری باتوں کی سن گن ضرور ہو گئی ہے۔''

''اللہ ہی جانے۔'' سرفراز بیگم نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''اچھا..... میں ذرا اوپر جا رہی ہوں۔''

ان کے اٹھنے کے بعد نور بانو نے آہستہ سے کہا۔ ''اماں کو بھی عجیب محبت ہوئی ہے چھوٹے ٹھاکر سے۔ اس پر مامتا لٹانے کو بے قرار رہتی ہیں۔ دن رات ایک کر کے کرتا کاڑھا ہے۔ اب وہ دے کر آئیں گی۔''

''تم تو بس یونہی علامہ بنی پھرتی ہو۔ تم کہاں سمجھ سکتی ہو یہ بات۔ یہ محبت ہے..... محبت!'' حور بانو نے جل کر کہا۔

''میں تم سے زیادہ سمجھتی ہوں باجی۔''

حور بانو نے بہت غور سے اسے دیکھا۔ ''کیا واقعی؟ یقین نہیں آتا۔'' اس کے لہجے میں تضحیک تھی۔

نور بانو اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ ''تمہارے یقین کرنے نہ کرنے سے کچھ نہیں ہوتا باجی۔ یہ سچ ہے کہ میں تم سے زیادہ سمجھتی ہوں۔ لیکن اللہ کے حکم سے روگردان کبھی نہیں کر سکتی۔''

''بس بڑے بڑے الفاظ بول سکتی ہو تم۔'' حور بانو نے اٹھتے ہوئے کہا اور پاؤں پٹختی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

ادھر اوپر جاتے ہوئے سرفراز بیگم سوچ ہی تھیں کہ ان کی محبت یقیناً سچی ہے۔ وہ اس محبت کی وجہ سے چھوٹے ٹھاکر کے لئے کپڑے سی رہی تھیں۔ آج کرتا مکمل ہوا اور آج ہی اس کا نتیجہ نکلا۔ اب یہ امتحان میں پاس ہونے کا انعام کہلائے گا۔

.....☆.....

وہ اوتار سنگھ کے سامنے بیٹھی ''اسے محبت سے تک رہی تھیں۔ پھر انہوں نے اس کی طرف وہ کپڑے بڑھائے۔ ''یہ میں نے تمہارے لئے کپڑے سیے ہیں۔ آج ہی کرتا مکمل ہوا اور آج ہی تم پاس ہوئے۔ اب اسے اپنا انعام سمجھ لو۔''

اوتار سنگھ نے کپڑے لے لئے اور شوخ لہجے میں بولا۔ ''انعام تو میں الگ سے لوں گا۔ یہ تو آپ ویسے ہی میرے لئے سی رہی تھیں۔''

''ٹھیک کہہ رہے ہو۔ انعام الگ سے ملے گا۔'' سرفراز بیگم کو اس کے ردعمل نے خوش کر دیا۔

اوتار سنگھ کرتے کو کھول کر اس کی کڑھائی کا جائزہ لے رہا تھا..... انگلی پھیر کر محسوس کر رہا تھا۔ سرفراز بیگم کا دل پھر اندیشوں سے بھر گیا۔ کیا پتا، یہ لباس اسے پسند نہ آئے۔ انہیں گھبراہٹ ہونے لگی۔

''یہ آپ نے اپنے ہاتھوں سے سیا ہے.....؟ یہ کڑھائی بھی؟'' اس نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ہاں..... خود سیا ہے، خود کاڑھا ہے۔ لیکن.....''

''معاف کیجئے گا ماں جی۔ میں ابھی آیا۔'' ان کا بات پوری ہونے سے پہلے ہی اوتار سنگھ اٹھا اور باہر چلا گیا۔ اس کے انداز میں عجلت تھی سرفراز بیگم کو پھر اندیشے ستانے لگے۔ شاید اسے اچھا نہیں لگا.....

''اب بتائیں، آپ کیا کہہ رہی تھیں؟'' اس نے انہیں چونکا دیا۔

وہ چونکیں تو لیکن اس کیفیت سے نہ نکل سکیں۔ وہ دارفتگی سے اسے دیکھے جا رہی تھیں۔ ''میں کہہ رہی تھی کہ یہ سیتے وقت میں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ تمہیں یہ لباس اچھا بھی لگے گا یا نہیں۔'' انہوں نے اس کیفیت میں دل کی بات کہہ دی۔ حالانکہ اب اس کا کوئی جواز نہیں تھا

''اس کا جواب تو عملی طور پر میں دے چکا ہوں۔'' اوتار سنگھ نے سادگی سے کہا۔ ''مگر یہ بتائیں کہ آپ نے یہ بات سوچی کیوں؟''

''میں نے تمہیں کبھی کرتا پہنے ہوئے نہیں دیکھا نا، اس لئے۔''

''ماں جی، یہ تو اتنا خوب صورت اور نفیس ہے اور پھر آپ نے اتنی محبت سے خود سیا ہے اور خود کڑھائی کی ہے کہ میں اسے ہمیشہ فخر اور محبت سے پہنوں گا مجھے تو اس میں مامتا کی نرمی اور ٹھنڈک بھی محسوس ہو رہی ہے۔''

سرفراز بیگم کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس کے لہجے میں سچائی تھی۔

''اور میں ایک بات بتاؤں ماں جی۔ میں نے ہمیشہ اچھا لباس پہنا۔ مگر باہر کا سلا ہوا۔ ماتا جی کو سینا آتا ہی نہیں تھا۔ اماں کو بھی میں نے کبھی سلائی کرتے نہیں دیکھا۔ یہ پہلا لباس ہے جو کسی نے میرے لئے اپنے ہاتھ سے سیا ہے۔ اور یہ اتنی باریک اور نفیس کڑھائی ہے کہ میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ آپ نے اس پر کتنی محنت کی ہے۔ کتنا وقت لگایا ہے۔ یہ تو میری زندگی کا سب سے قیمتی لباس ہے ماں جی۔''

سرفراز بیگم کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ وہ اچھا قدرداں بھی تھا۔

''مگر یہ بتائیں ماں جی کہ آپ نے میرا ناپ لئے بغیر ٹھیک میرے ناپ کے کپڑے کیسے سی دیئے۔ اس پر مجھے حیرت ہے۔''

سرفراز بیگم کا دل محبت اور مامتا سے لبالب بھر گیا۔ ''میں تمہیں سچ مچ اپنا بیٹا سمجھتی ہوں چھوٹے ٹھاکر۔ اور کسی ماں کو اپنے بیٹے کا ناپ لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس کی نگاہوں کی پیمائش سچی ہوتی ہے۔''

اوتار سنگھ نے اپنا جائزہ لیا، پھر پوچھا۔ ''میں کیسا لگ رہا ہوں ماں جی؟''

''بہت اچھے..... بالکل مغل شہزادوں کے جیسے۔''

اوتار سنگھ ان کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''مجھے انعام میں ایسا ہی جوڑا اور دیں گی نا؟''

''ایک نہیں، کئی جوڑے دوں گی انشا اللہ۔'' سرفراز بیگم نے خوش ہو کر کہا۔ پھر بولیں۔ ''ارے..... میں نے تمہیں پاس ہونے کی مبارک باد تو دی ہی نہیں۔ بہت بہت مبارک ہو بیٹے۔ اللہ تمہیں ہر امتحان میں کامیابی عطا فرمائے۔''

اوتار سنگھ کے لئے وہ بہت بڑی دعا تھی۔ کیونکہ اس تذکرے پر اسے زندگی کے امتحان کا خیال آ گیا تھا۔

''لیکن بیٹے، مجھے تم سے ایک شکایت ہے۔'' سرفراز بیگم نے اچانک کہا۔

اوتار سنگھ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ ''مجھ سے ایسی کیا غلطی ہو گئی ماں جی؟''

''ہو سکتا، تمہارے نزدیک بڑی بات نہ ہو۔ مگر مجھے تو بڑی بات ہی لگی۔ اسی لئے شکایت کر رہی ہوں۔''

''کچھ بتائیں تو ماں جی۔''

''اس جذباتی لمحے میں سرفراز بیگم ہر احتیاط بھول گئیں۔ اس وقت وہ بس ایک ماں تھیں، جب اپنے بیٹے سے بدلحاظی کی شکایت تھی۔ ''ادب کا تقاضہ تھا بیٹے تم خود مٹھائی لے کر نیچے آتے، مجھے یہ خوش خبری سناتے اور اپنے ہاتھ سے میرا منہ میٹھا کراتے۔ تم نے تو غیروں کی طرح رنجنا کے ہاتھ مٹھائی اور خوش خبری بھیج دی۔ کیا بیٹے ماں کے ساتھ ایسا کرتے ہیں؟'' وہ جیسے پھٹ پڑیں۔

اوتار سنگھ کا چہرہ فق ہو گیا۔ ''آپ کا دل دکھا ماں جی۔ مجھے معاف کر دیجئے۔ لیکن میرے اس عمل میں گستاخی اور بے ادبی نہیں تھی۔ نہ ہی کوئی بدنیتی تھی۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ لیکن مجبور ہی ہوں ماں جی۔''

''تم یہ کہہ رہے ہو کہ تم نیچے..... میرے گھر کبھی نہیں آؤ گے!''

''جی ماں جی۔''

''تو مجھے اس کی وجہ بھی بتا دو۔''

اوتار سنگھ سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی ہچکچاہٹ واضح تھی۔ ''یہ آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟''

''میں جاننا چاہتی ہوں۔ یہ ضروری ہے میرے لئے۔''

''میں جھوٹ نہیں بولتا ماں جی۔ اور سچ بولوں گا تو مجھے ڈر ہے کہ آپ مجھے برا سمجھنے لگیں گی۔''

سرفراز بیگم کا دل دھڑک اٹھا۔ ایسی کیا بات ہو سکتی ہے؟ کہیں نور بانو کا خیال درست تو نہیں؟ وہ پریشان ہو گئیں۔ لیکن انہیں اس کی یہ ادا اچھی لگی کہ اس نے جھوٹ نہیں بولا۔ ''سچ بولنے سے کبھی نہیں ڈرو۔ اور ماں کا دل تو بہت بڑا ہوتا ہے۔ وجہ تو تمہیں بتانی ہوگی۔''

''بات یہ ہے ماں جی کہ میں اگر آپ کا بیٹا ہوں تو مجھے گھر کی عزت کا خیال بھی رکھنا ہے۔'' اوتار سنگھ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''میں آپ کے گھر بیٹے کی طرح آؤں اور پاس پڑوس والوں کے علم میں یہ بات آئے تو باتیں بنیں گی۔ کوئی کسی کی زبان تو پکڑ نہیں سکتا۔ اپنی عزت کا خود خیال رکھنا ہوتا ہے۔ اور اب آپ کے گھر کی عزت میری عزت ہے۔''

اس کی بات کی سچائی نے سرفراز بیگم کے دل کو چھو لیا۔ لیکن انہیں احساس ہو رہا تھا کہ بات صرف اتنی نہیں ہے۔ ''اس طرح سوچنا تو تمہاری بڑائی اور اچھائی کی دلیل ہے۔ اس پر میں تمہیں برا کیسے سمجھ سکتی ہوں۔'' انہوں نے کہا۔ ''بہتر یہ ہے کہ مجھے پوری بات بتاؤ۔''

''آپ مجھ سے وہ کیوں سننا چاہتی ہیں، جو میں کہنا نہیں چاہتا۔'' اوتار سنگھ بے بسی سے بولا۔ ''میں کہہ رہا ہوں تا کہ میرا آپ کے گھر آنا آپ کے لئے نقصان دہ ہو سکتا ہے، اس لئے میں نیچے نہیں آؤں گا۔''

''نہیں۔ مجھے پوری بات بتاؤ۔ ورنہ میں سمجھوں گی کہ تم مجھے ماں نہیں سمجھتے۔''

''ٹھیک ہے۔ تو سن لیجئے۔'' اوتار سنگھ نے گہری سانس لیکر کہا۔ ''دیکھئے ماں جی۔ آدمی تو خطا کا پتلا ہوتا ہے۔ کچھ پتا نہیں، کب کہاں بہک جائے۔ میں بہن سے محروم رہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ بھائی بہنوں کے ساتھ کیسے ہوتے ہیں۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

بہنوں کے ساتھ کیسا رویہ ہوتا ہے ان کا۔اور میں بھی آدمی ہوں۔کبھی میری نظر بھی بہک گئی، چاہے ایک لمحے کے لئے بہکے،تو میں تو ساری زندگی کے لئے اپنی نگاہوں میں گر جاؤں گا۔مجھے ہمیشہ پچھتاوا رہے گا کہ ماں جی نے مجھ پر بیٹے کا سا اعتبار کیا اور میں نے اس اعتبار کو دھوکہ دیا۔اور اس شرمندگی میں میں آپ کو بھی کھو بیٹھوں گا۔میں جانتا ہوں ماں جی کہ کوئی بھی انسان کسی بھی لمحے کسی کمزوری کا شکار ہوسکتا ہے۔میں خود کو ایسی کسی آزمائش میں کیوں ڈالوں،جس میں ہار کر میں محبت کرنے والی ماں کو کھو بیٹھوں۔''

سرفراز بیگم بہوت ہو کر اسے دیکھ رہی تھیں۔وہ کتنا اچھا تھا.....کتنا محبت والا.....کتنا سمجھ دار.....کتنا حساس۔اور اتنی سی عمر میں وہ دور اندیشی بھی ہے۔اتنے آگے تک کی کیسے سوچ لیتا ہے۔اور وہ کیسا سچ بولنے والا ہے کہ اس نے اتنا بڑا سچ بول دیا۔اور وہ کتنے لحاظ والا ہے۔اس نے صرف اپنی کمزوری کی بات کی۔یہ نہیں کہا کہ ان کی کسی بچی پر بھی کوئی کمزوری حاوی آسکتی ہے.....اور اس کے نتیجے میں بھی شرمندہ وہی ہوگا۔واقعی.....اس کے لئے تو ان کے گھر آنا جانا ہر طرح سے خسارے کا سودا تھا۔

خاموشی گہری اور طویل ہوگئی تھی۔اوتار سنگھ مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھا تھا۔نظریں اٹھانے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔اور سرفراز بیگم کی خاموشی نے اسے چور بنا دیا تھا۔وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہیں.....ان کا کیا ردعمل ہے۔وہ ان کے کچھ کہنے کا منتظر تھا۔

اور سرفراز بیگم کو اس پر ایسی محبت آئی تھی کہ وہ گنگ ہو کر رہ گئی تھیں۔

وہ کچھ نہ بولیں تو اوتار سنگھ نے نظریں اٹھائے بغیر ڈرتے ڈرتے کہا۔''کیا میں نے یہ سوچ بول کر آپ کو کھو دیا ماں جی؟''

سرفراز بیگم نے حیرت سے اسے دیکھا۔چند لمحے تو وہ اس کی بات سمجھیں ہی نہیں۔بات سمجھ میں آئی تو وہ اٹھیں۔انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں بھرا اور بے حد محبت سے اس کی پیشانی چوم لی۔''نہیں بیٹے۔تم تو مجھے پہلے سے بھی زیادہ عزیز ہوگئے ہو۔تم جیسے بیٹے تو نصیب والوں کو ملتے ہیں۔مجھے تو تم پر فخر ہے بیٹے۔اب ذرا سر تو اٹھاؤ۔ادھر دیکھو تو۔''

اوتار سنگھ نے نظریں اٹھائیں۔اسے ان کی آنکھوں میں محبت اور مامتا کا سمندر موج زن نظر آیا۔''شکریہ ماں جی۔''اس نے دھیرے سے کہا اور پھر نظریں جھکا لیں۔وہ اب بھی کھسیایا ہوا تھا۔

''ماں اور بیٹے کے درمیان شکریے کا لفظ کبھی نہیں آتا۔''

اس لمحے سرفراز بیگم کے دل میں بے اختیار ایک تند..... بے حد منہ زور خواہش ابھری۔کاش.....کاش یہ لڑکا مسلمان ہوتا۔اور وہ اسے داماد بنا لیتیں۔اس کی اخلاقی خوبیاں قابل رشک تھیں۔

اگلے ہی لمحے انہوں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

.....☆.....

اوتار سنگھ اپنے اندر کے مسائل میں اس طرح الجھا ہوا تھا کہ باہر کی دنیا کا اسے کچھ پتا ہی نہیں تھا،اسے علم ہی نہیں تھا کہ باہر کی فضا کتنی بدل رہی ہے۔ایک دن بیٹھے بیٹھے نعروں کی آوازیں سن کر وہ چونکا۔اس نے سماعت پر زور دے کر سننے کی کوشش کی۔لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے رگھو؟''اس نے پوچھا۔

''یہ تو ہر روز ہوتا ہے مالک۔''رگھو نے کہا۔''مسلمان جلوس نکالتے ہیں۔الگ ملک مانگ رہے ہیں نا۔''

اوتار سنگھ کو ٹھے پر گیا۔وخاصا بڑا جلوس تھا۔اس میں بچوں کی اکثریت تھی۔لیکن بڑے بھی شامل تھے۔آگے موجود شخص نے سبز رنگ کا ایک پرچم اٹھا رکھا تھا۔وہ قیادت کر رہا تھا۔وہ کہتا.....پاکستان کا مطلب کیا.....پیچھے والے ایک آواز ہو کر جواب دیتے .....لا الہ الا اللہ۔

پاکستان!تو یہ ہے اس ملک کا نام جو یہ بنانا چاہتے ہیں۔اس نے سوچا۔نام اسے اچھا لگا.....اپنا اپنا سا اور پاکستان کا مطلب ہے.....اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔یعنی اس ملک میں صرف وہی لوگ ہوں گے،جو عبادت میں اللہ کا شریک کسی کو نہ بنائیں۔لیکن نجانے کیوں اسے یہ بات اچھی نہیں لگی کہ اس نعرے میں آدھا کلمہ تھا،پورا نہیں۔اس نے دل ہی دل میں پورا کلمہ پڑھا۔

جلوس آگے نکل گیا۔نعروں کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے معدوم ہوگئی۔وہ وہیں کھڑا سوچتا رہا۔اس روز پہلی بار اسے احساس ہوا کہ شہر کی فضا میں ایک ممکنہ تبدیلی سانس لے رہی ہے۔وہ اچھی ہے یا بری،یہ اندازہ وہ نہیں لگا سکتا تھا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

لیکن چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ایک اور جلوس نمودار ہوا۔ وہ جوابی جلوس تھا۔ باہر دیکھتے ہوئے اسے اندازہ ہوا کہ اس جلوس میں ہندو اور سکھ شریک ہیں۔ وہ قریب آئے تو اسے ان کے نعرے سنائی دیئے۔ بٹ نہ سکے گا۔ ہندوستان۔ بننے نہ دیں گے پاکستان۔ اس دھرتی سے نکلو مسلو۔ ہندوستان ہمارا ہے۔ اپنا ترنگا اپنی آن، بھارت ماتا اپنے پران۔

دونوں جلوسوں کا تضاد بے حد واضح تھا۔ ایک طرف کے نعروں میں ایک وطن کے خواب کی محبت تھی تو دوسری طرف دہکتی ہوئی شدید نفرت تھی۔ ایک طرف جسمانی حرکات وسکنات کی زبان میں نرمی اور عزم تھا تو دوسری طرف سختی اور جارحیت۔ یہ دو گروہ تھے جو تصادم کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اوتار سنگھ کو اندازہ ہو گیا کہ فضا میں جو ممکنہ تبدیلی اسے محسوس ہو رہی ہے، اس میں انسانی خون اور تشدد کی بو رچی ہوئی ہے۔

وہ نیچے چلا آیا۔ لیکن وہ نہایت فکرمندی سے اسی بارے میں سوچے جا رہا تھا۔

اس روز اس نے رگھو سے ماسٹر جی کے بارے میں پوچھا۔ ''ماسٹر جی جاتے وقت تمہیں اپنے گھر کا پتا تو دے کر گئے ہوں گے؟''

''نہیں مالک۔''

''تم نے پوچھا بھی نہیں۔''

''پوچھا تھا مالک۔ وہ بولے، پتے کا تمہیں کیا کرنا ہے۔ میں خود ہی دو چار دن میں واپس آ جاؤں گا۔''

اور اب اس بات کو تقریباً دو مہینے ہو گئے تھے اور وہ واپس نہیں آئے تھے، اوتار سنگھ کو تشویش ہونے لگی۔ کہیں ماسٹر جی زیادہ بیمار تو نہیں ہو گئے۔ ورنہ وہ آ جاتے۔ کہیں وہ.....؟ اس سے آگے وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

ایک ہی جگہ ایسی تھی، جہاں سے اسے ماسٹر جی کا پتا معلوم ہو سکتا تھا۔ ماسٹر جی اسی اسکول میں پڑھاتے رہے تھے، جس میں وہ پڑھتا تھا، جب وہ پتا جی کے ساتھ گاؤں آئے تو ریٹائر ہو چکے تھے۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر نے ہی ماسٹر جی کو پتا جی سے متعارف کرایا تھا اور ان کی سفارش کی تھی، ہیڈ ماسٹر صاحب سے ہی ماسٹر جی کا پتا معلوم ہو سکے گا۔ لیکن ان دنوں اسکول کی چھٹیاں تھیں۔ اسکول اب یکم اگست کو کھلے گا۔ تبھی کچھ معلومات ہو سکیں گی۔

.....☆.....

کالج کھل گئے۔ ابتدا میں تو پڑھائی ویسے بھی کم ہوتی ہے۔ لیکن اوتار سنگھ کو اندازہ ہو گیا کہ اب پڑھائی کا ماحول ہے ہی نہیں۔ وہاں تو اب سیاسی گفتگو زیادہ ہوتی تھی۔ ٹیچرز کو بھی پڑھانے میں بہت زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی۔ ادھر دوستوں کے دلوں میں بھی دوری ہو گئی تھی۔ محمود اور رام گوپال اب بھی ساتھ بیٹھتے تھے۔ اختلاف رائے تو ان کے درمیان پہلے ہی تھا۔ لیکن اب ان کے درمیان نفرت اور شدید کھنچاؤ تھا۔ درحقیقت وہ دو ایسی قوموں کے نمائندے تھے جو ایک بے حد دھماکہ خیز تصادم کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

اوتار سنگھ کو گردوپیش سے ہمیشہ دلچسپی رہی تھی۔ وہ اندر کی دنیا میں دلچسپی لینے والا ایسا شخص تھا، جو اندر کی دنیا کو باہر کے حوالوں سے اور باہر کی دنیا کو اندر کے حوالوں سے سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اسے افسوس ہوا کہ وہ حالات حاضرہ سے اتنا بے خبر بیٹھا رہا..... اپنے اندر کی دنیا میں مگن، اندر کی دنیا کے مسائل میں گم۔

یہ جولائی 46ء کا عرصہ تھا، اس عرصے میں وہ introvert نہیں رہا extrovert ہو گیا۔ اندرونی دنیا کے باطنی مسائل دب کر رہ گئے۔ اس لئے کہ اب اس کے پاس ان پر سوچنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ اس کے لئے سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس وقت پورا ملک بارود کے سلگتے ہوئے ڈھیر پر بیٹھا تھا اور کسی بھی وقت پھٹ سکتا تھا۔ بڑے پیمانے پر خون ریزی کا خدشہ اسے حقیقت میں بدلتا نظر آ رہا تھا۔ وہ اس صورت حال سے بے تعلق نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ایسے معاملات میں آدمی کنارہ کش ہو کے، غیر جانب دار ہو کے گزارہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ جہاں پوری قوم کا معاملہ ہو، وہاں آدمی چاہے تو بھی غیر جانب دار نہیں رہ سکتا۔ کبھی وہ خود بہ خود ملوث ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے، کبھی لوگ زبردستی اسے ملوث کر دیتے ہیں۔ اور ایسی بے اختیاری میں اس بات کی بھی ضمانت نہیں ہوتی کہ وہ درستی پر ہے۔ اس لئے اوتار سنگھ صورت حال کو پوری طرح سمجھنا اور اس کے بارے میں درست فیصلہ کرنا چاہتا تھا، تاکہ اگر کسی بھی مرحلے پر، کسی بھی حد تک اسے کسی فریق کا ساتھ دینا پڑے تو وہ غلطی نہ کرے۔ اس کا ساتھ دے، جس کا موقف درست اور جائز ہو۔

اس کے نتیجے میں وہ اخبارات میں دلچسپی لینے لگا۔ اور اخبارات میں بھی وہ دونوں جانب کے پڑھتا تھا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

اخبارات پڑھنے شروع کئے تو اسے حیرت بھی ہوئی اور خود پر افسوس بھی ہوا۔ اتنا کچھ ہو چکا تھا اور اسے کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ پاکستان کو وہ مسلمانوں کا خواب سمجھتا تھا۔ لیکن صورت حال بتا رہی تھی کہ مسلمان تیزی سے تعبیر کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ یہ بات طے تھی کہ انگریز رخصت ہونے والے ہیں۔

16 مئی کو کیبنٹ پلان سامنے آیا۔ اس میں انگریزوں نے تقسیم ہند اور قیام پاکستان کو مسترد کر دیا تھا۔ لیکن مسلمانوں کے شدید ردعمل نے انہیں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے ملک کو تین گروپس میں تقسیم کر دیا۔ پہلے گروپ میں مدراس، بمبئی، متحدہ صوبے، مرکزی صوبے، بہار اور اڑیسہ شامل تھے۔ یہ ہندوؤں کے اکثریتی علاقوں کا گروپ تھا۔ دوسرے گروپ میں پنجاب اور صوبہ سرحد تھے۔ یہ مسلمانوں کے مغربی اکثریتی علاقوں کا گروپ تھا۔ تیسرے گروپ میں بنگال اور آسام تھے۔ یہ مسلمانوں کے مشرقی اکثریتی علاقوں کا گروپ تھا۔ انگریز چاہتے تھے کہ تینوں گروپ ایک ڈھیلے ڈھالے وفاق کے تحت چلیں۔ دفاع، خارجہ امور و مواصلات، یہ تین شعبے مکمل طور پر اس وفاق کے اختیار میں ہوں۔ باقی اختیارات صوبوں کے پاس ہوں۔

کیبنٹ پلان کے دو حصے تھے۔ ایک دستور ساز اسمبلی سے متعلق تھا اور طویل المیعاد تھا۔ دوسرا عبوری حکومت سے تعلق رکھتا تھا اور مختصر المیعاد تھا۔ کیبنٹ مشن نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ اس پلان کو مسترد کیا جائے یا قبول کیا جائے تو مکمل طور پر۔ اور اگر بڑی سیاسی جماعتیں اس عبوری حکومت میں شامل ہونے سے انکار کریں گی تو وائسرائے کو اختیار ہوگا کہ اپنی مرضی کے کسی بھی گروپ کو حکومت بنانے کی دعوت دے۔

مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے یہ اسکیم قبول کر لی۔ وائسرائے نے عارضی جناح کو یقین دہانی کرائی کہ عبوری حکومت 12 ارکان پر مشتمل ہوگی۔ ان میں 5 کانگریس کے، 5 مسلم لیگ کے اور ایک سکھ کا اور ایک ہندو دستانی عیسائیوں کا نمائندہ ہوگا۔ جبکہ کانگریس 5 کانگریس اراکین (تمام ہندو) 4 مسلم لیگی اراکین، ایک غیر مسلم لیگی مسلمان رکن، ایک غیر کانگریسی ہندو رکن، ایک شودر، ایک انڈین عیسائی، ایک سکھ اور ایک کانگریسی عورت پر مشتمل 15 رکنی کابینہ کا مطالبہ کر رہی تھی اور ڈیڈ لاک کو ختم کرنے کیلئے وائسرائے نے 16 جون کو کچھ تجاویز پیش کیں۔ ان کی رو سے عبوری حکومت 14 ارکین پر مشتمل ہوگی جن میں 6 کانگریسی، 5 مسلم لیگی، ایک، ایک انڈین عیسائی اور ایک پارسی شامل ہوگا۔ مسلم لیگ نے یہ تجویز قبول کر لی۔ لیکن کانگریس نے اس بنیاد پر اسے مسترد کر دیا کہ اس میں قوم پرست مسلمانوں کا کوئی نمائندہ نہیں ہے۔

وائسرائے نے کہہ دیا تھا کہ اگر کوئی بڑی پارٹی اس تجویز کو قبول نہیں کرتی تو بھی حکومت تشکیل دینے وقت کوشش کی جائے گی کہ وہ ممکنہ طور پر تمام سیاسی طبقوں کی نمائندہ حکومت ہو۔

کانگریس کے انکار کے بعد مسلم لیگ کو توقع تھی کہ وائسرائے کانگریس کے بغیر عبوری حکومت تشکیل دے گا۔ لیکن وائسرائے کے پیچھے ہٹنے سے یہ ثابت ہو گیا کہ اس کا جھکاؤ کانگریس کی طرف ہے۔ چنانچہ 27 جولائی کو مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن کی تجاویز قبول کرنے سے انکار کر دیا اور 16 اگست کو برطانوی حکومت کے خلاف راست اقدام کا دن منانے کا اعلان کر دیا۔ اس کے فوراً بعد کلکتہ میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ بڑی تعداد میں مسلمان مارے گئے۔ ان فسادات نے اختارالدین کو یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا کہ مسلمان پاکستان کا مطالبہ کرنے میں حق بہ جانب ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو ہندو اپنی اکثریت کی بنیاد پر مسلمانوں کو غلام بنا کر رکھیں گے اور انہیں کچل ڈالیں گے۔

.....☆.....

یکم اگست کو اسکول کھل گئے۔ اختارالدین ہیڈ ماسٹر سے ملنے کیلئے گیا۔ ہیڈ ماسٹر نے اسے بڑی عزت سے بٹھایا۔ ”کیسے ہو اختارالدین؟“

”جی ٹھیک ہوں۔“

”ہماری یاد کیسے آ گئی؟“

اختارالدین شرمندہ ہو گیا۔ ”اس اسکول کو اور آپ سب اساتذہ کو تو میں بھول ہی نہیں سکتا۔ علم حاصل کرنا آپ ہی لوگوں سے سیکھا ہے میں نے۔“

”ہمیں تم پر فخر ہے اختارالدین۔ تم بہت ہونہار شاگرد ہو۔“ ہیڈ ماسٹر نے کہا۔ پھر پوچھا۔ ”تمہارے چاچی کیسے ہیں؟“

”ان کا تو دیہانت ہو گیا سر۔“ اختارالدین نے انہیں تفصیل بتائی۔

”مجھے بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔“ ہیڈ ماسٹر نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔

”میں آپ کے پاس ایک کام سے آیا ہوں سر۔“

”کہو۔ میں کیا کر سکتا ہوں تمہارے لئے۔“

”میرے استاد تھے، جن کی سفارش آپ نے کی تھی۔ وہ اس اسکول سے ہی ریٹائر ہوئے تھے..... کاشی پرشادجی۔“

”ہاں..... ہاں، مجھے یاد ہے۔“

”مجھے ان کا پتا چاہئے۔“

”پتا؟ وہ تو شاید پرانے ریکارڈ میں ہی مل سکے گا۔ اچھا..... میں دیکھتا ہوں۔“ انہوں نے گھنٹی بجائی۔ چپراسی آیا تو انہوں نے ایک پرچ پر کچھ لکھ کر اسے دیا۔ ”یہ جنسی دھرم کے پاس لے جاؤ۔ اس سے کہو، یوفوری طور پر چاہئے۔“

چپراسی چلا گیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد جنسی دھرم آیا اور کاشی پرشادجی کا پتا ایک کاغذ پر لکھ کر دے دیا۔

اختارالدین ہیڈ ماسٹر صاحب کا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔

.....☆.....

وہ اچھا خاصا مکان تھا۔ اختارالدین نے دروازے پر دستک دی تو سات آٹھ سال کا ایک لڑکا سامنے آیا۔

”کاشی پرشادجی یہیں رہتے ہیں نا؟“ اختارالدین نے اس سے پوچھا۔

”یہ نام تو میں نے کبھی نہیں سنا۔“

اختارالدین گڑبڑا گیا۔ ”تمہارے چاچی کا کیا نام ہے؟“ اسے یاد رہا کہ پرانا پتا ہے۔ ہجانے اب ماسٹری وہاں رہتے بھی ہوں گے یا نہیں۔

”رام پرشاد۔“

اسی لمحے اندر سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ”گنگا..... او گنگا..... کون آیا ہے رے؟“ پھر اس جوان عورت نے قریب آ کر باہر جھانکا۔ ”کون ہیں آپ؟ کس سے ملنا ہے؟“ اس نے اختارالدین سے پوچھا۔

”کون کاشی پرشاد..... ارے..... تم کہیں باپو کو تو نہیں پوچھ رہے ہو؟“

”وہ اسکول میں پڑھاتے تھے۔“

عورت نے اسے غور سے دیکھا۔ ”تم انہیں کیسے جانتے ہو؟“

اختارالدین کو یہ بات عجیب لگی کہ وہ دروازے پر کھڑی تفتیش کر رہی ہے۔ پہلے تو وہ کاشی پرشادجی کو ان کے نام سے بھی نہیں پہچانی تھی۔ میں ان کا شاگرد ہوں۔ کئی سال سے وہ میرے ساتھ رہے ہیں۔“

”ارے..... تو وہ تم ہو۔ آؤ..... اندر آؤ۔“

وہ اسے اندر لے گئی۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی خاصا بڑا صحن تھا۔ صحن کے پار سامنے کے رخ پر کمرے بنے ہوئے تھے۔ کونے والے کمرے کے پہلو میں زینہ تھا۔ اوپر بھی دو کمرے بنے تھے۔

وہ اسے نیچے کے ایک کمرے میں لے گئی۔ اب اس کا انداز بدل گیا تھا۔ ”آپ یہاں بیٹھئے۔“ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کے لئے شربت لاتی ہوں۔“

اختارالدین نے کھڑے کھڑے کمرے کا جائزہ لیا۔ ”بیٹھئے..... ماسٹری کہاں ہیں؟ مجھے ان سے ملنا ہے۔ اس نے کہا۔

وہ کمرے سے جاتے جاتے پلٹی۔ ”وہ..... وہ تو.....“ وہ کہتے کہتے رکی۔ اختارالدین کا دل گھبرانے لگا۔ ”کہیں ماسٹری.....؟

”وہ تو اپنے کمرے میں ہیں۔“ بالآخر اس نے جملہ پورا کیا۔

”مجھان سے ملوا دیجئے۔“ اختارالدین نے لجاجت سے کہا۔ ”میں ان کے لئے ہی آیا ہوں۔“

”میں ابھی شربت لائی۔ آپ پی لیں۔ پھر ان سے مل لیجئے گا۔“

”شربت کی کچھ ایسی ضرورت نہیں۔ اور وہ میں ان کے کمرے میں ہی پی لوں گا۔“

اس کا منہ کھل گیا۔ ہجانے وہ حیرت تھی یا خوف۔ ”آپ یہیں پی لیں۔“ اس نے جھگڑتے ہوئے کہا۔

اختارالدین جھنجلا گیا۔ ”شربت کی کوئی اہمیت نہیں۔ میں یہاں ماسٹری سے ملنے آیا ہوں۔ آپ مجھے ان سے ملوا دیں۔“

”اچھا، آئیں میرے ساتھ۔“ عورت کے انداز سے لگا کہ وہ اپنی جھنجلاہٹ اور غصے پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہے۔

وہ صحن میں آئے۔ عورت نے سامنے ایک چھوٹی سی کوٹھری کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ وہاں ہیں۔ جاؤ، ان سے مل لو۔“

اختارالدین کو وہ کوٹھری دور سے ہی نظر آ گئی۔ اتنے کمروں کے ہوتے ہوئے ماسٹری اس تنگ کوٹھری میں کیوں رہ رہے ہیں۔ بہرحال وہ اس طرف بڑھنے لگا۔ درمیان میں اس نے پلٹ کر کمرے کی طرف دیکھا۔ وہ عورت اب بھی دروازے پر کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے دیکھتے پاتا تو اس نے منہ پھیر لیا، وہ کمرے میں چلی گئی۔

اختارالدین کوٹھری کے دروازے پر ٹھٹکا۔ اندر اندھیرا تھا۔ بالآخر اس نے اندر قدم رکھا۔ چند لمحے تو اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ مگر پھر چند لمحوں میں اس کی نظر اندر کے اندھیرے سے ہم آہنگ ہو گئی۔ تب جو کچھ اس نے دیکھا، اس نے اسے ہلا دیا۔

کوٹھری اس کے اندازے سے بھی بڑھ کر تنگ تھی۔ کونے میں دیوار کے ساتھ ایک جھلنگا چارپائی تھی، جس پر ایک استخوانی وجود دکھر ہا تھا۔ نقوش نظر آنے کے باوجود وہ ماسٹر جی کو پہچان نہیں سکا۔ وہ تو جیسے چرمرا کر رہ گئے تھے۔ چہرے پر بھی ہڈیوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اور ان کی آنکھیں بند تھیں۔

وہ بے تابی سے ان کی طرف لپکا۔ چارپائی کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے اس نے ان کے ہاتھ تھام لئے۔ ”ماسٹری..... ماسٹری..... یہ کیا ہو گیا آپ کو؟“

ماسٹری نے آنکھیں کھولیں اور نحیف آواز میں بولے۔ ”کون ہے؟“

”میں ہوں ماسٹری اختارالدین۔“

ماسٹری نے پہلو بدلنے کی ناکام کوشش کی اور اسے بہت غور سے دیکھا۔ ”تم..... تم یہاں کیوں آ گئے بیٹے۔“

باہر سے گنگا کی بیچ کی آواز سنائی دی۔ ”وہ اسے پکار رہا تھا۔ ”باپو جی..... باپو جی..... یہ کرسی لے لو۔“

اختارالدین نے دروازے کی طرف رخ کر کے جواب دیا۔ ”اندر لے آؤ۔“

”میں اندر نہیں آ سکتا باپو جی۔ آپ آ کر کرسی لے لو۔“

”اندر نہیں آ سکتے تو باہر لے جاؤ۔“ اختارالدین نے جھنجلا کر کہا۔ پھر وہ ماسٹری کی طرف مڑا۔ ”یہ سب کیا ہے ماسٹری۔ اور آپ کا اتنا برا حال ہے.....“

”مجھے..... مجھے..... ٹی بی..... ہو گئی ہے۔“ ماسٹری نے اٹک اٹک کر کہا۔

اختارالدین کے لئے وہ ایسا صدمہ تھا کہ چند لمحے کو اسے لگا کہ اس کے دماغ کی نسیں پھٹ جائیں گی۔ وہ رونے لگا۔ شاید اس وقت وہ نہ روتا تو اسے کچھ ہو جاتا۔ ”میں بہت برا ہوں..... بہت غیر ذمے دار ہوں ماسٹری۔“

”ایسا نہ کہو بیٹے.....“

اردو فینز ڈاٹ کام

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''دو مہینے ہو گئے اور میں نے آپ کی خبر تک نہیں لی۔ یہ غیر ذمے داری ہی تو ہے۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ ''لیکن آپ واپس کیوں نہیں آ گئے؟''

''اس بیماری کے ساتھ کیسے آتا۔'' ماسٹر جی کے لہجے میں بے بسی تھی۔ ''یہ تو گلنے والی بیماری ہے بیٹے۔'' اچانک وہ چونکے۔ ''یہاں سے اٹھ جاؤ بیٹے۔ تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں یہ بیماری لگے.....''

''مجھے کچھ نہیں ہو گا ماسٹر جی۔'' اوتار سنگھ نے تڑپ کر کہا۔ ''اور ہو جائے تو بھی بھرپور انہیں۔ آپ نے مجھے علم جیسی دولت دی ہے۔ اگر مجھے آپ کی بیماری بھی لگ جائے تو مجھے قبول ہے.....''

''میرے اپنے بچے بھی میرے پاس نہیں آتے۔'' ماسٹر جی نے رندھی ہوئی آواز میں کہا اور رونے لگے۔

اوتار سنگھ نے کٹھری کا تفصیلی جائزہ لیا۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ لوہے کے کچھ پرانے ٹرنک اور تختے رکھے تھے۔ ان کے پاس چند گٹھریاں تھیں۔ ایک ناکارہ سلائی کی مشین بھی پڑی تھی۔ گرد و کیچ کا انبار ہوتا تھا کہ مدت سے وہاں جھاڑو نہیں دی گئی۔ کٹھری میں کوئی کھڑکی، کوئی روزن نہیں تھا۔ گھٹن بہت زیادہ تھی۔ ہوا کا کوئی گزر ہی نہیں تھا۔ رطوبت بھی صرف صبح کے وقت تھوڑی دیر کے لئے آتی ہو گی۔

پٹی پر بیٹھے بیٹھے اس کی کمر دکھ گئی تھی۔ اس نے پہلو بدلا تو اس کے پاؤں برتن سے ٹکرائے۔ اس نے نیچے دیکھا۔ وہ ایک پلیٹ تھی، جس میں تھوڑی سی دال بچی ہوئی تھی۔ قریب ہی ایک چگیر تھی، جس میں موجود آدھی روٹی سوکھ کر لکڑی ہو چکی تھی۔ وہ برتنوں کو اٹھانے کے لئے جھکا تو اسے وہ پژمردہ نظر آیا، جو یقیناً تھوکنے کے کام آتا تھا۔ وہ بہت گندا ہو رہا تھا۔

اوتار سنگھ کی سمجھ میں لمحوں میں سب کچھ آ گیا۔ ماسٹر جی کا دکھ، ان کا رونا۔ انہوں نے اپنے بچوں سے بہت محبت کی تھی۔ ان کا بہت خیال رکھا تھا۔ کئی برس وہ اس کے ساتھ رہے۔ چاہتی انہیں معقول فیس دیتے تھے۔ اور ماسٹر جی کے اپنے اخراجات نہیں تھے۔ وہ سب کچھ بچوں کو بھیج دیا کرتے تھے۔ مگر آج ان پر وقت پڑا تھا تو ان کے بچوں نے انہیں کاٹ کباڑ کی طرح اس کوٹھری میں پھینک دیا تھا۔ اچھوت بنا کر رکھ دیا تھا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ ان کے بچوں کو نقصان کا احساس ہو رہا ہو گا۔ وہ ایک باقاعدہ آمدنی سے بھی محروم ہو گئے تھے۔ الٹا ماسٹر جی ان پر بوجھ ہو گئے تھے۔

اچانک ماسٹر جی پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ ان سے اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ اوتار سنگھ نے سہارا دے کر انہیں اٹھایا۔ پھر اس نے تسلا ان کے سامنے رکھ دیا۔ کھانسی کے دورے کے باوجود ماسٹر جی نالی میں سرہانے جا رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ اس تسلے کو چھوئے بھی۔

''آپ میری فکر نہ کریں ماسٹر جی۔ تھوک دیں۔''

مجبور ہو کر ماسٹر جی نے تسلے میں تھوکا۔ کھانسی کا دورہ رکا تو ماسٹر جی کا چہرہ تھوک سے لتھڑ چکا تھا۔ اوتار سنگھ نے رومال نکالا اور ان کا منہ پونچھ دیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں ابھی آتا ہوں ماسٹر جی۔''

وہ کٹھری سے نکلا۔ عورت اور بچہ کچھ دور کھڑے اسی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ ان سے کچھ کہے بغیر گھر سے نکل آیا۔

.....☆.....

ڈاکٹر نے جتنی دیر ماسٹر جی کا معائنہ کیا، اس سے زیادہ دیر تک کٹھری کا تفصیلی جائزہ لیا۔ پھر اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ یہاں کب سے ہیں؟''

اوتار سنگھ نے ماسٹر جی کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ نہیں بولے۔ آخر اس نے جواب دیا۔ ''ایک مہینے سے زیادہ ہو گیا ہو گا۔''

''آپ کیسے بیٹے ہیں۔'' ڈاکٹر نے ملامت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اس بیماری میں ایسے ماحول میں رہنا ان کے لئے مہلک ہے۔ کیا آپ یہ بات نہیں سمجھتے؟ یہ گرد، یہ گندگی ان کے مرض کو اور بڑھا دے گی۔ انہیں صاف ستھرے ماحول، روشنی، تازہ ہوا اور اچھی غذا کی ضرورت ہے۔ ان کے لئے یہ چیزیں دوا سے بڑھ کر ہیں۔ اور آپ نے انہیں اس کوٹھری میں مرنے کے لئے چھوڑ رکھا ہے۔''

اوتار سنگھ نے ندامت سے سر جھکا لیا۔ کاتی پرشاد جی نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا۔ مگر اس لمحے کمرے میں ایک جوان آدمی داخل ہوا۔ اس میں ان کے پرانے دوری شباہت تھی۔ اس نے منہ پر رومال رکھا ہوا تھا۔ ''تم کون ہو؟'' اس نے آتے ہی گھمنی گھمنی آواز میں اوتار سنگھ سے پوچھا۔

''میں اوتار سنگھ ہوں..... ماسٹر جی کا شاگرد۔'' اوتار سنگھ نے نرم لہجے میں کہا۔ ''آپ کے پاس آنے سے پہلے ماسٹر جی میرے ہی پاس رہتے تھے۔''

''میں بدری پرشاد ہوں..... ان کا بیٹا۔'' جوان آدمی نے کاتی پرشاد جی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اوتار سنگھ کے ساتھ اس کا رویہ باب مودبانہ تھا۔

ڈاکٹر حیرت سے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ ''آئی ایم سوری مسٹر اوتار سنگھ۔ میں نے بلا وجہ آپ کو برا بھلا کہا۔''

''ایسی کوئی بات نہیں۔ میں واقعی اپنی غفلت اور بے خبری پر شرمندہ ہوں۔ دو مہینے میں ماسٹر جی کو بھولا رہا۔ میں قصوروار ہوں۔''

''بہر حال جو کچھ میں نے آپ سے کہا، اصولاً مجھے ان سے کہنا چاہیے تھا۔'' ڈاکٹر نے بدری پرشاد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر حقارت بھرے لہجے میں بولا۔ ''لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ان پر کچھ اثر ہو گا۔''

بدری پرشاد کھسیا گیا۔ ''دیکھیے، ہم سے جو بن پڑا، ہم نے کیا۔ اپنی حیثیت کے مطابق ڈاکٹر کو دکھایا، دوا دی۔ لیکن کچھ فائدہ نہیں۔ یہ مرض ہی لاعلاج ہے۔''

''آپ کی حیثیت کا مجھے علم نہیں۔'' ڈاکٹر نے تڑخ کے جواب دیا۔ ''لیکن جو آپ نے کہا، وہ میں دیکھ رہا ہوں۔ آپ کے منہ سے تو ابھی تک رومال نہیں ہٹا۔ انہیں یہاں جس طرح کھانا دیا جا رہا ہے، اس کا آپ کی حیثیت سے کوئی تعلق نہیں، اور آپ کے انداز سے مجھے پتا چل گیا کہ انہیں یہاں پھینکنے کے بعد آپ یہاں پہلی بار آئے ہیں۔ ذرا یہ بتائیں، انہیں کھانا دینے کون آتا ہے یہاں؟''

''گھر کی ملازمہ ہے.....''

''وہ آپ کی حیثیت کا ثبوت ہے اور یہ جس حال میں ہیں، اس سے آپ کی سنگ دلی ظاہر ہوتی ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ پھر وہ اوتار سنگھ کی طرف مڑا۔ ''باہر چلیں۔ مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔''

وہ دونوں باہر نکل آئے۔ بدری پرشاد ان کے پیچھے پیچھے تھا۔

دروازے پر پہنچ کر ڈاکٹر رکا۔ ''ان کا مرض بہت بڑھ چکا ہے۔ اب آپ ان کے ساتھ ایک ہی بھلائی کر سکتے ہیں۔''

''بتائیے ڈاکٹر صاحب۔''

ڈاکٹر اب بدری پرشاد کو پوری طرح نظر انداز کر رہا تھا۔ ''مجھے نہیں معلوم، آپ افورڈ کر سکیں گے یا نہیں۔''

''ماسٹر جی کے لئے میں سب کچھ افورڈ کر سکتا ہوں۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ ''آپ بتائیے تو۔''

''جتنی جلد ہو سکے، انہیں کسی پہاڑی مقام پر لے جائیں۔ کسی سینی ٹوریم میں داخل کرا دیں۔''

''یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ آپ کوئی مقام تجویز کریں۔''

''شملہ بہتر رہے گا۔ آپ کہیں تو میں وہاں کے ایک سینی ٹوریم کو لیٹر لکھ دوں گا۔''

''تو آپ لکھ دیں۔ میں ماسٹر جی کو کل ہی لے جاؤں گا۔''

بدری پرشاد کو تین کا احساس ہونے لگا۔ ''آپ لوگ یوں فیصلے کر رہے ہیں، جیسے پتا جی کا کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔ ہماری مرضی کے بغیر.....''

''میں ان کے پوچھنے والوں کو دیکھ چکا ہوں۔'' ڈاکٹر نے بے حد خراب لہجے میں کہا۔ ''برسوں بعد آپ اس حال کو پہنچیں اور آپ کی اولاد آپ کو اس طرح رکھے تو آپ کی سمجھ میں یہ سب کچھ زیادہ آسانی سے آ جائے گا۔''

''آپ کچھ بھی کہیں، ہماری مرضی کے بغیر آپ پتا جی کو کہیں نہیں لے جا سکتے۔''

''آپ ماسٹر جی کے بیٹے ہیں۔ ان کے حوالے سے میں آپ کی عزت کرتا ہوں۔'' اوتار سنگھ نے بدری پرشاد سے کہا۔ ''آپ سے بعد میں بات ہو جائے گی۔'' پھر وہ ڈاکٹر کی طرف مڑا۔ ''ڈاکٹر صاحب کل مجھے سفارشی خط مل جائے گا۔''

''جی ہاں، میرے مطب سے لے لیجئے گا اور ہاں میں کچھ دوائیں لکھ رہا ہوں۔ وہ انہیں دیتے رہیے۔'' ڈاکٹر نے دواؤں کا پرچہ لکھا اور اوتار سنگھ کی طرف بڑھا دیا۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد اوتار سنگھ بدری پرشاد کی طرف مڑا۔ ''اب فرمائیے۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

''میں چاہتا ہوں کہ پتا جی یہیں رہیں اور ان کا علاج بھی ہوتا رہے۔''

بات اوتار سنگھ کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ خود غرض بنیا اب باپ کی بیماری سے منفعت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ پیسہ اوتار سنگھ کے لئے مسئلہ نہیں تھا۔ لیکن وہ ماسٹر جی کی سنگ دل اولاد کو کچھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''آپ نے ڈاکٹر کی بات قبول سے نہیں سنی۔ اس نے اسے ماسٹر جی کے ساتھ آخری بھلائی کہا ہے۔''

''ڈاکٹر تو کہتے ہی رہتے ہیں۔'' بدری پرشاد نے بے پروائی سے کہا۔

اوتار سنگھ نے باپ کی طرف سے بے پروائی اور بے حسی کا طعنہ دینا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کہا۔ ''فیصلہ ماسٹر جی خود کر لیں گے۔''

وہ دونوں پھر کٹھری میں چلے آئے۔ بدری پرشاد نے پھر منہ پر رومال رکھ لیا تھا۔ اوتار سنگھ نے کاتی پرشاد جی سے کہا۔ ''ڈاکٹر کہتا ہے کہ آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ اس کے لئے آپ کو کسی فضا مقام پر جانا ہو گا۔''

کاتی پرشاد جی اسے دیکھتے رہے۔ بولے کچھ نہیں۔

''اب آپ کے سامنے تین راستے ہیں۔'' اوتار سنگھ نے کہا۔ ''شملہ چلے جائیں۔ وہاں ہر طرح سے آپ کا خیال رکھا جائے گا اور میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہر ہفتے آپ سے ملنے آیا کروں گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ میرے گھر چلیں اور مجھے خدمات کا موقع دیں۔ تیسری تجویز میری نہیں، آپ کے بیٹے کی ہے۔ آپ یہیں رہیں۔ میں آپ کا علاج کراؤں گا۔''

''جینا تو بہت دور کی بات ہے۔ میں ان مورکھوں کے پاس مرنا بھی نہیں چاہتا۔'' کاتی پرشاد جی نے بیٹے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''پتا جی، ہمارے ہوتے ہوئے آپ.....''

''رومال تو منہ سے ہٹائے مورکھ۔ میرے اس شاگرد نے اپنے ہاتھ میں تسلا اٹھا کر مجھے تھوکنے کا موقع دیا۔ اپنے رومال سے میرا اگلدان ہوا منہ صاف کیا۔ اسے بیماری لگنے کا ڈر نہیں اور تم لوگوں نے مجھے جانور سے بھی بدتر بنا دیا ہے۔'' کاتی پرشاد جی نے اوتار سنگھ کا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو چھوٹے ٹھاکر۔ میں عزت سے سانس لینا بھی بھول چکا ہوں یہاں۔''

اوتار سنگھ نے بدری پرشاد کو دیکھا۔ ''اب تو اجازت ہے۔''

بدری پرشاد کھسیا کر رہ گیا۔ اوتار سنگھ نے ماسٹر جی کو ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ اس کا دل دکھنے لگا۔ وہ پھول جیسے ہلکے تھے۔ انہیں ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے وہ کٹھری سے نکل آیا اور دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

.....☆.....

کالج کھلنے کے دن تک اوتار سنگھ کو ارجن کی فکر تھی۔ ارجن ہی ہے پورو والے راز سے پردہ اٹھا سکتا تھا۔ کالج کھلے۔ دو تین دن ہو گئے، لیکن ارجن کی صورت نظر نہیں آئی۔ ویسے وہ اس کے دوستوں کے حلقے میں تھا ہی نہیں۔

پھر اس نے ارجن کے متعلق معلوم کیا۔ پتا چلا کہ وہ اب تک آیا ہی نہیں ہے۔

(جاری ہے)

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

کئی دن تک اسے ہر روز یہ دھڑکا رہتا کہ ابھی ارجن اسے نظر آئے گا اور اس پر جھپٹتے ہوئے کہے گا..... کتنے لوگوں کو ختم کرا دیا تم نے!

لیکن ایسا کبھی ہوا نہیں۔

انسانی فطرت ہے کہ کسی بات کا خوف ہو تو اس کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ لیکن وہ ٹلتی رہے تو دھیرے دھیرے خوف مٹ جاتا ہے۔ یہی اوتار سنگھ کے ساتھ ہوا۔ ویسے بھی اس کا معاملہ تھا بھی کچھ عجیب۔ ایسا کھلا معاملہ جس طرح سے پردے میں رہا تھا، اس سے اسے اسی معاملے میں کسی بڑی طاقت کی کارفرمائی کا خیال آتا تھا۔

بہر حال چند ہی روز میں وہ ارجن کو بھول گیا۔ سامنے اور اہم معاملات بھی تھے۔

ماسٹر جی کو وہ شملہ کے سینی ٹوریم میں چھوڑ آیا تھا۔ صرف چھوڑ نہیں آیا تھا، اس نے وہاں دو ر دو روز رک کر اطمینان کیا تھا کہ وہاں ماسٹر جی کی بہت اچھی دیکھ بھال ہوگی۔

کالج میں پڑھائی کی صورت حال اب بھی ویسی ہی تھی۔ جہاں پورا ملک بے یقینی اور انتشار کی کیفیت میں ہو، وہاں زندگی بھی رک جاتی ہے۔ ان کے خالی پیریڈز کی تعداد بڑھ گی تھی۔ ان کے لائبریری میں جانے اور مطالعہ کرنے کا رجحان کم ہو گیا تھا۔ مطالعہ اخبارات تک محدود ہو گیا تھا۔ باہر لان پر اور کامن روم میں دوستوں کی نشستیں ہوتی تھیں۔ ان میں بھی صرف سیاست پر گرما گرم بحث ہوتی تھی۔

''جناح بے اصول آدمی ہیں''۔ ایک دن ایسی ہی ایک نشست میں رام گوپال نے اعلان کیا۔

''تم اور کچھ کہہ بھی نہیں سکتے''۔ محمود نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

''میں نے یہ بات اس وقت کہی تھی، جب مسلم لیگ نے کانگریس کے بغیر عبوری حکومت میں شامل ہونا قبول کیا تھا''۔ رام گوپال نے کہا۔ ''اصل میں مسلم لیگ یہ چاہتی تھی کہ کانگریس عبوری حکومت میں شامل نہ ہو''۔

''یہ تجزیہ احمقانہ ہے۔ دراصل یہ سوچ کانگریس کی ہے۔ کیونکہ اس نے ملک میں دو اکثریتی جماعتوں کے وجود جیسی حقیقت کو تسلیم ہی نہیں کیا ہے۔ مسلم لیگ کانگریس کے وجود سے انکار نہیں کرتی۔ اس کی بنیاد پر دو قومی نظریہ پیش کیا گیا ہے۔ مسلم لیگ ملک کی دوسری بڑی سیاسی جماعت ہے اور مسلمانوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ اسے ملک کے 90 فی صد سے زیادہ مسلمانوں کی حمایت حاصل ہے۔ اب ذرا یہ تو دیکھو کہ کانگریس نے وائسرائے کی تجاویز کو قبول کرنے سے انکار کس بنیاد پر کیا.....؟ اس پر کہ اس میں قوم پرست مسلمانوں کا کوئی نمائندہ شامل نہیں ہے۔ حالانکہ ایسے نام نہاد قوم پرستوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے اور کانگریس کو ان کی فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تو موجود ہے نا''۔

''کانگریس کسی مذہب کو ماننے والوں کی جماعت نہیں''۔ رام گوپال نے بڑے جوش سے کہا۔ ''وہ تو پورے ملک کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس میں مسلمان بھی شامل ہیں۔ کانگریس ایک قومی سطح کی سیاسی جماعت ہے۔ جبکہ مسلم لیگ مذہب کی بنیاد پر قائم ہونے والی غیر مذہبی سیاسی جماعت ہے''۔

''میں تھوڑی دیر کو تمہاری بات مان لوں، تب بھی یہ حقیقت تو نہیں بدلے گی کہ مسلمان مسلم لیگ کے جھنڈے تلے متحد ہیں۔ الیکشن میں مسلم لیگ کے امیدواروں کے سامنے بڑے بڑے لوگوں کی ضمانتیں ضبط ہو گئیں.....''۔

''ایک تو تم لوگ بحث کرتے ہوئے موضوع سے ہٹ جاتے ہو''۔ فتح سنگھ نے اعتراض کیا۔

''میں موضوع سے نہیں ہٹ رہا ہوں۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ کانگریس کا یہ مطالبہ کہ عبوری حکومت میں قوم پرست مسلمانوں کا نمائندہ ہونا ضروری ہے، دراصل اپنی Strangth بڑھانے کے لئے ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ایک کانگریس مسلمان کو مسلم لیگی کی جگہ دی جائے۔ یوں مسلمانوں کا ایک نمائندہ کم ہوگا اور دوسری طرف ان کی طاقت بڑھے گی۔ یہ کانگریس کی بدنیتی کا ثبوت ہے''۔

''اور یہ مسلم لیگ کی بدنیتی ہے کہ کانگریس مکا نکار پر میدان خالی پا کر اس نے اس پر قبضہ کرنے کا فیصلہ کر لیا''۔ رام گوپال بولا۔

''یہ تو سیاسی اور جمہوری عمل جاری رکھنے کی کوشش تھی۔ ورنہ انگریز تو یہاں رکنے کا بہانہ چاہتے ہیں''۔ محمود نے کہا۔

''تو اب مسلم لیگ پیچھے کیوں ہٹ گئی؟'' رام گوپال نے اعتراض کیا۔

''اصول کی بنیاد پر وائسرائے نے اپنے مؤقف سے پیچھے ہٹ کر یہ ثابت کر دیا کہ در پردہ وہ کانگریس سے ملے ہوئے ہیں۔ اس جانب داری کے ساتھ مسلم لیگ عبوری حکومت میں صرف استعمال ہو گئی۔

''اور اس جانب داری کے ساتھ تم ان سے پاکستان مانگ رہے ہو''۔ رام گوپال نے مضحکہ اڑایا۔

''پاکستان تو انہیں دینا پڑے گا۔ پاکستان تو ہم لے کر رہیں گے''۔ ٹھنڈے دل و دماغ سے بات کرنے والا محمود ایک دم جذباتی ہو گیا۔

''تم اصول کی بات کرتے ہو، مسلم لیگ نے عبوری حکومت سے منہ موڑ کر ثابت کر دیا کہ وہ کانگریس کے ساتھ کسی پلیٹ فارم پر بھی بیٹھنا نہیں چاہتی''۔

''اور میں کہتا ہوں کہ کانگریس کا اعتراض وائسرائے اور انگریس کی ملی بھگت تھی..... ڈراما تھا۔ کانگریس صرف یہ چاہتی ہے کہ مسلم لیگ مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے کہیں نمایاں نہ ہونے پائے۔ اس سازش کے ذریعے انہوں نے مسلم لیگ کے لئے عبوری حکومت میں شامل ہونے کا راستہ ہی نہیں چھوڑا''۔

''تو یہ تو تدبر کی کمی ہے''۔ رچرڈ اچانک بول پڑا۔ ''مسلم لیگ کا ردعمل وہی رہا جو کانگریس چاہتی تھی''۔

''مجھے یقین ہے کہ لیگی قیادت بالآخر درست فیصلہ کرے گی''۔ محمود نے کہا۔

''فیصلہ تو کر لیا ہے انہوں نے''۔ رام گوپال نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''16 اگست ڈائریکٹ ایکشن ڈے ہوگا''۔

''میں ایک بات بتاؤں''۔ رچرڈ پارس بولا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ تم لوگ آزادی کے قابل نہیں ہو۔ تم میں اختلاف رائے کو برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ تمہارے اندر تشدد کا رجحان ہے۔ یہ بہت بڑی آبادی کا ملک ہے، جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے رہتے ہیں۔ کلکتہ میں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے، وہ گواہی دیتا ہے کہ آزاد ہونے کے بعد تم ایک دوسرے کے گلے کاٹتے رہو گے۔ کہیں اختلاف رائے کو دبانے کے لئے تو کبھی مذہب کے نام پر۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کا پاکستان کا مطالبہ بالکل جائز اور فطری ہے۔ متحدہ ہندوستان میں تو ان کی نسل ہی مٹا دی جائے گی۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ سو سال تک تو اس خطے میں کوئی الیکشن خوں ریزی کے بغیر نہیں ہوگا''۔

''تم پورے ہندوستان کو توہین کر رہے ہو''۔ رام گوپال نے مشتعل ہو کر کہا۔

''جو دیکھ رہا ہوں، اس کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔ دلیل سے تردید کر سکتے ہو تو کرو''۔ رچرڈ نے چیلنج کیا۔

''تم لوگوں کو سیاست کا ہوکا ہو گیا ہے''۔ امرتا جلبلا کر بولی۔ ''کتنی تکلیف دہ گفتگو کرتے ہو۔ میرے تو سر میں درد ہو گیا''۔

''چلو..... اب چائے پلاؤ''۔ پشپا نے کہا۔

وہ سب کینٹین کی طرف چل دیئے۔

.....☆.....

سرفراز بیگم کو اس بار ایسا سکون آیا تھا کہ کوئی خلش ہی نہیں رہی تھی۔ وہ پوری طرح سے مطمئن ہو گئی تھیں۔ اسی لئے انہوں نے بچیوں سے کوئی بات ہی نہیں کی۔ حالانکہ بچیاں توقع کر رہی تھیں۔

(جاری ہے)

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

وہ کچھ بدل گئی تھیں۔ چھوٹے ظفار کا تمذکرہ کرنا انہوں نے چھوڑ دیا تھا۔ بچیاں ان کی تبدیلی کو گہری نظر سے دیکھ رہی تھیں۔

ایک دن اسی طرح گزر گیا۔ اگلے دن دوپہر کے کھانے کے بعد تینوں بہنیں ساتھ بیٹھی تھیں۔ سرفراز بیگم دوپہر کے کھانے کے بعد آدھے گھنٹے لیٹنے کی عادی تھیں۔ وہ اپنے کمرے میں تھیں۔

خلاف معمول بات نور بانو نے چھیڑی۔ ”پرسوں اماں اوپر سے ہو کر آئی ہیں تو چپ چپ ہیں“۔

”ہاں آپی، انہوں نے کوئی بات ہی نہیں کی“۔

”مجھے لگتا ہے، غبارے سے ہوا نکل گئی ہے“۔ نور بانو نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ نور بانو نے تنک کر پوچھا۔

”میرے بات کی تصدیق ہوگئی ہوگی کس طرح“۔ نور بانو بولی۔ ”ورنہ اماں تو اوپر سے آتے ہی چھوٹے ظفار کا قصیدہ پڑھتی تھیں“۔

”مجھے تو لگتا ہے کہ اماں اس معاملے میں ہم سے خفا ہیں..... تمہاری وجہ سے“۔ حور بانو نے اسے الزام دیا۔

”جی نہیں۔ میرے کہنے سے کچھ فرق پڑتا تو وہ اوپر جانا ہی چھوڑ دیتیں“۔ نور بانو نے تنک کر کہا۔

”دو دن ہو گئے۔ وہ اوپر نہیں گئی ہیں“۔ گلنار بولی۔

”اگر وہ اوپر نہیں جائیں تو سمجھ لو کہ چھوٹے ظفار کی اصلیت کھل گئی ہے۔ میرا کوئی نقصان اس میں نہیں“۔

لیکن اسی شام سرفراز بیگم اوپر چلی گئیں۔

اس بار بھی ان کا رویہ پہلے والا تھا۔ لڑکیاں پھر سر جوڑ کر بیٹھیں ”مجھے نہیں لگتا کہ کوئی بڑی بات ہے“۔ حور بانو نے کہا۔ وہ نور بانو سے مخاطب تھی۔ ”اگر تمہارا انداز ہ درست ہوتا تو اماں اوپر جاتی ہی نہیں“۔

”میں اماں کو سمجھتی ہوں“۔ نور بانو کے لہجے میں فخر تھا۔ ”کوئی بڑی بات ہو جائے تو بھی اوپر جانا نہیں چھوڑیں گی۔ ان کی طبیعت میں رفع داری ہے۔ اسے بیٹا کہا ہے تو عمر بھر نبھائیں گی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اسے نیچے نہیں آنے دیں گی“۔

”تم سے تو بس کوئی افسانہ نگاری کرائے“۔ حور بانو نے جھنا کر کہا۔ ”بے پر کے بھی کو اہا ڈالتی ہو“۔

”میری سمجھ میں بات آرہی ہے“۔ اچانک گلنار نے کہا۔

”لو..... بھائی کی آرزو مند بہن بھی بولی“۔ نور بانو نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

”کیوں..... یہ کیوں نہیں بول سکتی“۔ حور بانو فوراً چھوٹی بہن کی حمایت میں ڈٹ گئی۔ ”ہاں گلنار..... بتاؤ تمہاری سمجھ میں کیا آیا ہے“

”اس بار حوا ماں اوپر گئی تھیں تو چھوٹے ظفار کیلئے کرتا پاجامہ لے کر گئی تھیں“۔

”ہاں مجھے یاد ہے“۔ حور بانو نے کہا۔

”وہ کرتا جو انہوں نے ایک مہینے کی مشقت کے بعد کاڑھا تھا.....“۔ نور بانو نے تیجب سے لہجے میں کہا۔

”جی..... اور بہت خوب صورت کاڑھا تھا“۔ گلنار نے جلدی سے وضاحت کی۔

”تم کچھ کہہ رہی تھیں“۔ حور بانو نے گلنار کو آنکھیں دکھائیں۔

”میرا خیال ہے باجی کہ چھوٹے ظفار کو ان کا وہ تحفہ اچھا نہیں لگا ہوگا.....“۔

”اتنا خوب صورت لباس کسے برا لگے گا“۔ حور بانو نے بے یقینی سے کہا۔

”وہ ہندو ہیں نا..... ہندو کرتا بھی اور طرح کا پہنتے ہیں اور ساتھ میں دھوتی ہوتی ہے“۔

”تو پھر؟“

چھوٹے ظفار کے اس کا اظہار بھی کر دیا ہوگا اماں پر۔ ظاہر ہے، اماں کو یہ بات اچھی نہیں لگی ہوگی“۔

”ہاں..... یہ ممکن ہے“۔ نور بانو نے کہا۔

”تو اب اماں جاتی تو ہیں۔ لیکن ان سے متعلق بات نہیں کرتیں“

صورت حال ایسی تھی کہ اس سے بہتر کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

سرفراز بیگم کا معمول اب بھی وہی تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن وہ چھوٹے ظفار کے ہاں چلے اوپر جاتی تھیں اور اس کے لئے کچھ نہ کچھ لے کر جاتی تھیں۔ لیکن بچیوں سے انہوں نے اس کے متعلق کوئی بات نہیں کی۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ باب مکمل ہو چکا ہے۔

لیکن ایک ماہ بعد یہ بات بھی غلط ثابت ہوگئی کہ فساد کرتے اور پاجامے کی وجہ سے تھا۔

اس روز اماں نے بہار دلی کو بلوایا۔ ”بہار دلی، دو دھان لائے ہیں کپڑے کے“۔ انہوں نے دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہو کر کہا۔ ”ایک تھان دھاکا کی بہترین ململ کا اور ایک بہت اچھے لٹھے کا“۔

”لے آتا ہوں بیگم صاحبہ“۔

اماں نے دھیمے سے بوا کو پیسے دیئے جو انہوں نے بہار دلی کو دے دیئے۔

تینوں لڑکیوں کا تجسس سے برا حال تھا۔ ”آپ بھی کمال کرتی ہیں اماں۔ گرمیاں رخصت ہو رہی ہیں اور آپ ململ کا تھان منگوا رہی ہیں“۔ حور بانو نے کہا۔

”اور پرسوں تھان کا کریں گی کیا؟“ حور بانو نے اعتراض کیا۔

”کرتے ہی بناؤں گی۔ ململ کا اور صرف کیا ہے!“ سرفراز بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اتنے کرتے!! وہ وہ بھی چاندی گرمیوں میں“۔ حور بانو نے کہا۔

”کڑھائی میں مہینے سے کم نہیں لگتا۔ اگلی گرمیاں آنے تک کرتے تیار ہو جائیں گے“۔

”اب اتنا وقت بھی نہیں لگتا اماں“۔

”مجھے تو لگتا ہے۔ بلکہ زیادہ ہی لگتا ہے۔ گھر کے اتنے کام ہوتے ہیں۔ تم کو تو ہاتھ بٹاتی نہیں ہو“۔ سرفراز بیگم کے لہجے میں ملامت تھی۔ ”میں روپیٹ کر ایک کرتا کاڑھ لوں مہینے میں تو یہ کوئی بڑی بات ہے۔ پھر اب اٹکا بھی تو پہلے جیسی نہیں رہی“۔

”اچھا اماں..... ایک کرتا مجھے بھی دیجئے گا۔ میں بھی کاڑھوں گی“۔ حور بانو بولی۔

”یہ تو آپ نے بتایا نہیں کہ اس تھان میں سے کرتے کس کس کے نکلیں گے؟“

”صرف چھوٹے ظفار کے اور کس کے بھی نہیں“۔ سرفراز بیگم کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔

ان تینوں کے منہ کھل گئے حیرت سے۔ ”اتنے کرتے..... چھوٹے ظفار کے لئے؟“ حور بانو نے بے ساختہ کہا۔ ”اور ایک کرتا نور بانو بھی کاڑھے گی“۔

نور بانو جھینپی، کھسیانی، ایک لمحے کو ہچکچائی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ انکار کر دے گی۔ لیکن پھر شاید اسے اپنی آن کا خیال آ گیا۔ ”لو..... اس میں ایسی کون سی بات ہے۔ کرتا کاڑھنے میں کیا برائی ہے۔ وہ تو میں ضرور کاڑھوں گی“۔

”ایک پر میں بھی کڑھائی کروں گی“۔ حور بانو نے کہا۔

”چلو کر لینا“۔ سرفراز بیگم نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”لیکن سچ یہ ہے کہ میں اس کام میں کسی کا ساجھا نہیں چاہتی“۔

لڑکیوں نے ماں کو حیرت سے دیکھا۔ وہ سخت محبت کرتی ہیں چھوٹے ظفار سے۔ ”تو انہیں وہ کپڑے پسند آئے؟“ حور بانو نے پوچھا۔

”اتنے پسند آئے کہ اس نے اسی وقت پہن لئے۔ اور کہنے لگا..... ایسے اور کپڑے سی کر دیں گی مجھے؟“

”اور آپ نے ایک درجن جوڑے دینے کا ارادہ کر لیا“۔ نور بانو بولی۔

”تم نے دیکھا نہیں اسے اس لباس میں“۔ سرفراز بیگم نے کہا۔ ”سچ پوچھو تو محفل شہزادہ لگ رہا تھا وہ۔ اتنا خوب صورت کہ جی چاہے، دیکھتے ہی رہو“۔

یہ سن کر تینوں لڑکیوں کے دل میں کرتا پاجامہ پہنے ہوئے چھوٹے ظفار کو دیکھنے کی خواہش مچلنے لگی!

☆.....☆

”دیکھ لیا۔ میں نے کہا تھا نا کہ یہ وائسرائے اور کانگریس کی ملی بھگت ہے“ محمود جوشیلے انداز میں کہہ رہا تھا۔ اس کا لہجہ فاتحانہ نہیں تھا۔ ”اسے کہتے ہیں ویژن“۔

”اسے سیاست کہتے ہیں بچے“۔ رام گوپال نے حقارت سے کہا۔ ”اب ماں لوگ مسلمان سیاست میں طفل مکتب ہیں۔ انہیں بہت کچھ سیکھنا ہے ہم سے۔ اسی لئے تو ہم کہتے ہیں کہ تم الگ ملک لے بھی لو تو چلا نہیں سکو گے۔ آخر ہم سے ہی ملنا پڑے گا“۔

”اگر سیاست جھوٹ، مکاری اور منافقت کا نام ہے تو ایسی سیاست کو سات سلام“۔ محمود نے تمدنے میں کہا۔ ”پاکستان نام اس لئے تجویز کیا گیا ہے کہ وہ سرزمین انشاءاللہ ہر گندگی سے پاک ہوگی۔ اور اگر کانگریس کی گندی سیاست کا جہاں تعلق ہے تو اس کا تو زبردست مسلم لیگ کرے گی“۔

”اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ کانگریس ان پر مسلم لیگ آؤٹ“۔ رام گوپال نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ ”گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن کو نسل کے نمائندے ہم زد کے جا چکے۔ وائسرائے نے اعلان کر دیا“

”دیکھ لینا۔ ہم یہ سازش بھی ناکام بنا دیں گے۔“

یہ گفتگو کالج کی کینٹین میں ہو رہی تھی۔ پڑھائی کسی حد تک شروع ہو گئی تھی۔ لیکن سیاسی ماحول کے درجہ حرارت نے اب بھی اساتذہ اور طلبا کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ پڑھائی کا ماحول تھا ہی نہیں۔

ستمبر کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ سیاسی صورت حال ہر پل رنگ بدل رہی تھی۔ وائسرائے نے 16 مئی پلان سے پہلوتہی اختیار کی تو مسلم لیگ نے اس کی جانب داری محسوس کرتے ہوئے 27 جولائی کو پلان کی اپنی منظوری واپس لے لی۔ 8 اگست کو کانگریس نے اپنے موقف سے یوٹرن لیتے ہوئے 16 مئی پلان قبول کر لیا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ مسلم لیگ کو سیاسی منظر سے ہٹانے کی خواہاں ہے اور اس میں وائسرائے اس کا ساتھ دے رہا ہے۔ سیاسی صورت حال اس وقت اور گمبھیر ہو گئی، جب محمد علی جناح کو گورنر جنرل کرنے کی افواہیں گردش کرنے لگیں۔ رد عمل میں محمد علی جناح نے اعلان کیا کہ وہ وہ جنگ لڑنے کا تہیہ کر چکے ہیں۔

24 اگست کو وائسرائے نے اعلان کیا کہ تاج برطانیہ نے گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کے اراکین کے انتخاب منظور کرتے ہوئے نہرو، پٹیل، راجندر پرشاد، آصف علی، راج گوپال چاریہ، سرت چندر بوس، جون متھائی، سردار بلدیو سنگھ، شفاعت احمد خان، جگ جیون رام، سید علی ظہیر اور ای ایچ بھابھا کو ان کی جگہ ایگزیکٹو کونسل کے لئے نامزد کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ لارڈ ویول نے پانچ غیر مسلم لیگی اراکین کی نشستوں کی تقرری کا اختیار بھی کانگریس کو دے دیا۔ اسی شام وائسرائے نے ریڈیو پر عبوری حکومت کی تشکیل کا اعلان کر دیا۔ اس کے جواب میں محمد علی جناح نے تقسیم ہند اور قیام پاکستان کا مسلم لیگ کا مطالبہ شدومد سے دہرایا۔ تاہم 2 ستمبر کو مسلم لیگ کی نمائندگی کے بغیر عبوری حکومت قائم ہوگئی۔

اداتار سطح دستوں کے سیاسی تبصرے بھی غور سے سنتا تھا اور خود بھی سوچتا تھا۔ اس کا تجزیہ تھا کہ اگر یہ دونوں نے کانگریس کے ساتھ مل کر یہ بھرپور چال چلی ہے اس کے دو مقصد ہیں۔ ایک تو مسلمانوں کو مایوس کرنا، دوسرے مسلم لیگ پر ان کے اعتماد میں شگاف ڈالنا۔ یہ فطری امکان اپنی جگہ تھا کہ فرقہ وارانہ فسادات کے نتیجے میں مسلمانوں کی جانوں کے زیاں کے پیش نظر مسلمان بددل ہو کر کسی بھی مسلم لیگ کی حمایت سے ہاتھ اٹھالیں اور پاکستان کے مطالبے سے دست بردار ہو جائیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ آزمائش مسلم لیگ کی قیادت کی نہیں، عام مسلمانوں کی ہے۔ اگر اس وقت وہ ڈگمگا گئے تو مسلم لیگ کی قیادت کا تدبر، حوصلہ اور عزم بھی کچھ نہیں کر سکے گا۔ مسلمان عوام کی آزمائش اعتبار سے بھی سخت تھی کہ ہندو انہیں طعنے دیں گے کہ کتنی آسانی سے مسلم لیگ کو اقتدار سے باہر کر دیا گیا ہے اور یہ کہ یہ سب بڑی ناکامی ہے۔

اب مسلمان اس آزمائش پر پورے اترتے ہیں یا نہیں، اس کا فیصلہ تو آنے والے وقت کو ہی کرنا تھا۔

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

اوتار سنگھ تو پہلی بار سیاست اور اقتدار کے کھیل کو عملی شکل میں اتنے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ خود کو غیر جانب دار رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن اس غیر جانب داری کے نتیجے میں اس کی ہمدردیاں مسلمانوں کے ساتھ تھیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کے ذریعے انہیں پاکستان بنانے سے روکنے کی کوشش کی جارہی تھی، یہ سمجھے بغیر کہ اس طرح تو مسلمانوں کو عدم تحفظ میں مبتلا کیا جارہا ہے۔ یہ باور کرایا جارہا ہے کہ ان کی بقا کی واحد صورت قیام پاکستان ہے۔ کسی کو یہ خیال نہیں آیا کہ مسلمانوں کو صرف محبت اور امن سے قائل کیا جاسکتا ہے۔ اوتار سنگھ کے نزدیک قیام پاکستان اب ناگزیر ہو چکا تھا۔

''تم کہاں کھوئے ہوئے ہو؟'' ریٹا پارسن نے اسے چونکا دیا۔

''کہیں نہیں۔ میں تو یہیں ہوں۔''

''کل سیٹرڈے ہے۔ ہمارے گھر پارٹی ہے۔ آؤ گے؟'' ریٹا کے لہجے میں لگاوٹ تھی۔

''سوری، میں تو نہیں آسکتا۔''

''کیوں؟ ایسی کیا معروفیت ہے؟''

''میں شہر سے باہر ہوں گا۔''

''پچھلے ہفتے بھی تم شہر سے باہر تھے؟''

''ہاں۔ ویک اینڈ پر میں شملہ جاتا ہوں۔''

''تفریح کے لئے؟''

''نہیں۔ وہاں سینی ٹوریم میں میرے استاد داخل ہیں۔ ویک اینڈ میں ان کے ساتھ گزارتا ہوں۔''

''تو آئندہ ہمیں پارٹی کے لئے کوئی اور دن رکھنا پڑے گا؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

ریٹا بجھ سی گئی۔ ''اس ہفتے مس کردو نا..... میری خاطر۔''

''سوری، ماسٹر جی سے ملنے میرے سوا کوئی نہیں آتا۔ وہ پورے ہفتے میری آمد کا دن گنتے ہیں۔''

''چلو، ٹھیک ہے۔ آئندہ میں پارٹی ارینج کرتے وقت اس کا خیال رکھوں گی۔''

.....☆.....

اوتار سنگھ ڈاکٹر چارلس کے سامنے بیٹھا تھا۔ ''مجھے آپ کا شکریہ ادا کرنا ہے ڈاکٹر۔'' اس نے کہا۔ ''ماسٹر جی کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ صرف دو ماہ میں اتنا فرق پڑ گیا ہے۔''

''کیا واقعی؟'' ڈاکٹر نے بھویں اچکاتے ہوئے اسے دیکھا۔

''جی ہاں۔ جب میں انہیں یہاں لایا تھا تو چلنا درکنار، ان میں بولنے کی طاقت بھی نہیں تھی۔ اب وہ دس منٹ کی چہل قدمی کرتے ہیں۔ اپنی وہیل چیئر پر ادھر سے ادھر گھومتے ہیں۔ اور ان کے چہرے پر زندگی کی چمک نظر آتی ہے۔''

''یہ صرف غذا کی وجہ سے ہے۔ غذا آدمی کے ظاہر پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جب وہ یہاں آئے تھے تو انہیں دیکھ کر لگتا تھا کہ ہفتوں سے انہوں نے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا ہے۔ بیماری سے جسم کمزور ہو جاتا ہے۔ لیکن غذا نہ ملنے سے تو بالکل تباہ ہو جاتا ہے۔ اب یہاں انہیں ہر وہ چیز مل رہی ہے، جس کی انہیں ضرورت ہے۔ دودھ، پھل، ہر چیز۔ اس لئے وہ دیکھنے میں بہتر ہو گئے ہیں۔''

''آپ کا مطلب ہے، ان کی صحت بہتر نہیں ہوئی ہے؟'' اوتار سنگھ کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ایگزیکٹلی۔ دیکھو مسٹر اوتار سنگھ، میں تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''تم جب انہیں یہاں لائے تو ان کی بیماری بہت بڑھ چکی تھی۔ ان کے دونوں پھیپھڑے تقریباً ناکارہ ہو چکے ہیں۔ وہ بیماری کے اس اسٹیج پر ہیں، جہاں علاج ممکن نہیں رہتا۔ لیکن ہم ڈاکٹر لوگ ناممکن سے بھی لڑتے رہتے ہیں۔ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ہم کسی کی زندگی بڑھا نہیں سکتے۔ ہاں زندگی کی کوالٹی بہتر کر سکتے ہیں۔ ان کی تکلیف کم کر سکتے ہیں۔ وہ ہم کر رہے ہیں۔'' اوتار سنگھ مایوس نظر آرہا تھا۔ ''لیکن مجھے تو اب وہ صحت مند لگتے ہیں۔''

''دیکھو مسٹر اوتار سنگھ، یہ جو ٹی بی ہے نا، یہ بہت دھوکے باز اور پرفریب مرض ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی اندر سے ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ لیکن بظاہر بہت صحت مند دکھائی دیتا ہے۔ ابھی تین دن پہلے مسٹر پرشاد پرشدید اٹیک ہوا تھا۔ مجھے امید نہیں رہی تھی۔ لیکن وہ اچانک اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ قوت ارادی کے دم سے ہے۔ اور سنو، وہ تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ تمہاری خاطر جینا چاہتے ہیں۔''

''تھینک یو ڈاکٹر فار ایوری تھنگ۔ آپ ان کے گھر ہفتہ وار رپورٹ تو بھیج رہے ہیں نا؟''

''ہاں۔ یہ تو ہمارا فرض ہے۔''

''وہاں سے کوئی ان سے ملنے نہیں آیا۔''

''نہیں۔ شاید آئے گا بھی نہیں۔ یہاں جہالت بہت ہے۔ اپنے ڈر کی وجہ سے لوگ مریض کے جلد از جلد مرنے کا سامان کر دیتے ہیں۔'' ڈاکٹر کے لہجے میں شکایت تھی۔

''بہر حال آپ انہیں باخبر رکھئے گا۔''

''میں نے کہا نا۔ یہ میرا فرض ہے۔''

اوتار سنگھ ڈاکٹر کا شکریہ ادا کر کے باہر نکل آیا۔

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

''وہ تو گھر میں نہیں ہیں بڑی بیگم۔ ہفتے کو وہ شملہ چلے جاتے ہیں۔ اتوار کو واپس آتے ہیں۔''

سرفراز بیگم کو حیرت ہوئی کہ وہ بے خبر ہیں۔ اب اسے اتفاق ہی کہا جاسکتا ہے کہ ہفتے یا اتوار کو وہ کبھی اس سے ملنے نہیں آئیں۔'' کیوں..... حیرت تو ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''وہ ماسٹر جی وہاں اسپتال میں داخل ہیں۔ چھوٹے ٹھاکر وہاں جا کر ایک دن ان کے ساتھ گزارتے ہیں۔''

''کون ماسٹر جی؟'

''ماسٹر جی کو نہیں جانتیں آپ۔ وہ ہمارے ساتھ ہی تو یہاں آئے تھے۔''

اچانک سرفراز بیگم کو ماسٹر جی یاد آ گئے۔''اچھا وہ..... کیا ہوا انہیں؟ تمہارے گاؤں والا واقعہ ہوا تو وہ یہیں تھے۔''

''جی بڑی بیگم۔ ان کی طبیعت خراب ہوگئی تھی۔ انہی کی وجہ سے تو ہم بھی گاؤں نہیں جا سکے تھے۔''

''تو طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تھی ان کی؟''

''پتا نہیں۔ یہاں تو کچھ ٹھیک ہوگئے تھے۔ ہم سے کہنے لگے کہ گھر جاؤں گا۔ بچوں سے ملنا ہے۔ چلے گئے۔ پھر چھوٹے ٹھاکر واپس آئے تو اپنے دکھ میں ان کو بھولے رہے۔ یاد آیا تو ہم سے پوچھا۔ ہم نے بتایا کہ وہ تو اپنے گھر چلے گئے۔ جب سے واپس نہیں آئے۔''

''پھر وہ تم پر ناراض ہوا ہوگا؟''

''ناراض کہاں ہوتے ہیں چھوٹے ٹھاکر۔ خود پر افسوس کرتے رہے۔ دیر تک دکھ کرتے رہے کہ اتنے دن وہ ماسٹر جی کو بھولے کیسے رہے۔''

''وہ ناراض نہیں ہوتا کبھی؟'' سرفراز بیگم نے حیرت سے پوچھا۔''میں نے تو سنا ہے کہ یہ زمین دار لوگ غصہ کے بہت تیز ہوتے ہیں۔''

''ہوتے تو ہیں بڑی بیگم۔ پر ہمارے چھوٹے ٹھاکر کو کبھی کسی نے غصہ کرتے نہیں دیکھا۔''

''چلو خیر..... پھر کیا ہوا؟''

''پھر چھوٹے ٹھاکر نے ہم سے پوچھا کہ ماسٹر جی اپنا پتا دے کر گئے ہیں۔ ہم نے کہا نہیں۔''

''پھر ماسٹر جی ملے کیسے؟''

''چھوٹے ٹھاکر اسکول کھلنے کا انتظار کرتے رہے۔ اسکول کھلے تو وہاں سے ماسٹر جی کا پتا لیا اور ان سے ملنے چلے گئے۔ واپس آئے تو ماسٹر جی ان کے ساتھ تھے۔ اور ماسٹر جی کا اتنا برا حال تھا کہ ڈھانچہ بن کر رہ گئے تھے۔''

''ہوا کیا تھا انہیں؟''

''وہ ہوتی ہے نا تپ دق..... وہ بیماری ہوگئی تھی انہیں۔''

سرفراز بیگم کا ہاتھ بے اختیار اپنے منہ پر جا پہنچا۔''ہائے میرے اللہ..... ٹی بی!''

''ہاں بڑی بیگم۔ اور ماسٹر جی نے بتایا کہ ان کے بچوں نے انہیں کوٹھری میں ڈال دیا تھا کباڑی کی طرح۔ کوئی اس کوٹھری میں نہیں جاتا تھا۔ ایک نوکرانی اپنے منہ پر کپڑا ڈال کر دور سے ان کے پاس کھانا رکھ جاتی تھی اور بعد میں برتن لے جاتی تھی.....''

''ٹی بی کے مریض کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ لگنے والی بیماری ہے نا۔''

''پر ہمارے چھوٹے ٹھاکر تو رات بھر ماسٹر جی کے پاس بیٹھے روتے رہے۔ کہتے تھے ماسٹر جی کا یہ حال یہ میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں کیسے باپ جیسے استاد کو بھول کر بیٹھ گیا۔ ماسٹر جی میں تو بولنے کی طاقت بھی نہیں تھی۔ بے چارے بار بار چھوٹے ٹھاکر کے سر پر ہاتھ رکھتے، کچھ بولنے کی کوشش کرتے اور پھر رونے لگتے۔ اس رات چھوٹے ٹھاکر ایک پل نہیں سوئے۔ اگلے روز کالج بھی نہیں گئے۔''

''ہئے ہئے..... یہ بیماری ایسی ہی ظالم ہے، اپنوں کو بھی دور کر دیتی ہے بیمار سے۔'' سرفراز بیگم نے تاسف سے کہا۔''بچوں کا بھی کیا قصور۔ اللہ ہر ایک کو محفوظ رکھے اس بیماری سے۔''

''پر ہمارے چھوٹے ٹھاکر تو ماسٹر جی کا ہر کام اپنے ہاتھ سے کرتے رہے۔ اپنے ہاتھ سے انہیں کھانا کھلاتے۔ ان کے برتن خود دھوتے۔ حد یہ کہ ان کا اگال دان بھی اپنے ہاتھوں سے دھویا چھوٹے ٹھاکر نے۔'' یہ کہتے کہتے رنجنا رونے لگی۔''میرا من کرتا تھا بڑی بیگم کہ میں مر جاؤں۔'' وہ سسکیوں کے درمیان بولی۔''میں نے اور رگھو نے چھوٹے ٹھاکر کے پاؤں پکڑ لئے..... سر رکھ دیا ان کے پیروں میں کہ ماسٹر جی کی سیوا ہم کریں گے۔ پر چھوٹے ٹھاکر نے ڈانٹ دیا ہمیں۔ بولے ماسٹر جی کی سیوا میرا دھرم ہے، تمہارا نہیں۔ انہوں نے مجھے پڑھایا ہے، علم دیا ہے۔ وہ میرے لئے پتا سمان ہیں۔ ان کی خدمت میرا فرض ہے۔''

سرفراز بیگم سناٹے کے عالم میں ان کی باتیں سن رہی تھیں۔ چند لمحے خاموش رہی۔ پھر انہوں نے پوچھا۔''ماسٹر جی یہاں کتنے دن رکے؟''

''دو دن بڑی بیگم۔ پھر چھوٹے ٹھاکر انہیں شملہ لے گئے..... بڑے اسپتال۔''

''اور اب وہ ہر ہفتے ان سے ملنے شملہ جاتا ہے؟''

''جی بڑی بیگم۔''

سرفراز بیگم کا دل بھر آیا۔ اس وقت وہ ان کے سامنے ہوتا تو شاید وہ اسے سینے سے لگا لیتیں۔ انہوں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔''تمہارا چھوٹا ٹھاکر بڑا آدمی ہے رنجنا۔ اللہ نے اسے بہت بڑائی دی ہے۔''

''ہمیں پتا ہے بڑی بیگم۔'' رنجنا پھر رونے لگی۔''بھگوان ہمیں سدا ان کے چرنوں میں رکھے۔ ایسا ہوا تو سمجھیں، جیون سپھل ہوگیا اپنا۔''

دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ وہ دونوں ہی اوتار سنگھ کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔

.....☆.....

دسمبر کا مہینہ آ گیا۔ سردیاں شروع ہوگئیں۔ مگر ہندوستان اپنے سیاسی ماحول کے اعتبار سے جون کے مہینے میں جی رہا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی خلیج بڑھتی جا رہی تھی۔ عقل والوں کی سمجھ میں آ رہا تھا کہ بلوؤں کی وجہ سے قیام پاکستان ناگزیر ہوتا جا رہا ہے۔

2 ستمبر کو مسلم لیگ کے نمائندوں کے بغیر عبوری حکومت قائم ہوگئی۔ مسلم لیگ کے قائدین نے صورت حال کا جائزہ لیا۔ انہیں احساس ہوگیا کہ اگر مسلمانوں نے کانگریس کیلئے کھلا میدان چھوڑ دیا تو یہ ان کے لئے تباہ کن ہوگا۔ ابھی تک تو عام مسلمانوں میں بددلی نہیں پیدا ہوئی تھی۔ بلکہ ان کا جوش وخروش اور بڑھ گیا لیکن بددلی اور اس کے بعد مایوسی پھیلنے میں دیر نہیں لگتی۔

چنانچہ طویل اور مسلسل مذاکرات کے بعد مسلم لیگ بالآخر 25 اکتوبر کو کانگریس کی بالادستی قبول کئے بغیر عبوری حکومت میں شامل ہوگئی۔ اس کونسل کا نائب صدر نہرو کو مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن اس تقرری کا مقصد صرف اور صرف گورنر جنرل کی غیر موجودگی کی صورت میں کونسل کے اجلاس۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

اس تقرری کا مقصد صرف اور صرف گورنر جنرل کی غیر موجودگی کی صورت میں کونسل کے اجلاس کی صدارت کرنا تھا۔ اس کے پاس کوئی خصوصی اختیار نہیں تھا۔ لیکن وہ ایسے اختیارات کا خواہاں تھا، جو پارلیمانی جمہوریت میں وزیراعظم کو حاصل ہوتے ہیں۔ مگر مسلم لیگ کو اس سے اتفاق نہیں تھا۔ لیگ دیکھ رہی تھی کہ پٹیل جو ہم پر حاوی گورنمنٹ پر دو پیٹنڈ اسٹیبلشمنٹ کو اپنی پارٹی کے مفاد کے سلسلے میں بے دریغ استعمال کر رہا تھا۔ اس موقع حال میں یہ اتحاد نتاؤ سے بھرپور شراکت کے مترادف تھا اور اسے ایک طرح کی مسلح جانب داری کہا جا سکتا تھا۔

کالج کا ماحول بھی بے حد کشیدہ تھا۔ محمود اور رام گوپال کے درمیان نفرت اتنی بڑھ گئی کہ اب وہ ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے روادار بھی نہیں تھے۔ رام گوپال نے دوستوں کو بھی چھوڑ دیا تھا۔ سنا گیا تھا کہ وہ ان ہندوؤں انتہا پسند ہندوؤں کے درمیان رہنے لگا ہے۔

ماسٹری کو شدید میں رہتے چار مہینے ہو گئے تھے۔ ان کی ظاہری حالت تو بہتر تھی۔ لیکن ڈاکٹر ان کے بارے میں پر امید نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مرض بہت آگے بڑھ چکا ہے۔ اور اس مرض میں ظاہری بہتری قابل اعتبار نہیں ہوتی۔

ماسٹری اس بات کو بہت محسوس کرتے تھے کہ ان سے ملنے کے لئے ادتا رنگھ کے سوا کوئی نہیں آتا۔ یہ بات نہیں کہ انہیں اپنے بیٹوں سے کوئی اس طرح کی امید ہو۔ لیکن اس کے باوجود ان کا جی چاہتا تھا کہ ان کا کوئی بیٹا کبھی ان سے ملنے کے لئے آئے۔

ادتا رنگھ کو اس کی گلرگ گئی تھی۔ وہ ماسٹری کی بے آرزو پروری کرتا رہا تھا۔ اسے کوئی امید تو نہیں تھی۔ لیکن اس نے ماسٹری کی خاطر کوشش کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اس شام اس نے بازار سے پھل اور مٹھائیاں خریدیں۔ بچوں کے لئے کھلونے خریدے اور ماسٹری کے گھر کی طرف چل دیا۔

اس کی دستک پر دروازہ بدری پرشاد نے کھولا۔ اسے دیکھ کر وہ بڑے تپاک سے مسکرایا اور جھک کر نمسکار کیا۔

ادتا رنگھ کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اس پر تپاک خیر مقدم کا تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔ ان کا تو خیال تھا کہ ان کا دریہ اس کے ساتھ معاندانہ ہوگا۔ اس نے بھی نمسکار کیا۔ ''کیسے ہیں بدری بھیا؟'' اس نے اپنائیت سے کہا۔

''آیئے نا دروازے پر کیوں کھڑے ہیں''۔

ادتا رنگھ اس کے ساتھ اندر چلا گیا۔ بدری پرشاد نے اسے کمرے میں بٹھایا۔ ''آپ بیٹھیں۔ میں ابھی آیا''۔ اس نے کہا۔ ''اس وقت میرے دونوں بھائی بھی موجود ہیں۔ ان سے بھی آپ کی ملاقات ہو جائے گی''۔

''بچوں کو بھی بلا لیجئے گا''۔

تھوڑی ہی دیر میں بدری پرشاد اپنے چھوٹے بھائیوں کے ساتھ آیا۔ ''یہ میرے بڑے بھائی ہیں رام پرشاد اور یہ سب سے چھوٹا ہے ہری''۔

ان دونوں نے بھی ادتا رنگھ کو بڑے تپاک سے نمسکار کیا۔ ''چاچی آپ کی بہت باتیں کرتے تھے''۔ ہری پرشاد نے کہا۔ ''بہت تعریف کرتے تھے آپ کی''۔

''آپ سب سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ بچے کہاں ہیں؟''۔

اسی لمحے دھوتی پہنے تین بچوں کے ساتھ کمرے میں آئیں۔ ان میں ایک عورت اور سب سے بڑے لڑکے سے دو چھوٹی بالو بچا تھا۔

''یہ میری بھابھی ہیں رادھا..... یہ میری چچی سادھنا''۔ بدری پرشاد نے تعارف کرایا تھا۔ ''یہ بھیا کا بیٹا گنگا ہے، یہ بھیا کا بیٹا اور یہ میرا بیٹا مرلی''۔

ادتا رنگھ نے دونوں عورتوں کو نمسکار کیا۔ ''آپ کیسی ہیں بھابھی''۔ پھر پھل اور مٹھائی بڑی بھابھی کی طرف بڑھائی۔ ''ماسٹری نے مجھ سے تاکید کر کے کہا تھا اور پیسے دیئے تھے کہ آپ لوگوں کے لئے ان کی طرف سے مٹھائی اور پھل لے جاؤں''۔

رادھا نے دونوں چیزیں لیں اور ساد ھنا کے ساتھ کمرے سے چلی گئی۔

ادتا رنگھ نے بچوں کو بلایا اور انہیں کھلونے دیئے۔ ''یہ تمہارے دادا جی نے بھجوائے ہیں''۔

''دادا جی؟''۔ سب سے چھوٹے لڑکے نے چلاتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارے دادا ہسپتال میں ہیں۔ تم سب کو بہت یاد کرتے ہیں''۔ ادتا رنگھ نے کہا۔

''ماتا جی مجھے دادا کے پاس جانے ہی نہیں دیتیں''۔

''اچھا..... اب تم لوگ جاؤ''۔ رام پرشاد نے پہلی بار زبان کھولی تھی۔

بچوں کے جانے کے بعد رام پرشاد ادتا رنگھ سے مخاطب ہوا۔ ''آپ نے بہت تکلف کیا ادتا رنگھ جی''۔

''کیا مطلب؟''۔

''مطلب یہ کہ چاچی یہ سب کچھ نہیں بھیج سکتیں۔ ان کے پاس پیسے ہے ہی نہیں''۔

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ ماسٹری کے پاس پیسے نہیں تھے۔ مگر اب ہیں۔ اور یہ سب کچھ انہوں نے ہی بھیجا ہے۔ میری طرف ان کی دو مہینے کی فیس تھی۔ وہ میں نے ادا کی اور اب ہر ماہ انہیں فیس دیتا ہوں''۔

رام پرشاد اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ ''کیئے فارم کے اخراجات کم تو نہیں ہوں گے''۔

''وہ تو میری ذمے داری ہے۔ فرض ہے میرا۔ اور یقین کریں، مجھے ماسٹری کا نام لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں خود بھی ایسا کرتا جب سے میرا۔ ماسٹری کا پیار میرے پر بیار ہے۔ وہ میرے پر احسان ہیں تو آپ میرے بھائی ہوئے نا''۔

''چلیں..... ٹھیک ہے۔ یہ بتائیں، چاچی کیسے ہیں؟''۔

''یہ تو آپ کو بھی معلوم ہوگا۔ میں نے آپ کا ایڈریس لکھوا دیا تھا۔ کیئے فارم والے رپورٹ بھیجتے ہوں گے''۔

رام پرشاد جیسے ان نظر آنے لگا۔ ہری نے جلدی سے کہا ''ہاں بڑے بھیا، ہر ہفتے رپورٹ آتی ہے ڈاک سے''۔

''مجھے نہیں بتایا تم نے؟''۔

''میں نے سوچا، آپ خوامخواہ پریشان ہوں گے''۔

''کیوں..... کوئی بہتری نہیں ہوئی''۔

''مرض بہت بڑھ چکا ہے بڑے بھیا''۔

''دو رپورٹ تو اندر کی بات ہے''۔ ادتا رنگھ نے مداخلت کی۔ ''آپ انہیں دیکھیں گے تو خوش ہوں گے۔ دیکھنے میں وہ صحت مند لگتے ہیں۔ چلتے پھرتے ہیں، چہل قدمی کرتے ہیں۔ اور وہ آپ کو بہت یاد کرتے ہیں''۔

''آپ ان سے ملتے جاتے ہیں؟''۔

''ہر ہفتے۔ ویک اینڈ میں ان کے ساتھ ہی گزارتا ہوں''۔ ادتا رنگھ نے کہا۔ ''کبھی آپ بھی چلیں نا''۔

''کون..... میں.....؟''۔ رام پرشاد نے حیرت سے کہا۔ جیسے یہ تصور ہی اس کے لئے قابل قبول نہ ہو۔ ''میں تو نہیں جا سکتا۔ میری تو ڈیوٹی ہی ایسی ہے۔ اور پھر مجھے پھل نہیں سکتی۔ آج کل حالات ایسے ہیں.....''۔

ادتا رنگھ نے بدری کی طرف دیکھا۔ ''بھیا وقت اچھے برے کا نہیں دیکھتے۔ ہر ہفتے ہی جاتے ہیں''۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ''گھر اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا''۔

''آپ میں سے کوئی ایک بار بھی چلے تو ماسٹری کو بہت فائدہ ہوگا۔ میں کچھ بھی کر لوں، حقیقی بیٹے کا بدل نہیں ہو سکتا''۔

وہ شرمندہ نظر آنے لگے۔ ''ہاں..... ہری جا سکتا ہے''۔ بدری نے کہا۔

''میں کیسے جا سکتا ہوں''۔ ہری ایک دم پریشان ہو گیا۔

''بیٹے کو اسکول سے چھٹی کرا لو۔ اتوار کو تو چھٹی ہوتی ہی ہے''۔

''اور میری ٹیوشنز.....''۔

''اس سے بھی ایک دن تو چھٹی کر سکتے ہو''۔

ہری کے چہرے پر چند لمحے کشمکش نظر آئی۔ پھر جیسے باپ کی محبت ہر رکاوٹ پر حاوی آ گئی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں چلوں گا''۔ اس نے کہا۔ ''آپ اب کب جائیں گے؟''۔ اس نے ادتا رنگھ سے پوچھا

''اب کرسمس کی چھٹیاں ہو رہی ہیں نا۔ اس بار پورا ہفتہ گزاروں گا ماسٹری کے ساتھ''۔

ہری گھبرا گیا۔ ''اسکول کی تو چھٹیاں ہوں گی۔ لیکن ٹیوشنز کی اتنی چھٹیاں میں نہیں کر سکتا۔ پھر امتحان سر پر آ جائے گا''۔ اس نے کہا۔ پھر چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔ ''میں امتحان کے بعد آپ کے ساتھ چلوں گا..... مارچ یا اپریل میں''۔

ادتا رنگھ کا دل بہت دکھا۔ سب سے اچھا بیٹا موت کی دہلیز پر بیٹھے باپ سے ملاقات کیلئے چار ماہ بعد کا وعدہ کر رہا تھا۔ دوسرے تو اس کے لئے تیاری نہیں تھے۔ کاش ماسٹر صاحب، اس وقت تک زندہ رہیں۔ یہ خوشی تو مل جائے انہیں۔ اس کے دل نے دعا مانگی۔

بہر حال ان لوگوں کی کچھلی بے حسی کے سامنے یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔

ادتا رنگھ نے چلتے وقت چند نوٹ رام پرشاد کی طرف بڑھائے۔ ''یہ ماسٹری نے آپ لوگوں کے لئے بھجوائے ہیں''۔

دوسرے دو لڑکوں کے چہرے ستے گئے تھے!

.....x.....

سردی بہت شدید تھی، موسم بدل گیا تھا۔ مگر زندگی کے معمولات نہیں بدلے تھے۔ سب کچھ پہلے جیسا تھا۔ گھر کے لوگوں کو اس بات کا تو احساس تھا کہ سیاسی موسم بدل گیا ہے۔ گھر و باہر کی بات تھی۔ گھر میں اتنی سنگینی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ گھر میں اخبار ہر روز آتا تھا۔ خوں ریزی کی خبریں، مسلمانوں کا قتل روز کی بات تھی اس سے گھر کے مکین خوف زدہ تھے لیکن وہ مطمئن بھی تھے کہ اپنے گھر کی چار دیواری میں وہ محفوظ ہیں۔

حور بانو اور نور بانو ابھی تک ایک کرکے ڈاکٹر کی مکمل نہیں کر سکی تھیں جبکہ سرفراز جم تیسرے کرتے کی ڈاکٹر ی کر رہی تھیں بار یک کام کیلئے ان کی نگاہ پہلے بھی تیز رہی تھی لیکن مشق بہر حال بڑی چیز ہوتی ہے۔ لڑکیوں نے ڈاکٹر ی سیکھی تو تھی۔ مگر ابھی تو آزمودہ تھیں۔ بلکہ باقاعدہ ڈاکٹر ی کرنے کا تو وہ ان کیلئے پہلا موقع تھا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ خوب صورتی کے شوق میں انہوں نے بہت باریک نیفس اور مشکل ڈیزائن منتخب کیا تھا۔ ہر روز وہ چھوڑا سا کام کرتیں اور ماں کو دکھاتیں۔ بعض اوقات انہیں کام دوبارہ کرنا پڑتا۔ سرفراز جم کا معمول اب بھی وہی تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن وہ اوپر جاتیں اور خالی ہاتھ بھی نہ ہوتیں۔ اوپر وہ کم از کم دو تین گھنٹے گزارتیں۔ لیکن چھوٹے ڈاکٹر کے بارے میں ان لوگوں سے بات وہ اب بھی نہیں کرتی تھیں۔

لڑکیوں کو بہت تجسس تھا۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ اماں نے چھوٹے ڈاکٹر کے متعلق بات کرنا کیوں چھوڑ دیا۔ جبکہ وہ اس سے خفا بھی نہیں ہیں۔ بلکہ اس کے لئے ان کی محبت اور بڑھ گئی ہے۔

اس روز نور بانو نے ڈکرائی والا گاجر انہیں دکھایا۔ وہ جائزہ لینے کے بعد بولیں۔ ''یہ بڑا دوبارہ بنا دیا نا۔ صفائی نہیں آئی ہے اس میں''۔

''اور وہ ہر روز دس بیس مسلمانوں کو مار رہے ہیں۔ اور یہاں ہم ان کے لئے کرتا کاڑھ رہے ہیں..... نفاست اور صفائی سے''۔ نور بانو نے تنک کر کہا۔

سرفراز جم نے چونک کر اسے غور سے دیکھا۔ اس کا یہ ردعمل غیر معمولی تھا۔ وہ تو بڑے دھیمے، محتاط مزاج کی لڑکی تھی۔ وہ بات ہی کم کرتی تھی اور سخت بات تو اس کے مزاج میں تھی ہی نہیں۔ چھوٹے ڈاکٹر کے معاملے میں البتہ وہ ترش رو ہو گئی تھی۔

سرفراز جم گھر کا فضہ بالکل نہیں آیا۔ انہوں نے بڑی بے رخی سے سر دلیجے میں کہا۔ لاؤ بیٹا..... یہ مجھے دے دو۔ میں تو یہ کام تم سے کسی سے کروانا ہی نہیں چاہتی تھی تم لوگ خود ہی سمجھدار تھیں اس میں''۔

(جاری ہے)

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

''جو سچی بات آپ کے لئے نہیں، وہ بھی آپ کو کڑوی لگتی ہے اماں؟''۔

''یہ بات سچی ہے نہ کڑوی۔ یہ تو جہالت کی بات ہے''۔ سرفراز بیگم نے نرم لہجے میں کہا۔ ''اول تو جو مسلمان کو قتل کر رہے ہیں وہی اس کے ذمے دار ہیں نہ کہ تمام ہندو۔ اللہ کے ہاں ہر آدمی اپنے عمل کا جواب دہ ہوگا۔ اور ہندو تو ایسے بھی ہیں کہ جو مسلمانوں کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور دوسرے..... خیر جانے دو''۔

''بات پوری کریں نا اماں''۔

حور بانو اور گلنار بھی لپک کر آ گئیں۔ ''ہاں اماں، بتائیں نا۔ آپ نے تو ٹھاکر بھیا کے بارے میں بات کرنا ہی چھوڑ دیا''۔ گلنار بولی۔

کیوں؟ یہ بھی کبھی سوچا تم نے''۔

''بہت سوچا ہے اماں۔ سمجھ میں نہیں آتا''۔ حور بانو نے کہا۔

''میں نے دیکھا کہ جتنی میں اس کی تعریف کرتی ہوں، تم لوگ اتنا ہی اس سے چڑتی ہو۔ حالانکہ خدا گواہ ہے، میں اس کی تعریف نہیں کرتی، حقیقت بیان کرتی ہوں، اس لئے میں نے اس کا نام لینا ہی چھوڑ دیا''۔

''صرف نور بانو چڑتی ہے اماں۔ میں اور گلنار تو نہیں چڑتیں''۔ حور بانو نے کہا۔

سرفراز بیگم نے سنی ان سنی کر دی۔ ''میں جانتی ہوں کہ چھوٹا ٹھاکر کیسا ہے۔ اب تم لوگ میرے سمجھانے، منع کرنے کے باوجود اس کے متعلق بدگمانی کرو تو گناہ گار تو ہوگی نا۔ اور لطف یہ کہ اسے کار ثواب بھی سمجھو۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ تمہارا نقصان کیسے گوارا کر سکتی ہوں۔ اس لئے میں نے اس کا تذکرہ کرنا ہی چھوڑ دیا۔ کم از کم بدگمانی سے تو بچی رہو گی تم''۔

''اچھا اماں۔ آج آپ ہمیں بتائیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ بدگمانی نہیں کروں گی''۔ نور بانو نے کہا۔

''تو سن لو۔ سب سے پہلے تو میں نے یہ سمجھ لیا کہ چھوٹا ٹھاکر جھوٹ نہیں بولتا۔ یہ اس کا کمال نہیں۔ اللہ کی رحمت ہے اس پر۔ وہ بچپن سے ہی ہر بات پر غور کرنے والا تھا۔ ماں کے کہنے پر پوجا پاٹھ کرتا تھا۔ لیکن سوال بہت کرتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ جو بت اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتا، وہ کسی اور کو کیا دے گا۔ ماں کی موت کے بعد اس نے پوجا بالکل چھوڑ دی۔ اس کا یقین ہے کہ کائنات کا نظام چلانے والی ہستی واحد ہے۔ وہ کہتا ہے، جہاں کئی حکمراں ہوں، وہاں فساد ہوتا ہے۔ نظام نہیں چلتا۔ وہ بڑے خلوص سے، محبت سے جستجو کر رہا ہے۔ میں پوری سچائی کے ساتھ کہتی ہوں کہ اسے مشرک یا کافر کہنا اس کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہے۔

''اور سنو۔ بے شک مجھ سے پہلی بار جذبات میں بڑی غلطی ہوئی۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ گھر اس کا ہے۔ ہم سب اس کے گھر کے فرد ہیں اور ہمارے ہاں کوئی اس سے پردہ نہیں کرے گا۔ نور بانو نے احساس دلایا تو مجھے اپنی غلطی محسوس ہوئی۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میں ڈرتی رہی کہ وہ آئے گا اور میں گناہ گار ہوں گی۔ اب اسے منع بھی نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن وہ نہیں آیا۔ میں ہی اوپر جاتی رہی۔ اور میں نے اس سے نیچے آنے کو کہا بھی نہیں۔

''پھر جب وہ امتحان میں پاس ہوا اور اس نے مٹھائی نیچے بھجوائی، تب میں نے بے اختیار دوبارہ غلطی کی۔ میں نے اس سے شکایت کی کہ اسے مٹھائی لے کر خود آنا چاہئے تھا۔ تب اس نے کہا کہ وہ کبھی بھی نیچے نہیں آئے گا۔

وہ وجہ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ مگر میں نے اصرار کیا تو اس نے وجہ بتائی۔ اس کے بعد میری نظروں میں اس کا مقام اور بلند ہو گیا۔ اس کے بعد میں نے تم لوگوں سے اس کے بارے میں بات کرنی چھوڑ دی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تم لوگ اس کے متعلق بدگمانی کرو اور گناہ گار بنو۔ اب وہ وجہ بھی سن لو جس کے تحت وہ کبھی نیچے نہیں آئے گا''۔

انہوں نے سب کچھ بچیوں کو سنا دیا۔ پھر انہوں نے ماسٹر جی کی بیماری اور اس کے عمل کے بارے میں بتایا۔ بچیاں منہ کھولے سنتی رہیں۔ نور بانو کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ وہ خاص طور پر بہت زیادہ حیران تھی۔

''تو یہ ہے چھوٹا ٹھاکر..... اصل چھوٹا ٹھاکر''۔ سرفراز بیگم نے آخر میں کہا۔ ''میں تمہاری بھلائی اور بہتری کے لئے نہیں چاہتی کہ تم اس کے متعلق بدگمانی کرو۔ میں خود اس کے لئے دعا کرتی ہوں کہ اللہ اس کی کوشش قبول فرمائے، اسے اپنا راستہ دکھائے اور بھٹکنے سے بچائے رکھے۔ اور مجھے یقین ہے کہ انشا اللہ ایسا ہی ہوگا''۔

''میں بہت شرمندہ ہوں اماں''۔ نور بانو نے کہا۔ ''اور میں اللہ سے سچے دل سے توبہ کروں گی''۔

''اور اب کبھی یہ فکر نہ کرنا کہ وہ نیچے آ جائے گا۔ کیونکہ وہ کبھی نیچے نہیں آئے گا''۔

(جاری ہے)

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

یہ کہتے ہوئے سرفراز بیگم کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کی یہ بات درست نہیں۔ چھوٹا ٹھاکر ایک دن نیچے آئے گا۔

.....x.....

کرسمس اور نیو ایئر کی چھٹیوں سے پہلے وہ کالج کا آخری دن تھا۔ اوتار سنگھ لائبریری میں چلا گیا۔ وہ کچھ کتابیں ایشو کرانا چاہتا تھا۔ اس کا پروگرام یہ تھا کہ وہ یہ چھٹیاں ماسٹر جی کے ساتھ گزارے گا۔ ماسٹر جی بھی خوش ہو جائیں گے۔

اس نے تین کتابیں منتخب کیں۔ کتابیں رجسٹر پر چڑھوانے کے لئے وہ لائبریرین کی طرف جا رہا تھا کہ ریٹا پارسن آ گئی۔ ''مجھے معلوم تھا کہ تم یہیں ملو گے''۔ اس نے سنسنی آمیز لہجے میں کہا۔

''بات کیا ہے؟''۔

''سکون سے بیٹھو تو بات کروں''۔

وہ وہیں بیٹھ گئے۔ ''ہاں.....اب بولو''۔

''بات یہ ہے کہ تم میرے ہاں کی کئی پارٹیاں مس کر چکے ہو''۔

''میں نے تمہیں وجہ بھی بتائی تھی اور معذرت بھی کی تھی''۔ اوتار سنگھ بولا۔

''اور میں نے قبول بھی کر لی تھی''۔ ریٹا نے شوخ لہجے میں کہا۔ ''لیکن اب معذرت نہیں چلے گی''۔

''کیا مطلب؟''۔

''مطلب یہ کہ تم اپنے ماسٹر جی سے ملنے پرو یک اینڈ پر جاتے ہو؟''۔

''ہاں۔ میں نے یہی بتایا تھا تمہیں''۔

''ہمارے ہاں کرسمس پارٹی میں آنا ہے تمہیں۔ اور میں انکار نہیں سنوں گی''۔

اوتار سنگھ مسکرا دیا۔ ''اب میں تمہیں ایک عجیب بات بتاؤں۔ میں نے یہ کتابیں ایشو کرانے کے لئے نکالی ہیں۔ میں یہ ارادہ کر چکا تھا کہ یہ تمام چھٹیاں میں ماسٹر جی کے ساتھ گزاروں گا۔ وہاں ان کتابوں پر ڈسکشن بھی کر لوں گا ماسٹر جی سے''۔

ریٹا کا چہرہ تو بجھ گیا۔ پھر وہ بولی۔ ''میں کچھ نہیں جانتی۔ تمہیں اس پارٹی میں ضرور آنا ہے''۔

''میں نے انکار تو نہیں کیا۔ میں تو تمہیں بتا رہا تھا کہ میرا یہ ارادہ تھا۔ اب یہ ہے کہ میں ماسٹر جی کے پاس 26 تاریخ کو چلا جاؤں گا''۔

ریٹا کھل اٹھی۔ ''یہ ہوئی نا بات۔ تو تم آؤ گے نا؟''۔

''ہاں.....ضرور آؤں گا''۔

''تو تم سات بجے آجانا''۔

''شام سات بجے!''۔اوتار سنگھ کے لہجے میں حیرت تھی۔''پارٹیاں تو رات کو دیر سے شروع ہوتی ہیں''۔

''پارٹی تو دس بجے ہی ہوگی۔مگر میں چاہتی ہوں کہ تم سات بجے آجاؤ۔مجھے تم کو کچھ دکھانا ہے''۔

''لیکن میں.....''۔اوتار سنگھ ہچکچا رہا تھا۔

''اتنی پارٹیاں مس کی ہیں تم نے۔میری اتنی سی بات نہیں مانو گے''۔ریٹا کے لہجے میں لجاجت تھی۔

''چلو،ٹھیک ہے۔میں آجاؤں گا''۔اوتار سنگھ نے کہا۔

وہ یوں خوش ہوئی،جیسے کوئی بہت بڑی نعمت مل گئی ہو۔''وعدہ؟''۔

''میں کچھ کہتا ہوں تو کرنے کا ارادہ بھی کرتا ہوں۔اگر کوئی غیر معمولی رکاوٹ آجائے تو الگ بات ہے۔ورنہ میں وقت پر پہنچ جاؤں گا''۔

''تھینک یو اوتار سنگھ''۔وہ پلٹی۔''میں تمہیں منتظر ملوں گی''۔

وہ چلی گئی اور اوتار سنگھ اٹھ کر لائبریرین کی طرف چل دیا.....

.....x.....

انگریزوں کے لئے وہ بڑا اداس کرسمس تھا۔انہوں نے بھانپ لیا تھا کہ ہندوستان میں ان کے اقتدار کے دن گنے جا چکے ہیں۔اور وہ اپنے وطن سے دور یہاں تھے تو صرف اقتدار کے لالچ میں ہی تھے۔اب اقتدار جا رہا تھا تو ان میں بیشتر ایسے تھے جو اس وقت سے پہلے ہی ہندوستان چھوڑ دینا چاہتے تھے۔

کرسمس کے دن پارسن فیملی کے درمیان موضوع گفتگو یہی تھا۔''شاید ہمیں ایک اور کرسمس یہاں منانا پڑے''۔جیمز ہارسن کہہ رہا تھا

''مگر اب مجھ سے برداشت نہیں ہوگا''۔الزبتھ بولی۔''اب تو یہاں میرا دم گھٹتا ہے''۔

''ابھی چند روز پہلے میری کچھ اہم لوگوں سے بات ہو رہی تھی''۔جیمز نے کہا۔''وہ سب متفق تھے کہ اب انڈیا انگریزوں کیلئے محفوظ نہیں رہا ہے۔ہندو جس طرح مسلمانوں پر حملے کر رہے ہیں،کسی بھی وقت ان کا رخ انگریزوں کی طرف بدل سکتا ہے''۔

''میں تو اس پر حیران ہوں کہ ہم نے اب تک یہاں حکومت کیسے کر لی۔یہ اتنا بڑا ملک ہے۔کروڑوں کی آبادی ہے۔ہماری تعداد تو کچھ بھی نہیں''۔

''برطانیہ عظمیٰ نے ہر جگہ غداروں کے زور پر حکومت کی ہے۔بے شک یہاں آبادی بہت زیادہ ہے۔لیکن غداروں کی کثرت بھی دوسری نو آبادیوں کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ورنہ کسی اجنبی ملک میں،اجنبی ماحول،اجنبی موسم میں،جہاں کی زبان اور رسم و رواج بھی مختلف ہوں،چند لاکھ افراد چالیس کروڑ لوگوں پر حکومت نہیں کر سکتے''۔

''مگر اب یہ لوگ سیاسی طور پر بیدار ہو چکے ہیں''۔

''اس کے باوجود بنیادی طور پر یہ لوگ درندے ہیں''۔جیمز نے کہا۔

''سچ کہتے ہو،مجھے تو اب ڈر لگنے لگا ہے یہاں''۔الزبتھ نے جھرجھری لے کر کہا۔

''ایک چیز نے ہمیں بچایا ہوا ہے اور وہی ہمیں بچائے گی''۔جیمز بولا۔''اور وہ ہے ہمارے مقابلے میں ان کا احساس کم تری۔میں دعوے سے کہتا ہوں کہ یہ لوگ قومی سطح پر سو سال تک تو اس احساس کم تری سے نہیں نکل سکیں گے،جس میں ہم نے انہیں مبتلا کر دیا ہے۔سو سال تک یہ ہماری برابری نہیں کر سکیں گے''۔

''لیکن جیمز،مجھے لگتا ہے کہ انتقال اقتدار کے موقعے پر یہاں خوں ریزی ہو سکتی ہے''۔

''میں نہیں سمجھتا کہ ایسا ہوگا۔دیکھو،وہ ہم سے آزادی چھین نہیں رہے ہیں،مانگ رہے ہیں اور وہ بھی دب کر انگریزوں کے خلاف کوئی گڑبڑ کرنے سے پہلے وہ دس بار سوچیں گے۔وہ یہ بھی سمجھیں گے کہ آزادی ملنے سے پہلے ہی چھن بھی سکتی ہے۔انگریزوں کی ہلاکت کے سلسلے میں برطانیہ ان پر فوج کشی بھی کر سکتا ہے''۔

''لیکن جیمز،mob کی نفسیات میں سوچنے کا کوئی دخل نہیں ہوتا''۔الزبتھ نے کہا۔''یہی وجہ ہے کہ بہت لوگ اپنی فیملیز کو واپس بھیج رہے ہیں۔ابھی واکر فیملی انگلستان

واپس گئی ہے''۔

''سنو الزبتھ، تم اور بچے چاہو تو انگلستان واپس جا سکتے ہو، جہاں تک میرا تعلق ہے تو فی الحال یہ ممکن نہیں''۔

الزبتھ نے سوالیہ نظروں سے ریٹا کو دیکھا۔ ریٹا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں ماما، میں تو واپس نہیں جانا چاہتی''۔

''حیرت ہے، تمہیں وطن کا خیال نہیں آتا''۔

جیمز ہنسنے لگا۔ ''ہمارے بچے تو یہاں پیدا ہوئے ہیں۔ کبھی گرمیوں کی چھٹیوں میں دو تین بار انگلستان چلے گئے۔ انہیں تو یہی اپنا وطن لگتا ہوگا''۔

''لیکن جیمز، کلچر کا فرق تو بہت بڑا ہے''۔

''ماما، مجھے تو یہاں کا کلچر بہت اچھا لگتا ہے..... سوکلرفل، سوامیزنگ۔ مجھے یہاں کا موسم بھی اچھا لگتا ہے۔ موسم گرما کو ہٹا دیں تو لندن میں بارشوں اور کہر کے سوا کیا رہ جاتا ہے۔ یہاں موسم سرما میں بھی دھوپ میسر ہوتی ہے''۔

''اور مجھے اس کے باوجود دنیا میں لندن سے پیاری کوئی اور جگہ نہیں لگتی''۔ الزبتھ نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ پھر وہ رچرڈ کی طرف مڑی۔ ''اور تم کیا کہتے ہو ڈک؟''۔

''میں اپنی تعلیم نامکمل نہیں چھوڑنا چاہتا ماما''۔

''مگر بھئی میں تو واپس جانا چاہتی ہوں''۔

''چلو، اس پر بعد میں بات کریں گے''۔ جیمز نے کہا۔ ''فی الحال تو ہمیں وائسرائے کی پارٹی میں جانا ہے۔ تیاری کرو۔ چھ بجے تک پہنچنا ہے''۔

''ڈیڈی، میں تو آپ لوگوں کے ساتھ نہیں چل سکوں گی''۔ ریٹا نے معذرت کی۔

''تم یہ پارٹی مس کرو گی؟''۔ الزبتھ کے لہجے میں حیرت تھی۔ ''جانتی ہو، وہاں کیسے کیسے لوگ ہوں گے..... کریم آف ایسٹ انڈیا کمپنی!''۔

''سوری ماما۔ میں نے کچھ دوستوں کو گھر پر مدعو کیا ہے''۔

''ان میں کوئی بہت خاص دوست بھی ہوگا؟''۔ رچرڈ نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں شرارت تھی۔

ریٹا کے رخسار دہک اٹھے۔ ''وہ جتنے بھی ہیں، سبھی بہت خاص دوست ہیں''۔ اس نے سچائی سے کہا۔

''آل رائٹ۔ کم آن لزبتھ۔ تم تیار ہو جاؤ..... اور ڈک تم بھی''۔ جیمز نے کہا۔

وہ لوگ تیار ہوئے اور ساڑھے پانچ بجے پارٹی کے لئے نکل گئے۔ ''تمام نوکر سرونٹ کوارٹرز میں موجود ہیں''۔ جیمز ہارسن نے جاتے جاتے ریٹا سے کہا۔

''تم انہیں طلب کر سکتی ہو۔ کک کو بلا کر سمجھا دو کہ تمہاری پارٹی کے لئے اسے کیا کرنا ہے''۔

''او کے ڈیڈی''۔

ان کے جانے کے بعد وہ اپنے خاص مہمان کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف ہوگئی۔ سب سے پہلے اس نے کک کو بلایا۔ ''دو افراد کے لئے ڈنر تیار کرنا ہے۔ رات گیارہ بجے تک''۔

''دو افراد کے لئے!''۔ کک کی آنکھوں میں حیرت چمکی۔ لیکن اس کے لہجے میں صرف تعمیل تھی۔ ''یس میم ساب۔ ہو جائے گا''۔

ریٹا نے اسے مینو بتایا۔ کک چلا گیا۔

اب ریٹا کو مشروب کی فکر تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اوتار سنگھ شراب نہیں پیتا۔ چنانچہ اس نے اس کے لئے ایک خاص قسم کا شربت تیار کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے کئی مختلف ذائقوں کے ایسنس منگوائے تھے۔ عرق گلاب اس کے علاوہ تھا۔ عرق گلاب کے بارے میں اس نے کک سے معلومات حاصل کی تھیں۔

اس نے بڑے اہتمام سے اوتار سنگھ کے لئے وہ کاک ٹیل تیار کی اور اسے ایک بڑے جگ میں بھر کے ٹھنڈا ہونے کے لئے رکھ دیا۔

اب آخری مرحلے میں اسے خود تیار ہونا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اوتار سنگھ وقت کا پابند ہے۔ ٹھیک سات بجے آجائے گا۔

اس موقعے کے لئے اس نے خاص طور پر سفید رنگ کا بہت خوب صورت ڈریس سلوایا تھا۔ ٹائٹ فٹنگ کا وہ ڈریس کچھ کچھ چھپانے اور بہت کچھ دکھانے والا تھا۔ اس ڈریس کو دیکھ کر ماما نے اسے چھیڑنے والے انداز میں کہا تھا۔ ''ارے ڈارلنگ، ایسا ڈریس تو میں نے تمہاری شادی پر سلوانے کا ارادہ کیا تھا''۔

اور وہ شرما گئی تھی۔

اس پر ماما نے کہا تھا۔ ''یہ تو یہاں کی لڑکیوں کی طرح شرماتی ہے''۔

اس وقت وہ ڈریس پہن کر ریٹا نے آئینے میں خود کو دیکھا۔ اسے احساس تھا کہ وہ بہت حسین لگ رہی ہے۔

اس نے بہت ہلکا میک اپ کیا۔ لیکن اس روز اسے خوشبو کا ہوکا ہوگا تھا۔ خوشبو اس نے لگائی تھی اور پورا کمرا مہک رہا تھا۔

اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ سات بجنے میں دس منٹ باقی تھے۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ کوئی طویل انتظامیہ نہیں تھا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

اوتار سنگھ تھری پیس سوٹ میں تھا۔اس نے بازار سے کچھ تحفے بھی خریدے تھے۔ تحفے صرف ریٹا اور رچرڈ کے لئے تھے۔کیسی عجیب بات تھی کہ اپنے دوستوں کے والدین کو اس نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔اسے خیال آیا کہ آج شاید ان سے ملاقات ہو۔لیکن بہرحال پہلی ملاقات میں، انہیں دیکھے، سمجھے اور جانے بغیر ان کے لئے کوئی تحفہ لے کر جانا اس کے خیال میں ممکن نہیں تھا۔

ریٹا پورچ پر اس کی منتظر تھی۔ وہ فر کا لمبا کوٹ پہنے تھی۔ سردی بہت زیادہ تھی۔اس کے رخسار تمتما رہے تھے اور وہ بہت حسین لگ رہی تھی اس نے بانہیں پھیلا کر اس کا خیر مقدم کیا۔

اوتار سنگھ کو اس طرح کے استقبال کی امید نہیں تھی۔ وہ گڑبڑا گیا۔ایک لمحے کو بے اختیار وہ اس کی بانہوں میں چلا گیا۔ پھر اس نے سنبھلتے ہوئے بڑی نرمی اور احتیاط سے اسے پیچھے ہٹا دیا اور اسے بہت غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔''میری کرسمس ریٹا''۔

''یوسلی.....تمہیں میرے رخسار پر بوسا دینا چاہئے تھا''۔ریٹا نے بناوٹی خفگی سے کہا۔

اوتار سنگھ مسکرایا۔''تم جانتی ہو کہ ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا۔البتہ آج کرسمس ہے۔اس خوشی میں تمہیں کچھ رعایت مل سکتی ہے''۔یہ کہہ کر اس نے ریٹا کا ہاتھ تھاما، اسے اٹھایا اور اس کے ہاتھ کی پشت کو چوم لیا.....صرف ایک شائبئے کے لئے!

ریٹا کو یوں لگا جیسے کوئی تتلی اس کے ہاتھ کو چھو کر اڑ گئی ہو۔

وہ دونوں اندر ڈرائنگ روم میں چلے آئے۔ وہاں آتش دان دہک رہا تھا۔ کمرا گرم ہو رہا تھا۔

اوتار سنگھ کو گھر پر چھایا ہوا سناٹا بہت غیر فطری لگا۔گھر میں لوگ موجود ہوں۔لیکن خاموشی ہو تو بھی گھر کی اپنی آوازیں ہوتی ہیں۔ وہ لفظ نہیں ہوتے۔مگر وہ آوازیں گھر میں لوگوں کی موجودگی اور رونق کا اظہار کرتی ہیں۔مگر یہاں تو گہرا سناٹا تھا۔بس کبھی کبھی آتش دان میں کوئلوں کے چٹخنے کی آواز سناٹے کو تار تار کر دیتی تھی۔

''ارے.....کوٹ اتارنے میں میری مدد کرو نا''۔

ریٹا نے اسے چونکا دیا۔اس نے بڑی نزاکت سے فر کا وہ کوٹ اتروایا۔لیکن اگلے ہی لمحے وہ سناٹے میں آ گیا۔ ریٹا اس سفید لباس میں آسمان سے اتری ہوئی کوئی اپسرا لگ رہی تھی۔مگر وہ لباس ایسا تھا کہ نظر اٹھانا ناممکن ہو گیا تھا۔اوتار سنگھ کی نظریں جھک گئیں۔

اوتار سنگھ کا ردعمل بے حد واضح تھا۔ریٹا نے دانستہ یہ ظاہر کیا، جیسے وہ اس سے بے خبر ہو۔ بے حد سرسری انداز میں اس نے اوتار سنگھ کا کوٹ اتروانے میں اس کی مدد کی۔اس دوران غیر محسوس طور پر وہ اس کے اتنا قریب ہو گئی کہ ان کی سانسیں ایک دوسرے کو چھونے لگیں۔

اوتار سنگھ نے جلدی سے کوٹ سے جان چھڑائی اور گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔

ریٹا کا جی چاہا کہ اس کے سامنے کھڑی ہو کر کہے..... مجھے غور سے دیکھو اوتار سنگھ۔کیسی لگ رہی ہوں میں۔لیکن نسوانی جبلت نے اسے خبردار کر دیا کہ اس طرح وہ ریلیکس نہیں ہو سکے گا۔لوہے کو اس طرح گرم کرنا ہے کہ خود لوہے کو بھی پتا نہ چلے۔ وقت کی تو اس کے پاس کمی نہیں تھی۔

''بیٹھ جاؤ نا اوتار سنگھ''۔

اوتار سنگھ تھری سیٹر صوفے پر سمٹ کر بیٹھ گیا۔

اس وقت ریٹا ایک ایسی عورت تھی، جو اپنے بے حد مشکل محبوب کو ہر قیمت پر تسخیر کرنا چاہتی تھی۔اور اس نے یہ نکتہ سمجھ لیا تھا کہ جلد بازی میں کھیل بگڑ جائے گا۔ بے صبرا پن اسے اس کی منزل سے دور کر دے گا۔کامیابی کیلئے ضروری ہے کہ وہ صبر و تحمل سے کام لے

وہ اوتار سنگھ کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ اس وقت یہ تاثر دے رہی تھی کہ وہ خود سے.....اپنی حشر سامانیوں سے یکسر بے خبر ہے۔یوں وہ اپنے جلووں کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کر سکتی تھی۔

اوتار سنگھ کو نظریں اٹھانے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

ان دونوں کے درمیان میز حائل تھی۔میز پر اوتار سنگھ کے لائے ہوئے تحفے رکھے تھے۔''میں اپنا تحفہ کھول کر دیکھ سکتی ہوں؟''۔ریٹا نے کہا۔

اوتار سنگھ نے اپنی اعصابی کشیدگی کو اپنی حس مزاح سے کم کرنے کی کوشش کی۔''کیوں نہیں، میں تحفے لایا ہوں، خالی پیکنگ نہیں''۔اس نے کہا۔

ریٹا کے لئے دو تحفے تھے۔ریٹا نے پہلے چھوٹا پیکٹ کھولا۔اس میں سے عطر کی ایک بے حد خوب صورت شیشی نکلی.....بلور کی بڑے خوب صورت ڈیزائن کی خاصی بڑی شیشی۔

''خوب صورت''۔ریٹا کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔''مگر میں اسے کیسے اسپرے کروں؟''۔

''یہ عطر ہے، پرفیوم نہیں۔اسے اسپرے نہیں کرتے۔اس کا ڈھکنا کھولو اور دو تین جگہ ہلکا سا لگا لو''۔

ریٹا نے شیشی کھولی اور اسے سونگھا۔''یہ کچھ مختلف ہے۔مگر خوشبو بہت اچھی ہے''۔

''یہ مشرقی خوشبو ہے۔تیل میں بنائی جاتی ہے، الکحل میں نہیں''۔

ریٹا نے دوسرا پیکٹ کھولا۔وہ بے حد نازک، خوب صورت اور نفیس نیکلس تھا۔''یہ بھی بہت خوب صورت ہے۔شکریہ اوتار سنگھ۔تمہارے ذوق کی داد دینی پڑے گی''۔

''داد عملی ہونی چاہئے''۔اوتار سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔''پہن کر دادو گی تو اچھا لگے گا''۔

ریٹا کہنا چاہتی تھی کہ اپنے ہاتھوں سے پہناؤ گے تو پہنوں گی۔لیکن وہ ایک سوچی سمجھی حکمت عملی کے تحت چل رہی تھی۔اس نے ہنستے ہوئے قدرے بے نیازی سے کہا۔

''مناسب وقت پر پہنوں گی''۔

اب اوتار سنگھ کو پھر گھر کا سناٹا چبھنے لگا تھا۔اس نے رچرڈ کے تحفے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔''رچرڈ کہاں ہے؟''۔

''گھر میں تو کوئی بھی نہیں ہے''۔ریٹا نے بے پروائی سے کہا۔

اوتار سنگھ ایک دم چوکنا ہو گیا۔''تم تو کہہ رہی تھیں کہ تمہارے گھر پر پارٹی ہے''۔

''وہ تو ہے۔تمہیں اسی لئے تو بلایا ہے''۔ریٹا بلی اور چوہے کا کھیل کھیل رہی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کی توقع کے عین مطابق اوتار سنگھ اعصابی تناؤ میں مبتلا ہو گیا۔اب اس کا اگلا جواب اس تناؤ کو دور کرے گا تو وہ کافی دیر تک پرسکون رہے گا..... بلکہ شاید آخر تک پرسکون ہی رہے۔

''تو پھر؟ گھر میں کوئی موجود نہیں ہے!''۔

''دراصل عین وقت پر وائسرائے کی پارٹی کی دعوت مل گئی۔ میں نے تمہیں سات بجے بلایا تھا۔اس لئے میں اس پارٹی میں نہیں گئی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تم یہاں اکیلے میرا انتظار کرو اور بور ہو''۔

اس کی توقع کے عین مطابق اوتار سنگھ نہ صرف ریلیکس ہو گیا۔ بلکہ وہ اس کیلئے زیادہ نرم ہو گیا۔''یہ تو زیادتی ہوتی تمہارے ساتھ''

اس نے کہا''وائسرے کی پارٹی تو بہت اہم تھی''۔

''تمہارے اپائنمنٹ سے زیادہ اہم نہیں تھی''۔ریٹا نے اسے لگاوٹ بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اوتار سنگھ کی ممنونیت بہت واضح تھی۔''تم مجھے پروگرام کی تبدیلی کی اطلاع دے دیتیں تو میں بھی گیارہ بجے آ جاتا''۔

''میں نے کہا نا، میرے لئے تمہاری ملاقات دنیا کی ہر چیز سے زیادہ اہم تھی''۔

چند لمحے خاموش رہی۔پھر ریٹا نے کہا۔''سردی بہت زیادہ ہے۔تمہارے لئے ڈرنکس بناؤں؟''۔

''تم جانتی ہو میں شراب نہیں پیتا''۔اوتار سنگھ نے جلدی سے کہا۔

''تم عجیب آدمی ہو.....سحر انگیز.....مشرق کے شہزادے''۔ ریٹا نے خواب ناک لہجے میں کہا''میں نے تمہارے لئے خاص شربت تیار کرایا ہے۔اس میں مشک کا عرق اور دوسری گرم جڑی بوٹیاں ہیں''

اس نے شربت کے جگ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔اور ایک گلاس میں انڈیل کر اوتار سنگھ کی طرف بڑھایا۔

اوتار سنگھ نے مشروب لے لیا۔ریٹا نے اپنے لئے برانڈی کا جام بنا لیا تھا''اتنا اہتمام کرنے کی کیا ضرورت تھی''۔

''ضرورت تو تھی۔دیکھو نا، اب ہم دونوں انجوائے کریں گے''۔

اوتار سنگھ نے شربت کا گھونٹ لیا۔شربت خوش ذائقہ اور فرحت بخش تھا۔مگر اس میں ہلکی سی تلخی تھی جو بری بہرحال نہیں لگ رہی تھی۔اور ایک بات یہ کہ وہ ہلکا نہیں، کافی بھاری تھا۔اس نے یہ بات ریٹا سے بھی کہی۔

''کڑواہٹ مشک اور جڑی بوٹیوں کی وجہ سے ہے''۔

اوتار سنگھ نے مزید چند گھونٹ لئے۔اسے مشروب کی خوشبو بہت اچھی لگی تھی۔سچ یہ ہے کہ اس نے ایسا شربت اس نے کبھی نہیں پیا تھا۔

ریٹا اپنے منصوبے کے پہلے مرحلے پر کامیابی سے عمل کر چکی تھی۔اب دوسرا مرحلہ شروع ہو رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اوتار سنگھ علم دوست ہے۔علمی مباحثے اسے بہت پسند ہیں۔ اس کیلئے اس نے خاص طور پر تیاری کی تھی۔

اس نے پہلے ایک موضوع چھیڑا، پھر دوسرا۔تھوڑی دیر میں اوتار سنگھ سب کچھ بھول کر گفتگو میں کھو گیا۔ وہ بڑے جوش و خروش سے اپنے موقف کے حق میں دلائل دے رہا تھا اور ریٹا بڑی معقولیت سے انہیں تسلیم کر رہی تھی۔کتابوں، دانشوروں کے اور مفکرین کے حوالے دیئے جا رہے تھے۔

ریٹا نے کہیں بھی معاملات کا ٹمپو تیز نہیں ہونے دیا۔اور ساتھ ہی اوتار سنگھ کا گلاس بھی شربت سے بھر دیتی ہے۔ کک نے اسے بتایا تھا کہ شربت کا نشہ بہت آہستہ آہستہ، لیکن بہت گہرا ہو گا۔

اوتار سنگھ کی جھجک آہستہ آہستہ ختم ہو گئی۔اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ شربت سے کچھ سرور آ رہا ہے۔ وہ کسی قدر ترنگ میں آ گیا ہے۔ناپسندیدہ گفتگو ہو رہی ہوتی یا وہ تناؤ میں ہوتا تو اسے اس بات کا احساس ہو جاتا۔لیکن وہاں تو اس کی من پسند گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ اپنے اندر کے ان سوالات پر گفتگو کر رہا تھا، جن کے جواب اسے ابھی تک نہیں ملے تھے اور وہ بہت خوش تھا۔ پہلے وہ نظر اٹھاتے ہوئے جھجک رہا تھا۔مگر اب یہ جھجک ختم ہو گئی تھی۔اب وہ ریٹا کی آنکھوں میں دیکھ کر بات کر سکتا تھا اور کر رہا تھا۔

اوتار سنگھ نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ساڑھے نو بجے تھے۔ وہ اور مطمئن ہو گیا۔ابھی دس بجے دوسرے لوگ.....کالج کے ساتھی لڑکے اور لڑکیاں آ جائیں گے۔

یہ وہ وقت تھا کہ ریٹا نے ٹھیک حساب کتاب سے وہ حساس موضوع چھیڑ دیا.....محبت! محبت جو اوتار سنگھ کیلئے بے حد اہم تھی۔

''محبت کے بارے میں تم کیا سمجھتے ہو اوتار سنگھ''۔

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

اوتار سنگھ نے چونک کر اسے دیکھا ''محبت میرے نزدیک دنیا کا سب سے طاقت ور جذبہ ہے.....آفاقی جذبہ''۔اس نے بلا جھجک کہا'' دنیا کی تمام رونقیں اسی کے دم سے ہیں''۔

ریٹا کو پہلی بار اوتار سنگھ کی آواز میں لڑکھڑاہٹ محسوس ہوئی۔وہ مسکرائی''اور جسمانی ربط کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟''۔

سوال اتنا اچانک تھا کہ اوتار سنگھ سناٹے میں آ گیا۔چند لمحے تو اس کی سمجھ میں ہی کچھ نہ آیا۔اسے احساس ہوا کہ اس کے دماغ پر بھی دھندلاہٹ سی طاری ہوگئی ہے۔شاید کمرے کے گرم ماحول کا اثر تھا۔چند لمحے بعد اس نے سنبھل کر کہا''میرا خیال ہے،ہمیں اس پر بات نہیں کرنی چاہئے''۔

''کیوں؟''۔

''اس لئے کہ اس کی ضرورت نہیں''۔

''''میں پہلی بار تمہیں کسی علمی موضوع سے ہٹ کر فرار اختیار کرتے دیکھ رہی ہوں''۔ریٹا کے لہجے میں چیلنج تھا۔

''ایسی کوئی بات نہیں لیکن میں نے کہا کہ اس کی ضرورت نہیں''۔

''تو تم اس سے انکار کرتے ہو کہ زندگی میں اس کی بہت زیادہ اہمیت ہے''۔

''نہیں۔میں اس سے انکار نہیں کرتا۔لیکن اس وقت ہم محبت کے موضوع پر بات کر رہے تھے''۔

''محبت اور جسمانی ربط کا چولی دامن کا ساتھ ہے''۔

''میں نہیں مانتا''۔

''مگر یہ حقیقت ہے۔ماں کو بیٹے سے اور باپ کو بیٹی سے زیادہ محبت ہوتی ہے''۔

''میں اس نظریئے کو گمراہ کن سمجھتا ہوں۔اور یہ بات پوری سچائی سے کہہ رہا ہوں کہ مجھے اپنے پتا جی سے عشق تھا۔میں نے کبھی ماتا جی سے اتنی محبت نہیں کی''۔

''اچھا یہ بتاؤ،محبت کی معراج کیا ہے؟''۔ریٹا نے پوچھا۔

''خدا کی اپنے بندوں سے محبت میرے نزدیک محبت کی معراج ہے''۔

''خدا کی.....آل مائٹی کی محبت اور چیز ہے۔اسے ہم کبھی پوری طرح سمجھ ہی نہیں سکتے۔وہ بات کرو،جو میری سمجھ میں آئے''۔ریٹا نے اسے چھیڑا۔

''انسانوں کی بات کرتی ہو تو بندے کی خدا سے محبت،محبت کی معراج ہے''۔

''چلو مان لیا۔تو پھر؟''۔

''اور اس محبت میں جسمانی ربط کا کوئی دخل نہیں ہوتا''۔اوتار سنگھ نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

ریٹا گھوم گئی۔اوتار سنگھ کی ذہانت میں کوئی شک نہیں تھا۔اس نے بے ضرر سی بات میں اپنے موقف کیلئے ایک ایسی دلیل نکال لی تھی،جس کی کاٹ نہیں کی جا سکتی تھی۔''یہ بھی آسمانی محبت ہے''۔وہ بولی''مجھ سے زمینی محبت.....حقیقی محبت کی بات کرو''۔

''چلو ماں کی اپنے بچے سے محبت کی بات کرلو''

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''تمہارا تجربہ، تمہارا رویہ انفرادی ہے۔ یہ ایک مسلمہ نظریہ ہے کہ ماں بیٹے سے زیادہ محبت کرتی ہے اور باپ بیٹی سے''۔

''اور میں کہہ چکا ہوں کہ یہ گمراہ کن نظریہ ہے..... پاکیزہ رشتوں کو داغ دار کرنے کی سازش۔ اس نظریئے کو تسلیم کر لیا جائے تو کوئی معاشرہ اچھا نہیں رہے گا''۔

''میرا خیال ہے، یہ بات طے ہو چکی تھی کہ صرف مدلل گفتگو کی جائے گی''۔

''دلیل تو موجود ہے۔ ذرا تصور کرو کہ ایک بے بس نوزائیدہ بچہ جو اپنی کوئی ضرورت پوری نہیں کر سکتا۔ ماں اس کی ہر ضرورت پوری کرتی ہے۔ خود تکلیف اٹھاتی ہے۔ اسے آرام پہنچاتی ہے۔ خود گیلے میں سوتی ہے، اسے سوکھے میں سلاتی ہے۔ تمہارے خیال میں ایسی محبت بھری نگہداشت کے پیچھے کیا جذبہ کارفرما ہے؟''۔

اوتار سنگھ اب جوش کے عالم میں بول رہا تھا۔

ریٹا بے حد مطمئن تھی۔ کچھ تو وہ نشے میں آ چکا تھا اور اب اس جوش کے عالم میں اسے ہوش نہیں تھا کہ ریٹا نے اس کے سامنے برانڈی کا جام رکھ دیا ہے۔ اس نے گلاس اٹھایا اور ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا،

''.....اگر میں اس نظریئے کو درست مان لوں، تب تو ایک ماں کو اپنی بیٹی کی کوئی فکر نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن نہیں، وہ اپنی نوزائیدہ بیٹی کا بھی اسی طرح خیال رکھتی ہے، جیسے بیٹے کا۔ اگر مائیں اولاد سے محبت نہ کریں تو اولاد جی ہی نہیں سکتی۔ اب اس کے بعد میں نہیں سمجھتا کہ کسی دلیل کی ضرورت رہ جاتی ہے''۔

''تم ٹھیک کہتے ہو۔ تم نے مؤثر دلیل دے کر اپنی بات ثابت کر دی''۔ ریٹا نے اسکے جام میں پھر برانڈی انڈیل دی۔ ''لیکن یہ تو کوئی معقول بات نہیں کہ تم مرد اور عورت کی عام محبت سے انکار کر دو''۔

''میں نے کب انکار کیا ہے۔ میں تو محبت کی عظمت کا قائل ہوں''۔

''تو پھر مرد اور عورت کی محبت میں کس جذبے کا دخل ہوتا ہے؟ کیا جسمانی ربط.....؟''۔

اب شراب اوتار سنگھ پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ وہ اپنے خیالات مجتمع نہیں کر پا رہا تھا ''یہ میں نہیں مانتا، یہ تو پھر ہوس ہوئی نا''۔

ریٹا نے اس کی بے بسی محسوس کر لی۔ لوہا گرم ہو رہا تھا ''دلیل سے بات کرو اوتار سنگھ۔ اب محبت اس حقیقت کو تو نہیں مٹا سکتی.....؟''

''مگر یہ تو دیکھو کہ دنیا کے ہر مذہب میں شادی کا تصور موجود ہے۔ کسی مذہب نے بھی اس معاملے میں انسان کو آزاد نہیں چھوڑا، ہر مذہب نے مرد اور عورت کو ایک خاص مرد اور عورت کا پابند کیا ہے۔ ورنہ انسان اور جانور میں کوئی فرق نہ رہتا''۔

ریٹا مسکرائی۔ اس نے نہیں کہا کہ وہ موضوع سے ہٹ رہا ہے۔ اوتار سنگھ کی زبان کی لڑکھڑاہٹ بڑھ گئی تھی۔

''اچھا چھوڑو اس بات کو۔ یہ بتاؤ، تم مجھے کیا سمجھتے ہو۔ میرے اور تمہارے درمیان کیا تعلق ہے؟''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

اوتار سنگھ چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر بولا ''ہم دوست ہیں.....اچھے دوست''۔

''دیکھو میں تمہارا کتنا لحاظ کرتی ہوں۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں اور تم مجھ سے محبت نہیں کرتے۔ لیکن تم مجھے دوست سمجھتے ہو نا۔ تو دوست سے دور بیٹھنے کا کوئی جواز نہیں۔ آؤ میرے پاس آ کر بیٹھو''۔

شراب کے اثر کی وجہ سے اوتار سنگھ کا دماغ کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ اٹھا اور دوسرے صوفے کی طرف چلا۔ مگر درمیان میں رکھی میز سے الجھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کے قدم لڑکھڑا رہے ہیں اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا دماغ جس دھندلاہٹ کا شکار ہو رہا ہے، اسے نشہ کہتے ہیں۔

اب اوتار سنگھ کو احساس ہوا کہ وہ شربت نہیں شراب ہے۔ ''یہ تو شراب ہے۔ لیکن تم مجھے شراب کیوں دے رہی ہو''۔

''یو سلی۔ تمہیں پتا بھی نہیں اور تم چار جام پی چکے ہو''

اوتار سنگھ کو نشہ تو رہا تھا لیکن وہ یہ نہیں سمجھ سکا کہ نشہ پر اس اثر کر رہا ہے۔ اب اس کی آواز بری طرح لڑکھڑا رہی تھی۔

ریٹا نے آئینے میں اس کے چہرے پر اس کی اندرونی کیفیات کا عکس دیکھا اور مسکرا دی۔ اس نے اپنے پتے بڑی احتیاط سے، بڑے ماہرانہ انداز میں کھیلے تھے۔ اسے یقین تھا کہ اب اوتار سنگھ اس کے سحر سے نہیں نکل سکتا۔

اس نے اب بھی جلد بازی نہیں کی۔ اس نے اوتار سنگھ کو دیکھتے ہوئے کہا ''میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتی ہوں اوتار سنگھ تم آؤ میرے ساتھ''۔

اوتار سنگھ اس وقت اپنے آپ میں نہیں تھا۔ ''ہم.....ہوں.....'' اس نے کہا۔

وہ اسے ایک کمرے میں لے گئی۔

''یہ تصویر دیکھ رہے ہو''۔ ریٹا نے ڈریسنگ پر رکھی اپنی بڑی فریم میں لگی تصویر کی طرف اشارہ کیا۔

''تمہاری ہے.....خوب صورت ہے.....''۔ اوتار سنگھ کی آواز میں لرزش بھی تھی اور لڑکھڑاہٹ بھی۔

ریٹا نے دو انگلیوں سے اپنی تصویر کھینچ کر باہر نکال لی۔ ''اب دیکھو.....''۔

اوتار سنگھ نے ریٹا کی تصویر کے نیچے سے برآمد ہونے والی تصویر کو دیکھا۔ وہ تصویر کچھ کچھ اس کی لگ رہی تھی۔ کچھ کچھ اس لئے کہ تصویر میں وہ کسی انگریز نائٹ کے گیٹ اپ میں تھا اور گھوڑے پر سوار تھا۔ ''یہ تو.....یہ مجھ سے.....ملتی جلتی ہے''۔

''سلی، یہ تمہاری ہی تصویر ہے۔ میں نے ایک آرٹسٹ سے خاص طور پر بنوائی ہے''۔ ریٹا نے کہا۔ پھر محبت بھرے لہجے میں بولی ''یہ تصویر سامنے بھی رہے تو کوئی مجھے کچھ نہیں کہے گا۔ لیکن میں نے محبت کو چھپانے کے آداب تم سے سیکھے ہیں''۔ اس نے اپنی تصویر پھر اس کی تصویر پر لگا دی۔ ''یہ تصویر بتاتی ہے کہ میں تمہیں کیسا دیکھتی ہوں''۔

ریٹا پوری طرح ہوش و حواس میں تھی اور اسے اوتار سنگھ سے پوری طرح بیگانہ تھا۔ ریٹا چالاک شکاری تھی۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

جس نے بڑی مہارت اور چابک دستی سے جال پھیلایا تھا۔اور اوتار سنگھ شکار تھا جو جال کے خلاف مزاحمت کرنے کے قابل بھی نہیں تھا۔لیکن شکار کا انداز شکاریوں کا سا تھا، جیسے وہ شکار کھیل رہا ہو۔

اوتار سنگھ کو چکر آ گیا۔وہ بستر پر بیٹھ گیا اور اب دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا، پھٹی پھٹی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہو گیا اوتار سنگھ''۔ریٹا نے اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی۔

اوتار سنگھ نے اسے جھٹک دیا۔پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔اسکے قدموں میں اب لڑکھڑاہٹ بھی نہیں تھی۔''نہیں ریٹا..... مجھے تم کو چھونے کا کوئی حق نہیں''۔اس نے نرم لہجے میں کہا۔''اور تم جسے آسمانی محبت کہتی ہو، وہی زمین پر کی جانے والی محبت کی معراج ہوتی ہے۔میں تو محبت کا آدمی ہوں۔جہاں تک آ چکا ہوں، اس پر ہی عمر بھر خود سے شرمندہ رہوں گا''۔یہ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

ریٹا تیزی سے اٹھی اور پاگلوں کی طرح اس کی طرف جھپٹی۔

لیکن اتنی دیر میں اوتار سنگھ بیڈ روم سے نکل چکا تھا۔وہ بھی اس کے پیچھے لپکی۔

اوتار سنگھ ڈرائنگ روم میں کوٹ اسٹینڈ سے اپنا کوٹ اتار رہا تھا۔ریٹا وحشت کے عالم میں چیخی ''تم مجھے ایسے چھوڑ کر نہیں جا سکتے''۔

اوتار سنگھ نے نرمی سے کہا''پلیز ریٹا، ہٹ جاؤ۔مجھے جانے دو''

''میں تمہیں نہیں جانے دوں گی''۔ریٹا پر وحشت طاری تھا۔

''دیکھو ریٹا، میں عورت کی بہت عزت کرتا ہوں۔مجھے جانے دو''

''تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟ مجھ پر ہاتھ اٹھاؤ گے؟''۔

''نہیں۔اس کی نوبت نہیں آئے گی''۔

''ریٹا نے اسے اور مضبوطی سے پکڑ لیا۔اس نے ریٹا کے دونوں ہاتھ سختی سے تھامے اور اسے خود سے علیحدہ کر دیا۔ریٹا نے اس سے لپٹنے کی کوشش کی۔وہ اسے دھکیلتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔

ریٹا کوشش کے باوجود اس سے نہ لپٹ سکی۔اور وہ چلا گیا۔ریٹا باہر تک اس کے پیچھے گئی۔لیکن تماشا بننے کے خیال سے وہ زبردستی نہیں کر سکی۔وہ واپس آئی تو اس حال میں اس کا وجود ناکامی اور توہین کے احساس سے پھنک رہا تھا۔

اوتار سنگھ بڑی عجیب ذہنی کیفیت میں باہر نکلا تھا۔وہ نشے میں تھا، یہ ایک ایسی حقیقت تھی۔جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔لیکن ہر آدمی کے اندر کچھ نظریات ہوتے ہیں، جو اس کے لئے بہت اہم ہوتے ہیں..... زندگی جیسے اہم! وہ زد پر آئیں تو نشے میں ہونے کے باوجود اس کے اندر مدافعت ابھرتی ہے۔اس کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔وہ پوری طرح سوچنے سمجھنے کے قابل تو نہیں تھا۔لیکن اس احساس نے کہ جس چیز کو وہ بے حد مقدس سمجھتا تھا، اس پر غلاظت کے چھینٹے آئے ہیں، اسے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔اسے یہ احساس بھی تھا کہ اس کا ذمے دار وہ خود ہے۔اسی لمحے اسے اپنے آپ سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔وہ شرمندہ بھی تھا اور جھنجھلایا ہوا بھی۔وہ کچھ کر نہیں سکتا تھا، اس لئے خود ملامتی کا شکار ہو گیا تھا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

اس چیز نے ایک مہیب موج کی طرح اسے نشے کے سمندر سے اوپر اچھال دیا تھا.....مگر صرف کچھ دیر کے لئے!

اس کے حواس اس وقت صرف ایک نکتے پر مرکوز تھے۔اسے اس گندگی، اس غلاظت سے نکلنا تھا۔یہ اس کا یک نکاتی ہنگامی ایجنڈا تھا اور جس طرح ریٹا نے ہنگامہ کیا تھا، اس پر عمل درآمد آسان نہیں لگ رہا تھا۔

اب وہ باہر نکل آیا تو اسے کم از کم یہ سکون ہو گیا کہ محبت کا مقدس تصور اب غلاظت کے چھینٹوں سے محفوظ ہو گیا ہے۔اس کی شرمندگی، جھنجھلاہٹ اور خود ملامتی، اب بھی اس کے اندر کہیں موجود تھی۔لیکن اوپر کا سکون زیادہ اہم تھا۔پھر ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کے چہرے سے ٹکرائے تو نشہ گہرا ہونے لگا۔اس کے قدم پھر لڑکھڑانے لگے۔

اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔سردی اپنے پورے شباب پر تھی۔سڑکیں سنسان تھیں۔کہیں کوئی سائیکل رکشہ نظر نہیں آ رہا تھا۔وہ پیدل ہی آگے بڑھنے لگا۔یہ بڑی بات تھی کہ راستہ اسے معلوم تھا۔وہ جانتا تھا کہ اسے کہاں جانا ہے، کہاں پہنچنا ہے۔

سامنے کچھ فاصلے پر اسے روشنی رقص کرتی نظر آئی۔روشنی کیا، کبھی وہ آگ لگتی تھی.....اور وہ ایک دائرے کی شکل میں گھومتی ناچتی نظر آ رہی تھی۔وہ یہ نہیں سمجھ سکا کہ یہ اس کے نشہ کا کمال ہے۔

یہ دو پولیس والے تھے، جنہیں رات کے گشت پر مامور کیا گیا تھا۔دو تین گھنٹے کے گشت نے ان کے جسم میں وقتی طور پر گرمی تو بھر دی تھی۔لیکن انہیں تھکا بھی دیا تھا۔ستانے کے لئے وہ ایک دکان کے سائبان کے نیچے بیٹھے تو سردی کا احساس زیادہ ہی ہونے لگا۔انہوں نے ادھر ادھر سے لکڑیاں اور کاغذ جمع کئے، آگ جلائی اور ہاتھ تاپنے لگے۔

انہیں سوٹ پہنے ایک جوان لڑکا لڑکھڑاتا ہوا آتا دکھائی دیا تو وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ان کے جسم اب تک کافی گرم ہو چکے تھے۔

اوتار سنگھ قریب آیا تو انہوں نے اسے للکارا۔"کون ہے؟ رک جاؤ"

اوتار سنگھ رک گیا اور انہیں غور سے دیکھا"کیا بات ہے؟"۔اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

"اوہو.....نشے میں بھی ہے"۔ایک پولیس والے نے کہا۔

"لگتا ہے، بڑا دن منا کے آ رہا ہے"۔دوسرے نے تبصرہ کیا۔

"بڑی رات کہو"۔پہلے نے ترمیم کی۔

اوتار سنگھ خاموش رہا۔اسے وہ دونوں ادھر ادھر ڈولتے نظر آ رہے تھے؟

اچھا لباس قانون کے رکھوالوں کو ہر دور میں مرعوب کرتا رہا ہے۔اوتار سنگھ آقاؤں کے لباس میں تھا۔مگر اپنی سرخ و سپید رنگت کے باوجود وہ آقاؤں میں سے نہیں لگتا تھا۔مگر پھر بھی آقاؤں کے لباس نے انہیں مرعوب کر دیا"کہاں سے آ رہے ہو راج کمار؟"۔ایک نے پوچھا۔

"کرنل پارسن کے گھر سے"۔

"اوہو.....گورے راجا کے گھر گئے تھے۔نام کیا ہے تمہارا؟"۔

"نام سے کیا.....ہوتا.....ہوتا ہے۔نام تو.....اوتار سنگھ.....ہے"

"مطلب؟"۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''مطلب یہ کہ نام تو اوتار سنگھ ہے۔ پر ایک خدا..... مانتا ہوں''۔

''اور شراب گوروں کی پیتے ہو''۔ پولیس نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

''تم نے..... موجھے روکا..... کیوں.....؟''۔

''تمہارے بھلے کیلئے۔ تم مسلے ہوتے تو سمجھاتے کہ اتنی رات کو اکیلے پھر رہے ہو۔ کوئی چھرا گھونپ دے گا۔ مگر تم تو اوتار سنگھ ہو۔ تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔ جانا کہاں ہے تمہیں؟''۔

لیکن اوتار سنگھ کے دماغ میں مسلے والی بات پھنس گئی تھی۔ ''چھرا گھونپنے سے پہلے نام بھی پوچھتے ہیں کیا؟''۔

''ہاں..... اوش پوچھتے ہیں کہ کہیں ہندو جان کے ساتھ ظلم نہ ہو جائے''۔

''اور اوتار سنگھ کے اندر..... کوئی محمود..... ہو تو؟''۔

''جاؤ بھائی جاؤ۔ تمہیں چڑھ رہی ہے۔ پر نتو یہ بات کسی چھرے والے سے نہ کہنا''۔

''تم ہندو ہو؟''۔

''ہاں''۔

''تو مسلمان بھی تو ہوں گے پولیس میں''۔

''وہ کہاں نوکری کرتے ہیں۔ ان کو تو راج کرنے کی عادت ہے نا۔ پر اب وہ دن گئے۔ اب تو نوکری ہی نہیں ملے گی۔ غلامی کریں غلامی''۔

''جبھی تو وہ..... یہاں نہیں..... رہنا چاہتے''۔ اوتار سنگھ نے کہا۔

''چھوڑو مہاراج۔ تم جاؤ''۔

اوتار سنگھ چل دیا۔ وہ نشے میں تھا۔ لیکن کچھ باتیں اسے چبھ رہی تھیں۔ سڑکوں پر قتل کئے جانے کا خطرہ صرف مسلمانوں کے لئے تھا۔ ہندو اس سے محفوظ تھے۔ تو ایسے غیر محفوظ ملک میں وہ کیسے رہ سکتے ہیں۔ جبھی تو وہ الگ ملک مانگ رہے ہیں۔

دوسری بات یہ تھی کہ اگر سر سید احمد خان نے انگریزی تعلیم کے حق میں تحریک نہ چلائی ہوتی تو مسلمان بہت پیچھے رہ جاتے۔ بہر حال تعلیم کے میدان میں اب بھی وہ ہندوؤں سے بہت پیچھے تھے۔ اور یہ بھی حقیقت تھی کہ ان کا ملازمتوں کی طرف رجحان نہیں تھا۔ درحقیقت وہ اب بھی اپنے عظیم الشان ماضی سے چمٹے ہوئے تھے۔ یہ نہیں سمجھ پا رہے تھے کہ یہ خود فریبی انہیں کچھ نہیں دے گی۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے وہ جانے پہچانے راستوں پر بے اختیار چلتا رہا۔ نشے میں ہونے کے باوجود وہ راستہ نہیں بھٹکا۔ اس کے قدم خود کار انداز میں گھر کی طرف اٹھتے رہے۔

گھر پہنچ کر وہ بے سدھ ہو کر اپنے بستر پر گر گیا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ اس نے کھانا نہیں کھایا ہے۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

ناشتے کی میز پر سب کو احساس ہو گیا کہ ریٹا کا موڈ بہت خراب ہے۔ایسے میں رچرڈ کی کوشش ہمیشہ یہی ہوتی تھی کہ اس سے کنارہ کش رہے۔وہ کچھ پوچھے تو جواب دے دے اور حتیٰ الامکان اس سے الجھنے سے بچے۔

الزبتھ اور جیمز بھی اسے نظر انداز کر رہے تھے۔لیکن ناشتے کی میز پر یہ کوئی آسان کام نہیں تھا.....خاص طور پر الزبتھ کیلئے۔

الزبتھ نے ٹوسٹ پر مکھن لگایا اور ریٹا کی پلیٹ میں رکھ دیا۔جوس کا گلاس پہلے ہی اس کے سامنے رکھا تھا۔

ریٹا نے کوئی تعرض نہیں کیا اور ٹوسٹ اٹھا کر کھانے لگی۔وہ اچھی علامت تھی۔

''تمہیں کافی دوں مائی ڈیئر؟''۔کچھ دیر بعد الزبتھ نے پوچھا۔

''جی ماما''۔

الزبتھ نے کافی کا مگ اس کی طرف بڑھا دیا۔''رات پارٹی میں بہت لوگ تمہیں پوچھ رہے تھے''۔اس نے کہا۔

''ہوں ہم''۔

''مائیک اینڈرسن تمہیں بہت مس کر رہا تھا۔بار بار تمہارا پوچھتا۔وہ بہت اچھا لڑکا ہے مائی بے بی''۔

''یس ماما۔میں نے کب کہا کہ وہ برا ہے''۔ریٹا نے بے پروائی سے کہا۔

''اینڈرسنز بھی تو وطن واپس جا رہے ہیں''۔جیمز پارسن نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔

''نیو ایئر وہ وہیں منائیں گے۔28 تاریخ کو ان کی روانگی ہے''۔الزبتھ بولی۔

''واہ.....کرسمس یہاں اور نیو ایئر وہاں۔خوش قسمت ہیں وہ لوگ''۔ریٹا نے تبصرہ کیا۔لیکن اس کے لہجے میں پھیکا پن تھا۔

الزبتھ کو فضا قدرے سازگار محسوس ہوئی۔''رات تمہاری پارٹی بہت جلدی ختم ہو گئی تھی؟''۔اس نے بے حد سرسری طور پر پوچھا۔

''نہیں تو ماما''۔ریٹا نے بے ساختہ کہا۔پھر سنبھل کر پوچھا۔''آپ لوگ کس وقت واپس آئے تھے؟''۔

''ڈھائی بجے تھے''۔الزبتھ نے جواب دیا اور تائید طلب نظروں سے شوہر کو دیکھا۔جیمز نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ہماری پارٹی ڈیڑھ بجے ختم ہوئی تھی''۔ریٹا نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

''تب بھی جلدی ہی ختم ہوئی نا''۔الزبتھ نے کہا۔وہ جانتی تھی جھوٹ بول رہی ہے۔رات وہ لوگ واپس آئے تو گھر کی ایسی صورت حال ہرگز نہیں تھی، جیسے وہاں پارٹی ہوئی ہو۔اس پر الزبتھ پارسن کو تشویش ہوئی۔ریٹا کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔اس نے کک سے پوچھ گچھ کی تو اسے سب معلوم ہو گیا۔ریٹا نے کک کو صرف دو افراد کے ڈنر کیلئے کہا تھا.....اور اس کے پاس صرف ایک مہمان آیا تھا۔گیارہ بجے کے لگ بھگ وہ واپس گیا تھا اور اس عالم کہ ریٹا چیخ رہی تھی، چلا رہی تھی، زبردستی اسے روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔لیکن وہ نہیں رکا تھا، چلا گیا تھا۔اس کے جانے کے بعد ریٹا اکیلی بیٹھی پیتی رہی تھی۔اس نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا اور کک کو ڈانٹ کر بھگا دیا تھا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

الزبتھ پارسن کو یہ سب معلوم تھا۔لیکن اس نے ریٹا سے کچھ نہیں کہا۔اس نے یہ بھی نہیں کہا کہ وہ لوگ پارٹی سے ڈھائی بجے نہیں، بلکہ ایک بجے واپس آئے تھے۔وہ سمجھ گئی تھی کہ اس کی بیٹی محبت کی چوٹ کھائے بیٹھی ہے اور مایوسی سے دوچار ہے۔

اس نے ریٹا کی طرف دوسرا ٹوسٹ بڑھایا۔ریٹا نے وہ بھی لے لیا۔ظاہر ہے، وہ رات سے بھوکی تھی۔

''یہ بتاؤ، تمہارے دوستوں نے انجوائے تو خوب کیا نا؟''۔الزبتھ نے اچانک پوچھا۔

ریٹا گڑبڑا گئی۔''یس ماما، بہت زیادہ''۔اس نے جلدی سے سنبھلتے ہوئے کہا۔

''اور تم نے؟''۔الزبتھ نے اسے بہت غور سے دیکھا۔

''میں نے بھی ماما''۔ریٹا نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''مگر تم خوش تو نہیں لگ رہی ہو''۔

''وہ ماما نیند پوری نہیں ہو سکی ہے نا، اس لئے''۔

الزبتھ اب جو بات کر رہی تھی، وہ ایک منصوبے کے مطابق تھی۔رات اس نے اس سلسلے میں جیمز سے بھی بات کی تھی۔وہ دونوں جانتے تھے.....اور رچرڈ بھی انہیں اشارتاً بتا چکا تھا کہ ریٹا ایک ہندوستانی لڑکے سے محبت کرتی ہے، جو ہندو ہے۔بلکہ رچرڈ نے اس کی بہت.....بہت زیادہ تعریف بھی کی تھی۔رچرڈ نے انہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ کرسمس پر ریٹا نے صرف اوتار سنگھ کو بلایا ہے۔الزبتھ اس بات سے خوش نہیں تھی۔لیکن جیمز کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔

مگر رات جو کچھ انہوں نے دیکھا اور سنا، اس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ لڑکا ریٹا میں انٹرسٹڈ نہیں ہے۔الزبتھ کا کہنا تھا کہ یہ وقت برطانیہ واپس جانے کا تذکرہ کرنے کیلئے مناسب ہے۔شکستہ دلی کی وجہ سے ریٹا اس وقت مان بھی سکتی ہے۔لیکن جیمز کا کہنا تھا کہ وہ اس سلسلے میں براہ راست اس لڑکے سے بات ضرور کرے گا۔

اس وقت الزبتھ نے اس سلسلے میں پہل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔''میں تو بس اب تھوڑے ہی دن تمہارے ساتھ ہوں ریٹا''۔اس نے کہا۔

''کیا مطلب ماما''۔ریٹا بری طرح چونکی۔

''کرنل ولکسن سے بات ہوئی تھی۔انہوں نے نیوایئر کے بعد مجھے بلایا ہے۔کہہ رہے تھے کہ جیمز کے علاوہ ہم سب واپس جا سکتے ہیں۔یہ بھی کہہ رہے تھے کہ زیادہ سے زیادہ پندرہ دن لگیں گے''۔

''اور ماما''۔

''میں تمہیں بہت مس کروں گی ڈیئر''۔

وہ پہلا موقع تھا کہ ریٹا مسکرائی۔''نہیں ماما، آپ مجھے مس نہیں کریں گی''۔

''کیوں نہیں کروں گی۔بہت کروں گی۔تمہیں نہیں پتا، میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں''۔

''مجھے پتا ہے ماما۔مگر آپ مجھے مس نہیں کریں گی۔کیونکہ میں آپ کے ساتھ چل رہی ہوں''۔

وہ سب ہکا بکا رہ گئے۔''ابھی کل ہی کی بات ہے کہ تم نے منع کر دیا تھا''

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

جیمز نے کہا۔

''کل اور آج میں بڑا فرق ہوتا ہے ڈیڈی''۔ ریٹا نے جواب دیا۔

''تمہیں تو یہاں کا کلچر بھی پسند ہے اور موسم بھی''۔

''لیکن ڈیڈی، یہاں کے لوگ بہت بیک ورڈ ہیں''۔ ریٹا کے لہجے میں قطعیت تھی۔ ''یہ کتنی ہی تعلیم حاصل کرلیں، روشن خیال کبھی نہیں ہوں گے۔ ان کی قدامت پسندی کبھی ختم نہیں ہوگی''۔

رچرڈ مسکرا دیا۔ وہ بہن کی بات اور اس کے پس منظر کو پوری طرح سمجھ سکتا تھا۔

لیکن جیمز پارسن سوچ رہا تھا کہ وہ کم از کم ایک بار اس لڑکے اوتار سنگھ سے ضرور ملے گا..... کچھ نہیں تو صرف اپنے تجسس کی تسکین کیلئے!

.....x.....

اوتار سنگھ شروع ہی سے سحر خیز تھا۔ اول تو رات کو وہ جلدی سوتا تھا۔ لیکن دیر سے سوئے تو بھی اس کی آنکھ صبح پانچ بجے کھل جاتی تھی۔ اور اسے صبح کا وقت اچھا بھی بہت لگتا تھا۔

اس صبح بھی وہ معمول کے مطابق اٹھ گیا۔ لیکن اس کی طبیعت بہت عجیب سی ہو رہی تھی۔ سر ایسا بوجھل اور بند سا لگ رہا تھا، جیسے وہاں دماغ کی جگہ کوئی بھاری پتھر رکھا ہو۔ اس کے علاوہ یہ کہ وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔ حالانکہ صبح اس کا دماغ ہمیشہ تر و تازہ اور روشن روشن ہوتا تھا۔ وہ تو اس وقت کو پڑھنے اور کچھ یاد کرنے کیلئے سب سے اچھا وقت قرار دیتا تھا۔

دوسرا احساس اسے یہ ہوا کہ اس کے منہ کا ذائقہ بہت کڑوا ہو رہا ہے۔ اس نے سوچا، شاید یہ لباب کی وجہ سے ہے۔ لیکن باتھ روم میں جا کر تھوکنے، دانت صاف کرنے اور کلیاں کرنے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ منہ میں تھوک بار بار آ رہا تھا اور وہ بے حد کڑوا بھی تھا۔

تیسرا احساس اسے یہ ہوا کہ اس کا جی متلا رہا ہے۔ وہ بار بار جھرجھری لیتا۔ ایسا لگتا کہ ابھی اسے قے ہو جائے گی۔ لیکن قے ہوئی نہیں۔ بہر حال اسے بری طرح گھبراہٹ ہونے لگی۔

یہ صبح آخر اتنی مختلف کیوں ہے، اس نے گھبرا کر سوچا۔ کیا کوئی نئی بات ہوئی ہے۔

اگلے ہی لمحے اسے بڑا شدید ذہنی جھٹکا لگا۔ اسے رات کی باتیں دھندلی دھندلی یاد آئیں۔ ریٹا کے گھر جانا، شربت پینا، اس شربت کی کڑواہٹ اور اس کے سلسلے میں ریٹا کی وضاحت۔ وہ سب صوری یادیں تھیں، جیسے کوئی فلم بہت تیز چلائی جا رہی ہو..... اور وہ بھی ٹوٹ ٹوٹ کر۔ مگر بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے گھبرا کر سر جھٹکا۔ آگے جو کچھ تھا، وہ فی الحال اسے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ جتنی بات سمجھ میں آ گئی تھی، فی الوقت اتنی ہی بہت تھی۔

اس کے منہ کی کڑواہٹ اور متلی کے احساس میں اور اضافہ ہو گیا۔ شاید اس لئے کہ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ رات وہ نشے میں تھا۔ ریٹا نے اسے جو شربت پلایا تھا، اس میں شاید شراب کی ملاوٹ تھی۔

منہ کی کڑواہٹ اور بڑھی تو وہ پریشان ہو گیا۔ اس نے رنجنا کو پکارا جو باورچی خانے میں ناشتہ تیار کر رہی تھی۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

رنجنا دوڑی دوڑی آئی۔ ''کیا حکم ہے چھوٹے مالک؟''۔اس نے پوچھا۔

''مجھے ایک پیالی میں بغیر دودھ اور چینی کی تیز چائے لا کر دو''۔

رنجنا نے حیرت سے اسے دیکھا۔لیکن کچھ کہنے کی اسے ہمت نہیں ہوئی۔اس کا دیکھنے کا انداز ایسا تھا، جیسے اس سے سننے میں کچھ بھول ہوگئی ہو۔

اوتار سنگھ نے اس کی بے یقینی بھانپ لی۔''میری بات سمجھ گئی ہو نا؟''۔

''دودھ اور چینی کے بغیر چائے کہاں ہوتی ہے چھوٹے مالک''۔

''بس ابلے ہوئے پانی میں زیادہ پتی ڈال کر پکاؤ اور مجھے لا دو''۔

رنجنا کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔لیکن وہ تعمیل کی عادی تھی۔''بہتر چھوٹے سرکار''۔یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

اوتار سنگھ بے تابی سے ٹہلتا رہا۔کڑواہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔نہ جانے اس کے دماغ میں یہ بات سما گئی تھی کہ اس کڑواہٹ کو کڑواہٹ ہی ختم کر سکتی ہے۔ورنہ اسے تو یہ معلوم بھی نہیں تھا کہ خمار کا توڑ بلیک کافی ہے.....وہ بھی بغیر شکر کی۔

چند منٹ بعد رنجنا چائے لے آئی۔اس نے چائے کچھ زیادہ ہی تیز بنا دی تھی۔اوتار سنگھ نے چائے کا طویل گھونٹ لیا۔چائے اسے زیادہ کڑوی نہیں لگی۔شاید اس لئے کہ اس کا منہ زیادہ ہی کڑوا ہو رہا تھا۔

چائے کے تین چار گھونٹ لینے کے بعد اچانک اسے احساس ہوا کہ سر اور دماغ کا بوجھل پن دور ہو گیا ہے۔یہی نہیں، دماغ پر جو دھند سی چھائی ہوئی تھی، وہ بھی چھٹ گئی تھی۔اب اس کا جی بھی نہیں متلا رہا تھا۔بلکہ اسے بھوک لگ رہی تھی۔

تاہم اس نے ابھی ناشتہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔پہلے وہ رات کے واقعات کو یاد کرنا اور ان پر سوچنا چاہتا تھا۔

وہ ریٹا کے گھر گیا تھا۔گھر میں کوئی نہیں تھا۔ریٹا نے اس کی بہت معقول وضاحت پیش کی تھی۔وہ مطمئن ہو گیا تھا۔پھر اس نے ریٹا کو کرسمس کے وہ تحفے دیئے، جو وہ اس کے لئے لے کر گیا تھا۔

وہاں تک سب ٹھیک ٹھاک تھا۔گڑبڑ اس وقت شروع ہوئی ہوگی، جب ریٹا نے اپنے لئے برانڈی اور اس کے لئے شربت نکالا تھا۔یہ بھی اس کا قیاس تھا۔کیوں کہ وہ سب کچھ اسے پوری طرح یاد تھا۔اسے یاد تھا کہ شربت پینے کے کافی دیر بعد تک وہ نارمل رہا تھا۔

بس ایک بات عجیب تھی۔شربت عام طور پر میٹھے ہوتے ہیں۔وہ شربت بھی میٹھا تھا۔لیکن اس میں کڑواہٹ بھی تھی۔اور اس نے اس سلسلے میں ریٹا سے پوچھا بھی تھا لیکن اس بار بھی ریٹا نے معقول وضاحت پیش کی تھی۔اور وہ مطمئن ہو گیا تھا۔کیوں کہ تلخی کے باوجود وہ اسے شربت ہی لگا تھا۔

یہاں اوتار سنگھ ٹھٹھکا۔اسے یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ شربت میں شراب کی آمیزش ہوتی ہے۔اس نے تو شراب کبھی چکھی ہی نہیں۔پھر وہ کیسے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ شراب نہیں ہے۔کہیں ایسا تو نہیں کہ لاشعوری طور پر وہ اس سب کی خواہش کر رہا ہو۔

اب اوتار سنگھ اپنی عدالت میں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا تھا۔اور اس کا ضمیر اس پر الزام عائد کر رہا تھا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

چند لمحوں کے لئے وہ گڑبڑا گیا۔ پھر اس نے سنبھل کر سوچا۔ کیا وہ اس سلسلے میں اپنی صفائی پیش کر سکتا ہے..... کچھ ہے اس کے پاس کہنے کو؟

''یہ سچ ہے کہ میں نے شراب کبھی نہیں چکھی۔ اس کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے، مجھے نہیں معلوم۔ لیکن میں شربت کا ذائقہ تو پہچانتا ہوں۔ وہ سوفی صد شربت ہی تھا''۔ وہ بڑبڑایا۔

''سوفی صد شربت!''۔ ضمیر کی آواز میں چیلنج تھا۔

''سوفی صد نہ سہی۔ ممکن ہے، اس میں کسی نشہ آور شے کی ملاوٹ ہو۔ لیکن اس میں شربت کا ذائقہ واضح اور غالب تھا''۔

''تمہیں اس کی کڑواہٹ پر بھی شبہ نہیں ہوا؟''۔

''نہیں..... شبہ نہیں ہوا۔ ورنہ میں محتاط ہو جاتا''۔

''حالاں کہ ہونا چاہئے تھا۔ شربت ایسی چیز نہیں ہوتی کہ کوئی کسی کو گلاس بھر بھر کر پلاتا رہے''۔

''واقعی، یہ میری غلطی ہے۔ لیکن میں بلاوجہ کسی کے بارے میں بدگمانی کرنا پسند نہیں کرتا۔ یہ میری فطرت ہے۔ اس لئے مجھے شک نہیں ہوا''۔

''بلاوجہ! بدگمانی!''۔ ضمیر نے حقارت سے کہا۔ ''وہ تمہیں بتا چکی تھی کہ تم سے محبت کرتی ہے اور تم جانتے تھے کہ وہ آزاد معاشرے کی پروردہ ہے''۔

''مگر جب میں نے اسے بتا دیا کہ میں کسی اور سے محبت کرتا ہوں تو اس نے افسردگی سے مائی لک کہہ کر بات ختم کر دی تھی''۔

''نہیں۔ تم جانتے تھے کہ تمہاری محبت کو اس نے مشرق کی حماقت سمجھا ہے۔ اس کے نزدیک تم اب بھی قابل حصول تھے۔ اس نے تمہیں پارٹی میں بلایا اور وہاں کوئی نہیں تھا..... سوائے اس کے اور تمہارے۔ تمہیں سمجھ لینا چاہئے تھا کہ وہ تمہاری خیالی محبت کو اپنی بے باک محبت سے شکست دینے کی کوشش کرے گی''۔

''میں نے کہا نا کہ میں بدگمانی نہیں کرتا''۔ اوتار سنگھ نے کہا۔ ''اور پھر وہ دور بیٹھ کر مجھ سے علمی گفتگو کر رہی تھی۔ شبہ کرنے کا کوئی جواز ہی نہیں تھا میرے پاس''۔

''کارروائی آگے بڑھائی جائے''۔ دماغ جج کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے رولنگ دی۔

اوتار سنگھ کو یاد تھا کہ وہ بہت معقولیت کے ساتھ علمی گفتگو کر رہی تھی۔ پھر اس نے گفتگو کا رخ محبت کی طرف پھیر دیا تھا۔ مگر تھی وہ بھی علمی گفتگو۔

اب وہ سب کچھ یاد کرتے ہوئے اسے دھندلا سا خیال آ رہا تھا کہ محبت سے جسمانی ربط تک بات گئی تھی تو وہ بہت پرجوش ہو گیا تھا اور اس دوران ریٹا نے اسے جو مشروب دیا تھا، وہ شربت نہیں تھا۔ شاید خالص شراب تھا۔ کیوں کہ یہی وہ وقت تھا کہ اسے دماغ پر دھند سی چھاتی محسوس ہوئی تھی۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ پھر صوری یادیں تھیں۔ لیکن اس باران میں ریل ٹوٹ جانے کی سی کیفیت نہیں تھی۔ بلکہ تسلسل تھا۔

اس نے ریٹا سے اپنے تعلق کو دوستی کہا تھا۔ اور ریٹا نے چیلنج کیا تھا کہ اگر وہ دوست ہیں تو انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھنا چاہئے۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

اب وہ اس سے انکار کرتا تو ریٹا کہتی کہ درحقیقت وہ اس سے محبت کرتا ہے۔مگر اس سے باخبر ہے۔ چناں چہ وہ اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھنے کے لئے بڑھا تھا۔اس وقت اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔اور وہ یقیناً نشے میں تھا۔اس لئے کہ اس نے جانتے بوجھتے شراب کے کئی جام قبول کر لئے تھے.....

اس کے بعد مسلسل ایسے مناظر تھے،جنہیں وہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔اس نے سختی سے آنکھیں بند کر لیں۔مگر فلم بند آنکھوں کے سامنے بھی چلتی رہی۔شرمندگی اور ندامت بوند بوند اس کے وجود میں ٹپکتی رہی اور دیکھتے ہی دیکھتے ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں تبدیل ہوگئی۔

اب وہ شرمندگی سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔یہ میں کہاں پہنچ گیا تھا.....کتنی پستی میں گر گیا تھا میں۔اور میں بچ نہیں سکتا تھا۔میں تباہ ہو جاتا،اگر خدا نے مجھے بچا نہ لیا ہوتا۔ ہاں.....اس نے مجھے بچا لیا۔ورنہ میں محبت کا نام زبان پر لانے تک کے قابل نہ رہتا۔وہ سوچ رہا تھا۔

''محبت کا نام زبان پر لانے کے قابل تو تم اب بھی نہیں رہے ہو''۔ضمیر نے تلخ تبصرہ کیا۔

جو منظر اس کی نگاہوں کے سامنے پھر رہے تھے،انہیں دیکھ کر اس نے سر جھکا لیا۔بات درست تھی۔

مگر وہ کیسا لمحہ تھا۔خدا کے حوالے میں کیسی تاثیر تھی کہ اس کا نشہ ہرن ہو گیا تھا۔وہ پوری طرح ہوش میں آ گیا تھا۔اگر ریٹا نے اس لمحے بندے کی خدا سے محبت کا مضحکہ نہ اڑایا ہوتا تو وہ یقیناً ایسے گرتا کہ اٹھنا تو درکنار،کبھی نظر بھی نہ اٹھا پاتا۔خدا کا نام سنتے ہی اسے ایسا لگا تھا کہ کس نے اس پر ٹھنڈے پانی کی بالٹی انڈیل دی ہے۔کیسا خوف طاری ہوا تھا اس پر خود کو ریٹا کے ساتھ اس حال میں دیکھ کر۔

وہ ریٹا کے سحر سے باہر آ گیا تھا.....خدا کے حوالے کی وجہ سے۔مگر ریٹا کو خبر نہیں تھی۔اس نے اس پر اکتفا نہیں کیا۔اس نے ان دیکھی لڑکی کی محبت کا بھی مذاق اڑایا تھا۔ اسے کم زور اور بودا قرار دیا تھا۔اس لئے کہ وہ خود کو فاتح سمجھ رہی تھی۔اور یہ بات اسے پوری طرح ہوش میں لے آئی تھی اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ ریٹا اپنی فتح پر اترائی نہ ہوتی تو محبت کو اور اوتار سنگھ کو شکست ہو چکی ہوتی۔

وہ سب کچھ یاد کرنے اور سمجھنے کے بعد اوتار سنگھ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔وہ رونے والا آدمی نہیں تھا۔لیکن وہ ندامت کے آنسو تھے اسے خود پر شرم آ رہی تھی۔ وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔بس اس کا جی چاہتا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

دیر تک وہ روتا رہا.....دنیا و مافیہا سے بے خبر۔پھر جیسے اندر کے سوتے خشک ہو گئے۔آنسو بھی رک گئے۔شاید اب اس کے اندر کچھ بچا بھی نہیں تھا۔سینہ اسے خالی خالی لگ رہا تھا، جیسے کوئی عمارت کھنڈر میں تبدیل ہو گئی ہو۔

پھر اچانک ایک تبدیلی آئی۔اللہ کا نام اس کے کھنڈ وجود میں گونجا اور اس کی زبان پر آیا۔اس کے ساتھ ہی اس کا دماغ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گیا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اللہ نے اسے اور اس کی محبت کے تصور کو بچایا ہے۔ اسے اس پر اللہ سے معافی مانگنی چاہئے اور اس کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے اسے بچا لیا۔

یہاں پہنچ کر وہ الجھ گیا کہ معافی مانگنا زیادہ اہم ہے یا شکر ادا کرنا۔ کیوں کہ اس کے لئے تو دونوں ہی باتیں اہم تھیں۔ اسے توبہ کرنا نہیں آتا تھا۔ البتہ شکر وہ زبان سے ادا کر سکتا تھا۔ وہ دیر تک شکر ادا کرتا رہا۔ معافی مانگنے کے خیال سے وہ پھر الجھنے لگا۔ بس وہ زبان سے ہی تو کہہ سکتا تھا کہ اے اللہ، مجھے معاف کر دے۔

مگر یہ کہتے کہتے اسے لگا کہ اس کے سینے میں پھر سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا ہے۔ آنسو اتنی تیزی سے امنڈ کر آئے کہ وہ خود کو سنبھال بھی نہ سکا۔ اب وہ پھر ننھے بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ ناپاک ہو گیا ہے۔ روتے روتے بھی وہ کلمہ پڑھنے لگا..... یہ سوچ کر کہ یہ کلمہ اس کی ناپاکی کو دور کر کے اسے پاک کر دے گا۔

پھر اسے احساس ہوا کہ جیسے جیسے آنسو بہہ رہے ہیں، اس کے سینے میں کوئی پتھر ہے جو ہلکا ہوتا جا رہا ہے۔ جیسے وہ اندر سے دھل رہا ہے۔ اور جب اس کے آنسو تھمے تو اسے یہ خوش گوار احساس ہوا کہ وہ اب ہلکا پھلکا ہو چکا ہے۔ اس نے تصور میں ان مناظر کو دیکھنا چاہا، جن پر وہ شرمندہ تھا۔ مگر اب وہ بہت دھندلے تھے۔ نہ وہ خود کو واضح طور پر دیکھ پا رہا تھا نہ ریٹا کو۔ وہ تو بس دو ہیولے تھے۔

اس وقت نہ تو وہ توبہ کو سمجھتا تھا اور نہ توبہ قبول ہونے کی علامات کو۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اللہ توبہ قبول کر لے تو اپنی رحمت اور مغفرت سے بندے کے دل و دماغ سے اس گناہ کی یاد بھی مٹا دیتا ہے، جس پر اس نے توبہ کی ہو۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اللہ نے اس کی توبہ قبول فرما لی ہے۔

ہلکا ہونے کے بعد وہ ذہنی طور پر اس قابل ہو گیا کہ اس پورے معاملے کو عقل کی کسوٹی پر پرکھ کر تجزیہ کر سکے۔ اس نے سوچنا شروع کیا تو یہ بات سمجھنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگی کہ ریٹا نے کچھ بھی اضطراری طور پر نہیں کیا تھا۔ اس نے پوری منصوبہ بندی کی تھی۔ اس نے بڑی احتیاط سے، خوب سوچ سمجھ کر اس کے لئے جال بچھایا تھا۔ اور اس نے کہیں بھی جلد بازی سے کام نہیں لیا تھا۔

قدرتی بات تھی کہ اس کے بعد اسے ریٹا پر غصہ آیا۔ اسے ریٹا سے یہ امید نہیں تھی۔ مگر اگلے ہی لمحے یہ سوچنے کے بعد اس کا غصہ سرد ہو گیا کہ اسے اللہ نے بچا لیا تو شکایت کیسی۔ اور اس کی اپنی غلطیاں بھی تو تھیں، جن سے وہ انکار نہیں کر سکتا۔

اس نے چند باتیں زندگی بھر کے لئے سمجھ لیں اور ذہن نشین کر لیں۔ عورت اور مرد کے درمیان دوستی نہیں ہو سکتی اور عورت سے ہمیشہ ہشیار رہنا چاہئے۔ عورت مکر سے کام لینے پر آئے تو اس سے بچنا ممکن نہیں ہوتا۔ اللہ ہی بچائے تو بچائے۔

بہر حال اس کے دل میں ریٹا کے لئے جو برائی آئی تھی، اس نے اسے جھٹک دیا۔ ریٹا نے جو کچھ کیا، وہ اپنی بے لگام خواہشات سے مجبور ہو کر کیا۔ اور اس کے ہاتھ تو کچھ بھی نہیں آیا۔ بلکہ اب شاید وہ ہمیشہ اس سے شرمندہ ہی رہے گی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اسے مزید شرمندہ نہیں کرے گا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''چھوٹے مالک، ناشتہ لاؤں؟''۔رنجنا نے اسے چونکا دیا۔

''ہاں، جلدی سے لے آؤ''۔اوتار سنگھ نے کہا۔اسے بہت بھوک لگ رہی تھی۔''اور ہاں، میں آج شملہ جا رہا ہوں..... ماسٹر جی کے پاس۔چار پانچ دن بعد واپس آؤں گا''۔

رنجنا خاموشی سے ناشتہ لانے کے لئے چلی گئی۔

.....x.....

وہ پہلا موقع تھا کہ اوتار سنگھ نے ماسٹر جی کے ساتھ سینی ٹوریم میں مسلسل پانچ روز گزارے..... پہلا اور آخری موقع!

اس نے ایک قریبی ہوٹل میں اپنے لئے ایک کمرا لے لیا تھا۔کمرا تو وہ پہلے بھی لیتا تھا، مگر صرف ایک رات کے لئے۔ہوٹل کے سبھی لوگ اسے پہچانتے تھے۔حالاں کہ ہوٹل میں صرف نہانے دھونے، کھانا کھانے اور ناشتہ کرنے اور رات کو سونے کے سوا وہ رکا بالکل نہیں تھا۔

''اس بار مجھے 31 تاریخ تک کمرا چاہئے ہوگا''۔اس نے استقبالیہ کلرک سے کہا۔

''جب تک دل چاہے رہیں صاحب۔آج کل سیزن تو ہے نہیں۔کمرا بھی آپ کو اچھا والا دوں گا''۔

ماسٹر جی کو پتا چلا کہ وہ پانچ دن رکنے کے ارادے سے آیا ہے تو ان کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔انہوں نے بڑی ممنونیت سے اسے دیکھا۔''تم میرے کسی اچھے کرم کا پھل ہو اوتار سنگھ۔حالاں کہ میں نے زندگی میں شاید ہی کوئی اچھا کام کیا ہو''۔

''یہ تو اچھے لوگوں کی پہچان ہوتی ہے ماسٹر جی کہ انہیں اپنا کوئی اچھا کام یاد ہی نہیں ہوتا''۔اوتار سنگھ نے کہا۔

''اچھے تو تم ہو اوتار سنگھ''۔

''اگر میں اچھا ہوں تو صرف اس لئے کہ آپ میرے استاد ہیں''۔

ماسٹر جی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔''میری اپنی اولاد نے مجھے چھوڑ دیا۔تم نہ ہوتے تو میں اس گندی کوٹھری میں کب کا مر کھپ چکا ہوتا''۔انہوں نے رقت بھرے لہجے میں کہا۔

''آپ ایسے نہ سوچا کریں ماسٹر جی''۔

''کیسے نہ سوچوں۔چار مہینے سے یہاں پڑا ہوں۔کسی نے نہیں پوچھا مجھے۔کوئی ایک بار بھی نہیں آیا یہاں''۔

''ارے میں تو آپ کو بتانا بھول ہی گیا۔میں آپ کے گھر گیا تھا۔گنگا، کانتا اور مرلی آپ کو بہت یاد کر رہے تھے''۔اوتار سنگھ نے اسے خوش کرنے کی کوشش کی۔

''بچے تو من کے سچے ہوتے ہیں نا۔وہ تو وہاں بھی میری کوٹھری میں آنے کو تڑپتے تھے۔پر ان کی کٹھور مائیں انہیں آنے ہی نہیں دیتی تھیں''۔

''وہاں سب آپ کو یاد کرتے ہیں ماسٹر جی۔آپ کے بیٹے برے نہیں ہیں، مجبور ہیں''۔

''ہاں، مجھے کوٹھری میں اکیلا چھوڑ دینا مجبوری ہی تو تھی''۔ماسٹر جی نے تلخ لہجے میں کہا۔کوٹھری کی خوف ناک یادیں ان کے اندر کہیں بہت گہرائی میں شکایت بن کر اتر گئی تھیں۔

(جاری ہے)

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''رام بھیا کی تو رات کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ بدری بھیا کی بھی ڈیوٹی بہت سخت ہوتی ہے۔ ہری بھیا نے میرے ساتھ آنے کا وعدہ کیا ہے''۔

''کب.....؟ اگلی بار؟''۔ ماسٹر جی نے زہریلی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

اوتار سنگھ کھسیا گیا۔ ''اب تو اسکول کے امتحان سر پر ہیں۔ ٹیوشنز سے بھی چھٹی نہیں کر سکتے وہ''۔ اس نے کہا۔ ''کہہ رہے تھے کہ مارچ یا اپریل میں میرے ساتھ آئیں گے''۔

''مارچ اپریل کا کس کو پتا۔ میں ہوں نہ ہوں''۔ ماسٹر جی نے سرد آہ بھر کے کہا۔

''آپ ایسی باتیں نہ کریں ماسٹر جی۔ ایک دن آپ صحت یاب ہوں گے اور میں آپ کو گھر لے کر جاؤں گا''۔

ماسٹر جی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر وہ خاموشی بھی جواب تھی..... یہ جواب کہ انہیں ایسی کوئی امید نہیں۔

اوتار سنگھ نے جلدی سے ایک کتاب ماسٹر جی کی طرف بڑھادی۔ ''آپ موقع نکال کر اسے پڑھیئے گا۔ پھر ہم اس پر بات کریں گے''۔

ماسٹر جی نے کتاب کا سرسری جائزہ لیا۔ ''اس پر تو ہم اب بھی بات کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ تم اس کا مطالعہ کر چکے ہو''۔

ان کے درمیان علمی گفتگو شروع ہوئی تو ماسٹر جی اپنا دکھ، اپنی شکایتیں بھول گئے۔ اوتار سنگھ کو احساس ہوا کہ ماسٹر جی کا ذہن اور حافظہ اب بھی پہلے جیسا ہی ہے۔ وہ اس کتاب پر سیر حاصل گفتگو کر رہے تھے۔

رات کو وہ ہوٹل جانے کے لئے اٹھا تو ماسٹر جی بچوں کی طرح ضد کرنے لگے۔ ''جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہیں رک جاؤ نا''۔ انہوں نے کہا۔

''میں صبح سویرے ہی آجاؤں گا ماسٹر جی''۔

''میں میٹرن سے بات کروں گا۔ یہیں تمہارے لئے پلنگ ڈال دیا جائے گا''۔ ماسٹر جی بچوں کی طرح ایکسائیٹڈ تھے۔ مگر اس کی ہچکچاہٹ دیکھ کر اچانک ان کا لہجہ بدل گیا۔ ''مگر تم میرے ساتھ کیسے سو سکتے ہو۔ یہ چھوت کا مرض ہے۔ تمہیں لگ گیا تو.....''۔ اس کے چہرے پر نظر پڑی تو وہ کہتے کہتے رک گئے۔ انہیں احساس ہو گیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

اوتار سنگھ کو ان کی بات سے دلی صدمہ ہوا تھا۔ وہ اسے ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن بے اختیار دل کی کیفیت کا عکس اس کے چہرے پر آ گیا تھا۔ اور عین اسی لمحے ماسٹر جی نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

''یہ بات نہیں ماسٹر جی.....''۔ اس نے کہنا چاہا۔

مگر دیکھتے ہی دیکھتے ماسٹر جی کا چہرہ یوں چٹخا، جیسے ساکت پانی میں عکس ایک کنکر پھینکے جانے پر چٹخ جاتا ہے۔ اگلے ہی لمحے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

''ماسٹر جی، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ کاش آپ نے مجھے وضاحت کا موقع دیا ہوتا۔ مگر خیر، اب تو میں یہیں رکوں گا''۔

ماسٹر جی نے ہاتھ اٹھا کر اسے منع کرنا چاہا۔ لیکن وہ کچھ کہنے کے قابل نہیں تھے۔ مدت سے جمع ہونے والا غبار آنسوؤں کی شکل میں نکل رہا تھا۔

(جاری ہے)

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

اوتار سنگھ لپک کر بڑھا اور ان کی پیٹھ تھپتھپانے لگا۔ ''ماسٹر جی، آپ نے ایسا کیسے سوچ لیا۔ میں تو آپ کو پتا سمان سمجھتا ہوں۔ دل چھوٹا نہ کریں ماسٹر جی، میں نے تو شروع میں ہی کہا تھا کہ آپ کی صحت یابی تک میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں''۔

''اسی لئے تو..... رو رہا..... ہوں''۔ ماسٹر جی نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔

اوتار سنگھ اس جملے کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔ ماسٹر جی کے جملے کا رخ اس کے بیان کے پہلے حصے کی طرف تھا۔ لیکن اس نے سمجھا کہ وہ اس کے آخری جملوں کے حوالے سے جواب دے رہے ہیں۔ ''اب میں کہیں نہیں جاؤں گا ماسٹر جی۔ آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ میں آپ کے ساتھ ہی رہوں گا''۔

ماسٹر جی کا گریہ اور بڑھ گیا۔ ساتھ ہی وہ زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگے۔

کچھ دیر میں غبار چھٹا تو ماسٹر جی نے اوتار سنگھ کے سامنے ہاتھ جوڑ لئے۔ مگر بولنا اب بھی ان کے بس میں نہیں تھا۔ چند لمحے بعد انہوں نے کہا۔ ''میں ہاتھ جوڑ کر تم سے بنتی کرتا ہوں بیٹے کہ مجھے معاف کردو''۔

اوتار سنگھ نے بے تابی سے ان کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو علیحدہ کیا اور انہیں چومنے لگا۔ ''یہ کیا کر رہے ہیں ماسٹر جی..... یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔ مجھے گناہ گار کر رہے ہیں آپ؟''۔

''گناہ گار تو میں ہوں بیٹے۔ تم تو میرے اپنے بیٹوں سے بڑھ کر میرے بیٹے ثابت ہوئے۔ اور میں نے تمہارے متعلق ایسے سوچا۔ میں اتنا کڑوا، اتنا زہریلا ہو گیا ہوں، مجھے اندازہ ہی نہیں تھا۔ میں نے امرت رس کی ندی میں اپنا زہر گھول دیا۔ اب سمجھ میں آیا ہے کہ امرت رس سچا ہو تو اس میں گرنے والا زہر بھی امرت ہی بن جاتا ہے۔ مجھے شما کردو بیٹے''۔

''ارے ماسٹر جی، ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے تو برا بھی نہیں لگا۔ آپ کی بات فطری تھی۔ لیکن میں.....''۔

''تم نے کبھی مجھ سے چھوت چھات نہیں کی۔ پھر بھی میں نے تمہیں طعنہ دیا۔ بس تم مجھے شما کردو''۔

''آپ مجھے گناہ گار نہ کریں ماسٹر جی۔ آپ کی کسی بات سے مجھے تکلیف نہیں ہوئی۔ مگر اس بات سے ہو رہی ہے''۔

''تم سچے بیٹے ہو۔ تم نے مجھے پتا سمان ہی سمجھا ہے۔ مجھے تو پرمان ہے بیٹے۔ اب میں یہ بات نہیں کروں گا۔ مگر اب تم یہاں نہیں رکو گے''۔

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر ماسٹر جی۔ مگر پہلے میں آپ کے پہلے حکم کی تعمیل کروں گا۔ آج رات تو میں یہیں رکوں گا''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

اوتار سنگھ نے اتنی قطعیت کے ساتھ بات کی تھی کہ ماسٹر جی کچھ کہہ نہ سکے۔ ویسے بھی وہ شرمندہ تھے۔

.....x.....

اگلی صبح اوتار سنگھ کا دماغ نیند سے بوجھل تھا۔ جسم بری طرح ٹوٹ رہا تھا۔ دراصل وہ معمولات کا آدمی تھا، اچھی اور طویل نیند اس کے لئے بہت ضروری تھی۔ اور رات کو کسی بھی وقت وہ سوئے، صبح پانچ بجے اس کی آنکھ بہر حال کھل جاتی تھی۔ اس کے بعد دن بھر وہ سو بھی نہیں سکتا تھا۔ نیند پوری نہ ہونے کی صورت میں اس کا یہی حال ہوتا تھا۔

رات شروع میں تو ماسٹر جی کو یہ ملال تھا کہ انہوں نے زبردستی اسے روکا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر فرائیڈ اور ڈارون کے نظریات پر گفتگو چھڑی تو وہ سب کچھ بھول گئے۔ ایسے میں تو انہیں اپنی بیماری بھی یاد نہیں رہتی تھی۔ وہ پہلے جیسے ہو جاتے تھے۔ وہ اتنے خوش نظر آ رہے تھے کہ مدت سے اوتار سنگھ نے انہیں اتنا خوش نہیں دیکھا تھا۔ خود وہ انہیں خوش دیکھ کر بہت خوش تھا۔

نفسیات کا موضوع خود اوتار سنگھ نے نکالا تھا اور اسے فرائیڈ تک لے گیا تھا۔ ماسٹر جی تو حیران تھے کہ وہ فرائیڈ کے نظریات پر گفتگو کر رہا ہے۔

''دیکھو بیٹے.....مرد اور عورت کے درمیان کشش ایک کائناتی حقیقت ہے''۔ ماسٹر جی نے کہا تھا ''انسان کا نسلی ارتقا اسی حقیقت پر ہی قائم ہے۔ انسان کی جبلت میں جو طاقت ور ترین محرکات ہیں ان میں بقا اور بھوک کے ساتھ جنس بھی شامل ہے''۔

''میرے خیال میں جنس کو بقا اور بھوک جیسے محرکات کے ساتھ رکھنا زیادتی ہے ماسٹر جی''۔ اوتار سنگھ نے ان سے اختلاف کیا۔ ''بقا خطرے میں ہو یا بھوک حد سے گزر جائے تو آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے.....اپنی فطرت اور مزاج کے برعکس''۔

''جنسی خواہش بھی درحقیقت بھوک ہی ہوتی ہے۔ ان محرکات کو طاقت ور ترین اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کے زیر اثر انسان جانور بن جاتا ہے۔ درندگی پر اتر آتا ہے۔ کسی کی پروا نہیں کرتا۔ کچھ نہیں دیکھتا''۔

''جنس کا معاملہ مختلف ہوتا ہے ماسٹر جی۔ اگر آدمی میں تہذیب ہو تو وہ اس معاملے میں خود کو مذہبی اور معاشرتی اقدار کا پابند رکھتا ہے''۔

''تہذیب کو یہیں تک محدود کیوں کرتے ہو بیٹے۔ اسی میں تو انسان کی عظمت ہے۔ بھوک سے تڑپتی ہوئی ماں روٹی کا ایک ٹکڑا مل جانے پر اسے خود نہیں کھاتی۔ اپنے کم بھوکے بچے کو کھلا دیتی ہے۔ یہ تو چھوٹی بات ہے۔ لوگ اپنے حصے کی روٹی کسی اور بھوکے کو بھی دے دیتے ہیں۔ بقا کا معاملہ اور سخت ہے۔ لیکن ایسی مثالیں موجود ہیں کہ انسان نے مارنے پر مرنے کو ترجیح دی۔ خود کسی کا خون بہانے کے بجائے قتل ہو جانا بھی گوارا کر لیا۔ انسان میں بڑا تنوع ہے۔ ایک طرف وہ آکاش سے بلند ہے تو دوسری طرف پاتال سے بھی پست۔ فیصلہ اس پر ہوتا ہے کہ کس نے اپنے نفس کو کس حد تک فتح کیا ہے''۔

اس نے گفتگو کا رخ بدلا۔ ''ماسٹر جی، فرائیڈ کا نظریہ تو احمقانہ، مضحکہ خیز اور گمراہ کن ہے۔ میں اس بات کو کیسے مان لوں کہ ہر رشتے کے پیچھے جنس کارفرما ہے۔''

''یہ تو میں بھی کہتا ہوں''۔ ماسٹر جی نے کہا ''میں نے کبھی اس کی حمایت نہیں کی''۔

انہی باتوں میں چار بج گئے۔ ماسٹر جی کی آنکھیں مندنے لگیں، جماہیاں آنے لگیں۔ لیکن مدت سے کسی اپنے کی قربت کو ترسا ہوا وہ بوڑھا اور بیمار شخص اب بھی سونا نہیں چاہتا تھا۔ اور موضوعات کی اس کے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ صاحب علم آدمی تھا اور اپنے ہونہار ترین شاگرد سے باتیں کر رہا تھا۔

آخر اوتار سنگھ کو اسے ٹوکنا پڑا ''ماسٹر جی، اب آپ سو جائیں''۔

''ٹھیک ہے۔ روشنی گل کر دو''۔

اوتار سنگھ بھی ماسٹر جی کے ساتھ ہی سویا۔ لیکن اسے سونا تو نہیں کہیں گے۔ کیونکہ اس کی آنکھ سوا پانچ بجے کھل گئی۔ اس نے مزید سونے کی کوشش کی۔ لیکن اس سے سویا ہی نہیں گیا۔ ماسٹر جی البتہ بے سدھ سو رہے تھے۔

اوتار سنگھ نے چیسٹر پہنا، مفلر لپیٹا اور باہر نکل آیا۔ سردی ایسی تھی کہ اس کے دانت بج رہے تھے۔ مگر ایسے میں بھی وہ چہل قدمی اس کی روح کو شاداب کر گئی۔ صبح کے حسن کا تو وہ ہمیشہ سے قائل تھا۔

چہل قدمی کے نتیجے میں جسم میں گرمی آئی اور سردی کا احساس کم ہو گیا۔ باہر ایک ہوٹل میں اس نے ڈٹ کر ناشتہ کیا۔ واپس آیا تو ماسٹر جی اب بھی سو رہے تھے۔ وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گیا اور وہ کتاب اٹھالی جو اس نے کالج کی لائبریری سے ایشو کرائی تھی۔

لیکن مطالعہ اس وقت اس کے بس میں نہیں تھا۔ نیند نہ پوری ہونے کی وجہ سے جسم اور ذہن کی عجیب کیفیت تھی۔ جسم ایسے ٹوٹ رہا تھا، جیسے وہ رات بھر دوڑتا رہا ہو، اور ذہن کا یہ حال تھا کہ نہ وہ سو رہا تھا، نہ جاگ رہا تھا۔

وہ اسی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ گیارہ بجے کے بعد ماسٹر جی کی آنکھ کھلی۔ لیکن ان کے چہرے پر بھی پژمردگی اور اضمحلال تھا۔ انہوں نے حیرت سے اوتار سنگھ کو دیکھا ''تم سوئے نہیں اوتار سنگھ؟''۔

''میں تو اپنے وقت پر اٹھ گیا تھا ماسٹر جی۔ اور دن میں مجھے نیند ہی نہیں آتی''۔ اوتار سنگھ کے لہجے میں بے بسی تھی۔

میں نے تم پر ظلم کیا اوتار سنگھ۔

''ایسی کوئی بات نہیں ماسٹر جی۔ میرا دل چاہ رہا تھا آپ سے باتیں کرنے کو۔ اور سچ یہ ہے کہ رات میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا.....''

''لیکن تمہارا بہت برا حال ہو رہا ہے''۔

''مگر میں بہت خوش ہوں ماسٹر جی۔ اور ایسی خوشی کے لئے ہزار راتیں جاگ سکتا ہوں میں''۔

لیکن خود ماسٹر جی کے معمولات بگڑ گئے تھے۔ سینی ٹوریم میں وہ بڑی مضبوط زندگی گزار رہے تھے اور اس کا اثر ان کی صحت پر بہت مثبت پڑا تھا۔ ایک دن کی بے اعتدالی نے ان پر بڑا منفی اثر ڈالا تھا۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ ان کے لئے اچھا نہیں۔ انہوں نے ناشتہ دیر سے کیا۔ پھر دوپہر کا کھانا بھی دیر سے کھایا۔ اس کے نتیجے میں رات کو انہیں بھوک ہی نہیں لگی۔ اور دن الگ بے کیف گزرا۔

رات کو انہوں نے خود ہی اوتار سنگھ سے کہا ''تم اب چلے جاؤ بیٹے''۔

''میں رکنا چاہتا ہوں ماسٹر جی۔ لیکن یقین کریں، میں اس لئے نہیں رکتا کہ آپ کی صحت کے لئے دیر تک جاگنا اچھا نہیں ہے''۔ اوتار سنگھ نے بے حد خلوص سے کہا۔ ''میں رکوں گا تو آپ سے باتیں کروں گا۔ آپ کو جگاؤں گا۔ بس یہ بات ہے''۔

''میری سمجھ میں سب کچھ آ گیا ہے بیٹے۔ بس اب تم جاؤ اور آرام کرو۔ تمہارا بھی برا حال ہو رہا ہے''۔

.....x.....

اوتار سنگھ کے شملہ میں قیام کے وہ دن کانتی پرشاد کے لئے بے حد خوش گوار تھے۔ دن بھر وہ اوتار سنگھ سے باتیں کرتے۔ رات کو وہ اسے جلدی ہی ہوٹل بھیج دیتے۔ سردی کی راتیں ویسے بھی جلدی آ جاتی ہیں اور دیر تک رہتی ہیں۔

اوتار سنگھ سے باتیں کرتے ہوئے خوشی ان کے چہرے سے پھوٹ پڑتی۔ مگر اچانک ایک لمحے کے لئے ان کے چہرے پر دکھ کا سایہ سا لہرا جاتا۔ دراصل اپنے بچوں کی بے نیازی اور بے پروائی ان کے لئے بے حد اندوہ ناک تھی۔

اچھے دن ہوا کے جھونکوں کی طرح گزر جاتے ہیں۔ پل بھر میں جیسے اوتار سنگھ کے قیام کا آخری دن آ گیا۔

''تم کل چلے جاؤ گے اوتار سنگھ''۔ اس شام انہوں نے اداس لہجے میں کہا۔

''ضروری نہیں ماسٹر جی''۔ اوتار سنگھ نے انہیں بہت غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ان کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔

''کل نہیں تو پرسوں جاؤ گے۔ جانا تو ہے''۔

''میں یہی تو کہہ رہا ہوں ماسٹر جی کہ ضروری نہیں ہے۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہہ رہا ہوں۔ میں آپ کے پاس رہوں گا.....آپ کی صحت یابی تک۔ اور پھر آپ کو لے کر ہی گھر جاؤں گا''۔

ماسٹر جی تڑپ کر اٹھ بیٹھے ''یہ کبھی نہیں ہو سکتا''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''کیوں نہیں ہوسکتا ماسٹر جی؟''۔

''میں جانتا ہوں کہ میں یہاں سے زندہ واپس نہیں جاؤں گا''۔

''آپ ایسی باتیں نہ کریں ماسٹر جی۔امید سے ہی سب کچھ ہوتا ہے''۔اوتار سنگھ کے لہجے میں خفگی تھی۔

''تمہاری خاطر منہ سے نہ کہوں۔مگر اپنے اندر کا حال تو مجھے معلوم ہے نا۔اپنی موت کا وقت کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔لیکن یہ مجھے معلوم ہے کہ اب میں یہاں سے کہیں نہیں جاسکتا''۔

''اب یہ بات سننے کے بعد تو میں یہاں سے جاؤں گا ہی نہیں''۔

''تمہیں جانا پڑے گا اوتار سنگھ۔میں ہر ہفتے تمہارے انتظار میں ہی تو جیتا ہوں''۔

''مگر آپ مجھے یہاں رہنے کیوں نہیں دیتے؟''۔

''میں تمہارا تعلیمی سال خراب کیوں کروں؟ایسا ہوگیا تو میں ٹھاکر جی کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ٹھاکر جی کے اور تمہارے کتنے احسان ہیں مجھ پر۔کیا میں اس کا یہ صلہ دوں گا''۔ماسٹر جی کی آواز بھری گئی۔

یہ کہنے کے بعد جو انہوں نے اوتار سنگھ کے چہرے کی طرف دیکھا تو وہاں انہیں عجیب سا تاثر نظر آیا۔اسے دیکھ کر انہیں ایک پل میں اپنی بہت بڑی غلطی کا احساس ہو گیا۔انہیں شرمندگی بھی ہوئی۔بیماری کے بعد سے انہوں نے ایک بار بھی بڑے ٹھاکر کی خیریت دریافت نہیں کی تھی۔گاؤں کے بارے میں بھی کچھ نہیں پوچھا تھا۔ان کی شرمندگی کی کوئی حد نہیں تھی۔ان کی نظریں جھک گئیں۔''میں بہت کٹھور اور خودغرض ہوں اوتار سنگھ۔مجھے معاف کردو''۔ان کی آواز لرز رہی تھی۔

اوتار سنگھ نے ان کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔''اب ایسا کیا ہوگیا ماسٹر جی۔آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں''۔

''شرمندہ کرتا نہیں، ہوگیا ہوں۔میں اپنی نظروں میں گر گیا ہوں۔اپنی بیماری، اپنی پریشانی میں ایسا الجھا کہ مجھے کسی اور کی پرواہی نہیں رہی۔میں نے ایک بار بھی ٹھاکر جی کی خیریت نہیں پوچھی۔

اوتار سنگھ نے کوئی جواب نہیں دیا۔اب وہ ان کے دونوں ہاتھ سہلا رہا تھا۔

''کیسے ہیں ٹھاکر جی؟''۔

''اب تو بس میرے پاس آپ ہی ہیں ماسٹر جی''۔

ماسٹر جی کو باقاعدہ جھٹکا سا لگا۔انہوں نے اپنے ہاتھ کھینچ لئے۔''کیا مطلب ہے تمہارا؟بتاتے کیوں نہیں۔ٹھاکر جی خیریت سے ہیں نا؟''۔

''نہیں ماسٹر جی۔جب میں آپ کو چھوڑ کر گاؤں گیا تھا، یاد ہے۔میں گاؤں پہنچا تو وہاں لال آندھی نے گاؤں کا نام ونشان بھی مٹا دیا تھا۔آس پاس کے کئی گاؤں بھی پوری طرح ختم ہوگئے تھے۔پتا جی اب اس دنیا میں نہیں ہیں ماسٹر جی''۔

ماسٹر جی بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔ان کا سر یوں جھکا ہوا تھا کہ ٹھوڑی سینے سے لگ گئی تھی۔اور وہ چپکے چپکے رو رہے تھے۔ان کے آنسو بہے جا رہے تھے۔ان کے جسم میں لرزش نہ ہوتی تو اوتار سنگھ کو پتا بھی نہ چلتا کہ وہ رو رہے ہیں۔

اس نے ماسٹر جی کو لپٹا لیا اور ان کی پیٹھ تھپکنے لگا۔''آپ نہ روئیں ماسٹر جی۔پر زندگی کا انجام تو یہی ہے''۔

لیکن ماسٹر جی نے اس کی بات نہیں سنی۔وہ کچھ سننے کے قابل ہی نہیں تھے۔وہ تو اس وقت سوچ رہے تھے۔ان کے دل میں بار بار یہ خیال آیا تھا کہ اوتار سنگھ نے دو مہینے تک ان کو پلٹ کر پوچھا بھی نہیں۔ان کی خبر ہی نہیں لی۔اس خیال سے ان کے اندر اس کے لئے شکایت ابھرتی تھی۔لیکن دو سبب ایسے تھے کہ وہ اپنی شکایت کو رد کر دیتے تھے۔ایک تو یہ کہ دو ماہ کی غفلت اپنی جگہ، لیکن دو ماہ بعد اسی اوتار سنگھ نے ان کی ذلت بھری زندگی اور درماندگی کا مداوا کیا تھا۔ان پر اتنی عنایتیں کی تھیں کہ اپنی غفلت کی تلافی کر دی تھی۔دوسرے یہ کہ وہ اس غفلت کے باوجود ان کی اپنی اولاد سے کروڑ درجہ بہتر تھا۔

لیکن ان کی شکایت ایسی تھی کہ ختم نہیں ہوتی تھی، اندر دب جاتی تھی، ایسا نہ ہوتا تو وہ بار بار کیوں ابھرتی۔اور اس شکایت کا تعلق اس مان سے تھا، جو انہیں اوتار سنگھ پر تھا۔وہ اس پر بیٹوں سے بڑھ کر مان کرتے تھے۔بیٹوں نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا، اس پر انہیں اتنی شکایت نہیں تھی، جتنی اوتار سنگھ کی دو ماہ کی غفلت پر تھی۔

مگر اب وہ شرمندہ تھے۔انہوں نے ایک لمحے کو بھی نہ یہ سوچا، نہ اس سے پوچھا کہ وہ دو مہینے ان کی طرف سے بے پروا کیوں رہا۔ایسی کیا گزری اس پر ان دو ماہ میں۔اپنے باپ جیسا ان کا ادب کرنے والا، ان سے اولاد جیسی محبت کرنے والا وہ شاگرد ایسا تو نہیں تھا کہ عام حالات میں ان کی طرف سے ایسی بے پروائی کرتا۔

اب انہیں معلوم ہوگیا تھا اور وہ محسوس کر سکتے تھے کہ اس پر کیا گزری ہوگی۔وہ جو سال بھر کے بچھڑے باپ سے، اپنے محبوب لوگوں سے ملنے کیلئے گیا تھا، اپنے گاؤں میں، اپنے گھر میں کچھ وقت گزارنے گیا تھا، وہاں اپنی آنکھوں سے سب کچھ..... پورا گاؤں، اپنا باپ، اپنے لوگ ٹنوں ریت کے نیچے دب کر دفن ہوتے دیکھ کر آیا تھا، اس پر ان دو ماہ میں کیا گزری ہوگی۔

وہ شرمندہ تھے.....اس کے اور اپنے ظرف کے فرق پر۔وہ کتنا بڑا دکھ سینے میں چھپائے ان کی دل جوئی کرتا رہا۔اور وہ اتنا کچھ ملنے کے باوجود کتنی حقیر سی شکایت دل میں چھپائے بیٹھے رہے۔اب وہ شرمندہ نہ ہوتے تو کیا کرتے۔

وہ اس سے کہنا چاہتے تھے کہ مجھے معاف کردو۔لیکن بات ان کے ہونٹوں پر رک گئی۔وہ دیکھ چکے تھے کہ اس پر وہ کیسا شرم سار ہوتا ہے، کھسیاتا ہے۔چناں چہ انہوں نے بلند آواز میں.....رندھی ہوئی آواز میں کہا۔''بھگوان مجھے معاف کرے۔میں بہت کم ظرف اور خودغرض آدمی ہوں''۔

وہ بوجھ ہٹنے کے بعد وہ کھل کر روئے.....اتنا روئے کہ نڈھال ہوگئے۔اب وہ بڑے ٹھاکر کو یاد کر کے رو رہے تھے۔

اگلی صبح اوتار سنگھ ان سے رخصت ہونے کے لئے آیا تو اس نے ہنس کر کہا۔''اس بار تو میں صرف تین دن بعد واپس آجاؤں گا''۔

''ہوں.....''۔ماسٹر جی نے بے دھیانی سے کہا۔وہ کسی اور سوچ میں تھے۔''اوتار سنگھ، بیٹے.....میں تم پر ایک بہت بڑا بوجھ ڈالنا چاہتا ہوں''۔

اوتار سنگھ ہمہ تن متوجہ ہوگیا۔''حکم کریں ماسٹر جی''۔

''تم نے میرے لئے بہت کچھ کیا ہے.....بلکہ سب کچھ کیا ہے.....ایک بیٹے کی طرح! تو بیٹے کی طرح میرا ایک آخری کام بھی کر دینا''۔

''آپ حکم تو کریں ماسٹر جی''۔

''میں مرجاؤں تو میری چتا یہیں جلانا۔اور میری چتا کو آگ تمہیں دینا''۔

''لیکن ماسٹر جی.....''۔

''یہ میری وصیت ہے اوتار سنگھ''۔ماسٹر جی نے سخت لہجے میں کہا۔''میں یہاں سب ڈاکٹروں سے بات کر چکا ہوں۔میری چتا میرا کوئی بیٹا نہیں جلائے گا۔تم جلاؤ گے۔یہ تمہارے لئے میرا حکم ہے''۔

''مگر ماسٹر جی، وہ لوگ آپ سے ملنے آنا چاہتے ہیں.....اور آئیں گے بھی''۔اوتار سنگھ کے لہجے میں احتجاج تھا۔

''آئیں گے تو ان کا احسان ہوگا مجھ پر۔نہیں آئیں گے تو شکایت نہیں کروں گا۔مگر میرا یہ فیصلہ آخری ہے''۔

اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش نہیں تھی!

.....x.....

جنوری کا مہینہ گزرا جا رہا تھا۔کالج دوبارہ کھلا تو اوتار سنگھ یہ سوچ کر گھبرا رہا تھا کہ ریٹا کا سامنا کیسے کرے گا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

یہ بات نہیں کہ وہ کسی بھی اعتبار سے اس کا مجرم ہو۔ وہ تو اس کیلئے شرمندگی کا نشان تھی۔

لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ رچرڈ اور ریٹا دونوں غائب تھے۔ کالج کھلے ہوئے پندرہ دن ہو گئے اور وہ نہیں آئے۔ اب اوتار سنگھ اس طرف سے پریشان تھا کہ ان کی غیر حاضری کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ اس کا دل وسوسوں میں گھر گیا۔ اسے رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ کہیں ریٹا نے اس کے نکل آنے کے بعد کوئی الٹی سیدھی حرکت تو نہیں کر لی۔ کہیں اسے کچھ ہو تو نہیں گیا۔ رچرڈ ہی آجاتا تو اس سے حقیقت حال معلوم ہو جاتی۔

وہ اس معاملے کی حقیقت جاننے کو بے تاب تھا۔ صرف اسی طرح اس کی پریشانی دور ہو سکتی تھی۔ مگر اس کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ بس ایک ہی حل تھا۔ وہ ان کے گھر جا کر معلوم کرے۔ لیکن اس کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اور پھر کون جانے کہ وہاں جانے پر کیا صورتحال سامنے آئے۔ اور اسی پر اس کی ذمے داری عائد کر دی جائے۔

پھر سیاسی ماحول میں بھونچال آگیا۔ پورا ہندوستان جیسے کسی آتش فشاں کے دہانے پر تھا۔ وائسرائے نے دستور ساز اسمبلی کا اجلاس 9 دسمبر 46ء کو طلب کیا تھا۔ اس پر محمد علی جناح نے تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ وائسرائے نے موجودہ صورت حال کی سنگینی اور زمینی حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کر لی ہیں اور وہ پوری طرح کانگریس کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ انہیں مسلم لیگ اور ہندوستان کی دیگر سیاسی تنظیموں کی کوئی پروا نہیں۔

دستور ساز اسمبلی کا اجلاس شیڈول کے مطابق ہوا۔ لیگ کے تمام نمائندے اجلاس میں شریک نہیں ہوئے۔ اجلاس میں چیئرمین کا انتخاب ہوا اور ایک ضابطہ کمیٹی تشکیل دی گئی۔ ایک قرارداد منظور کی گئی، جس کے تحت ہندوستان کو وفاقی جمہوریہ قرار دے دیا گیا۔ جب کہ پلان میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ علاقائی آئین کی تشکیل تک وفاقی آئین پر غور نہیں کیا جائے گا۔

دوسری طرف کانگریس پنجاب میں خضر حیات ٹوانہ کی نام نہاد مخلوط پٹھو حکومت کی کھل کر حوصلہ افزائی کر رہی تھی، جو یکے بعد دیگرے شہری حقوق کو غصب کرتی جا رہی تھی۔ پٹھو حکومت نے 24 جنوری 47ء کو مسلم لیگ نیشنل گارڈز کی تنظیم کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ پولیس نے گارڈز کے ہیڈ کوارٹر پر چھاپہ مارا، جس میں انہیں کافی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ پنجاب کے بیشتر بڑے مسلم لیگی رہنما گرفتار کر لئے گئے۔ اس کے خلاف تحریک شروع ہوئی، جو اتنی پھیل کر خضر حیات حکومت کے بس سے باہر ہو گئی۔ نتیجہ یہ کہ حکومت کو مستعفی ہونا پڑا۔

اسی دوران بمبئی، احمد آباد اور کئی شہروں میں اور متحدہ اور وسطی صوبوں اور مدراس کے گاؤں دیہاتوں میں فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ الہ آباد اور کانپور میں تشدد کی وارداتیں معمول بن گئیں۔ کلکتہ میں چھرا گھونپنے کے واقعات جاری رہے۔ ڈھاکا اور نواکھلی بھی فسادات کی لپیٹ میں آگئے۔ میرٹھ میں گڑھ مکھٹیشر اور بہار میں سرن، پٹنہ، گیا، مونگیر اور بھاگلپور میں ہندو مسلمانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہزاروں مسلمان مارے گئے، ان کی جائیدادیں لٹیں اور ان کی عورتوں کو اغوا کر لیا گیا۔ برصغیر پوری طرح یک طرفہ خانہ جنگی کی لپیٹ میں آچکا تھا۔

ان حالات میں برطانیہ کے وزیر اعظم ایٹلی نے 20 فروری کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کا اقتدار جون 48ء سے پہلے ذمے دار ہندوستانیوں کے سپرد کر دیا جائے گا۔ اس سلسلے میں ضروری اقدامات کئے جا رہے ہیں۔

اوتار سنگھ بہت دکھی تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ انگریز کیا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اگر درست فیصلے کرتے اور کانگریس سے جانب داری نہ برتتے تو اتنی خوں ریزی نہ ہوتی۔ وہ حکمراں تھے۔ انہیں فیصلے کرنے کا اختیار تھا اور کانگریس اور مسلم لیگ، دونوں ان سے تعاون کرنے پر مجبور تھیں..... آزادی کی خاطر! اسے لگتا تھا کہ انگریز یہ سب دیدہ و دانستہ کرا رہے ہیں۔ ہندوؤں کا چیلنج تھا کہ پاکستان بن بھی جائے تو قائم نہیں رہ سکے گا۔ اوتار سنگھ کے خیال میں وہ بے بنیاد چیلنج نہیں تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ انگریز کانگریس سے ملے ہوئے ہیں اور تقسیم اس غیر منصفانہ انداز میں کی جائے گی کہ پاکستان بن بھی جائے تو تھوڑے ہی عرصے میں ٹوٹ پھوٹ جائے۔

اوتار سنگھ ذہین اور حساس تھا۔ غیر جانب دار بھی تھا لیکن مسلمانوں کے مسلسل جانی نقصان نے اس کی غیر جانب داری ختم کر دی۔ اس پر واضح ہو گیا کہ مسلمان مظلوم ہیں۔ قیام پاکستان کے حق میں تو وہ پہلے ہی تھا۔

فروری کے آخر میں رچرڈ اچانک کالج چلا آیا۔ کلاس میں وہ اوتار سنگھ کے برابر ہی بیٹھا۔ ''کیا بات ہے؟ تم لوگ اتنے دن کالج نہیں آئے''۔ اوتار سنگھ نے اس سے پوچھا۔ اس کے لہجے میں تشویش تھی۔ ''خیریت تو ہے نا؟''۔

''پریشانی کی کوئی بات نہیں''۔ رچرڈ نے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''بس ایک اہم کام میں الجھے ہوئے تھے''۔

''ریٹا نہیں آئی؟''۔

رچرڈ نے اسے غور سے دیکھا۔ ''کیا تم اسے مس کرتے رہے ہو؟''۔ اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''مس تو خیر نہیں کر رہا تھا۔ مگر مجھے تشویش تھی تم لوگوں کی طرف سے''۔

''اور پھر بھی گھر آکر خیریت دریافت نہیں کی؟''۔

اوتار سنگھ کھسیا گیا۔ ''بس مصروفیات ہی ایسی ہیں''۔ وہ بولا۔ ''مگر تم نے بتایا نہیں کہ ریٹا کیوں نہیں آئی''۔

''وہ نہیں آسکتی۔ مگر اس نے تمہارے لئے یہ بھجوایا ہے''۔ رچرڈ نے فائل میں سے ایک لفافہ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔

اوتار سنگھ نے لفافے کا جائزہ لیا۔ لفافے پر صاف ستھری تحریر میں اس کا نام لکھا تھا۔ اس نے لفافہ جلدی سے اپنی فائل میں رکھ لیا۔ پھر وہ رچرڈ کی طرف متوجہ ہوا۔

''تم نے اب بھی نہیں بتایا کہ ریٹا کیوں نہیں آئی۔ وہ خیریت سے تو ہے نا؟''۔

رچرڈ مسکرایا۔ ''یہ لفافہ کھول کیوں نہیں لیتے۔ میرا خیال ہے، اس میں تمہارے ہر سوال کا جواب موجود ہے۔ ویسے پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ وہ خیریت سے ہے''۔

اس روز پڑھائی میں اوتار سنگھ کا دل نہیں لگا۔ وہ اس لفافے کو اپنے کمرے کی تنہائی میں کھولنا چاہتا تھا۔ کون جانے، اس میں کیا ہو۔ اندازہ تو یہی ہو رہا تھا کہ اس میں خط ہے۔ اور وہ یہ اندازہ بھی لگا سکتا تھا کہ خط میں کرسمس کی اس رات کا تذکرہ ہوگا۔ بلکہ خط اسی کے بارے میں ہوگا۔ اب انداز کیا ہوگا، اس واقعے کے بارے میں ریٹا کا نکتہ نظر کیا ہوگا، اس کے بارے میں وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا، البتہ وہ متجسس بہت زیادہ تھا، اور وہ تجسس لفافہ کھلنے پر ہی دور ہوتا۔

یہ بڑی بات تھی کہ اس نے جیسے تیسے پورے پیریڈ اٹینڈ کر ہی لئے۔

.....x.....

اپنے کمرے میں اوتار سنگھ لفافے کو دونوں ہاتھوں میں یوں تول رہا تھا، جیسے اس کے وزن کا اندازہ لگا رہا ہو۔ اب وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ لفافے میں بس ایک خط ہے۔ تجسس اسے خط کھولنے پر مجبور کر رہا تھا اور خط کھولتے ہوئے وہ ڈر بھی رہا تھا۔ یہ سوچ کر کہ اس میں الزام تراشیاں ہوں گی، شکایتیں ہوں گی اور ایسی کہ وہ ان کا جواب بھی نہیں دے سکے گا۔

مگر خط تو بہر حال اسے کھولنا تھا، دل کڑا کر کے اس نے لفافہ چاک کیا اور خط نکال لیا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

دھڑکتے دل سے اس نے خط کی تہیں کھولیں اور اسے پڑھنے لگا۔

پیارے دوست،

سدا خوش رہو،

جس وقت تم یہ خط پڑھ رہے ہو گے، میں یہاں سے بہت دور جا چکی ہوں گی۔ دراصل جو کچھ ہوا..... بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ میں نے جو کچھ کیا، اس کے بعد مجھ میں تمہارا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ سامنا کرنا تو بہت دور کی بات ہے، میں اس پر معذرت بھی نہیں کر سکتی۔ شرمندگی کا اظہار بھی نہیں کر سکتی۔ یہ خط بھی صرف اس لئے لکھ رہی ہوں کہ تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ پوری سچائی کے ساتھ بتا دوں۔ شاید اس کے بعد تم مجھے معاف کر سکو۔

میں ہندوستان میں ہی پیدا ہوئی اور پلی بڑھی۔ بہت چھوٹی سی تھی، تبھی سے ہندوستانی لوگوں میں، ان کے کلچر میں، ان کی زبان میں دل چسپی لیتی تھی۔ یہاں کے ڈریس مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ یہاں رنگ ہی رنگ تھے۔ میں یہاں کے رنگ میں رنگنا چاہتی تھی۔ میں نے تعلیم کے لئے انگلینڈ جانے سے انکار کر دیا۔ میں تو یہاں کی زبان سیکھنا چاہتی تھی۔ مجھے کانونٹ بھیج دیا گیا۔

اس سب کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں کہیں کی نہ رہی۔ سچ پوچھو تو میرا اپنا کوئی کلچر نہیں۔ نہ میں انگریز ہوں نہ ہندوستانی۔ آدھی ادھر آدھی ادھر۔ کانونٹ میں ہندوستانی لڑکیاں بھی تھیں۔ میں نے انگریز لڑکیوں کے مقابلے میں دوستی کے لئے انہیں ترجیح دی۔ تب میری سمجھ میں پہلی بار آیا کہ ہندوستانی لوگ بہت رومینٹک ہوتے ہیں..... بے حد تخیلاتی۔ ہندوستانی لڑکیاں اپنے خوابوں کے شہزادے کا انتظار کرتی ہیں۔ ان کی محبت کی بنیاد پاکیزگی پر ہوتی ہے۔ ان کا انداز ایسا ہوتا ہے، جیسے محبت بھی کوئی مذہب ہے۔ کانونٹ میں پڑھنے والی بے حد ماڈرن لڑکیوں کو بھی میں نے محبت کے معاملے میں قدامت پرست ہی پایا۔ مجھے یہ سب بہت اچھا لگا۔ میں شاید پیدائشی طور پر رومان پسند تھی اور تخیلاتی بھی۔ میں نے مشرق کے اس فلسفہ محبت کو اپنا لیا۔ میرے خیالوں میں بھی خوابوں کا ایک شہزادہ بس گیا۔ کانونٹ یں کوئی بھی ایسا نہیں تھا، جو میرے خوابوں کا وہ شہزادہ ہو۔ میں اس کا انتظار کرتی رہی۔

جب تمہیں دیکھا تو میں نے پہلی نظر میں جان لیا کہ وہ تم ہو۔ میں جواب تک محبت کے بارے میں صرف سوچتی رہی تھی، محبت میں گرفتار ہوئی تو مجھے پتا چلا کہ یہ کسی سحر انگیز کیفیت کا نام ہے۔ اب میرے اندر اور باہر..... میرے گرد و پیش میں ہر طرف خوب صورتی ہی خوب صورتی تھی۔ میری ہم نسل سہیلیوں نے جو محبت میں جسمانی ربط کو ضروری سمجھتی تھیں، اپنی جو کیفیات بتائی تھیں، میری کیفیت ان سے بہت مختلف تھی۔ تب میں نے سمجھ لیا کہ جسمانی ربط انتشار، ٹوٹ پھوٹ اور محبت کے زوال کے سوا کچھ نہیں دیتا۔ محبت تو اصل میں پاکیزگی، ایثار اور قربانی کا نام ہے۔ محبت کچھ لینے کا نہیں، سب کچھ دے دینے کا نام ہے۔

پھر میں نے پہلی بار تم سے اظہار محبت کیا۔ اس وقت میں بہت پر اعتماد تھی۔ میرے خیال میں مجھ میں کوئی کمی نہیں تھی۔ میں خوب صورت تھی۔ نسلی اعتبار سے برتر تھی۔ لیکن تم نے بتایا کہ تم پہلے ہی کسی سے محبت کرتے ہو..... ایک ایسی لڑکی سے، جس کی تم نے صرف آواز سنی ہے۔ کبھی دیکھا تک نہیں ہے۔

میرا پہلا ردعمل بے حد مہذبانہ تھا۔ میں نے سوچا..... میرا نصیب۔ محبت میں زبردستی نہیں ہوتی۔ وہ تو خود بہ خود ہو جاتی ہے۔ لیکن بعد میں گڑبڑ ہو گئی۔ شاید مشرقی انداز میں سوچنے کے باوجود میں اپنی بنیاد میں مغرب کی لڑکی تھی۔ مجھے اپنے حسن پر بہت غرور تھا۔ شاید محبت کی عظمت کو سمجھنے کے باوجود میں اس کی عظمت پر، اس کے بنیادی فلسفے پر یقین نہیں رکھتی تھی۔ تمہارے انکار نے میری انا کو ٹھیس پہنچائی اور اس کے زیر اثر میں نے تمہارے حصول کو ایک آسان چیلنج سمجھ کر قبول کر لیا۔ میں یہ بھول گئی کہ انا سر اٹھالے تو محبت کہیں پیچھے رہ جاتی ہے۔ محبت میں تو انا کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔

تو میری انا نے مجھے یہ سمجھایا کہ جسم ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ جب کہ آواز محض ایک گمان ہے۔ اس آواز والی کو تم دیکھو اور وہ کوئی بدصورت لڑکی ہو تو تمہاری محبت پانی کے بلبلے کی طرح ختم ہو جائے گی۔ اور اگر وہ خوب صورت بھی ہو تو مجھ سے زیادہ خوب صورت تو نہیں ہو گی۔ اور ہو بھی تو وہ تو اوجھل ہے۔ جب کہ میں تمہارے سامنے، تمہارے قریب ہوں۔ میں اگر منصوبہ بندی کر کے کوشش کروں تو تم میرے سحر سے نہیں نکل سکتے۔

مجھے اعتراف ہے کہ میری انا نے مجھے بہت پست کر دیا، گھٹیا بنا دیا اور میں بن گئی۔ میں نے وہ گھٹیا منصوبہ بنایا۔ میں نے تمہارے لئے وہ ملاوٹ شدہ مشروب تیار کرایا۔ پھر میں نے تمہیں بے خیالی میں شراب بھی پلا دی۔ اس سے اندازہ لگا لو کہ تمہیں کردار کے اعتبار سے میں کتنا بڑا آدمی سمجھتی ہوں..... بڑا اور ناقابل تسخیر۔ اور آج میں اپنے اس عمل پر، اس سازش پر اتنی شرمندہ ہوں کہ خود کو معافی کے قابل بھی نہیں سمجھتی۔ تم میرے چاند تھے۔ میں نے تمہیں داغ دار کرنے کی کوشش کی۔ خدا کا شکر ہے کہ تم داغ سے محفوظ رہے۔ اب تم چاہے مجھے معاف کر دو۔ مگر میں اپنے اس گھٹیا پن پر خود کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔

اوتار سنگھ، یہ پورا خط سچا ہے۔ اس میں کہیں کوئی جھوٹ نہیں۔ میں تم سے محبت کرتی تھی۔ تمہیں حاصل کرنا چاہتی تھی۔ تم سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ مگر میں جسمانی ربط کی قائل نہیں تھی۔ جو کچھ ہوا، صرف تمہیں پانے کی اندھی خواہش میں ہوا۔ میں نے سوچا کہ تم ایسے ہو کہ اگر تم سے لغزش ہو گئی تو تم اسے نباہنے کے لئے مجھ سے شادی کر لو گے۔ اور پھر میں تمہاری محبت جیت لوں گی۔

میں اپنی سازش میں کامیاب ہو جاتی۔ مگر میں نے پہلے خدا کی محبت اور اس کے بعد آواز والی ان دیکھی لڑکی کی محبت کا طعنہ دے کر اپنا کھیل خراب کر لیا۔ میں اس پر خدا کا شکر ادا کرتی ہوں۔ کیوں کہ اسی وجہ سے تم اپنی نظروں میں گرنے سے بچ گئے۔ ورنہ میں زندگی بھر اس پر ملول رہتی۔ دوسری بات یہ کہ اس طعنے ہی کی وجہ سے مجھ پر حقیقی محبت کی عظمت کھلی۔ تم نشے میں دھت تھے۔ لیکن میرے وہ دونوں طعنے تمہیں ہوش میں لے آئے۔ تم سنبھل گئے۔ پستی میں گرنے سے بچ گئے۔ میرا کیا ہے، میں تو تھی ہی پست۔ تمہاری وجہ سے میں بھی بچ گئی۔ میں تمہاری شکر گزار ہوں۔

یہ اعتراف نامہ میں نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کیلئے پوری سچائی سے لکھا ہے۔ یہ میرا تم سے آخری رابطہ ہے۔ ایک بات اب تک کسی کو نہیں بتائی ہے۔ صرف تمہیں بتا رہی ہوں۔ میرے اس گناہ نے میری روح کو بہت بوجھل کر دیا ہے۔ میں اس کا کفارہ ادا کروں گی۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ زندگی کی تمام خوشیوں اور لذتوں سے ناتا توڑ کر لوگوں کے دکھوں اور ان کی پریشانیوں کو اپناؤں گی۔ میں چرچ جوائن کر کے راہبہ بن جاؤں گی۔ زندگی بھر خدا سے اپنے لئے معافی اور تمہارے لئے سچی خوشیاں، بلند مقام اور بلند مرتبہ منگتی رہوں گی۔

آخر میں ایک التجا کرتی ہوں۔ جو کچھ اس رات ہوا، اس میں تمہارا ذرہ برابر قصور نہیں تھا۔ تم کبھی اس کے بارے میں شرمندہ ہو یا خود کو مجرم سمجھو تو اس سے میرے گناہوں کے بوجھ میں اضافہ ہو گا۔ کیوں کہ سازش میں نے کی تھی۔ قصوروار میں تھی۔ اگر ایک دوست کی حیثیت سے تمہیں میرا ذرا بھی خیال ہے تو خود کو مجرم کبھی نہ سمجھنا۔ بلکہ تم خدا سے میرے لئے دعا کرنا کہ وہ مجھے معاف کر دے۔ اور کاش تم بھی مجھے معاف کر دو۔

خدا ہمیشہ تم پر کرم فرمائے۔ خدا حافظ

تمہاری گناہ گار دوست

ریٹا پارسن

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

اوتار سنگھ نے خط تہہ کر کے دوبارہ لفافے میں رکھ دیا۔اس کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔

ریٹا کے بارے میں اس کا جو تصور تھا، ریٹا اپنے خط میں اس سے بہت مختلف ثابت ہوئی تھی۔کیسی عاجزی، کیسی نرمی، کیسا گداز اور کیسی سچائی تھی اس کے خط میں۔وہ دل کو چھو لینے والی تحریر تھی۔

اوتار سنگھ نے دیکھا تھا کہ عام طور پر غلطی کر کے لوگ اس پر اصرار کرتے ہیں۔بلکہ جتنی بڑی غلطی ہو، اتنا ہی اصرار کرتے ہیں۔غلطی تسلیم کرنا، معذرت کرنا آسان کام نہیں۔اس کے لئے بڑا ظرف درکار ہوتا ہے۔اور ریٹا نے خود کو صاحب ظرف ثابت کر دیا تھا۔

پھر اس نے ریٹا کے فیصلے کے بارے میں سوچا۔چرچ کی ننوں کے بارے میں وہ تھوڑا بہت جانتا تھا۔ریٹا نے دنیا ترک کر کے نن بننے کا فیصلہ کیا تھا۔مگر اس کے خیال میں یہ غلط تھا۔بلکہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ خدا کی اسکیم کے خلاف ہے.....ایک طرح کی بغاوت ہے۔رومن کیتھولک عقیدے کے پادری اور راہبائیں جو زندگی گزارتے تھے، وہ یکسر غیر فطری تھی۔اگر دنیا کے تمام لوگ یہ نظریہ اپنا لیتے اور اس طرح کی زندگی گزارتے تو نسل انسانی کا وجود ہی مٹ چکا ہوتا۔اس اعتبار سے یہ خدا سے بغاوت تھی۔دوسری طرف وہ غیر فطری زندگی گناہ کے امکان کو بہت زیادہ قوی کر دیتی تھی۔فطری تقاضوں کے سامنے ان میں سے کوئی بھی سرنگوں ہوتا تو گناہ کی دلدل میں دھنس کر رہ جاتا۔اس کے نزدیک اس میں خسارہ ہی خسارہ تھا۔

لیکن وہ یہ بات ریٹا کو سمجھ نہیں سکتا تھا۔سمجھانا بھی نہیں چاہتا تھا۔سمجھانے میں اس تعلق کا اظہار ہوتا جو اس کے اور ریٹا کے درمیان تھا ہی نہیں۔اور وہ پھر سے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے سمجھ لیا کہ وہ اس کی کتاب زندگی کا ایک چھوٹا سا اور غیر اہم باب تھا، جو ختم ہو گیا ہے۔

.....x.....

حور بانو اور نور بانو کے کرتے مکمل ہو گئے تھے۔سرفراز بیگم ان کا کام دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔خاص طور پر نور بانو کی کڑھائی نے تو انہیں حیران کر دیا۔انہیں معلوم تھا کہ وہ کام اس نے بس مروت میں کیا۔ورنہ اوتار سنگھ سے تو وہ چڑتی تھی۔وہ سوچ رہی تھیں کہ اگر اس کے ٹالنے والے کام میں اتنی خوب صورتی ہے تو محبت سے کام کرے گی تو غضب ہی ڈھائے گی۔

انہوں نے یہ بات نور بانو سے کہہ بھی دی۔

''آپ غلط سمجھ رہی ہیں اماں''۔نور بانو نے کہا۔''کام تو میں نے محبت سے ہی کیا ہے۔کام محبت سے کیا جائے تو عبادت ہی ہوتا ہے نا اماں''۔

سرفراز بیگم نے اسے حیرت سے دیکھا۔وہ عجیب لڑکی تھی۔بپھرتی تو آتش فشاں بن جاتی۔اور نرم ہوتی تو دور سے ہی احساس ہوتا کہ مخمل سے بنی ہے۔اے اللہ.....اس کے نصیب بہت اچھے کرنا۔انہوں نے دل میں اس کے لئے دعا کی۔

یہ حقیقت تھی کہ وہ اس کے لئے فکر مند رہتی تھیں۔وہ بڑی خوبیوں، بڑے ہنر والی تھی۔لیکن شکل وصورت کے اعتبار سے بہ مشکل اسے گوارا ہی کہا جا سکتا تھا۔اب انہیں لڑکیوں کی شادی کی فکر بھی تھی۔ملک کے حالات ایسے تھے کہ آنے والی کل کا بھی کچھ پتا نہیں تھا۔شہر میں کشیدگی تھی۔مسلمانوں کے چھرا گھونپنے کی وارداتیں عام ہو گئی تھیں۔ایسے میں بیوہ عورت عزت اور آبرو کی طرف سے نہ ڈرے تو کیا کرے۔

ایسا نہیں تھا کہ لڑکیوں کے رشتے آئے ہی نہ ہوں۔حور بانو کے لئے تو اب تک چار پیغام آ چکے تھے۔دو خاندانی اعتبار سے کم تر تھے۔اور دو معاشی مضبوطی سے محروم تھے۔چناں چہ انہوں نے انکار کر دیا تھا۔گلنار کے بھی دو رشتے آئے تھے۔وہ دونوں ہی اچھے تھے۔لیکن سرفراز بیگم نور بانو کے بیٹھے ہوئے اس کی شادی کیسے کر سکتی تھیں۔انہیں تو سب سے بڑھ کر نور بانو کے لئے رشتے کا انتظار تھا۔مگر اس کا کوئی رشتہ نہیں آیا تھا۔

مگر اب جو حالات تھے، ان کے بارے میں سوچ کر وہ پچھتا رہی تھیں۔انہیں احساس ہو رہا تھا کہ انہوں نے انکار کر کے غلطی کی ہے۔کچھ نہیں، دو بیٹیاں تو عزت کے ساتھ اپنے گھر کی ہو جاتیں۔ایک نور بانو ہی تو رہ جاتی۔اب تو وہ تین گنا بوجھ سر پر لئے بیٹھی تھیں۔

باہر کے حالات ایسے تھے کہ وہ مستقل طور پر پریشان رہنے لگی تھیں۔بس اوتار سنگھ کی محبت ان کے لئے بڑا سہارا تھی۔ان کا دل گھبرا جاتا تو وہ اوپر چلی جاتیں۔اس سے بات کرتے ہوئے وہ سب کچھ بھول جاتیں۔بس ایسا لگتا کہ برسوں کا بچھڑا بیٹا انہیں مل گیا ہے۔ان کا سینہ خوشی سے پوری طرح بھر جاتا۔سچ یہ تھا کہ وہ اس کی قربت میں بہت محفوظ ہوتی تھیں۔

انہیں خوشی اس بات کی تھی کہ اوتار سنگھ بھی ان سے بہت محبت کرتا تھا۔وہ ان کا ویسے ہی ادب اور احترام کرتا تھا، جیسے کوئی اچھا بیٹا اپنی ماں کا کرتا ہے۔وہ ان کی ہر بات بہت غور سے سنتا اور اس دوران اس کی نگاہوں میں محبت ہوتی۔

گھر میں صرف سرفراز بیگم ہی ایسی نہیں تھیں، جو پریشان ہوں۔بہادر علی ان سے کہیں زیادہ پریشان تھا۔اس کی وجہ بھی تھی۔اس کا تو باہر آنا جانا رہتا تھا۔صورت حال کی سنگینی کا اسے سب سے بڑھ کر احساس تھا۔اس کی پریشانی کا سرفراز بیگم کو علم نہیں تھا۔کیوں کہ وہ اس کے سامنے نہیں آتی تھیں۔لیکن چھمن بوا کو علم تھا کہ وہ بہت پریشان ہے۔بلکہ وہ تو اس کی پریشانی کا سبب بھی جانتی تھیں۔یہی وجہ تھی کہ وہ خود بھی پریشان رہنے لگی تھیں۔اکیلی بیٹھی ہوتیں تو تشویش بھرے انداز میں بڑبڑاتیں.....اے اللہ، آبرو رکھ لیجیو، بس تیرا ہی آسرا ہے۔

بہادر علی نے از خود انہیں کچھ نہیں بتایا تھا۔مگر وہ جہاں دیدہ تھیں۔بے خبر رہ بھی نہیں سکتی تھیں۔وہ جانتی تھیں کہ بہادر علی حکم کا بندہ ہے۔ہر حکم پر بلا چون وچرا عمل کرتا ہے۔مگر ایک دن انہیں احساس ہوا کہ نہ جانے کب اس میں تبدیلی آ گئی ہے۔

ہوا یوں کہ اس رات انہوں نے بہادر علی سے کہا۔''آدھا سیر دہی لے آؤ''۔

''ابھی شام کو ہی تو میں دہی لایا تھا''۔بہادر علی نے معترضانہ لہجے میں کہا۔

یہ غیر معمولی بات تھی۔بہادر علی کبھی کسی کام میں ہیر پھیر نہیں کرتا تھا۔''تمہیں اس سے کیا''۔چھمن بوا نے تنک کر کہا۔''تم سے جو کہا جائے، وہ کرو''۔

بہادر علی زیر لب کچھ بدبدایا۔چھمن بوا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔''کچھ کہا تم نے؟''انہوں نے تیز لہجے میں کہا۔

''میں یہ کہہ رہا ہوں کہ تم آ کر دروازہ بند کر لو''۔

''پانچ منٹ تو لگیں گے تم کو دہی لانے میں''۔

''دیر بھی لگ سکتی ہے۔تم میرے ساتھ چلو اور دروازہ بند کر لو''۔بہادر علی کے لہجے میں قطعیت تھی۔

چھمن بوا سمجھ گئیں کہ بہادر علی کی بات نہ مانی تو وہ نہیں ہلے گا۔''اچھا چلو''۔انہوں نے غصے سے کہا۔

وہ گئیں اور دروازہ بند کر کے آئیں۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

انہیں اس وقت سچ مچ بہت غصہ آیا، جب دو تین منٹ بعد انہیں اس کی دستک پر دروازہ کھولنے کیلئے جانا پڑا۔ دروازہ کھولنے کے بعد وہ اس پر برسنے ہی والی تھیں کہ اس نے الٹا ان سے باز پرس شروع کر دی۔ ''تم نے دروازہ کھولنے سے پہلے یہ کیوں نہیں پوچھا کہ کون ہے؟''

چھمن بوا نے اسے یوں دیکھا، جیسے ان کے خیال میں وہ پاگل ہو گیا ہو۔ ''کیوں پوچھتی۔ دہی لینے تم ہی گئے تھے نا۔ تو واپس بھی تم ہی آئے ہو گے''۔

''دیکھو..... یہ وقت ایسا نہیں''۔ بہادر علی کا لہجہ نرم ہو گیا۔ ''وقت بہت خراب آ لگا ہے۔ کبھی پوچھے بغیر دروازہ نہ کھولنا''۔

''کیوں بھئی؟''

بہادر علی ایک لمحے کو ہچکچایا۔ پھر بولا۔ ''آج کل چوری کی وارداتیں بہت ہو رہی ہیں''۔

چھمن بوا اس کی لحاتی ہچکچاہٹ دیکھ چکی تھیں۔ انہیں یقین نہیں آیا۔ مگر انہوں نے جرح نہیں کی۔ اس وقت تو انہیں بس دہی کی ضرورت تھی۔

پھر ایک دن ایک بہت غیر معمولی بات ان کے سامنے آئی۔ بہادر علی ڈیوڑھی میں سوتا تھا۔ اس رات چھمن بوا نجانے کسی کام سے ڈیوڑھی میں گئیں۔ بہادر علی بے خبر سو رہا تھا۔ اچانک ان کی نظر بہادر علی کی چارپائی پر پڑی۔ سرہانے کی طرف تکیے کے نیچے لوہے کا ایک بڑا اور بھاری سریا رکھا تھا۔ وہ اتنا بڑا تھا کہ چارپائی کے دونوں طرف نکلا ہوا تھا۔

اس کی کیا ضرورت پڑ گی بہادر علی کو۔ انہوں نے سوچا اور وہ بھی سوتے وقت۔ جبکہ یہ گھوڑے بیچ کر سوتا ہے۔

چند لمحے وہ اچھنبے میں رہیں۔ مگر پھر ان کے دل نے کہا کہ یہ بات بے سبب تو نہیں ہو سکتی۔

وہ جس چیز کی تلاش میں آئی تھیں، اندھیرے کی وجہ سے اس کا ملنا آسان نہیں تھا۔ روشنی وہ کرنا نہیں چاہتی تھیں کہ بہادر علی کی نیند خراب نہ ہو، حالاں کہ انہیں پورا یقین تھا کہ روشنی سے بہادر علی کی آنکھ نہیں کھلے گی۔ وہ ایسا ہی بے خبر سوتا تھا۔

ذرا دیر میں ان کی نگاہ اندھیرے سے ہم آہنگ ہو گئی۔ وہ ٹٹولتی ہوئی آگے بڑھیں۔ بہادر علی کی چارپائی کے پاس سے گزرتے ہوئے ان کا پاؤں کسی چیز میں الجھا اور وہ لڑکھڑا گئیں۔ وہ بہادر علی کا سلیپر تھا۔ ان کی چپل سلیپر میں پھنس گئی تھی، سلیپر گھسٹنے کی ہلکی سی آواز ہوئی۔ انہوں نے بڑی مشکل سے اپنے آگے کی طرف گرتے ہوئے جسم کو روکا اور سنبھلنے کی کوشش کی۔

وہ سنبھل تو گئیں۔ مگر اگلے ہی لمحے انہیں جو جھٹکا لگا، وہ ذہنی تھا۔ گہری بے ہوشی جیسی نیند سونے والا بہادر علی سلیپر گھسٹنے کی ہلکی سی آواز سے ہڑبڑا کر اٹھا، اس نے جھپٹ کر سرہانے رکھا سریا اٹھایا اور للکار کر بولا۔ ''کون ہے؟ جہاں ہو، وہیں رک جاؤ''۔

چھمن بوا اپنی جگہ بت بن کر رہ گئیں۔ انہوں نے دیکھا کہ بہادر علی کی آنکھیں ٹھیک سے کھلی بھی نہیں ہیں۔ مگر اس نے سریا اٹھا لیا ہے اور اسے سر سے اوپر بلند کر رہا ہے۔

''بہادر علی..... یہ کیا کر رہے ہو بہادر علی''۔ انہوں نے گھبرا کر کہا۔ انہیں ڈر تھا کہ وہ اپنی بات پوری نہیں کر سکیں گی اور سریا ان کے سر سے ٹکرا چکا ہو گا۔

مگر ان کی آواز سے بہادر علی کو جھٹکا لگا۔ پہلے تو کسی اضطراری عمل کے تحت اس کے سریے والے ہاتھ ساکت ہو گئے۔ پھر اس کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ اس نے چھمن بوا کو حیرت سے دیکھا۔ پھر گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ ''ارے چھمن بوا..... تم یہاں کیا کر رہی ہو اس وقت''۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

چھمن بوا کا پورا جسم لرز رہا تھا۔ انہیں احساس تھا کہ وہ بال بال بچی ہیں۔ غنیمت ہے کہ ان کی زبان کھل گئی۔ ورنہ اگلے ہی لمحے سر کھل جاتا اور زبان ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتی۔ ان سے بولا تو کچھ نہیں گیا، بس وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتی رہیں۔

''میں نے پوچھا، تم یہاں کیا کر رہی ہو اس وقت؟''

''کچھ ڈھونڈنے آئی تھی۔ کیا ڈھونڈنے آئی تھی، یہ اب یاد نہیں، مگر یہ کیا حرکت ہے، تم نے تو مجھے مار ہی دیا ہوتا''۔

''کون سی حرکت؟ کیا کہہ رہی ہو؟'' بہادر علی نے حیرت سے پوچھا۔

''تمہیں نہیں معلوم، حالاں کہ اب بھی سریا سر سے اوپر اٹھائے کھڑے ہو''۔

بہادر علی کو اس بات کا احساس ہوا تو وہ کھسیا گیا۔

''اب تو خدا کے لئے اسے رکھ دو، میں تو مچل رہی ہوں''۔

بہادر علی کے سریا اٹھائے ہوئے ہاتھ نیچے آئے۔ اس نے سریا دوبارہ سرہانے رکھ دیا۔ ''بس اب تم جاؤ۔ مجھے سونا ہے''۔ اس نے چھمن بوا سے کہا۔

''ایسے کیسے سونا ہے۔ میری تو نیند اڑا دی تم نے''۔ چھمن بوا نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر چیلنج کرنے والے انداز میں کہا۔

''کیا کہہ رہی ہو؟''

''مجھے بتاؤ، بات کیا ہے، تمہیں ہو کیا گیا ہے''۔

''مجھے تو کچھ نہیں ہوا''۔

''یہ سریا سرہانے رکھ کر کیوں سونے لگے ہو تم اور یہ معمولی سی آہٹ پر چونک کر اٹھتے ہو اور حملہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہو، ایسا کون سا خطرہ لاحق ہو گیا ہے تمہیں؟''

بہادر علی گڑبڑا گیا۔ ''خوف؟ کیسا خوف! ایسی تو کوئی بات نہیں''

''تو پھر یہ سریا سرہانے کیوں؟ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا''۔

''ارے وہ..... وہ میں نے بتایا تھا نا کہ آج کل چوریاں بہت ہو رہی ہیں''۔ بہادر علی کے لہجے میں بے پروائی در آئی۔

چھمن بوا نے اسے کڑی نظروں سے دیکھا۔ ''تم جھوٹ بولتے ہوئے اچھے نہیں لگتے، بس سچ اگل دو''۔

''سچ وہی ہے، جو میں نے بتایا''۔

''تم مجھے جانتے ہو، اب تمہاری جان نہیں چھوٹے گی''۔

بہادر علی کا جسم ڈھیلا پڑ گیا، کندھے جھک گئے، وہ جانتا تھا کہ اب جان واقعی نہیں چھوٹے گی۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، بتاتا ہوں، مگر گھر میں کسی کو پتا نہ چلے''۔

''اے ہے، ایسی کیا بات ہے، تم تو ہولائے دے رہے ہو مجھے''

''بات یہ ہے چھمن کو ہندو مسلم فساد کا خطرہ ہے۔ رات کے وقت مسلمان راہ گیر نظر آ جائے تو ہندو چھرا گھونپ دیتے ہیں.....''

''تو اس لئے تم اس دن دہی لانے سے گھبرا رہے تھے''۔ چھمن بوا نے طنز کیا۔

''بکو مت۔ مجھے اپنی جان کی پروا نہیں۔ موت جب آنی ہے تو آئے گی''۔ بہادر علی نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم میری بات سن لو۔ میں باہر آتا جاتا ہوں، مجھے معلوم ہے کہ شہر میں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ ابھی تک تو ایسا نہیں ہوا ہے لیکن ہندوؤں کے عزائم ہیں کہ مسلمانوں کے گھروں پر منظم حملے کئے جائیں۔ ان کے گھر لوٹے جائیں اور انہیں ختم کر دیا جائے۔ اس لئے میں محتاط رہتا ہوں۔ بہت بھاری ذمے داری ہے مجھ پر۔ دیکھو نا، جوان بچیوں کا ساتھ ہے''۔

''ہاں، یہ تو ہے''۔ چھمن بوا نے پرتشویش لہجے میں کہا۔ ''مگر گھر کے لوگوں کو بے خبر تو نہیں ہونا چاہئے''۔

''بتانے کا کچھ فائدہ نہیں۔ اس کے سوا کیا ہو گا کہ سب پریشان ہو جائیں گے۔ رہی بات بڑی بیگم کی تو وہ بے خبر نہیں ہوں گی''۔

''ہاں۔ پریشان تو وہ رہتی ہیں آج کل۔ لیکن کبھی کوئی بات نہیں کی''

''بس اب تم جاؤ مجھے سونے دو''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

بس اس دن سے چھمن بوا کو بھی فکر رہنے لگی۔ بیٹھے بیٹھے وہ ہولنے لگتیں۔ گلی میں پتنگ لوٹنے والوں کا شور ہوتا تو وہ ڈر جاتیں۔ معمول کے مطابق گزرنے والے روز وشب ان کے لئے سخت ہو گئے۔

.....X.....

اوتار سنگھ کے لئے کاڑھا جانے والا کرتا مکمل کر کے حور بانو کو جو خوشی ہوئی تھی، وہ اس کا اظہار نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ خود اوپر جاتی اور اوتار سنگھ کو وہ کرتا دے دیتی۔ لیکن یہ تو کسی بھی طرح اور کبھی بھی ممکن نہیں تھا۔

چھوٹے ٹھاکر کے معاملے میں تو شروع ہی سے یہ ہو رہا تھا کہ وہ جو چاہتی، اسے معلوم ہوتا کہ وہ ناممکن ہے۔ محبت تو اسے بے اختیار اور بے ارادہ ہوئی تھی۔ بلکہ اس نے اس کے خلاف بساط بھر مزاحمت بھی کی تھی۔ مگر وہ ہار گئی تھی اور اس محبت کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بعد اس کے اندر دو عادتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ ایک تو وہ تاویلیں تلاش کرنے لگی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک مشرک سے محبت وہ گوارا نہیں کر سکتی تھی اور ترک محبت بھی اس کے بس میں نہیں تھی۔ خوش قسمتی سے اس کی تاویلوں کو جواز بھی میسر آ گیا تھا۔ ایسی باتیں سامنے آئیں کہ صاف لگتا تھا کہ چھوٹا ٹھاکر مشرک نہیں ہے۔ پھر یہ ہوا کہ اسے اپنی تاویلوں پر پختہ یقین ہو گیا۔

دوسری عادت یہ تھی کہ جو اس کا دل چاہتا اور وہ ممکن نہ ہوتا تو وہ اس کا تصور کر لیتی اور وہ تصور اتنا جان دار اور حقیقت سے اتنا قریب ہوتا تھا کہ اس سے اسے حقیقی تسکین حاصل ہوتی تھی۔

وہ دن بہت خوب صورت تھے اور اسے بہت یاد آتے تھے، جب چھوٹا ٹھاکر شام کو کوٹھے پر بیٹھتا تھا اور وہ بہانوں سے جا جا کر چھپ چھپ کے اسے دیکھ لیا کرتی تھی۔ مگر پھر استانی جی آنے لگی تو وہ سلسلہ رک گیا اور ایک دن استانی جی نے چھٹی کی تو اسے پتہ چلا کہ چھوٹا ٹھاکر اپنا وہ معمول ترک کر چکا ہے۔ اس کے بعد بھی اس نے کئی بار موقع نکال کر دیکھا لیکن ثابت ہو گیا کہ چھوٹا ٹھاکر اب کوٹھے پر نہیں آتا ہے۔ وہ اس کے لئے بہت بڑی محرومی تھی اسے پھر تصور کا سہارا لینا پڑا۔ ابتدا میں تو بڑی بے کیفی ہوئی کیوں کہ وہ اسے دیکھنے کی عادی ہو چکی تھی، مگر چند روز بعد رنگ دوبارہ جم گیا بلکہ اسے احساس ہوا کہ براہ راست دیکھنے کے مقابلے میں تصور میں زیادہ گنجائش ہے۔ تصور حقیقت کی طرح محدود جو نہیں ہوتا۔

تو اب کرتے کے معاملے میں بھی یہی ہوا۔ اس کے تصور کو موقع مل گیا۔ اس کے تصور کو گویا ایک کھلونا ہاتھ آ گیا۔ اور اس کے لئے عرصہ بھی کافی تھا۔ اماں ابھی کڑھائی کر رہی تھیں۔ گرمیوں کی آمد میں بھی ابھی کافی دن تھے۔

حور بانو کی محبت تمام نشیب و فراز دیکھ چکی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ ہر روز چھوٹے ٹھاکر کو دیکھا کرتی تھی۔ مگر اب بہت عرصے سے یہ سلسلہ موقوف تھا۔ محبت کمزور ہو یا سطحی ہو تو ایسے عرصے میں ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن حور بانو کی محبت کم نہیں ہوتی۔ بلکہ اور بڑھ گئی۔ دوسری طرف بغیر کسی وجہ کے اسے یہ یقین بھی تھا کہ قرآن سنتے سنتے چھوٹا ٹھاکر کسی دن اچانک ایمان لے آئے گا۔ مسلمان ہو جائے گا۔

سب کچھ وہ سوچتی رہتی تھی۔ کسی سے کہہ نہیں سکتی تھی۔ اس بات نے اسے اور تصوراتی بنا دیا تھا۔ ہر بات..... ہر کام وہ تصور میں کر لیتی تھی۔

اس کرتے کو کاڑھنے میں اسے بہت زیادہ وقت لگا تھا۔ اس کی وجہ بھی تھی۔ ورنہ کرتا اس سے آدھے وقت میں مکمل ہو گیا ہوتا۔ ایک تو یہ تھا کہ کرتا وہ اکیلے میں لے کر بیٹھتی تھی۔ ایسا کم ہی ہوا تھا کہ کسی کے ساتھ اس نے کڑھائی کی ہو۔ کرتا کاڑھنا اس کے لئے چھوٹے ٹھاکر سے ملاقات کے مترادف تھا۔ وہ اکیلے میں بیٹھتی۔ ایک ٹانکا لگاتی، پھر بیٹھ کر اسے انگلی سے سہلاتی، اسے تنقیدی نظروں سے دیکھتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ وہ اسے ادھیڑ کر دوبارہ سے لگاتی۔ اور کڑھائی کے دوران وہ کرتے کے کپڑے کو کئی کئی بار نرم ہاتھ سے محبت بھرے انداز میں سہلاتی۔ زیادہ تر یہ عمل غیر شعوری ہوتا تھا۔ لیکن کبھی کبھار اس کے شعور میں یہ خیال آتا کہ وہ کپڑا نہیں، چھوٹے ٹھاکر کا وجود ہے۔ یہ خیال آتے ہی وہ شرم سے دہری ہو جاتی۔ چور نگاہوں سے وہ ادھر ادھر دیکھتی کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ اور وہ کپڑے سے یوں ہاتھ ہٹاتی، جیسے دہکتے ہوئے انگاروں پر ہاتھ پڑ گیا ہو۔

کئی بار اس نے یہ بھی سوچا کہ چھوٹا ٹھاکر تو اس کی محبت سے بے خبر ہے۔ اگر اسے اس کی محبت کا پتا چل جائے تو کیا ہو گا۔ اس خیال کے آگے امکانات کا بہت بڑا میدان تھا۔ اس میدان میں وہ کئی زاویوں سے یہ کھیل کھیلتی۔ کسی Version میں چھوٹا ٹھاکر یہ جان کر خوش ہوتا تو کسی میں اس پر برہمی کا اظہار کرتا۔ کسی میں وہ پریشان ہو کر کہتا..... یہ کیسے ممکن ہے۔ تمہارے اور میرے درمیان مذہب کی اتنی بڑی خلیج ہے کہ جسے پاٹا نہیں جا سکتا۔ اور کبھی وہ اعلان کرتا..... اس وقت میں مسلمان نہیں ہوں تو ہندو بھی نہیں ہوں۔ اور میں اسلام کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ چھوٹے ٹھاکر کے ردعمل کے مطابق اس کی کیفیات ہوتیں۔ کبھی وہ خوش ہوتی، کبھی اداس ہو جاتی اور کبھی پریشان۔ لیکن ہر حال میں اسے لطف آتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک رکی ہوئی کہانی کو آگے بڑھا رہی ہوتی تھی۔

اسے ایک بات پر بڑی حیرت تھی۔ اس نے کرتا مکمل کرنے میں بڑی دیر لگائی تھی۔ لیکن نور بانو کے کرتے کی کڑھائی بھی اس کے ساتھ ہی مکمل ہوئی تھی۔ کیوں؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اس کے حساب سے تو نور بانو کو اتنے عرصے میں دو کرتے مکمل کرنا چاہئے تھے۔ اس نے اتنا سست کام کیوں کیا، اس کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

اس نے سوچا، بیگار سمجھ کے کر رہی تھی نا، اس لئے دیر لگی ہو گی۔ مگر اسی لمحے اس کے کانوں میں نور بانو کے الفاظ گونجے..... کام تو میں نے محبت سے ہی کیا ہے۔ کام محبت سے کیا جائے تو عبادت ہی ہوتا ہے نا اماں۔

حور بانو نے سر جھٹک دیا۔ یہ معما اس کی سمجھ میں آنے والا نہیں تھا۔

.....X.....

''تمہارے ماسٹر جی کا کیا حال ہے بیٹے؟''۔ سرفراز بیگم نے پوچھا۔

''بس ٹھیک ہیں ماں جی۔ پہلے سے تو بہت بہتر ہیں''۔ اوتار سنگھ نے جواب دیا۔

''تمہاری بات سے تو لگتا ہے کہ ان کی حالت اچھی نہیں ہے''۔

اوتار سنگھ نے نظریں جھکا لیں۔ چند لمحے وہ خاموش رہا۔ پھر بولا تو اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔ ''ڈاکٹروں کا کہنا ہے ماں جی کہ مرض بہت بڑھ چکا ہے۔ یہ بھی میری کوتاہی ہے۔ مجھے پہلے خیال آ جاتا تو شاید یہ صورت حال نہ ہوتی''۔

سرفراز بیگم نے اسے محبت بھری نظروں سے دیکھا اور بناوٹی خفگی سے بولیں۔ ''تم ہر الزام اپنے سر لینے کی کوشش کیوں کرتے ہو۔ تمہارے ماسٹر جی تم سے زیادہ اپنے بیٹوں کی ذمے داری تھے''۔

''اپنی ذمے داری وہ جانیں ماں جی۔ مجھے تو اپنی فکر کرنی چاہئے نا۔ کوتاہی تو مجھ سے ہوئی۔ مجھے فوراً ان کا خیال آ جاتا تو مرض اتنا بڑھنے سے پہلے میں انہیں سینی ٹوریم لے جا سکتا تھا''۔

''یہ بھی تو سوچو کہ اگر تمہیں مزید کچھ دن ان کا خیال نہ آتا تو کیا ہوتا؟''۔

اوتار سنگھ نے انہیں زخمی نگاہوں سے دیکھا۔ لیکن کہا کچھ نہیں۔

''زندگی اور موت صرف اللہ کے اختیار میں ہے''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

سرفراز بیگم نے وضاحت کی۔ پھر انہوں نے موضوع بدلا۔ ''ابھی بڑے دن کے موقعے پر تم کئی دن ان کے پاس رہ کر آئے ہونا''۔

اوتار سنگھ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''جی ماں جی۔ اور ماسٹر جی بہت خوش ہوئے''۔

''یہ بتاؤ، ان کے بیٹے بھی کبھی ان سے ملنے جاتے ہیں؟''۔

''اپنے اپنے روزگار میں الجھے ہوئے ہیں..... مصروف ہیں وہ''۔ اوتار سنگھ نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن شاید اگلے مہینے ان کا چھوٹا بیٹا میرے ساتھ جائے''۔

''زندگی کی مصروفیات تو چلتی رہتی ہیں بیٹے۔ لیکن بیمار باپ کی خدمت اور عیادت کیلئے کوئی عذر نہیں چلتا۔ اور جب انہوں نے بیمار باپ کو اچھوت بنا کر کوٹھری میں ڈال رکھا تھا، تب کون سی مجبوری تھی انہیں۔ وہ ان کے مرنے کا ہی انتظار تو کر رہے تھے''۔

اوتار سنگھ نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ''آپ..... آپ کو یہ سب کچھ کیسے معلوم ہے؟''۔

''رنجنا نے بتایا تھا مجھے''۔

''مگر میں پھر کہوں گا ماں جی کہ ان کے بیٹوں کی غیر ذمہ داری میری کوتاہی کا جواز نہیں ہے۔ مجھے ان سے کیا۔ میں تو اپنی کوتاہی پر کڑھتا ہوں''۔

''اور میں تمہیں یہ سمجھا رہی ہوں کہ اپنے ضمیر پر بلاوجہ بوجھ لینا اچھا نہیں ہوتا۔ اس سے آدمی کمزور ہو جاتا ہے۔ اللہ کی مرضی کو بھی سامنے رکھنا چاہئے''۔

اوتار سنگھ کو مسلمانوں کی یہ بات بہت اچھی لگتی تھی۔ اسے مولوی صاحب کی موت پر ان کے بیٹے اور بیوی کا ردعمل بھی یاد تھا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ماں جی'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''زندگی اللہ کی امانت ہوتی ہے، وہ جب چاہے واپس لے لے۔ اس میں شکایت کیسی''۔ سرفراز بیگم نے سرد آہ بھر کے کہا۔ ''حالانکہ کسی آدمی کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا۔ کوئی آدمی سائبان کی طرح ہوتا ہے۔ چلا جائے تو غیر محفوظ ہو جانے کا احساس پیچھے رہنے والوں کو ہمیشہ ستاتا ہے''۔

ان کے لہجے میں عجیب سا دکھ تھا۔ اوتار سنگھ پچھلے کچھ دنوں سے محسوس کر رہا تھا کہ وہ پریشان رہنے لگی ہیں۔ یہ بات نہیں کہ وہ پریشانی ظاہر کرتی ہوں بلکہ وہ آتیں تو ہمیشہ اس کی دل جوئی کرتیں، اس کی فکر کرتیں۔ لیکن اسے محسوس ہوتا تھا کہ وہ اندر ہی اندر پریشان ہیں۔ کوئی فکر انہیں ستا رہی ہے۔

اس وقت اسے موقع مل گیا۔ ''ماں جی..... آپ پریشان کیوں رہتی ہیں آج کل؟''۔ اس نے پوچھا۔

''کون، میں؟ نہیں تو۔ ایسی تو کوئی بات نہیں''۔ سرفراز بیگم نے جلدی سے کہا۔

''میں تو کئی دن سے یہ بات محسوس کر رہا ہوں۔ آپ کو خود ہی بتا دینا چاہئے تھا۔ لیکن شاید آپ بس زبان سے مجھے بیٹا کہتی ہیں، سمجھتی نہیں''۔

''ایسی کوئی پریشانی تو نہیں''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''مطلب یہ کہ کچھ تو ہے۔تو کیا چھوٹی پریشانی بیٹوں کو نہیں بتائی جاتی؟''۔اوتار سنگھ کے لہجے میں شکایت تھی۔

''ایسا کچھ ہے ہی نہیں''۔سرفراز بیگم نے کہا۔''تم تو بات پکڑ رہے ہو''۔

''نہیں ماں جی۔سچ یہ ہے کہ آپ مجھے بتانا نہیں چاہتیں۔ورنہ پریشان تو آپ ہیں۔اس سے میں یہی سمجھوں گا کہ آپ مجھے بیٹا نہیں سمجھتیں''۔

سرفراز بیگم کے سینے میں کچھ پگھلنے لگا۔''پریشان تو میں ہوں۔مگر تمہیں پریشان کرنے کا کیا فائدہ۔جو مدد کرنے والا ہے،اس سے چپکے چپکے مدد مانگ لیتی ہوں''۔

اوتار سنگھ سمجھ گیا کہ ان کا اشارہ اللہ کی طرف ہے۔''لیکن ماں جی،جوان بیٹے اسی لئے تو ہوتے ہیں کہ اپنی پریشانی انہیں سونپ دی جائے اور وہ اسے دور کرنے کی کوشش کریں۔مسئلے کا کوئی حل نکالیں''۔

''اب اتنے بڑے بھی نہیں ہو تم''۔سرفراز بیگم نے معاملے کی سنگینی کم کرنے کے لئے ذرا شگفتگی سے کہا۔

''عمر سے کچھ نہیں ہوتا ماں جی۔میں تو ماں،باپ..... بہت کچھ کھو چکا ہوں۔میں چھوٹا نہیں ہوں ماں جی۔آپ بتائیں،کیا پریشانی ہے آپ کی؟''۔

''کیا کہوں بیٹا۔بس یہ خیال آتا ہے کہ گلنار کے ابا ہوتے تو ڈھارس رہتی''۔سرفراز بیگم کی آواز بھرا گئی۔

''آپ خود ہی کہتی ہیں کہ زندگی اور موت اللہ کے اختیار میں ہے۔اور پھر جوان بیٹا تو ہے نا۔آپ بات تو بتائیں''۔

''بس بیٹا،یہ ملکی حالات سے ڈر لگنے لگا ہے۔شہر کے حالات بھی اچھے نہیں ہیں۔اور یہ موئی دلی تو ہر دور میں اجڑتی رہی ہے۔اب دیکھ لو،ہر روز چار چھ مسلمانوں کے چھرا گھونپ دیا جاتا ہے۔اب تو اخبار پڑھنا بھی چھوڑ دیا میں نے۔بہت گھبراہٹ ہوتی تھی''۔

''آپ پریشان نہ ہوں ماں جی۔آپ تو گھر میں محفوظ ہیں نا''۔

''نہیں بیٹے۔میں جانتی ہوں۔یہ آگ ابھی اور بھڑکے گی۔اللہ محفوظ رکھے۔نجانے کتنے گھر جلیں گے اس آگ میں۔میں نے سنا ہے..... منظم حملوں کا ارادہ بھی ہے متعصب ہندوؤں کا۔میرے ساتھ جوان بیٹیاں ہیں۔ہر وقت ڈرتی رہتی ہوں میں''۔ان کی آنکھیں بھیگ گئیں اور آواز لرزنے لگی۔

اوتار سنگھ دہل کر رہ گیا۔وہ تو باہر جاتا تھا۔حالات سے بہت زیادہ واقف تھا۔اس کے باوجود اس نے اس بارے میں کچھ نہیں سوچا۔ماں جی نجانے کب سے عدم تحفظ کے احساس میں،اس خوف میں گرفتار تھیں۔اس نے کبھی ان کی ڈھارس نہیں بندھائی،ان کی دل جوئی نہیں کی۔اس نے بیٹا ہونے کا حق بالکل ادا نہیں کیا۔وہ کتنا غیر ذمہ دار ہو گیا ہے۔اپنے سوا کسی کا ہوش نہیں ہے اسے۔کیا وہ خود غرض ہو گیا ہے۔وہ ایسا شرمندہ ہوا کہ جی چاہتا تھا،زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

وہ اٹھا اور سرفراز بیگم کے قدموں میں بیٹھ گیا۔اس نے ان کے دونوں ہاتھ محبت سے تھام لئے۔''میں بہت شرمندہ ہوں ماں جی۔میں الٹا آپ سے شکایت کر رہا تھا کہ آپ مجھے بیٹا نہیں سمجھتیں۔مجھے اپنی پریشانی نہیں بتاتیں۔حالانکہ اس پر تو مجھے خود سوچنا چاہئے تھا۔مجھے خود آپ سے بات کرنی چاہئے تھی۔میں بہت شرمندہ ہوں ماں جی۔آپ مجھے معاف کر دیں''۔

سرفراز بیگم تو ہکا بکا رہ گئیں۔''ارے نہیں بیٹے.....اس میں تمہارا کیا قصور ہے''۔وہ دل میں سوچ رہی تھیں کہ یہ کیسا لڑکا ہے۔ہر بات کو اپنی ذمے داری سمجھتا ہے اور

پھر خود کو غیر ذمے دار سمجھ کر خود ملامتی میں مبتلا ہوتا ہے۔ شرمندہ ہوتا ہے اور تلافی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

پھر اوتار سنگھ نے ایسی بات کہی کہ سرفراز بیگم ہل کر رہ گئیں۔ ''دیکھیں ماں جی، بظاہر تو میں ہندو ہوں اور آپ کا بیٹا بھی ہوں۔ اب یہ تو مجھے معلوم ہے کہ میں ہندو نہیں۔ میں تو کچھ بھی نہیں۔ میں تو منزل کی تلاش میں بھٹکتا ہوا ایک راہی ہوں۔ مگر میرا بظاہر ہندو ہونا یہاں فائدہ مند ہے۔ میرے ہوتے ہوئے کوئی آپ کے گھر کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ آپ آج کے بعد اس طرف سے بالکل پریشان نہ ہوں''۔

''مگر بیٹا، تم خود اکیلے.....''۔

''آپ مجھے نہیں جانتیں ماں جی۔ چاچا جمال دین نے مجھے لٹھیا چلانا سکھایا تھا۔ بیس تیس کے لئے تو میں اکیلا ہی کافی ہوں''۔ اوتار سنگھ نے کہا اور پھر عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ ''اور ویسے بھی ہندو کسی ہندو پر تو ہاتھ نہیں اٹھائیں گے''۔

''ٹھیک ہے بیٹا۔ تم واقعی سچے بیٹے ہو''۔

اوتار سنگھ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ ان کے چہرے پر اسے مکمل اطمینان نظر نہیں آیا۔ ''آپ مطمئن نہیں ہوئیں ماں جی۔ مگر یقین کریں، میرے جیتے جی کوئی آپ کی دہلیز نہیں پھلانگ سکتا۔ کوئی آپ کی عزت کو میلی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔ مجھ پر بھروسہ کریں ماں جی۔ میں ہوں نا''۔

سرفراز بیگم نے اس کے دونوں ہاتھ اٹھائے اور انہیں لبوں سے لگا لیا۔ ''میں مطمئن ہو گئی بیٹا۔ جوان بیٹے کے ہوتے ہوئے ماں پریشان کیسے ہو سکتی ہے''۔

اوتار سنگھ مسکرایا۔ ''اور آپ نے مجھے معاف بھی کر دیا نا؟''۔

''کس بات پر؟''۔

''میری بے خبری پر..... میری غیر ذمے داری پر''۔

سرفراز بیگم ہنس دیں۔ ''اگر تم غیر ذمے دار ہو تو سب کو ایسا ہی غیر ذمے دار ہونا چاہئے''۔

''نہیں ماں جی۔ آپ معاف نہیں کریں گی تو میری تسلی نہیں ہوگی''۔

''اچھا بیٹے..... معاف کیا''۔

اوتار سنگھ کی کہی ہوئی وہ بات سرفراز بیگم کبھی نہیں بھولیں کہ وہ ہندو نہیں ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ منزل کی تلاش میں بھٹکتا ہوا راہی ہے۔ اس دن کے بعد مرتے دم تک وہ اس کے لئے ہر نماز میں دعا کرتی رہیں..... اے اللہ، اپنے اس بندے کو صراط مستقیم پر لے جائیے۔ اے اللہ اسے اپنا راستہ دکھا دیجئے۔ اے اللہ، اس میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو اہل ایمان میں ہوتی ہیں۔ اسے ایمان سے نواز دیجئے اے اللہ.....

.....x.....

اس دن کے بعد اوتار سنگھ کو بے کلی لگ گئی۔ اس نے سرفراز بیگم سے جو کچھ کہا تھا، صرف زبانی نہیں تھا۔ وہ اس نے پوری سچائی سے کہا تھا اور اس پر عمل کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس دن سے اس نے وہ ذمے داری قبول کر لی۔

اس کے نتیجے میں اسکے معمولات بدل گئے۔ وہ جلدی سونے کا عادی تھا۔ لیکن پہلی ہی رات کھانا کھانے کے بعد وہ کوٹھے پر چلا گیا۔ کتاب لے جانے کا اس نے تکلف نہیں کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ پڑھ نہیں سکے گا۔

رات دس بجے کے بعد سناٹا ہو جاتا تھا۔ وہ دس بجے سو جاتا تھا۔ مگر اس رات وہ جاگ رہا تھا۔ کرسی پر بیٹھا وہ آسمان کو تکتا رہا۔ بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو ٹہلنے لگا۔ بار بار جا کر وہ گلی میں جھانکتا، مکان کے صدر دروازے کو دیکھتا۔ کوٹھے پر اس نے دانستہ روشنی کی تھی۔ تاکہ کوئی حملہ آور اس طرف آئے تو سمجھ لے کہ وہاں لوگ جاگ رہے ہیں۔

دو بجتے بجتے وہاں کافی سردی ہو گئی۔ وہ کوئی چادر یا شال بھی نہیں لایا تھا۔ سردی سے اس پر کپکپی چڑھنے لگی۔ ڈھائی بجے کے قریب وہ نیچے آ گیا۔ اسکے خیال میں اب

اردو فینز ڈاٹ کام

خطرے کا وقت نہیں تھا۔

وہ بستر پر لیٹا اور رضائی اوڑھ لی۔ جسم کو گرمی ملی تو اس کی آنکھیں مندنے لگیں۔ اصولاً اسے گہری نیند سو جانا چاہئے تھا۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔ نیند کے عالم میں اسے خیال آیا کہ اگر اس وقت حملہ ہو جائے تو اسے تو پتا بھی نہیں چلے گا۔ اس کی نیند اچٹ گئی۔ اس سے اٹھا بھی نہیں گیا اور وہ ٹھیک سے سو بھی نہیں سکا۔

اس کے بعد تو یہ معمول ہو گیا۔ رنجنا پہلی رات تو بے خبر رہی۔ لیکن دوسری رات اسے پتا چل گیا۔ وہ اور رگھو اسے بلانے کے لئے اوپر آئے۔ لیکن اس نے سختی سے انہیں منع کر دیا۔ وہ دونوں اس کی بے چینی اور اضطراب دیکھتے رہے۔ رنجنا کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ لیکن رگھو سمجھ گیا تھا۔

''تم لوگ سو جاؤ جا کر''۔ اوتار سنگھ نے ان سے کہا۔

''لیکن مالک آپ.....؟''۔

''مجھے نیند نہیں آ رہی ہے''۔

''تو آپ نیچے چلیں۔ میں سر میں تیل لگا دوں گی۔ نیند آ جائے گی''۔

''مگر مجھے سونا نہیں ہے''۔ یہ کہتے ہوئے اوتار سنگھ کو خیال آیا کہ کتاب اوپر لانا ضروری ہے۔ ''مجھے پڑھائی کرنی ہے۔ چلو..... کتابیں تو لے آؤں''۔

وہ نیچے آیا اور اپنی کتابیں اٹھائیں۔ پھر ان لوگوں کو سو جانے کی تاکید کر کے وہ اوپر چلا گیا۔

رنجنا نے رگھو کو مستفسرانہ نگاہوں سے دیکھا۔ ''کیا ہو گیا ہے چھوٹے ٹھاکر کو؟''۔

''وہ پریشان ہیں''۔ رگھو نے کہا۔

''یہ کیسی پریشانی ہے کہ رات بھر چھت پر ٹہلتے رہیں''۔

''فسادات کا خطرہ ہے نا۔ وہ نیچے والوں کی حفاظت کے خیال سے جاگتے ہیں''۔

''ہائے رام''۔ رنجنا کا ہاتھ سینے پر پہنچ گیا۔ ''تو کیا گھر پر بھی حملہ ہو سکتا ہے''۔

''ہاں۔ ابھی تو منصوبے بن رہے ہیں۔ پر نتو یہ ہو کر رہے گا''۔

رنجنا پریشان ہو گئی۔ ''تو چھوٹے ٹھاکر کیا کر سکتے ہیں؟''۔

''جو کر سکتے ہیں، اوش کریں گے۔ راج پوت ہیں وہ۔ جان پر کھیل جائیں گے سب کی حفاظت کے لئے''۔

رنجنا اور متوحش ہو گئی۔ ''ہے بھگوان۔ اب کیا ہو گا؟''۔

''تو چنتا نہ کر۔ جا کے سو جا''۔

''اور تم؟''۔

''میں تو جاگوں گا۔ مالک جاگے اور میں سوؤں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''تو میں بھی کیسے سو سکتی ہوں''۔

وہ دونوں بھی جاگتے رہے۔ اوتار سنگھ نیچے آ کر سونے کے لئے لیٹا تو وہ دونوں بھی سوئے۔

ایک ہفتہ گزرا تو وہ معمول اوتار سنگھ کی صحت پر اثر انداز ہونے لگا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے پڑ گئے۔ آنکھیں ہر وقت متورم رہنے لگیں۔ رنگت بھی سنولانے لگی۔ اسے یہ احساس بھی ستا رہا تھا کہ اس کی ذہنی صلاحیتیں ماند پڑنے لگی ہیں۔

ایسے میں ایک دن سرفراز بیگم نے اسے دیکھا تو دھک سے رہ گئیں۔ ''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے بیٹے؟''۔

''جی ماں جی۔ میں بالکل ٹھیک ہوں''۔

''مگر تمہاری حالت تو کچھ اور بتا رہی ہے۔ آنکھوں کے نیچے حلقے.....جھلسی ہوئی رنگت.....''۔

''کچھ نہیں ماں جی۔ نیند پوری نہیں ہو رہی ہے نا۔ آج کل پڑھائی کا زور ہے''۔

''مگر اتنا نہ کرو کہ صحت متاثر ہونے لگے''۔

رنجنا پہلے سے اس کی یہ حالت دیکھ کر کڑھ رہی تھی۔ لیکن کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ سرفراز بیگم کی بات سننے کے بعد اس سے رہا نہیں گیا۔ ان کے جانے کے بعد اس نے اوتار سنگھ سے کہا۔ ''ایک بنتی کروں مالک؟''۔

''ہاں رنجنا، کہو''۔

''جب تک پڑھائی کا زور ہے، آپ دن میں دو گھنٹے سو لیا کریں''۔

اوتار سنگھ کے دل کو یہ بات لگی۔ مسئلہ یہ تھا کہ اسے دن میں نیند نہیں آتی تھی۔ مگر اس نے سوچا، کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ اگلے دن کالج سے واپس آ کر اس نے کھانا کھایا۔ نیند پوری نہ ہونے کے نتیجے میں اس کی بھوک بھی کم ہو گئی تھی۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

کھانا کھا کر وہ لیٹا تو اسے لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ اور وہ دو گھنٹے کا ارادہ کر کے لیٹا تھا۔ ٹھیک دو گھنٹے بعد آپ ہی اس کی آنکھ کھل گئی۔

یوں یہ دوپہر کی نیند بھی اس کے معمولات میں شامل ہو گئی۔

ایک رات وہ کوٹھے پر ٹہلتے ٹہلتے تھک کر کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ نیچے سے دروازے کی چرچراہٹ سنائی دی۔ وہ لپک کر اٹھا، اپنی لاٹھی اٹھائی اور تیزی سے لپکا۔ اس نے جھانک کر دیکھا۔ صدر دروازہ کھلا ہوا تھا۔ لیکن کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ''کون ہے؟''۔ اس نے للکار کر کہا۔

جواب نہیں ملا تو وہ پھر چلایا۔ رات کے سناٹے میں اپنی آواز اسے بہت بلند آہنگ لگی۔ وہ نیچے اترنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ جواب مل گیا۔

''میں ہوں بہادر علی چھوٹے ٹھاکر''۔ اس کے ساتھ ہی بہادر علی کی صورت نظر آئی۔

''اتنی رات کو ایسے دروازہ نہ کھولا کریں آپ''۔ اوتار سنگھ نے سخت لہجے میں کہا۔

بہادر علی نے اس کے لہجے پر چونک کر اوپر دیکھا تو اس کے ہاتھ میں لاٹھی نظر آئی۔ ''اتفاق سے کھولنا پڑ گیا۔ ورنہ میں خود بڑی احتیاط کرتا ہوں''۔ انہوں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن تم اوپر کیا کر رہے ہو چھوٹے ٹھاکر''۔

''میں پڑھ رہا ہوں''۔ اوتار سنگھ نے کہا اور پیچھے ہٹ آیا۔

نیچے بہادر علی نے دروازہ بند کیا۔ اسے بڑی تقویت کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اب وہ اکیلا نہیں۔ ان کا ہندو کرائے دار بھی ان کے تحفظ کی فکر کرتا ہے..... راتوں کو جاگتا ہے۔ اس کا بوجھل پن کافی حد تک کم ہو گیا۔

دو بجے کے بعد اوتار سنگھ نیچے چلا آیا۔ صبح اسے ماسٹر جی سے ملنے کے لئے جانا تھا۔

یہ ماسٹر جی والا معمول اب اس کے لئے کشمکش کا باعث ہو گیا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ ماسٹر جی بھی اس کی ذمے داری تھے اور دوسری طرف اس گھر کا تحفظ بھی اس کی ذمے داری تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ماسٹر جی کے پاس نہ جائے۔ اور وہ وہاں جانے کے لئے نکلتا تو اسے یہ فکر رہتی کہ گھر کو بے آسرا چھوڑ کر جا رہا ہے۔ وہاں وہ ایک رات ہوٹل میں گزارتا۔ مگر اس کا دل گھر میں اٹکا رہتا۔ اس سے سویا ہی نہ جاتا۔ ہر پل وہ وسوسوں میں گھرا رہتا۔ کہیں کچھ ہو نہ جائے۔

ویسے اپنی وہاں کی ذمے داری وہ رگھو پر چھوڑ کر آتا تھا۔ اپنی دانست میں اس نے بڑی رازداری سے رگھو کو سب کچھ سمجھا دیا تھا اور اسے کہہ دیا تھا کہ اس معاملے میں اپنی جان کی بھی پروا نہیں کرنی ہے۔ مشکل یہ تھی کہ وہ اس طرح مطمئن ہونے والا نہیں تھا۔ لہٰذا ہفتے میں ایک بار یہ اذیت اس کے لئے لازمی ہو گئی تھی۔

اسکولوں کے امتحانات ہو چکے تھے۔ وہ ماسٹر جی کے گھر گیا تھا..... اس امید پر کہ شاید اس بار ان کا کوئی بیٹا اس کے ساتھ چلا جائے۔ لیکن ہری پرشاد نے اس بار بھی مصروفیت کا عذر پیش کر دیا۔ دوسرے دونوں تو پہلے ہی اس عذر کے تحت انکار کر چکے تھے۔

اس بار اوتار سنگھ ان کی بے حسی پر بہت جھنجھلایا تھا۔ اس نے عہد کر لیا کہ اب ان لوگوں سے کبھی نہ امید رکھے گا، نہ چلنے کو کہے گا۔

.....x.....

سرفراز بیگم چھوٹے ٹھاکر کی طرف سے فکرمند تھیں۔ اس کی صحت میں انہیں بہت بڑا فرق نظر آیا تھا۔ انہوں نے اسے ٹوکا بھی تھا اور اس نے وجہ بھی بتائی تھی کہ وہ رات بہت دیر تک جاگ کر پڑھائی کر رہا ہے۔ لیکن وہ مطمئن نہیں ہوئی تھیں۔ ان کے خیال میں یہ امتحانوں کا عرصہ تو تھا نہیں کہ وہ پڑھائی میں اتنی محنت کرتا۔ بہرحال اس معاملے میں وہ مزید جرح تو نہیں کر سکتی تھیں۔

اگلی بار وہ گئیں تو وہ سو رہا تھا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ کیونکہ دن میں انہوں نے اسے کبھی سوتے نہیں دیکھا تھا۔ انہیں ڈر لگا کہ کہیں اس کی طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی۔

''کیا ہوا رنجنا۔ خیریت تو ہے؟''۔ انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔

''جی بڑی بیگم''۔ رنجنا ان کا مطلب نہیں سمجھی۔ ''خیریت ہے''۔

''یہ چھوٹا ٹھاکر کیوں سو رہا ہے اس وقت۔ پہلے تو کبھی دن میں سوتے نہیں دیکھا''۔

''وہ..... رات کو دیر تک جاگتے ہیں نا بڑی بیگم۔ میں نے کہا، دن میں گھنٹے دو گھنٹے سو لیا کریں''۔

''اتنی رات تک کیوں جاگنے لگا ہے یہ؟''۔

رنجنا ایک لمحے کو ہچکچائی۔ پھر اس نے جلدی سے کہا۔ ''پڑھائی کرتے ہیں نا بڑی بیگم''۔

سرفراز بیگم نے اس کی وہ ہچکچاہٹ دیکھ لی تھی۔ معاملہ ان کے نزدیک اور پراسرار ہو گیا تھا۔ عجیب معما تھا۔ بہرحال انہوں نے اس خلش کو ذہن سے جھٹکا اور غور سے سوئے ہوئے چھوٹے ٹھاکر کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے جو حلقے تھے، وہ اس وقت اتنے گہرے نہیں لگ رہے تھے۔ انہیں اطمینان ہوا کہ نیند سے بہرحال فرق پڑا ہے۔ یعنی صحت میں کوئی بڑی خرابی نہیں ہے۔

تھوڑی دیر بعد وہ اٹھا تو اسے دیکھ کر وہ اس کی صحت کی طرف سے اور مطمئن ہو گئیں۔ اس کی رنگت بھی بحال ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر وہ نیچے چلی آئیں۔

جو معما ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ گزشتہ رات خود بہ خود حل ہو گیا۔ عشا کے آدھے پونے گھنٹے بعد سو جانا ان کا معمول تھا۔ مگر رات اچانک گلا خشک ہونے کے احساس کے ساتھ ان کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اٹھیں تو گھبرائی ہوئی تھیں۔ جاگنے کے ذرا دیر بعد انہیں احساس ہوا کہ وہ گھبراہٹ پیاس کی تھی۔

وہ اٹھیں اور انہوں نے پانی پیا۔ آدھی رات کے بعد کا وقت تھا۔ انہیں خیال آیا کہ اب جاگی ہیں تو وضو ہی تازہ کر لیں۔ اس ارادے سے وہ غسل خانے جانے کے لئے دالان میں نکلیں۔ اوپر کوٹھے پر روشنی دیکھ کر وہ چونکیں۔ مگر وہ چونکنا بس ایک لمحے کا تھا۔ کیونکہ اگلے ہی لمحے انہیں خیال آ گیا کہ آج کل اوتار سنگھ رات کو دیر تک پڑھائی کر رہا ہے۔

انہوں نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ وہاں روشنی ہو رہی تھی۔ جالیوں کی درزوں سے اوپر کا منظر بالکل صاف تو نہیں، البتہ ٹکڑے ٹکڑے نظر آ رہا تھا۔ چھوٹا ٹھاکر کرسی پر بیٹھا تھا۔ انہوں نے بہت غور سے دیکھنے کی کوشش کی لیکن انہیں اس کے ہاتھ میں کتاب نظر نہیں آئی۔

وہ وضو کرنے کیلئے غسل خانے میں گئیں۔ واپس آئیں تو ان کی نیند اچٹ چکی تھی۔ وہ دالان میں بچھے تخت پر دراز ہو گئیں۔ اوپر چھوٹا ٹھاکر بدستور کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کتاب اب بھی نہیں تھی۔

ذرا دیر بعد چھوٹا ٹھاکر اٹھا۔ اس کے ہاتھ میں کتاب اب بھی نہیں تھی۔ وہ کوٹھے پر ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔ ہر چند منٹ بعد وہ ٹہلتے ٹہلتے بیرونی دیوار کے پاس رکتا اور باہر گلی میں جھانکنے لگتا۔ چند لمحے وہاں رکنے کے بعد وہ پھر چہل قدمی شروع کر دیتا۔

ایک گھنٹا ہو گیا اور وہ ٹہلتا رہا۔ سرفراز بیگم کو ایسا لگا کہ وہ خود ٹہلتے ٹہلتے تھک گئی ہیں۔ ان کی ٹانگیں دکھنے لگی ہیں۔ یا اللہ، یہ لڑکا پڑھتا ہے۔ یا رات بھر ٹہلتا رہتا ہے۔ ابھی تک تو اس کے ہاتھ میں کتاب دیکھی نہیں۔ وہ بڑبڑائیں۔ اور کتنا ٹہلتا ہے یہ۔ ٹانگیں نہیں دکھ جاتی ہوں گی۔ صحت تو خراب ہونی ہی ہے۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

اوپر کوٹھے پر چھوٹا ٹھاکران کی موجودگی سے بے خبر ٹہلے جا رہا تھا۔اب اس کی رفتار کچھ کم ہوگئی تھی۔شاید تھکن کی وجہ سے!

یا اللہ..... یہ لڑکا کس لئے جاگے جا رہا ہے؟ کیا مسئلہ ہے اس کے ساتھ؟ وہ پھر بڑبڑائیں۔اس بار ان کے لہجے میں بے زاری تھی۔وہ جو بیرونی دیوار کے پاس کچھ دیر رکتا تھا اور پھر باہر گلی میں جھانکنے لگتا تھا، اس کا یہ انداز انہیں کچھ مشتبہ سا لگنے لگا۔کہیں کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں۔انہوں نے سوچا۔لیکن اگلے ہی لمحے انہیں اپنی سوچ پر افسوس ہونے لگا۔وہ چھوٹے ٹھاکر کو بہت مضبوط کردار کا لڑکا سمجھتی تھیں۔انہوں نے اس کے بارے میں ایسی بات سوچی ہی کیوں۔وہ دل ہی دل میں خود کو ملامت کرتی رہیں۔

کچھ دیر بعد چھوٹا ٹھاکر دوبارہ کرسی پر جا بیٹھا۔شاید ٹہلتے ٹہلتے تھک گیا تھا۔

لیکن اگلے ہی لمحے ایک عجیب بات ہوئی۔چھوٹا ٹھاکر کرسی سے یوں جھٹکے سے اٹھا، جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔اور وہ اٹھا تو سرفراز بیگم کو اس کے ہاتھ میں لاٹھی نظر آئی۔وہ بجلی کی سی تیزی سے بیرونی دیوار کی طرف لپکا۔اس نے گلی میں جھانکا اور للکار کے کہا۔''کون ہے؟''۔

سرفراز بیگم اٹھ کر بیٹھ گئیں۔چھوٹے ٹھاکر کا انداز ایسا تھا، جیسے وہ کوئی خطرہ محسوس کر رہا ہو۔

وہ چھوٹے ٹھاکر کو صاف دیکھ رہی تھیں۔ایک لمحہ گلی میں جھانکنے کے بعد چھوٹا ٹھاکر پلٹ ہی رہا تھا کہ دوبارہ گلی کی طرف مڑا اور جھانکنے لگا۔سرفراز بیگم کو کوئی آواز تو سنائی نہیں دی تھی لیکن چھوٹے ٹھاکر کا ردعمل بتاتا تھا کہ اسے نیچے سے جواب ملا ہے۔

ایک لمحے بعد اودتار سنگھ نے سخت لہجے میں کہا۔اتنی رات کو ایسے دروازہ نہ کھولا کریں آپ''۔

سرفراز بیگم کو لگا کہ وہ ان کے دروازے کی بات کر رہا ہے۔اور اس کے لہجے میں سختی کے ساتھ احترام بھی تھا۔اس کا مطلب تھا کہ وہ کسی اجنبی سے نہیں، بلکہ کسی شناسا سے بات کر رہا ہے۔

ایک لمحے کو خاموشی رہی۔سرفراز بیگم کو اب بھی دوسری کوئی آواز نہیں سنائی دی تھی۔لیکن چھوٹے ٹھاکر کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کسی کی بات سن رہا ہو۔

پھر چھوٹے ٹھاکر نے کہا''میں پڑھ رہا ہوں''۔یہ کہہ کر وہ پیچھے ہٹ آیا۔اس نے لاٹھی دیوار سے لگا کر کھڑی کی اور پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔

سرفراز بیگم کو یقین ہوگیا کہ چھوٹے ٹھاکر کی بہادر علی سے بات ہوئی ہے۔اب انہیں اس کی تصدیق کرنی تھی۔عام حالات میں وہ اتنی رات کو کبھی ڈیوڑھی کی طرف نہ جاتیں۔مگر یہ ان کے گھر اور بچیوں کے تحفظ کا معاملہ تھا۔

بہادر علی ڈیوڑھی میں سوتا تھا۔دروازہ وہ بند رکھتا تھا۔سرفراز بیگم نے دروازے پر رک کر اسے پکارا۔''بہادر علی.....تم جاگ رہے ہو؟''۔

بہادر علی کے لئے وہ غیر معمولی بات تھی۔اتنی رات کو بڑی بیگم پکار رہی تھیں۔''جی بڑی بیگم، میں جاگ رہا ہوں۔خیریت تو ہے نا''۔اس نے دروازہ کھولے بغیر دروازے کے قریب آ کر کہا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''چھوٹا ٹھاکر تم سے بات کر رہا تھا؟''۔ سرفراز بیگم نے پوچھا۔

''جی بڑی بیگم''۔ بہادر علی کے لہجے میں شرمندگی تھی۔ ''میں نے مجبوری میں بڑی آہستگی سے دروازہ کھولا تھا۔ پھر بھی اسے پتا چل گیا''۔

''تم حالات سے بے خبر تو نہیں ہو بہادر علی؟''۔ سرفراز بیگم کے لہجے میں تنبیہ تھی۔

''ساری زندگی اس گھر کا نمک کھایا ہے بڑی بیگم۔ آپ جانتی ہیں کہ غیر ذمہ دار نہیں ہوں۔ میرے جیتے جی اس گھر کی دہلیز کوئی نہیں پھلانگ سکے گا میں ہر صورت حال کے لئے تیار رہتا ہوں۔ لیکن بڑی بیگم آج مجھے طاقت کا احساس ہو رہا ہے۔ میں اکیلا نہیں..... اس گھر کی حفاظت کی فکر کرنے والے اور لوگ بھی ہیں۔ اور وہ چوکنا بھی رہتے ہیں''۔

''ٹھیک ہے بہادر علی۔ تم آرام کرو''۔

سرفراز بیگم دوبارہ تخت پر آ بیٹھیں۔ چھوٹا ٹھاکر اب بھی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اور اب بھی اس کے ہاتھ میں کتاب نہیں تھی۔

اس وقت ان کی کیفیت بہت عجیب تھی۔ دل کو کچھ ہو گیا تھا۔ وہ چھوٹے ٹھاکر کو بہت اچھا سمجھتی تھیں۔ لیکن ہر بار، ہر نئے موڑ پر انہیں پتا چلتا تھا کہ وہ ان کے تصور سے بڑھ کر اچھا ہے، وہ کتنا سچا ہے۔ جو کہتا ہے، دل سے کہتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے۔ اس کا ثبوت اس وقت ان کے سامنے تھا۔

انہیں یاد آیا، ابھی کچھ دن پہلے ہی تو اس نے ان کے قدموں میں بیٹھتے ہوئے، ان کے دونوں ہاتھ بڑی محبت سے تھام کر اپنی شرمندگی کا اظہار کیا تھا، ان سے معافی مانگی تھی..... اپنی بے خبری اور غیر ذمے داری پر! اور اس نے ان سے کہا تھا کہ اب وہ پریشان نہ ہوں۔ اسکے ہوتے ہوئے کوئی ان کے گھر کی دہلیز نہیں پھلانگ سکتا انہوں نے اس کی بات سنی تھی اور مطمئن نہیں ہوئی تھیں۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ کسی پختہ ارادے کے ساتھ یہ بات کہہ رہا ہے۔ یہ تو انہیں گمان بھی نہیں تھا کہ اس بات کے بعد وہ ہر رات پہرہ دے کر وہ ذمے داری نبھائے گا۔ اور نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے اس کی آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے پڑ جائیں گے۔ اس کی رنگت پھیکی پڑ جائے گی۔ اس کی صحت خراب ہو جائے گی۔ اس کی یہ حالت تو انہوں نے خود دیکھی تھی۔ اور پھر جب وہ دوپہر میں تھوڑی دیر کے لئے سونے لگا تو وہ بہتر ہو گیا تھا۔

سرفراز بیگم کا دل بھر آیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کتنی محبت، ہم دردی اور چارہ گری ہے اس لڑکے میں اور ابھی تھوڑی دیر پہلے، جب وہ بار بار دیوار کے پاس رک کر گلی میں جھانک رہا تھا تو انہیں مشتبہ لگا تھا۔ انہوں نے سوچا تھا کہ کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں۔ یہ خیال آیا تو وہ شرمندگی سے نڈھال ہو گئیں۔ ارے..... انہوں نے ایسے بے غرض اور جاں نثار لڑکے پر اس طرح کا شک کیا، جو اپنی نیند صرف اس لئے قربان کر رہا ہے کہ وہ سکون سے سو سکیں۔

اس لمحے ان کے دل سے ہر خوف، ہر پریشانی مٹ گئی۔ موت جس وقت آنی ہے سو آئے گی۔ جو کچھ ہونا ہے، وہ ہو گا۔ مشیت کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ اللہ کو جو منظور ہو، وہ ہو کر رہتا ہے۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ اللہ کی مہربانی سے کوئی ہے جو ان کے، ان کے گھر کے اور ان کی بچیوں کے تحفظ کے لئے جاگتا ہے۔ تو وہ ڈر کس بات سے رہی ہیں۔ اور کیوں ڈر رہی ہیں۔

انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ چھوٹا ٹھاکر اب بھی وہیں بیٹھا تھا۔ وہ اٹھیں اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ اب وہ پوری طرح بے فکر تھیں۔

.....x.....

کالج کی فضا بے حد خراب ہو گئی تھی!

جس روز محمود کی موت کی خبر آئی، پورا کالج جیسے سہم گیا۔ محمود بہت زندہ دل اور خوش مزاج لڑکا تھا۔ اس کے مزاج میں دردمندی بھی بہت تھی۔ وہ اپنے نظریات میں بے حد اٹل اور ان کے اظہار میں بے حد پرجوش بھی تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ کالج کے ہر دل عزیز طلبا میں سے تھا۔ جن لوگوں کو اس سے نظریاتی اختلاف تھا، وہ بھی اس کی عزت کرتے تھے۔ اس لئے کہ نظریاتی اختلاف کو وہ ذاتی نہیں بننے دیتا تھا۔ جن سے اختلافات تھے، وہ ان کے بھی کھلے دل سے کام آتا تھا۔

محمود کی موت کا علم انہیں اخبار سے ہوا تھا۔ رات کو دس بجے کے قریب وہ چاندنی چوک کے علاقے سے گزر رہا تھا۔ اس کے ساتھ مسلم لیگ کے تین کارکن بھی تھے۔ ایک سنسان سڑک پر متعصب ہندوؤں کا ایک گروہ ان پر حملہ آور ہوا۔ حملہ آور چاقوؤں، برچھیوں اور بلموں سے مسلح تھے۔ چاروں افراد کو ختم کرنے کے بعد وہ فرار ہو گئے۔

یہ تمام خبریں مصدقہ نہیں تھیں۔ یہ محض اندازے اور قیاس آرائیاں تھیں۔ کیوں کہ اس واقعے کا کوئی عینی گواہ نہیں تھا۔ اور اگر تھا تو سامنے بہر حال نہیں آیا تھا۔ تمام اخبارات نے ظاہری شواہد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی اپنی پالیسی کے مطابق خبر بنائی تھی۔

بہر حال اس روز کالج میں پڑھائی بالکل نہیں ہوئی۔ پورا کالج تو محمود کے گھر پہنچا ہوا تھا۔ جنازے میں اتنے افراد تھے کہ شاید ہی کسی کو دوسری بار کندھا دینے کا موقع ملا ہو گا۔ محمود کے والد کے حوصلے اور استقامت نے سب کو متاثر کیا۔ غم اور صدمے کے باوجود انہوں نے خود کو سنبھالا ہوا تھا۔ وہ بار بار یہی کہتے کہ یہ تو ایک بیٹا تھا۔ پاکستان پر تو وہ ایسے سو بیٹے بھی قربان کر سکتے ہیں۔ کالج کی لڑکیوں نے بتایا کہ گھر میں محمود کی ماں اور بہنوں کا بھی یہی رویہ تھا۔ ان لوگوں کو پہلی بار پتا چلا کہ محمود اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا اور بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔

اگلے روز کالج کے آڈیٹوریم میں تعزیتی جلسہ ہوا۔ اس جلسے نے کالج کی فضا کو نہایت مکدر اور کشیدہ کر دیا۔ وہ تعزیتی جلسہ کالج کے ایک ہونہار اور ہر دلعزیز طالب علم کی یاد میں ہوا تھا۔ مسلمانوں کی تو بات ہی اور تھی۔ محمود کے قتل کی مذمت تو کالج کے طلبا کی بھاری اکثریت نے کی تھی۔ ان میں ہندو بھی تھے، سکھ بھی اور انگریز بھی۔ اس قتل کی مذمت میں طلبہ یونین بھی پیش پیش تھی۔

یونین کے صدر نے اپنی تقریر میں کہا کہ محمود سیاست ے تشدد بھرے ماحول میں شائستگی، نرمی اور رواداری کا علم بردار تھا۔ اس کی زندگی بھی اس بات کا ثبوت تھی اور موت نے بھی یہ بات ثابت کر دی ہے۔

یہ وہ موقع تھا کہ رام گوپال اور اس کے چند ساتھیوں نے ماحول خراب کر دیا۔ حالاں کہ تقریر کے دوران مداخلت کا کوئی جواز نہیں تھا۔ مگر ایک متعصب ہندو لڑکے نے نہایت بدتمیزی کے ساتھ یونین کے صدر کو چیلنج کیا۔ ''یہ بات تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''۔

''اگر محمود اور اس کے ساتھی بھی مسلح ہوتے تو دو ایک لاشیں حملہ آوروں کی بھی ملتیں''۔ یونین کے صدر نے کہا۔

''میرے خیال میں یہ حملہ آوروں کی جاں بازی کا ثبوت ہے''

''جاں بازی! چار نہتے افراد پر دس بارہ مسلح افراد کے حملہ کرنے کو جاں بازی کیسے کہا جا سکتا ہے۔ یہ تو بہادری کے اصولوں کے خلاف ہے''۔

''یہ تم سے کس نے کہہ دیا کہ حملہ کرنے والے دس بارہ تھے؟''۔ معترض نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ عین ممکن ہے کہ ان کی تعداد پچاس ہو یا اس سے بھی زیادہ''۔ یونین کے صدر نے بھی تمسخرانہ انداز اختیار کر لیا۔

''یہ سب اخبار والوں کے بنائے ہوئے افسانے ہیں۔ محمود اور اس کے ساتھی ان حالات میں اتنی رات کو نکلے تھے تو وہ مسلح بھی رہے ہوں گے.....''۔

''اور ان کی آتمائیں پرلوک سدھارتے وقت ان کے ہتھیار بھی ساتھ لے گئی ہوں گی''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

یونین کے صدر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اور اب تم یہ بھی کہو گے کہ اصل میں حملہ آور محمود اور اس کے ساتھی تھے۔ اور دوسرے فریق کی لاشیں اخبار والوں نے غائب کر دی ہوں گی.....''۔

''پولیس بھی مسلوں سے ملی ہوئی ہے''۔ کسی نے پکار کر کہا۔ ''اور گورے بھی اس میں شامل ہیں''۔

اس کے بعد وہ ہلڑ بازی ہوئی کہ تعزیتی جلسہ ختم ہو گیا۔

ایک گھنٹے بعد اوتار سنگھ رچرڈ پارسن کے ساتھ کینٹین میں بیٹھا تھا کہ رام گوپال بھی آ گیا۔ وہ بے تکلفی سے ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ''اور سناؤ دوستو، کیا حال ہے؟''۔

''یہ ہنگامہ آرائی غیر ضروری تھی''۔ اوتار سنگھ نے اس سے کہا۔

''میں تم سے متفق ہوں۔ یہ جذباتی لوگ گڑبڑ کر دیتے ہیں۔ ان کی وجہ سے میرا منصوبہ دھرا رہ گیا''۔

''اور تمہارا منصوبہ کیا تھا؟''۔ رچرڈ نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا

''مجھے تقریر کرنی تھی۔ اور میں اس میں لوگوں کو بتایا کہ بھارت ایک ہے اور ایک رہے گا۔ ہم بٹوارا نہیں ہونے دیں گے''۔

''حالاں کہ ہندوؤں کی اسی پالیسی کی وجہ سے بٹوارا لازمی ہو گیا ہے''۔ رچرڈ نے کہا۔ ''مسلمانوں کو محبت سے سمجھایا..... قائل کیا جاتا۔ انہیں اچھے مستقبل اور تحفظ کا یقین دلایا جاتا تو شاید بٹوارا رک جاتا''۔

''نہیں رکتار چرڈ۔ تم ہماری قوم کے مزاج سے ناواقف ہو۔ مسلمان جذباتی طور پر فیصلہ کر چکے ہیں۔ وہ پاکستان بنا کر رہیں گے''

''تو پھر اتنے خون خرابے کی کیا ضرورت ہے۔ جب یہ ہونا ہے تو اسے تسلیم کر لو''۔ اوتار سنگھ بولا۔

''پاکستان بنے گا۔ لیکن زیادہ دن نہیں چلے گا۔ اور پاکستان بننے تک ہم مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلتے رہیں گے۔ اس سے ان کی طاقت بھی کم ہو گی اور حوصلہ بھی پست ہو گا۔ اب تمام مسلمان تو یہاں سے نہیں جا سکتے نا۔ ہم یہاں سے بھاگنے والے مسلمانوں کو بھی کاٹتے رہیں گے اور یہاں رہ جانے والوں کو بھی مارتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ بچے کھچے مسلوں کی سمجھ میں آ جائے گا کہ ان کی بقا صرف بھارت میں ہے۔ ہمارا خواب اکھنڈ بھارت ہے۔ میں آج یہی بتانا چاہتا تھا کہ مسلے پاکستان کا خیال دل سے نکال دیں۔ ورنہ انہیں کہیں پناہ نہیں ملے گی۔ میں انہیں بتانا چاہتا تھا کہ اصل پاکستان وہ ہے، جہاں محمود اور اس کے ساتھی گئے ہیں..... پرلوک میں! وہ نہیں مانیں گے تو جیسے ہم نے محمود اور ان کے ساتھیوں کو پاکستان بھیجا ہے، ویسے ہی دو دو چار چار کر کے ہم ان سب کو پاکستان بھیجتے رہیں گے.....''۔

اوتار سنگھ بہت متحمل مزاج تھا۔ لیکن اس کا تحمل جواب دینے لگا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''رچرڈ، تم اگر بیٹھنا چاہو تو بیٹھو۔ لیکن میں یہ بدبودار گفتگو مزید برداشت نہیں کر سکتا''۔

جواب میں رچرڈ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں بھی چل رہا ہوں''۔

وہ دونوں جا رہے تھے کہ عقب سے رام گوپال چلایا۔ ''تم کالی بھیڑ ہو اوتار سنگھ۔ اور میں جانتا ہوں کہ ہمارے درمیان کالی بھیڑیں موجود ہیں''۔

اوتار سنگھ پلٹا اور اس کی طرف واپس آیا۔ اس کے بہت قریب آ کر وہ رکا۔ ''کالی بھیڑ میں نہیں ہوں، تم ہو رام گوپال، کیوں کہ کالی بھیڑیں اکثریت میں کبھی نہیں ہوتیں۔ تم جیسے لوگ اپنے عمل سے امن پسند اکثریت کو رسوا کر رہے ہیں۔ ملک کا ماحول خراب کر رہے ہیں''۔

''امن پسندی..... ہنہہ!''۔ رام گوپال نے حقارت سے کہا۔ ''یہ بزدلی کو چھپانے والا لفظ ہے''۔

''بزدلی اور بہادری تم کیا جانو''۔ اوتار سنگھ نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔ ساتھ ہی اس کا ہاتھ رام گوپال کے گلے کی طرف لپکا۔

رام گوپال کو شاید پہلے سے اندازہ تھا۔ وہ گھبرا کر ایک قدم پیچھے ہٹا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ''یہ کیا طریقہ ہے اوتار سنگھ.....؟''۔

''تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں رام گوپال۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ تم نہیں سمجھو گے۔ یہ امن پسندی ہے۔ میں یہیں، اسی وقت صرف اپنے ہاتھوں سے تمہیں ختم کر سکتا ہوں۔ یہ بہادری بھی ہے اور امن پسندی بھی ہے۔ بہادری ایسے کہ میں یہ کر سکتا ہوں۔ اور امن پسندی ایسے کہ میں یہ نہیں کروں گا۔ اور تم جس طرح گھبرا کر پیچھے ہٹے ہو، یہ بزدلی ہے۔ اس وقت تمہارے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ لیکن ابھی تمہارے ساتھ چند کالی بھیڑیں اور ہوتیں اور تمہارے پاس ہتھیار بھی ہوتے تو تم مجھے کاٹ کر پھینک دیتے۔ یہ بزدلی ہے رام گوپال، اور مجھے فخر ہے کہ محمود جیسا بہادر آدمی میرا دوست تھا۔ آئندہ میرے سامنے اس انداز میں کبھی نہ بولنا رام گوپال۔ میں تم جیسے تیس چالیس مسلح افراد سے اکیلا ہی نمٹ سکتا ہوں۔ یاد رکھنا رام گوپال، میں راج پوت ہوں اور بزدلوں سے دوستی نہیں رکھتا''۔ یہ کہہ کر اوتار سنگھ پلٹا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا کینٹین سے نکل گیا۔ رچرڈ پارسن اس کے پیچھے تھا۔

رام گوپال بت بنا کھڑا تھا۔ وہ شاک میں تھا۔ نرم خو، نرم گفتار اوتار سنگھ کا یہ روپ اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اوتار سنگھ کا لہجہ تو اب بھی سخت نہیں تھا۔ بلکہ پہلے سے زیادہ نرم تھا۔ لیکن جو کچھ اس نے کہا تھا، اس نے رام گوپال کو دہلا دیا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ رام گوپال کو اس کے کہے ہوئے ہر لفظ پر یقین تھا۔ اس نے جو کہا تھا، وہ کر کے بھی دکھا سکتا تھا۔

رام گوپال صرف متعصب ہی نہیں، بے حد کینہ پرور بھی تھا۔ ٹھیک ہے اوتار سنگھ۔ میں تمہاری ہر بات یاد رکھوں گا۔ میں وہ موقع نہیں دوں گا تمہیں کہ تم اپنی بات سچ ثابت کر سکو۔ اور میں تمہیں ایسی سزا دوں گا کہ تم تڑپتے رہو گے اور کچھ بھی نہیں کر سکو گے۔

.....x.....

تین دن بعد کالج میں امتحان کی تیاری کے سلسلے میں دی جانے والی چھٹیوں کا اعلان ہو گیا۔ نام تو امتحان کی تیاری کا تھا۔ لیکن درحقیقت کالج کے سخت کشیدہ ماحول کی وجہ سے چھٹیاں ایک ہفتہ پہلے ہی شروع کر دی گئی تھیں۔

اوتار سنگھ کے لئے وہ اچھی خبر تھی۔ کالج میں ویسے بھی پڑھائی بالکل نہیں ہو رہی تھی۔ وہاں وقت ہی ضائع ہوتا تھا۔ رات کو کوٹھے پر پہرہ دینے کے دوران وہ بالکل نہیں پڑھتا تھا۔ کیوں کہ جانتا تھا کہ وہ کتاب میں ایسا الجھا ہو جائے گا کہ اسے گردوپیش کی خبر نہیں رہے گی۔ ان میں دو گھنٹے سونے کے معمول کی وجہ سے پڑھائی کا وقت بہت کم رہ گیا تھا۔

اب کالج کی چھٹیاں ہوئیں تو اسے پڑھائی کا موقع مل گیا۔ اس نے اپنے معمولات میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ وہ کالج جانے کے حساب سے ہی اٹھتا تھا۔ فرق یہ تھا کہ کالج جانے کے بجائے وہ گھر پر ہی پڑھائی کر رہا تھا۔ جو وقت اس کا کالج سے واپسی کا تھا، اس وقت تک وہ پڑھائی کرتا تھا۔ پھر وہ کھانا کھاتا اور دو گھنٹے کے لئے سو جاتا۔ اٹھنے کے بعد پھر پڑھائی شروع۔ یہاں تک کہ رات کے پہرے کا وقت آ جاتا۔

شہر کی فضا میں کشیدگی اور بڑھ گئی تھی مسلمانوں کے چھرا گھونپنے کے واقعات میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ گلی سے گزرنے والے جلوسوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ ان میں پاکستان مخالف ہندوؤں کے جلوس بھی ہوتے تھے، جن میں سکھ بھی خاصی تعداد میں شامل ہوتے تھے۔ مسلمانوں کے جلوس البتہ ان کے مقابلے میں زیادہ ہوتے تھے۔ لیکن ان جلوسوں میں بڑی تعداد بچوں کی ہوتی تھی۔

تین چار مرتبہ ایسا ہوا کہ ایک ہی وقت میں دونوں متحارب جلوس گلی میں داخل ہوئے۔ ایک، ایک طرف سے اور دوسرا دوسری طرف سے۔ اس کے نتیجے میں تصادم ہوا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

ڈنڈے چلے۔ کچھ افراد زخمی ہوئے۔ مگر ہلاکت کی نوبت نہیں آئی۔ اوتار سنگھ اور رگھو ہر بار نیچے گئے اور بیچ بچاؤ کرایا۔ ورنہ بات بہت آگے بڑھ جاتی۔

ایسے موقعوں پر اوتار سنگھ کا دل چاہتا تھا کہ وہ اپنی لٹھیا اٹھائے اور زیادتی کرنے والے ہندوؤں پر پل پڑے۔ لیکن مصلحت اور حکمت نے اسے روک دیا۔ اگر وہ کھلے عام مسلمانوں کی حمایت کرتا تو وہ اس کی ماں جی کے گھرانے کے لئے نقصان دہ ہوتا۔ ان کے تحفظ کے لئے اس کا خود کو غیر جانب دار ظاہر کرنا ضروری تھا۔

امتحان شروع ہوئے اور ختم بھی ہو گئے۔ اوتار سنگھ کے سر سے جیسے کوئی بوجھ اتر گیا۔ نجانے کیا بات تھی کہ اس بار امتحان اسے بہت بے معنی اور بوجھ لگ رہے تھے۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ ان امتحانوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ دے یا نہ دے، کامیاب ہو یا ناکام، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ البتہ امتحان کے بعد جو آزادی کا احساس ہوتا تھا، وہ پہلے سے بھی بڑھ کر تھا۔

امتحانوں کے دوران بھی اس کا معمول نہیں بدلا تھا۔ ہفتے میں ایک بار وہ ماسٹر جی کے پاس جاتا، اور ان کے ساتھ دن گزارتا۔ ان کی ظاہری حالت تو اب بھی پہلے جیسی ہی تھی لیکن ڈاکٹر نے اسے بتا دیا تھا کہ اب ماسٹر جی پر کثرت سے کھانسی کے دورے پڑنے لگے ہیں۔ ان کا دورانیہ بھی زیادہ ہو گیا ہے اور شدت بھی بڑھ گئی ہے۔ اس کے علاوہ منہ سے خون آنا بھی بڑھ گیا ہے۔ مجموعی طور پر صورت حال اچھی نہیں تھی۔ ڈاکٹر عام طور پر مکمل طور پر مایوس تو نہیں ہوتے لیکن ڈاکٹر نے کھل کر بتایا کہ یہ صورت حال امید افزا ہرگز نہیں ہے۔ علاج کے باوجود مرض بہت بڑھ گیا ہے۔

ایک بار تو اوتار سنگھ کی موجودگی میں ماسٹر جی پر دورہ پڑا۔ اوتار سنگھ سے ان کی تکلیف، ان کی وہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ اس دوران ماسٹر جی کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ کبھی تو ایسا لگتا تھا کہ سانس ٹوٹ ہی جائے گی۔ وہ دہرے ہو ہو جاتے تھے۔ جسمانی طور پر وہ اتنے کمزور ہو چکے تھے کہ وہ تکلیف ان کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ ان کا پورا جسم تشنجی کیفیت میں تھا۔ آخر میں ان کے منہ سے جیتا جاگتا خون باہر آ رہا تھا۔

دورہ تقریباً 25 منٹ جاری رہا۔ اس کے نتیجے میں ماسٹر جی بے جان ہو کر رہ گئے۔ جس وقت انہیں اس سے نجات ملی تو ان میں آنکھیں کھلی رکھنے کی سکت بھی نہیں رہی تھی۔ اس کے بعد تین گھنٹے تو ان پر غشی طاری رہی۔ پھر جب وہ اس غشی سے نکلے تو انہیں تھوڑا سا دلیہ دیا گیا۔ تب کہیں وہ بات کرنے کے قابل ہوئے۔ مگر ان کی آواز تک سے کمزوری عیاں تھی۔

''تم نے دیکھا ہے بیٹے''۔ انہوں نے اوتار سنگھ سے کہا ''یہ حال ہوتا ہے میرا۔ جب بھی دورہ پڑتا ہے تو میں بھگوان سے موت کی پرارتھنا کرنے لگتا ہوں''۔

''آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ حوصلہ رکھیں ماسٹر جی''۔

''صرف تمہاری میں لڑ رہا ہوں۔ ورنہ تکلیف سے جی چاہتا ہے کہ حوصلہ چھوڑ دوں۔ میں نے سمجھ لیا ہے کہ موت میں بڑی راحت ہے''

ماسٹر جی کی اذیت اور بے بسی نے اوتار سنگھ کو دہلا دیا تھا۔ وہ بھی یہی بات سوچ رہا تھا کہ جب زندگی پوری ہو جائے تو موت راحت ہے۔ موت نجات ہے۔ لیکن وہ یہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ بے بسی یہ تھی کہ وہ سوچ خود کار تھی۔ اس پر اس کا اختیار نہیں تھا۔

ماسٹر جی نے اسے چونکا دیا ''اوتار سنگھ! تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا؟'' انہوں نے نحیف آواز میں پوچھا۔

اوتار سنگھ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس کا ذہن ویسے ہی الجھا ہوا تھا ''کون سا وعدہ ماسٹر جی؟''۔

''میں نے تم سے وعدہ لیا تھا کہ میری چتا کو آگ تم ہی دو گے''۔

اس یاددہانی کے جواب میں کچھ کہنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

ماسٹر جی کی حالت نے اسے دکھی کر دیا۔ وہ کچھ عرصہ اس نے بڑی ذہنی اذیت میں گزارا۔ وہ دہلی میں ہوتا تو اس کا دل ماسٹر جی میں اٹکا رہتا۔ ماسٹر جی کے پاس ہوتا تو گھر کی فکر لگی رہتی۔ یہی نہیں، اس کے ضمیر پر ایک اور بوجھ آ گیا تھا۔ اب جبکہ وہ کالج نہیں جا رہا تھا تو اسے ماسٹر جی کے ساتھ زیادہ وقت گزارنا چاہئے تھا۔ بلکہ اصولاً تو اسے کچھ دن ماسٹر جی کے ساتھ گزارنے چاہئے تھے۔ لیکن یہاں تو ایک دن بھی اس کے لئے بھاری ہو جاتا تھا۔ ایسے میں وہ اپنی بے بسی اور تقسیم پر کڑھنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اس کا پہرہ دینے کا معمول اب بھی جاری تھا۔ بلکہ اب تو وہ رات بھر کوٹھے پر رہتا تھا۔ صبح ہوتی تو نیچے آتا، اب صبح ناشتے کے بعد وہ دوپہر تک سو لیتا تھا۔

.....×.....

چھمن بوا کو اچانک چھوٹا ٹھاکر بہت برا لگنے لگا تھا!

بہادر علی سے اس رات کی گفتگو کے بعد وہ مسلسل تشویش زدہ اور پریشان رہنے لگی تھیں۔ گلی میں پتنگ لوٹنے والے بچوں کا شور بھی ہوتا تو وہ دہل جاتیں اور دروازے پر جا کر اس کی سن گن لیتیں کہ کہیں حملہ تو نہیں ہو گیا ہے۔ پاکستان کے حق میں نعرے لگاتا کوئی جلوس گلی میں داخل ہوتا تو بھی ان کی حالت غیر ہو جاتی اور اکھنڈ بھارت والوں کا جلوس آتا تو وہ گویا سولی پر لٹک جاتیں.....

ایک دن تو ان کا بہت برا حال ہوا۔ دروازے سے ٹکے ٹکے انہیں یوں لگا کہ وہ اب گریں اور جب گریں۔ ہوا یہ کہ ایک طرف سے مسلمانوں کا جلوس گلی میں داخل ہوا اور دوسری طرف سے ہندوؤں کا جلوس آ گیا۔ دونوں طرف کے نعرے گھل مل گئے۔ آوازوں کا حجم اور لہجوں کی تندی بڑھتی گئی۔ اس کی چیخ و پکار اور آہ و زاری کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ دونوں جلوسوں میں ٹکراؤ ہو گیا ہے۔ اب چھمن بوا میں دروازہ کھولنے کی ہمت تو نہیں تھی۔ بلکہ وہ تو یہاں سے بھاگ کر ہٹ جانا چاہتی تھیں۔ لیکن ان کے پاؤں تو جیسے من من بھر کے ہو گئے تھے۔

اچانک اوپر والے زینوں کی طرف سے لپکتے ہوئے قدموں کی چاپ ابھری۔ پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ قدموں کی چاپ بتاتی تھی کہ اترنے والے دو افراد ہیں۔ وہ چھوٹا ٹھاکر اور رگھو ہی ہو سکتے تھے۔

پھر گلی میں چھوٹے ٹھاکر کی آواز ابھری ''ارے ہٹو..... چھوڑو ..... یہ کیا وحشت ہے''۔

چھمن بوا کو اندازہ ہو گیا کہ چھوٹا ٹھاکر بیچ بچاؤ کرا رہا ہے۔ چند منٹ میں تصادم تو موقوف ہو گیا۔ لیکن دونوں طرف کی تند و تیز گفتگو اب بھی سنائی دے رہی تھی۔ آوازوں میں وحشت تھی اور لہجوں میں تیزی اور نفرت۔ شاید اسی لئے چھمن بوا کی سمجھ میں ایک لفظ بھی نہیں آ رہا تھا،

مگر چھوٹے ٹھاکر کی شائستہ آواز ابھری۔ لہجے میں نرمی اور تحمل تھا۔ اس کا کہا ہوا ایک ایک لفظ ان کی سمجھ میں آ رہا تھا۔

''یہ کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو۔ ہمیشہ سے ساتھ رہنے والے، رشتے داروں سے بڑھ کر ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے والے، بے لوث ایک دوسرے کے کام آنے والے۔ آج تم ایک دوسرے کے جانی دشمن ہو رہے ہو۔ جانوروں کی طرح لڑ رہے ہو.....''۔ لہجے میں ملامت اور شکایت۔

کچھ ملی جلی آوازیں.....

''جلوس نکالنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ صرف نفرتیں بڑھیں گی۔ دلوں کے فاصلے بڑھیں گے۔ جو ہونا ہے، وہ تو ہو کر رہے گا''۔

مزید آوازیں.....

''تم تو اکثریت میں ہو۔ تمہارا رویہ بڑے بھائی جیسا ہونا چاہئے''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''یہ لوگ ''بن کے رہے گا پاکستان..... بٹ کے رہے گا ہندوستان'' کا نعرہ کیوں لگاتے ہیں۔ ہمیں چڑانے کے لئے؟ تو ہم ہمیں سبق بھی نہ سکھائیں''۔ ایک تند آواز ابھری۔

''تم اپنی کہو۔ تم کون ہو؟ ان کی طرف داری کیوں کر رہے ہو؟''۔ ایک اور تند آواز.....

ایک لمحہ ایسی خاموشی رہی، جیسے جواب دینے والا لاجواب ہو گیا ہو۔ پھر چھوٹے ٹھاکر کی آواز ابھری۔ ''میں ہندو ہوں..... راج پوت''۔ اس کی آواز میں جھجک تھی اور لہجے میں فخر۔ ''اور میں کسی کی طرف داری نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو دلوں کی نفرت مٹانے کی، آگ بجھانے کی کوشش کر رہا ہوں''۔ ایک لمحے کا توقف۔ پھر چھوٹا ٹھاکر شاید دوسرے گروہ سے مخاطب ہوا۔ ''یہ بات تو واقعی غلط ہے۔ جب تمہارے کسی نعرے سے کسی بھائی کی دل آزاری ہوتی ہے تو وہ نعرہ کیوں لگاتے ہو؟''۔

''یہ ہمارا عزم ہے۔ پاکستان بن کر رہے گا۔ ہندوستان تقسیم ضرور ہوگا''۔ ایک کم عمر جذباتی آواز.....

''یہ نہیں ہوگا..... اس سے پہلے ہم تمہیں مٹا دیں گے''۔

''ہمیں جان کی پروا نہیں۔ پاکستان پر ایسی سو جانیں قربان.....''

چھوٹے ٹھاکر نے پھر مداخلت کی۔ ''عزم دل میں ہوتا ہے۔ آدمی کے اندر ہوتا ہے۔ مزہ تو یقین کی کمزوری کی دین ہے۔ اگر تمہارا یقین سچا ہے تو اعلان مت کرو..... چیلنج مت کرو..... تمہارا یقین سچا ہے تو تمہارا خیال حقیقت میں بدل جائے گا۔ نعرے سے فساد ہوتا ہے تو نعرہ مت لگاؤ''۔

''انہیں نعرے لگانے دو۔ ہم انہیں ٹھکانے لگا دیں گے''۔

''ہم تم سے ڈرتے نہیں ہیں۔ ہم تو شہادت کی آرزو کرتے ہیں''

''اور ہم تمہاری آرزو پوری کرنا چاہتے ہیں''۔

''تو آ جاؤ.....''۔

''بس.....!''۔ اچانک چھوٹے ٹھاکر نے گرج کر کہا۔ اس کا لہجہ اچانک بدل گیا تھا۔ ''میں تمہیں بتا دوں کہ ہم ہندو بہت رواداری ہیں ..... اہنساء کے پجاری ہیں۔ تمہیں سمجھ لینا چاہئے کہ ہمیں اشتعال دلاؤ گے تو وہ پاکستان تمہیں کم از کم نہیں ملے گا، جس کے تم خواب دیکھ رہے ہو۔ اسلئے تم مارے جاؤ گے۔ کان کھول کر سن لو۔ اب اس گلی میں کوئی جلوس نہیں آئے گا۔ کوئی نعرہ نہیں لگے گا۔ یہاں ہندو مسلمان صدیوں سے بھائیوں کی طرح رہ رہے ہیں۔ میں یہاں کی فضا خراب نہیں ہونے دوں گا''۔ اس نے لاٹھی زور سے زمین پر ماری۔ ''اور یہ بات میں کہہ رہا ہوں، جسے اختلاف ہو، وہ مقابلے پر آ جائے۔ تم سب کے لئے میں اکیلا ہی کافی ہوں۔ میں اس گلی میں صرف امن اور محبت دیکھنا چاہتا ہوں''۔

وہاں سناٹا چھا گیا۔ پھر آوازوں سے لگا کہ دونوں گروہ منتشر ہو گئے ہیں۔ گلی میں خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد زینے پر اوپر جاتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

چھمن بوا بھی لرزتی ٹانگوں کے ساتھ دروازے سے ہٹ آئیں۔ اس لمحے سے چھوٹا ٹھاکر انہیں برا لگنے لگا۔ آخر میں اس نے مسلمانوں کو کتنی نفرت اور حقارت سے مخاطب کیا تھا۔ اور اس نے کتنے فخر سے خود کو ہندو اور راج پوت کہتے ہوئے ہندوؤں کی رواداری اور امن پسندی کی تعریف کی تھی۔ اس نے کھلم کھلا اپنے متعصب ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ اس نے واضح طور پر جانب داری برتی تھی۔ اور اندرون خانہ وہ بڑی بیگم کا بیٹا بنا بیٹھا ہے۔ اسے کہتے ہیں بغل میں چھری اور منہ پر رام رام۔

پریشان اور خوف زدہ تو وہ تھیں ہی۔ اس صدمے کے نتیجے میں انہیں بیٹھے بیٹھے بڑبڑانے، خود کلامی کرنے کی عادت ہو گئی۔ وجہ یہ بھی تھی کہ اب وہ چھوٹے ٹھاکر سے خوف زدہ تھیں اور اس کا اظہار بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ خوف سے بڑی بات یہ تھی کہ ان کا اعتبار اس پر سے اٹھ گیا تھا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ کسی دن وہ خود ہی بغلی دروازے سے گھر میں گھس آئے گا اور سب کو کاٹ کر رکھ دے گا۔ اس وہم سے دن بھر وہ اس دروازے کو دیکھتیں کہ اپنی طرف سے بند ہے یا نہیں۔ رات کو سونے سے پہلے وہ خاص طور پر اس دروازے کو دیکھتیں۔

بڑبڑانے کا معمول ایسا تھا کہ وہ کوئی بھی کام کرتے ہوئے بڑبڑانا شروع کر دیتیں۔ اور انہیں خود بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ بڑبڑا رہی ہیں۔

اس روز بھی وہ بڑبڑا رہی تھیں۔ ''موئے کافر تو ہوتے ہی منافق ہیں.....''۔

یہ بات قریب بیٹھی ہوئی نور بانو نے سن لی۔ ''یہ آپ کس کے بارے میں بات کر رہی ہیں بوا؟''۔

چھمن بوا نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''میں کب بات کر رہی ہوں''۔ انہوں نے کہا۔ ''میں تو چپ بیٹھی ہوں''۔

''کمال ہے بوا۔ آپ بول رہی ہیں اور بولنے سے انکاری بھی ہیں۔ بتائیے نا، کس کے بارے میں کہہ رہی تھیں آپ''۔

چھمن بوا نے غور سے اسے دیکھا کہ کہیں وہ مذاق تو نہیں کر رہی ہے۔ لیکن اس کے چہرے پر تو گہری سنجیدگی تھی۔ ویسے بھی نور بانو نہ مذاق کرتی تھی اور نہ ہی کبھی جھوٹ بولتی تھی۔ وہ پریشان ہو گئیں۔ کیا سچ مچ وہ ایسے بول رہی تھیں کہ انہیں خود بھی علم نہیں تھا۔ یہ تو بڑی پریشانی کی بات ہے۔ کیا دماغ چل گیا ہے میرا؟ ارے..... ابھی تو میں ساٹھ کی ہوئی بھی نہیں۔

''اچھا یہ بتاؤ، میں کیا کہہ رہی تھی؟''۔

''آپ کو نہیں معلوم کہ مجھ سے پوچھ رہی ہیں''۔

''مجھے واقعی نہیں معلوم''۔

نور بانو نے چند لمحے انہیں تولنے والی نگاہوں سے دیکھا۔ پھر ان کی بات دہرا دی۔

چھمن بوا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''یہ کہہ رہی تھی میں؟''۔ انہیں یقین ہونے لگا کہ وہ سٹھیا رہی ہیں۔

''جی ہاں، یہی کہہ رہی تھیں آپ۔ اب یہ بتائیں، کس کے بارے میں کہہ رہی تھیں؟''۔

چھمن بوا صرف ایک لمحے کو ہچکچائیں۔ ''ارے وہی چھوٹا ٹھاکر۔ اور کس کے بارے میں کہوں گی''۔ انہوں نے جھنجھلا کر کہا۔

''چھوٹے ٹھاکر نے ایسا کیا کر دیا؟''۔ نور بانو کی دل چسپی اور بڑھ گئی۔

چھمن بوا نے سب کچھ اسے بتا دیا۔

''میں تو پہلے ہی سے کہتی ہوں یہ بات''۔ نور بانو نے کہا۔ ''لیکن اماں تو سچ مچ اسے اپنا بیٹا سمجھتی ہیں''۔

نور بانو سے وہ بات حور بانو اور گلنار تک پہنچی۔ حور بانو یہ سن کر بہت تلملائی۔ لیکن چھمن بوا نے جو بات اپنے کانوں سے سنی تھی، اس کے پاس اس کا کوئی توڑ نہیں تھا۔

اس طرح یہ بات سرفراز بیگم تک بھی پہنچ گئی۔ کئی دن سے وہ دیکھ رہی تھیں کہ لڑکیاں سر جوڑے بیٹھی سرگوشیوں میں گفتگو کرتی رہتی ہیں۔ ان کے انداز سے لگتا تھا کہ بحث کر رہی ہیں۔ کوئی ایسا متنازعہ معاملہ تھا، جس پر وہ متفق نہیں تھیں۔ ان کے استفسار پر نور بانو نے انہیں وہ بات بتا دی۔

سرفراز بیگم تو دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

''اماں..... دل چھوٹا نہ کریں۔ اللہ حفاظت کرنے والا ہے''۔ نور بانو نے بڑے خلوص سے انہیں دلاسہ دیا۔ ''بس اندر کے دشمن سے ہشیار رہنا ضروری ہے یہ تو اللہ کی رحمت ہے کہ اندر کے دشمن کا پتا چل گیا.....''۔

''بس چپ رہو تو''۔ سرفراز بیگم نے اسے اس طرح ڈانٹا کہ وہ دہل کر رہ گئی۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''چھوٹے ٹھاکر سے تمہیں اللہ واسطے کا بیر ہے۔ میں جب بھی تمہیں سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں تو یہ نور بانو تاویلیں لانے لگتی ہے۔ اس کی اچھائی کو برائی میں بدل دیتی ہے۔ تم مجھے بے وقوف سمجھتی ہو۔ مگر تم خود بے وقوف ہو۔ آج میں تمہیں وہ کچھ نہیں بتاؤں گی، جو میں جانتی ہوں۔ تم اس میں بھی بدنیتی تلاش کرلوگی۔ اسلئے میں تمہیں حکم دے رہی ہوں۔ اسے میری وصیت سمجھ لو.....''

ان الفاظ پر تینوں لڑکیاں تھرا کر رہ گئیں۔ لیکن کسی میں کچھ کہنے کی ہمت نہیں تھی۔

''چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں جس کا جو گمان ہے، بے شک وہ اس پر قائم رہے۔ لیکن میں تمہیں حکم دے رہی ہوں کہ ہمیشہ اس پر ویسا ہی اعتبار کرنا، جیسا مجھ پر کرتی ہو۔ اور اسے اپنا ویسا ہی بہی خواہ سمجھنا، جیسا بہادر علی کو سمجھتی ہو۔ چھوٹے ٹھاکر سے تمہیں کبھی دھوکہ نہیں ملے گا۔ وہ تمہاری ویسی ہی حفاظت کرے گا، جیسے بہنوں کے بھائی کرتے ہیں۔ اس سے کبھی نہ ڈرنا اور اس سے بڑھ کر اعتبار کسی پر نہ کرنا۔ سمجھ گئیں''۔

''مگر اماں.....''۔ نور بانو نے کچھ کہنا چاہا۔

''اگر مگر نہیں۔ میں نے تمہیں بہت بڑی قسم دی ہے۔ آگے تم جانو''۔ یہ کہہ کر سرفراز بیگم اٹھ گئیں۔

اس کے بعد انہوں نے چھمن بوا کی خبر لی۔ ''بوا..... تم نے تو حد ہی کر دی۔ ایسے حالات میں تم بچیوں کو ان کے ہمدرد سے برگشتہ کر رہی ہو۔ انہیں بدگمانی میں مبتلا کر رہی ہو۔ ارے بچیوں کو تو ان حالات کا پتا ہی نہیں چلنا چاہئے تھا۔ اور تم نے تو انہیں گھر کے آدمی سے خوف زدہ کر دیا''۔

چھمن بوا کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ''آپ کس کی بات کر رہی ہیں بڑی بیگم؟''۔ انہوں نے سہم کر پوچھا۔

''میں چھوٹے ٹھاکر کی بات کر رہی ہوں بوا''۔

''میں نے تو بچیوں کو کچھ بھی نہیں بتایا تھا، وہ تو انہوں نے مجھے بڑبڑاتے ہوئے سن لیا، پھر مجھے منہ کھولنا پڑا''۔

''جو ہوا سو ہوا۔ اب آئندہ تم چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں بچیوں سے کبھی بات نہ کرنا۔ یہ میرا حکم ہے''۔

چھمن بوا ان کے سامنے دم نہیں مار سکیں۔ پہلی بار بڑی بیگم نے ان سے اس طرح بات کی تھی۔ لیکن چھوٹے ٹھاکر کی یہ حمایت ان کے حلق سے نہیں اتری۔ موقع پاتے ہی انہوں نے اس سلسلے میں بہادر علی سے بات کی۔ انہوں نے بہادر علی کو سب کچھ بتایا اور پھر بولیں۔ ''مجھے تو لگتا ہے، چھوٹے ٹھاکر نے بڑی بیگم پر کوئی جادو کر دیا ہے''۔

''جہالت کی باتیں مت کرو''۔ بہادر علی نے الٹا انہیں ڈانٹ دیا۔ ''جانتی بھی ہو، چھوٹا ٹھاکر اس گھر اور گھر والوں کی حفاظت کے لئے رات بھر پہرہ دیتا ہے''۔

چھمن بوا کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ''یہ کیسے کہہ رہے ہو تم؟''۔

''آنکھوں دیکھی کہہ رہا ہوں۔ اور بڑی بیگم کو بھی یہ بات معلوم ہے''۔

''تو پھر وہ اس دن گلی میں ایسی باتیں کیوں کر رہا تھا؟''۔ چھمن بوا نے اچھنبے سے کہا۔

''یہ تو میں نہیں جانتا۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ اسے ہم سب کی حفاظت کی فکر ہے''۔ بہادر علی نے بے حد یقین سے کہا۔ پھر چند لمحے سوچنے کے بعد وہ بولا ''ایک بات سمجھ میں آتی ہے۔ وہ ہماری خاطر ہندوؤں میں اپنا اعتبار قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ ہندو اسے ہمارا ہم نوا اور محافظ سمجھیں۔ ایسا ہوا تو اس کا کام اور مشکل ہو جائے گا''۔

''تو یہ منافقت تو ہوئی نا''۔ چھمن بوا نے تنک کر کہا۔

''یہ منافقت نہیں، اسے مصلحت کہتے ہیں۔ آج کے دور میں یہ سیاست کہلاتی ہے۔ اور یاد کرو، اس دن کے بعد سے ہندوؤں کے جلوس تو رک گئے نا۔ اور مسلمانوں کے جلوس اب بھی نکلتے ہیں۔ چھوٹے ٹھاکر نے انہیں تو کبھی نہیں ٹوکا۔ گلی کا فساد تو بہر حال رک گیا نا''۔

چھمن بوا نے ذہن پر زور دیا۔ بہادر علی کی بات واقعی ٹھیک تھی۔ جس روز چھوٹے ٹھاکر نے دونوں جلوسوں کے شر کا کو سختی سے ڈانٹا تھا اور ہندوؤں کی خاص طور پر حمایت کی تھی، اس دن کے بعد سے ہندوؤں کا کوئی جلوس گلی میں داخل نہیں ہوا تھا۔ مگر مسلمان نہیں رکے تھے۔ اور چھوٹا ٹھاکر بھی اس دن سے جلوس کو روکنے کیلئے نیچے نہیں اترا تھا۔

اس رات چھمن بوا نہیں سوئیں۔ آدھی رات کو وہ دبے پاؤں باہر آئیں۔ انہوں نے دیکھا کہ چھوٹا ٹھاکر کوٹھے پر ٹہل رہا ہے۔ وہ مطمئن ہو گئیں۔ ساتھ ہی انہیں افسوس ہوا کہ اس کے بارے میں اس طرح کی بات کر کے وہ گناہ گار ہوئیں۔ اب وہ اسی طرح اس کا کفارہ ادا کر سکتی تھیں کہ لڑکیوں کو حقیقت بتا دیں۔ لیکن اس کی انہیں ہمت نہیں ہوئی۔ بڑی بیگم نے سختی سے انہیں حکم دیا تھا کہ اب وہ لڑکیوں سے چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں کوئی بات نہ کریں۔

وہ دل پر بوجھ لئے پھرتی رہیں!

.....×.....

اوتار سنگھ مطالعہ کرنے کا عادی تھا۔ لیکن ان دنوں اس کے لئے کچھ پڑھنا ناممکن ہو گیا تھا۔ ایسے میں اچانک اسے عربی کا خیال آ گیا۔ اس نے پرانی کاپیاں اٹھائیں اور عربی کو تازہ کرنے لگا۔ آخری دنوں میں مولوی صاحب نے اسے عربی میں کئی کہانیاں لکھ کر دی تھیں۔ وہ انہیں بھی پڑھنے لگا۔ پھر اس نے ان کہانیوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس کے بعد اس نے اپنے کئے ہوئے اردو ترجمے کو عربی میں منتقل کیا اور اس کا موازنہ مولوی صاحب کی لکھی ہوئی کہانیوں سے کیا۔ اس مشق سے اسے بہت فائدہ ہوا۔ اس کی عربی کی استعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور اس معاملے میں اس کی خود اعتمادی بھی بڑھ گئی۔

اس معمول سے اسے بہت فائدہ ہوا۔ اس میں اس کا دل لگتا تھا، اس لئے اسے خوشی بھی ہوتی۔ ورنہ مطالعے میں دل نہ لگنے کے نتیجے میں اس کے لئے وقت گزارنا بھی مسئلہ ہو گیا تھا۔ اور وہ مسلسل اعصابی تناؤ کا شکار رہنے لگا تھا۔ اس خوشی نے اس تناؤ کو کم کر دیا۔

ماسٹر جی کی حالت اور خراب ہو گئی تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک بار پھر ان کے گھر گیا اور ان کے بیٹوں سے بات کی۔ اس نے انہیں یہاں تک بتا دیا کہ کسی بھی وقت انہیں ماسٹر جی کی طرف سے کوئی بری خبر مل سکتی ہے۔ لیکن یہ سن کر ان کے دل نہیں پسیجے۔ انہوں نے پہلے کی طرح اسے ٹرخا دیا۔ ان کی اس بے حسی نے اسے بہت دکھی کر دیا۔

ملکی صورتحال بھی اور ابتر ہو گئی تھی۔ مارچ میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو انڈیا کا وائسرائے مقرر کر دیا گیا۔ اس تقرری پر کانگریس میں خوشی کے شادیانے بجے۔ وجہ یہ تھی کہ پنڈت جواہر لال نہرو سے ماؤنٹ بیٹن کے قریبی تعلقات تھے۔ یہ بھی حقیقت تھی کہ بعد میں وہ تعلقات کانگریس کے کام آئے۔ ماؤنٹ بیٹن نے پاکستان کی تشکیل کے معاملہ میں جانب داری سے کام لیکر مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ بہت سے ایسے علاقے جنہیں اصولاً پاکستان میں شامل ہونا تھا، پاکستان میں شامل نہ ہو سکے۔ اس کے نتیجے میں مسلمانوں کو جانی نقصان بھی اٹھانا پڑا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

بہر حال جس وقت ماؤنٹ بیٹن نے چارج سنبھالا، پورا ہندوستان یک طرفہ فرقہ واریت فسادات کے نتیجے میں خانہ جنگی میں مبتلا تھا۔اس صورتحال میں مسئلے کا واحد حل تقسیم ہند تھا۔یعنی ہندوستان کی تقسیم اور پاکستان کا قیام ناگزیر ہو چکا تھا۔3 جون کو ماؤنٹ بیٹن نے اپنا منصوبہ پیش کیا، جسے ماؤنٹ بیٹن پلان کا نام دیا گیا۔اس پلان میں 15 اگست 47ء کو اقتدار کی منتقلی کا دن قرار دیا گیا تھا۔

ایک رات اوتار سنگھ کو ٹھے پر پہرہ دے رہا تھا۔آدھی رات کے قریب کا وقت تھا اور وہ تازہ دم تھا۔اس لئے ٹہل رہا تھا۔ٹہلتے ٹہلتے وہ دیوار کے پاس رکا اور گلی میں جھانکنے لگا۔وہ پورے چاند کی رات تھی اور پوری گلی چاندنی میں نہائی ہوئی تھی۔

اچانک اس نے دو افراد کو گلی میں داخل ہوتے دیکھا۔دونوں جوان لڑکے تھے۔ان میں سے ایک جانا پہچانا لگ رہا تھا۔وہ انہیں بہت غور سے دیکھتا رہا۔وہ قریب تو اس نے اسے پہچان لیا، جو اسے جانا پہچانا لگ رہا تھا۔وہ اس کا کلاس فیلو رام گوپال تھا۔

''ارے رام گوپال.....تم یہاں؟''۔اس نے بے ساختہ اسے پکارا

دونوں لڑکوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔وہ اس وقت عین کوٹھے کے نیچے سے گزر رہے تھے۔رام گوپال نے اسے دیکھا۔اس کی آنکھوں میں چمک سی نظر آئی۔

''اوہ اوتار سنگھ۔نمسکار''۔اس نے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

اوتار سنگھ نے جواب میں اسے نمسکار نہیں کیا''کیسے ہو رام؟''

''ٹھیک ہوں.....ہمیشہ کی طرح''۔رام گوپال بولا''تو تم یہاں رہتے ہو؟''۔

''ہاں''۔

''اتنی رات کو کوٹھے پر کیا کر رہے ہو؟''۔

''پڑھ رہا تھا۔بیٹھے بیٹھے ٹانگیں اینٹھ گئیں تو سوچا ٹہل لوں''۔

''پڑھائی؟ اور امتحان سے فارغ ہونے کے فوراً بعد''۔رام کے لہجے میں حیرت تھی۔پھر وہ مسکرایا''ہاں بھئی، میں بھول گیا تھا کہ تم تو پورا سال پڑھنے والوں میں سے''۔مگر پھر اس کے تیور بدلے۔''چوکی داری تو نہیں کر رہے ہو؟''۔اس کے لہجے میں اشتباہ تھا۔

''چوکی داری.....کیسی اور کس کی''اوتار سنگھ نے بے پروائی سے کہا۔''کوئی خطرہ ہو تو چوکی داری بھی کی جائے''۔

رام گوپال شیطنت بھرے انداز میں ہنسا۔''ٹھیک ہی کہتے ہو۔تمہیں تو کوئی خطرہ نہیں''۔

''میری چھوڑو۔اپنی کہو تم اتنی رات کو کہاں جا رہے ہو؟''۔

''گھر جا رہا ہوں۔یہاں ایک دوست سے ملنے آیا تھا''۔

''اتنی رات کو تمہیں اس طرح نہیں گھومنا چاہئے''۔

رام گوپال پھر شیطنت سے ہنسا۔''میں کوئی مسلا تو ہوں نہیں کہ مجھے کوئی خطرہ لاحق ہو''۔اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''ٹھیک کہتے ہو۔ان بے چاروں نے تو کبھی کسی ہندو پر حملہ نہیں کیا''۔

''یہ کام بزدلوں کے بس کا نہیں اوتار سنگھ۔یہ تو ہم جیسے بہادر ہی کر سکتے ہیں''۔

''اکیلے اور نہتے آدمی کو گھیر کر دس آدمی ماریں تو یہ تمہارے نزدیک بہادری ہے۔میں تو اسے بزدلی کہتا ہوں''۔

''وقت قریب آ رہا ہے اوتار سنگھ۔عن قریب تم ہماری بہادری بھی دیکھ لوگے''۔

''بہادروں کی خاطر مدارت کیلئے میں ہر وقت تیار رہتا ہوں''۔اوتار سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا''اس وقت بھی کر سکتا ہوں۔لیکن کچھ مناسب نہیں لگتا۔خواہ مخواہ کسی کی نیند کیوں خراب کریں۔کبھی مناسب وقت میں آنا۔ٹھاکروں کی تواضع بھی دیکھ لینا''۔اس کا لہجہ ذو معنی تھا۔

''ضرور۔اب تو میں گھر دیکھ لیا ہے تمہارا''۔رام گوپال نے ڈھٹائی سے کہا''کسی دن آؤں گا۔چلتا ہوں''۔

وہ چلے گئے۔اوتار سنگھ انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔یہاں تک کہ وہ گلی سے نکل گئے۔

اوتار سنگھ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔رام گوپال کا یہاں نظر آنا خالی از علت نہیں تھا۔یہ ناممکن نہیں تھا کہ وہ یہاں اپنے کسی دوست سے ملنے آیا ہو۔لیکن یہ بات بھی کم خطرناک نہیں تھی کہ اس کا کوئی دوست یہاں رہتا ہے۔

.....×.....

اس روز اوتار سنگھ سو رہا تھا کہ رگھو نے اسے اٹھا دیا تھا، پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔اوتار سنگھ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''کیا بات ہے رگھو؟ خیریت تو ہے نا؟''۔

رگھو ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔''شما کر دینا مالک۔مجبوری تھی، ورنہ آپ کو کبھی نہ جگاتا''۔

''میں پوچھ رہا ہوں، بات کیا ہے؟''۔رات بھر کا جاگا ہوا اوتار سنگھ جھنجھلا گیا۔

رگھو اور گھبرا گیا۔''وہ.....مالک.....وہ.....ڈاکیا آیا ہے''۔

''تو خط لایا ہوگا نا''۔

''کھت نہیں مالک، تار ہے۔وہ کہتا ہے، دس کھت بھی کرنے ہیں''۔

اوتار سنگھ کی نیند ہوا ہو گئی۔وہ اٹھا اور زینے کی طرف لپکا۔اسے تو اب کوئی خط لکھنے والا تھا ہی نہیں۔تار تو ویسے ہی خطرناک ہے۔اس کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ اچھی خبر نہیں ہے۔اور وہ جانتا تھا کہ تار شملہ سے آیا ہے۔

ڈاکیے نے اس سے دستخط لئے اور لفافہ اسے دیا۔اس نے وہیں کھڑے ہو کر لفافہ چاک کیا اور تار نکال کر پڑھا۔وہ ذہنی طور پر اس کے پہلے ہی تیار ہو چکا تھا۔اس کے باوجود اسے شاک لگا۔رات ماسٹر جی کا انتقال ہو گیا تھا۔اسے فوری طور پر شملہ جانا تھا۔

اوتار سنگھ کا ذہن سنسنا رہا تھا۔زندگی کی اذیت کو موت کے سکون نے نگل لیا تھا۔اذیت اٹھانے والے ماسٹر جی کو شانتی مل گئی تھی۔

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اوپر آیا۔رنجنا اسے دیکھ کر گھبرا گئی۔اس کا چہرہ دھواں ہو رہا تھا۔''کیا ہوا مالک؟''۔

''ماسٹر جی.....''اپنی آواز اسے خود ہی اجنبی لگی۔''ماسٹر جی کا دیہانت ہو گیا''۔

''ہائے رام''۔

اوتار سنگھ کے سنسناتے ذہن میں کوئی خیال نہیں تھا۔وہ کچھ سوچنے کے قابل نہیں تھا۔اچانک اسے ماسٹر جی کی خواہش یاد آئی۔ماسٹر جی بار بار اس سے کہتے تھے.....بار بار وعدہ لیتے تھے۔اوتار سنگھ میری چتا کو آگ تم دکھانا۔اسے ماسٹر جی کی آواز سنائی دی۔وہ اس سے یہی کہہ رہے تھے۔

وہ خیال اسے یک لخت شاک سے باہر لے آیا۔ارے.....اسے تو بہت کچھ کرنا ہے۔کئی ذمے داریاں نبھانی ہیں اسے.....اپنی بھی اور دوسروں کی بھی۔اس پر اسے ماسٹر جی کے وارث.....ان کے بچوں کو خیال آیا۔ان لوگوں نے کبھی اپنی ذمے داری کو نہیں سمجھا تھا۔وہ بار بار ان کے پاس جا کر ان کی خوشامد کرتا تھا کہ کم از کم ایک بار ان میں سے کوئی ماسٹر جی کے پاس چلا چلے.....صرف ماسٹر جی کی خوشی کے لئے۔ان کا یہ کرب تو کم ہو جائے کہ ان کے اپنے بیٹوں نے انہیں چھوڑ دیا ہے۔لیکن وہ ہمیشہ اسے ٹالتے رہے۔وہ ان سے اتنا نالاں ہوا کہ اس نے آئندہ ان کے پاس نہ جانے کا عہد کر لیا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

لیکن اب صورت حال اور تھی۔ وہ کتنے ہی برے سہی، بہر حال وہ یتیم ہوئے تھے۔ ان کا باپ مرا تھا۔ تو اب اسے ان کو اطلاع بھی دینی تھی۔

تار تنہا مجھے، انہیں بھی بھیجا گیا ہوگا۔ اس نے سوچا۔ میں نے سینی ٹوریم والوں کو تاکید کی تھی کہ جو اطلاع مجھے دیں، مجھ سے پہلے ان کے گھر والوں کو دیں۔ تو یہ ممکن نہیں کہ انہیں اطلاع نہ ہو۔

کچھ بھی ہو۔ یہ اس کا فرض ہے، ذمے داری ہے۔ ضمیر نے اسے ملامت کی۔ ماسٹر جی کے بیٹے اس کے روحانی بھائی ہیں۔ کیا وہ ان کے دکھ میں شریک نہیں ہوگا۔ انہیں سینے سے لگا کر دلاسا نہیں دے گا۔

ایک نئے عزم سے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور جانے کی تیاری کرنے لگا

''رگھو.....رات کو میں نہیں آ سکوں گا''۔ اس نے رگھو سے کہا ''لیکن جلد سے جلد آنے کی کوشش کروں گا.....''۔

''میں بھی آپ کے ساتھ چلوں مالک؟''۔ رگھو نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''یہ کیسے ممکن ہے''۔ اوتار سنگھ نے تڑپ کر کہا۔ ''تم میرے ساتھ چلے گئے تو گھر کا خیال کون رکھے گا''۔

''رگھو کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ''لیکن مالک.....''۔

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ رات کو میری جگہ تمہیں پہرا دینا ہوگا۔ چوکس رہنا۔ جان چلی جائے پر نیچے والوں پر آنچ نہ آئے''

اب بات رگھو کی سمجھ میں آئی ''آپ کے حکم پر سب قربان ہے مالک۔ آپ چنتا نہ کریں''۔

''میں چلتا ہوں''۔ اوتار سنگھ نے بیگ کندھے پر لٹکاتے ہوئے کہا۔

پہلے وہ ماسٹر جی کے گھر گیا۔ دروازہ ماسٹر جی کی بڑی بہو نے کھولا۔ اوتار سنگھ کو دیکھ کر ایک لمحے کو وہ جھجھکی۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اسے نمسکار کیا۔ ''آپ..... آپ کو پتا ہے؟''۔

''جی.....ابھی کچھ دیر پہلے تار آیا تھا۔ مجھے بہت.....''۔

''تار یہاں بھی آیا تھا۔ بھگوان نے بڑی دیا کی بابو جی پر''۔

ابھی تک اوتار سنگھ کو اندر آنے کو نہیں کہا گیا تھا۔ ''وہ تو دیا کرتا ہے۔ پر بندے تو اپنا فرض بھی پورا نہیں کرتے''۔ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ پھر بولا ''کسی کو بلا دیں نا۔ میں شملہ جانے کے لئے آیا ہوں''۔

''گھر میں تو کوئی بھی نہیں بچوں کے سوا''۔

''کیوں؟ ہری بھیا کی تو اسکول کی چھٹیاں ہوں گی''۔

''وہ تو بھیا شہر سے باہر گیا ہے۔ ایک ہفتہ ہو گیا''۔

''تو بدری بھیا رات کی ڈیوٹی کر کے آئے ہوں گے۔ انہیں جگا دیں''۔

''کل سے ان کی دن کی ڈیوٹی لگی ہے''۔

اوتار سنگھ نے ایسے بے حسی کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اسے بڑی شدت سے غصہ آیا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ گھر میں کوئی نہیں ہے تو تار کس نے پڑھا۔ اسے ماسٹر جی کی موت کا پتا کیسے چلا۔ اور وہ اسے اندر کیوں نہیں بلا رہی ہے۔ اسی لئے تا کہ وہ اندر جائے گا تو اسے مردوں کی موجودگی کا پتہ چل جائے گا۔ ''اچھا بھابی، میں چلتا ہوں''۔ اس نے کہا اور جانے کے لئے مڑا۔

''جل پان تو کرتے جاؤ بھیا''۔

اس نے پلٹ کر غصے سے اس عورت کو دیکھا۔ ''جہاں کریا کرم کا معاملہ ہو، وہاں جل پان کسے یاد رہتا ہے''۔ یہ کہہ کر وہ پلٹا اور واپس چل دیا۔

.....×.....

گھر میں عید کا سا سماں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ پچھلے روز چھوٹے ٹھاکر کے لئے سیا جانے والا آخری کرتا بھی مکمل ہو چکا تھا۔ اس کے بعد استری کا سلسلہ شروع ہوا۔ اب ایک درجن جوڑوں پر استری کوئی آسان کام تو نہیں ہوتا، کوئلوں کی استری تھی۔ اور استری کرنے والی سرفراز بیگم، جو یہ اہتمام چھوٹے ٹھاکر کیلئے کر رہی تھیں۔ ایک ایک سلوٹ دور کی جا رہی تھی۔

سرفراز بیگم خوش بھی تھیں اور بے تاب بھی۔ ان کا حال بچوں جیسا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ جلد سے جلد اوپر چلی جائیں اور چھوٹے ٹھاکر کو یہ جوڑے دیں۔ اس کے بعد اس کے چہرے پر غیر معمولی خوشی دیکھنا ان کی خواہش تھی۔

اس روز سرفراز بیگم نے کھانے میں بالکل دل چسپی نہیں لی۔ یہ کام انہوں نے چھمن بوا کے سپرد کر دیا اور خود استری کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ ایک کرتا استری کرتیں تو اس کے بعد وہ اسے خس کے عطر میں بسا تیں اور پھر تہ کر کے رکھ دیتیں۔

لڑکیوں میں نور بانو تو ان کی اس کیفیت پر جل کڑھ رہی تھی۔ حور بانو اور گلنار بار بار ماں کو تعاون کی پیشکشیں کرتیں۔ ''اماں.....آپ تھک گئی ہوں گی۔ لائیں، ایک کرتا میں استری کر دوں''

''لو.....اس میں تھکن کیسی میرے لئے تو یہ خوش کرنے والا کام ہے۔ اور ایک جوڑا استری کرنے میں لگتا ہی کیا ہے''۔ سرفراز بیگم کہتیں۔

لیکن یہ بس کہنے کی بات تھی۔ کلف لگے کپڑے پر استری کرنے میں وقت لگتا ہے۔ بہر حال سرفراز بیگم نے دو بیٹوں کو ایک ایک کرتا کاڑھنے کی اجازت تو دے دی تھی۔ لیکن وہ کسی کو استری کرنے کی سعادت دینے کے موڈ میں نہیں تھیں۔

یہ سلسلہ چلتا رہا۔ دوپہر ہو گئی۔ ''اماں.....چلیں کھانا تو کھا لیں''۔ نور بانو نے کہا۔

''تم لوگ کھا لو۔ میں تو کام ختم کر کے کھاؤں گی''۔

''ارے اماں.....ایسا بھی کیا۔ اور کام تو بہت باقی ہے''۔ نور بانو تنک کر بولی۔

''بہت کہاں۔ بس دو جوڑے ہی تو رہ گئے ہیں''۔

''جس طرح سے آپ کر رہی ہیں تو ان دو جوڑوں میں دو گھنٹے تو لگیں گے ہی''۔

گھر کا اصول تھا کہ دستر خوان پر سب لوگ ساتھ ہی بیٹھتے تھے۔ سرفراز بیگم کہتی تھیں کہ جو دستر خوان پر نہیں بیٹھے گا، اسے بعد میں کھانا نہیں ملے گا۔

انہیں خیال آیا کہ خود اپنا اصول توڑ کر وہ کوئی اچھی مثال قائم نہیں کر رہی ہیں۔ انہیں خود بھی اپنے اصول پر عمل کرنا ہوگا۔ اور اس کے باوجود یہ کوئی اچھی بات نہیں ہوگی۔ آئندہ کبھی بچیاں بھی یہی کر سکتی ہیں۔

چناں چہ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ''چلو بھئی، دستر خوان لگاؤ۔ پھر کھانا کھا لیں''۔

مگر کھانا بھی انہوں نے بے دلی سے کھا۔ دل تو ان کا استری میں اٹکا ہوا تھا۔ بچیوں نے یہ بات محسوس کر لی۔ ''اماں.....ٹھیک سے کھانا کھائیں''۔ نور بانو نے انہیں ٹوک دیا۔

''کھا تو رہی ہوں''۔

کھانے کے بعد وہ دوبارہ استری کرنے میں مصروف ہو گئیں

وہ آخری جوڑا استری کر رہی تھیں کہ اوپر سے رنجنا آ گئی۔ ''یہ کیا کر رہی ہیں بڑی بیگم؟''۔

''چھوٹے ٹھاکر کیلئے کپڑے سیئے ہیں۔ اب استری کر رہی ہوں۔ چھوٹا ٹھاکر تو گھر میں ہی ہے نا؟''۔

''نہیں بڑی بیگم۔ وہ تو شملہ گئے ہیں''۔

سرفراز بیگم کا ماتھا ٹھنکا۔ یہ ہفتے کا دن تو نہیں۔ چھوٹا ٹھاکر تو ہفتے کے دن وہاں جاتا ہے۔ پھر آج کیوں؟ ''خیریت تو ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''ماسٹر جی کا دیہانت ہو گیا بڑی بیگم''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''اوہ.....سرفراز بیگم کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔''تو وہ واپس کب آئے گا؟''۔ان کا استری کرنا اب بھی نہیں رکا تھا۔

''کہہ رہے تھے،کل صبح تک آ جائیں گے.....ماسٹر جی کا اتم سمسکار کر کے''۔

''کریا کرم تو یہاں دلی میں ہوگا نا؟''۔

''نہیں بڑی بیگم۔وہیں ہوگا.....شملے میں''۔

''ارے.....کیوں؟''سرفراز بیگم کے لہجے میں حیرت تھی۔''ان کے بچے تو یہاں ہیں.....دلی میں۔وہ جائیں گے وہاں؟ زندگی میں تو کبھی گئے نہیں''۔

''وہ کہاں جانے والے ہیں بڑی بیگم۔ماسٹر جی نے چھوٹے ٹھاکر سے وچن لیا تھا کہ ان کی چتا کو آگ وہی دیں گے.....''۔

''ہائے اللہ،بیٹوں کے ہوتے ہوئے!''۔

''جی بڑی بیگم۔ماسٹر جی نے کہا تھا کہ ان کے بیٹے آئیں اور موجود ہوں تو بھی ان کی چتا کو آگ چھوٹے ٹھاکر ہی دیں گے''۔رنجنا بولی۔''مگر بڑی بیگم،ان کے بچے تو اتنے مورکھ ہیں کہ مجھے نہیں لگتا،وہ جائیں گے''۔

''ٹھیک کہتی ہو۔ایسے ناخلف بچوں سے کوئی امید نہیں رکھی جا سکتی''۔بڑی بیگم نے کہا۔پھر آخری کرتے پر عطر لگایا اور اسے تہ کرنے لگیں۔''صبح تو آ جائے گا چھوٹا ٹھاکر''۔ان کے لہجے میں بچوں کی سی بے تابی تھی۔

''کہا تو یہی ہے بڑی بیگم۔اور اب وہ وہاں رکیں گے کیوں؟''۔رنجنا نے کہا۔پھر حیرت سے تمام جوڑوں کو دیکھا۔''یہ اتنے سارے کپڑے!یہ سب آپ نے چھوٹے ٹھاکر کیلئے سیئے ہیں؟''۔

''اتنے سارے کہاں،صرف بارہ جوڑے ہیں''۔سرفراز بیگم نے سادگی سے کہا۔''انتوں ہی کی فرمائش کی تھی اس نے''۔

''چھوٹے ٹھاکر نے خود کہا تھا!''۔رنجنا حیران تھی۔

''ہاں!اسے بہت اچھا لگا تھا یہ لباس''۔سرفراز بیگم نے کہا۔''اب یہ کپڑے میں ٹرنک میں رکھ دوں۔کل وہ آئے گا تو اسے دوں گی''۔

.....×.....

اوتار سنگھ ماسٹر جی کے چہرے کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔مرنے کے بعد ان کے چہرے پر بے پناہ سکون تھا۔آنکھیں بند تھیں۔اور انہیں دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ مرے نہیں،بس گہری نیند سو گئے ہیں۔

تو یہ ہوتی ہے موت!اوتار سنگھ نے سوچا۔زندگی کے ساتھ کتنے بکھیڑے ہوتے ہیں۔غم روزگار،غم جاناں۔گزرے ہوئے کل کے پچھتاوے۔آج کی مصروفیت اور آنے والے کل کی فکر۔نہ ملنے والی محبتوں کا دکھ۔لوگوں سے شکایتیں۔کتنی بھاری چیز ہے زندگی۔پھر بھی آدمی موت سے ڈرتا ہے.....گھبراتا ہے۔زندگی سے چمٹے رہنا چاہتا ہے۔بیماری کی بدترین اذیت اٹھا کر بھی جینا چاہتا ہے۔نہیں سمجھتا کہ موت میں ہی مکتی ہے.....نجات ہے۔

لیکن نہیں۔ایسا نہیں ہے۔شاید موت کے پہلے مرحلے میں اس کی سمجھ میں یہ بات آ جاتی ہے کہ موت ہر دکھ سے نجات کا نام ہے۔تبھی تو مرنے کے بعد آدمی کے چہرے پر اتنا سکون ہوتا ہے۔ماسٹر جی کے چہرے پر کوئی تاسف نہیں۔اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے باہیں پھیلا کر موت کا استقبال کیا ہوگا۔

''ان کے بچے نہیں آئے؟''۔ڈاکٹر براؤن کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

اوتار سنگھ نے سر اٹھا کر خالی خالی نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔وہ اپنے خیالوں میں ایسا گم تھا کہ اس نے ڈاکٹر کی بات نہیں سنی تھی۔''کیا کہا آپ نے؟''۔

''ان کے بچے آج بھی نہیں آئے؟''۔ڈاکٹر نے دہرایا۔

''سب مصروف ہیں۔گھر پر کوئی نہیں تھا چھوٹے بچوں اور عورتوں کے سوا''۔

''ان کا انتظار کرو گے؟''۔

اوتار سنگھ کے نزدیک وہ بڑی ذمے داری تھی۔وہ کوئی فیصلہ کن جواب نہیں دے سکتا تھا۔''آپ کی کیا رائے ہے ڈاکٹر؟''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

ڈاکٹر نے کندھے جھٹک دیئے۔''مردہ خانے میں لاش دس دن بھی محفوظ رہ سکتی ہے''۔وہ بولا۔''لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ان کے گھر سے کوئی آئے گا۔وہ آنے والے ہوتے تو آپ سے پہلے آ چکے ہوتے۔دوسری بات ان کی وصیت ہے۔یہاں انہوں نے ہر ڈاکٹر، ہر نرس، ہر وارڈ بوائے سے یہی کہا کہ ان کی آخری رسومات یہیں ہوں گی۔اور یہ کہ ان کے بیٹے موجود ہوں یا نہ ہوں، ان کا چتا کو آگ آپ دیں گے''۔

اوتار سنگھ کے دل سے ایک بوجھ سا ہٹ گیا۔''تو ٹھیک ہے۔میں تیاری کراتا ہوں۔اس کام میں دیر کرنا مناسب نہیں''۔

وہ باہر چلا آیا۔اس وقت اس کے دل میں ایک خیال آیا۔اوپر والا جو کچھ کرتا ہے، اس میں بہتری ہوتی ہے۔وہ چاہتا تو ان کے بیٹوں کے دل میں یہاں آنے کا خیال ڈال دیتا۔اور وہ آ جاتے۔لیکن کیا ان کی موجودگی میں وہ ماسٹر جی کی وصیت پر عمل کر پاتا۔وہ یہی سوچتا کہ ماسٹر جی کی چتا کو آگ دکھانے کا اصل حق ان کے بیٹوں کا ہے۔وہ تو بہت بڑی آزمائش میں پڑ جاتا۔اس کے لئے وقت حتمی طور پر یہ سوچنا مشکل تھا کہ اس صورت حال میں وہ کیا کرتا۔بہر حال وہ جو بھی کرتا، اس کے نتیجے میں عمر بھر کے لئے اس کے ضمیر پر بوجھ آ جاتا۔اگر ماسٹر جی کی چتا ان کے بیٹے جلاتے تو وہ عمر بھر یہ سوچ کر کڑھتا کہ اس نے ماسٹر جی کی آخری خواہش پوری نہیں۔ان کے آخری حکم کی تعمیل نہیں کی۔اور اگر چتا وہ جلاتا تو اسے عمر بھر یہ سوچ کر کڑھتا کہ اس نے ماسٹر جی کی آخری خواہش پوری نہیں کی۔ان کے آخری حکم کی تعمیل نہیں کی۔اور اگر چتا وہ جلاتا تو اسے عمر بھر یہ پھانس چبھتی رہتی کہ اس نے ماسٹر جی کے بیٹوں سے ان کا حق چھینا ہے۔انہیں ان کے حق سے محروم کیا ہے۔واقعی.....اوپر والے کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے کیوں کہ وہ سب جانتا ہے۔

اس وقت شام ہو چکی تھی۔اس کا اندازہ تھا کہ ماسٹر جی کی آخری رسومات ادا ہوتے ہوئے دس بج جائیں گے۔سوال یہ تھا کہ وہ رات کو ہی واپسی کیلئے نکل سکے گا یا نہیں۔اس نے ادھر ادھر معلومات کیں تو پتہ چلا کہ آخری گاڑی گیارہ بجے روانہ ہوتی ہے۔

اس کے بعد وہ اس کوشش میں لگ گیا کہ ہر کام وقت پر ہو جائے اور رات کو ہی دہلی کے لئے روانہ ہو جائے۔اسے گھر کی فکر ہی ستا رہی تھی۔

تمام کام آسانی سے ہو گئے۔سوا نو بجے ماسٹر جی کی ارتھی شمشان گھاٹ لے جانے کیلئے اٹھائی گئی۔اپنے کندھے پر ارتھی اٹھاتے ہوئے اوتار سنگھ کو یاد آیا کہ وہ ماسٹر جی کے ان کے گھر سے اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر ہی اپنے گھر لایا تھا۔اور آج وہ اور لوگوں کے ساتھ مل کر انہیں ان کے آخری سفر پر لے جا رہا تھا۔شمشان گھاٹ تک کے سفر میں وہ ماسٹر جی کے ساتھ گزرے وقت کو دہراتا رہا۔کیسے وہ اسے پڑھاتے تھے۔کیسے وہ ان سے سوال کرتا تھا۔ٹیڑھے سوالوں پر کیسے وہ گھبراتے تھے۔ڈرتے تھے کہ کہیں بڑے ٹھاکر ان سے باز پرس نہ کریں۔کیسے وہ اس طرح کے سوالوں سے بچتے تھے اور کیسے اس کے اصرار پر اس سے وعدہ لیتے تھے کہ وہ یہ بات کسی سے نہیں کہے گا۔تب وہ اپنی رائے دیتے تھے۔پھر ان کی بیماری کا عرصہ.....ان کا سینی ٹوریم آنا، یہاں اس کا نام.....ان سے باتیں کرنا۔ایک ایک لمحہ اسے یاد آتا رہا۔اس کی آنکھیں خشک رہیں۔لیکن سینے پر جیسے کوئی بڑا اور بھاری پتھر آ گرا۔اس بوجھ سے اسے سانس لینا دشوار محسوس ہونے لگا۔

پھر آخری مرحلہ آ گیا۔ماسٹر جی کی چتا تیار کر دی گئی۔آگ دکھانے کے لئے جلتی ہوئی لکڑی اس کے ہاتھ میں دے دی گئی۔اس لمحے اسے خیال آیا کہ اس نے اتنی موتیں دیکھیں۔لیکن اس مرحلے سے وہ پہلی بار گزر رہا ہے۔یہ کام تو وہ اپنے پتا جی کے لئے بھی نہ کر سکا۔موقع ہی نہیں ملا اسے۔وہ تو اپنے باپ کو بے گور و کفن چھوڑ کر آنے پر مجبور ہو گیا تھا۔وہ تو خود ہی ریت میں دفن ہو گئے ہوں گے۔وہ بھی اور چاچا جمال دین بھی اور ویر جی بھی اور مولوی صاحب بھی۔وہ کسی کے لئے کچھ نہ کر سکا۔اپنی جان بچا کر بھاگ آیا۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اسے ایسا لگا کہ اس کے سینے پر رکھا ہوا پتھر پگھل رہا ہے۔کوئی چیز وہاں سے حرکت کر کے اس کے حلق کی طرف بڑھ رہی تھی۔اس کی آنکھیں جلنے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔

وہ لرزتے قدموں سے آگے بڑھا اور اس نے ماسٹر جی کی چتا کو آگ دکھا دی۔اس نے سوچا، چلو کوئی ایک ذمے داری پوری کرنے کا تو موقع ملا مجھے۔

اس وقت رات کے ٹھیک دس بجے تھے!

.....x.....

عین اس وقت دہلی میں لوگوں کے سونے کا وقت تھا!

رگھو نے چھوٹے ٹھاکر کی لاٹھی کو یوں چھوا، جیسے وہ کوئی بہت مقدس چیز ہو۔پھر اس نے لاٹھی کو اوپری حصے سے مضبوطی سے پکڑ لیا۔اس کو چھونے سے اسے ایسا لگا، جیسے اس کے جسم میں طاقت کی لہر دوڑ گئی ہو۔

عام حالات میں وہ اس لاٹھی کو چھونے کی جرات بھی نہ کرتا۔لیکن یہ عام حالات نہیں تھے۔چھوٹا ٹھاکر اس پر بہت بھاری ذمے داری ڈال کر گیا تھا اور اسے وہ نبھانی تھی۔چھوٹے ٹھاکر کی موجودگی میں وہ خود کو بہت چھوٹا اور کمزور محسوس کر رہا تھا۔لاٹھی میں اس کی دل چسپی کی یہ وجہ نہیں تھی کہ وہ اسے استعمال کرنا جانتا تھا، لٹھیا بازی کے فن سے تو وہ بالکل ناواقف تھا۔بس اس وقت وہ لاٹھی اس کے لئے چھوٹے ٹھاکر کی حیثیت رکھتی تھی۔لاٹھی ہاتھ میں تھی تو اسے لگ رہا تھا کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔بلکہ چھوٹے ٹھاکر اس کے ساتھ ہیں۔

اسے لاٹھی لے کر جاتے ہوئے دیکھا تو رنجنا نے پوچھا۔''تم کہاں چلے؟''۔

''اوپر جا رہا ہوں.....پہرہ دینے''۔

''اس کی کیا ضرورت ہے؟''۔

''مالک کا حکم ہے تو ضرورت بھی ہو گی''۔

چھوٹے ٹھاکر کے حوالے پر رنجنا چپ ہو گئی۔مگر ایک لمحے کے بعد بولی۔''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی''۔

''تو کیا کرے گی چل کر؟''۔

''تمہارا ساتھ دوں گی۔اور کچھ تو میرے بس میں نہیں ہے''۔

''اس کی ضرورت نہیں۔تو سو جا''۔

لیکن رنجنا مصر رہی۔رگھو نے بھی سوچا، کوئی حرج نہیں ہے۔

اوپر پہنچ کر رگھو ٹہلنے لگا۔وہ اس وقت پوری طرح اوتار سنگھ کے انداز کی نقل کر رہا تھا۔ٹہلتے ٹہلتے اچانک وہ بیرونی دیوار کے پاس رکتا، چند لمحے نیچے گلی میں جھانکتا رہتا اور پھر ٹہلنا شروع کر دیتا۔

رنجنا بھی اس کے ساتھ ٹہل رہی تھی۔مگر تھوڑی دیر میں وہ تھک گئی۔اس کی ٹانگیں دکھنے لگیں۔''اب بس بھی کرو''۔اس نے فریاد کرنے والے انداز میں کہا۔

''یوں ٹہلتے رہنا ضروری ہے کیا؟''۔

''ہاں۔مالک روز یہی کرتے ہیں''۔

''میں تو تھک گئی ہوں''۔رنجنا نے کہا اور کرسی پر جا بیٹھی۔

کچھ دیر بعد رگھو بھی اس کے پاس آ بیٹھا۔''اتنا چلتے ہیں ٹھاکر!''۔رنجنا نے حیرت سے کہا۔

''نہیں پگلی۔میں تو جلدی تھک گیا ہوں۔وہ اتنی جلدی نہیں بیٹھتے''۔رگھو نے کہا۔''میری ان کی عمر میں بھی تو فرق ہے''۔

''مالک سے تمہارا کیا مقابلہ''۔وہ تنبیہی لہجے میں بولی۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''توبہ توبہ، میں چھوٹے ٹھاکر سے کیوں مقابلہ کروں گا۔ میں دھرتی ہوں تو وہ آکاش ہیں''۔ رگھو نے دونوں کان پکڑے اور پھر دونوں ہاتھوں سے رخسار پیٹنے لگا۔

''میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ وہ بہت دیر تک چلتے رہتے ہیں۔ اتنی جلدی نہیں بیٹھتے وہ''۔

''اور رات بھر ٹہلتے ہیں۔ کتنا تھک جاتے ہوں گے''۔

''یہی تو میں بھی سوچتا ہوں''۔

''ہائے رام''۔ اچانک رنجنا نے کہا اور آنکھ پر ہاتھ رکھ لیا۔

رگھو نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''کیا ہوا؟''۔

''میری الٹی آنکھ پھڑک رہی ہے''۔ رنجنا کے لہجے میں پریشانی تھی۔

''تو کیا ہوا؟ تو اس طرح سے کیوں چیخی؟''۔

''تم بھی نرے بدھو ہو۔ پتا نہیں، الٹی آنکھ پھڑکنا اشبھ ہوتا ہے۔ کوئی مصیبت آنے والی ہو تو الٹی آنکھ پھڑکتی ہے''۔

رگھو چند لمحے سوچتے رہا۔ کچھ ایسا ہی ماں بھی کہتی تھی۔ پر نتو..... اس نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ ''عورت کی الٹی آنکھ پھڑکنا شبھ ہوتا ہے۔ ہاں مرد کی سیدھی آنکھ پھڑکنا اشبھ ہوتا ہے''۔

''تم الٹا بول رہے ہو۔ یہ تو مرد ذات کے لئے ہے''۔

''تم الٹا سمجھ رہی ہو''۔

دونوں میں بحث ہونے لگی۔ ''میری الٹی آنکھ پھڑکنا اشبھ ہے''۔ رنجنا نے زور دے کر کہا۔

''مردوں کی الٹی آنکھ پھڑکنا اشبھ ہوتا ہے مورکھ۔ عورت کی الٹی آنکھ پھڑکنا شبھ ہے''۔

''بے بھگوان''۔ اچانک رنجنا نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ ''میں کہہ رہی تھی نا کہ اشبھ ہوتا ہے۔ سو ہے''۔ یہ کہہ کر وہ زینے کی طرف لپکی۔

''کچھ بتاؤ تو۔ ہوا کیا؟''۔ رگھو نے پریشان ہو کر پوچھا۔

رنجنا جاتے جاتے پلٹی۔ ''دودھ کی دیگچی چولہے پر رکھ کر آئی تھی میں۔ اب تک یا تو سارا ابل چکا ہوگا۔ یا جل چکا ہوگا۔ جبھی تو میں کہوں کہ میری الٹی آنکھ کیوں پھڑک رہی ہے۔ ہوانا اشبھ انجام''

وہ نیچے چلی گئی۔ رگھو پھر اٹھا اور ٹہلنے لگا۔

.....x.....

جس وقت اوتار سنگھ نے شملہ میں ماسٹر کانتی پرشاد جی کی چتا کو آگ دی۔ اس وقت دہلی میں سرفراز بیگم کے گھر میں سب لوگ سونے کے لئے لیٹ چکے تھے۔ سرفراز بیگم بہت تھکی ہوئی تھیں۔ درجن بھر جوڑوں پر استری کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ جب کہ کپڑوں پر کلف بھی ہو۔ سہ پہر کو وہ اس کام سے نمٹی تھیں اور انہوں نے کپڑے ایک ٹرنک میں رکھ دیئے تھے۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

وہ بچوں کی طرح پرجوش تھیں۔بس کسی طرح وہ سو جائیں اور اٹھیں تو صبح ہو چکی ہو۔چھوٹا ٹھاکر واپس آ چکا ہو۔وہ جائیں اور کپڑے اسے دے دیں۔وہ کتنا خوش ہوگا۔اس کی وہ خوشی دیکھنے کے لئے وہ تڑپ رہی تھیں۔

وہ بستر پر لیٹیں اور لیٹتے ہی بے خبر سو گئیں۔

چھمن بوا تو سب سے پہلے سونے اور سب سے پہلے اٹھنے کی عادی تھیں۔وہ سرفراز بیگم سے پہلے ہی سو چکی تھیں۔تینوں لڑکیاں بھی سونے کیلئے لیٹ چکی تھیں۔نور بانو سب سے آخر میں سوتی تھی۔اسے سونے سے پہلے مطالعہ کرنے کی عادت تھی۔مطالعہ کرتے کرتے جب آنکھیں بند ہونے لگتیں تو وہ لائٹ بند کر کے لیٹتی اور لیٹتے ہی سو جاتی۔

نور بانو کو جماہیاں آنے لگیں۔اس نے کتاب بند کی اور اٹھ کر ایک انگڑائی لی۔کتاب کو اس کی جگہ پر رکھ کر اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔دونوں بہنیں بستر پر تھیں اور سو چکی تھیں۔اس نے روشنی گل کی اور خود بھی سونے کے لئے لیٹ گئی۔اسے نہیں معلوم تھا کہ حور بانو ابھی تک نہیں سوئی ہے۔

حور بانو جاگ رہی تھی۔لیکن یہ بات وہ کسی پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔اس کے نہ سونے کی ایک خاص وجہ تھی۔ایک کام تھا، جو اسے سب کے سونے کے بعد کرنا تھا۔

نور بانو پڑھ رہی تھی اور حور بانو چڑ رہی تھی۔یہ سوتی کیوں نہیں۔اس نے جھنجلا کر سوچا۔وہ جانتی تھی کہ نور بانو کے سوا باقی سب لوگ سو چکے ہیں۔اس وقت جاگتی ہوئی نور بانو ہی اس کی راہ کی واحد رکاوٹ تھی۔

نور بانو نے روشنی گل کی اور سونے کے لئے لیٹی تو حور بانو نے سکون کی سانس لی۔اس کے ساتھ ہی اس کا دل تیز دھڑکنے لگا۔آنے والے لمحوں کا تصور ہی اس کے لئے ہیجان انگیز تھا۔

وہ جانتی تھی کہ نور بانو لیٹتے ہی سو جاتی ہے۔اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اسی لمحے وہ اٹھ کھڑی ہو۔لیکن وہ مکمل احتیاط سے کام کرنا چاہتی تھی۔کوئی غیر ضروری خطرہ مول نہیں لینا چاہتی تھی۔

ایسے میں ایک ایک پل ساعت بن کر گزرتا ہے۔وقت کی رفتار بھی کم ہو جاتی ہے۔نہ جانے کیسے وہ ضبط کر رہی تھی۔

بالآخر اس کے اندازے کے مطابق نور بانو کو لیٹے ہوئے آدھا گھنٹا ہو گیا تو وہ اٹھی اور دبے پاؤں کمرے سے نکل آئی۔اس کا رخ اس کوٹھری کی طرف تھا، جہاں صندوق رکھے تھے۔کمرے کے دروازے پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔دونوں بہنیں ساکت تھیں اور سو رہی تھیں۔

کوٹھری کے قریب وہ کمرا تھا، جہاں اماں سوتی تھیں۔کوٹھری میں داخل ہونے سے پہلے اس نے اماں کے کمرے میں جھانکا۔ظاہری آثار بتاتے تھے کہ اماں بھی بے خبر سو رہی ہیں۔لیکن اسے سب سے زیادہ ڈر اماں سے ہی تھا۔اماں کی نیند بہت کچی تھی۔ذرا سے کھٹکے پر اٹھ جاتی تھیں۔

بہر حال وہ پلٹی اور کوٹھری میں داخل ہوئی۔گھر کا تمام فاضل سامان کوٹھری میں ہی رکھا جاتا تھا۔وہ اس طرف بڑھی، جہاں صندوق رکھے تھے۔اچانک اسے خیال آیا کہ روشنی کی ضرورت ہے۔وہ پلٹ کر اپنے کمرے میں گئی اور لیمپ اٹھا لائی۔کوٹھری میں اس نے لیمپ روشن کیا۔روشنی کوٹھری سے باہر جا رہی تھی۔اس لئے اس نے کوٹھری کا دروازہ بھیڑ دیا۔

وہ اوپر تلے تین ٹرنک تھے۔سب سے نیچے سب سے بڑا اور سب سے چھوٹا اوپر۔اس کا اندازہ تھا کہ اس کی مطلوبہ چیز اوپر والے ٹرنک میں ہی مل جائے گی۔اس نے لیمپ ایک اونچی جگہ پر رکھ دیا اور اوپر والا ٹرنک کھولا۔

ٹرنک کھولتے ہی اس کا دل خوش ہو گیا۔اس کی مطلوبہ چیز اوپر ہی موجود تھی۔

اماں نے دو درجن جوڑے ترتیب اور سلیقے سے رکھے تھے۔اوپر صرف کرتے تھے اور کرتوں کے نیچے پاجامے۔اس نے اوپر والے کرتے کو غور سے دیکھا اور چھوا۔وہ اس کے ہاتھ کا کاڑھا ہوا نہیں تھا۔اماں نے شاید کرتے اس طرح سے رکھے تھے کہ جس کرتے پر سب سے آخر میں استری کی تھی، وہ سب سے اوپر تھا اور اسے یاد تھا کہ اماں نے سب سے پہلے اس کا کاڑھا ہوا کرتا استری کیا تھا۔اس کا مطلب تھا کہ وہ کرتا سب سے نیچے ہوگا۔

اس نے بڑی آہستگی اور احتیاط سے ایک ایک کرتا اٹھایا اور دیکھا۔اپنی کڑھائی کو وہ اچھی طرح پہچانتی تھی۔اس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔اس کا کاڑھا ہوا کرتا سب سے نیچے تھا۔اس نے وہ کرتا نکال لیا اور باقی کرتوں کو دوبارہ سلیقے سے ٹرنک میں رکھ دیا۔ایسے کہ وہ ذرا بھی نہ مسکیں۔

اپنا کاڑھا ہوا کرتا اپنے کندھے پر ڈال کر اس نے آہستگی سے ٹرنک بند کیا، لیمپ بجھایا اور کوٹھری سے نکل آئی۔اس نے اماں کے کمرے میں جھانکا۔وہ بدستور بے خبر، اسی کروٹ سو رہی تھیں۔اس نے اطمینان کی سانس لی اور اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

اپنے بستر پر لیٹ کر اس نے اس کرتے کو کھولا اور اپنے اوپر چادر کی طرح پھیلا لیا۔یہ کرتا میں نے کتنی محبت سے کاڑھا ہے چھوٹے ٹھاکر کے لئے۔اس نے سوچا۔اس یقین کے ساتھ کہ وہ محبت اس تک پہنچ جائے گی۔لیکن اب رات بھر یہ کرتا میرے ساتھ رہے گا تو میری محبت کی خوشبو اس میں اس طرح بس جائے گی کہ کبھی بھی نہیں مٹے گی۔وہ وارفتگی سے سوچ رہی تھی۔اس کرتے میں اب میرے جسم کی خوشبو بھی ہوگی۔اس خیال سے وہ شرما گئی۔

وہ کرتا اس کے پاس رات بھر کا مہمان تھا۔کل اماں اسے دوسرے کرتوں کے ساتھ چھوٹے ٹھاکر کو دے آئیں گی۔اور کون جانے کہ اس کی محبت کی سچائی کی وجہ سے، اس کی خوشبو کی وجہ سے چھوٹا ٹھاکر سب سے پہلے اسے ہی پہنے۔کیا پتا، وہ یہ کرتا کل ہی پہنے اور کسی طرح اسے دیکھنے کا موقع بھی مل جائے۔کیسا لگے لگا وہ اس کرتے میں..... جیسے مغل شہزادہ! اس کے کانوں میں اماں کے الفاظ گونجے۔

اس خیال نے اسے تصور کی دنیا میں پہنچا دیا، جہاں وہ چھوٹے ٹھاکر کو یہ کرتا پہنے دیکھ سکتی تھی اور دیکھ رہی تھی۔

اس تصور سے کھیلتے کھیلتے نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔اس کی آنکھیں مندنے لگیں۔نیند پلکوں پر بوجھ بن گئی تھی۔اچانک اس خیال نے اسے چونکا دیا کہ لیمپ تو وہ کوٹھری میں ہی بھول آئی ہے۔

اس نے سوچا کہ کوٹھری میں جائے اور لیمپ اٹھا لائے۔لیکن نیند کا غلبہ اس قدر تھا کہ اس میں ہلنے کی بھی سکت نہیں تھی۔اس نے بے پروائی سے سوچا۔چھوڑو..... صبح دیکھا جائے گا۔ویسے بھی مجھے تو صبح سب سے پہلے اٹھنا ہے۔اگر کسی نے مجھے یہ کرتا اوڑھے ہوئے دیکھ لیا تو.....؟ نہیں..... مجھے سب سے پہلے جاگنا ہے اور جا کر اس کرتے کو ٹرنک میں رکھنا ہے۔تب لیمپ بھی لا کر یہاں رکھ دوں گی۔

اے اللہ..... صبح سب سے پہلے مجھے جگا دیجئے گا۔اس نے بڑے خشوع و خضوع سے اللہ سے دعا کی۔میری محبت کا پردہ رکھ لیجئے گا۔

اسے پتا نہیں تھا کہ اس کی دعا اللہ کی بارگاہ میں قبول ہو گئی ہے!

بہادر علی نے دیوار کے ساتھ کھڑی چارپائی سیدھی کر کے بچھائی اور ملحقہ کوٹھری میں چلا گیا۔وہاں اس کا بستر تھا۔اس کا صندوق تھا، جس میں اس کے کپڑے اور دوسری چیزیں ہوتی تھیں۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

وہ گدا اور چادر لے کر آیا اور چارپائی پر بستر بچھایا۔ پھر وہ تکیہ لے کر آیا۔ اس کے بعد اس نے سرہانے کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں رات کو سونے سے پہلے سرہانے رکھنا وہ کبھی نہیں بھولتا تھا۔ نہ جانے کب ضرورت پڑ جائے۔

مگر سرہانا ڈیوڑھی میں نہیں تھا۔ صبح سویرے اٹھنے والا بہادر علی نیند سے بے حال ہو رہا تھا۔ لیکن سرہانا سرہانے رکھے بغیر تو اسے نیند بھی نہ آتی۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ بس اب بستر پر گر جائے۔ لیکن وہ اٹھ کر کوٹھری میں گیا۔ سرہانا وہاں موجود تھا۔ وہ اسے لایا اور تکیے کے نیچے رکھ کر بستر پر دراز ہو گیا۔

چند لمحوں میں اس کی آنکھیں مندنے لگیں۔ مگر اسے خیال آیا کہ اس نے دعا نہیں مانگی۔ اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا دامن پھیلایا اور دعا کرنے لگا۔ ''اے اللہ..... عمر بھر اس ڈیوڑھی کا نمک کھایا ہے۔ نمک حرامی سے بچا لینا اے مالک۔ اے اللہ، تو ہی حفاظت کرنے والا ہے کمزوروں کی۔ اور موت کا وقت بھی تو ہی مقرر کرتا ہے۔ میری دعا ہے اے رب کہ میرے جیتے جی کوئی بری نیت سے اس ڈیوڑھی کو نہ پھلانگ پائے''۔

یہ دعا وہ ہر رات کرتا تھا۔ وہ ان وفادار ملازموں میں سے تھا، جو جان کو مالک کا قرض سمجھتے ہیں۔ اور یہاں تو گھر کا مالک مر چکا تھا۔ اب اس کی بیوہ اور بچیوں کی حفاظت اس کی ذمے داری تھی۔ اسے احساس تھا کہ وہ اکیلا ہے۔ کوئی حملہ ہوا تو وہ جان دینے کے سوا کچھ نہیں کر سکے گا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کا رب اس کے ساتھ ہے اور وہ سب سے بڑھ کر حفاظت کرنے والا ہے۔ اور جب اس نے کوٹھے پر چھوٹے ٹھاکر کو پہرہ دیتے دیکھا تھا تو اس کا دل اور مطمئن ہو گیا تھا۔ اللہ نے اسے زمین پر بھی اکیلا نہیں رہنے دیا تھا۔ اس گھر کا ایک اور محافظ بنا دیا تھا۔

دعا کرتے کرتے اسے نیند آ گئی۔

اوتار سنگھ چتا کے بھڑکتے ہوئے شعلوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا!

اس کے ذہن میں سوچوں کا اژدہام تھا۔ چند گھنٹے پہلے ایک زندگی اپنے انجام کو پہنچ گئی تھی۔ اور اس وقت وہ وجود جل رہا تھا، مٹ رہا تھا، جو نصف صدی سے زائد عرصے تک ایک حقیقت رہا تھا۔ آج کے بعد وہ ایک گزری ہوئی داستان ہو گا۔ ماسٹر جی کا وجود، ان کا سراپا صرف پیچھے رہ جانے والوں کے تصور میں رہے گا..... ان کی یادوں میں رہے گا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ ماسٹر جی کا عرصہ امتحان پورا ہو چکا ہے۔ اب امتحانی پرچا ان کے ہاتھ سے لیا جا چکا ہے۔ اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ بہت عرصے کے بعد اسے وہ کتابیں یاد آئیں، جن میں اس نے جنت دوزخ کا احوال پڑھا تھا۔ اس کتاب میں قبر کا حال بھی دیا گیا تھا۔ اس وقت اس نے سوچا تھا کہ اس کی ماتا کی تو چتا چلائی گئی تھی۔ چناں چہ وہ اس تفتیش سے بچ نکلی ہوں گی۔ مگر اس وقت ماسٹر جی کو راکھ میں تبدیل ہونے کے عمل سے گزرتا دیکھ کر اسے خیال آیا کہ اس کی وہ سوچ بے حد احمقانہ تھی۔ حساب کتاب ہونا ہے تو حساب کتاب ہو گا۔

اس نے سوچا کہ جو ہستی ایسی قدرت والی ہے کہ مرنے کے بعد بھی ہر انسان کو..... زمانہ آغاز سے لے کر لمحہ آخر تک روئے زمین پر پیدا ہونے اور مرنے والے ہر انسان کو دوبارہ زندہ کر دے، اس سے کون بچ سکتا ہے۔ اس کا بنایا ہوا ہر قانون اٹل، اس کا قائم کیا ہوا ہر نظام مسلسل۔ اس سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ موت بھی تو اس کے حکم سے آتی ہے۔ اب کوئی شخص ریل کے نیچے کٹ کر مر جاتا ہے..... ایسے کہ اس کا جسم بوٹی بوٹی ہو جاتا ہے تو وہ اس کے نظام سے بچ تو نہیں سکتا۔ جواب دہی تو سبھی کو کرنی ہے نا۔

مگر کیسے؟ اس نے سوچا۔

اگلے ہی لمحے جواب اس کے ذہن میں ابھرا۔ جو قیامت کے دن مردوں کو، جن کے وجود کا کچھ بھی نہیں بچا ہو گا..... ہڈیاں بھی خاک ہو چکی ہوں گی، دوبارہ زندہ کر سکتا ہے تو وہ مرنے کے فوراً بعد بھی آدمی کو یک جا کر دیتا ہو گا..... سوال جواب کیلئے..... یہ تو زیادہ آسان ہے بہ نسبت ہزار سال بعد اسے زندہ کرنے کے۔

بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ بلکہ قیاس کے زور پر وہ اپنے تئیں بہت کچھ سمجھ گیا۔ مرتے وقت چاہے آدمی کا پورا وجود مٹ گیا ہو، اللہ اسے یک جا کرتا ہے اور کسی مقام پر اس کا حساب کرتا ہے۔

وہ جانتا تھا کہ موت آتما کے شریر سے چلے جانے کا نام ہے۔ لیکن سوال جواب کے اس مرحلے سے گزارنے کے لئے اللہ آتما کو دوبارہ اس شریر میں لے آتا ہو گا۔ اور تفتیش مکمل ہونے کے بعد آتما پھر چلی جاتی ہو گی۔ اور آتما شریر میں دوبارہ اس وقت آتی ہو گی، جب شریر دنیا والوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہو گا۔ وہ چاہے جلانے کے نتیجے میں ہو یا تدفین کے نتیجے میں۔

پھر اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ ممکن ہے، اللہ نے ہر آدمی کی ایک قبر بھی مقرر کی ہو۔ آدمی کسی طرح بھی مرے اور مرنے کے بعد اسے جلائیں یا دفن کریں، وہ اپنی اس قبر میں کچھ دیر سوال جواب کے مرحلوں سے ضرور گزرتا ہو گا۔ ورنہ جو آدمی سمندر میں ڈوب کر مر جائے اور اس کی لاش بھی نہ ملے، ظاہر دار لوگ تو یہی سمجھیں گے کہ وہ سوال جواب کے مرحلوں سے بچ گیا۔ لیکن اللہ کا فرمان ہے کہ یہ مرحلہ ہر آدمی کے لئے ہے تو یہ اٹل ہے۔

وہ یہ سوچتا رہا۔ لیکن پنڈت نے اسے چونکا دیا۔ ''یہ لو بالک''۔

اس نے چونک کر پنڈت کو دیکھا۔ وہ ایک ہانڈی اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔ ''یہ کیا ہے مہاراج؟''۔ اس نے پوچھا۔

پنڈت کی نگاہوں میں ایک لمحے کو ملامت ابھری۔ مگر فوراً ہی معدوم ہو گئی۔ ''یہ راکھ ہے تمہارے پتا کی''۔

ہانڈی کے منہ پر لال کپڑا بندھا تھا۔ اوتار سنگھ نے وہ ہانڈی لے لی۔ پنڈت نے کپڑے کا ایک خاصا بڑا تھیلا ہی اسے دیا۔ اس میں ارتھی کے پھول اور کچھ دوسری چیزیں بھی تھیں۔ اس نے وہ تھیلا بھی لے لیا۔

اسپتال کے حساب اس نے پہلے ہی صاف کر دیا تھا۔ نچلے اسٹاف میں جتنے لوگوں کا بھی ماسٹر جی سے تعلق رکھا تھا اور جنہوں نے ماسٹر جی کی خدمت کی تھی، ان سب کو وہ انعام دے کر آیا تھا۔ اب تو بس واپسی کا مرحلہ تھا۔

اس نے تھیلے اور ہانڈی کو اپنے بیگ میں رکھا اور لاری اڈے کی طرف چل دیا۔ خوش قسمتی اس کے ساتھ تھی۔ گاڑی کی روانگی میں تو ابھی وقت تھا۔ لیکن اسے ایک پرائیویٹ کار نظر آ گئی۔

''کہاں جانا ہے بابو جی؟''۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے اس سے پوچھا۔ وہ یقیناً کسی کی ذاتی گاڑی چلانے والا تھا۔ اور اس وقت گاڑی اس کے پاس تھی۔ وہ اس موقعے سے فائدہ اٹھا کر کچھ کما لینا چاہتا تھا۔

''مجھے دہلی جانا ہے''۔

''تو میرے ساتھ چلیں۔ آپ کو گاڑی کے مقابلے میں مہنگا تو پڑے گا۔ لیکن میں آپ کو اس کے مقابلے میں بہت جلدی پہنچا دوں گا''۔

اوتار سنگھ کے لئے وہ پیشکش بہت بڑی نعمت تھی۔ وہ تو اس وقت اڑ کر دہلی پہنچ جانا چاہتا تھا۔ پیسے کی اسے کوئی پروا نہیں تھی۔

ڈرائیور نے باہر نکل کر اس کے لئے عقبی نشست کا دروازہ کھولا۔ اس نے اپنا بیگ رکھا اور پھر خود اندر بیٹھ گیا۔

ڈرائیور نے اپنی سیٹ سنبھالی۔ ''آپ نے یہ نہیں پوچھا صاحب کہ میں کیا لوں گا؟''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''اس کی مجھے پروانہیں۔تم مجھے جلد سے جلد دہلی پہنچادو۔جوتم مانگو گے،میں اس سے زیادہ ہی دوں گا''۔

ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کردی!

یہی وہ وقت تھا کہ اٹھارہ بیس افراد کا وہ گروہ اس گلی میں داخل ہوا، جہاں سرفراز بیگم کا مکان تھا۔جو شخص سب سے آگے تھا،اس نے گلی میں داخل ہوتے ہی منہ پر ڈھاٹا باندھ لیا۔وہ اس گروہ کا سرغنہ تھا۔

''یہ کیا؟''۔اس کے ایک ساتھی نے اعتراض کیا۔''کیا تمہیں ڈر ہے کہ کوئی تمہیں پہچان لے گا؟''۔

سرغنے کے انداز سے لگتا تھا کہ اسے یہ سوال پسند نہیں آیا ہے۔''یہی سمجھ لو''۔اس نے مختصر جواب دیا۔لہجے میں بے پروائی تھی۔

''کوئی زندہ بچے گا تو پہچانے گا نا''۔اس کے ایک اور ساتھی نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

سرغنے نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا تو وہ سب گلی کے سرے پر ہی رک گئے۔''میری بات غور سے سن لو''۔سرغنے نے کہا۔''اب کوئی زور سے نہیں بولے گا۔بات کرنے کی تو ضرورت نہیں۔ضروری ہوتو آہستہ بولو''۔

''تو کیا ہم ڈرتے ہیں؟''۔کسی نے اعتراض کیا۔

سرغنے کی آنکھوں میں مسکراہٹ کی چمک نظر آئی۔''یہ سیاست ہے۔وقت آنے والا ہے کہ ہم کھل کر بھی کام کریں گے''۔وہ کہتے کہتے رکا اور چند لمحے توقف کے بعد بولا۔

''اب پہلا کام یہ ہے کہ گلی میں جتنے بھی دروازے ہیں،سب کو باہر سے بند کردو''۔

اس کی ہدایت پر عمل کیا جائے گا۔گلی میں کھلنے والے تمام دروازوں کی کنڈیاں باہر سے بند کردی گئیں۔

وہ تمام افراد مسلح تھے۔کچھ کے ہاتھوں میں بلم تھے۔جو خالی ہاتھ نظر آرہے تھے۔وہ بھی مسلح تھے۔ان کے پاس خنجر اور کرپانیں تھیں۔

تمام دروازے بند کردیئے گئے۔

اب وہ لوگ سرفراز بیگم کے مکان کے دروازے پر کھڑے تھے۔''یہی گھر ہے نا؟''۔کسی نے پوچھا۔

سرغنے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''یہاں لڑکیاں بھی ہیں نا؟''۔کسی نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں''۔

''مزہ آجائے گا''۔ایک اور چٹخارہ لیتے ہوئے بولا۔

سرغنہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔اس نے برابر والے دروازے کو غور سے دیکھا۔وہ اسی مکان کے اوپری زینے کا دروازہ تھا۔اس دروازے کو بند نہیں کیا گیا تھا۔''یہ دروازہ بھی بند کردو''۔اس نے کہا۔

''اسے بند کرنے کی کیا ضرورت ہے گرو۔یہاں تو ہم دھاوا بولنے والے ہیں''۔

''جیسا میں کہتا ہوں،ویسا ہی کرو بے وقوف''۔سرغنے نے سخت لہجے میں کہا۔''یہ اوپر والوں کا دروازہ ہے۔میں نہیں چاہتا کہ اس طرف سے کوئی مداخلت ہو۔وہ ہیں تو ہندو۔مگر مسلوں کے ہم درد ہیں''۔

وہ دروازہ بھی بند کردیا گیا۔

''دروازہ کھٹکھٹائیں؟''۔کسی نے پوچھا۔

''اس کی کیا ضرورت ہے بے وقوف''۔سرغنے نے جھنجلا کر کہا۔''بلم استعمال کرو اور دروازہ توڑ دو''۔

دو بلم والے آگے بڑھ آئے۔باقی سب لوگ دروازے سے ہٹ گئے۔

.....x.....

رنجنا چائے لے کر کوٹھے پر پہنچی تو رگھو کوٹھے پر ٹہل رہا تھا۔''ارے.....تم ٹہلے جارہے ہو۔تھکے نہیں؟''۔رنجنا نے کہا۔

حقیقت یہ تھی کہ رگھو تھک گیا تھا۔مگر وہ سوچ رہا تھا کہ مالک بھی تو ٹہلتے رہتے ہیں۔''تھک تو گیا ہوں''۔

''تو بیٹھ جاؤ۔چائے پی لو''۔

رگھو بیٹھ گیا اور چائے کی پیالی لے لی۔

''یہ بتاؤ۔ٹہلنے سے کیا فائدہ؟''۔رنجنا نے کہا۔

''مجھے کیا پتا۔پر چھوٹے ٹھاکر ٹہلتے ہیں تو کچھ فائدہ ہوگا ہی''۔رگھو نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے جواب دیا۔

''میری تو سمجھ میں نہیں آتا''۔

''میں اور تو مالک کی طرح بدھی مان تو نہیں ہیں نا''۔

''ہاں۔یہ تو ہے''۔

دونوں بیٹھے کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔رگھو چائے کے گھونٹ لیتا رہا۔پھر اس نے خالی پیالی نیچے رکھ دی۔

وہ اٹھنے ہی والا تھا کہ رنجنا نے کہا۔''اب پھر کھڑے ہو رہے ہو؟''۔

''ہاں''۔

''بیٹھو کچھ دیر۔تھوڑی دیر سے کچھ فرق نہیں پڑے گا''۔

رگھو بیٹھ گیا۔یہی وہ لمحہ تھا،جب نیچے بند دروازے پر بلموں کی پہلی ضرب پڑی۔

وہ آواز سن کر رگھو تڑپ کر اٹھا۔''کون ہے نیچے؟''۔وہ چلایا اور ساتھ ہی وہ دیوار کی طرف لپکا۔اس نے باہر جھانکا۔وہاں اسے بڑتعداد میں لوگ نظر آئے۔وہ بلموں سے دروازے پر ضربیں لگا رہے تھے۔

''کون ہو تم لوگ؟ کیا کر رہے ہو؟''۔رگھو نے انہیں للکارا۔

ان میں سے ایک نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔اس کے چہرے پر ڈھاٹا بندھا تھا۔''ڈاکو ہیں.....اور دروازہ توڑ رہے ہیں''۔اس نے پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

رنجنا بھی رگھو کے پاس آکھڑی ہوئی تھی اور نیچے دیکھ رہی تھی۔''ہائے رام.....''۔وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔

رگھو اس طرف لپکا،جہاں چھوٹے ٹھاکر کی لاٹھی تھی۔اس نے لاٹھی اٹھائی اور رنجنا کی طرف دیکھا۔''تم نیچے نہیں آنا''۔

رنجنا نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے روکنے کی کوشش کی۔''وہ اتنے لوگ ہیں۔تم اکیلے کیا کروگے۔مت جاؤ رگھو''۔

''ہٹ جا''۔رگھو نے اسے جھٹک دیا۔''میں وہی کروں گا جو چھوٹے ٹھاکر ہوتے تو کرتے''۔

لیکن رنجنا نے پھر اس کا ہاتھ تھام لیا۔''تم انہیں نہیں بچا سکتے''

''دو چار کو مار کے مر تو سکتا ہوں۔مالک کو وچن دیا تھا میں نے۔کیا اب بزدلوں کی طرح منہ کالا کر کے بیٹھ جاؤں۔کیا منہ دکھاؤں گا مالک کو۔مجھے جانے دے''۔

وچن کا سنتے ہی رنجنا نے جھرجھری لی اور اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔''تو میں بھی چلوں گی تمہارے ساتھ''۔

رگھو نے بحث نہیں کی۔وہ زینے کی طرف لپکا۔رنجنا اس کے پیچھے تھی۔

رگھو نے نیچے اتر کر باہر کھلنے والے دروازے کی چٹخنی کھولی اور دروازے کو کھینچا۔مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔اس نے نیچے کے گھر میں کھلنے والے بغلی دروازے کو آزمایا۔مگر وہ بھی دوسری طرف سے بند تھا۔

باہر سے سنائی دینے والی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ گھر کا دروازہ توڑ دیا گیا ہے اور حملہ آور اندر گھس گئے ہیں۔

رگھو لاٹھی سے کبھی ایک دروازے پر ضرب لگاتا اور کبھی دوسرے دروازے پر۔لیکن وہ ایسے کھلنے والے نہیں تھے۔تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ اوپر لپکا۔''کہاں جارہے ہو؟''۔

رنجنا نے پکارا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''دروازے کوتوڑنے کے لئے کچھ لانا ہے''۔رگھو نے پلٹ کر دیکھے بغیر جواب دیا۔

بہادر علی کی آنکھ اس احساس سے کھلی تھی کہ باہر سے آوازیں آرہی ہیں۔وہ گہری نیند سے اٹھا تھا۔چند لمحے تو وہ بستر پر لیٹا رہا۔آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔باہر کئی افراد تھے اور وہ سرگوشیوں میں باتیں کررہے تھے۔

پہلے تو بہادر علی نے اسے اپنا وہم سمجھا۔لیکن پھر خطرے کے احساس نے اسے اٹھ کر بیٹھنے پر مجبور کردیا۔

وہ اٹھ کر بیٹھا ہی تھا کہ دروازے پر باہر سے ایسی ضرب لگائی گئی کہ دروازہ ہل کر رہ گیا۔

اضطراری طور پر بہادر علی کو پوچھنا چاہئے تھا کہ.....للکارنا چاہئے تھا.....کون ہے۔لیکن خطرے کے احساس نے اس کی تمام حسوں کو مہمیز کردیا تھا۔اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔اس کے ہونٹ بھنچ گئے۔یہ سوال بے معنی تھا.....مہمل تھا۔یہاں تو دروازہ توڑنے کی کوشش کی جارہی تھی۔اگر دروازے پر دستک دی گئی ہوتی تب بھی وہ اس سوال کو بے معنی اور مہمل ہی سمجھتا۔کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ وہ کون ہیں اور کس نیت سے آئے ہیں۔

بہادر علی کو کافی دن سے یہ خوف تھا.....یہ خدشہ اسے ستا رہا تھا۔وہ سوچتا کہ جب ایسا ہوگا تو اس کا کیا حال ہوگا۔وہ گھبرائے گا۔اسکے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے۔دل کی دھڑکن تیز ہوجائے گی۔لیکن خدشہ حقیقت بن کر سامنے آیا تو ایسا کچھ نہیں ہوا۔بلکہ وہ اتنا پرسکون تھا کہ اسے خود بھی اپنے آپ پر حیرت ہونے لگی۔

دروازے پر دوسری ضرب لگی تو وہ تکیے کے نیچے سے سریا نکال چکا تھا۔سریا اٹھا کر وہ خاموشی سے دروازے کی طرف بڑھا اور دروازے کی ایک جانب دیوار سے ٹک کر کھڑا ہوگیا۔سریا اس نے دونوں ہاتھوں سے تھام کر سر سے اوپر اٹھا رکھا تھا۔چل بہادر علی.....حق نمک ادا کرنے کا وقت آگیا۔اس نے خود سے کہا۔

وہ جانتا تھا کہ حملہ آور تعداد میں زیادہ ہوں گے۔ایسے میں للکارنے کا کوئی فائدہ نہیں۔اس کے لئے تو بہتر یہی ہے کہ حملہ آوروں کو اس کی موجودگی کا احساس بھی نہ ہو۔ان پر اچانک حملہ کرکے وہ ان میں ابتری پھیلا سکتا ہے۔ان میں سے کچھ کو ٹھکانے لگا سکتا ہے۔ورنہ للکارنے میں تو اس کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آئے گا.....سوائے موت کے!

وہ بہت حقیقت پسند بن کر سوچ رہا تھا۔اللہ کی مشیت اس کے حق میں ہو اور اللہ کی خاص مدد آجائے تو اور بات ہے۔ورنہ اس کے سامنے تو بس یہی راستہ تھا کہ ان پر حملہ کرے اور انہیں بساط بھر نقصان پہنچا کر انہیں اندر گھسنے سے روکے۔یہ وہ اللہ سے دعا ہی کرسکتا تھا کہ ان کے اندر گھسنے سے پہلے اسے موت آجائے۔جو کچھ ہونا ہے،اس کے جیتے جی نہ ہو۔

چوتھی پانچویں ضرب میں بلم دروازے کی لکڑی کو چیرتے ہوئے اندر آئے۔وہ دیوار سے چپکا سانس روکے کھڑا رہا۔مزید ضربوں کے نتیجے میں دروازے میں خاصا بڑا موکھا سا بن گیا۔اس میں سے ایک ہاتھ اندر آیا،جس نے ٹٹول کر چٹخنی ہٹادی۔

دروازہ کھلا اور جیسے ہی پہلا آدمی اندر آیا،بہادر علی نے پوری قوت سے سریا اس کے سر پر دے مارا۔وہ آدمی گرا۔لیکن اس کے پیچھے دو آدمی اور اندر آئے تھے۔پہلے آدمی کا حشر دیکھ کر وہ بڑی پھرتی سے دائیں بائیں ہوکر اندر لپکے۔جو بہادر علی کے قریب تھا،بہادر علی نے اس کی کمر پر سریے کا وار کیا اور وہ چیختا ہوا ڈھیر ہوگیا۔

بہادر علی دوسرے آدمی کی طرف متوجہ ہوا۔مگر وہ اس سے بہت دور تھا۔اور اتنی دیر میں اور حملہ آور بھی اندر آگئے تھے۔

اب وہ کھلی جنگ تھی۔بہادر علی نے فلک شگاف آواز میں نعرہ تکبیر بلند کیا اور سریے کو اندھا دھند گھمانا شروع کیا۔لیکن بلموں کی وجہ سے اسے پسپا ہونا پڑ رہا تھا۔وہ دیوار سے جا لگا۔اب سریا گھمانے کیلئے اس کے پاس زیادہ جگہ نہیں تھی۔اور وہ سب ایک ساتھ اس پر یلغار کررہے تھے۔اس کے باوجود وہ ان میں سے دو اور کافروں کو نشانہ بنانے میں کامیاب ہوگیا۔یہ تو نہیں معلوم کہ یہ جئیں گے یا مریں گے۔بہرحال میں چار کو ضرب لگا چکا ہوں۔اس نے مسکراتے ہوئے سوچا۔

اس وقت اس کے پیٹ میں ایک بلم لگا۔اس نے سریے کو اور مضبوطی سے پکڑ لیا اور گھماتا رہا۔دوسرا بلم اس کے سینے سے ٹکرایا تو سریا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔وہ دیوار سے ٹک کر بیٹھتا گیا۔حیرت ہے،مجھے تکلیف نہیں ہورہی ہے۔اس نے سوچا۔

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔چار افراد اسے گھیرے کھڑے تھے۔دوسرے اندر کی طرف کھلنے والے دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''میری عزت رکھ لے میرے معبود''۔اس نے زیرلب اپنے رب کو پکارا۔''میں نے ہمیشہ یہی دعا کی ہے کہ میرے جیتے جی کوئی بدنیت اس ڈیوڑھی کو نہ پھلانگے''۔

''ہاں بھئی مسلے.....پاکستان جائے گا؟''۔کوئی اس سے پوچھ رہا تھا۔

دوسری طرف گھر میں کھلنے والے دروازے پر ضربیں پڑ رہی تھیں۔اندر سے چھمن بوا اور بڑی بیگم کے چیخنے.....مدد کے لئے پکارنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

بہادر علی نے بولنے کی کوشش کی تو اس کے منہ سے خون ابل پڑا۔تکلیف اسے اب بھی نہیں ہو رہی تھی۔''پاکستان زندہ باد.....''۔اس نے ٹوٹتی نحیف آواز میں کہا۔

''جے واہ گرو کی''۔سکھ نے نعرہ لگایا اور اس کی کرپان حرکت میں آئی۔

بہادر علی کی گردن سے خون کا فوارہ بلند ہوا۔اے اللہ.....کلمہ نصیب فرمادے۔اس نے دل میں دعا کی۔اس کے لب ہلے.....لا الہ.....الا اللہ.....خون کے بلبلے اس کے لبوں پر بن رہے تھے.....پھوٹ رہے تھے۔ایک لمحے ہونٹ بے آواز ہلے.....پھر صاف اور واضح آواز.....محمد الرسول اللہ۔اور خون کا ایک بڑا بلبلہ اس کے ہونٹوں پر ساکت ہوگیا۔

اندر گھر میں کھلنے والا دروازہ ٹوٹا تو بہادر علی اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کر چکا تھا۔اللہ نے اس کی عزت رکھ لی تھی!

.....x.....

رگھو بولایا بولایا پورے گھر میں پھر رہا تھا۔اسے ایسی کوئی چیز نہیں مل رہی تھی، جو دروازہ توڑنے میں مدد کرتی۔

رنجنا خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

رگھو دوبارہ رسوئی میں چلا آیا۔''کچھ بھی تو نہیں ہے گھر میں''۔

''کچھ بتاؤ تو۔کس طرح کی چیز''۔

''کلہاڑی ہو، کدال ہو، کوئی آری ہو''۔

''ایسی تو کوئی چیز گھر میں ہے نہیں''۔

رگھو جھنجھلا گیا۔وہ بار بار ہاتھ مل رہا تھا۔''کیا کروں میں؟''۔پھر اس نے لپک کر بڑی، لمبی چھری اٹھالی، جو سبزی کاٹنے کے کام آتی تھی۔

''اس کا کیا کرو گے؟''۔رنجنا نے گھبرا کر پوچھا۔

''دروازہ کاٹنے کی کوشش کروں گا''۔

''اس سے کچھ نہیں ہوگا''۔

رگھو نے سل کے پاس رکھا ہوا بٹا اٹھالیا۔''کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے''۔

دونوں چیزیں لے کر وہ پھر زینے پر لپکا۔رنجنا اس کے پیچھے تھی۔رگھو کی لاٹھی وہیں دروازے کے پاس پڑی تھی۔

رگھو نے باہر والے دروازے پر مناسب جگہ تلاش کر کے وہاں چھری رکھ دی اور بٹے سے اس کے دستے پر ضربیں لگا کر اسے دروازے میں پیوست کرنے کی کوشش کرنے لگا۔لیکن ذرا دیر میں ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ اس دروازے کی لکڑی بہت مضبوط ہے۔ایک طرف تو چھری کی نوک کند ہونے لگی۔دوسری طرف چھری کا دستہ ٹوٹ گیا اور دھات نمودار ہوگئی۔

مزید کچھ کوشش کے نتیجے میں دروازے کی لکڑی کی کچھ کھپچیاں ٹوٹ کر اڑیں۔

رگھو نے ہاتھ روک لیا۔وہ مایوس ہوگیا تھا۔اس نے نیچے کے گھر میں کھلنے والے دروازے کو دیکھا۔باہر کے دروازے کی نسبت وہ آسان ہدف معلوم ہوتا تھا۔اس نے اس دروازے پر کوشش شروع کردی۔

اسی کوشش میں اس کے ہاتھ زخمی ہوگئے۔کئی بار چھری چھپھل کر اس کے ہاتھ پر لگی۔

''ہے بھگوان۔تمہارا ہاتھ گھائل ہوگیا ہے''۔رنجنا نے پریشان ہو کر کہا''چھوڑو نا۔اس طرح دروازہ نہیں کھلے گا''۔

رگھو نے اپنے زخمی ہاتھ سے بہتا ہوا خون اپنی قمیص پر پونچھا اور جھنجھلا کر بولا''تو کیا کروں؟''۔

''کچھ اور سوچو''۔

اسی وقت دروازے کی دوسری طرف سے ایک دل دوز نسوانی چیخ سنائی دی۔رگھو پھر چھری لے کر دروازے پر پل پڑا۔

.....x.....

نیچے سب سے پہلے چھمن بوا کی آنکھ کھلی تھی۔اور اس کا سبب دروازے پر پڑنے والی ضربیں تھیں۔وہ چونک کر اٹھیں۔ان کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔اٹھنے سے پہلے ہی ان کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ بات کیا ہے۔کیوں کہ وہ خوف تو انہیں ہر روز ستاتا تھا۔آج وہ خوف حقیقت میں بدل گیا تھا۔

جاگتے ہی وہ تیزی سے بڑی بیگم کو جگانے کے لئے لپکیں۔

لیکن سرفراز بیگم پہلے ہی جاگ چکی تھیں۔فرق یہ تھا کہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔یہی بات اس نے چھمن بوا سے پوچھی۔

''ہہ.....ہہ.....حملہ.....بب.....بڑی بیگم''۔چھمن بوا کی آواز بری طرح لرز رہی تھی۔

سرفراز بیگم یوں بستر سے اٹھیں، جیسے کرنٹ لگا ہو''بچیاں! بچیوں کو کہیں چھپانا ہے''۔وہ بولیں۔

دونوں اندر کی طرف بھاگیں۔دونوں پوری جان سے کانپ رہی تھیں۔چھمن بوا باورچی خانے میں گھس گئیں اور سرفراز بیگم بچیوں کے کمرے کی طرف چل دیں۔

کمرے میں نور بانو جاگ چکی تھی۔مگر نیند میں تھی۔اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، یہ آواز کیسی ہے اور وہ کیوں جاگی ہے؟

سرفراز بیگم کمرے میں داخل ہوئیں تو وہ بستر پر بیٹھی ہوئی تھی''جلدی سے اٹھو اور کہیں چھپ جاؤ''۔سرفراز بیگم نے اس سے کہا۔

''کیا ہوا ہے اماں؟''۔

''یہ سب بتانے کا وقت نہیں ہے''۔سرفراز بیگم نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔''بہنوں کو اٹھاؤ اور کہیں ایسی جگہ چھپ جاؤ، جہاں ظالم تمہیں دیکھ نہ سکیں۔جلدی کرو میری بچی''۔وہ رونے لگیں''اے اللہ.....تو ہی حفاظت کرنے والا ہے''۔

نور بانو اپنے برابر لیٹی ہوئی گلنار کو جھنجھوڑنے لگی''اٹھ جاؤ گلنار۔جلدی کرو''۔

سرفراز بیگم نے حور بانو کو جھنجھوڑا۔

آخر تمام بچیاں اٹھ گئیں۔حور بانو خود کو رضائی میں چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں کیوں کہ اس کے جسم پر چھوٹے ٹھاکر کا کرتا تھا۔عجیب بات تھی کہ وہ زندگی اور موت کے اس کھیل میں زندگی بچانے کی فکر کرنے کے بجائے اس فکر میں تھی کہ اس کی خاموش محبت کا راز نہ کھل جائے۔

اس نے سوتے وقت اللہ سے پردہ رکھنے کی دعا کی تھی اور وہ دعا قبول ہوگئی تھی۔وہ سب سے پہلے تو نہیں اٹھ سکی تھی۔لیکن وہ لوگ جس صورت حال میں جاگے تھے، اس میں کسی کو یہ دیکھنے کی فرصت نہیں تھی کہ کون کس حال میں ہے۔کسی نے نہیں دیکھا کہ اس کے جسم پر چھوٹے ٹھاکر کا ایک کرتا چادر کی طرف پڑا ہے۔

''اٹھو تم لوگ۔جلدی جلدی کہیں چھپ جاؤ''۔سرفراز بیگم کے لہجے میں وحشت تھی۔

''کہاں چھپیں اماں؟''۔

''جہاں تمہارا دل گواہی دے کہ تم محفوظ ہو۔لیکن الگ الگ چھپنا''۔سرفراز بیگم نے کہا اور باہر کی طرف لپکیں۔بچیوں کو اس حال میں چھوڑ کر باہر جانے کو ان کا دل تو نہیں مان رہا تھا۔لیکن وہ بچیوں کے پاس رہتیں تو ان کے لئے نقصان کا باعث ہی بنتیں۔اگر وہ اپنی آنکھوں سے بچیوں کو کسی محفوظ جگہ پر چھپا ہوا دیکھ لیتیں تو ان کے دل کو سکون ہو جاتا۔لیکن اتنی مہلت ان کے پاس نہیں تھی۔

(جاری ہے)

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

باہر دروازے پر پڑنے والی ضربوں سے اب اندازہ ہو رہا تھا کہ دروازہ کسی بھی لمحے ٹوٹ جائے گا اور یہ ضروری تھا کہ دروازہ ٹوٹے تو وہ وہاں موجود ہوں۔ اس طرح وہ اپنی بچیوں کے لئے تھوڑی سی مہلت کما سکتی تھیں۔

''جلدی تم کرو لوگ۔ فوراً چھپ جاؤ۔ اللہ تمہاری حفاظت فرمائے''۔ سرفراز بیگم نے کہا اور دل میں کلمہ طیبہ کا ورد کرتی ہوئی باہر نکلیں۔

بچیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور کوٹھری کی طرف بڑھیں۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ یہی سوچ رہی تھیں کہ کاش اماں انہیں چھپنے کی جگہ بھی بتا دیتیں۔ ان کا ٹانگیں ان کے جسم کا بوجھ نہیں اٹھا پا رہی تھیں۔ ان کے جسم سوکھے پتوں کی طرح لرز رہے تھے۔

جس خوف سے وہ نڈھال تھیں، اس کی نوعیت کا انہیں ذرا بھی اندازہ نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ انہیں کس طرح کا خطرہ لاحق ہے!

.....×.....

حملہ آور دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوئے تو سب سے پہلے انہیں چھمن بوا نظر آئیں۔ ان کے ہاتھ میں چھری تھی۔ لیکن جسم پر لرزہ طاری تھا۔

سرغنہ سب سے آگے تھا۔ چھمن بوا کو دیکھ کر وہ زہریلے انداز میں ہنسا ''تم لوگ بھی وہی دیکھ رہے ہو جو مجھے نظر آ رہا ہے''۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا۔ اس کے ساتھی بھی قہقہے لگانے لگے ''ہاں گرو۔ اب اس بڑھیا سے مقابلہ کرنا پڑے گا''۔

یہ بڑھیا کسی کام کی نہیں، بے کار چیز ہے''۔ سرغنے نے کہا۔ ''اسے پاکستان بھیج دو''۔

چھمن بوا کے ہاتھ سے چھری چھوٹ گئی۔ اسی لمحے ایک بلم ان کے سینے میں پیوست ہو گیا۔

یہ وہ لمحہ تھا، جب سرفراز بیگم صحن میں نکل کر آئیں۔ ''کیا چاہتے ہو تم لوگ؟''۔ انہوں نے باوقار لہجے میں کہا۔ لیکن ان کی آواز لرز رہی تھی۔

''بتانے سے کیا ہوگا؟''۔ سرغنے نے جواب میں سوال کیا۔

''تم جو چاہو گے مل جائے گا۔ بس جان اور عزت کا امان دے دو ہمیں''۔

''تمہارے احسان کی ضرورت نہیں۔ وہ تو ہمیں یوں بھی مل جائے گا''۔ سرغنہ زہریلے انداز میں ہنسا۔ ''کون روک سکتا ہے ہمیں''۔

''میں نے کہا نا کہ جان اور عزت کی امان دے دو ہمیں''۔

''اور اگر میں یہ کہوں کہ یہ دونوں چیزیں تمہیں نہیں مل سکتیں تو؟''۔

''تو میں یہ کہوں گی کہ صرف عزت کی امان دے دو۔ بے شک مجھ سے زندگی چھین لو''۔

سرغنہ پھر ہنسنے لگا۔ ''ہاں جیون تو تمہارا پاکستان کے لئے ہے۔ وہ تو خوشی سے دے دو گی۔ ہم لے بھی لیں گے۔ مگر عزت تو تمہاری ہندوستان میں ہے۔ ہندوستان کے لئے ہے۔

(جاری ہے)

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

تم تو اتنی قیمتی بھی نہیں ہو۔ہمیں تو لڑکیاں چاہئیں تمہاری''۔

''وہ.....وہ تو گھر میں نہیں ہیں''۔

''اوہ.....ہمیں تو پتا ہی نہیں تھا۔ورنہ ہم آتے ہی کیوں یہاں''۔ سرغنے نے کہا۔''ویسے یہ تو بتادو وہ ہیں کہاں؟''۔

''وہ آگرہ گئی ہیں.....اپنے چچا کے ہاں''۔

''ہمیں پتا ہے۔بے خبر نہیں ہیں ہم۔یہاں سے کوئی اب تک کہیں نہیں گیا۔ہاں اب جائے گا.....اور جو بھی جائے گا، پاکستان جائے گا''۔

''دیکھو.....ہم پر رحم کرو۔ہمارے ہاں کوئی مرد نہیں جو ہمارا تحفظ.....''

''تھوڑی دیر پہلے تک ایک تھا۔اسے ہم نے پاکستان بھیج دیا ہے''۔ سرغنے نے کہا۔پھر اس کے لہجے میں نفرت اور سفاکی در آئی۔''اس نے ہمیں جو نقصان پہنچایا ہے اس کا حساب بھی تم سے لینا ہے''۔

''جے ہند''۔ اس کے ساتھیوں نے نعرہ لگایا۔

سرفراز بیگم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔تو وفادار، نمک خوار بہادر علی اپنے آقا کے گھر کی چوکھٹ پر قربان ہوگیا۔ان کے سینے میں جیسے کچھ ٹوٹ گیا۔چھمن بوا بھی گئیں اور اب ان کی باری ہے۔کوئی بات نہیں۔موت تو اپنے وقت پر آنی ہے۔انہیں اپنی موت کی فکر نہیں تھی۔انہیں تو یہ پریشانی تھی کہ بچیوں کا کیا ہوگا انہیں فکر تھی تو عزت کی۔انہوں نے دل ہی دل میں اللہ کو پکارا۔

''گرو.....آگے بھی بڑھنا ہے''۔کسی چیلے نے سرغنے کو چونکا دیا۔

سرغنہ سرفراز بیگم کو گھورنے لگا۔وہ نگاہیں بے حد گندی.....غلیظ تھیں۔سرفراز بیگم کے رخسار تمتما اٹھے۔وہ نظریں جھکانے پر مجبور ہوگئیں۔

''سنو.....عمر تو زیادہ ہے۔لیکن ہڈیوں میں رس اب بھی ہے''۔سرغنے نے سرفراز بیگم کو گھورتے ہوئے کہا''اب جو زیادہ بھوکا ہو، وہ کھانا کھالے''۔

سرفراز بیگم کا چہرہ فق ہوگیا۔اپنی عمر کے پیش نظر ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کی عزت کو بھی خطرہ لاحق تھا۔مرنے کے لئے تو تیار تھیں۔لیکن عزت ہی سے تو سب سے زیادہ ڈرتی تھیں۔''خدا کے لئے، ہم پر رحم کرو''۔وہ گڑگڑائیں۔

''بھگوان کیلئے کہو تو میں کچھ سوچوں''۔سرغنے نے زہریلے لہجے میں کہا۔''لیکن وہ تم کہو گی نہیں''۔

''سرفراز بیگم کے ہونٹ بھنچ گئے۔وہ دو قدم پیچھے ہٹیں۔اپنی عزت پر بات آئی۔تو وہ بچیوں کو بھی بھول گئیں۔

اسی وقت تین چار افراد ان پر ٹوٹ پڑے۔

''چلو.....لڑکیوں کو تلاش کریں''۔سرغنے نے باقی لوگوں سے کہا۔

وہ لمحے ایسے تھے کہ شیطان ننگا ہو کر ناچ رہا تھا، انسانیت کی تذلیل ہو رہی تھی۔مسلمانوں کو مسلمان ہونے اور اپنے لئے الگ وطن مانگنے کی سزا دینے والے اپنی دانست میں تقسیم ہند کے عمل کو روک رہے تھے۔ان کے سڑے ہوئے بدبودار دماغوں میں یہ بات نہیں آئی کہ اپنے اس عمل سے وہ پاکستان کی ضرورت ثابت کر رہے ہیں۔مسلمانوں کو جتا رہے ہیں کہ ان کی بقا اسی میں ہے کہ پاکستان قائم ہو اور ہمیشہ قائم رہے۔

اس گھر سے پہلی بلند ہونے والی چیخ سرفراز بیگم کی تھی۔اس کے بعد تو ان کی چیخیں آسمان کو چھونے لگیں۔وہ جس درندگی کا سامنا کر رہی تھیں، اس کا انہوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

''باقی لوگ گھر میں دندنا رہے تھے، انہیں لڑکیوں کی تلاش تھی''۔

''یہیں کہیں چھپی ہوں گی۔ڈھونڈو انہیں''۔ سرغنے نے کہا۔

تین چار آدمی کوٹھری میں گھس گئے۔''اس صندوق کو کھول کر دیکھو''۔کسی نے کہا۔

صندوق کھولا گیا۔اس میں استری کئے ہوئے کرتے تہ کئے ہوئے رکھے تھے۔''اس میں کپڑے ہیں''۔کھولنے والے نے جواب دیا۔

''لاٹھی سے ٹٹول کر دیکھو۔کیا پتہ، نیچے کوئی ہیرا ہو''۔

''مگر اسی وقت کوئی چلایا''وہ رہی''۔

صندوق کھولنے والے نے بے ساختہ صندوق بند کر دیا اور اس طرف دیکھا۔وہاں اس کا ایک ساتھی گلنار کو دبوچے کھڑا تھا''باہر لے چل اسے.....گرو جی کے پاس''۔وہ فاتحانہ لہجے میں چلایا۔

اسی لمحے حور بانو بھی پکڑی گئی۔

دونوں لڑکیوں کو کمرے میں لے جایا گیا، جہاں سرغنہ موجود تھا۔''یہ مل گئیں گرو''۔لانے والے نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔

''تیسری نہیں ملی؟''۔

''تلاش کر رہے ہیں گرو۔مل جائے گی۔جائے گی کہاں؟''۔

''ڈھونڈو اسے''۔

''کوٹھری میں تو نہیں ہے۔باہر دیکھتے ہیں''۔

باہر سے سرفراز بیگم کی فلک شگاف دردناک چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔کمرے میں دونوں لڑکیاں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل بھی نہیں تھیں۔وہ تھر تھر کانپ رہی تھیں۔بالآخر وہ ڈھے گئیں۔

سرغنہ انہیں ناقدانہ نظروں سے دیکھتا رہا۔''پہلے چھوٹی کا اگنائن کرتے ہیں''۔اس نے کہا۔

درندگی کا کھیل شروع ہوگیا۔باہر اور اندر کی چیخیں گھل مل گئیں۔تھوڑی دیر بعد باہر کی چیخیں دم توڑ گئیں۔مگر اندر ایک چیخنے والی کا اضافہ ہوگیا تھا۔روئے زمین پر کوئی سننے والا نہیں تھا.....سوائے اس ایک کے جو بے بس تھا!

.....×.....

رگھو کی چھری جواب دے گئی تھی اور دونوں ہاتھ لہولہان تھے۔دروازے کے پار صحن کی طرف سے دردناک چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔پھر اندر سے بھی چیخوں کی آواز سنائی دینے لگی۔

''میں کیا کروں مالک.....میں ہار گیا''۔ رگھو نے دروازے سے سر ٹکرایا۔''میں کیا دکھاؤں گا تمہیں مالک''۔

رنجنا دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے رو رہی تھی۔''ہے بھگوان، یہ کیسا انیائے ہے؟''۔

''رگھو دروازے سے سر ٹکراتا رہا۔اس کے سوا وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔اس وقت وہ تکلیف کے ہر احساس سے بے نیاز تھا۔اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ اس کا ماتھا زخمی ہوگیا ہے اور خون بہہ کر اس کے چہرے پر آرہا ہے۔

رنجنا بدستور روئے جا رہی تھی۔اب اس نے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لئے تھے۔

گزرتا ہوا ہر لمحہ اذیتوں کی طرح طویل تھا۔دردناک چیخوں کو سنتے ہوئے لگتا تھا کہ دل پھٹ جائے گا۔پھر اچانک ہی صحن کی طرف سے سنائی دینے والی چیخیں دم توڑنے لگیں اور آہستہ آہستہ معدوم ہوتی گئیں، جیسے کسی نے زندگی کو اذیت سے چھٹکارا دلا دیا ہو۔

لیکن اندر سے سنائی دینے والی چیخوں میں اضافہ ہوگیا تھا۔

رگھو دروازے سے سر ٹکراتا رہا، رنجنا روتی رہی۔سسکتے ہوئے لمحے اٹک اٹک کر، ٹھہر ٹھہر کر گزرتے رہے۔کتنا وقت گزر گیا تھا، اس کا کوئی پیمانہ نہیں تھا.....نہ اذیت دینے والوں کے پاس، نہ اذیت سے گزرنے والوں کے پاس اور نا کام چارہ گروں کے پاس۔

پھر اچانک ہی ہر طرف موت کا سا سناٹا چھا گیا۔کہیں کوئی آواز نہیں تھی۔بس رات کا سکوت نوحہ گری کر رہا تھا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''سب کچھ نشٹ ہوگیا.....سب کچھ''۔رگھو نے دروازے سے زخمی پیشانی ٹکادی اور رونے لگا۔رنجنا بھی رو رہی تھی۔

پھر دروازے کے دوسری طرف بھاری قدموں کی چاپیں ابھریں.....پھر اوباش قہقہے،فحش تبصرے اور گندے جملے۔یہ سب دور ہوتا گیا۔پھر گلی کی جانب سے وہی سب کچھ سنائی دیا اور دور ہوتا گیا۔

اب رات کے سناٹے میں رگھو کی سسکیوں اور رنجنا کے گریے کے سوا کچھ نہیں تھا۔قیامت صرف ڈیڑھ گھنٹے کے لئے آئی تھی اور سب کچھ تہس نہس کر کے چلی گئی تھی۔

.....×.....

گلی میں گھستے ہی اوتار سنگھ کو یہ احساس ستانے لگا کہ کہیں کوئی بڑی گڑبڑ ہے۔پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔اس کا احساس غیر شعوری تھا۔بہر حال وہ چوکنا ہوگیا، جیسے کوئی نامعلوم خطرہ اس کا منتظر ہو۔

پھر اچانک بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ایک گھر کے دروازے کو اس نے باہر سے بند دیکھا۔پھر دوسرے کو بھی بند پایا۔اس کا دل گھبرانے لگا۔کوئی بات ضرور تھی۔

اس نے پلٹ کر پیچھے رہ جانے والے دروازوں کو دیکھا۔وہ سارے بھی بند تھے۔شاید انہی دروازوں کو اس نے غیر شعوری طور پر دیکھا تھا اور انہی کی وجہ سے اسے گڑبڑ کا احساس ہوا تھا۔

اس کے قدموں کی رفتار تیز ہوگئی۔لیکن وہ دونوں طرف کے دروازوں کو بھی دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔اب تک گلی میں اسے ایک دروازہ بھی ایسا نظر نہیں آیا تھا، جو بند نہ ہو۔البتہ ہر گھر میں سناٹا تھا کہیں کوئی آہٹ،کوئی آواز نہیں تھی۔

اپنے گھر کے دروازے پر پہنچا تو اس کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آ گیا۔نیچے والے گھر کا دروازہ ٹوٹا ہوا تھا۔وہ کھلا ہوا نہیں تھا، بلکہ اسے توڑا گیا تھا۔

اسے دیکھ کر وہ گلی کے بند دروازوں کو یکسر بھول گیا۔اس نے بڑھ کر یہ بھی نہیں دیکھا کہ ٹوٹے ہوئے دروازے سے دو قدم آگے اس کے گھر کا دروازہ ہے اور وہ بھی باہر سے بند ہے۔وہ تو ٹوٹے ہوئے دروازے پر ٹھٹھک کر رہ گیا تھا۔اس کے قدم جیسے زمین نے پکڑ لئے تھے۔

چند لمحے تو وہ ساکت وصامت کھڑا رہا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر اندر جھانکا۔اندر اندھیرا تھا۔ابتدا میں تو اسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔لیکن پھر نظر اندھیرے سے ہم آہنگ ہوئی تو اسے فرش پر ایک جسم پڑا نظر آیا۔اور وہ جسم بے حس وحرکت تھا۔

اوتار سنگھ نے وہ چوکھٹ کبھی نہیں پھلانگی تھی۔وہ ہچکچا رہا تھا۔ مگر پھر اس نے سوچا کہ یہ تو ڈیوڑھی ہے.....زنان خانے سے بہت دور۔اور صورت حال ایسی ہے کہ اس کا اندر جا کر دیکھنا ضروری ہوگیا ہے۔

وہ اندر گیا اور اس جسم کے پاس جا کر جھکا۔وہ خون میں لت پت بہادر علی کی لاش تھی۔اس نے ادھر ادھر دیکھا۔کارنس پر لالٹین رکھی تھی۔مگر وہ روشن نہیں تھی۔وہ کارنس کی طرف بڑھا،مگر اس سے پہلے ہی کسی چیز سے الجھ کر گر پڑا۔

وہ ایک اور لاش تھی!

اب اوتار سنگھ کا دل بری طرح گھبرا رہا تھا۔وہ تیزی سے اٹھ کر کارنس کی طرف بڑھا۔وہاں لالٹین کے برابر دیا سلائی بھی موجود تھی۔اس نے لالٹین روشن کر دی اور جائزہ لیا۔دوسری لاش کسی اجنبی کی تھی۔اور وہاں جا بجا خون بکھرا ہوا تھا۔لگتا تھا کہ میدان جنگ ہے۔بہادر علی کے ہاتھ میں اب بھی لوہے کا سریا تھا۔

اندر کی جانب کھلنے والا دروازہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔اوتار سنگھ چند لمحے یہ سوچ کر الجھتا رہا کہ اندر جائے یا نہ جائے۔اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اندر بھی سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔کون جانے،وہاں کیا دیکھنے کو ملے۔مگر اس نے پھر سوچا کہ اندر ممکن ہے،کسی کو اب بھی مدد کی ضرورت ہو۔وہ وقت بہر حال پردے کا خیال کرنے کا نہیں تھا۔

اس نے ایک ہاتھ میں لالٹین اٹھالی اور دوسرے میں اجنبی لاش کے قریب پڑا ہوا خنجر اٹھایا اور گھر میں داخل ہوگیا۔

اندر داخل ہوتے ہی دل دہلا دینے والا ایک منظر اس کے سامنے تھا۔وہ چھمن بوا تھیں۔وہ بھی مر چکی تھیں۔

مگر اس کے بعد اس نے جو کچھ دیکھا۔اس سے اس کا دل پھٹنے لگا۔ماں جی کو وہ صرف ایک نظر دیکھ سکا.....اور وہ نظر بھی غیر ارادی تھی۔ارادے سے نظر بھر کر تو وہ انہیں اس حال میں دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔اور جو کچھ اس چھلتی ہوئی غیر ارادی نظر میں اس نے دیکھا، وہ کبھی اس کے حافظے سے محو نہیں ہوا۔حالانکہ وہ ان یادوں کو مٹا دینا چاہتا تھا۔کیوں کہ وہ اس کا دل کا.....ضمیر کا بوجھ تھیں۔

وہ ماں جی، جو اسے بیٹا کہتی تھیں،اس کے سامنے ایسی ڈھکی چھپی آتی تھیں کہ چہرے کے نقوش بھی کسی غیر مرئی نقاب میں چھپ جاتے تھے۔وہ ماں جی آج مرنے کے بعد اس حال میں تھیں کہ ان کے بدن پر کپڑے برائے نام تھے،اور اس چھلتی ہوئی پہلی نظر میں اس نے دیکھ لیا تھا کہ انہیں بری طرح نوچا کھسوٹا،کاٹا اور بھنبھوڑا گیا ہے۔ان کے جسم سے جا بجا خون رس رہا تھا اور ان کے چہرے پر خوف اور اذیت کا ملا جلا تاثر جیسے منجمد ہو کر رہ گیا تھا۔

اوتار سنگھ نے ان کی لاش سے نظریں چرائیں اور ادھر ادھر دیکھا۔قریب ہی اسے ماں جی کی اوڑھنے والی چادر نظر آئی۔وہ اس چادر کو اٹھا کر منہ پھیرے پھیرے آگے بڑھا اور اسے ماں جی کے جسم پر ڈال دیا۔

اوتار سنگھ کا دل پھٹ رہا تھا،آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔دل میں ایک ملال تھا.....پچھتاوا جو کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا۔ضمیر پر ایک بوجھ تھا۔شاید اس لئے کہ جو کچھ اس نے دیکھا تھا،اس نے اسے ہوش مندوں کے سے انداز میں سوچنے اور سمجھنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔اس کے ذہن میں بس ایک ہی خیال تھا،اس نے ماں سے اس گھر کی،اس گھر کے لوگوں کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا۔اور وہ یہ وعدہ پورا نہیں کر سکا تھا۔اس کی ذرا سی غیر ذمے داری کے نتیجہ میں ان سب پر قیامت گزر گئی تھی۔

وہ ماں جی کے چہرے کو دیکھتا رہا.....اور شرمندگی سے روتا رہا۔میں اپنی ذمے داری پوری نہ کر سکا۔میں اپنا وعدہ نبھا نہ سکا۔وہ دل ہی میں کہہ رہا تھا۔میں آپ سب کو تحفظ.....

سب کے خیال نے اسے چونکا دیا۔ارے گھر میں اور لوگ بھی تو ہوں گے۔کیا پتا،ان میں سے کوئی غیر محفوظ ہو۔عقل کہتی تھی کہ کوئی نہیں بچا ہوگا۔ماں جی کو نہیں چھوڑا ظالموں نے تو لڑکیوں کو کہاں چھوڑیں گے۔لیکن دل کہتا تھا کہ موت تو خدا کے حکم سے ہے،اگر کسی کے لئے حکم نہیں ہوا تو وہ بچ گیا ہوگا نا۔اور کون جانے،وہ آواز والی لڑکی بچ گئی ہو.....

کوئی ظاہری امکان نہیں تھا۔لیکن اس کے دل نے امکان کا وہ تنکا بڑی مضبوطی سے تھام لیا۔وہ تڑپ کر اٹھا۔اس نے لالٹین اٹھائی اور اندر کی طرف چلا۔اس کی آنکھوں سے آنسو اب بھی بہہ رہے تھے۔

اندر پہلا کمرا اسے خالی ملا۔وہ آگے بڑھا۔اس نے اسٹور روم میں جھانکا۔وہاں کوئی نہیں تھا۔اس کے برابر والا کمرا بھی خالی نہیں تھا۔''کوئی ہے.....کوئی ہے''۔اس نے پکارا۔مگر کہیں کوئی آواز نہیں تھی۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

وہ سامنے والے کمرے کی طرف بڑھا۔ وہ اس کے دروازے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ گھٹی گھٹی سی سسکیوں کی آواز سنائی دی، وہ ایسی آواز تھی، جیسے کوئی اپنی سسکیوں کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ آواز اتنی موہوم تھی کہ اسے اپنے اندر موجود امید کی تخلیق لگی۔ اور اس کے پلٹتے پلٹتے وہ موہوم آواز بھی معدوم ہوگئی۔ اس نے سر جھٹکا اور پلٹا۔

وہ اس آخری کمرے میں داخل ہوا۔ اندر کا وہ منظر اتنا روح فرسا تھا کہ اس پر لرزہ چڑھ گیا۔

وہاں دو بستر تھے، جن پر دو لڑکیاں بکھری ہوئی تھیں۔ ان کے جسم جس طرح تڑے مڑے تھے، اس کو دیکھ کر یقین ہو جاتا تھا کہ وہ مر چکی ہیں۔ وہ دونوں بے لباس تھیں اور ان کے جسم لہولہان تھے۔ ان کے جسموں پر کھرونچے بھی تھے۔ اور دانتوں کے نشان بھی۔ لیکن کوئی زخم نہیں تھا۔ اوتار سنگھ تھرا کر رہ گیا۔ پہلی بار وہ دیکھ رہا تھا کہ انسان درندگی پر اتر آئے تو درندے بھی شرما جاتے ہیں۔

اس نے ایک نظر میں وہ سب کچھ دیکھا اور اضطراری طور پر نظر ہٹالی۔ اب وہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ جو بستر اس کے قریب تھا، اس پر کوئی چادر، کوئی چیز ایسی نہیں تھی، جو پردے کا کام کرتی ہو۔ پھر اسے وہ سفید کرتا نظر آ گیا۔

وہ بکھرے ہوئے وجود سے نظریں چراتے ہوئے اس طرف بڑھا۔ اس نے وہ کرتا اٹھایا اور بے کسی کی موت مرنے والی کے بدن پر ڈال دیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ یہ لڑکی ماں کی سب سے بڑی بیٹی حور بانو ہے، اور جس کرتے سے اس نے اس کی برہنگی کو ڈھانپا ہے، وہ کرتا اس لڑکی نے اس کے لئے اپنے ہاتھوں سے کاڑھا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ لڑکی رات کو اس کرتے کو چادر کی طرح اپنے جسم پر ڈال کر سوئی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ لڑکی اس سے محبت کرتی تھی..... اتنی محبت کہ لوگ کسی سے کم ہی کرتے ہیں..... وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔

اسے لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس نے اس کے جسم پر کرتا ڈالا تھا۔ اسے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ کرتا اس کے جسم کو پوری طرح سے ڈھانپ سکا ہے یا نہیں۔ اس لئے اس طرف دیکھنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔

وہ دوسرے پلنگ کی طرف بڑھا۔ وہاں چادر موجود تھی۔ اس نے چادر کو اچھی طرح پھیلا کر اس مڑے تڑے وجود پر ڈل دیا۔ اس نے دوسری لڑکی کے چہرے کو دیکھا۔ وہ بہت کم سن تھی۔ یقینی طور پر وہ سب سے چھوٹی بہن ہوگی۔ اس کے معصوم چہرے پر سکون ہی سکون تھا۔ لیکن کھلی آنکھوں میں منجمد اذیت گواہی دے رہی تھی کہ زندگی کی موت سے ہم آغوشی کے لمحے اس کے لئے بہت بھیانک رہے ہوں گے۔

اوتار سنگھ نے بڑی نرمی اور نزاکت سے اس کی آنکھوں کو بند کر دیا۔ اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یہ لڑکی اسے ٹھاکر بھیا کہہ کر پکارنا چاہتی تھی۔ بھیا کہہ کر اس سے لپٹ جانا، اس سے لاڈ کرنا چاہتی تھی۔ بھائی سے محروم وہ لڑکی اسے بھائی سمجھتی تھی۔ اور اس سے بہت محبت کرتی تھی۔

اوتار سنگھ نے دوسری چادر یا کسی اور چیز کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ پھر اسے پلنگ کے پہلو میں فرش پر گری ہوئی وہ چادر نظر آئی۔ اس نے اسے اٹھایا، جھاڑا اور اسے لے کر پہلی لڑکی کی طرف بڑھ گیا۔ منہ پھیرے پھیرے اس نے لڑکی پر وہ چادر پھیلا کر ڈالی۔ پھر اس نے لڑکی کے چہرے کی طرف دیکھا۔

وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ بے حد حسین لڑکی رہی ہوگی۔ لیکن اس کا چہرہ اذیت سے چٹخا ہوا تھا۔ جو چیز چھوٹی لڑکی کی صرف آنکھوں میں تھی، وہ اس لڑکی کے پورے جسم پر تھے۔ اس چہرے کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ چہرہ نہیں، عکس ہے..... اور وہ بھی چور چور آئینے میں نظر آنے والا عکس۔ اس کی آنکھیں بھی کھلی ہوئی تھیں۔

اس لڑکی کی آنکھیں بند کرتے ہوئے اوتار سنگھ سوچ رہا تھا کہ دونوں لڑکیوں میں یہ کیسا تضاد ہے۔ ایک کے چہرے پر سکون اور دوسری کے چہرے پر اذیت۔ پھر اس کی سمجھ میں یہی آیا کہ چھوٹی لڑکی نے موت سے کچھ دیر پہلے خود کو موت کے سپرد کر دیا ہوگا۔ اسے بھیانک حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا ہوگا۔ جب کہ بڑی لڑکی آخری لمحے تک موت اور ذلت..... دونوں سے لڑتی رہی ہوگی۔

اچانک اوتار سنگھ کو خیال آیا کہ وہ تین بہنیں تھیں۔ تیسری کہاں ہے؟

یہی وہ وقت تھا کہ گھٹی گھٹی سسکیوں کی وہ آواز پھر ابھری..... اور بہ تدریج بلند آہنگ ہوتی گئی۔ گھٹی گھٹی سسکیاں تو وہ اب بھی تھیں لیکن اتنی گھٹی ہوئی نہیں تھی۔ آواز سے پتا چل رہا تھا کہ سسکیوں کو گھونٹنے والی اب اپنی قوت سے محروم ہو رہی ہے۔ سسکیاں اس کے ضبط سے باہر ہوئی جا رہی تھیں۔

اوتار سنگھ آواز کی سمت لپکا۔ ساتھ ہی اس نے پھر پکارا۔ ''کون.....؟ کہاں ہو تم؟''۔

اس کی آواز پر ردعمل یہ ہوا کہ سسکنے والے نے شاید اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر سسکیاں بھینچنے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجے میں آواز ہلکی ہوگئی۔

اتنی دیر میں اوتار سنگھ کو اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ آواز کوٹھری کے اندر سے آ رہی ہے۔ وہ لالٹین اٹھائے کوٹھری میں داخل ہوا۔ خنجر نجانے کب وہ پچھلے کمرے میں چھوڑ آیا تھا۔ ویسے بھی اس کی اب ضرورت نہیں تھی۔ گھر میں کوئی حملہ آور موجود نہیں تھا۔

وہ کوٹھری میں داخل ہوا تو وہ آواز بے حد موہوم ہو چکی تھی۔ اس کی وجہ سے سمت کا پتا نہیں چل رہا تھا۔ بلکہ دھیمی..... بہت دھیمی سی وہ آواز، اسے تو لگتا تھا کہ ہر طرف سے آ رہی ہے۔

اس نے کوٹھری کا جائزہ لیا۔ وہ ویسی ہی کوٹھری تھی، جیسی عام طور پر گھروں میں ہوتی ہیں۔ وہاں گھر کا فاضل سامان رکھا تھا..... مگر بکھرا ہوا نہیں۔ اسے سلیقے سے رکھا گیا تھا۔ سامنے ہی اسے اوپر تلے تین ٹرنک رکھے نظر آئے۔ اس کے برابر ایک بہت بڑا صندوق رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر ہی اندازہ ہوگیا کہ اس میں بستر رکھے جاتے ہوں گے۔ پہلو والی دیوار کے ساتھ ایک بڑی الماری رکھی تھی۔ اور جو ادھر ادھر دوسرا سامان تھا، اس میں ایسا کچھ نہیں تھا کہ کسی کے چھپنے کی جگہ ہو۔

اس کی نگاہیں اوپر تلے رکھے صندوق پر جم گئیں۔ اوپر والا صندوق بھی اتنا بڑا تھا کہ اس میں ایک لڑکی بہ آسانی سما سکتی تھی۔ سسکیوں کی موہوم، گھٹی گھٹی آواز اب بھی آ رہی تھی۔ اسے لگا کہ آواز اسی بندوق سے آ رہی ہے۔

وہ اس طرف بڑھا ''ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ میں ہوں اوتار سنگھ''۔

اسکے یہ کہتے ہی سسکیاں ہذیانی چیخوں میں تبدیل ہوگئیں۔ ''نہیں..... نہیں..... میرے پاس نہ آنا..... خدا کے لئے..... مجھے چھوڑ دو..... رحم کرو مجھ پر.....''۔

آواز سے اوتار سنگھ کو اندازہ ہوا کہ آنے والی پوری طرح حوش و ہواس میں نہیں ہے۔ خوف اتنا بڑھا ہوا ہے کہ دہشت کی حد کو پہنچ گیا ہے۔ ''ڈرو نہیں، یہ میں ہوں چھوٹا ٹھاکر''۔

آواز پھر بھنچنے لگی۔ اوتار سنگھ نے صندوق کھولا۔ اس میں کرتے رکھے تھے۔ صندوق کافی بڑا تھا۔ اس نے کرتے ہٹائے۔ لیکن لمحوں میں اسے اندازہ ہوگیا کہ لڑکی وہاں نہیں ہے۔ ساتھ ہی اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ کہاں ہے۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

اس نے بستروں کے بہت بڑے صندوق کو کھولا، اوپر دو تین لحاف مڑے تڑے، بے ترتیب رکھے تھے۔ صندوق کی مجموعی حالت بھی ابتری کی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کی تلاشی لی گئی ہے۔

اور دیکھتے ہی دیکھتے لڑکی کے دانت بھنچ گئے۔ آنکھیں مندنے لگیں۔ اس کے لرزتے بدن نے ایک طویل جھٹکا لیا اور اگلے ہی لمحے وہ کسی بے جان گڑیا کی طرح ڈھے گئی۔

اوتار سنگھ صرف ایک لمحے کے لئے جھجکا۔ پھر اس نے اس لڑکی کو اپنے ہاتھوں پر اٹھا لیا۔ اس کا دل سینے میں دھڑ دھڑ کر رہا تھا۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ کم از کم کوئی ایک تو زندہ مل گیا۔ وہ لڑکی کو ہاتھوں پر اٹھائے ہوئے کوٹھری سے باہر نکلا اور صحن کی طرف چل دیا۔

.....×.....

نور بانو ٹھیک سے جاگی نہیں تھی۔ لیکن اماں کے لہجے اور انداز سے اسے سنگینی کا احساس ضرور ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے چھپنے کے لئے کپڑوں کا ٹرنک منتخب کیا تھا۔ کرتوں کو اپنے اوپر پھیلاتے ہوئے اس نے ٹرنک کو بند کر لیا تھا۔

اندر گھسنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ وہ کتنی ہی دبلی پتلی سہی، ٹرنک اس کے لئے بہت تنگ ہے۔ وہ مڑی تڑی حالت میں دبکی ہوئی تھی۔ دم بھی گھٹ رہا تھا۔ لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ بستروں والا بڑا صندوق چھپنے کے لئے بہترین جگہ تھی۔ لیکن وہاں گلنار چھپ گئی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اس تنگ صندوق سے نکل کر کوئی اور جگہ تلاش کرے۔ لیکن اسے ہمت نہیں ہوئی۔

اسے اتنا تو معلوم تھا کہ گھر پر حملہ ہوا ہے۔ لیکن خطرے کی نوعیت کے بارے میں وہ اندازہ نہیں لگا سکتی تھی۔ وہ دبکی بیٹھی کلمے کا ورد کرتی رہی۔ خوف ایسا تھا کہ آیۃ الکرسی اسے یاد نہیں آ رہی تھی۔

ٹرنک میں آواز سنائی نہیں دے سکتی تھی۔ وہاں اندھیرا اور سناٹا تھا۔ پھر بھی اسے کوٹھری میں لوگوں کی موجودگی کا احساس ہو گیا۔ کچھ لوگ تھے، جو انہیں ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ اور سمٹ گئی، خطرہ سر پر آ پہنچا تھا۔

پھر کسی نے ٹرنک کھولا۔ ''اس میں کپڑے ہیں''۔ ٹرنک کھولنے والے نے کہا۔

''لاٹھی سے ٹٹول کر دیکھ۔ کیا پتا نیچے کوئی ہیرا ہو''۔ دوسری آواز نے کہا۔

نور بانو نے ایک آنکھ کی جگہ بنالی تھی اور وہ دم سادھے ہوئی تھی۔ ٹرنک کے پاس کھڑا آدمی اسے بہت بڑے ہیولے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کا دل دھک سے رہ گیا کہ ایک اور شخص بستروں والا ٹرنک کھول رہا ہے۔ ادھر اسے اپنا ڈر تھا کہ ابھی کپڑے ہٹا کر دیکھیں گے تو وہ پکڑی جائے گی۔ ادھر اسے چھوٹی بہن کی فکر تھی۔

پھر بستروں والے صندوق کو کھولنے والا چلایا۔ ''وہ رہی''۔

یہ آواز سنتے ہی ٹرنک کھولنے والے نے بے ساختہ ٹرنک بند کر دیا۔ نور بانو نے سکون کی گہری سانس لی۔ مگر پھر اسے یہ فکر ستانے لگی کہ گلنار کا کیا ہوگا۔ اس پریشانی میں اس نے ٹرنک کو تھوڑا سا کھول لیا۔ تاکہ باہر کی سن گن مل سکے۔

باہر کی آوازوں سے پتا چل گیا کہ حور بانو بھی پکڑی گئی ہے۔ عجیب بات یہ تھی کہ دونوں بہنوں کے چیں کرنے کی آواز بھی اس نے نہیں سنی تھی۔ شاید وہ فرط خوف سے گنگ ہو گئی تھیں۔ البتہ کسی نے کہا..... انہیں گرو جی کے پاس لے چلو۔

قدموں کی چاپوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ سب ان کے کمرے کی طرف جا رہے ہیں۔ نور بانو نے ٹرنک تھوڑا سا اور کھولا۔ چند لمحوں میں اسے یقین ہو گیا کہ کوٹھری میں اب کوئی نہیں ہے۔

نور بانو چند لمحے جھجکتی رہی۔ پھر نجانے کہاں سے اس میں اتنی ہمت آ گئی کہ وہ ٹرنک سے نکل آئی۔ اس نے کرتے سلیقے اور ترتیب سے رکھنے کے بعد ٹرنک بند کر دیا۔ پھر وہ لرزتے قدموں سے دروازے کی طرف بڑھی۔

کوٹھری کے دروازے پر رک کر اس نے سر ذرا سا باہر نکالا۔ کمرے کا منظر تو وہ باہر نکلے بغیر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اور باہر نکلنے کی بہرحال اس میں ہمت نہیں تھی۔ کمرے کی آوازیں اسے صاف سنائی دے رہی تھیں۔

''تیسری نہیں ملی؟''۔ کمرے میں کوئی پوچھ رہا تھا۔

''تلاش کر رہے ہیں گرو۔ مل جائے گی۔ جائے گی کہاں؟''۔ کسی نے جواب دیا۔

''ڈھونڈ وا سے''۔

''کوٹھری میں تو نہیں ہے۔ باہر دیکھتے ہیں''۔

باہر..... دوسری طرف سے اسے ماں کی دردناک چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ ان چیخوں میں ایسی اذیت تھی کہ اس پر تھرتھری چڑھ گئی۔ حملہ آوروں کی آخری بات سے اسے یہ اطمینان ہو گیا کہ کم از کم فوری طور پر وہ کوٹھری کا رخ نہیں کریں گے۔ لیکن یہ تشویش بھی ہوئی کہ انہیں اس کے وجود کا علم ہے اور وہ اسے تلاش کر رہے ہیں۔

وہ تھوڑا سا پیچھے ہٹ آئی اور دروازے کے ایک پٹ کو آہستگی سے بھیڑ دیا۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے اسے یہ ڈر نہیں تھا کہ کوئی اسے دیکھ لے گا۔

لالٹین ہاتھ میں لئے کچھ لوگ اسے باہر جاتے دکھائی دیئے۔ وہ سمجھ گئی کہ وہ اس کو تلاش کرنے کے لئے نکلے ہیں۔ باہر سے اماں کی چیخیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن اندر کمرے میں جہاں اس کی دونوں بہنیں موجود تھیں، خاموشی تھی۔

مگر اس لمحے اسے گلنار کی لرزہ خیز چیخ سنائی دی۔ چند لمحے خاموشی رہی۔ پھر گلنار کی نہ رکنے والی چیخوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان چیخوں میں اتنی اذیت تھی کہ انہیں سن کر کوٹھری میں کھڑی نور بانو کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔ کھڑا رہنا اس کے لئے ممکن نہیں رہا۔ وہ بیٹھ گئی۔

باہر سے اماں کی چیخیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ نور بانو نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لئے تھے۔ ورنہ وہ پاگل ہو جاتی۔ کیونکہ اس کے وجود میں بہن کو بچانے کے لئے لپک کر جانے کی دیوانی خواہش مچل رہی تھی۔ اور یہ پاگل پن ہی ہوتا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ بہن کو تو نہیں بچا سکے گی۔ البتہ خود بھی اسی اذیت سے دوچار ہو جائے گی۔

پھر باہر کی جانب سے اماں کی آخری چیخ سنائی دی۔ وہ دم توڑتی ہوئی چیخ تھی۔ اس کے بعد باہر سناٹا چھا گیا۔ اندر گلنار کی چیخوں میں شدت اور اذیت اور بڑھ گئی تھی۔ پھر اندر سے ایک اور چیخ بلند ہوئی۔ وہ آپی کی چیخ تھی..... حور بانو کی چیخ!

اب کانوں پر ہاتھ رکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ بہنوں کی وہ چیخیں اس کے وجود میں اتر کر بازگشت کی طرح گونج رہی تھیں..... وجود کی دیواروں سے سر ٹکرا رہی تھیں، ایسے پرندوں کی طرح، جو کسی تنگ جگہ میں بند کر دیئے گئے ہوں اور انہیں باہر نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا ہو۔ وہ ادھر ادھر دیوانہ وار اڑ رہے ہوں کہ شاید کہیں روزن ہو، جس سے باہر نکلنے کا انہیں موقع مل جائے۔

نور بانو نے غیر ارادی طور پر کانوں پر سے ہاتھ ہٹا لئے اور کوٹھری سے نکل آئی۔ اب وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ اسے یہ خیال بھی نہیں تھا کہ وہ کمزور ہے۔ کسی کے لئے کچھ نہیں کر سکتی۔ البتہ خود کو بھی مصیبت میں پھنسا لے گی۔ وہ تو اس وقت جیسے کسی ٹرانس میں تھی۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

وہ اس کمرے کی طرف بڑھی، جو تینوں بہنوں کی خواب گاہ تھا۔اس کا انداز اس مکھی کا سا تھا جو چھپکلی کی آنکھوں سے مسحور ہو کر بے اختیار چھپکلی کے کھلے منہ کی طرف بڑھتی ہے۔

وہ کوٹھری سے نکل کر چند قدم چلی۔کمرے کا کھلا دروازہ اس کے سامنے تھا۔اندر لیمپ کی روشنی تھی اور کمرے کا منظر بالکل صاف نظر آ رہا تھا۔

وہ منظر ایسا تھا کہ اسے دیکھ کر فرط دہشت سے وہ اپنی جگہ جم کر رہ گئی۔نہ وہ آگے بڑھ سکتی تھی۔اور نہ پیچھے ہٹ سکتی تھی۔وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھتی رہی، جو اسے نہیں دیکھنا چاہئے تھا،مگر وہ مجبور تھی۔

اس کے تصور کے کسی تاریک ترین گوشے میں بھی یہ خیال نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے،وہ تو نہایت معصوم اور بے خبر لڑکی تھی۔اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ انسان اس طرح درندہ بھی بن سکتا ہے۔

اس کی دونوں بہنوں کے بدن پر کپڑے کا تار بھی نہیں تھا۔اور ان کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا،اسے دیکھتے ہوئے اس کے شل دماغ میں ایک بے بس سوچ سر اٹھا کر اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی کوشش کر رہی تھی.....کہ اسے یہ سب کچھ نہیں دیکھنا چاہئے۔لیکن ماؤف دماغ اس سوچ کو سننے سے قاصر تھا۔

وہ دیکھتی رہی اور پوری جان سے لرزتی رہی۔درندے اس کی بہنوں کو نوچ رہے تھے.....کاٹ رہے تھے.....بھنبھوڑ رہے تھے۔وہ بہنیں جن کے سینوں سے دوپٹہ کبھی اماں اور چھمن بوا کے سامنے بھی نہیں ڈھلکتا تھا،آج نامحرموں کے سامنے بے لباس تھیں۔دو چاند تھے،جن پر گہن لگ رہا تھا۔

وہ دیکھتی رہی۔سن دماغ کا کوئی حصہ اسے کچھ بتانے کی کوشش کر رہا تھا.....یہ کہ اگر وہ پکڑی گئی تو یہی سب کچھ اس کے ساتھ بھی ہوگا۔لیکن وہ ایسی کیفیت میں تھی کہ اس پیغام کو سمجھنا اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔خوف ایسا تھا کہ اس نے ہر ممکنہ خوف کو مٹا ڈالا تھا۔

اس کی دونوں بہنوں کی چیخیں اب آسمان کو چھو رہی تھیں۔

وہ یونہی کھڑی رہتی اور پکڑی جاتی۔لیکن اس لمحے ایک معجزہ ہو گیا۔کمرے کی دیوار پر لرزتی ہوئی روشنی پڑی.....اور وہ روشنی جیسے اس کے دماغ میں اتر گئی۔اس کا دماغ ایک دم روشن ہو گیا۔ایک پل میں وہ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گئی۔

کمرے میں جو لوگ درندگی کا کھیل کھیل رہے تھے،انہیں نظر اٹھانے کی فرصت نہیں تھی کہ وہ اسے دیکھ پاتے۔لیکن دیوار پر تھرکتی لالٹین کی روشنی بتا رہی تھی کہ جو لوگ اسے ڈھونڈنے کے لئے گئے تھے،وہ ناکام واپس آ رہے ہیں۔انہوں نے اسے دیکھ لیا تو پکڑ لیں گے اور انہوں نے پکڑ لیا تو اس پر.....

بھی وہی گزرے گی،جو بہنوں پر گزر رہی ہے۔

حد سے بڑھا ہوا خوف بھی عجیب چیز ہے۔کبھی تو آدمی کو ہلنے کے قابل بھی نہیں رہنے دیتا اور کبھی اس کو پر لگا دیتا ہے۔

نور بانو کا ٹرانس تو اس روشنی کو دیکھتے ہی ختم ہو گیا تھا۔مگر ایک پل میں وہ کوٹھری کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔کہاں تو چند لمحے پہلے تک اس کا دماغ مفلوج تھا اور کہاں یہ کہ اب اس کا دماغ بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔

کوٹھری کے علاوہ اس کیلئے کہیں پناہ نہیں تھی۔کوٹھری میں گھس کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔وقت بہت کم تھا۔وہ بہت تیزی سے سوچنے کی کوشش کر رہی تھی۔اس کی نظریں بستروں والے صندوق پر جم گئیں۔

ہاں.....یہ ٹھیک ہے۔اس نے سوچا۔انہوں نے گلنار کو اسی صندوق میں سے نکالا تھا۔اب انشا اللہ کم از کم وہ اس صندوق کو کھول کر نہیں دیکھیں گے۔یہ سوچ کر وہ اس صندوق کی طرف مڑی۔مگر لڑکھڑا گئی۔

دراصل بچنے کے خیال نے اسکے جسم میں بجلی ضرور بھر دی تھی۔لیکن اس کی تھرتھری کا وہی عالم تھا۔خوف نے رخ ضرور بدل لیا تھا لیکن اصل خوف ذہن کے کسی گوشے میں اب بھی موجود تھا۔

اس نے خود کو سنبھالا اور صندوق میں اتر گئی۔گلنار کو نکالتے ہوئے ان لوگوں نے بستر بے ترتیب چھوڑ دیئے تھے۔لہٰذا انہیں ترتیب دینے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔اس نے ایک لحاظ اور گدا اپنے اوپر گھسیٹ لیا اور صندوق کو بند کر دیا۔

صندوق بند ہوتے ہی اسے ایسا لگا کہ وہ کسی پناہ گاہ میں آ گئی ہے۔باہر کی تمام آوازیں باہر ہی رہ گئی تھیں۔

محفوظ ہونے کا احساس ہوا تو اس کی نظروں میں بہنوں پر گزرنے والی قیامت کے منظر پھرنے لگے۔وہ رونے لگی،سسکیوں کی آواز بلند ہونے لگی تو اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔کہیں یہ سسکیاں ان درندوں کو اس تک نہ لے آئیں۔عافیت اس میں تھی کہ فی الوقت وہ بہنوں کے بارے میں نہ سوچے۔یہ کام تھا تو بہت مشکل۔مگر عزت آبرو اور زندگی داؤ پر لگی تھی۔اسلئے قدرے آسان ہو گیا۔

اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔اور یہ اس کے حق میں بہتر ہی تھا۔ورنہ ممکن تھا کہ ڈر کر وہ کوئی آواز نکال دیتی۔اسے پتا ہی نہیں چلا کہ وہ اسے تلاش کرنے کے لئے کوٹھری میں آئے تھے۔جس صندوق میں وہ پہلے چھپی تھی،انہوں نے اسے کھول کر دیکھا تھا۔پھر ان میں سے ایک بستروں والے صندوق کی طرف بڑھا،جہاں وہ چھپی ہوئی تھی تو دوسرا نے اسے ٹوک دیا۔''اسے دیکھا جا چکا ہے۔چھوٹی اسی میں سے نکلی تھی''۔

پھر وہ ناکام ہو کر چلے گئے۔نور بانو کا پتا بھی نہیں چلا۔وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ بھینچے صندوق میں دبکی رہی۔

نجانے کتنی دیر ہو گئی۔اسے باہر کا کچھ پتہ نہیں تھا۔اور اندر سوچنے کے لئے اس کے پاس بہنوں کی ابتلا کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔رہ رہ کر وہ منظر اس کی آنکھوں میں پھر رہے تھے،اور باہر نکلنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔اس میں تو اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ صندوق کا پٹ ہی تھوڑا سا اٹھا دیتی۔

اب اس کے لئے اپنی سسکیوں کو روکنا مشکل ہو گیا۔اس کی سسکیاں بلند ہونے لگیں۔وقت کتنا گزر گیا ہے،اسے معلوم نہیں تھا۔وہ تو بس بے بسی سے رو رہی تھی.....سسک رہی تھی۔

کچھ وقت اور گزر گیا۔اب اس کا دم گھٹ رہا تھا۔رونے کی وجہ سے سانس لینا اور دشوار ہو گیا تھا۔اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ صندوق کا ڈھکنا تھوڑا سا اٹھائے تاکہ تازہ ہوا اندر آئے۔

روتے اور سسکتے ہوئے اس نے صندوق کا ڈھکنا تھوڑا سا اوپر اٹھایا۔یہ وہ وقت تھا،جب اوتار سنگھ کوٹھری کے سامنے سے گزر رہا تھا۔اس نے اس کی سسکیوں کی آواز سنی۔لیکن کوٹھری کا رخ کرنے کے بجائے کمرے میں چلا گیا۔

نور بانو میں باہر نکلنے کی ہمت اب بھی نہیں تھی۔اس نے صندوق کا ڈھکنا مزید اوپر اٹھایا۔وہ اپنی سسکیوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔لیکن بہنوں پر گزرنے والی قیامت کے منظر نگاہوں میں پھرتے تو اس کی سسکیاں گھٹی گھٹی چیخوں میں تبدیل ہونے لگتیں۔وہ انہیں روک نہیں سکتی تھی۔

پھر ایک نئی بات ہوئی۔بہنوں کا خیال آیا تو اسے احساس جرم ہونے لگا۔اس کا ضمیر اسے ملامت کرنے لگا۔اس کی بہنوں پر کیسی قیامت گزری تھی اور وہ بے حسی سے تماشہ دیکھ رہی تھی۔پھر اس نے سوچا کہ وہ کچھ کر تو نہیں سکتی تھی۔زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ وہ خود بھی اس درندگی کی بھینٹ چڑھ جاتی۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

اس پر اس نے سوچا کہ ایسا ہوا ہوتا تو اچھا ہی ہوتا۔کم از کم ضمیر پر بوجھ تو نہ ہوتا۔اور ابھی تو اسے یہ بھی نہیں معلوم کہ دونوں بہنوں پر کیا گزری ہے وہ زندہ بھی ہیں یا.....

اس سے آگے اس سے سوچا بھی نہیں گیا۔اس کے اندر متضاد اور ایک دوسرے سے متصادم سوچوں نے اسے اور کمزور کر دیا۔اس کی سسکیاں اور بلند ہو گئیں۔اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ دہاڑیں مار کر..... چیخ چیخ کر روئے۔اور خود پر قابو پانا اس کیلئے ناممکن ہوا جا رہا تھا۔کوشش کے باوجود اس کے منہ سے گھٹی گھٹی چیخیں نکلنے لگیں۔

یہ وہ وقت تھا کہ اس نے کوٹھری کی طرف آتے ہوئے قدموں کی چاپ سنی۔پھر کسی نے پکارا۔''کون.....کہاں ہو تم؟''۔

اس نے اپنا ہاتھ منہ میں لیا اور چبا ڈالا۔اس کی گھٹی ہوئی چیخیں معدوم ہو گئیں اور سسکیاں رہ گئیں۔اسی لمحے صندوق کی جھری سے اس نے کسی کو لالٹین اٹھائے کوٹھری میں داخل ہوتے دیکھا۔اس نے گھبرا کر صندوق کو نیچے کر لیا۔لیکن اسے پتا نہیں چلا کہ صندوق پوری طرح بند نہیں ہوا ہے۔بہت چھوٹی سی ایک جھری رہ گئی ہے۔

وہ دہشت سے بے حال ہو گئی تھی۔اس پر لرزہ چڑھا ہوا تھا۔اس کا ہاتھ اپنے منہ پر بہت سختی سے جما تھا۔لیکن وہ اپنی ڈری ڈری آوازوں کا پوری طرح گلا نہیں گھونٹ پا رہی تھی۔اسے بس ایک خیال ستا رہا تھا.....اب اس کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوگا، جو اس کی بہنوں کے ساتھ ہو چکا ہے۔اور یہ خیال بے حد روح فرسا تھا۔اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہونے لگی۔ہوش و حواس اس کا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔

قدموں کی چاپ اسے اب بھی سنائی دے رہی تھی۔مگر وہ بہت ہلکی تھی۔حالانکہ اندر آنے والا اب کوٹھری میں آ چکا ہوگا۔اس سے اس کی سمجھ میں آ گیا کہ صندوق پوری طرح بند نہیں ہوا ہے اور جیسے اسے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہے، اسی طرح کوٹھری میں آنے والے کو اس کی سسکیاں سنائی دے رہی ہوں گی۔مگر اب اس میں ہلنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔لرزتے ہوئے ہاتھ اس کے قابو میں نہیں تھے، وہ صندوق کو پوری طرح بند کرنے کی کوشش کرتی تو زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ وہ اپنی موجودگی کا راز افشا کر دیتی۔

اور تو کچھ نہیں ہوا، اس پر وحشت اور گھبراہٹ طاری ہو گئی۔خوف اتنا بڑھا کہ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی سلب ہو گئی۔اب وہ تصور میں اپنے ساتھ وہی کچھ ہوتے دیکھ رہی تھی، جو اس کی بہنوں کے ساتھ ہوا تھا۔

باہر کسی نے کچھ کہا۔اس نے آواز سنی۔لیکن ایک لفظ بھی نہ سمجھ سکی۔بس اسے یہ خیال آیا کہ آنے والے کے اور ساتھی بھی آ گئے ہیں اور وہ ان سے کچھ کہہ رہا ہے۔اس کا خوف اور بڑھ گیا۔اب اسے کوئی نہیں بچا سکتا.....

پھر کسی نے صندوق کھول دیا۔نور بانو کو ایسا لگا کہ اس کا دل بند ہو جائے گا۔اپنا ہاتھ سختی سے منہ پر جمائے جمائے اس نے آنکھیں بند کر لیں اور دل میں دعا کرنے لگی کہ صندوق کھولنے والا لحاف نہ ہٹائے۔

مگر آنکھیں بند ہونے کے باوجود اسے احساس ہو گیا کہ لحاف ہٹا دیئے گئے ہیں۔اب اسے چیخنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔اب تو چیخیں روکنے کا کوئی جواز ہی نہیں رہا تھا۔اس نے آنکھیں کھول دیں اور منہ پر سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے چلائی۔''ہٹ جاؤ۔مجھے چھوڑ دو۔رحم کرو مجھ پر''۔

اس نے کھلی آنکھوں سے دیکھا۔سامنے کوئی تھا۔لیکن اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا رہا تھا۔وہ اسے نہیں دیکھ سکتی۔وہ بری طرح لرز رہی تھی۔اور پھر اس کے ہوش و حواس پوری طرح اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔وہ ایک طرف گرتی چلی گئی۔

.....x.....

رگھو اور رنجنا اوپر چلے آئے تھے۔اور دونوں روئے چلے جا رہے تھے۔رنجنا کو یہ خیال بھی نہیں تھا کہ رگھو کے زخمی ہاتھوں اور ماتھے کی فکر کرنی ہے۔بس وہ تو یہ سوچ کر روئے جا رہی تھی کہ نیچے اتنے پیارے پیارے لوگوں میں سے کوئی بھی نہیں بچا۔اور رگھو اس خیال سے رو رہا تھا کہ مالک کو کیا منہ دکھائے گا۔

کچھ دیر گزری تو انہیں ایسا لگا کہ زینے پر کوئی چڑھ رہا ہے۔رگھو ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے لاٹھی اٹھا لی۔

مگر اگلے ہی لمحے لاٹھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔اوپر آنے والا چھوٹا ٹھاکر تھا اور اس نے ہاتھوں پر ایک لڑکی کو اٹھا رکھا تھا۔وہ جیسے ہی اندر داخل ہوا، رگھو تیزی سے اس کے قدموں میں سر رکھ کر بیٹھ گیا۔''مجھے شما کر دو مالک۔میں کچھ نہیں کر سکا۔مجھے شما کر دو مالک''۔

''رگھو.....ہوش میں آ۔مجھے راستہ دے''۔اوتار سنگھ نے اسے ڈانٹا۔

لیکن رگھو نے تو جیسے کچھ سنا ہی نہیں تھا۔''میں مجبور تھا مالک۔انہوں نے دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا.....''۔وہ اپنی کہے جا رہا تھا

''مجھے معلوم ہے رگھو۔انہوں نے گلی کے ہر گھر کا دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔تو اٹھ جا رگھو۔مجھے راستہ دے''۔

رگھو اٹھ کھڑا ہوا۔اوتار سنگھ تیزی سے اس کمرے کی طرف بڑھ گیا، جو کبھی اس کے ویر جی.....وصال دین کے استعمال میں رہتا تھا۔وہاں اس نے لڑکی کو بستر پر لٹایا اور پھر کمرے سے باہر آ گیا۔

رگھو اور رنجنا سر جھکائے کھڑے تھے۔''رگھو.....تم جاؤ اور گلی کے تمام گھروں کے دروازے کھول کر آ جاؤ''۔اوتار سنگھ نے کہا۔

''لیکن مالک اپنا دروازہ بھی تو بند ہے۔کھلا ہوتا تو.....''۔

''میں اڑ کر تو نہیں آیا ہوں رگھو۔بیچ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور ماں جی کا.....''۔ماں جی کا نام لیتے ہوئے اوتار سنگھ کی آواز بھرا گئی۔''گھر کا دروازہ ٹوٹا ہوا ہے میری بات دھیان سے سنو رگھو۔ماں جی کے گھر میں جاتے ہی بیچ کا دروازہ اس طرف سے بند کر دینا۔پھر گلی کے تمام دروازے کھول کر آؤ تو اپنا دروازہ بھی کھول لینا اور اسی سے اندر آنا''۔

بات تو رگھو کی سمجھ میں آ گئی۔لیکن وہ الجھ گیا۔لیکن وجہ پوچھنا اس کے مزاج میں ہی نہیں تھا۔''جو حکم مالک''۔اس نے کہا اور جانے کے لئے پلٹا۔

''اور ہاں، ایک بات اور''۔اوتار سنگھ نے کہا۔''کسی کو نہیں بتانا کہ وہ لڑکی ہمارے گھر میں ہے''۔

رگھو پلٹ کر اس کی بات سن رہا تھا۔اس نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔لیکن بولا کچھ نہیں۔

رگھو کے جانے کے بعد اوتار سنگھ رنجنا کی طرف متوجہ ہوا۔''تم بھی دھیان سے سنو رنجنا۔اندر جاؤ اور اس لڑکی کو ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔مگر پہلے دروازہ اندر سے بند کر لینا۔اسے سمجھانا کہ وہ محفوظ ہے۔کہنا کہ وہ چیخے چلائے نہیں۔زور سے بولے بھی نہیں۔کسی کو اس کی یہاں موجودگی کا پتا نہ چلے، اسی میں اس کی بہتری ہے۔جن لوگوں نے حملہ کیا تھا، ممکن ہے ان میں کوئی جان پہچان والا بھی ہو۔ایسا ہے تو انہیں علم ہوگا کہ تیسری لڑکی موجود نہیں تھی۔تو وہ اس کے چکر میں رہیں گے''۔

''مگر پڑوسیوں کو تو معلوم ہونا چاہئے چھوٹے ٹھاکر.....''۔

''یہی تو میں نہیں چاہتا''۔اوتار سنگھ نے گہری سانس لے کر کہا ''دیکھو، پڑوسیوں کو پتا چلے گا تو وہ لڑکی کو یہاں نہیں رہنے دیں گے۔کوئی مسلمان گھر اسے پناہ دے گا۔مگر مسلمان گھر سب خطرے میں ہیں۔جبکہ ہمارا گھر محفوظ ہے۔میں کچھ بھی نہیں کر سکا اور ماں جی کا پورا گھر ختم ہو گیا''۔اوتار سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''اب میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ لڑکی بچ جائے۔اسے کچھ نہ ہو۔میری شرمندگی کچھ تو کم ہو''۔

رنجنا کا دل کٹنے لگا۔''آپ فکر نہ کریں مالک۔وہ مجھے جانتی ہے''

''بس تم اس کے پاس جاؤ اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرو''۔

رنجنا کمرے میں چلی گئی اور دروازہ بند کر لیا۔اوتار سنگھ اکیلا رہ گیا۔واپسی کے بعد سے یہ پہلا موقع تھا کہ جو کچھ ہو چکا تھا، اس پر سوچنے کی اسے مہلت ملی تھی۔اور لڑکی کے بارے میں بغیر سوچے سمجھے اس نے جو فیصلہ کیا تھا، اس پر اسے حیرت ہوئی تھی۔اس بحران میں اس نے کب اور کیسے یہ سب کچھ سوچ لیا۔ویسے یہ حقیقت تھی کہ مسلمانوں کے پاس وہ لڑکی غیر محفوظ رہتی۔اور اب اس لڑکی کی حفاظت اس کا مشن تھا۔اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اسے سات پردوں میں چھپا کر رکھے گا اور اسے کوئی ضرر نہیں پہنچنے دے گا۔

اسے اندازہ ہو گیا کہ اس نے بہت برا بحران دیکھا ہے۔اور ابھی وہ اس پر سوچ نہیں سکتا۔کیونکہ اس نے سوچنے کی کوشش کی تو اس کی نگاہوں میں ماں جی کی بے یار و مددگار لاش پھر گئی۔پھر وہ دونوں لڑکیاں.....کیا وہ یہ مناظر کبھی بھول سکے گا؟ کیا اس احساس جرم سے کبھی اسے نجات مل سکے گی.....؟

رگھو آیا تو اسے ان سوچوں سے نجات مل گئی۔مگر رگھو کو دیکھ کر اسے جھٹکا لگا۔اس کی پیشانی زخمی اور چہرہ لہولہان تھا۔ہاتھ بھی لہولہان ہو رہے تھے۔

''ارے.....یہ تمہیں کیا ہوا ہے رگھو؟''۔اس نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

رگھو پھر اس کے پیروں میں گر گیا۔''مجھے شما کر دو مالک، مجھے شما کر دو''۔

اوتار سنگھ جھنجھلا گیا۔''میں پوچھ رہا ہوں، ہوا کیا ہے؟''۔

''آپ کے حکم پر ان کے بچانے کے لئے میں جان بھی دے دیتا مالک''۔رگھو اب رو رہا تھا۔''مگر موقع ہی نہیں ملا۔بس یہی کچھ کر سکا میں''۔

''میں پھر پوچھ رہا ہوں کہ ہوا کیا ہے؟''۔

''مجھے نہیں معلوم مالک۔بس میں چھری سے بیچ کا دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہا تھا؟''۔

''اچھا.....اب چلو میرے ساتھ''۔اوتار سنگھ نے جھٹکے سے اسے کھڑا کیا۔اس کے زخم دھلا کر اس کی مرہم پٹی کرنی تھی۔

اس واقعے کو ایک ہفتہ ہو گیا تھا۔مارے جانے والوں کی تدفین پہلے ہی دن ہو گئی تھی۔متاثرہ گھر میں سب سے پہلے محلے کی خواتین داخل ہوئی تھیں۔ان میں مسلمان بھی تھیں اور ہندو بھی۔اندر جو کچھ انہوں نے دیکھا تھا، اس نے ان کی روحوں تک کو لرزا دیا تھا۔پردہ دار عورتوں کی بے لباسی اور ان کے جسموں پر درندگی کے نشانات کوئی کبھی نہیں بھول سکا۔

اس واقعے کے نتیجے میں مسلمان بری طرح سہم گئے تھے۔

نور بانو کو پہلے دن ہوش آیا تو اس کے سامنے ایک جانا پہچانا چہرہ تھا۔رنجنا اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دے رہی تھی۔نور بانو کے اندر بے شمار چیخیں گھٹی ہوئی تھیں، جنہیں وہ دباتی رہی تھی۔جانا پہچانا چہرہ دیکھتے ہی اس نے چیخنے کے لئے منہ کھولا.....

رنجنا نے گھبرا کر بے ساختہ کہا۔''چیخنا مت منجھلی بی بی۔وہ لوگ تمہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں''۔

یہ سنتے ہی نور بانو کے دانت بھنچ گئے۔آنکھوں سے خالی پن جھانکنے لگا اور وہ بے ہوش ہو گئی۔

رنجنا کو نہیں پتا تھا کہ اس نے بے خبری میں ایک مسئلے کو ہمیشہ کے لئے حل کر دیا ہے۔یہ جملہ نہ ہوتا تو نور بانو اس طرح چیختی کہ پورا محلہ اکٹھا ہو جاتا۔اس جملے نے نور بانو کو سمجھا دیا.....یاد دلا دیا کہ وہ چیخے گی.....آواز بھی نکالے گی تو گویا ظالموں کو اپنا پتا دے رہی ہوگی۔

بے چاری رنجنا تو پریشان ہو گئی کہ منجھلی بی بی پھر بے ہوش ہو گئی ہے۔

اس شام کو نور بانو کو دوبارہ ہوش آیا تو اس کے تمام لوگوں کی تدفین ہو چکی تھی۔اس نے آنکھیں کھول کر رنجنا کو دیکھا اور بولی۔''تم رنجنا ہی ہو نا''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''ہاں منجھلی بی بی''۔رنجنا کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔''مجھے بھول گئیں؟''۔

''بھول گئی!''۔نور بانو جیسے ذہن پر زور دینے کی کوشش کر رہی تھی۔''نہیں.....بھولی تو نہیں۔مگر لگتا ہے، کچھ کچھ بھول گئی ہوں''۔پھر اچانک اس نے پوچھا۔''میں کہاں ہوں؟''۔

''ہمارے گھر میں اپنے مکان کے اوپری حصے میں''۔

''میں یہاں کیوں آئی ہوں؟ کون لایا ہے مجھے یہاں؟''۔

رنجنا نے اسے غور سے دیکھا۔''آپ کو یاد نہیں''۔

نور بانو نے پھر ذہن پر زور دیا اور اچانک تھر تھر کانپنے لگی۔''کچھ کچھ یاد آتا ہے۔لیکن زیادہ یاد کروں تو ڈر لگتا ہے.....بہت ڈر لگتا ہے.....اتنا کہ لگتا ہے کہ میں خوف سے مر جاؤں گی''۔

رنجنا پڑھی لکھی نہیں تھی۔لیکن عقل مند تھی۔اس نے سمجھ لیا کہ خود سے سب کچھ بتانا ٹھیک نہیں۔اگر وہ نور بانو کے سوالوں کے جواب دے گی تو ممکن ہے، وہ بھڑک جائے یا پھر سے دورہ پڑ جائے۔اور خاص طور پر یہ بات کہ اسے چھوٹے ٹھاکر اوپر لائے ہیں۔''آپ کو یاد نہیں کہ آپ خود یہاں آئی ہیں''۔اس نے گول مول بات کی۔

''میں یہاں کیوں آئی؟ پہلے تو کبھی میں یہاں نہیں آئی''۔

''اب یہ تو آپ خود ہی یاد کریں''۔

نور بانو نے پھر ذہن پر زور دیا.....اور اس پر پھر لرزہ چڑھ گیا۔''یاد نہیں آتا''۔اس نے بے بسی سے کہا۔پھر ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔''مگر میں یہاں نہیں رہ سکتی۔میں اپنے گھر جاؤں گی''۔

وہ بہت تیزی سے اٹھی تھی۔رنجنا گھبرا گئی کہ اب اسے کیسے روکے۔مگر اسی لمحے نور بانو چکرائی اور گر گئی۔اچھا یہ ہوا کہ وہ پلنگ پر گری تھی۔اسے چوٹ تو نہیں لگی۔لیکن جیسے اسے چکر آیا تھا، اس سے وہ خوف زدہ ہو گئی۔''یہ کیا ہوا ہے مجھے؟''۔اس نے گھبرا کر کہا۔''مجھ سے کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا ہے''۔

رنجنا نے اس موقعے سے فائدہ اٹھایا۔''آپ یہاں اس لئے ہیں منجھلی بی بی کہ آپ کی طبیعت خراب ہے۔طبیعت ٹھیک ہو جائے تو چلی جایئے گا''۔رنجنا جانتی تھی کہ اسے کمزوری ہے۔رات سے اب تک اس نے کچھ کھایا بھی تو نہیں تھا۔بے ہوشی کے دوران اس نے اسے دلیہ کھلانے کی کوشش کی تھی۔لیکن دانت پر دانت سختی سے جمے ہونے کی وجہ سے اس کے حلق میں کچھ بھی نہیں گیا تھا۔

''طبیعت خراب ہو تو آدمی اپنے گھر میں رہتا ہے''۔نور بانو کے لہجے میں الجھن تھی۔''اچھا.....اماں کو بلا دو''۔

''بڑی بیگم تو نہیں ہیں''۔رنجنا نے بے ساختہ کہا۔

''کیوں.....؟ وہ کہاں ہیں؟''۔

رنجنا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔کاش وہ چھوٹے ٹھاکر سے پوچھ سکتی۔اچانک اسے یاد آیا کہ بڑی بیگم آگرہ میں اپنے رشتہ داروں کا ذکر کرتی تھیں۔اس نے جلدی سے کہا۔''وہ تو آگرہ گئی ہیں.....آپ کے ماموں کے ہاں''۔

''تو آپی کو بلا دو''۔

''گھر میں کوئی نہیں ہے منجھلی بی بی۔سب لوگ بڑی بیگم کے ساتھ گئے ہیں''۔

''عجیب بات ہے''۔

''آپ کو بیماری کی وجہ سے یہاں چھوڑ گئے ہیں۔اچھا.....میں آپ کے لئے دلیہ لاتی ہوں منجھلی بی بی''۔

رنجنا نے بڑی مشکل سے بہلا پھسلا کر اسے دلیہ کھلایا۔کھانے کے ذرا دیر بعد نور بانو سو گئی۔سونا کیسا، وہ تو پیٹ بھرنے کے بعد کی غشی تھی۔

رنجنا نے وہ سب کچھ اوتار سنگھ کو سنایا۔اوتار سنگھ چند لمحے سوچتا رہا۔پھر بولا۔''یہ تو قدرت کی مدد ہے۔ورنہ بڑا مسئلہ ہو جاتا۔لیکن رنجنا، ہم اسے ڈاکٹر کو بھی نہیں دکھا سکتے۔تمہیں ہی اسے سنبھالنا ہوگا''۔

''میں کیسے سنبھالوں گی مالک۔ان کے تو دماغ پر اثر ہو گیا ہے''

''یہ کوئی اثر وثر نہیں ہے''۔اوتار سنگھ نے نرم لہجے میں کہا۔''اس نے جو کچھ دیکھا ہے، اسے بھول جانا چاہتی ہے۔تم اس سے اصرار کبھی نہ کرنا۔بس اسے دھیرے سے یاد کرنے کا کہتی رہنا۔تھوڑا تھوڑا یاد آئے گا تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ایک دم یاد آئے گا تو اس کے لئے بڑا صدمہ ہوگا''۔

''اور ایک دم سب یاد آ گیا تو؟''۔

''جیسے ہی کچھ یاد آئے تو بات بدل دینا۔پھر تھوڑی دیر بعد بات آگے بڑھانا''۔

رنجنا اب بھی گھبرا رہی تھی۔مگر چھوٹے ٹھاکر کے سامنے دم نہیں مار سکتی تھی۔

اوتار سنگھ کی بات ٹھیک تھی۔نور بانو نے جو کچھ دیکھا تھا، اس نے اس کو ذہنی طور پر تقسیم کر دیا تھا۔ذہن کا ایک حصہ وہ سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا۔جبکہ دوسرا حصہ اسے یاد رکھنے پر مصر تھا۔یوں وہ ایک عارضی دماغی اختلال میں مبتلا ہو گئی تھی۔

تین دن گزرے تو نور بانو کی کمزوری دور ہو گئی۔رنجنا نے اس کے کھانے پینے کا بہت خیال رکھا تھا۔

چوتھے دن بیٹھے بیٹھے نور بانو نے کہا۔''تمہیں پتا ہے، رات کو ہمارے گھر میں کچھ لوگ گھس آئے تھے''۔

رنجنا کو چھوٹے ٹھاکر کی ہدایت یاد تھی۔وہ بولی۔''ہاں.....مجھے معلوم ہے''۔

''تمہیں معلوم ہے، اس کے بعد کیا ہوا؟''۔نور بانو نے الجھن بھرے لہجے میں کہا۔

''نہیں.....یہ تو مجھے نہیں معلوم''۔رنجنا نے کہا۔''تمہیں یاد نہیں؟''

نور بانو ذہن پر زور دے رہی تھی۔''کچھ کچھ یاد آ رہا ہے''۔وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔''اماں گھبرائی ہوئی آئی تھیں اور ہمیں سوتے سے اٹھایا تھا۔کہنے لگیں.....تم لوگ کہیں چھپ جاؤ جلدی کرو''۔

''پھر کیا ہوا؟''۔

''ہم تینوں اٹھ کر کوٹھری کی طرف بھاگیں.....''۔یہ کہتے کہتے نور بانو پر لرزہ طاری ہو گیا۔

رنجنا نے جلدی سے بات بدلی۔''منجھلی بی بی.....تمہیں اپنے پتا جی یاد ہیں''۔

''ابا!''۔نور بانو نے برا مانتے ہوئے تصحیح کی۔''ہاں.....مجھے ابا یاد ہیں۔ابا بہت اچھے تھے''۔اتنی دیر میں وہ نارمل ہو گئی۔اب وہ جیسے دور کہیں دیکھ رہی تھی۔''ابا ہمیں بازار لے کر جاتے تھے۔عید کے کپڑے ابا خود دلاتے تھے.....''۔

''میرے پتا جی بھی بہت اچھے تھے''۔رنجنا نے کہا۔''ماں باپ سب کے ایک جیسے ہوتے ہیں۔مجھے اس بات کا بڑا دکھ ہے کہ پتا جی کے مرتے سمے میں ان کے پاس نہیں تھی۔میں انہیں دیکھ بھی نہیں سکی آخری بار''۔

''تمہارے پتا جی کو کیا ہوا تھا رنجنا؟''۔

''آپ کو یاد نہیں منجھلی بی بی؟''۔

''ہاں.....یاد آ گیا۔تمہارا تو پورا گاؤں ختم ہو گیا تھا لال آندھی میں''۔نور بانو کے لہجے میں ہمدردی تھی۔

''ہاں منجھلی بی بی۔ہمارا تو سب کچھ ختم ہو گیا۔ماں باپ، بہن بھائی، سب رشتے داریت کے تلے دب کر ختم ہو گئے۔کریا کرم بھی نصیب نہیں ہوا کسی کو''۔رنجنا کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔وہ اس لڑکی کو بہلانے کی کوشش میں اپنے زخم ہرے کر بیٹھی تھی۔

نور بانو ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو پونچھنے لگی۔''ایسے نہ رو رنجنا۔پتا ہے، موت تو اللہ کا حکم ہوتی ہے۔آنی ہے تو کوئی روک نہیں سکتا۔بہانہ چاہے کوئی ہو۔زندہ رہنے والوں کو تو بس صبر کرنا ہوتا ہے.....اور اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے آپ کو زندگی دی.....مہلت دی''۔

''جس کا بھرا پرا پریوار ختم ہو گیا ہو.....کوئی بھی نہ بچا ہو، اسے صبر کیسے آ سکتا ہے منجھلی بی بی''۔

''صبر تو کرنا پڑتا ہے۔اللہ کی مرضی کے آگے سر جھکانا پڑتا ہے''۔نور بانو نے رنجنا کا ہاتھ تھام لیا اور اسے سہلانے لگی۔

اگلے روز رنجنا نے پھر بات چھیڑی۔''جب لوگ گھر میں گھس آئے اور بڑی بیگم نے آپ لوگوں سے چھپنے کو کہا تو آپ کہاں چھپی تھیں منجھلی بی بی؟''۔

نور بانو نے ذہن پر زور دیا.....اور اگلے ہی لمحے جیسے وہ ٹرانس میں آ گئی۔اس کا جسم لرزنے لگا، آنکھیں پھیل گئیں جو کچھ اس پر گزری تھی، جو کچھ اس نے دیکھا تھا، وہ سنانے لگی۔اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

رنجنا اس کا ہاتھ تھام کر اسے سہلا رہی تھی۔ ''بس.....اب بس کرو منجھلی بی بی۔ بھول جاؤ وہ سب''۔

''بھولی ہوئی تو تھی۔ کب تک بھولی رہتی۔ اب سب یاد آ رہا ہے''۔ نور بانو نے سسکیوں کے درمیان کہا۔ پھر وہ چونکی۔ ''تم نے تو کہا تھا کہ میں بیمار ہوں۔ اس لئے یہاں ہوں۔ اور اماں.....اور سب لوگ آگرہ گئے ہیں''۔

''بیمار تو آپ تھیں منجھلی بی بی۔ اور اب بھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہیں''۔

''اماں کہاں ہیں؟ میری بہنیں کس حال میں ہیں؟''۔ نور بانو کا لہجہ ہذیانی ہو گیا۔ ''میں یہاں نہیں رکنا چاہتی۔ میں نیچے جاؤں گی.....اپنے گھر''۔

رنجنا گھبرا گئی۔ سخت مرحلہ آ گیا تھا۔ اس نے چھوٹے ٹھاکر کا انداز اختیار کیا۔ ''میری بات دھیان سے سنو منجھلی بی بی۔ ہم تم ایک ہی حال میں ہیں۔ ہمارے دکھ ایک جیسے ہیں''۔

''مطلب کیا ہے تمہارا؟''۔

''تمہارا بھی سب کچھ ختم ہو گیا۔ کچھ بھی نہیں بچا منجھلی بی بی''۔

نور بانو یوں بلک کر روئی کہ رنجنا کا دل پھٹنے لگا۔ اس نے نور بانو کو اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔ اچھا ہے، رو لے۔ دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ اس نے دل میں سوچا۔ لیکن نور بانو کی آواز بلند ہونے لگی تو اسے ٹوکنا پڑا۔ ''منجھلی بی بی.....خود پر قابو رکھو۔ تمہاری آواز گھر سے باہر نہیں جانی چاہئے''۔

نور بانو نے جھٹکے سے خود کو چھڑا لیا اور عجیب سی نظروں سے رنجنا کو دیکھا۔ ''کیوں؟ تم نے مجھے یہاں قید کر رکھا ہے؟''۔ یہ کہتے کہتے وہ سہم گئی۔

''نہیں۔ پر نتو تم کو چھپا رکھا ہے۔ کسی کو نہیں معلوم کہ تم یہاں ہو''۔

''کیوں؟''۔

''اس لئے کہ جنہوں نے تمہارا گھر اجاڑا ہے، ہو سکتا ہے، وہ تمہاری تلاش میں ہوں''۔

نور بانو اور سہم گئی۔ اسے یاد آ گیا کہ وہ لوگ تیسری لڑکی کو تلاش کر رہے تھے۔ ''مگر تم لوگ بھی تو ہندو ہو۔ میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتی۔ محلے میں مسلمان گھر بھی تو ہیں۔ مجھے ان میں سے کسی کے ہاں بھیج دو''۔

رنجنا کے دل پر چوٹ لگی۔ ''کیسی باتیں کرتی ہو منجھلی بی بی۔ ہم تمہارے گھر میں رہتے ہیں۔ برسوں کا ساتھ ہے ہمارا۔ میں تمہارے گھر میں آتی تھی۔ گھنٹوں بیٹھتی تھی۔ میرے مالک کو بڑی بیگم نے بیٹا بنایا تھا۔ اور تم کہتی ہو کہ ہم پر اعتبار نہیں کر سکتیں۔ ایمان کر رہی ہو ہمارا''۔ رنجنا کے لہجے میں شکایت تھی۔

''ہاں.....اب میں کسی ہندو پر اعتبار نہیں کر سکتی۔ میں نے درندگی دیکھی ہے۔ تم مجھے کسی مسلمان گھر میں پہنچا دو''۔

رنجنا کو غصہ بھی آیا اور جھنجھلاہٹ بھی ہوئی۔ لیکن چھوٹے ٹھاکر کے خیال سے وہ اسے پی گئی۔ ''سنو منجھلی بی بی، یہاں سے زیادہ محفوظ تم کہیں بھی نہیں ہو۔ مسلمانوں کے تمام گھر خطرے میں ہیں۔ کسی بھی سمے کسی بھی گھر میں وہی کچھ ہو سکتا ہے، جو تمہارے گھر میں ہوا تھا۔ تمہیں اپنی بہنیں یاد نہیں ہیں؟''۔

اس حوالے نے نور بانو کو ہلا کر رکھ دیا۔ بہنوں پر جو اس نے گزرتے دیکھی تھی، وہ اس کی نگاہوں میں پھر گئی۔ وہ پوری جان سے کانپنے لگی۔ کیا اس کے ساتھ بھی وہی سب ہو گا۔ یہ تصور بھی اس کے لئے روح فرسا تھا۔ اور یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ کوئی مسلمان گھر بھی محفوظ نہیں ہے۔ البتہ یہ گھر محفوظ ہے۔ مگر سوال یہ تھا کہ کیا یہاں وہ محفوظ ہے۔

اسے یاد تھا۔ اس نے چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں کبھی اچھا گمان نہیں رکھا تھا۔ اسکے معاملے میں وہ اماں سے ہمیشہ اختلاف اور بحث کرتی رہی تھی۔ اسے ہمیشہ چھوٹے ٹھاکر کی نیت پر شبہ رہا تھا۔ اور اب تو ہندوؤں کے بارے میں اس کی رائے بہت ہی خراب ہو گئی تھی۔

تو کیا یہ ممکن نہیں کہ یہاں بھی وہ لٹ جائے۔ اس نے سوچا۔

وہ بہت کم عمر تھی۔ لیکن بہت بڑے سانحے کم عمروں کو بھی جہاں دیدہ بنا دیتے ہیں۔ وہ بڑے لوگوں کے انداز میں سوچنے لگی۔ خطرہ یہاں بھی تھا۔ مگر یہاں سے باہر بہت بڑا خطرہ تھا۔ وہ یہاں بھی لٹ سکتی تھی۔ لیکن کم از کم اس کے ساتھ وہ کچھ نہیں ہو گا، جو اس کی بہنوں کے ساتھ ہوا تھا۔ اور یہ بھی ہے کہ وہ اپنے بچاؤ کے لئے بھی کچھ کر سکتی ہے۔ اور بچاؤ ممکن نہ ہو تو وہ جان بھی دے سکتی ہے۔

اس نے گہری سانس لی۔ وہ ایک نتیجے پر پہنچ گئی تھی۔ ''تم جانتی ہو رنجنا دیدی کہ میں پردہ کرتی ہوں''۔ اس نے کہا۔

''ہم سب کو پتا ہے۔ خود دیکھ لو کہ چھوٹے ٹھاکر اس کمرے کے پاس سے بھی نہیں گزرے ہیں''۔

اچانک نور بانو کو ایک خیال آیا۔ ''یہ بتاؤ، مجھے یہاں کون لایا تھا؟''۔

''چھوٹے ٹھاکر لائے تھے''۔ رنجنا کی نظریں جھک گئیں۔ ''مگر وہ تو مجبوری تھی۔ ان کلمونہوں نے تمہارا دروازہ توڑنے سے پہلے گلی کے تمام گھروں کے دروازے بند کر دیئے تھے۔ کوئی اپنے گھر سے نہیں نکل سکتا تھا۔ چھوٹے ٹھاکر شملہ سے آئے تو انہوں نے تمہارے گھر کا دروازہ ٹوٹا دیکھا۔ اندر گئے تو سب ختم ہو چکے تھے۔ تم بے ہوش تھیں۔ وہ اور کیا کرتے''۔

نور بانو کو شرم بھی آئی اور کراہت بھی۔ لیکن اب وہ سمجھوتہ کرنا سیکھ رہی تھی۔ جو کچھ اس کی بہنوں کے ساتھ ہوا تھا، اس کے مقابلے میں تو چھوٹے ٹھاکر کا آنا اور اسے یہاں لانا بہت بڑی نعمت ہی تھا۔

''اچھا رنجنا دیدی، اب مجھے اکیلا چھوڑ دو''۔

رنجنا وہاں سے ہٹ آئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ نور بانو اکیلے میں اپنے بچھڑے ہوؤں کا غم کرنا چاہتی ہے۔

مگر نور بانو کو چپ لگ گئی تھی۔ اور کھانے پینے میں وہ دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ یہ بات نہیں کہ اس نے کھانے سے انکار کیا ہو۔ بس اتنا تھا کہ وہ کم.....بہت ہی کم کھا رہی تھی، اور وہ دو ہی کیفیات میں نظر آتی تھی یا تو وہ رو رہی ہوتی یا پھر کسی گہری سوچ میں مستغرق ہوتی۔ رنجنا یہ اندازہ لگانے سے قاصر تھی کہ نور بانو کیا سوچ رہی ہے کیونکہ سوچنے کے دوران اس کا چہرہ بے تاثر ہوتا تھا۔

جو کچھ نور بانو پر گزری تھی اور جو کچھ اس نے دیکھا تھا، اس نے اس کی پوری شخصیت کو تبدیل کر ڈالا تھا۔ بڑے المیے آدمی کے لئے ہمیشہ انقلابی ثابت ہوئے ہیں۔ اہم بات یہ ہوتی ہے کہ تبدیلی مثبت ہے یا منفی۔ اس میں آدمی کی عمر اور المیے سے پہلے جو اس کی شخصیت تھی، اس کا بڑا دخل ہوتا ہے۔

نور بانو کم عمر تھی اور اس کی شخصیت بھی پختہ نہیں تھی۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اس کی شخصیت زیر تعمیر تھی۔ جس سانحے کی وہ عینی شاہد تھی، وہ بہت بڑا اور بہت الم ناک تھا۔ ایسے سانحے بہت گہرا، بہت دیرپا اثر چھوڑتے ہیں۔ بلکہ ان کے اثرات سے آدمی بعض اوقات برسوں بعد بھی متعارف ہوتا ہے، وہ زلزلے کی طرح ہوتے ہیں۔ زلزلے کی شدت زیادہ ہو تو ایک طرف تو دیواریں گر جاتی ہیں۔ دوسری طرف ایسا بھی ہوتا ہے کہ زلزلے سے متاثرہ کھڑی دیوار کو کافی عرصے بعد چھو کر دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ اسے تو زلزلے نے ہلا دیا تھا۔ وہ تو بس ایک ہلکے سے دھکے کی محتاج ہے

دو دن نور بانو سوچتی رہی۔ اس حقیقت کو اس نے قبول کر لیا تھا کہ جانے والے تو چلے گئے۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

جیسے بھی گئے، یہ ان کا نصیب۔ جو کچھ ہوا، اسے تو بھول جانا ہی بہتر ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ بچ گئی۔ وہ زندہ ہے۔ اب اسے ایسے رہنا ہے کہ جو کچھ بہنوں کے ساتھ ہوا، وہ اس کے ساتھ نہ ہو۔ کیونکہ خطرات تو اتنے ہی ہیں۔

اپنی بقا کا مسئلہ سامنے آیا تو الم ناک سانحہ کہیں بہت پیچھے، بہت اندر گہرائی میں چلا گیا۔ شعور میں صرف اپنے تحفظ کا خیال رہ گیا۔ اس کیلئے اسے سمجھوتے کرنے تھے۔ پہلے کبھی رنجنا کھانے کی کوئی چیز نیچے لاتی تھی تو وہ نہیں کھاتی تھی۔ مگر اب وہ کھانا پڑ رہا تھا۔ نہ کھاتی تو کیا کرتی۔ سو اس نے اتنا سمجھوتہ کرلیا کہ جینے کے لئے کھالیتی تھی۔ پیٹ بھر کر کھانا وہ بھول گئی۔

ان دو دنوں میں اس نے سوچا اور کچھ فیصلے کر لئے۔

اس روز اس نے رنجنا سے کہا۔ ''میں چھوٹے ٹھاکر سے بات کرنا چاہتی ہوں''۔

''میں ابھی بلا لاتی ہوں انہیں''۔

تھوڑی دیر بعد چھوٹا ٹھاکر دروازے کے پاس آ کھڑا ہوا۔

''میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے گلی میں کسی بھی مسلمان کے گھر بھیج دیں''۔ نور بانو نے نرم لہجے میں کہا۔

''کیا آپ یہاں خود کو غیر محفوظ سمجھتی ہیں؟''۔

نور بانو ہر مصلحت، ہر سمجھوتا، ہر احتیاط بھول گئی۔ ''جی ہاں۔ یہاں کئی اعتبار سے میں غیر محفوظ ہوں''۔

''کئی اعتبار سے؟''۔ چھوٹے ٹھاکر کے لہجے میں حیرت تھی۔

''جی ہاں۔ آپ کے ہاں کھانے کو میرا دل نہیں چاہتا۔ آپ نہیں سمجھیں گے۔ یہ ایمان کا معاملہ ہے۔ اور کتنے دن سے میں نے نماز بھی نہیں پڑھی''۔

''نماز تو آپ پڑھ سکتی ہیں۔ یہ آپ کا کمرا بالکل الگ تھلگ ہے''۔

''نماز کیلئے..... قرآن کی تلاوت کے لئے وضو کرنا ہوتا ہے۔ اور مجھے تو لگتا ہے کہ میں اس کمرے میں قید ہوں''۔

''میں سمجھ گیا۔ دیکھیں..... میں نیچے چلا جاتا ہوں۔ وہیں آپ کی ڈیوڑھی میں رہ لوں گا۔ آپ پورے گھر میں گھوم پھر سکیں گی۔ اور میں نیچے سے آپ کے برتن لا دوں گا۔ آپ اپنا کھانا خود پکالیں۔ تب تو آپ کا ایمان محفوظ رہے گا۔ ٹھیک ہے نا؟''۔

''وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن میں آپ کو آپ کے گھر سے نکالوں، یہ اچھا تو نہیں لگے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ میں کسی مسلمان کے گھر چلی جاؤں''۔

''دیکھئے..... آپ بھی سمجھتی ہیں کہ مسلمانوں کے گھر غیر محفوظ ہیں۔ کسی بھی وقت کسی کے گھر پر بھی حملہ ہوسکتا ہے۔ ویسے تو آپ کہیں بھی رہیں، میں آپ کی حفاظت کروں گا۔ میرے جیتے جی آپ پر آنچ نہیں آئے گی۔ لیکن ایک بات اور ہے۔ آپ ایک ہفتہ میرے گھر میں رہنے کے بعد کہیں اور جائیں گی تو لوگ آپ کو اچھا نہیں سمجھیں گے۔ وہ آپ کے بارے میں بری بات ہی سوچیں گے''۔

''اس کی شائستگی اور سوچ کی گہرائی نے نور بانو کو متاثر کیا۔ لیکن ہندوؤں سے نفرت اس کے وجود کی گہرائی میں اتر چکی تھی۔ اس نے بے حد کڑوے لہجے میں کہا۔

''آپ کو میری حفاظت کی اتنی فکر کیوں ہے؟''۔

''اسلئے کہ میں نے ماں جی سے آپ سب کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا.....''۔

''اور وہ آپ پورا نہیں کر سکے''۔ نور بانو نے اس کی بات کاٹ دی۔ اس کے لہجے میں الزام تھا۔ شکایت تھی۔

''میں مجبور تھا۔ مجھے جانا پڑا۔ اسے قسمت ہی کہیں گے۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ مگر اب کوتاہی نہیں کروں گا۔ آپ شاید نہیں جانتیں، ماں جی نے مجھے بیٹا بنایا تھا۔ اور میں سچ مچ انہیں ماں سمجھتا تھا۔ جو کچھ ہوا، وہ میرے ضمیر پر بوجھ ہے اور ہمیشہ رہے گا''

''مگر میں نہ آپ پر بوجھ بننا چاہتی ہوں نہ آپ کے ضمیر پر''۔

''جو آپ چاہتی ہیں، اس میں آپ کا نقصان ہے''۔

''تو پھر میرا مستقبل کیا ہے۔ آپ ساری عمر میری حفاظت تو نہیں کر سکتے''۔

''میں تو کر سکتا ہوں لیکن آپ یہ پسند نہیں کریں گی''۔ چھوٹے ٹھاکر نے سادگی سے کہا۔ ''آپ کی نظر میں کوئی قابل قبول حل ہو تو بتائیں''۔

نور بانو نے چند لمحے سوچا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کا کوئی مستقبل تھا ہی نہیں۔ اس کے پاس بچا ہی کیا تھا۔ پھر اچانک اس کے ذہن میں روشنی سی ہوگئی۔ ''آگرہ میں میرے چچا رہتے ہیں''۔ اس نے کہا۔

''آپ ان کا پتا لکھ دیں۔ میں رگھو کو بھیج کر معلومات کرالوں گا''۔

''اس کی کیا ضرورت ہے۔ آپ مجھے آگرہ بھجوا دیں''۔

''مسلمان گھرانے تیزی سے ہجرت کر رہے ہیں۔ اس بات کی تصدیق ہو جائے کہ وہ لوگ آگرہ میں ہی ہیں۔ پھر میں خود آپ کو وہاں چھوڑ آؤں گا''۔

نور بانو کو اس کی ذمے داری بہت اچھی لگی۔ ''چلیں..... ٹھیک ہے''۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''لیکن اس کام میں دیر نہ کریں''۔

اوتار سنگھ وہاں سے چلا آیا۔

نور بانو کو سکون ہوگیا۔ بس چند ہی دنوں کی بات ہے۔ پھر وہ چچا کے ہاں چلی جائے گی۔

.....x.....

اوتار سنگھ اس روز نیچے منتقل ہوگیا!

نیچے کے گھر میں جس روز جنازے اٹھے تھے، دروازہ اس نے اسی دن لگوالیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اب وہاں لوٹ مار ہو۔ ایک لڑکی زندہ تھی، اور نیچے جو کچھ تھا، اب اسی کا تھا۔ اسے لڑکی ہی کی نہیں، اس کے مال و متاع کی بھی حفاظت کرنی تھی۔

بیچ کا دروازہ کھول دیا گیا۔ اوتار سنگھ نے ڈیوڑھی میں اپنا ٹھکانہ بنالیا۔

اگلے روز اس نے نور بانو کے چچا کا پتا دے کر رگھو کو آگرہ بھیج دیا

نور بانو قدرے پرسکون ہوگئی۔ اب گھر میں وہ آزادانہ گھوم پھر سکتی تھی۔ اس کی نماز کا سلسلہ بھی بحال ہوگیا۔ لیکن رات کی نیند اس کا مسئلہ بن گئی۔ وہ بستر پر لیٹی کروٹیں بدلتی رہتی تھی۔ نگاہوں میں بہنوں کی بے آبروئی کے اذیت ناک مناظر پھرتے رہتے تھے۔ وہ بہت دیر سے سوتی۔ اور وہ کوئی پرسکون نیند نہیں ہوتی تھی۔ وہ ڈراؤنے خواب دیکھتی۔ آنکھ کھلتی تو اس کا پورا جسم پسینے میں نہا رہا ہوتا۔

پھر آس کی وہ ڈوری بھی ٹوٹ گئی۔ رگھو نے آکر بتایا کہ اس کے چچا اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پاکستان چلے گئے ہیں۔

اس روز اوتار سنگھ اس سے بات کرنے کے لئے آیا۔ ''اب میرا کیا ہوگا؟''۔ نور بانو کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

''ہم پاکستان چلیں گے اور انہیں تلاش کریں گے۔ آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کو ان تک پہنچا دوں گا''۔

اوتار سنگھ نے بے حد اعتماد سے کہا۔

''پتا معلوم نہ ہو تو چھوٹے سے شہر میں کسی کو تلاش کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اتنے بڑے ملک میں انہیں کیسے تلاش کریں''۔

''سب ہو جائے گا، آپ فکر نہ کریں''۔

نور بانو کا دن بہرحال اچھا گزرتا تھا۔ یہ احساس کہ وہ اپنے ہی گھر میں ہے اور آزادی سے چل پھر رہی ہے، بہت خوش کن تھا۔ البتہ نیچے جانے کے خیال سے اس پر لرزہ چڑھ جاتا تھا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

پھر ایک دن رنجنا نے اسے کچھ نوٹ دیئے۔

''یہ کیا ہے؟''۔نور بانو نے ہاتھ بڑھائے بغیر کہا۔

''یہ مکان کا کرایہ ہے اس مہینے کا''۔

''میں.....میں کیا کروں گی ان کا''۔

''رکھیں اپنے پاس۔اور ہاں، مالک کہہ رہے تھے کہ آپ نیچے سے اپنی تمام قیمتی چیزیں اور نقدی اوپر لے آئیں اور اپنے پاس رکھیں''۔

یہ سب کچھ تو نور بانو نے سوچا ہی نہیں تھا۔''رہنے دو۔مجھے کیا کرنا ہے کسی چیز کا''۔

''پھر بھی منجھلی بی بی.....''۔

''نہیں۔مجھ میں نیچے جانے کی ہمت نہیں ہے''۔نور بانو کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔

رنجنا اس کے دل کا حال سمجھ سکتی تھی۔''اب کوئی فکر نہ کریں منجھلی بی بی۔آپ محفوظ ہیں''۔

''میں تو بس۔جانتی ہوں کہ میرا دنیا میں کوئی ٹھکانا نہیں۔اور کوئی میرا اپنا نہیں''۔

''ہم ہیں نا منجھلی بی بی''۔

نور بانو نے کچھ نہیں کہا۔مگر اس کی وہ خاموشی بہت کچھ کہہ رہی تھی۔اور رنجنا وہ سب سمجھ رہی تھی۔اس کے دل پر گھونسہ سا لگا۔بے بھگوان۔اس نے دل میں سوچا۔آدمی کا آدمی پر سے اعتبار اٹھ جائے تو کیسا لگتا ہوگا۔

اس رات نور بانو نے پھر ڈراؤنا خواب دیکھا۔اس کے بعد اس کی نیند اڑ گئی۔وہ اٹھ کر باہر نکل آئی۔رگھو بھی چھوٹے ٹھاکر کے ساتھ نیچے ہی رہتا تھا۔یوں اسے کوٹھا بھی مل گیا تھا۔دل گھبراتا تو وہ اوپر ہی چلی جاتی۔

وہ کوٹھے پر چلی گئی۔وہ اندھیری رات تھی.....اماوس کی رات۔عجیب بات تھی کہ کوٹھے پر اسے ڈر نہیں لگتا تھا۔وہاں کرسی پڑی تھی۔وہ اس پر بیٹھ گئی۔تازہ ہوا میں اس نے گہری گہری سانسیں لیں تو اس کی طبیعت بحال ہوگئی۔

سوچتے سوچتے اسے خیال آیا کہ یہ اتنی اندھیری رات کیوں ہے۔اس پر سوچتے ہوئے اسے یاد آیا کہ رمضان کا چاند ہونے والا ہے۔جس روز وہ خوف ناک واقعہ ہوا تو شب برات میں دو ہی دن رہ گئے تھے۔اسی شام تو اماں نے آکا میاں سے کہا تھا کہ کل جا کر شب برات کے لئے سامان لے آنا۔

تو کل پرسوں چاند ہو جائے گا۔رمضان آ گئے۔اللہ.....میں کتنی اکیلی ہوگئی۔رمضان میں کتنی رونق ہوتی تھی گھر میں۔اب میں اکیلی روزے رکھوں گی! یہ خیال ہی رلا دینے والا تھا۔وہ روتی رہی.....دیر تک روتی رہی۔

پھر اس نے ایک دم سے آنسو پونچھ دیئے۔اب تو روزوں کی فکر کرنی ہے۔وہ اٹھ کر منڈیر کی طرف گئی۔اس نے باہر جھانکا۔

وہ لمحہ حیرت کا تھا!

نیچے دروازے پر ایک لالٹین رکھی تھی۔اور لاٹھی اٹھائے ہوئے دو آدمی گلی میں گشت کر رہے تھے۔پہلے تو وہ ڈر گئی۔مگر چھوٹا ٹھاکر دروازے کے پاس آیا اور نور بانو نے لالٹین کی روشنی میں اسے دیکھا تو پہچان گئی۔اس سے پہلے اس نے چھوٹے ٹھاکر کو بس ایک ہی بار دیکھا تھا۔مگر اس کی وہ جھلک وہ کبھی نہیں بھولی تھی۔

یہ کیا کر رہے ہیں؟ نور بانو نے حیرت سے سوچا۔آدھی سے زیادہ رات ہو چکی۔یہ ابھی تک سوئے کیوں نہیں۔

چھوٹا ٹھاکر اور رگھو اب دروازے پر بیٹھ گئے تھے اور ستا رہے تھے۔

نور بانو کچھ دیر وہاں کھڑی رہی۔پھر پیچھے ہٹ آئی۔اس کا رخ زینے کی طرف تھا۔

اس بار باورچی خانے میں بھی روشنی تھی اور برتنوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔وہ باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔''اس وقت کیا کر رہی ہو رنجنا؟''۔

''چائے بنا رہی ہوں چھوٹے ٹھاکر کے لئے''۔

''اس وقت؟''۔

''ہاں۔اس وقت انہیں ضرورت ہوتی ہے نا۔رات بھر ٹہلتے رہتے ہیں گلی میں''۔

''ہر روز؟''۔

''جی چھوٹی بی بی، ہر روز''۔

''لیکن کیوں؟''۔

''پہرہ دیتے ہیں نا''۔رنجنا نے کہا۔''گلی میں مسلمانوں کے گھر ہیں نا۔ان پر کہیں حملہ نہ ہو''۔

''ہمارا گھر تو لٹ گیا نا''۔نور بانو نے دکھے دل سے کہا۔

رنجنا نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور محبت سے اسے سہلانے لگی۔''بس قسمت کی بات ہے منجھلی بی بی۔مالک گھر میں نہیں تھے۔وہ ہوتے تو یہ سب کچھ کبھی نہیں ہوتا''۔

نور بانو کو یاد آیا۔چھوٹے ٹھاکر نے بھی یہی کچھ کہا تھا۔مگر وضاحت نہیں کی تھی۔''تو کیا انہیں پتا تھا کہ یہ سب ہونے والا ہے''

''بڑی بیگم نے ان سے کہا تھا کہ انہیں ڈر لگتا ہے۔مالک نے ان سے وعدہ کیا کہ ان کے جیتے جی کچھ نہیں ہو سکتا۔اس دن سے وہ رات بھر کوٹھے پر ٹہل کر پہرہ دیتے تھے۔وہ تو ایک مہینے سے پہرہ دے رہے تھے''۔

''تو اس روز کون سی مجبوری آ پڑی تھی کہ وہ گھر میں نہیں تھے''۔نور بانو کے لہجے میں شکایت تھی۔

''بڑی مجبوری تھی منجھلی بی بی۔ماسٹر جی کے دیہانت کا تار آیا تھا۔ماسٹر جی کے بچے تو ان کے پاس جاتے نہیں تھے۔ماسٹر جی نے مالک سے وچن لیا تھا کہ ان کی چتا کو آگ وہی دیں گے۔مالک جانا نہیں چاہتے تھے۔مگر مجبور تھے۔وہ رگھو سے کہہ کر گئے تھے کہ بس ایک رات کی بات ہے۔خیال رکھنا''۔

''لیکن رگھو نے تو کچھ بھی نہیں کیا''۔

''ان راکھشسوں نے سب گھروں کے دروازے باہر سے بند کر دیئے تھے۔کوئی بھی گھر سے نہیں نکل سکتا تھا''۔

''تو تمہارے چھوٹے ٹھاکر ہوتے تو کیا کر لیتے۔وہ بھی باہر نہیں نکل سکتے تھے''۔نور بانو نے اعتراض کیا۔

''آپ مالک کو نہیں جانتیں منجھلی بی بی۔وہ کوٹھے پر ہوتے تو نیچے کود جاتے اپنی لاٹھی لے کر''۔

''رگھو کو یہ خیال نہیں آیا؟''۔

''میں بھی کوٹھے پر تھی رگھو کے ساتھ۔ہم نے ان راکھشسوں کو آتے دیکھا۔ہم دونوں نیچے آئے۔دروازہ بند تھا۔رگھو پہلے تو باہر کا دروازہ توڑنے کی کوشش کرتا رہا۔پھر بیچ کا دروازہ توڑنے کی کوشش کی۔یہ تو خیال ہی نہیں آیا کہ کوٹھے سے کود کر نیچے پہنچا جا سکتا تھا''۔رنجنا کہتے کہتے رکی اور چند لمحے سوچنے کے بعد بولی۔

''رگھو تو شاید کود بھی نہ پاتا۔چھوٹے ٹھاکر کی بات اور ہے۔وہ بڑی آن والے ہیں۔جان جائے پر وچن نہ جائے۔اور وہ صرف لاٹھی سے سب کو ختم کر دیتے''۔

''یہ کیسے ممکن ہے۔ان لوگوں کے پاس تو ہتھیار تھے''۔

''چھوٹے ٹھاکر کو لٹھیا بازی آتی ہے۔گاؤں میں ایک بار چھ سات ڈاکوؤں نے انہیں گھیر لیا تھا۔چھوٹے ٹھاکر نے لٹھیا سے انہیں مار بھگایا۔اور اس وقت تو وہ چھوٹے ہی تھے''۔

''موت تو اللہ کے حکم سے ہوتی ہے۔موت سے کوئی کسی کو نہیں بچا سکتا''۔نور بانو کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

یہ جملہ اس نے بے سوچے سمجھے کہا تھا۔لیکن کہتے ہی اس کی معنویت اس پر پوری طرح روشن ہوگئی۔ارے.....ایسے تو اس نے سوچا ہی نہیں۔مگر حقیقت تو یہی ہے۔اور اس کے لئے اللہ کا حکم نہیں تھا۔اس لئے وہ بچ گئی۔

پہلی بار اسے صبر آیا۔اس نے سوچا کہ اسے تو زندگی اور آبرو کے بچنے پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔اور پہلی بار اس نے چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں مثبت انداز میں سوچا۔اماں چھوٹے ٹھاکر پر جان چھڑکتی تھیں، بڑا مان کرتی تھیں تو کوئی بات تو ہوگی۔وہ خوامخواہ اسے برا سمجھتی رہی۔حالانکہ کمزوری اس کی اپنی تھی۔لیکن اپنی کمزوری کو اس نے اس کی نفرت کا جواز بنالیا۔

پہلی بار اسے یقین ہوا کہ اب وہ محفوظ ہے!

''میں چائے دے آؤں منجھلی بی بی''۔رنجنا نے اسے چونکا دیا۔

.....x.....

اب نیچے جانا نور بانو کے لئے ضروری ہوگیا تھا!

نزول قرآن کا مبارک مہینہ آپہنچا تھا اور وہ پہلا موقع تھا کہ دو ہفتے سے اس نے قرآن پاک نہیں پڑھا تھا۔یہ درست کہ وہ بڑی آفت اور ابتلا میں تھی۔اور اللہ بڑا درگزر فرمانے والا ہے۔لیکن اب قرآن سے دوری کا احساس اسے بہت گراں گزر رہا تھا۔

دشواری یہ تھی کہ وہ ان میں سے کسی سے قرآن پاک نہیں منگوا سکتی تھی۔اس کیلئے اسے خود ہی نیچے جانا تھا۔اور نیچے جانے کے تصور سے ہی اس پر لرزہ چڑھ جاتا تھا۔لیکن یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ رمضان المبارک کا مہینہ آئے اور وہ قرآن کی تلاوت سے محروم رہے۔اور اب تو اس کے سارے لوگ تازہ تازہ بچھڑے تھے۔ان کے ایصال ثواب کے لئے بھی کچھ کرنا تھا۔

اگلی صبح اس نے رنجنا سے کہا۔''میں نیچے جاؤں گی''۔

رنجنا نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کچھ ضروری چیزیں لانی ہیں''۔اس نے وضاحت کی۔

مگر رنجنا کی حیرت کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ نیچے جانے کو کہہ رہی تھی۔وہ تو ایک قدرتی بات تھی۔اسے حیرت اس پر تھی کہ یہ کہتے ہوئے اسے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ بری طرح لرز رہی تھی۔رنجنا یہ سوچ رہی تھی کہ ابھی سے یہ حال ہے تو نیچے جا کر کیا ہوگا۔وہاں تو منجھلی بی بی کی طبیعت بھی خراب ہوسکتی ہے۔''ٹھیک ہے منجھلی بی بی''۔اس نے کہا۔''میں آپ کے ساتھ چلوں گی''۔

نور بانو نے تشکر آمیز نظروں سے اسے دیکھا۔''تم چھوٹے ٹھاکر سے بات کرلو''۔

''ان سے بات کرنے کی کیا ضرورت ہے۔گھر آپ کا ہے''۔

''تم سمجھی نہیں۔ان سے کہنا، وہاں سے ہٹ جائیں''۔

''وہ تو اس وقت سو رہے ہیں۔آپ ابھی چلی چلیں''۔

''کیا پتا، آنکھ کھل جائے۔انہیں تو معلوم بھی نہیں ہوگا کہ میں نیچے ہوں۔نہیں.....پہلے تم انہیں بتا دینا''۔

''تو چھوٹے ٹھاکر کے اٹھنے کا انتظار کرلیں۔شام کو چلیں گے''

''ٹھیک ہے''۔

اس دوران نور بانو رمضان کے بارے میں سوچ رہی تھی۔رمضان آتے تھے تو اماں سحری اور افطار کے لئے کیسا اہتمام کرتی تھیں۔اب اسے کیا کرنا چاہئے۔کھانے میں اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔وہ تو اب بس زندہ رہنے کے لئے کھاتی تھی۔اب اہتمام کیسا!اس نے سوچا۔بس روزے ہی تو رکھنے ہیں۔

اسی لمحے اس کے کانوں میں اماں کی آواز گونجی۔''سحری اور افطاری، دونوں کا اپنی حیثیت کے مطابق اہتمام کرنا چاہئے۔اس سے اللہ خوش ہوتا ہے۔اور اس مہینے دوسروں کا بھی خاص خیال رکھنا چاہئے.....خاص طور پر ناداروں کا.....''۔

نور بانو کو یاد تھا کہ افطار سے پہلے اماں افطاری کا سامان سینی پر سجا کر آکامیاں کے ہاتھ مسجد بھجواتی تھیں۔پڑوسیوں کے ہاں بھیجنے کا سلسلہ الگ تھا۔

مگر میں یہ سب کیسے کروں گی؟ نور بانو نے سوچا۔میرے پاس تو پیسے بھی نہیں ہیں۔

اسی وقت اسے یاد آیا کہ رنجنا نے اسے مکان کا کرایہ دیا تھا۔پیسے تو ہیں اس کے پاس!

مگر میں افطاری مسجد یا کہیں اور کیسے بھجوا سکتی ہوں۔کون ہے لے جانے والا؟ اور اب اس گھر سے کہیں افطاری بھیجی جائے تو.....یہ تو کسی کو بھی نہیں معلوم کہ میں یہاں رہ رہی ہوں۔اس نے سرد آہ بھر کے سوچا.....کاش، یہ لوگ مسلمان ہوتے۔

پھر بھی اس نے فیصلہ کرلیا کہ تھوڑا بہت اہتمام ضرور کرے گی۔اس طرح اللہ بھی خوش ہوگا اور اماں کی روح کو بھی سکون ملے گا۔پھر اس کے دل میں ایک عجیب خیال آیا۔وہ ان لوگوں کو بھی کھلائے گی۔آخر یہ وہ لوگ ہیں، جنہوں نے بغیر کسی لالچ کے اس کی زندگی اور آبرو بچائی ہے اور اس کی حفاظت کررہے ہیں۔

اور وہ انکار کردیں تو؟ آخر وہ بھی تو ان کے گھر کا پکا ہوا نہیں کھاتی۔تو وہ اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کیوں کھائیں گے؟ جیسے وہ انہیں ناپاک سمجھتی ہے، وہ بھی مسلمانوں کو ملیچھ کہتے ہیں۔یہ الگ بات کہ وہ حق پر ہے اور وہ واقعی ناپاک ہیں۔کیونکہ وہ اللہ کا انکار کرتے ہیں۔

تو بھلے ہی وہ انکار کردیں، پوچھنا تو اس کا فرض ہے۔

وہ آپ ہی آپ یہ سب کچھ سوچتی رہی اور فیصلے بھی کرتی رہی۔پھر اس نے ایک فہرست بنائی اور کچھ رقم کے ساتھ رنجنا کو دے دی۔''رگھو سو کر اٹھ جائے تو اسے یہ پرچا دے دینا۔بازار سے یہ سودا لانا ہے''۔

''تو پیسوں کی کیا ضرورت ہے منجھلی بی بی''۔

''اس لئے کہ پیسوں کے بغیر کچھ نہیں آتا''۔نور بانو نے خشک لہجے میں کہا۔''اور یہ سودا میں منگوا رہی ہوں.....رمضان کے لئے''

''ارے.....روزوں کا مہینہ آگیا''۔رنجنا نے چہک کر کہا۔وہ رمضان کی رونق دیکھتی رہی تھی۔اسے روزے بہت اچھے لگتے تھے۔

''ہاں.....شاید آج چاند ہوجائے''۔

''مجھے یہ مہینہ بہت اچھا لگتا ہے''۔رنجنا نے بے ساختہ کہا۔

نور بانو نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔''اچھا.....چھوٹے ٹھاکر سے وہ بات بھی کرلینا''۔

''کرلوں گی منجھلی بی بی۔آپ فکر نہ کریں''۔

.....x.....

رنجنا اوتار سنگھ کے لئے ناشتہ لے کر گئی تو اس نے نور بانو کی وہ بات کی۔''مالک.....منجھلی بی بی کچھ چیزیں لینے کے لئے نیچے آنا چاہتی ہیں''۔

''تو ٹھیک ہے۔میں تو پہلے ہی سے یہ بات کہہ رہا ہوں''۔

''پر مالک، یہ بات کہتے ہوئے وہ تھر تھر کانپ رہی تھیں''۔

''یہ بھی قدرتی بات ہے۔وہ نیچے آئیں گی تو انہیں اس رات کا ایک ایک پل یاد آئے گا''۔اوتار سنگھ نے پرخیال لہجے میں کہا۔''وہ جب تک نیچے رہیں، تم ان کے ساتھ ہی رہنا''۔

''جی مالک۔پر ایک بات اور کہی ہے انہوں نے''۔رنجنا ہچکچا رہی تھی۔

''تو بتاؤ نا''۔

''وہ.....مالک.....مجھے اچھی نہیں لگی وہ بات''۔

''تم بتاؤ تو''۔

''وہ کہہ رہی تھیں کہ آپ اتنی دیر کیلئے یہاں سے ہٹا جائیں''۔

''تو اس میں کون سی بری بات ہے۔میں باہر چلا جاؤں گا۔جب تم انہیں واپس چھوڑ آؤ تو مجھے بتا دینا''۔

.....x.....

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''مالک..... مجھے لگتا ہے، ان کی طبیعت بھی خراب ہوسکتی ہے یہاں''۔

''تو میں باہر رہوں گا۔ مجھے بلا لینا''۔

''اور مالک، کل سے شاید روزے شروع ہو رہے ہیں''۔

''اوہ۔ روزوں کا تو بڑا اہتمام ہوتا ہے''۔

''انہوں نے ایک پرچا اور پیسے دیئے ہیں۔ رگھو سے سودا منگوانے کو کہا ہے۔ میں نے پیسوں کے لئے منع بھی کیا۔ مگر وہ نہیں مانیں''۔

''یہ تو اچھا ہے۔ اس طرح ان کی خود اعتمادی بڑھے گی''۔ اوتار سنگھ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''پچھلی باتیں بھولنے میں بھی مدد ملے گی۔ ویسے بھی یہ گھر تو انہی کا ہے''۔

''جی مالک''۔

اوتار سنگھ کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر وہ بولا۔ ''سنو رنجنا، تمہیں معلوم ہے نا کہ روزوں میں مسلمان دن میں کھانا نہیں کھاتے''۔

''معلوم ہے مالک''۔

''بس تو خیال رکھنا۔ دن میں کھانا نہیں پکانا۔ ہم لوگ بھی نہیں کھائیں گے''۔

''ٹھیک ہے مالک''۔

''اور رگھو ناشتہ کر لے تو اس کو سودا لانے کے لئے بھیج دینا''۔

.....x.....

نور بانو نے نیچے جانے کے لئے زینے پر پہلا قدم رکھا تو اس کا یہ حال تھا کہ دل سینے میں دھڑ دھڑ کر رہا تھا اور ٹانگیں یوں لرز رہی تھیں، جیسے اس کے وجود کا بوجھ ان کے لئے بہت زیادہ ہو گیا ہو۔ اس کا جی چاہا کہ وہ پلٹ جائے اور اپنے اس نئے کمرے میں جا کر چھپ جائے، جہاں اسے پناہ ملی ہے۔ لیکن اس نے خود کو یاد دلایا کہ اس مرحلے سے تو گزرنا ہی ہے۔ ورنہ وہ ساری عمر اسی طرح خوف میں مبتلا رہے گی۔

اگر اسے ہر قیمت پر قرآن پاک نہ لانا ہوتا تو شاید وہ واپس ہی چلی جاتی۔

اس نے کوشش کی تھی کہ رنجنا پر اس کا حال نہ کھلے۔ لیکن رنجنا تو پہلے ہی سے اس کی کیفیت سمجھ رہی تھی۔ بہر حال اس نے نور بانو پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح نور بانو خود کو مضبوط بنانے کی کوشش کرے گی۔

بیچ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ابھی اس نے چوکھٹ پھلانگ کر صحن میں قدم بھی نہیں رکھا تھا کہ وہ جیسے ماضی میں پہنچ گئی۔ بھولی بسری یادیں آواز کا روپ دھار کر اس کی سماعت میں گونجنے لگیں۔

وہ بت بن کر رہ گئی۔ وہ دہلیز پار کرنا اس کے لئے آسان نہیں تھا۔

''رات کو سونے سے پہلے میں دس بار دیکھتی ہوں کہ بیچ کا دروازہ بند ہے نا''۔ وہ چھمن بوا کی آواز تھی۔

''کیوں بوا؟'' وہ حور بانو تھی۔

''ارے..... وہ موا چھوٹا ٹھاکر! کسی دن دروازہ کھلا ہوا مل گیا تو گھر میں گھس آئے گا''۔

نور بانو کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ اب بیچ کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ روکنے والا بھی کوئی نہیں۔ اور وہی چھوٹا ٹھاکر اپنے گھر میں اس لئے قدم نہیں رکھتا کہ اس نے ..... نور بانو نے اسے منع کر دیا ہے۔

''..... میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کئے ہیں۔ میں آدمی کو پہچانتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس وقت جو کچھ میں تم سے کہوں، وہ تمہیں ہمیشہ یاد رہے۔ اسے کبھی نہ بھولنا۔ تمہیں میری قسم..... تمہارے مرے ہوئے باپ کی قسم.....''۔ وہ اماں کی آواز تھی۔

نور بانو چونکی۔ حیرت ہے..... یہ اتنی بڑی بات مجھے یاد ہی نہیں رہی۔ یاد ہی نہیں آئی۔

''آپ کہیں اماں۔ ہم یاد رکھیں گی''۔ وہ حور بانو تھی۔

''چھوٹے ٹھاکر سے تمہیں اللہ واسطے کا بیر ہے''۔ اماں کہہ رہی تھیں۔ ''میں جب بھی تمہیں سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں تو یہ نور بانو تاویلیں لانے لگتی ہے۔ اس کی اچھائی کو برائی میں بدل دیتی ہے۔ تم مجھے بے وقوف سمجھتی ہو۔ مگر خود بے وقوف ہو۔ آج میں تمہیں وہ کچھ نہیں بتاؤں گی جو میں جانتی ہوں۔ تم اس میں بھی بدنیتی تلاش کر لوگی۔ اس لئے میں تمہیں حکم دے رہی ہو۔ اسے میری وصیت سمجھ لو..... چھوٹے ٹھاکر کے بارے میں جس کا جو گمان ہے، بے شک وہ اس پر قائم رہے۔ لیکن میں تمہیں حکم دے رہی ہوں کہ اس پر ہمیشہ ویسا ہی اعتبار کرنا، جیسا مجھ پر کرتی ہو۔ اور اسے اپنا ویسا ہی بہی خواہ سمجھنا، جیسا بہادر علی کو سمجھتی ہو۔ چھوٹے ٹھاکر سے تمہیں کبھی دھوکہ نہیں ملے گا۔ وہ تمہاری ویسی ہی حفاظت کرے گا، جیسی بہنوں کے بھائی کرتے ہیں۔ اس سے کبھی نہ ڈرنا۔ اس سے بڑھ کر اعتبار کسی پر نہ کرنا''۔

کیا مجھے چھوٹے ٹھاکر سے اللہ واسطے کا بیر تھا؟ نور بانو نے دل میں سوچا۔ نہیں..... ایسا تو نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کمزوری میری اپنی تھی اور میں اس پر اس سے چڑتی تھی اور اماں کی بات تو سچ ثابت ہوئی ہے۔ حرف بہ حرف۔ چھوٹا ٹھاکر اس کی حفاظت کر رہا ہے۔

''کیا ہو گیا منجھلی بی بی، رک کیوں گئیں؟ آئیں نا''۔ رنجنا نے اسے چونکا دیا۔

''آ رہی ہوں''۔ نور بانو نے کہا۔

وہ صحن میں داخل ہو گئی۔ ماضی سے رابطے کے نتیجے میں اس کی دہشت کم ہو گئی تھی۔ اس کے جسم میں لرزش تو اب بھی تھی۔ لیکن پہلے جیسا حال نہیں تھا۔ اب اس کے پاؤں اپنے قابو میں تھے۔

صحن میں اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ جائزہ لے رہی تھی۔ جانا پہچانا گھر نجانے کیوں اسے اجنبی اجنبی لگ رہا تھا۔

ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ وہ قرآن پاک لیتی اور اوپر کا رخ کرتی۔ لیکن اس نے سوچا، کون جانے پھر یہاں آنے کا موقع ہی نہ ملے۔ میں پورے گھر کو آخری بار دیکھ لوں۔

اس کے قدم ڈیوڑھی کی طرف اٹھ گئے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اور باہر کا دروازہ بند تھا۔ لیکن اب اس پر پہلے کی طرح چلمن نہیں تھی۔ وہ چلمن جس کے توسط سے اس نے چھوٹے ٹھاکر کو پہلی بار دیکھا تھا۔ دروازے کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ دوبارہ لگایا گیا ہے۔

وہ ڈیوڑھی میں داخل ہوئی۔ وہاں دو پلنگ بچھے تھے..... آمنے سامنے، دو دیواروں کے ساتھ۔ ایک پلنگ تو وہاں پہلے بھی بچھتا تھا۔ اس پر آکا میاں سوتے تھے، باقی سب کچھ ویسا ہی تھا۔ وہاں کاٹھ کباڑ، کئی طرح کے اوزار بکھرے ہوئے تھے۔

اچانک نور بانو کو جھٹکا لگا۔ وہ خیال ہی ایسا تھا۔ ''چھوٹے ٹھاکر یہاں سوتے ہیں؟''۔ اس نے رنجنا سے پوچھا۔

''جی منجھلی بی بی''۔

نور بانو اوپر والے گھر میں آزادانہ پھرتی رہی تھی۔ اس نے چھوٹے ٹھاکر کا کمرا دیکھا تھا۔ وہ بہت نفیس کمرا تھا۔ وہاں مسہری تھی۔ نرم دبیز بستر تھا۔ کتابوں کا ایک شیلف تھا۔ جس میں کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ ایک رائٹنگ ٹیبل تھی۔ ایک طرف ایک آرام کرسی تھی، جس پر آدمی آرام سے نیم دراز ہو جائے اور جی چاہے تو جھولتا رہے۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

نور بانو کو حیرت بھی ہوئی اور شرمندگی بھی۔ چھوٹے ٹھاکر کے کمرے کے مقابلے میں ڈیوڑھی تو اصطبل لگ رہی تھی۔ اسے یہ احساس تو تھا کہ اس نے چھوٹے ٹھاکر کو اس کے کمرے کی آسائش سے محروم کر دیا ہے۔ مگر وہ نیچے اس حال میں رہ رہا ہوگا، یہ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

''یہاں کیوں سوتے ہیں تمہارے چھوٹے ٹھاکر''۔ اس نے رنجنا سے کہا۔ ''اندر کسی کمرے میں آرام سے سو جاتے''۔

''اب میں تو ان سے نہیں پوچھ سکتی منجھلی بی بی''۔

نور بانو ڈیوڑھی سے نکل آئی۔ صحن صاف ستھرا تھا۔ لگتا تھا کہ وہاں صفائی کی جاتی رہی ہے۔ لیکن اندر گھستے ہی اسے لگا کہ جیسے گھر برسوں سے غیر آباد اور اجڑا ہوا ہے۔ ہر چیز ویسی ہی تھی، جیسی اس رات چھوڑی گئی تھی۔ بلکہ ہر چیز پر منوں گرد جم گئی تھی۔ ادھر ادھر مکڑیوں نے بے شمار جالے بن دیئے تھے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ بیس دن پہلے یہ گھر آباد تھا۔ اس میں چہل پہل تھی۔

اپنے کمرے میں گھستے ہوئے نور بانو کی حالت پھر غیر ہوگئی۔ ہاتھ پاؤں بری طرح کانپنے لگے۔ اس نے بستر کو دیکھا۔ یہی تو وہ جگہ تھی جہاں اس نے درندگی کا وہ کھیل دیکھا تھا۔ جہاں اس کی بہنیں آبرو اور زندگی دونوں سے محروم ہوئی تھیں۔

اسے سردی لگنے لگی۔ دانت بجنے لگے۔

''کیا ہو رہا ہے منجھلی بی بی؟''۔ رنجنا نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

''مم.....میری.....طط.....طبیعت خراب ہو رہی ہے''۔

''جو کچھ ہوا، اسے بھول جائیں۔ وہ ہو چکا۔ اب ایسا کچھ نہیں ہوگا''۔

نور بانو کو یاد آیا۔ اماں نے یہی بات اور انداز میں کہی تھی۔ اودتار سنگھ بھائیوں کی طرح تمہاری حفاظت کرے گا۔ اس پر اعتبار کرنا ہے۔ یہ میرا حکم ہے..... وصیت ہے۔ اور نور بانو کی طبیعت ایک دم سنبھل گئی۔ ہاں.....اب انشاءاللہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔

اس کے جسم کی تھرتھری رک گئی۔ اب اس نے بستر کو دیکھا۔ وہ اسی طرح مسکا ہوا تھا۔ مگر دونوں بستروں پر چادر نہیں تھی۔ وہ سمجھ گئی۔ چادریں خون آلود ہوں گی۔ ہٹا دی گئی ہوں گی۔

اس کی نگاہوں میں پھر وہ مناظر پھرنے لگے۔ وہ جلدی سے کمرے سے نکل آئی۔

اماں کے کمرے میں کوئی بے ترتیبی نہیں تھی۔ چھمن بوا بھی اسی کمرے میں سوتی تھیں۔ دونوں بستروں کی چادروں پر شکنیں تھیں۔ لگتا تھا، اماں اور چھمن بوا ابھی ابھی سوتے سے اٹھ کر کہیں گئی ہیں اور ابھی واپس آجائیں گی۔ بس اتنا تھا کہ ہر چیز پر گرد کی تہہ جمی ہوئی تھی۔

نور بانو کمرے سے نکل کر کوٹھری کی طرف بڑھی۔ وہاں سے اسے قرآن پاک لینا تھا۔ اور اپنے لئے کچھ کپڑے بھی۔

کوٹھری بھی اسی حال میں تھی، جس میں اسے چھوڑا گیا تھا۔ بستروں والا بکس کھلا ہوا تھا۔ چند لحاف اور گدے نیچے فرش پر گرے ہوئے تھے۔ اسے یاد تھا، اس نے اس بکس میں انہی لحاف گدوں کے نیچے خود کو چھپایا تھا۔ اور جب وہ بکس کھولا جا رہا تھا تو وہ دہل رہی تھی کہ اس کا انجام بھی اپنی بہنوں جیسا ہوگا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ آنے والا چھوٹا ٹھاکر ہے۔ اور معلوم بھی ہوتا، تب بھی اس کے خوف میں کمی نہ ہوتی۔ آخر چھوٹا ٹھاکر بھی تو ہندو ہی تھا نا۔

اور جب وہ بکس کھولا گیا تھا تو وہ دہشت سے بے ہوش ہوگئی تھی۔ رنجنا نے بتایا تھا کہ چھوٹا ٹھاکر اسے اپنے ہاتھوں پر اٹھا کر اوپر لے گیا تھا۔ اس خیال سے اس وقت بھی اس کے رخسار حیا سے دہک اٹھے۔ اس کا پردہ ختم ہوگیا۔ چھوٹے ٹھاکر نے اسے دیکھا..... بلکہ چھوا بھی۔

اس کے اندر جھنجھلاہٹ بھر گئی۔ ایک بار پھر چھوٹا ٹھاکر اسے برا لگنے لگا۔ مگر اماں کی وصیت پھر اس کے کانوں میں گونجی۔ وہ متضاد جذبوں میں گھر گئی۔ چھوٹے ٹھاکر سے اسے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ مگر اس میں چھوٹے ٹھاکر کی کسی خرابی کا دخل تھا نہ اس کے ہندو ہونے کا۔ کیونکہ کسی ہندو سے اسے ایسا بیر نہیں ہوا تھا۔ یہ بیر اس کی اپنی کمزوری کی وجہ سے تھا۔ اور اس کمزوری کے بارے میں کسی سے بات کرنا تو درکنار، وہ تنہائی میں بھی اس پر سوچنے سے گریز کرتی تھی۔ بس چھوٹے ٹھاکر پر اسے غصہ آتا رہتا تھا۔

اس نے جزدان میں لپٹا ہوا قرآن پاک اٹھا لیا۔ اپنے لئے کپڑے اس نے رنجنا سے نکلوائے۔ پھر وہ رنجنا کے ساتھ اوپر چلی آئی۔

اگلی شام رمضان کا چاند نظر آگیا!

نور بانو چاند دیکھنے کے لئے کوٹھے پر جا رہی تھی کہ رنجنا نے اسے روک دیا۔ ''آپ کا اوپر جانا مناسب نہیں ہے منجھلی بی بی''۔

''کیوں؟''۔ نور بانو نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''سب لوگ چاند دیکھنے کے لئے اپنے اپنے کوٹھے پر چڑھے ہوئے ہیں۔ آپ اوپر جائیں گی تو سب کو پتا چل جائے گا''۔

بات نور بانو کی سمجھ میں آگئی۔ وہ دل مسوس کر رہ گئی۔

کچھ دیر بعد نقاروں کی آواز سنائی دی۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ چاند نظر آگیا ہے۔ تب نور بانو اپنے سب لوگوں کو یاد کر کے روئی..... اور خوب روئی۔ رنجنا اسے لپٹا کر تھپکیاں دیتی رہی۔ مگر نور بانو کے آنسو کسی طرح تھم ہی نہیں رہے تھے۔

روئی تو وہ پہلے بھی تھی۔ مگر وہ رونا بچھڑنے والوں سے زیادہ اپنے لئے تھا۔ وہ اپنی بے کسی پر بہائے جانے والے آنسو تھے۔ ان آنسوؤں کا اصل محرک خوف اور دہشت تھا۔ جو بہنوں پر گزری تھی، اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ اور اسے ڈر تھا کہ اس کے ساتھ بھی وہی کچھ ہو سکتا ہے۔ اس لئے اسے رونا آیا تھا۔ لیکن آج اس کے دل سے ہر خوف دور ہوگیا تھا۔ دہشت مٹ گئی تھی۔ پہلی بار وہ ان کی موت پر روئی تھی۔

اس کے آنسو تھمے تو اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہوگیا۔ اسے خیال آیا کہ اس نے ان کے ایصال ثواب کے لئے اب تک کچھ نہیں کیا ہے۔ چلو اچھا ہوا..... رمضان کا بابرکت مہینہ آگیا۔ وہ کثرت سے سورہ ملک پڑھے گی۔

اس رات عشا کے بعد وہ سونے کے لئے لیٹ گئی کہ سحری کے لئے بہت سویرے اٹھنا ہوگا۔ لیکن اسے نیند نہیں آئی۔ وہ کروٹیں بدلتی رہی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اندوہناک واقعہ، جس میں اس نے تمام اپنوں کو کھو دیا، آج ہی کی بات ہے۔ ایک اعتبار سے یہ سچ بھی تھا۔ شعوری طور پر تو آج اس نے پہلی بار ہی ان لوگوں کا غم کیا تھا۔ وہ بستر پر لیٹے لیٹے روتی رہی۔

آدھی رات کے قریب وہ گھبرا کر اٹھ گئی۔ اب اس سے لیٹا بھی نہیں جا رہا تھا۔ وہ اٹھ کر باہر نکل آئی۔ اس کے قدم چھوٹے ٹھاکر کے کمرے کی طرف اٹھ رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر اس کمرے کو دیکھ کر نیچے والی ڈیوڑھی سے اس کا موازنہ کرنا چاہتی تھی۔

اس نے کمرے میں روشنی کی اور کمرے کا جائزہ لیا۔ پھر یونہی وہ کتابوں کے شیلف کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ شیلف میں ادبی کتابیں زیادہ تھیں۔ سائنس پر بھی کافی کتابیں تھیں اور کچھ علمی کتابیں بھی تھیں۔

مگر وہاں دو کتابوں کو دیکھ کر وہ چونک گئی۔ ان میں سے ایک تو بائبل تھی اور دوسری دوزخ اور آخرت کے موضوع پر اسلامی کتاب تھی۔ یہ کتابیں یہاں کیوں ہیں؟ اس نے حیرت سے سوچا۔

اس لمحے اسے کچھ یاد آگیا۔ ایک بار باجی نے اسے دکھایا تھا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

کوٹھے پر چھوٹا ٹھاکر کسی مسلمان استاد سے عربی سیکھ رہا تھا۔ یہی نہیں، اس کے بعد استاد نے قرآن پاک کی قرات کی تھی اور چھوٹا ٹھاکر احترام سے سر جھکائے سنتا رہا تھا۔ بلکہ اس پر تو باجی بھی حیران ہوئی تھیں کہ وہ ہندو ہو کر قرآن کی تلاوت سنتا ہے۔

اسے یاد آیا کہ اماں نے کہا تھا کہ چھوٹا ٹھاکر حق کی جستجو کر رہا ہے۔ وہ اللہ کا نام لیتا ہے۔ اس نے کبھی بتوں کی پوجا نہیں کی۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے گھر میں کوئی اسے کافر اور مشرک کہے یا سمجھے۔ لیکن وہ اس پر مصر رہی تھی۔ اس نے ہمیشہ چھوٹے ٹھاکر کو کافر اور مشرک کہا تھا۔ صرف اپنی کمزوری کی وجہ سے..... وہ کمزوری جس پر وہ شعوری طور پر سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

تو چھوٹا ٹھاکر سچ مچ حق کی جستجو کرتا رہا ہے! نور بانو نے سوچا۔ دوزخ کے موضوع پر اس کتاب..... اور بائبل کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے۔ اس کے علاوہ شیلف میں عربی کی بھی کئی کتابیں موجود تھیں۔ نور بانو کو اس پر حیرت ہوئی کہ وہاں قرآن کا کوئی نسخہ موجود نہیں۔ اس کے بغیر تلاش حق کیسے مکمل ہو سکتی ہے۔ اور چھوٹا ٹھاکر تو قرآن سنتا رہا ہے۔ پھر یہاں قرآن کیوں موجود نہیں۔

وہ کمرے سے نکل آئی۔ اسے ایسی بے چینی ہو رہی تھی، جیسے وہ کچھ کرنا چاہ رہی ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ کیا کرے۔ اپنے کمرے میں جا کر وہ بستر پر لیٹی۔ مگر فوراً ہی اٹھ گئی۔ بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔

اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ کیا چاہ رہی ہے۔ آج رمضان کی پہلی شب تھی۔ اسے کم از کم سات بار سورہ ملک پڑھنی چاہئے تھی۔

اس نے وضو کیا، قرآن شریف لیا اور کوٹھے کی طرف چل دی۔ وہاں بیٹھ کر وہ سکون سے تلاوت کرے گی۔

اوپر پہنچ کر اس نے روشنی کی، کرسی پر بیٹھ کر قرآن پاک کو گود میں رکھا اور تلاوت شروع کی۔

چند لمحے بعد اس پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوئی، جس کا اسے پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اسے دنیا و مافیہا کا ہوش نہیں رہا۔ اسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

.....x.....

اوتار سنگھ لاٹھی لئے گلی میں گشت کر رہا تھا!

گلی کے اس سرے سے چلتا ہوا وہ اپنے گھر کے دروازے تک پہنچا تو اسے وہ آواز سنائی دی۔ اس کے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے۔

وہ بلاشک وشبہ وہی آواز تھی..... وہ آواز جو اس نے پہلی بار سنی تو اسے محبت ہو گئی۔ وہ آواز جسے سنے ہوئے اسے جیسے صدیاں ہو گئی تھیں۔ وہ آواز جسے وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں بھولا تھا۔ وہ آواز جو آج بھی اس کی سماعت میں گونجتی تھی۔

پہلے تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ یہ آواز سچ مچ کی ہے۔ اس نے یہی سوچا کہ شاید یہ اس کی سماعت کی خواہش اور طلب کا ثمر ہے۔ مگر آواز کے تسلسل نے اسے مزید سوچنے کے قابل نہیں چھوڑا

اسے کچھ نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ ازخود رفتگی کے عالم میں اس کے قدم خود بخود اٹھ رہے تھے۔ وہ گھر کے کھلے دروازے سے ڈیوڑھی میں داخل ہوا اور صحن میں نکلا۔ یہاں اس کے قدم ایک لمحے کو رکے۔

اب آواز بالکل صاف اور واضح تھی۔ وہ اوپر سے آ رہی تھی۔ اس کے قدم جیسے اس آواز کی ڈور سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ بیچ کے دروازے کی طرف بڑھا اور زینے پر چڑھنے لگا۔ اسے بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے، کہاں ہے اور کدھر جا رہا ہے۔ بس وہ آواز مقناطیس کی طرح اسے کھینچ رہی تھی۔

باہر رگھو حیران تھا کہ یہ مالک کو اچانک کیا ہو گیا۔ مگر پھر اس نے فیصلہ کیا کہ اسے اپنا کام کرتے رہنا چاہئے۔

اوپر والے گھر کے دروازے پر اوتار سنگھ کے قدم ایک لمحے رکے۔ پھر وہ مڑا اور کوٹھے کی طرف جانے والے زینے پر چل دیا

اوپر پہنچتے ہی وہ ٹھٹھک گیا۔ اس کے قدم جیسے زمین میں گڑ گئے۔ وہ منظر اسے اس دنیا کا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ لڑکی بڑے سلیقے سے چادر میں لپٹی دوپٹہ سر پر رکھے، گود میں کتاب رکھے پڑھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ اتنا روشن تھا کہ اس کی روشنی سیاہ دوپٹے کے پار بھی نظر آ رہی تھی۔

ایک لمحے میں اوتار سنگھ نے یہ سب کچھ دیکھا۔ پھر اس کے بعد جیسے اس کی بینائی چلی گئی۔ جیسے بہت گھپ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دیتا، ویسے ہی بہت زیادہ روشنی میں بھی نظر بے کار ہو جاتی ہے۔ اور وہاں تو اتنی روشنی تھی کہ آسمان بھی غائب ہو گیا تھا۔ اب کہیں کچھ بھی نہیں تھا..... سوائے اس آواز کے۔ اوتار سنگھ نے آنکھیں بند کر لیں۔ لگتا تھا کہ آنکھیں کھلی رہیں تو وہ ہمیشہ کے لئے اندھا ہو جائے گا۔

لگتا تھا کہ اس کے تمام حواس سماعت میں مرتکز ہو گئے ہیں۔ ایک ایک لفظ یوں صاف سنائی دے رہا تھا، جیسے ٹھہر ٹھہر کر پڑھا جا رہا ہو۔ اور سماعت کا جیسے فہم سے گہرا ربط تھا۔ وہ ہر لفظ کا مفہوم سمجھ رہا تھا۔ عربی اس نے بڑی لگن اور شوق سے پڑھی تھی۔ اس کی غیر معمولی استعداد کے مولوی صاحب بھی معترف رہے تھے۔ لیکن بہرحال وہ اہل زبان تو نہیں تھا۔ پھر بھی وہ ایک ایک لفظ کا مفہوم سمجھ رہا تھا۔

نور بانو اپنی کیفیت میں مستغرق پڑھے جا رہی تھی۔ آخری آیت پڑھنے کے بعد اس نے سورہ ملک دوبارہ شروع کی۔ ''تبارک الذی بیدہ الملک.....'' وہ..... فاسا وھو خبیر..... تک پہنچی تھی کہ اس آواز نے اسے چونکا دیا۔

''شروع سے پڑھو..... اور ذرا ٹھہر ٹھہر کر''۔

نور بانو بری طرح چونکی۔ بلکہ ڈر گئی۔ اس نے سر اٹھایا تو اسے احساس ہوا کہ روشنی زیادہ..... بہت زیادہ ہو گئی ہے۔ اور اس نے سر گھما کر دیکھا تو اسے وہ روشن ہیولا نظر آیا۔ اسے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ وہ اوتار سنگھ ہے۔ وہ روشنی کا کمال تھا یا اس کی کیفیت کا، بہرحال اسے ایسا لگا کہ وہ آسمان سے اترا ہوا کوئی فرشتہ ہے، جو اس کے بچھڑے ہوؤں کی خیر خبر لایا ہے اور سورہ ملک سننے کے لئے آیا ہے۔

''رک کیوں گئیں۔ شروع سے پڑھو..... اور ذرا ٹھہر ٹھہر کر پڑھو''۔ اوتار سنگھ نے آنکھیں بند کئے کئے دھیمی آواز میں کہا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

نور بانو نے سر جھکایا اور دوبارہ پڑھنے لگی۔"تبرک الذی بیدہ الملک وھو علی علی کل شی قدیر"

"بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہے بادشاہی"۔اوتار سنگھ کے لہجے میں عجیب سا جاہ وجلال تھا۔اس کی آنکھیں اب بھی بند تھیں"اور وہ ہر چیز پر قادر ہے"۔"الذی خلق الموت والحیوۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا، وھو العزیز الغفور"

"وہ ذات جس نے پیدا کیا موت اور زندگی کو تا کہ آزمائش کرے تمہاری کہ کون تم میں سے زیادہ اچھا ہے عمل میں۔اور وہ ہے زبردست، بے انتہا معاف فرمانے والا۔"

نور بانو اب گویا اشارے پر پڑھ رہی تھی۔"الذی خلق سبع سموت طباقا"

"وہ ذات جس نے بنائے سات آسمان تہ بہ تہ"۔اور اوتار سنگھ نے بے ساختہ آنکھیں کھول دیں۔روشنی تو اب بھی ویسی ہی تھی۔لیکن نگاہ کام کر رہی تھی۔وہ دیکھ سکتا تھا۔

اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ذہن میں ایک خیال تھا.....آسمان تو ایک ہی نظر آتا ہے۔پھر سات آسمان....."۔

مگر وہ عجیب منظر تھا۔ اوپر نیلے آسمان کی روشنی چھت پر تھی۔پھر وہ جیسے شفاف ہو گیا اور اس کے پار رنگ برنگے کئی آسمان.....شفاف آسمان نظر آنے لگے۔وہ بس ایک لمحے کی بات تھی۔اگلے ہی لمحے اس کے سامنے وہی نیلا آسمان تھا، جو وہ ہر روز دیکھتا تھا۔اس نے گنے نہیں تھے، رنگوں کی ترتیب بھی وہ نہیں بتا سکتا تھا کیونکہ وہ بس ایک ٹانئے کا نظارہ تھا اور ایسا محیر العقول نظارہ دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا تھا۔لیکن اتنا وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ اس نے روز نظر آنے والے نیلے آسمان کے اوپر چھ مختلف رنگوں کے چھ اور آسمان دیکھے ہیں۔

نور بانو خاموش تھی۔اس کا سر جھکا ہوا تھا۔مگر نجانے کیسے اسے یہ احساس تھا کہ اب آگے پڑھنا مناسب نہیں ہے۔وہ خاموشی اسے بتا رہی تھی سمجھا رہی تھی کہ فرمائش کرنے والا اپنے مکمل ارتکاز کے ساتھ کسی جستجو میں مصروف ہے۔وہ خاموشی جیسے ایک بلیغ حکم تھا۔آگے نہ بڑھنے کا۔اور اس کی حیثیت محض ایک معمول کی سی تھی۔

"بے شک اے اللہ۔میں نے دیکھ لیا۔میں گواہی دیتا ہوں"۔ اوتار سنگھ کو احساس ہی نہیں تھا کہ یہ اس کی آواز ہے۔

یہ اشارہ تھا آگے پڑھنے کا۔نور بانو نے اگلی آیت مبارکہ پڑھی۔"ما تری فی خلق الرحمن من تفوت"

اب اوتار سنگھ کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ آسمان کو دیکھ رہا تھا۔"نہیں دیکھو گے تم رحمان کی تخلیق میں کوئی بے ربطی"۔اوتار سنگھ نے ایسی کیفیت میں کہا۔آسمان کے سوا گردوپیش کی کسی چیز کا اسے احساس نہیں تھا۔

ایک بار پھر اس خاموشی کے تحکم کو اپنے وجود میں گونجتا محسوس کیا۔نور بانو خاموش تھی۔ابھی آگے پڑھنے کا حکم نہیں تھا۔اس کی نگاہیں قرآن پاک پر جمی تھیں۔

اوتار سنگھ آگے بڑھ کر منڈیر تک گیا۔اس کی نگاہیں آسمان کو ٹٹول رہی تھیں.....کھوج رہی تھیں۔ایک سرے سے دوسرے سرے تک۔

ارے..... یہ کیا؟ اس نے حیرت سے سوچا۔زندگی کے ہر روز آسمان کو میں کئی کئی بار دیکھتا ہوں۔میں نے پہلے کبھی یہ محسوس نہیں کیا۔ارے واقعی..... یہ بیکراں لامتناہی آسمان جو وہاں تک نظر آتا ہے جہاں تک نظر جاتی ہے۔جس کی وسعت کو نہیں سمجھا جا سکتا۔ارے.....اتنے بڑے آسمان میں کہیں کوئی بے ربطی نہیں ہے۔ہر طرف سے ایک سا خم، ایک سی ہمواری۔انسان چھوٹا سا گنبد بھی بنائے تو خفیف سی اونچ نیچ ضرور ہوتی ہے۔کوئی مینار بنائے تو کہیں نہ کہیں فرق ضرور پڑ جاتا ہے۔کچھ نہیں تو وقت گزرنے کے ساتھ کسی طرف سے جھک جاتا ہے۔اور بوسیدہ بھی ہو جاتا ہے۔مگر یہ آسمان جو زمین بننے کے بعد سے اب تک قائم ہے، اس کا رنگ بھی پھیکا نہیں پڑا۔ہر طرف سے ایک سا خم، ایک سی ہمواری۔کہیں کوئی اونچ نیچ نہیں۔کہیں کوئی فرق نہیں۔

وہ ورطہ حیرت میں تھا۔اس نے پکار کر کہا"بے شک اے اللہ۔میں نے دیکھا اور میں گواہی دیتا ہوں۔آپ کے آسمان میں کہیں کوئی بے ربطی نہیں"۔

وہ حکم تھا آگے پڑھنے کا۔نور بانو نے آیت مبارکہ کا اگلا حصہ پڑھا۔"فارجع البصر ھل تری من فطور"

"ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھو۔بھلا نظر آتا ہے تم کو کوئی خلل"۔

پھر اوتار سنگھ کی آواز دوبارہ ابھری۔"دیکھ لیا اے اللہ، کہیں کوئی خلل نہیں۔میں گواہی دیتا ہوں اے اللہ"۔

نور بانو نے اگلی آیت پڑھی"ثم ارجع البصر کرتین ینقلب الیک البصر خاسئا وھو حسیر"

"پھر دوڑاؤ نظر۔بار بار پلٹ آئے گی تمہاری طرف نگاہ تھک کر۔اور وہ نامراد ہو گی اپنی تلاش میں"۔

نور بانو قرآن پاک پر نظریں جمائے خاموش بیٹھی تھی۔

چند لمحے بعد اوتار سنگھ اپنی اسی گونج دار آواز میں بولا"اس کی ضرورت نہیں اے اللہ۔میں نے جان لیا۔میں نے سمجھ لیا۔آپ کی ہر بات حق۔لیکن آپ کے حکم کی تعمیل ضروری ہے۔اس لئے دوبارہ نظر دوڑا رہا ہوں"۔

یہ کہہ کر اوتار سنگھ منڈیر کی طرف بڑھا۔اس کی نظریں آسمان کو کھوج رہی تھیں.....روشن نیلے آسمان کو۔منڈیر کے پاس پہنچ کر وہ چند لمحے آسمان کو متلاشی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ان نگاہوں میں سچی تلاش تھی۔

پھر وہ بولا تو اس کے لہجے میں بلا کی عاجزی تھی۔"بے شک اے اللہ۔میری نگاہ اپنی تلاش میں نامراد ہو کر لوٹ آئی ہے"۔

اب ہر طرف خاموشی تھی۔رات کا گہرا سکوت تھا۔نور بانو یوں دم بہ خود بیٹھی تھی، جیسے یقین ہو کہ ابھی کچھ غیر معمولی.....بہت غیر معمولی ہونے والا ہے۔

اوتار سنگھ اب نظریں جھکائے کھڑا تھا.....کسی گناہ گار کی طرح۔گردوپیش میں اب بھی وہی روشنی تھی۔اور اب تو اسے اپنے اندر.....اپنے وجود میں بھی نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی نظر آ رہی تھی۔

پھر جیسے اس کے اندر روشنی کی ایک بہت بڑی موج اٹھی اور اس کے دل سے ٹکرائی۔اسے لگا کہ اسکا دل نرم ہو رہا ہے۔پھر اس کا دل جیسے پگھلنے لگا اور پگھلا ہوا وہ سیال اوپر کی طرف اٹھنے لگا۔ وہ گلے تک پہنچا.....اور اگلے ہی لمحے اس کی آنکھوں تک آ پہنچا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ساتھ ہی اس کا وجود ہلکا ہونے لگا..... ہلکا ہوتا گیا۔اور جیسے جیسے ہلکا ہوتا گیا، وہ اوپر اٹھتا گیا۔اب آسمان ایسا تھا کہ جیسے وہ ہاتھ بڑھائے تو اسے چھو سکتا ہے۔پھر اچانک آسمان شفاف ہونے لگا اور کسی باریک دوپٹے کی طرح ہو گیا۔اس کے پار اسے دوسرا، پھر تیسرا، پھر چوتھا..... اسے مختلف رنگوں کے آسمان ہی آسمان دکھائی دینے لگے۔اور وہ اب بھی اڑ رہا تھا۔ہلکا ہو کر اوپر اٹھ رہا تھا.....

اچانک اس کے اندر کسی نے ڈپٹ کر کہا۔''کیا اس کے بعد بھی تو کلمہ نہیں پڑھے گا''۔

اوتار سنگھ کے جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔''کلمہ؟''۔اس نے زیر لب حیرت سے کہا۔''یہ کلمہ کیا ہوتا ہے؟''۔

اس کے ساتھ ہی اس کی بے وزنی کی کیفیت ختم ہو گئی۔اس کے جسم کو ایسا جھٹکا لگا، جیسے وہ واقعی آسمان سے زمین پر آ گرا ہو۔

''ہاں.....کلمہ تو مجھے یاد ہے''۔وہ ہڑبڑایا۔''مجھے کلمہ پڑھنا چاہئے''

''کون سا کلمہ؟''۔اس کے اندر کسی نے سوال اٹھایا۔

''مجھے گواہی دینی ہے۔میں سمجھ گیا، جان گیا۔اب گواہی دینی ہے''

''تو دیر کس بات کی؟''۔

اوتار سنگھ کے ہونٹ ہلے۔پہلے تو کوئی آواز نہیں نکلی۔پھر آواز نکلی تو بلند ہوتی گئی.....ایسی بلند کہ اس آواز کے سوا کہیں کچھ نہیں رہا ایسے جیسے وہ آواز آسمان کے پار.....آسمان کے پار جا رہی ہو۔

''اشھدان لا الہ الا اللہ واشھدان محمدا عبدہ ورسولہ''۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہے کہ محمدؐ اللہ کے بندے اور اللہ کے رسول ہیں''۔

اس بار آواز سن کر نور بانو چونکی۔وہ تو چھوٹے ٹھاکر کی آواز تھی۔اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔وہ واقعی چھوٹا ٹھاکر ہی تھا اور منڈیر کے پاس کھڑا تھا۔اور کلمہ بھی وہی پڑھ رہا تھا۔اور اس کا بدن یوں کانپ رہا تھا، جیسے اس کے اندر بجلی کا کوئی بہت طاقتور کرنٹ دوڑ رہا ہو۔

''اب پاک بھی ہو جا''۔اوتار سنگھ کے اندر کسی نے تلقین کی۔

نور بانو کو بہت غصہ آیا۔اسے جرأت کیسے ہوئی اوپر آنے کی۔کیا یہ نہیں جانتا کہ میں پردہ کرتی ہوں۔وہ اس پر برسنے ہی والی تھی۔مگر وہ لمحہ ایسا تھا کہ وہ بھی اس کی اسیر ہو گئی۔وہ حیرت سے اوتار سنگھ کو دیکھتی رہی۔

اوتار سنگھ کی کپکپی بڑھ گئی۔مگر اس کی آواز بہت صاف اور گونج دار تھی۔وہ کلمہ پڑھ رہا تھا۔لا الہ الا اللہ محمد الرسول.....

.....×.....

مجذوب یوں تیز تیز قدم اٹھاتا چل رہا تھا، جیسے کہیں پہنچنے کی جلدی ہو!

اندھیرے میں دیوار کے ساتھ بیٹھے ہوئے چار جوان لڑکوں نے اسے دور سے آتے دیکھا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔''لو بھئی.....شکار آ گیا''۔ان میں سے ایک نے کہا۔

''اور کوئی ہندو ہوا تو''۔دوسرا بولا۔

''تو بھی بے وقوف ہے شمبھو۔اس وقت کوئی ہندو گھر سے نہیں نکلتا۔نکلتا ہے تو ہماری طرح گھات لگا کر بیٹھتا ہے''۔تیسرے نے کہا۔

''مگر بڈھا لگتا ہے''۔چوتھے نے تبصرہ کیا۔

''بس مسلا ہو۔ہمیں بڈھے جوان سے کیا لینا دینا''۔پہلا بولا۔

''نہیں متر۔جوان ہو تو شکار کا مزہ ہی اور ہے''۔

اتنی دیر میں مجذوب ان کے بہت قریب پہنچ گیا تھا۔وہ چاروں اپنے ہتھیار سنبھالے اس کی طرف بڑھے۔''کہاں جا رہے ہو مہاراج؟''۔پہلے جوان نے تمسخرانہ لہجے میں پوچھا۔

''ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں''۔مجذوب نے رکے بغیر کہا۔

''مگر اب تو تم بس قبرستان جاؤ گے''۔دوسرا بولا۔

مجذوب اب ان کے بہت قریب آ چکا تھا۔وہ اسے اچھی طرح دیکھ سکتے تھے۔اس کے سر کے بالوں اور بڑھی ہوئی بے ترتیب داڑھی میں نام کو بھی سیاہ بال نہیں تھا۔لیکن اس کا سلوٹوں سے پاک چہرہ جوان تھا۔بلکہ اس پر بچوں کی سی معصومیت تھی۔اس کا کرتہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور پاجامے سے اگر پیوند نکال دیئے جاتے تو شاید کچھ بھی نہ بچتا۔

مگر اس کی شخصیت میں سب سے نمایاں چیز اس کی آنکھیں تھیں۔ایک طرف تو ان بڑی بڑی آنکھوں سے روشنی پھوٹتی محسوس ہو رہی تھی اور دوسری طرف ان میں دل دہلا دینے والی سرخی تھی۔''تم قبرستان کا نام کیوں لیتے ہو۔تمہارا مرگھٹ تو شمشان گھاٹ کہلاتا ہے''۔اس کی آواز میں گہرائی تھی اور گونج تھی.....صحراؤں کی گونج!۔

چاروں جوان الجھ گئے۔''تو تم مسلمان نہیں ہو؟''۔

''کیوں نہیں۔الحمدللہ۔میں مسلمان ہوں''۔

''تو پھر تم نے شمشان گھاٹ کیوں کہا؟''۔

''وہ تو تمہارے لئے کہا تھا۔تمہیں جانا ہو گا اور ابھی میرا قبرستان جانے کا وقت نہیں آیا۔ابھی تو مجھے ایک اہم کام کرنا ہے''۔

''پاگل معلوم ہوتا ہے''۔ان میں سے ایک بولا۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔مارو سالے کو''۔

ان میں دو کے ہاتھ میں خنجر تھے۔ایک کے پاس بلم تھا اور چوتھا لاٹھی اٹھائے ہوئے تھا۔وہ چاروں بیک وقت حرکت میں آئے.....

''تم میرا راستہ کھوٹا نہیں کر سکتے''۔مجذوب نے کہا اور ایک نظر ان چاروں پر ڈالی۔

ان چاروں کو ایسا لگا کہ ان کے جسم پتھر کے ہو گئے ہیں۔جو جہاں جس حال میں تھا، ویسا ہی رہ گیا۔

''میں نے کہا تھا کہ تمہیں شمشان گھاٹ جانا ہے''۔مجذوب نے پرسکون لہجے میں کہا۔''دوسروں کو مارتے.....لوگوں کا گھر جلاتے پھرتے ہو نا۔آج تمہارے گھر میں آگ لگی ہے''۔یہ کہتے ہی اس نے انگلی سے ایک خنجر بردار کی طرف اشارہ کیا۔''تمہارے گھر میں..... یہاں وقت برباد نہ کرتے تو شاید کچھ لوگوں کو بچا لیتے۔مگر اب تو کسی کو نہیں بچا سکو گے۔تمہارا تو گھر ہی شمشان گھاٹ بن گیا۔افسوس.....صد افسوس''۔

وہ اپنی جگہ بے بس کھڑے اسے جاتے دیکھتے رہے۔وہ اپنی انگلی تک ہلانے کے قابل نہیں تھے۔البتہ وہ بول سکتے تھے۔''یہ مسلا کیا کر گیا ہے ہمیں؟''۔

''کوئی جادوگر تھا شاید''۔

''اب ہم ٹھیک کیسے ہوں گے؟''۔

اسی لمحے مجذوب ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔اور اس کے ساتھ ہی جیسے ان کے جسموں کی بندش کھل گئی۔''چلو.....دوڑ کر پکڑتے ہیں سالے کو''۔بلم بردار نے کہا۔

''نہیں۔میرے گھر کی چنتا کرو۔میرے گھر چلو''۔وہ بولا۔جس کی طرف مجذوب نے اشارہ کیا تھا۔''مجھے ڈر لگ رہا ہے..... ہے بھگوان.....میرے گھر والوں کی سہائتا کرنا''۔

وہ چاروں مخالف سمت میں چل دیئے۔انہیں نہیں معلوم تھا کہ جس گھر کی بات ہو رہی ہے وہ جل کر خاک ہو چکا ہے۔کچھ بھی نہیں بچا۔کوئی بھی نہیں بچا!

.....×.....

نور بانو سن ہو کر رہ گئی۔کیا یہ قبول اسلام ہے؟ وہ سب کچھ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

کلمہ پڑھتے ہوئے اوتار سنگھ کو احساس ہوا کہ باہر کی تمام روشنی اس کے جسم میں اتر رہی ہے۔آسمان اب پہلے کی طرح سیاہ نظر آ رہا تھا۔لیکن اس کے اندر روشنی اتنی بڑھ گئی ہے کہ اس کی نگاہیں چندھیا رہی ہیں۔وہ روشنی اسے اچھی بھی لگ رہی تھی۔وہ ایسا ناقابل بیان سکون محسوس کر رہا تھا، جس کا پہلے کبھی اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔وہ ایسا سکون تھا کہ ایسے آنے لگی.....مکمل نیند! وہ اس کی آنکھوں میں بھی تھی اور دماغ پر بھی قبضہ جما رہی تھی۔اسکے جسم کے تمام عضلات ڈھیلے ہوتے جا رہے تھے۔پھر اسے پتا بھی نہیں چلا کہ وہ گر رہا ہے۔

نور بانو نے اسے گرتے دیکھا تو اس کے حلق سے بے ساختہ چیخ نکلی۔اس نے قرآن پاک کرسی پر رکھا اور اس کی طرف لپکی۔اوتار سنگھ اس طرح گرا تھا کہ اس کے سر پر یقیناً شدید چوٹ آئی ہو گی۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

اس کے پاس پہنچ کر وہ ٹھٹک گئی۔ وہ کیا کر سکتی ہے اس کیلئے؟ کچھ بھی نہیں۔ اسے رگھو اور رنجنا کو بلانا ہے۔ لیکن اسے اس حال میں کوٹھے پر اکیلا چھوڑ کر نیچے جانے کا اس کا دل نہیں مانا۔ وہ ہر احتیاط بھول کر منڈیر کی طرف لپکی۔ رگھو دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھا تھا۔ ایک لمحے کے لئے نور بانو کو حیرت ہوئی۔ اتنی تیز آواز نیچے نہیں پہنچی۔ رگھو نے کچھ نہیں سنا؟

''رگھو چاچا.....رگھو چاچا.....''۔ اس نے پکارا۔

رگھو نے حیرت سے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس طرح کون پکار سکتا ہے اسے.....منجھلی بی بی کی سوا۔ مگر وہ تو پردہ کرتی ہیں۔ اس نے اوپر دیکھتے ہوئے سوچا.....یہ منجھلی بی بی کے سوا کون ہو سکتا ہے۔ ''کیا بات ہے منجھلی بی بی؟''۔

''جلدی سے اوپر آؤ۔ چھوٹے ٹھاکر کو کچھ ہو گیا ہے''۔

یہ سنتے ہی رگو کو تو جیسے پر لگ گئے۔ مگر اس عالم میں بھی وہ دروازہ بند کرنا نہیں بھولا۔

وہ اوپر آیا تو نور بانو نے کہا۔ ''تم انہیں سنبھالو چاچا۔ میں رنجنا دیدی کو جگاتی ہوں''۔

وہ رنجنا کو لیکر اوپر آئی تو رگھو چھوٹے ٹھاکر کا سر اپنی گود میں رکھے بیٹھا تھا۔ وہ رو رہا تھا اور بار بار بڑی محبت بھری نرمی سے چھوٹے ٹھاکر کے رخسار تھپ تھپا رہا تھا۔

''کیا ہو گیا مالک؟ آنکھیں کھولو نا مالک.....''۔

رنجنا کے ہاتھ میں پانی کی لٹیا تھی۔ اس نے چھوٹے ٹھاکر کے چہرے پر پانی کے چھینٹے دیئے۔

''انہیں کیا ہوا ہے منجھلی بی بی؟''۔ رگھو نے نور بانو سے پوچھا۔

نور بانو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا بتائے۔ ''معلوم نہیں۔ میں یہاں قرآن شریف پڑھ رہی تھی کہ یہ اوپر آ گئے۔ کچھ دیر سنتے رہے۔ پھر.....''۔ نور بانو کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ جو کچھ ہوا، وہ سب بتانا مناسب بھی ہے یا نہیں۔

یہ تو رگھو کو بھی یاد تھا کہ چھوٹے ٹھاکر اچانک گھر میں چلے گئے تھے۔ ''پھر کیا ہوا منجھلی بی بی؟''۔ اس نے پوچھا۔

''چھوٹے ٹھاکر کو ہوش آئے گا تو وہی بتا سکیں گے''۔ نور بانو نے پہلو تہی کی۔

رنجنا چھوٹے ٹھاکر کے چہرے پر چھینٹے مارے جا رہی تھی۔ بالآخر وہ کسمسانے لگا.....اور پھر اٹھ بیٹھا۔ ''کیا ہوا؟ یہ میرا چہرہ کیوں بھگو دیا تم نے؟''۔

''آپ.....آپ بے ہوش ہو گئے تھے مالک'' رگھو نے کہا۔

''نہیں.....ایسا سکون ملا تھا کہ میں بے خبر سو گیا'' اوتار سنگھ بولا۔

''آپ کا سر تو نہیں دکھ رہا ہے۔ بہت زور سے گرے تھے آپ۔ چوٹ یقیناً لگی ہو گی'' نور بانو نے کہا۔ وہ اپنا پردہ بھول ہی گئی تھی۔

اوتار سنگھ نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''نہیں کوئی چوٹ نہیں لگی۔ کوئی تکلیف نہیں۔ ایسا آرام اور سکون تو مجھے کبھی ملا ہی نہیں تھا''۔ ''جو کچھ ہوا، وہ آپ کو یاد ہے؟''۔ نور بانو کو شبہ تھا کہ یہ دماغی چوٹ کا معاملہ ہے۔

''وہ سب کچھ تو میں مرتے دم تک نہیں بھولوں گا''۔ اوتار سنگھ نے خواب ناک لہجے میں کہا۔ ''آپ جو کچھ پڑھ رہی رہی تھیں، میں وہ پوری طرح سمجھ رہا تھا۔ پھر میں نے اس کی تصدیق کے لئے آسمان کی طرف دیکھا۔ اور میں نے ایک نہیں، سات آسمان دیکھے۔ ہر آسمان الگ رنگ کا تھا۔ اور کسی میں کوئی بے ربطی نہیں تھی۔ کہیں کوئی خلل نہیں تھا۔ ہر طرف سے ایک ساحم، ایک سی ہمواری۔ پھر مجھ سے کسی نے کہا.....کیا اس کے بعد تو کلمہ نہیں پڑھے گا۔ پھر میں نے کلمہ پڑھا اور مجھے لگا کہ میرا وجود بہت روشن، بہت ہی زیادہ روشن ہو گیا ہے۔ مجھے نا قابل بیان سکون کا احساس ہو رہا تھا۔ مجھے نیند آنے لگی اور میں سو گیا۔

سات آسمانوں کے نظارے کا تذکرہ سنتے ہی نور بانو کے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ ارے.....میں اس شخص کو کتنا حقیر سمجھتی تھی، کافر اور مشرک کہتی تھی اسے، اور اللہ نے اسے کیسا اعزاز عطا فرمایا ہے۔ میں ایمان پر پیدا ہوئی۔ اب تک بلاشبہ ہزاروں بار میں نے یہ آیات پڑھیں۔ ان کا مطلب بھی سمجھتی ہوں اور آسمان کو کبھی میں نے یہ سوچ کر نہیں دیکھا کہ یہ اللہ کی کیسی بے مثال تخلیق ہے.....بے مثال اور بے عیب۔ اور جو شخص جو مشرک گھرانے میں پیدا ہوا، آج اس نے پہلی بار یہ آیات سنیں، سمجھیں اور آسمان کو اس خیال سے دیکھا تو اللہ نے اسے یہ نظارہ نصیب فرما دیا۔

نور بانو کی شرمندگی کی کوئی حد نہیں تھی۔ ''کلمہ پڑھتے ہوئے آپ اپنے ہوش و حواس میں تھے؟''۔ اس نے پوچھا۔

''ہاں۔ اتنے ہوش و حواس میں اس سے پہلے میں کبھی نہیں رہا''۔ اوتار سنگھ نے سادگی سے کہا۔

''کلمہ پڑھنے کا مطلب سمجھتے ہیں آپ؟''۔

اوتار سنگھ کو ریٹا پارسن کی پارٹی میں اپنی کلاس فیلو نادرہ سے اپنی گفتگو یاد آ گئی۔ اس نے نادرہ سے پوچھا.....کوئی مسلمان کیسے ہو سکتا ہے؟ تو نادرہ نے اسے بتایا تھا کہ آدمی دل کی گہرائیوں سے ایمان لائے اور کلمہ پڑھے تو وہ مسلمان ہو جاتا ہے۔

اوتار سنگھ کا دل خوشی سے بھر گیا ''ہاں.....میں جانتا ہوں۔ میں مسلمان ہو گیا۔ اللہ کا شکر ہے''۔

اس کی خوشی نے نور بانو کو حیران کر دیا۔ وہ بڑی سچی خوشی تھی۔

اوتار سنگھ رگھو کی طرف مڑا۔ ''اب تم اور رنجنا آزاد ہو رگھو۔ میرے اور تم لوگوں کے راستے آج الگ ہو گئے''۔

رگھو رونے لگا اور اس کے پیروں پر گر پڑا۔ ''یہ ناممکن ہے مالک.....''

''میں تم لوگوں کو بہت کچھ دوں گا۔ تم جہاں جی چاہے، چلے جاؤ۔ میں نے وہ دھرم چھوڑ دیا، جو تمہارا ہے''۔

رنجنا بھی رونے لگی۔ وہ بھی اوتار سنگھ کے پیروں میں گر پڑی۔ ''ہمارا دھرم تو جیون بھر تمہاری سیوا کرنا ہے مالک۔ اور ہمارا کوئی دھرم نہیں''۔

''ہمیں بھی مسلمان کر لو مالک''۔ رگھو گڑگڑانے لگا۔

اوتار سنگھ نے سوالیہ نظروں سے نور بانو کو دیکھا۔

''اللہ کی محبت میں دل کی گہرائیوں سے کوئی ایمان لائے تو مسلمان ہوتا ہے۔ یہ تو صرف آپ کی خوشی کیلئے مسلمان ہو رہے ہیں''۔ نور بانو نے افسردگی سے کہا۔

''مالک کی محبت بھی تو اوپر والے نے دی ہے''۔ رگھو نے تڑپ کر کہا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں کہ سچا مسلمان بنوں گا''۔

نور بانو کا دل کٹنے لگا۔ ''یوں تو آپ کیلئے بھی یہ ضروری ہے کہ کسی دین دار امام کے سامنے کلمہ پڑھیں۔ پھر وہ آپ کا اسلامی نام رکھے''۔

''تو میں ابھی جامع مسجد چلا جاتا ہوں.....'' اوتار سنگھ نے افسردگی سے کہا۔

''میں بھی.....'' رگھو بھی اٹھ کھڑا ہو۔ اور رنجنا بھی۔

''اس وقت تو مسجد میں کوئی نہیں ہو گا''۔

''تو سحری کے وقت چلے جائیں گے''۔

''آپ نے اعلان کر دیا تو میری حفاظت کیا کریں گے؟ آپ تو خود خطرے میں پڑ جائیں گے''۔ نور بانو کے لہجے میں خدشات تڑپ رہے تھے۔

''ارے حفاظت کرنے والا اللہ ہے۔ اس کی مرضی ہو تو کوئی بچا نہیں سکتا۔ اور وہ نہ چاہے تو موت آ نہیں سکتی''۔ یہ بات ایک نو مسلم اس لڑکی سے کہہ رہا تھا جو مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئی تھی اور دینی تعلیم بھی حاصل کرتی رہی تھی۔

(جاری ہے)

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

نور بانو کے لئے وہ شرمندگی کی رات تھی۔ وہ اس پر غور کر رہی تھی کہ وہ کیسی مسلمان ہے۔

وہ سب اپنی اپنی سوچوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ انہیں سحری کے وقت کا انتظار تھا۔

اچانک نیچے دروازے پر ہونے والی دستک نے انہیں چونکا دیا۔

رگھو منڈیر کی طرف گیا اور جھانکا۔ گلی میں اندھیرا تھا۔ لیکن دروازے پر کوئی کھڑا تھا۔ ''کون ہو تم؟ کیا بات ہے؟''۔ رگھو نے پکارا۔

نیچے کھڑے شخص نے سر اٹھایا۔ ''دروازہ کھول۔ میں تیرے مالک سے ملنے آیا ہوں بہت دور سے۔ جلدی کر''۔

.....×.....

بابا کو اپنے ساتھ اوپر لے کر آتے ہوئے رگھو کو یاد آ گیا کہ اس نے اسے پہلے کہاں دیکھا ہے۔ ہاں..... یہ وہی ہے۔ اس نے دل میں کہا۔ جس روز چھوٹے ٹھاکر کا جنم ہوا تھا۔ اس روز یہ بابا ٹھاکروں کی گڑھی آیا تھا۔

اس نے ہمت کر کے بابا سے یہ بات پوچھ ہی لی۔

''ہاں..... میں وہی ہوں''۔

اوپر پہنچ کر مجذوب نے اوتار سنگھ سے ہاتھ ملایا۔ اوتار سنگھ بھی اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ کوئی بھولی بسری یاد اس کے ذہن میں کلبلا رہی تھی۔ یعنی گرفت میں نہیں آ رہی تھی'' کیسے ہو بیٹے؟'' مجذوب نے پوچھا۔

اوتار سنگھ کو یقین تھا کہ اسی آواز اور لہجے میں لفظ لفظ یہی جملہ وہ پہلے بھی کہیں سن چکا ہے۔ ''جی..... میں ٹھیک ہوں۔ آپ سنائیں، کیسے تشریف لائے''۔

''آج تو آنا ہی تھا بیٹے۔ آج تو آپ کو میری ضرورت تھی۔ میں بھی خوش ہوں کہ آج آپ خوش ہیں..... خوش رہنے والی باتوں میں''۔

اوتار سنگھ کو یاد آ گیا۔ اس نے اس بابا کو پہلے بھی ایک بار دیکھا تھا۔ اس وقت وہ بہت چھوٹا تھا۔ اور یہ اس دن کی بات ہے، جب وہ پہلی بار ویر جی کے گھر جانے کے لئے ماتا، پتا جی کے ساتھ نکلا تھا۔ ''آپ وہی ہیں نا بابا.....؟''۔

''ہاں۔ میں وہی ہوں۔ تمہیں مبارک باد دینے کیلئے آیا ہوں''

نور بانو متجسسانہ انداز میں ان کی گفتگو سن رہی تھی۔ یہ تو اسے ایک نظر میں اندازہ ہو گیا تھا کہ آنے والا کوئی بزرگ ہے۔ حیرت اسے اس پر ہو رہی تھی کہ وہ چھوٹے ٹھاکر سے اتنے احترام سے بات کر رہا ہے۔ اور پھر مبارک باد کی بات.....

''کس بات کی مبارک باد؟''۔ اوتار سنگھ نے مجذوب سے پوچھا۔

''آج آپ نے خوش رہنے والی سب سے بڑی بات ڈھونڈ لی ہے۔ مبارک ہو''۔

''شکریہ بابا۔ اوتار سنگھ نے کہا۔ ''لیکن آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''اللہ جب کرم کرے تو آدمی کے حواسوں پر پڑے پردے ہٹا دیتا ہے۔ پھر آدمی سب کچھ دیکھ لیتا ہے، سن لیتا ہے، محسوس کر لیتا ہے اور جان جاتا ہے''۔ مجذوب کے لہجے میں عاجزی تھی۔ ''آپ بھی تو یہ بات سمجھ سکتے ہیں۔ آج کیا کچھ دکھا دیا آپ کو اللہ نے۔ کیا کچھ سمجھا دیا۔ یہ سب اللہ کا کرم ہے''۔

نور بانو کے جسم میں تھرتھری سی دوڑ گئی۔ مجذوب جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ اسے معلوم ہی نہیں ہونا چاہئے تھا۔ وہ تو اسے بھی صرف اسلئے معلوم ہو سکا تھا کہ چھوٹے ٹھاکر نے اسے بتا دیا تھا۔ حالانکہ سب کچھ اس کے سامنے ہی ہوا تھا۔ مگر چھوٹے ٹھاکر نے کیا دیکھا ہے، یہ تو وہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

''میری بچی نے ٹھیک کہا''۔ مجذوب نے نور بانو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو باقاعدہ اسلام قبول کرنا ہوگا۔ اس کیلئے کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں خود یہاں چلا آیا ہوں۔ یہ سعادت اللہ نے مجھے نصیب فرمائی ہے''۔

اوتار سنگھ نے کلمہ پڑھا۔

''مبارک ہو۔ اللہ آپ کو ایمان پر زندہ رکھے اور ایمان پر اٹھائے''۔ مجذوب نے کہا۔ اور چند لمحوں کے توقف کے بعد بولا۔ ''میں آپ کا نام عبدالحق تجویز کرتا ہوں۔ اچھا نہ لگے تو بتا دیجئے''

اوتار سنگھ کی آنکھیں خواب ناک ہو گئیں۔ یہ..... یہ میرا نام ہے..... اتنا سادہ، زبان پر اتنا رواں..... اتنا خوب صورت نام! ''بابا..... مجھے تو یہ نام بہت اپنا لگ رہا ہے۔ جیسے شروع ہی سے میرا نام ہو''۔

''بس تو آج..... اس لمحے سے آپ عبدالحق ہیں''۔

''شکریہ بابا''۔

''پہلے اللہ کا شکر ادا کیجئے۔ پھر بندے کو شکریہ کہئے۔ یہی بندگی ہے۔ اور اس میں کوتاہی شرک ہے۔ اور یاد رکھئے، اللہ شرک پر کبھی معاف نہیں کرتا''۔

اوتار سنگھ نے چہرہ آسمان کی طرف اٹھا کر کہا۔ ''اے اللہ..... آپ کا شکر ہے''۔

رگھو بڑھا اور مجذوب کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ ''مجھے بھی مسلمان کر لیجئے بابا..... اور میری پتنی کو بھی''۔

وہ دونوں خود سے کلمہ نہیں پڑھ سکتے تھے۔ مجذوب نے انہیں کلمہ پڑھایا۔ اس نے ان کے نام محمد زبیر اور رابعہ تجویز کئے۔

اب مجذوب نور بانو کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ادھر آؤ بیٹی''۔

نور بانو جھجکتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ ''تم اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تمہاری آرزو پوری کر دی''۔ مجذوب نے کہا۔

نور بانو کے رخسار دہک اٹھے۔ ''آپ کس آرزو کی بات کر رہے ہیں؟''۔

''تم چاہتی تھیں کہ تمہارا رمضان مسلمانوں کے درمیان گزرے۔ دیکھ لو، اب تم مسلمانوں کے درمیان ہو''۔

نور بانو نے اطمینان کی سانس لی۔ ''جی..... بے شک، میں نے یہ آرزو کی تھی۔ اللہ کا شکر کہ اس نے پوری فرمائی''۔

اسی وقت نقاروں کی آواز سنائی دی۔ سحری کا وقت ہو گیا تھا۔ ''اب ہم نیچے چلیں گے''۔ مجذوب نے کہا۔ ''تم سحری کی تیاری کرو''۔

.....×.....

سحری نور بانو بنا رہی تھی۔ باقی لوگ اوتار سنگھ کے کمرے میں بیٹھے تھے۔ مجذوب انہیں دین کی باتیں سمجھا رہا تھا۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے انہیں کیا کیا کرنا چاہئے اور کیا کیا نہیں کرنا چاہئے

سحری کے بعد مجذوب نے انہیں وضو کرنا سکھایا۔ پھر روزہ رکھنے اور افطار کرنے کی نیت یاد کرائی۔ پھر انہیں نماز سکھائی۔ عبدالحق کو تو دشواری نہیں ہوئی۔ لیکن زبیر اور رابعہ کو چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد کرانا بھی آسان نہیں تھا۔ ان کیلئے تو وہ بالکل اجنبی زبان تھی۔

مجذوب نے رابعہ کو ہدایت کی کہ وہ نور بانو کے ساتھ نماز پڑھے اور جو نور بانو پڑھے، اسے دہراتی رہے۔ انہوں نے نور بانو سے کہا کہ رابعہ کی خاطر اسے بہ آواز بلند نماز پڑھنی ہوگی۔

ان دونوں کے جانے کے بعد مجذوب نے عبدالحق سے رکعت نماز سنت پڑھنے کو کہا اور زبیر کو اس کی تقلید کرنا تھا۔

عبدالحق کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ اس کیلئے جیسے اہم ترین امتحان تھا۔ اس کا جسم پسینے میں نہا رہا تھا اور دل جیسے حلق میں دھڑک رہا تھا۔

''نیت کرتا ہوں دو رکعت نماز سنت.....''۔

''نیت کرتے ہی اسے ناقابل بیاں سکون کا احساس ہوا۔ وہ سب کچھ بھول گیا اور نماز پڑھنے لگا۔ زبیر اس کا پڑھا ہوا دہرا رہا تھا اور اس کی تقلید کر رہا تھا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

عبدالحق نے سلام پھیرا تو مجذوب نے خوش ہوکر کہا۔''سبحان اللہ.....تم نے پہلی نماز ہی کتنی اچھی پڑھی ہے''۔

''یہ سب اللہ کا کرم ہے''۔عبدالحق نے کہا۔

''اب میں سنتیں ادا کرلوں۔پھر فرض نماز تم میرے پیچھے پڑھنا''

وہ بڑی مختصر جماعت تھی۔ایک امام،ایک اقامت پڑھنے والا اور ایک مقتدی۔لیکن نماز پڑھتے ہوئے عبدالحق کو احساس ہو رہا تھا کہ کمرے میں بے شمار لوگ ہیں۔ کمرے کی فضا میں حدت تھی،جیسے وہاں بہت سے لوگ سانس لے رہے ہوں۔

مجذوب نے بہت اچھی دعا کرائی۔دعا کے بعد عبدالحق کو لگا کہ کمرا بالکل خالی ہوگیا ہے۔اس نے یہ بات مجذوب سے کہہ بھی دی۔

''اللہ کے بھید بے شمار ہیں۔اللہ ہی جانے''۔

مجذوب نے نور بانو اور رابعہ کو اسی کمرے میں بلالیا۔

''وقت بہت کم ہے۔میں چاہتا ہوں کہ اس میں تمہاری زیادہ سے زیادہ رہنمائی کروں۔یاد رکھو،اپنے بندوں کی ہدایت کے لئے اللہ نے قرآن نازل فرمایا۔تم لوگ بہت خوش نصیب ہو کہ اللہ نے نزول قرآن کے مہینے کی پہلی شب ہدایت سے سرفراز فرمایا۔یوں تمہیں قرآن سے خاص نسبت عطا کی گئی ہے۔قرآن حکیم کی ایک ایک آیت میں ہزار ہزار حکمتیں ہیں۔اللہ ہی چاہے تو بندہ سمجھے۔ورنہ یہ ناممکن ہے۔سو قرآن کو ہدایت کی نیت سے پڑھو اور سمجھنے کی کوشش کرو۔اس کیلئے ضروری ہے کہ پڑھنے سے پہلے اللہ سے رہنمائی کی التجا کرو.....ایک بندے کے شایان شان عاجزی کے ساتھ۔دوسرا ذریعہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک۔حضورؐ نے پوری زندگی قرآن کے احکام کے تحت گزاری۔سیرت پاک کو پڑھتے رہو اور پیروی کرتے رہو تو سمجھ لو کہ تم قرآن پر عمل کر رہے ہو''۔مجذوب نور بانو کی طرف مڑا۔

''اب تم پر بڑی ذمے داری ہے بیٹی۔تم پیدائشی مسلمان ہو۔انہیں مسلمانوں کے طور طریقوں سے متعارف کراتی رہو۔اچھا مسلمان بننے میں ان کی مدد کرو۔یہ بہت بڑا کام ہے۔اللہ کے ہاں تمہیں اس کا بہت بڑا اجر ملے گا۔اور ہاں،انہیں قرآن پاک بھی تمہیں پڑھانا ہے''۔

''لیکن بابا،میرا پردہ.....''۔

''تم نیت اور ارادہ تو کرو۔راستہ اللہ بنائے گا''۔مجذوب نے چند لمحے توقف کیا۔''تم رابعہ کو پڑھاؤ۔وہ اپنے شوہر کو پڑھائے گی۔اور ہاں.....پردے پر مجھے یاد آیا کہ ابھی ایک دن تمہارے درمیان پردہ نہیں رہے گا''۔

وہ سوالیہ نظروں سے مجذوب کو دیکھ رہے تھے۔

''اللہ کو یہ منظور ہے کہ تم یہ مبارک مہینہ پوری آزادی کے ساتھ پاکستان میں گزارو''۔

''لیکن بابا،پاکستان تو ابھی بنا نہیں ہے''۔عبدالحق نے کہا۔

''پاکستان بن گیا ہے۔یوں کہو،ابھی دنیاوی اعلان نہیں ہوا ہے۔بہرحال تمہیں پاکستان جانا ہے۔پرسوں صبح تم لوگ روانہ ہوگے۔سفر کے دوران تم لوگ خود کو ہندو ظاہر کروگے۔اسلئے تمہارے درمیان پردہ نہیں ہوگا۔نور بانو بھی ہندوانہ لباس میں ہوگی''۔

''ہمیں پاکستان میں کہاں جانا ہے؟''۔

''جہاں کوئی تمہاری راہ تک رہا ہے''۔

''پاکستان میں؟وہاں میرا انتظار کون کرسکتا ہے''۔

''بھول گئے اپنی اماں کو''۔

عبدالحق تڑپ گیا۔''اماں!اماں میرا انتظار کر رہی ہیں!اماں موجود ہیں!اللہ کا شکر ہے۔مگر وہ ہیں کہاں؟''۔

''وہیں.....تمہارے گاؤں میں''۔

''لیکن ہمارا گاؤں تو ختم ہوگیا تھا بابا جی''۔

''ٹھاکروں کی گڑھی ریت کے نیچے دفن ہوگئی۔لیکن اب وہ پھر سے آباد ہوگا.....نئے نام کے ساتھ۔حمیدہ اس مدفون گاؤں کی سرحد پر تمہارا انتظار کر رہی ہے''۔

عبدالحق کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔''تو بابا جی،میرا گاؤں پاکستان میں ہے؟''۔

''تمہارا گاؤں پاکستان میں ہی ہوسکتا تھا''۔

عبدالحق کو اللہ نے ایمان عطا فرمایا تھا۔وہ الجھ رہا تھا۔''مگر بابا،ہم ہندو بن کر کیوں سفر کریں''۔

''اللہ کا حکم ہے۔اپنی مصلحت وہ جانے۔کیا پتا،اس میں تمہارے لئے آزمائش ہو''۔

''آپ ہمارے ساتھ ہوں گے؟''۔

''نہیں۔میں تو ابھی واپس جا رہا ہوں''۔

''کہاں؟''۔

''یہ میں نہیں بتاؤں گا۔تمہارے پاس بھی کام کے سلسلے میں آیا تھا۔اب آگے ایک اور کام کرنا ہے''۔

وہ سب افسردہ ہوگئے۔اتنی سی دیر میں بابا انہیں اپنے گھر کا فرد لگنے لگے تھے۔

.....×.....

تو انقلاب ایسے آتا ہے!نور بانو سوچ رہی تھی۔ایسے کو ایک لمحے پہلے تک کسی کو علم نہیں ہو پاتا۔اگر کسی اور نے یہ سب کچھ اسے سنایا ہوتا تو وہ اسے گھڑی ہوئی کہانی.....کوئی افسانہ قرار دیتی۔لیکن وہ تو اس انقلاب کی عینی شاہد تھی۔

یہ بات ہی کیسی ناقابل یقین تھی کہ وہ کوٹھے پر تلاوت کر رہی تھی اور چھوٹا ٹھاکر اوپر چلا آیا تھا۔وہ جو اس سے ڈرتی رہتی تھی،وہ تو اسے دھتکار کر بھگا دیتی اور وہ نہ جاتا تو وہ کوٹھے سے کود جاتی۔لیکن اس کے آنے کے بعد وہ جیسے اس کے حکم کی پابند ہوگئی تھی۔وہ اس کے حکم پر ہی پڑھ رہی تھی،اس کے حکم پر توقف کر رہی تھی۔صرف اس لئے کہ وہ اسے چھوٹا ٹھاکر نہیں لگ رہا تھا۔وہ تو اس کے نزدیک آسمان سے اترا ہوئی کوئی فرشتہ تھا،جو اس کی قرأت سننے کے لئے چلا آیا تھا۔

آدمی بھولنا چاہے تو بڑی سی بڑی بات آسانی سے بھول جاتا ہے۔بس جتنی بڑی بات ہو،اسے بھولنے کے لئے اتنا ہی طاقت ور جواز ہونا چاہئے۔اور نور بانو کے پاس تو طاقت ور ترین جواز تھا۔وہ اس کے ایمان کا معاملہ تھا۔

مگر اب وہ جواز ختم ہوگیا تھا۔ایک چھوٹے سے لمحے نے کتنی آسانی سے چھوٹے ٹھاکر کو اوتار سنگھ سے عبدالحق بنا دیا تھا۔اب وہ بھولی ہوئی ہر بات یاد کرسکتی تھی۔ چاہے اس کے نتیجے میں اسے کتنی ہی شرمندگی ہو۔وہ تو آخرت کی شرمندگی سے ڈرتی تھی۔دنیا کی شرمندگی تو کوئی بات نہیں۔وہ تو غلطی کی سزا ہے اور اس پر وہ توبہ اور استغفار بھی کرسکتی ہے۔

چناں چہ نور بانو سوچ رہی تھی.....یاد کر رہی تھی۔حالانکہ یاد کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔وہ تو وہ سب کچھ زبردستی بھولے بیٹھی تھی۔وہ سب اسے یاد تھا مگر اس نے اسے لاشعور کے نہاں خانے میں دھکیل دیا تھا۔

سوال یہ تھا کہ وہ شروع کہاں سے کرے.....؟

اسے اماں کی بات یاد آئی۔اماں نے کہا تھا.....تم لوگ میرے سمجھانے اور منع کرنے کے باوجود چھوٹے ٹھاکر کے متعلق بدگمانی کرو تو گناہ گار تو ہوگی نا۔اور سمجھو گی کہ وہ کار ثواب ہے۔ہوا نا دہرا نقصان۔میں تمہاری ماں ہوں۔تمہارا نقصان کیسے گوارا کرسکتی ہوں۔اس لئے میں نے اس کا تذکرہ کرنا ہی چھوڑ دیا کہ کم از کم بدگمانی سے تو بچی رہو گی تم۔

اسے یاد آیا.....اس نے اماں سے بدگمانی نہ کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے اصرار کیا تھا کہ وہ چھوٹے ٹھاکر کے متعلق انہیں بتائیں۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

اب اسے اماں کی کہی ہوئی ہر بات یاد آ رہی تھی۔ اماں نے کہا تھا..... چھوٹا ٹھاکر جھوٹ نہیں بولتا۔ یہ اس پر اللہ کی رحمت ہے۔ وہ بچپن ہی سے ہر بات پر غور کرنے والا تھا۔ سوال بہت کرتا تھا۔ ماں کی موت کے بعد اس نے پوجا چھوڑ دی۔ اس کا یقین ہے کہ کائنات کا نظام چلانے والی ہستی واحد ہے۔ وہ کہتا ہے، جہاں کئی حکمراں ہوں وہاں فساد ہوتا ہے، نظام نہیں چلتا۔ وہ بڑے خلوص سے، محبت سے اس واحد ہستی کی جستجو کر رہا ہے۔ وہ اس واحد ہستی سے محبت کرنا چاہتا ہے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں، اسے کافر یا مشرک سمجھنا بھی بڑی زیادتی ہے۔

آج اماں کی بات سچ ثابت ہوگئی تھی۔ وہ اس کی تلاوت سن کر ہی تو اوپر آیا تھا۔ اور جو آیات اس نے سنیں، ان کا ترجمہ بھی سنایا۔ پھر اس نے کلمے سے، اللہ کے کلام کی سچائی کی گواہی دی۔ اماں نے ٹھیک کہا تھا۔ وہی بدگمانی کرتی تھی۔

اور اس کی اماں نے یہ وجہ بتائی تھی کہ ان کے اصرار کے باوجود وہ بھی نیچے..... ان کے گھر کیوں نہیں آیا۔ اماں کا بیٹا بننے کے بعد ان کے گھر کی عزت اس کی گھر کی عزت تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ نیچے آئے جائے اور لوگ باتیں بنائیں۔ دوسرے وہ خود کو انسان سمجھتا تھا..... خطا کا پتلا۔ وہ نظر کے بہکنے سے بھی ڈرتا تھا۔ اس نے خود کو آزمائشوں سے دور رکھا۔ وہ اماں کے اعتبار کی آبرو رکھنا چاہتا تھا۔

اور اب نور بانو اس کا احسان سمجھ رہی تھی۔ س نے نیچے نہ آ کر دوسروں پر احسان کیا تھا۔ کون کون آزمائشوں میں پڑ جاتا۔ نیچے بھی تو خطا کے پتلے ہی رہتے تھے۔ وہاں بھی تو بہکنے والی نظریں تھیں۔

تو یہ ہے وہ شخص جسے اپنی کمزوری کی وجہ سے وہ کافر اور مشرک کہتی رہی۔ جبکہ اس میں وہ اوصاف تھے، جو بہت اچھے مسلمانوں میں ہوتے ہیں۔ اس نے بڑا ظلم کیا۔ اس پر بھی اور خود پر بھی۔ اپنی کمزوری کے بارے میں تو وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے کہ وہ اس سے لڑ نہیں سکتی تھی..... اسے دور نہیں کر سکتی تھی۔ سو وہ شتر مرغ کی طرح ریت میں سر چھپا کر بیٹھ گئی۔ اور وہ اسے کافر اور مشرک کہتی رہی۔ اس کی ہر بات، ہر عمل پر شک کرتی رہی۔ اسے مکار اور سازش سمجھتی رہی۔

مگر اب وہ اپنی کمزوری کے بارے میں سوچ سکتی تھی..... اس سے آنکھیں چار کر سکتی تھی۔ اس کمزوری کے نتیجے میں اس نے چھوٹے ٹھاکر کے ساتھ جو زیادتی کی تھی، اس پر وہ توبہ کر سکتی تھی۔ بس ضروری یہ تھا کہ وہ اس بارے میں سوچے۔

اس کی کمزوری تھا چھوٹا ٹھاکر ..... ٹھاکر اوتار سنگھ!

وہ اس لمحے کو منحوس کہتی تھی، جب اس نے چھوٹے ٹھاکر کو پہلی بار دیکھا تھا۔ اس وقت تو وہ محبت کو جانتی بھی نہیں تھی۔ بس چھوٹے ٹھاکر جب اس نے دیکھا تو واضح طور پر اسے ایسا لگا کہ وہ اس کی آنکھوں کے راستے دل میں اتر گیا ہے۔ اگلے ہی لمحے اس نے خود کو یاد دلایا کہ وہ ہندو ہے۔

شروع میں اس نے اس دید کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ پریشانی اس وقت شروع ہوئی، جب اسے احساس ہوا کہ چھوٹے ٹھاکر کا سراپا اس کی آنکھوں میں نقش ہوگیا ہے۔ وہ کسی وقت بھی اسے دیکھ سکتی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی دیکھ سکتی تھی۔ تب اپنے اوپر یہ بے اختیاری اسے بری لگنے لگی۔ ایک کافر کو اس طرح دیکھنا..... یہ تو ایمان خراب کرنا ہے۔ اس نے بہت کوشش کی لیکن اسے نگاہوں سے اور دل سے وہ دور نہ کر سکی۔

دل بڑی ظالم بلا کا نام ہے۔ دل چاہتا تھا کہ وہ اسے بار بار دیکھے۔ اور قدم ڈیوڑھی کی طرف اٹھنے لگتے۔ مگر دل سے تو آدمی لڑ سکتا ہے۔ نور بانو نے اپنے قدموں کی ہر بار ڈیوڑھی میں پہنچنے سے روک لیا۔ لیکن نگاہوں کا وہ کچھ نہ کر سکی، جن میں چھوٹا ٹھاکر بس گیا تھا۔ وہ کہیں بھی بیٹھی ہوتی، کچھ بھی کر رہی ہوتی، اچانک اسے چھوٹے ٹھاکر کا خیال آتا اور اس کے ساتھ ہی وہ اسے اپنے روبرو نظر آنے لگتا۔ اور اسے ہٹانے کا اسے اختیار نہیں تھا۔

اسے احساس ہوگیا کہ یہ محبت ہے۔ اسے چھوٹے ٹھاکر سے محبت ہوگئی ہے۔ لیکن اس کے نزدیک یہ ناپاک محبت تھی۔ وہ اس محبت کو ختم کرنے کا اختیار نہیں رکھتی تھی۔ اسی جھنجلاہٹ میں وہ اس محبت پر لعنت بھیجنے لگی۔ اس نے اس پر سوچنا بھی کبھی گوارا نہیں کیا۔ محبت کے لطیف پہلوؤں سے وہ ہمیشہ کے لئے دور ہوگئی۔ یوں محبت نفرت کا روپ دھارنے لگی۔ اور نفرت دن بہ دن بڑھنے لگی۔

بس ایک عمل ایسا تھا، جس کے دوران اوتار سنگھ کی شبیہہ مداخلت نہیں کرتی تھی۔ اور وہ تھا قرآن پاک کی تلاوت۔ یہ احساس ہوا تو وہ کثرت سے قرآن پڑھنے لگی۔ قرآن پڑھتے ہوئے اس پر عجیب کیفیت طاری ہوتی تھی اور وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتی تھی۔ سو اس نے تلاوت قرآن پاک کو اپنا قلعہ بنا لیا اور اس میں محصور ہو گئی۔

لیکن وہ ہر وقت تو قرآن نہیں پڑھ سکتی تھی۔ خالی وقت میں اسے اوتار سنگھ کی شبیہہ سے لڑنا پڑتا تھا۔ اور رات کو بستر پر لیٹے ہوئے تو اس کا تصور جیسے مہمیز ہو جاتا تھا۔ بہرحال وہ پوری شدت سے اس سے لڑتی تھی۔

اپنی اس الجھن میں وہ اس طرح گم تھی کہ گردوپیش پر دھیان دینے کی فرصت ہی نہیں رہی تھی۔ پھر بھی اس نے کئی بار دیکھا کہ دو خاص اوقات میں..... صبح کے وقت اور دوپہر کے وقت..... باجی کے قدم خود بہ خود ڈیوڑھی کی طرف اٹھتے ہیں۔ یہی نہیں، ڈیوڑھی کی طرف جاتے ہوئے ان کے قدموں میں جھجک..... اور لڑکھڑاہٹ ہوتی ہے۔ ویسی ہی جیسے اس کے قدموں میں ہوتی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ خود کو روک لیتی تھی۔ جبکہ باجی کھنچی چلی جاتی ہیں۔ اور ایسے میں ان کے چہرے پر قوس قزح کے رنگ بکھرے ہوتے ہیں۔

یہ اس کیلئے دلچسپی کا معاملہ تھا۔ کہیں باجی کے ساتھ بھی وہی تو نہیں ہو رہا ہے، جو میرے ساتھ ہو چکا ہے۔ یوں اسے ایک ایسا مشغلہ مل گیا، جس میں اس کا دھیان بٹنے لگا۔ وہ باجی کو بہت غور سے دیکھنے لگی۔

چند ہی روز میں اسے احساس ہوگیا کہ باجی میں بڑی تبدیلی آ رہی ہے۔ عصر سے ذرا پہلے وہ دالان میں تخت پر جا بیٹھتی تھیں۔ پھر عصر کی اذان ہو جاتی، تب بھی وہ وہیں بیٹھی رہتیں۔ یہاں تک کہ اماں انہیں آواز دیتیں..... حور بانو، عصر نہیں پڑھو گی۔ تب وہ اٹھتیں اور عصر پڑھتیں۔

عصر سے مغرب تک تینوں بہنوں کا لگا بندھا سا معمول تھا۔ عصر کی نماز کے بعد مغرب تک وہ قرآن پاک کی تلاوت کرتی تھیں۔ مگر اب وہ دیکھ رہی تھی کہ تلاوت میں باجی کا دل پہلے کی طرح نہیں لگتا ہے۔ وہ وضو پر زیادہ دھیان دے رہی تھیں۔

پھر اسکول کی گرمی کی چھٹیاں ہوئیں۔ اوپر والے گاؤں چلے گئے۔ اس نے سکون کی سانس لی۔ کم از کم وہ قدموں کو روکنے باندھنے کی مشقت سے تو بچ گئی۔ لیکن اس نے دیکھا کہ باجی بہت بدل گئی ہیں۔ وہ کھوئی کھوئی رہتیں۔ اکثر بیٹھے بیٹھے اداس ہو جاتیں۔

اوپر والے ابھی نہیں آئے تھے کہ اماں نے استانی جی کو ان کی دینی تعلیم پر مامور کر دیا۔ استانی جی نے اپنے لئے عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت منتخب کیا تھا۔ یوں ان کا یہ نیا معمول شروع ہوگیا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

پھر اوپر والے لوٹ آئے۔اس دن باجی بہت خوش نظر آرہی تھیں۔عصر سے پہلے انہوں نے سلائیاں اوراون کا گولا لیا اور دالان میں پڑے تخت پر جا بیٹھیں۔

نور بانو وضو کرنے کے لئے نکلی تو پہلی بار اس نے تفصیلی جائزہ لیا۔اس سے پہلے اس نے کبھی باجی کے معاملے میں تجسس نہیں کیا تھا۔وہ دبے قدموں دالان کی طرف بڑھی اور ذرا پیچھے ہی رک گئی۔وہ باجی کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔

باجی کے ہاتھوں میں سلائیاں تھیں،مگر ساکت۔ بلکہ وہ تو سلائیوں کو دیکھ بھی نہیں رہی تھیں۔ان کی نظریں تو سامنے کوٹھے پر تھیں۔نور بانو نے ان نظروں کی سمت دیکھا تو کوٹھے پر جالیوں کی دیوار کے اس پار چھوٹا ٹھاکر بیٹھا نظر آیا۔

باجی اسی کو دیکھ رہی تھیں.....اوران کی نگاہوں میں عجیب سا والہانہ پن تھا۔

نور بانو کا پہلا تاثر یہ تھا کہ چھوٹا ٹھاکر بھی باجی کو دیکھ رہا ہوگا۔لیکن چند ہی لمحوں میں اسے احساس ہوگیا کہ اس کا اندازہ غلط ہے۔چھوٹا ٹھاکر تو کوٹھے پر ادھر سے ادھر اورادھر سے ادھر ٹہلے جارہا تھا۔اوراس نے ایک بار بھی دالان کی طرف رخ نہیں کیا تھا۔ویسے اگر وہ اس طرف دیکھتا تو باجی کو بھی دیکھ سکتا تھا اور اسے بھی۔بالکل ویسے ہی جیسے وہ دونوں اسے دیکھ رہی تھیں۔

پھر نور بانو کو ایک تبدیلی کا احساس ہوا۔چھوٹے ٹھاکر کے ٹہلنے کی رفتار بڑھ گئی تھی۔یہی نہیں،اس کے جسم کا ایک ایک عضو اس کے اندرونی اضطراب کا اظہار کررہا تھا۔اور باجی گردوپیش سے بے خبر،والہانہ نظروں سے اسے تکے جارہی تھیں۔

نور بانو کی سمجھ میں چھوٹے ٹھاکر کا اضطراب نہیں آیا۔وہ کوٹھے پر کیوں ٹہل رہا تھا۔اگر باجی کی وجہ سے ٹہل رہا تھا تو اس نے ان کی طرف دیکھا کیوں نہیں۔بہرحال یہ طے تھا کہ باجی اسے دیکھ رہی تھیں۔اس بات کی بھی تصدیق ہوگئی کہ باجی کے ساتھ بھی وہی ہوا ہے،جو اس کے ساتھ ہوا تھا۔فرق اتنا تھا کہ باجی خود سے لڑ نہیں رہی تھیں۔بلکہ وہ اس میں خوش تھیں۔

وہ وہیں کھڑی رہتی۔لیکن اماں کی آواز نے اسے چونکا دیا۔''حور بانو،عصر پڑھ لو۔استانی جی آتی ہی ہوں گی''۔

حور بانو تو بعد میں چونکی۔پہلے نور بانو دالان سے گزر کر غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔

استانی جی کے جانے کے بعد اس نے مغرب پڑھی۔سلام پھیرا تو پتا چلا کہ باجی پہلے ہی اٹھ چکی ہیں۔وہ پھر دالان کی طرف گئی۔باجی وہاں موجود تھیں۔وہ تخت پر بیٹھی اسی سمت گھور رہی تھیں۔اس بار انہوں نے سلائیوں اوراون کے گولے کا تکلف بھی نہیں کیا تھا۔

نور بانو نے جالیوں کے اس پار دیکھا۔اوپر اندھیرا ہونے لگا تھا۔لیکن چھوٹا ٹھاکر ایک ہیولے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔اوراب بھی اس کا رخ جالیوں والی دیوار کی طرف نہیں تھا۔وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ دالان سے اسے دیکھا جارہا ہے۔

اس سے نور بانو کو ایک فائدہ ضرور ہوا۔اس کے اندر کی خود ملامتی کم ہوگئی۔ملامت کا رخ اب باجی کی طرف ہوگیا تھا۔کیا باجی نہیں جانتیں کہ وہ کافر ہے،مشرک ہے۔پھر وہ اس کی طرح خود کو روکنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔وہ تو بڑی ہیں۔زیادہ سمجھدار ہیں۔

اور کبھی کبھی اسے خیال آتا کہ چھوٹا ٹھاکر بھی ضرور باجی کو دیکھتا ہوگا۔یہ خیال آتا تو اس باجی سے رقابت ہونے لگتی۔مگر وہ تھوڑی دیر کی بات ہوتی۔پھر وہ سوچتی،چلو اچھا ہے،میری جان تو چھوٹی باجی اپنی جانیں۔اللہ کے آگے جواب بھی خود ہی دیں گی۔

کبھی وہ سوچتی کہ اگر چھوٹا ٹھاکر مسلمان ہوتا.....اور وہ دونوں بہنوں کو دیکھتا تو اس کی طرف کبھی متوجہ نہ ہوتا۔وہ باجی سے ہی محبت کرتا۔باجی ہیں ہی اتنی خوب صورت۔اور وہ خود اتنی معمولی سی لڑکی ہے۔اسے تو کوئی دوسری نظر دیکھنا بھی گوارہ نہ کرے۔

یہ احساس کم تری شروع ہی سے اس کے ساتھ تھا۔اسے شدت سے احساس تھا کہ باجی اور گلنار کے سامنے وہ نوکرانی لگتی ہے۔اس احساس کم تری نے اسے کم آمیز بنا دیا تھا۔وہ بہنوں میں گھلتی ملتی نہیں تھی۔زیادہ وقت کتابوں کے ساتھ ہی گزارتی تھی۔

احساس کم تری تو الگ رہا،اسے تو اللہ سے بھی شکایت تھی۔اماں اور ابا،دونوں ہی بہت خوش شکل اور خوب صورت تھے۔پھر اللہ نے اسے ایسا کیوں بنایا۔ایک بار چچا نے ہنس کر کہا تھا''مجھے تو لگتا ہے بھابھی کہ آپ کی یہ بیٹی بدل گئی ہے کہیں،یہ آپ کی اور بھائی کی بیٹی تو لگتی ہی نہیں''۔

چند روز بعد ایک عجیب بات ہوئی۔وہ بیٹھی مطالعہ کررہی تھی کہ باجی کمرے میں آئیں۔''نور.....نور اٹھو تو۔کچھ دکھانا ہے تمہیں''۔ان کے لہجے میں سنسنی آمیز مسرت تھی۔

''کیا ہے باجی؟''۔وہ جھنجلا گئی۔

''تم میرے ساتھ چلو''۔

''کہاں؟''۔

''دالان میں۔اور کہاں لے جاسکتی ہوں میں تمہیں''۔

''میں پڑھ رہی ہوں باجی۔یہیں بتا دینا نا،کیا بات ہے''۔

''بہت عجیب بات ہے۔بتانے میں مزہ نہیں آئیگا۔آؤ نا''۔باجی اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگیں۔

وہ بہت جھنجلائی۔لیکن بہرحال وہ باجی کا بہت لحاظ کرتی تھی،اٹھ گئی۔باجی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے دالان میں لے گئیں۔''آؤ.....یہاں بیٹھو''۔باجی نے اسے تخت پر بٹھایا اور خود بھی بیٹھ گئیں۔

نور بانو سمجھ تو گئی تھی،لیکن ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی۔اس لئے ادھر ادھر دیکھتی رہی۔لیکن اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔کیا آج باجی ہر لحاظ،ہر حجاب ختم کردیں گی۔وہ تاسف سے سوچ رہی تھی۔''یہاں تو کچھ بھی نہیں ہے باجی''اس نے لہجے میں مایوسی سموتے ہوئے کہا۔

''جو میں دکھانا چاہتی ہوں،وہ یہاں نہیں،اوپر ہے.....کوٹھے پر''۔

یہ سن کر نور بانو کا دل جیسے حلق میں آگیا۔اس نے فیصلہ کرلیا کہ آج باجی کو خوب سنائے گی۔''کوٹھے پر''۔اس نے حیرت سے کہا اور کوٹھے کی سمت دیکھا۔''وہاں دو آدمی بیٹھے ہیں۔مگر اس میں کیا خاص بات ہے؟''۔

''دیکھنا اتنا ضروری نہیں۔تم ذرا کان لگا کر سنو''۔

نور بانو نے چند لمحے سماعت پر زور دیا۔''ہاں.....پڑھائی ہورہی ہے''۔

''بالکل ٹھیک۔مگر یہ سنو کہ کیا پڑھایا جارہا ہے''۔

نور بانو کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔''ارے ہاں.....یہ تو عربی پڑھا رہے ہیں''۔

''ہاں''۔باجی نے کہا۔

مگران کا فاتحانہ لہجہ نور بانو کو بہت برا لگا۔اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اس میں باجی کی خوشی کی کیا بات ہے۔

''مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ عربی کیوں پڑھ رہے ہیں''۔باجی کے لہجے میں بناوٹی حیرت تھی۔

''اس میں کیا خاص بات ہے باجی۔لوگ عربی بھی پڑھتے ہیں اور فارسی بھی''۔

''لیکن ایک ہندو عربی کیوں پڑھنے لگا؟''۔باجی نے اعتراض کیا۔

نور بانو کا دل بہت زور سے دھڑکا۔یہ وہ لمحہ ہے،جب باجی کھل کر سامنے آسکتی ہیں۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

اس نے چھوٹے ٹھاکر کو پہچان لیا تھا۔مگر اس نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا۔''ہندو! یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو باجی۔ایک مسلمان لڑکا بھی تو رہتا ہے وہاں''۔

''وہ تو ہے۔لیکن اس وقت جو پڑھ رہا ہے، وہ مسلمان لڑکا نہیں، چھوٹا ٹھاکر ہے''۔

نور بانو نے بہت غور سے باجی کو دیکھا۔''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو باجی؟''

باجی چورسی ہوگئیں۔لیکن اب وہ پیچھے بھی نہیں ہٹ سکتی تھیں۔اور انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ بھی چھوٹے ٹھاکر کو پہچانتی ہے۔''میں پہچانتی ہوں ان دونوں کو''۔ان کے لہجے میں حجاب تھا۔''کبھی کبھی اسکول جاتے آتے نظر آتے ہیں دونوں۔یہ چھوٹا ٹھاکر ہے''۔

اب کے نور بانو کے دل میں رقابت کی جولہر اٹھی، وہ بے حد تند تھی۔اس وقت وہ ہر قیمت پر باجی کو تکلیف پہنچانا چاہتی تھی.....انہیں مایوس کرنا چاہتی تھی۔''لیکن باجی، میں نے سنا ہے کہ ہندو بھی عربی فارسی پڑھتے ہیں۔دیکھو نا، علم تو کسی کی میراث نہیں''۔

اور اسے خوشی ہوئی کہ باجی کو مایوسی ہوئی۔وہ خاموش ہوکر سوچنے لگیں۔ان کے انداز سے لگتا تھا کہ وہ اس بات کو غیر معمولی ثابت کرنا چاہتی ہیں اور اس کے حق میں کوئی دلیل ڈھونڈ رہی ہیں۔لیکن انہیں کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔

اس لمحے ایک عجیب بات ہوئی۔اوپر موجود پڑھانے والے نے اچانک تلاوت شروع کردی۔ان کی آواز بھی بہت اچھی تھی اور وہ بڑی خوب صورت قرات کررہے تھے۔اور وہ سورہ یٰسین کی تلاوت کررہے تھے۔

دونوں بہنیں مبہوت ہوکر سن رہی تھیں۔تلاوت ختم ہوگئی۔پھر بھی چند لمحے انہیں ادھر ادھر کا ہوش نہیں تھا۔

پھر دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔اور باجی نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔''اب کیا کہتی ہو نور بانو۔بات صرف عربی پڑھنے کی نہیں۔یہ تو قرآن کی تلاوت تھی''۔

نور بانو کو اس کا فاتحہ لہجہ بہت برا لگا۔باجی یوں خوش ہورہی تھیں، جیسے اس میں ان کا کچھ کمال ہو لیکن اسے بہرحال اعتراف کرنا پڑا کہ واقعی یہ ایک غیر معمولی بات ہے۔

اسی وقت مغرب کی اذان شروع ہوئی اور کوٹھے پر دونوں افراد اٹھ کھڑے ہوئے۔پڑھانے والا نورانی چہرے والا باریش ادھیڑ عمر آدمی تھا۔

وہ دونوں بھی وضو کے لئے چل دیں۔

اس روز نور بانو باجی کے بارے میں سوچتی رہی۔یہ بات طے تھی کہ باجی کو چھوٹے ٹھاکر سے محبت ہوگئی ہے۔یوں چھوٹے ٹھاکر سے محبت اسے بھی تھی۔لیکن فرق بہت بڑا تھا۔وہ اس محبت پر شرمندہ تھی، نادم تھی۔وہ اس محبت سے نفرت کرتی تھی۔جبکہ باجی اس محبت میں سرشار تھیں، خوش تھیں۔

وہ اس فرق کے اسباب پر غور کرنے لگی۔اسے خوشی ہوئی کہ وہ باجی سے بہتر ہے۔وہ ایک مشرک اور کافر سے محبت پر مجبور ہوگئی ہے تو کم از کم اپنی اس مجبوری سے نفرت تو کرتی ہے۔وہ اپنے محبوب سے نفرت کرنے کی کوشش تو کرتی ہے۔وہ بھی اللہ کی خاطر۔باجی نے تو خود کو اس محبت کے سپرد کردیا ہے۔انہوں نے تو سپردگی اوڑھ لی ہے۔وہ تاویلیں گھڑتی ہیں۔جواز ڈھونڈتی ہیں۔یہ نہیں سوچتیں کہ عربی پڑھنے سے انسان مسلمان نہیں ہوجاتا۔مشرک اور کافر تو عربوں میں بھی تھے۔اور عربی ان کی مادری زبان تھی۔اور قرآن کی تلاوت سننے سے بھی کوئی مسلمان نہیں ہوجاتا۔

یوں اپنے موقف پر اس کا یقین اور بڑھ گیا۔

مگر آج ثابت ہوگیا کہ باجی درست تھیں اور وہ غلطی پر تھی۔لیکن باجی یہ دن دیکھنے کے لئے موجود نہیں تھیں۔وہ ہوتیں تو کتنی خوش ہوتیں۔اسے اپنی بہت اچھا گمان رکھنے والی، محبت کرنے والی سیدھی سچی بہن پر اس لمحے بہت پیار آیا جو اب اس دنیا میں نہیں تھی۔اسے رونا آگیا۔

پھر اسے خیال آیا کہ وہ جسمانی طور پر ہی نہیں، صورت شکل میں ہی نہیں، باطنی طور پر بھی باجی کی ضد تھی۔اس نے گمان اچھا نہیں رکھا۔اس نے محبت جیسی خوب صورت چیز کو بھی بدصورت بنادیا۔وہ کھل کر اسے برا کہتی رہی۔اس سے پہلے نہ اس کے بعد، اس نے کبھی کسی ہندو کو برا نہیں کہا تھا۔مشرک اور کافر تضحیک کرنے کے انداز میں نہیں کہا تھا۔بری بات یہ تھی کہ وہ اپنی مذمت کرنے سے بچنے کیلئے اسے برا کہتی تھی، اس کی توہین کرتی تھی۔اللہ اسے معاف کرے۔اسی لئے تو کہا جاتا ہے کہ کافر کو بھی کافر نہ کہو۔اسلئے کہ نہیں معلوم، کب اللہ کی ہدایت اسے نصیب ہوجائے

اس کی نگاہوں میں پھر وہ منظر پھر گیا۔سماعت میں پھر وہ آوازیں گونجنے لگیں۔وہ اور شرمندہ ہوگئی۔چھوٹا ٹھاکر ایمان پر پیدا نہیں ہوا تھا۔

(جاری ہے)

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

مگر وہ اللہ کی روشن دلیل پر ایمان لایا تھا۔ وہ اس کے مقابلے میں کتنی چھوٹی اور حقیر ہے۔ اور الٹا اسے حقیر سمجھتی رہی۔ اس نے تو اللہ کی بین اور روشن دلیلیں ہزاروں بار پڑھی تھیں۔ مگر انہیں نہ کبھی اس طرح سمجھا تھا اور نہ ان سے اپنے ایمان کو تازہ اور مستحکم کیا تھا۔

پھر اچانک اس کے وجود میں اطمینان اور خوشی کی ایک لہر اٹھی۔ اس نے سوچا، اب تو مجھے اس محبت پر شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب تو میں اسے محترم سمجھ کر بھی محبت کر سکتی ہوں۔ اب تو سلیقے سے..... محبت کی طرح محبت کی جا سکتی ہے۔

اندر سے کسی حریص جذبے نے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں..... اب کوئی رکاوٹ بھی نہیں۔ اب وہ تمہیں مل سکتا ہے''۔

اور نور بانو تڑپ گئی۔ وہ پھر رونے لگی۔ بہنیں رکاوٹ نہیں ہوتیں۔ وہ بڑبڑائی۔ بہنوں کو تو اپنے حصے کی بڑی سے بڑی خوشی دی جا سکتی ہے۔ اور میں تو خود اپنی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ میں کیا ہوں..... کیسی ہوں۔ میں تو چاند کی بس آرزو کر سکتی ہوں.....

اسی وقت رابعہ اس کے پاس آ گئی۔ اس نے اسے نماز کے لئے چند چھوٹی چھوٹی سورتیں یاد کرانے کا وعدہ کیا تھا۔ پھر وہ زبیر کو یاد کراتی۔

بے چین، مضطرب اور شرمندہ نور بانو کے لئے اس وقت صرف اس کام میں سچی خوشی اور روحانی سکون تھا۔ وہ رابعہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔

.....x.....

عبدالحق نے بہت اہتمام سے وضو کیا۔

اسے یاد تھا، جن دنوں وہ حق کی جستجو کر رہا تھا، اسے قرآن پاک کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ لیکن ہر ایک نے یہ بھی کہا تھا کہ پاک ہوئے بغیر اس کتاب مقدس کو چھونا بھی بڑا جرم ہے۔ کیسے اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ قرآن پڑھے۔ لیکن دس مسوس کر رہ جاتا تھا۔ مگر آج وہ مبارک دن تھا کہ اس کی یہ آرزو پوری ہونے والی تھی۔

وضو کر کے وہ اٹھا تو اسے خیال آیا کہ اس کے پاس قرآن پاک تو ہے ہی نہیں۔ وہ ابھی بازار چلا جاتا۔ لیکن اس میں دیر لگتی۔ اور یہ اسے گوارا نہیں تھا۔ وہ بہت بے صبرا اور بے تاب ہو رہا تھا۔

اس نے رابعہ کو آواز دی۔ ساتھ ہی اسے حیرت ہوئی..... کیسی عجیب بات ہے کہ وہ زبان پر چڑھا ہوا اس کا پرانا نام بھول چکا ہے اور اس نئے نام سے اسے پکار رہا ہے۔ یہ یقیناً اللہ کی مہربانی ہے۔ اس نے دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔

رابعہ آئی تو اس نے کہا۔ ''منجھلی بی بی سے کہو کہ مجھے قرآن پاک چاہئے''۔

رابعہ نور بانو کے پاس چلی گئی۔

نور بانو جواب میں بے ساختہ کہنے والی تھی کہ نیچے اسٹور روم میں موجود ہیں۔ وہاں سے لے لیں۔ لیکن وہ ایک لمحہ اس کے لئے بہت طویل ہو گیا۔ اس نے اپنا قرآن پاک جو وہ گزشتہ روز ہی نیچے سے لائی تھی، رابعہ کو دے دیا۔ ''لو..... یہ انہیں دے آؤ''

اس ایک لمحے میں نور بانو نے کتنا کچھ سوچ لیا۔ اس کا جی چاہا کہ چھوٹے ٹھاکر کو باجی کا قرآن پاک دیا جائے۔ مگر اس نے فوراً ہی اس سوچ سے نظریں چرا لیں۔ ہونا تو یہی چاہئے تھا۔ کیونکہ اوپر اس کے اپنے پاس یہی قرآن پاک تھا۔ مگر اس نے وہی دے دیا۔

''ایسا کیوں؟''۔ اس کے اندر کسی نے پوچھا۔

''وہ پڑھیں گے تو مجھے بھی ثواب ملے گا''۔ اس نے سادگی سے کہا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ بات صرف اتنی سی نہیں۔ لیکن وہ اس پر گہرائی میں جا کر سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے سوچا، میں نیچے سامان لینے جاؤں گی تو اور قرآن پاک بھی لے آؤں گی۔

ادھر قرآن پاک کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے عبدالحق کا دل اس عاشق کی طرح دھڑک رہا تھا، جو پہلی بار اپنے محبوب سے ملنے والا ہو۔

اس نے قرآن پاک لیا، اسے چوما، آنکھوں سے لگایا اور کھولا

اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ واہ..... اس نے سوچا۔ ہر کام کرنے سے پہلے یہ پڑھ لینا چاہئے..... بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

اب اس کے سامنے سورہ فاتحہ تھی۔ بابا نے کہا تھا کہ اس کی تلاوت کے بغیر کوئی رکعت مکمل نہیں ہو سکتی۔ اور ہر رکعت میں اس کے بعد ایک چھوٹی سورت کی تلاوت کرنی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ مجھے پندرہ چھوٹی سورتیں یاد ہونی چاہئیں۔ لیکن یہ تو بہت مشکل کام ہے۔

اللہ چاہے تو کوئی کام مشکل نہیں۔ اندر سے ایک آواز ابھری۔ دیکھ لو، اس نے تمہیں، زبیر اور رابعہ کو ایمان عطا فرما دیا۔ یہ کوئی آسان کام تھا۔

بے شک، یہ سچ ہے۔ عبدالحق نے کہا اور دل میں اللہ کو پکارا۔ ''میری مدد کیجئے اے اللہ۔ میرا کام آسان کر دیجئے۔ اپنا کلام میرے حافظے پر نقش کر دیجئے''۔

اس نے دوبارہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھا اور پہلی آیت کی طرف بڑھا۔ نجانے کیوں اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس پر کائنات کے، زندگی کے تمام راز اور علوم کھلنے والے ہیں۔

اس کا دل دھڑک رہا تھا اور پیشانی سے پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔

تعریف اللہ کے لئے ہے جو رب ہے تمام جہانوں کا.....

پہلی ہی آیت نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔ ارے..... میں کہتا تھا کہ یہ مربوط نظام کسی ایک ہستی نے قائم کیا ہے، جو بہت زبردست ہے۔ میں تو ایک عالم کی بات کرتا تھا..... صرف اس دنیا کی۔ وہ تو پہلی ہی آیت میں بتا رہا ہے کہ یہ کائنات بے شمار جہانوں پر مشتمل ہے، جن کا تمہیں علم ہی نہیں۔

اسے اقبال کا مصرعہ یاد آیا..... ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

اور تعریف اللہ کیلئے ہے! صرف اللہ کے لئے؟ کسی اور کے لئے نہیں! اور ہم جو کسی کی تعریف کرتے ہیں..... وہ بہت اچھا انسان ہے..... تو یہ نہیں کہنا چاہئے؟

اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے دماغ میں بے شمار مشینیں ہیں..... گراریاں ہیں جو حرکت کر رہی ہیں۔ کوئی بہت بڑا بھید، بہت بڑا راز عیاں ہونے کی کوشش کر رہا ہے

تعریف صرف اللہ کے لئے ہے.....!

اگلے ہی لمحے وہ تھرا کر رہ گیا۔ اس پر کپکپی چڑھ گئی۔ یہ اللہ کا کلام ہے۔ ایک دن میں کہا، ایک برس میں، ایک عمر میں بھی نہیں سمجھ میں آئے گا۔ بابا نے کہا، عاجزی سے پڑھنا، ایک ایک لفظ پر غور کرنا اور اللہ سے رہنمائی طلب کرنا۔ تو یہ تو عمر بھر کا کام ہے۔ پہلے پڑھنا تو سیکھ لے۔ پھر غور کرنا۔

اسے خیال آیا کہ ابھی تو اسے کم از کم پندرہ سورتیں یاد کرنی ہیں۔ پہلے سورہ فاتحہ یاد کر لے۔ پھر بابا نے کہا تھا..... آخری پارے میں چھوٹی سورتیں ملیں گی۔

وہ پڑھنے لگا۔ ہر آیت پر اس کا دل اٹکتا تھا۔ وہ غور کرنا چاہتا تھا۔ مگر وہ خود کو دھکیل کر آگے بڑھا دیتا تھا۔

بہت مہربان، نہایت رحم والا۔ مالک روز جزا کا۔ تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ دکھا ہمیں راستہ سیدھا۔ راستہ ان کا کہ جن پر تو نے انعام کیا۔ نہ کہ ان کا جو بھٹکنے والے اور گمراہ ہیں۔

اب وہ یاد کرنے کی غرض سے بار بار پڑھ رہا تھا۔ ایک بات اس نے بہت اچھی طرح سمجھ لی تھی۔ اسے قرآن پاک سے محبت ہو گئی ہے۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

دہراتے ہوئے اس نے دیکھے بغیر اگلی آیت پڑھی تو اس کے جسم میں خوش گوار سنسنی دوڑ گئی۔ ارے..... کیا مجھے یاد ہو گیا۔ اس نے جانچنے کیلئے قرآن پاک سے نظریں ہٹائیں اور آگے پڑھنے کی کوشش کی۔ روانی کے ساتھ نہ سہی، مگر اگلی آیت بھی اسے یاد ہو گئی تھی۔ شاید کمی صرف زبان پر رواں ہونے کی تھی۔

چھ سات بار دہرانے کے بعد اس نے خود کو پھر آزمایا۔ اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ اسے سورہ فاتحہ روانی کے ساتھ یاد ہو چکی تھی۔ یہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ عاجزی سے زیر لب بولا۔ یہ اللہ کی مہربانی ہے۔

اگلے صفحے پر سورہ بقرہ اسے پکار رہی تھی۔ اس کا دل مچل اٹھا۔ لیکن اس نے خود کو روکا۔ پہلے نماز کے اسباب مکمل کر لوں۔ پھر پڑھوں گا..... اور اللہ نے جتنی زندگی دی، اتنا ہی پڑھوں گا۔ اس نے کہا۔ مگر بے صبرا پن ٹھیک نہیں۔

اس نے تیسواں پارہ کھولا۔ شروع میں تو بڑی سورتیں تھیں (اس وقت تک اس نے بڑی سورتیں دیکھی ہی نہیں تھیں۔ وہ تو بس سورہ فاتحہ سے موازنہ کر رہا تھا) اس نے دیکھا کہ سورتیں بتدریج چھوٹی ہو رہی تھیں۔ آخر اس نے پیچھے سے یاد کرنے کا فیصلہ کیا۔

ایک گھنٹے بعد اس نے پھر اللہ کا شکر ادا کیا۔ وہ دن ہی شاید مبارک دن تھا۔ ایک گھنٹے کے اندر اسے سولہ سورتیں یاد ہو گئیں۔ وہ روانی سے یاد ہوئی تھیں۔ مگر پڑھتے ہوئے وہ کبھی کبھی اٹکتا تھا۔ اس نے سوچا، کوئی بات نہیں۔ میں پڑھتا رہوں گا تو روانی سے یاد ہو جائیں گی۔ اور جب نماز میں پڑھوں گا تو اعتماد بھی بڑھ جائیگا۔

اس نے رابعہ کو بلایا۔ ''منجھلی بی بی کے ساتھ نیچے جاؤ۔ ان سے کہنا، بہت ضروری اور قیمتی سامان الگ باندھ لیں۔ کل صبح سویرے ہم روانہ ہوں گے''۔

.....x.....

اس بار نور بانو نیچے گئی تو جیسے سب کچھ بدل چکا تھا!

اب وہ پچھلی بار والا خوف نہیں تھا۔ نگاہوں میں اس رات کے وہ خوف ناک مناظر نہیں پھر رہے تھے۔ ہاں، ان کی یاد تھی، جو دھیمے انداز میں دکھی کر رہی تھی۔ مگر وہ دکھ نارمل تھا۔ آدمی جب اپنے لوگوں کو کھوتا ہے تو اسے دکھ ہوتا ہے۔ پچھلی بار دکھ تو کم تھا، دہشت زیادہ تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ اپنی بقا کی طرف سے خوف زدہ اور عدم تحفظ کا شکار تھی۔

صرف دو دن میں یہ تبدیلی آئی تھی۔

اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اسے بہت زیادہ سامان نہیں لینا ہے۔ صرف بہت ضروری چیزیں اور ایسی قیمتی چیزیں لینی ہیں، جو بہت زیادہ جگہ نہ گھیرتی ہوں۔ بنیادی ضرورت کی چیز تو کپڑے تھے..... اور اس کی کتابیں۔

اس نے کپڑوں کا صندوق کھولا تو سب سے پہلے اسے وہ کرتے نظر آئے جو اماں نے، باجی نے اور خود اس نے اوتار سنگھ کے لئے کاڑھے تھے۔ پہلی بار وہ انہیں دیکھ کر خوش ہوئی۔ عبدالحق اب ان تحفوں کا..... اور اس محبت کا جو ان کرتوں میں چھپی تھی، پوری طرح مستحق تھا۔

اس نے کرتوں کو گنا تو حیران ہوئی۔ وہ نو کرتے تھے، دس نہیں۔ ایک کرتا کہاں گیا؟ اس نے پورا صندوق الٹ پلٹ کر دیا۔ مگر دسواں کرتا موجود ہی نہیں تھا۔ پاجامے البتہ پورے دس تھے۔

اس نے ایک ایک کرتے کا جائزہ لیا۔ اپنا کرتا تو وہ بہت اچھی طرح پہچانتی تھی۔ بھول ہی نہیں سکتی تھی۔ اس نے جب کیفیت میں اس کی ترپائی اور کڑھائی کی تھی، وہ بھولنے والی بات ہی نہیں تھی۔ اور وہ کرتا موجود تھا۔

ذرا دیر میں اسے اندازہ ہو گیا کہ باجی کا کاڑھا ہوا کرتا کم ہے۔ سوال یہ تھا کہ وہ کہاں گیا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کا جواب اسے کبھی معلوم نہیں ہوگا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ بے کسی کی موت کے بعد وہ کرتا ہی باجی کی آبرو کا پردہ دار بنا تھا۔ اور وہ کرتا خود اس نے منہ پھیرتے ہوئے باجی کے جسم پر ڈالا تھا، جس کے لئے بڑی چاہت سے باجی نے اسے کاڑھا تھا۔

اس نے وہ کپڑے اس صندوق میں رکھ دیئے، جس میں لے جانے والا سامان رکھنا تھا۔ اس کا کاڑھا ہوا کرتا سب سے اوپر تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ رابعہ دالان میں بیٹھی تھی۔ وہ اس کے ساتھ محض دوسرا ہٹ کیلئے آئی تھی۔ اسے اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ کیا رکھ رہی ہے اور کیا چھوڑ رہی ہے۔

اسے خوشی تھی کہ اسے تنہائی میسر ہے۔ اس نے اس کرتے کو بڑی محبت سے چھوا۔ اس وقت اس کے چہرے پر جو رنگ تھے، وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی انہیں دیکھے۔ اور وہ اس وقت کو یاد کرنا چاہتی تھی، جب اس نے وہ کرتا کاڑھا تھا۔ مگر اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ اس وقت تو اسے جلد از جلد سامان پیک کرنا تھا۔ اس کے بعد افطار کی تیاری کرنی تھی۔

وہ کپڑوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ پہلے اس نے اپنے عام استعمال کے کپڑے نکالے۔ پھر اچھے کپڑوں کا خیال آیا۔ اماں تھوڑا تھوڑا کر کے تینوں بیٹیوں کی شادی کی تیاری کرتی رہی تھیں۔ جب جب موقع ہوتا، وہ ایک ایک جوڑا بنا کر اس صندوق میں ڈال دیتیں۔ ہر بیٹی کا انہوں نے الگ صندوق بنا رکھا تھا۔

اس نے اپنا صندوق کھولا اور اس میں سے تمام چیزیں نکال لیں۔ اس کا ارادہ تھا کہ دونوں بہنوں کی کسی چیز کو بھی ہاتھ نہیں لگائے گی۔ مگر پھر اس نے سوچا کہ ان کے زیورات نکال لینے چاہئیں۔ پاکستان جا کر وہ کسی ضرورت مند کو دے دے گی۔ اللہ بہنوں کو اجر دے گا۔

اس نے گلنار کے صندوق سے زیورات نکال لئے۔ پھر وہ باجی کے صندوق کی طرف متوجہ ہوئی۔ زیورات نکالتے ہوئے باجی کے ایک کام دانی کے جوڑے پر اس کی نظریں جم گئیں اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ جوڑا نکال کر اپنے سامان میں رکھ لے۔ لیکن وہ ہچکچا رہی تھی۔ مری ہوئی بہن کی کوئی ذاتی چیز لینا اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مگر دل اسے چھوڑنے کو مان ہی نہیں رہا تھا۔ نجانے کیوں وہ جوڑا اسے بہت اہم لگ رہا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس کی اہمیت وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

وہ ہچکچاتی رہی۔ لیکن نہ وہ صندوق کے پاس ہٹی، نہ ہی اس نے صندوق بند کیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ سب چیزیں جو وہاں چھوڑ جائے گی، نجانے کس کو ملیں گی۔ ضروری تو نہیں کہ کوئی مستحق ہی ہو۔ پھر یہ ایک جوڑا لینے میں حرج ہی کیا ہے۔

خاصی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے وہ جوڑا اپنے سامان میں رکھ لیا۔

اماں کی تجوری میں اماں کے زیورات کے علاوہ نقد رقم بھی تھی۔ اس نے وہ تمام چیزیں بھی سامان میں رکھ لیں۔ اب صرف کتابوں کا مرحلہ رہ گیا تھا۔ کتابیں سب دینی اور علمی تھیں۔ یہ حقیقت اس پر پوری طرح روشن تھی کہ کتابیں وہ عبدالحق کی وجہ سے لے جانا چاہتی ہے۔ اس سے زیادہ عبدالحق کو ان کتابوں کی ضرورت تھی۔

ہر طرف سے مطمئن ہو کر اس نے رابعہ کو آواز دے لی۔

.....x.....

عشا کے بعد وہ سب سونے کے لئے لیٹ گئے۔ دن بھر ان میں سے کسی نے ایک جھپکی بھی نہیں لی تھی اور صبح انہیں سفر کے لئے نکلنا تھا۔

مگر عبدالحق کی آنکھوں میں اب بھی نیند کا نام و نشان تک نہیں تھا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

اس نے ایک ایسا دن گزارا تھا، جس میں اسے نہ اپنی خبر تھی، نہ گردوپیش کا احساس تھا۔ بلکہ گزشتہ رات سے ہی اس کی یہ کیفیت تھی۔ اسے سوچنے کی تو فرصت ہی نہیں ملی تھی۔

جو کچھ ہوا تھا، بہت تیزی سے ہوا تھا اور ایک دن میں اتنا کچھ ہو گیا تھا کہ جو برسوں میں بھی نہیں ہوتا۔ برسوں سے جو کچھ وہ سمجھنے اور جاننے کی کوشش کر رہا تھا، وہ اس نے صرف ایک لمحے میں سمجھ لیا تھا اور جان لیا تھا۔ برسوں سے جس چیز کی وہ جستجو کر رہا تھا، وہ صرف ایک لمحے میں اسے مل گئی تھی۔ اور کیسی سچی چیز تھی وہ کہ اس کا سینہ اس نے روشن کر دیا تھا۔

اسے ایسی خوشی کا احساس ہوا، جو بہت بڑی تھی۔ ایسی خوشی جس کا اسے پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اس کا پورا وجود اس خوشی سے بھر گیا..... چھلکنے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ اسے اور باہر نکل جائے اور چیخ چیخ کر سب کو..... ہر شخص کو، وہ شناسا ہو یا اجنبی، اپنی اس خوشی کے بارے میں بتائے..... ارشمیدس کی طرح، جس نے پانی میں غوطہ لگاتے ہوئے کثافت کا راز سمجھا تو اتنا خوش ہوا کہ میں نے جان لیا..... میں نے سمجھ لیا..... میں نے پالیا کے نعرے لگاتا ہوا پانی سے نکل آیا تھا اور اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ وہ بے لباس ہے۔

لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ وہ اپنی اس خوشی سے محظوظ ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے اندر ہی اندر اس خوشی سے کھیل سکتا تھا۔

اچانک اسے خیال آیا۔ بابا نے کہا تھا..... پہلے اللہ کا شکر ادا کیجئے۔ پھر بندے کو شکریہ کہئے۔ اس میں کوتاہی شرک ہے۔ اور اللہ شرک پر کبھی معاف نہیں کرتا۔

وہ اس پر غور کرنے لگا۔ یہ تو وہ جانتا تھا کہ اللہ نے اسے بڑی نعمت عطا فرمائی ہے۔ بہت بڑا کرم ہوا ہے اس پر۔ یہ کسی کے بتانے کی بات نہیں تھی۔ یہ احساس تو اس کے وجود کے اندر پہلے ہی سے موجود تھا۔ مگر اسے لگ رہا تھا کہ بابا کی بات میں سمندر کی سی گہرائی ہے۔ بڑے معنی چھپے ہیں اس میں۔

لیکن اس وقت وہ ارتکاز سے محروم تھا۔ غور نہیں کر پا رہا تھا۔ اس نے اس خیال سے دامن چھڑا لیا۔

اللہ کا شکر تو اسے ادا کرنا تھا..... اور ساری زندگی ادا کرنا تھا۔ وہ دل میں اللہ کا شکر ادا کرتا رہا۔ پھر اچانک اسے اپنی ایک پرانی..... دیرینہ آرزو یاد آئی۔ برسوں سے وہ سوچتا تھا..... وہ اوپر والا ہی تو ہے، جس نے زندگی سمیت بے شمار نعمتیں عطا کی ہیں۔ وہی سب سے زیادہ محبت کا حق دار ہے۔ انسان کو سب سے بڑھ کر اس سے محبت کرنی چاہئے۔ اور وہ چاہتا تھا کہ اس سے محبت کرے۔ اسی لئے تو وہ اس کی جستجو کر رہا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ وہ اسے سمجھے گا نہیں، جانے گا نہیں تو محبت کیسے کرے گا۔

اور اب اس نے رحمت فرمائی تھی۔ اس نے اسے اپنا راستہ دکھا دیا تھا۔ اسے خود سے متعارف کرا دیا تھا۔ اب تو وہ اس سے محبت کر سکتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اسے بے بسی کا نہایت شدید احساس ہوا۔ اس بے بسی کے دو رخ تھے۔ ایک تو یہ تھا کہ تعارف ہو تو ہو گیا۔ لیکن وہ اب بھی اسے کتنا جانتا ہے..... کچھ بھی نہیں؟ کچھ بھی تو نہیں! ساتھ ہی اسے یہ احساس بھی ہوا کہ اس کی عظمت تو ایسی ہے کہ جاننے والے بھی شاید یہ دعویٰ نہ کر سکیں کہ اسے جانتے ہیں۔ پھر یہ تسلی بھی ہوئی کہ اب اسے راستہ تو دکھا دیا گیا ہے۔ اب وہ جاننے کی کوشش کر سکتا ہے..... اور وہ بھی درست سمت میں۔ اور محبت تو اسے اپنے پیدا کرنے والے سے ہے اور وہ کرتا رہے گا۔

بے بسی کا دوسرا رخ یہ تھا کہ وہ اس سے محبت کیسے کرے۔ محبت کوئی اظہار کرنے کا..... زبان سے یہ کہتے رہنے کا نام تو ہے نہیں کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ یہ سچ ہے کہ محبت کرنے والوں کو دنیا میں بے عمل اور ناکارہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر درحقیقت محبت عملی چیز ہے۔ اس کا اظہار زبان کے بجائے عمل سے ہی اچھا لگتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ الل سے کیسے محبت کرے۔

بے بسی کے عالم میں اس نے سوچا کہ آدمی اپنے جیسے کسی آدمی سے محبت کرے تو کیا کرتا ہے۔ کوشش کرتا ہے کہ جو کچھ اسے اچھا لگتا ہو، وہ اسے دے۔ وہ کام کرے جو اسے پسند ہوں۔ وہ کام نہ کرے جو اسے ناپسند ہوں۔ اس کی خوشی میں خوش ہو۔ اس کی ہر مرضی پوری کرے۔

پھر اس نے سوچا کہ اللہ کو کچھ دینے کا تو سوال ہی نہیں۔ سب کچھ اللہ کا ہی ہے۔ اور اللہ تو دینے والا ہے۔ ہر ضرورت سے پاک اور بے نیاز۔ ہاں..... وہ کام کئے جائیں، جو اللہ کو پسند ہیں اور وہ کام نہ کئے جائیں جو اسے ناپسند ہوں۔ اللہ کے ہر حکم کی تعمیل کی جائے۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ بہت تیز دوڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ابھی تو اسے ہدایت پائے چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے۔ اتنا تیز دوڑنے میں کوئی لغزش نہ ہو جائے۔ کوئی گمراہی مسلط نہ ہو جائے! ابھی تو اسے قرآن پڑھنا ہے..... پڑھتے رہنا ہے اور سمجھنا ہے۔ پھر اس کی سمجھ میں آنے لگے گا۔

بابا نے کہا تھا..... یاد رکھنا، قرآن اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، جو انسان کو عطا کی گئی اور انسان پر قرآن کے چار حقوق ہیں۔ اسے پڑھو۔ اس کو سمجھو۔ اس پر عمل کرو اور اسے دوسروں تک پہنچاؤ۔ یہ سفر بہت طویل ہے اور زندگی اسی لئے دی گئی ہے۔

اس نے سوچا، وہ خوامخواہ جلد بازی کر رہا ہے۔ برسوں وہ جستجو کرتا رہا..... بھٹکتا رہا۔ اس کی کوشش سے کچھ نہ ہوا۔ اور اللہ نے عنایت کی تو ایک لمحے میں اتنا کچھ ہو گیا۔ اسے بس ترتیب سے قرآن پاک کے چاروں حقوق ادا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اللہ کو جب منظور ہو گا تو وہ اسے محبت کرنا بھی سکھا دے گا۔

لیکن اس کے جسم میں سنسنی دوڑ رہی تھی۔ اس کی کیفیت ہیجانی تھی۔ ایسے میں خود کو سوچنے سے روکنا آسان نہیں تھا۔ اس وقت تو نیند ہی اس کا مسئلہ حل کر سکتی تھی۔ اور نیند اسے آ نہیں رہی تھی۔

ہیجان اس بات کا تھا کہ اس دن کے ایک ایک لمحے میں اس کے لئے ایسی لذت اور سرشاری تھی، جس سے وہ اس سے پہلے ناواقف تھا۔ اور اس لمحے کی لذت تو وہ بھول ہی نہیں سکتا تھا، جب اس نے کلمہ پڑھا تھا۔ اس وقت گردوپیش میں ایسی روشنی تھی، جس کا حسن وہ بیان ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے کہ ایسی روشنی اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ ارضی روشنی تو تھی ہی نہیں۔ وہ تو کوئی آسمانی چیز تھی۔ اور اس میں کیسی ٹھنڈک اور کیسا سکون تھا۔ اور پھر وہ روشنی اپنی ٹھنڈک اور سکون سمیت اس کے جسم میں اترنے لگی تھی، اور نجانے کیسے اسے یہ قدرت حاصل ہو گئی تھی کہ وہ اپنے جسم کے اندر جھانک سکتا اور اس نے حیرت سے دیکھا تھا کہ اس کا وجود ویسا ہی روشن ہو گیا تھا، جیسا گردوپیش تھا۔ بلکہ باہر اندھیرا چھانے لگا تھا اور اندر روشنی اتنی بڑھتی جا رہی تھی کہ نگاہیں چندھیانے لگی تھیں۔ وہی وہ لمحہ تھا، جب اس کا وجود سکون اور طمانیت سے بھر گیا تھا۔ دماغ سے ہر خیال، ہر سوچ مٹ گئی تھی۔ سکون اور طمانیت کے سوا کوئی احساس باقی نہیں رہا تھا۔ اسے نیند آنے لگی تھی۔ اور اس نیند میں انوکھی اور ناقابل بیان لذت تھی، جسے وہ اب بھی محسوس کر سکتا تھا۔ لیکن بیان نہیں کر سکتا تھا۔ اسے یاد تھا کہ ان لمحوں میں جب اس پر نیند طاری ہو رہی تھی، اس نے اپنے اندر جھانکتے ہوئے اپنے دل کو دیکھا تھا، وہ اتنا روشن لگ رہا تھا کہ اس کی طرف دیکھنا محال تھا، اور اس روشنی کا کم از کم کوئی زمینی رنگ نہیں تھا۔ وہ رنگ لگ تو رہا تھا، لیکن ویسا رنگ اس نے کبھی دیکھا نہیں تھا اور اس کے دل سے رنگ برنگی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

پھر اس کے بعد اسے ہوش نہیں رہا تھا اور وہ سو گیا تھا۔

اور جب وہ جاگا تو.....؟ وہ یاد کر رہا تھا..... اور اسے یاد آ رہا تھا۔ وہ جاگا تو اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بہت طویل، بہت اچھی اور پر لذت نیند کے بعد بیدار ہوا ہے۔ اس کا دماغ تر و تازہ اور روشن تھا۔ اس کی جسمانی کیفیت بھی یہی تھی۔ یہ بات اس کے لئے اب بھی نا قابل یقین تھی کہ وہ محض چند لمحے سویا تھا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ یہ حقیقت ہے۔ تو وہ کیسی نیند تھی؟ اور اب اسے نیند نہیں آ رہی تو کیا اس لئے کہ ان لمحوں میں وہ کئی راتوں کی نیند پوری کر چکا ہے؟

وہ وقت یاد کرتے ہوئے اس وقت بھی اس کے رگ و پے میں کیف و انبساط دوڑ رہا تھا۔ بڑی لذت تھی اس یاد میں بھی۔ اس نے سوچا، کیوں نہ شروع سے وہ سب یاد کروں۔

اس نے یاد کرنا شروع کیا.....

وہ اپنی لاٹھی اٹھائے گلی میں ٹہل کر پہرہ دے رہا تھا کہ اس نے وہ آواز سنی.....

اس سے آگے وہ کچھ نہیں سوچ سکا۔ وہ بری طرح چونکا تھا۔ پھر وہ اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ارے..... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں!

اپنے کمرے میں نور بانو بھی جاگ رہی تھی!

جو کرتا اس نے اس وقت کے چھوٹے ٹھاکر کے لئے اپنے ہاتھوں سے کاڑھا اور سیا تھا، اس وقت اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اس کے ایک ایک ٹانکے کو، کڑھائی کئے ہوئے ایک ایک پھول کو بڑی محبت سے سہلا رہی تھی۔ کرتا کیا تھا، وہ تو اس کے لئے یادوں کا خزانہ تھا..... ایسی یادوں کا خزانہ، جو کبھی اس کے لئے ناخوش گوار تھیں۔ مگر اب خوش گوار ہو گئی تھیں۔ اب وہ یاد کر سکتی تھی۔

اس نے جس وقت اماں سے کہا کہ ایک کرتا وہ کاڑھے گی تو اسے گمان بھی نہیں تھا کہ وہ کرتے چھوٹے ٹھاکر کے لئے کاڑھے جا رہے ہیں۔ وہ تو یہ سمجھی تھی کہ اماں ابھی سے گھر کے لوگوں کے لئے گرمی کا سامان کر رہی ہیں۔

اسے یاد تھا کہ جب اماں نے بتایا کہ وہ تمام کرتے چھوٹے ٹھاکر کے لئے کاڑھے جا رہے ہیں تو وہ کیسے کھسیائی تھی۔ اور باجی نے کیسے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اور انہوں نے کہا تھا۔ ''اتنے کرتے..... چھوٹے ٹھاکر کے لئے! اور ایک کرتا نور بانو بھی کاڑھے گی''۔

وہ اس لمحے انکار کرنے والی تھی۔ لیکن جانتی تھی کہ اس صورت میں بہنیں اس کا مذاق اڑائیں گی۔ سو اس نے دل پکا کر کے بظاہر بے پروائی سے کہا تھا ''کرتا کاڑھنے میں کیا برائی ہے۔ وہ تو میں ضرور کاڑھوں گی''۔

باجی نے جھٹ سے کہا تھا..... اماں، ایک کرتا میں بھی کاڑھوں گی۔

اور اماں نے بس ان کی محبت میں اجازت دے دی تھی۔ ورنہ وہ اس کام میں کسی کا ساجھا نہیں چاہتی تھیں۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

اس نے کہہ تو دیا تھا۔ مگر شروع میں اس کا دل ہی نہیں چاہا۔ اس نے سوچا تھا، وہ کرتا کاڑھے گی ہی نہیں۔ اور آخر میں اماں تنگ آ کر اس سے کرتا واپس لے لیں گی۔

لیکن پھر اس نے باجی کو کرتا کاڑھتے دیکھا تو اسے کچھ ہونے لگا۔

اس نے دیکھا تھا کہ باجی کرتے پر کڑھائی کرتی ہیں تو بالکل اکیلے میں..... تنہائی میں۔ اس وقت جب گھر کے سب لوگ مصروف ہوتے ہیں۔ وہ خود بھی کسی کتاب کے مطالعے میں کھوئی ہوئی ہوتی تھی۔ وہ تو اس روز وہ پانی پینے کے لئے نہ اٹھی ہوتی تو اسے بھی پتا نہیں چلتا۔

اٹھی تو وہ پانی پینے کے لئے تھی۔ مگر نجانے کیوں وہ دالان میں چلی گئی۔ وہاں باجی تخت پر بیٹھی کرتے پر کڑھائی کر رہی تھیں۔ اور ان کے انہماک کا یہ عالم تھا کہ وہ کھڑی انہیں دیکھتی رہی اور انہیں اس کی موجودگی کا احساس تک نہیں ہوا۔

اور وہ منظر بہت عجیب، بہت خوب صورت تھا۔ باجی کے چہرے پر جیسے دھنک کے تمام رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ ایک بار انہوں نے آنکھیں اٹھا کر بھی دیکھا تو ان کی آنکھوں میں وہی رنگ نظر آئے۔ لیکن یہ بھی ثابت ہو گیا کہ وہ کچھ دیکھ نہیں رہی تھیں۔ کیونکہ انہوں نے اسے بھی نہیں دیکھا جو ان کی نگاہوں کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ تو جیسے کچھ اور ہی دیکھ رہی تھیں۔ اور ان کی آنکھوں کی کیفیت، ان کے تاثرات بتاتے تھے کہ وہ کوئی بہت حسین منظر دیکھ رہی ہیں۔ پھر انہوں نے نظریں جھکائیں اور دوبارہ کرتے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

نور بانو مبہوت ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ باجی نے اسے دیکھ کر بھی نہیں دیکھا۔ دیکھ لیا ہوتا تو وہ، وہ کچھ نہیں کرتیں، جو انہوں نے بعد میں کیا۔ نور بانو تو بس سحر زدہ سی انہیں دیکھتی رہی۔ باجی ویسے ہی بہت خوب صورت تھیں۔ مگر اس وقت تو آسمان سے اتری ہوئی کوئی حور لگ رہی تھیں۔ اور ان کے چہرے پر ایسی پاکیزگی تھی کہ اس کی قسم کھائی جا سکتی تھی۔

وہ باجی کو دیکھتی رہی۔ باجی نے کپڑے کو بڑی محبت اور نرمی سے چھوا..... سہلایا۔ پھر ان کے ہونٹ ہلے۔ لیکن آواز سنائی نہیں دی۔ پھر انہوں نے ایک ٹانکا لگایا۔ پھر اس ٹانکے کو سہلایا۔ اور ان کے ہونٹ دوبارہ ہلے۔

وہ حیرت سے دیکھتی رہی۔ چند لمحوں میں اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ سب باجی کا معمول ہے، جسے وہ دہراتی ہیں۔ وہ کپڑے کو سہلاتیں، دھاگے کو سہلاتیں، سوئی کو چومتیں، ٹانکا لگاتیں اور پھر ٹانکے کو سہلاتیں۔

اچانک نور بانو کے اندر شدید غصہ ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ باجی اس کرتے کی ہر چیز کو اپنی محبت سونپ رہی تھیں۔ اور ان کا انداز ایسا تھا، جیسے وہ عبادت کر رہی ہوں۔

اس کا جی چاہا کہ وہ باجی کو جھنجوڑ کر رکھ دے۔ لیکن وہ ان سے بدتمیزی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ وہاں سے ہٹ آئی۔

لیکن اب کتاب میں اس کا دل نہیں لگا۔ اسے رہ رہ کر وہ منظر یاد آ رہا تھا جو اس نے دالان میں دیکھا تھا۔ اور غصے کے باوجود وہ یہ اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی کہ وہ بے حد خوب صورت منظر تھا..... خوب صورت، اور پاکیزہ۔ اور اس میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ اس زمین کا کوئی منظر نہیں لگ رہا تھا۔ اس میں کوئی غیر ارضی بات تھی۔

اس نے سوچا، کیا محبت اتنی پاکیزہ اور اتنی خوب صورت ہوتی ہے۔ صرف محبت کی بات ہوتی تو اسے اتنی حیرت نہ ہوتی۔ مگر یہ تو ایک کافر، ایک مشرک کی محبت تھی۔ اور وہ محبت اس کے پاس بھی تھی۔ مگر وہ اس پر شرمندہ رہتی تھی..... اور اسے یقین تھا کہ اس کی شرمندگی بجا ہے۔ بلکہ کم ہے۔ تو باجی کو شرمندگی کا احساس کیوں نہیں ہوتا؟

وہ اپنی اس شرمندگی پر فخر کرتی رہی تھی..... اور باجی کی ڈھٹائی پر انہیں برا سمجھتی رہی تھی۔ مگر وہ منظر دیکھنے کے بعد وہ سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ خوب صورتی اللہ کی عطا ہے..... ہر اچھی چیز کی طرح۔ اللہ نے باجی کو حسین..... بہت حسین بنایا۔ یہی تو اسے شکایت تھی اللہ سے کہ اسے نظر انداز کر دیا۔ مگر اس کرتے پر کڑھائی کرتے ہوئے باجی جتنی خوب صورت تھیں، اس سے ہزار گنا خوب صورت لگ رہی تھیں۔ تو یہ بات واضح تھی کہ خوب صورتی میں وہ اضافہ اس محبت کی وجہ سے تھا، جو وہ اس وقت چھوٹے ٹھاکر کے لئے محسوس کر رہی تھیں اور جس کے زیر اثر وہ اس وقت چھوٹے ٹھاکر کے کرتے پر کڑھائی کر رہی تھیں۔ اور وہ اضافی خوب صورتی بھی اللہ کی عطا تھی۔ وہ اسے شیطان کی دین تو نہیں کہہ سکتی تھی۔ یہ سوچتے ہوئے بھی اس پر لرزہ چڑھنے لگا تھا۔ تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اللہ کو باجی کی چھوٹے ٹھاکر سے محبت پر کوئی اعتراض نہیں۔ بلکہ وہ اللہ کے ہاں مقبول ہے۔ اس لئے تو انعام کے طور پر باجی کی خوب صورتی بڑھ گئی۔

اس بات نے اسے الجھا دیا۔ اللہ بہت غفور الرحیم ہے۔ لیکن مشرک کو وہ کبھی معاف نہیں کرے گا۔ پھر یہ عنایت کیسی؟ تو کیا یوں ہے کہ محبت، پاکیزہ ہو تو وہ اللہ کے ہاں مقبول ہوتی ہے، خواہ کسی مشرک سے کی جائے۔ مگر اس خیال سے وہ لرز کر رہ گئی۔ یہ تو یقینی طور پر فاسد خیال ہے۔ مگر باجی کی ان لمحوں کی خوب صورتی کی وہ چشم دید گواہ ہے۔ اسے ڈر لگنے لگا۔ اس کی سوچیں گمراہی کی طرف جا رہی تھیں۔ اس نے انہیں ذہن سے جھٹک دیا۔ کیسی عجیب بات ہے۔ وہ اللہ کی خاطر اپنی محبت سے منہ موڑ رہی ہے اور پھر بھی عذاب میں ہے۔ اور باجی اللہ کیلئے بھی اپنی محبت نہیں چھوڑتیں اور پرسکون اور خوش ہیں۔ یہ کیسا انصاف ہے۔ بس یہ ہے کہ اللہ نے باجی کو ہر معاملے میں نوازا ہے اور اسے نظر انداز کیا ہے۔ باجی کو گناہ پر بھی انعام ملتا ہے۔ اس نے جل کر سوچا۔

مگر وہ فوراً ہی ڈر گئی۔ یہ اللہ کے بارے میں وہ کیسے سوچ رہی ہے۔ اس نے دل میں توبہ کی اور سوچا، بس یہ محبت کا کمال ہے۔ ثابت ہو گیا کہ محبت بہت خوب صورت اور طاقت ور جذبہ ہے۔

اس کے بعد اسے باجی سے شدید رقابت محسوس ہونے لگی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی باجی کا رویہ اپنائے گی۔ چھوٹے ٹھاکر کے معاملے میں اپنی محبت کا گلا نہیں گھونٹے گی۔ چپکے چپکے اس سے محبت کرے گی اور اس کی محبت سے نہیں لڑے گی۔

لیکن عملی طور پر یہ ناممکن ثابت ہوا۔ وہ چھوٹے ٹھاکر سے محبت تو کرتی تھی۔ مگر اس محبت کو قبول کر لینا، خود کو اس کے سپرد کر دینا اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ وہ کافر تھا..... مشرک تھا، اس نے باجی کی دلیلوں کو استعمال کرنے کی کوشش کی۔ مگر بات نہیں بنی۔ کیا ہوا جو وہ عربی سیکھتا ہے۔ کیا ہوا، جو وہ قرآن پاک کی تلاوت سنتا ہے، اس کے باوجود ہے تو وہ مشرک ہی۔

بس اس نے باجی کی ضد میں ایک فیصلہ کر لیا۔ وہ چھوٹے ٹھاکر کیلئے کرتا کاڑھے گی اور اس میں اپنی پوری محبت سمو دے گی۔ اس میں کوئی برائی نہیں۔ ہاں..... وہ ترک محبت کی کوشش بھی کرتی رہے گی اور اس میں ناکامی پر شرمندہ بھی ہوتی رہی گی۔

تب اس نے کرتے پر کڑھائی شروع کی اور بڑی محبت سے کی۔ کرتے کا ایک ایک ٹانکا، ایک ایک پھول اس کی محبت کا گواہ تھا۔ پہلی بار اس نے اپنی دبی ہوئی، کچلی ہوئی محبت کو ابھرنے کا موقع دیا تھا تو وہ پوری شدت سے ابھری تھی۔ اس محبت کی گرمی، گداز، نزاکت اور سچائی سب اس کرتے میں منتقل ہو گئی تھی۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

اماں نے کرتا دیکھا تھا تو بہت خوش ہوئی تھیں۔ان کا خیال تھا کہ اس نے محض مروت میں، بے دلی کے ساتھ کام کیا ہے تو اتنا خوبصورت کام کیا ہے۔طبیعت سے کرے گی تو کتنا اچھا کریگی۔

اور اس نے کہا تھا۔''آپ غلط سمجھ رہی ہیں اماں۔کام تو میں نے محبت سے ہی کیا ہے۔اور کام محبت سے کیا جائے تو عبادت ہوتا ہے''۔یہ آخری جملہ کہتے وقت اس کے تصور میں کرتا کاڑھتی ہوئی باجی کا سراپا لہرا گیا تھا۔

کرتا مکمل کرنے کے بعد وہ پھر پہلے جیسی ہوگئی تھی۔وہ اکثر سوچتی اور کڑھتی کہ اس کا اتنی محبت سے کاڑھا ہوا کرتا ایک مشرک پہنے گا۔یہ تو بڑی زیادتی ہوگی۔

اور اب اس وقت وہ اسی کرتے کو بڑی محبت اور فخر سے سہلا رہی تھی۔اس کے پاس چھوٹے ٹھاکر کیلئے ایک یہی کرتا تو تھا جو اچھا تھا۔باقی تو سب کچھ برا ہی تھا.....بہت برا۔وہ تو کبھی وقت پڑنے پر اس کے سامنے محبت کا دعوا بھی نہیں کرسکتی تھی۔وہ اسے کیسے بتاتی کہ وہ اسے کیا سمجھتی رہی ہے.....اور وہ بھی اس سے محبت کرنے کے باوجود۔

اس نے کرتے کو محبت سے چوم لیا۔مجھے خوشی ہے کہ یہ کرتا ایک مومن پہنے گا۔وہ بڑبڑائی۔

اور اب وہ سوچ رہی تھی کہ اماں ٹھیک ہی کہتی تھیں۔کافر کو کافر اور مشرک کو مشرک نہ کہو۔اس کیلئے اللہ سے ایمان کی دعا کرو۔کون جانے، اللہ کب اسے ہدایت سے نواز دے اور اسے تم سے زیادہ ہدایت یافتہ بنادے۔

یہ سوچتے ہوئے اس کا احساس کم تری اور بڑھ گیا۔وہ جسے کافر اور مشرک کہتی تھی، اسے اللہ نے ایمان عطا فرمایا اور کیسے مبارک وقت میں عطا فرمایا۔رمضان المبارک کی پہلی شب!اور جس انداز میں ایمان عطا فرمایا، وہ اس کی عینی شاہد تھی۔چھوٹے ٹھاکر نے عربی پڑھی تھی اور سمجھتا تھا۔اس نے اللہ کی روشن آیات سنیں، سمجھیں، سر اٹھا کر ان کی تصدیق کی اور ان کی سند پر ایمان لایا۔خالص ایمان.....بغیر کسی لالچ کے.....صرف اللہ کے لئے!اور کیسے وہ بزرگ اس کی مدد کیلئے آیا۔یقیناً اللہ اس پر بہت مہربان ہے۔

اور وہ اس کے سامنے کتنی حقیر، کتنی چھوٹی ہوگئی ہے!

اچانک اسے خیال آیا، اس وقت اماں موجود ہوتیں تو کتنی خوش ہوتیں۔اور باجی ہوتیں تو.....؟اس کا دل کٹنے لگا، ارے.....یہ تو باجی کا حق تھا۔انہیں کیسا یقین تھا کہ وہ اسلام کی طرف مائل ہے۔اسی لئے تو وہ اپنی محبت پر کبھی شرمندہ نہیں ہوئیں۔انہوں نے اپنی محبت کو بڑے فخر سے سنبھال کر رکھا لیکن باجی ہوتیں تو میں.....؟

اس سے آگے اس نے خود کو سوچنے سے روک دیا۔کوئی فرق نہیں پڑتا۔وہ بڑبڑائی۔اب باجی نہیں ہیں تو بھی میرے لئے کوئی امکان نہیں ہے۔میں اس قابل ہوں بھی کہاں۔صورت شکل بھی اچھی نہیں۔اور اس کی تحقیر بھی کرتی رہی ہوں میں۔بس میں تو یہ کرتا اسے دے سکتی ہوں۔

اب اسے نیند آنے لگی تھی۔

اس نے سوچا، مجھے باجی کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔محبت کرنا انہی سے تو سیکھ سکتی ہوں میں۔کچھ ملنے کا امکان ہو نہ ہو، مجھے اب محبت کرنے کا سلیقہ تو سیکھنا چاہئے۔اور یہ محبت میں نے ارادے سے کب کی ہے۔یہ تو مجھے زبردستی سونپی گئی ہے۔مجھے اس سے کیا غرض کہ عبدالحق مجھے کبھی نہیں مل سکیں گے۔مجھے تو اس توہین کا ازالہ کرنا ہے جو میں محبت کی اور اپنے محبوب کی کرتی رہی ہوں۔اور باجی کو بھی کوئی ملنے کی امید تو نہیں تھی۔بس محبت انہیں سونپ دی گئی اور وہ اسے بڑے سلیقے سے، بڑی محبت سے کرتی رہیں۔باجی یقیناً اندر سے بھی بہت روشن رہی ہوں گی۔آدمی کے لئے تو بس یہی بہتر ہے کہ جو کچھ اسے دیا جائے، اس سے بہترین طور پر استفادہ کرنے کی کوشش کرے۔

یہی سب کچھ سوچتے سوچتے وہ سوگئی!

.....X.....

ہیجان سے تو وہ گزشتہ رات سے ہی دوچار تھا۔پورے دن جسم میں خوش گوار اور کیف آمیز سنسنی دوڑتی رہی تھی۔مگر اس وقت وہ ہیجان اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔اسے خیال ہی ایسا آیا تھا!

وہ اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا!

ارے.....یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔یہی ایک خیال اس کے ذہن میں اس پرندے کی طرح چکرا رہا تھا، جو کسی کمرے میں بند ہوگیا ہو اور گھبرا کر پر پھڑپھڑاتا ہوا اڑ رہا ہو۔لیکن اسے نکلنے کا موقع نہیں مل رہا ہو۔

وہ آواز.....وہ آواز!وہ تو وہی آواز تھی، جو اس نے پہلی بار سنی تھی تو اسے آواز والی سے محبت ہوگئی تھی۔وہ آواز، جو بعد میں اس سے چھن گئی تھی۔لیکن اس کی سماعت میں گونجتی رہتی تھی۔وہ آواز جس نے اسے دنیا کے حسن سے اور ریٹا پارسن کی خوف ناک ترین ترغیبات سے بے نیاز کردیا تھا۔وہی آواز تو تھی، جس کی ڈور سے بندھا گزشتہ رات وہ بے اختیار کوٹھے پر کھنچا چلا گیا تھا۔

ہاں.....وہ وہی آواز تھی۔اور بے اختیاری کے ابتدائی لمحوں میں اسے اس کا احساس بھی ہوا تھا۔لیکن اس کے بعد وہ اب تک اس بات کو بھولا رہا تھا۔

وہ بے قرار ہوگیا۔اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔تو وہ لڑکی زندہ ہے.....وہ منجھلی بی بی ہے۔وہ اس کا نام نہیں جانتا۔لیکن وہ زندہ ہے۔

اسے یاد تھا۔دو لڑکیوں کی تدفین کے موقعے پر اس نے سوچا تھا کہ شاید وہ آواز والی ان دونوں ہی میں سے کوئی ایک ہے۔اور اس خیال سے اس کے دل میں ایسا غم ابھرا تھا کہ زندگی اسے بے معنی لگنے لگی تھی۔

مگر اس وقت.....!اس وقت شاید اسے زندگی کی سب سے بڑی خوشی ملی تھی۔

اس خوشی کے سحر سے نکلنے میں اسے کچھ دیر لگی۔جب وہ سوچنے کے قابل ہوا تو اسے خیال آیا کہ یہ کتنی غیر معمولی بات ہے کہ تقریباً چوبیس گھنٹے بعد اسے یہ احساس ہوا۔اسے اس آواز کے بارے میں یاد ہی نہیں آیا۔یہ کیسی محبت ہے؟کیا یہ محبت میں کمی کی، اس کی اہمیت کم ہونے کی یا اہمیت بالکل ختم ہونے کی دلیل ہے؟

آخری بات تو غلط ثابت ہوگئی۔اندر ابھرنے والی خوشی اتنی بڑی تھی کہ وہ خود اس محبت کی زندگی اور اہمیت کی دلیل تھی۔

عبدالحق تو شروع ہی سے غور کرنے والا، تجزیہ کرنے والا ذہن رکھتا تھا۔وہ اتنی بڑی بات کو نظر انداز نہیں کرسکتا تھا۔وہ آواز کو سننے کے لمحے سے لے کر آخر تک دہرانے لگا۔

آواز سنتے ہی وہ آواز کی سمت لپکا تھا۔اس لمحے اسے احساس تھا کہ یہ وہی آواز ہے، جس کی خاطر اس نے عربی سیکھی تھی۔جس نے اسے محبت کرنا سکھایا تھا۔مگر اس کے بعد وہ آواز کہیں پیچھے چلی گئی تھی اور اس پر ازخود رفتگی کی کیفیت طاری ہونے لگی تھی۔اور اوپر پہنچتے پہنچتے وہ ایک خاص کیفیت میں آگیا تھا، جس میں اسے نہ اس آواز کا خیال تھا اور نہ گردوپیش تھا۔اور وہ ازخود رفتگی ایسی مکمل تھی کہ وہ اوپر کوٹھے پر پہنچ کر ہی رکا تھا۔اگر وہ ذرا بھی ہوش میں ہوتا تو پردہ دار لڑکی کو اوپر دیکھ کر ایک لمحہ بھی وہاں نہ رکتا۔خاموشی سے نیچے چلا آتا۔لیکن اسے تو کسی بات کا احساس ہی نہیں تھا۔

اور اسے یاد تھا۔آواز کہیں پیچھے.....بہت پیچھے چلی گئی تھی۔وہ صرف الفاظ سن رہا تھا۔اس وقت وہ ایسی حالت ارتکاز میں تھا کہ اس کے لئے کائنات میں ان لفظوں کے سوا کچھ نہیں رہا تھا۔اور وہ ایک ایک لفظ کا مطلب صاف اور واضح طور پر سمجھ رہا تھا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

اور وہ ایک ایک لفظ کا مطلب صاف اور واضح طور پر سمجھ رہا تھا۔

وہ آیات اسے اب بھی مفہوم سمیت یاد تھیں۔ وہ تو جیسے اس کے دل پر کندہ ہوگئی تھیں۔ آج بھی جب وہ کوٹھے پر گیا تو اس نے آسمان کو دیکھا۔ وہ آیات پڑھیں اور آسمان کی طرف انگشت شہادت اٹھاتے ہوئے گواہی دی۔ اشھد ان لا.....

اسے یقین تھا کہ اب زندگی بھر وہ جب بھی آسمان کو دیکھے گا تو یہی کرے گا۔ لیکن شاید اب وہ سات آسمان کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔ وہ تو اللہ نے اس پر رحمت فرمائی تھی..... اسے ایمان عطا فرمانے کے لئے!

تو اس وقت وہ بس وہ الفاظ سن رہا تھا..... سمجھ رہا تھا اور ان کی تصدیق کر رہا تھا۔ پھر اس کے اندر کسی نے اسے ڈانٹا تھا..... کیا تو اب بھی کلمہ نہیں پڑھے گا۔ تب وہ جھٹکے سے ہوش میں آیا تھا۔ ورنہ تو اسے یہ بھی ہوش نہیں تھا کہ کلمہ کیا ہوتا ہے..... اور یہ کہ اسے کلمہ یاد ہے۔

یہ سب کچھ یاد کرتے ہوئے اچانک عبدالحق کی آنکھیں پھیل گئیں۔ بالکل ہی اچانک اسے ادراک ہوا تھا کہ اللہ نے اس رات اس پر صرف یہی عنایت نہیں کی کہ اسے ایمان سے نوازا۔ اللہ نے اس پر ایک اور بڑی رحمت فرمائی۔ ورنہ وہ ساری زندگی ایک بہت بڑی خلش میں مبتلا رہتا۔ اللہ نے عنایت فرمائی کہ ہدایت کے ان لمحوں میں اس آواز کو بیچ سے ہٹا دیا۔

اب وہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ محبت کی کمی نہیں تھی۔ بلکہ اللہ کی رحمت تھی۔ اور اب وہ اس کی حکمت کو بھی سمجھ سکتا تھا۔

اچھا ہوا کہ آواز درمیان سے ہٹ گئی۔ رابطہ الفاظ بنے..... اللہ کے الفاظ..... ورنہ وہ اس آواز سے..... آواز والی سے کیسی محبت کرتا تھا۔ اسے ہمیشہ یہ خلش ستاتی کہ اس نے اس آواز کی وجہ سے..... آواز والی کی محبت میں ایمان قبول کیا۔ ارے، وہ تو اس احساس کو کبھی مٹا ہی نہیں سکتا تھا۔ اور اس بات کی بڑی اہمیت تھی۔ جب زبیر نے اسلام قبول کرنے کا کہا تو اسی منجھلی بی بی نے کہا تھا..... یہ تو آپ کی محبت میں ایمان لا رہے ہیں۔ اللہ کی محبت میں، دل کی گہرائیوں سے کوئی ایمان لائے تو مسلمان ہوتا ہے۔ تو یہ بات اسے بھی سننی پڑتی اور سننی نہ بھی پڑتی تو اس کا ضمیر تو اسے ہمیشہ ملامت کرتا۔ اپنا ایمان اس کی نظروں میں ہمیشہ مشتبہ رہتا۔ اللہ نے اسے کتنی بڑی خرابی سے بچالیا۔

اور بات اتنی سچی تھی کہ چوبیس گھنٹے بعد اسے پہلی بار اس آواز کا..... اور آواز والی کا خیال آیا تھا۔

وہ دل ہی دل میں شکر ادا کرنے لگا۔

لیکن چند لمحے بعد سنسنی اس کے وجود میں موج در موج اٹھی۔ پہلی بار شعوری طور پر اسے پوری طرح اس بات کا ادراک ہوا، اس بات کی اہمیت اس پر اجاگر ہوئی کہ وہ جس سے محبت کرتا ہے، نہ صرف اس کی آواز موجود ہے۔ بلکہ وہ زندہ ہے۔

سینے میں اس کا دل خوشی سے ناچنے لگا۔ وہ زندہ ہے۔ اسی کے پاس ہے۔ بلکہ وہ اس کے ساتھ اس کے گاؤں جا رہی ہے۔ اور اب اس کے اور اس کی محبت کے درمیان کوئی رکاوٹ نہیں۔ اب اللہ نے اسے ایمان دے دیا ہے۔ اب وہ ہر طرح سے اس کے قابل ہے۔ اس میں کوئی کمی نہیں۔

لیکن ہوسکتا ہے، وہ مجھے پسند نہ کرے۔ دل میں اچانک ایک وسوسے نے سر اٹھایا۔ یہ محبت تو دل کا سودا ہوتا ہے۔ اچھا ہونا ایک بات ہے۔ اور دوسروں کو اچھا لگنا دوسری بات۔

تو کیا ہوا، اس نے بے پروائی سے سوچا۔ مجھے اس سے کیا۔ محبت کوئی تجارت تو ہے نہیں کہ اس کی قیمت بھی وصول کی جائے۔ میں کب کہتا ہوں کہ وہ بھی مجھ سے محبت کرے۔ میرے لئے تو یہ خوشی بہت ہے کہ وہ زندہ سلامت رہے اور خوش رہے۔

باقی رات اس میں گزر گئی۔ وہ پہلی بار آزادانہ اپنی محبت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اور اس میں بڑی لذت تھی!

.....X.....

نور بانو خواب دیکھ رہی تھی!

یہی گھر تھا۔ مگر بڑی گہما گہمی تھی۔ اماں بھی موجود تھیں، دونوں بہنیں بھی اور چھمن بوا بھی۔ اور گھر مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ یقیناً کوئی تقریب تھی..... بڑی تقریب! مگر اس کی سمجھ میں تقریب کی نوعیت نہیں آ رہی تھی۔

چھمن بوا ادھر سے ادھر بھاگتی پھر رہی تھیں۔ کام بہت تھے اور سب انہی کو نمٹانے تھے۔ حور بانو مہمانوں کو دیکھ رہی تھی۔ مگر ان میں اسے ایک بھی جانا پہچانا چہرہ نظر نہیں آیا۔ ہاں..... یہ ضرور تھا کہ تمام مہمانوں کے چہرے غیر معمولی طور پر روشن تھے۔

چھمن بوا اس کے پاس سے گزریں تو اس نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ ''چھمن بوا..... میری بات تو سنیں''۔

''کیا ہے بٹیا۔ جلدی سے کہو۔ دیکھتی نہیں ہو، کتنا کام ہے''۔

''مجھے یہ تو بتا دیں کہ یہ تقریب کیسی ہے؟''۔

چھمن بوا نے اسے شکایتی نظروں سے دیکھا۔ ''اتنی مصروفیت میں مذاق اچھا نہیں لگتا بٹیا۔ تم ہم سے پوچھ رہی ہو کہ یہ تقریب کیسی ہے''۔

''مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ مجھے سچ مچ پتا نہیں ہے''۔

''بس بنو مت''۔ یہ کہہ کر بوا نے ہاتھ چھڑایا اور آگے بڑھ گئیں

نور بانو حیرت سے انہیں جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ یہ کیسی بات کر رہی ہیں بوا۔ ان کا انداز تو ایسا ہے جیسے مجھے معلوم ہونا چاہئے۔

اتنے میں اماں اس کی طرف چلی آئیں۔ ''ارے نور بانو..... تم یونہی بیٹھی ہو۔ تیار ہو جاؤ نا''۔

''مگر یہ تو بتائیں اماں کہ یہ کیسی تقریب ہے؟''۔

اماں نے بھی اسے شکایتی نظروں سے دیکھا۔ ''لو..... ہم اتنی دور سے تمہاری تقریب میں شرکت کے لئے آئے ہیں اور تم ہم سے تقریب کے متعلق پوچھ رہی ہو''۔

نور بانو تقریب کو بھول گئی اور اتنی دور سے آنے کے بیان میں الجھ گئی۔ ''کتنی دور سے آئی ہیں آپ؟''۔ اس نے معترضانہ لہجے میں کہا۔ ''آپ تو یہیں رہتی ہیں اماں''۔

''تم بھول گئیں۔ ہم اب یہاں نہیں رہتے۔ ہم سب تو یہاں سے چلے گئے تھے''۔

خواب میں نور بانو کو اس سانحے کی یاد آئی اور اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ''مجھے یاد آ گیا اماں۔ ظالموں نے آپ سب کو مار دیا تھا''

''نہیں..... مارا نہیں تھا''۔ اماں مسکرا دیں۔ ''ہم مرے تھوڑا ہی ہیں۔ ہم تو زندہ ہیں۔ شہید کبھی نہیں مرتے''۔

''شہید!'' نور بانو نے حیرت سے دہرایا۔

''ہاں۔ ہم نے تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ اللہ اپنی رحمت سے ہمیں یہ مرتبہ عطا فرمائیں گے۔ ہم اس قابل کہاں تھے۔ بس اللہ نے ہم سب کو نواز دیا''۔ اماں نے کہا۔ ''اسی لئے تو ہم سب تمہیں اتنے خوش نظر آ رہے ہیں۔ یہ تو ہم تمہاری محبت میں یہاں آ گئے۔ ورنہ ہم تو اتنی خوب صورت جگہ رہتے ہیں کہ اسے چھوڑنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ اتنی نعمتیں ہیں وہاں اللہ کی۔ اور ایسی عزت اور ایسا سکون ہے کہ ہم نے کبھی تصور میں بھی نہیں سوچا تھا''۔

''لیکن اماں، میں تو یہاں اکیلی رہ گئی''۔ نور بانو نے اداس ہو کر کہا۔ ''مجھے بھی ساتھ لے چلیں نا''۔

''بھئی اللہ کی مشیت یہی ہے۔ اس میں بندے کی مرضی تو نہیں چلتی''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

''آپ وہاں خوش ہیں۔اور میں یہاں ناخوش بھی ہوں اور اکیلی بھی''۔نور بانو کے لہجے میں شکایت در آئی۔

''تم یہ ناشکرا پن چھوڑ دو..... یہ ہر وقت ہر بات پر شکایت''۔اماں کے لہجے میں فہمائش تھی۔''اللہ اتنا مہربان ہے تم پر۔رحمت فرماتا ہے،نعمتیں عطا فرماتا ہے۔اور اب تم نہ اکیلی رہو گی نہ ناخوش۔ہم اسی لئے تو آئے ہیں یہاں''۔

نور بانو کا ذہن پھر الجھنے لگا۔اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔''کس لئے؟''۔

''ارے اس تقریب کیلئے.....اور کس لئے''۔اماں نے جھنجلا کر کہا۔

بات پھر وہی آ کر رک گئی۔''اور یہ تقریب کیسی ہے،یہ آپ بتا نہیں رہیں''۔نور بانو بھی جھنجلا گئی۔

''ارے تمہیں یہ بھی نہیں معلوم۔آج تمہاری شادی ہو رہی ہے''۔اماں نے کہا۔پھر دوسری طرف رخ کر کے پکارا۔''اے حور بانو.....گلنار۔کہاں ہو بھئی۔کیا کر رہی ہو جلدی سے آؤ نا''۔وہ پھر نور بانو کی طرف مڑیں۔''بس یہ غیر ذمے داری اور سستی ان کی مجھے بہت بری لگتی ہے''۔

نور بانو نے ان کی بات نہیں سنی۔اس کا دماغ جیسے سن ہو گیا تھا۔اس کی شادی ہو رہی ہے!مگر کس سے؟

اتنی دیر میں دونوں بہنیں بھی اس کے پاس آ کھڑی ہوئیں۔''جی اماں؟''۔

''کتنی غیر ذمے داری کی بات ہے''۔اماں نے انہیں ڈانٹا۔''اب یہ کیا خود دلہن بنے گی؟تم لوگوں کی کوئی ذمے داری نہیں ہے؟''

''تو اماں،اسی کی تو فکر کر رہے تھے ہم''۔حور بانو نے کہا۔''یہ جوڑا مل ہی نہیں رہا تھا۔بڑی مشکل سے ملا ہے.....انہی محترمہ کے صندوق میں سے''۔

نور بانو شرمندہ ہو گئی کھسیا کر بولی.....''مجھے اچھا لگا تھا باجی۔میں نے سوچا،اب تم تو پہنو گی نہیں۔اس لئے میں نے رکھ لیا''۔

''اچھا کیا نور۔یہی تو تمہارا شادی کا جوڑا ہے۔چلو،اب تمہیں تیار کرا دیں''۔حور بانو نے خوش دلی سے کہا۔

''تم لوگ جلدی کرو۔میں ذرا مہمانوں کو دیکھ لوں''۔اماں نے کہا اور کمرے سے چلی گئیں۔

اسی لمحے باہر کسی نے کہا۔ارے.....برات نہیں آئی اب تک؟''

''آ گئی ہے۔دولہا میاں مسجد گئے ہیں.....شکر کے نفل ادا کرنے''

نور بانو اداس ہو گئی۔تو آج چھوٹے ٹھاکر کا کانٹا ہمیشہ کے لئے نکل رہا ہے۔اس نے سوچا۔پھر حیرت سے سوچا،کانٹا نکلنے میں اداسی کیسی۔مگر اسے رونا آنے لگا۔

''چلو نور،اب کپڑے بدل لو''۔حور بانو نے اس سے کہا۔''پھر ہم تمہیں تیار کر دیں تمہارے دولہا کے لئے''۔

''مجھے یہ تو بتا دو کہ میری شادی کس سے ہو رہی ہے؟''۔نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لہجے میں فریاد تھی۔

''ارے.....تمہیں نہیں معلوم۔تمہاری شادی عبدالحق سے ہو رہی ہے''۔

''کون عبدالحق؟''۔

''وہی عبدالحق جنہیں ہم پہلے چھوٹا ٹھاکر کہتے تھے''۔

نور بانو حیران رہ گئی۔مگر وہ بے حد خوش گوار حیرت تھی۔پھر اچانک اسے باجی پر ترس آنے لگا۔''لیکن باجی.....تم تو ان سے.....''

حور بانو نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔اسے جملہ پورا نہیں کرنے دیا۔''کچھ بھی نہیں کہنا۔ہم جہاں ہیں،وہاں ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔اسی لئے تو ہم یہاں تمہیں وداع کرنے آئے ہیں''۔

''لیکن باجی،تمہیں افسوس.....''۔

''بالکل نہیں ہو گا''۔حور بانو نے اس کی بات کاٹ دی۔''ہم جہاں ہیں،وہاں ایسی نعمتیں ہیں،ایسی خوشیاں ہیں،جن کا یہاں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔میں نے کہا نا کہ اب میرے لئے ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں''۔

''اور یہ تمہارا جوڑا.....''۔

''یہ ہم نے تمہیں سونپ دیا۔یہ بھی اور اپنی محبت بھی''۔حور بانو مسکرائی۔وہ بہت خوب صورت مسکراہٹ تھی۔ان میں سچی خوشی تھی۔''اب یہ تمہارا نکاح کا جوڑا ہے.....عروسی جوڑا''۔

''کیا میرے لئے نیا عروسی جوڑا نہیں بن سکتا تھا؟''۔نور بانو کے لہجے میں شکایت تھی۔

''دیکھو.....ایک تو بالکل اچانک ہو رہی ہے تمہاری شادی۔تیاری کا کوئی موقع نہیں ملا۔دوسرے تمہیں یہ جوڑا بہت پسند ہے۔تیسرے تمہیں معلوم نہیں کہ تم اس جوڑے میں کتنی حسین لگو گی''۔

''میں اور حسین!''۔نور بانو نے حقارت سے کہا۔

''خود دیکھ لینا۔بس اب کپڑے بدل لو''۔

نور بانو نے کپڑے بدلے۔باجی اور گلنار اسے تیار کرنے لگیں۔پھر حور بانو نے اسے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا کر دیا۔''لو.....خود دیکھ لو''۔

نور بانو نے نظریں اٹھا کر آئینے میں اپنے عکس کو دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہ ہے۔اسے تو جیسے جادو کے زور سے کسی نے یکسر بدل دیا تھا۔چہرے کے نقوش تو وہی تھے۔لیکن وہ بہت حسین لگ رہی تھی۔اس نے پیچھے کھڑی دونوں بہنوں کے عکس کو بھی دیکھا۔ان دونوں کے سامنے تو وہ ہمیشہ نوکرانی لگتی تھی۔لیکن آج وہ دونوں ہی اس کے سامنے پھیکی لگ رہی تھیں۔

''دیکھا۔آج تو ہم دونوں بھی تمہاری کنیز لگ رہی ہیں''۔حور بانو نے ہنس کر کہا۔

اسی وقت باہر کسی نے خوشی سے پکار کر کہا۔''برات آ گئی''۔

اماں کمرے میں آئیں۔انہوں نے اسے دیکھا تو خوش ہو کر بلائیں لینے لگیں۔''میں ہمیشہ فکر کرتی تھی کہ میری یہ بیٹی بہت معمولی شکل وصورت کی ہے۔اس کا کیا ہو گا۔میں بہت دعائیں کرتی تھی تمہارے لئے۔اللہ نے میری ہر دعا قبول کر لی۔تم تو ان دونوں سے بڑھ کر حسین لگ رہی ہو۔اور اللہ نے نصیب بھی اچھے کر دیئے''۔

اس نے شرما کر سر جھکا لیا۔

اماں نے اس کی پیشانی چوم لی۔''دیکھو نور بانو،میرے عبدالحق کا دل بھی کبھی میلا نہ ہونے دینا۔اللہ نے تمہیں بڑی نعمت عطا فرمائی ہے۔اس کی ہمیشہ قدر کرنا۔اسے خوش رکھنا۔اسے کبھی کسی شکایت کا موقع نہ دینا''۔

اسی وقت اسے نقاروں کی آواز سنائی دی اور اس کی آنکھ کھل گئی

خواب ایسا تھا کہ اس کا ٹوٹنا اسے برا لگا۔وہ چاہتی تھی کہ خواب کا سلسلہ وہیں سے جڑ جائے،جہاں سے ٹوٹا تھا۔اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔مگر اس سے سویا نہیں گیا۔

وہ لیٹی خواب کے بارے میں سوچتی رہی۔اسے اپنا سراپا یاد آیا۔مگر اس کے اندر خود اعتمادی پیدا کرنے کے بجائے اس نے اس کا احساس کم تری اور بڑھا دیا۔اس نے سوچا،خواب میں تو کچھ بھی ہو جاتا ہے۔اس کا حقیقت سے تو کوئی تعلق نہیں ہوتا۔خواب میں تو میری اس سے شادی بھی ہو گئی،جس سے میں محبت کرتی ہوں۔جبکہ حقیقت میں یہ ناممکن ہے۔مجھ جیسی لڑکیوں کے لئے تو خواب ہی ہوتے ہیں۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

لیکن اس خیال سے اسے خوشی ہورہی تھی کہ خواب میں باجی نے اپنے اس جوڑے کو اس کا عروسی جوڑا قرار دیا اور اپنی محبت بھی اسے سونپ دی۔ چند لمحے بعد وہ سحری بنانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ خیال آیا تو اس کا دل عجیب انداز میں دھڑکنے لگا کہ آج وہ یہ گھر چھوڑ کر کسی اجنبی جگہ کے لئے روانہ ہورہی ہے.....اور اسے ہندو عورت کے بھیس میں بے پردہ سفر کرنا ہے۔

.....x.....

عبدالحق نے اس سفر کے بارے میں بہت سوچا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ آسان سفر نہیں ہے۔ متعصب ہندو اور سکھ سفر کرنے والوں پر خاص طور پر گھات لگاتے تھے۔ ان کے پاس اس کی معقول وجہ بھی تھی۔ جو علاقے ہندوستان میں تھے، وہاں سے ہجرت کرنے والے صرف مسلمان ہی تھے۔ اور وہ ان علاقوں کی طرف جارہے تھے، جو پاکستان میں شامل ہوئے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ وہ اپنے گاؤں کا نام بھی نہیں لے سکتا تھا۔ اس صورت میں وہ مشتبہ قرار پاتا۔ کیونکہ جس گاؤں کا نام ونشان مٹ چکا ہو، وہاں کوئی کیوں جانا چاہے گا۔

رکاوٹیں اپنی جگہ، بہرحال انہیں تو وہاں جانا تھا۔ بابا نے کہا تھا کہ یہ حکم ہے۔ اب حکم ہے تو اسے تعمیل کرنی ہے۔

اس نے فیصلہ کیا کہ پہلے وہ جے پور جائیں گے۔ وہاں سے وہ اونٹ خرید کر ان کے ذریعے سفر کریں گے۔ اسے احساس تھا کہ اپنا گاؤں ڈھونڈنا بھی آسان نہیں ہوگا۔

سفر کی صبح ساتھ لے جانے والے سامان پر بھی بحث ہوئی۔ نور بانو کتابیں نکال کر الگ رکھ رہی تھی۔ وہ اس وقت ہندوانہ لباس میں تھی اور اس کی وجہ سے خاصی چڑچڑی ہورہی تھی۔

''یہ کیا ہے؟''۔ عبدالحق نے پوچھا۔

''قرآن پاک کے نسخے ہیں.....اور دینی کتابیں ہیں''۔ نور بانو نے جواب دیا۔

''تو یہ آپ الگ کیوں کررہی ہیں''۔

''ہم ہندوؤں کے بھیس میں سفر کررہے ہیں۔ یہ سب کچھ اپنے سامان میں کیسے رکھ سکتے ہیں''۔

''میں ان کا جائزہ لے سکتا ہوں؟''۔

''کیوں نہیں''۔

عبدالحق نے کتابوں کا جائزہ لیا اور خوش ہوگیا۔ ''یہ نعمت تو ہم نہیں چھوڑ سکتے۔ مجھے تو ان کی بہت ضرورت ہے''۔

''میں نے یہی سوچ کر نکالی تھیں۔ لیکن انہیں ساتھ رکھنا خطرناک ہوگا''۔ نور بانو نے کچھ جھجکتے، کچھ شرماتے ہوئے کہا۔

''کچھ بھی ہو۔ میں یہ سب کتابیں ضرور لے کر جاؤں گا''۔

''منجھلی بی بی ٹھیک کہہ رہی ہیں مالک''۔ زبیر بولا۔

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ ''انہیں کپڑوں میں لپیٹ کر رکھ لیں۔ میں انہیں نہیں چھوڑ سکتا''۔

نور بانو نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔ ''جیسی آپ کی مرضی''۔

''ایک ذاتی بات پوچھ سکتا ہوں آپ سے؟''۔ عبدالحق نے اس سے کہا۔

نور بانو پھر جھجکی۔ ''جی ضرور''۔

''آپ کا نام کیا ہے؟''۔

نور بانو کا چہرہ تمتما اٹھا۔ چند لمحے جھجکنے کے بعد اس نے کہا۔ ''نور بانو''۔

اوتار سنگھ نے اپنی خوشی چھپانے کے لئے سر جھکا لیا۔ کیسا خوب صورت نام ہے۔ اس نے دل میں سوچا۔

جے پور جانے کے لئے وہ گاڑی میں بیٹھے۔ سفر شروع ہوگیا۔

مگر دہلی شہر سے نکلتے ہی مسلح ہندوؤں اور سکھوں کے ایک جتھے نے گاڑی رکوادی۔ انہوں نے تمام مسافروں کو نیچے اترنے کا حکم دیا۔ وہ لوگ بھی گاڑی سے اتر آئے۔

سوال جواب ہونے لگے۔ کہاں جارہے ہو؟ کیوں جارہے ہو؟ کون ہو؟ نام کیا ہے؟ وہ پوچھتے اور جس سے مطمئن ہوتے، اسے گاڑی میں بھیج دیتے۔

نور بانو نے گھونگھٹ کاڑھ رکھا تھا۔ لباس بھی ایسا تھا، جیسے نئی نئی شادی ہوئی ہو۔

''میرا نام ٹھاکر اوتار سنگھ ہے''۔

''میں رگھو ہوں.....رگھبیر.....چھوٹے ٹھاکر کا سیوک۔ اور یہ میری پتنی ہے.....رنجنا''۔

''اور یہ کون ہے؟''۔

سوال نور بانو کے بارے میں تھا۔ اور عبدالحق جانتا تھا کہ ایک لمحے کی ہچکچاہٹ بھی نقصان دہ ثابت ہوگی۔ چنانچہ اس نے سوچے سمجھے بغیر بے ساختہ جواب دیا۔ ''یہ میری پتنی ہے.....لاجونتی''

گھونگھٹ کے اندر نور بانو کے چہرے پر حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ دل یوں دھڑکا، جیسے سینے سے نکل آئے گا۔

''اس کا گھونگھٹ تو اٹھاؤ مہاراج''۔

عبدالحق کے تیور بدلنے لگے۔ لاٹھی کی مٹھ پر اس کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ گھونگھٹ کی آڑ میں اس کی طرف دیکھتی ہوئی نور بانو نے بھانپ لیا کہ معاملہ بگڑنے والا ہے۔ اس نے جلدی سے گھونگھٹ اٹھادیا۔

عبدالحق سخت جواب دینے ہی والا تھا کہ نور بانو نے اسے حیران کردیا۔ وہ نور بانو کو دیکھتا رہ گیا۔

نور بانو نے گھونگھٹ تو اٹھادیا تھا۔ لیکن اتنے سارے مردوں کے سامنے پہلی بار بے حجاب ہوئی تھی۔ اس کی نظریں جھک گئیں۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔

''سچ مچ لاج والی ہے مترو''۔ روکنے والوں میں سے ایک نے دوسروں سے کہا۔

اب عبدالحق برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ ''اپنی حد میں رہو''۔ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ''ہم ٹھاکر لوگ جان لیتے زیادہ ہیں، دیتے کم ہیں''۔

بولنے والا کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن دوسرے نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ ''ہم اپنے لوگوں کو ستانے کے لئے نہیں نکلے ہیں''۔ وہ بولا۔

''ضروری نہیں کہ یہ اپنے ہی لوگ ہوں''۔

''کیا مطلب؟''۔

''مسلمان بچے نکلنے کے لئے ہندوؤں کا روپ بھی دھار لیتے ہیں''۔

''تو اب یہ کیسے پتا چلے گا؟''۔

''یہ کون سی مشکل بات ہے۔ الگ لے چل کر دیکھ لیتے ہیں۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی ہوجائے گا''۔ اس نے شیطنت بھرے لہجے میں کہا۔

بات عبدالحق کی سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن زبیر سمجھ گیا۔ تاہم عبدالحق کو یہ اندازہ ہوگیا کہ وہ کوئی ایسی بری بات ہے، جسے قبول کرنے پر وہ مرجانے کو ترجیح دے گا۔ لاٹھی کی مٹھ پر اس کی گرفت اور مضبوط ہوگئی۔

زبیر نے دوسرے شخص سے کہا۔ ''مہاشے.....آپ ذرا الگ چل کر میری ایک بات سن لیں''۔

''سننا سنانا کیا ہے۔ ہمیں تو دیکھنا ہے۔ کہو تو یہیں دیکھ لیں.....سب کے سامنے''۔ پہلے والے نے پھر مداخلت کی۔

زبیر نے اسے نظرانداز کردیا۔ ''میں دھرم کے نام پر بنتی کررہا ہوں مہاشے''۔

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

دوسرے شخص نے زبیر کا ہاتھ تھاما اور اسے ایک طرف لے گیا۔ ''اب بولو، کیا بات ہے؟''۔

''میرا مالک سوریہ ونشی راج پوت ہے۔ آن کے لئے جان لینا بھی جانتا ہے اور جان دینا بھی۔ آپ کا متران کا اپمان کئے جا رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ یہاں خون خرابہ ہو جائے گا''۔

''خون خرابہ!''۔ وہ مضحکہ لہجے میں بولا۔ ''تمہارے پاس ہے کیا؟ خون بھی تمہارا ہوگا اور خرابہ بھی''۔

''تم غلط سمجھ رہے ہو مہاشے۔ چھوٹے ٹھاکر کو لٹھیا کا ہنر آتا ہے۔ چالیس پچاس آدمی تو ان کے سامنے ٹھہر بھی نہیں سکتے''۔

اس کو یقین تو نہیں آیا۔ لیکن بہر حال وہ متاثر ہوا۔ ''تو تم کیا چاہتے ہو؟''۔

''مجھے جس طرح چاہو، دیکھ لو۔ لیکن چھوٹے ٹھاکر یہ اپمان برداشت نہیں کریں گے''۔

''چلو..... ٹھیک ہے''۔

اس دوران وہ شر پسند بھی ان کے پاس آ گیا تھا۔ ''جس کی وہ تجویز تھی۔ اس کے ساتھی نے کہا۔ ''لالو..... تو اسے دیکھ لے''۔

لالو زبیر کی طرف مڑا۔ ''چل..... دھوتی اوپر اٹھا''۔

چند لمحے بعد لالو نے اپنے ساتھی سے کہا۔ ''یہ ہندو ہی ہے''۔

''جاؤ مہاشے، گاڑی میں بیٹھ جاؤ''۔

یوں یہ مشکل مرحلہ آسان ہو گیا۔ زبیر کو پتا ہی نہیں تھا کہ اس نے اپنے مالک کو بہت بڑی مشکل سے بچا لیا ہے۔ خود عبدالحق کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ مرحلہ کتنا دشوار تھا۔

.....x.....

جے پور سے ان کے اصل سفر کا آغاز ہوا۔ انہوں نے چار اونٹ لئے تھے۔ ایک پر سامان تھا۔ دوسرے پر رابعہ اور نور بانو تھیں۔ عبدالحق اور زبیر باقی دونوں اونٹوں پر تھے۔ عبدالحق کو احساس تھا کہ نور بانو کیلئے وہ بہت تکلیف دہ سفر ہے۔ اس نے حتیٰ الامکان اسے آسان کرنے کی کوشش کی تھی۔ رابعہ کو اونٹ کا تجربہ تھا۔ اس لئے نور بانو اس کے ساتھ تھی۔

صحرا کا سفر اور وہ بھی دن میں..... بہت ہی دشوار ہوتا ہے۔ دھوپ ایسی ہوتی ہے کہ جسم کا پانی ختم ہو جاتا ہے۔ اور وہ سب تو روزے سے تھے۔ ریت دیکھ دیکھ کر ان کے جی اوب گئے۔

وہ سمت پوچھ کر چلے تھے۔ عبدالحق اپنے گاؤں کا حوالہ تو نہیں دے سکتا تھا۔ تاہم اس نے سندر پور کے حوالے سے راستہ پوچھا تھا۔ یہ قریب کا وہ گاؤں تھا، جو اس کی معلومات کے مطابق تباہی سے بچ گیا تھا۔

اب دھوپ کی تیزی ختم ہو رہی تھی اور وہ بہ تدریج پھیکی ہوتی جا رہی تھی۔ عبدالحق کو تشویش ہونے لگی۔ مسافت کا اسے خوب اندازہ تھا۔ اس کے خیال میں اب تک انہیں گاؤں پہنچ جانا چاہئے تھا۔ لیکن وہاں تو کوئی آثار ہی نہیں تھے۔

صحرا میں سورج بہت تیزی سے غروب ہوتا ہے۔ ابھی نظر آ رہا ہے اور ابھی غائب۔ اور ان کی تو زندگی ہی اس صحرا میں گزری تھی۔ زبیر نے عبدالحق سے کہا۔ ''مالک..... سانجھ ہو گئی ہے۔ ہمیں روزہ بھی کھولنا ہے''۔

''ابھی کچھ وقت ہے''۔ عبدالحق نے کہا۔ ''دیکھو..... شاید کوئی مناسب جگہ نظر آ جائے''۔

وہ چلتے رہے۔ کوئی پندرہ منٹ بعد انہیں کچھ فاصلے پر کھجور کے درختوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈ نظر آیا۔ ''چلو..... یہاں افطار کریں گے''۔ عبدالحق نے خوش ہو کر کہا۔

سب سے زیادہ خوشی نور بانو کو ہوئی تھی۔ اس سفر نے اس کا برا حال کر دیا تھا۔ اس کے انجر پنجر ڈھیلے ہو گئے تھے۔ جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں تھا کہ اترنے کے بعد وہ اپنے پیروں پر بھی کھڑی ہو سکے گی۔

وہ درختوں کے قریب پہنچے تو انہیں درختوں کے درمیان ایک جھونپڑی نظر آئی۔ ''لگتا ہے، ہم یہاں رات بھی گزار سکیں گے''۔ عبدالحق نے کہا۔

انہوں نے وہاں پڑاؤ ڈالا۔ اونٹوں کو درختوں سے باندھ دیا گیا۔ نور بانو ریت پر بیٹھ گئی تھی۔ رابعہ سامان اتروانے میں زبیر کی مدد کر رہی تھی۔ عبدالحق یہ دیکھنے کی غرض سے جھونپڑی کی طرف بڑھا کہ وہ آباد ہے یا نہیں۔

اسی وقت جھونپڑی کے اندر سے ایک لرزتی تڑپتی ہوئی آواز ابھری۔ ''ارے..... یہ تو میرے چھوٹے ٹھاکر کے قدموں کی چاپ ہے۔ ارے..... کیا میرا چھوٹا ٹھاکر آ گیا..... میرا چھوٹا ٹھاکر..... اے اللہ.....''۔

عبدالحق کے پاؤں جیسے زمین نے پکڑ لئے۔ وہ قدم اٹھانا بھول گیا۔ اس کی نظریں جھونپڑی کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں

وہ آواز سب نے سنی تھی۔ نور بانو اپنی بے آرامی اور تھکن بھول گئی۔ وہ بھی اٹھ کر جھونپڑی کی سمت چلی۔

اسی لمحے دروازے سے ایک بوڑھی عورت تیز مگر لڑکھڑاتے قدموں سے نکلی۔ اس کے استخوانی وجود میں ہڈیوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ''اے اللہ، تیرا شکر ہے۔ میرا چھوٹا ٹھاکر آ گیا۔ کہاں ہو تم چھوٹے ٹھاکر''۔

عبدالحق اپنی جگہ بت بنا کھڑا تھا۔ وہ سب اس کے لئے اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ وہ سانس لینا بھی بھول گیا تھا۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ مگر کوئی آواز نہیں تھی۔

بوڑھی عورت ہاتھوں سے ادھر ادھر ٹٹول رہی تھی۔ ''نہیں..... مجھے دھوکہ نہیں ہو سکتا۔ میرا چھوٹا ٹھاکر یہیں کہیں ہے۔ چھوٹے ٹھاکر، تم بولتے کیوں نہیں''۔

عبدالحق کے ہونٹ پھر لرزے..... مگر بے آواز۔ نور بانو بھی وہیں کھڑی تھی۔

بوڑھی عورت ایک طرف لپکی اور کھجور کے ایک درخت سے ٹکرا کر گر گئی۔ یہ وہ لمحہ تھا کہ زمین نے جیسے عبدالحق کے پیروں کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ وہ بوڑھی عورت کی طرف جھپٹا جو کھڑی ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے اسے اٹھایا اور لپٹا لیا۔ پھر وہ دیوانہ وار اس کی پیشانی چومنے لگا۔ ''ہاں اماں، یہ میں ہی ہوں۔ اماں..... چوٹ تو نہیں لگی تمہیں؟''۔

بوڑھی عورت بڑی بے یقینی سے اس کے چہرے کو اپنی کانپتی انگلیوں سے چھو رہی تھی۔ ''چوٹ..... کون سی چوٹ؟ میں تو ہر دکھ بھول گئی اپنا چھوٹے ٹھاکر تم آ گئے تو سب کچھ دھل گیا میرے چھوٹے ٹھاکر''۔

''اب تو مجھے ایسے نہ پکارو اماں۔ اب میں عبدالحق ہوں''۔ عبدالحق نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

اور حمیدہ ایک دم ساکت ہو گئی۔ عبدالحق کے چہرے پر اس کا ہاتھ جہاں تھا، وہیں رہ گیا۔ اس نے یوں سر اٹھایا، جیسے اس کا چہرہ تک رہی ہو..... یا جب اس کے کہے ہوئے لفظوں کی بازگشت سننے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر اس نے لرزتی آواز میں کہا۔ ''کیا کہا تم نے؟ ذرا پھر سے کہنا پتر''۔

''اماں، اب مجھے کبھی ٹھاکر نہ کہنا۔ اب میرا نام عبدالحق ہے''۔

''تم..... تم مسلمان ہو گئے.....؟''۔

''ہاں اماں۔ الحمدللہ۔ اللہ کا کرم ہے''۔

حمیدہ نے آسمان کی طرف چہرہ اٹھایا اور آنچل پھیلا کر بکھرتی ہوئی آواز میں بولی۔ ''اے اللہ، شکر ہے تیرا۔ اے اللہ تو نے میرے دودھ کی لاج رکھ لی''۔ پھر وہ عبدالحق سے لپٹ گئی اور ایسے رونے لگی، جیسے اب کبھی چپ نہیں ہو گی۔

نور بانو بوڑھی عورت کی بات سن کر حیرت سے سن ہو کر رہ گئی تھی۔ حالانکہ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ بوڑھی عورت نے وہ الفاظ کہے ہیں۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

اسے لگتا تھا کہ وہ اس کی سماعت کا وہم ہے۔ وہ پاگلوں کی طرح ایک بات سوچے جا رہی تھی..... کیا چھوٹے ٹھاکر نے اس مسلمان عورت کا دودھ پیا تھا۔

زبیر کی پکار نے اس منظر کو تبدیل کر دیا۔ ''مالک..... سورج ڈوب گیا ہے''۔

حمیدہ چونکی۔ ''ارے..... یہ تو رگھو کی آواز ہے''۔

''رگھو نہیں اماں، اب وہ زبیر ہے۔ اور رنجنا کا نام اب رابعہ ہے''۔ عبدالحق نے کہا اور نرمی سے حمیدہ کو خود سے الگ کیا۔ ''تم سے بہت باتیں کرنی ہیں اماں۔ مگر افطار کا وقت ہو گیا ہے۔ اور مجھے اذان بھی دینی ہے''۔

چند لمحے بعد اس مردہ گاؤں کی فضا میں اذان کی آواز گونج رہی تھی، جہاں پہلے کبھی مسجد بھی نہیں تھی۔ جہاں صرف تین مسلمان رہتے تھے۔ اور وہاں اذان دینے کا اعزاز ٹھاکر پرتاپ سنگھ کے بیٹے عبدالحق کو حاصل ہو رہا تھا۔ جبکہ اسے اسلام قبول کئے صرف تین دن ہوئے تھے۔

.....x.....

باتیں کرنے کا موقع ملنا آسان نہیں تھا۔ وہ ایسا بے سروسامانی کا عالم تھا کہ انہیں پہلے اس کی فکر کرنی تھی۔ جھونپڑی میں ایک چارپائی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ مگر فی الوقت کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

مغرب اور عشا کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں ہوتا۔ عبدالحق نے عشا کی اذان دی۔ نماز کے بعد انہیں سونے کی فکر ہوئی۔ سفر کی تھکن نے نور بانو کو ایسا نڈھال کر دیا تھا کہ وہ بیٹھے بیٹھے جھوم رہی تھی۔

''منجھلی بی بی چارپائی پر سو جائیں گی''۔ رابعہ بولی۔

''ہاں، یہ ٹھیک ہے''۔ عبدالحق نے کہا۔

''نہیں۔ یہ ناممکن ہے''۔ نور بانو نے کہا۔ ''ہم اندر سونے والے تو فرش پر بھی سو جائیں گے۔ چارپائی باہر والوں کو ملنی چاہئے''۔

ان کی خوش قسمتی تھی کہ رابعہ نے سامان میں بستر بھی رکھ لیا تھا۔ ان کے پاس ایک بڑا بستر بند تھا، جس میں گدے، لحاف، چادریں اور تکئے تھے۔ یوں ان کا بڑا مسئلہ حل ہو گیا۔ چارپائی باہر لا کر بچھا دی گئی۔ اندر حمیدہ، نور بانو اور رابعہ کے بستر بچھ گئے۔ زبیر نے اپنا بستر کھجور کے درخت کے پاس بچھا لیا۔

تھوڑی ہی دیر میں عبدالحق اور حمیدہ کے سوا سب لوگ سو گئے۔

عبدالحق حمیدہ کو باہر لے آیا اور چارپائی پر بٹھا دیا۔ وہ خود اس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ ''اب ہم خوب باتیں کریں گے اماں''۔

لیکن حمیدہ دہل گئی۔ ''تم نیچے کیوں بیٹھے ہو چھوٹے.....''۔ وہ کہتے کہتے رک گئی۔

''اچھا ہوا اماں کہ تم نے جملہ پورا نہیں کیا''۔ عبدالحق نے کہا۔ ''اللہ کا شکر ہے اماں کہ ٹھاکری ختم ہو گئی۔ اب میں تمہارا بیٹا ہوں اور تم میری ماں ہو اور جہاں میں بیٹھا ہوں،

وہی میرا مقام ہے''۔

دونوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں سے شروع کریں۔ان کی گفتگو ترتیب سے محروم تھی۔البتہ دونوں کے لئے نکتہ آغاز ایک ہی تھا۔وہ لمحہ جب وہ آخری بار ملے تھے..... بچھڑنے کے لئے۔جب پہلی بار حمیدہ نے ماں بن کر اسے وہاں سے چلے جانے کا حکم دیا تھا۔اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ وہ پڑھائی مکمل کر کے واپس آئے گا تو وہ اسے ملے گی۔کس یقین سے کہا تھا اس نے.....اور اس وقت کے اوتار سنگھ نے اس پر ویسا ہی یقین کیا تھا۔

''تم پر کیا گزری اماں؟''۔عبدالحق نے پوچھا۔

''مجھ پر کیا گزری؟ کچھ بھی نہیں۔اللہ کی رحمت تھی۔گاؤں کے گاؤں مٹ گئے۔مگر اللہ نے مجھے بچا لیا۔اور تمہارے جانے کے ذرا دیر بعد ہی آندھی آئی تھی۔میں تمہاری طرف سے ڈرتی رہی۔مگر نجانے کیسے دل کو اطمینان ہو گیا کہ تم خیریت سے ہو''۔

''مجھے بھی بس اللہ نے بچا لیا اماں۔ورنہ میں ریت میں دب رہا تھا۔سانس بھی نہیں لی جا رہی تھی مجھ سے''۔عبدالحق کو اب بھی وہ منظر یاد آیا تو اس کے جسم میں تھرتھری دوڑ گئی۔''پر اماں،تمہاری آنکھوں کو کیا ہوا''۔

''رب کی امانت تھی پتر۔جب تک رہی،اس کی مہربانی۔جب اس کی مرضی ہوئی،واپس لے لی۔مگر جان بخش دی اس نے.....تمہارے لئے۔اور اس کا شکر ہے کہ آج اس نے یہ دن دکھایا۔تمہیں مجھ سے ملایا''۔

''پر آنکھوں کو ہوا کیا اماں؟''۔

''ہونا کیا تھا۔رب نے کرم کیا۔جس ریت کے نیچے گاؤں کے گاؤں دب گئے،اس کے سامنے میری کیا بساط تھی۔بس جیسے وہ ساری کی ساری میری آنکھوں میں بھر گئی۔نظر تو کچھ نہیں آتا پر اب بھی کبھی کبھی آنکھوں میں کھٹک ہوتی ہے۔اللہ کا شکر ہے پتر''

عبدالحق کو اس پر پیار آ گیا۔اس نے اس کا ہاتھ تھام کر لبوں سے لگا لیا۔کیسی شکر گزار تھیں اماں۔

''تم نے یہاں اکیلے اتنے برس کیسے گزار دیئے اماں؟''۔

''میں کہاں گزار سکتی تھی۔رب نے گزار دیئے''۔حمیدہ نے شکر گزاری سے کہا۔''میں تو پریشان تھی۔آنکھوں سے بھی محروم ہو گئی تھی۔وقت کا بھی کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔پھر ایک اللہ کا بندہ میرے پاس آیا۔بولا..... یہاں کیسے جیو گی۔چلو تمہیں اللہ کی رحمت کے سائے میں لے چلوں۔میں نے کہا..... مجھے کسی کا انتظار ہے.....اور اس کی امانتیں بھی سنبھالے بیٹھی ہوں۔وہ بولا.....امانتیں بھی محفوظ ہیں۔بس تم چلو۔بہت اصرار سے وہ مجھے یہاں لے آیا۔کہنے لگا.....سر چھپانے کو یہ چھت ہے۔سونے کے لئے چارپائی۔کھانے کے لئے کھجوریں۔اور یہ پانی کا گھڑا بھی رکھا ہے۔اور کیا چاہئے تمہیں۔میں نے کہا..... پانی ختم ہو جائے گا تو میں اندھی کہاں پانی ڈھونڈتی پھروں گی۔وہ ہنس کر بولا..... پانی بھی ختم نہیں ہو گا۔بس.....اس دن سے میں یہاں ہوں۔بھوک لگتی ہے تو درختوں کے نیچے ٹپکی ہوئی کھجوریں کھاتی ہوں۔گھڑے میں پانی کبھی کم نہیں ہوتا۔اللہ کی مہربانی ہے۔تمہارا انتظار تھا۔تم بھی آ گئے۔اللہ کا شکر ہے''۔

''اور وہ آدمی کہاں گیا؟''۔

''اس دن کے بعد میں نے کبھی اس کی آواز بھی نہیں سنی''۔

''تم نے کتنی تکلیف اٹھائی ہے اماں''۔

''کوئی تکلیف نہیں تھی پتر۔بس وقت کا پتا نہیں چلتا تھا۔پرندوں کے شور سے صبح اور شام کا اندازہ ہو جاتا تھا۔اندازے سے نماز پڑھتی تھی۔پتا نہیں،کتنی غلط نمازیں پڑھی ہوں گی میں نے۔اللہ معاف کرے۔اور مہینوں کا تو پتا ہی نہیں چلتا تھا۔اب یہی دیکھ لو،مجھے نہیں معلوم تھا کہ رمضان آ گئے ہیں۔نجانے کتنے روزوں سے محروم رہی میں''۔ وہ رونے لگی۔''اور وقت کٹتا ہی نہیں تھا''۔

عبدالحق کا دل کٹنے لگا۔واقعی،وہ کیسی روح فرسا تنہائی ہو گی،جس سے اماں گزری تھیں۔

اردو فینز ڈاٹ کام

''مجھے بتاؤ تو، تمہیں گئے کتنے برس ہو گئے؟''۔

''دو سال ہو گئے اماں''۔

''صرف دو سال''۔ حمیدہ کے لہجے میں حیرت بھی تھی اور اذیت بھی۔ ''مجھے تو وہ دس بیس سال پرانی بات لگتی ہے''۔

عبدالحق اس بات کو سمجھ سکتا تھا۔

''اچھا پتر، اب تم سو جاؤ''۔ حمیدہ نے کہا اور اندر چلی گئی۔

عبدالحق لیٹ گیا۔ تھکن بہت زیادہ تھی۔ جسم کو آرام ملا۔ مگر نیند نہیں آئی۔ اس رات کلمہ پڑھنے کے بعد جو اسے نیند آئی تھی تو اس کے بعد اب تک وہ ایک لمحے کیلئے بھی نہیں سو سکا تھا۔ اور یہ بھی نہیں کہ اسے نیند کی کمی کا احساس ہوتا ہو۔ وہ تازہ دم ہی رہتا تھا۔

گھڑی اس کے پاس تھی۔ سحری کے وقت اس نے سب کو جگا دیا۔

.....x.....

پہلا مرحلہ اس جگہ کو زندگی گزارنے کے قابل بنانا تھا۔ ضروری تھا کہ رہنے کے لئے ایک گھر بنایا جائے۔ مگر اس سے زیادہ ضروری اس بات کا خیال رکھنا تھا کہ وہ گھر اپنے گاؤں کی..... اپنی زمین پر بنایا جائے۔

فجر کے بعد عبدالحق زبیر کے ساتھ اس جستجو میں نکلا۔ بظاہر تو وہاں کہیں کوئی نشانی نظر نہیں آ رہی تھی۔ مگر تلاش کرنے پر ایک اونچے ٹیلے کے پیچھے حویلی کے آثار نظر آ گئے۔ آثار کیا، وہ ایک منڈیر سی تھی۔ لیکن ان کی پہچان کے لئے کافی تھی۔ اور وہ آثار بھی اس ٹیلے کی وجہ سے نمایاں ہوئے تھے۔ وہاں سے ریت نے اڑ اڑ کر ٹیلے کی شکل اختیار کی تھی اور جہاں سے ریت اڑی تھی، وہاں چھت کی منڈیر نمایاں ہو گئی تھی۔

اسے دیکھ کر عبدالحق کو ایسی بے قراری ہوئی کہ وہ خود بھی حیران رہ گیا۔ جی چاہتا تھا کہ ہاتھوں سے زمین کھود کر نیچے اتر جائے۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اس طرح یہ ممکن نہیں۔

بہر حال حویلی کے حوالے سے پورے گاؤں کا نقشہ ان دونوں کو یاد تھا۔ وہاں کھڑے ہو کر انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ دونوں حیران رہ گئے۔ اماں کی جھونپڑی عین اس جگہ تھی۔ جہاں ان کی یادداشت کے مطابق گاؤں کا مرکز تھا۔

عبدالحق نے یہ بات زبیر سے کہی۔ زبیر نے اس کی تائید کی۔ حیرت اس بات کی تھی کہ کھجوروں کا وہ جھنڈ اچانک کہاں سے آ گیا۔ ''زبیر..... یہ اللہ کی قدرت ہے۔ اس کی رحمت ہے۔ ورنہ تو اماں کے بچنے کا بھی کوئی امکان نہیں تھا''۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں مالک''۔

''بس..... اب ہمیں شہر چلنا ہے''۔

اس بار وہ جے پور کی مخالف سمت میں گئے۔ راستے میں انہیں کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں ملے۔ وہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ ہندو بڑی تعداد میں اپنے گھر چھوڑ گئے تھے اور جو موجود تھے، وہ عافیت میں رہ رہے تھے۔

انہوں نے پوچھ گچھ کی تو پتا چلا کہ ان کی ضرورت شہر میں ہی پوری ہو سکتی ہے۔ اور شہر زیادہ دور بھی نہیں ہے۔

اور وہ قریب ترین شہر صادق آباد تھا!

.....x.....

پہلا دن تو صرف جھونپڑیاں کھڑی کرنے میں گزر گیا۔ دو جھونپڑیاں ان کے اپنے لئے تھیں اور دو راج مزدوروں کے لئے۔ عبدالحق نے حمیدہ سے اس کی جھونپڑی خالی کرنے کی اجازت لے لی تھی۔

اگلے روز عبدالحق نے راج کو تفصیل سے بتایا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ مسجد کے لئے اس نے اماں کی جھونپڑی والا مقام منتخب کیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس کے اندازے

کے مطابق وہ گاؤں کا وسطی مقام تھا۔لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ اللہ نے ایک بہت بڑی آفت کے دوران اس مقام پر اماں کے لئے اپنی رحمت کا دامن پھیلایا تھا۔

''صاحب..... یہاں مسجد کی ضرورت کہاں ہے؟''۔راج نے اعتراض کیا۔

عبدالحق نے اسے یوں دیکھا، جیسے اس کی ناسمجھی پر حیران ہو رہا ہو۔''کیوں؟ یہاں مسلمان ہیں رہتے؟''۔

''آپ دو ہی تو آدمی ہیں یہاں''۔

''مگر نماز تو پڑھیں گے''۔

راج شرمندہ ہو گیا۔''مگر اتنی بڑی مسجد!''۔

''دیکھو.....انشاءاللہ یہ گاؤں آباد ہو گا۔میں چاہتا ہوں، یہاں پہلی بنیاد ایک مسجد کی رکھی جائے۔اور میں بڑی مسجد کی بات نہیں کر رہا ہوں۔میں اس کے لئے اتنی جگہ چھوڑنا چاہتا ہوں کہ بعد میں ضرورت پڑنے پر توسیع کی جا سکے''۔

''ٹھیک ہے صاحب۔مگر مال دور سے آئے گا۔خرچا بہت ہو گا''

''خرچے کی تم پروا مت کرو۔بس عید سے پہلے کام مکمل ہو جائے''۔عبدالحق نے کہا۔''اب مکان کے لئے جگہ دیکھ لو''۔

راج پیمائش میں مصروف ہو گیا۔کچھ مزدوروں کو مال کے لئے شہر بھیج دیا گیا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

اوراذان کی آوازتوان کی آمد کے ساتھ ہی گونج چکی تھی۔اب وہاں باجماعت نماز ہونے لگی۔اگلے روز سے تعمیر کا کام بھی شروع ہوگیا۔

نور بانو کے لئے وہ بالکل نئی اور مختلف زندگی تھی۔اس نے خواب میں بھی اس زندگی کا تصور نہیں کیا تھا۔وہ ایک عجیب عالم حیرت میں جی رہی تھی۔پہلی رات تو اسے لگتا تھا کہ وہ سو ہی نہیں سکے گی۔نیچے فرش پر وہ کبھی سوئی ہی نہیں تھی۔اب سونا تھا اور وہ بھی اونٹ پر طویل اور تکلیف دہ سفر کے بعد، جس میں تھکن اور درد اس کی ہڈیوں میں سرائیت کر گیا تھا اور اسے لگتا تھا کہ اس کے جسم کا ایک ایک جوڑ الگ ہوگیا ہو۔

لیکن سونے کیلئے لیٹنا تو تھا۔اور عجیب بات یہ ہوئی کہ لیٹتے ہی وہ سوگئی۔اور وہ ایسی بے خبر نیند تھی.....ایسی لذت والی نیند کہ رابعہ کے جھنجھوڑنے پر بھی سحری میں اس کی آنکھ نہیں کھل رہی تھی۔

اس کے لئے وہ تبدیلی بہت بڑی، بالکل مکمل اور یکسر تھی۔اس نے آنکھ کھولنے کے بعد بس گھر کی چار دیواری دیکھی تھی۔گھر سے باہر کی دنیا کا اس کے پاس بے حد محدود سا تصور تھا۔پہلے تو اس سفر نے ہی اس کی آنکھیں کھول دیں۔یہ احساس الگ تھا کہ وہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں چلی آئی ہے۔اللہ کی زمین اتنی بڑی ہے.....اتنی وسیع، یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔

اگلے روز سویرے ہی عبدالحق اور زبیر کہیں چلے گئے۔وہ رابعہ کو قرآن پڑھانے بیٹھ گئی۔اماں بھی اس کے پاس بیٹھی سن رہی تھیں۔

قرآن پڑھنے کے بعد رابعہ نے کہا۔''آؤ منجھلی بی بی، ذرا باہر چل کر دیکھیں''۔

نور بانو ہچکچا رہی تھی۔دل تو چاہ رہا تھا باہر جانے کا۔

''یہاں تو کوئی ہے ہی نہیں دیکھنے والا۔چلیں چادر لپیٹ لیں اچھی طرح''۔

وہ رابعہ کے ساتھ باہر نکل آئی۔

باہر آکر پہلا ردعمل یہ ہوا کہ اس کا دل گھبرانے لگا۔اپنا وجود اسے بہت چھوٹا، بہت حقیر لگنے لگا۔کھجور کے درختوں کے جھنڈ سے باہر حد نظر تک ریت اور آسمان کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔اور وہ منظر اتنا بڑا، اتنا وسیع تھا کہ انسان کی بے بضاعتی کا احساس دلاتا تھا۔

پھر اسے ڈر لگنے لگا۔وہاں وہ بس تین عورتیں ہی تو ہیں۔کوئی آجائے تو۔اس نے یہ بات رابعہ سے کہہ دی۔

''کوئی نہیں آتا منجھلی بی بی۔آئیں.....''۔

نور بانو کو ایسا لگ رہا تھا کہ اب اسے ازسرنو زندگی گزارنا سیکھنا ہوگا۔وہ دیکھتی رہی۔رابعہ نے درختوں کے جھنڈ میں ہوا کے رخ سے ہٹ کر مٹی کا بہت خوب صورت چولہا بنایا۔اسے بہت اچھا لگا۔

عبدالحق اور زبیر واپس آئے تو ان کے ساتھ راج مزدور تھے۔اس کے علاوہ وہ کھانے پینے کا سامان اور جلانے کے لئے لکڑی بھی لائے تھے۔ان کے آتے ہی نور بانو جھونپڑی میں جا گھسی۔رابعہ باہر کام میں مصروف رہی۔

ذرا دیر بعد حمیدہ نے پکارا۔''نور بانو.....دھیے.....ذرا عبدالحق کو تو بلا لا''۔

''میں کیسے جاؤں اماں۔باہر مرد ہیں''۔نور بانو نے کہا۔

''سن دھیے، میں کوئی پڑھی لکھی نہیں ہوں۔دین کا بھی کچھ علم نہیں ہے مجھے۔پر زندگی کی سمجھ ہے مجھے۔دین پردے کے نام پر عورت کو قید نہیں کرتا۔دین میں آسانی ہے، مشکل نہیں۔عورت کے باہر نکلنے پر پابندی نہیں۔پابندی ہے تو بس نفس کیلئے۔عورت کے لئے باہر نکلنے کی پابندی نہیں۔بس وہ اپنی نمائش نہ کرے''۔

نور بانو یہ سب کچھ جانتی تھی۔مگر وہ جس ماحول میں رہی تھی، اس میں یہ پابندیاں تھیں۔وہ دین کا علم حاصل کرتی رہی تھی۔اس کو علم تھا کہ اسلام کے ابتدائی دور کی عورتیں علم حدیث حاصل بھی کرتی تھیں اور اس کی تعلیم بھی دیتی تھیں.....اور وہ بھی صرف عورتوں کو نہیں۔مرد بھی ان سے علم حاصل کرنے آتے تھے اور ان سے سند لے کر جاتے تھے۔ لیکن وہ جس معاشرت میں رہی تھی، اس کے یہی تقاضے تھے اور وہ اس کی عادت بن چکے تھے۔اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔''لیکن اماں، مجھے اچھا نہیں لگتا''۔

''دیکھو بیٹی۔تو شہر میں رہتی تھی نا۔یہاں گاؤں کی زندگی کا تجھے کچھ پتا نہیں۔یہاں عورت کی ذمے داری صرف گھر سنبھالنا نہیں۔یہاں کبھی اسے کھیتوں میں بھی کام کرنا پڑتا ہے۔ڈنگر بھی چرانے پڑتے ہیں۔اب مجھے نہیں معلوم، تجھے یہاں رہنا ہے یا نہیں۔لیکن آدمی پر خدانخواستہ وقت تو کہیں بھی پڑ سکتا ہے.....گاؤں میں بھی اور شہر میں بھی۔میں چاہتی ہوں، تو اس کے لئے خود کو بدل لے۔بس چادر میں خود کو اچھی طرح چھپا لے۔پھر بھی دل نہ مانے تو اسی چادر سے آدھے چہرے کو بھی چھپا لے۔جا..... جا کر عبدالحق کو بلا لا''۔

نور بانو نے خود کو چادر میں پہلے ہی لپیٹا ہوا تھا۔اسی چادر کا نقاب بنا کر وہ باہر نکلی۔مگر اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔وہ تو دہلی سے یہاں تک کے سفر نے اس کی جھجک قدرے کم کردی تھی۔ورنہ شاید وہ بے ہوش ہی ہوجاتی۔

خوش قسمتی سے مرد خاصے فاصلے پر زمین کا جائزہ لے رہے تھے۔رابعہ ایک اور چولہا بنانے میں مصروف تھی۔نور بانو نے اس سے کہا۔''سنو.....عبدالحق سے کہو کہ اماں انہیں بلا رہی ہیں''۔

رابعہ اٹھ کر اس طرف چل دی۔

نور بانو سوچنے لگی۔زندگی اس سے تبدیلیوں کا تقاضہ کر رہی ہے اور بنیادی چیز زندگی ہی ہے۔مزاج اور معاشرت کی تبدیلی آسان نہیں ہوتی۔لیکن ناگزیر ہو تو زندگی کی خاطر کرنی پڑتی ہے۔پھر یہاں تو تبدیلی اسے اچھی لگ رہی تھی۔چند گھنٹوں میں ہی اسے احساس ہوگیا تھا کہ کھلی فضا میں سانس لینا کتنا خوب صورت ہے۔ہر سانس کے ساتھ وجود جیسے روشن ہوا جا رہا تھا۔

اس نے خود کو سمجھایا کہ حیا آنکھ میں ہوتی ہے، نیت میں ہوتی ہے اور دل کی بے غرضی میں ہوتی ہے اور مستور ہونے میں ہوتی ہے۔حیا خود کو غائب کر لینے میں نہیں ہوتی۔ مستور ہونا دنیا سے کٹ جانا نہیں ہوتا۔پردہ ایسا ہو کہ کسی کے لئے ترغیب کا سامان نہ ہو۔

مگر عبدالحق کے معاملے میں یہ ممکن نہیں تھا۔وہاں اس کا دل بے غرض نہیں تھا۔وہ اس سے محبت کرتی تھی اور چاہتی تھی کہ وہ بھی اس سے محبت کرے۔لہٰذا اس کے سامنے جانے کے خیال سے اسے گھبراہٹ ہوتی تھی۔

شام سے پہلے وہ دوسری جھونپڑی میں منتقل ہوگئے۔جہاں اماں کی جھونپڑی تھی، وہاں عبدالحق نے مسجد بنانے کا ارادہ کیا تھا۔نور بانو نے یہ سوچ کر سکون کی سانس لی کہ اب عبدالحق کو کھلے آسمان کے نیچے نہیں سونا پڑے گا۔

مزدوروں کو کام مکمل ہونے تک وہیں رہنا تھا۔چنانچہ وہاں کھلے آسمان کے نیچے باجماعت نماز ہونے لگی۔مزدوروں میں دو ایسے تھے، جن کی داڑھی تھی۔ان میں سے ایک امامت کراتا تھا۔

حمیدہ کے لئے وہ بہت بڑی خوشی تھی۔ساری عمر وہ اذان کی آواز سننے کو ترستی رہی تھی۔اس نے ہمیشہ اندازے سے نماز پڑھی تھی۔اب پانچوں وقت اذان کی آواز سننا اسے بہت اچھا لگتا تھا۔اس کی آنکھیں بھیگ جاتیں۔اور وہ اذان کے فوراً بعد نماز کے لئے کھڑی ہوجاتی۔نمازیں اس کی طویل ہوگئی تھیں۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

سچ یہ تھا کہ پہلے ایسی نماز اس نے کبھی نہیں پڑھی تھی۔ پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ آزادی کے ساتھ نماز پڑھنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔

حمیدہ کو نور بانو کے بارے میں اندازہ ہوا کہ وہ باقاعدہ علم دین حاصل کرتی رہی ہے تو اس نے اسے اپنے قریب کر لیا۔ ویسے بھی اسے یہ لڑکی بہت اچھی لگی تھی۔ اسے احساس ہوتا تھا کہ عبدالحق اس لڑکی کو پسند کرتا ہے۔ اگرچہ بہ ظاہر کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ لیکن اس معاملے میں عورتوں کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔

.....x.....

اس روز حمیدہ نے عبدالحق کو اپنے پاس بلا لیا۔ ''پتر..... میں چاہتی ہوں کہ عید سے پہلے تمہاری امانتیں تمہارے سپرد کر دوں''۔

عبدالحق متجسس ہو گیا۔ اسے یاد تھا، لال آندھی والے دن بھی اماں نے یہی کہا تھا کہ انہیں اس کی امانتوں کی فکر ہے۔ ''اب جلدی کیا ہے اماں''۔ اس نے کہا۔ ''میں آ گیا ہوں نا''۔

''جلدی تو ہے پتر۔ کیا پتا، اب ضرورت پڑ جائے''۔

عبدالحق کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

''تم مجھے کھجور کے اس درخت کے پاس لے چلو، جو سب سے اونچا ہے''۔

ذرا دیر بعد وہ اس درخت کے پاس کھڑے تھے۔ حمیدہ نے جھک کر درخت کے تنے کو نیچے سے چھوا۔ چند لمحے وہ ٹٹولتی رہی۔ پھر ذرا سا ہٹ کر اس نے زمین پر نشان لگایا۔

''یہاں کھودنا ہوگا پتر۔ تمہاری امانت یہیں ہے''۔

''میں مزدور کو بلاتا ہوں''۔

''نا پتر..... کسی کو پتا نہ چلے۔ یہ کام تم لوگ..... زبیر سے لے سکتے ہو۔ پر خود ہی کرو تو اچھا ہے''۔

عبدالحق بحث کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ وہ خود ہی اس کام میں لگ گیا۔ اور اسے زیادہ کھودنا نہیں پڑا۔ تھوڑی سی کھدائی کے بعد کدال کسی دھات کی چیز سے ٹکرایا۔ اس نے مٹی ہٹا کر دیکھا۔ وہ کافی بڑا ایک دیگچہ تھا، جس کے اوپر ڈھکن بھی تھا۔

وہ آواز سنتے ہی حمیدہ کے چہرے پر خوشی دوڑ گئی۔ اس سے پہلے اسکے جسم میں تناؤ تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ چیز یہاں موجود بھی ہوگی یا نہیں۔ ''ہاں..... یہی ہے پتر۔ نکال لو اسے''۔ اس نے سنسنی آمیز لہجے میں کہا۔

دیگچہ نکالنے کے لئے اور ادھر ادھر کی مٹی ہٹانی پڑی۔ بالآخر اس نے دیگچہ نکال لیا۔ ''اب کیا کروں اماں؟''۔

''اسے کھول کر دیکھو۔ یہ سب تمہارا ہے''۔

عبدالحق نے دھڑکتے دل کے ساتھ ڈھکنا ہٹایا۔ دیگچے میں ایک بڑی گٹھری تھی۔ ''اس میں گٹھری ہے اماں''۔

''ہاں..... یہ تمہاری امانت ہے''۔ حمیدہ نے کہا اور آسمان کی طرف سر اٹھاتے ہوئے بولی۔ ''تیرا شکر ہے ربا۔ تو نے میرا بوجھ اتار دیا''۔

عبدالحق نے گٹھری کو کھولا۔ گٹھری میں کچھ کاغذات تھے اور دو بڑی بڑی پوٹلیاں تھیں۔ اس نے کاغذات اٹھائے اور ان کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ عدالتی کاغذات تھے۔ ان کی رو سے جمال دین نے اپنی تمام زمین، اپنا مکان، سب ٹھاکر اوتار سنگھ کے نام کر دیا تھا۔

چند لمحے تو وہ ان کاغذات کو خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر کچھ خیال آیا تو اس نے تاریخ دیکھی۔ وہ اس کے لئے ایک اور مقام حیرت تھا۔ وہ دستاویزات 1932ء کی تھیں۔ یعنی بات یہ نہیں تھی کہ جمال دین نے اپنی موت سے کچھ پہلے وہ سب کچھ اس کے نام کیا تھا۔ یہ اس سے بہت پہلے کی بات تھی۔

''یہ..... یہ سب کیا ہے، اماں؟''۔ بڑی مشکل سے وہ بولا۔

''سب بتا دوں گی۔ پہلے سب چیزیں دیکھ لو اور مجھے بتا دو۔ مجھے تسلی ہو جائے کہ امانت پوری ہے اور تمہیں مل گئی''۔

عبدالحق نے پوٹلیاں کھولیں۔ مگر اس کا دماغ اب بھی کاغذات میں الجھا ہوا تھا۔ چاچا جمال دین نے یہ سب کچھ اس کے نام کیوں کیا۔ انہیں تو یہ سب کچھ ویر جی کے نام کرنا چاہئے تھا۔

اس نے پوٹلیاں کھول کر دیکھا۔ ایک میں نقدی تھی اور دوسری میں سونا اور زیورات۔ رقم بھی بھاری تھی اور سونا بھی کم نہیں تھا۔ وہ تو اچھا خاصا خزانہ تھا۔

''اماں..... اس میں نقدی اور زیورات بھی ہیں..... بہت سارے''

''یہ سب تمہارا ہے پتر۔ تمہاری امانت تھی میرے پاس۔ رب سے دعا کرتی تھی کہ امانت لوٹائے بغیر مجھے مرنے نہ دینا''۔

عبدالحق نے اسکے ہاتھ تھام لئے۔ ''ایسی باتیں نہ کرو اماں۔ اب تمہارے سوا میرا کون ہے''۔ پھر وہ بولا۔ ''لیکن اماں، چاچا نے یہ سب میرے نام کیوں کیا؟ انہیں تو ویر جی کے نام کرنا چاہئے تھا؟''۔

''اسلئے کہ یہ سب کچھ تمہارا ہی تھا۔ ہمارا اس پر کوئی حق نہیں تھا''

''کیسے اماں۔ سمجھاؤ تو''۔

تب حمیدہ نے اسے سب کچھ بتایا۔ کیسے بڑے ٹھاکر نے دودھ کے صلے میں اپنی زمین اور ہر چیز کا نصف انہیں دیا تھا۔ ''ہم ٹھاکر جی کو انکار تو نہیں کر سکتے تھے نا۔ وصال دین کے ابا نے کہا..... یہ سب کچھ چھوٹے ٹھاکر کا ہے حمیدہ۔ ہم چپکے سے سب کچھ اس کے نام کر دیں گے۔ یاد رکھنا حمیدہ..... یہ سب کچھ چھوٹے ٹھاکر کی امانت ہے میرے پاس''۔

عبدالحق کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''لیکن پتا جی نے سب کچھ خوشی سے دیا تھا..... آپ کے احسان کے صلے میں''۔

''ہم نے کوئی احسان نہیں کیا تھا پتر۔ تمہیں پہلی بار دیکھا تو دل میں تمہیں دودھ پلانے کی آرزو پیدا ہوئی تھی۔ اس میں تو میری خوشی تھی۔ اور اسے بھی بھول جاؤ تو بھی وہ بڑے ٹھاکر کے احسان کا صلہ تھا، احسان نہیں''۔

''آپ کس احسان کی بات کر رہی ہیں اماں؟''۔

''مجھے تو نہیں معلوم۔ وصال دین کے ابا نے بتایا تھا''۔ حمیدہ نے کہا اور پھر اسے بتایا کہ کیسے وہ لوگ دوسرے گاؤں میں رہتے تھے اور زمین دار کی نظر جمال دین کی بہن پر تھی۔ اس نے مہاجن کے ذریعے چکر چلایا۔ اور کیسے بڑے ٹھاکر نے وہ قرضہ چکا کر ان کی جان چھڑائی۔ عزت بچائی۔ پھر اپنے گاؤں میں انہیں زمین دی، عزت اور مرتبہ دیا۔

یہ کیسے احسان ماننے والے لوگ ہیں۔ عبدالحق نے سوچا۔ ''مگر اماں، مجھے یہ سب لینا اچھا نہیں لگے گا''۔

''کیوں اچھا نہیں لگے گا؟''۔ حمیدہ نے خفگی سے کہا۔

''پتا جی کی دی ہوئی چیز میں واپس لے رہا ہوں۔ یہ کوئی اچھی بات ہے''۔

''تم واپس کہاں لے رہے ہو۔ یہ تو وصال دین کے ابا نے تمہیں دیا ہے۔ اور وہ تمہیں اپنے بیٹے سے زیادہ چاہتے تھے۔ تم انکار کیسے کر سکتے ہو''۔

عبدالحق کی کیفیت عجیب تھی۔ اس سے کچھ بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

''پھر مان لو کہ یہ سب میرا ہے۔ اب یہ بتاؤ، تمہارے سوا میرا کون ہے۔ تم نہ ہوتے تو میں موت کی دعا مانگتی۔ اور پتر، موت تو یہاں بن مانگے مل رہی تھی۔ اللہ نے مجھے بچایا..... صرف تمہارے لئے''۔

عبدالحق کو دل میں تسلیم کرنا پڑا کہ یہ سب سچ ہے۔ اماں کا بچ جانا معجزے سے کم نہیں۔ جہاں گاؤں کے گاؤں مٹ گئے، اماں کیسے بچیں۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

اور پھر آنکھوں سے محروم ہونے کے بعد اتنے برسوں کیسے جیتی رہیں۔ یہ کھجور کے درخت کہاں سے آئے۔ گھڑے میں پانی کبھی ختم نہیں ہوتا تھا۔ کیوں؟ اور اسے یاد تھا، آنے کے بعد تین دن تک اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ گھڑا بھرا ہی رہتا تھا۔ پھر گھڑا خالی ہونے لگا۔ اور اب پانی مسئلہ بن گیا تھا۔

''ٹھیک کہتی ہو اماں۔ میرا بھی تمہارے سوا کون ہے''۔

''بس.....اب تم شادی کرلو''۔

''ارے اماں.....''۔

''سچ کہتی ہوں پتر۔ یہ نور بانو بہت پیاری لڑکی ہے.....''۔

''تم نے تو اماں اسے دیکھا بھی نہیں.....''۔

''کیوں نہیں دیکھا۔ من کی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیتی ہوں۔ اور وہ تجھ سے پیار بھی کرتی ہے''۔

ایک لمحے کو عبدالحق کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ پھر اس نے افسردگی سے سوچا، اماں تو میری محبت میں کہہ رہی ہیں۔ ورنہ یہ کہاں ممکن ہے.....

اسی وقت باہر سے زبیر کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''مالک.....جلدی آئیں۔ پانی نکل آیا۔ مالک پانی.....''۔

عبدالحق نے وہ سب کچھ حمیدہ کے پاس چھوڑا اور باہر لپکا.....

.....x.....

عبدالحق نے جب پہلی بار کنویں کی بات کی تو راج نے کہا۔ ''صاحب..... یہاں پانی کہاں سے آیا۔ یہاں تو ریت ہی ریت ہے''۔

مگر عبدالحق کو گاؤں کی ندی یاد تھی۔ اس نے کہا۔ ''جہاں میں کہوں، وہاں کھدائی کر کے دیکھو''۔

ہر پرانی جگہ کا اندازہ لگانے کے لئے اس کے پاس ایک ہی حوالہ تھا.....حویلی۔ وہ حویلی کے آثار کے پاس کھڑا ہو کر اندازہ کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ اس کی مطلوبہ جگہ کہاں ہوگی۔ اسی طرح اس نے اماں کے گھر کا اندازہ لگایا تھا۔ وہ اپنے لئے مکان وہیں بنانا چاہتا تھا، جہاں کبھی اماں کا گھر تھا..... جہاں اس کے چاچا جمال دین اور اس کے ویر جی رہتے تھے۔ اس کے اندر اس بات پر اصرار تھا کہ مکان وہیں بنے۔

لیکن وہیں کیوں؟ اس نے خود حیرت سے سوچا۔ اصولاً تو اسے ریت میں دفن حویلی پر اپنے نئے گھر کی بنیاد رکھنی چاہئے تھی

مگر جواب بھی اسے اپنے اندر سے فوراً ہی ملا تھا۔ اس لئے کہ گاؤں میں وہی ایک جگہ تو تھی جہاں نماز پڑھی جاتی تھی، قرآن پڑھا جاتا تھا..... اللہ کا ذکر کیا جاتا تھا۔ اور اس کا دل مطمئن ہو گیا تھا۔

اسی طرح اس نے کنویں کی جگہ کا تعین کیا تھا۔ اور اب وہاں سے پانی نکل آیا تھا۔

جہاں کنواں کھودا گیا تھا، وہاں جشن کا سماں تھا۔ تمام مزدور خوشی سے ناچ رہے تھے۔ پانی نکلنے کی خوشی کو صحرا کے باشندوں سے زیادہ کون سمجھ سکتا ہے۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

''آپ نے ٹھیک کہا تھا صاحب''۔راج نے اس سے کہا۔''پانی نکلا ہے.....اور وہ بھی میٹھا پانی''۔

عبدالحق نے آسمان کی طرف چہرہ اٹھایا اور بولا۔''اللہ کا شکر ہے''۔

''بہت مبارک ہو صاحب''۔

''تمہیں بھی مبارک ہو۔محنت تو تم لوگوں کی ہے''۔عبدالحق نے کہا۔''اب یہاں چرخی بھی لگا دینا''۔

.....x.....

راج اور مزدور کام مکمل کر کے رخصت ہونے لگے۔عبدالحق نے انہیں طے شدہ اجرت سے زیادہ دیا۔''میں تو چاہتا ہوں کہ ابھی تم لوگس یہاں اور رکو۔کام بہت ہے یہاں''۔

راج نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا۔''کام کہاں ہے صاحب؟''۔

''مجھے یہاں اور مکان بنوانے ہیں''۔

''لوگ تو ہیں نہیں۔مکان کس کے لئے بنوائیں گے؟''۔

''لوگ آئیں گے۔یہ گاؤں آباد ہوگا۔تھوڑے ہی دن کی بات ہے''۔

راج اس کی فیاضی اور حسن اخلاق سے بہت متاثر ہوا تھا۔وہ بولا۔''جب ضرورت ہو صاحب،بلوا لیجئے گا''۔

''اچھا ہے،ابھی کام کر جاؤ''۔

''اب تو عید سر پر ہے صاحب۔سب لوگ عید گھر پر کرنا چاہیں گے۔میری مانو تو صاحب،آپ لوگ بھی شہر چلو۔عید کر کے آجانا''۔

عبدالحق نے ایک لمحے کو سوچا۔پھر نفی میں سر ہلا دیا۔''تم نے خود ہی تو کہا ہے کہ لوگ عید گھر میں کرنا چاہتے ہیں۔اور یہ ہمارا گھر ہے''۔

''پر صاحب عید کی نماز کے لئے تو آپ کو شہر ہی آنا ہوگا۔یہاں تو نہیں ہو سکتی نا''۔

ان کے جانے کے بعد عبدالحق حمیدہ کے پاس گیا اتفاق سے حمیدہ نے بھی وہی بات کہی۔''آج کون سا روزہ ہے پتر''۔

''پچیسواں اماں''۔

''اللہ کا شکر ہے۔اس نے تمہیں عید سے پہلے رہنے کو گھر بھی دے دیا۔اب کچھ عید کی فکر بھی کرو''۔

''مجھے بتائیں اماں کہ مجھے کیا کرنا ہے''۔

''اللہ دے تو عید کے دن بندہ نئے کپڑے پہنے۔اچھا کھائے پیئے۔اللہ کا شکر ادا کرے''۔

''ٹھیک ہے اماں۔وہ میں کرلوں گا''۔عبدالحق نے کہا۔پھر اس نے عید کی نماز کے بارے میں پوچھا۔

اماں نے بھی وہی کہا،جو راج نے کہا تھا۔

اگلا دن یہ حساب لگاتے گزرا کہ انہیں گھر کے لئے کن چیزوں کی ضرورت ہے۔تیسرے دن عبدالحق شہر گیا۔وہاں پر زبان پر ایک ہی بات تھی۔پاکستان بن گیا ہے۔گزشتہ رات ریڈیو پر اناؤنس ہوا تھا.....اور وہ ریڈیو پاکستان تھا۔

عبدالحق کے جسم میں سنسنی دوڑنے لگی۔پاکستان ایک خواب تھا،جو جہد مسلسل کے نتیجے میں حقیقت میں تبدیل ہو گیا تھا۔

.....x.....

حمیدہ ایک ایک چیز کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھ رہی تھی۔وہ حیران تھی کہ عبدالحق نے ہر چیز کا خیال رکھا ہے۔کپڑے تو سامنے کی بات تھے۔وہ چوڑیاں،مہندی،رابعہ کے لئے پائل،اور سب کے لئے زیور بھی لایا تھا۔

''تمہیں ان سب چیزوں کا کیسے خیال آیا پتر؟''۔اس نے پوچھا۔

عبدالحق نے شرماتے ہوئے کہا۔''مجھے تو کچھ بھی نہیں پتا تھا اماں۔دکان دار سے پوچھا تھا''۔پھر بولا۔''پر تمہارے لئے چوڑیاں نہیں لایا اماں''۔

''اب اس عمر میں سب کچھ کھو کر چوڑیاں میں کیا پہنوں گی''۔

''ایک بیٹا تو تمہارا زندہ ہے اماں''۔

''اللہ بڑی عمر دے۔تیرے ہی لئے تو جی رہی ہوں پتر''۔

''تو اماں،تمہارے لئے میں کپڑے لایا ہوں''۔

''اس کی ضرورت نہیں.....''۔

عبدالحق نے اپنے ہاتھ سے سونے کے وہ کپڑے اسے پہنا دیئے۔''اب اماں،سب لوگوں کی ان کی چیزیں تم دے دینا''۔

اچانک حمیدہ کو خیال آگیا۔''پتر،اپنے کپڑے اور جوتے تو تم نے دکھائے نہیں''۔

عبدالحق نے چپ سادھ لی۔

''بولتے کیوں نہیں''۔حمیدہ نے ذرا خفگی سے کہا۔

''وہ.....یاد ہی نہیں رہا اماں''۔

''یاد نہیں رہا یا جان بوجھ کر.....''۔

عبدالحق نے اس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے جلدی سے کہا۔''نہیں اماں،سچ مچ یاد نہیں رہا''۔

''کیسے یاد نہیں رہا۔زبیر کے لئے لیتے ہوئے.....''۔

''سب سے پہلے تو اسی کی چیزیں خریدی تھیں اماں۔میں نے سوچا،سب کے بعد اپنے لئے لوں گا۔پھر پاکستان بننے کی خوشی میں سب کچھ بھول گیا''۔

''کل جا کر لانا.....''۔

''اب تو جانا مشکل ہے اماں.....''۔

''تو پھر کوئی نئے کپڑے نہیں پہنے گا''۔

''اچھا اماں،دیکھوں گا''۔

مگر اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔حمیدہ نور بانو اور رابعہ کو ان کی چیزیں دے رہی تھی۔دبی دبی سسکیوں کی آواز سے وہ چونکی۔''ارے.....یہ کون رو رہا ہے؟''۔

''منجھلی بی بی''۔رابعہ نے جواب دیا۔

''کیوں،کیا بات ہے؟''۔حمیدہ نے نور بانو کا ہاتھ تھاما اور اسے محبت سے سہلانے لگی۔

محبت کا لمس پا کر نور بانو پھٹ پڑی۔وہ اس طرح روئی کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔حمیدہ اور رابعہ اسے چمکارتی،دلاسے دیتی رہیں۔''نہ رو دھیے،کچھ تو بول۔بات کیا ہے؟''۔

ذرا دیر میں نور بانو کا بوجھ ہلکا ہوا۔''اماں.....باجی.....سب لوگ یاد آگئے تھے اماں''۔اس نے کہا۔''اماں ہمیشہ عید کا اہتمام کرتی تھیں۔میں نئے کپڑے کیسے پہنوں گی اماں.....''۔

''یہ سوچ کر یہ تمہارے لئے وہ لایا ہے،جو تم سے پہلے ماں باپ سے محروم ہو چکا ہے۔اس میں اس کی خوشی ہے''۔

نور بانو کی کیفیت ایک دم بدل گئی۔حیا سے اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔کچھ دیر تو اس سے بولا ہی نہیں گیا۔''یہ.....یہ.....یہ وہ لائے ہیں''۔

''ہاں۔اور ہر چیز کا خیال رکھا اس نے۔بس اپنے لئے کچھ نہیں لایا۔کہتا ہے،بھول گیا۔پر میں سمجھتی ہوں۔اس کا دل چاہتا ہوگا کہ کوئی اور محبت سے اس کی فکر کرے۔خود اپنے لئے کچھ کرنے میں اتنا مزہ کہاں''۔

نور بانو کو اچانک اس کے وہ کپڑے یاد آگئے جو اماں نے بڑے اہتمام سے تیار کئے تھے۔اللہ.....یہ کیسی بات ہے۔وہ انہیں عید کے موقعے پر ملتے تھے۔اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔''آپ ان کی فکر نہ کریں اماں۔میں ابھی آئی''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

نور بانو نے بکس کھولا اور وہ کرتے پائجامے نکالے۔ وہ گیارہ جوڑے تھے۔ باجی کا کاڑھا ہوا کرتہ کم تھا۔ اس نے اپنا کاڑھا ہوا کرتہ صندوق میں ہی رہنے دیا اور اماں کے تیار کئے ہوئے جوڑے نکال کر حمیدہ کے پاس لے گئی۔

حمیدہ نے ٹٹول کر کپڑوں کو دیکھا اور بولی۔ ''اتنے کپڑے؟''

''یہ..... یہ اماں نے ان کے لئے بڑی محبت سے سیئے تھے۔ اسی لئے میں انہیں چھوڑ نہ سکی''۔

''چلو..... وہ خوش ہو جائے گا۔ اسے بن مانگے مل گیا۔ اللہ کا شکر ہے''۔

تھوڑی دیر بعد حمیدہ نے عبدالحق کو بلا کر وہ کپڑے اسے دیئے تو وہ حیران ہو گیا۔ ''یہ ماں جی نے سیئے..... میرے لئے''۔ اس نے بے ساختہ کہا اور کپڑوں کو چومنے لگا۔

''ماں جی!''۔ حمیدہ نے حیرت سے دہرایا۔

عبدالحق اسے ماں جی کے بارے میں بتانے لگا۔ اس وقت وہ بہت خوش تھا۔ جیسے کوئی بہت بڑی نعمت مل گئی ہو۔

.....x.....

اگلی صبح فجر کے بعد عبدالحق زبیر کے ساتھ مدفون حویلی کی چھت کی منڈیر پر کھڑا تھا کہ دور سے اسے غبار سا اٹھتا دکھائی دیا۔ دیکھتے رہنے پر احساس ہوا کہ غبار آگے کی سمت متحرک ہے۔

وہ پاکستان بننے کے بعد کی پہلی صبح تھی۔ انہیں ٹھیک طرح سے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کی زمین پاکستان میں شامل ہے بھی یا نہیں۔ بس وہ یہ جانتے تھے کہ بابا نے بتایا تھا کہ وہ پاکستان میں ہے۔

اور اب وہ غبار گواہی دیتا تھا کہ اونٹ پر سوار کچھ لوگ اس طرف آ رہے ہیں۔ اتنے فاصلے سے یہ اندازہ نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ان کی تعداد کیا ہے۔ اور یہ شناخت تو ممکن ہی نہیں تھی کہ وہ دوست ہیں یا دشمن۔

عبدالحق نے زبیر سے کہا۔ ''لاٹھیاں لے آؤ''۔

زبیر لپکتے قدموں سے گھر کی طرف بڑھ گیا۔

وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں دو لاٹھیاں تھیں۔ اس نے ایک لاٹھی عبدالحق کی طرف بڑھا دی جو اب بھی غبار پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ ''یہ جو لوگ بھی ہیں، تین اونٹوں پر سوار ہیں''۔ عبدالحق نے تبصرہ کرنے والے انداز میں کہا۔

زبیر نے غبار کی سمت دیکھا۔ اسے تو ایسا کچھ دکھائی نہیں دیا۔

لیکن چند منٹ بعد عبدالحق کی بات کی تصدیق ہو گئی۔

آنے والوں نے انہیں دیکھا تو ان کے چہروں سے خوف جھلکنے لگا۔ تاہم وہ وہاں رکے بغیر نہ رہ سکے۔ عبدالحق اس کی وجہ سمجھ سکتا تھا۔ ان لوگوں کے چہرے ریت سے اٹے تھے اور وہ نڈھال لگ رہے تھے۔ یہ بات طے تھی کہ انہوں نے رات بھر سفر کیا تھا۔ رات کے وقت صحرا کا سفر بہت ہی خطرناک ہوتا ہے۔ وہاں سمتوں کا پتا تو دن میں بھی نہیں چلتا۔ رات میں تو یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ آدمی ایک چھوٹے سے دائرے میں سفر کر رہا ہے اور درحقیقت جہاں تھا وہیں ہے۔

اب رات بھر سفر کرنے والوں نے صبح ہونے پر دیکھا ہو گا تو چاروں طرف بے نشان ریت کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا ہو گا۔ اور بھوک پیاس سے ان کا برا حال ہو گا۔ ایسے میں انہیں وہ مکان اور جھونپڑیاں نظر آئی ہوں گی تو ان کے دل میں امید جاگی ہو گی۔ لیکن انہیں ڈر بھی ہو گا۔ بہرحال صحرا میں امید خوف سے بڑی ہوتی ہے۔ کیونکہ صحرا میں بھٹکنے کا مطلب یقینی موت ہوتا ہے۔

وہ لوگ رک تو گئے تھے۔ لیکن انداز ایسا تھا کہ کسی بھی لمحے بھاگ کھڑے ہوں گے۔

''السلام علیکم''۔ عبدالحق نے پرتپاک لہجے میں کہا۔

یہ سنتے ہی ان کے چہروں پر جو سکون نظر آیا، وہ حیران کن بالکل نہیں تھا۔ ''وعلیکم السلام''۔ انہوں نے کہا۔ ''یہ جگہ پاکستان میں ہے نا؟''۔

''الحمدللہ''۔

''اللہ کا شکر ہے''۔ سب سے بڑے نے کہا۔ ''ہم لوگ یہاں کچھ دیر رک سکتے ہیں؟''۔

''کچھ دیر کیا، آپ جب تک چاہیں، یہاں رہیں''۔

''چلو نواز..... اترو''۔

وہ تین مرد تھے اور ان کے ساتھ پانچ عورتیں تھیں۔ جس نے بات کی تھی، اس کے ساتھ ایک بوڑھی عورت تھی، جو یقیناً اس کی ماں تھی۔ دوسرے دو مردوں کے ساتھ دو دو عورتیں تھیں۔ ان میں ایک جوان لڑکی تھی..... سولہ سترہ سال کی۔

بات کرنے والے نے اپنی گود میں اٹھا کر بوڑھی عورت کو اتارا۔ لیکن بوڑھی عورت کی ٹانگیں جواب دے گئیں۔ وہ ریت پر ڈھیر ہو گئی۔ اس کا حال بہت برا تھا۔ بیٹے نے ریت پر بیٹھتے ہوئے ماں کو سہارا دیا۔ دوسرے لوگ بھی اتر آئے تھے۔

''زبیر..... پانی لاؤ ان لوگوں کے لئے''۔ عبدالحق نے زبیر سے کہا۔ زبیر کے جانے کے بعد وہ بڑے لڑکے کی طرف مڑا۔ ''خواتین کو وہاں بھیج دیں۔ وہاں میری اماں اور بھابھی موجود ہیں''۔ اس نے مکان کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے تشکر آمیز نظروں سے عبدالحق کو دیکھا، پھر عورتوں سے بولا۔ ''جاؤ..... تم لوگ وہاں چلی جاؤ''۔

عورتیں چلی گئیں۔ زبیر پانی لے آیا تھا۔ بوڑھی عورت کو دو گھونٹ پانی دیا گیا۔ اس کے چہرے پر بحالی نظر آنے لگی۔

.....x.....

ایک گھنٹے بعد عبدالحق ان کے بارے میں سب جان چکا تھا۔ وہ تینوں بھائی تھے۔ سب سے بڑا نیاز تھا۔ اس کے ساتھ اس کی ماں تھی۔ پھر نواز تھا اور سب سے چھوٹا ریاض۔ تینوں شادی شدہ تھے اور ان کی بیویاں بھی ساتھ تھیں۔ سب سے کم عمر لڑکی ان کی بہن تھی۔

ان لوگوں کا تعلق اودے پور سے تھا۔ وہ وہاں کے خوش حال لوگوں میں سے تھے۔ لیکن پاکستان کی خاطر اپنا سب کچھ وہیں چھوڑ آئے تھے۔ اپنے بھرے پرے گھر سے پاکستان کے لئے نکلتے ہوئے انہوں نے صرف تن کے کپڑے لئے تھے۔

''شہر یہاں سے کتنا دور ہے؟''۔ نیاز نے پوچھا۔

''بارہ پندرہ میل ہو گا''۔ عبدالحق نے کہا۔

''یعنی زیادہ وقت نہیں لگے گا''۔

''تو آپ لوگ ابھی جانا چاہتے ہیں''۔

''جی ہاں۔ جانا تو ہے''۔

عبدالحق سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ ''کوئی ضروری تو نہیں۔ آپ لوگ یہاں رک سکتے ہیں''۔

''آپ پر بوجھ ہی بنیں گے''۔

''بھائی بھائی کے لئے بوجھ نہیں ہوتا''۔ عبدالحق نے سادگی سے کہا۔ ''آپ چاہیں تو یہاں زندگی بھر رہیں''۔

نیاز نے بہت غور سے اسے دیکھا۔ پھر اس کی نگاہوں سے تشکر جھلکنے لگا۔ ''آپ کے خلوص اور محبت نے مجھے خرید لیا ہے۔ لیکن یہاں ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ ہم لوگ نہ کاشت کار ہیں، نہ گلہ بان۔ ہم تاجر ہیں۔ ہمارے لئے شہر ہی مناسب رہے گا''۔

''لیکن ابھی شہر میں آپ کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ عورتوں کو لیکر کہاں پھرتے رہیں گے۔ میری مانیں تو عید یہیں کریں۔ پھر آپ شہر جا کر حالات دیکھیں۔ بات بن جائے تو آ کر سب کو لے جائیں''

''بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔ لیکن.....''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

''دیکھیں، یہاں جگہ کی کمی نہیں۔اللہ کے فضل سے ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔دو مکان ہیں۔دو جھونپڑیاں بھی ہیں۔ایک مکان میں آپ لوگ رہ سکتے ہیں''۔

''ہم آپ کا یہ احسان.....''۔

''اس میں احسان کی کوئی بات ہی نہیں''۔عبدالحق نے اس کی بات کاٹ دی۔

اس کی ضرورت تو نہیں تھی۔مگر عبدالحق نے دو مکان یہ سوچ کر بنوائے تھے کہ ایک زبیر اور رابعہ کے لئے ہے۔

شام تک انہیں پوری طرح احساس ہو گیا کہ پاکستان بن چکا ہے۔شام تک تین اور مہاجر گھرانے وہاں پہنچ گئے۔وہ سب بہت زیادہ تباہ حال تھے۔کیونکہ وہ سب پیدل سفر کر کے آئے تھے۔اور صحرا میں تو سفر ہی آسان نہیں ہوتا۔کجا یہ کہ پیدل سفر۔

عبدالحق نے انہیں بھی ٹھہرالیا۔

وہاں اسلامی یگانگت اور ایثار کا جو مظاہرہ دیکھنے میں آیا، وہ اس اعتبار سے غیر معمولی نہیں تھا کہ وہ پورے پاکستان کا منظر تھا۔ہر جگہ یہی کچھ ہو رہا تھا۔لوگ کھلی بانہوں کے ساتھ ہندوستان سے لٹ، پٹ کر ہجرت کر کے آنے والوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔چودہ سو سال پہلے انصار مدینہ نے جو روایت قائم کی تھی، وہ آج بھی زندہ تھی۔بلکہ اب اس کا احیا ہو رہا تھا۔

پہلے آنے والوں نے خود ہی فیصلہ کر لیا کہ بدلی ہوئی صورت حال میں ان کے لئے الگ مکان میں رہنا مناسب نہیں۔طے یہ پایا کہ دن میں عورتیں ایک گھر میں رہیں گی۔کھانا پکانا کریں گی۔رات کو شادی شدہ لوگ ایک گھر میں رہیں گے۔غیر شادی شدہ عورتیں دوسرے گھر میں رہیں گی اور غیر شادی شدہ مرد جھونپڑیوں میں شب بسری کریں گے۔

انہوں نے عبدالحق کو مستثنیٰ کرنا چاہا۔لیکن وہ نہ مانا۔

اگلے روز وہ مردوں کے ساتھ شہر گیا۔اس نے زبردستی ان کے اور گھر والوں کے لئے عید کی خریداری کی۔ضرورت کی چیزیں خریدیں۔پھر انہوں نے اپنی مسجد کے لئے بات کی۔بالآخر انہیں ایک پیش امام مل گیا۔

اب وہ عید کی نماز اپنی مسجد میں پڑھ سکتے تھے!

.....x.....

عید کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں تیزی سے آباد ہونے لگا۔عبدالحق نے شہر جا کر پٹواری سے بات کی۔کاغذات دکھائے۔لیکن وہ آدھی زمین کے کاغذات تھے.....اس زمین کے جو اس کے پتاجی نے چاچا جمال دین کے نام کی تھی۔باقی کاغذات حویلی میں ہوں گے، جوریت کے تلے دفن تھی۔

''بابا.....اس وقت کاغذات کی ضرورت نہیں۔جہاں تک زمین پر کسی کا دعویٰ نہیں، آپ قبضہ کر سکتے ہو''۔پٹواری نے کہا۔

''لیکن میں قبضہ نہیں کرنا چاہتا۔میں صرف اپنا حق لینا چاہتا ہوں''۔

''تم عجیب آدمی ہو۔میں بولتا ہوں، جہاں تک چاہو، زمین لے لو۔تم حساب کتاب میں پڑ رہے ہو''۔

عبدالحق کے اصرار پر پٹواری گاؤں آیا۔گاؤں میں وہ لوگوں سے ملا تو اور متاثر ہوا۔لوگ تو اس نوجوان کی پرستش کرتے تھے۔اس نے ان لوگوں کو گھر بنوا کر دیئے تھے۔غیر مشروط طور پر انہیں زمین دی تھی اور ہر طرح سے ان کی مدد کی تھی۔

''تم بابا اپنے لئے تو زمین لے نہیں رہے ہو۔پھر میری بات کیوں نہیں مانتے''۔پٹواری نے عبدالحق سے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ آپ حد بندی کر دیں۔اور پہلے ہمارے گاؤں کو نہری پانی بھی ملتا تھا۔لال آندھی کے بعد وہ رک گیا''۔

پتاجی کو لپٹائے بیٹھا تھا۔ان سے بولا نہیں جا رہا تھا۔لیکن انہیں بہت باتیں کرنی تھیں۔وقت بہت کم تھا۔لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہوئے تھے۔کچھ سمجھ میں آ رہا تھا اور بہت کچھ مبہم تھا۔شاید اس لئے بھی کہ اس وقت اس کا ذہن ٹھیک سے سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔مگر اب بھی اسے پتاجی کا کہا ہوا ایک ایک لفظ یاد تھا۔

ایک بات طے تھی۔گاؤں پر جے پور والوں نے حملہ کیا تھا۔

اچانک اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔پتاجی کی بات اسے یاد بھی آئی اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں نے جڑ کر جیسے مفہوم بھی پالیا۔

پتاجی نے کہا تھا.....تہہ خانے میں جو کچھ ہے، سب تمہارا ہے۔تم دہلی جا کر پڑھو۔یہاں نہیں رکنا۔

تہہ خانہ! سب کچھ!!

اچانک اس کا ذہن جیسے روشن ہو گیا۔''سب کچھ'' اس کی سمجھ میں آنے لگا۔تہہ خانے میں تجوری تھی۔زمین کے کاغذات کے علاوہ وہاں بھاری نقد رقم بھی ہو گی اور شاید سونا بھی۔اور وہ سب کچھ اس کا تھا۔

یادوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔اس کا ذہن بہت تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا۔اس کے پاس کھدائی کرا کے گاؤں کو برآمد کرانے کے وسائل نہیں تھے۔لیکن وہ وسائل حاصل ہو سکتے تھے۔وہ وسائل موجود تھے۔بس انہیں پانے کی کوشش کرنی تھی۔

بس اسے حویلی کے تہہ خانے تک رسائی حاصل کرنی تھی۔اور اس کے لئے اس کے پاس وسائل موجود تھے۔وہ سمجھ گیا کہ اگر وہ حویلی کو برآمد کرنے میں کامیاب ہو گیا تو گاؤں بھی برآمد ہو جائے گا۔

.....x.....

نور بانو اب پہلے کے مقابلے میں خوش تھی۔اب اسے یہاں آئے ہوئے اتنا عرصہ ہو گیا تھا کہ وہ وہاں اور یہاں کی زندگی کا موازنہ کر سکتی تھی.....تقابلی جائزہ لے سکتی تھی۔اور خوش وہ یوں تھی کہ اسے یہاں کی زندگی واضح طور پر اچھی لگی تھی۔

یہ ضرور تھا کہ وہاں کی زندگی آسان تھی اور یہاں کی سخت۔لیکن وہ زندگی بے رنگ بھی تو تھی جبکہ یہاں زندگی میں تمام کے تمام رنگ موجود تھے۔وہاں ہر چیز میسر تھی۔یہاں پانی بھی بہت بڑی نعمت تھا۔وہاں موسم کی سختیاں نہیں تھیں۔گرمی آئی تو ہلکے کپڑے پہن لئے۔سردی آئی تو گرم کپڑے پہن لئے۔یہاں موسم بے رحمی کی حد تک سخت تھا۔وہاں موسموں سے لطف لیا جاتا تھا۔یہاں موسم آزمائش تھا۔

نور بانو نے بہت کم وقت میں سمجھ لیا کہ یہ کینوس کا فرق ہے۔وہاں زندگی کا منظر بہت محدود تھا۔وہاں دنیا چار دیواروں کے درمیان تھی۔آسمان بے کراں نہیں تھا۔صحن سے جو آسمان کا چھوٹا سا ٹکڑا نظر آتا تھا، وہی آسمان تھا، ہاں کبھی چھت پر چلے گئے تو آسمان دیکھ لیا۔مگر یہاں کے آسمان کے مقابلے میں تو وہ بھی بہت چھوٹا تھا۔

نور بانو نے سمجھ لیا کہ وہ پنجرے میں قید پرندوں جیسی زندگی تھی۔وہاں ضرورت کی ہر چیز میسر تھی۔کھانا، پینا، کپڑے، کتابیں سب کچھ تھا۔وہ پڑھتی بھی تھی، سمجھتی بھی تھی۔اس کے مطابق عمل بھی کرتی تھی۔لیکن وہ کچھ اتنا مشکل نہیں تھا۔اللہ کے کسی حکم پر عمل کرنا اسے مشکل نہیں لگتا تھا۔کم از کم اوتار سنگھ سے بلا ارادہ محبت سے پہلے تو صورت حال یہی تھی۔وہ محبت ہوئی تو پہلی بار اسے احساس ہوا کہ یہ کام آسان نہیں۔ورنہ وہ سمجھتی تھی کہ اللہ کے احکامات مانتے ہوئے بڑی آسانی سے زندگی گزاری جا سکتی ہے۔اور جب اسے اوتار سنگھ کی محبت سے.....اپنے آپ سے لڑنا پڑا، تب بھی وہ صحیح معنوں میں نہیں سمجھ پائی۔بلکہ وہ اور مغرور ہو گئی۔وہ باجی کو حقیر سمجھنے لگی جو اپنی خواہش نفس سے لڑنے کے بجائے اس کے سامنے سپر ڈال بیٹھی تھیں۔اس نے نہیں سمجھا کہ ملامت کرنا دنیا کا آسان ترین کام ہے۔اور نفس سے لڑنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔زندگی کی ترغیبات سامنے موجود نہ ہوں تو نفس کشی بے معنی ہے۔وہ تو سمجھتی تھی کہ جنت کا حصول نہایت آسان ہے۔

اب پردے ہی کو لو۔وہاں پردہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔چھوٹے ٹھاکر سے پہلے تو وہاں کوئی ایسا تھا ہی نہیں، جس سے پردہ کیا جاتا۔باہر وہ نکلتی نہیں تھیں۔آکا میاں موجود تھے۔باہر کے تمام معاملات وہ دیکھتے۔ضرورت کی ہر چیز پیسوں سے مل جاتی تھی۔اس وقت تو اس نے کبھی ایسے نہیں سوچا۔لیکن اب وہ سوچتی تھی کہ اگر آکا میاں نہ ہوتے تو کیا ہوتا۔بوا بھی نہ ہوتیں تو سودا سلف لانے کے لئے اماں کو بازار جانا پڑتا۔تب پردہ ان کے لئے آزمائش ہوتا۔اور اگر اماں بیمار ہو جاتیں تو اسے بازار جانا پڑتا۔تب اس کی آزمائش ہوتی۔وہ کیا کرتی۔مردوں کے پیچھے اس کے تو منہ سے آواز بھی نہ نکلتی۔مگر دو چار بار جاتی تو اسے سمجھوتہ کرنا آ جاتا۔

یہاں کھلی فضا میں اسے آزادی کا احساس ہو رہا تھا۔پہلی بار وہ یہ سوچ رہی تھی کہ وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔وہ کہیں بھی جا سکتی ہے۔کوئی اسے نہیں روکے گا۔اب اسے اللہ کی پابندیوں کا خیال رکھنا ہے۔اب یہ اس کے لئے آزمائش ہے۔عبدالحق اس کے سامنے چلتا پھرتا ہے۔وہ اسے کھل کر، نظر بھر کر نہیں دیکھتی۔لیکن چوری چوری دیکھتی ہے۔اسے نہیں یاد رہتا کہ اللہ نگاہوں کی چوری سے بھی باخبر ہے۔وہ سب کچھ جانتا ہے۔سب کچھ دیکھتا ہے۔اب ہوئی نا مشکل۔

پردہ تو یہاں بھی ہوتا تھا۔اسی کو دیکھ کر اس کی سمجھ میں آیا کہ اصل میں پردہ کیا ہے۔یہاں زندگی ایسی تھی کہ عورتوں کو مردوں کے ساتھ کام کرنا پڑتا تھا۔ان کا ہاتھ بٹانا پڑتا تھا۔گھر کے باہر بہت سے کام عورتوں کو کرنے پڑتے تھے۔وہ پردہ کرتی تھیں۔پردے کا اہتمام نہیں کرتی تھیں۔وہ گھونگھٹ اس طرح نکالتیں کہ ان کا چہرہ چھپ جاتا۔پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا کہ پردہ برقع پہننے کا نام نہیں ہے۔برقع پہنے بغیر بھی پردہ کیا جا سکتا ہے۔پردہ خود کو اس طرح رکھنے اور چلنے پھرنے کا نام ہے کہ کم از کم آپ کے جسم کے حوالے سے کسی شخص کے ذہن میں کوئی سفلہ خیال نہ پیدا ہو۔کم از کم آپ کی کسی کوتاہی اور بے پروائی کی وجہ سے ایسا نہ ہو۔سچ یہ ہے کہ اسے چادر برقعے کے مقابلے میں زیادہ اچھی لگی۔

پھر پہلی بار اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ ہر چیز کے دو رخ ہیں۔ایک ظاہری اور دوسرا باطنی۔ظاہری رخ سے آپ دیا دکھاوا تو کر سکتے ہیں۔لوگوں کی نظر میں اچھے تو بن سکتے ہیں۔لیکن اللہ تو سب کچھ جانتا ہے۔اس کے سامنے سرخرو ہونے کے لئے باطن کو صاف کرنا ضروری ہے۔اس اعتبار سے ظاہری پردے کی کوئی اہمیت نہیں۔اہمیت باطنی پردے کی ہے۔اگر وہ عبدالحق کے سامنے نہیں آتی۔لیکن چھپ چھپ کر اسے دیکھتی ہے تو پردہ بے کار ہے۔

''حد بندی میں کر دیتا ہوں۔پر پانی کے لئے بابا تم کو محکمہ زراعت والوں سے بات کرنی ہو گی''۔

پٹواری نے بہت کھلے دل سے حد بندی کی۔اس نے وہ زمین بھی شامل کر دی۔جس کے کاغذات حویلی میں دفن تھے۔اس کے علاوہ اس نے ادھر ادھر کی اور زمینیں بھی اس گاؤں میں شامل کر دیں، جن کا کوئی دعوے دار نہیں تھا۔

''اب بابا اس گاؤں کا کوئی نام بھی رکھ دو''۔

''نام؟''۔عبدالحق نے حیرت سے کہا۔پھر اسے خیال آیا کہ پرانا نام تو اب مناسب نہیں۔''نام کی کیا ضرورت ہے''۔انہوں نے کہا۔

نیاز آگے بڑھ آیا۔وہاں اس وقت گاؤں کے سبھی لوگ موجود تھے۔''نام میں بتاتا ہوں''۔

''بولو بابا''۔

''اس گاؤں کا نام ہے حق نگر''۔

عبدالحق کو احتجاج کا موقع بھی نہیں ملا۔سب لوگ اس نام کی تائید میں بولنے لگے۔

''ٹھیک ہے بابا۔آج سے یہ حق نگر ہے''۔پٹواری بولا۔پھر وہ عبدالحق کی طرف مڑا۔''تم بابا کسی دن میرے پاس آ جاؤ۔میں تمہیں محکمہ زراعت سے ایک افسر سے ملوا دوں گا۔پانی کی بات کر لینا''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''دیکھیں، یہاں جگہ کی کمی نہیں۔اللہ کے فضل سے ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔دو مکان ہیں۔دو جھونپڑیاں بھی ہیں۔ایک مکان میں آپ لوگ رہ سکتے ہیں''۔

''ہم آپ کا یہ احسان.....''۔

''اس میں احسان کی کوئی بات ہی نہیں''۔عبدالحق نے اس کی بات کاٹ دی۔

اس کی ضرورت تو نہیں تھی۔مگر عبدالحق نے دو مکان یہ سوچ کر بنوائے تھے کہ ایک زبیر اور رابعہ کے لئے ہے۔

شام تک انہیں پوری طرح احساس ہو گیا کہ پاکستان بن چکا ہے۔شام تک تین اور مہاجر گھرانے وہاں پہنچ گئے۔وہ سب بہت زیادہ تباہ حال تھے۔کیونکہ وہ سب پیدل سفر کر کے آئے تھے۔اور صحرا میں تو سفر ہی آسان نہیں ہوتا۔کجا یہ کہ پیدل سفر۔

عبدالحق نے انہیں بھی ٹھہرا لیا۔

وہاں اسلامی یگانگت اور ایثار کا جو مظاہرہ دیکھنے میں آیا، وہ اس اعتبار سے غیر معمولی نہیں تھا کہ وہ پورے پاکستان کا منظر تھا۔ہر جگہ یہی کچھ ہو رہا تھا۔لوگ کھلی بانہوں کے ساتھ ہندوستان سے لٹ، پٹ کر ہجرت کر کے آنے والوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔چودہ سو سال پہلے انصار مدینہ نے جو روایت قائم کی تھی، وہ آج بھی زندہ تھی۔بلکہ اب اس کا احیا ہو رہا تھا۔

پہلے آنے والوں نے خود ہی فیصلہ کر لیا کہ بدلی ہوئی صورت حال میں ان کے لئے الگ مکان میں رہنا مناسب نہیں۔طے یہ پایا کہ دن میں عورتیں ایک گھر میں رہیں گی۔کھانا پکانا کریں گی۔رات کو شدی شدہ لوگ ایک گھر میں رہیں گے۔غیر شادی شدہ عورتیں دوسرے گھر میں رہیں گی اور غیر شادی شدہ مرد جھونپڑیوں میں شب بسری کریں گے۔

انہوں نے عبدالحق کو مستثنیٰ کرنا چاہا۔لیکن وہ نہ مانا۔

اگلے روز وہ مردوں کے ساتھ شہر گیا۔اس نے زبردستی ان کے اور گھر والوں کے لئے عید کی خریداری کی۔ضرورت کی چیزیں خریدیں۔پھر انہوں نے اپنی مسجد کے لئے بات کی۔بالآخر انہیں ایک پیش امام مل گیا۔

اب وہ عید کی نماز اپنی مسجد میں پڑھ سکتے تھے!

.....x.....

عید کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے گاؤں تیزی سے آباد ہونے لگا۔عبدالحق نے شہر جا کر پٹواری سے بات کی۔کاغذات دکھائے۔لیکن وہ آدھی زمین کے کاغذات تھے.....اس زمین کے جو اس کے پتا جی نے چاچا جمال دین کے نام کی تھی۔باقی کاغذات حویلی میں ہوں گے، جو ریت کے تلے دفن تھی۔

''بابا.....اس وقت کاغذات کی ضرورت نہیں۔جہاں تک زمین پر کسی کا دعویٰ نہیں، آپ قبضہ کر سکتے ہو''۔پٹواری نے کہا۔

''لیکن میں قبضہ نہیں کرنا چاہتا۔ میں صرف اپنا حق لینا چاہتا ہوں''۔

''تم عجیب آدمی ہو۔ میں بولتا ہوں، جہاں تک چاہو، زمین لے لو۔ تم حساب کتاب میں پڑ رہے ہو''۔

عبدالحق کے اصرار پر پٹواری گاؤں آیا۔ گاؤں میں وہ لوگوں سے ملا تو اور متاثر ہوا۔ لوگ تو اس نوجوان کی پرستش کرتے تھے۔ اس نے ان لوگوں کو گھر بنوا کر دیئے تھے۔ غیر مشروط طور پر انہیں زمین دی تھی اور ہر طرح سے ان کی مدد کی تھی۔

''تم بابا اپنے لئے تو زمین لے نہیں رہے ہو۔ پھر میری بات کیوں نہیں مانتے''۔ پٹواری نے عبدالحق سے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ آپ حد بندی کر دیں۔ اور پہلے ہمارے گاؤں کو نہری پانی بھی ملتا تھا۔ لال آندھی کے بعد وہ رک گیا''۔

''حد بندی میں کر دیتا ہوں۔ پر پانی کے لئے بابا تم کو محکمہ زراعت والوں سے بات کرنی ہوگی''۔

پٹواری نے بہت کھلے دل سے حد بندی کی۔ اس نے وہ زمین بھی شامل کر دی۔ جس کے کاغذات حویلی میں دفن تھے۔ اس کے علاوہ اس نے ادھر ادھر کی اور زمینیں بھی اس گاؤں میں شامل کر دیں، جن کا کوئی دعوے دار نہیں تھا۔

''اب بابا اس گاؤں کا کوئی نام بھی رکھ دو''۔

''نام؟''۔ عبدالحق نے حیرت سے کہا۔ پھر اسے خیال آیا کہ پرانا نام تو اب مناسب نہیں۔ ''نام کی کیا ضرورت ہے''۔ انہوں نے کہا۔

نیاز آگے بڑھ آیا۔ وہاں اس وقت گاؤں کے سبھی لوگ موجود تھے۔ ''نام میں بتاتا ہوں''۔

''بولو بابا''۔

''اس گاؤں کا نام ہے حق نگر''۔

عبدالحق کو احتجاج کا موقع بھی نہیں ملا۔ سب لوگ اس نام کی تائید میں بولنے لگے۔

''ٹھیک ہے بابا۔ آج سے یہ حق نگر ہے''۔ پٹواری بولا۔ پھر وہ عبدالحق کی طرف مڑا۔ ''تم بابا کسی دن میرے پاس آ جاؤ۔ میں تمہیں محکمہ زراعت سے ایک افسر سے ملوا دوں گا۔ پانی کی بات کر لینا''۔

''میں آ جاؤں گا''۔ عبدالحق نے کہا۔

.....x.....

نیاز عید کے تیسرے دن اپنے بھائی نواز کے ساتھ شہر گیا تھا۔ وہاں جا کر جو انہوں نے جائزہ لیا تو صورت حال کو خاصا مایوس کن پایا۔ ان کے پاس تھوڑی بہت رقم تھی۔ باقی تو سب کچھ وہ پیچھے ہی چھوڑ آئے تھے۔ انہیں پتا چلا تھا کہ ہندو ان کے گھر پر حملے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ ان کے ساتھ عورتیں بھی تھیں۔ عزت کا معاملہ تھا۔ وہ راتوں رات چپکے سے نکل آئے۔ عزت سے بڑھ کر تو کوئی چیز نہیں ہوتی۔

دونوں بھائی منہ لٹکائے واپس آئے تو عبدالحق سے بات ہوئی۔ ''آپ لوگ کام کیا کرتے رہے ہیں؟''۔ عبدالحق نے پوچھا

''میری تو دکان تھی۔ ریاض میرے پاس ہوتا تھا۔ اور یہ نواز مکان بناتا تھا''۔

عبدالحق کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''تب تو بات بن سکتی ہے''۔

''کیا مطلب؟''۔

''میرا مشورہ مانیں گے آپ؟''۔

''مشورہ کیسا، آپ حکم کریں''۔

''یہ گاؤں آباد ہوتا ہے تو یہاں مکان بھی بنیں گے۔ نواز بھائی کا تو کام ہو گیا۔ اور آپ لوگوں کے لئے میرا مشورہ ہے کہ مویشی پالیں''۔

اردو فینز ڈاٹ کام

''مگر ہمیں اس کا کوئی تجربہ ہی نہیں ہے''۔

''زبیر تجربہ کار ہے۔آپ اس کے ساتھ مل کر کام کریں۔تجربہ آپ ہی ہو جائے گا''۔

''ہمارے پاس زیادہ رقم بھی نہیں ہے''۔

''اس کی فکر نہ کریں۔سرمایہ زبیر کا ہوگا''۔

نیاز ہچکچا رہا تھا۔

''شہر میں جگہ بنانے کی نسبت یہ زیادہ آسان ہے''۔عبدالحق نے اسے سمجھایا۔''بکریوں میں برکت بھی ہے''۔

یوں وہ لوگ وہیں رک گئے اور انہوں نے زبیر کے ساتھ کام شروع کر دیا۔نواز بھی مصروف ہو گیا تھا۔وہ لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں رکے تو شاید اس لئے کہ نیاز کو گاؤں کا نام تجویز کرنا تھا۔

.....x.....

عید سے پہلے جو اور گھرانے آئے تھے،وہ کاشت کار تھے۔عبدالحق نے انہیں وہاں رکنے کو کہا تو وہ ہچکچائے۔''یہاں پانی تو ہے نہیں''۔

''ہمارے گاؤں میں پانی تھا''۔عبدالحق نے کہا۔''یہاں فصلیں ہوتی تھیں۔انشاءاللہ اب بھی ہوں گی۔انشاءاللہ ہمیں پانی ملے گا''۔

اس کے لہجے میں ایسا یقین تھا کہ وہ لوگ ماننے پر مجبور ہو گئے۔ویسے بھی وہ انہیں تمام سہولتیں فراہم کر رہا تھا اور وہ بھی بغیر کسی لالچ کے۔سر چھپانے کو ٹھکانہ اور پیٹ بھرنے کو کھانا۔اس ابتری کے عرصے میں یہ بہت بڑی نعمت تھی۔وہ جانتے تھے کہ در در پھرنے میں بڑی کٹھنائیاں ہیں۔

عبدالحق شہر گیا اور پٹواری کی وساطت سے محکمہ زراعت و آب پاشی کے افسر سے ملا۔افسر نے اس کی بات بڑی توجہ اور ہمدردی سے سنی۔وہ اس سے متاثر بھی نظر آ رہا تھا۔

''آپ تو پڑھے لکھے آدمی ہیں عبدالحق صاحب''۔

''جی.....میں گریجویشن نہیں کر سکا۔ایف اے پاس ہوں''۔عبدالحق نے بڑی عاجزی سے کہا۔

''آپ جیسے لوگوں کی تو سرکاری محکموں میں ضرورت ہے''۔

''فی الحال تو مجھے اپنے گاؤں کی فکر ہے جناب''۔

''بات یہ ہے عبدالحق صاحب کہ اس وقت ہمارے پاس وسائل نہ ہونے کے برابر ہیں۔ایسے میں ہجرت کر کے آنے والوں کے بوجھ نے مسائل میں بہت اضافہ کر دیا ہے۔آپ کا کیس میں سمجھ گیا ہوں۔لال آندھی نے نہ صرف نہری رابطہ منقطع کر دیا بلکہ زرعی اراضی کو صحرا میں تبدیل کر دیا ہے''۔

''نہری رابطہ بحال کیسے ہوگا؟''۔

''موجودہ صورت حال میں تو یہ ممکن ہی نہیں ہے۔پانی بلندی سے نشیب کی طرف جاتا ہے۔نشیب سے بلندی کی طرف نہیں۔اور آپ کا گاؤں پورے علاقے سے کم از کم بارہ پندرہ فٹ بلند ہو گیا ہے۔میری بات سمجھ رہے ہیں نا آپ''۔

عبدالحق کی سمجھ میں بات آ رہی تھی۔اس نے اثبات میں سر ہلایا

''اب ہمارے پاس ایسے وسائل نہیں کہ ہم ریت میں دبے ہوئے گاؤں کو نکال سکیں۔اور اس کے بغیر کچھ ہو نہیں سکتا''۔

''اگر میں یہ کام کر لوں تو؟''۔

''پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں۔لیکن یہ آپ کریں گے کیسے؟''۔

''کوشش کروں گا۔اللہ سے امید ہے کہ کامیابی ہوگی''۔

وہ رخصت ہونے لگا تو افسر نے کہا۔''میری بات پر غور کیجئے گا۔ہمارا ملک تعمیر کے مرحلے سے گزر رہا ہے۔اسے آپ جیسے پڑھے لکھے جوانوں کی ضرورت ہے۔ملک کے

لئے کچھ کرنے کا ارادہ ہو تو مجھ سے مل لیجئے گا"۔

عبدالحق وہاں سے چلا آیا۔

.....x.....

وہ اس پر سوچتا رہا۔ بظاہر یہ کام ناممکن تھا۔ ہزاروں ایکڑ زمین پر سے بارہ پندرہ فٹ ریت ہٹانا کوئی بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ اس کے لئے مشینوں اور آلات کی ضرورت تھی۔ اور اس پر بھی اس میں وقت لگتا۔ اور مشینوں اور آلات کی اس میں استطاعت نہیں تھا۔

رقم تو وہ دہلی سے بھی خاصی لایا تھا۔ پھر اماں نے بھی دیئے تھے۔ لیکن وہ خرچ بھی تو کھلے دل سے کرتا رہا تھا۔ گاؤں کو آباد کرنے کے لئے اس نے بہت خرچ کیا تھا۔ اب بھی اس کے پاس اچھی خاصی رقم تھی۔ لیکن جو مہم درپیش تھی، اس کے لئے تو وہ بہت ہی کم تھی۔ پھر یہ سوچ کر اس کا دل دکھ رہا تھا کہ اب تک کے کئے کرائے پر پانی پھر جائیگا۔ ریت کے نیچے سے گاؤں کو نکالنے کا مطلب تھا کہ جو مکان اس نے بنوائے ہیں، وہ ختم ہو جائیں گے۔ اور گاؤں کے نکلنے کے بعد نئے سرے سے تعمیر ہوگی۔

وہ سوچتا رہا۔ لیکن کوئی حل سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

اول تو وہ پریشان ہوتا ہی نہیں تھا۔ فکرمند ہوتا تو وہ قرآن پڑھنے بیٹھ جاتا۔ قرآن میں اس کے لئے یہ عجیب تاثیر تھی کہ وہ ہر پریشانی بھول جاتا تھا۔ ایک اور نعمت مسجد کے امام مہر علی تھے۔ وہ ان کے پاس جا بیٹھتا۔

مہر علی سادہ طبع اور دین سے بہت محبت کرنے والے تھے۔ ان کی طبیعت میں بہت نرمی اور حلیمی تھی۔

عبدالحق مہر علی کے پاس چلا گیا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''کیا بات ہے پتر۔کچھ پریشان لگ رہے ہو''۔مہر علی نے پوچھا۔

عبدالحق نے انہیں پوری روداد سنائی۔''اور میں نے پانی کا وعدہ کر کے لوگوں کو روکا تھا''۔اس نے آخر میں کہا۔

مہر علی چند لمحے سوچتے رہے۔پھر بولے۔''دیکھو پتر،اللہ کے ہاں نیتیں چلتی ہیں۔تمہاری نیت اچھی ہے۔تم نے جو کچھ کیا اور کر رہے ہو،بے لوثی کے ساتھ کر رہے ہو۔اس میں تمہاری اپنی کوئی غرض نہیں ہے۔تو اللہ تمہاری مدد ضرور کرے گا''۔

''مگر کیسے؟ مجھے تو کوئی امکان نظر ہی نہیں آ رہا ہے''۔

''یہ امکان تو ہم عقل والوں کی بات ہے۔اللہ کے ہاں تو ہونی ہوتی ہے اور ہو جاتی ہے۔چاہے بعد میں بھی بندوں کی سمجھ میں نہ آئے''۔

عبدالحق شرمندہ ہو گیا۔عمر اس کی کم تھی۔لیکن کتنا کچھ وہ دیکھ چکا تھا۔اماں اس کی مثال تھیں۔جہاں گاؤں کے گاؤں دفن ہو گئے۔وہاں اماں زندہ رہیں۔وہ ریت میں دفن نہیں ہوئیں۔اور وہ کیسے زندہ رہیں۔کھجور کے وہ درخت اب بھی موجود ہیں،جن کے ذریعے نے اللہ نے اماں کو غذا فراہم کی۔عبدالحق جانتا تھا کہ وہ درخت اللہ کی قدرت کی نشانی ہیں۔اس علاقے میں کھجور کم ہی ہوتا ہے۔آگے سندھ کی طرف بہت ہے۔اور پھر کھجور کا درخت راتوں رات بڑا نہیں ہوتا۔مگر اماں کو تو سب کچھ جیسے تیار ملا۔پینے کے لئے پانی۔وہ گھڑا،جس میں پانی کم نہیں ہوتا تھا۔تین دن تک تو اللہ کی اس قدرت کا ان سب نے مشاہدہ کیا تھا۔اب سوچو،اماں کے بچنے کا کوئی امکان تھا۔نہیں..... ہرگز نہیں۔مگر اماں بچ گئیں اور موجود ہیں۔یہ اللہ کی قدرت ہے۔واقعی اللہ کے ہاں امکان نہیں ہوتا۔ہونی ہوتی ہے اور ہو کر رہتی ہے۔

اور وہ خود کیسے بچا تھا۔لال آندھی آئی تو وہ خود بھی تو اس کی حدوں میں تھا۔ایک وقت ایسا لگتا تھا کہ وہ بھی ریت میں زندہ دفن ہو جائے گا۔اس کے جسم میں ہلنے کی بھی طاقت نہیں تھی۔ریت اس پر برس رہی تھی۔اور وہ اب بھی زندہ تھا۔

اتنا کچھ دیکھنے کے بعد بھی وہ امکان کی بات کرتا ہے!سچ ہے،انسان پر جب کوئی بحران آتا ہے،وہ اللہ کی پچھلی مہربانیاں اور نشانیاں بھول جاتا ہے۔وہ مایوس ہو جاتا ہے اور اللہ کو پکارنے کے بجائے امکان کی جستجو میں ادھر ادھر سر ٹکراتا رہتا ہے۔

عبدالحق پہلے تو شرمندہ ہوا۔پھر اس کے اندر ایک یقین ابھرا۔اللہ کے حکم سے گاؤں ریت میں دفن ہوا تو اللہ کی مرضی ہے تو وہ ریت سے نکلے گا بھی۔آباد بھی ہوگا۔اور اگر اللہ کی یہ مرضی نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔پریشان ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔

اس رات عشا کے بعد وہ ٹہلتا ہوا حویلی کی طرف چلا گیا۔وہاں وہ اس منڈیر پر بیٹھ گیا۔دعا میں اس نے اللہ سے گاؤں کے لئے مدد مانگی تھی۔اور اس کا دل مطمئن ہو گیا تھا۔جیسے اب یہ معاملہ اس کا نہیں رہا ہو۔

حویلی کی چھت کی اس منڈیر پر بیٹھے بیٹھے وہ حویلی کے بارے میں سوچنے لگا۔کبھی وہاں کیسی رونق ہوتی تھی۔اس کی نگاہوں میں بچپن کے منظر پھرنے لگے۔پتا جی گھوڑا بنے ہوئے ہیں اور وہ ان کی پیٹھ پر سواری کر رہا ہے۔ماتا جی پتا جی کا پسینے میں نہایا ہوا جسم تولئے سے خشک کر رہی ہیں۔اماں اسے دودھ کا پیالہ دے رہی ہیں۔وہ پتا جی سے ضد کر رہا ہے کہ اب ویر جی کی باری ہے۔

پھر اس نے جمال دین کو دیکھا۔اسے یاد آیا کہ گھوڑا بننے کی ذمے داری چاچا جمال دین نے سنبھال لی تھی۔اسے اپنا لکڑی کا گھوڑا یاد آیا۔چاچا جمال دین نے کیسے اسے سمجھایا تھا کہ اس نے لکڑی کے گھوڑے کو چھوڑ دیا ہے۔اس لئے اب وہ اداس رہنے لگا ہے۔

اور اسے اپنا کمرا یاد آیا۔حویلی کا سب سے روشن اور ہوادار کمرا!سچ یہ ہے کہ وہ کمرا اسے بہت عزیز تھا۔رہنے کی کوئی جگہ کبھی اسے اتنی اچھی نہیں لگی،جتنا وہ کمرا لگتا تھا۔اس کمرے میں کوئی بات تھی۔اس میں عجیب سا سکون تھا۔اور وہاں کسی کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا..... کسی بہت محبت کرنے والی مہربان ہستی کی موجودگی کا احساس!

اسے حیرت ہوئی کہ اس کمرے کو وہ کیسے بھولا ہوا تھا۔اس نے کبھی اسے یاد ہی نہیں کیا۔اس وقت وہ کمرا یاد آیا تو اس کا دل اس کمرے کے لئے مچلنے لگا۔اس کا بس چلتا تو ریت ہٹا کر اس کمرے میں پہنچ جاتا۔

وہ خواہش بچکانہ حد تک شدید تھی۔اس کے زیر اثر اس کا جسم کانپنے لگا۔اس نے دھیان ہٹانے کی کوشش کی۔

اسے حویلی کا آخری حوالہ یاد آیا۔

حویلی کا احاطہ لاشوں سے پٹا پڑا تھا۔اکثریت اجنبی لاشوں کی تھی۔پھر اس میں اسے ویر جی کی لاش نظر آئی تھی اور پھر چاچا جمال دین اور کئی جاننے والوں کی لاشیں ملی تھیں۔اس آخری روز وہ حویلی کے ہال سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔حویلی کے صدر دروازے پر دو لاشیں پڑی تھیں۔اندر دیوار سے ٹک کر پتا جی بیٹھے تھے۔وہ زندہ تھے۔ان کے قریب ہی مولوی برکت علی اور کیدار ناتھ کی لاشیں پڑی تھیں۔

وہ اس منظر کو تازہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔یادوں میں وہ سب کچھ دہرانا نہیں چاہتا تھا۔لیکن ان یادوں سے دامن چھڑانا اس کے بس میں نہیں تھا۔وہ تو جیسے کسی ٹرانس میں تھا۔

اور اب تو وہ جیسے جیتا جاگتا منظر تھا!

پتا جی کو لپٹائے بیٹھا تھا۔ان سے بولا نہیں جا رہا تھا۔لیکن انہیں بہت باتیں کرنی تھیں۔وقت بہت کم تھا۔لفظ ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہوئے تھے۔کچھ سمجھ میں آ رہا تھا اور بہت کچھ مبہم تھا۔شاید اس لئے بھی کہ اس وقت اس کا ذہن ٹھیک سے سمجھنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔مگر اب بھی اسے پتا جی کا کہا ہوا ایک ایک لفظ یاد تھا۔

ایک بات طے تھی۔گاؤں پر جے پور والوں نے حملہ کیا تھا۔

اچانک اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔پتا جی کی بات اسے یاد بھی آئی اور ٹوٹے پھوٹے لفظوں نے جڑ کر جیسے مفہوم بھی پا لیا۔

پتا جی نے کہا تھا..... تہہ خانے میں جو کچھ ہے،سب تمہارا ہے۔تم دہلی جا کر پڑھو۔یہاں نہیں رکنا۔

تہہ خانہ!سب کچھ!!

اچانک اس کا ذہن جیسے روشن ہو گیا۔''سب کچھ''اس کی سمجھ میں آنے لگا۔تہہ خانے میں تجوری تھی۔زمین کے کاغذات کے علاوہ وہاں بھاری نقد رقم بھی ہوگی اور شاید سونا بھی۔اور وہ سب کچھ اس کا تھا۔

یادوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔اس کا ذہن بہت تیز رفتاری سے کام کر رہا تھا۔اس کے پاس کھدائی کرا کے گاؤں کو برآمد کرانے کے وسائل نہیں تھے۔لیکن وہ وسائل حاصل ہو سکتے تھے۔وہ وسائل موجود تھے۔بس انہیں پانے کی کوشش کرنی تھی۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

بس اسے حویلی کے تہہ خانے تک رسائی حاصل کرنی تھی۔اور اس کے لئے اس کے پاس وسائل موجود تھے۔وہ سمجھ گیا کہ اگر وہ حویلی کو برآمد کرنے میں کامیاب ہوگیا تو گاؤں بھی برآمد ہوجائے گا۔

.....x.....

نوربانو اب پہلے کے مقابلے میں خوش تھی۔اب اسے یہاں آئے ہوئے اتنا عرصہ ہوگیا تھا کہ وہ وہاں اور یہاں کی زندگی کا موازنہ کرسکتی تھی.....تقابلی جائزہ لے سکتی تھی۔ اور خوش وہ یوں تھی کہ اسے یہاں کی زندگی واضح طور پر اچھی لگی تھی۔

یہ ضرور تھا کہ وہاں کی زندگی آسان تھی اور یہاں کی سخت۔لیکن وہ زندگی بے رنگ بھی تو تھی جبکہ یہاں زندگی میں تمام کے تمام رنگ موجود تھے۔وہاں ہر چیز میسر تھی۔یہاں پانی بھی بہت بڑی نعمت تھا۔وہاں موسم کی سختیاں نہیں تھیں۔گرمی آئی تو ہلکے کپڑے پہن لئے۔سردی آئی تو گرم کپڑے پہن لئے۔یہاں موسم بے رحمی کی حد تک سخت تھا۔ وہاں موسموں سے لطف لیا جاتا تھا۔یہاں موسم آزمائش تھا۔

نوربانو نے بہت کم وقت میں سمجھ لیا کہ یہ کینوس کا فرق ہے۔وہاں زندگی کا منظر بہت محدود تھا۔وہاں دنیا چار دیواروں کے درمیان تھی۔آسمان بے کراں نہیں تھا۔صحن سے جو آسمان کا چھوٹا سا ٹکڑا نظر آتا تھا، وہی آسمان تھا، ہاں کبھی چھت پر چلے گئے تو آسمان دیکھ لیا۔مگر یہاں کے آسمان کے مقابلے میں تو وہ بھی بہت چھوٹا تھا۔

نوربانو نے سمجھ لیا کہ وہ پنجرے میں قید پرندوں جیسی زندگی تھی۔وہاں ضرورت کی ہر چیز میسر تھی۔کھانا، پینا، کپڑے، کتابیں سب کچھ تھا۔وہ پڑھتی بھی تھی، سمجھتی بھی تھی۔ اس کے مطابق عمل بھی کرتی تھی۔لیکن وہ کچھ اتنا مشکل نہیں تھا۔اللہ کے کسی حکم پر عمل کرنا اسے مشکل نہیں لگتا تھا۔کم از کم اوتار سنگھ سے بلا ارادہ محبت سے پہلے تو صورت حال یہی تھی۔وہ محبت ہوئی تو پہلی بار اسے احساس ہوا کہ یہ کام آسان نہیں۔ورنہ وہ سمجھتی تھی کہ اللہ کے احکامات مانتے ہوئے بڑی آسانی سے زندگی گزاری جاسکتی ہے۔اور جب اسے اوتار سنگھ کی محبت سے.....اپنے آپ سے لڑنا پڑا، تب بھی وہ صحیح معنوں میں نہیں سمجھ پائی۔بلکہ وہ اور مغرور ہوگئی۔وہ باجی کو حقیر سمجھنے لگی جو اپنی خواہش نفس سے لڑنے کے بجائے اس کے سامنے سپر ڈال بیٹھی تھیں۔اس نے نہیں سمجھا کہ ملامت کرنا دنیا کا آسان ترین کام ہے۔اور نفس سے لڑنا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔زندگی کی ترغیبات سامنے موجود نہ ہوں تو نفس کشی بے معنی ہے۔وہ تو سمجھتی تھی کہ جنت کا حصول نہایت آسان ہے۔

اب پردے ہی کو لو۔وہاں پردہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔چھوٹے ٹھاکر سے پہلے تو وہاں کوئی ایسا تھا ہی نہیں، جس سے پردہ کیا جاتا۔باہر وہ نکلتی نہیں تھیں۔آکا میاں موجود تھے۔باہر کے تمام معاملات وہ دیکھتے۔ضرورت کی ہر چیز پیسوں سے مل جاتی تھی۔اس وقت تو اس نے کبھی ایسے نہیں سوچا۔لیکن اب وہ سوچتی تھی کہ اگر آکا میاں نہ ہوتے تو کیا ہوتا۔بوا بھی نہ ہوتیں تو سودا سلف لانے کے لئے اماں کو بازار جانا پڑتا۔تب پردہ ان کے لئے آزمائش ہوتا۔اور اگر اماں بیمار ہوجاتیں تو اسے بازار جانا پڑتا۔تب اس کی آزمائش ہوتی۔وہ کیا کرتی۔مردوں کے پیچھے اس کے تو منہ سے آواز بھی نہ نکلتی۔مگر دو چار بار جاتی تو اسے سمجھوتہ کرنا آجاتا۔

یہاں کھلی فضا میں اسے آزادی کا احساس ہو رہا تھا۔پہلی بار وہ یہ سوچ رہی تھی کہ وہ کچھ بھی کرسکتی ہے۔وہ کہیں بھی جاسکتی ہے۔کوئی اسے نہیں روکے گا۔اب اسے اللہ کی پابندیوں کا خیال رکھنا ہے۔اب یہ اس کے لئے آزمائش ہے۔عبدالحق اس کے سامنے چلتا پھرتا ہے۔وہ اسے کھل کر، نظر بھر کر نہیں دیکھتی۔لیکن چوری چوری دیکھتی ہے۔ اسے نہیں یاد رہتا کہ اللہ نگاہوں کی چوری سے بھی باخبر ہے۔وہ سب کچھ جانتا ہے۔سب کچھ دیکھتا ہے۔اب ہوئی نا مشکل۔

پردہ تو یہاں بھی ہوتا تھا۔اسی کو دیکھ کر اس کی سمجھ میں آیا کہ اصل میں پردہ کیا ہے۔یہاں زندگی ایسی تھی کہ عورتوں کو مردوں کے ساتھ کام کرنا پڑتا تھا۔ان کا ہاتھ بٹانا پڑتا تھا۔گھر کے باہر بہت سے کام عورتوں کو کرنے پڑتے تھے۔وہ پردہ کرتی تھیں۔پردے کا اہتمام نہیں کرتی تھیں۔وہ گھونگھٹ اس طرح نکالتیں کہ ان کا چہرہ چھپ جاتا۔پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا کہ پردہ برقع پہننے کا نام نہیں ہے۔برقع پہنے بغیر بھی پردہ کیا جاسکتا ہے۔پردہ خود کو اس طرح رکھنے اور چلنے پھرنے کا نام ہے کہ کم از کم آپ کے جسم کے حوالے سے کسی شخص کے ذہن میں کوئی سفلہ خیال نہ پیدا ہو۔کم از کم آپ کی کسی کوتاہی اور بے پروائی کی وجہ سے ایسا نہ ہو۔سچ یہ ہے کہ اسے چادر برقعے کے مقابلے میں زیادہ اچھی لگی۔

پھر پہلی بار اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ ہر چیز کے دو رخ ہیں۔ایک ظاہری اور دوسرا باطنی۔ظاہری رخ سے آپ دنیا دکھاوا تو کرسکتے ہیں۔لوگوں کی نظر میں اچھے تو بن سکتے ہیں۔لیکن اللہ تو سب کچھ جانتا ہے۔اس کے سامنے سرخرو ہونے کے لئے باطن کو صاف کرنا ضروری ہے۔اس اعتبار سے ظاہری پردے کی کوئی اہمیت نہیں۔اہمیت باطنی پردے کی ہے۔اگر وہ عبدالحق کے سامنے نہیں آتی۔لیکن چھپ چھپ کر اسے دیکھتی ہے تو پردہ بے کار ہے۔

اگر وہ برقع اوڑھ کر خود کو نمایاں کرتی ہے تو وہ سزا کی مستحق ہے۔

ان سوچوں کے نتیجے میں اسکے اندر تبدیلیاں آئیں۔ویسے ہی وہ ایک بالکل مختلف معاشرت میں چلی آئی تھی۔ایسے میں یا تو آدمی اس نئی معاشرت کو یکسر مسترد کردیتا ہے یا پھر خود کو اس میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔مگر اس کے ذہن میں تو ایک لمحے کے لئے بھی اس معاشرت کو مسترد کرنے کا خیال نہیں آیا تھا چنانچہ اسے مطابقت تو پیدا کرنی تھی۔اسے پتہ چل رہا تھا کہ اس کے ذہن میں دین کی تفہیم اب پیدا ہو رہی ہے۔

وہ یہاں چولی اور گھاگھرے میں آئی تھی، جو یہاں کا خاص لباس تھا۔اسے حجاب تو آیا تھا لیکن اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ پہلی بار بے پردہ باہر نکلی تھی۔بعد میں اسے اندازہ ہوا کہ اسے وہ لباس برا نہیں لگا تھا بلکہ اچھا لگا تھا۔پھر یہاں اس نے حمیدہ کو اس لباس میں دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ یہ لباس غیر اسلامی نہیں ہے۔اور حمیدہ خود کو چادر میں اس طرح لپیٹتی تھی کہ اس کے سامنے برقع بے حیثیت لگتا تھا۔

چنانچہ اس کے بعد اس نے چولی اور گھاگھرا شوق سے پہنا۔عبدالحق اس کیلئے عید کے کپڑے شہر ہی لایا تھا۔لیکن ساتھ میں چادر بھی تھی۔اس نے حمیدہ کی باقاعدہ تقلید شروع کردی۔

وہ رابعہ کو روز قرآن پڑھاتی تھی۔اسے اسلامی معاشرت کے بارے میں بتاتی تھی مگر ساتھ ہی وہ باہر کے کاموں میں دلچسپی لینے لگی۔اس کے علاوہ وہ کھانا بہت شوق سے پکاتی تھی۔وہ سب اس کے ہاتھ کے کھانے کے عادی ہوگئے۔خاص طور پر حمیدہ۔اس نے دہلی کے کھانے بھلا کب کھائے تھے۔

ابتدا میں تو اسے عبدالحق سے بہت حجاب آتا تھا۔پھر چادر لے کر، گھونگھٹ نکال کر وہ بلا جھجک اس کے سامنے سے گزرنے لگی۔ہاں اس کی موجودگی میں چلتے ہوئے اس کی دھڑکنیں تیز ہوجاتی تھیں۔ان کی لے ہی بدل جاتی تھی اور قدموں میں تیزی کے ساتھ لڑکھڑاہٹ بھی آجاتی تھی۔مگر وہ سب کچھ بے حد خوشگوار ہوتا تھا۔

پھر اور لوگ آئے اور عبدالحق نے انہیں روک لیا۔عید بہت اچھی ہوگئی۔شروع میں تو وہ ایک فیملی کی طرح رہے۔بعد میں عبدالحق نے ان کیلئے الگ کچے مکان بنوا دیئے۔ ان میں لڑکیاں بھی تھیں اور سب کی سب بہت خوب صورت تھیں۔

عورتوں میں ایک جبلی حس ہوتی ہے۔بہت سی باتیں وہ بغیر کہے جان لیتی ہیں۔نوربانو بھی جان گئی کہ ان میں سے ہر لڑکی عبدالحق میں دلچسپی لے رہی ہے۔اس میں ان کا قصور بھی نہیں تھا۔عبدالحق تھا ہی ایسا۔لیکن نوربانو بھڑک اٹھی۔اب تک وہ مسابقت سے محفوظ تھی۔لیکن اب مسابقت درپیش تھی۔اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ پہلی کمزوری تو یہ تھی کہ عبدالحق پر اس کا کوئی حق نہیں تھا۔وہ تو یہی جانتی تھی کہ عبدالحق کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں مگر اسے اپنی محبت کی خاطر اسے ان لڑکیوں سے محفوظ رکھنا تھا۔

چادر اوڑھنے کا سلیقہ اس نے حمیدہ سے سیکھ لیا تھا۔وہ باہر نکلنے لگی۔چند ہی دنوں میں اس کی جھجک ختم ہوگئی۔وہ چادر کو چہرے پر اس طرح لیتی کہ اس کا چہرہ چھپ جاتا۔لیکن عبدالحق قریب ہوتا تو جیسے اس کا پلو خود بہ خود سرک جاتا۔کبھی کوئی لڑکی عبدالحق کے آس پاس ہوتی اور اسے اپنے وجود کا احساس دلانے کی کوشش کر رہی ہوتی تو وہ اسے پکارتی اور کسی کام کا کہہ کر وہاں سے ہٹا دیتی۔وہاں وہ سب کے لئے بڑی محترم تھی۔وہ سب اسے ملکہ سمجھتے تھے۔اس کی بات کی تعمیل کرنا ان پر فرض تھا۔بلکہ وہ تو اس پر حیران ہوتیں کہ نوربانو پانی بھرنے کے لئے کنویں پر کیوں جا رہی ہے جبکہ وہ اس کام کے لئے حاضر ہیں۔

اس دوران اسے ایک اطمینان ہوگیا۔عبدالحق خواتین کی موجودگی میں نظریں اٹھانے کا قائل ہی نہیں تھا۔اور ایک اس میں بڑی بات یہ تھی کہ وہ دیکھتا تو کھل کر دیکھتا۔کن انکھیوں سے چپکے چپکے دیکھنا اسے آتا ہی نہیں تھا۔

کبھی وہ یہ سوچتی کہ یہ سب کچھ وہ کیوں کر رہی ہے۔جبکہ اس کا کوئی امکان ہی نہیں کہ عبدالحق اس کی طرف متلفت ہوگا۔لیکن مذہب کی دیوار گر جانے کے بعد اس کے پاس اپنی محبت سے لڑنے کا کوئی جواز نہیں رہا تھا۔اب وہ اس محبت میں بہنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتی تھی۔بلکہ اب تو اس کی سمجھ میں یہ بھی آگیا کہ معاشرت کی یہ تبدیلی بھی اس نے عبدالحق کی محبت میں ہی قبول کی ہے۔یہ سوچ کر وہ اس کے محبوب کی معاشرت ہے۔

پھر اس کے لئے مسابقت کا مسئلہ ہی نہیں رہا۔عبدالحق گاؤں کی بہتری کی فکر میں ایسا مصروف ہوا کہ اس کی ایک جھلک دیکھنا بھی مسئلہ بن گیا۔بس دو وقت وہ حمیدہ سے ملنے ضرور آتا تھا.....صبح سویرے اور رات کو سونے سے پہلے۔

ادھر زبیر نے نیاز کے ساتھ مل کر بکریاں پالیں تو اسے ایک مشغلہ مل گیا۔رابعہ بکریوں کا خیال رکھتی تھی۔نوربانو اس کام میں اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔بکریاں اسے بہت اچھی لگتی تھیں۔وہ ان کے لئے چارہ بناتی، پانی لاکر ناند میں بھرتی۔پہلی بار اس نے جانور دیکھے تھے۔گائیں تو خیر اسے گندی لگتی تھیں اور وہ ان سے گھبراتی تھی لیکن بکریوں کی طرف اس کا دل کھنچتا تھا۔

پھر پہلی بکری نے بچے دیئے تو وہ اس کیلئے بہت خوب صورت دن تھا۔دو اتنے خوب صورت، اتنے نرم بچے۔ان سے تو اسے پہلی نظر میں محبت ہوگئی۔وہ انہیں اچھنبے سے دیکھتی اور سوچتی.....زندگی ایسی ہوتی ہے، ایسے شروع ہوتی ہے اور اتنی خوب صورت ہوتی ہے۔بکری کے وہ دونوں بچے اس کے کھلونے بن گئے۔ان کی رفتار دیکھ دیکھ کر وہ حیران ہوتی۔

''یہ دونوں بچے مجھے چاہئیں آپا''۔اس نے رابعہ سے کہا۔

''تو آپ ہی کے ہیں منجھلی بی بی''۔

''ایسے نہیں.....باقاعدہ میرے۔تم زبیر بھائی سے بات کرو، میں ان کی قیمت ادا کروں گی''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

''وہ آپ سے پیسے لیں گے!نہیں منجھلی بی بی.....وہ مجھ پر خفا ہوں گے''۔

لیکن نور بانو نہ مانی۔پہلی بار اس نے اپنی رقم میں سے کچھ رقم نکالا اور ان بچوں کی قیمت ادا کر دی۔

اب وہ بچے اس کے تھے۔

اسے پتا ہی نہیں تھا کہ کھلی آب وہوا کی یہ صحرائی زندگی اس پر کیا اثرات مرتب کر رہی ہے۔مگر اس دن آئینہ دیکھتے ہوئے اسے تبدیلی کا احساس ہوا۔اس نے اپنے عکس کو غور سے دیکھا اور حیران رہ گئی۔

اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ وہ ہے۔اس نے غور ہی نہیں کیا تھا کہ وہ اتنی تبدیل ہو چکی ہے۔وہ سحر زدہ سی اپنے عکس کو دیکھتی رہی۔

اس کی رنگت شروع ہی سے سانولی تھی۔مگر اب اس کی جلد چمک دار اور چکنی ہو گئی تھی۔اور آنکھیں تو اس کی اپنی لگ ہی نہیں رہی تھیں۔ان آنکھوں میں اب صحراؤں کی وسعت اور پنہائیاں تھیں۔ان میں نجانے کہاں سے گہرائی آ گئی تھی۔اور اس کا استخوانی چہرہ بھر گیا تھا اور خوب صورت لگ رہا تھا۔

آئینے سے نظریں ہٹانے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔لیکن اب وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ کیا یہ تبدیلی چہرے تک محدود ہے،یا وہ جسمانی طور پر بھی تبدیل ہوئی ہے۔ہاتھوں پر ایک نظر ڈالتے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ تبدیلی مکمل ہے۔جلد کی وہ چمک اور چکناہٹ چہرے تک محدود نہیں تھی۔اس کے ہاتھ بھی خوب صورت ہو گئے تھے۔اس کا جسم چھریرا ہو گیا تھا۔ہڈیوں پر گوشت چڑھ گیا تھا۔لیکن وہ موٹی ہرگز نہیں ہوئی تھی۔

پہلی بار اسے اپنا آپ بہت اچھا لگا۔پہلی بار وہ بہت گہرائی میں اترے ہوئے اپنے احساس کم تری کی قید سے آزاد ہوئی۔اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ ہے۔مگر اب جو کچھ وہ تھی،وہ یہاں آ کر بنی تھی۔یہ یہاں کی فضاؤں،وسیع زمین اور کھلے آسمان کا کرشمہ تھا۔یہ باہر نکل کر باہر کے کام کرنے کی وجہ سے تھا کہ اس کے جسم کو صحت مندی اور مضبوطی ملی تھی۔

پہلی بار اس کے دل نے خلوص اور سچائی سے نعرہ لگایا.....پاکستان زندہ باد!

اس روز وہ باہر نکلی تو اس کی چال بدلی ہوئی تھی۔

.....×.....

عبدالحق کے پاس جو کچھ بھی تھا اس نے وہ سب حویلی میں جھونکنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔اس کا مقصد کم سے کم وقت میں حویلی کے تہہ خانے تک پہنچنا تھا۔اس کے وہ شہر سے مزدور بھی لایا اور دو ٹریکٹر بھی۔

گاؤں کے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کی عظمت رفتہ کو بحال کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔گاؤں میں جو کاشت کار گھرانے تھے،وہ پانی کے امکان سے مایوس ہو چکے تھے۔انہیں عبدالحق سے موہوم سی امید تھی کہ وہ ریت ہٹوائے گا تو نہری نظام بحال ہو جائے گا۔حالانکہ یہ بہت مشکل کام تھا۔لیکن انسان جبلی طور پر پرامید ہوتا ہے۔انہیں یقین تھا کہ یہ معجزہ رونما ہو گا۔لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ وہ صرف حویلی کو برآمد کرانے کے بعد کھدائی کر رہا ہے تو وہ مایوس ہو گئے۔

وہ سب عبدالحق کے احسان مند تھے۔بے سروسامانی اور غریب الوطنی کے عالم میں اس نے انہیں وہ سب کچھ دیا تھا،جو کوئی انہیں نہیں دے سکتا تھا۔جبکہ اسے ان سے کوئی لالچ،کوئی غرض نہیں تھی۔

تو اب وہ اس سے بے مروتی نہیں کر سکتے تھے۔وہ اس سے منہ پھیر کر تو نہیں جا سکتے تھے۔لیکن ان کے لئے اس نئی مملکت میں اپنے مستقبل کو تلاش کرنا بہت ضروری تھا۔کیونکہ گاؤں میں پانی نہیں تو کچھ بھی نہیں تھا۔اور پانی کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔

چنانچہ اپنے گھر والوں کو گاؤں چھوڑ کر وہ نئے امکانات کی تلاش میں شہر کی طرف چل دیئے۔

گاؤں میں مٹی ہٹانے کا کام بہت تیزی سے شروع ہوا۔عبدالحق نے بڑے پیمانے پر کام شروع کرایا تھا۔وجہ یہ تھی کہ اس نے بھی لوگوں کی مایوسی محسوس کر لی تھی اور وہ جلد از جلد گاؤں کے لئے پانی کی فراہمی شروع کرانا چاہتا تھا۔

کام شروع ہوا تو عبدالحق کو ایک اور اہم کام کے لئے فرصت مل گئی۔وہ اہم کام تھا اماں کی آنکھوں کا علاج۔شہر میں ایک بڑے ڈاکٹر سے اس نے بات کی تھی۔بس اب اسے اماں کو وہاں لے جانا تھا۔

حویلی برآمد کرانے کے کام کی دیکھ بھال زبیر بخوبی کر سکتا تھا۔کیونکہ وہ حویلی کے چپے چپے سے واقف تھا۔عبدالحق نے اس عرصے میں اماں کو لے کر شہر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

ڈاکٹر نے حمیدہ کی آنکھوں کا تفصیلی معائنہ کیا۔اس کا تجزیہ بے حد حوصلہ افزا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب،اماں کی آنکھیں ٹھیک ہو سکتی ہیں نا؟''۔عبدالحق نے پوچھا۔وہ نروس ہو رہا تھا۔اس کیلئے اماں کی آنکھوں کی بڑی اہمیت تھی۔

''انشااللہ ٹھیک ہو جائیں گی''۔ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔''دراصل ابتدا میں کوتاہی نہ ہوتی تو یہ مسئلہ ہی نہ ہوتا۔انہیں آنکھوں کو خوب اچھی طرح دھوتے رہنا چاہئے تھا۔آنکھیں آپ ہی دھل کر صاف ہو جاتیں''۔

''تو اب آپ کیا تجویز کریں گے؟''۔

''میں ایک دوا لکھ رہا ہوں۔تین دن تک یہ آنکھوں میں ڈالیں۔اس کے بعد معائنہ کر کے ہی میں کچھ کہہ سکوں گا''۔

عبدالحق نے اماں کو گاؤں واپس لے جانا مناسب نہ سمجھا۔ایک تو وہ انہیں بار بار سفر کی تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔دوسرے وہ اس مسئلے کو حل کر کے ہی واپس جانا چاہتا تھا۔وہ وہیں مقیم ہو گیا۔

ڈاکٹر نے دن میں تین بار آنکھوں میں دوا ڈالنے کی ہدایت کی تھی۔لیکن عبدالحق نے پہلی بار ہی دوا ڈالی تو حمیدہ تڑپ کر رہ گئی۔صابر عورت تھی،اس نے شکایت تو نہیں کی۔بس اتنا کہا۔''پتر.....تم مل گئے ہو تو مجھے آنکھوں کی کیا ضرورت ہے۔اور بینائی چلی جائے تو واپس نہیں آتی''۔

''ایسی بات نہیں ہے اماں''۔عبدالحق بولا۔''ڈاکٹر نے کہا ہے تو انشااللہ تم دیکھ سکو گی۔بس تین دن برداشت کر لو''۔

مگر حمیدہ کی آنکھوں میں تو جیسے آگ لگ گئی تھی۔آنکھوں کے ڈھیلوں میں درد بھی بہت شدید ہو گیا تھا۔ایسا لگ رہا تھا،جیسے انہیں کھرچا جا رہا ہو۔لیکن عبدالحق کی محبت میں وہ برداشت کر رہی تھی۔پھر بھی وہ آنکھوں کو ملے بغیر نہ رہ سکی۔

اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔عبدالحق نے رومال سے اس کی آنکھیں پونچھیں۔وہ مٹیالے رنگ کا پانی تھا۔

ہر بار دوا ڈالنے پر آنکھوں سے جو پانی نکلتا تھا،وہ پہلے سے زیادہ مٹیالا اور زیادہ گاڑھا ہوتا تھا۔خوش آئند بات یہ تھی کہ ہر بار تکلیف پہلے سے کم ہو جاتی تھی۔دوسرے دن تو وہ کچھ سی لگنے لگی۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

تیسری صبح ایک عجیب بات ہوئی۔ عبدالحق حمیدہ کی طرف پانی کا گلاس بڑھا رہا تھا کہ حمیدہ نے ہاتھ بڑھا کر گلاس سے ذرا پیچھے روکا اور لرزتی ہوئی بیچانی آواز میں بولی۔ ”پتر..... یہ گلاس ہے نا“

”ہاں اماں“۔

حمیدہ نے گلاس کو چھوا۔ اس کی انگلیاں لرز رہی تھیں۔ گلاس تھامنے کے بجائے اس نے اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اس کے چہرے کی طرف بڑھایا اور بولی۔ ”یہ..... یہ تمہاری ناک..... یہ ہونٹ..... یہ آنکھیں ہیں“۔

عبدالحق کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ ”تم دیکھ رہی ہو اماں۔ تمہیں نظر آ رہا ہے؟“ اس کے لہجے میں یقین اور بے یقینی کا امتزاج تھا۔

”ہاں پتر۔ دھندلا دھندلا سا نظر آ رہا ہے مجھے“۔

اب تو یہ کھیل ہو گیا۔ حمیدہ کسی چیز کو چھوتی، اس کا نام بتاتی۔ پھر وہ دونوں خوش ہوئے۔ پھر حمیدہ نے آنکھوں پر زور دیتے ہوئے عبدالحق کو بہت غور سے دیکھا۔ ”ارے پتر..... تو کتنا بڑا ہو گیا۔ کتنا خوب صورت نکلا ہے تو۔ ارے تو تو پورا مرد بن گیا رے“۔ اور اس نے عبدالحق کو لپٹا لیا۔

وہ پہلا دن تھا کہ حمیدہ نے شوق سے آنکھوں میں دوا ڈالوائی۔ ویسے تو اب تکلیف پہلے جیسی تھی بھی نہیں۔ لیکن اب اسے یقین تھا کہ اللہ اسے اس کی بینائی واپس دے رہا ہے۔

تین دن پورے ہونے پر عبدالحق اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر بہت خوش ہوا۔ ”مجھے یقین تھا کہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ آپریشن کی نوبت نہیں آئے گی“۔ ڈاکٹر نے کہا۔

”شروع میں بہت تکلیف ہوئی تھی ڈاکٹر صاحب“۔

”وہ تو ہونی ہی تھی۔ دراصل آپ کی اماں کی آنکھوں میں جو ریت بھر گئی تھی، وہ صاف نہ ہونے کی وجہ سے جم کر سخت ہو گئی۔ ابتدا میں دوا نے اسے نرم کرنے کا کام کیا تو تکلیف ہوئی۔ نرم ہونے کے بعد وہ ریت اکھڑ کر بہنے لگی۔ ہر بار دوا ڈالنے پر مرحلہ آسان ہوا ہوگا“۔

”جی ہاں“۔

”مگر مجھے بس دھندلا دھندلا دکھائی دیتا ہے، صاف نہیں“۔ حمیدہ نے کہا۔

ڈاکٹر ہنسنے لگا۔ ”برسوں کی جمی ہوئی ریت ہے اماں۔ آنکھ صاف ہونے میں وقت تو لگے گا۔ بس دوا ڈالتی رہیں اور ہاں عرق گلاب بھی ڈالتی رہیں۔ اس سے دکھن کم ہو گی اور آنکھوں کو آرام ملے گا“۔

”آپ معائنہ تو کر لیں ڈاکٹر صاحب“۔ عبدالحق نے کہا۔ ”دیکھ لیں۔ کیا پتا، آپریشن کی ضرورت ہو“۔

ڈاکٹر نے حمیدہ کی آنکھوں کا تفصیلی معائنہ کیا۔ ”نہیں..... آپریشن کی ضرورت نہیں۔ سیدھا سا معاملہ ہے۔ بس یہ دوا اور عرق گلاب ڈالتے رہیں“۔

”ہمیں یہیں رکنا ہوگا؟“ عبدالحق نے پوچھا۔

”نہیں..... اس کی ضرورت نہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کو بعد میں بھی یہاں آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ البتہ احتیاط کرنا ہوگی۔ ایک تو یاد رکھیں کہ دو مسلسل رات دن سے زیادہ نہ ڈالیں۔ سات دن ہو جائیں تو تین چار دن کا وقفہ کر دیں۔ عرق گلاب مگر باقاعدہ ڈالتے رہیں۔ اس کے علاوہ آنکھوں کو تیز چمک سے بچانا ہوگا۔ اس کے لئے رنگین شیشوں کا چشمہ لگا لیں۔ ورنہ آنکھوں کو نقصان پہنچ سکتا ہے“۔

عبدالحق اور حمیدہ گاؤں واپس آئے تو بہت خوش تھے۔

.....X.....

حمیدہ کو سب سے زیادہ اشتیاق نورا نو کو دیکھنے کا تھا۔ اور جج یہ ہے کہ اسے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی۔ جیسا اس نے سوچا تھا، وہ اس سے بڑھ کر ہی تھی۔

حمیدہ نے عبدالحق توسیع کر دیا تھا کہ وہ گاؤں میں کسی کو بھی اس کی بینائی کی جزوی بحالی کے بارے میں نہ بتائے۔ لہٰذا نورا نو کو معلوم بھی نہیں تھا کہ حمیدہ اسے دیکھ رہی ہے۔ حمیدہ کو چشمے سے بہت الجھن ہو رہی تھی۔ ایک تو وہ چشمہ لگنے کی عادی نہیں تھی۔ چشمہ اسے بوجھ لگتا تھا۔ دوسرے چشمہ لگا کر اسے ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔ لیکن جب اس نے دن کی روشنی میں چشمہ اتارا تو گھبرا گئی۔ دن کی روشنی اور بھی صحرائی علاقے میں..... وہ تو سخت منظر آنکھوں کیلئے بھی آزمائش بن جاتی ہے۔ وہ تو ایک طرح سے چھلی ہوئی آنکھیں تھیں۔ روشنی اس کی آنکھوں میں بری طرح چبھی اور ایک لمحے کے بعد اسے ہر طرف گھپ اندھیرا نظر آنے لگا۔ وہ ڈر گئی کہ شاید بینائی بحال ہونے سے پہلے وہ پوری طرح اندھی ہو گئی ہے۔ اس نے گھبرا کر دوبارہ چشمہ لگا لیا۔ مگر آنکھوں کی وہی کیفیت تھی۔ اور وہ حماقت پر پچھتانے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اس بار چشمہ لگانے پر چشمے کی ایک اذیت اس کی سمجھ میں آئی۔ چشمہ لگانے پر ضمخدک کا احساس ہمیشہ ہوتا ہوگا۔ مگر کیونکہ وہ چشمے کو بوجھ سمجھتی تھی، اس لیے یہ احساس اس کے شعور تک نہیں پہنچا تھا۔ لیکن اس بار اس کی سمجھ میں آ گیا۔

چند لمحے بعد اس کا خوف دور ہو گیا۔ کیونکہ اسے پہلے جیسا ہی نظر آ رہا تھا۔ جیسے دو رات میں سب کچھ دھندلا ہی ہو۔ اس نے دل میں اللہ کا شکر ادا کیا اور چشمے پر قناعت ہو گئی۔

وہ اس کیلئے بڑا دلچسپ عرصہ تھا۔ اسے ہر طرح کے مشاہدے کا موقع مل رہا تھا۔ خاص طور پر نورا نو کو بہت قریب سے۔ خوف، باتیں کرتی اور بڑے غور سے دیکھتی۔ وہ اس سے اس کی دلی کی زندگی کے بارے میں پوچھتی۔ نورا نو کو ماضی میں جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ ماضی میں دو تین چیزیں تھیں، وہ دو کھٹے، جنہیں وہ بھول جانا چاہتی تھی۔ اس نے حمیدہ کو اپنے گھر اور گھر والوں پر گزرنے والے سانحے کے بارے میں بتایا تو مگر بہنوں کی آبروریزی والی تفصیل گول کر گئی۔

حمیدہ کو بھی اندازہ ہو گیا کہ نورا نو اپنے دکھ بھول جانا چاہتی ہے۔ اس نے اس کے ماضی کو کریدنا چھوڑ دیا۔ نورا نو نے جو کچھ اسے بتایا تھا، اس سے وہ اس کے پچھلے رہن سہن کے بارے میں جان گئی تھی۔ اسے احساس تھا کہ یہ لڑکی بہت بڑی تبدیلی سے گزری ہے۔

وہاں اور لڑکیاں بھی تھیں اور وہ سب بنیادی طور پر اسی ماحول کی تھی۔ لیکن حمیدہ کو عبدالحق کے لئے یہ شہری لڑکی ہی بھائی تھی۔ نجانے اس میں ایسی کیا بات تھی۔

ایک دن حمیدہ نے نورا نو سے پوچھا۔ ”یہاں کی زندگی تو تمہیں بہت سخت لگتی ہوگی؟“

”سخت تو ہے اماں، لیکن اتنی سخت بھی نہیں۔ بلکہ میں سمجھتی ہوں کہ آدمی کو یہ سب کچھ آنا چاہئے“۔ نورا نو نے جواب دیا۔

”پھر بھی تمہارا من تو شہر میں زندگی گزارنے کو چاہتا ہوگا“۔

”نہیں اماں۔ یہاں مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ یہاں آ کر مجھے لگا ہے کہ میں نے خود کو اب جانا ہے۔ میں تو خود کو جانتی ہی نہیں تھی۔ یہاں کی مصروفیت مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ وہاں خالی پن کا احساس ہوتا تھا“۔

”عبدالحق کو کب سے جانتی ہو؟“

”جی..... وہ..... جی نہیں۔ میں کہاں.....“ نورا نو بری طرح گڑبڑا گئی۔

”تو تم نے اسے پہلے دیکھا ہی نہیں تھا؟“

”نن..... نہیں..... ایک بار دیکھا تھا۔ وہ مارے ہاں تو پردہ تھا نا..... بہت سخت پردہ“۔

حمیدہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ لیکن اس کے چہرے کے تاثرات وہ نہیں دیکھ سکی۔ کاش..... وہ پہلے کی طرح دیکھ سکتی ہوتی۔ اسے محرومی کا احساس ہونے لگا۔ پھر بھی زبان کی لڑکھڑاہٹ بھی بہت کچھ بتا رہی تھی۔ حمیدہ نے سمجھ لیا کہ یہ لڑکی عبدالحق کو بہت پہلے سے پسند کرتی ہے۔

حمیدہ نے اس وقت چشمہ اتارا ہوا تھا۔ ”یہ غم اپنا حال کیا کرلیا رے پتر“۔

”بس اماں، وہ چار دن کی بات ہے۔ پھر فرصت مل جائے گی“۔

”تم نے تو خود کو بہت مصروف کر لیا ہے پتر۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ حویلی کو نکالنا چاہتی ہے“۔

عبدالحق بری طرح چونکا۔ ”کیوں اماں؟“

”وہ آندھی اللہ کا قہر تھی۔ اور جہاں اللہ کا قہر آئے، اس جگہ سے دور رہنا اچھا ہوتا ہے۔ میں تو کہتی ہوں، دو بار بنے دے وہ سب کچھ“۔

عبدالحق چند لمحے سوچتا رہا۔ پھر اس کا دل نہیں مانا۔ ”دیکھو اماں، ایہ جگہ پاکستان میں ہے اور جب تک ریت نہیں ہٹتی، بے کار ہے۔ جبکہ ہندوستان سے لوگ پاکستان اور اسلام کی محبت میں اپنے گھر زمین سونا چاندی چھوڑ کر بے سروسامان چلے آ رہے ہیں تو میں سوچتا ہوں کہ اس پر ان کا حق ہے۔ وہ یہاں آباد ہوں، انہیں زمین ملے، وہ کاشت کاری کریں۔ اچھی زندگی گزاریں۔ میں یہ سب ان لوگوں کے لئے کر رہا ہوں“۔

”تو اس کے لئے تو دو بے ہوئے گاؤں نکالنے ہوں گے“۔

”ہاں اماں۔ اور اس کیلئے بہت پیسہ چاہئے۔ اسی لئے تو میں پہلے حویلی نکال رہا ہوں۔ وہاں سے مجھے پیسہ بھی ملے گا اور زمین کے کاغذات بھی۔ پھر میں یہ دوسرا کام شروع کراؤں گا“۔

”بات تو اچھی ہے پتر۔ پر کام بہت بڑا اور مشکل ہے“۔

”اللہ سے دعا کرتی رہو اماں۔ انشاء اللہ ہو جائے گا“۔

”مجھے تو اب تیری شادی کی فکر ہے پتر۔ تو اتنے لیے کھیڑوں من نہ پڑ“۔

”اماں، میں تو بس اللہ کو خوش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ شادی کا کیا ہے۔ وہ بھی ہو جائے گی“۔

”کوئی لڑکی پسند ہے تجھے؟“

عبدالحق گڑبڑا گیا۔ ”ارے نہیں اماں۔ وقت آنے پر تم ہی دیکھ لینا کوئی لڑکی“۔

”میں نے تو پہلے ہی دیکھی ہوئی ہے۔ بس یونورا نو ہمیں بہت اچھی لگتی ہے۔ تجھے کیسی لگتی ہے؟“

”اچھا بہلانے کی بات نہیں اماں۔ وہ تو بہن ہی اچھی“۔ عبدالحق نے گہری سانس لے کر کہا۔ ”لیکن اماں، تم ان کے بارے میں ایسے نہ سوچا کرو۔

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

میں انہیں اس وعدے پر ساتھ لایا ہوں کہ ان کے رشتہ داروں کو تلاش کروں گا اور انہیں ان تک پہنچاؤں گا۔ وہ بس ہمارے ہاں مہمان ہیں اماں"۔

یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں ایسی اداسی تھی کہ حمیدہ کا دل کٹنے لگا۔ بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ یہ دونوں ہی ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن اپنی اپنی محبت میں گم ہیں..... دوسرے کے دل سے بے خبر۔ دونوں اپنی اپنی جگہ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دوسرے کی محبت کے قابل نہیں۔ اس نے سوچ لیا کہ انہیں ملانا اس کا کام ہے۔

.....X.....

بالآخر حویلی یوں نمودار ہوئی، جیسے چند برس پہلے وہ سطح زمین پر تھی۔

عبدالحق کو پہلی بار مٹی کی طاقت کا اندازہ ہوا۔ پہلے وہ نہیں سمجھ سکتا تھا کہ مٹی پتھر کو بھی چاٹ جاتی ہے۔ وسیع و عریض حویلی کی تعمیر بڑی مضبوط تھی۔ اپنے زمانے میں اسے دیکھ کر اس کے ناقابل تسخیر ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ مگر اب وہ ایک کھنڈر میں تبدیل ہو چکی تھی۔ چھتیں تو تمام بیٹھ چکی تھی۔ بیشتر دیواروں کا یہ حال تھا کہ ہاتھ سے دھکیلوں تو ڈھے جائیں۔ یہ بڑی بات تھی کہ چند کمرے اچھی حالت میں تھے۔ ان میں ٹھاکر پرتاب سنگھ کی خواب گاہ اور عبدالحق کا کمرا شامل تھا جو اسے بہت پسند تھا۔ لیکن چھتوں سے وہ بھی محروم ہو گئے تھے۔

وہاں پہلا سب سے بڑا کام ان سینکڑوں ڈھانچوں سے نمٹنا تھا، جو ریت کے نیچے سے برآمد ہوئے تھے۔ انہیں دیکھ کر عبدالحق ٹھہر گیا۔ یہ ہے زندگی اور یہ ہے زندگی کا انجام۔ اس نے سوچا۔ ان ڈھانچوں کی کوئی شناخت نہیں تھی۔ وہ خود اپنے باپ کو نہیں پہچان سکتا تھا۔

ان ڈھانچوں کو اجتماعی طور پر زمین میں دبا دیا گیا۔

عبدالحق نے مزدوروں اور ٹریکٹروں کو واپس نہیں جانے دیا۔ بلکہ انہیں آگے کے کام پر لگا دیا۔ اب تو اسے مزدوروں اور ٹریکٹروں کی تعداد میں اور اضافہ کرنا تھا۔ اپنے گاؤں کو دوبارہ آباد کرنا اس کا خواب بن گیا تھا۔

اس شام کو وہ بہت خوش خوش حمیدہ کے پاس پہنچا۔ ''اماں..... حویلی پوری طرح نکل آئی ہے''۔

''مبارک ہو پتر۔ اور مجھے لگ رہا ہے اب میں سب کچھ پوری طرح دیکھ سکتی ہوں''۔ حمیدہ نے کہا۔

''اماں..... دیکھنے چلو گی؟'' اس کے لہجے میں دبا دبا ہیجان تھا۔

نور بانو کچھ فاصلے پر بیٹھی یہ گفتگو سن رہی تھی۔

حمیدہ اللہ کے قہر کے حوالے سے خوف زدہ تھی۔ لیکن بیٹا خوش تھا تو وہ انکار کیسے کر سکتی تھی۔ بس اسے ڈھارس یہ تھی کہ عبدالحق نے یہ سب کچھ ایک بہت بڑے اور نیک مقصد کیلئے کیا ہے۔ ''کیوں نہیں پتر۔ ضرور چلوں گی''۔

''تو آؤ نا اماں''۔

حمیدہ اٹھ کر اس کے ساتھ چلی۔ نور بانو پر نظر پڑی تو اس نے کہا۔ ''چل دھیے، تو بھی آ جا''۔

نور بانو کچھ جھجکی، کچھ شرمائی۔ مگر حویلی دیکھنے کی اسے آرزو تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ حویلی کو دیکھ کر عبدالحق کے بارے میں کچھ اور جاننے کا موقع ملے گا۔ اس نے حمیدہ کا ہاتھ تھام لیا۔

''رابعہ کہاں ہے؟'' باہر نکل کر عبداللہ نے کہا۔

''ہاں پتر۔ ان دونوں کا بھی حق ہے۔ ساتھ لے لے انہیں''۔

''زبیر کو تو میں وہاں چھوڑ کر آیا ہوں۔ رابعہ کو لینا ہے''۔

رابعہ جانوروں کے باڑے سے نکلتی دکھائی دی۔ عبدالحق نے اسے بھی ساتھ لے لیا۔

وہ سب حویلی کے کھنڈر کی طرف بڑھ گئے۔

.....X.....

حویلی کی حدود میں وہ چار افراد، افراد نہیں رہے، کردار بن گئے۔ انہیں وہاں گزرے ہوئے لمحے اور واقعات یاد آ رہے تھے۔ وہ ایسی تنویمی کیفیت میں تھے کہ بلند آواز میں واقعات کو دہراتے اور انہیں خیال بھی نہ ہوتا کہ ان کی آواز بلند ہے۔ حال سے ان کا رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ اس وقت وہ سب اپنے اپنے ماضی میں تھے۔

اور ان میں ایک فرد تماشائی تھا..... جیسے کوئی مبصر ہو۔ اور وہ نور بانو تھی۔ کبھی تو اسے شرمندگی ہوتی کہ وہ مخل ہو رہی ہے۔ لیکن وہاں تو کسی کو اس کی موجودگی کا احساس ہی نہیں تھا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

احاطے کی طرف بڑھتے ہوئے زبیر نے کہا۔"یہیں باہر چھوٹے ٹھاکر کی پیدائش کا جشن منایا جارہا تھا"۔

"شہر سے ناچنے گانے والیاں آئی ہوئی تھیں"۔رابعہ بولی۔

"وصال دین کے ابا نے مجھے بتایا تھا کہ ٹھاکرانی نے بڑے ٹھاکر کو بلایا تھا اور کسی کی ہمت نہیں تھی ان سے کہنے کی۔تو ان لوگوں نے وصال دین کے ابا سے کہا تھا.....۔

نور بانو حیرت سے انہیں دیکھ اور سن رہی تھی۔ان سبھوں کے لہجے خواب ناک تھے۔لگتا تھا کہ حال سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے،جیسے وہ ابھی آیا ہی نہیں ہے۔وہ عبدالحق کو چھوٹے ٹھاکر کہہ رہے تھے اور عبدالحق کو کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔اس نے عبدالحق کو دیکھا۔مگر وہ جیسے اپنے آپ میں نہیں تھا۔

نور بانو نے حیرت اور مسرت سے سوچا،اس وقت یہاں ایسی تنہائی ہے کہ وہ اسے جی بھر کر دیکھ سکتی ہے۔کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا.....خود عبدالحق کو بھی نہیں۔

"اور وہ بوڑھا بابا ادھر سے آیا تھا"۔زبیر اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔"وہی بابا،جس نے دہلی میں ہمارے گھر کو آکر ہمیں مسلمان کیا"۔

اس بار جیسے نور بانو بھی سحر زدہ ہوگئی۔اسے دہلی والا بالا لمبے ڈگ بھرتا،آتا ہوا دکھائی دینے لگا۔

پٹرومیکس اٹھائے ہوئے زبیر آگے آگے چل رہا تھا۔وہ احاطے میں داخل ہوئے تو اس نے کہا۔"یہاں بڑے ٹھاکر پنچایت لگاتے تھے"۔

عبدالحق کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔اس کے پاس حوالہ ہی ایسا تھا۔یہی تو وہ جگہ تھی،جہاں اس نے ویر جی کی اور چاچا جمال دین کی لاشیں دیکھی تھیں۔اسے لگ رہا تھا کہ اس کا دل پگھل رہا ہے۔سینہ خالی ہوا جارہا ہے۔

وہ صدر دروازے سے گزر کر اندر داخل ہوئے تو عبدالحق کا گریہ اور بڑھ گیا۔یہاں اس نے مولوی صاحب کی لاش دیکھی تھی اور مرتے ہوئے باپ سے آخری بار بات کی تھی۔وہ سب کچھ اسے لفظ بہ لفظ یاد تھا اور اس کی سماعت میں گونج رہا تھا۔سچ تو یہ ہے کہ حویلی کو برآمد کرانے کا خیال اسے پتا جی کی آخری گفتگو یاد کرتے ہوئے ہی آیا تھا۔

وہ آگے بڑھتے رہے۔"یہ بڑے ٹھاکر کی بیٹھک ہے"۔زبیر کہہ رہا تھا۔"دن میں وہ یہیں لوگوں سے ملتے تھے"۔

اب وہ بڑے ٹھاکر کی خواب گاہ کے دروازے پر تھے۔زبیر سب سے آگے تھا اور نور بانو سب سے پیچھے۔نور بانو نے عبدالحق کے قدموں کو ٹھٹھکتے دیکھا۔زبیر بھی ایک لمحے کو رکا تھا۔لیکن حمیدہ نے ہیجانی لہجے میں کہا۔"آگے چلو....."۔

زبیر نے پلٹ کر عبدالحق کو دیکھا۔عبدالحق نے اثبات میں سر ہلایا۔زبیر آگے بڑھ گیا۔

نور بانو نے سوچا،یہ کمرا یقیناً عبدالحق کیلئے اہمیت رکھتا ہے۔تبھی تو اس کے قدم رکے تھے۔

حمیدہ ایک بے چوکھٹ کے دروازے کے پاس رک گئی۔"یہ ہے میرے پتر.....میرے چھوٹے ٹھاکر کا کمرا"۔اس نے چھلکتی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ سب اس کشادہ کمرے میں داخل ہوئے۔"یہاں.....کھڑکی کے پاس بستر تھا۔بستر کے ساتھ پنگھوڑا۔اس میں چھوٹے ٹھاکر لیٹے تھے۔یہیں میں نے پہلی بار چھوٹے ٹھاکر کو دیکھا۔اور میں نے پہلی بار اسے گود میں لیا تو وہ دودھ مانگنے لگا....."یہ کہتے ہوئے بوڑھی حمیدہ کے رخسار بھی دہک اٹھے۔"ٹھاکرانی نے بتایا کہ اس نے ابھی تک دودھ نہیں پیا ہے۔وہ مجھ سے دودھ مانگ رہا تھا اور ماں کا دودھ نہیں پی رہا تھا....."۔

سب اپنے اپنے ماضی کے سحر سے نکل آئے تھے۔ان کے سامنے ماضی کا ایک ایسا باب کھل رہا تھا،جس سے وہ بے خبر تھے۔

"ایسی ضد کبھی کسی بچے نے نہیں کی ہوگی۔جان کے لالے پڑ گئے۔ڈاکٹر بھی ناکام ہوگئے....."۔

وہ سب سحر زدہ سے حمیدہ کو تک رہے تھے.....

"ایک طرف راج پوتی آن تھی،دوسری طرف بیاہ کے بائیس برس بعد پیدا ہونے والے منتوں مرادوں کے بچے کی جان....."

بائیس برس!نور بانو نے سوچا۔کتنا چاہتے ہوں گے ان کے ماں باپ انہیں.....

"پتا نہیں کیا بات تھی۔کچھ اللہ کی طرف سے ہی تھا۔میں چھوٹے ٹھاکر کو دودھ پلانے کیلئے ایسے تڑپی کہ اپنے وصال دین کو دودھ پلانے سے چڑنے لگی۔وصال دین کے ابا ڈرتے تھے کہ ٹھاکر جی کو اس تڑپ کا پتا چل گیا تو وہ ہم سب کو مروادیں گے....."

کیسی پریوں والی کہانی ہے!

"مگر ٹھاکر جی بڑے آدمی تھے۔جب ان کی سمجھ میں آگیا تو وہ آدھی رات کو خود چل کر ہمارے گھر آئے۔حالانکہ وہ کسی کو بھیج کر بلواتے تو میں سر کے بل جاتی۔میری تو اپنی غرض تھی۔لیکن وہ خود چل کر آئے.....سوالی بن کر....."۔

نور بانو کے ذہن میں بڑے ٹھاکر کا خاکہ بن رہا تھا.....بارعب.....آن والے.....

"بیٹے کی خاطر انہوں نے پرکھوں کی آن اور اپنے دھرم کو ایک طرف رکھ دیا....."۔

نور بانو اس باپ کی محبت کا اندازہ کرنے کی کوشش کررہی تھی.....

"یہاں مسہری تھی۔یہاں بیٹھ کر میں نے چھوٹے ٹھاکر کو گود میں لیا۔وہ بہت کمزور ہورہا تھا۔پھر میں نے پہلی بار اسے دودھ پلایا۔پھر میں یہاں لیٹ کر سوگئی اس دن سے ٹھاکر جی نے ہمیشہ ہمارا احسان مانا۔حالانکہ وہ احسان نہیں تھا،محبت تھی۔ماتا کا احسان سے کیا واسطہ۔مگر ٹھاکر جی نے ہمیں برابر کا رتبہ دیا اپنا سب کچھ آدھا ہمیں دے دیا۔وہ مجھے بہن کہتے تھے۔بہت بڑے آدمی تھے وہ....."۔

عبدالحق کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"میں یہیں چھوٹے ٹھاکر کو ہر روز دودھ پلاتی تھی۔ٹھاکرانی پریشان تھیں کہ رات کو میرے گھر جانے کے بعد کیا ہوگا۔مگر میرا چھوٹا ٹھاکر عقل مند بچہ تھا۔اس نے رات کو میری ضد کبھی نہیں کی۔رات کو وہ اپنی ماتا جی کا دودھ پی لیا کرتا تھا۔یوں کبھی کسی کو پتا نہ چلا....."

عبدالحق کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"میں یہیں چھوٹے ٹھاکر کو ہر روز دودھ پلاتی تھی۔ٹھاکرانی پریشان تھیں کہ رات کو میرے گھر جانے کے بعد کیا ہوگا۔مگر میرا چھوٹا ٹھاکر عقل مند بچہ تھا۔اس نے رات کو میری ضد کبھی نہیں کی۔رات کو وہ اپنی ماتا جی کا دودھ پی لیا کرتا تھا۔یوں کبھی کسی کو پتا نہ چلا....."۔

وہ اس کمرے سے نکلے۔باہر ایک دروازہ تھا۔اس دروازے کے باہر پچھواڑا تھا.....بے حد وسیع وعریض۔سامنے کہیں کہیں شکستہ دیوار نظر آرہی تھی۔

"یہاں ٹھاکر جی پہلی بار اپنے بیٹے کیلئے گھوڑا بنے تھے"۔حمیدہ نے خواب ناک لہجے میں کہا۔"اور جب چھوٹے ٹھاکر نے کہا کہ اب ویر جی کی باری ہے تو ٹھاکر جی نے وصال دین کو پیٹھ پر بٹھالیا اور اسے لے کر دوڑنے لگے۔میں وصال دین پر بہت چیخی۔پر ٹھاکر جی نے مجھے روک دیا۔بولے.....یہ وصال دین میرے بیٹے اوتار سنگھ کا دوست ہے۔اس ناتے یہ اس کا حق ہے مجھ پر....."۔

نور بانو نے تصور میں وہ منظر بھی دیکھا.....کیسے محبت کرنے والے وضع دار لوگ تھے وہ.....

"اس کے بعد وصال دین کے ابا نے ٹھاکر جی کو کبھی چھوٹے ٹھاکر کا گھوڑا بھی نہیں بننے دیا....."۔

"کیسے اماں؟"وہ عبدالحق کی آواز تھی۔

حمیدہ نے نظریں اٹھا کر اسے نہیں دیکھا،وہ بدستور نگاہوں کے سامنے جیسے کسی غیر مرئی شے کو دیکھتی رہی۔"وہ ہر صبح حویلی آجاتے تھے.....چھوٹے ٹھاکر کو گھوڑا بن کر سیر کراتے....."

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

عبدالحق کو دھندلا دھندلا سا یاد آ رہا تھا..... بہت کچھ..... ایک لکڑی کا گھوڑا..... اور چاچا جی کی باتیں..... وہ کچھ محبت کے بارے میں سمجھا رہے تھے..... طاقت اوقات کی بات کر رہے تھے۔

وہ دوبارہ اندر آئے۔ اب وہ ٹھاکر پرتاب سنگھ کی خواب گاہ میں تھے۔

یہ کمرا سب سے بہتر حالت میں تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس کی چھت نہیں گری تھی۔ یہ بات عبدالحق کیلئے حیرت انگیز تھی اور ہر حیرت انگیز بات کو وہ اللہ کا اشارہ سمجھتا تھا۔ چاہے وہ اشارہ اس کی سمجھ میں نہ آئے۔

وہاں مسہری تھی۔ مسہری پر دو تکیے تھے۔ ہر چیز مٹی میں بنائی ہوئی تھی۔ مگر عبدالحق کی نگاہوں میں پتا جی کی خواب گاہ پھر گئی۔

اسے ایک سات یاد آ گئی۔ وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں گاؤں گیا تھا۔ مولوی صاحب اس کے ساتھ تھے اور وہ اپنی نئی نویلی محبت میں سرشار تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ ہر وقت مولوی صاحب سے عربی پڑھتا رہتا۔ وہ پتا جی کو بھول ہی بیٹھا تھا۔

اس رات اس نے سوچا تو اسے شرمندگی ہوئی۔ وہ پتا جی کے کمرے میں چلا گیا۔ پتا جی بیٹھے ڈائری میں کچھ لکھ رہے تھے۔ اسے دیکھ کر انہوں نے ڈائری ایک طرف رکھ دی۔ اس نے پوچھا..... آپ سوئے نہیں پتا جی!..... انہوں نے کہا..... نیند تو مجھے کم ہی آتی ہے پتر؟ اور وہ کیسا شرمندہ ہوا تھا۔ اسے احساس ہوا تھا کہ ماں کی موت کے بعد وہ کتنے اکیلے ہو گئے ہیں۔ اور وہ بھی دہلی چلا گیا ہے۔ اس نے کبھی پتا جی کی تنہائی کے بارے میں، ان کے کرب کے بارے میں نہیں سوچا۔

تب اس نے پہلی بار پتا جی کے پاؤں دبائے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ سو جائیں گے۔ لیکن وہ پاؤں دباتا رہا اور وہ کروٹیں بدلتے رہے۔

پھر اس رات پہلی بار ٹھاکر ایک عام آدمی بن گیا تھا۔ اس کے پتا جی نے کہا..... میری ایک خوش پوری کر دو۔ یہاں میرے ساتھ لیٹ کر سو جاؤ۔

عبدالحق کو اس رات کا ایک ایک لمحہ، ایک ایک بات یاد تھی۔ وہ دونوں کچھ فاصلے پر لیٹ گئے۔ چند لمحے گزرے تو پتا جی نے کہا..... اودا رادتار سنگھ، ساتھ ایسے تو نہیں سوتے۔ مجھ سے لپٹ جا نا یار۔ اور وہ کسی چھوٹے سے بچے کی طرح حیران، باپ سے لپٹ گیا تھا۔

تب پتا جی نے اس سے اندر کی باتیں کی تھیں۔ ان کے پتا..... اس کے دادا نے انہیں اچا ٹھاکر بننے کی تلقین کی تھی۔ ٹھاکر کو سخت، مضبوط اور آن والا ہونا چاہئے..... اور محبت سے دور، کیونکہ محبت آدمی کو کمزور کر دیتی ہے۔ محبت ہو جائے تو اسے چھپا کر رکھو۔ اس کا اظہار مت کرو۔ پتا جی نے کہا تھا..... میں پتا جی کی آگیا کا پالن کرتا رہا۔ لیکن میں اچھا ٹھاکر تھا ہی نہیں۔ میں تمہاری ماتا جی سے بہت پریم کرتا تھا۔ لیکن کبھی اس پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ یہاں تک کہ وہ چلی گئی۔ اودا رادتار سنگھ، تم سے میں نے محبت نہیں کی۔ تم تو میری جان تھے۔ تم میں میری جان تھی۔ پر میں نے تمہیں کبھی بتایا نہیں۔ آج بھی نہیں بتا رہا۔ ہوں۔ ٹھاکر کبھی یہ بات بتایا نہیں کرتے۔

پھر پتا جی نے کہا تھا..... میں تم سے یہ ضرور کہوں گا کہ تمہیں ٹھاکر بننے کی ضرورت نہیں۔ تم آزاد ہو۔ جو چاہو، کر سکتے ہو..... اور کرو۔ یہ کہتے کہتے وہ سو گئے تھے۔

پھر وہ جب تک گاؤں میں رہا، اسی طرح لپٹ کر پتا جی کے ساتھ سوتا رہا۔

نور بانو اس دوران عبدالحق کو بہت غور سے دیکھتی رہی تھی۔ وہ حمیدہ کی طرح از خود رفتہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے اندر گہرائی تھی۔ وہ خاموش رہا تھا۔ لیکن اس کے چہرے کے تاثرات بہت کچھ کہہ رہے تھے..... بہت کچھ بتا رہے تھے۔

پھر عبدالحق چونکا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کی نظریں مسہری کے سرہانے رکھے سیف پر جم گئیں۔ وہ سیف کی طرف بڑھا اور اس نے ہینڈل گھمایا۔ لیکن سیف لاک تھا۔

چند لمحے سوچنے کے بعد عبدالحق پلٹا۔ اس نے تکیہ اٹھا کر دیکھا۔ اس کے نیچے چابی موجود تھی۔ اس نے چابی اٹھالی۔

چابی کے باوجود سیف آسانی سے نہیں کھلا۔ شاید زنگ کا مسئلہ تھا

سیف کھلا تو عبدالحق نے زبیر سے پیٹرومیکس لے کر سیف کا جائزہ لیا۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ سیف میں کتابیں تھیں۔ اس نے کتابوں کو باہر نکالا اور مسہری پر رکھنے لگا۔

کتابوں کے ہٹنے کے بعد اسے نوٹ نظر آئے۔ اس نے نوٹ نکالے۔ خاصی موٹی گڈی تھی۔ ساتھ ہی چابیوں کا ایک گچھا بھی تھا۔ عبدالحق سمجھ گیا کہ یہ چابیاں تہہ خانے میں کام آئیں گی۔

وہ نوٹ اور چابیاں نکال ہی رہا تھا کہ نور بانو کی استعجابیہ آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔

''یہ..... یہ تو سب دینی کتابیں ہیں..... اسلامی کتابیں!''۔ نور بانو نے کہا۔

اس کی بات نے سب کو چونکا دیا۔ عبدالحق نے مسہری پر بکھری ہوئی کتابوں کو دیکھا۔ اس نے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ سب سے اوپر سیرت پر ایک کتاب تھی۔ قرآن پاک کا ایک مترجم نسخہ بھی اسے نظر آ رہا تھا۔

''کیا..... کیا آپ کے والد مسلمان تھے؟'' نور بانو نے سنسنی آمیز لہجے میں پوچھا۔ صورت حال ایسی تھی کہ وہ اپنا حجاب بھی بھول گئی تھی۔

''مم..... مجھے پتا نہیں''۔ عبدالحق نے گڑبڑا کر کہا۔ ان کتابوں کو دیکھ کر اسے حیرت بھی ہو رہی تھی اور خوشی بھی۔

''میں نے تو ان میں بہت ساری باتیں بہت اچھے مسلمانوں والی دیکھی تھیں''۔ حمیدہ خوش ہو کر بولی۔

عبدالحق کو بہت خوشی ہوئی۔ کاش ایسا ہی ہو۔ اس نے دل میں سوچا۔ پھر وہ بولا۔ ''اب تہہ خانہ اور دیکھنا ہے''۔

وہ دیوار کی طرف بڑھا اور دیوار کو ٹٹولنے لگا۔ اس کا ہاتھ دیوار سے تھوڑا سا باہر نکلے ہوئے ایک ہینڈل سے ٹکرایا۔ اس نے اسے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ کھڑکھڑاہٹ سی ہوئی اور دیوار میں ایک خلا سا نمودار ہوا۔ اس خلا میں نیچے اترتی ہوئی سیڑھیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔

عبدالحق نے خلا کی طرف قدم اٹھایا۔ مگر اسی لمحے زبیر چلایا۔ ''نہیں مالک..... رک جائیں''۔ ساتھ ہی وہ اس طرف لپکا۔

عبدالحق پلٹ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ زبیر اس کے پاس چلا آیا۔ ''کیا بات ہے زبیر؟''۔

''پہلے میں جاؤں گا مالک''۔ زبیر نے کہا۔

''لیکن کیوں؟''۔

''برسوں سے بند پڑا تہہ خانہ ہے۔ حویلی تک ریت کے نیچے دفن تھی۔ اندر کی فضا زہریلی ہو گی''۔

''میرے لئے زہریلی ہے تو تمہارے لئے بھی ہو گی''۔

''تو میں فوراً تھوڑا ہی اتروں گا مالک۔ گھٹن کم ہونے کا انتظار کروں گا''۔

عبدالحق کو وہ تاخیر بری لگ رہی تھی۔ مگر زبیر کی بات بھی معقول تھی۔

وہ کچھ دیر انتظار کرتے رہے۔ پھر زبیر پیٹرومیکس ہاتھ میں لئے خلا کی طرف بڑھا۔ عبدالحق نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا۔ ''نہیں زبیر..... پہلے میں ہی اتروں گا''۔

''میرے پاس روشنی ہے مالک۔ آگے تو مجھے ہی رہنا ہے''۔ زبیر نے دلیل دی۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

''تم ہنڈا مجھے دے دو''۔

حکم ماننے کا عادی زبیر جھجک رہا تھا۔''یہ مناسب نہیں مالک.....''اس کے لہجے میں احتجاج تھا۔

''خطرہ سب کے لئے برابر ہے.....''۔

''نہیں مالک۔زبیر کو آگے جانے دیں.....خدا کیلئے''۔عقب سے رابعہ نے مداخلت کی۔

عبدالحق اس کی طرف متوجہ ہوا۔اتنی دیر میں زبیر اس خلا میں اتر گیا۔

لیکن زبیر عقل مند تھا۔وہ ایک دم سے نیچے نہیں اترا۔اور اس نے ایک دم سے گہری سانس بھی نہیں لی۔چند لمحوں میں اسے احساس ہوگیا کہ فضا میں گھٹن ضرور ہے لیکن زہریلا پن نہیں ہے۔پھر بھی احتیاط ضروری تھی۔اس نے منہ اوپر کر کے پکارا۔''جب تک میں آواز نہ دوں،آپ نیچے نہیں آیئے گا مالک''۔

نور بانو نے جاں نثاری کا ایسا مظاہرہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔آکامیاں کی وفاداری اور ایثار سے وہ بے خبر تھی۔اسے پتا ہی نہیں تھا کہ انہوں نے کیسے جان دی۔

''نیچے سب ٹھیک ہے نا؟''۔عبدالحق نے پکارا۔

''جی مالک۔میں نیچے اتر کر آپ کو آواز دوں گا''۔

عبدالحق خواتین کی طرف مڑا۔''آپ لوگوں کو نیچے آنے کی ضرورت نہیں''۔

دوسری طرف زبیر نیچے اتر گیا۔پوری طرح اطمینان کرنے کے بعد اس نے عبدالحق کو آواز دی اور خود پیٹرومیکس لیکر سیڑھیوں کے نیچے کھڑا ہوگیا۔چند لمحوں میں عبدالحق بھی تہہ خانے میں اتر آیا

تہہ خانہ بہت بڑا نہیں تھا۔وہ ٹھاکر کی خواب گاہ سے کچھ چھوٹا ہی تھا۔وہاں دو بڑی الماریاں تھیں اور ایک بہت بڑی تجوری تھی۔چابیوں کا گچھا عبدالحق کے پاس تھا۔

سب سے پہلے اس نے تجوری کو کھولا۔تجوری میں موجود رقم دیکھ کر اس کا دل خوش ہوگیا۔اس کو ایک نظر میں اندازہ ہوگیا کہ تجوری میں اس کی توقع سے کہیں بڑھ کر نقد رقم موجود ہے۔اس نے نوٹوں کی گڈیاں باہر نکال کر ڈھیر کر دیں۔

تجوری میں کاغذات بھی تھے۔اس نے کاغذات بھی نکال لئے۔کاغذات کا جائزہ لینے کا موقع نہیں تھا۔اس نے انہیں بھی نوٹوں کے ساتھ رکھ دیا۔

اب وہ چھوٹی الماری کی طرف متوجہ ہوا۔اس الماری میں سونے،زیورات اور ملبوسات کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔اس الماری کو بھی اس نے خالی کر دیا۔سونے اور زیورات کو کپڑوں میں لپیٹ کر زبیر نے گٹھریاں بنا دیں۔''میں یہ اوپر پہنچاتا ہوں مالک''۔وہ بولا۔

عبدالحق نے سر کو تفہیمی جنبش دی اور دوسری الماری کی طرف متوجہ ہوا۔

وہ بہت بڑی الماری تھی۔عبدالحق جانتا تھا کہ اس میں کیا ہے۔بہ ظاہر تو اب وہ چیزیں کسی کام کی نہیں تھیں۔لیکن وہ یہاں کچھ بھی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ہر چیز اس کے باپ دادا،بلکہ پرکھوں کی امانت تھی۔

اس نے الماری کھولی۔الماری کیسی،وہ تو پورا اسلحہ خانہ تھا۔ہر طرح کے ہتھیار وہاں موجود تھے۔تلواریں،نیزے،بھالے،تیر کمان اور ڈھالیں بھی۔اور ہر سائز کے طپنچے اور بندوقیں بھی۔پھر کارتوسوں کا ڈھیر بھی تھا۔

ایک لمحے کو عبدالحق نے سوچا کہ یہ سب کچھ اس الماری میں ہی چھوڑ دیا جائے۔لیکن اس کا دل نہیں مانا۔اس نے ان سب چیزوں کو بھی کپڑوں میں لپیٹنا شروع کر دیا۔

.....x.....

سامان اتنا تھا کہ اسے گھر تک پہنچوانے میں مزدوروں کی مدد لینی پڑی۔عبدالحق نے سوچا تھا کہ مزدوروں کی مدد سے تہہ خانے کی چھت تڑوا کر الماریاں اور تجوری بھی اٹھوا لے گا۔لیکن رات میں کسی وقت ٹھاکر کی خواب گاہ کی چھت ہی بیٹھ گئی۔جیسے امانت کے وصول کئے جانے کی منتظر تھی۔

نقد رقم،سونا اور زیورات عبدالحق نے حمیدہ کو سونپ دیئے۔زیورات کا جائزہ لیتے ہوئے حمیدہ نے اس پر احتجاج کیا۔''پتر.....تو مجھ اندھی پر یہ بوجھ کیوں ڈالتا ہے.....''یہ کہتے کہتے اس کی نظر اس جڑاؤ ہار پر پڑی۔اس کے ہیرے آنکھوں کو چکا چوند کئے دے رہے تھے۔اس نے بے ساختہ کہا۔''یہ ہار تو میں بہو کو دوں گی پتر''۔

''اللہ کا شکر ادا کرو اماں۔اب تم اندھی کہاں ہو۔بہو کے لئے ہار پسند کر رہی ہو''۔عبدالحق نے ہنستے ہوئے کہا۔

حمیدہ کھسیا گئی۔''ہاں پتر،اللہ کا شکر ہے۔واقعی اب تو سب دکھائی دیتا ہے مجھے''۔پھر وہ بولی۔''اب تو تو خوش ہے نا پتر؟''۔

''ہاں اماں۔اب میں انشا اللہ گاؤں کو آباد کر سکوں گا۔اور اللہ نے چاہا تو یہاں پہلے سے زیادہ خوش حالی ہوگی۔اب تو یہ پاک سرزمین پر ہے نا''۔

''بس تو خوش رہ.....''۔

عبدالحق نکلنے ہی والا تھا کہ نور بانو آگئی۔اس کے ہاتھ میں ٹھاکر کی کتابیں تھیں۔''یہ کتابیں لے لیں آپ''۔

''آپ اپنے پاس رکھیں۔فرصت سے دیکھوں گا انہیں''۔عبدالحق نے جاتے ہوئے کہا۔

نور بانو نے حیرت سے اسے دیکھا۔اسے تھوڑا سا افسوس ہوا۔عبدالحق کو صرف نقدی اور زیورات کی فکر تھی۔باپ کے سیف سے نکلی ہوئی کتابوں کو اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

''تو غلط سمجھ رہی ہے دھیئے''۔حمیدہ نے اسے چونکا دیا۔

اس نے چونک کر حمیدہ کو وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

''اسے پیسے کی فکر تھی۔صرف اس لئے کہ وہ ہندوستان میں سب کچھ چھوڑ کر آنے والوں کو اسی گاؤں میں آباد کرنا چاہتا ہے۔انہیں خوش حالی دینا چاہتا ہے۔اسے اپنے لئے کچھ نہیں چاہئے۔وہ تو بس دوسروں کے لئے دیوانہ ہو رہا ہے۔اس کے سوا اس وقت اسے کچھ سجھائی نہیں دے گا''۔

نور بانو شرمندہ ہوگئی۔

حمیدہ نے ہیروں کا ہار اس کی طرف بڑھایا۔''دھیئے.....ذرا یہ پہن کر تو دکھا مجھے''۔

''آپ کو کیا پتا چلے گا اماں؟''۔

''ارے.....میری آنکھیں ٹھیک ہوگئی ہیں۔سب دکھائی دینے لگا ہے مجھے۔تو پہن تو سہی''۔

نور بانو نے ہار لے کر دیکھا۔وہ بہت خوب صورت،بے حد جگمگاتا ہوا ہار تھا۔مگر بھاری بہت تھا۔اس نے سوچا،یہ پہن کر تو میری گردن ہی لٹک جائے گی۔اس نے یہ بات حمیدہ سے بھی کہہ دی۔

''کچھ نہیں ہوتا دھیئے۔تو پہن تو سہی''۔

نور بانو نے بڑے اشتیاق سے ہار پہنا۔تب اسے اندازہ ہوا کہ وہ پہلے جیسی مرگھلی نہیں رہی ہے۔

حمیدہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔''خوب سجا ہے یہ تیرے گلے میں۔پتا ہے،ٹھاکرانی نے بہت پہلے یہ مجھے دکھایا تھا۔کہتی تھی،اپنی بہو کے گلے میں ڈالوں گی یہ ہار۔میں نے بھی سوچ لیا ہے۔یہ ہار عبدالحق کی بیوی کے لئے ہے.....''۔

نور بانو کا ہاتھ ہار اتارنے کے لئے حرکت میں آیا تھا۔مگر حمیدہ کی بات سن کر اس کے ہاتھ نے ہار کو یوں گلے سے چپکا لیا،جیسے اب اسے اترنے نہیں دے گا۔ساتھ ہی اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

وہ بس ایک لمحے کی بات تھی۔لیکن حمیدہ نے دیکھ لیا تھا۔نور بانو ہار اتارنے لگی تو وہ جلدی سے بولی۔''رہنے دے دھیئے۔پہن لے دو چار دن۔اچھا لگتا ہے تیرے گلے میں''۔

مگر نور بانو نے جلدی سے ہار اتار کر حمیدہ کو دے دیا۔''نہیں اماں۔مجھے پتا ہوتا تو پہنتی ہی نہیں۔کسی کی چیز جھوٹی کرنے سے کیا فائدہ''۔

''اب یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ کس کے نصیب میں ہے۔مجھے تو تو ہی اچھی لگتی ہے اور عبدالحق کو بھی.....''۔

مگر نور بانو اس کا پورا جملہ نہ سن سکی۔وہ اس سے پہلے ہی اٹھ کر کمرے سے نکل گئی تھی۔

.....x.....

صبح عبدالحق حمیدہ کے پاس آیا تو اس کے چہرے سے دبا دبا ہیجان جھلک رہا تھا۔نور بانو بھی وہاں بیٹھی تھی۔

''میں شہر جا رہا ہوں اماں۔کچھ منگوانا ہے؟''۔عبدالحق نے پوچھا۔

''اون لے آیئے گا میرے لئے۔سردیاں آ رہی ہیں،سویٹر بننے ہیں''۔

''جی لے آؤں گا''۔

''یہ پیسے لے لیں''۔

''اس کی کیا ضرورت ہے''۔

''یہ ضروری ہے''۔

عبدالحق نے نوٹ لے لئے۔نور بانو وہاں سے چلی گئی۔عبدالحق چند لمحے ہچکچاتا رہا۔پھر بولا۔''اماں.....ایک بات پوچھنی ہے تم سے''۔

''پوچھ پتر''۔

''وہ اماں.....جب سے میں نے اپنا کمرا دیکھا ہے،بے تاب ہو گیا ہوں''۔عبدالحق اب بھی جھجک رہا تھا۔''پر اماں،سوچتا ہوں۔خود غرضی کی بات ہے۔اللہ کو بری لگے گی''۔

''بات تو بتا پتر''۔

''کل سے میرا دل چاہ رہا ہے اماں کہ اسی جگہ مکان بنواؤں۔حویلی تو بہت بڑی تھی۔میں وہاں اپنی ضرورت کے مطابق مکان بنوانا چاہتا ہوں۔جہاں میرا کمرا تھا۔وہیں میرا کمرا ہو۔ویسا سکون اماں مجھے کبھی کہیں اور نہیں ملا''۔

''نہ تو یہ بری بات ہے پتر اور نہ اس میں خود غرضی ہے''۔

''نہیں اماں۔میری گاؤں کو آباد کرنے کی جو خواہش تھی،یہ اس سے بھی بڑی خواہش ہے۔جی چاہتا ہے،پہلے اس پر کام شروع کرا دوں۔بلکہ میں نے سوچا ہے اماں کہ جہاں حویلی تھی،وہاں ہمارے گھر کے ساتھ اور گاؤں والوں کے بھی گھر ہوں''۔

''اس میں کوئی برائی نہیں پتر۔بندے پر سب سے پہلا حق تو اس کا اپنا ہوتا ہے۔تو بے فکر ہو کے یہ کام کر پتر۔اور اب تو تیرے پاس پیسے کی کمی نہیں۔دونوں کام ایک ساتھ بھی ہو سکتے ہیں''۔

عبدالحق نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر اٹھائے اور انہیں چوم لیا۔''تم نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا اماں۔واقعی دونوں کام ایک ساتھ ہو سکتے ہیں''۔

حمیدہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔''تو اللہ سے کتنا ڈرتا ہے پتر''۔

''کہاں ڈرتا ہوں۔ویسا تو نہیں ڈرتا جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ہاں کوشش ضرور کرتا ہوں۔یہ تو بنیاد ہے اماں۔ہدایت ہی ان لوگوں کیلئے ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں،بن دیکھے،ایمان لاتے ہیں،آخرت پر یقین رکھتے ہیں،نماز قائم کرتے ہیں،اور اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے خرچ کرتے ہیں''۔

''یہ تجھے کس نے بتایا پتر؟''۔

''قرآن نے۔یہ سورہ بقرہ کے پہلے رکوع کی آیات ہیں اماں''۔

حمیدہ تھرا کر رہ گئی۔زندگی بھر وہ قرآن پڑھتی رہی تھی۔مگر یہ تو اسے معلوم ہی نہیں تھا۔پھر اسے عبدالحق پر فخر بھی ہوا اور پیار بھی آیا۔وہ نو مسلم تھا۔مگر قرآن سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کرتا تھا۔''تو قرآن کو سمجھ کر پڑھتا ہے پتر''۔

''تو اماں،قرآن صرف پڑھنے کے لئے تو نہیں ہے۔پڑھ کر سمجھنا اور عمل کرنا ضروری ہے''۔

''تو کیسے سمجھ لیتا ہے؟''۔

''ترجمے والے قرآن بھی ہوتے ہیں اماں۔اور اللہ کی مہربانی سے میں نے تو عربی بھی پڑھی ہے''۔عبدالحق کی نگاہوں میں نور بانو کا سراپا لہرا گیا۔یہ اس پر اس کی محبت کا احسان تھا۔

''تو پتر،خرچ تو سبھی کرتے ہیں''۔

''ایسے نہیں اماں،اللہ نے بتایا ہے کہ مال کہاں کہاں خرچ کرنا چاہئے۔مختصر سی بات یہ ہے اماں کہ مال اللہ کو خوش کرنے کے لئے خرچ کیا جائے۔اس لئے تو میں ڈر رہا تھا۔اچھا اماں،اب میں چلتا ہوں''۔

وہ کمرے سے نکلا۔باہر نور بانو کھڑی تھی۔اس کے ہاتھ میں ٹھاکر کے سیف سے نکلی ہوئی کتابیں تھیں۔''سنیئے.....مجھے آپ سے اجازت چاہئے''۔

''جی؟''عبدالحق ایک دم مودب ہو گیا۔

''یہ آپ کے والد کی کتابیں میں لے لوں؟''۔

عبدالحق کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی۔

اس کی کیفیت دیکھ کر نور بانو نے جلدی سے وضاحت کی۔''میں ٹھیک سے اپنی بات نہیں کہہ سکی شاید۔میں آپ سے انہیں پڑھنے کی اجازت مانگ رہی ہوں۔یہ آپ کی امانت ہو گی میرے پاس۔جب کہیں گے،واپس دے دوں گی''۔

عبدالحق مسکرایا۔''جی ضرور۔کیوں نہیں۔مجھے تو اپنے کام نمٹانے کے بعد ہی ان کی ضرورت پڑے گی۔اور میرے کام دیر طلب ہیں''۔

نور بانو نے دل میں سوچا.....یعنی آنکھیں آپ کو دیکھنے کو ترس جائیں گی۔اس نے آہستہ سے کہا۔''شکریہ''۔

عبدالحق سر جھکائے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

.....x.....

محکمہ زراعت کا ڈپٹی ڈائریکٹر عبدالحق سے ملاقات کا کب سے مشتاق تھا۔پٹواری حسن دین نے جس انداز میں اس کا غائبانہ تعارف کرایا تھا،وہ غیر معمولی تھا۔ڈپٹی ڈائریکٹر عرفان احمد جانتا تھا کہ حسن دین بہت اصول پرست اور سخت آدمی ہے۔اگر وہ کسی شخص کی اتنی تعریف کرے تو اس شخص کے بہت اچھے ہونے میں شک ہی نہیں کیا جا سکتا۔

مگر وہ عبدالحق سے ملا تو حیران ہوا۔اس کی توقع کے برعکس وہ بہت کم عمر تھا۔اس کی عمر بیس اکیس سے زیادہ ہرگز نہیں تھی۔لیکن اس میں بڑوں جیسی متانت اور بردباری تھی۔

''حسن دین نے مجھے بتایا کہ آپ اپنے خرچ پر ریت ہٹوانے کا کام کرنے کے لئے تیار ہیں''۔عرفان احمد نے کہا۔

''جی ہاں۔الحمدللہ.....اللہ نے مجھے اس قابل بنا دیا ہے''۔عبدالحق نے منکسرانہ انداز میں کہا۔

''ہم نے طے کر لیا ہے کہ جتنی زمین بھی آپ برآمد کرائیں گے،وہ آپ کی ہو گی''۔

''اس کی کوئی ضرورت نہیں۔زمین تو اللہ کی ہے اور ضرورت مندوں کے لئے ہے''۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

''وہ آپ جانیں۔ ہماری طرف سے تو وہ تمام زمین آپ کی ہوگی۔ یہ ایک طرح سے میری.....ہم سب کی طرف سے.....اس نوزائیدہ ملک کی طرف سے اظہار تشکر ہے۔ آپ جو چاہیں کریں، ہمیں اس میں کوئی تعرض نہیں ہوگا''۔

''تشکر کیسا؟ میرے پاس اللہ کے دیئے ہوئے وسائل ہیں۔ اور میں وہ کچھ کر رہا ہوں جو مجھے کرنا چاہئے''۔

''دراصل آپ صورت حال کی سنگینی کو سمجھے بغیر ہمارے اس تشکر کو نہیں سمجھ سکتے''۔ عرفان احمد نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''ہم ہندوؤں کی منافقت اور مکاری اور انگریزوں کی عیاری کا شکار ہوئے ہیں۔ ہمارے ساتھ تقسیم میں بھی دھاندلی کی گئی اور اب وسائل کی تقسیم کے معاملے میں بھی زیادتی کی جارہی ہے۔ ایک تو ہمارا حق ہمیں دیا ہی نہیں جارہا ہے۔ دوسری طرف جو نام نہاد وسائل ہمیں ملنے ہیں، ان میں بھی لیت ولعل سے کام لیا جارہا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ ہمارے دفتروں میں لکھنے کے لئے کاغذ اور پینسل تک کی قلت ہے''۔

''لیکن اس سے انہیں کیا فائدہ ہوگا؟''۔ عبدالحق نے پوچھا۔

''انگریز اور ہندو، دونوں ہی تقسیم کے مخالف تھے۔ لیکن مسلم لیگ کی تحریک کے پیچھے عوامی طاقت ایسی تھی کہ انہیں ماننا پڑا۔ مگر ہندوؤں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ پاکستان زیادہ دن نہیں چلے گا۔ آخر وہ خود آکر ہندوستان سے ملے گا۔ تو یہ اسی ایجنڈے پر کام ہورہا ہے۔ تقسیم میں دھاندلی کی وجہ سے مسلمانوں کو بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ فارمولا یہ تھا کہ جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ وہ علاقے پاکستان میں شامل ہوں گے۔ تو اکثریتی علاقوں والے مسلمان مطمئن تھے۔ عین وقت پر انہیں پتا چلا کہ وہ تو ہندوستان میں بیٹھے ہیں۔ تب وہاں ان کا قتل عام ہوا۔ ہندوؤں اور سکھوں نے ہجرت کر کے پاکستان آنے والوں کی ٹرینوں کی ٹرینیں کاٹ ڈالیں۔ ابھی تو گرد بیٹھی نہیں ہے۔ پھر بھی یہ یقینی ہے کہ شہید ہونے والے مسلمانوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ اور جو پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوگئے، انہیں یہاں آباد کرنے اور ضروریات زندگی فراہم کرنے کا مسئلہ ہے۔ جبکہ وسائل ہیں ہی نہیں۔ یہ ایک بہت بڑا انسانی المیہ ہے۔ ہجرت کر کے آنے والوں میں گنتی کے خوش نصیب ہی ایسے ہوں گے، جنہوں نے اپنے کسی پیارے کو نہ کھویا ہو۔ بچے ماں باپ سے محروم ہو کر یہاں پہنچے ہیں۔ جو وہاں صاحب ثروت تھے، ان کے پاس یہاں سر چھپانے کا ٹھکانہ نہیں، یہ انسانی ایثار اور قربانی کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ سرکاری مشینری کے سامنے مسئلہ صرف وسائل سے محروم اس ملک کو چلانے کا نہیں۔ ان لوگوں کی آبادکاری کا بھی ہے اور انہیں روزگار فراہم کرنے کا بھی ہے''۔

''واقعی.....یہ تو بہت مشکل صورت حال ہے''۔

''جی ہاں۔ لیکن ہمارے ساتھ اللہ کی رحمت ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ پاکستان اللہ کے حکم سے قائم رہنے کیلئے بنا ہے۔ ہندوؤں کا یہ خواب کہ پاکستان دوبارہ ان سے جا ملے گا، کبھی شرمندہ خواب نہیں ہوگا۔ ہم اس مشکل وقت سے گزر کر جب ابھریں گے تو انشا اللہ بہت مضبوط ہوں گے''۔

''انشا اللہ، ایسا ہی ہوگا''۔ عبدالحق نے بے حد خلوص سے کہا۔

''انشا اللہ، آپ جیسے لوگ جو موجود ہیں۔ اب آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ ہم کیوں آپ کے احسان مند ہیں۔ آپ نا قابل کاشت اراضی کو قابل کاشت بنا کر اپنے وطن کو اضافی وسائل مہیا کر رہے ہیں۔ یہ آپ کا احسان ہے۔ اسی لئے یہ فیصلہ کرلیا گیا ہے کہ وہ تمام اراضی آپ کی ہوگی''۔

عبدالحق عرفان احمد سے بہت متاثر ہوا۔ اس میں افسرانہ شان نہیں تھی۔ وہ ملک کی محبت سے سرشار تھا۔ ملک پر کوئی احسان کرے تو وہ اسے خود پر احسان سمجھتا تھا۔ وہ منکسر المزاج تھا اور خدمت کے جذبے سے معمور۔ اور عبدالحق نے اب تک تمام افسر ایسے ہی دیکھے تھے۔ انہیں دیکھ کر یقین ہوتا تھا کہ یہ ملک بہت ترقی کرے گا۔ کسی بھی ملک کے لئے یہ بہت بڑی نعمت ہوتی ہے کہ اس کی بیوروکریسی امین اور دیانت دار بھی ہو اور اس سے محبت بھی کرتی ہو۔

''اور ہاں، میں نے آپ کے وسائل میں اضافے کا سامان بھی کیا ہے''۔ عرفان احمد نے اسے چونکا دیا۔

''جی.....میں سمجھا نہیں''۔

''میں نے ایک کنٹریکٹر سے بات کرلی ہے۔ جو ریت آپ ہٹوا رہے ہیں، وہ بہت کام آئے گی۔ آپ کو اس کا معقول پے منٹ بھی ملے گا۔ اگر آپ کو قبول ہو تو یہاں دستخط کردیں''۔ عرفان احمد نے ایک کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔ ''وہ ریت کنٹریکٹر اٹھواتا رہے گا''۔

عبدالحق نے کاغذ پر دستخط کردیئے اور ممنونیت سے اسے دیکھا۔ ''میں آپ کے تعاون پر آپ کا شکر گزار ہوں''۔

''یہ تو ہمارا فرض ہے۔ اور ہاں، کرنسی تبدیل کرانے کیلئے میں تیار رہیئے گا۔ پاکستانی کرنسی آنے ہی والی ہے''۔

عبدالحق اس کا شکریہ ادا کر کے کمرے سے نکل آیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ بظاہر ناممکن نظر آنے والا کام ہر مرحلے میں آسان سے آسان تر ہوتا جارہا تھا۔ حسن دین کی طرف جاتے ہوئے وہ بہت مطمئن تھا۔

.....x.....

نور بانو ان کتابوں کا جائزہ لے رہی تھی، جو ٹھاکر پرتاپ سنگھ کے سیف سے نکلی تھیں۔ ان میں سے ایک کتاب تو سیرت النبیؐ پر تھی۔ دوسرا قرآن پاک کا ترجمہ تھا۔ پھر ایک اور کتاب تھی.....احکامات الٰہی۔

کتابوں کو سرسری طور پر دیکھ کر ہی اندازہ ہوگیا کہ پڑھنے والے نے انہیں بڑی دیدہ ریزی سے پڑھا ہے۔ اہم عبارت کو پینسل سے خط کشیدہ کیا گیا تھا۔ جابجا حاشیئے میں تبصرے لکھے تھے اور تبصروں سے پڑھنے والے کی فہم کا بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔

نور بانو کو یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ عبدالحق کے والد کا کام تھا۔ کیونکہ جب اس نے عبدالحق سے انکے مسلمان ہونے کے بارے میں پوچھا تھا تو اس کے جواب سے اس کی الجھن ظاہر ہورہی تھی۔ یعنی اسے اپنے باپ کے مسلمان ہونے کا علم نہیں تھا۔ اور بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ باپ مذہب تبدیل کرلے اور بیٹا اس تبدیلی سے بے خبر رہے۔

دوسری طرف یہ بھی حقیقت تھی کہ کتابوں کا مطالعہ تو کوئی بھی کرسکتا ہے۔ اس نے سنا تھا کہ دوسرے مذاہب کے لوگ قرآن تک کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ بات تو گاندھی کے بارے میں بھی کہی جاتی تھی۔ لیکن جس طرح عبارات کو خط کشیدہ کیا گیا تھا اور جس طرح خوشی میں تبصرے تحریر کئے گئے تھے، اس سے ثابت ہوتا تھا کہ قاری اور مبصر مسلمان نہیں بھی تھا تو لازمی طور پر مسلمان ہوگیا ہوگا۔

معاملہ عبدالحق سے متعلق نہ ہوتا، تب بھی اس کے لئے دلچسپ ہی ہوتا۔ لیکن عبدالحق کے تعلق کی وجہ سے وہ نور بانو کے لئے ایک ایسی گتھی بن گیا، جسے وہ ہر حال میں سلجھانا چاہتی تھی۔

قرآن پاک میں ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی توجہ کا مرکز وہ روشن آیات تھیں، جو اللہ کے قادر مطلق، واحد اور احد ہونے کی دلیل تھیں۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

نور بانو کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان میں سورہ ملک کی وہ آیات بھی تھیں، جنہیں سن کر عبدالحق ایمان لایا تھا۔ وہاں حاشیے میں ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے لکھا تھا..... میں نے اس کا مشاہدہ کیا۔ یہ بالکل سچ ہے۔ اس پر میں اپنی ڈائری میں تفصیل سے لکھوں گا۔

یہ پڑھ کر نور بانو کو اس کی ڈائری کے بارے میں تجسس ہوا۔ تب اسے پہلی بار پتا چلا کہ ان کتابوں میں ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی دو ڈائریاں بھی ہیں۔

اس نے دونوں ڈائریوں کا سرسری جائزہ لیا۔ ایک تو واقعتاً ٹھاکر پرتاپ سنگھ کے روز و شب کی ڈائری تھی۔ جبکہ دوسری ڈائری مختلف تھی۔ اس میں ٹھاکر نے اپنے تجربات اور مشاہدات تحریر کئے تھے اور جو کچھ اس نے پڑھا تھا، اس پر تبصرے لکھے تھے۔

نور بانو نے پہلی ڈائری کو تو ذاتی قرار دے کر چھوڑ دیا۔ اصولاً تو دوسری ڈائری بھی ذاتی تھی اور اسے بلا اجازت اسے پڑھنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ مگر اس نے سوچا کہ وہ صرف ان آیات پر ٹھاکر کا تبصرہ پڑھنا چاہتی ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں۔

بالآخر اس نے وہ صفحہ نکال لیا، جہاں ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے سورہ ملک کی ان آیات پر تبصرہ لکھا تھا۔ وہ اسے پڑھنے لگی.....

یہ نشانی پڑھ کر میں آسمان کا مشاہدہ کرنے کیلئے نکلا۔ میرا خیال تھا کہ یہ دو منٹ کا کام ہے۔ میں باہر نکلا اور میں نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں آسمان کو دن میں دسیوں بار دیکھتا رہا ہوں۔ مگر غیر شعوری طور پر۔ میں نے کبھی شعوری طور پر آسمان کو نہیں دیکھا۔ مشاہدہ کبھی نہیں کیا۔ اس پر غور کبھی نہیں کیا۔ اس اتنی بڑی چیز کو میں کیسے نظر انداز کرتا رہا۔ ہم سبھی ایسا کرتے ہیں۔ اسی لئے تو حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں۔ اس کتاب میں بالکل سچ لکھا ہے کہ چیزوں کو دیکھو، ان پر سوچو اور غور کرو۔ ان میں نشانیاں ہیں۔

تو جب میں نے پہلی بار آسمان کو سمجھنے کے خیال سے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ صحرا کے آسمان کو منش غور سے دیکھے تو ہیبت طاری ہو جائے۔ اس کا کوئی انت نہیں۔ اپنے سر کے عین اوپر دیکھو تو وہ گنبد کا مرکزی نقطہ لگتا ہے..... آسمان کا بلند ترین مقام۔ اور وہاں سے ہر سمت میں وہ ایک جیسا ستواں ہے۔ ہلکا سا ہموار جھکاؤ ہر سمت میں دور تک..... حد نظر تک چلا جاتا ہے۔ اور یہ سچ ہے کہ اس میں ذرا سی بھی ناہمواری نہیں۔ کہیں ذرا سا بھی فرق دکھائی نہیں دیتا۔ اور صحرا کی وسعت میں بھی آسمان صحرا سے بڑا..... بہت بڑا دکھائی دیتا ہے۔

میں بہت اچھی طرح مشاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ایک سمت نظر جما کر دیکھا۔ ایک جگہ دھرتی اور آکاش ملتے دکھائی دے رہے تھے۔ آکاش کا نیلا پن صحرا کی ریت سے گھلتا ملتا نظر آرہا تھا۔

میں آگے اس طرف بڑھنے لگا۔ کچھ آگے جا کر میں رکا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اب بھی آسمان کا مرکزی نکتہ..... بلند ترین مقام عین میرے سر کے اوپر تھا۔ حالانکہ میں کوئی پچاس قدم آگے چلا آیا تھا۔ اور میں نے سامنے دیکھا تو وہی منظر تھا۔ دھرتی اور آکاش آپس میں گھل مل رہے تھے۔ میں آگے ہی آگے بڑھتا رہا بار بار میں رک کر اوپر دیکھتا۔ لگتا تھا کہ آسمان کا مرکز میرے ساتھ سفر کر رہا ہے اور سامنے آخری منظر وہی تھا..... دھرتی اور آکاش کے گلے ملنے کا!

میں بھی ایک دھن میں تھا۔ بڑھتا رہا..... بڑھتا رہا۔ مگر آسمان کے مرکزی حد سے نہیں نکل پایا۔ ہاں، سامنے کا منظر ضرور بدل گیا۔ اب آسمان صحرائی جھاڑیوں کو چوم رہا تھا۔

میں اور آگے بڑھا تو آسمان ان جھاڑیوں کی حد سے بھی دور نکل گیا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا تو میرے گاؤں کے آثار تک دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں اپنی دھن میں بہت دور نکل آیا تھا۔ مگر آسمان کے مرکز کی حد سے باہر نہیں نکل سکا تھا۔ مجھ پر ہیبت طاری ہوگئی۔ میرے پاؤں شل ہوگئے۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ دیر تک مجھ سے اٹھا بھی نہیں گیا۔ اب مجھے اتنی ہی دور پیچھے بھی جانا تھا۔

میں نے بہت غور کیا اور کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ میں دنیا کے کسی ملک بھی چلا جاؤں، آسمان کا مرکز میرے سر کے عین اوپر ہی رہے گا۔ اس کا مطلب؟ آسمان کی وسعت نامعلوم ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آسمان کی مرکزی وسعت اتنی ہے کہ پوری زمین بس اسی کے نیچے ہے۔ میں کہیں بھی کھڑا ہو کر دیکھوں، خود کو اس مرکز کے عین نیچے پاؤں گا۔

میں آسمان کی ناہمواری کھوجنے نکلا تھا۔ کئی گھنٹوں میں میلوں کی مسافت طے کر کے نامراد لوٹا۔ لیکن نہیں۔ میں نامراد نہیں تھا۔ میں تو ایک بہت بڑا بھید سمجھ آیا تھا۔

سائنس داں کہتے ہیں کہ آسمان فریب نظر ہے۔ مجھ سے کہیں تو میں ان سے فرمائش کروں کہ اس طرح کا ایک چھوٹا سا..... بہت ہی چھوٹا سا..... بہت ننھا منا فریب نظر تخلیق کر کے بتاؤ تو مانوں۔ فریب سب کے لئے نہیں ہوتا۔ کسی کو فریب لگتا ہے، کسی کو نہیں لگتا۔ یہ کیسا فریب نظر ہے کہ دنیا کے ہر انسان کو ہوتا ہے۔ تمام انسانوں کے پرکھوں کو بھی ہوتا رہا اور آنے والی نسلوں کو بھی ہوتا رہے گا۔ ہاں..... فریب نظر ہوتا ہے۔ آدمی جب آسمان اور زمین کو ملتے دیکھتا ہے تو وہ فریب نظر ہوتا ہے۔ مگر سب کو الگ الگ..... اپنی اپنی نظر کے مطابق۔ ایک ہی جگہ کھڑے ہو کر آدمی کو زمین آسمان ملتے دکھائی دیں گے۔ مگر کسی کو کہیں اور کسی کو کہیں۔ کسی کو آگے، کسی کو درمیان میں اور کسی کو پیچھے۔ اپنی اپنی نظر کی بساط کے مطابق۔

مجھے افسوس ہوا کہ یہ نشانی میرے مذہب کی کتابوں میں کیوں موجود نہیں۔ میں شروع سے سمجھتا تھا کہ بھگوان، خدا اور اللہ ایک ہی ہستی کے نام ہیں۔ فرق صرف زبانوں کا اور تہذیب و ثقافت کا ہے۔ لیکن یہاں میں سوچنے پر مجبور ہو گیا، بنیادی فرق تو تعلیمات کا ہے اور مذہبی عقائد کا ہے۔ عمل کا ہے۔ اب میں اس پر غور کرنا اور سمجھنا چاہتا ہوں۔

میں نے یہ نشانی اتفاقاً پڑھی تھی۔ میں تو بس قرآن کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ نامانوسیت کی وجہ سے میں جم کر پڑھ نہیں پا رہا تھا۔ یونہی میری نظر اس عبارت پر پڑی اور جم گئی۔

اب سوچتا ہوں کہ جس کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے ایسی دلیل نظر آئے، اس میں اور کتنا کچھ ہوگا۔ اب میں اس کتاب کو باقاعدہ پڑھوں گا۔ مجھے لگتا ہے، کوئی بہت بڑی طاقت میرے اندر سے میرہ نمائی کر رہی ہے.....

نور بانو سوچ میں پڑ گئی۔ کیسی عجیب بات تھی کہ باپ کی نظر انہی آیات پر پڑی..... اور بعد میں بیٹے نے انہی آیات کو سن کر اسلام قبول کیا۔ یقیناً اللہ نے دونوں کی رہ نمائی کی۔

وہ اس ڈائری کو پڑھنا چاہتی تھی۔ لیکن بغیر اجازت کے پڑھنا اخلاقی اعتبار سے بری بات ہوتی۔ اس نے سوچا کہ وہ اس کے لئے عبدالحق سے اجازت لے لے گی۔

.....x.....

گاؤں میں زراعت کے مستقبل سے مایوس ہو کر کام اور ٹھکانے کی تلاش میں جانے والے شہر کی خاک چھان کر مایوس ہو کر لوٹے تو حیران رہ گئے۔ گاؤں میں مصروفیت اور گہما گہمی کا عجیب عالم تھا۔ کئی جہتوں میں کام ہو رہا تھا اور بہت تیز رفتاری سے ہو رہا تھا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

وہ یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ حویلی برآمد ہو چکی ہے۔ بلکہ اب تو حویلی کی جگہ مکانات تعمیر کئے جا رہے تھے۔ دوسری طرف ٹریکٹر اور مزدور اب حویلی کے اطراف سے ریت ہٹانے میں مصروف تھے اور اچھا خاصا علاقہ صاف ہو چکا تھا۔ تیسری طرف شہر سے ٹرک اور اونٹ گاڑیاں ریت لینے کیلئے مسلسل آ رہی تھیں۔ ریت کے پہاڑ سمٹ رہے تھے۔ منظر صاف ستھرا اور خوب صورت لگ رہا تھا۔

وہ عبدالحق کے پاس پہنچے۔ عبدالحق نے پرتپاک لہجے میں ان سے حال احوال پوچھا۔ پھر بولا۔ ''کوئی بات نہیں؟''۔

وہ سب شرمندہ ہو گئے۔ ''نہیں بھائی، کوئی امکان نظر نہیں آتا''۔

''مایوس کیوں ہوتے ہو''۔ عبدالحق نے انہیں دلاسہ دیا۔

''ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی املاک اور اراضی ان لوگوں کو دی جا رہی ہے، جن کے پاس ہندوستان میں اس اراضی اور املاک کے دستاویزی ثبوت موجود ہیں، جو وہ ہندوستان میں چھوڑ کر آئے ہیں۔ ہمارا تو صرف زبانی دعوا ہے۔ ہم ایسی افراتفری میں جان بچا کر نکلے کہ ہمیں کاغذات کا خیال بھی نہیں آیا''۔

''کوئی بات نہیں۔ اللہ بڑا کارساز ہے''۔

ان لوگوں کو اندازہ تھا کہ عبدالحق کے خواب کو تعبیر ملنے میں وقت لگے گا۔ مگر یہ طے تھا کہ اب یہ گاؤں خوش حال ہو کر رہے گا۔ وہ انتظار کر سکتے تھے۔ لیکن وہ کھسیار ہے تھے۔ انہیں شرمندگی تھی کہ وہ اپنا گاؤں چھوڑنے کا ارادہ ظاہر کر چکے تھے۔ اب کس منہ سے وہاں رہنے کی بات کرتے۔

عبدالحق نے ان کی شرمندگی محسوس کر لی۔ ''تو اب فکر کی کیا بات ہے''۔ اس نے بے حد اپنائیت سے کہا۔ ''میں نے کہا تھا نا کہ انشا اللہ یہ گاؤں آباد بھی ہو گا اور خوش حال بھی۔ دیکھ لیں، آپ سب کے لئے مکان بھی بن رہے ہیں۔ اور انشا اللہ زمین کی بھی کمی نہیں ہو گی''۔

''اصل میں ہم تو یہ سمجھے تھے کہ آپ گاؤں کی طرف سے مایوس ہو کر حویلی کی طرف متوجہ ہوئے ہیں''۔ عمر نے کہا۔

''حویلی برآمد کرائے بغیر ہم یہ بڑا کام کر ہی نہیں سکتے تھے''۔ عبدالحق نے وضاحت کی۔

''تو اب ہم یہاں رہ سکتے ہیں؟''۔ اصغر نے پوچھا۔

''مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں آپ۔ فیصلہ تو آپ کو خود کرنا ہے''۔

وہ سب خوش ہو گئے۔

اب یہ صورت حال بھی نہیں تھی کہ گاؤں میں کام نہ ہو۔ بے کاری ہو تو کام کرنے کے عادی لوگوں کا جی اوب جاتا ہے۔ مگر یہاں تو کام کی کمی نہیں تھی۔ ایک طرف جو ریت ٹرکوں اور گاڑیوں میں بھر کر شہر لے جائی جا رہی تھی، اس کا حساب رکھنا تھا۔ دوسری طرف ریت ہٹائی جا رہی تھی۔ تیسری طرف مکانات تعمیر ہو رہے تھے۔ وہ سب شریک ہو گئے تو عبدالحق کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اب ہر کام کی نگرانی کے لئے لوگ موجود تھے۔ لیکن عبدالحق کا مزاج ایسا تھا کہ وہ ہر کام اپنی نگرانی میں کرانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اسے فرصت تو نہیں ملی۔ لیکن سب لوگ مصروف ہو گئے۔

نیاز اور اس کے بھائی بہت خوش تھے۔ یہ نیا کام انہیں راس آ گیا تھا۔ دودھ کی بہتات تھی۔ رابعہ نے ان کی عورتوں کو گھی مکھن بنانا سکھا دیا تھا۔ چنانچہ آمدنی شروع ہو گئی تھی۔ اس کام کی وجہ سے شہر میں تعلقات الگ بن رہے تھے۔

پہلی بار نفع تقسیم ہوا تو زبیر اپنا حصہ لیکر عبدالحق کے پاس پہنچا۔ اس نے نوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ لو مالک''۔

عبدالحق نے ہاتھ بڑھانے کے بجائے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے زبیر؟''۔

''یہ آپ کے حصے کا منافع ہے مالک''۔

''میرا حصہ کیسے، یہ تو تمہارا ہے''۔ عبدالحق نے کہا۔ ''اس کاروبار میں تم اور نیاز کے بھائی برابر کے شریک ہو۔ میرا تو کوئی پیچ نہیں''۔

زبیر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''کیسی غیریت کی بات کر دی مالک۔ کیا آپ نے مجھے اپنی زندگی سے نکال دیا ہے؟''۔

''دیکھو زبیر، تم بات سمجھ نہیں رہے ہو۔ پرانی باتیں بھول جاؤ۔ وہ تمہارے دھرم کے ساتھ گئیں۔ یہ مت بھولا کرو کہ اب ہم مسلمان ہیں''۔

''تو مالک، اس سے پرانے رشتے تو نہیں ٹوٹ گئے.....''۔

''تم اسلام کو سمجھنے کی کوشش کرو زبیر۔ اسلام نے غلامی ختم کی ہے۔ مسلمان سب برابر ہیں اور ایک دوسرے کے لئے بھائی ہیں۔ اب نہ میں تم سے برتر ہوں اور نہ تم مجھ سے کم تر''۔

''ایسا نہ کہو مالک۔ ہمارا کون ہے تمہارے سوا''۔

''تو میں تم سے تعلق تو نہیں توڑ رہا ہوں۔ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ اب تم میرے بڑے بھائی جیسے ہو''۔

زبیر باقاعدہ رونے لگا۔ ''میں پرانا تعلق نہیں بھول سکتا مالک''

عبدالحق بے بسی بھی محسوس کر رہا تھا اور اسے جھنجلاہٹ بھی ہو رہی تھی۔ لیکن اس وقت اس کا اظہار اور مخدوش تھا۔ زبیر تو پہلے ہی دل شکستہ ہو رہا تھا۔ ''زبیر..... بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ اب ہمیں اچھا مسلمان بننا ہے۔ یہ جو تم مجھے مالک کہہ کر پکارتے ہو، مجھے اچھا نہیں لگتا۔ مجھے اس میں تماشہ بننے کا احساس ہوتا ہے۔ مجھے خیال رہتا ہے کہ دوسرے ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے۔ یہی کہ ہم اپنے پرانے طور طریقے نہیں چھوڑ سکے۔ میری خوشی اس میں ہے کہ اب ہمارے درمیان برابری ہو.....''۔

''یہ تو ہو ہی نہیں سکتا مالک۔ ہماری تو سب سے بڑی خوشی چھن جائے گی''۔

''اب میں اوتار سنگھ نہیں ہوں کہ تم میرا نام نہ لے سکو۔ میں عبدالحق ہوں۔ تم بڑے ہو۔ تمہیں تو میرا نام لے کر مجھے پکارنا چاہئے.....''

''اس سے تو اچھا ہے مالک کہ تم ہمیں دھکے دے کر یہاں سے نکال دو.....''

''میں جو اجنبی لوگوں کو گلے لگا رہا ہوں، تمہارے ساتھ ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا''۔ عبدالحق نے بے بسی سے کہا ''تم تو میرے گھر کا فرد ہو۔ مگر اب مجھے تم سے شکایت ہے.....''

یہ سن کر تو زبیر لرز گیا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو مالک؟''۔

''ایک طرف تم مجھے مالک کہتے ہو۔ دوسری طرف میرا حکم بھی نہیں مانتے.....''۔

''جس دن آپ کا حکم نہ مانوں مالک تو مر ہی نہ جاؤں''۔

''تو میں کہتا ہوں کہ میرا نام لو، مجھے چھوٹا بھائی سمجھو''؟

زبیر کو چپ لگ گئی۔ ''آپ خود سوچو مالک کہ کیا یہ ہو سکتا ہے''

عبدالحق کو اس پر ترس آنے لگا۔ ''چلو، تم مجھے مالک کہتے رہو۔ مگر دل میں مجھے چھوٹا بھائی سمجھو تو۔ اور میں کہتا ہوں کہ تم سب کچھ چھوڑ کر پہلے دین کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ تبھی یہ بات تمہاری سمجھ میں آئے گی۔ میں مولوی صاحب سے بات کروں گا۔ تم روزانہ ان کے پاس پڑھنے کے لئے جایا کرو.....''۔

''جو حکم مالک۔ میں جاؤں گا۔ پر یہ پیسے رکھ لو''۔

''نہیں زبیر۔ یہ تمہارے ہیں۔ اب تم اپنی مرضی سے خرچ کرنا سیکھو۔ تم اگر شہر جاؤ اور میرے لئے کوئی چیز خرید کر لاؤ تو مجھے اس سے بہت خوشی ہو گی۔ تمہارے علاوہ کون ہے مجھے تحفہ دینے والا''

یہ بات زبیر پر اثر کر گئی۔ ''ٹھیک ہے مالک۔ میں وہ سب کچھ کرنے کی کوشش کروں گا جو آپ چاہتے ہیں لیکن مجھ سے مالک کہنے کا حق چھینو گے تو میں مر جاؤں گا مالک''۔

''کوشش تو کرو گے؟''۔

''اچھا مالک'' زبیر نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

اگلے روز زبیر شہر گیا اور عبدالحق کیلئے ایک بہت شان دار گھوڑا خرید لایا۔ عبدالحق نے اسے بے حد تشکر کے ساتھ قبول کیا۔ اسے امید تھی کہ زبیر پیسہ خرچ کرے گا تو اس کا شوق بڑھے گا اور وہ پیسہ رکھنے لگے گا۔ لیکن اسے یقین ہو گیا کہ وہ لفظ مالک کو اور اپنے لئے اس کی خدمت گزاری کو بھی اس کے سسٹم سے نہیں نکال سکے گا

.....×.....

دو دن ہو گئے۔ نور بانو کا عبدالحق سے سامنا ہی نہیں ہوا کہ وہ اس سے ڈائری پڑھنے کی اجازت مانگتی۔ یوں وہ ڈائری اس کے لئے ایک بہت بڑی آزمائش بن گئی۔ وہ دن میں کئی کئی بار اسے لے کر بیٹھتی اور خود سے بحث کرتی۔

اس کے پاس ایک دلیل تھی۔ اس نے عبدالحق سے ان کتابوں کو پڑھنے کی اجازت مانگی تھی اور عبدالحق نے اجازت دی تھی۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ وہ انہیں نہ پڑھے۔

مگر رکاوٹ تھا تو اس کا ضمیر.....اس کا ضابطہ اخلاق۔ وہ جانتی تھی کہ جب وہ اجازت مانگ رہی تھی تو اسے نہیں معلوم تھا کہ ان کتابوں میں دو ذاتی ڈائریاں بھی ہیں۔ اور یہ بات عبدالحق کو بھی معلوم نہیں تھی۔ تو اس نے کتابیں پڑھنے کی اجازت مانگی تھی اور عبدالحق نے اسے کتابیں پڑھنے کی ہی اجازت دی تھی۔ وہ اجازت ڈائری کیلئے نہیں تھی۔ ڈائری تو بہت ذاتی چیز ہوتی ہے۔

دونوں دن وہ عبدالحق کیلئے باہر نکلی۔ لیکن اسے اس کی مصروفیت کا بخوبی اندازہ ہو گیا۔ وہ ایک جگہ ٹھہر ہی نہیں رہا تھا۔ ابھی یہاں ہے تو ابھی وہاں ہے اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ اس نے خود کو کام میں اس طرح الجھا لیا ہے کہ اسے سانس لینے کی بھی فرصت نہیں۔ اور تیسرے دن وہ نظر ہی نہیں آیا۔ کسی ضروری کام سے اسے شہر جانا پڑ گیا تھا۔

اس روز وہ گھر میں واپس آئی تو دونوں ڈائریاں سامنے رکھ کر بیٹھ گئی۔ وہ بڑی کشمکش میں تھی۔ دل چاہتا تھا کہ پہلی ڈائری کھولے اور پڑھنا شروع کر دے۔ لیکن یہ بھی جانتی تھی کہ اخلاقاً یہ غلط بات ہے۔

پھر اچانک ایک دلیل نے اس کے ذہن کو چھو لیا۔ عبدالحق کے والد کے سیف سے جتنی بھی کتابیں نکلی تھیں، اس نے ان کو پڑھنے کی اجازت اس سے لے لی تھی۔ اور ان کتابوں میں یہ ڈائریاں بھی شامل تھیں۔

وہ مسکرائی۔ دلیل اس کے دل کو مؤثر لگی تھی۔

لیکن ضمیر ماننے والا نہیں تھا۔ اس نے گرج کر کہا۔ اس وقت نہ تمہیں معلوم تھا کہ ان کتابوں میں کوئی ڈائری ہے، نہ ہی عبدالحق کے علم میں تھی۔ تو وہ اجازت کتابوں کیلئے تھی، ڈائری کیلئے نہیں۔

ضروری نہیں کہ عبدالحق کو ڈائریوں کی موجودگی کا علم نہ ہو۔ نور بانو نے ایک اور دلیل نکالی۔

علم ہوتا تو کتابوں کے برآمد ہونے پر وہ حیران نہ ہوتا۔ ضمیر نے دلیل رد کر دی۔

اس کی حیرت کا سبب کتابوں کے موضوعات تھے۔ ورنہ ایک بیٹے کو تو یہ علم ہوتا ہے کہ اس کا باپ ڈائری لکھتا ہے۔

مگر اس نے تمہیں کتابیں پڑھنے کی اجازت دی تھی، ڈائری پڑھنے کی نہیں۔ اور ڈائری پڑھنے کی اجازت تو تم نے مانگی بھی نہیں تھی۔

نور بانو اخلاقی اعتبار سے کوئی کمزور لڑکی نہیں تھی۔ وہ ضمیر کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔

کچھ دیر وہ یونہی ڈائری ہاتھ میں لئے بیٹھی رہی۔ پھر بے دھیانی میں اس نے ڈائری کا پہلا صفحہ کھول لیا۔ اب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بے دھیانی اس کی لاشعوری خواہش کی پیدا کردہ تھی یا نہیں۔

بہر حال صفحہ کھولتے ہی جو الفاظ اسے نظر آئے، انہوں نے اس کی توجہ کھینچ لی، اسے پتا بھی نہیں چلا کہ وہ ڈائری پڑھ رہی ہے۔ وہ الفاظ تھے ہی ایسے.....! ٹھاکر نے لکھا تھا.....

'میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی ڈائری لکھنے پر مجبور ہوں گا۔ میرے دوست امان اللہ نے مجھے بتایا تھا کہ ڈائری لکھنا ایسا ہے جیسے تنہائی میں خود سے باتیں کرنا۔ جو بات آدمی کسی کے ساتھ بھی نہ کر سکے۔ وہ اس کیلئے بوجھ بن جاتی ہے اس بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے وہ بات خود سے کر لی جاتی ہے.....ڈائری لکھ کر۔ یوں دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔

''اس پر میں نے اکڑ کر کہا تھا.....اسی لئے تو ہم ٹھاکر لوگ ڈائری کبھی نہیں لکھتے۔ ہمیں خود سے بات کرنے کی ضرورت کبھی نہیں پڑتی۔ ہم ٹھاکر لوگ تو ہر بات صاف کرنے کے قائل ہیں میرے دل میں جو بھی بات آتی ہے، کسی سے بھی کہہ دیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ مجھے کسی سے ڈر نہیں لگتا۔ اس پر امان نے کہا تھا.....اکڑو مت..... یہ وقت ہر انسان پر آتا ہے۔ میں نے کہا تھا.....مجھ پر کبھی نہیں آئے گا۔

''مگر اوتار سنگھ کی پیدائش سے پہلے ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا، جس پر میں رنجیتا کے سوا کسی سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ جب تک رنجیتا رہی، وہ بوجھ ہونے کے باوجود میرے لئے بوجھ نہیں بنا۔ لیکن رنجیتا کے بعد اوتار سنگھ تعلیم کے لئے دہلی چلا گیا اور میں اکیلا رہ گیا۔ تب مجھے ڈائری کا سہارا لینا پڑا''۔

''اوتار سنگھ کا جنم ایسا پراسرار معاملہ ہے کہ اگر میرے ساتھ نہ پیش نہ آیا ہوتا اور کسی اور نے مجھے سنایا ہوتا تو میں مذاق اڑاتا اور کہتا کہ اچھی کہانی ہے مگر میں جانتا ہوں کہ یہ حقیقت ہے، چاہے سمجھ میں نہ آئے''۔

''میں نے کبھی نہیں سنا کہ دو آدمیوں نے ایک ہی وقت میں ایک خواب دیکھا ہو.....لفظ بہ لفظ، ہو بہو، ایک ہی خواب۔ مگر اوتار سنگھ کی پیدائش سے پہلے میں نے اور رنجیتا نے ایک ہی رات ایسا خواب دیکھا تھا.....''

''نور بانو.....دھیئے، کہاں ہے''۔ حمیدہ نے پکار کر نور بانو کو چونکا دیا۔ چونکی تو اسے احساس ہوا کہ وہ تو ڈائری کے چار صفحے پڑھ چکی ہے۔ شرمندگی سے اس کا برا حال ہو گیا۔

''نور بانو.....''۔

دوسری پکار پر اسے خیال آیا کہ اس نے حمیدہ کو جواب بھی نہیں دیا ہے۔ ''ابھی آئی اماں''۔ اس نے کہا اور ڈائری کو تکیے کے نیچے رکھ دیا۔ پھر وہ کمرے سے نکل گئی۔

وہ حمیدہ کے کمرے میں پہنچی۔ ''کیا بات ہے اماں؟''۔

''میری آنکھوں میں دوا ڈال دے بیٹی۔ عبدالحق کو تو اب فرصت ہی نہیں ہے۔ پتا نہیں، ٹھیک سے کھاتا بھی ہے یا نہیں''۔

نور بانو نے دوا کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا ''آپ لیٹ جائیں اماں، میں دوا ڈال دوں''۔

وہ اس کی دوسری شرمندگی تھی۔ اماں کو پکارنے کی ضرورت پڑ گئی صرف اس لئے کہ ڈائری کے چکر میں اسے وقت کا احساس ہی نہیں رہا۔ ورنہ وہ خود ہی اماں کو یاد دلاتی تھی کہ دوا ڈالنے کا وقت ہو گیا ہے۔ اور بلا اجازت وہ ڈائری پڑھنا پہلی شرمندگی تھی۔

.....×.....

اب ڈائری پڑھنے سے پہلے تو وہ رک نہیں سکتی تھی۔ جو کچھ اس نے پڑھا تھا، اس سے تو آتشیں شوق بھڑک گئی تھی۔ اور اب اس کے پاس ایک دلیل بھی تھی۔ غلطی وہ کر چکی تھی تو اب مکمل غلطی ہی سہی۔

عبدالحق کے باپ نے جس انداز میں لکھا تھا، اس سے پتا چلتا تھا کہ عبدالحق کی ولادت ایک بڑا واقعہ تھی۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ وہ والدین کی شادی کے بیس سال بعد پیدا ہوا تھا۔

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

مگر اب یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی ولادت سے پہلے اور بعد پراسرار حالات پیش آئے تھے۔ پہلا واقعہ وہ خواب تھا، جو اس کے ماں اور باپ نے بہ یک وقت دیکھا تھا۔ وہ اس خواب کی تمہید ہی پڑھ رہی تھی کہ حمیدہ نے اسے آواز دے لی تھی۔ اب وہ آگے پڑھنے کو بے تاب تھی۔

اس نے آگے پڑھنا شروع کیا تو ڈائری میں کھو ہی گئی۔

وہ تو ناقابل فہم واقعات تھے۔ وہ حقیقت نہیں، افسانہ لگتا تھا۔ اور فسانہ بھی ایسا، جس کا حقیقت سے دور کا تعلق بھی نہ ہو.....ایک دیومالائی افسانہ!

جیسے جیسے وہ پڑھتی گئی، اس کی سمجھ میں آ گیا کہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کیلئے وہ ڈائری لکھنا کتنا ضروری ہو گیا تھا۔ ابتدا میں جو اس نے ڈائری لکھنے کی وجہ بیان کی تھی۔ نور بانو نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ لیکن ڈائری پڑھتے پڑھتے وہ یہ ماننے پر مجبور ہو گئی کہ ٹھاکر کیونکہ قلم کا دھنی نہیں تھا، اس لئے اپنی مجبوری کو پوری طرح سے بیان نہیں کر سکا تھا۔ جو کچھ اس ڈائری میں تھا، اسے وہ جھوٹ یا افسانہ بھی قرار نہیں دے سکتی تھی۔ اور وہ ایسا بھی نہیں تھا کہ اس پر آسانی سے یقین کیا جا سکتا۔ لیکن اس کا دل اس پر یقین کر رہا تھا۔

ٹھاکر پرتاب سنگھ نے واقعات کو ترتیب کے ساتھ، بے حد سادگی سے لکھا تھا۔ اس کے نتیجے میں کڑی سے کڑی ملتی گئی اور کہیں کوئی ابہام نہیں رہا تھا۔

مگر واقعات ناقابل یقین تھے۔ میاں بیوی کا ایک ہی رات ایک جیسا خواب دیکھنا بھی کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ پھر اس خواب کے بعد اس درخت کا سوکھ جانا، جس پر انہوں نے آخری بار اولاد کے لئے چڑھاوا دیا تھا۔ اس پر دونوں میاں بیوی کی مایوسی بھی بالکل فطری تھی۔ جس درخت سے وہ بیٹا مانگ رہے تھے، جس سے انہیں خوش خبری ملی تھی، وہ عین بہار کے موسم میں اس طرح جل گیا تھا کہ اس پر ایک پتا بھی نہیں بچا تھا۔ لیکن پھر اچانک ہی ٹھاکرانی کی گود بھر گئی تھی۔

مجذوب کے بارے میں پڑھ کر نور بانو کو وہ بابا یاد آیا، جو دہلی میں اس کے گھر عین ضرورت کے وقت آیا تھا۔ جب عبداللہ نے اسلام قبول کیا تھا، جب وہ کہہ رہی تھی کہ انہیں اسلام قبول کرنے کے لئے مسجد جانا ہوگا۔ تو وہ کیا وہی مجذوب تھا؟ اسے تو عبدالحق بھی جانتا تھا اور زبیر بھی۔ بلکہ زبیر نے تو کہا تھا کہ وہ عبدالحق کی پیدائش والے دن گاؤں آیا تھا۔ اور یہی بات ٹھاکر پرتاپ سنگھ نے بھی لکھی تھی۔ تو اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ وہ وہی تھا۔ اور وہ وہی تھا تو ٹھاکر کی ڈائری میں لکھی ہر بات کے سچ ہونے کی سند تھی۔ وہ سب ایک دوسرے کی تصدیق کر رہے تھے۔

پھر چھوٹے ٹھاکر کا ماں کا دودھ نہ پینا اور حمیدہ کے دودھ پر اصرار کرنا۔ یہ بھی افسانہ لگتا تھا۔ لیکن یہاں دودھ پلانے والی حمیدہ زندہ تھی۔ اور وہ، وہ تفصیل بھی بیان کرتی تھی، جو ٹھاکر کی ڈائری میں نہیں تھی۔ کیونکہ ٹھاکر کو اس کا علم نہیں تھا۔

آگے ایک ایسی بات تھی.....اہم بات، جو اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ آ بھی نہیں سکتی تھی۔ بات بہت الجھی ہوئی تھی اور ٹھاکر نے کھل کر بھی نہیں لکھی تھی۔ بس وہ یہ سمجھ سکتی تھی کہ وہ کوئی معاملہ ہے، جس میں تمام انسان ایک طرح سے پیدا ہوتے ہیں۔ تاہم مسلمان بچے کو اس حالت کو تبدیل کر کے دوسری حالت پر لایا جاتا ہے۔ یہاں چھوٹا ٹھاکر پیدا ہوا تو اسی دوسری حالت میں تھا۔ اور ٹھاکر نے پوری طرح چھان بین کی تھی اور اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس کا بیٹا اسی حال میں پیدا ہوا ہے۔ اسے اس پر لایا نہیں گیا ہے۔

نور بانو نے اس پر بہت غور کیا لیکن اسکی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

ٹھاکر نے آگے اپنی ڈائری میں لکھا تھا.....

رنجو کے علم میں یہ بات آئی تو وہ پریشان ہو گئی۔ اس وقت تک رنجو کے علاوہ دائی راجو اور شانتا کو بھی یہ بات معلوم تھی۔ وہ دونوں بہت خوف زدہ تھیں۔ کچھ ہی پہلے تو چھوٹے ٹھاکر کے غائب ہو جانے کا معاملہ ہوا تھا اور اس سلسلے میں شانتا پر شک بھی کیا گیا تھا اور اسے دھمکیاں بھی دی گئی تھیں۔ بہرحال رنجو نے مجھے بلوا لیا۔ مجھے یاد ہے کہ میں اس وقت چھوٹے ٹھاکر کے جنم کے جشن میں شریک تھا اور مہمانوں میں گھرا ہوا تھا۔ جمال دین نے مجھ سے اصرار نہ کیا ہوتا تو میں اس محفل سے کبھی نہ اٹھتا۔ میں نے جا کر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ مجھے پہلا خیال یہی آیا کہ یہ اس مجذوب کی حرکت ہے۔ کمرا تبدیل کرتے وقت اس نے میرے پتر کے ساتھ یہ کارروائی بھی کر دی ہوگی۔ لیکن پھر میں نے سمجھ لیا کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ ایک تو وہاں کوئی نشان نہیں تھا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

دوسرے وہ چیز تین دن سے پہلے ٹھیک بھی نہیں ہوتی۔ اور میرے پتر کی تو پیدائش کو بھی ابھی تین دن نہیں ہوئے تھے۔ یہ میں جانتا تھا کہ دائی راجو اور شانتا ایسی جرات نہیں کر سکتیں اور وہ کرتی بھی کیوں۔ میں نے ان دونوں سے اس راز کو ہمیشہ راز رکھنے کا وعدہ لیا۔ مگر اس دن میں نے پہلی بار یہ ضرور سوچا کہ میرے پتر کا مسلمانوں سے کوئی بہت گہرا تعلق ہے۔ بلکہ مجھے تو ایسا لگا کہ اسے کسی مسلمان کے گھر پیدا ہونا تھا۔ مگر بھگوان نے میری اور رنجو کی محرومی دیکھ کر اسے ہمارے گھر پیدا کر دیا ہے۔ تب میں نے سوچا کہ مجھے مسلمانوں کے بارے میں سوچنے اور جاننے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ورنہ شاید میں مجذوب کی ہدایات پر عمل بھی نہیں کر سکوں گا۔ مجذوب نے کہا تھا کہ مجھے بیٹے کی ہر بات ماننا ہوگی۔ وہ جو چاہے کرے۔ اور معنی خیز بات یہ ہے کہ میرے بیٹے نے ماں کا دودھ ہوتے ہوئے گاؤں میں موجود واحد مسلمان عورت کے دودھ کی ضد کی اور اس کیلئے جان پر کھیل گیا۔ وہ صرف چند روز کا تھا اور اس نے مجھے شکست دے دی.....

ڈائری پڑھتے ہوئے نور بانو کو یہ احساس ہو گیا کہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ بہر حال بہت اچھا انسان تھا۔ ورنہ راجاؤں کو اپنی رعایا سے کسی چیز کی ضرورت پڑے تو وہ اسے چھین لیتے ہیں۔ مگر ٹھاکر نے وہ چیز عزت اور عاجزی سے مانگی.....ضرورت مند بن کر مانگی اور اس کا احسان مانا۔ پھر اس احسان کا صلہ دینے کی بھی کوشش کی۔

نور بانو نے وصال دین کو صرف ایک بار دیکھا تھا۔ اور جمال دین کو تو وہ جانتی ہی نہیں تھی۔ حمیدہ کے ساتھ البتہ اب وہ وقت گزار رہی تھی۔ ٹھاکر کی ڈائری پڑھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ غیر معمولی انسان تھے۔ ٹھاکر کو انہوں نے بہت متاثر کیا تھا۔ بلکہ یوں کہیں کہ ٹھاکر کے ذہن پر انہوں نے ان مٹ نقش چھوڑے تھے۔ ٹھاکر کو اپنے بیٹے کی وجہ سے مسلمانوں کو سمجھنے کی، ان کے بارے میں جاننے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ مگر مسلمانوں کے بارے میں اچھا تاثر اس پر اس گھرانے نے قائم کیا تھا۔ ٹھاکر کی ڈائری سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ غیر معمولی طور پر وفادار، احسان شناس، منکسر المزاج، عالی ظرف اور نیک تھے۔ ٹھاکر نے دودھ کے صلے میں اپنی زمین جائیداد آدھی ان کے نام کر دی تھی۔ مگر وہ اسی طرح رہتے رہے اور ٹھاکر کو اسی طرح مانتے رہے۔ اور اب یہ تو نور بانو بھی جانتی تھی کہ انہوں نے چپکے سے وہ سب کچھ چھوٹے ٹھاکر کے نام کر دیا تھا۔

جیسے جیسے نور بانو وہ ڈائری پڑھتی گئی، اس کی شرمندگی بھی بڑھتی رہی اور پچھتاوے کا احساس بھی۔ اور دونوں چیزوں کا تعلق عبدالحق سے تھا۔ وہ شرمندہ تھی تو اپنے گمان پر۔ وہ محبت کے باوجود ہمیشہ اسے کافر اور مشرک کہہ کر رد کرتی رہی۔ اسکے بارے میں اماں نے جب بھی کوئی اچھی بات کی تو اس نے اسے مکاری اور منافقت قرار دیا۔ اس نے ہمیشہ یہی کہا کہ وہ ان کے گھر میں گھسنے کے لئے خود کو اچھا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور پچھتاوا اسے اس بات پر تھا کہ جو محبت اس کے لئے خوشی کا باعث ہو سکتی تھی، اس نے اسے اپنے لئے ذہنی اور روحانی اذیت کا سامان بنا لیا تھا۔ وہ اس محبت کو رد کرتی رہی۔ اس کے نتیجے میں ناخوش رہی اور جلتی کڑھتی رہی۔ اس بات کا احساس اسے باجی کو یاد کر کے ہوتا تھا۔ باجی کتنی خوش رہتی تھیں۔ باجی ایسی از خود رفتگی کی کیفیت میں رہتی تھیں کہ اس وقت تو انہیں دیکھ کر اسے غصہ آتا تھا اور لگتا تھا کہ وہ اللہ سے بغاوت کر رہی ہیں۔ مگر اب اس پر رشک آتا تھا۔

وہ ڈائری بند کر کے اس پر سوچتی رہی کہ اس کی اور باجی کی محبت میں اتنا فرق کیوں تھا۔ ایک جواب تو بالکل سامنے تھا۔ وہ اس محبت پر شرمندہ تھی، جبکہ باجی اس محبت پر نازاں تھیں۔ فرق دونوں کے گمان کا تھا۔ اس کا گمان برا اور غیر لچک دار تھا.....ضد اور ہٹ دھرمی پر مبنی۔ جبکہ باجی اپنے محبوب کے بارے میں اچھا گمان رکھتی تھیں۔ انہیں پتا چلا کہ وہ عربی پڑھتا ہے اور قرآن کی تلاوت سنتا ہے تو انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اس کا رجحان اسلام کی طرف ہے۔ جبکہ اس نے اتنی بڑی بات کو بھی کوئی اہمیت نہیں دی اور بدگمانی کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور بعد میں ثابت ہوا کہ باجی کی سوچ درست تھی۔

مگر یہ تو سامنے کی بات تھی۔ اب وہ یہ سوچ رہی تھی کہ اصل بات تو اندر کی ہے۔ پہلی بار اس نے خود کو سمجھنے کی کوشش کی۔ یہاں آنے کے بعد اس میں خود اعتمادی پیدا ہوئی تھی، یہ اس کی بدولت تھا۔ ورنہ تو کبھی وہ ایسا سوچتی بھی نہیں۔

اس کی سمجھ میں ایک بات آ گئی۔ اس کے اور باجی کے درمیان مزاج اور طبیعت کا بہت بڑا فرق تھا۔ باجی نرم خو اور درگزر کرنے والی تھیں۔ جبکہ وہ تند مزاج اور دوسروں کی غلطیاں پکڑ کر خوش ہونے والی تھی۔ باجی خوش مزاج تھیں، بات بات پر ہنسنے والی۔ اور مسکراہٹ تو کبھی ان کے ہونٹوں سے جدا ہی نہیں ہوتی تھی۔ اور وہ بدمزاج اور اپنے آپ میں گم رہنے والی تھی۔ مسکراتی بھی وہ کبھی کبھار ہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ محبت سے اس کا کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔ اور باجی کو تو لگتا تھا کہ بنایا ہی محبت کے لئے گیا ہے۔

اب اس نے سوچا کہ ایسا کیوں تھا۔ کوئی سبب بھی تو ہوگا۔ اس نے حوصلہ کر کے اس پر سوچا تو اسے اس کا بھی جواب مل گیا۔ وہ اپنی صورت شکل اور رنگ و روپ کے حوالے سے احساس کم تری کا شکار تھی۔ اسے اللہ سے شکایت تھی کہ اس نے اسے دونوں بہنوں سے مختلف بنایا۔ وہ اپنی بہنوں سے اپنا موازنہ کرتی اور اس کے نتیجے میں ناخوش رہتی۔

تو اب اس کی سمجھ میں آیا کہ مذہب کا فرق اور خوف خدا اپنی جگہ، لیکن اسے مسترد کئے جانے کا خوف بھی تھا۔ اس کے اندر کہیں گہرائی میں یہ خوف بیٹھا ہوا تھا کہ اسے کبھی محبت نہیں ملے گی۔ وہ اس قابل ہے ہی نہیں کہ کوئی اس سے محبت کرے۔ اس کے باوجود شاید وہ محبت اس کے لئے کوئی خوب صورت اور نازک خواب بن جاتی اور وہ چپکے چپکے، نہ چاہتے ہوئے بھی اس سے لطف اٹھاتی۔ مگر جب اسے یہ احساس ہوا کہ باجی کی محبت کا مرکز بھی چھوٹا ٹھاکر ہی ہے، تو اس نے سمجھ لیا کہ اس کے لئے اب کوئی امکان نہیں ہے۔ حالانکہ امکان تو کبھی چھوٹے ٹھاکر سے سامنا ہونے کا بھی نہیں تھا لیکن اب تو اسے خواب و خیال میں بھی چھوٹے ٹھاکر کی محبت نہیں مل سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اور کڑوی ہو گئی۔

یہ تو وہ جانتی تھی کہ عملی طور پر چھوٹے ٹھاکر کے باجی سے یا اس سے ربط ضبط کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس کے لئے تو وہ بس خواب خیال کا معاملہ تھا.....اور پھر وہ بھی نہیں رہا۔

لیکن اب وہ سوچ رہی تھی کہ ہونے کو تو دنیا میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ خواب و خیال میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ وہ جب کے چھوٹے ٹھاکر اور حال کے عبدالحق کے اتنا قریب رہ سکے گی۔ لیکن یہ ہو گیا تھا۔

اس نے سوچا میرے لئے تو یہ بھی بہت بڑی بات ہے۔ محبت نہیں مل سکتی تو کیا ہوا، اسے اپنے محبوب کی قربت تو مل گئی۔ اس نے عہد کیا کہ اب پہلے کی طرح ناشکرا پن کبھی نہیں کرے گی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ ابھی اسے پچھلے ناشکرے پن کی سزا ملنی ہے۔

.....x.....

جہاں کبھی حویلی تھی، وہاں عبدالحق کی مرضی کے مطابق مکانات تعمیر ہو گئے تھے۔ عبدالحق نے اپنے لئے وہی کمرا مخصوص کیا تھا، جو پہلے حویلی میں اس کا کمرا ہوتا تھا۔ اس نے اپنے لئے جو مکان بنوایا تھا، اس میں چھ کمرے تھے۔ ایک کمرا اماں کا، ایک نور بانو کا، دو زبیر کے اور ایک اس کا اپنا تھا۔ چھٹا کمرا مردانہ تھا اور بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کاشین

تحریر: علیم الحق حقی

یوں وہ جگہ، جہاں کبھی حویلی تھی، اب گاؤں کا رہائشی علاقہ بن گیا۔ جہاں ایک گھر تھا، وہاں دس گھر بن گئے۔ عبدالحق نے یہ کام بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ اس کے پیش نظر اس کی افادیت تھی۔ ایک تو وہ زمین کو کفایت کے ساتھ استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں ہندوستان سے آنے والوں کی نوآبادکاری کا اہم کام تھا۔ بڑی حویلی اور بڑے مکانوں کی ایسی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس طرح سے زمین بچا کر اسے زراعت کے کام میں لایا جاتا تو کسی ایک گھرانے کا تو بھلا ہوتا۔ دوسرے اس کے نتیجے میں گاؤں میں مرکزیت کا تصور بھی قائم ہوا تھا۔ وہاں رہنے والوں میں قربت اور یگانگت پیدا ہوتی۔

سب لوگ بہت خوش تھے۔ وہ عبدالحق کی طرف ایسے دیکھتے تھے، جیسے وہ اس دنیا کا آدمی ہی نہ ہو۔ وہ نوجوان تھا۔ لیکن وہ اس کی ایسی عزت کرتے، جیسے وہ ان سب سے بڑا ہو۔ انہوں نے اس کے دل کی بڑائی دیکھی تھی، اس کا ایثار دیکھا تھا، وہ کبھی صرف اپنے لئے نہیں سوچتا تھا۔ اس کی سوچ اجتماعی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اسے ان سے کوئی غرض نہیں ہے۔ وہ ان کی بہتری کے لئے یہ سب کچھ کر رہا ہے۔ وہ ان کی تکالیف، ان کے مصائب دور کرنا چاہتا تھا۔ اس کا مقصد ان کیلئے آرام اور خوش حالی کا حصول تھا۔ ورنہ وہ اس علاقے کا سب سے بڑا زمین دار بن سکتا تھا۔

سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں منتقل ہو گئے۔ زندگی اپنے نئے راستے پر قدم بڑھانے لگی۔ اب سب لوگوں کو صرف پانی کا انتظار تھا۔ پانی آجاتا تو وہ زمین سے رزق حاصل کرنے کی کوشش شروع کرتے۔ اور وہ دیکھ رہے تھے کہ اس سلسلے میں بھی بہت تیزی سے کام ہو رہا ہے وہ سب سوچتے تھے کہ عبدالحق نے اپنا سب کچھ اس کام میں جھونک دیا ہے۔ اور جواب میں ان سے کچھ طے بھی نہیں کیا ہے۔

نئے گھر میں منتقل ہونے کے بعد نور بانو کو عبدالحق سے دوری کا احساس ہونے لگا۔ سب کے کمرے الگ ہو گئے تھے۔ عبدالحق کا زیادہ وقت باہر ہی گزرتا۔ پھر وہ دن بھر کا تھکا ہارا لوٹ کر آتا تو کبھی تو وہ بیٹھک میں ہی لیٹ کر سو جاتا۔ کئی کئی دن وہ اس کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ پاتی۔ وہ اس سے ڈائری کے سلسلے میں بھی بات نہیں کر پا رہی تھی۔

دوسری طرف وہ خود بھی بہت مصروف ہو گئی تھی۔ وہ بیک وقت دو سویٹر بن رہی تھی۔ اور وہ چاہتی تھی کہ سردی کا موسم آنے سے پہلے چار سویٹر مکمل کر لے۔

حمیدہ کی آنکھیں تقریباً پوری طرح ٹھیک ہو چکی تھیں۔ عبدالحق اسے ہر ہفتے شہر لے جاتا تھا..... ڈاکٹر کو دکھانے کے لئے۔

''اب آپ چشمہ لگانا کم کر دیں''۔ ڈاکٹر نے حمیدہ سے کہا تھا۔

''میں تو یہ لگانا ہی نہیں چاہتی''۔

ڈاکٹر ہنسنے لگا۔ ''نہیں، ایسا نہ کریں۔ ابھی آپ کو اس کی ضرورت ہے''۔

''تو پھر کم کرنے کا مطلب؟''۔

''صبح کے وقت اور شام کے وقت، جب دھوپ ہلکی ہو جاتی ہے، آپ چشمہ اتار کر دیکھیں''۔ ڈاکٹر نے مشورہ دیا۔ ''لیکن نظروں میں چبھن ہو تو فوراً چشمہ لگا لیں''۔

''اور دوپہر میں؟''۔

''تیز دھوپ میں چشمہ لگانا ضروری ہے ابھی۔ یہ احتیاط کریں گی تو کچھ عرصے کے بعد چشمہ لگانے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی''۔

حمیدہ کو وہ رعایت بھی بڑی نعمت لگی۔ پہلی بار دن کے اجالے میں اس نے چشمے کے بغیر دنیا کو دیکھا تو اسے بڑی خوشی ہوئی۔ اس کے دل کی گہرائیوں سے عبدالحق کے لئے دعا نکلی۔ پھر وہ شوہر اور بیٹے کو یاد کر کے رونے لگی۔ آج وہ دونوں موجود ہوتے تو عبدالحق کو عبدالحق دیکھ کر کتنے خوش ہوتے۔ اور اپنے گاؤں میں اذان کی آواز سن کر انہیں کتنی خوشی ہوتی۔

.....x.....

گاؤں میں ریت ہٹانے کا کام بہت تیز رفتاری سے ہو رہا تھا۔ مگر کام بہت بڑا تھا۔ عبدالحق کو اندازہ تھا کہ اس تیز رفتاری کے باوجود کام مکمل ہونے میں کم از کم چار مہینے تو لگیں گے۔

وہ بہت مصروف ہو گیا تھا۔ اسے ریت ہٹانے کے کام کی نگرانی خود کرنا تھی۔ اگر وہ اس کام پر توجہ نہ دیتا تو کام کی یہ رفتار ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ سب کے پیچھے پڑا رہتا تھا۔ پھر شہر آنا جانا بھی لگا رہتا تھا۔ ان تمام مصروفیات میں وہ تھک کر چور ہو جاتا تھا۔ مگر اسے کوئی ملال نہیں تھا۔ یہ کام تو اسے کرنا ہی تھا۔

ایک اس پر اللہ کی رحمت تھی۔ وہ رات میں مشکل سے دو تین گھنٹے سوتا تھا۔ لیکن وہ ایسی بھرپور نیند ہوتی تھی کہ وہ ایسا تازہ دم اٹھتا تھا، جیسے اس نے آٹھ گھنٹے کی نیند لی ہو۔ اور یہ اس رات کا تحفہ تھا، جب اس نے اسلام قبول کیا تھا..... رمضان المبارک کی پہلی رات!

ابتدا میں تو وہ اس تبدیلی سے بہت ڈرا تھا۔ اس لئے کہ وہ اسے غیر فطری لگتی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ تقریباً دو مہینے تک تو وہ بالکل سو ہی نہیں سکا تھا۔ نیند آتی ہی نہیں تھی۔ مگر کوئی تکلیف بھی نہیں تھی۔ نیند کی کمی کا احساس ہوتا تھا، نہ ہی کوئی تھکن ہوتی تھی۔ بس وہ سارا دن، ساری رات جاگتا رہتا تھا۔ اس سے اسے جسمانی طور پر تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ البتہ ذہنی طور پر وہ خود کو بیمار اور ایب نارمل سمجھنے لگا تھا۔ تکلیف یہ بھی تھی کہ رات کو نیند نہ آئے تو وہ کیا کرے۔ کروٹیں بدلنے کے سوا کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ سوچتا کہ اللہ نے دن کام کرنے کیلئے بنایا ہے اور رات آرام کے لئے۔ اب وہ رات کی نیند سے محروم ہے تو کہیں اس کا سبب یہ تو نہیں کہ اللہ اس سے ناراض ہے۔ اس خیال سے وہ بہت بے چین رہتا تھا۔

وہ سوچتا کہ اس پر کسی سے بات کرے۔ لیکن ہمت نہیں ہوتی تھی۔ پھر جب مہر علی مسجد کے امام کی حیثیت سے آئے تو اس نے یہ مسئلہ ان کے سامنے رکھا۔

مہر علی چند لمحے اسے بہ غور دیکھتے رہے۔ پھر بولے۔ ''یہ تو تم پر اللہ کی رحمت ہوئی ہے عبدالحق''۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا''۔

''یہ سچ ہے کہ اللہ نے رات آرام کے لئے بنائی ہے۔ مگر اللہ کو یہ بہت پسند ہے کہ اس کا بندہ اپنے آرام کے وقت میں سے اس کے لئے وقت نکالے۔ آدھی رات کے بعد کی عبادت اللہ کو بہت پسند ہے۔ کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ جس دعا کی قبولیت کا امکان ہوتا ہے، وہ دعائے نیم شب ہے''۔

عبدالحق اب بھی انہیں ایسے دیکھ رہا تھا، جیسے ان کی بات سمجھ نہیں پا رہا ہو۔

''دیکھو..... دن اللہ نے کام کے لئے بنایا ہے۔ اس لئے بنایا ہے کہ تم اس میں اللہ کا فضل تلاش کرو۔ یعنی دن میں تمہیں بندوں کے حقوق ادا کرنے ہیں۔ اس میں دو فرض نمازیں بھی پڑھنی ہیں۔ سورہ مزمل میں اللہ نے فرمایا ہے کہ قرآن رات کے وقت پڑھو اور ٹھہر ٹھہر کر..... سمجھنے کی نیت سے پڑھو۔ وجہ؟''۔ اتنا کہہ کر مہر علی نے توقف کیا اور چند لمحے یوں خاموش رہے، جیسے اپنے ہی اٹھائے ہوئے سوال کا جواب سوچ رہے ہیں۔ پھر انہوں نے سلسلہ کلام جوڑا۔ ''دن کام کے لئے ہے۔ کام آدمی اپنے لئے بھی کرتا ہے اور دوسروں کے لئے بھی۔ یعنی وہ وقت خالص تمہارا اپنا نہیں ہوتا۔ اب تم دن میں قرآن پڑھو تو دو باتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ دھیان کسی ایسے کام کی طرف لگا ہوگا، جو تمہیں کرنا ہے تو یک سوئی نہیں ہوگی۔ یک سوئی نہیں ہوگی تو سمجھ میں کیا آئے گا۔ پھر وہ اللہ کا کلام ہے۔ یک سوئی کے بغیر اسے پڑھنا احترام کے منافی ہے..... گستاخی ہے۔ تو تمہیں قرآن پڑھنے سے وہ کچھ حاصل نہیں ہوگا، جو ہونا چاہئے۔ الا یہ کہ اللہ چاہے۔ اور پھر تم ایسے وقت میں قرآن پڑھ رہے ہو گے، جس پر دوسروں کا حق ہے یا پھر اللہ کے فضل کی تلاش میں کوتاہی کر رہے ہو گے۔ اور رات کا وقت خالص تمہارا اپنا ہے، تمہارے آرام کے لئے ہے۔ اپنے آرام کو نظر انداز کر کے اللہ کے لئے وقت نکالو گے تو اللہ خوش ہوگا۔ تمہاری عبادت قبول کرے گا۔ قرآن پڑھو گے تو تمہیں قرآن فہمی عطا فرمائے گا۔ اور یہ بھی ہوگا کہ تمہیں دنیا کے کسی کام کی فکر نہیں ہوگی اور تمہیں یک سوئی بھی حاصل ہو گی۔ اسلئے نفلی عبادت کے لئے رات ہی ہے۔ اللہ نے رات آرام کیلئے بنائی ہے۔ تم آرام کے بجائے عبادت کرو، قرآن پڑھو، ذکر کرو تو اس کے اجر کا تم اندازہ ہی نہیں کر سکتے''۔

عبدالحق کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس کے دل سے مہر علی کے لئے دعا نکلی۔ رات کے وقت کے زیاں نے اسے بہت بے چین کر رکھا تھا۔

مہر علی نے اسے تہجد کی نماز کے بارے میں بتایا۔

اس کے بعد پہلی بار وہ سویا۔ شاید اس لئے کہ تہجد کے لئے سو کر اٹھنا ضروری تھا۔ دو گھنٹے کے بعد وہ اٹھا تو پوری طرح تازہ دم تھا۔ یوں اس کا ایک نیا معمول قائم ہو گیا، ایسا معمول، جس میں اس کے لئے روحانی خوشی تھی۔ قرآن پاک سے تو اسے عشق تھا۔ قرآن پڑھنے سے تو اس کا دل ہی نہیں بھرتا تھا۔

یہاں بھی مہر علی نے اس کی رہنمائی کی۔ ''قرآن صرف اس وقت تک پڑھا کرو، جب تک طبیعت میں شگفتگی رہے۔ یہ بہت بھاری کلام ہے۔ دل و دماغ بوجھل محسوس ہونے لگیں تو طبیعت کی شگفتگی واپس آنے تک وقفہ کرو''۔

اب اس مصروفیت میں یہ نیا معمول اور بڑی نعمت بن گیا۔ دن میں قرآن پڑھنے کا وقت ملتا ہی نہیں تھا۔ وہ رات کو سونے سے پہلے اور پھر تہجد اور فجر کے درمیان قرآن پڑھتا تھا۔

شب بیداری میں اسے لذت ملنے لگی!

.....x.....

نور بانو نے ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی پہلی ڈائری پڑھ لی تھی، جس میں واقعات تھے۔ اسکے بعد وہ دوسری ڈائری بھی پڑھنے لگی۔ دوسری ڈائری تاریخ وار لکھی گئی تھی۔ اس میں ٹھاکر کے شب و روز بھی تھے، واقعات بھی اور اس کے بدلتے ہوئے رجحانات کا عکس بھی۔

وہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کی ایک بات سے پوری طرح متفق تھی۔ عبدالحق کی ٹھاکر پرتاپ کے ہاں پیدائش میں اللہ کی کوئی مصلحت تھی، اللہ کا کوئی بھید تھا، جو وہی جانتا تھا۔ ورنہ عبدالحق کو تو واقعی کسی مسلمان گھرانے میں پیدا ہونا چاہئے تھا۔

اب وہ سوچتی تھی کہ اماں پہلی بار اوپر گئیں تو چھوٹے ٹھاکر کو پرسہ دینے گئی تھیں۔ مگر وہ انہیں اتنا اچھا لگا کہ انہوں نے اسے بیٹا بنا لیا۔ وہ تو اسے اپنے گھر بلانے پر تلی ہوئی تھیں۔ اگر خود اس نے مزاحمت نہ کی ہوتی تو وہ اسے ہر حال میں اپنے گھر لے آتیں۔ اماں کہتی تھیں..... اس میں کافروں اور مشرکوں والی کوئی بات نہیں۔ وہ بتوں کی پوجا نہیں کرتا۔ وہ حق کی جستجو میں ہے۔ اور اماں کہتی تھیں کہ میں ہر نماز کے بعد اللہ سے اس کی ہدایت کے لئے دعا کرتی ہوں۔

اماں تو خیر اس سے ملتی رہی تھیں، باتیں کرتی رہی تھیں۔ لیکن باجی نے تو اس سے کبھی بات نہیں کی تھی۔ وہ تو بس اس سے محبت کرتی تھیں اور ان کا یقین تھا کہ وہ ایک دن مسلمان ہو جائے گا۔ کیسے؟ صرف محبت کی وجہ سے! وہ اسے اتنا یقینی طور پر سمجھتی تھیں۔ تو اس کی اپنی محبت میں کوئی کمی تھی کہ وہ اسے کافر اور مشرک سمجھتی اور کہتی رہی۔

بہر حال اب ڈائری پڑھ کر وہ سمجھ گئی کہ اماں اور باجی دونوں درست تھیں اور وہ غلطی پر تھی۔ اسے یہ احساس بھی ہو گیا کہ اس وقت کے چھوٹے ٹھاکر کیلئے اس کی اور باجی کی محبت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اور وہ اس پر شرمندہ ہونے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com

عشق کا شین

تحریر: علیم الحق حقی

دوسری ڈائری پڑھتے ہوئے ایک مقام ایسا آیا کہ وہ ہل کر رہ گئی۔ ٹھاکر نے لکھا تھا.....

"مجھے اپنے پتر کی صورت دیکھے کئی مہینے ہو گئے تھے۔ کبھی کبھی تو دل میں آتا تھا کہ اسے اسکول سے اٹھالوں۔ اسکول سے اچھی پڑھائی کا تو میں گھر پر بھی بندوبست کر سکتا تھا۔ لیکن ہر بار میں نے خود کو سمجھایا کہ گاؤں میں میرا بیٹا کتنا ہی علم حاصل کر لے، کنویں کا مینڈک رہے گا۔ شہر میں، اسکول میں وہ اور بہت کچھ سیکھے گا۔ میں اپنی خودغرضی پر کڑھتا تھا۔ مگر میں کیا کرتا، رنجو کے بعد میرے پاس اوتار سنگھ کے سوا تھا ہی کیا۔

پھر اس دن میری برداشت جواب دے گئی گرمیوں کی چھٹیاں ہونے والی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ اب اوتار سنگھ گھر آئے گا۔ مگر اس میں ابھی بھی دس پندرہ دن باقی تھے۔ اور میں اب اسے دیکھے بنا رہ نہیں سکتا تھا۔ میں اس کے ساتھ تین دن گزارنے کی غرض سے دہلی چلا گیا۔

میں ان تین دنوں میں اس کو ہر پل اپنی نگاہوں کے سامنے رکھنا چاہتا تھا۔ اسکول جانا تو مجبوری تھی۔ مگر شام کو وہ کتابیں لے کر کوٹھے پر جانے لگا مجھے فخر ہوا کہ اسے پڑھائی کی کتنی فکر ہے۔ میں اس کے ساتھ اوپر چلا گیا کہ وہ پڑھے، تب بھی میں اسے دیکھتا رہوں۔

مگر اوپر پہنچ کر وہ پڑھنے کے بجائے مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ میرے ٹوکنے پر اس نے کہا کہ امتحان تو ہو چکے ہیں۔ اب میں آ گیا ہوں تو وہ مجھے دیکھنا بھی چاہتا ہے اور مجھ سے باتیں کرنا بھی چاہتا ہے۔

مجھے احساس ہوا کہ بات کچھ اور ہے۔ بلکہ مجھے ایسا لگا کہ وہ پڑھائی کے لئے کوٹھے پر نہیں آیا، کسی اور وجہ سے آیا ہے۔ بیٹا کتنا ہی ذہین ہو، باپ کا تجربہ تو اس کے پاس نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ باپ بیٹوں کے بہت سے راز بغیر کہے سمجھ جاتے ہیں۔ میں اسے غور سے دیکھتا رہا۔ وہ بڑا ہو رہا تھا۔ جوانی کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ اور میں نے دیکھا کہ وہ بہت خوب صورت لگ رہا ہے۔ میں نے دل میں کہا، ہو نہ ہو، یہ کوئی لڑکی کا چکر ہے۔ میرا پتر محبت کرنے کی عمر میں داخل ہو گیا ہے۔

میں نظریں جھکا کر بیٹھ گیا۔ میں اسے موقع دے رہا تھا کہ وہ جس مقصد کے تحت اوپر آیا ہے، وہ پورا کرے۔ اور میں چپکے چپکے اسے دیکھ رہا تھا۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ اس کی نظریں مجھ پر جمی تھیں۔ وہ ادھر ادھر نہیں بھٹک رہی تھیں۔ وہ پورے دھیان کے ساتھ مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھے اپنی بدگمانی پر شرمندگی ہونے لگی۔ وہاں اردگرد اور کوٹھے بھی تھے۔ میں بڑی احتیاط کے ساتھ ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ مگر مجھے کسی کوٹھے پر کوئی لڑکی نظر نہیں آئی۔ پھر بھی میرے دل کو یقین تھا کہ کوئی بات ضرور ہے اور سامنے بھی آئے گی۔

یہ عبارت پڑھتے ہوئے خنک موسم میں بھی نور بانو کی پیشانی عرق آلود ہو گئی اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے لگ رہا تھا کہ کسی بہت بڑے راز سے پردہ اٹھنے والا ہے۔ ایک لمحے کو اس نے سوچا، کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی کوٹھے پر کوئی لڑکی آتی ہو اور چھوٹے ٹھاکر کو اس سے محبت ہو گئی ہو۔ مگر پھر اسے باجی کا خیال آیا، جو عصر کی نماز میں بھی الکسی کرتی تھیں اور قرآن پڑھتے ہوئے وضو کے بہانے اٹھ جاتی تھیں اور چھوٹے ٹھاکر کو دیکھتی تھیں۔ تو کیا چھوٹا ٹھاکر بھی انہیں دیکھتا تھا۔ اس کے دل میں کانٹا سا چبھ گیا۔ یہی بات ہو گی۔

پھر اسے شرمندگی ہوئی۔ اب تو وہ بہن دنیا میں ہی نہیں تھی۔ اور وہ اس سے رقابت محسوس کر رہی تھی۔

اس نے سر جھکایا اور دوبارہ ڈائری پڑھنے لگی.....

پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ اوتار سنگھ نے مجھ سے کہا کہ اسے ٹیچر کی ضرورت ہے۔ مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے کہا، کانتی پرشاد جی ہیں نا۔ اس پر وہ بولا.....نہیں پتا جی، مجھے عربی پڑھنی ہے۔ مجھے اور حیرت ہوئی۔ مگر میں نے کہا کہ گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد اس کا بندوبست بھی کر دوں گا۔ وہ کچھ شرمندہ نظر آنے لگا اور بولا کہ وہ اس بار گرمی کی چھٹیاں دہلی میں گزارنا چاہتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ جلد سے جلد عربی پڑھ لینا چاہتا ہے۔ کیونکہ عربی میں وہ دس سال پیچھے ہے اور چاہتا ہے کہ ان چھٹیوں میں یہ فرق پورا کر لے۔

میرے لئے تو وہ بہت بڑا دھچکا تھا۔ میں تو پورا سال ان چھٹیوں کی راہ دیکھتا تھا کہ میرا پتر میرے ساتھ وقت گزار سکے گا۔ میں اس سے کیسے دست کش ہو سکتا تھا۔ میں نے کہا.....تم فکر نہ کرو۔ تم چھٹیاں گاؤں میں بھی گزار سکو گے اور عربی بھی پڑھ لو گے۔

اس رات میں سوچتا رہا۔ اوتار سنگھ کو عربی پڑھنے کا خیال کیسے آیا؟ اور وہ بھی اتنا اچانک؟ اسکول اور کالج کے دنوں میں میرا سب سے قریبی دوست مسلمان تھا۔ میں جانتا تھا کہ عربی مسلمانوں کی زبان ہے۔ ان کی مقدس کتاب اسی زبان میں ہے۔ تو کیا یوں ہے کہ اسے کسی مسلمان لڑکی سے محبت ہو گئی ہے لیکن یہ کوئی معترضانہ خیال نہیں تھا۔ مجھے تو بالکل ابتدا ہی میں واضح طور پر بتا اور سمجھا دیا گیا تھا۔ مجذوب نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے اپنے بیٹے کی ہر بات ماننی ہو گی۔ میں اسے کسی بات سے نہیں روکوں گا۔ وہ جس طرف جانا چاہے گا، میں اسے اسی طرف جانے دوں گا۔ اور جیوتشی نے مجھ سے کہا تھا.....چھوٹے ٹھاکر اپنا بھاگیہ آپ لکھیں گے۔ اور بالکل ابتدا میں میرے شیر خوار بچے نے عملی طور پر مجھے سمجھا دیا تھا کہ مجھے مجذوب اور جوتشی کی باتیں ہمیشہ یاد رکھنی ہوں گی۔ شاید میں ذہنی طور پر اس کے لئے تیار بھی تھا۔ اگر اوتار سنگھ نے مسلمان عورت کا دودھ پینے کی ضد کی تھی اور اس کے لئے جان کی بازی لگا دی تھی تو یہ امکان بھی قوی تھا کہ وہ اپنے لئے مسلمان پتنی چنے گا۔ تو مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بلکہ میرا جی چاہا کہ اس لڑکی سے ملوں۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھوں۔ بیٹے کا رجحان دیکھ کر ہی تو میں نے مسلمانوں کو اور ان کے دھرم کو سمجھنے کے لئے مطالعہ شروع کیا تھا۔ اور سچ یہ ہے کہ جو کچھ میں نے پڑھا اور جانا تھا، اس نے مجھے متاثر کیا تھا۔ میرا مطالعے کا شوق اور بڑھ گیا تھا۔

اگلے روز میں اس کے اسکول جا کر ہیڈ ماسٹر سے ملا۔ ان کی مدد سے مجھے اوتار سنگھ کے لئے عربی کا استاد مل گیا۔ مولوی برکت علی ہمارے ساتھ گاؤں میں گرمی کی چھٹیاں گزارنے پر بھی رضامند ہو گئے۔ مجھے اطمینان ہو گیا کہ کم از کم چھٹیوں میں تو وہ مجھ سے دور نہیں ہو گا۔

مگر مجھے اس معاملے کی کھوج تھی۔ اگلے دن شام کو وہ اچانک بے چین نظر آنے لگا۔ وہ مجھ سے بات کر رہا تھا۔ لیکن اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ مجھے اس پر محبت آ گئی۔ میں نے خود اس سے کہا.....تم پڑھنے کیلئے اوپر نہیں جاؤ گے پتر؟.....اس نے بے پروائی سے کہا.....نہیں پتا جی، آپ کے ساتھ وقت گزارنے کا یہ موقع میں ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے کہا.....دو گھنٹے کی تو بات ہے پتر۔ جاؤ تم پڑھ لو۔ ہو سکتا ہے کہ ابھی میں بازار جاؤں۔

(جاری ہے)

www.allurdu.com